PAGES MISSING
WITHIN THE BOOK
ONLY


کلیم
Checked 1975
مدیر جوش ملیح آبادی

نقش و نگار

شاعرِ انقلاب حضرتِ جوش ملیح آبادی

کی وجد آفرین نظموں کا مجموعہ جو سند رجۂ ذیل ابواب پر منقسم ہے

(۱) نگار خانہ (۲) خمریات (۳) تاثرات (۴) مطالعہ و نظر (۵) تشبیب

ہر نظم اپنی جگہ مکمل، مرصع اور کیفیاتِ شعری میں ڈوبی ہوئی ہے، اور اس کے مسحور کن نغمے دل و دماغ کے لئے ایک مستقل سکون، اور رُوح کے لئے ایک خاص سرور کا باعث ہوتے ہیں

لکھائی چھپائی نفیس اور دیدہ زیب ہے

قیمت

غیر مجلد ایک روپیہ آٹھ آنے۔ مجلد دو روپے

کلیم بک ڈپو جینتی نواس نمبر ۴۔ دریا گنج دہلی سے منگائیے

شاعر کی راتیں

شاعرِ انقلاب نے چند راتوں کی مختلف کیفیتوں کو اپنے خاص وجد آفرین اور کیف آور انداز میں بیان کیا ہے جنھیں پڑھکر ہر شخص اپنے آپ کو اسی ماحول میں محسوس کرنے لگتا ہے۔ راتوں کی تفصیل حسبِ ذیل ہے۔

مست رات	بدمست رات	راز و نیاز کی رات	انتظار کی رات
اندھیری رات	چاندنی رات	جوانی کی رات	تصورات کی رات
التفات کی رات	جدائی کی رات	اشکوں کی رات	برسات کی رات
ربودگی کی رات	بیخودی کی رات	سرشار رات	بھیگی ہوئی رات

تصورات کی رات   بےچین رات   بیابن ناگن کالی رات

قیمت صرف آٹھ آنے

کلیم بک ڈپو جینتی نواس نمبر ۴ دریا گنج دہلی سے منگائیے

شعلہ و شبنم

شاعر انقلاب حضرت جوش ملیح آبادی

(کی)

پُر جوش اور کیف آور نظموں کا مجموعہ

جو آپ کو آتشکدے کی شعلہ افشانیوں۔ اسلامی شان و حریت کے خون کھولا دینے والے واقعات، بادۂ سرجوش کی سرمستیوں اور گلبانگِ فطرت کے رُوح پرور نغموں سے لطف اندوز ہونے کا موقع دیگا

شاعرِ انقلاب کا یہ لافانی شاہکار غیر مطبوعہ کلام سے مرصع ہے

کتاب مجلد ہے اور نہایت خوشنما گرد پوش سے آراستہ ہے

قیمت صرف تین روپے

کلیم بک ڈپو، جینتی نواس نمبر ۴ دریا گنج دہلی سے منگائیے

پیغمبر اسلام

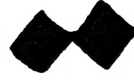
خواجۂ دو جہاں سرورِ کائنات آنحضرت محمد مصطفٰے صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت اور رسالت پر شاعرِ انقلاب جوش ملیح آبادی کا وہ غیر فانی شہ پارہ جس کی رفعت و عظمت کے سامنے قصرِ کفر سرنگوں ہوتا ہے۔ ثبوتِ پیغمبری کے باب میں اس لافانی شاہکار کے انوکھے استدلال دل میں تیر کی طرح اُترتے چلے جاتے ہیں۔ اس کے ازلی الہامات سے دماغ میں یزدانی نور سرایت کرجاتا ہے۔ اس کے دلائلِ قاطع کے سامنے ادراک منطق چھانٹنا بھول جاتا ہے۔ شاعرِ انقلاب پر جب ایک سرشاریت کا عالم طاری ہوا اُسی وقت اُنھوں نے یہ نظم کہنا شروع کردی عالمِ بیخودی میں چار روز کی ریاضتِ شاقہ اور یکسوئی قلب سے جو کچھ حاصل ہوا صرف وہی صفحۂ قرطاس پر تحریر کیا گیا۔ قیمت صرف آٹھ آنے

کلیم بک ڈپو، جینتی نواس نمبر ۴ دریا گنج دہلی سے منگائیے

بنام قوت وحیات

کلیم

دہلی



اے یگانہ جانے کب زمانہ اپنا
آگے کئی صدیوں ہے فسانہ اپنا
قدرت سے ملا ہے مجھکو صحیفۂ حکیم
بہروں کو سنائے جا ترانہ اپنا

منظور شدہ
ڈائرکٹران تعلیم
ریاستہائے میسور. پٹیالہ وحیدرآباد دکن

سالانہ چندہ چھ روپے
سہ ماہی چندہ دو روپے
ششماہی چندہ تین روپیہ آٹھ آنے
قیمت فی پرچہ نو آنے (۹)

جلد ۶ — فہرست مضامین بابتہ ماہ جولائی ۱۹۳۸ء — نمبر ۱

نمبر شمار	عنوان	مضمون نگار	نمبر صفحہ	نمبر شمار	عنوان	مضمون نگار	نمبر صفحہ
۱	اشارات	مدیر	۲	۱۳	انقلابی کی موت	جناب وجاہت صاحب سندیلوی	۳۹
۲				۱۴	ابابیل اور سرو ہربا دل	جناب سجاد حیدر صاحب ملیح آبادی	۴۱
۳	علامہ اقبال کا نظریۂ تغیر	جناب ل احمد صاحب اکبرآبادی	۹	۱۵	قومیت	جناب امین حزیں صاحب بہاولپوری مدیر شیرازۂ نگون	۴۲
۴	سفید ڈاڑھی	جناب عبید اللہ صاحب قدسی ایچ - پی - ایچ ایل	۱۲	۱۶	ہندوستان کے صنعتی مزدور	جناب عبدالرحیم صاحب شبلی بی کام	۴۵
۵	زاڈگ	جناب رشید احمد صاحب صابر ویلور	۱۶	۱۷	نئی چنگاری (نظم)	جناب ساغر صاحب	۵۶
۶	خواب	جناب شریمتی کملا دیو چودھری	۱۸	۱۸	ہندوستان کی جمہوری زبان	جناب امام اکبرآبادی صاحب	۵۷
۷	محبت کا چاند (نظم)	جناب انور صاحب بی اے	۲۳	۱۹	مجھے معلوم نہ تھا (نظم)	جناب تسکیں صاحب سعیدی ٹونکی	۶۱
۸	سپاہی کے ہزار فن	جناب اثر لکھنوی	۲۴	۲۰	افسانہ اور اُس کے عناصر	جناب مولانا امداد صاحب صابری	۶۲
۹	مقالات زریں	جوش ملیح آبادی	۲۸	۲۱	فیڈریشن	جناب شاد صاحب عارفی رامپوری	۶۹
۱۰	قومی غیرت	مولیپان - مترجمہ جناب سالک لکھنوی	۲۹	۲۲	چنگاریاں	جناب ازکی صاحب نقوی بجنوری	۷۱
۱۱	جنگ عظیم میں فرانس کے مذاکرات	جناب عمر عباسی صاحب	۳۲	۲۳	اشتہارات	مشتہرین	۷۳
۱۲	حسرت چمن	جناب امام اکبرآبادی	۳۵				
۱۳	عقیدت کے پھول	جناب اثر صاحب چکوالی	۳۸				

(جوش ملیح آبادی پرنٹر و پبلشر نے محبوب المطابع برقی پریس دہلی میں چھپوا کر دفتر رسالہ کلیم دریا گنج دہلی سے شائع کیا)

اشارات

حضرتِ "علاّمہ" کچھ فرما رہے ہیں!

قدیم موضوعاتِ شاعری کی نعشِ مجروح پر ایک اور ضربِ گراں
"حضرت علاّمہ — اپنی تحریک کی وضاحت میں"

"جس دن سے میں نے اُردو شاعری میں موضوعِ جام و شراب کے ترک پر توجہ دی ہے، لوگوں میں گوناگوں ظنّیات پیدا ہو رہے ہیں، کوئی کہتا ہے کہ اس تحریک کے پسِ منظر شخصی مُنافرت ہے، کوئی کہتا ہے اُردو شاعری کو سیاسی رنگ دے کر سیاست کی ہمنوائی مقصود ہے...

میرا مقصد اِس تحریک سے صرف یہ ہے کہ جس طرح میں نے......
گُل و بلبل، کنگھی چوٹی، وصل و ہجر، شیریں فرہاد، لیلیٰ مجنوں، دُوپٹہ اور پائینچے، رقیب و عدو، زُلف و شانہ، بوس و کنار، اور ساق و کمر کو مردود قرار دیا ہے، اُسی طرح موضوعِ شراب کو بھی ترک کرتا ہوں"

مندرجۂ بالا پارے کی معنوی غلطیاں ظاہر کرنے سے پیشتر، پہلے اس کی دو لفظی غلطیاں ظاہر کی جاتی ہیں۔

۱؎ پہلی غلطی تو ہے "وضاحت" جس کی جگہ صحیح لفظ ہے "توضیح" یا "وضُوح" گو یہ غلطی بہت عام ہے، مگر "علاّماؤں" کو اِس سے مجتنب رہنا لازمی ہے۔

۲؎ دوسری غلطی، یعنی حضرتِ "علامہ" تحریر فرماتے ہیں کہ "جس دن سے میں نے اردو شاعری میں موضوعِ شراب کے ترک پر توجہ دی ہے"

"علاّمہ" کی بارگاہِ علم و ادب میں دست بستہ گزارش ہے کہ توجہ "کی" جاتی ہے۔ "دی" نہیں جاتی — "توجہ دینا" یہ خالصاً انگریزی طرزِ بیان کی نقالی ہے، اور اِس قسم کی غلطی اُن لوگوں سے سرزد ہوتی ہے، جو زبانِ اُردو سے بیگانہ ہوتے ہیں۔

"توجُّہ دینا" مجھے معلوم ہے کہ اُردو زبان کا بھی ایک محاورہ ہے، مگر یہ محاورہ محدود ہے صوفیا کے حلقے تک، اور اِس کے معنی بھی توجہ کرنے کے معنی سے قطعاً مختلف واقع ہوئے ہیں۔ اب اِس پارے کے معنوی اسقام ملاحظہ ہوں:-

"علامہ" فرماتے ہیں کہ جن لوگوں کا یہ خیال ہے کہ میں نے ترکِ شراب کے خلاف جو آوازہ بلند کیا ہے۔ اُس کے پسِ پردہ شخصی منافرت کام کر رہی ہے، اور یہ "حُبِّ علی" نہیں، بلکہ "بُغضِ معاویہ" ہے، وہ سراسر غلطی پر ہیں۔

"علامہ" کی خدمت میں صرف اِس قدر عرض کیا جاتا ہے کہ وہ اُن اُمور کا ابطال کر کے خود اپنے ہاتھوں اپنی توہین نہ کیا کریں، جو تمام ہندوستان میں آفتاب کی طرح روشن ہیں۔

ہندوستان کا بچّہ بچّہ جانتا ہے کہ "علامہ" کی اِس "تحریک" کے پسِ پردہ رُوحانی طہارت اور درویشانہ تقویٰ نہیں، بلکہ شخصی منافرت اور ذاتی عداوت ہے۔

افسوس اُس "خیر" پر، جس نامراد "خیر" کے پیچھے "شر" کا جذبہ کام کر رہا ہو — اور حیف اُس "نیکی" پر جو بدی کا دودھ پی کر پروان چڑھی ہو۔

اب رہا "علامہ" کا یہ بیان کہ جس طرح وہ گُل و بلبل، اور شیریں فرہاد

مدیر

کے موضوعات کو ترک کرا چکے ہیں۔ اُسی طرح آج اپنے وابستگانِ دامانِ شاعری کے نام وہ یہ شاہانہ فرمان بھی جاری فرما رہے ہیں کہ آج سے شراب، اور متعلقاتِ شراب کے تمام پہلوؤں پر خامہ فرسائی ترک کر دی جائے ——
سو اس کے متعلق میں اس کے علاوہ کیا عرض کروں کہ حضرت "علامہ" سب سے پہلے اس بات کی معرفت حاصل کریں کہ شاعری دراصل نام ہے کس چیز کا!

حیرت ہے کہ "علامہ" کو شعر کہتے ساٹھ برس گزر چکے ہیں، اور اب تک بدقسمتی سے اُنھیں اس کی فرصت ہی نہ مل سکی کہ وہ شاعری کی تعریف تو کم سے کم سمجھ لیتے۔

اگر شاعری، حیات کو آغوش میں لے لینے، اور کائنات کا احاطہ کر لینے کا نام ہے، اور اگر شاعری، جذباتِ انسانی سے لے کر ذرات و انجم تک کی ترجمانی و تشریح کا ایک غیر مشروط لائیسنس ہے، تو پھر اس کے دائرے سے نہ تو گُل و بلبل ہی کو خارج کیا جا سکتا ہے، اور نہ شیریں و فرہاد ہی بے دخل کئے جا سکتے ہیں۔

اگر اس کرۂ ارض کے ذرات سے لیکر آسمان کے تمام اجرام، احاطۂ شاعری میں داخل ہیں تو پھر کس کی مجال ہے کہ وہ ملکۂ شاعری کی غیر محدود قلمرو سے کسی ادنیٰ سے ادنیٰ حصے کو بھی خارج کر سکے ——

یہ سچ ہے کہ اُردو شاعری کے احاطے سے "گل و بلبل" وغیرہ کے اخراج کا مشورہ اس سے قبل بعض سنجیدہ حضرات بھی دے چکے ہیں۔ لیکن اُن کا منشا وہ نہیں تھا جو حضرتِ "علامہ" نے سمجھ رکھا ہے۔

بات یہ ہے کہ ایران کی نقالی کے ہاتھوں ہماری غزل میں گل و بلبل اور شیریں فرہاد کی روایتی ہرزہ سرائیاں اس قدر حد سے متجاوز ہو چکی تھیں کہ بعض افراد نے تنگ آ کر یہ کہنا شروع کر دیا تھا کہ اب اس قصے کو چکا دینا ہی مناسب معلوم ہوتا ہے، تاکہ غزل گو حضرات، ایرانی شعراء کے دیوانوں میں نقب لگانے سے محترز ہو کر خود اپنے قوائے ذہنی سے کام لینا شروع کر دیں۔

لیکن اس کے برخلاف "علامہ" یہ سمجھ بیٹھے کہ دراصل "گل و بلبل" اور "شیریں فرہاد" ہی میں کچھ ایسا لِس بھرا ہوا ہے کہ اُنھیں سرے سے ترک ہی کر دیا جائے۔

اسی کے ساتھ ساتھ یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ دُنیا کی ہر قوم کی شاعری میں بعض مخصوص الفاظ، بعض مخصوص اصطلاحیں اور بعض مخصوص تصورات ایسے ہوتے ہیں کہ اگر اُنھیں اُس زبان کی شاعری سے خارج کر دیا جائے تو شاعری کا چہرہ بے نُور ہو کر رہ جائے، اور ادائے مطالب میں ناقابلِ حل پیچیدگیاں پیدا ہو جائیں۔

ہماری اُردو شاعری بھی اس سے مستثنیٰ نہیں۔ اس میں بھی شیریں فرہاد، لیلیٰ مجنوں، وامق عذرا، نل دمن، ہیر رانجھا، یوسف زلیخا، اور برقِ طُور، بوئے پیرہن، گلزارِ خلیل، یدِ بیضا، ماہِ مصر، رطلِ گراں، جامِ زہر، خوابِ نرگس نیاز، سرو رواں، شمشادِ چمن، انفاسِ مسیح، بنتِ عنب، گُل و بلبل، ساعدِ سیمیں، طور و کلیم اور مصحفِ رُخ وغیرہ ایسی چیزیں ہیں کہ اگر ہم انھیں شاعری سے خارج کر دیں، تو ہماری شاعری کے دیار میں خاک اُڑنے لگے۔

یہ مندرجۂ بالا اور اسی قبیل کے صدہا مخصوص الفاظ و تصورات، متقدمین کی صدیوں کی کاوش کا نتیجہ ہیں، اور ان تمام الفاظ و تصورات پر ماہ و سال کی مسلسل موجیں اسی طور سے گزر چکی ہیں کہ اُن میں موتی کی سی چمک اور ترشے ہوئے نگینوں کی سی دل آویزی پیدا ہو چکی ہے۔ کیا ہم اِن نگینوں سے ہات اُٹھا لیں، اور کیا اس دولتِ بیدار کو برباد کر دیں جو وقت کے پوشیدہ ہات نے ہمارے واسطے جمع کر رکھی ہے! کاش "علامہ" غور فرما سکتے۔

اس کے علاوہ آئیے ایک دوسرے نقطۂ نظر سے موضوعاتِ شاعری پر نظر ڈالیں۔

اس سے پیشتر بھی شاید "کلیم" ہی میں عرض کیا جا چکا ہے کہ ہر شاعر، موزوں طبع ہوتا ہے، لیکن ہر موزوں طبع، شاعر نہیں ہوتا —— پس ہر وہ شخص جو صرف موزوں طبع تو واقع ہوا ہے، مگر شاعر نہیں ہے، ایسا غیر شاعر آدمی جس موضوع پر بھی خامہ فرسائی کرے گا خواہ وہ موضوع کتنا ہی بلند کیوں نہ ہو اُسے بگاڑ دے گا، اور جس پھول کو توڑے گا، اُس میں سے بُو آنے لگے گی۔

لیکن اس کے برخلاف جو شخص حقیقی شاعر ہے، وہ جس موضوع پر بھی قلم اُٹھائے گا، عام اس سے کہ وہ موضوع بجائے خود بہترین ہو کہ بدترین، اُس میں چار چاند لگا دے گا۔ اور جس ذرّے پر تصرف کرے، زُہرا د

مشتری کو آرزو ہوگی کہ کاش ہم اُسے چوم سکتے۔

اور جب فطری و غیر فطری شاعری کے تیور اِس طور کے واقع ہوئے ہیں تو کیا یہ ایک جا ہلانہ مسخرگی نہیں کہ شاعری میں بعض اُمور کو ترک اور بعض کو اختیار کیا جائے، بعض کو حلال سمجھا جائے اور بعض کو حرام؟

کیا حضرتِ "علامہ" مدظلہ العالی کو جلال الدین رومی کا یہ شعر یاد نہیں۔

ہر چہ گیرد علتی، علت شود
کفر گیرد کاملے، ملت شود

غور کرنے کا مقام ہے کہ جب دُنیا کی بہترین چیزیں بھی، علتی کے تصرف میں آکر علت بن جاتی ہیں اور کُفر کی سی شے بھی کامل کے تصرف میں آکر ملت کا مرتبہ حاصل کر لیتی ہے تو پھر اشیاء کا نہیں، بلکہ افراد کا سوال باقی رہ جاتا ہے ——— یعنی اشیائے عالم، اپنے مرتبۂ ذات میں نہ تو اچھی ہی ہیں، نہ بُری، یہ کام تو افراد کا ہے کہ اُنھیں صحیح یا غلط استعمال کر کے اُن کے مدارج کو متعین کر دیں۔

بہت ممکن ہے بعض حضرات یہ کہیں کہ اگر موضوعاتِ شاعری کا دائرہ لامحدود کر دیا جائے گا تو اِس سے ادبیات میں، اور ادبیات کی معرفت سوسائٹی میں خرابیاں پیدا ہو جانے کا اندیشہ ہے، لیکن میں اِسے تسلیم کر لینے پر اپنے کو مہیا نہیں کر سکتا۔

بات یہ ہے کہ حقیقی اُدبا و شعراء کے ذہن میں ایک خُفیہ پیمانہ ہوتا ہے، جس سے وہ اپنے تخیلات و ابیات کو جانچا اور تولا کرتے ہیں، اور اِس پیمانے کی امداد سے شعراء کا ادراک ہر اُس شعر کو وجود میں آنے سے روک دیتا ہے جس میں پستی کی جھلک پائی جاتی ہے۔

اب رہے غیر فطری شُعراء، سو اُن کے واسطے یہ قطعی غیر ضروری اور مہمل بات ہے کہ اُن سے درخواست کی جائے کہ فلاں فلاں اُمور پر خامہ فرسائی کریں، اور فلاں فلاں اُمور کو ترک کر دیں ——— اُن کے واسطے تو بہترین تدبیر یہ ہے کہ "شعر ایکٹ" پاس کر کے اُنھیں قانوناً شعر کہنے سے منع کر دیا جائے۔

اب "علامہ" خطبہ پڑھتے نظر آرہے ہیں

ملاحظہ فرمائیے:-

"اِس وقت مسئلہ زیرِ غور، موضوعاتِ شعر و شاعری کی ترمیم و تجدید ہے:"

میں ابھی موضوعاتِ شاعری، اور فطری و غیر فطری شاعروں کے سلیقے کے متعلق جو کچھ عرض کر چکا ہوں، وہ آپ کے ذہن میں ہوگا ——— اور اُس روشنی میں اگر آپ "علامہ" کے "خطبے" کا یہ فقرہ دیکھیں گے تو آپ کو یقیناً "علامہ" پر ترس آنے لگے گا۔

بہر حال اِس فقرے سے یہ ظاہر ہو رہا ہے کہ "علامہ" موضوعاتِ شاعری کی ترمیم و تجدید چاہتے ہیں۔

لیکن حیرت کی کوئی انتہا نہیں رہ جاتی، جب ہم اِس فقرے کے فوراً ہی بعد مندرجۂ ذیل فقرہ پڑھتے ہیں۔

"دُنیا کی جتنی حالتیں، اور کیفیتیں ہیں، وہ سب موضوعاتِ شاعری ہیں، اور دُنیا کی حالات و کیفیات کی تجدید ناممکن و محال ہے"

اِس تضاد کی کوئی انتہا بھی ہے؟ ایک طرف تو جناب ترمیم و تجدید پر آمادہ نظر آتے ہیں، اور دوسری طرف اِس حقیقت کا اقرار بھی فرماتے ہیں کہ تجدید و ترمیم ناممکن و محال ہے۔ آخر یہ مُعمہ کیا ہے؟

"علامہ" ارشاد فرماتے ہیں:-

"اُردو شاعری، جو فارسی کے بطن سے پیدا ہوئی، سنِ بلوغ تک نئے خیالات، و موضوعات کی حامل رہی"

"علامہ" کا بڑا احسان ہوگا اگر وہ اُردو شاعری کے اُن نئے خیالات و موضوعات کی فہرست مرتب فرما کر شائع کر دیں گے جن کی وہ سنِ بلوغ تک حامل رہی ہے۔

جہاں تک میری نظر کا تعلق ہے میں تو عرض کروں گا کہ اُردو شاعری یعنی غزل، کبھی اور کسی عالم میں بھی نئے خیالات و موضوعات کی حامل نہیں رہی ہے۔

اِس کے علاوہ نکتہ رس حضرات کی خدمت میں گزارش ہے کہ کیا آپ اُس کلامِ موزوں کو شاعری کا لقب دینے کی جرأت کر سکیں گے، جو کسی دوسری زبان کی شاعری کے بطن سے پیدا ہوا ہو؟ اور کیا کسی مُلک کی شاعری، اُس مُلک کے جغرافی، سماجی، اور نفسیاتی حالات و تاثرات کے عوض کسی اجنبی مُلک کی شاعری کے بطن سے پیدا ہوا کرتی ہے؟ اور اگر یہ دوسری صورت غلط ہے تو پھر آپ اپنی غزل کو کیا شاعری،

یعنی حقیقی شاعری کا لقب دے سکتے ہیں ؟

اِس کے بعد "علاّمہ" ایک فقرے میں فرماتے ہیں "عرصۂ مختصر" یہ "عرصۂ مختصر" کیا بلا ہے ؟ چونکہ یہ "علاّمہ" کی تحریر ہے ، اس لئے ہم بہایت ادب کے ساتھ خود "علاّمہ" ہی کی خدمتِ عالی میں عرض کریں گے کہ "عرصہ" بمعنی "مدّت" مؤنث ہے ، اور اربابِ فن کے نزدیک اُردو الفاظ کی ترکیب ناجائز ہے ، "عرصۂ مختصر" کے معنی تو ہوں گے "چھوٹا سا میدان" اور آپ کہنا چاہتے ہیں "تھوڑی سی مدّت" اس مفہوم کو جناب نے "مُدّتِ مختصر" سے کیوں نہیں ادا فرمایا ؟

اِس کے بعد ارشاد ہوتا ہے کہ :-

"جو ضمیر اور نفوس ، آسانی شہنشاہیت تک رسا ہیں ــــــ"

"علاّمہ" آپ تو پادریوں کی سی باتیں کرنے لگے ، اور اس "پادریت" کے دَور میں آپ کو یہ بھی خیال نہیں رہا کہ "شاہنشاہ" اور اُس کا مخفف "شہنشاہ" فارسی لفظ ہے ، اور اس لحاظ سے اسے لقاعدۂ عربی "شاہیت" اور "شہنشاہیت" کی صورت میں لانا ، علاّمہ پن کے جہل کا پردہ چاک کرنا ہے ۔

اب ایک بات قارئینِ کرام اچھی طرح ذہن نشین فرمالیں ــــــ یعنی "علاّمہ" نے یہ "خطبہ" موضوعاتِ شاعری میں سے شراب اور متعلقاتِ شراب کے خارج کر دینے کے واسطے پڑھا تھا۔

نیز اس امر پر بھی نگاہ رکھی جائے کہ "علاّمہ" مسلمان ہیں ، اور اپنی گزشتہ زندگی سے تائب ہو کر نماز روزے کے پابند ہو گئے ہیں ، قرآن کو خدا کی کتاب ، اور آیاتِ قرآنی کے ابطال کو کفر سمجھتے ہیں ــــــ اور چونکہ "علاّمہ" کا عقیدہ ہے کہ قرآن پاک نے شراب کو ناپاک اور حرام ٹھہرایا ہے ، اِس لئے "علاّمہ" کے واسطے زندگی میں ایسا کوئی موقع نہیں نکل سکتا کہ وہ شراب کو کبھی اور کسی عالم میں ، اور کسی شرط کے ساتھ بھی اچھا سمجھ سکیں ۔

مندرجۂ بالا اُمور کو سامنے رکھتے ہوئے ذیل کا پارہ ملاحظہ فرمائیے ۔

"امریکہ اگر تحریکِ انسدادِ مے نوشی میں کامیاب نہ ہو سکا ، تو اس کا سبب یہ تھا کہ بہ اقتضائے آب و ہوا وہاں شراب ، شریکِ تمدن و معاشرت تھی ، ہندوستان میں شراب نوشی کا ایک تفریحی اور نشاطی جذبۂ خارجی ہے .... امریکہ میں شراب مُعاونِ صحت ہو سکتی ہے ، لیکن یہاں ہمیشہ مُخربِ صحت ثابت ہوئی ہے "

"علاّمہ" کے حسبِ قول امریکہ کی آب و ہوا اِس کی مقتضی ہے کہ وہاں شراب پی جائے ۔ اور چونکہ یہ اقتضائے آب و ہوا کا معاملہ ہے ، اس لئے "علاّمہ" بھی اِس موقع پر اظہارِ اکراہ نہیں فرماتے ہیں ۔ اور چونکہ ہندوستان ایک گرم مُلک ہے اور گرم مُلک ہونے کے باعث یہاں کی آب و ہوا شراب پلانے پر اصرار نہیں کرتی ہے ، اور چونکہ ہندوستان میں شراب نوشی کا جذبہ محض ایک "نشاطی جذبۂ خارجی" ہے ۔ اِسی بنا پر "علاّمہ" اپنے ہموطنوں کو شراب پینا گناہ ، شراب کا تذکرہ کرنے تک کی اجازت نہیں دیتے ، اور اس باب میں یہاں تک احتیاط آمیز سختی روا رکھتے ہیں کہ گروہِ شعراء تک کو ، جو اپنی وارستہ مزاجیوں کے ہاتھوں کسی مُلک میں بھی پابندیوں کا غلام نہیں رہا ہے ، یہ مشورہ دیتے ہیں کہ وہ اپنے اشعار کو بھی شراب کے ذکر سے خالی کرکے آگرے کی پہاڑیوں کی طرح خشک بنا ڈالیں ــــــ

یعنی بہ الفاظِ دیگر "علاّمہ" "شراب نوشی ، اور "شراب گوئی" کے ترک پر اِس لئے زور نہیں دیتے ہیں کہ کلامِ پاک میں اِس کو "حرام" قرار دیا گیا ہے ، بلکہ جغرافی حالات کی رُو سے وہ ہندوستانیوں کے حق میں شراب کو "مُخربِ صحت" خیال کرتے ہیں ، جس کے معنی اِس کے سوا اور ہو ہی کیا سکتے ہیں کہ اگر ہندوستان کی آب و ہوا کسی وقت امریکہ سے ملنے لگے اور یہاں بھی شراب بہ اقتضائے آب و ہوا ، ایک "نشاطی جذبۂ خارجی" کے عوض ایک فطری اور داخلہ جذبۂ حیات ، بن جائے تو حضرت "علاّمہ" تشنہ کامانِ ہند کو بھی شراب نوشی کا پروانہ عطا فرما سکتے ہیں ۔

اِس کے بعد جو کچھ ارشاد فرمایا ہے ، اُس میں تو آپ کی اسلامیّت اپنی پوری تابانی کے ساتھ جلوہ گر ہو گئی ہے ۔ ملاحظہ فرمائیے :-

"امریکہ میں شراب معاونِ صحت ہو سکتی ہے "

ایک مسلمان ، اور شراب کے متعلق یہ رائے رکھتے کہ وہ بعض خاص حالات اور بعض خاص ممالک میں مفیدِ صحت بھی ہو سکتی ہے ۔ کیا یہ قرآن کا کُھلا ہوا انکار نہیں ہے ؟ وہ شراب جس کے متعلق قرآن یہ کہتا ہے کہ اُس کی مُضرتیں بہت بڑھی ہوئی ہیں ۔ وہی شراب حضرت "علاّمہ" کے نزدیک

امریکہ میں "معاونِ صحت" ہو سکتی ہے۔

"علامہ" سے دریافت کیا جائے کہ قرآن تو ہر قوم، اور ہر ملک اور ہر زمانے کے واسطے نازل ہوا ہے۔ اور اگر مسلمانوں کا یہ دعویٰ صحیح ہے تو شراب کے باب میں صرف دو ہی صورتیں ہو سکتی ہیں۔ یعنی یا تو شراب، ہر قوم، ہر ملک، ہر آب و ہوا، اور ہر زمانے کے واسطے مُضر ہے، یا نعوذ باللہ، خدا سے یہ چُوک ہو گئی ہے کہ وہ امریکہ اور امریکہ کی طرح کے دیگر سرد ممالک کو مستثنیٰ کرنا بھُول گیا ہے۔

لیکن حضرت "علامہ" کو اِن مُوشگافیوں سے کیا سروکار، ضرب خواہ بندے پر پڑے، خواہ خدا پر، اُنھیں تو اپنی "علامیت" کا سکہ بٹھانا مقصود ہے۔

آج "علامہ" نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ نماز پڑھتے دیکھنے سے مسلمان خوش ہوتے ہیں، اور اُن کے خوش ہونے سے فائدہ پہونچ رہا ہے۔ اِس لئے اُنھوں نے اس عمر میں نماز شروع کر دی ہے۔ لیکن اگر کل کسی ذریعے سے اُنھیں یہ معلوم ہو جائے گا کہ مندر میں گھنٹہ بجانے سے اِس سے زیادہ فائدہ حاصل ہو گا تو وہ نماز چھوڑ کر گھنٹہ بجانے لگیں گے۔

آج "علامہ" یہ دیکھ رہے ہیں کہ قوم قوم پکارنے سے شہرت حاصل ہوتی ہے ہر اس بلند پایہ قومی نظم پر فوراً ایک نظم کہہ ڈالتے ہیں جو ملک میں شہرت حاصل کر چکی ہوتی ہے۔ لیکن اگر کل انگریز انگریز کے نعرے مارنے سے فائدے کی کوئی اُمید وابستہ ہو جائے تو "علامہ" کے گلوئے مبارک سے "یا انگریز" "یا انگریز" کے نعرے نکلنے لگیں گے۔

"علامہ" کو یاد ہو گا کہ اُن کے ایک ذی اقتدار دوست کے دہاں کچھ دن ہوئے کہ ایک مشاعرہ ہوا تھا، جس کی صدارت وہی کر رہے تھے، اور خود اُن کی صدارت میں ایک صاحب نے ہندوستانی قومیت اور کانگریس کے خلاف نہایت ہی سخت ایک نظم پڑھی تھی، جس پر میں "علامہ" کے کان میں یہ کہہ کر اُٹھ گیا تھا کہ مولانا یاد رکھئے گا آپ کی صدارت میں آزادی پسند ہندوستان کی یہ تذلیل ہو رہی ہے۔ لیکن چونکہ صاحب مشاعرہ کی شخصیت رُعب آفریں تھی، "علامہ" میری بات پر اِس طرح مُسکرا کر چُپ ہو گئے تھے گویا میں کوئی طفلانہ حرکت کر رہا ہوں۔

قارئینِ کرام خود اندازہ فرما سکتے ہیں کہ اِس کیرکٹر کے حضرات سے کوئی قوم کیا اُمیدیں قائم کر سکتی ہے۔

"علامہ" ارشاد فرماتے ہیں:۔

"کیا اب وقت نہیں ہے کہ ہم ضرورتِ ملک و قوم کے پاس و لحاظ سے اردو شاعری کے اِس موضوع یعنی (جام و شراب، یا یوں سمجھئے کہ "ساغر") کو جو مذہباً، اخلاقاً، اور اب قانوناً بھی قابلِ ترک ہے، بے اثر کرکے مذہب، اخلاق اور قانون کی نگاہ میں شایانِ عزت و قبول سمجھے جائیں"

یہاں ایک بڑا نازک سوال پیدا ہوتا ہے، اور وہ یہ ہے کہ "علامہ" موصوف سے دریافت کیا جائے کہ شراب کے مذہباً حرام ہونے کا آپ کو کس سن میں علم ہوا تھا؟

ایسا تو نہیں ہے کہ جس روز کانگریسی حکومت کے ماتھے پر شراب کو دیکھکر شکنیں پڑی تھیں، عین اُسی دن، کسی لطیفۂ غیبی کی بنا پر، یہ بات بھی قدرت آپ کے علم میں لے آئی کہ شراب "مذہباً" اور "اخلاقاً" بھی "حرام" ہے؟

اگر ایسا نہیں ہے تو، چونکہ علامہ، مسلمان خاندان میں پیدا ہوئے ہیں، اس لئے اگر میں یہ خیال کروں تو غالباً بجا ہو گا کہ مکتب کے زمانے ہی میں "علامہ" کو یہ معلوم ہو گیا ہو گا کہ "کالا پانی" "حرام اور اُمّ الخبائث ہے"

لیکن اِس کے باوجود "علامہ" اپنی شاعری میں شراب و متعلقاتِ شراب سے برابر رنگ بھرتے رہے، اور یہیں تک آپ نے اکتفا نہیں کیا، بلکہ سالہا سال تک بوتلوں پر بوتلیں بھی چڑھانے میں آپ نے ایک لمحے کے واسطے بھی کوئی پس و پیش نہیں فرمایا۔ اور ایک بیچاری شراب ہی کیا ہے، "علامہ" میرا منہ نہ کھلوائیں۔ خود ہی اپنے گریبان میں منہ ڈال کر دیکھ لیں کہ وہ کیا کرتے رہے ہیں۔

جس سے ثابت ہوتا ہے کہ حضرتِ "علامہ" کو اگر مذہب و اخلاق کا پاس ہوتا تو وہ کبھی ایسی زندگی بسر کرنے پر ماضیٔ قریب تک، جب کہ وہ بوڑھے ہو چکے ہیں، اصرار نہ کرتے رہتے۔

اور جب خود حضرتِ "علامہ" کی تمام زندگی مذہب و اخلاق کی مسلسل سرتابی میں بسر ہوئی ہے تو اب یہ نفرتِ شراب کیا معنیٰ رکھتی یا رکھ سکتی ہے!

آئیے، میں آپ کو بتاؤں، اس لئے کہ حضرتِ "علامہ" کے کیرکٹر

کے عرفان کی سعادت مجھے مُدّتِ دراز سے حاصل ہے۔ اِس نفرتِ شراب کے دو اور صرف دو سبب ہیں،

(۱) شخصی منافرت ——

(۲) اور کانگریسی حلقے میں سَستی شہرت اور سَستی شہرت کے ذریعے سے حلبِ منفعت —

"علامہ" کے یہ فقرے پھر سُنیئے:۔

"کیا اب وقت نہیں ہے کہ.......... اردو شاعری کے موضوعِ (شراب) کو بے اثر کر کے ہم...... قانون کی نگاہ میں شایانِ عزت و قبول سمجھے جائیں۔"

بس مدّعا تو صرف اِس قدر ہے کہ ہم قانون، یعنی کانگریس کے حلقے میں عزت و حرمت حاصل کر لیں۔

یعنی ایک طرف تو شخصی منافرت کے جذبے کو آسودگی حاصل ہو، اور دوسری طرف کانگریس ہمارے رسالے اور ہماری کتابوں کے سر پر شفقت کے ساتھ ہاتھ پھیرنے لگے۔

حیف اُس طہارت پر جس کی بنیاد ہو عداوت کی گندگی پر — اور حیف اُس تقوے پر جس کی بنا ہو معدے کی عفونت پر!

مقطع میں آ پڑی ہے سخن گسترانہ بات
مقصود اِس سے قطعِ محبت نہیں مجھے

اعتذار

نہایت افسوس کے ساتھ اطلاع دی جاتی ہے کہ "کلیم" کے رُوحِ رواں اسرائیل احمد خاں صاحب بعض وجوہ کی بنا پر کچھ دنوں کے لئے دہلی سے باہر تشریف لے گئے ہیں، اور چونکہ "رفتارِ زمانہ" صاحبِ موصوف ہی خاص طور سے لکھا کرتے تھے۔ اس لئے اُن کی غیر موجودگی کے باعث یہ باب اس بار ضبطِ تحریر میں نہ آسکا۔

ہر چند یہ بآسانی ممکن تھا کہ اس باب کو کسی دوسرے صاحب سے لکھا لیا جاتا، مگر چونکہ "مولوی مدن" کی سی بات کا پیدا ہونا تقریباً ناممکن تھا، اس لئے ایک ناقص شے کے پیش کرنے کے عوض اُس کا نہ پیش کیا جانا ہی مناسب معلوم ہوا

اُمید کی جاتی ہے کہ اسرائیل احمد خاں صاحب اس ماہ کے اختتام تک واپس تشریف لے آئیں گے، اور "رفتارِ زمانہ" کا سلسلہ حسبِ دستور جاری کر دیا جائے گا۔ —— اُمید کہ قارئینِ کرام معاف فرمائیں گے۔

اس ملک میں اک عمر سے ہوں بے خور و خواب
کس طرح معطل ہوں رسوم و آداب
جی تو ہے وضعِ راستگوئی لیکن
برداشت بھی کر سکیں گے اس کو احباب

جوش

ہر عالمِ دیں پناہ، جاہل نکلا
ہر کوہ شمائل ایک کاہ، بسمل نکلا
افسوس کہ جس شجر کے میوے پہ تھی ٹیک
چکھا کہ جو میٹھا تو مغز، باطل نکلا

جوش

بے حجابانہ درآ

بے حجابانہ درآ، رُوح کو مضطر کردے | جسم کو جان بنا، خاک کو جوہر کردے

آ تمناؤں میں بھرتا ہوا پھر طرفہ خروش | دِل کو پھر منصبِ شورش پہ مُقرر کردے

آ، شبِ یاس کو دیتا ہوا پیغامِ اُمید | ایک ہلچل سی سرِ بالش و بستر کردے

آ، خس و خارِ جنوں کو بھی بنا سرو و سمن | آ، شبستانِ وفا کو بھی منوّر کردے

عالمِ عشق کو پھر عہدِ گُل ارزانی کر | ذرۂ شوق کو پھر خسروِ خاور کردے

ایک ہی دَور میں آج اے نگہِ بادہ فروش | فتنۂ ہوش کو عرقِ مئے احمر کردے

آتشِ تشنگیٔ دِل کو بنا آبِ خضر | گردِ آئینۂ ہستی کو سکندر کردے

تجھکو اپنے لبِ گُل رنگ کی خوشبو کی قسم | شامِ ہجراں کی ہواؤں کو مُعطّر کردے

صحنِ گیتی کے، بہ یک نازِ مٹا پست و بلند | سطحِ عالم کو، بہ یک عشوہ برابر کردے

عشق کے سر کو بنا، حُسن کے زانو کا نگیں | خار کو، دولتِ آغوشِ گُلِ تر کردے

مَوجۂ چشمۂ حیواں کا تصدّق اے زُلف | میرے شانوں پہ رواں زمزم و کوثر کردے

آشنا رُوئے کتابی کی کوئی آیۂ ناز
جوشِ وارفتہ کو شاعر سے پیمبر کردے

جوشؔ

علامہ اقبال کا نظریۂ ملیّہ

ل۔ احمد

ذیل کا مضمون علامۂ اقبال کی وفات سے دو چار روز قبل ہی اخبار مدینہ کو بھیجا گیا تھا۔ فاضل مدیر اخبار نے، علامہ کی وفات کے بعد شاید اس کی اشاعت کو غیر مناسب سمجھا۔ لیکن میرا خیال ہے کہ علمی اذکار اور اصولی بحثیں تو علم اور بحث کی خاطر ہونا چاہئیں افراد و اشخاص کے واسطے کیوں ہو؟ بحث کو علم کی زیادتی کا موجب کہا گیا ہے مصنف و ناقد کو بیش بہا فوائد حاصل ہوتے ہیں۔ چنانچہ اسی نظر سے یہ مضمون کلیم میں شائع کیا جا رہا ہے۔ ل۔ احمد

حضرت مولانا حسین احمد صاحب مدنی کے اس قول پر کہ قومیں وطن سے بنتی ہیں علامۂ اقبال کا اعتراض شروع میں تو ایک لغوی و لسانی بحث کی صورت رکھتا تھا، لیکن اس نے فوراً ہی ایک دینی مسئلے کی شکل اختیار کر لی اور اب اخبارات میں موافق و مخالف آراء کا اظہار ہو رہا ہے۔ میری نظر سے صرف وہی مضامین گزر سکے جو مدینے میں نکلے یا حضرت کشّاف کا مضمون جو کلیم کے اپریل نمبر میں شائع ہوا تھا۔

ظاہر ہے کہ دینی نقطۂ نظر سے میں اس بحث میں شریک ہونے کا مجاز اور اہل نہیں، مگر ایک بحث کے مختلف گوشے ہو سکتے ہیں۔ علامہ اقبال کا جوابی مضمون، جسے ایک مستقل مقالہ کہنا چاہیئے، پڑھنے کے بعد بعض شبہات پیدا ہوتے ہیں جنھیں یہاں پیش کرنے سے مقصود بس یہ ہے کہ شرکاء بحث ان پر روشنی ڈال سکیں اور خود حضرت علامہ بھی توضیح فرما دیں۔

علامۂ اقبال تسلیم کرتے ہیں، کہ حُبّ وطن ایک فطری جذبہ ہے۔ اتنا فطری کہ "اُس کے ثبوت میں کسی قول یا دلیل کی بھی گنجائش نہیں" اور اس لئے کہ وہ فطری جذبہ ہے اصولِ اسلام سے متصادم نہیں ہو سکتا، کیونکہ اسلام خود دینِ فطرت ہے، اور تمام مظاہرِ فطرت اسلام ہی کی تائید کرتے نظر آنے چاہئیں، اور اس لئے حبِ وطن کے جذبے کو اصلاً و اصولاً مطابق اسلام ہونا چاہیئے۔

اور چونکہ انسانی جذبات انسانی افعال کے موجب اور حرکات کے محرک ہوتے ہیں اس لئے حبِ وطن کو صرف فطری جذبہ کہہ کر چھوڑ دینا نفسِ بحث کو مطمئن نہیں کرتا۔ مگر علامہ اقبال نے یہی کہا ہے کہ "وہ فطری جذبہ ہے۔ مگر جب سیاسی نظریہ بنایا جائے گا ہیئتِ اجتماعیہ انسانیہ سے متصادم ہوگا" میری غرض یہ ہے کہ اس میں "جب" کی شرط کیسی۔ مجھے اپنے گھر سے محبت ہے اور وہ ختم ہوتی ہے سیاست میں جا کر؛ چونکہ میں اپنے گھر اور اس لئے اپنے وطن سے محبت کرتا ہوں، اس لئے ایک نہ ایک دن مجھے یا میری نسلوں کو اُس ملک یعنی اپنے گھر کی حفاظت کے لئے دوسروں سے برسرِ پیکار ہونا ہی پڑے گا۔ حب وطن کا جذبہ سیاسی نظریہ بنے بغیر رہ کیونکر سکتا ہے؟

اب چونکہ میں اپنے گھر کو نہ صرف ہمسایہ غیر مسلم سے بلکہ اپنے بھائی تک کے حملے سے محفوظ رکھنے کے لئے فطرتاً مجبور ہوں۔ اس لئے وہ غیر ملکی حملہ آور اگر کوئی مسلمان بھی ہے تو حفاظتِ وطن کے لئے اس سے میرا نبرد آزما ہونا بھی ایک فطری فعل ہوگا۔ میرا مدعا یہ ہے کہ گھر یعنی وطن کی محبت مجھے ہر اس فعل و عمل پر آمادہ کر دے گی جو اُسے غیر کے حملہ و تصرف سے بچانے کے لئے مناسب معلوم ہو۔ ایسی صورت میں میرا جذبۂ وطنیت جو ایک فطری چیز ہے اور اس

عین مطابق اسلام ——— ایک بنا بنایا سیاسی نظریہ ہے اس میں شرط کی گنجائش ہی نہیں۔ بہرحال حبِ وطن کے جذبے کا سیاسی نظریہ بن جانا مستلزم ہے

لیکن اگر یہ صحیح ہے تو علامہ موصوف کے نقطۂ نظر کے مطابق ہیئتِ اجتماعیۂ انسانیہ کا نظریہ بھی بقول علامہ عین دین ہے۔ اس لئے لازماً دونوں باتوں میں ایک غلط ہے یا دونوں ایک ہی شے ہیں، سمجھا غلط جا رہا ہے۔ اگر ہیئتِ اجتماعیہ انسانیہ کا نظریہ عین دین ہے تو حبِ وطن کا جذبہ غیر فطری یعنی غیر اسلامی قرار پاتا ہے کیونکہ وہ اِتنے اہم واساسی نظریئے سے متصادم ہوتا ہے! لیکن علامہ موصوف اُسے بھی فطری مانتے ہیں، اور ظاہر ہے کہ یہ جذبہ نہ صرف انسانوں میں بلکہ حیوانوں میں بھی عام طور سے مشاہدے میں آتا ہے، اُسے غیر فطری کہہ بھی کون سکتا ہے :

علامہ اقبال، با دعائے خود "مقامِ محمدؐ" سے باخبر ہیں، اور اس باخبری ہی کا نتیجہ ہیئتِ اجتماعیۂ انسانیہ کا نظریہ ہے۔ ہے تو گستاخی مگر کہنا ہی پڑتا ہے کہ علامہ نے اخبار کا ڈیڑھ صفحہ لکھا، مگر بحث کے ہر پہلو کو تشنہ چھوڑا۔ ہیئتِ اجتماعیہ انسانیہ کا نظریہ جس صورت میں اس مضمون کے اندر پیش کیا گیا ہے۔ مجھ سی نارسا فہم رکھنے والوں کے لئے تو ناقص ونامکمل ہے، رعایت کی جائے تو اُسے ایک مطلعی چیز کہہ سکتے ہیں۔ یہ نظریہ ہے تو "انسانیت" پر محیط۔ لیکن اس کا اعلان واد عا مسلمانوں کی طرف سے ہوا ہے، اس لئے ازبس لازمی ہے کہ مسلمانانِ عالم اور خاصکر مسلمانانِ ہند کے افعال و اعمال اُس نظریئے سے مطابقت بھی رکھتے ہوں، فلسفے کا کوئی اصول ونظام اگر انسانی فعل وعمل سے مطابقت نہ رکھتا ہو تو وہ کوئی مفید وکارآمد چیز نہیں۔ مگر علامہ موصوف نے اِس پہلو سے بھی مطلق بحث نہیں کی کہ ہیئتِ اجتماعیۂ انسانیہ کا نظریہ مسلمانوں کی زندگی اور ان کے قول وعمل پر کیونکر موثر ہوا کس طرح موثر ہو رہا ہے، اور کیسے موثر ہوگا۔

علامہ فرماتے ہیں کہ اسلام کے ہیئتِ اجتماعیۂ انسانیہ کے نظریئے میں کوئی لچک نہیں۔ مگر ہم سُنتے آئے ہیں کہ اسلام دینِ فطرت ہے۔ وہ اکراہ کو جائز نہیں رکھتا، وہ اُس سے زیادہ تکلیف نہیں دیتا، جتنی کہ ایک نفس برداشت کرسکتا ہے، وہ اپنا پیغام سُنا دینے کے بعد اپنے دین پر بھی چھوڑ دیتا ہے، اور اسلام کی فطرت میں قدرت نے لچک دی ہے" ہم نے جھوم جھوم کر سنا ہے، پھر اس کے بعد ہمارے کان میں آواز پڑتا کہ بعض باتوں میں ہمارا دینِ فطرت لچکنا جانتا ہی نہیں، معمولی سمجھ سے اونچی بات ہے۔

ہم دیکھتے ہیں کہ قوموں کے عروج وزوال یا دوسرے لفظوں میں انسانی گمراہی وخطاکاری کا فطری قانون ایک قانون بلا استثنا رہے۔ اس لئے فطرت پر مستلزم نہیں آج جس قوم سے مسلمان مفہوم ہوتا ہے اس قوم کو باقی رکھے بلکہ جو قوم اصولِ اسلام پر عامل رہی وہی مسلم تھی اور جو عامل ہوگی مسلم ہوگی۔ اسلام جس چیز کا نام ہے وہ کچھ اصول ہیں اور اُن پر جو بھی عمل کرے گا مسلم ہوگا۔

بہرحال علامہ کو حبِ وطن کا فطری ہونا بھی تسلیم ہے، اور وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ اُسے حبِ سیاسی نظریہ بنایا جائے گا ہیئتِ اجتماعیہ انسانیہ کے نظریئے سے متصادم ہوگا، اس لئے کہ اس نظریئے کے اندر کوئی لچک ہی نہیں۔ تو اس سے یہی ایک نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ اگر یہ دونوں نظریئے باہم مطابق نہیں ہوتے تو ان میں سے ایک ضرور ناقص ہے، اور بحث کا یہی پہلو ہے جہاں شکوک پیدا ہونے لگتے ہیں۔

ہیئتِ اجتماعیہ انسانیہ کا نظریہ، بہرحال، قرآن پاک سے مستنبط کیا گیا ہوگا۔ اس لئے اُسے عین منشائے ایزدی ہونا چاہیئے، اور جب وہ مشیت ربانی ٹھیرتا ہے تو یہ صورت مستلزم ہو جاتی ہے کہ ہندوستانی یا چینی مسلمانوں کی موجودہ حالت وسیاست بھی مشیتِ الہٰی میں ہو، پھر کیا یہ کہا جائے گا کہ مسلمانوں کا خدا چاہتا کچھ ہے اور کراتا کچھ ہے؟ کیونکہ اس سے شاید انکار نہ کیا جا سکے کہ ہر ملک کو کوئی نہ کوئی سیاسی نظریہ سامنے رکھنا اُس ملک کے باشندوں کے لئے ازبس لازمی ہے، حاصل کلام یہ ہے کہ ہندوستان اور چین کے مسلمانوں کے سامنے کیا چیز ہونا چاہیئے اور ہیئتِ اجتماعیہ انسانیہ بن کے آیا وہ اپنے ہموطن غیر مسلموں کو فنا کر دیں یا اُس ملک کو چھوڑ دیں ——— ہر چند کہ انکے لئے آج مُلکِ خدا تنگ ہی نہیں بلکہ بہت تنگ ہو گیا ہے۔

علاوہ برایں، اِس گفتگو میں یہ پہلو کسی طرح نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ عہدِ پاستیں میں بلکہ قرنِ اول میں مسلمانوں نے ہیئتِ اجتماعیۂ انسانیہ کے نظریئے کو کس طرح دیکھا اور کس طرح سمجھا تھا اور کس طرح سمجھا تھا، اور دیکھا یا سمجھا تھا بھی یا نہیں۔ اور یہ کہ آج عالم اسلامی میں اس نظریئے کو اگر دیکھا اور سمجھا جا رہا ہے تو کس طرح پر؟

چونکہ میں ایک معمولی فہم وادراک کا آدمی ہوں، اس لئے بحث کی فلسفیانہ نوعیت کو تو سمجھ نہیں سکتا۔ لیکن وہ مفہوم جو فلسفے سے پیدا ہوا، ایک غیر فلسفی کو سمجھائے تو جا سکتے ہیں۔ اس لئے میں یہ ضرور سمجھنا چاہتا ہوں کہ ہیئتِ اجتماعیہ انسانیہ کا نظریہ جو حب وطن کے سے فطری جذبے کو ہمارے اندر سے نکال پھینکنا چاہتا ہے، ہم ہندوستانی مسلمانوں سے کیا چاہتا اور کیا سکھاتا ہے؟

ایک کم فہم کو بھی سوال کا حق حاصل ہے۔ عاقل و حکیم اُس کا مغالطہ دور کر سکتا ہے۔ خلافت کے جھگڑے اور معرکے امویوں اور عباسیوں کی خانہ جنگی، فاطمیوں اور عباسیوں کی جنگیں، اور ہر زمانے میں مسلمانوں کی باہمی آویزشیں، اگر ہیئتِ اجتماعیہ انسانیہ سے غیر متعلق مان لی جائیں تو تاریخ میں ایسی مثالیں بھی مفقود نہیں کہ حملہ و مدافعت، دونوں صورتوں میں، غیر مسلم سے تعاون تعامل کی شہادت ہو سکتی ہیں، یعنی ایک مسلمان ہندو کی مدافعت میں دوسرے مسلمان سے لڑا ہے۔ مسلمان نے مسلمان کو مٹانے میں غیر مسلم کی مدد لی ہے۔ تو کیا ان مساعی کو ہم ہیئتِ اجتماعیہ انسانیہ کے نظریئے کا ماحصل کہیں گے؟

حضرت جمال الدین افغانی کے سیاسی اتحاد اسلامی کی تحریک اور خود علامہ اقبال کی ایک عمر کی تبلیغ و تلقین کے بعد آج ممالک اسلامی بالخصوص آزاد و خود مختار ممالک اسلامی، اس نظریئے کے متعلق کیا افکار و آراء رکھتے ہیں؟ آیا وہ اُسے مانتے ہیں یا کم از کم اس خیال نے ان ملکوں میں زمین پکڑ لی ہے؟ یقیناً علامہ کی نظر سے خالدہ خانم کی تازہ تصنیف جو ہندوستان کے متعلق ہے ضرور گزری ہوگی، اس کے پڑھنے کے بعد علامہ اپنے نظریئے کو دنیا کے مسلمانوں کے لئے قابلِ عمل صورت دینا چاہیں گے تو لامحالہ سیاسی نظریہ ہی بنا کر پیش کرنا پڑے گا۔ کیونکہ تاریخ اسلامی کے کسی دور میں یہ نظریہ اُسی صورت میں جس میں کہ علامہ پیش کر رہے ہیں ثابت نہ ہو سکے گا۔ ترکی و عراق وغیرہ کے حال کے میثاق کو اگر دلیل میں پیش کیا جائے تو یہ دیکھنا لازم آجاتا ہے کہ ان میثاقوں کی محرک کیا شے ہے؟ اُن کی بناء و اساس کس چیز پر ہے؟ آیا یہ وہی نظریہ ہے جس کے مبلغ علامہ اقبال ہیں یا حالات حاضرہ کے سیاسی نتائج؟

اسلام کا درس مواخات وطنی قومیت کو باطل نہیں کرتا، لیکن اس مواخات کو اس غیر فطری حد تک پہنچا دینا کہ کابلی مسلمان میرا گھر لوٹ رہے ہوں اور میں اپنے غیر مسلم ہمسائے کی امداد و اعانت یہ کہہ کر مسترد کر دوں کہ لٹیرا میرا بھائی ہے! مواخاتِ اسلامی کا یہ مفہوم بھی اسلامی یا فطری نہیں ہو سکتا کہ غیر مسلم کو دنیا میں سانس لینے کا حق ہی نہیں۔

المختصر ان غیر مربوط خیالات کے اظہار سے میرا مدعا بس اتنا ہے کہ علامہ اقبال اپنے نظریئے کو مسلمانانِ عالم کے حالات حاضرہ پر منطبق کر کے ثابت کریں، مطابقت دے کر سمجھائیں کہ وہ مسلمانوں کے لئے کیونکر ایک دستور العمل کا کام دے سکتا ہے۔

خاتمۂ کلام پر ادب کے ساتھ یہ اور کہنا چاہتا ہوں کہ علامہ اقبال کے مفصل جواب کا پیرایہ نہ تو ایک فلسفی کا انداز بیان کہا جا سکتا ہے اور نہ ایک جلیل القدر ادیب کے شایانِ شان۔



آرام سے ہے نجات میرے دل کو
چھوٹی نہیں کائنات میرے دل کو
رہتا ہے جو پردۂ تغافل میں نہاں
حاصل ہے وہ التفات میرے دل کو

ادیب

جنت کی کھلی ہے راہ میرے دل میں
ہر داغ وفا ہے ماہ میرے دل میں
ہوتی نہیں جو کسی کو بھی محسوس
پنہاں ہے وہ نگاہ میرے دل میں

ادیب

سفید ڈاڑھی

عبید اللہ قدسی، ایچ پی۔ ایچ اے بیاور

میں اور ناظر برسوں سے ایک ایسی انجمن کے قیام کی کوشش کر رہے تھے جو بلغیر امتیاز نسل و رنگ اور قوم و ملت انسانی تنظیم کی علمبردار ہو اور موجودہ ہندوستان کی پستی و ذلت کا صحیح علاج ہو۔ اس سلسلہ میں بڑے بڑے مفکرین و مدبرین سے تبادلۂ خیالات کیا گیا۔ خفیہ انجمنوں کی مدد لی گئی۔ عملی کارکنوں کی خدمات حاصل کی گئیں۔ لیکن گزشتہ دور ابتری میں چند نفوس بھی ہم خیال نہ مل سکے۔

ہم دونوں ایک عرصے تک اس جستجو میں سرگرم رہے۔ ذرائع عمل تلاش کرتے رہے۔ اور آخر ایک ایسی انجمن بنانے میں کامیاب ہو گئے جس نے ہندوستانیوں کی اجتماعی زندگی بہتر بنانے کے لئے، چند نفوس کی قربانی گوارا کر لی، ———— یہ دنیا کا مسلمہ امر ہے اور آپ بھی تسلیم کریں گے کہ بغیر افراد کی قربانی کے اجتماعی سدھار نہیں ہو سکتا، پودوں کو خوشنما بنانے اور اشجار کو تنومند کرنے کے لئے غیر ضروری شاخوں کی قطع و برید ضروری ہے۔

چنانچہ آج ہماری انجمن نے میری ایک محدود تجویز چند ضروری ترمیموں کے ساتھ بالاتفاق منظور کر لی تھی، اور میں اس کامیابی پر انتہائی مسرور واپس آ رہا تھا، میں نے تجویز پیش کی تھی کہ آئندہ سال کے لئے اعلان کیا جائے کہ ہماری انجمن پیشوایانِ اُمّت کو "مفت" حج کرائے گی اور سعودی سلطنت سے جبہ و خرقہ اور تحائف دیارِ مقدسہ دلانے کی کوشش کرے گی اور اس طرح جب تمام زعمائے اُمّت کی درخواستیں آ جائیں جو حقیقت میں مفت خوری اور زر کشی کی مشین بنے ہوئے ہیں تو ایک مخصوص جہاز تیار کرایا جائے اور ان حضرات کا بیڑا سمندر کے حوالے کر دیا جائے"

———— ایک صاحب نے اس میں ترمیم پیش کی کہ جہاز کے ناخدا اور ملاح بھی انھیں فوجدارانِ اُمّت میں سے منتخب کر کے تربیت کئے جائیں، اور حسبِ مدارج خدمتِ سرکار عہدوں کی تقسیم کی جائے۔ اس ترمیم کو بخوشی منظور کیا گیا، دوسرے بھائی نے تجویز پیش کی کہ "ہندوستانی ساحل سمندر پر یا تو آگ جلائی جائے اور یا ایسی گیس چھوڑی جائے جو جراثیم کی روک تھام کے لئے کافی ہو، اور ان کے کنارے تک آنے کا کوئی امکان نہ رہے۔ لیکن یہ تجویز لاگت زیادہ بیٹھنے کی وجہ سے واپس لے لی گئی، اور اس کی بجائے ناظر کی یہ ترمیم سب نے بڑی خوشی سے شامل کر لی کہ آبدوز کشتی کے بجائے بمبار طیارے استعمال کئے جائیں"

———— ان جزوی اور ضروری ترمیموں کے بعد حقیقت میں تجویز صحیح طور پر قابلِ عمل ہو گئی اور قبولیتِ عام حاصل ہوئی، اس تجویز کو عملی جامہ پہنانے کے لئے اور دیگر چند اہم تجویزیں پاس کی گئی۔ درخواستوں پر غور کرنے کے لئے ایک سب کمیٹی بنائی گئی جس کا کنوینر حضرتِ جوش کو منتخب کیا گیا۔

اس سلسلے میں مسٹر گھوش نے بھی ایک ترمیم پیش کی تھی کہ اس تجویز کو عام کر دیا جائے اور اس سال چند اعلیٰ ذات کے برہمنوں اور پنڈتوں کو مفت تیرتھ کرایا جائے، یا ہمالیہ کی مقدس چوٹی پر برہما کے پاس

روانہ کر دیا جائے۔ لیکن ممبرانِ انجمن نے درخواست کی کہ فی الحال اس تجویز کو محدود
ہی رکھا جائے اور خاطر خواہ نتیجہ دیکھنے کے بعد پھر کوئی تجویز منظور کی جائے گی،
اگرچہ مسٹر گھوش ممبران کے اصرار پر ترمیم واپس لینے پر راضی ہو گئے۔ لیکن بہت
دیر تک افسوس کرتے رہے۔

میں آئندہ نسلوں کی نکھری ستھری فضا اور خالص و بے لاگ زندگی
کا تصور کر رہا تھا، اور کبھی کبھی اس سلسلہ میں مسٹر ناظر کو بھی مخاطب کر لیتا تھا کہ
راہ میں مجھے مسٹر خان ملے اور یہ دلچسپ داستان سنائی، جو ناظرین کی
دلچسپی و واقفیت کے لئے پیش ہے۔

رائٹ آنریبل سر یعسوب، تنظیم الامرا، مطیع الامر نواب ممدوں خاں اور
نواب سعید الحیات اپنے چند دیگر شریک کار حضرات کے ساتھ عہدوں اور
خانیوں کے حصول کے لئے نئے نئے کرشمے دکھاتے تھے، اپنی زمینداری سے
مخلوق کا خون چوستے تھے۔ کبھی وقتی نفع کے لئے ہڈی اور پوست کے بھی (سونے
کا انڈا دینے والی مُرغی کی طرح) دام کھڑے کر لیتے تھے۔ کسانوں کی زبانیں
خشک تھیں۔ یتیموں کی آنکھیں ویران تھیں اور بیواؤں کے سینے گرم تھے۔
فلاکت و مصیبت اُس پر ساہوکاری کی نئی نئی چالیں قسم قسم کی جعل سازیاں
جن سے غریبوں کو کہیں پناہ نہ تھی۔ ہر طرف ان اہرمنوں کی حکومت نظر
آتی تھی رئیسانِ عظام غریب مخلوق کے لئے خدائی طاقت سے کم نہ تھے، ان
کا سلوک غریب پبلک کے ساتھ ایسا ہی تھا جیسا کہ بھیڑوں کے ساتھ
بھیڑیوں کا ہوتا ہے، لیکن یہی لوگ ملوکانہ طاقت کے سامنے اس طرح
ذلیل اور سرنگوں زمین چاٹتے ہوئے نظر آتے تھے، جیسے ایک کتا فرطِ مسرت
سے ٹکڑا ملنے پر اپنے آقا کے سامنے دم ہلا ہلا کر زمین پر لیٹ جاتا ہے۔

آپ حیران ہونگے کہ جب غریب رعایا اس قدر ظلم و ذلت برداشت
کرتی تھی، ان کی موت و حیات ان لوگوں کے ہاتھوں تباہ تھی تو وہ بغاوت
پر آمادہ کیوں نہیں ہوئی۔ غیرت و حمیت سے کام کیوں نہیں لیا۔ چند نوجوانوں نے
امنِ عام کی خاطر اپنی زندگی کو خطرہ میں کیوں نہ ڈال دیا؟ آخر ان لوگوں
کے پاس وہ کونسی چیز تھی جو اس تمام ذلت و مصیبت کے باوجود غریبوں
میں ایمانی قوّت کو ضعیف کر رہی تھی، انتقامی جوش کو روک رہی تھی؟ ——
تو سنئے اور صرف ایک لفظ میں سن لیجئے، وہ ایک مٹھی بھر سفید ڈاڑھی تھی،
اس سفید ڈاڑھی نے تمام خدائی قوتیں اپنے اندر جمع ہونے کا اعلان کر دیا تھا،
دنیا کی فلاح اور آخرت کی سند اُس کے ہاتھ میں تھی، قال اللہ و قال الرسول
اُس کی زبان پر تھا، اپنی تحریف کردہ تفسیریں اور اس کے خود ساختہ قرآنی
مطالب پر عمل کرنے اور تسلیم کرنے ہی پر نجات ہو سکتی تھی۔ تمام یونانی فلسفہ
علوم دینی کے جامے میں اس کے سینے میں محفوظ تھا، اور تمام اسرائیلی روایات،
کل ایرانی اوہام اور رومی محاکمات اس کی زبان کی نوک پر تھے۔ یہ نائبِ
رسول تھی، حکیم امت تھی، دنیا و آخرت کی کنجی اس کے ہاتھ میں تھی، جنت
کے تمام زیور اُس نے جمع کر لئے تھے، آخرت کا تمام سامان اس کے حجرے
میں موجود تھا، الغرض دنیا و آخرت اس کے اشاروں میں تقسیم ہوتی تھی،
اور یہ دنیا و آخرت کی ٹھیکیدار مٹھی بھر "سفید ڈاڑھی" ان غریب جہلا کے
دلوں میں خداوندانہ ملکوتیت کے ساتھ اپنے اقتدار کا پنجہ گڑوئے ہوئے تھی۔

لیکن یہ سفید ڈاڑھی بذاتِ خود کیا تھی، چند سفید ملکوں میں بکی ہوئی
تھوڑی سی زمین اور رعایت کے عوض ان سرمایہ دار زمینداروں کے
ہاتھوں میں بیچوں و چرا گرفتار، خود اس کا دل امیروں کی دو انگلیوں کے
بیچ میں تھا، یہ اپنی خانقاہ کی چہار دیواری، مریدوں کی کثرت اور زائرین
کی امیری پر نازاں تھی، اور امرا اُس کی گرفتاری پر فخر کرنے والے تھے،
غریبوں کا دل اُس کے قبضے میں تھا اور اُس کا دل امیروں کے پھندے میں۔

جب کبھی قحط و وبا کا طوفان بڑھا غریبوں میں ظلم و تعدی کے خلاف احتجاج
پیدا کرنے کا احساس ہوا۔ عدم تعاون اور لگان نہ دینے کی اسکیم نے زور
پکڑا، فوراً عالمانہ وجاہت اور نائبِ رسول کے روپ میں یہ نورانی سفید
ڈاڑھی میدان میں آگئی، تبلیغ و ارشاد کا دروازہ کھول دیا، محلے محلے اور
مسجد مسجد وعظ ہونے لگے، بازاروں میں آقاؤں کی فرمانبرداری اس طرح
کی گئی اور غلط بیانیوں اور وعظوں سے اس طرح مقصد برآری کی گئی جس
طرح ایک چالاک فاحشہ بیک وقت دو مخالفوں کو خوش کرتی ہے ——
ان اوقات میں اس نے غریبوں کو صبر کی تلقین کی خدا اور اس کے رسول کے
احکام ایک ایک دن میں تمام کے تمام بیان کر دئے، حضرت ایوب اور
حضرتِ بلال کی سوانح اور آلام حیات کو نہایت پر درد الفاظ میں بیان
کیا، بھوکے اور مصیبت زدہ لوگوں کو اپنی ساحرانہ قوت بیانی اور اپنے
یونانی فلسفے کے ذریعے چیخیں مار مار کر رُلایا، آخرت کی طمع اور جنت کے سبز
باغ دودھ اور شہد کی نہریں، حوریں اور غلمانوں کا ایسے گدگدانے

والے الفاظ کے ساتھ تذکرہ کیا کہ غریب اپنا دُکھ درد سب بھول گئے، اُنھیں بتایا کہ دنیا امیروں کے لئے ہے، اور آخرت غریبوں کے لئے، مرنے اور مارنے کے سوال پر "اسلام" کے فلسفے پر وعظ دیئے گئے، امن وامان کی تبلیغ کی گئی، حاکمِ وقت کی پیروی خدا اور رسول کی پیروی قرار دی گئی، موتوا قبل ان تموتوا کی سند میں ہزاروں قطبوں اور ولیوں کے اشعار اور خود ساختہ عربی و فارسی عبارتیں کتابوں اور صحیفوں کے حوالے کے ساتھ بیان کر دی گئیں۔ مومن کا ہر نفس ایک بیت قرار دیا گیا۔

لیکن اگر ضرورت ہوئی حاکموں کو دو قوموں کا توازن قائم کرنے کی مجبوری سامنے آگئی، کہیں مسجد کے سامنے باجے کا سوال درپیش ہو گیا تو دوسرے ہی روز ہوا کا رُخ پلٹ دیا۔ اس سفید ڈاڑھی نے اپنے وعظوں کی ترتیب بدل دی "ایں ہم بالائے علم" کہہ کر اللہ اکبر کے سر بفلک نعروں کی گونج میں مشرکین و مومنین کی تشریح شروع فرما دی، جان و مال صدقے کرنے کی ترغیب دی جانے لگی، جہاد کے فضائل بیان ہونے لگے۔ غرض یہ کہ (خدا کے واسطے) لڑانے کے لئے قوتِ بیانی کا کوئی حرف اٹھا نہیں رکھا اور دل کھول کر اس بازی گری میں تماشے دکھائے۔ پھر جبکہ حکومت نے مجاہدانِ ملت اور شیدایانِ حریت کو جیل کی تیرہ و تار کوٹھریوں میں بند کر دیا، سرزمینِ ہند رہبروں کی گونج سے خالی ہو گئی، وطن کا ایک ایک دیوانہ چن چن کر قید کر دیا گیا، تو شہروں میں خاموشی چھا گئی۔ عوام میں غفلت و جمود طاری ہو گیا، اور سب موت کی نیند سو گئے ــــ حکومت کو اطمینان ہو گیا اور اس نے "سفید ڈاڑھی" کے طویل دوروں کی سہولت بہم پہنچانے سے دست کشی اختیار کر لی ــــ تو آپ نے دیکھا ہوگا، اور انھیں آنکھوں سے دیکھا ہوگا کہ یہ سفید ڈاڑھی اس وقت جبکہ قوم کی حالت افیون خوردہ اور افعی گزیدہ نیند کے ماتے کی طرح تھی تو یہ نہایت عیش و آرام سے اپنی خانقاہ کی وسعت میں اور اپنے شیرازۂ غرور و نخوت کی اشاعت میں مصروف تھی، طویل وعظوں کا سلسلہ بند کر دیا گیا تھا، خانقاہ سے نکلنا ترک کر دیا گیا تھا۔ فتووں کی اشاعت میں کمی آگئی تھی اور اپنے ہی شہر کے چند غریبوں کو لنگر بانٹ کر چلّہ کشی اور ورد و وظائف کی بنیاد ڈال دی تھی۔

اس وقت جب کہ قوم کو رہنمائی کی ضرورت تھی وہ بےکسی و بےبسی کی حالت میں رہبری کی زیادہ محتاج تھی اس کا شیرازہ منتشر تھا۔ یہ سفید ڈاڑھی غریبوں کو فرشتہ بنانے کی فکر میں تھی۔

آپ نے اس دامِ تزویر پر کبھی غور کیا کہ وہ آیت و درود جو نہ کھانے پینے والے فرشتے، عرشِ بریں کا پایا تھامے ہوئے خدا کی قدوسیت و جبروتیت کی تسبیح کے ساتھ پڑھتے رہتے ہیں، جس اسمِ اعظم کے ذریعے جنت میں پریوں کی طرح اُڑتے رہتے ہیں اسی "اسمِ اعظم" اور آیتِ کریمہ کا وظیفہ یہ سفید ڈاڑھی لوگوں سے پڑھواتی ہے، اور کوشش کرتی ہے کہ جس انسان کو خدا نے اشرف المخلوقات بنایا ہے، جس کو فرشتوں سے برتر و اعلیٰ قرار دیا ہے، جس نے دنیا میں خدا کی خلافت کا شرف حاصل کیا ہے، جس نے آپس میں فائقیت و انسانیت ہی کا وعدہ کیا ہے اس مشتِ خاک کو آسماں میں اڑا لیجایا جائے اس سے وہ کام لئے جائیں جو فرشتوں کے ساتھ مخصوص ہیں، آپ کو معلوم ہے اس حلقۂ ارادت و عقیدت میں اس فرشتہ خصائل طبقے میں ان اعلیٰ صفات کی شمولیت کے لئے کون لوگ جمع ہوتے ہیں، وہ رؤسائے کرام اور خانِ بہادرانِ عظام نہیں، بلکہ وہ لالچی اور بھوکے انسان جن کا کہیں ٹھکانا نہیں ہوتا جن کا کہیں سہارا نہیں ہوتا۔ جن کو کوئی ہنر نہیں آتا وہ آ کر اس تسبیح و تحلیل میں شریک ہوتے ہیں، وہ چند طلبا جن کو گھر سے نکال دیا گیا ہو جن کی خراب عادتوں نے تن آسانی اور بےکاری کی عادت ڈال دی ہو وہ بھیک مانگنے اور ریاکاری کی تعلیم سیکھنے کے لئے شاطری اور جعل سازی کی سند لینے کے لیے اس حلقۂ ارادت میں داخل ہوتے ہیں ــــ روز جانے سے تواضع ہوتی ہے، شیرینیاں تقسیم ہوتی ہیں اور شمارہ کے باوام بتدریج قوت افزائی کرتے رہتے ہیں، پھر آخر روز ایک زبردست دعوت ہوتی ہے جس میں تین تین روز تک کی غذائیں کھالی جاتی ہیں ــــ یہ طریقہ اس ترتیب سے جاری رہتا ہے کہ ہر ہفتہ بلکہ تیسرے چوتھے ایک نہ ایک وقت کا وظیفہ ختم ہو کر دعوتِ طعام کا باعث ہوتا رہے۔

یہ سفید ڈاڑھی قینچی کی طرح چلنے والی زبانوں کی مسلح جماعت اپنے ارد گرد جمع رکھتی ہے اور بیکاری کے زمانے میں اس غیر شادی شدہ جماعت کو (جس کے دماغ شیطان کے کارخانوں سے کم نہیں ہوتے) علوم و فنون کی گتھیوں میں اُلجھائے رکھتی ہے، بظاہر تو یہ جماعت اپنی تحقیق و تفتیش سے بال کی کھال نکالتی ہے، لیکن حقیقت میں تیلی کے بیل سے زیادہ وہ بہتر مثال اُنکی

تحقیق کی موشگافی کے لئے نہیں مل سکتی۔ سوال در سوال، جواب کے جوابات، حاشیوں کے حاشیئے، ان کے موضوع ہوتے ہیں، یعنی فلسفۂ یونانی کی بوسیدہ ہڈیوں کے کفن کے گلے ہوئے تار ان کا منتہائے نظر ہوتے ہیں۔ —— اگر فقہ میں کو دپڑے تو قیامت تک جتنے شبہات بول و براز سے وضو ٹوٹنے پر ہو سکتے ہیں سب نکل آئیں گے، اولادِ آدم کی تمام جائداد انگلیوں پر تقسیم ہو جائے گی۔ جائز و ناجائز کی تمام دلچسپ تشریحیں یکجا ہو جائیں گی، اور عورت و مرد کے پوشیدہ حصص کے نام اور ان کے مسائل کی بحثیں مدت تک کام و دہن کو لذت بخشتی رہیں گی —— اگر احادیث کا تذکرہ ہے تو ثقہ اور غیر ثقہ احاد و متواتر کی طے شدہ بحثیں ان لوگوں کو اُلجھانے کے لئے کافی ہوں گی، بارہ سو برس کے بعد ہر طالب علم بخاری کی طرح اندھا بن کر درخت کے نیچے سے گزرنے کی کوشش کرتا ہے —— تجارت سے بالکل ناآشنا ہونے اور دست نگر و تہی جیب ہونے کے باوجود تمام دنیا کی خرید و فروخت کے مسائل طے ہو جائیں گے اور اس میں نکات آفرینی تمام کامرس کمیٹی کے ممبروں کو نیچا دکھاتی رہے گی، —— علم ادب اور لٹریچر کا اگر قصہ ہے تو ملا جامی کی گرامر کی ایک ہی کتاب (جو صرف شرح ہی شرح ہے) پڑھتے ہوئے عمر ختم ہو جائے گی۔ سو سو دفعہ پڑھنے پر بھی تشفی نہ ہوگی، اور نئے نئے اعتراض و جواب کی جستجو تاعمر سرگرداں رکھے گی۔

یہ ہے خلاصہ اس سفید ڈاڑھی کے کارنامہائے درخشاں کا، جس کی بنا پر اُسے نیابتِ رسول سپرد کی گئی ہے، جس کی بنا پر اُسے مسندِ تصوف پر بیٹھنے اور غریب انسانوں کی باگ ڈور ہاتھ میں لینے کا حق حاصل ہوا ہے۔

یہ سفید ڈاڑھی گزشتہ دورِ جمود و غفلت میں گوشہ نشین رہ کر اپنے ذمہ دارانہ کاموں میں "مصروف" رہی اور اب جب کہ پھر رعایائے ہند میں بیداری کی روح کارفرما ہے، کسانوں اور غریبوں میں آزادی کا جذبہ کام کر رہا ہے اور ذی ہوش انسانوں میں ہم آہنگی و یکجہتی کا احساس پیدا ہو گیا ہے۔ یہ سفید ڈاڑھی پوری کارفرمائی اور چالاکی کے ساتھ میدانِ قلم و تقریر میں غلغلہ انداز ہے، تنظیمِ ملت کے لئے اس کا دل بیقرار ہے، علوم و فنون کی خدمت اس کے لئے لایعنی چیز ہے، اور تمام اُمتِ محمدیہ کو ایک محاذ پر لاکھڑا کرنا اس کا اولین فرض ہے۔ اوراد و وظائف میں خلل آنے لگا، تفاسیر کی تحریر و تدوین کا نظامِ عمل بگڑ گیا، اور اپنی تمام تسبیح و تہلیل کرنے والی جماعت کو (جو عرش بریں کا پایہ تھامے ہوئے تھی) غریب انسانوں کی بستیوں میں پھیل جانے کا حکم دیدیا۔ "اب یہ لوگ گھومتے پھریں گے، ایسی باتوں کا پرچار کریں گے جن پر خود عمل نہیں کرتے" یہ ان کی پہچان ہے، اور یہی ان کی علامت ہے۔

خانہا وروں کے پیغام نے ایک روز اس سفید ڈاڑھی کو بھی یہ اعلان کرنے پر مجبور کر دیا کہ میں شاہراہِ عام پر سب کی آنکھوں کو اپنی نورانی چمک سے روشن کروں گی، —— اعلان ہوا، ہزارہا غریب آدمی جمع ہو گئے، اور ٹھیک شب کو ۹ بجے سفید ڈاڑھی "زندہ جنازہ" کی طرح سوار کر کے مجمع میں لائی گئی، تخت کے قریب آتے ہی سفید لاش بجلی کی لپک کی طرح اُٹھی اور تخت پر ایک توانا انسان کی طرح کھڑی ہو گئی، حاضرین محوِ حیرت تھے۔ اور ابھی کچھ سوچنے بھی نہ پائے تھے کہ سفید لاش کے چہرہ پر سفید ڈاڑھی ہلی اور اس طرح گویا ہوئی "آج مجھے الہام ہوا ہے کہ مخلوق کو ایک محاذ پر جمع کر دوں، اس کام کے لئے خدا نے مجھے از سرِ نو جوانوں کی سی طاقت بخش دی ہے اور ...."

قریب ہی ایک شخص کو کچھ شبہ ہوا، اُس نے بڑھ کر سفید ڈاڑھی پر ہاتھ مارا۔ "سفید ڈاڑھی" اس کے ہاتھ میں تھی، اور سفید ڈاڑھی کا چہرہ نوجوانی کی اکیسویں بہار سے گزر رہا تھا اور تازہ ولایت اُسترے سے گھٹا ہوا چکنے کاغذ کی طرح چمک رہا تھا —— تمام لوگ اس مصنوعی شخص پر ٹوٹ پڑے، بروقت پولس آگئی اور اس شخص کو گرفتار کر لیا، دوسرے روز تحقیق سے پتہ چلا کہ اصل سفید ڈاڑھی کو انتقال کئے ہوئے عرصہ گزر چکا اور یہ ایک مصنوعی شخص اس جماعت پر اثر و اقتدار قائم رکھنے کے لئے خانقاہ میں مسند نشین کیا گیا تھا، اب کہ پبلک نے سفید ڈاڑھی کو پبلک پلیٹ فارم پر آشکارا ہونے کے لئے مجبور کیا تو یہ راز اپنی ہی حماقت سے ظاہر ہو گیا۔

اس شخص کو دوسرے روز حوالات سے غائب کر دیا گیا اور اب "سفید ڈاڑھی" محض زائرین کی عبرت کے لئے خانقاہ میں رکھی رہتی ہے جو چاہے جا کر دیکھ لے۔

ناظرین رسالہ کلیم

دفتر کلیم سے خط و کتابت کرتے وقت نمبر خریداری ضرور لکھدیا کریں ورنہ عدم تعمیل کی شکایت سے معاف فرمائیں۔ (منیجر)

زاڈگ

رشید احمد صابر - ویلور

ایک دن زاڈگ ایک چھوٹے سے جنگل کے کنارے چہل قدمی کر رہا تھا کہ اُس نے دیکھا کہ ملکہ کے کئی اہل کار اس کی جانب دوڑے ہوئے آ رہے ہیں، یہ لوگ کچھ مضطرب سے معلوم ہو رہے تھے اور ان کی متجسس نگاہیں اس بات کا پتہ دے رہی تھیں کہ وہ کسی گم شدہ چیز کی تلاش میں سرگرداں ہیں، جو اچانک طور پر کھو گئی ہے۔ جب وہ زاڈگ کے قریب پہنچے تو خواجہ سرا نے آگے بڑھکر دریافت کیا: آپ نے ملکہ کے لاڈلے کتے کو دیکھا ہے؟"

"ایک چھوٹی سی کُتیا کہئے۔" زاڈگ نے جواب دیا۔

"درست۔ آپ سچ کہتے ہیں۔" خواجہ سرا نے سنبھل کر کہا۔

"ایک چھوٹی سی شکاری کتیا کہئے، جس نے حال میں بچے دئے ہیں، اور جس کا سامنے کا بایاں پیر لنگڑا ہے، اور کان لمبے ہیں۔" زاڈگ بولا

"بالکل ٹھیک۔ پھر آپ نے اُسے کہاں دیکھا؟" خواجہ سرا نے خوش ہو کر دریافت کیا۔

"جی نہیں۔ میں نے اُسے کبھی نہیں دیکھا، اور مجھے یہ بھی معلوم نہ تھا کہ ملکہ کے ہاں ایسی کتیا موجود ہے۔" زاڈگ نے جواب دیا۔

عین اسی موقعہ پر ایک عجیب اتفاق پیش آیا۔ بادشاہ کے اصطبل کا حسین ترین گھوڑا دفعتہً بھاگ گیا اور سائیسوں کے قبضے سے نکل کر بابل کے میدانوں کی طرف سرپٹ بھاگا، وزیر اعظم اور دربار کے تمام مصاحب گھوڑے کے تعاقب میں اسی اضطراب و بےچینی کے ساتھ نکل پڑے تھے جس طرح کہ ملکہ کے خدام کتیا کے تعاقب میں دوڑے ہوئے آ رہے تھے، جب یہ لوگ زاڈگ کے قریب پہنچے تو وزیر اعظم نے آگے بڑھکر گھوڑے کے متعلق دریافت کیا،

زاڈگ نے جواب دیا "گھوڑا بہترین انداز سے پویہ (Gallop) جاتا ہے وہ پانچ قدم اونچا ہے اور اس کے کھُر چھوٹے ہیں۔ دُم ساڑھے تین بالشت طویل ہے۔ لگام ۲۳ کیرٹ سونے کی اور نعل چاندی کے ہیں۔

وزیر نے بےچینی سے استفسار کیا "تو وہ کون سے راستے پر جا رہا تھا اور کس سمت؟"

لیکن زاڈگ نے اطمینان کے ساتھ جواب دیا "میں نے اُسے کبھی نہیں دیکھا اور اس کے متعلق سنا بھی نہیں۔"

وزیر اعظم اور خواجہ سرا کو اب یقین ہو گیا کہ زاڈگ نے بادشاہ کا گھوڑا اور ملکہ کی کتیا چرائی ہے۔ چنانچہ انھوں نے زاڈگ کو چوری کے الزام میں عدالت عالیہ کے روبرو پیش کیا۔ عدالت نے زاڈگ کے لئے کچھ جسمانی سزا اور پھر عمر بھر کے لئے سائبیریا کے دشت میں جلا وطنی تجویز کی۔ لیکن ادھر ججوں نے اپنا فیصلہ سنایا ہی تھا کہ عدالت میں کتیا اور گھوڑے کے واپس آ جانے کی اطلاع پہنچی۔ اب ججوں کو افسوس اور مجبوری کے ساتھ فیصلہ پر نظر ثانی کرنی پڑی۔ لہٰذا اُنھوں نے زاڈگ پر جھوٹ کا الزام برقرار رکھا، کیونکہ گھوڑے اور کتیا کو دیکھنے کے باوجود اُس نے لاعلمی کا اظہار کیا تھا۔ اور یہ تجویز پیش کی کہ وہ چار سو اونس سونا بطور جرمانہ ادا کرے، اور اس کے بعد چاہے تو صفائی پیش کرے۔

صفائی کے بیان میں ملزم نے کہا "جب میں جنگل کے کنارے چہل قدمی

کر رہا تھا تو بزرگ خواجہ سرا اور محترم وزیرِ اعظم سے ملاقات ہوئی۔ حقیقت یہ ہے کہ سڑک پر مجھے کسی چھوٹے سے جانور کے چھوٹے چھوٹے نقشِ قدم نظر آئے اور یہ سمجھنے میں دقت نہیں ہوئی کہ یہ کسی کتے کے نقشِ قدم ہوں گے، دونوں پاؤں کے نقوش کے درمیان کی واضح لکیر سے میں نے یہ نتیجہ نکالا کہ یہ کتیا ہوگی جس نے حال ہی میں بچے دئے ہیں۔ اس کے علاوہ نقوش کے پاس ہر جگہ مٹی کی سطح کا کچھ کچھ اُبھرا ہوا نظر آنا اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ کتیا کے کان لمبے ہوں گے، اور چونکہ پاؤں کے ہر چہار نقوش میں آگے کا بایاں نقش بالکل ہلکا نظر آرہا تھا، میں کہہ سکتا ہوں کہ ہماری قابلِ احترام ملکہ کی کتیا ——— مجھے معاف کیا جائے ——— ضرور لنگڑی ہوگی۔ اب رہا بادشاہ کا گھوڑا سڑک پر مجھے کھُر کے نشانات نظر آئے۔ جن کا درمیانی فاصلہ ہر جگہ مساوی تھا۔ مجھے یقین ہوگیا کہ یہ گھوڑا بہترین انداز سے پویہ جاتا ہے۔ پھر میں نے سڑک کے آزو بازو درختوں پر نظر دوڑائی تو دونوں جانب درختوں کے نچلے حصے مٹی اور گرد سے پاک صاف نظر آرہے تھے، لہٰذا یہ نتیجہ نکالنا مشکل نہیں کہ گھوڑے کی دم ساڑھے تین ہات لمبی ہوگی، کیونکہ سڑک کی چوڑان سات قدم ہے۔ سڑک کے وسط میں درختوں کے تازہ پتے جھڑ کر بکھر گئے تھے، اور چونکہ دونوں طرف کے درختوں کی شاخیں سڑک کے عین وسط میں، سڑک کی سطح سے ساڑھے پانچ قدم اوپر باہم گرگتھو گئی تھیں۔ یہ کہنا آسان ہے کہ گھوڑا زیادہ سے زیادہ پانچ قدم اونچا ہوگا۔ لگام ضرور ۲۳ کیرٹ سونے کی ہوگی، کیونکہ سڑک کے کنارے ایک اونچے سے پتھر پر ۲۳ کیرٹ سونے کی رگڑ کا نشان موجود تھا، جس کا میں نے بغور معائنہ کیا۔ پھر سڑک کی کنکریوں پر جا بجا چاندی کی رگڑ کے نشانات موجود تھے، اور مجھے یقین ہوگیا کہ گھوڑے کے نعل چاندی کے ہوں گے۔"

ملزم کے بیان پر ججوں کو بڑی حیرت ہوئی اور اُنھوں نے اس بیان کی ایک نقل بادشاہ اور ملکہ کو روانہ کی، دربار، محل، عدالت اور ہر مقام پر جہاں دو آدمی اکٹھے ہوتے زاڈگ کے متعلق چہ میگوئیوں کا سلسلہ چھڑ جاتا، ماغیوں (مجوسی مذہبی پیشواؤں) کا خیال تھا کہ زاڈگ ساحر ہے اور اُسے زندہ جلا دینا چاہیے۔ لیکن بادشاہ کی رائے اس کے برعکس تھی۔ اس نے ملزم کا جرمانہ معاف کیا اور رہائی کا حکم صادر فرمایا۔

اس کے بعد عدالت کے محافظ دفتر، وکیل۔ امین، ناظر وغیرہ سب نے مل کر زاڈگ کے مکان پر اس سے ملاقات کی اور عدالت کی جانب سے رقم جرمانہ کی واپسی مبارکباد پیش کی۔ لیکن چونکہ اس مقدمے میں عدالت کا خرچ ۳۹۸ اونس سونا بتایا گیا اور پھر اس پر عدالت کے چپراسی بخشش کا مطالبہ کر رہے تھے، یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ زاڈگ کو کیا واپس ملا ہوگا۔

بہرحال زاڈگ نے اچھی طرح محسوس کیا کہ بعض اوقات اپنی معلومات کا اظہار کرنا کس قدر خطرناک ہوتا ہے، اور یہ عزم کر لیا کہ آئندہ وہ ایسے معاملات میں کبھی لب کشائی نہ کرے گا۔

لیکن بہت جلد اس کو ایک ایسے ہی معاملے سے دوچار ہونا پڑا۔ ایک دن زاڈگ اپنے مکان کی کھڑکی کے پاس کھڑا ہوا تھا۔ کھڑکی کے نیچے سے ایک مفرور شاہی قیدی کسی طرف نکل گیا اور کچھ دیر میں شاہی سپاہی قیدی کی تلاش میں اُدھر آنکلے۔ چاروں طرف دیکھنے کے بعد اُنھوں نے زاڈگ سے قیدی کے متعلق دریافت کیا۔ زاڈگ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ چنانچہ اُنھوں نے زاڈگ کو عدالت میں کھینچا اور یہ ثابت کیا کہ قیدی کے فرار کے وقت زاڈگ کا سر کھڑکی کے باہر تھا۔ لہٰذا ججوں نے ملزم کے لئے پانسو پاؤنڈ سونا بطور جرمانہ سزا تجویز کی، اور بابل کے رسوم کے مطابق ملزم نے اس مہربانی پر ججوں کا شکریہ ادا کیا۔

زاڈگ نے خود سے مخاطب ہو کر کہا "چہل قدمی کے لئے جنگل کی طرف جانا، جہاں سے بادشاہ کا گھوڑا اور ملکہ کی کتیا گزرے ہوں، ایک مصیبت عظیم کا باعث ہوتا ہے! کھڑکی کے باہر سر نکالنا، ایک آفت کا پیش خیمہ ہوتا ہے! اس دنیا میں خوش رہنا ہی کس قدر دشوار ہے!" (از والٹیئر)

جہاں میں یہی قانون اجاری ہے
یقین نہیں کہ اس قسم کی بیماری ہے
انساں پہ زندگی کس کی گرانباری ہے
بچارے پہ یہ رات بہت بھاری ہے

خواب

شریمتی کملا دیوی چودھری

"مہاتما جی۔ سُریلا کی جیون نوکا کی پتوار اب میں آپ کے ہاتھوں میں دیتا ہوں۔ آپ کی کرپا درشٹی کے سوا دنیا میں اس دُکھیا کا کوئی دوسرا شانتی کا ذریعہ نہیں ہے"

"اپنی اکلوتی بیٹی کو اپنے پاس نہ رکھ کر آشرم میں چھوڑنے کے لئے بیقرار کیوں ہو"

"مہاتما جی کبھی آپ میرے دوست تھے۔ میری زندگی آپ سے چھُپی نہیں ہے، آپ مہان آتما ہیں۔ آپ نے اپنی زندگی میں لاثانی تبدیلی پیدا کی ہے۔ آج تپسوی ہیں۔ لیکن میں۔ میں بالکل وہی ہوں جو آج سے ۲۰ سال پیشتر تھا، صرف اتنا فرق ضرور ہوا ہے کہ جس دن سُریلا ودھوا ہوئی ہے اپنے مکروہات مجھے دوزخ کی آگ کی طرح جلا رہے ہیں"

"مہاتما جی میں بڑا نیچ ہوں۔ پاپی ہوں۔ دُراچاری ہوں۔ وبھچاری ہوں۔ لیکن میری بیٹی سُریلا دیوی ہے۔ لکشمی ہے۔ پوترتا کی مورتی ہے۔ گرو دیو، اُس پر رحم کیجئے۔ مجھے ڈر ہے کہ کہیں مجھ پاپی کے گناہوں کی ہوا اُس کے ارفع خیالوں کو سیاہی سے ملبوس نہ کر دے۔ ابھی تک وہ پوری طرح دنیا کی زد میں نہیں آئی ہے۔ وہ شاعرہ ہے، کسی دوسری ہی دُنیا کی سیر کرتی رہتی ہے۔ لیکن شباب کا عروج اُسے اس پاپی سنسار سے شناسا کرا کر رہے گا۔ دیو! اُس کی پوترتا کی رکشا کرو۔ وہ ودھوا ہے۔ میں اُس کا گمراہ پتا اُس کی آتما کی اونتی کا خواہاں ہوں۔ میری آخری خواہش یہی ہے کہ میری دیوی سی بیٹی دیوی ہی بن کر رہے"

مہاتما نے سریلا کو آشرم میں رکھنا منظور کر لیا۔

(۳)

مہاتما کبھی بیرسٹر تھے۔ اُن کی بیوی لکشمی نے دم واپسیں کہا تھا "دوسری شادی مکرنا ورنہ میرے بچوں کی دُرگتی ہو جائے گی۔ دوسری ماں پیار کے بدلے ان سے ۔۔۔۔۔۔" ظالم موت نے لکشمی کو اپنا جملہ پورا نہ کرنے دیا، لیکن یہ ادھورا فقرہ ہی بیرسٹر وِکشت کے ہردیہ پر امٹ چھاپ ڈال گیا۔ لکشمی کی نیم باز آنکھیں نہ جانے کیسا درد چھوڑ گئی تھیں وہ ٹوٹتے ہوئے شبد التجا کی ایسی انت سیما کی جھلک دکھلا گئے تھے کہ بیرسٹر وِکشت نے اَنگِنت مصیبتوں کا مقابلہ کیا، لیکن دوسری شادی نکی، اُسی روز سے اُن کے ٹائم ٹیبل میں بچوں کا پالنا پوسنا اور مرحوم لکشمی کی تصویر کی پوجا شامل ہو گئی تھی۔

بیوی کے انتقال کے وقت بیرسٹر وِکشت جوان ہی تھے، نئی روشنی، ولائتی تعلیم اور فیشنیبل سوسائٹی کا رنگ اُن میں بھی پوری مقدار میں موجود تھا، اور شاید وہی پُرانے سنسکار کوشش کرنے پر بھی ان کے دل کو بھنور سے نہ نکلنے دیتے، ان کے ہردیہ میں دیو اسر سنگرام چھڑا رہتا۔ کتنی ہی مرتبہ شیطانی طاقتوں نے اپنی فتح کا ڈنکا بجانے کا فیصلہ کر لیا۔ لیکن لکشمی کی اُن آنکھوں اور لفظوں نے ہمیشہ اُن کی رکشا کی۔

دل کو قابو میں رکھنے کی غرض سے استری جاتی سے قطعی علیحدہ رہنے کا اُنھوں نے فیصلہ کیا۔ اُن کے کئی ایسے دوست تھے جن کی بیویاں بے

اُن کی کافی بے تکلفی تھی۔ لکشمی کی موت کے بعد اُن لوگوں نے پوری ہمدردی کے ساتھ بچوں کے پالنے میں بیرسٹر دِکشت کا ہاتھ بٹایا، لیکن اُنھوں نے اُس کی ذرا بھی پروا نہ کرکے اُن سے ملنا جلنا تک بند کر دیا۔ وہ اپنے کرۂ ہوائی میں عورت کی موجودگی بھی گوارا کرنا نہ چاہتے تھے۔

بچوں کے پالنے والی پرانی آیا سے بھی کہہ دیا گیا کہ اب گھر جاؤ۔ تمہاری پنشن ماہ بماہ منی آرڈر سے پہونچتی رہے گی۔ اس معاملہ میں بیرسٹر دِکشت نے آیا کے آنسوؤں کی پروا کی نہ بچوں کے رونے دھونے کی۔ ہاں بچوں کو پوری آزادی تھی کہ جب جی چاہے جاکر آیا سے مل آیا کریں۔۔۔ اُن کے دوسرے نوکروں میں جو بیوی والے تھے اُنھیں تنخواہ کی ترقی کے ساتھ ساتھ حکم ملا کہ علیحدہ گھر لے کر اپنی اہلِ خانہ کو رکھیں۔

یہاں تک کہ بیرسٹر صاحب نے مستورات موکلوں کے کیس تک لینا ترک کر دیئے۔ اپنی بیٹی سونتیا سے بورڈنگ ہاؤس میں ملنے نہ جاتے کیونکہ ہیڈ ماسٹرنی صاحبہ سے ملے بغیر لڑکی سے مل سکنا بورڈنگ ہاؤس کے قانون کی رو سے ممکن نہ تھا۔ چھٹیوں میں سونتیا کا بڑا بھائی اُسے لوا لاتا۔ تب ہی باپ بیٹی ایک دوسرے کو دیکھ سکتے تھے۔

اسی قسم کے سخت قیدوں کے پردے میں وہ خود کو چھپا کر رکھنے لگے۔

(۳)

بیرسٹر دِکشت اپنے ساتھ اتنی سختی کرنے پر بھی دلپر قابو نہ رکھ پاتے، ہر وقت اُن کے دل میں ایک سنگرام مچا رہتا۔ دن بھر کسی طرح مختلف کاموں میں من کو اُلجھائے رکھتے۔ رات میں گیتا کے پاٹھ کے ساتھ نیند کی دیوی کا استقبال کرتے۔ پھر بھی خواب میں گزشتہ دنوں کے ہاس بلاس کے دِرشیہ اپنی چھایا ڈال ہی جاتے۔

ششیا ماچرن وکیل کے یہاں پارٹی ہے۔ کیلاش بہاری آتما کی بیوی راگنی آج کیسی سج دھج کر آئی ہے، راگنی کے روپ کی برابری کرنے والی فیشن ایبل عورت جگت میں دوسری نہیں ہے۔ دھانی ساڑی اُس کے منہ پر کیسی کھل رہی ہے۔۔۔۔۔۔۔ ایسے ایسے خواب اُن کے من کو چنچل کر جاتے۔

بیرسٹر صاحب آفس میں قانون کا مطالعہ کر رہے ہیں۔ باہر برانڈے کوئی نیا موکل محرر سے گفتگو کرتا ہے تو بیرسٹر صاحب کی کلپنا سب کچھ بھلا کر ایک عورت کا چتر اُن کے سامنے کھینچتی ہے۔ کوئی سفید ساڑی پہنے ہوئے ہوگی۔ جائداد پر کسی نے ادھیکار کر لیا ہوگا۔ اب روٹی دینا بھی قبول نہ کرتا ہوگا۔ لاچار مقدمے کی بات سوچ کر آئی ہے۔ آواز سے بھی عورت سی ہی معلوم ہوتی ہے سنکوچ سے دھیرے دھیرے بول رہی ہے۔ محرر کے ذریعے سے مشورہ تو دیدوں گا لیکن کیس اپنے ہاتھ میں نہ لوں گا۔ عین اُسی وقت محرر کمرے میں آتا اور بیرسٹر صاحب کے تخیل میں بادھا پڑتی۔ وہ کچھ کانپتے ہوئے ہردیہ سے اپنے تخیل کا پھل سننے کی پرتیکشا کرتے۔ محرر کہتا "صاحب چھدّی لال نامی ایک موکل آیا ہے"۔

شرم اور خجالت سے وہ پانی پانی ہو اُٹھتے۔ سوچتے۔ یہ کیا ہے۔ پہلے تو میرا من اتنا کمزور نہ تھا۔ اندریوں کو قابو میں کرنے کے سادھن اُلٹے مجھے ہی پراجت کر رہے ہیں اور ترقی کی راہ سے ہٹا کر نیچے کی جانب ڈھکیلے دے رہے ہیں۔ کیا اُپائے کروں بھگوان۔

(۴)

بیٹے بیٹیوں کے فرائض سے سبکدوش ہوکر بیرسٹر دکشت نے سنیاس لے لیا۔ ہمالیہ کی پہاڑیوں میں بھرمن کرتے ہوئے ایک پہونچے ہوئے مہاتما سے اُن کا ساکشات ہو گیا اور اُسی دن سے وہ اُن کے شاگرد ہو گئے۔

مہاتما در اصل ایک سدھ پُرش تھے۔ دنیا سے وِرکت ہوکر برسوں انھوں نے کٹھن تپسیا کی تھی۔ بہت دن تک دائرۂ انسانی سے پرے بھیانک جنگلوں اور دُرگم پہاڑوں میں گھومتے رہے تھے۔ لیکن اپنی سادھنا کو کامیاب بنا کر اب پھر دنیا کی بھلائی کے خیال سے اِدھر آگئے تھے۔ یوگی راج کی خواہش ایک آشرم بنانے کی تھی۔ جس میں بھٹکتے ہوئے پرانیوں کو شانتی اور روحانیت کے مطالعہ کا موقعہ ملے۔ ساتھ ہی غریبوں کے لئے وہ ایک شفا خانہ بھی کھولنا چاہتے تھے۔ اُنھیں بہت سی سنجیونی بوٹیوں کا علم تھا۔

بیرسٹر دِکشت نے اپنی جائداد کا آدھا بھاگ دے کر یوگی راج کی اچھا پوری کی اور خود بھی اُن کے ساتھ آشرم میں رہ کر سیوا اور اُپاسنا میں محو ہو گئے۔ یوگی راج کی کرپا درشٹی سے اُنھیں شانتی بھی پراپت ہوئی، اور تھوڑے ہی دنوں میں سخت ریاضت اور تپسیا کی بدولت ایک مہان تپسوی بن گئے۔ یوگی راج کے شاگردوں میں بیرسٹر دِکشت کا درجہ اولین تھا۔ چاروں طرف اُن کی شہرت پھیل چکی تھی، لوگوں کی شردھا بھگتی اُن کے گرد سے کمتر نہ تھی۔

یوگی راج کے شریر چھوڑ دینے پر آشرم نے گرو دیو کے پد کے قابل بیرسٹر دِلشت کو ہی سمجھا اور اُسی دن سے اُنھیں مہاتما کی پدوی بھی مل گئی۔ اب وہ بیرسٹر دِکشت نہیں، ایک پرسدھ مہاتما تھے۔

(۵)

سُریلا کو آشرم کی سیڑھیوں پر بٹھا کر اُس کے پتا گرو دیو کے درشن کرنے گئے تھے، سریلا کچھ دوری پر بہتی ہوئی گنگا کے نظارہ میں محو اپنے دل سے باتیں کر رہی تھی، پتاجی مجھے سنیاس دِلانا چاہتے ہیں۔ کہتے ہیں اِن مہاتما کی کرپا سے مجھے کرشن بھگوان کے درشن ہو جائیں گے، مجھے شانتی ملے گی۔ جن نٹ ناگر کے خواب رنگین میں اپنی شاعری میں باندھا کرتی ہوں۔ اُن کے درشن پانے سے بڑھکر اور کیا سو بھاگیہ ہو سکتا ہے۔ لیکن پتاجی سے علیحدہ ہونا بھی تو آسان نہیں ہے، اور میں اپنے اندر اشانتی تو کچھ محسوس نہیں کرتی۔ لوگ مجھے دُکھیا سمجھکر مجھ پر رحم درساتے ہیں، پر میں تو بہت سکھی ہوں، پتاجی مجھے کتنا پیار کرتے ہیں۔

میرے ماں نہیں ہیں، بھائی بہن بھی نہیں ہیں۔ میں اکیلی ہوں لیکن یہ اکیلاپن ابتک تو کچھ اکھرتا نہیں ہے۔ کتنے تو کام ہیں، مجھے یہ سوچنے کی فرصت ہی کب ملتی ہے کہ میں اکیلی ہوں۔

پتی کے میں نے درشن ہی نہیں کئے، کبھی کبھی من دُکھی ضرور ہونے لگتا ہے کہ میری شادی پتاجی نے اِتنی چھوٹی عمر میں کیوں کر دی، ولایت جاتے وقت پتی دیو مجھ سے ملنے آئے تھے، لیکن شرم کے مارے میں اُن کے پاس ہی نہیں گئی۔ وہ ناراض ہو کر سویرے ہی چلے گئے اور پردیس میں ہی اُنکی موت ہو گئی۔ یہ خیال البتہ دل کو ٹھیس پہنچاتا رہتا ہے۔

پتاجی کو چھوڑ کر میں یہاں کیسے رہوں گی۔ یہ آشرم تو میرے گھر کا سا بھی نہیں ہے۔ گنگا کا کنارہ ہونے سے کچھ سہاونا ضرور جان پڑتا ہے۔ مجھے یہاں پھلواری لگانے کو کہاں ملے گی، کویتائیں بھی شاید ہی لکھ سکوں۔ مہاتما جی کے حکم پر تو چلنا ہی ہوگا۔

اور پھر پتاجی کو کتنا کشٹ ہوگا۔ گھر دم ہی چائے پیتے ہیں، کوئی نوکر بھی اِتنے سویرے نہ اُٹھ سکے گا، اور میری منیا مجھے نہ دیکھکر بیاکل ہو جائیگی، بچھڑا ابلا میرے کھلائے آدھا چارہ بھی نہ کھائے گا۔

کہیں نوکروں نے شام کو کبوتروں کو بند نہ کیا تو اُنھیں بلی بھی چٹ کر جائیگی۔ میرے پیچھے میری پھلواری اُجڑ جائے گی۔ میری ساری چڑیاں مرجائیں گی۔ مصرانی کے بنائے کھانے سے پتاجی کا پیٹ بھی نہیں بھرے گا، وہ اور بھی دُبلے ہو جائیں گے اور کھانسی بڑھ جائے گی۔

ممکن ہے ہر سمے شراب ہی پیتے رہیں۔ ابھی تو میں اونھیں بہت دیر تک باتوں میں لگائے رکھتی ہوں۔ تاش کھیلتی ہوں، گانا سناتی ہوں۔ اور شام کو چڑیا خانہ کی سیر کراتی ہوں۔ پھر تو شام سے ہی بوتل لے کر بیٹھ جایا کریں گے، پرماتما، کیا ہوگا، میں تو چپکے سے شراب میں پانی بھی ملا دیتی ہوں، میرے پیچھے خالص شراب کی پوری بوتل ہی پی گئے تو پھر منہ سے خون گرنے لگے گا۔ کچھ بھی ہو، میں یہاں نہیں رہوں گی، میرے پتا شراب پیتے ہیں تو کیا ہوا، اُن کے برابر میرے لئے کون ہو سکتا ہے، کون مجھے ویسا پیار کرے گا، میں یہاں کسی طرح بھی نہیں رہوں گی، لیکن پتاجی کو کیسے سمجھاؤں، وہ ناراض ہو جائیں گے، دُکھی ہوں گے، سوچتے سوچتے سُریلا کی خوبصورت آنکھوں سے بڑے بڑے موتی کے سے آنسو ٹپکنے لگے۔

مہاتما کا چیلا شیکھر اشنان کرکے آرہا تھا، دُور سے اُسے سُریلا سفید سنگ مرمر کی مورتی سی جان پڑی۔ سیڑھی پر وہ ٹھٹک گیا، کوئی دُکھیا رو رہی ہے، اُس نے میٹھی بانی میں پوچھا "دیوی، روتی کیوں ہو، کیا میں تمہاری کچھ سیوا کر سکتا ہوں؟"

شیلا مردوں کے ماحول میں نہیں رہی تھی، لیکن فطرتاً وہ نڈر تھی۔ لمحہ کی اُلجھن اُس میں پیدا ہی نہوئی تھی، اُس نے بالکوں کی بھانت آنسو پونچھتے ہوئے پوچھا، "تم مہاتما کے پُتر ہو؟"

"میں مہاتما جی کا شِشیہ ہوں۔ وہ مجھ پر پُتر کی بھانت ہی سنیہ کرتے ہیں۔"

"تو تم کچھ نہ کر سکو گے، اسی آشرم کے تو ہو نہ"

"آشرم باسی ہونے سے کیا ہوا۔ کچھ کہو بھی تو ممکن ہے میں تمہارا کچھ اُپکار کر سکوں۔ ہم لوگوں کا مقصد ہی پروپکار ہے۔"

سُریلا نے لمحہ بھر پہلے سوچی ہوئی ساری باتیں شیکھر کو سنا دیں اور بولی "کیا اب تم میرے پتا سے سفارش کر سکو گے۔ یوں تو میرے پتا میری ہر ایک اِچھا پوری کرتے ہیں۔ مگر اُن کا وچار جم گیا ہے کہ اس آشرم میں رہنے سے میرا کلیان ہوگا۔"

شیکھر نے بڑے مدھر شبدوں میں سُریلا کے پتا کے خیالات کی تائید

کی اور ہر طرح اُسے تسلی دیتے ہوئے کہا " اس میں کیا ہرج ہے۔ پتا کی آگیا کے مطابق کچھ دن یہاں رہ دیکھو۔ اگر من نہ لگے تو چلی جانا۔ یہاں کسی طرح کا بندھن تھوڑا ہی ہے۔ تمہاری آزادی میں بھی رکاوٹ نہیں پڑے گی۔ اپنی اِچھا کے انوسار کویتا بھی کر سکو گی، پھلواری میں بھی سیر کر سکو گی۔ یہاں سکشا کے بہت سے وسائل ہیں۔ چلو تمہیں یہاں کی لائبریری اور تصویر گھر دکھلاؤں۔ یہاں تم چتر کلا، چکتسا، سنگیت کلا وغیرہ بھی پڑھ سکتی ہو "

ثریلا کو یہ معلوم کر کے بڑی مسرت ہوئی کہ شیکھر بھی شاعر ہے۔ یہاں اُسے ہمدردی مل سکتی ہے۔ شیکھر کے ششبدوں میں نہ جانے کیسی موہنی تھی، کہ ثریلا آشرم میں رہنے کو تیار ہو گئی۔ پتا جلد جلد آنے کا وعدہ کر کے چلے گئے۔

(۶)

ثریلا اور شیکھر میں متر تا ہو گئی، آشرم میں مرد عورتوں کے آپس میں ملنے جلنے کے لئے کوئی خاص قاعدہ نہیں تھا۔ سب کو مکمل آزادی تھی۔ دونوں آشرم کے کام۔ پوجا اوپاسنا وغیرہ سے فارغ ہو کر کلکل نادنی گنگا کے کنارے بیٹھ کر کویتا لکھتے۔ کبھی بات چیت کرتے اور کبھی روحانیت کا کوئی مسئلہ لے کر بحث۔ دونوں کے خیالات میں کسی قسم کی بھی گندگی نہ تھی۔ وہ گرودیو کے بتائے ہوئے مارگ پر چلتے، اور اُن کے اپدیش کے انوسار ہی مطالعہ اوپاسنا اور ابھیاس کرتے۔

لیکن گروجی کو یہ دوستی کھلکی، ایک نوجوان اور دوشیزہ کا اس طرح ہر وقت کا ساتھ اور ایک دوسرے پر اِتنا التفات درست بھی نہیں ہے، شیکھر ابھی ابھیاس ہی کر رہا ہے۔ تپسوی نہیں بن پایا ہے اور ثریلا کو ابھی آشرم میں داخل ہوئے دن ہی کے گزرے۔ گرودیو نے اپنے یہ وچار کسی پر پرگٹ تو نہیں کئے۔ لیکن ان دونوں پر کڑی نظر رکھنا شروع کر دی۔

اُنھوں نے شیکھر سے کہا " بیٹا! میں تم سے بہت خوش ہوں بھگوان تم پر جلد ہی پرسن ہوں گے۔ اب وہ وقت آگیا ہے کہ تم کچھ دنوں تک ایکانت میں تپسیا کرو۔ ایک ہفتہ بعد تمہیں ایک پہاڑ کی کندرا میں جانا ہوگا "

شیکھر نے ماہتا تُو اگر گرودیو کی آگیا سویکار کر لی۔ گرو نے ثریلا کا کمرہ نیچے سے بدل کر چھت پر اپنے کمرے کے قریب کر دیا۔ ثریلا کے من میں شنکا ہوئی کہ کیا گرو میرے اوپر شک کرتے ہیں۔ لیکن اُس نے خود ہی اپنے وچار کی نِندا کی اور گرو کی شردھا بھگتی میں کسی قسم کا فرق نہ آنے دیا۔

اُس روز رات دودھ سے اشنان کر رہی تھی اور اُس کی دھاروں نے پھیل کر تمام کائنات کو سفید بنا دیا تھا، اُسی اجیالی میں ہری گھاس کے مخملی بچھونے پر لیٹے ثریلا اور شیکھر بات چیت کر رہے تھے۔ شیکھر نے کہا " ثریلا۔ گرودیو کی آگیا سے اب میں ایک ماہ کے ایکانت باس کے لئے جاؤں گا "

ثریلا پر بجلی گر پڑی، اُسے ایسا معلوم ہونے لگا گویا دل کی دھڑکن بند ہوئی جاتی ہے، درد سے کلیجہ مسوسا جانے لگا۔ وہ ڈری ہوئی ہرنی کی مانند چھلچلائی آنکھوں سے شیکھر کا منہ نہارتی رہ گئی۔

ثریلا کی یہ دشا دیکھ کر شیکھر کا من بھی نہ جانے کیسا ہونے لگا لیکن اُس نے دل کو مضبوط بنا کر کہا " گھبراتی کیوں ہو، شانتی سے دل کو قابو میں کر کے رہو، گرودیو کے اپدیشوں پر منن کرنا تمہارا چِت سا دھان ہو جائیگا "

ثریلا نے کہا " شیکھر تم چلے جاؤ گے تو میں کسی پرکار بھی یہاں نہ رہ سکوں گی۔ مجھے پتا کے یہاں پہونچا دو "

" نہیں ثریلا، اتنے دنوں کے ابھیاس کو اس طرح نہ توڑو ــــ میں گرودیو سے پرارتھنا کروں گا کہ وہ اب تمہیں زیادہ وقت دیں۔ اُن کے اپدیشوں سے تمہیں شانتی ملے گی "

گھبرا کر ثریلا نے کہا " نہیں شیکھر ایسا نہ کرنا۔ بلکہ گرودیو سے کہو مجھے بھی ایکانت باس کی آگیا دیں "

" ایسا تو ہو نہیں سکیگا ثریلا۔ گرودیو تمہیں ایکانت باس میں جانے کی آگیا نہیں دیں گے۔ ابھی تم اُس کٹھن تپسیا میں کامیاب نہ ہو سکو گی "

" تو شیکھر میں یہاں نہیں رہوں گی، مجھے کشما کرنا شیکھر۔ گرو سے مجھے ایک طرح کا ڈر لگتا ہے۔ اُن سے زیادہ مجھے تم پر ...... "

بیچ ہی میں بات کاٹ کر شیکھر نے ڈانٹا " کیسی باتیں کرتی ہو ثریلا۔ گرودیو پر بھگتی کرو "

کانپتی ہوئی آواز سے ثریلا نے کہا " شیکھر میں نے انیک بار دیکھا ہے گرو چھپ چھپ کر ہم دونوں کی باتیں سنتے ہیں "

"تو ہرج کیا ہے۔ ہم دونوں پر نگاہ رکھنا گرو کا فرض ہے" سسکتے ہوئے سُریلا بولی "اتنا ہی نہیں شیکھر۔ رات میں مجھے کئی بار شبہ ہوا کہ کواڑ کی درازسے کوئی میرے کمرے میں جھانکتا ہے۔ تم نے جو اپنی تصویر بنا کر مجھے دی تھی اُسے میرے کمرے سے کوئی چرا کر لے گیا۔ مجھے یہ کام گرو کا ہی جان پڑتا ہے۔ میں یہاں نہیں رہوں گی یا پھر تم کچھ دنوں بعد جانا"

سُریلا سِسک سِسک کر رونے لگی۔ چندے خاموش رہ کر اُس نے شیکھر سے کہا: "شیکھر۔ میرا من تم سے پیے نہیں کھاتا ہے"

اس سادگی پر شیکھر ہنس دیا۔ اس وقت بات بدلنے کے لئے اُس نے کہا "آؤ کچھ دیر رامائن کا پاٹھ کریں"

(۷)

سُریلا رامائن گانے لگی۔ شیکھر آدھا لیٹا ہوا سننے لگا۔ پُستک پاٹھکا کا منورم پرسنگ چل رہا تھا۔ دونوں گوسائیں تلسی داس جی کی بھگتی رس کا سواد لے رہے تھے۔ بالکل رامائن میں محو تھے۔

اور گرو؟ گرو چھت کی کھڑکی سے آدھی رات میں دونوں کا بھید لینے بیٹھے تھے۔ ہوش وحواس میں ہی گرو دیو عالمِ خواب کی سیر کرنے لگے۔ یہ سُریلا کتنی سندر ہے۔ گویا حُسن خود مجسم ہو کر دنیا میں نمودار ہوا ہے۔ راگنی کا روپ اُس کی پرچھائیں کے برابر تھا۔

گرو چونک پڑے۔ آج برسوں بعد ماضی کی یاد کیوں ہلوریں لینے لگی۔ ہری اوم کہہ کر گرو نے آسمان پر ہنستے ہوئے چندرما کو دیکھا اور پھر اُفق پر سُریلا پر نظر ڈالی۔ اُنھیں ایسا معلوم ہوا گویا چندرما کا ایک حصہ ٹوٹ کر سُریلا بن گیا ہے۔ اُنھیں معلوم ہونے لگا کہ بھگوان نے خوش ہو کر اُنھیں نظرِ غیب عنایت کی ہے۔ سُریلا چاند کا ٹکڑا ہی نہیں رام کی سیتا بھی ہے۔ وِشنو کی لکشمی بھی ہے۔ کرشن کی رادھا بھی ہے اور کامدیو کی سُندر رتی بھی ہے۔ گرو بیٹھے ہوئے بھگتی ساگر میں ڈوب کر رادھا۔ لکشمی و سیتا کے درشنوں کا امرت پینے لگے۔

حالتِ غنودگی میں کتنا وقت گزر گیا، گرو دیو جان ہی نہ سکے۔ مرغ نے مدماتی بانگ سے آمدِ سحر کی سوچنا دی، تب شیکھر نے کہا "سُریلا اُٹھو، آج آشرم کی صفائی کرنے کی باری ہماری ہے۔ میں پانی لاتا ہوں تم چل کر پہلے گرو دیو کا کمرہ جھاڑ دو"

گرو کھڑکی پر سر رکھے بدرا میں محو تھے۔ یہ وقت تو اُن کا ہوا خوری کے لئے آشرم سے باہر جانے کا ہے۔ سُریلا جھاڑو لئے گرو جی کے جاگنے کی انتظار میں دروازہ پر کھڑی رہی۔ گرو مزیدار خواب دیکھ رہے تھے۔ بند رابن کے کنج بن میں چاندنی چھٹکی ہوئی ہے اور ہزاروں چندرما کی روشنی کو خیرہ کرنے والے کرشن بھگوان داہنے ہاتھ میں مُرلی لئے ہوئے رقص کر رہے ہیں۔ بائیں بغل میں پیاری رادھا جی شوبھا پا رہی ہیں۔

بہت سے دیوتاؤں کے ہمراہ گرو بھی بِوان پر بیٹھے پھول برسا رہے ہیں۔ بھگوان کرشن نے مُرلی اوپر اُٹھا کر گرو کو قریب آنے کا اشارہ کیا۔ بھگتی سے پاگل ہو کر گرو بِوان سے کود پڑے، اور بھگوان نے اُنھیں اپنے اندر جذب کر لیا۔ اب بھگوان کرشن اور گرو جدا نہیں تھے۔

پھر ایک بار رادھا کے مُکھ پر درشٹی ڈال کر مُرلی منوہر نے کہا، "پریہ۔ سنسار میں تم سُریلا تھیں اور میں مہاتما تھا۔ ابھی دُنیا میں پھر چل کر پرانیوں کا اُدھار کرنا ہے"

رادھکا بولی "میرا سُنیش۔ کیا مجھے ابھی اور الگ رہنا ہوگا، اس بار کی جدائی تو سیتا بن باس سے زیادہ ہو گئی ہے دیوتا۔"

کرشن جی نے رادھا کو چپٹا لیا اور بولے "نہیں پریہ۔ اب ہم تم ساتھ رہ کر ہی دنیا کا اُدھار کریں گے"

آنکھ کُھل کر بھی گرو دیو کی سمادھی نہ ٹوٹی۔ پاگلوں کی طرح سُریلا کا ہاتھ پکڑ کر بولے "رادھکا۔ پریہ"

سُریلا گرو کا ہاتھ جھٹک کر چیختی ہوئی بھاگی "مجھے بچاؤ شیکھر" شیکھر پانی کی بالٹی لئے سیڑھیاں پار کر چکا تھا، یہ نظارہ دیکھ کر ہکا بکا سا کھڑا رہ گیا۔ اُدھر بجلی کی مانند کوند کر سُریلا اُس کے قدموں پر لوٹ گئی۔ بالٹی کا کنارہ ماتھے میں چُبھ گیا اور خون کا فوارہ بہہ نکلا۔

بیہوش سُریلا کو گود میں اُٹھا کر شیکھر آشرم سے باہر ہو گیا۔ سارے آشرم میں شور مچ گیا۔ واقعہ کا پتہ لگانے کے لئے آشرم باسی گرو کے پاس گئے۔ لیکن دروازے بند تھے۔ سبھوں نے سمجھا گرو سمادھی میں ہیں شیکھر بغیر کچھ کہے ہی چلا گیا تھا۔

(۸)

پتا سے چمٹ کر سُریلا خوب روئی۔ پتا بھی رونے لگے "اچھا کیا آ گئی

—

سُریلا۔اب میرا آخری وقت قریب جان پڑتا ہے" بات کرتے کرتے اُن کے منہ سے سرخ سرخ خون بہنے لگا۔ شیکھر اُن کی تیمارداری میں لگ گیا، سُریلا اور بھی بلکھ اُٹھی" مجھے اپنے سے جُدا کرکے تم نے اپنی کیا گتی کرلی پتاجی "

نوکر نے شیکھر کے نام ایک خط لاکر دیا، لکھا تھا

"شیکھر، سُریلا نے میری آنکھیں کھول دیں، میں بھرم میں تھا جسے ابتک خواب سمجھا تھا دراصل حقیقت تھی اور جسے حقیقت سمجھا تھا وہی خواب تھا۔ مجھے اپنے مارگ کا پتہ اب لگا ہے۔ میں جاتا ہوں اور آشرم کا بھار تم دونوں پر چھوڑتا ہوں۔ تم سریلا سے شادی کرلو، تمہارا کلیان ہوگا، انسانی پریم سے ہی تمہیں حقیقی محبت کا سراغ ملے گا، خواہشات کے دبانے سے نہیں بلکہ اُنھیں روحانیت میں تبدیل کردینے سے ہی اصلی شانتی پراپت ہوتی ہے، یہی تمہارے گرو دیو کا آخری اپدیش ہے "

مترجم کانتی پرشاد ورما۔ بی اے

محبت کا چاند

شب کی دیوی چھیڑتی ہے جب خموشی کا رباب — کاروانِ زندگی ہوتا ہے جب مصروفِ خواب

منظرِ ہستی پہ چھا جاتی ہیں جب ویرانیاں — ظلمتوں کے بحر میں جب ڈوب جاتا ہے جہاں

جب نظر آتے ہیں فطرت کے مناظر ہولناک — چہرۂ آفاق پر اُڑتی ہے مایوسی کی خاک

اِس طلسمِ تیرگی میں آسماں پر دُور سے — جھانکتا ہے چاند اپنی خلوتِ مسرور سے

چاندنی کا اک منور شامیانہ تان کر — توڑ دیتا ہے فسونِ ظلمتِ شب کا اثر

جگمگا کر اک نرالی شان سے افلاک پر
نُور کے دریا بہا دیتا ہے فرشِ خاک پر

یونہی میری زندگانی کی اندھیری رات میں — رُوح فرسا، ہیبت افزا، دل شکن لمحات میں

دیدۂ بیتاب ہو جاتا ہے جب محرومِ دید — جب نگاہوں کو نظر آتا نہیں روئے اُمید

جب حصارِ ہجر میں محصور ہو جاتا ہے دل — یاس کے تاریک صحراؤں میں کھو جاتا ہے دل

گھورتا ہے جب مجھے دنیائے خود بیں کا غرور — جب اُداسی چھین لیتی ہے مری آنکھوں کا نور

جھانکتا ہے دفعتاً اک چاند دل کے طور سے — کُنجِ باطن جگمگا اُٹھتا ہے جس کے نُور سے

یہ مرے چرخِ محبت کا سنہری چاند ہے
آسماں کا چاند جس کی روشنی سے ماند ہے

انور، بی اے

"سپاہی کے ہزار فن"

اثر لکھنوی

نشیمن پھونکنے والے ہماری زندگی یہ ہے
کبھی روئے، کبھی سجدے کئے خاکِ نشیمن پر

جولائی ۱۹۳۷ء تک حضرتِ فراق گورکھپوری کو حضرتِ بیخودؔ موہانی کے مندرجۂ بالا شعر پر انتخابِ الفاظ، سلاستِ بیان، سادگی و ترنم، سوز و ساز کے اعتراف کے باوصف یہ اعتراض تھا کہ اُس کی جزئی خوبیاں ہی اسے ابتذال کے گڑھے میں گرا رہی ہیں، موصوف نے ابتذال کا ذمہ دار "والے" کو قرار دیا تھا، جس کے باعث اُن کے خیال میں گھنونی محاکات پیدا ہوگئی، میں نے عرض کیا تھا کہ یہ وہم ہی وہم ہے، شعر کے الفاظ اس تعریض کی تائید نہیں کرتے۔ یہ ہے خلاصہ اُن کے اعتراض اور میرے جواب کا۔

اپریل ۱۹۳۸ء کے کلیم میں فراقؔ صاحب نے حملے کا محاذ بدل دیا ہے اور اب منجملہ دیگر امور کے فرماتے ہیں کہ "نشیمن پھونکنے والے" کے طرزِ تخاطب میں ظلم کی ایسی تشریح ہے جو مذاقِ سلیم پر بار گزرتی ہے۔

پیشتر کے اعتراضوں کو بھلا کر شعر میں دوسری برائیاں ڈھونڈنا در پردہ ہار مان لینا نہیں تو کیا ہے؟

جس مذاقِ سلیم پر فراقؔ صاحب کو ناز ہے اُس کے بھولے پن کا یہ حال ہے کہ جو شعر غلط طور پر بھی میرؔ سے منسوب ہوگیا اُن کے لئے حدیث و آیت ہے۔ فرماتے ہیں کہ:۔

"کبھی میرؔ تقی نے اپنے ایک شعر میں ایک قیامت کا ٹکڑا رکھ دیا تھا،
ابے او چاک گریباں والے"

حالانکہ یہ شعر میرؔ کا ہی نہیں اور میرؔ سے اس قسم کے عامیانہ و سوقیانہ انداز بیان کی امید رکھنا مذاقِ سلیم کو رسوا کرنا ہے۔ پریشاں خیالی کا یہ عالم ہے کہ دیگر اساتذہ کے اشعار میں لفظ "والے" سے تخاطب کی خوبی دکھانا مقصود ہے۔ مگر مثالیں وہ درج کرتے ہیں جن میں بجز ایک شعر کے کسی میں خطاب نہیں ہے:۔

(۱) اُنکا بندہ ہوں جو بندے ہیں محبت والے
(۲) دل جلے، سینہ جلے، اُف نہیں کرنے والے
(۳) آپ کی جان سے دور آپ پہ مرنے والے!
(۴) وہ تیکھی نوک پیکاں والے، وہ سوفار پر والے
(۵) ذرا او جانے والے قبر پر پھر مسکرا دینا
(۶) شبِ ہجر غمخوار کس کو بنائیں
ہمیں ہنسنے والے، ہمیں رونے والے

ظاہر ہے کہ صرف نمبر ۵ میں لفظ والے میں خطاب ہے، باقی میں خطاب کا فقدان ہے۔

ان مثالوں میں تو بزعم حضرت فراقؔ لفظ والے خوش اسلوبی سے لایا گیا ہے۔ مگر نشیمن پھونکنے والے میں ظلم کی ایسی تشریح ہے جو مذاقِ سلیم پر گراں گزرتی ہے، مزید شرح فرماتے ہیں کہ شاعری اور غزل کی شاعری کا نازک دل اس لے دے اور اس تو تو میں میں سے بیزار ہوجاتا ہے۔ ایسے اندازِ تخاطب سے شعر میں سوز و گداز پیدا نہیں ہوتا۔

جواب میں بجز اس کے کیا کہا جائے کہ حضرتِ فراقؔ جس مذاقِ سلیم کے مالک ہیں وہ ہماری دسترس اور غالباً خود اُن کے قابو سے باہر ہو گیا ہے۔

ناظرین ملاحظہ فرمائیں گے کہ فراقؔ صاحب نے ایسے جتنے شعر پیش کئے ہیں جن میں معشوق یا دشمن سے براہِ راست خطاب ہے، ایک بھی ایسا نہیں جس میں نشیمن کی بربادی اور اثراتِ مابعد کا ذکر ہو، حالانکہ ہجو دعا کے شعر سے موازنہ اور اچھے بُرے کے فیصلے کی صرف یہی ایک صورت تھی۔

اس کے بعد فراقؔ صاحب نے اپنے گمان میں زبان و اندازِ بیان کے بعض بیش بہا نکات و رموز قلمبند فرمائے ہیں، جن کو امرِ زیرِ بحث سے کوئی علاقہ نہیں، ایسے اقدام کا یہ منشا ہوا کرتا ہے کہ پڑھنے والے کا دھیان بٹ کر اصل نزاع کھٹائی میں پڑ جائے۔ مثلاً ارشاد ہوتا ہے کہ حضرت امیرؔ مینائی کے زمانے تک نشیمن یا آشیانہ پر بجلی گرنے کا ذکر تو شعر میں آ جاتا تھا، لیکن نشیمن اُجاڑنے یا پھونکنے کا ذکر شاید ہی آیا ہو۔ یہی قول آگ لگنا اور لگانا اور آگ دنیا کے متعلق ہے۔ ان اسالیب کو موصوف نے لکھنؤ کی بگڑی ہوئی ذہنیت کا نتیجہ قرار دیا ہے۔

ایک طرف تو فراقؔ صاحب جدت کے مؤید ہیں اور دوسری طرف ایسے لکیر کے فقیر ہیں کہ نشیمن پر بجلی گرنے کے علاوہ نہیں چاہتے کہ نشیمن اُجاڑنا یا پھونکنا بولا جائے۔ حالانکہ اگر نشیمن جل سکتا یا جلایا جا سکتا ہے تو پھُنک بھی سکتا ہے اور پھونکا بھی جا سکتا ہے، اگر تاراج یا غارت یا برباد ہو سکتا ہے۔ یا کیا جا سکتا ہے تو اُجڑ بھی سکتا ہے اور اُجاڑا بھی جا سکتا ہے۔ فراقؔ صاحب کی طرح میں بھی میرؔ کا معتقد ہوں لہٰذا اُسی کے اشعار سے اُن کی تردید اور کوتاہ نظری واضح ہو جائے گی۔

آگ دینا

دی آگ رنگِ گُل نے واں اے صبا چمن کو
یاں ہم جلے قفس میں سُن حال آشیاں کا

آگ پھونکنا

بلبل بھی تو نالاں تھی، پر سارے گلستاں میں
اک آگ پھُنکی، میں جب سرگرمِ فغاں آیا

بجلی سے آشیاں جلنا۔

تڑپ کے خرمنِ گُل پر کبھی اے بجلی
جلانا کیا ہے مرے آشیاں کے خاروں کا

اور شاعروں کے کلام سے مثالیں ڈھونڈنا تضیعِ اوقات ہے، انھیں پر اکتفا کرتا ہوں۔

فراقؔ صاحب نے بڑے تشخص سے فرمایا ہے کہ واردات و سانحات کے بیان کرنے میں کسی شخصِ واحد پر الزام نہیں دھرنا چاہئے۔ غم اور درد و سوز و گداز ٹریجیڈی کے عناصر کائنات میں سموئے ہوئے ہیں، یہ تاثرات ازلی اور ابدی ہیں، کیا فلسفۂ غم اور یاسیات کے اس پہلو پر حضرتِ آثرؔ نے کبھی غور نہیں کیا .... دیکھئے میرؔ کے یہ اشعار۔

(۱) مصائب اور تھے، پر دل کا جانا
عجب اک سانحہ سا ہو گیا ہے

(۲) وصل و ہجراں میں کہ یہ دو منزلیں ہیں عشق کی
دلِ غریب ان میں خدا جانے کہاں مارا گیا!

وغیرہ وغیرہ۔

غریب آثرؔ نے بہت کچھ غور کیا اور سر کھپایا ہے۔ مگر فراقؔ صاحب کا دماغ کہاں سے لائے۔ اوّل تو اُسے شکوہ ہے کہ میرؔ صاحب کے دوسرے شعر کے پہلے مصرع میں عمداً یا سہواً تحریف کی گئی ہے، جس سے پورا شعر ناقص ہو گیا، صحیح اس طرح ہے:۔

وصل و ہجراں، یہ جو دو منزل ہیں راہِ عشق کی۔ الخ

اہلِ نظر جانتے ہیں کہ دوسرے مصرع کا صناعانہ تشکک شعر کی جان ہے، لیکن شک کی گنجائش ہی نہیں رہتی اگر پہلے مصرع میں بجائے "راہِ عشق" کے صرف عشق ہو، اور فراقؔ صاحب نے اسی لفظِ راہ کو خارج کر دیا!

اب فراقؔ صاحب کے اس مشفقانہ سبق کو لیجئے کہ واردات و سانحات کے بیان کرنے میں کسی شخصِ واحد پر الزام نہ رکھنا چاہئے۔ ایک حد تک یہ قول درست ہے مگر کلیہ کے تحت میں نہیں آتا۔ وہی میرؔ جو کہتا ہے کہ ؎

مصائب اور تھے، پر دل کا جانا
عجب اک سانحہ سا ہو گیا ہے

یہ بھی کہتا ہے ؎

خوش نہ آئی تمھاری چال ہمیں — یوں نہ کرنا تھا پائمال ہمیں
کہتے ہو اتحاد ہے ہم کو — ہاں کہو، اعتماد ہے ہم کو
جہاں کو فتنے سے خالی کبھو نہیں پایا — ہمارے عہد میں تو آفتِ زمانہ ہوا

اسی سلسلے میں مومن کا ایک شعر نقل کیا ہے ؎

میں بھی کچھ خوش نہیں وفا کرکے — تم نے اچھا کیا نباہ نہ کی

معشوق پر کھلا ہوا الزام تھا، لہٰذا اُس کی توجیہہ فرماتے ہیں کہ الزام دیا گیا ہے مگر کن الفاظ میں۔ فراق صاحب کی گریز پائی دیکھتے جائیے۔ ابتدا یوں ہوتی ہے کہ واردات و سانحات کے تذکرہ میں شخصِ واحد کو الزام نہ دینا چاہیئے اور خاتمہ اس طرح ہوتا ہے کہ اگر الفاظ مناسب ہیں تو الزام جائز ہے! بات یہ ہے کہ جہاں کانوں میں THEORY OF AUTOMATISM گونج رہی ہو اور اس کا اطلاق ذی حیات اشیا کے اضطراری وغیر ارادی حرکات کے بجائے کائنات کے واردات و سانحات پر کیا جائے اور اس خوابِ پریشاں کی تعبیر یہ نکلے کہ بیان واردات و سانحات میں شخصِ واحد کو ذمہ دار نہ بنانا چاہیئے اور وہ بھی اقلیم شعر میں، تو ساری بکواس کا حاصل بے معنی اظہارِ علمیت کے سوا کیا ہو اور اس منطق اور سخن پروری کی کہاں تک داد دی جائے۔ کہ جتنے طریقے الزام یا شکایت یا تخاطب کے ہیں وہ سب جائز و مستحسن ہیں، نہیں ہے تو "نشیمن پھونکنے والے" کا اندازِ بیان!

فراق صاحب کی ایک اور رطباعی در خورِ اعتنا ہے کہ جہاں جہاں "نشیمن پھونکنے والے" کا اعادہ کیا ہے اس کے قبل لفظ "او" یا "ہے" عمداً لائے ہیں تاکہ پڑھنے والا ایک قسم کا تنفر محسوس کرے، حالانکہ بیخود کے شعر میں "اے" یا "او" نہیں ہے۔

فراق صاحب نے ایک اور دلچسپ بحث شروع کی ہے کہ اکثر موقعوں پر ضمیر کا حذف کر دینا محاسن شاعری سے ہے۔ منظور! تائید میں اصغر گونڈوی مرحوم کا ایک شعر اس تمہید کے ساتھ پیش کیا ہے کہ

"یہ شعر حضرتِ اثر کو اس سے پہلے بھی متوجہ اور متاثر کر چکا ہوگا یا یہ میرا حسن ظن ہے!"

اصغر مر گئے اور مجھے مرنا ہے، البتہ فراق صاحب نے اپنا جو شعر ڈرتے ڈرتے پیش کیا ہے، اُس کے متعلق کچھ سُن لیں ؎

دلوں کی انجمن میں بزمِ یار میں نہیں ہوں اب
میں نقش تھا مٹا دیا، چراغ تھا بجھا دیا

پہلے مصرعہ کے آخر میں لفظ اب ایسی آواز پیدا کرتا ہے گویا ایک بھاری کچھوا (بقول حضرت اقبال سہیل) اونچے کگارے سے دریا میں دھڑام سے کود پڑا، یا کسی پُرخور نے بعد غذا توند پر ہاتھ پھیرا اور زور سے ڈکار لی۔ دوسرے مصرع کے متعلق فراق صاحب کو اُنھیں کا قول یاد دلاؤں گا کہ ظلم کیا نہیں جاتا، ہو جاتا ہے۔ لہٰذا حذفِ ضمیر کے ساتھ یہ وصف بھی اضافہ کیجئے۔ دلوں کی انجمن مہمل فقرہ ہے جسے نقش سے کوئی ربط نہیں، گُلوں کی انجمن کہئے، ورنہ غلطی کاتب کے سر تھوپئے۔ پہلے مصرع سے اب کا دھما کا نکالئے اور یوں کہئے ؎

گُلوں کی انجمن میں ہوں نہ بزم گاہِ ناز میں
مثالِ نقش مٹ گیا، برنگِ شمع بجھ گیا

آپکا دوسرا شعر بھی کاواک ہے ؎

وہ سوز و درد مٹ گئے، وہ زندگی بدل گئی
سوالِ عشق ہے ابھی، یہ کیا کیا یہ کیا ہوا؟

درد و سوز مٹنے والی چیزیں نہیں گو نوعیت بدل جاتی ہے "سوالِ عشق ہے ابھی" ایک مہمل ٹکڑا ہے۔ سوز و درد کے بجائے شوق کہئے جس میں سوز و درد و اضطراب سبھی کچھ ہوتا ہے، جس کے طوفان میں سطح دریا سے قعرِ دریا میں منتقل ہو جانے کا امکان ہے، شوق کے ساتھ "خونچکاں" (صفت) کا اضافہ کیجئے تاکہ دوسرے مصرع میں سوال کی گنجائش نکلے۔ غرضکہ آپ کا شعر چولا بدل کر یوں ہو گیا ؎

وہ شوقِ خونچکاں کہاں، وہ زندگی بدل گئی
کوئی جو پُوچھے کیا کہوں، یہ کیا کیا، یہ کیا ہوا!

فراق صاحب نے لکھنؤ والوں کے سر یہ الزام بھی تھوپا ہے کہ ضمیر کے حذف اور دیگر محذوفات سے بچتے ہیں (یعنی جائز نہیں رکھتے) جواب یہ ہے کہ ضمیر کے حذف یا اعلان کا انحصار موقع و محل پر ہے جو صورت جہاں مستحسن ہو، ضمیر کا حذف ضروری ہے تو حذف کرتے ہیں، اگر لانا چاہیئے لاتے ہیں، البتہ فراق صاحب کی طرح نہیں کہتے کہ

"میرے والد مرحوم حضرتِ عبرت کا ایک شعر یاد آیا"

یہاں میرے کی ضمیر اپنی مہملیت پر شرما رہی ہے اور غیرت سے زمین میں گڑی جاتی ہے، کسی ماہرِ زبان سے پوچھئے تو اس "میرے" کے متعلق نہ معلوم کیا کیا گلفشانی کرے، اگر ایسا ہی تکلف منظور تھا تو

فرماتے کہ مجھے اپنے والدِ مرحوم حضرت عبرت کا ایک شعر یاد آیا ورنہ " والدِ مرحوم حضرتِ عبرت کا ایک شعر یاد آیا " کافی تھا۔

اس کے بعد فراق صاحب نے پھر وہی دُکھڑا رونا شروع کر دیا ہے، کہ بیانِ مجبوری میں ضبط اور توازن کی ضرورت ہے اور رونے کو سلیقہ درکار ہے۔ لیکن حضرت بیخود کے شعر میں ایک چھوڑ دو دو مضطربانہ کیفیتیں رونا اور سجدے کرنا موجود ہیں۔ لہٰذا شعر سوز و گداز سے معرا ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ شعر میں درد پیدا کرنے کے لئے بڑی بے دردی کی ضرورت ہوتی ہے۔ بڑے ضبط کی ضرورت ہوتی ہے، مثال میں اپنا یہ معرکہ آرا شعر پیش کیا ہے ؎

چھوٹ کر اُن سے بہت بے درد ہم بھی ہو گئے
ایک خنجر ہو گئے جب سے کھنچے قاتل سے ہم

اس جتیہ سراپا تقصیر کو تو شعر میں تصنع، ناہمواری، عدم توازن اور ضعفِ نظم کے سوا کوئی خوبی نظر نہیں آتی۔ شعر کی کائنات لفظ "کھنچے" کا ایہام ہے جو حضرت مظہر جانِ جاناں علیہ الرحمتہ کے وقت سے متروک و مطرود تھا۔ اس بدعت کو دورِ متوسطین نے تازہ کیا اور امانت وغیرہ نے تو ابتذال سے بھی کئی درجے نیچے گرا دیا۔

تعجب ہے کہ علوم مغربی کے جید عالم حضرتِ فراق گورکھپوری (غالباً تھیوری آف آٹومٹیزم کے زیرِ عمل) ایہام کے احیا کی طرف مائل ہیں۔ حیرت ہے کہ ایسا فاضل جلیل ایسے شعر کو مجسمۂ سوز و گداز قرار دیتا ہے جس کا بھرپن محتاجِ ثبوت نہیں کیونکہ اس کی معنویت ایک ذومعنین لفظ "کھنچے" کی دست نگر ہے۔

فراق صاحب نے حضرتِ بیخود کے شعر کو اصلاح سے بھی مزین کیا ہے اور معجزانہ لہجے میں فرمایا ہے کہ اصلاح نے شعر کے معائب دور کر دئے، حتیٰ کہ "نشیمن پھونکنے والے" ٹکڑے میں جتنی خامیاں اور خرابیاں تھیں وہ سب حسن و سوز و گداز میں مبدل ہو گئیں، سُنئے اور دعد کیجئے ؏

کبھی روئے، کبھی چپ ہو رہے شاخِ نشیمن پر

کاش جناب موصوف اپنے ابتدائی مضمون میں اعلان فرما دیتے کہ اعتراض "نشیمن پھونکنے والے" یا رونے پر نہیں ہے بلکہ سجدے کرنے اور خاکِ نشیمن پر ہے۔ نہ معلوم کتنے صفحے سیاہ کرنے کے بعد حضرتِ فراق نے یہ پلٹا کھایا ہے۔ یا تو نشیمن پھونکنے والے کے انداز تخاطب اور رونے کے گھونسلے پن پر چشم نمائی ہو رہی تھی یا یہی ٹکڑے حسین بن گئے اور خاکِ نشیمن اور سجدے کا شمار حشو میں ہونے لگا۔ یارب یہ کیا بوالعجبی ہے۔ یہ تنقید نگاری ہے یا بازی گری؟

فراق صاحب کو یک رنگی سے اس قدر الفت ہے کہ آشیاں کی بربادی پر افسوس کے علاوہ، آشیاں سے محبت، اُس کی وقعت و عظمت کا اظہار بھی جرم سمجھتے ہیں حالانکہ بیخود صاحب کا منہو ذہنی یہی تھا کہ کبھی آشیاں کی بربادی پر آنسو بہائے اور کبھی اس کے روایات (جس کی آغوش میں تربیت پائی، جہاں جذبات اور تخیلات کی نشو و نما ہوئی، جہاں کا گوشہ گوشہ نغماتِ محبت اور نویدِ امن و عافیت سے لبریز تھا) یاد کر کے بے اختیار سجدے میں گر پڑے۔ فراق صاحب کو معلوم ہونا چاہیئے کہ سجدے میں جو حشرِ جذبات پنہاں ہے وہ رونے اور چپ لگ جانے سے بالکل مختلف ہے۔ رونے اور چپ رہنے سے صرف بربادیٔ نشیمن پر اظہارِ الم ہوتا ہے۔ جو باتیں میں نے عرض کیں اُن کی ترجمانی سجدہ ولہٰذا سے ہوتی ہے۔ مگر جو شخص نشیمن کے منہوم کو چڑیوں کے گھونسلے سے زیادہ نہ دے۔ اُس سے شعر کی گہرائیوں تک رسائی کی توقع رکھنا ہی بے جا ہے۔ فراق صاحب کی اصلاح کے بعد شعر کی یہ حالت ہو گئی کہ ویرانے میں اُلو ایک سوکھی شاخ پر منہ پھلائے ہوئے بیٹھا ہے۔

میں پچھلے مضمون کے بعد مزید خامہ فرسائی نہ کرتا اگر فراق صاحب کے اس ارشاد کی تعمیل ضروری تھی کہ

" آثر نے حضرت بیخود کے شعر کے متعلق میری ہرزہ سرائی کو جھکایا ہے، اسی طرح مفصل یا مجمل طور پر اسی مضمون کے یا میرے پہلے مضمون میں اصولی بحث کے سلسلہ میں میں نے جو " ہرزہ سرائی " کی ہے اُسے بھی ذرا ہاتھ لگائیں اور اُجاگر کریں خواہ یہ مشقِ ستم وہ میرے ہی کسی شعر پر کریں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔
شعر سے متاثر ہونے والی جماعت، شعرا کے قبیلے سے زیادہ اہم جماعت ہے، اس جماعت کی خدمت ہر نقاد پر فرض ہے کہ ملک کا مذاق بلند ہو "

مستقبل کی عنان میرے ہاتھ میں ہے نہ فراق صاحب کے ہاتھ

میں، لیکن اتنا کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ اردو کو غیر ملکی تنقیدوں کے عاریتی اصول میں پیش کرنا نہ تو ملک کے مذاق کو بلند کرسکتا ہے نہ اور کسی قسم کا فائدہ پہنچا سکتا ہے، کھوٹا کھرا پرکھنے کے طریقے اور ہیں۔ اس منزل میں پہلا قدم اپنی زبان سے کماحقہ واقفیت حاصل کرنا ہے، اُس کے بعد ذوق کی رہنمائی شروع ہوتی ہے۔ جب تک علم و تربیت سے بہرہ اور زبان کی نزاکتوں پر کافی عبور نہ ہو تنقید کے میدان میں جولانی دکھانے کا نتیجہ منہ کی کھانے کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔

مقالاتِ زرّیں

دُھول بے اطمینانی کا جاسوس ہے۔

انسان کے قاتل کو سُولی نہ دو، بلکہ احسان کے قاتل کو

عالمِ شباب میں موت آنا، کہانی شروع ہوئی تھی کہ نیند آگئی۔

دل قدرت کا بہترین لطیفہ ہے۔

ہیدستی اپنی ہی دستکاری ہے

شاعری عظمتوں کا ایک لبریز خزانہ ہے۔

شعر میرا اکل و شرب ہے

حرص کے پہیئے نے گھوم کر ایک عالم کو گھما دیا

اپنے سے سچا ہو جا، دوسروں سے خود بخود سچا ہو جائے گا

خوبصورت چہرے، خوش تقریری اور موسیقی کے مدرسے ہیں

معلوم ہوتا ہے شاید میں نیچر میں گم ہو گیا ہوں۔

خوشامد کے بظاہر نرم لہجے میں لعنت کی تلوار چھپی ہوئی ہے۔

بے سروسامانی میری محافظ ہے

خوشی کے لمحے پردار اور غم کی گھڑیاں لنگڑی ہوتی ہیں۔

حقیقی عظمت وہیں ہے جہاں حقیقی سچائی ہے۔

حال کے آئینے میں مستقبل کا عکس پڑ رہا ہے۔

اُن سے کانپ جو صرف ہونٹوں سے تیرے دوست ہیں۔

دولت بہت سے ذائقے خراب کر چکی ہے، کہیں چکھ نہ لینا

موت، پیدائش کی تکمیل ہے۔

وہی خوب زندگی گزارتا ہے جو خوب محبت کرتا ہے۔

تند خو بیوی تمام مصائب کی انتہا ہے۔

شرافت نسل میں نہیں ہوتی، بلکہ عمدہ عادات میں۔

نرم بستر جسم کو تو ضرور آرام پہنچاتا ہے مگر دل کو سخت کر دیتا ہے۔

"عظمت" "فلاح" یہ راستے نہیں، بلکہ منزلوں کے نام ہیں۔

جب ایک آدم، ایک حوا تو یہ لحاظ نسل، شریف و رذیل کتنے مہمل الفاظ ہیں۔

بحث کرتے ہوئے معشوق کا مسکرا دینا کس قدر شیریں استدلال ہے،

دزدیدہ نگاہی۔ دل چرا لینے کا کس قدر پیارا آلہ ہے،

اے حُسن ہر تفریح کی روشنی تیرا انتظار کر رہی ہے۔

بعض صورتیں ایسی ہیں جن کی طرف دیکھنے کے معنی ہیں "مر جانا"

ایمانداری فطرت کی سب سے بڑی شریفانہ ایجاد ہے۔

مومن ہمیشہ بشاش رہتا ہے

ارمان جس قدر زائد ہوتے ہیں اُتنے ہی کم وقت میں موت آجاتی ہے،

کام یوں کرو کہ ہر دن کو اپنا آخری دن سمجھو۔

ضمیر، اخلاق و عادات کی نبض ہے۔

بُزدل سب سے پہلے اُس سے ملتا ہے جس سے ڈرتا ہے۔

خودکشی بزدلی کا اعلیٰ ترین نمونہ ہے۔

دوزخ کے اندر کوئی شعلہ اس قدر تیز نہیں جیسے عورت کی نفرت

شعرا اور عشاق کبھی تجارت نہیں کرسکتے۔

کمزور دلوں میں محبت آشیانہ نہیں بناتی

شاید "حباب" موجوں کی اُمیدیں ہیں۔

کلاک ٹاور کی چڑیا نہ بنو کہ ہر جھونکا گھما دے۔

زندگی حیرتوں کا ایک سلسلہ ہے۔

(ماخوذ "مقالاتِ زرّیں" مصنفہ جوش ملیح آبادی)

قومی غیرت (فرانسیسی افسانہ)

از موپساں

جنگ عظیم ختم ہو چکی تھی۔ جرمن پورے فرانس پر چھا گیا تھا، اور فرانسیسی زمین اس نیم مردے کے مانند سانس لے رہی تھی، جو اپنے فاتح کے زانو کے نیچے تڑپ رہا ہو!

گرسنہ، خوفزدہ، برباد شدہ پیرس سے سرحدوں اور درمیانی شہروں کی جانب پہلی ٹرین پھر روانہ ہو گئی تھی۔ دورانِ سفر میں مسافروں کو چاروں طرف جلے جھلسے دیہات اور ٹوٹے پھوٹے مکانات دکھائی دیتے تھے۔ انہی برباد شدہ مکانوں کے سامنے جرمن سپاہی پڑاؤ ڈالے پڑے تھے اور ٹرین کی رفتار میں کبھی کبھی ان افسروں کی تحکمانہ آواز بھی کان میں پڑ جاتی تھی جو اپنے ماتحتوں کو حکم دیتے نظر آتے تھے۔

مسٹر ڈولس، جو قومی سفارت خانہ کا انچارج رہ چکا تھا، اب اپنے بیوی بچوں سے ملنے کے لئے سوئٹزر لینڈ جا رہا تھا، جہاں بخیالِ حفاظت جنگ شروع ہونے سے قبل ہی اُس نے اُنھیں بھیج دیا تھا۔

قحط اور ذہنی تکلیف کا اس موٹے تازے مالدار تاجر کے جسم پر کوئی اثر نہ تھا۔ اُس کی زندگی دورانِ جنگ میں بہت دشوار گزار تھی، کسی طرف چین نہ ملتا تھا، آج یہاں ہے کل وہاں! انہی پریشانیوں اور جنگ کے شعلوں کے درمیان اُسے اپنے بیوی بچے بہت یاد آتے۔ اُسے جنگ سے قطعی نفرت تھی۔ ایک پُرامن، نرم مزاج تاجر تھا۔ ام۔ ڈولس! اور اب جب کہ جنگ قریب الختم تھی، وہ زندگی میں پہلی بار جرمن افواج کے منتشر سپاہیوں کو دیکھ رہا تھا جو فرانس کے آتش زدہ دیہاتوں پر چھائے ہوئے تھے۔

اس نے دبے ہوئے غصے سے ان سُرخ ریش سپاہیوں کو دیکھا جو فرانس کی زمین پر اس طرح گھوم رہے تھے گویا انہی کی ملکیت تھی۔ اس نے اپنی روح میں ایک عجیب سی محسوس کی، جب وطن کا جذبہ اپنی پوری قوت کے ساتھ اُس کے دل میں چٹکیاں لے رہا تھا، اور یہ اس کے لئے ایک بالکل نئی چیز تھی، اس سے قبل اُسے اس جذبہ کا احساس نہیں ہوا تھا، وہ سر سے پیر تک سُرخ ہو گیا، اس کی نگاہیں اس صید کے مانند چمکنے لگیں جو اپنے شکاری کے بس سے چھوٹ نکلنے کی کوشش کر رہا ہو۔

اس کے ڈبہ میں دو انگریز بھی بیٹھے ہوئے سگرٹ پی رہے تھے۔ اُن کی نگاہیں شوق سے جھانک رہی تھیں اور وہ ہر نئے اسٹیشن پر اپنی گائڈ بک کھول کر دیکھتے آیا، اُن کے خیالات کہاں تک صحیح تھے۔

ایک چھوٹے شہر کے اسٹیشن پر گاڑی رُکی۔ ایک جرمن اچھل کر ڈبہ میں داخل ہوا۔ اُس کی تلوار اس کے پہلو میں لٹک رہی تھی۔ اُس کی فوجی وردی کے بٹن کسے ہوئے تھے۔ اُس کی سُرخ ڈاڑھی نے چہرہ کو بھیانک کر دیا تھا اور اُس کی طویل مونچھیں ہونٹوں کے دونوں جانب بہت دور تک نظر آ رہی تھیں۔

دونوں انگریز اُسے گھور گھور دیکھنے لگے، اور ڈولس نے ایک اخبار پڑھنے کا بہانہ کرتے ہوئے اپنا منہ چھپا لیا۔ وہ کسی قدر خوفزدہ ہو چکا تھا، وہ ایک کونے میں دبک گیا، اُس چور کے مانند جس کے قریب کوئی پولس کا آدمی آ گیا۔

ٹرین چلی، دونوں انگریز آپس میں گفتگو کرتے رہے۔ یکایک، جبکہ ایک انگریز ایک مسمار شدہ گاؤں کی جانب اپنی انگلی سے اشارہ کر رہا تھا، جرمن سپاہی ٹوٹی پھوٹی فرانسیسی میں بولا۔

"میں نے اس گاؤں میں بارہ فرانسیسیوں کو مارا ہے اور سو سے زیادہ

قیدی بنائے ہیں!"

دونوں انگریز جو ہر بات کو واضح طور پر جاننا چاہتے تھے، بولے۔

"اور اس گاؤں کا نام کیا ہے ——— ؟"

"فارس برگ!" جرمن نے جواب دیا ——— "میں نے ان کمینے فرانسیسیوں کو ناکوں چنے چبوا دئے ہیں ———" اور مسٹر ڈولس کی طرف دیکھتے ہوئے اُس نے ایک طویل قہقہہ لگایا۔ ٹرین تیزی سے چلی جارہی تھی۔ ہر طرف دشمن کے سپاہی فرانس کی زمین پر نظر آرہے تھے۔ سڑکوں پر، کھیتوں میں، تالابوں کے کنارے، درختوں کی ڈالیوں پر ——— !

جرمن نے اپنا ہاتھ ہلا کر کہا۔

"اگر مجھے چارج دلا دیا جائے تو میں ایک کو زندہ نہ چھوڑوں، سارے فرانس میں آگ لگا دوں کمبخت کو ——— !"

"ار ——— ر ———" دونوں انگریزوں کے منہ سے نکلا۔

"بیس برس میں ———" جرمن نے اپنی تقریر جاری رکھی ——— "بیس برس میں پورا یورپ ہمارا ہو جائے گا۔ ہم اسے اپنے آگے جھکنے پر مجبور کر دیں گے، جرمن ساری دنیا میں سب سے بڑی قوت ہے!"

انگریزوں نے اس کی بات کا جواب نہیں دیا، اُن کے چہروں پر جرمن سپاہی کی جانب سے نفرت کی جھلک آگئی تھی۔

جرمن نے ہنسنا شروع کیا ——— وہ ہنستا رہا اور پر غرور لہجہ میں اپنے کارنامے بیان کرتا رہا مضحکہ اُڑاتا رہا کمزور فرانس کی کمزور فوجوں کا، آسٹریا کی غیر متوقع لگاتار شکست کا۔ ان قیدیوں کا جو جنگ میں گرفتار ہوئے تھے، اور ان بدنصیب مقتولوں کا جنھیں جرمن سپاہیوں نے وحشیانہ بے رحمی کے ساتھ قتل کیا تھا ——— یکایک اُس نے اپنا بھاری پاؤں ڈولس کے گھٹنوں پر رکھدیا۔ مسٹر ڈولس کا چہرہ اس ذلت پر خون کے مانند سرخ ہو گیا مگر وہ مجبور تھا اور بے بس!

دونوں انگریز اس طرح خاموش تھے گویا اس دنیا میں اُن کے لئے کوئی دلچسپی باقی نہ تھی، انھوں نے جرمن سپاہی کی یہ بدتمیزی دیکھی اور بے پروائی سے اپنا منہ پھیر لیا۔

جرمن نے اپنا لمبا پائپ نکالا، اور مسٹر ڈولس کو سخت نگاہوں سے دیکھتے ہوئے بولا۔ "کیا تمہارے پاس پائپ کی تنباکو ہے ؟"

مسٹر ڈولس نے جواب دیا

"نہیں جناب!"

جرمن کی نگاہیں اندرونی شرارت سے چمکنے لگیں؛

"تو میں چاہتا ہوں کہ ———" جرمن نے کہا ——— "کہ جب آئندہ اسٹیشن پر گاڑی رُکے تو آپ میرے لئے تھوڑی سی تنباکو خرید لائیں۔ میں آپ کو بھی کچھ دیدوں گا۔"

گاڑی نے سیٹی دی، ایک تباہ شدہ گاؤں کے درمیان سے گزری اور پھر ایک اسٹیشن پر ٹھہر گئی۔

جرمن نے بے بس فرانسیسی ڈولس کو شانوں سے ہلاتے ہوئے کہا۔

"جاؤ اور جو میں نے کہا ہے وہ کرو، جاؤ جلدی جاؤ!" اور یہ کہتے ہوئے اُس نے فرانسیسی کا گلا پکڑ کر اسٹیشن پر دھکیل دیا ——— بدحواس ڈولس اپنی چوٹ کا خیال نہ کر کے دوڑا اور ایک دوسرے ڈبہ میں گھس گیا، اُسے ڈر تھا کہ شاید اُسے دوسری ٹرین نہ مل سکے ——— گاڑی نے سیٹی دی اور چل پڑی۔

ڈولس ڈبہ میں بالکل تنہا تھا۔ اُس نے پیشانی سے پسینہ پونچھا اور ویسٹ کوٹ کے بٹن تمام کھول دئے۔ کیونکہ اس کا دل بُری طرح دھڑک رہا تھا اور سانس پھول رہی تھی ——— گاڑی پھر ایک اسٹیشن پر رُکی، اور شریر جرمن ڈولس کے ڈبہ میں داخل ہوا۔ اس کے بعد فوراً ہی دونوں انگریز بھی، اُنھیں خوف تھا کہ ممکن ہے یہ بدمعاش جرمن غریب فرانسیسی کے ساتھ کوئی بُرا سلوک کرے۔

جرمن مسٹر ڈولس کے سامنے بیٹھ گیا اور طنز آمیز ہنسی ہنستے ہوئے بولا۔ "تو کیا تم مجھے تنباکو لا کر نہیں دو گے ——— ؟"

"نہیں جناب ———!" ڈولس نے جواب دیا۔ گاڑی پھر چلنے لگی تھی۔

"اچھی بات ہے ———" جرمن بولا ——— "میں تمہاری مونچھوں کے بالوں سے اپنا پائپ بھروں گا!"

اور جرمن نے اپنا بھاری ہاتھ غریب ڈولس کے چہرہ کی طرف بڑھایا

دونوں انگریز پھٹی پھٹی نگاہوں سے آنے والے حادثہ کا انتظار کرنے لگے۔

جرمن اپنی چٹکی میں فرانسیسی کی مونچھوں کے چند بال لے چکا تھا کہ ڈولس

ایک وحشی کتے کے مانند اُس پر پل پڑا۔ جرمن اس اچانک حملہ کے لئے تیار نہ تھا اس نے سنبھلنے کی کوشش کی مگر ڈولس کے دیو قامت جسم کا وزن نہ سنبھل سکا اور سیٹ کے نیچے آرہا۔ ایک پاگل کے مانند ڈولس نے اس کا گلا دبانا شروع کیا اور اس کے چہرے پر گھونسوں کی بارش کردی۔ اُس وقت اُسے اپنی جان کا خیال نہ تھا۔ غصے اور قومی ذلت نے اُسے خوفناک بنا دیا تھا، اُس کے گلے کی رگیں ابھر آئی تھیں، اس کا چہرہ سرخ اور اُس کی آنکھوں سے خون برس رہا تھا۔ وہ ایک ہاتھ سے جرمن کا گلا پکڑے تھا اور دوسرے سے گھونسے مار رہا تھا، اُسے ہوش نہ تھا کہ اُس کے بھاری پنجہ کی ضربیں کہاں پڑ رہی ہیں اور کتنی خوفناک ہیں۔ جرمن نے اُس کے وزنی جسم کے نیچے سے نکلنے کی کوشش کی، تاکہ اپنی قرولی پر ہاتھ ڈال سکے مگر فرانسیسی کا وزن کسی طرح تین من سے کم نہ تھا اور بے بس جرمن کے لئے اس سے نجات پانا قریب قریب ناممکن تھا۔

ڈولس اپنی پوری قوت سے اُسے دبائے رہا اور گھونسے مارتا رہا، بے تحاشا، بغیر ہاتھ روکے ہوئے، بغیر سانس لئے ہوئے، بغیر یہ سمجھے ہوئے کہ اُس کے بے رحم گھونسے کہاں پڑ رہے ہیں، خون جاری ہوگیا، جرمن کا ایک دانت ٹوٹ گیا تھا اور کانوں کی رگیں پھٹ گئی تھیں، اس نے ایک بار پھر اُبھرنے کی کوشش کی مگر بے سود، فرانسیسی کے ہاتھ اس مشین کے مانند حرکت کر رہے تھے جو کسی غیبی قوت کے ماتحت اپنا کام انجام دے رہی ہو۔

دونوں انگریز اپنی اپنی جگہ چھوڑ کر کھڑے ہوگئے تھے تاکہ اس دلچسپ منظر سے اچھی طرح محظوظ ہوں، یکایک ڈولس اپنے دشمن کے سینے پر سے اُٹھ کھڑا ہوا اور ایک کونہ میں بیٹھ گیا۔ وہ خاموش تھا، اُس کی سانس پھول رہی تھی، وہ اس جنگ میں تھک گیا تھا۔

جرمن بدحواس ہوچکا تھا اور اب اس میں اتنی ہمت نہ تھی جو فرانسیسی پر جھپٹ سکے، تاہم اُس نے خود کو سنبھالتے ہوئے کہا

اگر تم نے ڈویل (جنگ مساوی) میں میرا اطمینان نہ کردیا تو میں تمہیں مار ڈالوں گا۔

"جب تم چاہو۔" زندگی سے بیزار فرانسیسی نے جواب دیا ——— مجھے اس سے زیادہ کی تمنا نہیں!"

آئندہ اسٹیشن اسٹراسبرگ ہے!" جرمن نے کہا ——— اور میں وہاں کسی دو جرمن افسروں کو اپنا گواہ بنالوں گا، اور دوبارہ گاڑی چھوٹنے سے قبل ہمارے مقابلہ کا فیصلہ ہوجائے گا!"

مسٹر ڈولس جس کی سانس کی رفتار کسی طرح انجن کی رفتار سے کم نہ تھی دونوں انگریزوں کو مخاطب کرتے ہوئے بولا۔

"کیا آپ میرے گواہ بن جائیں گے؟"

اور دونوں نے بیک وقت کہا۔

"یقیناً ———!" گاڑی اسٹیشن پر پہونچ چکی تھی۔

اسٹیشن پر گھومنے والے فوجی افسروں میں سے جرمن نے اپنی گواہی کے لئے دو کو منتخب کرلیا۔ فرانسیسی اور جرمن دونوں آمنے سامنے کھڑے ہوگئے، ایک افسر نے دونوں کے ہاتھ میں ایک ایک پستول دیدیا، فرانسیسی نے اپنی زندگی میں کبھی کسی پستول کو ہاتھ نہیں لگایا تھا، مگر اس وقت اُسے اپنی زندگی کی پروا نہ تھی۔ اس نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے پستول پکڑ لیا ——— دونوں کے درمیان بیس قدم کا فاصلہ کردیا گیا ———

ایک انگریز نے فرانسیسی سے پوچھا۔

"کیا تم تیار ہو ———؟"

"ہاں جناب!" فرانسیسی نے جواب دیا۔ دونوں طرف کے گواہوں کی نظریں اپنی اپنی گھڑیوں پر تھیں کہ یکبارگی سب چلائے۔

"فائر ———!"

اور ڈولس نے نشانہ لئے بغیر پستول کی لبلبی پر ہاتھ رکھدیا، گولی چلی، جرمن کا ہاتھ بھی اُٹھا، مگر فائر کرنے سے پہلے ہی آہستہ آہستہ جُھک گیا۔ اُس کے جسم کو جنبش ہوئی اور زمین پر آرہا ——— ڈولس کے اناڑی ہاتھوں نے جرمن فوج کے ایک افسر کا خاتمہ کردیا تھا!

دونوں انگریزوں کے منہ سے نکلا۔

"ہررے!"

گارڈ نے سیٹی دی، دونوں انگریز دوڑ کر اپنے ڈبہ میں بیٹھ گئے، ڈولس بھی کسی قدر مطمئن مگر پریشان صورت ایک کونہ میں بیٹھ گیا۔

"ہم آپ کی فتح پر مبارکباد دیتے ہیں!" دونوں نے کہا مگر اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ ایک گہری سانس لی اور خاموش ہوگیا! ———

ترجمۂ سالک لکھنوی

جنگِ عظیم میں فرانس کے مذاکرات

عمر عباسی

یہ مسلّمہ ہے کہ انسان فطرتاً تمام قیود سے آزاد ہے، اس کا ایک ہی فعل اگر ایک دائرہ میں نیکی ہے تو دوسرے میں بدی، ایک ہی عمل اگر ایک کے لئے اصلاح ہے تو دوسرے کے لئے افساد، غرضکہ اس کا ظاہر و باطن یکساں نہیں ہوتا، اس کا یہ راز ہے کہ وہ دوسرے انسانوں کے آزادانہ اعمال و افعال کی سراغ رسانی کرکے اُن کے اختیارِ عمل کو سلب کرلے۔ فی الحقیقت یہ انسان کے فطری حق خود مختاری و آزادی میں ایک طرح کی مداخلت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اخلاق نے جاسوسی کو نہایت ہی مذموم فعل قرار دیا ہے، لیکن اگر سراغ رسانی ایک طرف بدترین عیب ہے تو دوسری طرف یہ ایک بہترین فضیلت ہے، جس پر انسانی دماغ کی بلندی و پستی کا تمام تر انحصار ہے۔

دنیا کی قدیم سے قدیم تاریخوں میں بھی جاسوسی کا پتہ چلتا ہے کہ سراغ رساں کس طرح بھیس تبدیل کرکرکے دشمن کی آنکھوں میں خاک ڈال کر اپنی تمام مطلوبہ معلومات حاصل کرلیتے تھے، اگر جنگِ عظیم میں (جرمنی) المانیہ کے سامان حربیہ میں کسی اسلحہ کا نام لیا گیا ہے تو وہ فرانس کی سب سے بڑی توپ تھی، جس کا قطرہ ۷، ملی میٹر تھا۔ ۱۸۶۹ء میں حکومتِ فرانس کو جرمنی کے ایک جنگی ایجاد کی خبر ملی، چنانچہ نظارات جنگ نے اس کی بڑھتی ہوئی طاقت کو رام کرنے کے لئے گفت و شنید شروع کردی تاکہ وہ اپنی لم تاک نہ پہنچ سکے، الغرض انگلستان کا ایک فوجی افسر "میجر اسٹورٹ" جو سراغ رسانی کی قابلیتوں کی وجہ سے بہت ہی مشہور تھا، اس خفیہ تحقیقات کا کام اس کے سپرد کیا گیا۔ یہ جرمن زبان پر بڑی قدرت رکھتا تھا، اور نہایت ہی فصاحت کے ساتھ بولتا تھا، اس کے علاوہ توپ سازی اور آلاتِ حربیہ کے جدید و قدیم ایجادات میں بڑا ملکہ رکھتا تھا، اس کی نسبی حالات کا صرف اس قدر پتہ چلتا ہے کہ اس کا باپ ایک انگریز اور ماں ایک فرانسیسی عورت تھی۔

یہ حقیقت ہے کہ ہر کام کے لئے تحریک جذبات کی شدید ضرورت ہوتی ہے، چونکہ میجر مذکور کی رگوں میں فرانسیسی خون شامل تھا، اس لئے وہ اس کی قومی خدمات کے لئے بھی اپنا خون پیش کرسکتا تھا، خود حکومت فرانس کو بھی اس پر حق تھا۔

وہ مشرقی افریقہ کے تمام حصوں کو دیکھ چکا تھا، اس لئے یہاں کے وہ تمام رازوں سے بخوبی واقف تھا۔ کچھ عرصہ تک وہ شہر ونار میں ہیرے کے کانوں کی تحقیق کے عہدہ پر مامور رہا۔

اس سلسلہ میں جرمن اور فرانس کے امراء اس سے مراسلت بھی کرتے تھے، چونکہ اس کو قیمتی پتھروں کی شناخت میں ایک خاص ملکہ حاصل تھا، اس لئے وہ دور دور سے مدعو کیا جاتا تھا۔ خود اُس نے بہت سے پتھر دریافت کئے، ایک بار وہ سیر و سیاحت کے سلسلہ میں فرانس گیا ہوا تھا، حکومتِ فرانس کو اس کا علم ہوا چنانچہ اس نے میجر مذکور کو طلب کیا، اور یہ کام اُس کے سپرد کیا۔ میجر اسٹورٹ ضروریات کار سے فارغ ہونے کے بعد جرمن کے روسا کے نام تعریفی خطوط حاصل کرکے

برلن روانہ ہوا۔ وہاں اس نے ایک نہایت ہی عالی شان ہوٹل میں قیام کیا اور دیرینہ تعلقات اور تقریبی خطوط کے ذریعہ سے سوسائیٹیوں میں رسائی حاصل کرنا شروع کی۔ چونکہ اس کا اصلی مقصد جرمنی کے مشہور کارخانہ توپ سازی کرپ سے وابستہ تھا اس لئے اس کے لئے صرف دو ہی راستے تھے، یا تو وہ یہاں کے ملازمین سے اس راز کو دریافت کرتا اور یا فوجی افسروں سے مل کر بھید معلوم کرتا۔ چنانچہ اس نے ابتدا میں ان دونوں جماعتوں سے احتراز کیا، تاکہ اشتباہ نہ ہوسکے، پہلے اس نے رؤسا کی صحبتوں میں آمد و رفت شروع کی، پھر عام مجمعوں میں شرکت کرنے لگا۔ وہ ایک بے فکر دولت مند اور عیش پرست انسان کی طرح حیلہ سازیوں کے پردے میں اپنے مقصود کی جانب تیزی سے قدم اٹھا رہا تھا۔ وہ تھیٹروں میں شرکت کرتا۔ رقص و سرود کی محفلوں میں بے دریغ روپیہ اڑاتا اور قمار خانوں میں بڑے سے بڑے داؤں لگاتا تھا، رفتہ رفتہ وہ دوستوں میں اس قدر مقبول ہو گیا تھا کہ بلا اس کے مشورہ کے کوئی کام ہی نہ ہوتا تھا، چنانچہ وہ اکثر یہ کہا کرتا تھا کہ محترم دوستو! مجھے صبح کے بستر کی چار اور شب کے لذیذ کھانے سے محروم کردو۔ مگر خدا کے لئے ان محبوب پتوں کو میری نظر سے اوجھل نہ کرو۔ ان کے لئے ہارنا بھی میرے لئے بہشت کے لطف سے کم نہیں ہے۔" کچھ عرصہ کے بعد اس کی اس امیرانہ زندگی کا چرچا دور دور ہونے لگا۔ اس دوران میں اُسے بہت سے فوجی افسروں اور فوجی کارخانوں کے متعلقین و ملازمین سے ملنے کا اتفاق ہوا۔ وہ بلا ناغہ کھیلنے آتا، اور جب کھیل ختم ہوجاتا تو اپنے دوستوں کو ہوٹل لیجاتا، اور حاتمانہ فیاضی کے ساتھ قیمتی سے قیمتی شرابیں پلاتا، اگر وہ اس پر تیار نہ ہوتے تو گریہ و زاری کرتا، غرضکہ وہ ان کو کسی نہ کسی طریقہ سے رام کر لیتا۔ وہ جس وقت جوش میں آتا تو ان کو بہترین افسانے سناتا۔ اگر کبھی مشرقی افریقہ کی سرگذشت سناتا تو کبھی جنوبی افریقہ کی محفلوں کے نقشے کھینچ کر ان کے دلوں کو گرماتا، کبھی کبھی وہ کارلو کے مشہور عالم قمار خانہ کے واقعات بھی سناتا، خود فوجی افسر اس درجہ قمار باز و عیش پرست تھے کہ وہ اس کی دل و جان سے پرستش کرتے تھے۔ ان کے لئے ایسے اجنبی مسافر کی صحبت جو اپنی دولت کے خزانوں کو ان پر بے دریغ لٹا رہا تھا، ایک نعمت غیر مترقبہ تھی، وہ اپنی قسمت پر ناز کرتے تھے کہ بے طلب ہی انھیں ایک ایسی صحبت مل گئی جو ان کے فہم و گمان میں بھی نہ تھی، اس طرح یہ سحر طراز جادوگر اپنی فیاضی و بخشش کا دام پھیلاتا جارہا تھا، دنیا اُسے کروڑپتی خیال کرتی تھی رفتہ رفتہ اس نے ان افسروں کے اندرونی حالات معلوم کرلئے۔ وہ جانتا تھا کہ فقرو افلاس نے اُن کو بے زر و مال کردیا ہے، اور اب وہ وقت دور نہیں کہ گوہر مراد ہاتھ آجائے۔

ان میں چند ایسے بھی تھے جو قمار بازی کو علمی اصول پر منطبق کرنے کے خبط میں مبتلا تھے۔ ان کا عقیدہ تھا کہ ایسے علمی اصول دریافت ہوسکتے ہیں کہ انسان کبھی ہار نہ سکے۔ لیکن اس علمی ماتم میں سب شریک تھے کہ "افسوس سائنس نے سب کچھ کیا لیکن اب تک جوئے کے لئے کوئی صحیح علم دریافت نہ کیا!" وہ بالاتفاق کہہ اٹھتے کہ "مستقبل کے علمی عہد کا سب سے بڑا حکیم وہی ہوگا جو جوئے کو ایک باقاعدہ فن بنادے" اس طرح میجر اسٹورٹ نے ان کی تمام داخلی کمزوریاں معلوم کرلیں۔ اب اُس نے نفوذ و اثر کی عمارت کو زیادہ استحکام دیا۔ اور ایسے افسانے سنانا شروع کئے کہ جن کے ذریعے سے انسانوں پر علم اسرار کے راز منکشف ہوجاتے تھے اور وہ سربستہ بھیدوں کو معلوم کرلیتے تھے اس وقت ان سے کوئی بھی بازی نہ لیجا سکتا تھا۔ ایک بار رقص و سرود کی محفل گرم تھی اس نے رجحانات کو مانوس دیکھتے ہوئے ایک واقعہ سنایا کہ ایک مرتبہ کارلو کے قمار خانہ میں ایک اجنبی سیاح آیا تھا، جسے واقعتاً کچھ ایسے نکات معلوم تھے کہ جب وہ بازی لگاتا تو زر و سیم کے ڈھیر گھسیٹ لیتا، دوسرے منہ تکتے کے تکتے رہ جاتے، کہیں کہیں وہ اپنی بھی مہارت کے افسانے سنا دیتا تھا۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ انکساری کرتا جاتا تھا، وہ کہتا کہ بھئی "اس میدان میں کون دعویٰ کرسکتا ہے تاہم مہارت بھی ایک علمی حقیقت ہے اور اس سے میں خود انکار نہیں کرسکتا"۔ اسٹورٹ بخوبی واقف تھا کہ قمار بازی نے انھیں بالکل مفلس کردیا ہے، اس لئے اس نے اسی پر زیادہ نظر رکھی، اور ان کی اخلاقی کمزوریوں کو اپنے مقاصد کے حصول کا ذریعہ بنایا، اس کے دوستوں میں جنگ زولو کا ایک نامور افسر بھی تھا، جو اس کا بڑا مداح تھا۔ اب اس نے آہستہ آہستہ تنہا مخلصانہ ملاقاتیں کرنا شروع کیں۔ وہ انھیں یقین دلاتا کہ میرا وجود صرف تمہارے ہی لئے ہے۔ تم یہ سوچتے ہوگے کہ میں کس قدر بے طرح روپیہ اڑاتا ہوں۔ لیکن تم نے یہ کبھی غور نہ کیا کہ جو چیز مفت و بے طرح حاصل ہوسکتی ہے، وہ بے طرح لٹائی بھی جاسکتی ہے۔ میری تمام دولت صرف مہارت قمار کا نتیجہ ہے۔ میں نے چند نکتے حاصل کرلئے ہیں، جن پر میرے تمام کھیل کا انحصار ہے، یہی وجہ ہے کہ دولت میرے پیروں پر نثار ہے۔ اگر تم چاہو تو ان کے چند گر بتلا دوں۔ لیکن ایک شرط ہے کہ اسکو اپنے ہی تک رکھو، میں سمجھتا ہوں

کہ تمہارے پاس دولت نہیں، اگر دولت حاصل کرنا ہے تو یہ چند نکتے حاصل کرو، اُن کے پاس اس جادو کا کوئی علاج ہی نہ تھا، اب کیا تھا یاس و حرماں کی جگہ انبساط و سرور پیدا ہو گیا، لیکن اسٹورٹ اب تک یہ نہ جانتا تھا کہ کون اس کے لئے مفید ثابت ہوگا، اسی لئے وہ ہر ایک فوجی افسر سے تعلقات رکھتا تھا، اس اثنا میں ایک عجیب واقعہ پیش آیا، دونوں وقت مل رہے تھے، اسٹورٹ اپنے ایک دوست کے ساتھ سحر طراز گفتگو میں مصروف تھا، شراب کے دور چل رہے تھے، دونوں مست و سرشار تھے کہ معاً اُس نے کہا کہ دوست دنیا میں کوئی کسی کا ساتھی نہیں۔ لیکن آج تم مجھے ایک ایسے ہمدم مل گئے ہو کہ جس کی مجھے مدت سے تلاش تھی، کیا بتلاؤں، یقین جانو کہ اب بھی افریقہ میں بہت سی ایسی خفیہ کانیں ہیں کہ جن کا کسی کو علم نہیں، ہم دونوں ایک کمپنی کھولیں، اور اس کے لئے فرانس و جرمنی سے معاملات کریں، یہ سنکر فوجی افسر بیتاب ہو گیا اور کہنے لگا کہ دوست بہت ہی عمدہ خیال ہے، لیکن دوست تمہاری کمپنی قائم نہ ہو سکے گی، اس لئے کہ جب ہماری حکومت کی جدید توپیں تیار ہو جائیں گی تو جنگ چھڑ جائے گی، اس لئے یہ خیال ابھی ملتوی کردو۔ دوست، صرف تمہاری محبت مجبور کرتی ہے کہ میں تمہیں سرکاری راز بتلا دوں۔ اگر تم نے یہ کمپنی قائم کردی تو جرمنی کے سرمایہ دار قطعاً حصہ نہ لیں گے۔ اسٹورٹ نے جواب دیا کہ ہم تو جنگ کے خواب ہی دیکھتے ہیں یہ سب کذب و ریا ہے کہ فلاں نے ایسی توپ تیار کی۔ اور فلاں نے اتنے طیارے بنائے، یہ سب عبث ہے۔ افسر نے جواب دیا دوست تم اپنی آنکھوں سے خود ہی دیکھ لوگے، جس وقت کرُپ کا کارخانہ اپنی محیر العقول توپ تیار کرلے گا تو یورپ کا تمام نقشۂ جنگ درہم برہم ہو جائے گا، اسٹورٹ نے جواب دیا کہ بھئی نہ جانے تم کیا باتیں کرتے ہو، افسر نے یقین دلاتے ہوئے کہا کہ دوست یہ تو کوئی بھی نہیں بتلا سکتا کہ کیا ہوگا۔ لیکن اس کارخانے کا ایک انجینیر میرا بہت بڑا دوست ہے، اس نے یہ راز بتلایا تھا،

اسٹورٹ نے پھر کہا کہ دوست تو پھر آخر کیا ہوگا۔ افسر نے جواب دیا کہ دوست اب (المانیہ) جرمنی کو اپنی قدرتی سیاست کی زیادہ ضرورت نہیں ہے، تمام سامان مکمل ہو گیا ہے۔ برلن میں عنقریب فوجیں جنگ کا ترانہ گانے والی ہیں، اب کیا تھا، اسٹورٹ کو یہ کامل یقین ہو گیا کہ فوجی افسر کا یہ بیان جرمنی کے اس پروگرام کی طرف اشارہ ہے کہ جو فروری ۱۸۹۸ء میں حملۂ فرانس کے لئے تجویز کیا گیا تھا، کچھ عرصہ کے بعد اسٹورٹ نے دوستوں کو اپنی بہن کا ایک تار دکھلایا کہ اس کی حالت بہت سقیم ہے۔ وہ کسی طرح ٹھہر نہیں سکتا، اُسے لندن جانا ضروری ہے، اس لئے اسٹورٹ ۱۵ دسمبر کو روانہ ہو گیا، اور سیدھا پیرس پہنچا، وہاں ۱۹ دسمبر کو جنرل بلو اور وزیر نظارات جنگ سے سارا ماجرا سنایا، چنانچہ جرمنی کو معلوم ہو گیا کہ فرانس جنگی تیاریوں کے لئے کیا تجدید و ترقی کر رہا ہے۔

سچ ہے کہ جب تک انسان کا علم اور کائنات فطرت کا مشاہدہ وسیع نہ ہوگا
اور ایک خاص سطح بلند تک نہ پہنچے گا، اس کی کبھی تکمیل نہیں ہو سکتی!!

چھانی ہر چند اک خدائی ہم نے
کیا کیا نہ یہاں خاک اڑائی ہم نے
واللہ کہ خشکی و تری میں کوئی شے
انساں سے عجیب تر نہ پائی ہم نے

[illegible]

نسلِ آدم میں کوئی معصوم نہیں
احساس کسی قلب میں معدوم نہیں
اس فیضِ ازل سے جس کو کہتے ہیں گناہ
صد شکر کہ اک فرد بھی محروم نہیں

[illegible]

حضرتِ جن

ایچ، ایچ، امام اکبر آبادی

معزز سامعین!

۱۰ جون ۱۹۳۷ء کو، اُس وقت جبکہ میں بمبئی کے سفر کی تیاری میں مصروف تھا، میرے عزیز دوست کیپٹن این احمد ڈسٹرکٹ میڈیکل اوفیسر کا مجھے ایک ارجنٹ تار ملا، جس کا مضمون یہ تھا۔

"فوراً دھن باد جاؤ، نصیر بیگم کے پاس ڈاکوؤں کے پرچے آرہے ہیں کہ تمہارے بنگلہ پر ڈاکہ پڑے گا"

(کیپٹن احمد، مراد آباد)

چونکہ تار میں ڈاکے کا مضمون تھا، اس لئے احتیاطاً مجھے چند آدمی ہمراہ لے کر آگرے سے دھن باد، جو کلکتے کے راستے میں ہے، جانا پڑا، میں طوفان سیل سے مع اپنے ہمراہیوں کے دو بجے دن کے دھن باد پہونچا۔ معلوم ہوا کہ کیپٹن این احمد دورے کے سلسلے میں مراد آباد گئے ہوئے ہیں، میں ابھی بیٹھا ہی تھا کہ چند لمحوں کے بعد ایک پرچہ لکھا ہوا، کیپٹن صاحب کا بچہ اُٹھا کر لایا، اور مجھے دیا۔ اِس پرچے کا مضمون یہ تھا کہ

"اچھا تم لوگ آگئے؟ آج رات کو تمہیں قتل کیا جائے گا"

میں نے پرچہ پڑھکر ایک قہقہہ لگایا، اور نصیر بیگم کو مخاطب کرکے کہا کہ یہ ڈاکو بڑے دلیر ہیں کہ ہمیں آگاہ کرکے قتل کرنا چاہتے ہیں، مگر ان کو نہیں معلوم کہ ہم اِن سے ڈرنے والے نہیں ہیں۔

پہلی شب:۔ رات کی خوفناک تاریکی، موسلا دھار بارش، بجلی کی کڑک اور بادل کی گرج، اپنے پورے غصہ و جلال کے ساتھ سرزمینِ دھن باد کے رہنے بسنے والوں کو تباہ کردینے پر آمادہ نظر آرہی تھی، ایسی حالت میں ہمارے دلوں پر ڈاکوؤں کے پورے پورے حملے کا خوف طاری تھا، درو دیوار اور درختوں کے جھونکے، اس تاریکی میں ڈاکوؤں کی صورت بن گئے تھے، لیکن صبح ہوا تو کچھ نہ تھا۔

دوسری شب، کو سرِ شام ایک پرچہ باتھ روم کے دروازے پر پڑا پایا جس کا مضمون یہ تھا کہ

"رات کو موقع نہیں ملا، لیکن آج رات کو تم سب یقیناً قتل کردیئے جاؤگے، ہوشیار"

لیکن یہ رات بھی خیریت سے گزر گئی۔ جب دن نکلا تو پھر پرچے آنا شروع ہوگئے، اس سے محسوس ہوا کہ یہ حرکت یا تو بچوں کی ہے یا نوکروں کی۔ یہ سوچ ہی رہا تھا کہ ایک پرچہ اور آیا، جس میں خوب گالیاں لکھی ہوئی تھیں، اس پر مجھے بہت غصہ آیا، اور چونکہ مجھے کیپٹن صاحب کے خانساماں پر زیادہ شبہ تھا، اس لئے میں نے اس کو اور اُس کے بارہ سالہ لڑکے کو بلا کر کہا کہ کیا تم اردو لکھنا جانتے ہو؟ خانساماں نے جواب دیا کہ جی ہاں، ہم دونوں جانتے ہیں۔

چنانچہ میں نے لڑکے سے وہی تحریر لکھوائی جو خفیہ پرچے میں لکھی ہوئی تھی، میری حیرت اور غصے کی انتہا نہ رہی، جب میں دیکھا کہ دونوں پرچہ

کی تحریر میں بال برابر فرق نہیں ہے، ہر چند خانساماں اور اُس کے لڑکے نے حلف اور قرآن سے یقین دلانا چاہا، لیکن میں نے پولس کے داروغہ کو بلاکر سارا ماجرا بیان کیا اور وہ دونوں کو مع بہتر کے، کیونکہ یہ بھی مشتبہ تھا، تھانے لے گیا، اس کے بعد تین چار روز تک کوئی پرچہ نہیں آیا۔ لیکن غالباً چوتھے روز دن میں کیپٹن احمد کا سوٹ کیس غائب ہوگیا۔ تمام بنگلے کو چھان مارا۔ لیکن کہیں پتہ نہ چلا۔ دفعتہً باتھ روم کے دروازے پر پڑا ہوا مل گیا۔ داروغہ سے جب یہ قصہ بیان کیا تو سب اس نتیجہ پر پہونچے کہ کوئی خفیہ ڈاکوؤں کا گروہ ہے اور غالباً یہ وہی گروہ ہے جو بہار کے علاقے میں کئی جگہ ڈاکے ڈال چکا ہے، اب اُس نے بنگلہ پر پولس کا پہرہ لگا دیا، نتیجہ یہ ہوا کہ بنگلے کا سامان تبدیل ہونے لگا، یعنی ایک کمرے کا سامان ازخود دوسرے کمرے میں، اور دوسرے کا تیسرے میں پہونچنے لگا۔ پہننے کے کپڑے، بنگلے کی نالیوں میں، موریوں میں، اور پانی کے ٹب میں پڑے ہوئے ملنے لگے، اور دن میں روزانہ دس دس، بیس بیس پرچے لکھے ہوئے آنے لگے، جن میں سوائے قتل کی دھمکیوں، اور گالیوں کے کچھ نہ ہوتا تھا، اب بنگلے کے اندر اور باہر پہرے لگا دئے، تاکہ بخوبی سراغ رسی ہوسکے کہ پرچے کس طرح اور کہاں سے آتے ہیں، لیکن بے سود۔

ایک روز دن میں کیپٹن احمد صاحب کی بالغ لڑکی کی گود میں اُنکی دو سالہ بہن تھی۔ اس کو پلنگ پر لٹایا ہی تھا کہ وہ غائب ہوگئی، بڑی بہن روتی ہوئی بیگم کے پاس آئی، اور سارے بنگلے کو تلاش کرنے پر بھی نہ ملی۔ لیکن دفعتہً ایک کمرے کے فرش پر پڑی ہوئی اور روتی ہوئی مل گئی۔

بیداری کی چند راتیں اور چند دن گزر گئے، سرگرانی، آنکھوں کا خمار، اور بدن کے ریشے ریشے کا مجبور اب اِس کی اجازت نہ دیتا تھا کہ میں ایک لمحہ کے لئے بھی آنکھ کھول سکوں، لیکن ڈاکے کے خطرے کا خیال اِن سب پر غالب تھا۔

آج کی رات گزشتہ تمام راتوں سے زیادہ خوفناک نظر آرہی تھی، پولس ملازمین اور میرے ہمراہی گہری نیند میں سو رہے تھے۔ صرف میں اور نصیر بیگم ریوالور ہاتھوں میں لئے ہوئے جاگ رہے تھے، ہر چند میں نے بیگم سے کہا کہ آپ سو جائیے، لیکن نیند کہاں؟ چنانچہ رسی پردے پر بحث شروع ہوگئی۔ چند شعلے ہیں، اور آدمیوں کی آہٹ ہے، سب سے پہلے میں نے اپنے حواس قائم کئے۔ اور نہایت اطمینان کے ساتھ اپنے ہمراہیوں کو، پولس کو، اور ملازمین کو چپکے چپکے جگاکر کہا کہ تم لوگ دو ٹکڑوں میں ہوکر اِن کو گھیر لو۔ میرے ہمراہی اور ملازمین، اندھیری رات میں درختوں کی قطاروں کے نیچے ہوتے ہوئے چلے اور میں دوسری طرف سے پولس کو لیکر آگے آگے چلا، لیکن جب میں نے مُڑکر دیکھا تو پولس مجھ سے تقریباً بیس قدم پیچھے تھی، اور بزدلی کا مظاہرہ کررہی تھی۔ میرے ایک ہاتھ میں ریوالور تھا، اور دوسرے میں ایک ٹورچ، جب میں پھاٹک کے قریب آڑ میں ہوکر پہنچا، اور ٹورچ کی روشنی کی مدد سے دیکھا تو کچھ نہ تھا، اس موقع پر نصیر بیگم نے بڑی دلیری کا ثبوت دیا۔

طائرِ صبح نے اپنے سفید بازو فضا میں پھیلا دئے، اور جوئے شیر آسمان پر بہنے لگی، پرندوں کی مترنم آوازیں، نسیم کے پردوں میں اس طرح گونج رہی تھیں جس طرح کسی مطربہ کی شیریں و دلکش آواز، ساز کے تاروں کی آواز کے ساتھ مرتعش ہو۔

آج بنگلے کی چیزوں کے بار بار غائب ہوکر مل جانے سے، مجھے محسوس ہونے لگا کہ یہ حرکتیں کسی انسان کی نہیں ہوسکتیں، بلکہ یہ کوئی جن ہے، اب سب اس شبہ میں مبتلا ہوگئے، حتیٰ کہ یہ شک، یقین میں تبدیل ہوگیا، اس کے بعد ایک پرچہ آیا، جس میں لکھا تھا کہ

"یہ جن نہیں ہے، بلکہ آدمی ہے، اور تمہارا دشمن ہے"

جب یہ بات میں نے کیپٹن احمد کو لکھی، تو انھوں نے یقین نہیں کیا، اور جواب دیا کہ یہ تمہاری کمزوریٔ دماغ ہے، اِس دوران میں روزانہ دس دس اور بیس بیس روپے کے تار مراد آباد سے آتے رہے، اور ایک روز دونوں طرف سے پچپن روپیہ کے تار آئے اور گئے، تاکہ ہر لحہ مراد آباد خیریت پہنچتی رہے۔

غرضکہ متواتر تیرہ روز تک یہ تماشا ہوتا رہا، ایک ایک دن میں پہننے کے اتنے اتنے کپڑے، نالیوں، موریوں، اور پانی کے ٹب میں پڑے ہوئے ملتے تھے، اگر بنگلہ کا دھوبی تنخواہ دار نہ ہوتا، تو ہم سب کو میلے کپڑے پہننے پڑتے۔ اب میں نے خواہش ظاہر کی کہ اس جن سے دوستانہ پیدا کرنا چاہیئے، ورنہ یہ نقصان پہونچائے گا، چنانچہ بلند آواز میں میں نے

کہا کہ "بھائی جن ہم سے دوستانہ کرلو" مگر کئی روز تک اس کا کوئی جواب نہ آیا۔ بالآخر ایک روز یہ جواب آیا کہ

"دو بجے رات کو باتھ روم میں آکر ہم سے ملاقات کرے"

(مرسلہ یعقوب جن)

اس پر میں خوش ہوا اور حسب الحکم اپنے یعقوب جن دوست کے دو بجے شب کے باتھ روم کے پاس پہونچا اور پکارا کہ بھائی جن میں آپہنچا ہوں، تم کہاں ہو؟ آؤ اور میرے دوست بن جاؤ، اگرچہ میرے ہاتھ میں ریوالو تھا، اور میں دل کی تسکین کیلئے قرآن کی آیات بھی پڑھ رہا تھا، تاہم میرے جسم میں کپکپی تھی، بدن کا سارا رونگٹا کھڑا ہوا تھا، اور سانسوں میں سرعت پیدا ہوگئی تھی، اور میں محسوس کر رہا تھا کہ میں عنقریب بھاگ جاؤں گا۔ لیکن دفعتہً میرے دماغ میں یہ خیال گردش کرنے لگا کہ اس سرزمین پر انسان سے زیادہ طاقتور کوئی مخلوق نہیں ہے، اب مجھے تسکین ہوئی، اور میں اپنے تئیں ایک جری و بہادر دیکھنے لگا۔ پھر نہایت اطمینان کے ساتھ میں نے آواز لگائی کہ دوست جن آتے ہو یا نہیں" دفعتہً باتھ روم کے کونے میں آپ نظر آئے، اس طرح کہ نشست کی حالت میں کم و بیش دس بارہ فٹ کی اونچائی، اور چھ سات فٹ کی چوڑائی تھی، آپ کی آنکھیں گویا بجلی کے دو قمقمے تھے، سر کے بال عمودی صورت میں کھڑے ہوئے تھے، کچھ سینگ سے بھی بالوں کے اندر معلوم ہوتے تھے، رنگت ایسی تھی، جیسے کالی رات۔ لیکن اس کا مجسمہ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہ ٹھوس نہیں ہے، بلکہ ایک دھواں ہے، اور اس دھویں کے اندر ایک شعلہ ہے، میں نہایت اطمینان کے ساتھ دیکھتا رہا۔ اور اب میں نے اپنی ہستی کا جائزہ لیا کہ کہیں مجھے واہمہ تو نہیں ہے؟ یا یہ کوئی خیالی تصویر تو نہیں ہے؟ جب دیکھا کہ یہ کچھ بھی نہیں تو میں نے اپنے دوست سے بات کی، لیکن میری بات پر وہ میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر گھورنے لگا، اس طرح گویا وہ مجھے ڈرانا چاہتا ہے، میں مسکرایا، اور مجھ میں انسانی قوت کا پندار ہوگیا، اب وہ غائب تھا، اور میں واپس پلنگ پر آگیا، دوسرے روز کیپٹن احمد بھی مراد آباد سے آگئے۔

اُنھوں نے آتے ہی میرے دماغ کی کمزوری کا مذاق اُڑانا شروع کیا، اور چند منٹ کی بحث کے بعد اپنا ہیٹ، کوٹ، پتلون، اور رسٹ واچ ایک طرف اُتار کر رکھی ہی تھی کہ یہ سب چیزیں غائب ہوگئیں، اُس کو یہ مذاق سمجھے، اور دوسرے روز تک جن کی مختلف حرکات کو مذاق سمجھتے رہے، بالآخر ان کو یقین ہوگیا کہ میں صحیح ہوں۔ اب اُنھوں نے اپنے انگریز دوستوں کو یہ تماشا دکھایا، اس کے بعد میں اپنے وطن آگرے آگیا، اور ان کا تبادلہ بکھارو ہوگیا۔

بکھارو

یعقوب جن بھی اُن کے ہمراہ بکھارو پہونچ گیا، اور وہاں بھی یہی کرشمہ سازیاں شروع کردیں، مثلاً کئی بار دودھ کی پتیلی چولھے پر سے اُڑی اور فضا میں غائب ہوگئی۔ دوسری چیزیں بھی فضا میں اُڑ اُڑ کر غائب ہوتیں، یہ اور اِن کے بچے، نیز ملازم چیزوں کو پکڑنے کے لئے دوڑتے، لیکن بے سود، کچھ وقفہ کے بعد یہ چیزیں جہاں کی تہاں مل جاتیں۔

آگرہ

کچھ دن بعد کیپٹن احمد مع اپنی بیگم اور بچوں کے آگرے آئے، یہاں میرے کمروں کے فوٹو، دفتر کے کاغذات، صراحیاں اور مٹکے توڑنے شروع کردئے، مجھے بہت غصہ آیا، اور میں لکڑی لے کر مارنے کو دوڑا، لیکن بے فائدہ، ایک روز میرے مکان پر جب کہ چند عورتیں اور مرد تماشہ دیکھنے آئے تو دفعتہً جوتے اُڑنے لگے۔ میں اور میری اہلیہ قریب بیٹھے ہوئے تھے کہ ایک جوتا اُڑ کر آیا اور میری اہلیہ کے لگا، انھوں نے کہا کہ "ہیں میں نے کیا قصور کیا ہے"؟ پرچے سے جواب آیا کہ "بہن مجھے معاف کرنا، میں نے تو (گالی دیکر) اس کے یعنی آئم کے مارنا چاہا تھا۔ اس کے بعد دو پرچے معافی کے لئے اور آئے۔

کیپٹن احمد سے اس جن کا جلد دوستانہ ہوگیا تھا، میں نے بھی خواہش کی کہ ان کے ذریعے میرا دوستانہ ہوجائے۔ لیکن جن کہتا تھا کہ اس نے یعنی میں نے اس کو مشہور کیوں کیا؟ بمشکل تمام دوستانہ ہوا، کیپٹن احمد اجمیر چلے گئے، اور میں اطمینان سے زندگی بسر کرنے لگا، اجمیر میں بھی یہی حرکتیں ہوتی رہیں، وہاں بھی گھر کی چیزوں کا نقصان کیا۔

آگرے سے اجمیر جاتے وقت فرسٹ کلاس میں ان کی بیگم اپنی

ساری کی ایک پن جس میں ہیرا جڑا ہوا تھا، بھول گئی تھیں، اور جب کئی روز کے بعد یہ دونوں اجمیر سے واپس ہوئے، تو وہ پن بدستور سیٹ پر رکھی ہوئی مل گئی۔

اس کے چند روز بعد میرے مکان کی چیزیں پھر ٹوٹنے لگیں۔ میں نے یعقوب جن سے کہا کہ وہ ستانے کے بعد یہ کیا حرکت؟

جواب آیا کہ میں نہیں ہوں، بلکہ چند اور جن آگئے ہیں اور وہ تمہیں ستا رہے ہیں؟ میں نے کہا اس کا سبب؟

جواب دیا کہ ان کو تمہارے ستانے میں مزا آتا ہے۔ یہ کہتے ہیں کہ تم نے انھیں کبھی ستایا تھا،

میں نے کہا کہ اس سے قبل مجھے جنات سے واسطہ تو پڑا تھا، مگر اب تم میری مدد کرو۔ چنانچہ اس نے میری مدد کی۔

تاہم اس کے بعد مجھے جنوں سے واسطہ پڑا۔ اور ایسا پڑا کہ جو اس واقعہ سے زیادہ حیرت افزا ہے۔ اگر آئندہ پروگرام میں مجھے موقع دیا گیا تو میں جنوں کی دنیا کا حال بتاؤں گا۔

عقیدت کے پھول

روپرٹ برک

برسائے جا، برسائے جا
اُن پر گلہائے عقیدت، برسائے جا
جنھوں نے وطن اور قوم کی خاطر
اپنی جانوں کو
میدانِ آزادی میں قربان کر دیا۔
اگرچہ وہ غریب والدین کے بیٹے تھے۔
مگر شہادت نے
اُن کو غیر فانی بنا دیا ہے
اور اُن کی قدر و قیمت دنیا کی
ہر قیمتی شے سے بڑھا دیتی ہے
بیشک اُنھوں نے وطن اور قوم کی خاطر
دنیا کی آسائشوں اور مسرتوں
کو خیرباد کہا
اور اپنی جوانی کی شراب کو
پانی کی مانند زمین پر اُنڈیل دیا
گو وہ میدانِ آزادی میں کام آچکے ہیں
مگر آنے والی نسلیں
اُن کے ناموں کو غیر فانی بنا دیں گی
برسائے جا، برسائے جا
اُن پر گلہائے عقیدت برسائے جا
جنھوں نے ہم کو حریت اور عزت واپس لا کر دی ہے
اور جن کی بدولت
ہمارے وطن کے قریے قریے اور گوشے گوشے میں
حب الوطن کا جذبہ کارفرما ہے
شرافت اور نجابت
پھر سے ہمارے راستوں میں مکیں ہے
واقعی، اُنھوں نے ہم کو
زندہ کر دیا ہے

اثر چکوالی۔ بی اے

یہ بہتر ہے

کہ چندہ بذریعہ منی آرڈر بھیج دیا جائے کیونکہ وی پی میں زیادہ خرچ ہوتا ہے

انقلابی کی موت

وجاہت سندیلوی

"جس انسان کی زندگی کا کوئی مقصد نہیں وہ زندہ ہی نہیں اور جس انسان کی زندگی کا کوئی مقصد ہے وہ فنا ہی نہیں ہو سکتا۔"

آپریشن کے کمرے سے نرس بڑی تیزی سے نکلی، اُس نے اپنی آنکھوں سے آنسو صاف کئے اور مسکرانے کی ایک ناکام کوشش کرتے ہوئے دروازہ کھول کر دوسرے کمرے میں داخل ہوئی، یہاں بہت سے لوگ بڑی بےچینی سے منتظر تھے، کئی آوازیں ایک ساتھ سنائی دیں" مریض کو ہوش آیا؟"

"ابھی نہیں" کہتی ہوئی نرس دواخانے چلی گئی اور کوئی چیز لیکر آپریشن کے کمرے کی طرف پلٹ گئی، آپریشن کے کمرے کے باہر والے کمرے میں لوگوں کا ہجوم بڑھتا چلا جاتا۔ وہ بڑی بےچینی سے کسی بات کے منتظر تھے، اُمید و بیم کے جذبات متلاطم تھے، ہر شخص پریشان نظر آتا، سارے کمرے میں ایک عجیب دلشکن سعی خیز خاموشی چھائی ہوئی تھی، آپریشن کے کمرے کا دروازہ پھر کھلا، ہر شخص متوجہ ہو گیا۔ بعض لوگوں کے دلوں کی دھڑکن صاف سنائی دیتی۔ بدن سے پسینے کے فوارے چھوٹ رہے تھے۔ زبانیں جواب دے چکی تھیں۔ رومال سے پسینہ پونچھتا ہوا ڈاکٹر داخل ہوا" مریض کو ہوش آگیا" اس نے کہا۔ مجمع ہمہ تن گوش ہو گیا" حالت نازک ہے، مجھے خوف ہے" اُس نے رُک کر پھر کہا، مجمع پر خوف و ہراس کا سناٹا چھا گیا۔ ڈاکٹر کہتا رہا" کئی آپریشن کرنا پڑیں گے۔ مریض بہت کمزور ہے، بڑا خطرہ معلوم ہوتا ہے۔"

"مریض کے ہوش و حواس ٹھیک ہیں، بات چیت کر سکتا ہے؟" ایک بڈھے آدمی نے جو قیافے سے مریض کا باپ نظر آتا، اور بہت زیادہ پریشان تھا، پوچھا۔

"ہاں آپ دو چار منٹ کے لئے اس سے بات چیت کر سکتے ہیں۔ اس کی ہمت بڑھانے اور قوتِ ارادی کو تقویت پہنچانے کی سخت ضرورت ہے" ڈاکٹر نے کہا

چند لوگ ڈاکٹر کے ساتھ ہو گئے اور وہ آہستہ آہستہ دبے پاؤں آپریشن کے کمرے میں چلے گئے۔

سنہ ۱۹۳۱ء کا زمانہ تھا، سارے ملک میں خون اور آگ کی بارش ہو رہی تھی اور جگہ جگہ پر غیروں کے ہاتھوں بھارت کی زمین بھارت کے لالوں کے خون سے سینچی جا رہی تھی۔ مجروح، غلام، مظلوم ہندوستان اپنی بےکسی اور ناطاقتی کے باوجود اپنے پیروں آپ کھڑے ہونے کی کوشش کر رہا تھا اور سامراج کا بھیانک دیو اپنی پوری بہیمیت اور بربریت کے ساتھ اُس کے نرم و نازک جسم کو روند روند کر خوش ہو رہا تھا، آزادی کے سوال کا جواب بدترین قسم کی غلامی سے دیا جاتا۔ عدم تشدد کو تشدد کی کُند چھری سے ذبح کرکے شجاعت اور جوانمردی کا پرچم لہرایا جاتا۔ دل میں آزادی کی تڑپ رکھنے والوں کا انعام جیل کی تنگ و تاریک کوٹھریاں تھیں اور "انقلاب زندہ باد"

کا نعرہ لگانے والوں کا صلہ پولس کے ڈنڈے اور فوج کی گولیاں۔ قصبہ بہادر پور میں بھی تحریک سول نافرمانی اپنے پورے زور پر تھی۔ صبح و شام سیکڑوں مزدوروں اور کاشتکاروں کا جلوس نکلتا۔ قصبے کے بھی کچھ لوگ اس میں شامل ہوتے۔ غریبوں اور مظلوموں کا یہ مجمع جب "انقلاب زندہ باد" کا روح پرور نعرہ لگاتا تو ان کی بجھی بجھی آنکھیں چمک اٹھتیں معلوم ہوتا کہ یہ آواز اُن کے دل کی گہرائیوں سے نکلی ہے، اور اُن کو پورا پورا احساس ہے کہ موجودہ سامراج میں وہ کیسی کیسی ناانصافیوں اور حق تلفیوں کے نیچے دبے ہوئے ہیں، اِن جلوسوں کا روحِ رواں کامریڈ شری پت سنگھ ہوتا۔ مجمع کے آگے جس وقت وہ جھنڈا لے کر جھوم جھوم کر پڑھتا

جانتے ہیں ایک لشکر آئے گا   توپ دکھلا کر ہمیں دھمکائے گا
پر یہ جھنڈا ابھی یونہیں لہرائے گا
آج جھنڈا ہے ہمارے ہاتھ میں!
لاکھ لشکر آئیں کب ڈرتے ہیں ہم   کام جو کرنے کا ہے کرتے ہیں ہم
زندہ رہنے کے لئے مرتے ہیں ہم
آج جھنڈا ہے ہمارے ہاتھ میں!

تو فرطِ جوش سے مجمع پر وجدانی کیفیات طاری ہو جاتیں، اس وقت اگر اُس سے کہا جاتا تو وہ ملک و قوم کی خاطر آگ میں بھی کودنے سے دریغ نہ کرتا، پولس ہر روز جلوس پر حملہ کرتی۔ اور اپنا جوشِ خدمت دکھانے کے لئے ایک آدھ والنٹیر کو گرفتار کرکے جاتی کبھی کبھی اِکا دکا والنٹیر کو زدوکوب بھی کر دیتی۔ اس سے زیادہ تھانے کے قریب ایک درجن کانسٹیبل، چار پانسو آدمیوں کے مجمع کے ساتھ اور کر ہی کیا سکتے تھے؟ لیکن یہ صورتِ حال زیادہ دنوں تک قائم نہ رہی۔ ڈپٹی کمشنر نے قصبے کی شورش دبانے کے لئے فوج کا ایک دستہ بھیجدیا۔ فوج کی آمد سے سارے قصبے میں ہلچل سی مچ گئی "باغیوں" کا کیا ذکر تھا بڑے بڑے "وفاداروں" کے دل دہل گئے اور وحشت سے حواس بجا نہ رہے۔ حسبِ معمول کامریڈ شری پت سنگھ نے اپنی فوج پھر جمع کی۔ اگرچہ آج اس کی تعداد دس پندرہ لوگوں سے زیادہ نہ تھی اور صدر بازار کی طرف اپنا جلوس لے چلا "انقلاب زندہ باد" کے نعرے لگاتا ہوا جلوس اسپتال کی طرف بڑھا۔ کیونکہ سنا گیا تھا کہ آج وہاں کی عمارت پر سے فوج جھنڈا اُتارنے والی ہے، سارے قصبے میں خوف وہراس کا سناٹا چھایا ہوا تھا، لیکن جلوس بڑے جوش وخروش کے ساتھ اپنی منزلِ مقصود کی طرف بڑھتا چلا گیا جس وقت ان نڈر نہتے سپاہیوں کا جلوس اسپتال کے احاطے میں پہونچا فوج کا دستہ اپنی بندوقیں سمیت وہاں پہلے ہی سے پہونچ چکا تھا اور ارادہ کیا جا رہا تھا کہ جھنڈے کو گولیوں سے گرا دیا جائے۔ بندوق کا ایک فیر کیا گیا۔ گولیاں جھنڈے کو چھیدتی ہوئی نکل گئیں۔ اس وقت کامریڈ شری پت سنگھ کو احساس ہوا کہ وہ کس لاچاری اور مجبوری میں پھنسے ہوئے تھے، اور کسی بیکسی سے ان کی آزادی کا نشان گرایا جا رہا تھا، اُس نے سوچا کچھ بھی ہو جھنڈے کی بے عزتی نہ ہونے پائے۔ کئی بندوقوں کے فیر کئے ہی جانے والے تھے کہ اسپتال کی چھت پر جھنڈے کے پاس ہی کامریڈ شری پت سنگھ نظر آیا، چند لمحوں کے لئے بندوقیں روک لی گئیں، سارے مجمع میں جوش وخروش کا سمندر موجیں مار رہا تھا۔ کامریڈ شری پت سنگھ کے ساتھ ہی ساتھ اُس نے گانا شروع کیا۔

اس کی شان نہ جانے پائے   چاہے جان چلی ہی جائے!!!

کئی بندوقوں کی آوازیں ایک ساتھ سنائی دیں، آنِ واحد میں کامریڈ شری پت سنگھ دونوں ہاتھوں سے جھنڈے کو سینے سے لگائے خاک وخون میں تڑپ رہا تھا۔ فوج نے کس مردانگی سے جھنڈے کو گرایا؟

آپریشن کے کمرے میں کامریڈ شری پت سنگھ ایک صاف وشفاف بچھونے پر پڑا ہوا تھا۔ اُسے ہوش آ چکا تھا اور اس کے گرد ڈاکٹروں اور نرسوں کے علاوہ اس کے چند اعزا اور دوست بیٹھے ہوئے تھے۔

"میری ٹانگیں ٹوٹی جاتی ہیں۔ کیا ہڈیاں بالکل ہی ٹوٹ چکیں" اس نے کراہتے ہوئے آہستہ سے پوچھا۔

ڈاکٹر نے بڑے غور سے اس کا چہرہ دیکھا اور اس کی زندگی سے بالکل ہی نا اُمید ہو کر نہایت مایوسی سے کہا "دونوں ٹانگیں علیحدہ کرنا پڑیں گی"

حاضرین پر بجلی سی گر پڑی، وہ مبہوت رہ گئے۔ کامریڈ شری پت سنگھ کے چہرے سے کسی جذبہ کا اظہار نہ ہوا، اس نے اپنے دونوں ہاتھ بلند کرکے کہا "یہ ہاتھ تو نہ کاٹے جائیں گے، اِن میں تو ابھی جھنڈا لہرائے گا"

ڈاکٹر نے حاضرین کو مخاطب کرتے ہوئے کہا "اب آپ جائیں"

"کیا پیٹ سے بھی کوئی گولی نکالی جائے گی" کامریڈ شری پت سنگھ نے

پھر پوچھا۔

"کیسی" ڈاکٹر نے آہستہ سے جواب دیا۔

"تو میں زندگی کے کنارے پر آ پہنچا" سرفروش مجاہد نے کہا

"سخت خطرہ ہے" ڈاکٹر اصل حقیقت کو اس قسم کے مریض سے چھپا نہ سکا،

"موت! میں موت سے نہیں ڈرتا۔ موت مجھے فنا نہیں کرسکتی۔ زمانہ ہوا میں جسمانی موت مرچکا۔ جس روز میں نے اپنے نفس کو قوم کی خدمت کے لئے قربان کر دیا جسمانی موت میں اُسی وقت مرچکا۔ اب تو میں ایک مقصد کے لئے زندہ ہوں۔ ایک مقصد میں زندہ ہوں اور جس وقت تک وہ مقصد نہیں فنا ہوسکتا میں نہیں فنا ہوسکتا۔ اور وہ مقصد تو نہیں فنا ہوسکتا، وہی تو ساری کائنات کی زندگی کا راز ہے انقلاب! انقلاب! "انقلاب زندہ باد" بہادر سپاہی کے یہ آخری الفاظ تھے۔

کون کہتا ہے کامریڈ شری پت سنگھ مرچکا!

ابابیل اور سرد مہر بادل

سجاد حیدر ملیح آبادی

شام کو ہوا تیز تھی۔ آسمان پر بادل کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے تیر رہے تھے۔ میں ٹہل کر واپس آیا، چار تیار ملی، ہوا میں ہلکی ہلکی خنکی تھی، اس لئے دو پیالیاں پی گیا۔ جب میں اپنے پلنگ پر لیٹا تو میں نے ابابیل کو یہ کہتے سنا۔

وہ کہہ رہی تھی، بادلو! مجھے تم سے محبت ہے۔ اسی لئے شائد تم نہیں برستے۔ مجھے تمہاری جستجو ہے۔ اسی لئے تم گم ہو۔ میں تم پر فدا ہوں اسی لئے تم ٹھکراتے ہو، اور میں تمہاری دیوانی ہوں اسی لئے تم بے وفائی کرتے ہو۔ پیارے بادلو برسو!۔۔۔۔۔۔۔ میرے ہونٹوں پر دم ہے، تمہارا ایک قطرہ مجھے دوبارہ زندگی بخشنے لگا، میرا حلق خشک ہو چکا ہے۔ زبان پر کانٹے پڑ گئے ہیں۔ دماغ چکرا رہا ہے، اور تم نہیں برستے۔ کتنے بے وفا ہو تم کتنے بے رحم ہو۔۔۔۔۔۔۔ کتنے خود غرض ہو، میری خاطر اتنا بھی نہیں کرسکتے، پھر کہتی ہوں مجھے تم سے محبت ہے، بے انتہا، سچی، تم میرے رونے پر ہنستے ہو، ہنسو، مجھے اس کی پروا نہیں، میں تو تم سے محبت کرتی ہوں۔ تم مجھ پر غصہ کرتے ہو، گرجتے ہو، گرجو۔ میں تم پر نثار ہو چکی ہوں۔ میری بڑی بہن ابابیل کہتی تھی تم لوگ بہت بے وفا ہوتے ہو۔ مگر مجھکو یقین نہیں آتا تھا، آج معلوم ہوا، واقعی تم سے محبت کرنا جان کھونا ہے تم کو اس کا احساس نہیں کہ میں ایک چھوٹی سی جان پانی کے ایک قطرے کے لئے تڑپ رہی ہوں، مر رہی ہوں، کیا میری زندگی کی قیمت پانی کے ایک قطرے سے بھی کم ہے۔ مانا کہ وہ تمہارے خون کا قطرہ ہوگا، لیکن میں بھی تو جان رکھتی ہوں۔ کیا میری آہ کا بدل غصہ ہے، اور کیا میرے رونے پر ہنسکر زخم پر نمک چھڑکنا نہیں۔

آہ! اے بادلو! شاید تمہارے سینے میں دل نہیں، اور اگر ہے تو پتھر کا، پانی کے ایک قطرے کے لئے میری جان نہ لو۔ کیا تم کو میری صورت اچھی نہیں لگتی۔ کیا میں بدصورت ہوں۔ ایک قطرہ، صرف ایک قطرہ! یہ تمہارا احسان ہوگا، تم پھر مسکرا رہے ہو۔ مجھ پر نہ ہنسو۔ مجھ پر نہ ہنسو!

آہ! یہ کیا! پانی کے بدلے آگ! پانی کے بدلے آگ، پانی کے بدلے آگ!!!

جب میری آنکھ کھلی تو سورج اونچا ہو چکا تھا۔

وہ زردیٔ رخ، وہ ناتوانی تیری
ہے وہ خموش نوحہ خوانی تیری
راتیں وہ شب یاد میں جب بیت گئے
سے بکھری سی تھی جوانی تیری

اختر

قومیت

امین حزیں بہاولپوری

مارشنگ ۔ بلجیم کی قومی افواج کا جرنیل

ہرشبرگ ۔ جرمنی کی ایک فوج کا سپہ سالار جو مارشنگ کی قید میں ہے

ویرا ۔ مارشنگ کی نوجوان حسین بیوی جو قومی خفیہ محکمے کی رضاکار ہے

وان زین ۔ جرمنی کی فاتح افواج میں ایک دستے کا سردار

پہلا سین

جنگِ عظیم ——— بلجیم

مارشنگ اپنے شاندار محل کے ایک وسیع اور قدیم انداز میں سجے ہوئے کمرے کے وسط میں صوفے پر نیم دراز ہے۔ تمام کمرہ برقی شمعوں اور قمقموں سے جگمگا رہا ہے اس کے سامنے میز پر یسوع مسیح کا چھوٹا سا مجسمہ ہے۔ مجسمہ کے قدموں میں چند کتابیں بکھری پڑی ہیں۔ جن میں ایک کتاب کے کچھ صفحات کھلے ہوئے ہیں۔

مارشنگ کے بالمقابل میز کی دوسری طرف ہرشبرگ بے چین صورت میں سرنگوں ایک کرسی پر بیٹھا ہے، اس کی دونوں کلائیوں میں ایک لمبی زنجیر پڑی ہوئی ہے دونوں کے چہرے پر سنجیدگی برس رہی ہے، جیسے کسی گہری سوچ میں ہیں، یا کسی اہم موضوع پر کافی دیر سے بحث کر رہے ہیں۔

ہرشبرگ ۔ (مہرِ سکوت توڑتے ہوئے) افسوس ہے! آپ نے میرے جواب کا ایک پہلو نظر انداز کر دیا ہے!! میں نے تو انسان کی اس خود اعتمادی کا مذاق اڑایا ہے جسے وہ اپنی ناکامیوں اور کوتاہیوں کے باوجود بھی قائم رکھتا ہے!---- بے وقوف سمجھتا ہے، دنیا میں ناکامیابی اور بربادی محض نااہلوں اور کمزوروں کے لئے ہے ------ جیسے دنیا کی تمام قوتیں اس کے تابع ہیں! میرا خیال نہیں، بلکہ ایمان ہے، کہ انسان وقت اور واقعات کی پیچیدگیوں میں بہت کم با اختیار ہوتا ہے ------

مارشنگ ۔ (نفرت سے) خوب! دنیا میں یہ سب قتل و غارت، خون و فساد، غریبوں پر ظلم، بے گناہوں پر سختیاں۔ سب انسان کی اس بے اختیاری کا صدقہ ہیں؟ قدرت ہی ظالم ہے نا!! (طنزیہ انداز میں) معصوم انسان بیچارہ!

ہرشبرگ ۔ قدرت کا سوال نہیں جناب! یہ سوال انسان کی بے اختیاری کا ہے۔

مارشنگ ۔ (سختی سے) انسان کو بے اختیار بنا کر کسے مجرم بنائیں گے آپ؟

ہرشبرگ ۔ ------------

مارشنگ ۔ (جوش میں) آپ کے نزدیک بیکس انسانوں کے خون سے ہولی کھیلنے والا نپولین بے اختیار تھا، (بے قصور تھا! (نفرت آمیز طنزیہ انداز میں) اور اب تم؟------ خدا کی اس مقدس سرزمین کو ہری مملکت میں جہنم زار بنانے والے! انسانوں کی ہڈیوں کو چبانے والے، انسانیت اور اس کے نام پر انسانیت اور اس کو تباہ کرنے والے جرمن!----- بے قصور ——— بالکل بے قصور ہو؟ (جوش میں)۔

ہرشبرگ ۔ (رحم آمیز لہجے میں) نپولین؟ نپولین!——— آہ! وہ ایک عجیب انسان تھا، بلند عزائم اور آتشیں امیدوں میں اس کا دل و دماغ واقعی بے اختیار تھا——— وہ ایک دیوانہ تھا عظیم الشان دیوانہ!--- وہ دن رات نئی اُمنگوں میں رقص کرتا تھا، عظمت و کامرانی کے خواب دیکھتا تھا، بلند تخیلات کے سایوں میں اس کی نیندیں حرام ہوتی تھیں———

وہ ایک آگ تھا، سلگتی ہوئی آگ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ وہ اپنے شعلوں سے دنیا کو بھسم کرنا چاہتا تھا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ تقدیر، جنگ، قتل و غارت سب اس کے کھیل تھے ۔۔۔۔ بے چارہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ وحشی!

(ویرا تیزی سے اندر داخل ہوتی ہے، اور گھبرائی ہوئی مارشنگ سے لپٹ جاتی ہے)

مارشنگ ۔ پیاری ویرا!!

ویرا ۔ (پریشانی اور بیتابی میں) محبت اور پیار؟ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ مارشنگ! اس کے لئے اب وقت نہیں ہے!! جرمنی کی فوجیں بلجیم کے دروازوں سے داخل ہو رہی ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اٹھو! اپنی زندگی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

(ہرشبرگ کا چہرہ خوشی سے تمتما اٹھتا ہے)

مارشنگ ۔ (مصنوعی مسکراہٹ سے بات کاٹ کر) ویرا! اپنی زندگی کی حفاظت؟ ہوں! مرد اپنی زندگی میں روزانہ ہزاروں مرتبہ تباہیوں سے روشناس ہوتا ہے ۔ (سنجیدگی سے) میری اس زندگی سے ہزاروں جانیں وابستہ ہیں، ہزاروں!! ان کی حفاظت کون کرے گا؟ اپنی جان کی حفاظت سے ان کی زندگیاں خطرے میں ڈال دوں! ۔۔۔ (جوش میں کھڑے ہوتے ہوئے) زندگی ہر شخص کو عزیز ہوتی ہے ویرا! مگر ایک اسے خرگوش کی طرح بلوں میں چھپا کر بچاتا ہے، اور دوسرا میدانِ جنگ میں قوت و طاقت سے اس کی حفاظت کرتا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ مجھے بزدلوں میں شامل کرنے کی کبھی غلطی نہ کرنا!

(تیزی سے باہر نکل جاتا ہے، ہرشبرگ حیرت سے اس کو جاتے ہوئے دیکھتا رہ جاتا ہے ۔)

دوسرا سین

جرمن قیدی ایک میز کا سہارا لئے کھڑا ہے، اس کے چہرے پر غم و حسرت کے آثار کا اُتار چڑھاؤ ہے ۔ ویرا عقب سے اُسے خاموشی سے تک رہی ہے، وہ اپنے آپ سے بول رہا ہے ۔

ہرشبرگ ۔ ایک تنہا انسان کی کیا طاقت ہے؟ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ بیوقوف اپنی اس قدر اہمیت سمجھتا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ خدا اور زندگی کے فرائض بناتا ہے، اور قومیت و وطنیت کے نام پر لاکھوں سینے چیر کر بھی سمجھتا ہے، کہ خدا کا منشا میں فریضہ بجا لایا! ۔۔۔۔ میری تمام فتوحات بیکار گئیں صرف آخری وقت میری فوج نے میرا ساتھ نہیں دیا ۔۔۔ ورنہ! (نیم مجنون حالت میں آنکھیں پھاڑ کر) ایک انسان کا گناہ کیا اور ثواب کیا! اگر قوم غلطی کرے تو رہنما ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ بے چارہ رہنما کر ہی کیا سکتا ہے؟!

(ویرا غصے مگر طنزیہ انداز میں مسکراتے ہوئے آہستہ آہستہ اس کے عقب سے ہٹ کر اس کے سامنے آکر ٹھہر جاتی ہے)

ویرا ۔ آپ اپنی تمام غلطیوں کا الزام بھی اپنی فوج کے سر تھوپ رہے ہیں؟! جیسے آپ معصوم فرشتہ ہیں، اور وہ سب غدار؟ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ آخر آپ اپنی اہمیت کو اپنی زندگی سے اس قدر کیوں لپٹائے ہوئے ہیں؟ ممکن ہے آپ ہی نے اس سے ناانصافی کی ہو؟! ۔۔۔ ہر شخص اپنے آپ کو ناکامیوں میں معصوم اور مظلوم سمجھتا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

ہرشبرگ ۔ (بغیر مخاطب ہوئے) خوب! انصاف اور ناانصافی بھی آپ کثرت رائے کی روشنی میں پہچانتی ہیں؟ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ شاید برطانیہ کی مکروہ جمہوریت کا آپ کو تجربہ نہیں (غصے اور جوش میں) جمہوریت! غلط بین، غلط اندیش انسانوں کا بنایا ہوا ڈھونگ، جس میں انسانوں کو پتھروں اور اینٹوں کی طرح گنا اور تولا جاتا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ آپ ہی فرمائیے! کثرت رائے سے تراشے ہوئے بت جو برطانیہ کی "مشترکہ دولت" کی حفاظت کرتے ہیں، کتنے بھوکوں کا پیٹ پالتے ہیں؟ کتنے یتیموں کے آنسو پونچھتے ہیں؟ کتنے غلاموں کی زنجیریں کاٹتے ہیں؟ کتنے بیکسوں کے ساتھ انصاف کرتے ہیں؟ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ آہ! بے شمار بھیڑوں کی بین بین حق و صداقت کے نغمے پرکھنے والے کس طرح اپنے مفاد کو انسانیت کا مفاد اور اپنی خود غرضیوں کو عوام کے حقوق سمجھ لیتے ہیں!؟

ویرا ۔ (غصے میں) پھر آپ ہی بتلائیے توپیں اور مشین گنیں صحیح ذہنیت کا پرچار کرتی ہیں؟ ہوائی جہازوں سے گرتے ہوئے بم صحیح نمائندے تلاش کرتے ہیں؟ یتیموں کی پرورش، بیواؤں کی امداد کیا تمہاری محبوب "قیصریت" اور "افرادیت" کر سکتی ہے؟ ۔۔۔ جو اپنی ہوس کی بھٹی میں لاکھوں بیکسوں کی زندگی بھون کر بھی اپنی وحشت اور فتح پر قہقہے بلند کرتی ہے!

ہرشبرگ ۔ (خیالات کے ہجوم سے پریشان ہو کر) کچھ نہیں! کچھ نہیں!! انسانیت کے مفاد اور قومیت کے حقوق کی آڑ میں ہر شخص غریبوں کا مدفن بنا رہا۔

...... ہماری خود غرضیاں، دنیا اور انسانیت کا کفن تیار کر رہی ہیں، کچھ نہیں! قومیت، قوت، وطنیت سب ہماری حرص و ہوس کی بے سود نمائش ہے، آہ! سب بے سود ــــ بیکار!

انتہائی بے چینی اور مضطرب انداز میں اپنا چہرہ اپنے ہاتھوں سے ڈھانپ لیتا ہے اور جہاں کھڑا ہے وہیں بیٹھ کر بچوں کی طرح بلک بلک کر رونے لگتا ہے ــــ ایک ایسے بے بس انسان کی طرح جس کے سامنے تمام دنیا تاریک ہو چکی ہو۔

(باہر سے آہٹ آتی ہے، دونوں ادھر متوجہ ہوتے ہیں، سامنے بلند دروازے سے مارشنگ زخموں سے چور، لڑکھڑاتے ہوئے اندر داخل ہوتا ہے۔)

ویرا دوڑ کر بیتابانہ اس سے لپٹ جاتی ہے، اور اُسے سہارا دے کر کونے میں پڑے ہوئے ایک صوفے پر لٹا دیتی ہے۔

ہرشبرگ آنکھوں میں آنسو لئے ہوئے اس کے سرہانے اندوہگیں انداز میں آکر ٹھہر جاتا ہے، اس کے چہرے پر حسرت برس رہی ہے۔

ہرشبرگ۔ (غصے سے کپکپائی ہوئی آواز میں یکدم بول اٹھتا ہے) وحشی! قاتل!! خونخوار!!! انسانوں کو حیوانوں کی طرح ......

مارشنگ۔ (مجروح ہلکے تبسم اور مدہم آواز میں بات ٹوک کر) اپنی قوم کو یہ انعام نہ دو! ہرشبرگ!!

ہرشبرگ۔ تمہاری شرافت اور تمہارا اخلاق مجھے اپنی قوم سے زیادہ عزیز ہے!

(مارشنگ لرز جاتا ہے)

مارشنگ۔ (فاتحانہ مسرت میں ہرشبرگ کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے) پیارے بھائی! قدرت نے انسانوں کو نفرت کی نسبت محبت زیادہ دی ہے، مگر ...... آہ! ظالم اس کا فریب، ہوس اور خودغرضی سے بچ کر صحیح استعمال نہیں کرتے!

(مسکراتے ہوئے آنکھیں بند کر لیتا ہے)

تیسرا سین

مارشنگ کی نعش ویرا اپنی آغوش میں لئے بیٹھی ہے، اس کے آنسو مارشنگ کی سرد پیشانی پر گر رہے ہیں۔ ہرشبرگ خاموشی سے سر جھکائے مارشنگ کی نعش کے پہلو میں بیٹھا ہے، وان زین سپاہیوں سمیت داخل ہوتا ہے۔

ہرشبرگ اُسے دیکھتے ہی تیزی سے کھڑا ہو جاتا ہے، وان زین اُسے دیکھتا ہے، مگر بے اعتنائی سے نظریں پھیر لیتا ہے۔

وان زین۔ (سپاہیوں کو حکم دیتے ہوئے) جلدی تلاشی لو ......!

(مارشنگ کی نعش کو کنکھیوں سے دیکھ کر مسکراتا ہے)

ہرشبرگ۔ (وان زین کے بالمقابل آکر) وان زین!!

وان زین۔ (طنزیہ انداز میں مسکراتے ہوئے) اوہو! آپ ہیں بھائی ہرشبرگ!! (سپاہیوں سے) پہلے ذرا آپ کی زنجیریں کاٹ دو! گھبرا گئے ہوں گے ــــ اتنا عرصہ اور قید!! ــــ آزادی واقعی بہت بڑی نعمت ہے!

ہرشبرگ۔ (درشتی سے) نہیں! میں اس قید کو تمہاری آزادی پر ترجیح دیتا ہوں۔

وان زین۔ اچھا!! ــــ ہاں! ــــ قید بھی تو ایک عادت ہے! (سپاہیوں سے) تلاشی لو! ــــ مگر جلدی!!

ہرشبرگ۔ تلاشی!

وان زین۔ ہاں!

ہرشبرگ۔ (ملتجیانہ انداز میں) اپنی آزادی کی طرح دوسروں کی آزادی کا بھی احترام کرو ــــ بھائی!

وان زین۔ خوب! ــــ مارشنگ کی قید نے آپ کو بہت انصاف پسند بنا دیا ہے!!

(غصے سے سپاہیوں کی طرف دیکھتا ہے، سپاہی آگے بڑھنا چاہتے ہیں، ہرشبرگ اُن کا راستہ روک کر مزاحمت کرنی چاہتا ہے، وان زین پستول نکال کر اُسے گولی مار دیتا ہے)

ہرشبرگ۔ (گرتے ہوئے) آہ! قومیت، وطنیت کا جنازہ! وان زین! میں تمہاری وحشت اور ہوس کی راہ میں حائل ہوا تھا نا؟ ہاں! میری یہی سزا تھی!...! یہی سزا!! (ویرا سے) ویرا! ویرا! مجھے جرمنی کا نہیں، بلجیم کا کفن پہنانا ...... اور دیکھو! ہوسِ ملک گیری پر قومیت اور وطنیت کی آخری لاش!

(مسکراتے ہوئے آنکھیں بند کر لیتا ہے)

(سپاہی تلاشی میں مصروف ہو جاتے ہیں، ویرا زخم خوردہ مریض کی طرح بیتاب ہو کر ہرشبرگ سے لپٹ جاتی ہے) (پردہ)

ہندوستان کے صنعتی مزدور اور اُن کی مہاجرانہ صفت

عبدالرحیم شبلی، بی، کام
(اختصاصی مالیات، زر، و بنکاری)

اگر "مزدور" کسی ایسے خستہ حال، بدنصیب، شخص کو کہتے ہیں جو اپنا تمام وقت، محنت اور قوت، کسی استعمار پسند آقا کی خدمت، اور غلامی کے لئے، نہایت قلیل محنتانہ کے عوض، دائمی طور پر، وقف کردے، تو ہم بلا خوف و خطر کہہ سکتے ہیں کہ ہندوستان ایک "مزدوروں کا ملک" ہے۔ لیکن اس مضمون میں ہم "مزدور" کی اصطلاح صرف ایسے آجرین تک محدود رکھیں گے، جو ہندوستان کی فیکٹریوں، ملوں اور کارخانوں میں کام کرتے ہیں۔

صنعتی مزدوروں کی تعداد

ہندوستان ایک زرعی ملک ہے، اس لئے یہاں کے زیادہ تر مزدور زراعت کے پیشہ سے متعلق ہیں۔ لیکن جب سے ملک میں کارخانے اور فیکٹریاں قائم ہوئی ہیں اعداد و شمار سے ثابت ہوتا ہے کہ ہندوستان کے "صنعتی مزدوروں" کی تعداد بھی روز بروز بڑھ رہی ہے۔

چنانچہ ۱۸۷۹ء میں ملک کے پارچہ بافی کے کارخانوں میں کل ۵۸۵۸۴ عاملین تھے۔ ۱۸۸۹ء میں اُن کی تعداد پٹ سن کے کارخانوں میں ۴۳۴۳و۵۹ تھی۔[۱] ۱۸۹۲ء اور ۱۹۲۹ء کے درمیان "انڈین فیکٹریز ایکٹ" کے ماتحت کارخانوں کی تعداد ۶۵۰ سے بڑھکر ۸۱۲۹ ہو گئی۔ اور اسی عرصہ میں روزانہ کام کرنے والے مزدوروں کی تعداد ۰۰و۴۳،۳ سے بڑھکر ۶۹۱،۳۵۵،۱۵۱ ہوگئی۔

لیبر کمیشن[۱] کے نزدیک ہندوستان کی "مستقل فیکٹریوں"[۲] میں کام کرنے والے مزدوروں کی تعداد تقریباً بارہ لاکھ پچاس ہزار ہے۔ ۱۹۲۲ء میں انڈیا آفس کی طرف سے جو یادداشت لیگ آف نیشنز کو بھیجی گئی تھی اس میں ہندوستان کی کل جماعتِ عاملہ کے متعلق حسبِ ذیل اعداد و شمار مندرج تھے۔

زراعتی عاملین (ان میں سے ۸۸۶و۴۶و۶۷،۷ کسان مالکین منہا کر لئے گئے ہیں) جو بین الاقوامی دفتر عاملین کے حیطۂ عمل کے اندر آتے ہیں

---

[۱] ہندوستان کے "مزدوری حالات" (　　) کا مطالعہ کرنے کے لئے گورنمنٹ نے رائٹ آنریبل جے ایچ وہائٹلے کی صدارت میں ایک کمیشن مقرر کیا تھا، جس نے اپنی رپورٹ جون ۱۹۳۱ء میں شائع کی۔ اسے "لیبر کمیشن رپورٹ" یا "وہائٹلے کمیشن رپورٹ" کہتے ہیں۔ میرے مضمون کا بیشتر حصہ اسی رپورٹ کا مرہونِ منت ہے۔

[۲] "مستقل فیکٹریوں" کی اصطلاح سے ایسے کارخانے خارج ہیں (ا) جن کا کام محض خام اجناس کے رکھ رکھاؤ تک محدود ہو۔ (ب) جو صرف سال کے ایک حصہ میں کام کرتے ہوں۔ (ج) جو یا تو کوئی مشین استعمال نہیں کرتے، اور اگر کرتے ہیں تو اُن میں بیس سے زیادہ مزدور ملازم نہیں ہیں۔

[۱] "ہندوستان میں کارخانوں کے مزدور" مصنفہ آر۔ کے۔ داس صفحہ ۱۵۔ ۱۶

——————— ۲،۷۸،۱۰،۱۳۰

بحری عاملین اور لشکر وغیرہ ——————— ۱۰،۴۱،۰۰۰

صنعتوں، کانوں اور رسل و رسائل میں کام کرنیوالے مزدور ۳،۰۲،۱۹،۰۰۰

۱۹۳۱ء کی مردم شماری کی رو سے زراعتی عاملین کی تعداد ۳،۱۰،۵۰،۰۰،۰۰۰ تک بڑھ گئی ہے، اور جو مزدور مصنوعات، کان کنی اور رسل و رسائل پر انحصار رکھتے ہیں ان کا شمار ۲،۶۰،۰۰،۰۰۰ ہوگیا ہے۔

۱۹۳۴ء کی آل انڈیا رپورٹ فار فیکٹریز کے مطابق ہندوستان کی کل فیکٹریوں کی تعداد ۸،۶۵۸ ہے۔ جن میں اوسطاً ۱۴،۸۷،۲۳۱ مزدور روزانہ کام کرتے ہیں۔

مزدوروں کی مختلف پیشوں میں تقسیم

۱۹۳۱ء کی مردم شماری سے معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان کی کل آبادی کا صرف ۹،۹۵ فیصدی حصہ مزدوروں پر مشتمل ہے۔ اور باقی آبادی کا انحصار کاشتکاری، تجارت اور ملازمتوں پر ہے۔

ہندوستان کے مزدوروں کی تقسیم مختلف پیشہ جات میں حسبِ ذیل ہے[1]

پارچہ بافی کے کارخانوں میں	۲۳۱،۰۲،۱۴
لباس اور فیشن کی اشیاء کے کارخانوں میں	۲۳،۰۸،۸۲۴
کارخانہ ہائے چوب	۱۶،۱۳،۷۲۳
اشیائے خورد و نوش کے کارخانے	۱۴،۷۶،۹۹۵
عمارات بنانے والے	۶۰،۱۸،۵۲۰
دھات کی اشیاء بنانے والے	۷۰،۱۳،۰۷۰
کیمیاوی کارخانوں میں	۶۳،۵۰۴
چمڑا اور کھالیں بنانے والے	۳،۱۲،۰۷۴
معدنیات اور کانوں کے مزدور	۳،۴۶،۰۰۰
متفرق	۱۴،۹۸،۰۵۴

علاوہ ازیں مزدوروں کی ایک بہت بڑی تعداد چھوٹے اور غیر رجسٹری شدہ کارخانوں میں کام کرتی ہے۔ ان کی تعداد ۴۰ لاکھ سے کم نہیں۔

مزدوروں کا گاؤں سے تعلق

ہندوستان کے "صنعتی مزدور" یورپ کے مزدوروں کی طرح کوئی ایسی مستقل جماعت نہیں ہیں، جس کا تعلق دیہات اور زراعت سے کچھ نہ ہو۔ بلکہ یہاں کے کام کرنے والے مزدور زیادہ تر دیہاتوں سے متعلق ہوتے ہیں اور جب کبھی اُن کی زرعی ضروریات کا تقاضہ ہوتا ہے، یا وہ بیکار ہوجاتے ہیں تو وہ دیہاتوں میں واپس چلے جاتے ہیں۔

لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ہندوستانی کارخانوں میں کام کرنے والا ایک اوسط درجہ کا مزدور عملی طور پر ایک زراعت پیشہ ہوتا ہے، جو اپنی آمدنی میں اضافہ کرنے کی غرض سے، عارضی طور پر، فیکٹری میں ملازمت اختیار کرلیتا ہے۔ بلکہ ہمارے کہنے کا مفہوم صرف یہ ہے کہ ہندوستانی کارخانوں میں عاملین زیادہ تر دیہاتی ہوتے ہیں جن کی پیدائش اور ابتدائی تربیت دیہاتی فضا اور دیہاتی ماحول کی مرہونِ منت ہوتی ہے۔ اس لئے وہ دل سے بھی دیہاتی ہوتے ہیں، اور جب کبھی ان کو موقع ملتا ہے وہ اپنے دیہاتوں میں واپس جانے کی سعی کرتے ہیں، اور یہ اکثر اوقات کامیاب ہوجاتی ہے۔ مگر یہ لوگ واپس جاکر کھیتی باڑی کا کام نہیں کرتے۔ بلکہ محض چھٹی منانے کی غرض سے وہاں جاتے ہیں، جب وہ شہر میں ہوتے ہیں تو اُن کا تعلق گاؤں سے صرف اس قدر ہوتا ہے کہ وہ اپنے متوسلین یا ساہوکار کو روپیہ بھیجتے رہتے ہیں۔

(لیبر کمیشن رپورٹ صفحہ ۱۱ تا ۱۴)

ہجرت کے اسباب

دیہاتوں سے شہروں کی طرف مزدوروں کی اس ہجرت کے اسباب مختصر طور پر درج ذیل ہیں۔

اوّل۔ دیہاتوں میں آبادی بڑھ رہی ہے، اراضی کے محدود ہونے کی وجہ سے وہاں ایک ایسی جماعت پیدا ہو رہی ہے جس کے پاس کوئی زمین نہیں۔ چنانچہ یہ لوگ قسمت آزمائی کے لئے شہروں میں آنکلتے ہیں، اور فیکٹریوں۔ ورک شاپوں، کانوں۔ ریلوں، اور نہروں وغیرہ کی ملازمت اختیار کرلیتے ہیں۔ یو۔ پی۔ اُڑیسہ۔ بہار اور رتنگری (بمبئی) وغیرہ

---

[1] ملاحظہ ہو "ہندوستانی مردم شماری کی رپورٹ" ۱۹۳۱ء

میں یہ سالانہ انتقال "علی الخصوص ترقی پذیر ہے، کیونکہ وہاں زمین پر بوجھ
بڑھ رہا ہے اور ہندوستان کے مخصوص قوانینِ وراثت کی وجہ سے زمین
متعدد ٹکڑوں میں تقسیم اور منتشر ہو رہی ہے، جس کے باعث وہاں روز افزوں
آبادی کی کھپت ممکن نہیں۔

دوم۔ اشتراکِ خاندانی (
اس ہجرت کو آسان بنا دیتا ہے، کیونکہ لوگ اپنی بیوی بچوں کو دوسرے
رشتہ داروں کے پاس دیہات میں ہی چھوڑ کر بآسانی شہر جا سکتے ہیں،

سوم۔ بعض اوقات ایک زراعت پیشہ شہروں میں اس لئے بھی
ملازمت اختیار کر لیتا ہے کہ ساہوکار کو قرضہ ادا کرنے یا ڈھور ڈنگر
اور اراضی خریدنے کے لئے اُس کو بہت سے روپیہ کی ضرورت ہوتی ہے،

چہارم۔ دیہاتوں کے کمین شہروں میں آجاتے ہیں کہ اُن کو اپنے
پیشہ کے معزز بنانے کا خیال ہوتا ہے؟

پنجم۔ ان سب پر مستزاد یہ کہ آج کل وسائلِ آمد و رفت نہایت آسان
اور عمدہ ہو رہے ہیں جو دیہاتیوں کی خواہش کو عملی جامہ پہنانے میں ممد
ثابت ہوتے ہیں۔

گاؤں سے نکلنے کی وجوہ خواہ کچھ ہوں لیکن قابلِ غور مسئلہ یہ ہے
کہ دیہاتی شہروں میں جا کر اپنے گاؤں سے بالکل منقطع کیوں نہیں ہو جاتے؟
اور جب کبھی اُن کو موقع ملتا ہے وہ واپس آنے کی سعی کیوں کرتے ہیں؟

لیبر کمیشن کا خیال ہے کہ

"ہجرت یکطرفہ ہوتی ہے یعنی صرف دیہاتی شہروں میں جاتے ہیں۔
شہری دیہاتوں میں نہیں جاتے۔ گاؤں کے مزدور کے لئے شہری زندگی
قدرے کشش کا باعث نہیں ہوتی۔ اُس کی خواہش صرف ضروریاتِ
زندگی کا حصول ہوتا ہے۔ اگر مزدوروں کو دیہات میں کافی سامانِ خورد
نوش میسر آجائے تو اُن کو "صنعت" کی طرف دوڑنے کی کوئی ضرورت
نہ رہے۔ الغرض یہ مزدور شہروں کی طرف "دھکیلے" جاتے ہیں "کھینچے" نہیں
جاتے۔" (لیبر کمیشن رپورٹ صـ)

مزدور کو نقصانات

چونکہ شہری زندگی دیہاتی عادات و اطوار سے قطعی مختلف ہے اسلئے
جب ایک مزدور دیہات سے ہجرت کر کے شہر میں جاتا ہے تو وہ اپنے آپ
کو بالکل ایک جداگانہ ماحول میں پاتا ہے، نتیجہ اس مغائرت کا یہ ہوتا ہے
کہ پرانے رسم و رواج کے بندھن ڈھیلے پڑ جاتے ہیں اور جو جکڑ بندیاں
دیہاتی زندگی کو مضبوط و مربوط کرتی ہیں وہ ٹوٹ جاتی ہیں اور اُن کی جگہ
منفردیت لے لیتی ہے۔

آب و ہوا کے اختلاف، خوراک کی خرابی، مکانوں کی تنگ دامانی،
حفظانِ صحت سے لاپروائی اور اپنے بیوی بچوں سے دوری کی وجہ سے
مزدور کی صحت پر بھی ایک ناگوار اثر پڑتا ہے، جس سے اُس کی اہلیت
کارکردگی ( ) میں بھی بہت حد تک کمی واقع
ہو جاتی ہے۔

پھر دیہاتی مزدور شہروں کی بعض ایسی بد تماشیوں میں گرفتار ہو جاتے
ہیں جن کا رواج دیہاتوں میں نسبتاً کم ہوتا ہے۔ مثلاً جوا، اور شراب نوشی،
اُن کی اخلاقی تباہی کا باعث بنتی ہے۔ اور وہ بے اعتدالی کی رَو میں بہہ
جاتے ہیں۔

پھر چونکہ فیکٹریوں اور کارخانوں میں اوقاتِ کار اور کام کی نوعیت
منضبط ہوتی ہے اور آزاد طبع دیہاتی اپنے آپ کو اِن جکڑ بندیوں کے پابند
نہیں بنا سکتے۔ اس لئے وہ بہت جلد کارخانوں کی بے کیف اور مشغول زندگی
سے اُکتا جاتے ہیں، اور آخر کار اپنے دیہاتوں میں واپس چلے جاتے ہیں۔

مزید برآں دیہاتی مزدور دلجمعی سے کارخانوں میں کام نہیں
کر سکتے۔ اِس وجہ سے وہ اکثر غیر حاضر رہتے ہیں۔ یہ غیر حاضری نہ صرف
اُن کی مزدوری اور اجرت پر اثر انداز ہوتی ہے بلکہ اگر وہ کچھ عرصے کے
بعد دوبارہ ملازمت حاصل کرنا چاہیں تو اُنھیں بہت سا روپیہ سردار یا
دلال کی بھینٹ بطور رشوت چڑھانا پڑتا ہے۔

غیر حاضری کا اثر کارخانوں پر

مزدوروں کی سیلانی طبیعت کا اثر ہندوستانی کارخانوں پر یہ پڑا
ہے کہ اُن میں "غیر حاضری" کی شکایت بہت عام ہو گئی ہے۔ اور اس وجہ سے
کارخانوں کا کام یکساں اور باقاعدہ رکھنا محال ہوتا ہے۔ ملوں کے مالکان
کا خیال ہے کہ جب کبھی اُجرتوں یا منافع کی تقسیم میں اضافہ کیا جائے کارخانو

سے مزدوروں کی رفتارِ غیر حاضری بڑھ جاتی ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ مزدوروں کو اپنی ضروریات پورا کرنے کے لئے کافی روپیہ مل گیا ہے۔

بمبئی میں یہ غیر حاضری کی رفتار ۸ فیصدی سے ۱۲ فیصدی تک ہے، گرمیوں میں سردیوں کی نسبت یہ رفتار بڑھ جاتی ہے۔ کیونکہ گرمیوں میں ایک تو موسم فصل ہوتا ہے اور دوسرے شادیاں بھی زیادہ تر اسی موسم میں رچائی جاتی ہیں۔ یہی حال کلکتہ میں ہے۔ وہاں گرمیوں میں پٹ سن کا کام بہت ہوتا ہے۔ اس لئے مزدور کارخانے چھوڑ کر اپنی زمینوں پر واپس چلے جاتے ہیں۔

مزدور نہ صرف دیہاتوں سے اپنا تعلق رکھنے کی وجہ سے غیر حاضر رہتے ہیں بلکہ فیکٹریوں کے کڑے ضبط و نظم اور اختلافِ اُجرت کی وجہ سے بھی وہ ایک آقا کی جگہ دوسرے آقا کی ملازمت اختیار کرتے رہتے ہیں۔ اِس "انتقالِ مکانی" کی وجہ سے بھی کارخانوں کے کام میں سخت حرج واقع ہوتا ہے، اور اِس کے لئے "مجلسِ محصولِ پارچہ بافی" (
) نے تجویز کی تھی کہ کارخانوں میں مزدوروں کی ریزو بھرتی ہونی چاہیئے۔ جس سے بوقتِ ضرورت فائدہ اُٹھایا جاسکتا ہے۔ (رپورٹ پیراگراف ۶۰)

رابطۂ دیہات کے فائدے

باوجود متذکرۃ الصدر نقصانات کے ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ مزدوروں کو اپنا تعلق دیہاتوں سے بالکل منقطع کر لینا چاہیئے اور شہروں میں بحیثیت ایک صنعتی جماعت کے اُنھیں مستقل رہائش اختیار کر لینی چاہیئے، کیونکہ یہ رابطۂ دیہات اپنے اندر بہت سے فوائد بھی پنہاں رکھتا ہے۔

اوّل۔ مزدور کی ابتدائی تربیت اور پرورش چونکہ گاؤں کی کھلی فضا میں ہوتی ہے۔ اس لئے بلحاظ صحت و طاقت دیہات کے مزدور زیادہ قوتِ عملی اور اہلیتِ کارکردگی کے مالک ہوتے ہیں۔ پھر جب مزدور کچھ عرصہ تک شہر سے واپس آکر دیہات میں رہتا ہے تو اُس کی طاقت و قوت پھر عود کر آتی ہے۔ جب وہ دوبارہ ملازمت اختیار کرتا ہے تو اُس کے جسم میں ایک نئی روح اور تازگی ہوتی ہے۔ یہ بات کارخانوں کے لئے بہر حال مفید ہے۔

دوم۔ اگر شومیٔ قسمت سے ایسے مزدوروں کو ملازمت سے جواب ملجائے یا کوئی کارخانہ اور مل ٹوٹ جائے تو گاؤں بیکار شدہ مزدوروں کو اپنی آغوشِ پناہ میں لینے کے لئے بہترین مقام ثابت ہوتے ہیں، اگر مزدوروں کا دیہاتوں سے تعلق نہ ہو تو ظاہر ہے کہ حکومت یا مالکانِ کارخانہ کو ناگہانی بیکاری یا ناکارگی کے انسداد کے لئے "بیمہ" کا ادارہ قائم کرنا پڑے گا لیکن رابطۂ دیہات کی صورت میں یہ مقصد خود بخود حل ہو جاتا ہے۔

سوم۔ دیہاتی اور شہری زندگی کا امتزاج شہروں اور گاؤں دونوں کے لئے مفید اور نفع بخش ہے۔ شہر مزدوروں کی صحت اور طاقت سے فائدہ اُٹھا سکتے ہیں، اور دیہات شہروں کی تہذیب و ترقی سے حصۂ وافر لے سکتی ہیں۔ اور اِس طرح پر تعصب و تنگ نظری کی جو وسیع خلیج آجکل دونوں کے درمیان حایل ہے وہ بہ آسانی پُر کی جاسکتی ہے۔

بنا بریں "مزدور کمیشن" کی یہ حتمی رائے ہے کہ

"موجودہ حالات میں مزدوروں کا دیہاتوں سے تعلق رکھنا بہر حال ایک گرانقدر اثاثہ ہے۔ اس لئے مذمت اور حوصلہ فرسائی کی بجائے ہمیں اس کو فروغ دینا اور منتظم بنانا چاہیئے۔" (لیبر کمیشن صفحہ ۱۷-۲۰)

اہم صنعتی مقامات میں مزدوروں کی بہمرسانی

اب ہم تفصیل کی خاطر ہندوستان کے بعض اہم صنعتی مقامات کے متعلق بتاتے ہیں کہ وہاں مزدور کہاں سے ہجرت کر کے آتے ہیں۔

(۱) بمبئی۔ بمبئی کی سب سے بڑی صنعت "پارچہ بافی" ہے، اس کے علاوہ وہاں ریلوے اور انجینیرنگ کی صنعتیں۔ آٹا اور تیل کی ملیں، لوہے، چمڑے اور بجلی کے کارخانے اور چھاپہ خانے وغیرہ بھی ہیں۔ بمبئی کے ۸۴ فیصدی باشندے باہر سے آکر وہاں آباد ہوئے ہیں (۱۹۳۱ء کے اعداد و شمار کے مطابق یہ نسبت ۴ ر ۵ ۷ ہو گئی تھی۔ لیکن اس کی صحت میں معاشین کو شک ہے) بمبئی کی "مزدور بہمرسانی" کے مراکز زیادہ تر دکن۔ کونکن اور علی الخصوص رتنگری کے اضلاع ہیں۔ علاوہ ازیں کاٹھیاواڑ۔ کچھ۔ یوپی، مدراس اور پنجاب وغیرہ سے بھی مزدور وہاں جاتے ہیں۔

(۲) احمد آباد اور شولاپور۔ احمد آباد کی اپنی آبادی کا صرف بیس فیصدی حصّہ کارخانوں میں ملازم ہے۔ باقی کے مزدور باہر سے آتے ہیں۔

(لیبر کمیشن رپورٹ صفحہ ۱۴) شولاپور میں بہ نسبت قدرے زیادہ ہے، بقیہ مزدور حیدرآباد دکن کی ریاست سے وہاں جاتے ہیں۔

(۳) **کلکتہ**۔ کی صنعت سن پاٹ بکلّی غیر صوبائی مزدوروں پر انحصار رکھتی ہے، جس کی وجہ یہ ہے کہ زمین کافی زرخیز ہے، اس لئے بنگالی خود کارخانوں کی زندگی پسند نہیں کرتے، وہاں یوپی، بہار، اُڑیسہ، مدراس اور سی پی سے مزدور ملازمت کے لئے جاتے ہیں۔

(۴) **کانپور**۔ کانپور میں اگرچہ پارچہ بافی سب سے بڑی صنعت ہے لیکن چمڑے، تیل، آٹے، چاول، کھانڈ، کیمیا اور انجینیرنگ کے کارخانے بھی بکثرت پائے جاتے ہیں۔ یہاں کے مزدور زیادہ تر کانپور کے اردگرد کے علاقے سے ہی تعلق رکھتے ہیں، یہاں چونکہ مزدوروں کے بود و باش کا انتظام نسبتاً اچھا ہے، اس لئے اُن میں "مہاجرانہ صفت" بھی کم ہے۔

(۵) **مدراس**۔ مدراس میں چونکہ کوئلہ کی کمی ہے، اس لئے یہاں صنعتی ترقی زیادہ نہیں ہوسکی۔ یہاں صرف چند پارچہ بافی اور چمڑے وغیرہ کے کارخانے ہیں۔ اُن میں مزدور زیادہ تر مدراس کے اپنے ہی باشندے ہوتے ہیں۔ بلکہ یہ صوبہ اپنے مزدور دیگر صنعتی مراکز کو بھی بکثرت بھیجتا ہے، چونکہ صنعتیں کم ہیں، اس لئے مزدور جو جگہ بھی چھوٹی موٹی ہے اُس پر قابض رہتا ہے اور بمبئی کی طرح ایک جگہ سے دوسری جگہ وہ متحرک نہیں رہتا۔[1]

(۶) **آسام**۔ آسام میں چائے کے وسیع رقبات ہیں۔ یہاں ہندوستان کے ہر گوشہ سے مزدور بکثرت جاتے ہیں۔ لیکن بھرتی کا طریق بہت مذموم ہے، ملازمت صرف "سرداروں" یا "دلالوں" کے ذریعہ مل سکتی ہے جو انجان مزدوروں سے خوب روپیہ اینٹھتے ہیں۔ ۱۹۳۲ء میں لیبر کمیشن کی سفارش پر گورنمنٹ نے آسام میں مزدوروں کی آمد کے متعلق ایک قانون پاس کیا تھا جس کی رُو سے صرف مصدقہ مزدور بھرتی کئے جاتے ہیں، اور اُن کو ایک مقررہ عرصہ سے قبل ملازمت چھوڑنی منع ہوتی ہے۔ باہر سے آنے والے ہر مزدور کو کم از کم نو روپے سالانہ بطور "محصولِ مقامی" Cess بھی دینا پڑتے ہیں۔

ہندوستانی مزدور کے مسائل

ہندوستان آہستہ آہستہ ایک صنعتی ملک بن رہا ہے۔ بمبئی، کلکتہ، کانپور، مدراس، احمد آباد، ناگپور اور جمشید پور وغیرہ میں متعدد کارخانے، ملیں اور فیکٹریاں جاری کی گئی ہیں، جن میں لاکھوں کروروں مزدور روزانہ کام کرکے اپنی روزی کماتے ہیں۔ جنگِ عظیم ۱۴ء نے جماعتِ عاملہ میں ایک جاگرتی پیدا کر دی ہے، اور اب مزدور اپنے حقوق اور مطالبات کے لئے ہر ممکن ذریعہ سے لڑتے ہیں۔ ہندوستان کی تحریکِ حزب العمال "بین الاقوامی مزدور تحریک" کے ساتھ متعلق ہوگئی ہے، اور لیگ آف نیشنز نے مناسب تحقیقات کے بعد ہندوستان کو صنعتی ممالک کی فہرست میں آٹھویں نمبر پر رکھا ہے۔ چنانچہ ہندوستان کے نمائندے ہر سال "بین الاقوامی مزدور کانفرنس" میں شامل ہوکر ہندی عاملین کے حقوق و مطالبات کی وکالت کرتے ہیں۔

ہندوستان میں قابل اور ماہر صنعتی مزدوروں کی ضرورت شدت سے محسوس کی جارہی ہے۔ چنانچہ ۱۹۲۹ء میں گورنمنٹ آف انڈیا نے بھی رائٹ آنریبل جے ایچ وہائٹلے کی صدارت میں ایک کمیشن اس بات کی تحقیق کے لئے مقرر کیا تھا کہ ہندوستانی مزدوروں کے موٹے موٹے مسائل کیا ہیں اور یہ کہ اُن کی اہلیت کارکردگی اور مہارت میں اضافہ کرنے کے لئے کیا کیا اقدام کرنا چاہیں۔

ہم ذیل میں ہندوستانی مزدوروں کے بعض اہم مسائل بیان کرتے ہیں۔

فیکٹریوں میں بھرتی

اکثر فیکٹریوں میں مزدوروں کی بھرتی براہِ راست نہیں ہوتی، بلکہ یہ کام ایک دلال (جس کو ملک میں سردار، مقدّم اور مستری کے مختلف ناموں سے پکارا جاتا ہے) کے ذریعہ سرانجام پاتا ہے۔

یہ دلال مزدوروں کے لئے کئی لحاظ سے ہادی سمجھا جاتا ہے، وہ مزدوروں کو اُدھار دیتا ہے، اُن کو خانگی مشورے دیتا ہے، اور اُن کے باہمی لڑائی جھگڑوں کا تصفیہ بھی کرتا ہے،

[1] "ہندوستانی صنعتوں میں مزدوروں کی کیفیت" جی ایم براڈش صفحہ ۱۴۸

چونکہ تمام مزدوروں کی بھرتی اس کے ذریعہ ہوتی ہے اس لئے نووارد مزدور کے لئے سوائے اس کے کوئی چارہ نہیں ہوتا کہ وہ دلاّل کو عارضی یا مستقل نوکری کے لئے کچھ رشوت پیش کرے۔ اس معاوضہ کو اصطلاحی زبان میں "دستوری" کہا جاتا ہے۔ اس کا کلکتہ کی جوٹ فیکٹریوں میں بہت رواج ہے۔

دلالوں کے علاوہ تنخواہ بانٹنے والے کلرک بھی اس لوٹ میں برابر کے شریک سمجھے جاتے ہیں اور علی الخصوص بیوہ مزدوروں کو بہت تنگ کیا جاتا ہے؎ بمبئی میں "نائیکیں" یہ کام کرتی ہیں، خصوصاً کپڑے کے کارخانوں میں جہاں عورتوں کی بھرتی زیادہ ہوتی ہے۔

یہ "چودھرانیاں" نوجوان لڑکیوں اور بیواؤں پر ڈورے ڈال کر اپنا اُلو سیدھا کر لیتی ہیں۔

اس دلالی کے طریق کو اب ہر جگہ مذموم قرار دیا جا رہا ہے۔ اس کے انسداد کا طریق یہ ہے کہ بھرتی، تقرر اور برخواستگی پر بلا واسطہ منضبط کیا جائے اور مِل کے افسر اِن شعبہ جات کی کڑی دیکھ بھال اور نگرانی کرتے رہیں۔

ای۔ ڈی۔ سیسون اینڈ کمپنی اور برہما آئیل شیل کمپنی نے خاص "افسرانِ مزدور رسد عامہ" ( ) مقرر کئے ہیں تاکہ وہ مزدوروں کی بھرتی اور اُن کی بہتری و بہبودی کا ہر وقت خیال رکھیں۔

گزشتہ عالمگیر کساد بازاری کی وجہ سے دلالی کے طریق کو بالکل اُڑا دینا ممکن نہیں ہو سکا۔ لیکن آہستہ آہستہ کوشش کی جا رہی ہے کہ بھرتی کے طریق میں اصلاح کی جائے۔

بہتر ہو گا کہ کارخانے مزدوروں کو اُن کی غیر حاضری کے بعد دوبارہ ملازم رکھنے کے لئے زیادہ آمادگی کا اظہار کریں۔ تاکہ مزدوروں کے دل میں بھی فیکٹریوں کے متعلق بہتر ہمدردی کا جذبہ پیدا ہو۔ اس مقصد کے لئے رخصت دہندگی اور ایام رخصت میں الاؤنس دینے کے قواعد پر غور کرنا چاہیئے۔ اس سے دلالوں کی طاقت کم ہو جائے گی، اور مزدور بھی مطمئن رہیں گے (لیبر کمیشن رپورٹ صفحہ ۲۳ تا ۲۷)

مزدوروں کے معاوضے

ہندوستان میں مزدوری کا معاوضہ علی العموم ماہانہ ہوتا ہے بمبئی میں عام طور پر کام کرنے کے اگلے مہینہ کی پندرہ تاریخ کو معاوضے تقسیم ہوتے ہیں۔ جس کے دوسرے معنے یہ ہوئے کہ ایک نووارد کو پورے ڈیڑھ مہینہ تک کام کرنے کے بعد اُجرت ملتی ہے۔ اس کا نقصان یہ ہوتا ہے کہ مزدور اپنا خرچ چلانے کے لئے مہاجنوں اور سود خواروں سے قرض لے لیتے ہیں اور اِس کو وہ مدت تک ادا نہیں کر سکتے۔

اِس مذموم طریق کی مدافعت میں مالکانِ کارخانہ یہ عذر پیش کرتے ہیں کہ چونکہ اکثر مزدور کام کو بلا اطلاع چھوڑ کر چلے جاتے ہیں، اس لئے یہ بقایا ہی ان کو روکنے کا بہترین ذریعہ ہے۔

کلکتہ میں تنخواہیں ہفتہ وار بٹتی ہیں۔ اور دوسرے ہفتے کے ختم ہونے پر دی جاتی ہیں۔ گویا مِل کے ذمے مزدور کا ایک ہفتے کا معاوضہ بقایا میں رہ جاتا ہے۔

احمد آباد میں چودہ سے لے کر سولہ دن کے بعد تنخواہیں دی جاتی ہیں۔

ستمبر ۱۹۲۴ء میں صوبوی حکومتوں کو اِس مسئلہ کی تحقیق و تفتیش کرنے کے لئے کہا گیا تھا۔ چنانچہ اِس تحقیق کا نتیجہ "انڈین انڈسٹریز اینڈ لیبرز کے بلیٹن نمبر ۳۴" ادائی معاوضہ کے وقفے" میں شائع ہوا تھا۔

اِس رپورٹ کو لیجسلیٹو اسمبلی میں پیش کیا گیا، جہاں فیصلہ ہوا کہ ایک "مجلس منتخبہ" اس پر غور کرنے کے لئے مقرر کی جائے، چنانچہ غور کے بعد ۱۹۳۵ء میں فیصلہ ہوا کہ

(۱) جو ریلوے یا فیکٹری یا صنعتی ادارہ کم از کم ایک ہزار مزدور ملازم رکھے اُس کے لئے ضروری ہو گا کہ مزدوروں کو ساتویں دن کے خاتمہ سے پہلے اُن کا معاوضہ دیدے۔

(۲) جو ادارہ ایک ہزار سے کم ملازم رکھے اُس کو چاہیئے کہ دسویں دن کے خاتمہ سے پہلے مزدوری ادا کرے۔

ہندوستان میں مزدوروں کے معاوضے دنیا بھر میں سب سے کم ہیں۔ چنانچہ فوسٹ کمیٹی نے (جو بمبئی کی ۱۹۲۸ء کی ہڑتال کی تحقیقات

؎ "ہندوستانی مزدور" جے ایچ کیلمن صفحہ ۱۰۸ — ۱۰۹

کے لئے مقرر کی گئی تھی) ہندوستانی معاوضوں کا تقابل انگلستان اور امریکہ کے معاوضوں سے حسبِ ذیل کیا ہے۔

ہندوستان میں ایک ماہ کی مزدوری (۲۶ دن ۱۰ گھنٹہ) تقریباً ۴۰ روپے
ریاستہائے متحدہ امریکہ " (۲۴ دن ۸ گھنٹہ) تقریباً ۲۱۰ "
انگلستان " (۲۴ دن ۸ گھنٹہ) تقریباً ۹۰ "

گویا اس ملک میں اوقاتِ کار بھی سب سے زیادہ ہیں اور مزدوری بھی سب سے کم ہے۔

گورنمنٹ بمبئی نے ۱۹۳۳ء میں احاطۂ بمبئی کے مزدوروں کے معاوضوں کے اعداد و شمار اکٹھا کئے تھے جو حسبِ ذیل ہیں۔

مراکز	روزانہ اوسط معاوضے											
	مرد			عورتیں			بچے			تمام جوان		
	روپیہ	آنہ	پائی	روپیہ	آنہ	پائی	روپیہ	آنہ	پائی	روپیہ	آنہ	پائی
بمبئی	۱	۳	۰	۰	۹	۹	۰	۰	۰	۱	۱	۰
احمدآباد	۱	۵	۰	۰	۱۱	۹	۰	۵	۰	۱	۳	۴
شولاپور	۰	۱۴	۵	۰	۵	۱۰	۰	۳	۶	۰	۱۲	۱۰

اگر اِن معاوضوں کا ماہانہ اوسط نکالا جائے تو نقشہ حسبِ ذیل ہوگا۔

صنف	اوسط ماہانہ معاوضے					
	بمبئی			شولاپور		
	روپے	آنے	پائی	روپے	آنے	پائی
مرد	۳۰	۱	۹	۲۰	۱۵	۰
عورتیں	۱۴	۳	۰	۸	۱۲	۰
بچے	۰	۰	۰	۵	۰	۰
تمام جوان	۲۶	۵	۶	۲۰	۰	۰

کلکتہ میں معاوضوں کا ماہوار اوسط چالیس روپے ہے اور آسام میں بتیس روپے۔ الغرض ہندوستان میں معاوضوں کا اوسط تیس چالیس روپے سے زیادہ نہیں ہے۔

ماہانہ مصارف

متذکرۃ الصدر معاوضوں کے بالمقابل اگر ہم مزدوروں کے اخراجات پر ایک نظر ڈالیں تو معلوم ہوگا کہ اُن کے لئے اس قلیل معاوضہ میں گزارا کرنے کی قطعاً کوئی ضرورت نہیں ہے۔

باوجودیکہ ہندوستان اپنے "کم معیارِ زندگی" کے لئے زبان زدِ خلائق ہے، مزدوروں کے ماہانہ مصارف اُن کی آمدنی سے بڑھ جاتے ہیں جس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ وہ فضول خرچ نہیں ہیں بلکہ اُن کی تنخواہ ہی کم ہے۔

۱۹۳۲-۳۳ء میں بمبئی کے "دفترِ عاملین" (   ) نے تحقیق کیا تھا کہ مزدوروں کے ایک پورے خاندان کے اوسط اخراجات ۴۵ روپے ۱۵ آنے ۹ پائی ہیں، چنانچہ تفصیل حسبِ ذیل ہے۔

مدات	اوسط ماہانہ خرچ			کل سے نسبت
	روپے	آنے	پائی	
خوراک	۳۱	۶	۱۰	۶ ر ۴۶ فیصدی
ایندھن اور روشنی	۳	۴	۴	۱۱ ر ۷
کپڑے اور جوتے وغیرہ	۳	۹	۰	۷۵ ر ۷
بستر اور خانگی ضروریات	۰	۱	۰	۱۳ ر ۰
کرایہ مکان	۵	۱۴	۳	۶ ر ۲۵
متفرقات	۱۱	۱۲	۰	۸۱ ر ۱۲
	۴۵	۱۵	۵	۱۰۰

ظاہر ہے کہ جب آمدنی صرف تیس چالیس روپے ہو اور خرچ ۴۵ روپے ۱۵ آنے ۵ پائی تو گزارہ کیسے ہو سکتا ہے؟

اگر اس فیملی بجٹ پر ایک نگاہ ڈالی جائے تو ہمیں کوئی اخراجات ناواجب نظر نہیں آتے۔ یہ کم سے کم اخراجات ہیں۔ اس سے زیادہ اور کیا تخفیف ہو سکتی ہے؟

مزدوروں کے بجٹ میں صرف ایک چیز قابلِ اعتراض نظر آتی ہے، وہ اپنی آمدنی کا کچھ حصہ شراب پر بھی صرف کرتے ہیں جس سے اُن کی اخلاقی جسمانی اور دماغی قوتیں زائل ہو جاتی ہیں، شراب کا ایک حقِ جواز مزدور یہ پیش کرتے ہیں کہ یہ اُنھیں اپنے گوناگوں تفکرات کو گم کر دینے میں مدد ہوتی ہے لیکن سوال یہ ہے کہ آیا تفکرات کو گم کرنا بہتر ہے یا اُن کا کوئی مداوا سوچنا؟

معاوضوں میں اضافہ کرنا

اخراجات کی فراوانی اور آمدنی کی کمی مزدوروں کی اہلیتِ کارکردگی

پر بھی اثر انداز ہوتی ہے۔ اس لئے اکثر مفکرین یہ تجویز پیش کرتے ہیں کہ مزدوروں کے معاوضوں میں خاطر خواہ اضافہ کیا جائے۔

لیکن بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اگر ہندوستانی مزدوروں کو زیادہ تنخواہیں دی گئیں تو وہ سب کچھ شراب اور جوئے میں ضائع کر دیں گے اور اس طرح سے اضافے کا اصل مقصد بالکل فوت ہو جائے گا، اس اعتراض کا جواب مشہور ماہر معاشیات پروفیسر پیگو Pigou نے یوں دیا ہے۔

"یہ صحیح ہے کہ بعض اوقات جب آمدنیوں میں فوری اضافہ کیا جاتا ہے تو ایسے لوگ جو عرصہ دراز تک محروم قسمت رہے ہیں، احمقانہ اخراجات کی طرف مائل ہو جاتے ہیں اور معاشی ترقی رک جاتی ہے۔ لیکن اگر یہ اضافہ کچھ زیادہ دیر تک رکھا جائے تو یہ حالت دور ہو جائے گی بلکہ اگر اضافہ تدریجی ہو تو یہ حالت پیدا ہی نہ ہوگی ۔۔۔۔۔"

("معاشیات مسرت" پیگو صفحہ ۵۳)

پس مزعومہ خطرہ کے ازالہ کے لئے تدریجی اضافہ بہترین رہے گا۔

دراصل جب تک اس باب میں کوئی بین الاقوامی اقدام نہ کیا جائے گا امن کا قیام مشکل ہے، کیونکہ جس جگہ اجرتوں میں اضافہ ہوگا وہاں تمام مزدور منتقل ہونا شروع ہو جائیں گے، اور دوسرے کم اجرت دہندہ مقام پر بھی ناروا اضطراب و احتجاج پیدا ہوگا۔

۱۹۲۸ء میں "گیارہویں بین الاقوامی مزدور کانفرنس" جنیوا کے مقام پر منعقد ہوئی تھی۔ جس میں فیصلہ کیا گیا کہ ایک ایسا نظام قائم کیا جائے جو تنخواہوں اور معاوضوں کا کم سے کم معیار مقرر کرے۔ اس کے لئے بھی "ارتقائی اصول" کا نظر انداز کرنا مناسب نہ ہوگا۔ (لیبر کمیشن صفحہ ۲۱۲-۲۱۳)

صنعتی مزدوروں کے مقروضات

تنخواہوں کی بے قاعدگی آمدنی کی کمی اور اخراجات کی زیادتی کا ایک بڑا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ "قرضہ" بھی مزدوروں کا ایک بہت بڑا مسئلہ بن گیا ہے۔ اندازہ ہے کہ شاید ہی کوئی صنعتی مرکز ہو جس کی ۳/۴ آبادی قرض کے بے پناہ جال میں نہ پھنسی ہو۔ ہر شخص کو قریباً تین ماہ کی تنخواہ کے برابر قرضہ ادا کرنا ہے۔ یہ زیادہ تر سامان خورد و نوش مہیا کرنے والوں کے ذمہ ہے، کیونکہ مزدور از حد کسمپرس، نادار اور قلاش ہوتے ہیں، اس لئے تھوڑی سی رقم بھی مہینوں تک ادا نہیں ہو سکتی۔ مقروض صنعتی مزدوروں کی حالت زراعتی مقروضین کی نسبت زیادہ قابل رحم ہوتی ہے۔ یہ اس لئے کہ ایک جگہ سے دوسری جگہ اور ایک فیکٹری سے دوسری فیکٹری کو منتقل ہوتا رہتا ہے۔

اس لئے قرضہ اٹھانے میں بہت سی دقتیں درپیش ہوتی ہیں۔ وہ شہر میں چونکہ نو وارد ہوتا ہے اس لئے اس پر کوئی اعتبار نہیں کرتا اور نہ وہ کاشتکاروں کی طرح کوئی ٹھوس ضمانت پیش کر سکتا ہے، اندریں حالات اسے شرح سود دیہاتی مقروضین کی نسبت کہیں زیادہ دینا پڑتی ہے۔ بالعموم وہ پٹھانوں سے قرض لیتے ہیں اور پٹھان سود خوار ظاہر ہے کہ کس قدر "خونخوار درندے" ہوتے ہیں۔

صورت حالات کی اصلاح کا سب سے موثر طریق یہ ہے کہ ایسے قوانین نافذ کئے جائیں، جن سے مزدوروں کو روپیہ قرض پر دینا چنداں منفعت بخش نہ رہے۔ چنانچہ لیبر کمیشن نے تجویز کی ہے کہ تین سو روپیہ سالانہ سے کم اجرت کمانے والے عاملین کی تنخواہ اور پراویڈنٹ فنڈ کو قرق نہ کیا جائے، اور جب تک یہ ثابت نہ ہو جائے کہ مزدور دیدہ و دانستہ ادائیگی سے گریز کرتا ہے اسے قید بھی نہ کیا جائے۔ اگر معاملہ عدالت میں جائے تو وہ ایسے طریق سے فیصلہ کرے جس سے کہ مزدور پر ناواجب سختی نہ ہو۔

جرمانے اور کٹوتیاں

اگر کوئی چیز ٹوٹ جائے یا کارخانے کا کوئی نقصان ہو جائے تو اس کا تاوان بھی مزدور کو بھرنا پڑتا ہے۔ پہلے یہ جرمانے بہت غیر متعین اور ناواجب ہوتے تھے، اب مسودہ "ادائیگی اجرت" کی رو سے کوئی جرمانہ کسی ایسے قصور کی بنا پر عاید نہیں کیا جا سکتا جس کا ذکر صوبائی یا مرکزی گورنمنٹ کی اجازت سے قواعد و ضوابط میں درج نہ ہو۔ ایسے منظور شدہ قصوروں کی فہرست فیکٹری میں مناسب جگہ پر لٹکانی ضروری ہے۔ کوئی جرمانہ دو پیسے فی روپیہ سے زیادہ نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح پندرہ سال سے کم مزدور سے جرمانہ لینا بھی منع قرار دیا گیا ہے۔

اجرت سے صرف مندرجہ ذیل قسم کی رقومات وضع کی جا سکیں گی۔

ہرجانے، غیر حاضری کے جرمانے، روپیہ یا مال کا نقصان، انکم ٹیکس، کرایہ مکان پیشگی کی واپسی، پراویڈنٹ فنڈ، بیمہ یا امدادِ باہمی کا چندہ یا کوئی اور ایسی رقم جس کی منظوری صوبوی یا مرکزی حکومت سے پیشتر ازیں لیلی گئی ہو۔

اوقاتِ کار

ہندوستان میں اوقات کار بھی تمام ملکوں سے زیادہ ہیں۔ اگر برطانیہ یا امریکہ کے مزدور ایک مہینہ میں ۲۴ دن ۸ گھنٹے کام کرتے ہیں تو ہندوستان میں کام کے دن ۲۷ دن ۱۰ گھنٹے ہوتے ہیں۔

۱۹۱۱ء فیکٹری ایکٹ کی رُو سے پارچہ بافی کی ملوں کے لئے اوقاتِ کار کی حد ۱۲ گھنٹے مقرر کی گئی۔ لیکن مالکانِ مِل کا خیال ہے کہ حقیقت میں مزدور صرف ۸ گھنٹے ہی روزانہ کام کرتے ہیں۔ بوجہ آوارہ گردی کی عادت کے وہ اِدھر اُدھر پھرتے رہتے ہیں، اس لئے کام باقاعدہ نہیں رہتا۔ نیز بوجہ سیلانی عادت کے وہ ایک ہی جگہ جم کر کام نہیں کرسکتے، لیکن آوارہ گردی کو "ہندوستانیوں کی عادت" قرار دینے کی بجائے ہمیں یہ کہنا چاہیئے کہ فیکٹریوں کی اندرونی حالت مزدوروں کے لئے چنداں قابلِ کشش نہیں۔ اگر کارخانوں میں مزدوروں کو زیادہ سہولتیں بہم پہنچائی جائیں تو کوئی وجہ نہیں کہ وہ دلجمعی سے کام نہ کریں، کلکتہ میں جوٹ ملوں کی حالت بہتر ہے، یہی وجہ ہے کہ وہاں اوقاتِ کار بھی آٹھ گھنٹے سے زیادہ نہیں ہیں۔

۱۹۳۲ء کے قانون کے مطابق اوقاتِ کار ۱۱ گھنٹے روزانہ اور ۶۰ گھنٹے فی ہفتہ کردیئے گئے۔ یہی اوقات عورتوں کے لئے مقرر کئے گئے بچوں کو ۵ یا ۶ گھنٹے سے زیادہ کام کرنے کی اجازت نہیں ہے۔

باوجود ان تحدیدات کے جب ہم معاوضہ کی طرف نگاہ کرتے ہیں تو یہ اوقاتِ کار ظالمانہ ہی معلوم ہوتے ہیں۔

بچّوں اور عورتوں کی ملازمت

بچوں اور عورتوں کی کارخانوں میں ملازمت نہایت قابلِ اعتراض ہے، بچے اپنی تعلیم مکمل نہیں کرسکتے اور عورتیں اِس کام کے لئے بنائی ہی نہیں گئیں۔ لیکن غربت سب کچھ کراتی ہے، ہندوستانی خاندان اس قدر غریب ہیں کہ جب تک وہ بچوں اور عورتوں کو ملازمت کے لئے مجبور نہ کریں اُن کا گزارہ نہیں ہوسکتا۔

۱۹۳۲ء میں برطانوی ہند کے چودہ لاکھ تین ہزار دو سو بارہ آجرین میں سے دو لاکھ سولہ ہزار آٹھ سو سینتیس عورتیں اور اُنیس ہزار اکانوے بچے تھے۔

وہائٹلے کمیشن کی رپورٹ میں عورتوں اور آٹھ برس کے بچوں کے ساتھ جو سلوک ہوتا ہے اُس کا ذکر بدیں الفاظ کیا گیا ہے۔

"کارخانوں میں عورتوں اور بچوں سے ڈنڈوں، بیدوں اور دوسری قسم کی مار پیٹ سے کام لیا جاتا ہے۔ جب اِن مزدوروں کو مار پڑتی ہے تو کارخانوں میں ایک ہنگامہ برپا ہوجاتا ہے، اور اِس قدر گرد وغبار اُڑاتا ہے کہ وہاں کھڑا ہونا محال ہوتا ہے۔ مزدور ماؤں کے بچے گندے کپڑے پہنے قریب ہی دھول اور ریت پر لیٹے ہوئے نظر آتے ہیں۔ یہ بچے اپنے سانس کے ساتھ گرد وغبار بھی کھینچتے رہتے ہیں۔"

(لیبر کمیشن)

پھر بیڑی کے کارخانوں کے متعلق لکھا ہے

"بیڑی کے کارخانوں میں پانچ پانچ برس کے بچے کام کرتے نظر آتے ہیں، اُنھیں پورے دن کے کام کے بعد بھی کوئی وقفہ آرام کا نہیں ملتا چہ جائیکہ ہفتہ میں آرام کا کوئی دن۔ یہ بچے صرف دو آنے یومیہ پر ۱۰۔۱۲ گھنٹے روزانہ کام کرتے ہیں۔"[۱]

عورتوں کو بھی آرام کا موقع بہت کم ملتا ہے۔ وہ ایک ہاتھ سے بچہ سنبھالتی ہیں اور دوسرے سے کام کرتی ہیں۔ حاملہ عورتیں محض ملازمت کے چھوٹ جانے کے ڈر سے فیکٹری میں ہی بچہ جن دیتی ہیں۔ چنانچہ ۱۹۲۲ء کی سرکاری رپورٹ کے مطابق ۱۴۲ حاملہ عورتوں میں سے ۱۰۲ عورتوں نے اپنے بچے کارخانوں میں جنے۔[۲]

جو عورتیں کارخانوں میں اپنے بچے نہیں لاتیں وہ اُن کو افیون کھلا کر آتی ہیں تاکہ وہ خاموشی سے شام تک سوتے رہیں۔ ۱۹۲۲ء کی سرکاری رپورٹ مظہر ہے کہ ۹۸ فیصدی بچوں کو افیون کھلائی جاتی ہے۔[۲]

---

[۱] دیکھو شریڈ اور فرٹ وینگلر [۲] بمبئی لیبر گزٹ ستمبر ۱۹۲۲ء

کارگاہوں کی حالتِ زار

مزدوروں کی صحت اور اہلیتِ کارکردگی برقرار رکھنے کے لئے ضروری ہے کہ کارخانوں میں روشنی، ٹمپریچر، کھانے پینے، اور نہانے دھونے وغیرہ کے انتظام کا خاص طور پر خیال رکھا جائے۔

ہندوستان میں اب اِس طرف توجہ ہو رہی ہے، لیکن خاطر خواہ نہیں۔

پارچہ بافی کی ملیں کئی منزلہ ہوتی ہیں، اس لئے اُن میں سوائے اوپر کی منزل کے ہوا اور روشنی کا انتظام کرنا کوئی آسان بات نہیں ہے۔ لیکن اِس کو نظر انداز کرنا بھی ممکن نہیں ہے، کیونکہ تجربہ سے ثابت ہوا ہے کہ پارچہ بافی کے جس کمرہ میں روشنی کا انتظام کم ہو اُس میں مزدوروں کی اہلیتِ کارکردگی بیس فیصدی کم ہو جاتی ہے۔

اکثر فیکٹریوں میں مزدوروں کے بیٹھ کر کھانے کے لئے کسی علیحدہ کمرے یا جگہ کا انتظام نہیں ہے، اُن کو یا تو کھلے صحن میں اور یا پھر مشین کے پاس بیٹھ کر ہی کھانا کھانا پڑتا ہے۔ مدراس کی کرناٹک اور بکنگھم ملز نے ہر فرقہ کے لوگوں کے لئے جداگانہ کھانے کے شیڈ تعمیر کئے ہیں۔ لیکن باقی جگہ ایسے انتظام کی سخت ضرورت ہے۔ جب تک فرقہ واری، تعصب اور رسومات موجود ہیں ہمیں مزدوروں کے "مذہبی احساسات" کا بھی خیال رکھنا پڑے گا۔

پھر رفعِ حاجت اور غسل کے لئے بھی پورا انتظام ہونا چاہیئے۔ بظاہر یہ معمولی باتیں نظر آتی ہیں، لیکن اِن کا اہلیتِ کارکردگی پر بہت گراں قدر اثر پڑتا ہے۔

احمد آباد کے کارخانے بیس پچیس روپے سالانہ والدین کو دے کر لڑکے مزدور بھرتی کر لیتے ہیں، اور اُن کی رہائش اور خورد و نوش کا انتظام بھی خود ہی کرتے ہیں۔ یہ انتظام جس قدر ناقص اور خراب ہوتا ہے وہ بیان نہیں کیا جا سکتا۔ کارخانے والے ہمیشہ یہی کوشش کرتے ہیں کہ اُن پر کم سے کم خرچ کیا جائے[1]

رہائش کا انتظام

مزدوروں کی رہائش کے لئے اچھے مکانات کا انتظام بھی ضروری ہے کیونکہ ―― اچھی رہائش کا مطلب یہ ہے کہ گھر کی زندگی، صحت اور مسرت کا دور دورہ ہو۔ غیر تسلی بخش مکانات بیماری، بد اخلاقی، اور جرم کا گہوارہ ہوتے ہیں، اور اُن سے ہسپتالوں، زہروں اور پاگل خانوں کی طلب بڑھ جاتی ہے، اور یہ سوسائٹی کا اپنا قصور ہے"

(صفحہ ۲۰ "بمبئی میں مزدوری اور مکانات کی حالت" مصنفہ برنٹ)

ہندوستان میں مزدوروں کی بود و باش کا انتظام از حد غیر تسلی بخش ہے۔ بالعموم مزدور یک منزلہ تنگ و تاریک کوٹھریوں میں رہتے ہیں جن میں نہ کوئی کھڑکی ہوتی ہے اور نہ روشنی اور ہوا کا گزر۔

لندن میں صرف چھ فیصدی آبادی کوٹھریوں میں رہتی ہے اور فی کوٹھری اقامت گزینوں کا اوسط صرف ۱٫۹۲ ہے۔ درآنحالیکہ ہندوستان کے ستر فیصدی مزدور بند کوٹھریوں میں رہتے ہیں اور ایک کوٹھری میں رہائش رکھنے والے مزدوروں کی تعداد کا اوسط ۴٫۰۳ ہے۔ اس سے معلوم ہو سکتا ہے کہ ہندوستان میں گنجانی کا کیا حال ہے۔

پھر اگر فرانس اور بلجیم میں ایک مزدور کے پاس دو کمرے ہیں، جرمنی میں تین اور انگلستان اور ویلز میں چار بلکہ پانچ تو ہندوستان میں ایک مزدور کے پاس صرف ایک کمرہ ہے، اور اُس میں بھی وہ اکیلا نہیں رہتا بلکہ متوسلین اور یار دوست بھی وہیں ڈیرا جما لیتے ہیں۔ چنانچہ وہائٹلے رپورٹ رقمطراز ہے۔

"۲۲-۱۹۲۱ء کی تحقیقات سے معلوم ہوا ہے کہ بمبئی میں ۷۰ فیصدی مکانات صرف ایک کوٹھری پر مشتمل ہیں جن میں ۶ سے لیکر ۹ آدمی تک رہتے ہیں، کراچی میں مزدوروں کی ½ آبادی اِنہی کوٹھریوں میں رہتی ہے۔ یہی حالت احمد آباد۔ کانپور۔ کلکتہ وغیرہ کی ہے"

۱۹۳۱ء میں "پارچہ بافی کی یونین" نے ایک رپورٹ شائع کی تھی جس میں لکھا کہ احمد آباد میں قریباً سولہ ہزار کوٹھریاں ایسی ہیں جن میں انسان رہائش نہیں رکھ سکتا، کیونکہ اِن میں نہ ہَوا کا گزر ہے اور نہ روشنی کا۔

جن مقامات پر مزدوروں کی بستیاں آباد ہیں یا اُن کے لئے کوارٹر بنائے گئے ہیں وہاں گلی کوچے اِس قدر تنگ و تاریک رکھے گئے ہیں اور نالیوں وغیرہ کا طریق اس قدر خراب ہے کہ وہاں بارہ ماہ گندگی، میلا اور کیچڑ اکٹھا رہتے ہیں، جن میں ہر قسم کے جراثیم پرورش پاتے رہتے ہیں۔ اِنہی گندگی کے ڈھیروں میں مزدوروں کے بیوی بچے گزارا کرتے ہیں۔ اِنہی میں پیدا ہوتے ہیں اور اِنہی میں مر جاتے ہیں۔

[1] "ہندوستان کی صنعتِ روئی" ۱۹۳۰ء پیرس

مکانات کی بہتری کے لئے وہائٹلے کمیشن کی سفارشات حسب ذیل ہیں،

(۱) صوبوی حکومتوں کو اِس مسئلہ پر مناسب لوگوں سے مشورہ لینا چاہئے،

(۲) گورنمنٹ کو روشنی۔ ہوا۔ پانی اور نالیوں وغیرہ کے انتظام کے لئے ایک کم سے کم معیار مقرر کر دینا چاہئیے۔

(۳) جہاں ضروری ہو "شہر سدھار" کے قوانین نافذ کرنا چاہئیں۔

(۴) ہر امپرومنٹ ٹرسٹ کے لئے ضروری قرار دیا جائے کہ وہ مزدوروں کے مکانات کی بھی اصلاح کرے۔

(۵) عمارتوں کے لئے "امدادِ باہمی" کی مجالس قائم کی جائیں۔

(۶) میونسپلٹیوں کو صحت اور تعمیر وغیرہ کے باب میں اپنے قوانین پر نظر ثانی کرنی چاہئیے۔ (لیبر کمیشن باب ۱۵)

علاوہ ازیں مزدوروں کی تعلیم اور اُنھیں حفظانِ صحت کے متعلق واقفیت پہونچانا بھی کم اہم نہیں ہے۔

ناقص غذا

ہندوستانی مزدور بالعموم کمزور صحت اور لاغر جسم کا مالک ہوتا ہے۔ جس کی وجہ یہ ہے کہ اُسے ایک طرف تو کام نہایت مشقت طلب کرنا پڑتا ہے اور دوسری طرف اُسے خوراک نہایت ناقص اور خراب ملتی ہے،

جو غذا ایک اوسط درجہ کا مزدور کھاتا ہے اول تو وہ ہوتی بہت کم ہے اور دوسرے اُس میں حیاتین یا وٹامین نام کو نہیں ہوتے۔

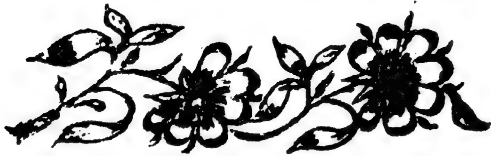
ناقص غذا کی وجہ سے معدے کی بہت سی بیماریاں مزدور کو لاحق ہو جاتی ہیں جو اُس کی عمر، صحت اور اہلیتِ کارکردگی پر بُری طرح اثر انداز ہوتی ہیں۔

جب وبائیں پھیلتی ہیں تو اُن کا سب سے پہلے شکار کارخانے کا مزدور ہوتا ہے۔ جس کی وجہ اُس میں قوتِ مدافعت کی کمی ہے،

سر جون میگو کی رپورٹ سے معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان میں صرف ۳۹ فیصدی لوگ ایسے ہیں جن کو مناسب خوراک ملتی ہے۔ ۴۱ فیصدی خراب کھانے سے اپنا گزارہ چلاتے ہیں۔ باقی ۲۰ فیصدی کو بدترین خوراک میسر آتی ہے۔

طبی امداد پہونچانے کے لئے کارخانے والے اور گورنمنٹ ہسپتال اور ڈسپنسریاں قائم کر رہی ہے، لیکن اصل علاج عمدہ خوراک۔ کم اوقاتِ کار اور حفظانِ صحت کی تعلیم ہے۔

مزدوروں کی حالت سُدھارنے کے لئے گورنمنٹ نے کیا کیا ہے، اِس کا ذکر کسی آئندہ مضمون میں آئے گا جس کا عنوان ہوگا "ہندوستان کے مزدور قوانین" اور مزدوروں نے خود اپنے مقام کو بلند کرنے کے لئے کیا کیا ہے۔ اِس کا تذکرہ ہم "ہندوستان میں تحریکِ حزب العمال" کے تحت کریں گے، اسی طرح مزدوروں کے متعلق دیگر باتوں کا آئندہ کے مضامین میں کیا جائے گا۔



سر کسی کہنہ ستمگار کروں گا تسلیم
سر کو ہن کا شہر یار کروں گا تسلیم
ہر خس کا بھی راز جان لیگا جبروت
اللہ سے میں دو چار کروں گا تسلیم
جوش

گرداب سے کھیل کر ابھرنے والے
منبعِ تجربات اے نہ ڈرنے والے
اس ارض کا تحفۂ خلافت ہے قبول
فردوس بنا اے گناہ کرنے والے
انیس

نئی چنگاری

شعور نے کا سینہ سوزِ نو سے مجمر آرا ہے
جو چنگاری ہے سورج ہے جو شعلہ ہے ستارا ہے

حریم ذات میں رقصِ صفت کا شور برپا ہے
عروسِ حسن کو پھر جلوہ کرنے کی تمنا ہے

حضورِ عشق اب دن رات جلوؤں کا تماشا ہے
کہ جو پنہاں ہی پنہاں تھا وہ اب پیدا ہی پیدا ہے

نہ زمزم ہے، نہ دجلہ ہے نہ گنگا ہے نہ جمنا ہے!
نمِ یک قطرہ نقاشِ دمِ ہر موجِ دریا ہے

حریم ناز سے کچھ بجلیاں پیغام لائی ہیں
کہ پھر منظور اُن کو امتحانِ عشق رسوا ہے

رباطِ عشق کے دیوار و در انگڑائی لیتے ہیں
جو ذرہ ہے وہ ہم آغوشِ محرابِ تمنا ہے

لباسِ کہنہ سوزِ حسن نے سب خاک کر ڈالے
تمنا کو بھی اک پیراہنِ نو کی تمنا ہے

جنوں میدانِ دار و گیر میں ہنس ہنس کے کہتا ہے
"ازل بھی اک تماشا تھا" ابد بھی اک تماشا ہے

مری جرأت کا یہ مصرف ہے اے بازی گہِ فطرت
کہ اک جانِ حزیں ہے اور تماشے پر تماشا ہے

نیا بادہ نیا ساغر نیا ساقی نئے میکش
سوادِ خشتِ خم سے اک عجب عالم برستا ہے

جبینِ دہر پر جو آتشیں نقشِ غلامی تھا
وہی خورشید گو کل ہمسرِ مہرِ کلیسا ہے

دلِ ساقی میں کیا سیلاب ہے یہ تو وہی جانے
نظر سے انقلابِ کیف کا طوفاں پیدا ہے

حقیقت اصل میں مخلوق ہے خلاقِ "باطل" کی
"یدِ بیضا" طلسمِ سامری ہی کا نتیجا ہے

کبھی اے سادہ دل تو نے نظر ڈالی بھی ہے دل پر
جو ہر انسان پر نازل ہوا یہ وہ صحیفا ہے

نیا اک نقشہ، کون و مکاں تیار ہے ساغر
پرِ جبریل پر ہلکا سا پر تو میں نے دیکھا ہے

ساغر

ہندوستان کی جمہوری زبان

امام اکبرآبادی

(۴)

اس کے بعد ذیل کا نقشہ پیش کیا جاتا ہے۔ یہ اخبارات و رسائل کی تعداد بتائے گی کہ ہندوستان کی مختلف زبانوں میں کتنے اخبار و رسائل نکلتے ہیں۔ ان میں کتنے ہفتہ وار ہیں؟ کتنے ماہانہ و سالانہ، اور کتنے روزانہ، نیز یہ کہ کس زبان کی اشاعت سب سے زیادہ ہے۔

اشاعتی نقشہ

نام زبان	تعداد اخبار و رسائل	روزانہ	ہفتہ وار	ماہانہ و سالانہ
اندھرا	۱۰۸	۲	۲۵	۸۱
آسامی	۱۰	۰	۲	۸
بنگالی	۲۳۸	۸	۱۲۲	۱۰۸
گجراتی	۲۴۱	۱۸	۶۵	۱۵۸
گورمکھی	۴۱	۳	۱۵	۲۳
ہندی	۴۱۰	۳۰	۱۰۶	۲۷۴
کناڑی	۸۹	۱۱	۲۹	۴۹
ملیالم	۸۰	۳	۱۴	۶۳
اڑیا	۵۶	۴	۱۴	۳۸
مرہٹی	۲۵۴	۱۳	۶۸	۱۷۳
سندھی	۸۹	۱۱	۴۷	۳۱
تامل	۱۵۳	۱۰	۳۴	۱۰۹
اردو	۸۱۲	۵۷	۳۴۲	۴۱۳

اس نقشہ کے دیکھنے سے بھی یہ ثابت ہوگیا کہ اردو زبان کے نہ صرف بولنے اور سمجھنے والوں کی تعداد زیادہ ہے بلکہ اشاعت کے لحاظ سے بھی اسی زبان کو شرف اولیت حاصل ہے۔ ڈاکٹر گستاؤلی بان محقق زبان کا نقشہ۔ انڈین نیشنل کانگریس کا نقشہ، جو خود ہندو دوستوں نے اقلیتوں کے سامنے پیش کیا ہے اور مندرجہ صدر اشاعتی نقشے سے بھی یہ صاف متبادر ہے کہ ہندوستان میں کونسی زبان جمہوری زبان بننے کے قابل ہے؟ اور کس زبان کا حق ہے کہ وہ حکومت ہند کی کرسی پر بیٹھے؟ تھوڑی دیر کے لئے ابھی فیصلہ نہ سنائیے بلکہ لگے ہاتھوں کچھ اور بھی سن لیجئے کہ یہ "داستانِ رنگین بیان" یہیں پر ختم نہیں ہوتی، بلکہ ہندوستان کے باہر بھی نظر اٹھا کر دیکھئے کہ وہاں ہند کی "ہندی" کے چرچے ہیں یا اردو کے۔

ہندوستان کے اکثر لوگ غیر ولائتوں میں سفر کرتے رہتے ہیں خصوصاً مسلمان اسلامی ممالک کے سفر ہر سال کرتے رہتے ہیں۔ میں نے بھی غیر ولایت کے سفر کئے ہیں، اور ہمیشہ ہر جگہ اردو زبان کی جستجو میں رہا ہوں، اعداد و شمار بھی میں نے مختلف ذرائع سے حاصل کئے ہیں۔ اس بنا پر میں بتا دینا چاہتا ہوں کہ اردو زبان ہر حیثیت سے نہ صرف ہندوستان کی زبان بلکہ ساری دنیا کی زبان بننے کے قابل ہے۔ بشرطیکہ ہندو دوست کچھ مدت تک مخالفت کرنا چھوڑ دیں، اور معاونت کی طرف اقدام کریں۔

چونکہ اول روز سے اس زبان کی پرورش دونوں قوموں نے کی ہے

بلکہ انگریز بھی اس پرورش میں شریک ہیں کہ اُنھوں نے اردو کو اپنی حکومت کی کرسی کا صدر نشین بنایا تھا۔ پس اگر اس تاریخی یادگار کو قائم رکھا جائے جس سے نہ تو کسی کے مذہب کو صدمہ پہنچا نہ قومی و سیاسی معاملات کو، تو کیا حرج ہے؟ کیا قباحت ہے؟ کونسی آفت اور کونسا قہر نازل ہو جائے گا۔

۱۸۳۶ء میں جسے آج سو سال کا زمانہ گزرا۔ اُس وقت اردو زبان کا صرف ایک اخبار تھا، جو سب سے پہلے مولانا محمد حسین آزاد نے دہلی سے جاری کیا تھا۔ مگر آج ۸۱۲ اخبار و رسائل کی تعداد ہے۔ ایسی ہونہار زبان کا استیصال کرنا ظلم کے مترادف ہوگا۔

آج ۱۹۳۶ء میں ہندوستان کی کل مردم شماری ۳۸ کروڑ کے لگ بھگ ہوگی۔ اس شمار میں گذشتہ شائع شدہ نقشوں کی رُو سے کم و بیش ہندوستان کے اندر ۲۴-۲۵ کروڑ انسان اس زبان سے ہر صورت آشنا ہیں۔ اس کے علاوہ ہندوستان سے باہر اسلامی و غیر اسلامی ممالک بھی اس زبان کو جانتے ہیں جس کا نقشہ درج ذیل ہے۔

نقشہ بیرونِ ہند

نام مقام	اردو بولنے اور سمجھنے والوں کا شمار
کابل مع علاقہ غیر	پچاس لاکھ
ایران	بیس لاکھ
گلگت۔ بلخ۔ بخارا۔ ختن	پچاس لاکھ
تمام عربستان مع عدن	پچانوے لاکھ
زنجبار۔ سیلون۔ افریقہ	تیس لاکھ
تمام یورپ و امریکہ	بیس لاکھ
جاپان و سنگاپور	پانچ لاکھ
مختلف اسلامی مقامات	پندرہ لاکھ
میزان کل	دو کروڑ پچاسی لاکھ

کابل میں ہزارہا ہندوستانی آباد ہیں اور یہاں کے اصلی باشندے اکثر اردو جانتے ہیں۔ علاقہ غیر میں بعض جگہ اردو پڑھائی جاتی ہے۔ ایران میں بھی ہزارہا ہندوستانی آباد ہیں جن کے ذریعے وہاں کے اکثر باشندے اردو سے واقف ہیں۔ گلگت، بلخ، بخارا اور ختن کے مکاتیب میں اردو پڑھائی جاتی ہے، عربستان میں ہزارہا ہندوستانی خاندان آباد ہیں، اور ہر سال ہزارہا ہندوستانی فرضِ حج کے لئے جاتے ہیں، اُن کے خلط ملط سے عرب کے تقریباً تمام شہری باشندوں کے علاوہ بدوی لوگ بھی اردو سے واقف ہیں۔ زنجبار، سیلون اور افریقہ میں بھی کثرت سے ہندوستانی آباد ہیں، اور اول الذکر مقامات پر اردو پڑھائی جاتی ہے۔ یورپ و امریکہ میں بھی ہندوستانی آباد ہیں، اور برسوں سے ہزارہا انگریز عہدے دار ہندوستان آتے جاتے رہے ہیں، اور یہ تمام اردو جاننے پر مجبور ہوتے ہیں۔

ان میں سے بعض مقامات پر میں خود گیا ہوں اور بعض مقامات سے اردو میں خط و کتابت کرتا رہا ہوں۔ اس بنا پر میں کہتا ہوں کہ مندرجہ بالا مقامات پر ہر جگہ اردو بولی اور سمجھی جاتی ہے۔

دنیا کی مردم شماری ۱۹۱۱ء میں ڈیڑھ ارب تھی اور آج پونے دو ارب سمجھی جاتی ہے۔ اس آبادی میں اردو زبان کے لکھنے پڑھنے، بولنے اور سمجھنے والے کم و بیش ۲۷ کروڑ انسان ہیں۔ یہ ظاہر ہے کہ اس زبان کی بنا پندرہویں صدی عیسوی میں پڑی تھی جس کو کم و بیش ساڑھے چار سو سال کا زمانہ گزرا۔ اس مدت میں اس کی ترقی حیرت افزا و تعجب خیز ہے۔ اسی سے محسوس ہوتا ہے کہ اس کی جاذبیت، حلاوت، سلاست، اور دلکشی ایسی ہے کہ جس کی وجہ سے یہ برقی سرعت کے ساتھ بڑھتی چلی جا رہی ہے۔

باوجود اس کے کہ یہ ایک فرعی زبان ہے، باوجود اس کے کہ کوئی حکومت اس کی سرپرست نہیں اور باوجود اس کے کہ چند سال سے برادرانِ وطن اس کے مٹانے پر تُلے ہوئے ہیں، لیکن اس کی سحر آفرینی کا اثر برابر بڑھتا چلا جا رہا ہے۔ خصوصاً گذشتہ تیس سال کے دوران میں اس نے باوجود سخت و شدید مخالفت کے کافی ترقی کی ہے۔ اگر اسی رفتار کے ساتھ ترقی جاری رہی تو عنقریب وہ دن آنے والا ہے کہ یہ علمی زبانوں کے ہمدوش نظر آئے گی۔ بلکہ میرا تو خیال ہے کہ اس وقت دنیا کی وسیع ترین زبانیں بھی جن کا سرمایۂ الفاظ چار اور پانچ لاکھ شمار کیا جاتا ہے مثلاً انگریزی و فرانسیسی، ان کے سمجھنے والے بھی شاید ۲۷ کروڑ کی تعداد میں نہوں۔ حالانکہ ان زبانوں کی سرپرستی و پرورش دنیا کی دو بڑی حکومتیں کر رہی ہیں اور ان دو میں سے برٹش حکومت اتنی وسیع ہے، کہا جاتا ہے کہ جس کی سلطنت زمین پر آفتاب کبھی غروب

نہیں ہوتا۔ پھر کیا کوئی بتا سکتا ہے کہ ۳۰ کروڑ انسان اس زبان کو سمجھتے ہیں اور اگر سمجھتے ہیں تو کوئی حیرت کی بات نہیں ہے کہ اول تو یہ یعنی انگریزی زبان علمی زبان ہے، دوسرے یہ ایک وسیع ترین سلطنت کی گود میں پل رہی ہے۔

اگر اردو کو ایسا ذریعہ حاصل ہو جائے اور برادرانِ وطن اُس کی معاونت کرنے لگیں، تو یقیناً ۵۰ سال میں یہ زبان دنیا کی زبان ہونے کا دعویٰ پیش کر دے جس کا مخزن نہ صرف مسلمانوں کو، نہ صرف ہندوؤں کو بلکہ انگریزوں تک کو کرنا چاہیئے کہ عہد برٹش میں ایک ہندوستانی زبان تمام عالم کی زبانوں پر فوقیت لے گئی۔

باوجود اس کے کہ یہ تمام نقشوں سے ثابت کر دیا گیا ہے کہ ہندوستان کی مشترکہ و حکومتی زبان بننے کا حق کس زبان کو ہے، تاہم ابھی فیصلہ نہیں کرنا چاہیئے، اور ایک نظر رسم الخط پر بھی ڈال لینا چاہیئے کہ جس زبان کو کانگریس کے ہندو قائدینِ عظام نے "ہندوستانی" زبان کے نام سے تعبیر کر کے مسلمانانِ ہند کو حسین فریب میں مبتلا کیا ہے؟ آیا اس کے رسم الخط سے تقریباً نصف دنیا واقف ہے؟ یا اردو رسم الخط سے؟ کانگریس حکومت کو غیر ولایتوں سے اور خصوصاً مسلم حکومتوں سے مراسلت میں ہندی رسم الخط مدد دیگا؟ یا اردو رسم الخط؟ ہند کے باہر کی سرزمین ہندی بیج کے لئے تیار ہے؟ یا اردو بیج کے لئے؟ دنیا کی آنکھیں ان دونوں میں سے کس زبان کے حروف کو پہچانتی ہیں؟

دنیا کے باخبر جانتے ہیں کہ اس سرزمین پر مسلمانوں کی کل تعداد کم و بیش ۴۵ کروڑ ہے، اور ان سب کا رسم الخط (سوائے چینی مسلمانوں کے) وہی ہے جو اردو کا ہے۔ عربی رسم الخط اردو رسم خط کے مماثل ہے۔ جو شخص اردو لکھ پڑھ سکتا ہے، وہ صرف ہفتے دو ہفتے کی محنت کے بعد عربی بھی لکھ پڑھ سکتا ہے، اور اردو و عربی رسم الخط میں غالباً ایسا ہی فرق، جیسا ہندی و مرہٹی میں، باقی پشتو، فارسی، اور ترکی رسم خط وہی ہے جو اردو کا ہے۔

پس اگر آج ہندوستان کو حکومتِ خود اختیاری حاصل ہو جائے اور اسلامی ممالک سے اردو میں مراسلت کی جائے تو کس قدر آسانی ہوگی، وہ زبان جس کے رسمِ خط کو ۴۵ کروڑ انسان پہچانتے ہوں، اور اگر اس میں زیادہ نہیں، دس کروڑ اُن ہندو دوستوں کو بھی شامل کر لیا جائے جو اردو رسم الخط کو پہچانتے ہیں تو یہ تعداد پچپن کروڑ تک ہو جائے گی۔ پس جس زبان کے سمجھنے والے ۳۰ کروڑ انسان ہوں اور جس کے حرفوں کی صورت پہچاننے والے ۵۵ کروڑ ہوں۔ اس کے مقابلے پر ہندی رسم خط کا کیا ذکر ہے؟

سر سید نے ۱۸۶۳ء میں ایک سائنٹیفک سوسائٹی قائم کی تھی، جس کا مدعا یہ تھا کہ دیسی زبان کے ذریعہ علوم کی اشاعت کی جائے۔ چنانچہ برٹش انڈیا ایسوسی ایشن کا وجود اسی سے متعلق تھا۔ اس نے والسرائے سے یہ استدعا کی کہ ایک ایسا سررشتہ قائم کیا جائے جس میں علوم و فنون کی تعلیم دیسی زبان میں ہوا کرے۔ دیسی زبان میں اُن مضامین کا امتحان ہوا کرے جن میں کلکتہ کے طلباء انگریزی میں دیا کرتے ہیں۔ اس کے لئے یا تو ایک اردو فیکلٹی کلکتہ یونیورسٹی میں قائم کی جائے یا شمالی مغربی اضلاع میں۔ یہ تجویز گورنمنٹ برٹش نے بہت پسند کی۔ لیکن ۱۸۸۲ء میں جب یہ مسئلہ پیش ہوا تو واقعات نے اس کو بار آور نہیں ہونے دیا۔ ۱۹۱۷ء میں پھر یہ مسئلہ حکومت کے روبرو آیا۔ لیکن والسرائے نے انگریزی کی موجودگی میں کسی دیسی زبان کی طرف توجہ نہیں کی۔ مشترکہ زبان کا مسئلہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے عہد سے زیر بحث ہے۔ اور کمپنی مذکور کے ایک فاضل رکن مسٹر کرپو کے یہ خیالات تھے۔

"اردو زبان کی اس وقت یہاں بعینہٖ فرنچ زبان کی سی حالت ہے کہ جس طرح وہ تمام یورپ میں بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ اسی طرح اردو ہندوستان کے تمام حصۂ ملک میں بے تکلف سمجھی جاتی ہے۔ ملک کے کسی حصہ میں کسی معاون و ترجمان کی ضرورت نہ ہوگی۔ یہ اردو زبان عربی، فارسی، اور سنسکرت کے میل سے بنی ہے اور فارسی خط میں بہ نسبت دیوناگری کے اس کا لکھا جانا زیادہ آسان اور بامعنی ہوتا ہے"

عہدِ اکبری میں طریقۂ تعلیم کے متعلق بابو نریندر ناتھ اپنے مضمون "ترقی علوم" میں اس طرح لکھتے ہیں۔

"بچوں کو پہلے تہجی حروف سکھائے جاتے۔ اس میں صرف آٹھ روز لگتے۔ املا سکھانے اور پڑھانے میں دوسرے آٹھ دن لگتے تھے۔ پھر جملے اور اخلاقی فقرے بتائے جاتے، اور اس طرح ایک ماہ کے اندر اندر لڑکا اردو خود پڑھ لیا کرتا تھا"

اکبر الٰہ آبادی فرماتے ہیں کہ

بچائیو تم کبھی ہندی کے مخالف نہ ہو   بعد مرنے کے کہیگا کہ یہ تھی کام کی بات

لسکر تھا نامۂ اعمال مرا ہندی میں　　کوئی پڑھ ہی نہ سکا مل گئی فی الفور نجات

پھر فرماتے ہیں کہ

ہم اردو کو عربی کیوں نکریں، اردو کو بھاشا کیوں نکریں؟
جھگڑے کے لئے اخباروں میں مضمون تراشا کیوں نکریں؟
آپس میں عداوت کچھ بھی نہیں پر ایک اکھاڑہ قائم ہے
جب اس سے فلک کا دل بہلے ہم لوگ تماشا کیوں نکریں؟

زبان ہمیشہ تین چیزوں سے مرکب ہوتی ہے، اسماء۔ افعال اور حروف ان میں زبان کی اصل افعال و حروف پر ہوتی ہے۔ لیکن اسماء ہمیشہ دوسری زبانوں سے دستیاب ہوتے رہتے ہیں۔ بعض مٹ جاتے ہیں۔ بعض بدلجاتے ہیں اور اکثر قائم رہتے ہیں۔ زمانہ جس قدر ترقی کرتا جاتا ہے، جس قدر آمد و رفت کے وسائل بڑھتے ہیں اُسی قدر اسماء میں اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ یہی حال اردو زبان کا ہے۔ اگر اس کے اکثر و بیشتر اسماء و حروف عربی فارسی زبانوں کے ہیں تو افعال بھاشا زبان کے ہیں، اور اگر یہ فارسی رسم خط میں لکھی جاتی ہے تو کیا قیامت ہے کہ بولنے میں اُس کا لہجہ اردو یا بھاشا ہے۔

اس کا رسم الخط ہند و مسلم اتحاد کا ایک پُر خلوص تاریخی واقعہ ہے مسلمان جب فاتح کی حیثیت سے ہندوستان میں داخل ہوئے تو اُنھوں نے سنسکرت کی طرح اپنی زبان کو الگ نہیں رکھا بلکہ ہندی کے رشتۂ زنار میں عربی و فارسی کے الفاظ تسبیح کے دانوں کی طرح پرو دئے، تاکہ رشتۂ اتحاد مضبوط ہو جائے۔ فارسی رسم خط اور بھاشا کے لہجے میں ایک نوع کی بُوئے اتحاد آتی رہی ہے، اب اُس کو بُوئے خُون میں تبدیل کر دینا دوراندیشی کے خلاف ہے۔ اس کی تعمیر "برقِ خرمن" اور دہقان کے "خونِ گرم" سے ہوئی ہے۔ پس "ہندوستانی" کے نام سے اردو رسم خط کو مٹا دینا آسان کام نہیں ہے۔

اُردو زبان کے متعلق یا اردو رسم الخط کے متعلق، برادرانِ وطن میں جو جذبۂ نفرت و حقارت پیدا ہو گیا ہے، وہ تو اُن کی مذہبی دیوانگی ہے، لیکن اس تنفر کی زیادہ تر ذمہ داری مسلمانوں کے مغرب زدہ گروہ پر بھی عاید ہوتی ہے اس انگلش نواز گروہ نے اس قدر بے اعتنائی برتی جس کی داستان ماتم کرنے کے قابل ہے، اس کا ذہنی میلان باصرہ فریب، سراب مغرب کے لب و لہجہ میں اس قدر مدغم ہوا کہ اُٹھتے بیٹھتے، سوتے جاگتے اس کی زبان پر سوائے انگریزی کے اور کچھ نہیں رہا۔ اس گروہ نے کبھی غور نہیں کیا، کبھی نہیں سوچا کہ زبان کا زوال قوم کا زوال ہے، جا و بیجا ضرورت و بے ضرورت، اس کی زبان پر، اس کی آنکھوں میں، اور اس کے قلم و کاغذ پر بجز انگریزی کے اور کچھ نہیں رہا۔ اس کی میز پر سوائے انگریزی اخبار و رسائل کے اور کچھ نہیں ملتا۔ اگر کبھی بھُولے سے اس کی زبان پر اردو کا کوئی لفظ آ بھی گیا یا مجبوری کوئی فقرہ اس کے مُنہ سے نکل بھی گیا، تو سننے والوں کو ایسا معلوم ہوا کہ گویا کوئی انگریز ہے، جو ہندوستان میں تازہ وارد ہوا ہے۔

اس گروہ کے طلبا نے کبھی اردو بولنے اور لکھنے کی زحمت گوارا نہ کی۔ مسلم افیسروں نے کبھی اپنے دفاتر کے کاغذات کے رسم خط کی تبدیلی خفی پر غور نہیں کیا۔ دلدادگانِ انگلش نے خطوط پر اردو میں پتے لکھنا اپنی توہین سمجھا، ان کے انگلش مآب ہاتھوں نے کبھی اُردو کے اخبار و رسائل نہیں چھوئے۔ اردو کتاب کا پڑھنا ان کے نزدیک جرم عظیم تھا۔ آداب و سلام کی جگہ "گڈ مارننگ" "گڈ ایوننگ" کو دیدی، اور اب عنقریب یہ جگہ "نمستے"[1] چھین لینے والا ہے، اور کون کہہ سکتا ہے؟ کس کو خبر ہے کہ عید بقر عید کی نمازیں بھی اس گروہ کی زبان سے بجائے عربی الفاظ کے، انگریزی الفاظ ہی ادا ہوتے ہوں، کیونکہ مشق بڑی چیز ہے۔

یہ بات کسی مُلّا کی "کٹ حجتی" نہ سمجھو۔ بلکہ یہ قوموں کے عروج و زوال کی بات ہے، ذہنی و دماغی ارتقا و انحطاط کی داستان ہے، اور سیاسی و معاشری انقلاب کا قصۂ غم ہے۔

اگر کسی قوم کے اولین آثار انحطاط کا مطالعہ کیا جائے گا تو اکثر اس کا سبب اس قوم کے لٹریچر کا زوال نظر آئے گا۔ پس اردو زبان سے اس گروہ کی بے اعتنائی کے معنی یہ ہیں کہ اُس کی سطحی نگاہ مادری زبان کی برکات و افادیت کی حقیقت علمی پر نہیں ہے اور اگر یہی لیل و نہار رہے اور اردو سے مسامحت و تنفر اسی درجے پر قائم رہا تو وہ دن دور نہیں کہ اردو رسم خط کو ترک کرکے ناگری رسم خط کے لئے اس کی آئندہ نسل کو مجبور کیا جائے کہ عروسِ نو سنسکرت، جو طبقاتِ حجاب میں مستور رہتی، پردے سے باہر آ چکی ہے، اور "شودر" قوم سے رشتہ قائم کرنے والی ہے۔ چند شوخ

---

[1] بمبئی میں ریڈیو اسٹیشن پر آداب کی جگہ جہراً "نمستے" کو دیدی گئی ہے۔

مبلغ برادرانِ وطن اس دوشیزہ کے دامنِ عصمت کو عوام کے ہاتھ میں دیدینا چاہتے ہیں، اور زہرہ جبین اردو کو اس کے گھر سے نکلوا دینے کا عزمِ محکم کر چکے ہیں۔

یہ دور اردو زبان کے لئے ایسا نازک و خطرناک دور ہے کہ اس سے قبل کبھی نہیں آیا، آج اردو موت و حیات کی منزل سے گزر رہی ہے۔ اگر ہم نے طلبِ صادق، اور عزم و استقلال کے ساتھ کام نہ کیا تو اب سے زیادہ سختیاں و دشواریاں پیش آئیں گی۔ کمندیں ڈال دی گئی ہیں، اور جال بچھا دئے گئے ہیں۔ اپنے گھروں سے اردو کو نکالا جا رہا ہے۔ اور سرکاری دفتروں پر اس کے لئے تالے جڑے جا رہے ہیں۔ اپنی زبانوں، اور قلموں پر اس کو لانا حرام سمجھا جا رہا ہے، اور ناگری کو بروئے کار لایا جا رہا ہے۔ بس ہمیں چاہیئے کہ ؎

نوا را تلخ ترمی زن چو ذوقِ نغمہ کمیابی
حدی را تیز تر میخواں چو محمل را گراں بینی!

(باقی آئندہ)

مجھے معلوم نہ تھا

غیر ممکن بھی ہے ممکن، مجھے معلوم نہ تھا
ایک دن آئے گا یہ دن، مجھے معلوم نہ تھا

اور کچھ میں ترے ظاہر سے سمجھتا تھا تجھے
اور کچھ ہے ترا باطن، مجھے معلوم نہ تھا

اپنے دامانِ تصنّع میں چھپا سکتے ہیں
ان معائب کو محاسن، مجھے معلوم نہ تھا

دشمنوں کے لئے مخصوص ہے جو طرزِ عمل
دوستوں سے بھی ہے ممکن، مجھے معلوم نہ تھا

خبثِ باطن کے گلے تھے مجھے اک کافر سے
جب یہ حالِ دلِ مومن، مجھے معلوم نہ تھا

آہ، ہو سکتی ہے بیداد پہ مائل وہ نظر
ہو جو الطاف کی ضامن، مجھے معلوم نہ تھا

عمر بھر صبر نہ آئے گا مجھے جس کے بغیر
چین پائے گا وہ مجھ بن، مجھے معلوم نہ تھا

باہمہ گرمیٔ دل نبضِ محبت اک دن
ہو کے رہ جائے گی ساکن، مجھے معلوم نہ تھا

آہ، اس عمرِ محبت میں کبھی اے بسمل!
ایک دن آئے گا یہ دن، مجھے معلوم نہ تھا

بسمل سعیدی

افسانہ اور اُس کے عناصر

امداد صابری

افسانے کی تعریف

افسانہ اردو لٹریچر میں ایک جدید شعبۂ ادب کی حیثیت سے اُس وقت شامل ہوا جب اردو زبان پر انگریزی ادبیات کا پَرتو پڑا۔ اس سے پہلے بھی قصّہ کہانیاں اور حکایات وغیرہ لکھی جاتی تھیں۔ مگر وہ چیزیں افسانے سے بہت مختلف ہوا کرتی تھیں، جس کے معینہ قاعدے ہیں، جو صرف ایک نتیجہ خیز واقعہ بیان کرنے پر اکتفا کرتا ہے، اور جس میں وعظ و پند کو طول دینے کی گنجائش نہیں ہوتی، پھر اِن دونوں میں ایک یہ فرق بھی ہے کہ قدیم قصّوں میں کرداروں کی پوری پوری زندگیاں دکھائی جاتی تھیں، اور افسانہ کسی کردار یا چند کرداروں کے کسی خاص واقعۂ زندگی کو زیادہ سے زیادہ اختصار کے ساتھ اس طرح بیان کرتا ہے کہ اس سے کوئی نتیجہ اخذ کرسکے۔

عصرِ حاضر میں افسانے نے اس قدر وسعت اور مقبولیت حاصل کرلی ہے کہ اردو زبان کا یہ دور تاریخ ادب میں شاید افسانے ہی سے منسوب کیا جائے۔ افسانے کی وسعت اور ہمہ گیری تو انگریزی زبان کے رواج اور اس کی قبولیت کی مرہونِ منت ہے۔ اور قبولِ عام کا راز یہ ہے کہ اب لوگوں کی مصروفیات اس قدر بڑھ گئی ہیں کہ وہ طول طویل قصّے پڑھنے کے لئے وقت نہیں نکال سکتے اور "مختصر کہانی" ہی محدود فرصتوں میں اوقات گزاری کا بہترین ذریعہ رہ گئی ہے۔

افسانے نے مختلف اصنافِ ادب سے خصائص حاصل کئے ہیں بعض خصوصیات اُس نے ناول سے لی ہیں، بعض ڈرامہ سے بعض داستان گوئی سے۔ مگر اپنے معینہ اصولوں کے لحاظ سے اس کا رنگ ان اصناف سے الگ ہے۔ اس کی بیانیہ دلچسپی، اس کا اختصار، اس کی وحدت تاثر اور بالخصوص ترتیب واقعات وغیرہ خصوصیات ایسی ہیں جو افسانے کو دیگر اصنافِ ادب سے مُمیّز کردیتی ہیں۔

بات یہ ہے کہ چونکہ افسانے میں زیادہ سے زیادہ اختصار کے ساتھ ایک واقعہ بیان کیا جاتا ہے، اس لئے بڑی ہوشیاری سے کام لیتے ہوئے اول سطر سے لے کر آخر تک افسانہ نگار کو حسنِ بیان۔ صفائی زبان اور تسلسلِ خیالات کا التزام رکھنا پڑتا ہے۔ تنہا زورِ بیان اور لطفِ زبان کے بل پر افسانے کو کامیاب بنالینا قطعاً ناممکن ہے۔ وجہ یہ کہ افسانے کو نتیجہ خیز بنانے کے لئے اسے موثر بنانا ضروری ہوتا ہے، اور اثر یا تاثیر صرف زبان کے چٹخارے سے یا چکنے چپڑے فقرے ڈھال دینے سے پیدا نہیں ہوجاتی۔ دوسرے لفظوں میں افسانے کی ترتیب اور تکمیل کو اثر آفرینی کا پابند رکھنا پڑتا ہے، سوال ہوسکتا ہے کہ آیا اس "آورد" اثر آفرینی سے کہانی کے حسنِ خیال یا اُس کے زورِ بیان میں فرق نہیں آتا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اثر آفرینی کی چاشنی دینے سے کہانی میں فنی تکمیل کی جھلک پیدا ہوجاتی ہے۔

افسانے کی حدیں

ترتیب کو اثر آفرینی کا پابند کرنے کا ایک نتیجہ یہ ہے کہ موضوع کے لحاظ سے افسانے کی ایک حد مقرر ہوگئی ہے اور وہ اس حد سے تجاوز نہیں کرسکتا۔ سب سے پہلی بات اس سلسلے میں قابلِ غور یہ ہے کہ افسانے میں کسی کی پوری زندگی کی سرگذشت بیان نہیں ہوسکتی۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ کسی انسان

کو افسانے میں مکمل طور پر بے نقاب نہیں کیا جا سکتا ہے۔ اس کی مکمل تصویر پڑھنے والوں کے سامنے لائی تو جا سکتی ہے، مگر کس طرح؟ کسی چبھتے ہوئے سے فقرے یا اشارے سے، اس کی زندگی کے کسی اہم واقعے یا لمحے پر روشنی ڈال کر یا اس کے کردار کی کسی خصوصیت کو اُجاگر کرکے۔ اس میں شک نہیں کہ اس کی زندگی کے کسی اہم لمحے پر روشنی ڈالتے وقت یا اس کے کردار کی نمائندہ خصوصیت کو اجاگر کرتے وقت افسانہ نگار زیادہ سے زیادہ صریح الفاظ استعمال کرتا ہے مگر پھر بھی جتنا کچھ کہتا ہے اُس سے بہت زیادہ تصور کے لئے چھوڑ دیتا ہے۔ مقصد یہ ہوتا ہے کہ صرف ایک واقعہ کو لیا جائے اور باقی تمام ماحول کو تاریکی میں رکھکر صرف اس واقعے پر اتنی روشنی ڈالی جائے کہ اس کی غیر اہم جزئیات تک بھی چمک اُٹھیں۔ گویا افسانہ کسی ایک انسان کی زندگی کے کسی ایک واقعے کا تجزیہ ہے۔ اس طرح ارذل اور پست انسانوں کا قریب سے مطالعہ کرنے کا موقع ملتا ہے۔ اُن اعلیٰ ظرف بلند فطرت انسانوں کی کرداری تصویریں مہیا ہوتی ہیں جو دنیا میں مصائبِ حیات سے بلند حوصلگی کیساتھ نبرد آزما ہیں، اہم تجربات نتھر جاتے ہیں۔ اُن کے مختلف پہلو اور اثرات نگاہوں کے سامنے آجاتے ہیں۔ ایک شخصیت اپنے ماحول سے جدا کرکے سامنے لائی جاتی ہے۔ اور اُس کے خصائص اور حرکات وسکنات کو سبق آموز طریق سے دکھایا جاتا ہے۔ کسی ایک انسان کے اغراض وعزائم کا سُراغ لگایا جاتا ہے اور اُن کی بنیادیں تک روشنی میں دکھا دی جاتی ہیں۔

افسانے کے لئے معمولی واقعات کی اہمیت

مگر یہ سمجھنا غلط ہے کہ کسی کی زندگی کے نازک ترین اور زیادہ سے زیادہ غیر معمولی لمحات ہی اس غرض کے لئے انتخاب میں آتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ معرکہ انگیز لمحات پر ہی کردار کا حیرت انگیز تجزیہ کیا جا سکتا ہے، اور جذبات کا پورا جوش الفاظ میں موجزن دکھایا جا سکتا ہے، اور اُسے مصائب ومشکلات کے مقابل نبرد آزما کرکے ہیرو کے کردار کی پستی یا رفعت کی بہت واضح اور روشن مصوری کی جا سکتی ہے۔ دنیا کے بعض بہترین افسانے ایسے ہی لمحات پر تعمیر بھی کئے جا چکے ہیں۔ مگر اصولی اعتبار سے یہ تسلیم کر لینا کہ افسانہ صرف نازک لمحات پر لکھا جا سکتا ہے، افسانے کی تصویر گرانہ وسعت کو محدود کر دینا ہے۔ اہم کو اہم تر بنا دینا لٹریچر کا کوئی نمایاں کارنامہ نہیں سمجھا جا سکتا۔ معمولی حالات کے نقوش کو اُبھار کر اُنھیں قابلِ توجہ بنا دینا البتہ ایک کام ہے۔

معرکہ آرا لمحات ہر انسان کی زندگی میں آتے ہیں۔ مگر زندگی کا ہر لمحہ معرکہ انگیز نہیں ہوتا۔ افسانہ نگار ان معمولی لمحات میں سے کسی ایک لمحہ کو لیکر اس پر بھی افسانہ تعمیر کر لیتے ہیں۔ معمولی خوشیاں، معمولی غمیاں، معمولی کامرانیاں اور معمولی شکستیں بھی افسانوں کے لئے دلچسپ اور نتیجہ خیز موضوع بن سکتی ہیں۔ مثلاً افسانہ نگار زندگی کے عدم تسلسل اور فقدانِ انضباط کی مصوری کر سکتا ہے۔ ہر تازہ بات، ہر دلچسپ بات، ہر حیرت انگیز بات جو انسانی زندگی سے کوئی تعلق رکھتی ہے افسانہ نگار کے مشاہدے میں آتی ہے۔ وہ اس پر ذہن لڑاتا ہے۔ اُس کے مختلف پہلوؤں پر غور وخوض کرتا ہے اور دنیا کے سامنے اسے اپنے سانچے میں ڈھال کر پیش کرتا ہے۔ کسی ایک معمولی لمحے میں کسی انسان پر جو گزرتی ہے، وہ ممکن ہے اُس کی ساری زندگی پر اثر انداز ہو۔ مگر اسی کے ذریعے سے افسانہ نگار اس کے کردار کے پہلو اُجاگر کرکے دکھا دیتا ہے۔ مگر یہ ضرور ہے کہ افسانہ نگار کو اس معمولی سے واقعے سے فطرتِ انسانی کا کوئی ایسا پہلو ضرور بے نقاب کرنا پڑتا ہے، جو پڑھنے والوں کے لئے سبق آموز ہو۔ انفرادی کردار کو فطرتِ انسانی سے مطابق کرکے دیکھنے سے افسانہ نگار اس فرد اور باقی خلقِ خدا میں ایک تعلق پیدا کر دیتا ہے۔ ہر شخص محسوس کرتا ہے کہ کم وبیش یہی بات مجھ میں بھی ہے۔ افسانہ کا ایک مفہوم ہو جاتا ہے، ایک معمولی سی بات سے غیر معمولی نتیجہ اخذ کرنے کا موقع نکل آتا ہے۔

صورتِ حال اور وقوع پر افسانے کی بنیاد

افسانہ یا تو کسی واقعے پر مبنی ہوتا ہے یا کسی صورتِ حال پر۔ ان دونوں میں ایک باریک فرق ہے اُسے سمجھ لینا چاہئیے۔ واقعہ ایک معمولی وقتی عملی تجربہ ہے جیسے کسی بینک کا ٹوٹ جانا، کسی ڈاکو کی گرفتاری، فٹ بال کا میچ جیتنا وغیرہ۔ واقعہ کو فی نفسہٖ استعمال کیا جا سکتا ہے (یعنی اس کے نتائج سے بے تعلق رہتے ہوئے) برخلاف اس کے صورتِ حال میں افراد کا افراد سے یا افراد کا اشیاء سے یا افراد کا حالات سے رشتہ وتعلق دکھانا پڑتا ہے۔ صورتِ حال کے نتائج ہو بھی سکتے ہیں اور نہیں بھی ہو سکتے۔ وقوعہ

اپنی جگہ مکمل ہوتا ہے۔ صورتِ حال اپنی جگہ نامکمل ہوتی ہے۔ فرض کرو ایک شخص ناکردہ گناہ چوری کے جرم میں گرفتار کر لیا جاتا ہے یا ایک شخص بینک کے دیوالیہ ہو جانے کی وجہ سے اپنی جمع شدہ رقم سے محروم ہو جاتا ہے جو اُس نے اپنی لڑکی کی شادی کے لئے پیسہ پیسہ کر کے جوڑی تھی۔ یہ صورتِ حال کی شالیں ہیں۔ اکثر و بیشتر بلند معیار کے افسانے صورت حال پر مبنی دیکھے گئے ہیں۔ ایک صورتِ حال کا خاکہ ذہن میں قائم کرنے کے بعد اس پر افسانہ تعمیر کرنا کسی غیر معمولی واقعے کو قرطاس پر منتقل کرتے ہوئے افسانہ بنا دینے کی بہ نسبت زیادہ مشکل ہے۔ لیکن اگر افسانہ نگار صورت کو نباہ جائے تو اس کا افسانہ بہت بلند پایہ بھی ہو جاتا ہے۔ صورتِ حال کو نباہنے کا بہترین طریق یہی ہے کہ اُسے موزوں حالات اور کردار پیدا کر کے تقویت دی جائے۔

نقطۂ عروج

افسانہ وقوعہ پر مبنی ہو یا صورتِ حال پر ــــــ دونوں صورتوں میں اُس میں ایک نقطۂ عروج قائم کرنا پڑتا ہے۔ جس پر پہنچکر افسانے کی دلچسپی کی انتہا ہو جاتی ہے۔ یہ نقطۂ عروج افسانے کے جذبات یا حالات و واقعات کی کشمکش کی انتہا ہوتا ہے۔ عموماً کسی ایسے واقعے سے نقطۂ عروج کا کام لیا جاتا ہے جو کسی نہ کسی اعتبار سے اہم ہوتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں افسانے میں ایک مقام ایسا ضرور آنا چاہئیے جب یہ معلوم ہو کہ کردار کے سابقہ افعال اور اُس کی سابقہ نقل و حرکت کے نتیجے کے طور پر یہ پیش آیا۔ ایسے موقعے پر کردار حالات کی شکل میں اپنے جوہن کا اظہار کرتا ہے۔ نقطۂ عروج کو افسانے کی تمام دلچسپیوں کے خطوط کا مقام اتصال کہا جا سکتا ہے۔ جب افسانہ پڑھنے والا اس مقام پر پہنچتا ہے اور یہاں سے واقعات رفتہ پر ایک نظر ڈالتا ہے تو اُسے فوراً معلوم ہو جاتا ہے کہ افسانہ نگار میرے ذہن کو بتدریج اسی بلندی کی طرف لا رہا تھا۔ اگر کسی افسانے میں نقطۂ عروج نہ ہو تو ہم اسے افسانہ نہیں کہہ سکتے۔ حقیقت یہ ہے کہ ایسا افسانہ لکھنا ہی ناممکن ہے جس میں نقطۂ عروج نہ ہو۔ مگر نقطۂ عروج اس قدر فوری طور پر یا دفعتاً پیدا نہیں کیا جاتا کہ پڑھنے والے کے ذہن یا اُس کے احساسات پر حیرت یا پریشانی کی شدید ضرب لگے۔ برخلاف اس کے دلچسپی کو تدریجی رفتار سے بڑھا کر نقطۂ عروج تک پہنچایا جاتا ہے۔ یوں نقطۂ عروج افسانے کے حالات کی شاہراہ کا قدرتی موڑ معلوم ہونے لگتا ہے، اور اس مقام پر اُس صورتِ حال یا اس وقوعے کی پوری قوت کا احساس پڑھنے والے کو پہلی مرتبہ ہوتا ہے جس پر افسانہ تعمیر کیا گیا ہے۔

پلاٹ یا ترتیب واقعات

نقطۂ عروج پیدا کرنے کے لئے واقعاتی ترتیب سے کام لیا جاتا ہے واقعاتی ترتیب جزئیات کو ممزوج کر دینے کا دوسرا نام ہے۔ یہ امتزاج واقعات کے تصوری سببوں کی مدد سے کیا جاتا ہے۔ یعنی حالات کا ایک مطلوبہ ڈیزائن تیار کرنے کے لئے جزئیات کو ایک دوسرے سے مربوط کرتے ہیں۔ اس مقصد کی تکمیل کے لئے ممکنہ جزئیات میں سے ایسے جزوی حالات و واقعات چننے پڑتے ہیں جن کے ربط دینے سے مطلوبہ ڈیزائن مکمل ہو جائے اور یکسانی بھی باقی رہے۔ یوں رفتہ رفتہ حالات کا افسانے کی انجام کی طرف رُخ موڑ دیا جاتا ہے۔ ہر وہ چیز چھوڑنی پڑتی ہے جو نقطۂ عروج تک پہنچنے میں حارج ہو اور کوئی ایسی زیادہ سے زیادہ جزوی بات بھی نظر انداز نہیں کی جاتی ہے جو وہاں تک پہنچنے میں کچھ بھی امداد دے سکے، کردار اور حالات، کردار اور کردار، اور حالات اور حالات کو اس طرح مربوط کیا جاتا ہے کہ ایک کے بغیر دوسرے کا وجود محال نظر آنے لگتا ہے۔ ایک انگریزی نقاد نے پلاٹ کی یوں تعریف کی ہے کہ یہ ان واقعات اور حالات کے تسلسل کا نام ہے جن میں سے ہر ایک کرداروں پر انحصار رکھتا اور جس پر کردار منحصر ہوتے ہیں۔ یہی نقاد ایک اور جگہ کہتا ہے کہ اگر یہ انحصار یک طرفہ ہو تو پلاٹ نہیں بنتا۔ یعنی فرض کرو کہ ایک افسانے میں واقعات کرداروں کی تقدیریں بناتے ہیں۔ مگر خود کردار ان حالات پر اپنا کوئی اثر نہیں ڈالتے، اس صورت میں ہیرو صرف حالات کا کھلونا بنا رہے گا اور واقعات کے مابین بہت ہی غیر چست تعلق قائم ہو گا۔ قدیم زمانوں کی داستانیں عام طور پر اسی قسم کی ہوا کرتی تھیں جیسے سندباد جہازی کے قصے وغیرہ۔ یہ قصے ایسے واقعات کا مجموعہ ہیں جن میں آپس میں صرف اتنا ہی تعلق ہے کہ ایک کتاب میں ایک مصنف نے جمع کر دئے ہیں۔ افسانہ اپنی جگہ بالکل مربوط ہوتا ہے، اس میں کوئی جزوی واقعہ بھی ایسا نہیں آ سکتا جس کا باقی جزئیات افسانہ سے کوئی تعلق نہ ہو۔ اگر افسانے کا ایک تار بھی ڈھیلا کر دیا جائے تو کل افسانہ بودا پڑ جاتا ہے اور نقطۂ عروج پیدا نہیں ہوتا

وحدتِ تاثر

پلاٹ اور نقطۂ عروج کے علاوہ جو افسانے کے ڈرامائی لوازم میں سے ہیں کامیاب افسانہ قاری کے ذہن پر ایک مخصوص اثر بھی ڈالتا ہے۔ اور یہ اثر اس کے دل و دماغ پر اس وقت بھی مستولی رہتا ہے جب پلاٹ کے جزوی لوازم اُس کے ذہن سے اتر کر نقشِ موہوم بن جاتے ہیں۔ بعض اوقات افسانے کے انجام پر قاری ایک معینہ اثر قبول کر لیتا ہے۔ لیکن اکثر و بیشتر ان بہت سے اثرات کا تجزیہ کرنے کے بعد جو افسانے اُس کے ذہن پر مرتسم کئے ہیں، وہ ایک منفرد اثر قبول کرتا ہے۔ وہ افسانہ نگار زیادہ کامیاب ہوتا ہے جو قاری کو تجزیے کی حد تک جانے کی اجازت ہی نہ دے بلکہ اپنی طرف سے ایک قوی معینہ تاثر افسانے کے نتیجے کے طور پر پیش کر دے جو قاری کے ذہن کو فوراً اپنی طرف متوجہ کرے۔

تاثر کی دو قسمیں

تاثرات عموماً دو قسم کے ہوتے ہیں یا تو حسی یا جذباتی یا کسی حقیقت کی تحدید۔ اردو میں منشی پریم چند اور راشد الخیری تاثرات کے استاد ہیں، نئی نسل کے افسانہ نگاروں میں منظہر انصاری اور مجیب بھی تخلیقِ تاثر میں استادانہ جا رہے ہیں۔ مگر کامیاب افسانہ نگار ان میں سے صرف ایک ہی تاثر منتخب کر کے اُس پر زور دیدیتا ہے۔ کیونکہ وحدتِ تاثر ہی پر کہانی کی صحیح ترتیب کا انحصار ہے، پھر تاثر کے معاملہ میں ڈرامائیت پر وحدت کو یوں بھی فوقیت حاصل ہے کہ وحدتِ تاثر کو نصب العین بنا کر افسانے کی تعمیر کو ایک خاص وضع پر ڈھالا جا سکتا ہے، جبکہ ڈرامائیت ہر پلاٹ کی مخصوص جزئیات سے متعلق ہو کر رہ جاتی ہے۔ مثلاً اگر ایک افسانے میں کوئی جذباتی یا حسی تاثر کام کر رہا ہے تو ڈرامائی تاثر کمزور ہونے کی صورت میں بھی وہ کامیاب رہیگا۔ لیکن وہ زیادہ سے زیادہ ڈرامائی ہونے کے باوجود بھی ناکامیاب ثابت ہوگی، اگر تاثر سے محروم ہے یا فاتح پر بیک وقت ذہن پر کئی کئی تاثرات قائم کرتا ہو۔

تاثر کے لحاظ سے ناول اور افسانے کا فرق

وحدتِ تاثر ہی افسانے کی مابہ الامتیاز خصوصیت ہے۔ ناول میں کئی کئی تاثرات ہوتے ہیں۔ شروع سے لے کر آخر تک اس میں مختلف جذبات کی لہریں بیک وقت پڑھنے والے کے ذہن کو متاثر کرتی رہتی ہیں۔ ہر نیا واقعہ گذشتہ سے کسی نہ کسی حد تک مختلف ہوتا ہے۔ ہر نزاکتِ حالات اپنا جداگانہ اثر رکھتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ایک ناول کے ہر واقعہ کا بیان اتنا کافی طویل ہوتا ہے کہ وہ ایک تاثر قائم کر لیتا ہے۔ چنانچہ جب ایک ہی طویل کہانی میں متعدد واقعے جمع ہو جاتے ہیں تو بیک وقت بہت سے تاثرات بھی پیدا ہو جاتے ہیں۔

ناولوں میں عام طور پر نہ تو وحدتِ تاثر کا التزام کیا جاتا ہے۔ اور نہ ایسا کرنا ضروری ہے۔ البتہ افسانے میں وحدتِ تاثر لازمی چیز ہے۔ ترتیبِ واقعات کو نتیجہ خیز بنانے کے لئے جس طرح نقطۂ عروج پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔ اسی طرح "وحدتِ تاثر" کی بھی ہے۔ اگر افسانے میں اثرات منتشر کر دئے جائیں تو اس کا تمام طور پر یہ مطلب ہوگا کہ افسانے کا کوئی بھی تاثر نہیں ہے۔ کیونکہ کہانی میں اختصار کی وجہ سے صرف ایک ہی تاثر پوری قوت کے ساتھ پیش کیا جا سکتا ہے۔

وحدتِ تاثر کے لئے غایت کا یقین

وحدتِ تاثر کے لئے لازمی عناصر میں سے پہلا عنصر غائت کا تعین ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ترتیبِ واقعات میں سادگی پیدا ہو جاتی ہے۔ انجام آغاز ہی سے نظر آنے لگتا ہے۔ تاثر کی وحدت ہی نہیں بلکہ اُس کی قوت کا انحصار بھی نقطۂ عروج پر ہے۔ کامیاب افسانے میں لب و لہجہ اور نقطۂ عروج میں کوئی تضاد ظاہر نہیں ہوتا۔ ان میں ایسی ہم آہنگی ہوتی ہے کہ ایک کے خصائص دوسرے میں جھلکتے نظر آتے ہیں۔ اگر نقطۂ عروج مصیبت و اندوہ کی گھڑی ہے تو ابتدا سے وحدتِ تاثر کا سلسلہ اس طرح اُٹھایا جاتا ہے گویا نقطۂ عروج کے نمودار ہونے کی تیاری ہو رہی ہے۔ اگر کہانی کا تاثر ڈر یا خوف ہے تو نقطۂ عروج کو انتہائی خوف کا لمحہ بنا دیا جاتا ہے۔ ایسی کہانیاں بھی لکھی گئی ہیں جن کا تاثر واحد ہے۔ اور جن میں نقطۂ عروج کا کہیں پتہ نہیں ملتا۔ مگر یہ کہانیاں واقعات کی داستانیں ہیں۔ افسانے نہیں ہیں، کیونکہ ان میں کردار یا حالات کی قوتوں کی کشمکش کہیں نہیں دکھائی گئی۔ ان کا تاثر تو یقیناً واحد ہے۔ مگر اس تاثر میں نتیجہ خیز و نمایاں ہونے کی صلاحیت نہیں پائی جاتی۔ نقطۂ عروج وہ مقام ہے جہاں واحد تاثر الگ تھلگ اور پوری طرح روشنی میں نظر آتا ہے۔ فرض کرو ایک شخص اپنے سامنے پست پہاڑیوں کا ایک سلسلہ دیکھتا ہے جو دور تک چلا گیا ہے۔ اس نظارہ سے

سے اس پر کوئی خاص اثر نہیں ہوگا۔ لیکن فرض کرو کچھ آگے بڑھکر اس کی نگاہ ایک
پہاڑی کی چوٹی پر ایک قدیم عمارت دیکھتی ہے۔ منظر کا اثر فوراً بدل جاتا ہے۔
اسی طرح افسانے میں نقطۂ عروج وحدتِ تاثر میں مرکزیت اور وضاحت پیدا
کرنے کا کام دیتا ہے۔

ذہنی اور جذباتی تاثر کا فرق

تاثر یا تو ذہنی ہوتا ہے یا جذباتی۔ اگر تاثر صرف افسانہ نگار کے ذہن کی
طراری ہو جو کسی مسئلے کے حل وغیرہ سے پیدا ہوتا ہے تو اُسے ذہنی تاثر کہتے
ہیں اور اگر تاثر افسانے کے مرکزی کردار کے حل سے متعلق ہو تو یہ جذباتی
ہو جاتا ہے۔ جدت طرازی اور طراریٔ ذہن صرف پڑھنے والے کے ذہنی
تجسس کی پرمسرت تسکین کا کام کرتی ہے جس کا صلہ حیرت اور تحسین ہیں۔ صحیح
معنوں میں افسانہ کا تاثر ہمیشہ جذباتی ہی ہوتا ہے۔ اگر کسی افسانے کا مدعا شر
ذہنی تجسس کی تسکین ہو تو جس قدر زیادہ معمے پیش کئے جائیں گے اسی قدر تجسس
زیادہ ہوتا جائے گا اور جس قدر زیادہ جدت طرازی کے ساتھ ان معموں کو
حل کیا جائے گا اسی قدر اثرات زیادہ گہرے ہوں گے۔ ہر چند تاثر ایک ہی
رہے گا۔ مگر افسانے میں لاتعداد وقوعوں کے لئے گنجائش نکل آئے گی، ان
وقوعوں میں ہر نئے اضافے سے افسانہ زیادہ موثر ہوتا چلا جائے گا۔ چنانچہ
جاسوسی کہانی اس اعتبار سے افسانے کی صحیح تعریف پر پوری نہیں اُترتی۔ ہاں
البتہ اگر اس میں جذبات کی آمیزش کر کے نقطۂ عروج پیدا کر دیا جائے تو جاسوسی
کہانی بھی صحیح معیاری افسانہ بن جائے گی کیونکہ اس طرح وحدتِ تاثر پیدا ہو جائیگی۔
کہانی کی طوالت اور اس کے اختصار کا انحصار اس وقوعے یا صورتِ
حال پر ہے جس پر افسانہ مبنی ہوتا ہے۔ بعض صورتیں ایسی ہوتی ہیں کہ اُن کا
مناسب نقطۂ عروج پیدا کرنے میں دو صفحے لکھے جاتے ہیں، اور بعض بیس صفحے
چاہتی ہیں۔ اگر یہ بات ذہن میں رہے کہ تاثر واحد ہونا چاہئے۔ نیز یہ کہ
وہ تاثر نقطۂ عروج ہی سے پیدا کیا جا سکتا ہے، تو افسانہ غلط طور پر طویل
نہیں ہونے پاتا۔ افسانے کے لئے موزوں ڈھب یہی ہے کہ زیادہ سے
زیادہ اختصار سے کام لیا جائے۔ ایڈگر ایلن پو نے ایک جگہ لکھا ہے: ناول
کی طوالت مجھے قابل اعتراض معلوم ہوتی ہے، کیونکہ وہ ایک ہی نشست میں
ختم نہیں کیا جا سکتا اور اس لئے تاثر کی قوت بہت کچھ ضائع ہو جاتی ہے۔
مطالعے کے دوران میں وقفے پڑنے سے کتاب کے اثرات بدل جاتے ہیں۔
یا بے اثر رہ جاتے ہیں یا ان کے زور میں فرق آجاتا ہے اور میں تو یہاں
تک کہتا ہوں کہ مطالعے کے دوران میں ٹھہر جانے ہی سے کہانی کی صحیح وحدتِ
تاثر برباد ہو جاتی ہے، مختصر کہانی میں مصنف البتہ اپنے اغراض و مقاصد کی
تکمیل کے لئے بہت زیادہ مواقع پاتا ہے۔ کہانی پڑھتے وقت پڑھنے والے
کی روح مصنف کے قابو میں ہوتی ہے۔ اندرونی اور بیرونی مداخلتوں کا
کوئی امکان نہیں ہوتا۔" اس بیان سے یہ نتیجہ نکالنا ناگزیر ہے کہ افسانے
کی رفتار جتنی تیز ہوگی اسی قدر اس کا تاثر زیادہ قوی ہوگا۔

افسانے کی مدت اور اشخاص وغیرہ

اسی اصول پر افسانے کی مدت، اس کے محلِ وقوع اور اشخاص کی
تعداد کا تعین کیا جاتا ہے۔ اگر تاثر کی وحدت برقرار رہتی ہے، اور نقطۂ عروج
دُھندلا نہیں ہونے پاتا، تو خواہ افسانے کی مدت پانچ منٹ ہو یا پچاس
برس۔ اشخاص ایک دو ہوں یا سو دوسو۔ محلِ وقوع منطقۂ شمالی ہو یا دلی
کا ایک بازار۔ کوئی فرق نہیں پڑتا۔ عموماً افسانہ صرف ایک شخص یا مرکزی کردار
پیش کرتا ہے۔ متعلقہ اشخاص عموماً مرکزی کردار کو اُجاگر کرنے کے لئے سامنے
لائے جاتے ہیں۔ یہ ممکن ہے کہ ایک افسانے میں ایک مجمع عام کو مرکزی کردار
کی حیثیت حاصل ہو۔ اِس صورت میں مجمع افراد کا مجموعہ نہیں بلکہ ایک منفرد کردار
سمجھا جائے گا، اور افسانے کے قواعد کا عمل جاری رہے گا۔

بحث کا اختصار

مندرجہ بالا بحث کا مختصراً مطلب یہ نکلا کہ افسانہ ایک قصہ ہے جس کا
تاثر واحد ہوتا ہے۔ اور یہ تاثر ایک ایسے وقوعے یا صورتِ حال کو روشنی
میں لانے سے پیدا کیا جاتا ہے جس کا ایک نقطۂ عروج بھی ہوتا ہے۔ ایک
سلیقہ مند ادبی صناع ایک کہانی تیار کرتا ہے، اگر صناع دانشمند ہے تو وہ
اپنے خیالات کو اپنی کہانی کے وقوعات کا پابند نہیں کرتا۔ بلکہ عمداً پہلے سے
ایک واحد تاثر پیدا کرنے کی دھن قائم کرتا ہے، اور پھر اس تاثر کی تخلیق
کے لئے حالات اور واقعات ایجاد کرتا ہے۔ اور ان کو اس ڈھب سے
ربط دیتا ہے کہ پہلے سے سوچا ہوا تاثر پیدا ہو جاتا ہے۔ اگر اس کا پہلا ہی

قدم اس کے معینہ راستے سے ہٹ جائے تو سمجھ لو کہ زینے کی پہلی سیڑھی پر وہ گر پڑا۔ تمام افسانے میں کوئی ایک لفظ بھی ایسا نہ ہونا چاہئے جو افسانہ نگار کے مقرر کردہ راستے سے ہٹا ہوا ہو۔

تمام حالات و واقعات ایسے ہونے چاہئیں جو اس پہلے سے قائم کئے ہوئے تاثر کے نقش کو پختہ کرتے جائیں اور یہ کام افسانے کی پہلی ہی سطر سے شروع ہو جانا چاہئے۔

افسانے کے تین ٹائپ

افسانے تین ٹائپ کے ہوتے ہیں۔ افسانۂ کردار، افسانۂ عمل، افسانۂ فضا۔ کچھ ضروری نہیں کہ ایک افسانے میں صرف ایک ہی رنگ غالب ہو۔ تینوں رنگوں کا امتزاج بھی ممکن ہے۔ چنانچہ ایک افسانۂ کردار میں عمل اور فضا بھی ممکن ہے اور ایک افسانۂ عمل میں کرداریت اور فضائیت بھی جھلکتی نظر آسکتی ہے۔ وعلیٰ قس ہذا۔

اقسام

اقسام کے لحاظ سے افسانے مندرجہ ذیل ہو سکتے ہیں۔ (۱) افسانۂ اسرار (۲) افسانۂ نفسیات (۳) افسانۂ مسائل (۴) افسانۂ معاشرت (۵) افسانۂ ماحول (۶) افسانۂ کیفیت (۷) افسانۂ سیر و سفر اور (۸) افسانۂ تعلیمی۔

بعض افسانے کئی کئی عنوانات کے ماتحت بھی آسکتے ہیں۔ مثلاً نیاز فتحپوری کا طویل افسانہ شہاب کی سرگذشت اصل میں نفسیاتی افسانہ ہے۔ مگر ہم اسے افسانۂ مسائل بھی کہہ سکتے ہیں۔ اسی طرح افسانۂ ماحول معاشرتی افسانہ بھی بن سکتا ہے۔ راشد الخیری، پریم چند، مظہر انصاری اور مجیب کے اکثر افسانے ایسے ہی ہیں۔ افسانۂ اسرار کے عنوان کے تحت میں بھوتوں کی کہانیاں، جاسوسی کہانیاں یا ناقابلِ یقین وقوعات وغیرہ رکھے جا سکتے ہیں۔ نیلی چھتری بہرام کی گرفتاری، اخوان الشیاطین اور تیرتھ رام فیروزپوری کے تراجم بالکل اسی ڈھنگ کی کہانیاں ہیں۔ میدان افسانہ نگاری کے تازہ وارد عموماً افسانۂ اسرار لکھتے ہیں کیونکہ عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے اور کچھ غلط نہیں سمجھا جاتا کہ غیر معمولی یا معرکہ آرا واقعات بیان کرکے پڑھنے والوں کی توجہ بہت جلد اپنی طرف پھیری جا سکتی ہے۔ مگر افسانۂ اسرار کو قابل یقین بنانا بہت دشوار کام ہے۔ جب تک پڑھنے والے کے تصورات پر مصنف اس قدر حاوی نہ آجائے کہ اس کے بیان کردہ حالات و واقعات مؤخر الذکر کو مطابق اصل ہی نہ معلوم ہونے لگیں۔ دلچسپی کا تسلسل کے ساتھ افسانے سے وابستہ رہنا بہت دشوار ہے۔ غیر اصل کو اصل بنا کر پیش کر دینا بڑی مہارت چاہتا ہے۔

افسانۂ مسائل میں یا تو مسئلہ حل کر دیا جاتا ہے یا اُسے چھیڑ کر چھوڑ دیا جاتا ہے۔ اکثر و بیشتر مسئلہ حل ہی کر دیا جاتا ہے۔ اس قسم کی کہانی لکھنا بھی دشوار کام ہے۔ کیونکہ ایسا افسانہ لکھنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ مصنف کو صورتِ حال پر پوری گرفت حاصل ہو۔ اور مناسب وقت سے قبل پڑھنے والے کی ہمدردیاں کسی ایک طرف بہت زیادہ نہ ڈھلکا دی جائیں۔ وقفۂ کشمکش ضرور ہونا چاہئے تاہم مسئلے کا حل (اگر ہو) پہلے سے تیار ہونا چاہئے، اور اس طرح پیش کرنا چاہئے کہ مطابق فطرت دکھائی دے۔

افسانۂ مسائل سے ملتا جلتا ایک اور قسم کا افسانہ ہوتا ہے جس میں درانہ تو معاشری یا اقتصادی یا سیاسی مسائل نہیں چھیڑے جاتے، مگر کہانی کی تہ میں ان کی جھلک ضرور نظر آجاتی ہے۔ یہ افسانے جماعتی امتیاز۔ سماج کے قید و بند، تجارتی فریب و دغا، سیاسی بے ایمانی، اور ان تمام اقتصادی یا معاشی مسائل پر مبنی ہوتے ہیں جو اس وقت دنیا میں بہت اہمیت رکھتے ہیں۔ اس وضع کے افسانے آج کل بہت جلد مشہور ہو جاتے ہیں۔ کیونکہ ایسے افسانے اپنے دور کے احساسات کی ترجمان ہوتے ہیں اور وہ پبلک کو ان مسائل کے حل میں مدد دیتے ہیں۔

افسانۂ ماحول میں مصنف بڑی کوشش سے ان خصائص کی عکاسی کرتا ہے جو کسی خاص فضا، یا جماعت سے متعلق ہوئے ہیں (نذیر احمد۔ راشد الخیری، آغا حیدر حسن، یلدرم کی اکثر کہانیاں خاص خاص فضا اُن سے متعلق ہوتی ہیں) افسانۂ کیفیت میں کسی خاص جذبے یا کیفیتِ ذہنی کا نقشہ اُتارا جاتا ہے۔ اس ذیل میں وہ افسانے آتے ہیں جس میں خوف اور ہیبت دکھائی جاتی ہے، یا درد و الم کا مرقع پیش کیا جاتا ہے، یا صرف مزاح سے کام لیا جاتا ہے، یا جذبۂ عشق کی کارفرمائی دکھاتے ہیں (ایسے افسانوں کی کامیابی کا دار و مدار اس بات پر ہے کہ مصنف واحد تاثر کو کہاں تک معین طور پر پیش کر سکا۔ بیشتر لوگ عموماً ایسی کہانیاں لکھتے وقت دو طرح کی غلطیاں کرتے ہیں۔ یا تو وہ جذبات کی عکاسی کو اس قدر پرجوش کر دیتے ہیں کہ وہ مضحکہ خیز یا مصنوعی اور غیر فطری

معلوم ہونے لگتی ہے یا پھر وہ اس قدر کم آمیزش جذبات سے کام لیتے ہیں کہ افسانہ پھیکا معلوم ہونے لگتا ہے۔ جذباتی افسانے لکھنے کے لئے بڑے ضبط اور مہارت کی ضرورت ہے۔ سیروسنز کے افسانے بچوں یا اُن سے ملتا جلتا مذاق رکھنے والوں کو بہت پسند آتے ہیں۔ ان میں یہ نہیں دیکھا جاتا کہ اشخاصِ قصہ کیسے ہیں بلکہ یہ دیکھتے ہیں کہ اُنھوں نے کیا کیا کارنامے انجام دئے یا اُنھیں کیا کیا پیش آیا۔

افسانۂ تلمیح بہت ہی قدیم سے چلا آتا ہے۔ استعاروں اور تشبیہوں میں بیان کی ہوئی کہانیاں یا مذہبی قصے یا قصص اصنام بھی جن کی غائت پند و نصیحت ہوتی ہے یا جن میں دینی اور روحانی اسرار و رُموز بیان کئے جاتے ہیں، تلمیحی افسانے ہوتے ہیں۔ منطق الطیر کی کہانیاں حضرت عیسیٰؑ کی استعاری کہانیاں، قرآن مجید کے مذہبی قصے اس کی مثال ہیں۔

تلمیحی افسانوں میں ایک بڑی مشکل افسانے کے سبق کو مناسب دباؤ میں رکھنے کی ہوتی ہے۔ تلمیح استعمال کرتے وقت کہانی کے نتیجے کو نظروں سے اوجھل رکھنا اسی قدر دشوار ہے، جتنا ایک چلبلے بلی کے بچے کو ایک ٹوکری میں بند رکھنا۔ سبق صاف صاف نہیں بتایا جاتا۔ صرف ایک موثر انداز میں اُس کی طرف اشارہ کر دیا جاتا ہے۔ افسانے میں وعظ کا دفتر کھولنا قطعاً خلاف قاعدہ ہے۔ بعض اسی کو اپنا طرۂ امتیاز سمجھتے ہیں (ڈاکٹر سعید کا دامنِ باغباں) یہ بات اس لئے بھی افسانے کے لئے مضر ہے کہ پڑھنے والا افسانے کو کچھ حاصل کرنے کے لئے تو پڑھتا ہے مگر وہ ایک طویل واعظانہ خطبہ سننے کے لئے تیار نہیں ہوتا۔ اس طرح بجائے نصیحت ماننے کے وہ کوفت محسوس کرتا ہے اور آئندہ کے لئے افسانہ نگار سے بدظن ہو جاتا ہے۔ جس شخص کو کسی موضوع پر نصیحت آمیز مضمون کی جستجو ہو گی وہ اس غرض کے لئے افسانہ پڑھنے کے لئے نہیں اٹھائے گا بلکہ کسی فاضل اجل کا وعظ سُنے گا یا مدبر یا مفکر کے پُراستدلال خطبے کو پڑھے گا۔ پھر ایک نفسیاتی نکتہ ہے کہ لوگ بہت کھلی ہوئی نصیحت پر کان دھرنے کے لئے تیار نہیں ہوتے۔

ہاں بادِ [illegible] سے اشعار روا ہے
[illegible] زور سے [illegible] رہا ہے یا رو رہا ہے
[illegible] گھٹا [illegible] ہے
[illegible] بھیگو بھیگو شراب خوار روا ہے

جوشؔ

اے ابرِ سیہ گھر کے آنے والے
خورشید کو ظلمات میں چھپانے والے
اب تک سرِ [illegible] ہے وہ دیکھ نیاز
قرباں ترے جھوم کے برسانے والے

جوشؔ

فیڈریشن

شاد عارفی

فیڈریشن ہمارے لئے کیا لایا۔ اس سوالیہ احتجاج کی بوالعجبی پر سادہ لوح ہندوستانیوں کے لئے میرے ذہن میں "ناسمجھ" سے زیادہ عمدہ لفظ موجود نہیں۔ اس لئے کہ کسی مملکت کے اربابِ حل و عقد و صاحبانِ سیاست اپنی مجہول العقل رعایا کو کبھی اُس کے ظرف میں نہ سمانے والی شے نہیں دیا کرتے اور یہی ظرف شناسی سیاست کا ایک ایسا "عین" تصور کیا جاتا ہے جس کے ہاتھوں میں امنِ عامہ کی باگ ڈور قیاس کر لی گئی ہے۔ کون نہیں جانتا کہ امریکہ صرف اپنے فولادی ظرف کے طفیل آزاد ہوا۔ آئرلینڈ کے ظرف میں بھی "اسپات" کا عنصر غالب تھا، اس لئے اس کے سر پر بھی بادلِ ناخواستہ آزادی کا تاج رکھنا پڑا۔ مصر کی آزادی کا چھوٹا سا پیمانہ اس سوڈا واٹر کی بوتل کی طرح تھا جس کا کاگ اُڑتے ہی آزادی کا آبجوش جھاگ بن بن کر زمین پر آ رہتا ہے۔ چنانچہ آج مصر کی خود مختارانہ حیثیت اُس صراحیٔ تنگ نائے سے ملتی جلتی ہے جس کی تہ میں آتشِ سیال کے چند قطرے باقی رہ گئے ہوں" خاکم بہ دہن "آج اٹلی کے دریا نوش بادہ خوار کے ہاتھوں وہ بھی خطرے میں نظر آ رہے ہیں۔ اسپین کے آزادی پسند "باغی" فرانکو جیسے ماہر آہنگر کی سرکردگی میں (جس کی پشت پناہی دو آہن شکن طاقتوں کی ممنونِ احسان ہے) اپنے دیگچونی ظرف کو آتشِ جنگ و جدال میں تپا تپا کر فولاد سے ہم معنے کرنے پر تُلے ہوئے ہیں۔ آپ ملاحظہ فرمائیں گے کہ اُدھر یہ اپنی کوششوں میں کامیاب ہوئے اور اُدھر حکومتِ فرانس اس طرح مسکرا کر کہ دانت پیسنے کا شبہ ہوگا، یہ کہنے پر مجبور ہوگی۔ اب تم آزادی کا مطلب سمجھ گئے ہو اس لئے شکریہ کے ساتھ تمہیں آزادی کی خونخوار دولہن عطا کی جاتی ہے۔ واہ رے ہمارے بھولے، ننگے، جاہل وفادار اور کم ظرف ہندوستان کہ ان غیر وفادارانہ مثالوں کی جانب آنکھ اُٹھا کر بھی نہیں دیکھتا۔ شاباش اس کی دلیری پر وفاداری کی بھینٹ چڑھا کر دنیا میں سُرخرو ہونے والے ہندوستان، شاباش، کیونکہ ع

اُن پہ دیکھیں نہ اثر کرتی ہیں آہیں کب تک

کے علاوہ ــــ ع

کلکِ قدرت را بہ ہر چیزے بہ ہر چیزے نگاشت

اس لئے عقلاً و جبراً یہ ماننا ہی پڑے گا کہ ہمارا یہ غریب ہندوستان جس کو ابھی تک چرخے اور کھدر میں سوراج کے درشن ہونے کی اُمید ہے۔ ابھی اس قابل کہاں کہ آزادی کا بھاری پتھر اپنی چھاتی پر رکھ سکے۔ جہالت کی انتہا ہے کہ سب سے پہلے میونسپلٹی ملی تو مانندِ کلاب سوئے جیفہ دوڑے۔ اور ممبروں کے چناؤ میں وہ ہم رچ مچائی کہ تہذیب نے کانوں میں انگلیاں دے لیں۔ اسمبلی میں سیٹوں پر وہ جوتا پیزار کہ عیاذاً باللہ۔ قلم۔ اِن وزارت کو ہاتھ لگانے میں وہ ہچر مچر کہ عقل دنگ رہ جائے۔ وزارتیں حاصل ہونے پر انتظامات میں وہ ابتری کہ سر پیٹ لیجئے۔ ہر دہقانی ایک مکمل اشتراکی۔ لگان کس چڑیا کا نام ہے۔ کل مال و ملک اللہ کا، جو جوتے وہ کاٹے۔ کھا برابر چل برابر مالیہ پر اس کا جس قدر اثر پڑا ظاہر ہے، ان سب پر مستزاد یہ کہ مالیہ کی کمی کو پوشیدہ رکھنے کے لئے وزارتوں نے استعفے دیدیئے اور پردہ یہ حائل

کیا کہ سیاسی قیدی کیوں نہ رہا کئے گئے۔ حکومت کی دور بین نگاہیں ان حالات سے باخبر ہوتے ہوئے چشم پوشی کرتی رہیں۔ صرف اس وجہ سے کہ ان ہندوستانیوں کو اپنی خام کاری کا اندازہ ہوجائے۔ طرہ یہ کہ جب کام بگڑتا دیکھا تو معمولی سی تحریک پر بہت خوش ہوکر استعفے واپس لے لئے۔ کیا ہماری دقیقہ رس حکومت کے نزدیک ہمارا یہ چھچھورا پن ہماری کم عقلی کی دلیل نہیں۔ ایسی حالت میں ہندوستان کی "بازی طفلانہ" پر عبور رکھنے والی حکومت ہندوستان کو ایسے عطیات سے محروم رکھنا ہی مناسب سمجھتی ہے جس میں ذرا سا بھی دباؤ اور وزن پایا جائے۔ غرضکہ ہندوستانیوں کا کچی مٹی سے بنا ہوا ظرف ابھی اس قابل نہیں کہ اُس میں آزادی کا تیزاب محفوظ رہ سکے اور کون کہہ سکتا ہے کہ ایسے حادثات کے پڑاووں کی کتنی آنچیں پختہ کر سکیں گی۔

راؤنڈ ٹیبل کانفرنس کا حشر ابھی آپ نہ بھولے ہوں گے ستیہ گرہ، ہڑتال، بھوک ہڑتال، جلسے۔ تقریریں۔ شور و غل۔ ان سب سے اظہار یہ مقصود کہ ہم اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کے قابل ہوگئے ہیں لہٰذا حسب وعدہ سوراج عطا کیجئے۔ حکومت نے ہندوستانیوں کی اس خود ستائی کو جہل مرکب خیال کرکے راؤنڈ ٹیبل کانفرنس میں شرکت کی دعوت دی۔ وہاں پہونچ کر آپس کی کشمکش نے مطلب سے اتنی دور جا پھینکا کہ لینا ایک نہ دینا دو۔ اب بتایئے ہماری فیاض حکومت کا اس میں بظاہر کیا قصور۔ لہٰذا نتیجہ وہی ہوا جو ہونا چاہیئے تھا۔ جیسے گئے تھے ویسے ہی پلٹے۔ بعد ازاں بے وقت کے بھیاگوں سے تنگ آکر ہماری عدالت نواز حکومت نے وہائٹ پیپر کی ہلکی پھلکی نعمت عطا کی۔ لیکن بات کی تہ کو نہ پہونچنے والے ہندوستانیوں میں گھر گھر رونا پیٹنا پڑگیا۔ یہ قرطاس ابیض ہے کیا بلا، دو کوڑی کا کاغذ، صرف عرض وطول۔ الفاظ زیادہ معنویت کم۔ ہمارا اس میں کیا بھلا ہو سکتا ہے۔ ان اعتراضوں کی رگوں میں بھی وہی جہالت اور ناسمجھی کارفرما تھی، ورنہ قرطاس ابیض کی خوبیاں بیان کرنا سورج کو چراغ دکھانے کے مترادف تھا۔ سوچئے تو سہی کہ اُس وقت ہندوستان ایک ایسے مرض میں مبتلا تھا جس کا مداوا صرف کڑوی کونین سے ممکن تھا۔ لیکن اس مریض نے قرطاس ابیض کی کڑوی کونین کھانے سے انکار کرکے اپنے حق میں کچھ اچھا نہ کیا، چنانچہ یورپ کے عیسیٰ نفس ڈاکٹروں نے فوائد مدنظر رکھتے ہوئے منہ چیر کر یہ کونین حلق سے نیچے اُتارنے پر مجبور کردیا، فائدہ کیا ہوا اس کے متعلق ہندوستان کے دقیانوسی وید تو چہ میگوئیاں کرتے رہے۔ لیکن انگلستان کے مسیح دم ڈاکٹروں کے یقینی فائدے پر اعتقاد جمائے کانا پھوسی کرتے رہے۔ اب فیڈریشن ایک تیسرا عطیۂ شاہی ہے جس کی بیمائیگی پر حسب عادت کھچڑی پک رہی ہیں۔ یہ فیڈریشن ہے کیا واہیات، اسے کالی جھنڈیاں دکھلاؤ، اس کا سنہ توڑ دو۔ ہاتھ کاٹ لو وغیرہ، لیکن میں کہتا ہوں! کیونکہ صرف میں نے ہی اس راز کو پالیا ہے کہ اس کے فوائد ہندوستانیوں کی فہم سے بالاتر ہیں۔ دنیا میں ہزاروں چیزیں ایسی ہیں جن کے نام بڑے اور درشن تھوڑے ہوتے ہیں۔ لیکن اس سوئے ظن سے اُس شے کے فوائد زائل نہیں ہوجاتے۔ اس ثبوت کے بعد بھی اگر آپ فیڈریشن کو غیر مفید کہتے رہیں تو یہ آپ کی عقلمندی۔ یہاں یہ گزارش بھی بیجا نہ ہوگی کہ عطیات شاہی پر نکتہ چینی کا کسی کو حق نہیں خصوصاً ہندوستان کی ایک ضرب المثل تو یہ ثابت کرتی ہے، کہ اگر بادشاہ تیل دے تو دامن میں لے۔ بفرض محال ان تمام دلائل کو پس پشت ڈال کر آپ فیڈریشن کو غیر مفید لکھنے پر اڑے رہیں اور بار بار "ہمیں فیڈریشن کی ضرورت نہیں" کا اعادہ کرکے اپنی ناراضگی کا ثبوت دیں تو کیا آپ یقین کرسکتے ہیں کہ آپ کا یہ ردِ نعمت کسی وقعت کی نگاہ سے دیکھا جائے گا، تو یہ سمجھئے، آپریشن کے لئے کوئی مریض تیار نہیں ہوتا، درحالیکہ اس میں مریض کا فائدہ پوشیدہ ہوتا ہے۔ تجربہ شاہد ہے کہ ایسے مواقع پر ہر حکومت "آخر الدوا" کے پر عمل کرکے اپنے مریض کو صحت کی طرف گھسیٹ لاتی ہے۔ اب سنا جارہا ہے کہ فیڈریشن کی افادیت منوانے کے لئے ایک دوسرے وہائٹ پیپر کی تجویز ہو رہی ہے۔ اس میں کیا ہوگا۔ یہ تو ایک نجومی بتاسکتا ہے۔ لیکن میں اس کا نام "کونین مکسچر" تجویز کرکے اس کے تلخ مگر مفید ہونے پر روشنی ڈال سکتا ہوں، اس لئے ہندوستان کو اُسے لبیک کہنے میں تامل نہ چاہیئے۔ اسی چیز کو تو پنڈت دیاشنکر نسیم نے اس طرح سراہا ہے۔

آتا ہو تو ہاتھ سے نہ دیجے!

گذارش!

مضمون نگار حضرات مضمون لکھتے وقت تحریر کی صفائی کا خیال بھی رکھیں

چنگاریاں

از آل نقوی بجنوری

اگر شاعر کی قوتِ خلاقی ایک بھڑکتے ہوئے آتش فشاں کے مانند ہوتی ہے تو پھر اس میں اتنی طاقت بھی ضرور ہوگی کہ وہ زمین کی جڑیں ہلا کر رکھ دے۔

ہر ملک کی شاعری میں ایک دور تو ایسا آتا ہے جس میں ہر مفلس شاعر کی نظریں ہر چمکدار چیز پر حریصانہ جا پڑا کرتی ہیں اور بجز ایک سیمگوں عکس کے کوئی دوسرا سادہ تصور اخذ نہیں کر پاتیں۔ لیکن یہ دور جلد ختم ہو جاتا ہے، رفتارِ زمانہ نظر سے تیز ہوتی ہے۔ رفتہ رفتہ دنیا ہی نہیں، نظریے ہی نہیں، نظریں تبدیل ہو جاتی ہیں

چلمن کے اندر بیٹھ کر دیکھنے والے اس کے باہر سے دیکھنے والوں کو اپنے اصلی رنگ میں دکھائی پڑ جاتے ہیں، کیونکہ یہ ایک ایسا دور ہوتا ہے جس میں ہر کامیاب شاعر کو موجودیت کا حامل ہونا پڑتا ہے۔ اور جذبات کی اُکھاڑ پچھاڑ میں وضع کے ساتھ ساتھ آواز بھی پیدا کرنی پڑتی ہے۔ ایک بے ربط مستقبل کے مقدمات کو ایسی نظروں سے دیکھنا پڑتا ہے جن سے ستارے ساکن معلوم ہوتے ہوں۔ سایہ میں بیٹھ کر سورج کو دیکھنے کی ناکام کوشش کرنے کے بجائے دھوپ میں کھڑے ہو کر آس پاس کی پرچھائیوں کے دھندلکے، مگر اچھوتے مشاہدات کا مطالعہ کرنا پڑتا ہے۔ یہاں تک کہ کچھ نہ ہونے والی چیزوں میں بھی سب کچھ نہیں تو کچھ نہ کچھ ضرور ہی نظر پڑ جاتا ہے۔ یوں ہی آہستہ آہستہ ادبی انقلاب رونما ہوتا ہے اور اپنے گہرے نشانات چھوڑتا ہوا گزر جاتا ہے اور شاعر اس وقت تک کے لئے پھر خاموش ہو جاتا ہے جب تک کہ دوبارہ ایسے ہی انقلاب کی ضرورت ماحول کے غیر شاعرانہ توازن کی ذمہ دار نہ بن جائے۔

اردو شاعری کا موجودہ دور بھی ایک ایسا ہی ثانوی دور ہے۔ اگر شاعری اور تاریخِ سیاست مختلف شعبے نہیں ہیں تو ضرور اس کا فطری ارتقا کسی بڑے معاشی انقلاب کا پیش خیمہ ہے جس کے نفسیاتی کچھ دنوں پیشتر حالی کے تاثرات دل میں داغ اور اکبر کے ہونٹوں پر ہنسی بن کر نمودار ہو چکے ہیں۔ لیکن فضا میں حسن قبولیت نہ ہونے کے باعث نہ ہنستوں کو رلانے میں کامیاب ہوئے نہ روتوں کو ہنسانے میں۔ مگر اب جبکہ شاعری کا خاص موسم چمن کے پھول اور پتوں میں روح بن کر سرایت کر چکا ہے۔ اب جبکہ فضائیں نرم ہو گئی ہیں، نظاروں میں لوچ پیدا ہو گیا ہے، روشنی میں دوسروں کے علاوہ خود کو روشن کرنے کا احساس بھی پیدا ہو گیا ہے، وہی چند اشارے، وہی چند منقلب لغزشیں، رنگ و بو کے پیہم میلانات اور موسم کے آمدہ اور رفتہ اثرات کے تصادمات سے محرک نظر آتی ہیں اور اس فعلیت کی زود کاریاں اقبال کی اسلام پرستی، جوش کی انسانیت شناسی، نذر الاسلام کی باغیت اور سردار جعفری کی "نو نوازی" میں روبہ آئینہ معلوم ہوتی ہیں۔ یہی ہوتا رہے گا اور جب تک ہوتا رہے گا جب تک کہ ہندوستان کو شاعروں کے پیدا کرنے کی ضرورت رہے گی،

جب علم الاخلاق محض انسانی جرائم کا آئینہ دار رہ جاتا ہے، جب پرانی رسومات نئے قالبوں میں ڈھالی جانے کے لئے گلائی جاتی ہیں، جب خون چوسنے والے "داء الاسد" (جذام) میں مبتلا ہو جاتے ہیں، جب بادلوں کے وہ چھوٹے چھوٹے ٹکڑے جو تمام رات چاند پر سے گزر گزر کر اس کی خوبصورتی کو ہر پردہ پوشی کے بعد دو چند حسین اور پر اثر بناتے رہتے ہیں۔ آہستہ آہستہ

اکٹھا ہو کر تمام فضائے بسیط پر چھا جاتے ہیں اور صبح تک کے لئے اٹل ہو جاتے ہیں۔ جب مشرق اور مغرب میں زلزلے آیا کرتے ہیں تو ہندوستان ہی پر کیا موقوف۔ ہر ملک میں ایسے ہی اقبال ایسے ہی جوش اور ایسے ہی نذر الاسلام پیدا ہوا کرتے ہیں۔

موجودہ دور میں ہندوستان ایک ایسے قطعۂ زمین کا نام ہے جہاں فطری اور ذہنی ضابطے اس کے ان باشندوں کا ساتھ دینے سے انکار کر چکے ہیں جو چلنی میں دودھ چھانکر تقدیر کو تلاش کرتے ہوں۔ جن کے دماغ میں سوسائٹی کا تصور صرف اس غول بیابانی کے مشابہ ہو جو اپنے افراد کے ہمراہ دلدل میں اتر جاتا ہے اور راہ چلتوں کو اپنی طرف بلاتا ہے اور اگر وہ نہیں آتے تو اُن پر کیچڑ اور غلاظت پھینکتا ہے۔ لیکن یہیں سے ایک اصول کی تکوین ہوتی ہے۔ کہتے ہیں "نہ کبھی دنیا سب سے زیادہ خراب ہوتی ہے نہ کبھی سب سے زیادہ اچھی"۔ اگر واقعی ایسا ہوتا ہے تو ہندوستانی سوسائٹی کا اس سے زیادہ خوفناک تصور اور دوسرا نہیں ہو سکتا۔ اس کا ردِ عمل لازمی شے ہے، اور اسی ردِ عمل کے تعمیری پہلو کا نام سیاست اور تخریبی پہلو کا نام شاعری ہے۔ لیکن تعمیری انداز کا زمانہ گزر چکا ہے۔ ہندوستان کی قوتِ انتظار زائل ہو چکی ہے اب اُس کو صرف شاعروں کی ضرورت ہے صرف شاعروں کی۔ اور اب ہر شاعر کو فطرتاً اس اہمیت کا اعتراف کرنا پڑے گا کہ وہ بانسوں کے سوکھے ہوئے ٹکڑوں میں دبکی ہوئی چنگاریوں کو دیکھے، ان کو پتھروں سے رگڑ رگڑ کر اُن سے نکلی ہوئی چنگاریوں کو بھڑکائے اور اسی بھڑکتی آگ میں ان تمام ٹکڑوں کو جلا کر راکھ کر دے۔ اس طرح یقیناً وہ راکھ اس کی موجودہ ہستی سے بدرجہا بہتر اور خوش وضع ہوگی۔ ایسا ہونے تک ہندوستان کیا کرے گا، یہ ایک ایسا سوال ہے جس کا جواب صرف یہی ہو سکتا ہے کہ وہ دوسروں کی محنت کا کھانے والوں کو اپنا اناج۔ اپنا پانی اور اپنا کپڑا دینے سے انکار کر دے گا اور بقول پریم چند ہری گھاس پر بیٹھنے والوں کو اس وقت معلوم ہو جائے گا کہ اس زمین میں کس قدر گرمی ہے جس سے اسکی جڑیں اپنی غذا حاصل کر رہی ہیں۔

ہر دل بہ ہمہ تن جبیں نظر آرہا ہے
[illegible] نظر آرہا ہے
اے نازشِ کائنات تیری خاطر
[illegible] نظر آرہا ہے

جوش

دل عقدۂ مشکل کو دعا دیتا ہے
ہر ضربتِ کامل کو دعا دیتا ہے
ہاں کون ہے مقتولِ محبت کے سوا
جو بازوئے قاتل کو دعا دیتا ہے

جوش

عزم تیرا "آگ" کے سانچے میں جب ڈھل جائیگا!
طوقِ محکومی کا لوہا خود بخود گل جائے گا!

ہندوستان میں سیاسی، سماجی، اقتصادی اور ذہنی انقلاب کا علمبردار

آگ
ہفتہ وار، باتصویر

جو

۷ جولائی ۱۹۳۸ء کو اودھ کی راجدھانی اور ہندوستان کے سیاسی و ادبی مرکز لکھنؤ سے طلوع ہو کر اُفقِ ہند پر پریم و محبت کے شعلے بھڑکائیگا

کسانوں، مزدوروں اور غریبوں کا ہندوستانی زبان میں یہ اکیلا مانگو ترجمان ہے جس کا مشن ہندوستانی نوجوان عورتوں اور مردوں کو بےچین و متحرک اور ملک کی انقلابی روح کو بیدار کر کے ہندوستان میں بلا تفریق مذہب و ملت اور بلا امتیازِ ذات پات ایک متحد اور مضبوط ہندوستانی قوم بنانا ہے۔

"آگ" میں آپ کو ہندوستان کے تمام مشہور سوشلسٹ لیڈروں اور بلند پایہ ادیبوں کے علمی، ادبی، سماجی، سیاسی، اقتصادی مضامین، مشہور افسانہ نگاروں کے سماجی و اصلاحی افسانے اور مسلم الثبوت شعرا کی روح پرور انقلابی نظمیں نظر آئیں گی۔ ہفتہ وار باتصویر "آگ" حجم سولہ صفحات اور سائز $\frac{22 \times 29}{4}$ یعنی "تیج" دہلی کے برابر ہوگا۔ اپنے مشن کو زیادہ سے زیادہ کامیاب بنانے اور اپنی دکھ بھری آواز غریب سے غریب ہندوستانی تک پہنچانے کے لئے سالانہ چندہ صرف تین روپے رکھا گیا ہے۔ فی پرچہ ایک آنہ کے حساب سے فروخت ہوگا۔

اگر آپ

اپنے وطن کو آزاد، خوشحال اور فارغ البال دیکھنا چاہتے ہیں۔
بڑے چھوٹے، آقا و غلام، امیر و غریب کے فرق کو مٹانا چاہتے ہیں
اپنے وطن کو ملاؤں اور پنڈتوں کے مکر و فریب سے نجات دلانا چاہتے ہیں،
ہندوستان میں ایک عظیم ذہنی انقلاب کے آرزومند ہیں
ہندوستان میں صرف ایک متحد و مضبوط قوم دیکھنا چاہتے ہیں
قدیم رسم و رواج و تقلید سے آزاد ہو کر تفکر صحیح کی روشنی سے ہندوستانی نوجوانوں کے دماغ کو روشن دیکھنا چاہتے ہیں۔
"آگ" کو بہترین اور ہندوستان کا سب سے سستا اخبار سمجھتے ہیں۔

تو

سب سے پہلی فرصت میں "آگ" کی خریداری منظور فرمائیے

تاجروں اور دیگر کاروباری حضرات کو اپنے اشتہاروں کے لئے فوراً جگہ محفوظ کرا لینی چاہیئے تاکہ ان کا اشتہار ہر ہفتے کم از کم تیس ہزار آدمیوں کی نظر سے گزرا کرے۔ نمونہ کا پرچہ درخواست آنے پر مفت بھیجا جائے گا۔

نوٹ:۔ مضامین اور نظمیں صفحہ کے ایک طرف خوشخط لکھکر بھیجی جائیں۔

پتہ۔ مینیجر ہفتہ وار "آگ"، دفتر "آگ" مکان حکیم رفیق ابراہیم صاحب جوائی ٹولہ لکھنؤ

مطبوعات ۱۹۳۸ء

دلّی کا سنبھالا — تذکرہ دہلی مرحوم کا اے دوست نہ چھیڑ / نہ سنا جائے گا ہم سے یہ فسانہ ہرگز — خواجہ محمد شفیع دہلوی نے دہلی مرحوم کی داستانِ الم، اس کے ایام عروج کی مرقع نگاری، صاحبانِ کمال کا تذکرہ اس ٹکسالی زبان میں کیا ہے جو اب نابود ہے۔ اندازِ بیان ایسا موثر کہ دل بے اختیار ہو جاتا ہے۔ کتابت، طباعت، اور تجلید کے لئے مکتبہ کا نام کافی ہے۔ صفحات ۱۵۰ قیمت فی جلد ایک روپیہ

لطائفِ غالب — مسز ایم۔ اے۔ شاہ، بی۔ ایس۔ سی۔ الیف۔ پی۔ اے۔ مرزا اسد اللہ خاں غالب کی شوخیٔ بیان، خوش طبعی اور ظرافت سے محظوظ ہونے کے لئے اسے ضرور پڑھئے۔ قیمت ایک روپیہ۔

شعلۂ طور — طبع ثانی۔ شاعرِ فطرت حضرت جگر مراد آبادی کے کلام کا مجموعہ، جو حضرات شعلۂ طور پر ایک دفعہ بھی اُچٹتی ہوئی نظر ڈال چکے ہیں وہ اُسے اس طرح لئے پھرتے ہیں جیسے کہ لوگ زمانۂ انقلاب فرانس میں "معاہدۂ عمرانی" لئے پھرتے تھے۔ اس ایڈیشن میں چند نئی شاعرانہ غزلوں کا اضافہ کیا گیا ہے۔ بالکل نئی ترتیب۔ از حد دیدہ زیب۔ پانچ رنگی سنہرا کور۔ اور جگر کی ایک بےنظیر تصویر۔ قیمت دو روپے آٹھ آنے

سبدِ چین — مرزا غالب کے کمیاب بلکہ نایاب فارسی کلام کا مجموعہ۔ اس میں قصائد۔ قطعات۔ مثنویاں، ترکیب بند۔ ترجیع بند۔ غزلیات اور رباعیات سب کچھ شامل ہیں۔ اس کے ساتھ ہی مرزا غالب کی مکمل سوانح حیات اور تصنیفات کا تذکرہ بھی شامل کر دیا گیا ہے۔ قیمت ۱۲ر

ذکرِ غالب — مرزا اسد اللہ خاں غالب کی مکمل سوانح حیات۔ اب تک مرزا صاحب کی سوانح حیات پر یادگارِ غالب۔ غالب اور غالب نامہ چھپ چکی ہیں لیکن اس کے باوجود غالب کی زندگی کے بہت سے ایسے پہلو تھے جو تاریکی میں تھے۔ چنانچہ اس کتاب میں تمام ممکن ذرائع سے معلومات فراہم کر کے غالب کی زندگی کے تمام پہلوؤں کو اُجاگر کیا گیا ہے۔ غرض یہ کتاب اتنی جامع اور مختصر ہے کہ شعر و ادب کا ذوق رکھنے والے حضرات کے لئے عموماً اور یونیورسٹی کے طلباء کے لئے خصوصاً ازبس مفید۔ قیمت آٹھ آنے

قرآن پاک کیا ہے اور اُس نے کیا کر دکھایا؟ — یہ کتاب بچوں کی نفسیات، شعور اور استعداد کو مدِ نظر رکھ کر آسان زبان میں لکھی گئی ہے۔ قرآن پاک آنحضرتؐ پر کس طرح اُترتا تھا، آپ کس طرح لوگوں تک پہنچاتے تھے۔ کیسے اس کی حفاظت آپؐ نے اور آپ کے بعد صحابہ کرام نے کی۔ اور کیسے اس نے لوگوں کے دلوں پر اثر کیا۔ بہت مفصل مع مثال قیمت چھ آنے

دلّی — بچوں کے لئے دہلی کی خاص عمارتوں کا دلچسپ بیان، جس کے پردے میں دہلی کی مختصر تاریخ بتا دی گئی۔ بلاک کی چھ تصاویر۔ اُجڑی اور بسی ہوئی دلیوں کے دو نقشے۔ قیمت چار آنے۔

مکتبہ جامعہ

دہلی — نئی دہلی — لاہور

ایک نفیس مزاج مہارانی

نے اپنے صدرِ اعظم سے کہا کہ دنیا کے ہر چہار جانب قاصد روانہ کرو کہ وہ ہر قسم کے پھول لائیں، تاکہ میں اپنے لیے بہترین خوشبو منتخب



کرسکوں، تعمیلِ حکم کیلئے فردوس شمال
کشمیر، جنت نظیر سوئٹزرلینڈ، شباب
انگیز تسمانیہ کے گلپاش مرغزاروں
میں گل چینی کی گئی، جب سب
پھول دُور دراز سفر کے بعد مہارانی
کے حضور میں پیش کئے گئے تو بیشتر
اپنی خوشبو کھو چکے تھے، اور باقی
اس قدر مرجھائے ہوئے تھے کہ
مہارانی کی حُسن شناس نگاہوں کو
تکلیف ہوئی، مہارانی اس خواہش
کے پورا نہ ہونے سے مُلول رہنے
لگی، کھانا پینا ترک کر دیا، مہاراجہ
کو فکر دامنگیر ہوا، اور وزراء سے
مشورہ طلب کیا، مہتمم توشہ خانہ
نے **اصغر علی محمد علی** سے عطر
منگوانے کو کہا، رائے معقول تھی،

فوراً عمل کیا گیا، جب عطر آیا تو مہارانی کا شباب رفتہ ایک بار پھر اپنی پوری بہاریں ساتھ لئے واپس آگیا

پتہ

اصغر علی محمد علی تاجر عطر لکھنؤ

بنامِ قوت و حیات

کلیم دہلی

آئے گا نہ جانے کب زمانہ اپنا
قدرت سے ملا ہے مجھکو صد حیف یہ حکم

آگے کئی صدیوں ہے فسانہ اپنا
پھر دل کو سنائے جا ترانہ اپنا

منظور شدہ
ڈائرکٹرانِ تعلیم
ریاستہائے میسور، پٹیالہ، حیدرآباد دکن

سالانہ چندہ چھ روپے
ششماہی چندہ تین روپے آٹھ آنے

سہ ماہی چندہ دو روپے
قیمت فی پرچہ نو آنے (۹)

جلد ٦ | نمبر ٢

فہرست مضامین بابتہ اگست سنہ ١٩٣٨ء

نمبر شمار	عنوان	مضمون نگار	نمبر صفحہ	نمبر شمار	عنوان	مضمون نگار	نمبر صفحہ
١	اشارات	مدیر کلیم	٨٢	١١	بے وفا دنیا	جناب سید محسن صاحب اعظم گڈھی	١٤٥
٢	اے تن (نظم)	جوش ملیح آبادی	٨٧	١٢	محبت اور گناہ	جناب سجاد حیدر صاحب ملیح آبادی	١٤٦
٣	ذریعۂ تعلیم کے متعلق وزارت صوبۂ بہار	وزارت تعلیمات صوبہ بہار	٨٩	١٣	تعویذ (نظم)	جناب شہید ابن علی صاحب	١٥١
٤	مذہب اور سوشلزم	ناظر	٩٤	١٤	شاعرِ مغرور (نظم)	جناب نشتر صاحب سندیلوی	١٥٢
٥	شہزادے کی قربانی	جناب رشید احمد صاحب صابر ویلور	٩٨	١٥	مذہب اور رواداری	جناب سید اختر علی صاحب تلہری	١٥٣
٦	بنارس	جناب برجموہن صاحب دتاتریہ کیفی	١٠٠	١٦	ہندوستان کی جمہوری زبان	جناب امام صاحب اکبرآبادی	١٥٧
٧	سیرت	مترجمہ جناب سید رضا قاسم صاحب مختار	١٠٤	١٧	مقالاتِ زرین	جوش	١٥٩
٨	بچپن کی یاد	جناب ظاہرہ انصاریہ صاحبہ	١١٤	١٨	زیکوسلواکیا کا ماضی حال مستقبل	جناب سید سعید جعفری صاحب مچھلی شہری	١٦٠
٩	سفید ماں	جناب سلیم احمد صاحب	١١٥	١٩	اشتہارات	مشتہرین	١٦٥
١٠	شبلی اور حریفانِ شبلی	جناب محمد اسمعیل خاں صاحب رزمی	١٢١				

(جوش ملیح آبادی پرنٹر و پبلشر نے محبوب المطابع برقی پریس دہلی میں چھپوا کر دفتر رسالہ کلیم [illegible] دریا گنج نمبر ۲ دہلی سے شائع کیا)

اشارات

معذرت

میں اُن تمام حضرات واحباب سے سخت نادم ہوں، جن کے متعدد خطوں کا اب تک جواب نہیں دے سکا ہوں۔ جن میں سے بہت سے رُوٹھ چکے ہیں، اور جو باقی ہیں وہ بہت جلد رُوٹھ جانے والے ہیں۔ مگر۔

یہ دنیا رنج و راحت کا غلط اندازہ کرتی ہے
خدا ہی خُوب واقف ہے کسی پر کیا گزرتی ہے

کس سے بتاؤں کہ میری زندگی اِس اثنار میں کِن ہولناک آفات کا شکار رہی۔ کتنی شدید آگ میں میرا دل جلتا رہا اور اِس وقت بھی میری رُوح کس بے پایاں عذاب میں مبتلا ہے۔

میں اس وقت زندگی کے ایک ایسے دوراہے پر کھڑا ہوا ہوں، جہاں انسان کی قوتِ فیصلہ سپر انداختہ ہو جاتی ہے، اور مسافر کی سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ کس طرف مُڑنے کو ترجیح دے —— ٹھیرا رہے، یا حرکت کرے، اور حرکت کرے تو کس طرف جائے۔

خود اپنے ولولوں کو بھی پہچانتا نہیں
کس راستے کے موڑ پہ ہوں جانتا نہیں

جنابِ امیر علیہ السلام فرمایا کرتے تھے کہ اب زمانہ مجھے اِس سے زیادہ کیا ذلیل کرے گا کہ میرا اور معاویہ کا تقابل کیا جاتا ہے۔ اسی طرح میں بھی یہ عرض کروں گا کہ اب ذہنی انتشار مجھے اِس سے زیادہ کیا ذلیل کرے گا کہ میں ایک "علامہ" کے "خطبے" پر اظہارِ خیال کر کے "کلیم" کے صفحات اور اپنے قلم کو برباد کر رہا ہوں۔

جلال مرحوم کا شعر ہے

بُلا لائے ناصح ہی کو آج کوئی اکیلے شبِ غم میں گھبرا رہے ہیں

اُس گھبراہٹ اور اُس تنہائی کے شدائد کا اندازہ تو کیجیے جب زندگی سے تنگ آ کر حضرتِ ناصح کے سے انسان کو دعوتِ مُلاقات دی جا سکتی ہے —— اور اُس پریشانی کا تصور تو فرمائیے جسے بُھلانے کی خاطر حضرت "علامہ" کے سے شخص کی جانب متوجہ ہونا پڑتا ہے۔

قارئین میرے حق میں دُعائے خیر کریں، مگر کس سے، اور کس توقع پر۔

حریفِ مطلبِ مشکل نہیں، فسُونِ نیاز
دُعا قبوُل ہو یارب کہ عُمرِ خضر دراز

آخر میں احباب سے خطوں کا جواب نہ دینے کی معذرت کرتے ہوئے میں اُن کی خدمت میں یہ درخواست کرتا ہوں کہ وہ فراخ دلی سے کام لے کر براہِ کرم میری اِس غیر ارادی بداخلاقی کو معاف فرما دیں، کیونکہ میں اب اُس منزل میں ہوں جس منزل کے رہنے والوں پر غصّہ نہیں کیا جا سکتا بلکہ ترس کھایا جاتا ہے۔

کشتی شکستگانیم، اے بادِ شُرطہ برخیز!

مُدیر

پھر وہی "علامہ"

"کلیم" کے گزشتہ نمبر میں "علامہ" کے ایک خطبے پر جو اظہارِ خیال کیا گیا تھا، وہ میری طبیعت کی ناسازگاری، اور موسم کی شدت سے تشنہ رہ گیا تھا، اس لئے اب اس کا تکملہ کیا جاتا ہے۔

حضرت "علامہ" نے ترکِ موضوعِ شراب کے دو خاص فائدے بیان فرمائے ہیں — یعنی —

(۱) پہلا فائدہ تو یہ ہوگا کہ اس سے فسق و فجور کی ترغیب، اور مفسدات سے اردو شاعری کا دامن پاک ہو جائے گا۔

(۲) اور دوسرا فائدہ یہ ہوگا کہ اس سے واعظ، زاہد، قاضی، اور محتسب پر (جو اسلام کے رجالِ محترم ہیں) تبرا بازی کی لعنت دور ہو جائے گی۔

مجھے ترس آتا ہے، رہ رہ کے ترس آتا ہے اس بیچارے "علامہ" کے دماغی توازن پر — وہ جو [illegible] میں ایک مثل مشہور ہے کہ "ماروں گھٹنا، پھوٹے آنکھ" سو وہ حضرت ہی پر صادق آتی ہے۔

کہاں ذکرِ جام و شراب، اور کہاں "علامہ" کے "رجالِ محترم" حیران ہوں کہ ان دونوں کو ایک دوسرے سے ربط ہی کیا ہے! —

کیا آگرے کی آب و ہوا اب ایسی خراب ہو گئی ہے کہ اتنی بے جوڑ باتیں ذہنوں میں آنے لگی ہیں؟

حضرتِ "علامہ" کے نزدیک گویا ذکرِ شراب کی یہ ایک طبعی تاثیر ہے کہ آدمی "اسلام کے رجالِ محترم" پر سبّ و شتم کرنے لگتا ہے۔ گویا اِدھر زبان سے یہ نکلا کہ:-

"ساقی بنورِ بادہ برافروز جام را"

اُدھر فوراً ہی آدمی نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ:-

واعظاں کیں جلوہ بر محراب و منبر می کنند

خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ "اسلام کے رجالِ محترم" اور "جام و شراب" کے درمیان وہ کونسا معنوی ربط، اور وہ کونسا روحانی تعلق ہے کہ دونوں ہمیشہ ساتھ ہی ساتھ چلتے ہیں، اور ان میں سے جب ایک ٹھہر جاتا ہے تو دوسرا بھی ٹھہر جانے پر مجبور ہو جاتا ہے۔

جناب یہ اسرارِ قصر الادب ہیں۔ انھیں "علامہ" ہی سمجھ سکتے ہیں، کیونکہ حضرت ہی "رجالِ محترم" اور "جام و شراب" دونوں کے بوقتِ واحد خلوتی رازدار واقع ہوئے ہیں۔

اس کے علاوہ حضرت "علامہ" نے یہ جو خیال ظاہر فرمایا ہے کہ موضوعِ شراب کو خارج کر دینے سے "فسق و فجور کی ترغیب اور مفسدات سے اردو شاعری کا دامن پاک ہو جائے گا" یہ بھی ویسی ہی نرالی منطق ہے جیسی کہ "رجالِ محترم" والی تھی — گویا کئی سو سال کی محنت کے بعد اُردو شاعری کو تمام مفسدات و ترغیباتِ گناہ سے اس قدر پاک کر لیا گیا ہے کہ اب اُس کے تمام موضوع الوہیت بردوش ہو چکے ہیں۔ البتہ بڑے موضوعات میں سے اب صرف ایک موضوعِ شراب ہی، ایامِ جاہلیت کی قدیم یادگار کے طور پر باقی رہ گیا ہے۔ جسے ترک کرتے ہی "فسق و فجور کی ترغیب اور مفسدات سے اُردو شاعری کا دامن پاک ہو جائے گا":

بسوخت عقل ز حیرت کہ ایں چہ بوالعجبی ست:

حضرت "علامہ" کی خدمت میں کوئی عرض کر دے کہ جناب والا اُردو شاعری ہی پر کیا موقوف ہے، دُنیا کی کسی زبان کی شاعری کو لے لیجئے۔ اگر نفسِ شاعری کو مذہب و اخلاق کا محکوم بنانا ہے تو سب سے پہلا کام یہ ہوگا کہ حسن و عشق کو یک قلم متروک و مردود قرار دے دیا جائے۔ کیونکہ صرف دو لفظوں کے اندر ایک ایسا عالم پنہاں ہے جو مذہب و اخلاق کی چاردیواری میں نہیں سما سکتا۔

مجھے معلوم ہے، اِس پر "علامہ" کیا ارشاد فرمائیں گے، "علامہ" تو جدید موضوعات بتانے کے شوق میں خود ہی تحریر فرما چکے ہیں کہ "حسن و عشق کے بلند ترین جذبات کا اظہار کیا جائے جو جنسی تعلقات، اور نفسانیت؟ سے بالاتر ہوں"

"یہ "بلند ترین جذبات" کیا ہوں گے، اور اب تک کیا کیا ہو چکے ہیں، "علامہ" ہی خود مطلع فرمائیں، "علامہ" کو معلوم نہیں کہ "پستی" اور "بلندی" حقیقت نفس الامری کے لحاظ سے کوئی چیز نہیں، یہ صرف اضافی چیزیں ہیں، ایک شے جو چند خاص حالات میں آج "بلند" ہے وہی شے چند خاص حالات میں کل "پست" ہو سکتی ہے —

اس کے علاوہ "علامہ" کو معلوم ہونا چاہئیے کہ محبت اپنے اصلی اور وسیع معنی میں ایک قطعی جنسی چیز ہے۔ اور جنسیت کا تعلق محبت سے اس قدر

اساسی ہے کہ دُنیا کی کسی قسم کی محبت کو بھی اِس سے مُنفک نہیں کیا جا سکتا۔ حتّٰی کہ وہ محبت بھی جسے رُوحانی کہا جاتا ہے، اور جس میں جسمانیت کا شائبہ تک نہیں ہوتا۔ اُس کی تہ میں بھی جنسیت ہی کارفرما ہوتی ہے۔ مگر یہ باتیں "علّامہ" کے سمجھانے کی نہیں ہیں، وہ اِن باریک مسائل کو قیامت تک نہیں سمجھ سکتے۔

اُنھوں نے تو کسی "مولوی صاحب" سے "پاک" اور "ناپاک" محبت کا نام سُن لیا ہے اور اُسی پر عمارتیں تعمیر کرتے چلے جا رہے ہیں۔

"حسن و عشق کے بلند ترین جذبات" سے آخر "علّامہ" کی مُراد کیا ہے؟ یعنی اگر کوئی شخص کسی خوبرو کو دیکھے تو فوراً ع

"ہر مرض کی دوا درود شریف"

کے نعرے لگانے لگے؟ یا پھر اِس خیال سے چیخیں مار مار کر رونے لگے کہ وہ جی بھر کے خدمت بھی نہیں کرنے پایا تھا کہ اُس کے "والدِ مرحوم" کا انتقال ہو گیا؟ یا یہ کہ اِدھر انسان کسی خوش چشم کو دیکھے، اُدھر فوراً اپنے خاندان کے پیر و مرشد کے مزار کا قُبّہ اُس کی نگاہوں میں پھرنے لگے، اور اُس کی زبان پر جاری ہو جائے ع

"میں اپنے پیر کے قُبّے کے قرباں
اجی میں پیر کے قُبّے کے قرباں؟"

کاش "علّامہ" غور کر سکتے
کاش "علّامہ" شاعر ہوتے

اب "علّامہ" کے "رجالِ محترم" کو لیجیے ــــ "علّامہ" اگر شاعر ہوتے تو اُنھیں معلوم ہوتا کہ شُعَرا نے سچے واعظوں، مخلص زاہدوں، اور بے لوث محتسبوں کو کبھی اور کسی عالم میں بھی بُرا نہیں کہا ہے ـــــ بُرا کہا ہے اُنھیں، جنھیں بُرا کہنا عین صواب ہے، بُرا کہا ہے اُنھیں جو داڑھیوں کے سائے میں ہولناک جراثیم کی پرورش کرتے ہیں، بُرا کہا ہے اُنھیں جو "محراب و منبر" پر جلوہ گُستری کے بعد خلوتوں میں "کارِ دیگر" کے مرتکب ہوتے رہتے ہیں، اور بُرا کہا ہے اُن ریاکار اور گندم نُما جَو فروش واعظوں کو جو "علّامہ" کی طرح مسجدوں کے حجروں میں محلّے کے بچّوں کے اخلاق بگاڑا کرتے ہیں۔

آپ کو معلوم ہے کہ "علّامہ" اب اِن ریاکار اور ننگِ اسلام ہستیوں کو "رجالِ محترم" کا خطاب کیوں دیتے ہیں، اور کیوں اُن کا دل نہیں چاہتا کہ اُن پر تبرّا بازی کی جائے؟

بات یہ ہے کہ اب بُڑھاپے کی بے توفیقیوں اور امراض ..... کی دردمندیوں نے "علّامہ" کے دل اور جسم دونوں سے گُناہ کی قوّت کو سلب کر لیا ہے اور اب وہ:-

اے حسن توبہ آں زماں کردی
کہ تُرا طاقتِ گُناہ نماند

کے زیرِ اثر واعظوں، زاہدوں، قاضیوں اور محتسبوں، یعنی "اسلام کے رجالِ محترم" میں خود بھی داخل ہو چکے ہیں، اور چونکہ اب وہ خود اِسی قبیل کے لوگوں میں سے ہو چکے ہیں۔ اِس لئے اُنھیں یہ کیونکر گوارا ہو سکتا ہے، کہ اُن کی اور اُن کے زُفقار کی مکّاریوں کا پردہ چاک کیا جائے۔

ہم پیشہ و ہم مشرب و ہمراز ہے میرا
غالبؔ کو بُرا کیوں کہو اچھّا مرے آگے

بعض اوقات تو "علّامہ" کی خود [illegible] اِس قدر گھناؤنی ہو جاتی ہے کہ متلی ہونے لگتی ہے، چنانچہ اپنے "خطبۂ مبارک" کے آخری پارے میں آپ نے یہی منظر پیش کیا ہے۔

ذرا اِس خود نمائی اور خود بزرگ بینی کو ملاحظہ فرمائیے۔ ارشاد ہوتا ہے کہ:-

"لہٰذا بحیثیت صدرِ مشاعرہ میرا عام قدغن ہے ــــــ"

سب سے پہلے اِس "لہٰذا" کے تبختُر کو دیکھیے، پھر "بحیثیتِ صدرِ مشاعرہ" کی ڈکٹیٹرشپ پر نگاہ ڈالیے، اور پھر "میرا عام قدغن ہے" کی فرعونیت کا تصوّر کیجیے۔ میں دریافت کرتا ہوں کہ حقیقتاً جو لوگ بڑے ہوتے ہیں کیا اُن کا یہی لب و لہجہ ہوا کرتا ہے؟ ایک دُور اُفتادہ مقام کے معمولی سے مشاعرے میں میرِ مجلس کیا بن گئے کہ شاہنشاہوں کی طرح گردن اینٹھا اینٹھا اور آنکھیں چمکا چمکا کے فرامین جاری کرنے لگے۔

ایاز، قدرِ خود را بشناس!

"میں، بزمِ ادب بھساول کے اِس مشاعرے میں، اِس وقت، اِس بلند اسٹیج سے منادی کرتا ہوں کہ ـــــــ"

اللہ اکبر ــــ اللہ اکبر ــــ اللہ اکبر ــــ اللہ اکبر!

جلّ جلالہٗ!!

"میں ــــ بزمِ ادب بھساول ــــ کے اِس مشاعرے میں ــــ اِس وقت اِس بلند اسٹیج سے ــــ مُنادی کرتا ہوں ـــــــ"

یعنی میں، کہ پروردگارِ شعر و سخن ہوں، اور بزمِ ادب بھساول کی سی مقتدر جماعت کا مہمان ہوں، اور اِس مشاعرے کا صدر ہوں، جو تاریخِ شاعری میں اپنا نظیر نہیں رکھتا۔ اِس وقت، یعنی اِس تاجپوشی کے اعلان کے وقت ــــ اِس بلند اسٹیج یعنی عرشِ معلّٰی سے منادی کرتا یعنی ایک صحیفۂ جدید نازل کرتا ہوں ــــ انا ربکم الاعلٰی! انا ربکم الاعلٰی!

سُنو، سُنو، اے اہلِ زمین سنو، آسمانِ بھساول سے شاعری کا دیوتا کلام کر رہا ہے ــــ یہ پیمبروں کی آواز نہیں ہے، یہ خدائے بزرگ و برتر کی بھی صدا نہیں ہے، جسے نوعِ انسانی حسبِ دستورِ قدیم ٹال دے۔ یہ بھساول کے مشاعرے کے صدر کی آواز ہے، جو "خاندیش کے خطۂ عظیم" سے بلند ہوئی ہے ــــ اِس گرجتی ہوئی آواز کے سامنے سر جُھکانا ہی پڑے گا۔ جُھک جاؤ، اے اُردو زبان کے شُعرا، جُھک جاؤ، ورنہ ابابیلیں آسمان سے کنکریاں برسانا شروع کر دیں گی۔

اب "علاّمہ" شاعری کے جدید موضوعات ڈکٹیٹ کرا رہے ہیں۔

شاعری میں موضوعات کا ڈکٹیٹ کرانا کتنی بے پایاں جہالت ہے۔ مگر اس کے باوجود حضرت "جدید موضوعات" ڈکٹیٹ کرا رہے ہیں ــــ سُنئے اور پُورے احترام کے ساتھ سُنئے ــــ نگاہ روبرو!

(۱) اُردو شاعری میں ایسے جذبات و احساسات کا اظہار جو بین الاقوامی ہوں۔

(۲) فطری مناظر کی گہرائیوں، اور حقائق کی ترجمانی، خصوصاً دیہاتی زندگی کی عکاسی۔

(۳) حُسن و محبت کے بلند ترین جذبات جو جنسی تعلّقات اور نفسانیت سے بالاتر ہوں۔

(۴) انسانیّت و روحانیت کی تفسیر و تحلیلِ نفسی۔

(۵) ادراک و عظمتِ نفس کا درس

(۶) ادراک، خودداری، اور امن و سکون کا پیغام۔

(۷) خُداشناسی اور خودشناسی کی تعلیم۔

(۸) اسرار و معارف کی موشگافی

(۹) وطنیّت اور قومیّت کی تبلیغ

(۱۰) تدبیرِ منزل، اور تہذیب

آپ "علاّمہ" کی فطرت سے واقف نہیں: "علاّمہ" کی یہ عادتِ جاریہ ہے کہ وہ اہلِ علم کی باتوں کو غور سے سُنتے رہتے ہیں، اور جدید مسائل اور جدید اصطلاحات کو ذہن میں محفوظ کر کے اپنی نثر و نظم میں اُن کا اظہار کرتے ہیں۔ تاکہ اُن کے بعد جب کوئی مورخِ ادب قلم اُٹھائے تو وہ حضرت کے متعلق یہ لکھنے پر مجبور ہو جائے کہ "علاّمہ" عورتوں کی اصطلاح والے "علاّمہ" نہیں، بلکہ درحقیقت مردوں کی اصطلاح "علاّمہ" تھے۔ کیونکہ اُن کے کلام میں اُن کے دَور کے تمام مسائل اور اُن کے عہد کی تمام اصطلاحیں پائی جاتی ہیں۔

چنانچہ اسی مندرجۂ بالا عادت کے تحت حضرت نے یہ چار جدید موضوعات اس لئے پیش فرمائے ہیں کہ دنیا کو یہ معلوم ہو جائے کہ آپ "بین الاقوامی" کی اصطلاح سے بھی واقف تھے۔ "فطری مناظر" اور اُن کی "گہرائیوں" کا بھی آپ کو علم تھا۔ "حقائق کی ترجمانی" میں بھی آپ کو دستگاہ حاصل تھی۔ "دیہاتی زندگی کی عکاسی" یعنی (Rural Life) سے بھی آپ آشنا تھے ــــ "حسن و عشق" اور اُس کے "بلند ترین جذبات" کا بھی جناب کو علم تھا ــــ اور آپ "جنسی تعلقات" سے بہت بالا واقع ہوئے تھے۔ اور "انسانیت و روحانیت" پر بھی آپ کو عبور حاصل تھا، اور اِن دونوں کی "تفسیر و تحلیلِ نفسی" بھی جناب کو آتی تھی۔

آپ یقین فرمائیں کہ "علاّمہ" خود ان تمام مسائل سے ناواقفِ محض ہیں، اور محض دوسروں پر اپنی "علاّمیت" کا رُعب ڈالنے کی خاطر اہلِ علم سے سُنی سُنائی باتیں دُہرا رہے ہیں۔ اور بس۔

اِن موضوعات کے پردے میں "علاّمہ" مرحوم اقبال کی بائیسکل پر چڑھے چڑھے پھر رہے ہیں۔ سائیکل کا نمبر تبدیل کر دینے کی ہرچند آپ نے بہت کوشش کی ہے۔ مگر نئی پالش کے اندر سے اقبال اور جلال الدین رومی کے مشترک نمبر صاف طور سے جھلک رہے ہیں۔

نوٹس

سائیکلوں کے سارقوں سے ہوشیار!

وہ شخص "وطنیت" اور "قومیّت" کی تبلیغ کا ادعا کرے جس کی صدارت میں وطنیّت و قومیّت کی تذلیل ہو چکی ہو، اور وہ صاحبِ مشاعرہ کے رُعب میں آ کر دم نہ مار سکا ہو۔ ع

وائے گر در پسِ امروز بود فردائے

اہاہ! ڈپٹی نظیر احمد صاحب مترجم قرآن تشریف

وتربیتِ اخلاق کی تلقین

لے آئے۔ حضرت: عالمِ ارواح سے کیونکر جھٹ پٹ چلی آئیے، تشریف لائیے۔ پہلے "اخلاقِ جلالی" پڑھائیگا کہ "الحقوق والفرائض" کا درس دیجئے گا؟

پہلے تو ہمیں یہ بتائیے کہ یہ ظالم نفسِ امارہ کیونکر مارا جاسکتا ہے، اور پھر یہ تعلیم دیجئے کہ میاں بیوی کیونکر امن کے ساتھ زندگی بسر کرسکتے ہیں، اور بچوں کو کس صورت سے موٹا تازہ رکھا جاسکتا ہے تاکہ ہم شعرائے اردو اپنی نظموں کے ذریعے سے آپ کے ارشادات کی تبلیغ کرکے سوسائٹی میں "مُصلحِ قوم" اور "حامیٔ دینِ مبین" کا لقب حاصل کرلیں، اور ارسطو کے قول کو جھوٹا ثابت کر دکھائیں۔

مجھے اس بُوڑھے اور بیچارے "علامہ" پر حقیقت میں بڑا ہی ترس آتا ہے۔ یہ بیچارہ تو شاعری کی ابجد سے بھی واقف نہیں۔ اس شخص کو کیا معلوم کہ شاعری، کبھی اخلاقیات کا قانون نہیں بن سکتی۔ اور شاعری کو کبھی اور کسی شرط کے ساتھ بھی "اخلاقِ جلالی" اور اخلاقِ محسنی" کے زیرِ فرمان نہیں کیا جاسکتا ہے۔

کیا "علامہ" سچ مچ شاعری کے فرشتے سے باورچی کا کام لینا چاہتے ہیں، اور شاعری کی دیوی سے بچوں کے پوتڑے دُھلوانے کی فکر میں ہیں؟ اگر ایسا ہی ہے تو پھر اس اندھیر نگری میں خاکسار بھی چند جدید موضوعاتِ شاعری پیش کرکے مُصلحِ شاعری کا لقب کیوں نہ حاصل کرے۔

پس قارئینِ کرام کی خدمتِ عالی میں ادب کے ساتھ گزارش ہے کہ اس خاکسار کی طرف سے بھی چند جدید موضوعاتِ شاعری نوٹ فرمالئے جائیں۔ تاکہ سند رہے، اور وقتِ ضرورت کام آئے۔

(خاکسار کی طرف سے چند جدید موضوعات)

(۱) توہینِ حُسن (۲) معائبِ عشق (۳) فوائدِ صلواۃِ معکوس (۴) رموزِ ریش دراز (۵) اسرارِ "نورنامہ" و "راہِ نجات" (۶) فوائدِ تراویح (۷) خواصِ روغنِ زیتون (۸) مفاسدِ وضُو (۹) قواعدِ ضربات یاہُو (۱۰) مسائلِ نرخِ اجناس (۱۱) تدابیرِ ضبطِ تولید (۱۲) اور مبادیٔ استنجہ وطہارت۔

اور چونکہ ہندوستان ایک زرعی مُلک ہے، اِس لئے ذیل کے موضوعات پر بھی نظمیں لکھی جائیں۔

(۱) بیل (۲) گائے (۳) خچر (۴) سانڈ (۵) بیج (۶) پانی (۷) ہل (۸) کھاد (۹) پھاوڑا (۱۰) اور گوبر ——

اور چونکہ مُلک کو صنعت وحرفت کی بھی شدید ضرورت ہے۔ اس لئے اِس موضوع پر بھی کثرت سے نظمیں کہی جائیں۔ مگر وطنِ عزیز چونکہ بیحد مفلس واقع ہوا ہے۔ اس لئے سرِدست ذیل کے تین موضوعوں تک ہی شاعری کو محدُود رکھا جائے۔

(۱) ٹین کے لوٹے (۲) ٹاٹ کے بوریئے اور (۳) وضُو کے بدھنے۔

والسلام

من آنچہ شرطِ بلاغ است با تو می گویم!

نوٹ:- "علامہ" کی طرف سے کلیم کے اشارات پر جو تازہ دُشنام آمیز گل افشانی فرمائی گئی ہے۔ آئندہ اشاعت میں، گالیوں کا جواب نظر انداز کرکے، اُس پر روشنی ڈالی جائے گی —— اور اُس کے بعد "علامہ" اور "متعلقاتِ علامہ" کے ذکرِ خیر سے "کلیم" کے اشارات کو ہمیشہ کے لئے پاک کردیا جائے گا۔ اِس لئے کہ ایسی ہستیوں سے اُلجھنا "کلیم" کی سخت توہین ہے ——

طاقت حملے کی جب چلی جاتی ہے
طینت حیلے پہ دل کو اُکساتی ہے
ہو گر بہ کا عزم حج، کہ زُہدِ سیماب
دونوں کے تصور پہ ہنسی آتی ہے

کیا مجھکو گراں خواب سمجھ رکھا ہے　　یا جُوئے تنک آب سمجھ رکھا ہے
جہّال سے ڈر کے ترک کردوں گا شراب　　تونے مجھے سیماب سمجھ رکھا ہے

اِس طرح کبھی میں نہوا تھا گُمراہ
یہ آج کدھر بھٹک کے پہونچی ہے نگاہ
سیماب میں اُلجھا دیا شیطاں نے مجھے
لَاحَوْلَ وَلَا قُوَّۃَ اِلَّا بِاللّٰہ!

جوش

اے تمنّا!

دیکھ اے میری تمنّا، اے عدوئے صبر و ہوش
ترک فرما یہ تلاطم، یہ تموّج، یہ خروش

تا بکے یہ کشمکش، یہ کرب، یہ کُلفت، یہ بار
کب تک آخر یہ تشنّج، یہ تلاطم، یہ فشار

یوں گرج کر کیوں ہلاتی ہے جڑیں جذبات کی
گونجتی ہیں جس طرح راتیں بھری برسات کی

چھوڑ دے لِلّٰہ ترسانا ترسنا چھوڑ دے
یہ گرجنا، یہ کڑکنا، یہ برسنا چھوڑ دے

دل کو کیوں جھونکا ہے غم کے کھولتے گرداب میں
آنچ بن کر دوڑتی پھرتی ہے کیوں اعصاب میں

خُون میں کیوں تیرتی رہتی ہے بَل کھاتی ہوئی
دِل کو دھڑکاتی ہوئی، آنکھوں کو برساتی ہوئی

چوٹ کھائے اژدہے کی طرح لہراتی ہے کیوں
آگ، ہاں دوزخ کی دل پر آگ برساتی ہے کیوں؟

کیوں گراتی ہے پیاپے بجلیاں، خاموش ہو
اے تمنّا، اے جہنّم کی زباں، خاموش ہو

اب تو دل میں آگ کا بہتا ہے دریا، رحم کر
اے تمنّا، اے تمنّا، اے تمنّا، رحم کر

کیوں جھکولے دے رہی ہے مجھکو اپنے زور میں
بند ہو جا میرے دل کے حُجرۂ پُر شور میں

بند ہو جا قلب میں اے قُلزُم کف در دہاں
بند کر دے جابجا دروازوں کو جُن لے کھڑکیاں

بند ہو جا اے تمنّا، بند ہو جا اِس طرح
قبر کے گوشے میں رکھ دیتے ہیں میّت جس طرح

بند ہو کر پھر نہ آ، تا صُبحِ محشر ہوش میں
سسکیاں لے لے کے سو جا موت کے آغوش میں

جب مرے سینے میں تُو گھُٹ کر فنا ہو جائے گی
خاک تیری، میرے حق میں کیمیا ہو جائے گی

خرمنِ اُمید، اِس سینے میں جب جل جائے گا
غم کو ارضِ شادمانی کا پتا چل جائے گا

ایک دُکھتے دل کے اندر اور اِتنا شور و شیں
اے تمنّا، یاد فرما مرگِ سُقراط و حُسینؑ

ہاں شہادت کے اُفق ہی پر بصد زورِ شباب
مُسکراتا ہے حیاتِ جاوداں کا آفتاب

ہاں تو جب سینے میں تُو گھُٹ کر فنا ہو جائیگی
زندگی رازِ طرب سے آشنا ہو جائے گی

رُوئے انور کے نظارے بیکراں ہو جائیں گے
"ثُمَّ وَجہُ اللہ" کے معنی عیاں ہو جائیں گے

دردِ دل کو، دردِ عالم کی دوا آجائے گی
میرے دُکھ میں وُسعتِ ارض و سما آجائے گی

پھر نہ تڑپوں گا کبھی ذاتی مسرت کے لئے
وقف ہو جاؤں گا آفاقی محبّت کے لئے

زخم جو ڈالے گی تُو دل میں رُلانے کے لئے
میں اُسے مرہم بنا دوں گا زمانے کے لئے

عشقِ جاناں، عشقِ حُسنِ جاوداں ہو جائیگا
یہ ستارہ ٹوٹ کر خود اک جہاں ہو جائیگا

اور او ظالم، اگر تُو نے نہ مانی میری بات
تنگ آکر بند کر دوں گا میں خود بابِ حیات

مبتلا ہونگا نہ او کافر ترے طاعون میں
غرق ہو جاؤں گا خود اپنے ہی دل کے خون میں

خود ہی اس قیدِ عناصر سے رہا ہو جاؤں گا
تو اگر باقی رہی تو میں فنا ہو جاؤں گا

اور فنا ہو کر بقا کا ہمعناں بن جاؤں گا
قطرہ ہوں، ٹوٹا تو بحرِ بیکراں بن جاؤں گا

جوش ملیح آبادی

ذریعۂ تعلیم کے متعلق وزیر تعلیم صوبہ بہار کا فیصلہ

اسکولوں میں تعلیم "ہندوستانی" زبان میں دی جائے!

کچھ عرصہ سے وزارت تعلیمات بہار میں یہ مسئلہ زیر غور تھا کہ اسکولوں میں تعلیم کے لئے کونسی زبان اختیار کی جائے۔ ڈاکٹر سید محمود صاحب وزیر تعلیم نے یہ حکم صادر فرمایا کہ آئندہ اسکولوں میں تمام علوم و فنون بجائے انگریزی زبان کے "ہندوستانی" زبان میں پڑھائے جائیں حکم کا ترجمہ حسب ذیل ہے۔

ملک میں قومی جذبات کی ترقی کے ساتھ ذریعۂ تعلیم اور ثانوی درجہ کے امتحانات کے مسئلہ نے روز افزوں اہمیت اختیار کرلی ہے، یہ ظاہر ہے کہ ابتدائی درجوں میں جہاں چھ سے بارہ سال تک کے بچے تعلیم پاتے ہیں۔ مادری زبان کے سوا دوسری زبان ذریعۂ تعلیم نہیں بنائی جاسکتی۔ اگرچہ یہ بھی صحیح ہے کہ ہمارے ملک کے اکثر حصوں میں ۹ اور ۱۰ برس کے بچوں کو بھی اسکولوں میں انگریزی زبان میں تعلیم دی جاتی ہے، اور اسکولوں کے ٹائم ٹیبل میں انگریزی پڑھانے کے لئے جو اوقات متعین کئے جاتے ہیں اُن سے صاف طور پر واضح ہوتا ہے کہ انگریزی کو نصاب تعلیم میں غیر معمولی اہمیت دی جاتی ہے، تھوڑے دنوں پیشتر تک ہندوستان کے تمام صوبوں میں ثانوی درجہ کے امتحانات اور تعلیم کے لئے انگریزی ہی کو استعمال کیا جاتا تھا، لیکن گزشتہ دس سال کے عرصہ میں اس قاعدہ کو ترک کردیا گیا ہے، اور اب بعض صوبوں میں ہندوستان کی جدید زبانوں مثلاً ہندی اور اردو کو اختیاری ذریعۂ تعلیم و امتحان قرار دیا گیا ہے مثلاً یوپی میں ہائی اسکول اور انٹرمیڈیٹ کی تعلیم کے متعلق ایک بورڈ ہے، جو اس صوبہ میں تعلیمی پالیسی کی نگرانی کرتی ہے، اور امتحانات لیتی ہے۔ اس بورڈ کے قواعد و ضوابط میں یہ ہے، کہ "ہائی اسکول کے امتحانات کے اُمیدواروں کو یہ اختیار ہے کہ وہ انگریزی ادب کے سوا باقی تمام مضامین میں، جواب انگریزی خواہ ہندی یا اردو میں لکھ سکتے ہیں" جہاں تک کہ اس مسئلہ کی خالصتاً تعلیمی حالات کا تعلق ہے، یہ بالکل واضح ہے کہ فطری حالات کے تحت میں لڑکوں اور لڑکیوں کو اس زبان میں تعلیم دینی چاہیئے، جو زبان اُنھوں نے والدین سے اپنے گھروں میں سیکھی ہے۔ سنہ ۱۹۱۹ء میں انگلستان میں بورڈ آف ایڈوکیشن کے صدر مسٹر FISHER نے انگریزی زبان میں تعلیم کے مسئلہ پر غور کرنے کے لئے ایک زبردست کمیٹی بنائی تھی وہ کمیٹی اپنی رپورٹ میں لکھتی ہے "انگلستان کے بچوں کے لئے انگریزی کے علم پر کسی دوسرے علم کو ترجیح نہیں دی جاسکتی۔ اور انگریزی ادب پر کسی دوسرے ادب کو تفوق نہیں دیا جاسکتا۔ اور یہ دونوں آپس میں اس طرح متعلق ہیں کہ صرف یہی قومی تعلیم کی بنیاد قرار دئے جاسکتے ہیں" کمیٹی

ریپورٹ میں آگے چل کر لکھتی ہے کہ "یہ بالکل ظاہر ہے کہ جب تک بچہ اپنی ملکی زبان کے اوپر ایک خاص حد تک قابو حاصل نہ کرے، کوئی تعلیمی ترقی ممکن ہی نہیں" بدقسمتی سے ہندوستان میں صرف یہی نہیں کہ ہندوستانی زبانوں کو علوم کی دوسری شاخوں پر کوئی ترجیح نہیں دی جاتی، بلکہ بالکل بیّن طور پر انھیں ایک کمتر درجہ عطا کیا گیا ہے، اور اُن کے ساتھ سوتیلی ماں کے جیسا سلوک کیا جاتا ہے۔ اِس پالیسی کے نتائج نہایت نقصان دہ ثابت ہوئے ہیں، قومی نقطۂ نظر سے اِس پالیسی نے انگریزی تعلیم یافتہ ہندوستانیوں اور ملکی زبان میں تعلیم یافتہ ہندوستانیوں کے درمیان ایک وسیع خلیج حائل کر دی ہے، اور ایک ایسے ملک میں جہاں ذات اور درجہ کے اختلافات پہلے سے موجود ہیں، اور زیادہ اختلافات پیدا کر دئے ہیں۔ انگلش پر زور دینے کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ فرقہ وارانہ اختلافات اور زیادہ بڑھ گئے ہیں، کیونکہ انگریزی عہد سے پہلے عام طور سے تعلیم یافتہ ہندو اور تعلیم یافتہ مسلمان ایک دوسرے کی زبان اور ادب کو پڑھتے اور سمجھتے تھے۔ مادری زبان کی جگہ پر انگریزی زبان کو ذریعۂ تعلیم بنا دینے کا یہ نتیجہ ہوا ہے کہ مختلف فرقوں کے لوگ ایک دوسرے کی زبان اور ادب کا مطالعہ ترک کرنے پر مجبور ہو گئے۔ تمدنی نقطۂ نظر سے بھی اس پالیسی نے ملکی زبانوں کی ادبی ترقی کو روکا ہے۔ کیونکہ فضلاً اور طلبًا دونوں کی ضروریات انگریزی کتابوں سے پوری ہو جاتی ہیں، اور مادری زبان میں ادبی سرمایہ مہیا کرنے کی کوئی ضرورت نہیں محسوس کی جاتی ہے، نو سال اور اس سے اوپر کے بچّوں کو مجبور کیا جاتا ہے کہ وہ علمی دنیا میں داخلہ کے لئے ایک غیر زبان میں مہارت حاصل کریں۔ اس طرح اُن کی تمام تر کوششیں غیر ملکی زبانوں کے قواعد اور الفاظ کو یاد کرنے میں صرف ہو جاتی ہیں۔ اُن کی توجہ فقط زبانی تعلیم پر صرف کی جاتی ہے، جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ علم کے حقائق سے محروم رہ جاتے ہیں، اور اُن کا تخیل بلند نہیں ہونے پاتا۔ وہ ہندوستانی جو انگریزی زبان میں تعلیم پاتا ہے، اپنے ملکی علوم اور معاشرت کی زمین سے اُکھاڑ پھینکا جاتا ہے، اور مجبوری میں وہ ایک ایسا گھر تلاش کرتا ہے جس کا ماحول اس کے خیالات اور طریقۂ زندگی سے بالکل بیگانہ ہوتا ہے۔

زبان خیالات کا سانچہ اور احساسات اور زندگی کے تجربات کے اظہار کا ذریعہ ہے جس چیز کو انسان وضاحت کے ساتھ بیان نہیں کر سکتا، وہ اُسے اچھی طرح نہیں جانتا، اسی طرح اس کا عکس بھی صحیح ہے، کہ خیالات کو الفاظ میں ادا کرنے کی قابلیت خیالات کی حد بندی کر دیتی ہے۔ جو شخص صرف اس لئے اپنی مادری زبان سے لاپرواہی برتتا ہے، کہ وہ کسی غیر ملکی زبان کے ذریعہ علم حاصل کرے، وہ کسی زبان میں بھی ایسی مہارت جس کے بغیر اظہار خیالات اور تخیل دونوں مشکل ہیں، کیونکر حاصل کر سکتا ہے؟ اسکولوں اور کالجوں کے نصاب تعلیم میں علوم و فنون کی جو مختلف شاخیں ہیں۔ اگر ان کا مطالعہ مادری زبان کے ذریعے کیا جائے، تو وہ زیادہ آسان اور مرغوب خاطر ہو جائیں گی، اگر ہندوستان میں طرز تعلیم کے اندر نقائص ہیں۔ مثلاً یہ کہ خیالات کو نقصان پہنچا کر حافظہ پر زیادہ زور دیا جاتا ہے تو اس کی اصلی وجہ یہ ہے کہ مادری زبان کی جگہ پر (جو تعلیم کا فطری ذریعہ ہے) ایک غیر ملکی زبان "انگریزی" کو قائم کر دیا گیا ہے۔

اس لئے نظام تعلیم میں مادری زبان کو اس کی فطری جگہ دینی چاہئے، اور اُسے تعلیم اور امتحانات کا ذریعہ بنانا چاہئے، اور انگریزی کی تعلیم بحیثیت ایک لازمی مضمون کے گیارہ سال سے اوپر کے بچّوں کو دینی چاہئے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ انگریزی کا معیار کم ہو جائے گا۔ لیکن اس نقصان کی تلافی دوسری طرف نہایت زبردست فوائد کے حصول سے ہو جائے گی۔ یہ قومی اتحاد اور تمدنی ترقی کو مستحکم کرے گا، اور تعلیم کے صحیح اصول کو ترقی دے گا، جس کا مقصد یہ ہے کہ احساسات اور تخیلات کو فقط الفاظ کی شکل میں نہیں، بلکہ حقیقت کے ماحول میں ظاہر کیا جائے۔

یہ نہ سمجھا جائے کہ میں کسی طرح انگریزی زبان یا انگریزی ادب کا مخالف ہوں، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ میں انگریزی زبان اور انگریزی ادب کا شیدائی ہوں، اور اسے دنیا کا بہترین ادب تصور کرتا ہوں۔ انگریزی زبان میں مہارت حاصل کرنا بہت ضروری ہے، لیکن یہ مہارت خیالات اور اظہار خیالات کو نقصان پہنچا کر حاصل نہ کی جائے۔

جس وقت سے میں وزیر ہوا ہوں، اسمبلی میں بار بار سوالات کئے جا رہے ہیں، اخبارات میں مضامین لکھے جا رہے ہیں اور میرے پاس خطوط بھیجے جا رہے ہیں کہ اس معاملہ میں اتنی دیر کیوں کی جا رہی ہے، دوسری طرف مجھے متنبہ کیا جا رہا ہے، کہ میں بغیر گہرے مطالعہ اور غور و فکر کے اس معاملہ میں جلدی نہ کروں۔ اخبارات میں اس مسئلہ پر بحثیں کی جا رہی ہیں۔ میں یہ کہنا چاہتا

ہوں کہ میں نے یہ خیال کہ ذریعۂ تعلیم مادری زبان ہونی چاہیئے، اُس وقت اختیار کیا تھا، جب میں ۱۹۰۷ء سے ۱۹۱۳ء تک یوروپ میں طالب علم تھا، اب یہ سوال رہ جاتا ہے کہ کس زبان کو ذریعۂ تعلیم قرار دیا جائے، میرا خیال یہ ہے کہ شمالی ہندوستان میں (جس میں میں پنجاب۔ یوپی۔ سی پی اور بہار کو شامل کرتا ہوں) ذریعۂ تعلیم "ہندوستانی" قرار دی جائے۔

لفظ "ہندوستانی" کے متعلق بہت کچھ بحثیں ہو رہی ہیں، بعض معترضین یہ کہتے ہیں کہ یہ لفظ کانگریس کا بنایا ہوا ہے۔ لیکن تاریخی حقیقت یہ ہے کہ زبان کا یہ نام سولھویں اور سترھویں صدی میں لوگوں کو اچھی طرح معلوم تھا، اور اُس وقت جو یورپی سیاح ہندوستان آئے تھے، انھوں نے اس لفظ کو اختیار کیا تھا، چنانچہ (ٹیری) (۱۶۱۶ء) اور فرائر (۱۶۷۳ء) نے اُسے "اندوستانی" کہا ہے۔ AMADUZZI (اما دوزی) نے ایک ڈکشنری "لنگوا اندوستانی گا" (۱۷۴۳ء) کا حوالہ دیا ہے اور کٹلائر نے (۱۷۱۵ء) میں اس کی پہلی گرامر اور لغت لکھی۔ تاریخ فرشتہ (۱۵۰۹ء) اور عبدالحمید لاہوری نے اپنے پادشاہ نامہ (۱۶۵۵ء) میں اس کا تذکرہ کیا ہے۔ اٹھارہویں صدی میں لفظ ہندوستانی عام ہو گیا۔ میر امن نے اپنی کتاب باغ و بہار، (۱۸۰۱ء) میں اسے "ٹھیٹھ ہندوستانی" کہا ہے۔ گلکرسٹ نے اپنی کتاب "انگریزی ہندوستانی ڈکشنری" کے نام میں اس لفظ کا استعمال کیا اور گارسن دی تاسی نے پیرس میں ہندوستانی زبان کی تاریخ پر لکچر دئے۔ بہت سے مصنفین نے اس لفظ کو اُردو کے معنی میں اور بعضوں نے ہندی کی جگہ استعمال کیا ہے۔ پوزیشن کو زیادہ صاف کرنے کے لئے مناسب یہ ہے کہ "گریرسن نے جو اس لفظ کی تعریف کی ہے، اُسے درج کیا جائے: "ہندوستانی وہ زبان ہے جو بالائی گنگا کے دوآبہ کے علاقہ میں بولی جاتی ہے، اور جو ہندوستان کی لنگوا فرنکا ہے، جسے فارسی اور دیوناگری دونوں رسم الخط میں لکھا جاتا ہے، اور جس میں نہ تو فارسی الفاظ کی کثرت ہو، اور نہ سنسکرت کی، اردو ہندوستانی زبان کی اس خاص قسم کا نام ہے، جس میں فارسی الفاظ کثرت کے ساتھ استعمال کئے گئے ہوں، اور اسی طرح ہندی ہندوستانی زبان کی وہ قسم ہے، جس میں سنسکرت کے الفاظ زیادہ پائے جاتے ہوں۔"

اس لئے ہندوستانی کوئی نیا نام نہیں، جو ہندی اُردو کی جگہ پر قائم کرنے کے لئے ایجاد کیا گیا ہو، بلکہ جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں، یہ قدیم اور تسلیم شدہ لفظ ہے، اور اس زبان کا نام ہے جو ہندی اور اردو کی مختلف شکلوں کی مشترکہ بنیاد ہے۔

ہندوستانی زبان کو سنسکرت سے بھرنے یا فارسی سے ملانے کے خلاف اکثر یوروپین اور ہندوستانی فضلانے آوازیں بلند کی ہیں، جن میں چند کے نام حسب ذیل ہیں۔

بیمس۔ گریرسن، پنڈت بال کرشن بھٹ، پنڈت پدم سنگھ شرما۔ پنڈت اُپادھیا، منشی پریم چند۔ سید علی بلگرامی، مولوی عبدالحق، مولوی وحید الدین سلیم۔ مولانا سید سلیمان ندوی وغیرہ وغیرہ۔ میں ان میں سے فقط دو حضرات یعنی پنڈت گردھر شرما اور مولانا وحید الدین سلیم کے خیالات درج کرتا ہوں۔ پنڈت جی فرماتے ہیں "سنسکرت مایا بنا کر اپنے بنگالی، مہاراشٹر آدی میں ہندی کا پرچار کر لیا۔ کن تو وہ کیول شکشیتوں کی بھاشا بن گئیں۔ سر دا سدھارن اُسے بالکل نہ سمجھ سکے، تو کیا لابھ ہوا۔ لابھ کیا بڑی ہانی ہو گئی .... ہندی بھاشا میں ہندی بھاشا کے مشبد ہی پر ستھان لینی چاہئیں، پھر جب اُن سے اوشکتا پوری نہ ہو، تب سنسکرت بھاسا سے سرل شبد لینے چاہئیں۔"

مولوی وحید الدین سلیم اپنی مشہور کتاب "وضع اصطلاحات" میں لکھتے ہیں "ہم کو اس دھوکے سے بچنا چاہیئے اور ہندی زبان کے الفاظ اور حروف سے، جو ہماری زبان کی فطرت میں داخل ہیں، ناک بھوں چڑھانی نہیں چاہیئے۔ ہم جس طرح عربی فارسی سے اصطلاحات لیتے ہیں، اسی طرح ہندی سے بھی بے تکلف وضع اصطلاحات میں کام لینا چاہیئے۔"

بابو راجندر پرشاد نے ۱۹۳۶ء ناگپور میں تقریر کرتے ہوئے اس مسئلہ پر نہایت ہی قابلیت اور وضاحت کے ساتھ بحث کی۔ افسوس یہ ہے کہ یہ سب جماعتیں ایک دوسرے سے علیحدہ علیحدہ کام کرتی رہیں، اس لئے اُن کے مشورے ابتک قبول نہیں کئے گئے۔ نتیجہ یہ ہے کہ اُردو ہندی نہایت تیزی کے ساتھ علیحدہ علیحدہ ایسی متعلق زبانیں بن رہی ہیں، جنھیں فقط علما و فضلا ہی سمجھ سکتے ہیں، اور جو عوام کی بول چال سے بالکل جداگانہ ہیں۔ یہ زبانیں بجائے اس کے کہ ہمسایوں کے اندر باہمی مفاہمت کا ذریعہ بنیں، نافہمی اور بیگانگی کی رُکاوٹیں پیدا کر رہی ہیں۔ اُن کے فوائد کا دائرہ تنگ ہوتا

جارہا ہے۔ اور اُن کی ہر دلعزیزی کی وسعت محدود ہوتی جارہی ہے۔

ہندوستان کے نوجوانوں کی تعلیم جب تک انگریزی کے ذریعہ ہوتی رہی، تو اس امر سے کوئی بحث نہ تھی کہ ہندوستانی زبان میں اصطلاحی الفاظ دو علیحدہ طریقے کے ہوں یا ایک۔ لیکن اب جب کہ ثانوی درجوں میں بھی تعلیم مادری زبان میں دی جارہی ہے اور ہم اس حالت کی طرف جارہے ہیں، جبکہ اعلیٰ تعلیم بھی اسی مادری زبان کے ذریعہ دی جائیگی، تو اس سوال نے کہ الفاظ کے اصطلاحات کے دو علیحدہ جوڑ ہوں بنگال کو چھوڑ کر سارے شمالی ہند میں غیر معمولی اہمیت اختیار کرلی ہے۔ اگر اُردو اور ہندی طالب علموں کی سمجھ سے بالاتر ہوجائیں تو نتیجہ یہ ہوگا کہ اسکولوں میں تعلیم کا دوسرا انتظام کرنا ہوگا، جس کی وجہ سے لازمی طور پر یا تو اس کے معیارِ کمال میں کمی واقع ہوجائے گی یا اخراجات بڑھ جائیں گے۔ یونیورسٹیوں کی دقتیں اور زیادہ بڑھ جائیں گی۔ تعلیم اور تحقیقاتِ علمی کے مسائل بہت پیچیدہ ہوجائیں گے۔ سوال یہ ہے کہ کیا ہر یونیورسٹی میں ہر مضمون کے لئے مدرسین کی دو علیحدہ جماعتیں قائم کی جائیں۔ ایک وہ جو اردو کے ذریعہ تعلیم دے سکے، اور دوسری وہ جو ہندی کے ذریعے تعلیم دے سکے، یا ہر مرکز میں دو یونیورسٹیاں قائم کی جائیں۔ اس کے بعد پھر یہ سوال پیدا ہوگا کہ مجالس قانون ساز اور گورنمنٹ کی زبان کیا ہوگی۔ ان کے علاوہ تماشہ گاہوں، ریڈیو، سنیما، تھیئٹر اور صوبوں کی باہمی تجارت اور تعلقات کے مسائل سامنے آتے ہیں۔ وہ کونسی زبان ہوگی جو انگریزی کی جگہ لے گی، کیونکہ اس امر پر ہم سب متفق ہیں، کہ آئندہ ان تمام کاموں میں انگریزی زبان ہمارے لئے مفید ثابت نہیں ہوسکتی۔ مجھے یہ امر نہایت ہی افسوسناک معلوم ہوتا ہے کہ محض قرضہ کے الفاظ کی وجہ سے ایک ہی زبان کی دو شکلیں ایک دوسرے سے بالکل جدا کردی جائیں، اور عملی تعلیم اور تنظیمی مسائل کا حل اور زیادہ مشکل بنا دیا جائے۔ حقیقت یہ ہے کہ جہاں تک ادب کا تعلق ہے، جدید ہندی اور جدید اُردو، ہندوستانی زبان کے فقط دو طرز ہیں، اور سائنٹفک تصنیفات میں اُن کا اختلاف فقط قرضہ کے الفاظ تک محدود ہے، مجھے معلوم ہوتا ہے کہ اس اختلاف کو دور کرنا ہرگز ہرگز ناممکن نہیں، بشرطیکہ اختلاف کو دور کرنے کا مستقل ارادہ کرلیا جائے، ذاتی طور پر میں اس طرزِ عمل کا پورے طور سے حامی ہوں۔ اور جہانتک جلد ممکن ہوسکے میں اس بات کی کوشش کروں گا کہ ان دو زبانوں کے اختلافات کی خلیج پاٹ دی جائے۔

یہ صحیح ہے کہ معلّمین کا مسئلہ وقت طلب ہوگا، لیکن پھر بھی ایسا نہیں جو حل نہ کیا جاسکے، اوّل تو یہ کہ یہ وقت اب بھی موجود ہے۔ لیکن یہ دائمی اور مستقل نہیں۔ اس غرض کے لئے کہ بحیثیت مشترکہ زبان کے ہندوستانی کا معیار قابل اطمینان ہوجائے۔ یہ ضروری ہے کہ ایک نمائندہ کمیٹی کی نگرانی میں محکمۂ تعلیمات لائق مصنفین کے ذریعہ سے کتابیں تیار کرائے۔ سائنٹفک اور اصطلاحی الفاظ کے مسئلہ پر باہمی اتحاد ہوگیا تو ہندی اور اردو کے باہمی اختلافات کا زہر دور ہوجائے گا۔ ایک علاقہ میں دو علیحدہ زبانوں کی موجودگی کے مشکلات حل ہوجائیں گے اور اردو اور ہندی ایک دوسرے سے مل کر گفتگو اور ادب کا ذریعہ بن جائیں گی۔ اس سلسلہ میں یہ بیان کرنا ضروری ہے کہ ورنکولر ڈیولوپمنٹ کمیٹی نے جسے بہار و اُڑلیسہ گورنمنٹ نے سر علی امام مرحوم کی صدارت میں قائم کیا تھا، یہ سفارش کی تھی کہ میٹریکولیشن تک انگریزی ادب کے سوا باقی اور تمام مضامین کے لئے ذریعہ تعلیم مادری زبان کو قرار دیا جائے، اور رفتہ رفتہ اس اصول کو اعلیٰ تعلیم کے لئے بھی اختیار کیا جائے (دیکھو پیراگراف ۵ رزولیشن ۷۴۲ ای آر تاریخ ۵ ستمبر ۱۹۲۹ء) اس کمیٹی نے یہ سفارش بھی کی تھی کہ ایک خاص معیار تک دونوں رسم الخط لازمی کردئے جائیں، لیکن میں اس کے متعلق کوئی حکم صادر نہیں کرتا۔ بلکہ اسے اس کمیٹی کے فیصلہ پر چھوڑ دیتا ہوں، جسے میں قائم کر رہا ہوں۔ پنجاب یونیورسٹی کی تحقیقاتی کمیٹی (۱۹۳۲-۳۳ء) نے بھی یہ سفارش کی کہ تمام اسکولوں میں ذریعۂ تعلیم مادری زبان کو قرار دیا جائے۔ یوپی کی حکومت نے بھی یہ سفارش کی ہے کہ تعلیمی پروگرام میں ذریعۂ تعلیم مادری زبان ہونی چاہئیے۔

فرانس کی اکاڈمی کی جیسی کسی فرقہ وار جماعت کے موجود نہ ہونے کے سبب یہ ضروری ہے کہ ایک نمائندہ کمیٹی قائم کی جائے جو مشترکہ اصطلاحی الفاظ کے مسئلہ پر غور کرے اور اس کا قاتلانہ حل پیش کرے۔

مجوزہ کمیٹی مندرجہ ذیل امور کو عمل میں لانے کی کوشش کرے گی۔

(۱) یہ ماہر مصنفین کے ذریعہ کتابیں تصنیف کرائے گی، انھیں جانچے گی، اور منظور کرے گی۔

(۲) ایسے الفاظ کی جو اُردو اور ہندی کے معیاری مصنفین استعمال کرتے ہیں، ایک لغت تیار کرائے گی۔

(۳) جدید اصول پر ایک قواعد مرتب کرے گی، جس میں ہندی اور اردو کے تلفظات اور ترکیب اور الفاظ کے ماخذ کے لئے اصول اور قواعد بنائے جائیں گے۔

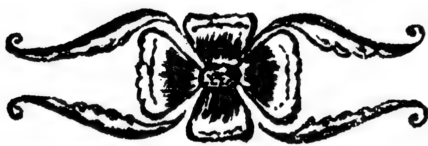
(۴) ہندی اور اردو مصنفین کے لئے اصطلاحی الفاظ کی ایک لغت تیار کرائے گی۔

(۵) مترجمین کے استعمال کے لئے ایک انگریزی ہندوستانی لغت مرتب کرائے گی۔ مجھے خوشی ہے کہ ملک کے بعض نہایت ہی ممتاز ادیبوں نے اس کمیٹی کا رکن ہونا منظور کر لیا ہے، اس لئے میں ایک کمیٹی مندرجہ ذیل حضرات کی بناتا ہوں۔

(۱) بابو راجندر پرشاد۔ پٹنہ
(۲) مسٹر ایس سنہا، وائس چانسلر پٹنہ یونیورسٹی
(۳) مولانا ابوالکلام آزاد۔ کلکتہ
(۴) پروفیسر ڈاکٹر تاراچند۔ الہ آباد
(۵) پروفیسر نارندادیو۔ بنارس
(۶) ڈاکٹر بابو رام سکسینا، ڈی لٹ۔ الہ آباد
(۷) مولانا سید سلیمان ندوی۔ اعظم گڈھ
(۸) مولوی عبدالحق۔ حیدرآباد (دکن)
(۹) ڈاکٹر عابد حسین۔ جامعہ ملیہ۔ دہلی
(۱۰) پروفیسر سیدین۔ علی گڈھ یونیورسٹی
(۱۱) پروفیسر بدری ناتھ ورما۔ پٹنہ
(۱۲) راجہ رادھکا رامن پرشاد سنگھ۔ سورج پورہ

اس کمیٹی کے صدر بابو راجندر پرشاد ہوں گے۔ اور سکرٹری کے فرائض پروفیسر سید نجم الہدیٰ پٹنہ کالج انجام دیں گے۔ لیکن ممبر نہ ہوں گے۔

اس کمیٹی پر ملک کو اعتماد ہوگا۔ ابتدا میں کمیٹی کے ارکان کو اکثر ملنا پڑیگا، لیکن جب کام شروع ہو جائے گا تو بار بار ملنے کی ضرورت باقی نہ رہے گی، ایک میموریل جس پر اردو بولنے والے حضرات کی بہت بڑی تعداد نے دستخط کئے ہیں، میرے پاس بھیجا گیا ہے، میں اسے فائل میں شامل کر دیتا ہوں۔ اس سلسلہ میں لیڈی امام کی سرکردگی میں ایک وفد بھی میرے پاس آیا۔ مجھے یقین ہے کہ اُن تمام باتوں پر جو اُنھوں نے پیش کئے ہیں وہ کمیٹی غور کرے گی۔ ان تمام مسائل پر کمیٹی مجھ سے زیادہ بہتر طور پر اظہار رائے کر سکے گی۔ اس کمیٹی سے لوگوں کو عام طور پر اطمینان ہو جائے گا، اور اس سے دوسرے صوبے بھی فائدہ اُٹھا سکتے ہیں۔ صوبہ میں ایک سے زیادہ مادری زبان کی موجودگی اور اردو ہندی کے مناقشات نے دقتیں پیدا کر دی تھیں۔ لیکن پنڈت جواہر لال کی تحریروں اور بابو راجندر پرشاد اور مولوی عبدالحق کے تصفیہ نے تمام دقتوں کو دور کر دیا ہے۔ اختلافات اور مناقشات بہت کافی ہو چکے ہیں۔ اب ہم لوگوں کو کام کی طرف متوجہ ہونا چاہیئے۔



رگ رگ میں بسی ہے تیری خوشبو اب تک
واللہ تھمے نہیں ہیں آنسو اب تک
اے رشکِ چمن جدھر بٹھایا تھا مجھے
ویران ہے اس دن سے وہ پہلو اب تک
جوش

کیا دور تھا وہ اے بتِ پرفن [illegible]
دنیا تھا سمٹ ہوائیں دامن [illegible]
ہے ہے وہ زمانہ کھیلتا تھا پہروں
جب میری جوانی سے لڑکپن [illegible]
جوش

مذہب اور سوشلزم

ناظر

اس زمانے میں سوشلزم کا لفظ بہت زباں زدِ خلائق ہے۔ مگر عوام میں شاید بہت کم لوگ اس کے صحیح مفہوم سے آشنا ہوں گے۔ مبہم طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ مساوات کی تحریک کا نام سوشلزم ہے۔ جس میں غریب طبقوں کی بہتری اور بہبودی مضمر ہے۔ زیادہ معروف معنی یہ سمجھے جاتے ہیں کہ مزدوروں اور سرمایہ داروں اور کسانوں اور زمینداروں کی باہمی آویزش کا نام سوشلزم ہے۔ سوشلزم چونکہ عامۃ الناس کے مفاد کی حمایت کرتا ہے، اس لئے عوام میں اس تحریک کو قدرتاً مقبول ہونا چاہیئے تھا۔ مگر واقعہ یہ نہیں ہے۔ دولتمند طبقے کی مخالفت کی وجہ تو خیر محتاجِ بیان نہیں۔ مگر عوام کے راستے میں جو چیز حائل ہے وہ مذہب ہے۔ اکثر مسلمانوں کا یہ خیال ہے کہ چونکہ اسلام سب سے زیادہ مساوات کا حامی ہے، اس لئے اُس کے ہوتے ہوئے سوشلزم وغیرہ کی ضرورت نہیں۔ لیکن دیگر مذاہب کے لوگ جو مساوات کے اس قدر مدعی نہیں ہیں وہ سوشلزم سے اس لئے ابا کرتے ہیں کہ اُن اداروں کی اس سے بیخ کنی ہوتی ہے، جن سے اُن کے مفاد وابستہ ہیں اور جو مذہب کے نام سے زندہ ہیں۔ بعض اہلِ مذہب کا یہ خیال ہے کہ سوشلزم چونکہ اقتصادیات سے متعلق تحریک ہے اس لئے مذہب کو اس سے کوئی سروکار نہ ہونا چاہیئے کیونکہ مذہب اُن کے نزدیک اقتصادیات سے تعلق نہیں رکھتا۔ بعض لوگوں کا یہ بھی خیال ہے کہ سوشلزم ایک بدیشی تحریک ہے اور اس لئے ہمارے ملک کے لئے سازگار نہیں ہے۔ یہ تمام اختلافات زیادہ تر اس وجہ سے ہیں کہ لوگ سوشلزم کا مفہوم اچھی طرح نہیں جانتے۔ اکثر لوگ سوشلزم اور کمیونزم میں کوئی تمیز نہیں کرتے۔ بعض لوگ اس کو ناقابلِ عمل کر اس کی طرف توجہ نہیں کرتے۔ بعض لوگوں کے نزدیک اس کا یہ پہلو تو خوش آئند ہے کہ وہ ملوکیت اور استبداد پر ضرب لگاتا ہے مگر اُس کا یہ پہلو بہت مکروہ ہے کہ وہ مذہب پر بھی ہاتھ صاف کرتا ہے۔ جہاں وہ اجتماعی مفاد اور مساوات کا علمبردار ہے وہاں شخصی اور انفرادی آزادی کو بھی بڑی حد تک سلب کرتا ہے۔ ہم ان تمام پہلوؤں پر آگے چل کر روشنی ڈالیں گے۔ مگر سب سے پہلے سوشلزم کے مفہوم کی مختصر طور پر وضاحت کرنا چاہتے ہیں، سوشلزم کا علم المعیشت سے بہت گہرا تعلق ہے۔ مگر ہم جزوی اور تفصیلی بحث سے یہاں پر اجتناب کریں گے۔ ورنہ تمام مضمون اصطلاحی ہو جائے گا۔

سوشلزم کا جدید ترین نظریہ یہ ہے کہ دولت آفرینی کا کام تمام تر حکومت کے سپرد ہونا چاہیئے۔ ذاتی اختیارات کو اس میں کوئی دخل نہو۔ اجتماعی مفاد کے لئے حکومت کا قیام یقیناً مفید ہے۔ (یہاں پر اجنبی حکومت خارج از بحث ہے۔) اور اس کو انفرادی آزادی کے منافی سمجھنا غلطی ہے۔ سوسائٹی کی مجموعی بہبودی کے لئے حکومت کا قیام ضروری ہے اور اسی لئے حکومت وجود میں آتی ہے۔ اس حکومت کے نظام کو اقتصادی یا معاشی مقاصد کے لئے استعمال کرنا چاہیئے اور دولت کی پیدائش اور تقسیم کے ذرائع کو بتدریج شخصی قبضہ اور انفرادی سرمایہ داروں کے اختیار سے نکال کر حکومت کو اپنے ذمہ لے لینا چاہیئے۔ یہاں پر یہ واضح کر دینا ضروری ہے کہ "شخصی" یا "انفرادی" الفاظ سے کوئی غلط فہمی نہ ہونی چاہیئے۔ اس مفہوم میں کمپنیاں بھی شامل ہیں۔ حکومت کے مقابلہ میں ہر ایک دوسری شکل پر نجی ہونے کا اطلاق ہوگا۔ اور وہ دولت آفرینی کے معاملہ

میں جائز نہ ہونی چاہیئے۔ حکومت کی کیا تعریف ہے، اس پر بھی سر دست بحث نہیں کرنا چاہتے۔ فلسفیانہ دقیقہ سنجی سے قطع نظر کر کے عملی مقاصد کے لئے ہر شخص حکومت کے معنی سمجھتا ہے۔ رہی یہ بات کہ حکومت کی بہت سی شکلیں ہو سکتی ہیں، یہاں پر کونسی شکل مراد ہے، تو اس کے متعلق اتنا بتا دینا کافی ہے کہ شخصی حکومت کے علاوہ اور کوئی بھی شکل ہو، سرمایہ داری کا تعلق صرف حکومت ہی سے ہونا چاہیئے۔ سرمایہ تو یقیناً ضروری اور ناگزیر ہے، اُس کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ البتہ یہ ضروری نہیں کہ وہ ذاتی ہی ہو، مال و دولت کے پیدا کرنے اور اُس کی تقسیم کے معاملہ میں ذاتی ملکیت سوشلزم کے نزدیک فتنہ انگیز ہے۔ سرمائے کا استعمال سب کے فائدے کے لئے ہونا چاہیئے۔ نہ کہ اُن معدودے چند کے مفاد کے لئے جو حسنِ اتفاق یا خوش بختی سے فی الحال اُس کے مالک ہیں۔ اور اگر اس اصول کو تسلیم کیا جائے تو ظاہر ہے کہ اِس کے نفاذ کی صورت یہی ہو سکتی ہے کہ یہ معاملہ حکومت کی تحویل میں رہے۔ غرض سرمایہ داری کا جہاں تک تعلق ہے سوشلزم ذاتی ملکیت کی بجائے حکومت کی ملکیت قائم کرنا چاہتا ہے۔ یعنی سرمایہ سب کی ملکیت ہو اور اس کا استفادہ عام ہو۔ یہ واضح رہے کہ سوشلزم ذاتی ملکیت کے سوال کو سرے سے مٹانا نہیں چاہتا۔ بلکہ اس کے نزدیک ذاتی ملکیت انسان کی انفرادی نشو و نما کے لئے ضروری ہے البتہ ذاتی ملکیت کی موجودہ تقسیم ناانصافی پر مبنی ہے۔

اُوپر کی تشریح سے یہ بات صاف ہو گئی ہوگی کہ سوشلزم میں اور کمیونزم میں کتنا فرق ہے، کمیونزم ہر چیز کی اشتراکیت کا حامی ہے اور سوشلزم فقط دولت کے معاملہ میں اجتماعی مفاد کی بنا پر ذاتی ملکیت کو برطرف کرنا چاہتا ہے۔ باقی تمام معاملات میں وہ اس کو برقرار رکھنا چاہتا ہے، کمیونزم ذاتی ملکیت کسی چیز میں بھی باقی نہیں رکھنا چاہتا۔ اس لحاظ سے سوشلزم اور کمیونزم دو مختلف چیزیں ہیں، اگرچہ یہ اختلاف نوعیت کا نہیں بلکہ درجہ کا ہے۔

سوشلزم کے لئے اردو میں اشتراکیت کا لفظ عام طور پر استعمال ہوتا ہے، اور کمیونزم کے لئے بھی یہی لفظ مستعمل ہے۔ لیکن دونوں میں امتیاز کرنے کے لئے ہمارے نزدیک سوشلزم کے لئے "اجتماعیت" اور کمیونزم کے لئے "اشتراکیت" کے الفاظ استعمال ہونے چاہئیں۔ سوشلزم جیسا کہ بتایا جا چکا ہے قابلِ عمل ہے اور نہ ہر لحاظ سے مفید، کیونکہ ذاتی ملکیت کو اگر ہر شعبہ میں ختم کر دیا جائے تو انفرادی نشو و نما کا میدان بالکل تنگ ہو جائے گا۔ اور یہ عملی پہلو سے بھی دشوار بات ہے اور فی نفسہ بھی سوسائٹی کے لئے کچھ اچھی چیز نہیں۔ انسانی سوسائٹی مدت سے ایک ایسے دستور العمل کی تلاش میں ہے جو اجتماعی زندگی کے لئے مکمل ہو اور ساتھ ہی شخصی آزادی بھی برقرار رہے، اور انفرادی حیثیت فنا ہو جائے۔ ایسا دستور العمل بظاہر ناممکن الوجود معلوم ہوتا ہے۔ اور جتنے بھی دستور معلوم ہو سکے ہیں اُن میں یہ سقم ضرور باقی رہتا ہے کہ وہ یا تو اجتماعیت پر زیادہ زور دیتے ہیں یا انفرادیت پر۔ اس نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو سوشلزم بڑی حد تک اس مسئلہ کو حل کر دیتا ہے جس میں شر کم از کم۔ اور منفعت زیادہ سے زیادہ۔ انفرادی نشو و کا لحاظ رکھتے ہوئے زیادہ سے زیادہ اجتماعی مفاد کی تکمیل کرنا چاہتا ہے۔ ساتھ کے ساتھ شخصی آزادی کا بھی بہت لحاظ رکھتا ہے۔ سوشلزم کے ساتھ اسٹیٹ سوشلزم کی بھی تشریح کر دیں۔ یہاں مناسب ہے۔ اس سے یہ مراد ہے کہ حکومت کے اختیارات اور دائرۂ عمل میں اضافہ جس کا سوشلزم حامی ہے، محض اس لئے ہونا چاہیئے کہ حکومت کی قوت و اقتدار، سطوت و جبروت اور لوگوں پر اس کی گرفت اور دباؤ زیادہ بڑھ جائے۔ کیونکہ یہ تو بالکل سوشلزم کے مقصد کے منافی ہے۔ سوشلزم دولت آفرینی کے معاملہ کو جو حکومت کو تفویض کرنا چاہتا ہے تو اس کا مقصد یہ ہے کہ اس طریقے پر زیادہ آدمی مستفید ہو سکیں گے اور مفاد عامہ کا دائرہ وسیع ہو جائے گا، اور اس صورت میں انفرادی آزادی زیادہ حاصل ہوگی۔ بہ نسبت موجودہ حالات کے جبکہ سرمایہ داری ذاتی اور نجی شے ہے اور دوسرے طبقے اس کے زیرِ اثر ہیں۔ لیکن جن ممالک میں حکومت مالدار طبقہ کی ہے وہاں پر حکومت کی باگ بڑھانا مفادِ عامہ کو اور زیادہ نقصان پہونچائے گا۔ البتہ جہاں جمہوری حکومت ہے وہاں پر اس کا کوئی اندیشہ نہیں اور وہاں پر سوشلزم اور اسٹیٹ سوشلزم کی کوئی تفریق نہیں، جیسے انگلستان میں۔

سوشلزم کی اس قدر تشریح کرنے کے بعد اور اس کے مفہوم کو اچھی طرح ذہن نشین کرنے کے بعد اب ہم اس کا موازنہ مذہب سے کرتے ہیں۔ مذہبوں میں ہم اسلام کو پہلے لیتے ہیں۔ کیونکہ جن لوگوں نے اسلام کا بغور مطالعہ کیا ہے اُن کو یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ اسلام اجتماعیت اور

جمہوریت، مساوات اور آزادی کا سب سے زیادہ مدعی ہے۔ وہ دُنیا کا آخری اور مقابلتہً جدید ترین مذہب ہے۔

یہاں اسلامی مساوات سے وہ مراد نہیں ہے جو عام لوگ لیتے ہیں، مثلاً عبادت کے وقت مسجد میں چھوٹے اور بڑے۔ امیر و غریب اور شاہ و گدا کا برابر پہلو بہ پہلو کھڑا ہو جانا۔ یہ ظاہری مساوات ہے۔ اصلی مساوات نہیں۔ اصلی مساوات معاشی پہلو پر مبنی ہونی چاہیئے۔ اُسی وقت معاشرتی مساوات بھی صحیح معنوں میں مستقل طور پر قائم ہو سکتی ہے ورنہ وہ صرف ظاہر داری ہے۔ آپس میں برابر داری کے سلوک کی تاکید جب کہ واقعی برابری نہو (یعنی بغیر اُن کی معاشی حالت کو درست کئے ہوئے) قابلِ عمل نہیں۔ یہ سچ ہے کہ انسان ہونے کی حیثیت سے سب یکساں اور برابر ہیں اور اخلاقاً برابر داری کا سلوک سب کے ساتھ ہونا چاہیئے۔ مگر خاص اِسی بنا پر یہ ضروری ہے کہ اُن کی مادّی احتیاج کا برابر لحاظ کیا جائے اور غریبوں کو امیروں کے رحم و کرم پر نہ چھوڑا جائے۔

ہم کو معاشی پہلو سے دیکھنا چاہیئے کہ اسلام نے کیا کیا ہے۔ ہر چند کہ اسلام کے آغاز کے وقت معاشی اور اقتصادی کشمکش کی یہ صورت نہ تھی جو آج ہے۔ لیکن سرمایہ داری کی لعنت اور اُس کے ممکن الوقوع نتائج کو نظر رکھکر اُس نے سُود حرام کیا۔ زکوٰۃ فرض کی۔ تجارت میں اور نیز روزمرّہ کی زندگی میں ذخیرہ اندوزی کو منع کیا۔ وراثت کے اصول ایسے بنائے کہ جائداد کے ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیں۔ خیرات کی تاکید کی۔ وغیرہ۔ وغیرہ۔ اِن تمام چیزوں کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن سوشلزم کی سمت میں یہ ایک اقدام تھا۔ یہیں پر ٹھیر جانا اور اس سے آگے نہ بڑھنا مذہبی تعصب ہے۔ اگر یہ باتیں مذہبی رنگ میں نہ ہوتیں تو اِن کا قدرتی مآلِ کار سوشلزم ہوتا۔ مگر مذہب نے اس تحریک کا گلا گھونٹ دیا۔ مذہبی ذہنیت ارتقاء کے منافی ہوتی ہے۔ اگرچہ خود مذہب کی مختلف صورتیں ارتقاہی کی پیداوار ہوتی ہیں۔

مذکورہ اسلامی اصول سوسائٹی میں سرمایہ داری کی روک تھام کی طرف مائل ہیں۔ لیکن سوشلزم کے نزدیک سرمایہ فی نفسہٖ کوئی بُری چیز نہیں ہے۔ بلکہ اُس کی ذاتی ملکیت خطرناک ہے۔ اقتصادی ترقی کے لئے سرمایہ ناگزیر ہے۔ صرف اس کی نجی حیثیت قائم نہ رہنی چاہیئے۔ پھر بھی سرمایہ بجائے لعنت کے نعمت بن جائے۔ مذہب دراصل اقتصادی ترقی ہی کو اچھی نظر سے نہیں دیکھتا۔ وہ زندگی کے مادّی پہلو پر زور دینا نہیں چاہتا۔ بلکہ روحانی پہلو ہمیشہ اس کے مدنظر ہوتا ہے۔ مذہب کے جن اُصولوں کو معاشی نقطۂ نظر سے دیکھا جاتا ہے، اُن کی غائت مادّی ترقی نہیں ہوتی۔ چنانچہ اسلام کے مذکورہ اصولوں کو ایک ایک کرکے دیکھیے۔ وراثت کے قوانین جو جائداد کو چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں تقسیم کر دیتے ہیں اُن کا مقصد اگرچہ سرمایہ داری پر ضرب لگانا ہے۔ مگر وہ اقتصادی ترقی کے نقطۂ نظر سے ابتری کا باعث ہیں۔ زراعتی طبقہ کی بدحالی کے اسباب میں یہ ایک بڑا سبب ہے، خیرات کی تاکید فرض اور واجب کے تحت میں نہیں آتی، اور اسی طرح ذخیرہ اندوزی کی ممانعت نواہی کے تحت میں نہیں آتی۔ یہ دونوں چیزیں محض اخلاقی محرکات پر مبنی ہیں، جن پر مذہبی حکومت عمل نہیں کرا سکتی۔ البتہ زکوٰۃ فرض ہے۔ لیکن وہ اندوختہ پر خاص حد پر اور خاص مدت میں لازم آتی ہے، یہ بھی سرمائے ہی کے متعلق ہے، اگر کوئی کثیر الآمدنی شخص اپنے تمول کو تعیشات پر صرف کرتا ہے، جو شرعی طور پر حرام نہوں اور اندوختہ پیدا نہ کرے تو اُس پر کوئی گرفت نہیں۔ اگر کہا جائے کہ اُس کا خرچ کرتے رہنا دُوسروں کے استفادے کا باعث ہوتا ہے۔ اس لئے اصل مقصد اِس صورت میں حاصل رہتا ہے اس لئے اِس کی گرفت کی ضرورت نہیں۔ لیکن یہ بات سرمائے سے بھی حاصل ہوتی ہے، کیونکہ وہ کاروبار میں لگایا جاتا ہے۔ سرمایہ کے معنی وہ پُونجی نہیں جو مقفل رہے۔ رہا سُود کا مسئلہ۔ تو اس کے متعلق بجا طور پر کہا جا سکتا ہے کہ دولت آفرینی کے ذرائع کو شخصی ملکیت کے تحت میں چھوڑتے ہوئے سُود کے نظام کو مٹانے کی کوشش کرنا اصولاً غلط ہے۔

اصل بات یہ ہے کہ اسلام موجودہ نظام معاشرت کو قائم رکھتے ہوئے اُسکی خرابیوں کی اصلاح کرنا چاہتا ہے۔ وہ کوئی معاشی نظریہ پیش کرنا نہیں چاہتا۔ کیونکہ اُس کا مقصد دولت آفرینی کے پہلو کو فروغ دینا نہیں ہے، بلکہ وہ ایسی باتیں بتاتا ہے جو سیدھی سادی سپاہیانہ اور قناعت کی زندگی کے لئے سازگار ہوں۔ یہ خوبیاں اگرچہ اپنی جگہ پر ناقابلِ تردید ہیں، اور تعریف سے مستغنی۔ مگر یہ تمام تر اخلاقی پہلو ہے۔

دیگر مذاہب کا حال اس باب میں قابلِ ذکر نہیں۔ ہندو مذہب میں

ذات پات کی بندشوں نے طبقاتی نزاع مستقل طور پر قائم کردی۔ وہاں معاشرتی مساوات ہی کا فقدان ہے۔ معاشی مساوات کا تو ذکر ہی کیا۔ عیسائیت کو زندگی کے اہم مسائل سے کوئی سروکار ہی نہیں۔

اگر مذاہب کو مجموعی حیثیت سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ مذہب کی مخصوص شان یہ ہوتی ہے کہ وہ اپنے وقت کے موجودہ نظام معاشرت اور اُس کے ماتحت اداروں کو برقرار رکھنا چاہتا ہے۔ خصوصاً وہ ادارے جن کا تعلق زندگی کے معاشی پہلو سے ہوتا ہے۔ اِن اداروں کی بُرائیوں میں وہ تخفیف کر دیتا ہے۔ لیکن اُن کو اصلاح شدہ حالت میں برقرار ضرور رکھتا ہے۔ مثال کے طور پر بردہ فروشی یا غلامی کے قدیم رواج کو لیجئے۔ نہ عیسائیت نے اُس کو توڑا اور نہ اسلام نے اس کو ناجائز قرار دیا۔ اور نہ اور کسی مذہب نے اس کا انسداد کیا۔ مذہب کا طُرۂ امتیاز یہی ہے کہ وہ موجودہ نظام معاشرت کی اخلاقی طور پر اصلاح کر دیتا ہے۔ مگر اس کو بدلتا نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آج بھی اُمرا کا طبقہ مذہب کی پشت پناہی کر کے سوشلزم کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرتا ہے۔ اور مذہبی علماء بھی بالعموم اس کے مخالف بلکہ دشمن ہیں۔ رہے عوام تو وہ زیادہ تر اِن ہی دو طبقوں کے زیر اثر ہیں۔

پھر مذہب خالص انفرادی شے ہے۔ وہ انفرادیت پر بہت زور دیتا ہے اور اُس کو ہر حیثیت میں قائم رکھنا چاہتا ہے۔ شخصی ملکیت کا زندگی کے کسی محدود شعبہ میں بھی فنا ہونا وہ گوارا نہیں کر سکتا۔ اور اس لئے مذہب کا اختلاف سوشلزم کے ساتھ اصولی ہے۔ اس میں خواہ مذہب اسلام ہو یا کوئی اور مذہب۔ جب تک مذہبیت باقی ہے، سوشلزم کے ساتھ نقیض باقی ہے۔ خاص طبقوں کے مفاد جو سوشلزم کی راہ میں حائل ہیں وہ بھی مذہب ہی کی آڑ میں پناہ لیتے ہیں۔ غرض مخالفت کی جائے پناہ مذہب ہی ہے مذہب باوجود اپنے مساوات کے دعاوی کے عملاً استبداد کا سنگین قلعہ ہے۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ ایک بالادست اور طاقتور ہستی کی پرستش کا جذبہ استبداد کے جراثیم کی پرورش کے لئے موافق فضا پیدا کر دیتا ہے۔ نیز وہ قدامت پرستی کے باعث اس فرسودہ نظام معاشرت کو بدلنے کے لئے تیار نہیں جو دُنیا کی موجودہ بدحالی اور کشمکش کی تہ میں کام کر رہا ہے۔

مذہبی ممالک میں سوشلزم صرف اسی حد تک رہے گا کہ مزدوروں اور کسانوں کی حالت کو حکومت کے ذریعے کچھ بہتر کر دیا جائے اور سرمایہ داروں کی خون آشامی اور زمینداروں کے مظالم میں کچھ تخفیف ہوجائے اور بس۔ لیکن جب تک دولت کی فراہمی اور تقسیم کا ایسا انتظام نہ ہو جس میں کسی خاص طبقہ کا مفاد دخل نہ پا سکے۔ بلکہ یہ متنازعہ معاشی طبقے ہی نہ رہیں اُس وقت تک دُنیا کی بے چینی رفع نہیں ہو سکتی۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ چونکہ ہندوستان میں یہ طبقاتی جنگ یعنی سرمایہ داروں اور مزدوروں کی نزاع ایسی شدید نہیں جیسی یوروپ میں ہے۔ اور نہ طبقاتی حالات اس قسم کے ہیں، جیسے وہاں صنعتی انقلاب کے بعد سے پیدا ہو گئے ہیں۔ پھر یہاں کے دیگر حالات بھی (مذہبی اور معاشری) وہاں سے مختلف ہیں۔ اس لئے یہاں یہ سوال نہ تو اس قدر خطرناک ہے اور نہ اُس کا حل سوشلزم ہے۔ یہاں خفیف اصلاح کر دینی کافی ہے۔ مگر اس کے یہ معنی ہیں کہ جب حالات ناگفتہ بہ ہو جائیں اس وقت بُنیادی اصلاح کی طرف قدم اُٹھایا جائے۔

ہندوستان میں مذہبی حالات سوشلزم کی راہ میں ضرور حائل ہیں جس کی ہم تشریح کر چکے ہیں۔ مگر جہاں تک ضرورت کا سوال ہے اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ یہاں زمینداروں اور کسانوں کے تعلقات پہلے ہی ناگفتہ بہ ہیں۔ اگرچہ سرمایہ داروں اور مزدوروں کی کشمکش اس قدر شدید نہیں لیکن دیگر ممالک کے اثر سے یہ بھی بڑھتی جا رہی ہے۔ اور اگر صرف معمولی روک تھام ہی سے کام لیا گیا تو حالات اُس نتیجہ پر ضرور پہونچ جائیں گے جو یورپ میں رُونما ہو چکا ہے۔ خطرہ کو معمولی سمجھ کر سہل انگاری سے کام نہ لینا چاہیئے۔ اگرچہ بنیادی انقلاب کے لئے ہندوستان اس وقت تیار نہیں ہے۔ کیونکہ مذہب کا سوال یہاں ابھی بہت اہم ہے۔ اور اس لئے یہ ضروری ہے کہ اصلاح بتدریج ہو۔ مگر مصلح نظریہ نہ ہونا چاہیئے کہ خفیف اصلاحات پر اکتفا کر لیا جائے۔ بلکہ مکمل اصلاح یا بنیادی تبدیلی پیشِ نظر ہونی چاہیئے۔ اور عوام کی ذہنیت کی اصلاح ابھی سے ضروری ہے۔

کلیم کے خریدار

چندہ بذریعہ منی آرڈر روانہ فرمائیں وی پی منگانے میں زیادہ نقصان ہے

شہزادے کی قربانی

ایک امریکی کہانی

رشید احمد صابر، ویلور

شاید آپ جانتے ہوں کہ اس گاؤں میں شہزادہ نامی ایک شخص رہتا تھا، جس کے رگ پٹھے فولاد سے بنے ہوئے معلوم ہوتے تھے۔ لوگ اسے شہزادہ کیوں پکارتے تھے۔ یہ مجھے نہیں معلوم۔ شاید اس لئے کہ وہ دریا دل واقع ہوا تھا یا شاید اس لئے کہ وہ اپنے مضبوط جسم اور قد و قامت کے لحاظ سے شہزادہ معلوم ہوتا تھا۔ بعض حلقوں میں یہ مشہور تھا کہ وہ جاہل اور اکھڑ آدمی ہے۔ لیکن میں یقیناً کہہ سکتا ہوں کہ یہ سفید جھوٹ ہے۔ بعض اوقات عوام یہ بھی بھول جاتے ہیں کہ مرحومین کا نام عزت و احترام سے لینا چاہیئے۔ مانا کہ وہ اپنا سارا وقت بلیرڈ، تاش اور گنجفے میں صرف کرتا تھا، مانا کہ غلطیاں انسان کو بدی کی طرف لے جاتی ہیں۔ اور یہ بھی مانا کہ وہ بندوق، تلوار اور دوسری فولادی ہتھیاروں سے کبھی خوفزدہ نہیں ہوا تھا۔ اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ موت اس کے سامنے ہیچ تھی۔ لیکن ذاتی جھگڑوں میں وہ کبھی مارپیٹ اور قتل کا مرتکب نہیں ہوا تھا۔ یہ سچ ہے کہ وہ اپنے دوستوں کو اُن کی غلطی پر سختی کے ساتھ تنبیہہ کرتا۔ لیکن جب کبھی ان کے حقوق غصب ہوتے تو وہ دلیرانہ اُن کی پشت پناہی پر آموجود ہوتا۔ جہاں تک مجھے علم ہے، اس نے کبھی کسی سے وعدہ شکنی نہیں کی۔ اور کبھی کسی کو دھوکا نہیں دیا۔ اگرچہ اس بیچارے کو گذرے ہوئے کئی سال ہو چکے ہیں۔ لیکن آج بھی اس کی یاد ہمارے دلوں میں تازہ ہے۔

شہزادے کا ایک عزیز دوست تھا، جو اپنے دُبلے پن، چھوٹا قد۔ گندمی رنگ اور گھونگریالے بالوں کی وجہ سے گاؤں بھر میں مشہور تھا۔ شہزادہ اور اُس کا عزیز دوست چارلس ورجینیا کے ایک ہی گاؤں میں رہتے تھے۔ میں کہہ سکتا ہوں کہ اُن کی دوستی اس قدر گہری تھی کہ ایک دوسرے پر اپنی جان قربان کرنے کے لئے تیار ہو جاتا۔ قسمت کی موج اگر چڑھاؤ پر ہوتی تو دونوں ایک ساتھ تیرتے اور اگر اتار پر ہوتی تو دونوں ایک ساتھ ڈوبتے۔

لیکن ایک زمانہ ایسا آیا کہ ایک لڑکی کا عشق دونوں کے درمیان خلیج بنکر حائل ہوا۔ واقعہ یہ تھا کہ دونوں دوست گاؤں کی ایک لڑکی پر دل ہار چکے تھے۔ ابتدا میں اگرچہ دونوں کی یہ کوشش تھی کہ یہ راز ایک دوسرے سے پوشیدہ رہے۔ لیکن کوئی کہاں تک ضبط کر سکتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ایک دن یہ راز کوہ آتش فشاں کی طرح پھٹ پڑا اور نفرت اور غصے کا لاوا کئی سال کی دوستی کو بہالے گیا۔

لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس تلخی میں لڑکی کا کوئی قصور نہ تھا۔ چونکہ وہ ایک کو دل و جان سے چاہتی تھی، اس لئے دوسرے سے جو اس کے محبوب کا دوست تھا شفقت و محبت کا برتاؤ کرتی تھی۔ مختصر یہ کہ لڑکی کے خیال میں شہزادہ اگرچہ ایک پُرلطف نوجوان تھا جو دوست بننے کے قابل تھا۔ لیکن چارلس ایک وجیہہ و حسین نوجوان تھا، جو دل لینے کے قابل تھا۔ شاید بعض لوگ تعجب کریں کہ چارلس نے کس طرح لڑکی کا دل موہ لیا۔ کیونکہ عورتیں عموماً قد آور اور مضبوط جوانوں کو چارلس کی قسم کے جوانوں پر ترجیح دیتی ہیں۔ میرے پاس اس کا کوئی جواب نہیں۔ میرا خیال تو یہ ہے کہ شہزادہ چارلس سے بدرجہا بہتر تھا، تاہم وہ اس لڑکی کی نگاہ میں سما نہ سکا۔ اور میں نے کہدیا کہ یہ پوچھنا بےکار ہے کہ کیوں؟

ایک دن چارلس کو اپنے مکان کے دروازے پر ایک خط ملا،

جس میں لکھا ہوا تھا "گزرے ہوئے دن واپس نہیں آسکتے۔ گڑے مُردے اُکھیڑنے سے حاصل کچھ نہیں ہوتا۔ وفا اور محبت، دونوں نے مجھے دھوکہ دیا۔ ان دونوں الفاظ کو اس دنیا کے مردوں اور عورتوں کی طرف منسوب کرنا محض حسنِ ظن، صنعت یا اندازِ بیان سے کچھ زیادہ نہیں۔" الفاظ بلاشبہ سخت ہیں، لیکن آفرین ہے اس شخص پر کہ بد دعا یا بد خواہی کا ایک لفظ بھی اس کے قلم سے نہیں نکلا۔ اس کے بعد گاؤں بھر میں مشہور ہو گیا کہ شہزادہ "جنوبیوں کے کیمپ میں داخل ہو گیا، تاکہ "شمالیوں" کے خلاف جنگ میں صف آرا ہو سکے۔"

کہتے ہیں۔ بیکار ہے جنوں کو ہے سر پیٹنے کا شغل۔ عشق کے میدان میں وہ ناکام رہا۔ اور اب زندگی بے لطف معلوم ہو رہی تھی۔ لیکن وہ اپنی بے چین طبیعت کو کیا کرے جو ہر دم کوئی نہ کوئی شغل ڈھونڈھتی تھی؟ میدانِ عشق نہیں تو میدانِ کارزار ہی سہی!

شمالیوں اور جنوبیوں کے درمیان، نیگرو غلاموں کے حقوق کے متعلق جنگ چھڑ چکی تھی۔ یہ بحث کرنا بیکار ہے کہ کون غلطی پر تھا اور کون حق پر۔ کیونکہ جنگ کے انجام نے اس کا فیصلہ کر دیا۔ غرض ورجینیا کے اچھے اچھے نوجوان اس جنگ میں کھپا دیئے گئے۔ میں خود اس جنگ میں شامل تھا اور اس کی ہولناک تباہیوں کو اپنی آنکھوں دیکھ چکا تھا، لیکن اب اس کی یاد سے کیا فائدہ؟ خیر جنگ کے ایک اہم دن کا سماں میری آنکھوں میں پھر رہا ہے، توپ کے آتش فشاں گولوں اور بندوق کی گولیوں کی دنادن، گھوڑے کے ٹاپوں کی آواز، جنگی سامان کی گاڑیوں کے پہیوں کی گڑگڑاہٹ، زخمیوں کی کراہ اور گھوڑوں کی ہنہناہٹ سے کان بہرے ہو رہے تھے۔ بارود کی بدبو اور تاریک دھوئیں سے دم گھٹ رہا تھا، اور اس پر سورج اپنی پوری آب و تاب سے بدن کو جھلس رہا تھا، خون کی ندیاں سی بہ رہی تھیں۔ اور لبِ جان زخمی خون کے کیچڑ میں لت پت ہو رہے تھے۔ لیکن رسالے کا سالار "شہزادہ" ہمیں بڑھائے جا رہا تھا اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ دنیا کی کوئی طاقت اُسے پیچھے ہٹا نہ سکے گی چھ مہینے کی مدت کے بعد میں نے سالار کے چہرے کو بغور دیکھا۔ اب اس پر بہت سی تبدیلیاں آچکی تھیں۔

ورجینیا کے تمام سپاہی فوج کے پیش پیش تھے۔ جب رات ہو چکی تو یہ خبر ملی کہ دشمن نے کسی طرح ان میں سے بیس سپاہیوں کو گرفتار کر لیا، اور یہ فیصلہ کیا ہے کہ سولہ کو قید کر لیا جائے اور چار کو موت کے گھاٹ اُتار دیا جائے۔ اور بیس میں سے ان چاروں بدقسمتوں کا انتخاب بذریعۂ قرعہ اندازی ہو۔ ان بیس قیدیوں میں شہزادہ اور چارلس بھی موجود تھے۔

زندگی میں ایک اور دفعہ دونوں کی قسمت ہم رنگ نظر آرہی تھی۔ دونوں موت یا زندگی میں سے کسی ایک کے منتظر تھے۔ ایک کو اپنی بیوی کا خیال ستا رہا تھا۔ لیکن دوسرے کے متعلق یہ کہنا دشوار ہے کہ اس کا خیال کہاں کہاں چکر لگا رہا تھا۔ رات بھر دونوں نے ایک لفظ بھی زبان سے نہیں نکالا جب دوسرے دن کا آفتاب طلوع ہوا تو دشمن نے بذریعہ قرعہ اندازی اپنا آخر فیصلہ سنایا۔ شہزادے کا نام قیدیوں کی فہرست میں تھا اور چارلس کا نام؟ ——— چند منٹوں میں چارلس کو زندگی سے ہاتھ دھونا تھا!

جب یہ فیصلہ سنایا گیا تو شہزادے کا رنگ فق ہو گیا۔ لیکن بہت جلد اس کے چہرے پر اطمینان اور سکون کے آثار بھی نمایاں ہو گئے۔ وہ مردانہ وار سیدھا جنرل کی طرف بڑھا اور چند الفاظ گوش گزار کرنے کی اجازت چاہی۔ جنرل نے رضامندانہ طور پر سر ہلایا تو شہزادہ گویا ہوا "ایک دُبلا پتلا گندمی رنگ کا لڑکا مرنے والوں کی فہرست میں آگیا ہے۔ آپ کو اس بات سے تو کوئی سروکار نہیں کہ وہ مرے یا اس کے عوض میں آپ کے سپاہیوں کی گولیوں کا نشانہ بنوں۔ جہاں تک میرا تعلق ہے، مجھے زندگی اور موت دونوں کی پروا نہیں۔ لیکن صاحب! وہ بیچارہ شادی شدہ ہے۔ آپ تو یہی چاہتے ہیں کہ ایک ضرور مرے تو پھر اس کے عوض مجھے کیوں نہ چن لیا جائے! ہاں اُسے یہ ضرور خبر کی جائے کہ وہ تبادلہ پر آزاد ہوا ہے ——— بیچارے کو اپنی بیوی کے پاس جانے دیجئے۔"

جنرل نے شہزادے کی درخواست قبول کر لی۔ کیونکہ شہزادہ چارلس کی بہ نسبت کیا بہ لحاظ قد و قامت اور کیا بہ لحاظ شرافتِ نفس بدرجہا بہتر معلوم ہوتا تھا۔ دراصل جنرل شہزادے کی عالی ہمتی سے مرعوب سا ہو گیا تھا۔ اسی دن کا واقعہ ہے کہ شمالیوں نے تین قیدیوں کو کھلے میدان میں گولیوں کا نشانہ بنایا، اور چوتھے کو اپنی ہی فوج کے صف میں کھڑا کر کے گولی سے اُڑا دیا۔ لیکن یہ چوتھا شخص چارلس نہیں تھا۔

چارلس کو اس واقعہ کی اس وقت تک خبر نہیں دی گئی، جب تک کہ چاروں بے جان جسدوں کو زمین پر لٹا نہ دیا گیا۔ لیکن اس کے بعد سپاہیوں نے چارلس کو

بنارس

تقریر جو برجموہن دتاتریہ کیفی نے ۲۳ مئی ۳۸ء کو لاہور کے ریڈیو اسٹیشن سے کی۔ فائدۂ عام کے لئے بہ اجازت صاحب اسٹیشن ڈائرکٹر یہاں شائع کی جاتی ہے

فنون و ثقافت یعنی آرٹ اور کلچر کے قدیم مرکزوں میں بنارس سب سے زیادہ ممتاز ہے، کیونکہ وہ باوجود لمبی قدامت کے ہندوستان کے جغرافیہ میں اب تک موجود ہے۔ پرانی کتابوں میں اس کا نام وارانسی اور کاشی بھی لکھا ہے۔ وارانسی سے ہی بنارس بنا۔

برنا اور اسی دو ندیاں گنگا میں آکر گرتی ہیں۔ انھیں کے دہانوں کے درمیان یہ شہر آباد ہے۔ اور انھیں ندیوں کے نام سے مل کر وارانسی اور بنارس بنا۔ سنسکرت میں کاش کے معنی خاص مٹی بھی ہیں۔ اور چونکہ اس مقام کو شوجی سے خاص نسبت ہے اور وہ سب سے بڑے جوگی مانے جاتے ہیں۔ اس سے کاشی بھی اس کا نام پڑ گیا۔ بنارس کو شوپوری بھی کہا گیا ہے۔ البیرونی کی تحقیق میں کاش نامی ایک قوم یہاں رہتی تھی۔ جس سے کاشی بنا۔ اتھروید اور شت پت برہمن میں کاشی کا ذکر آیا ہے۔ رامائن اور مہابھارت میں بھی بنارس کا ذکر کاشی کے راجاؤں کے دارالخلافہ کی حیثیت سے آیا ہے۔

بھگوت پوران میں لکھا ہے کہ کرشن جی نے دوارکا میں اپنا راج قائم کرکے کاشی پر چڑھائی کی۔ اس وقت یہاں کا راجہ پونڈرک نامی تھا۔ راجا مارا گیا اور کرشن جی خراج اور نذرانہ لے کر چلے گئے۔ پونڈرک کے بیٹے سُدکشا نے باپ کے خون کا بدلا لینے کی کوشش کی مگر ناکام رہا۔ تحقیق سے یہ پایا جاتا ہے کہ بنارس آریوں کے ہندوستان میں آنے اور عروج پانے سے پہلے ہندوستان کی قدیم کلچر کا مرکز تھا، اور کرشن جی کا حملہ آریوں کا پہلا حملہ تھا جو بنارس پر ہوا۔ چونکہ یہ شہر اُجڑ اُجڑ کر فوراً پھر بستا رہا۔ اس وجہ سے آثار قدیمہ کا پتا نہیں۔

گوتم بُدھ کے وقت یہ شہر آرین کلچر اور مذہب کا مرکز پایا جاتا ہے۔ اسی شہر سے چار میل کے فاصلہ پر سارناتھ میں سنہ ۵۹۰ قبل مسیح میں بُدھ نے پہلا وعظ کیا اور پانچ مُرید بنائے۔ جن کو اولیت کا امتیاز حاصل ہے۔ لکھا ہے کہ مہاتما بدھ نے اسی موقع پر جوگیا لباس یعنی چولا پہننا اختیار کیا جو بنارس کے ریشم کا بنا ہوا تھا۔ پاٹلی پُتر کے مہاراجہ اشوک نے جو پتھر کا کٹہرا اس مرگھداو یعنی غزالستان میں بنایا تھا وہ اب برآمد ہوا ہے۔ اشوک کے دو سنگین مینار بھی معہ کتبہ کے بنارس میں موجود ہیں ایک اسی غزالستان یعنی سارناتھ میں ہے اور دوسرا بنارس کے مشہور کوئینز کالج کے احاطے میں۔

پانچویں صدی عیسوی میں چینی سیاح فاہیان بنارس آیا۔ اس کے دو سو برس بعد ہیون سانگ کا یہاں آنا ہوا۔ وہ لکھتا ہے کہ "یہاں بُدھ مت کی تیس خانقاہیں اور تین ہزار بھکشو ہیں۔ جبکہ ہندوؤں کے سو مندر اور دس ہزار پجاری ہیں۔" اس وقت بھی مہیشور یعنی شوجی کی پوجا کا یہاں رواج تھا۔

۱۱۹۴ء میں شہاب الدین غوری کے جنرل قطب الدین ایبک نے بنارس پر حملہ کیا۔ اس حملہ کی کیفیت ابن الاطہر نے تاریخ کامل میں اس طرح لکھی ہے:۔

"بنارس کا راجا ہندوستان کے راجاؤں میں سب سے بڑا تھا۔ اس کا راج اِدھر چین کی سرحد سے مالوہ تک اور اُدھر سمندر سے لے کر لاہور سے دس منزل ورے تک پھیلا ہوا تھا۔ بنارس کے ہندو راجہ کے پاس سات سو ہاتھی تھے اور

دس لاکھ فوج تھی۔ اِس ملک میں مسلمان بھی رہتے تھے جو محمود کے وقت سے آئے ہوئے تھے۔"

راجہ کو اس لڑائی میں شکست ہوئی اور بنارس پر مسلمانوں کا قبضہ ہوگیا۔ بنارس اور علاقۂ کاشی میں حکومتیں بدلتی رہیں۔ لیکن ہندوؤں کا راج بالکل مٹ نہیں گیا بلکہ وہ میدانی علاقوں کو چھوڑ کر شمال کی جانب پہاڑی علاقوں میں منتقل ہوگیا، ابن الطاہر نے جو وسعت بنارس کی قلمرو کی لکھی ہے ممکن ہے وہ درست ہو یا اس میں کچھ مبالغہ ہو۔ بہرحال اِس زمانے کے مورخ یہ لکھتے ہیں کہ مسیح سے قبل چھٹی صدی میں شمالی ہند سولہ سلطنتوں پر منقسم تھا۔ اس فہرست میں نمبر ۱۲ پر کاشی کا نام آتا ہے جس میں وہ علاقہ شامل تھا جو اَب بنارس۔ غازی پور اور مرزا پور کے ضلعے بناتا ہے۔

۱۵۶۵ء میں اکبر پہلی بار بنارس آیا۔ اکبر کے عہد میں بنارس نے بہت ترقی کی۔ اکبر نے یہاں ایک ٹکسال قائم کی۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے زمانے میں جب واران ہیسٹنگز گورنر جنرل تھا بنارس کے راجہ کے معاملوں کا اکثر ذکر آتا رہا۔ بنارس اور بنارس کے راجاؤں پر جو انقلاب گزرے وہ لگاتار اور قسم قسم کے ہیں۔ سری کرشن اور مہاتما بدھ جیسی ممتاز عالم ہستیوں کا بنارس کے سلسلے میں نام آنا اس کی قدامت اور بزرگی کی قطعی سند پیش کرتا ہے۔ مختصر یہ کہ بننے بگڑنے اور پھر بننے کا ایک لمبا سلسلہ ہے جو یہ شہر اور علاقہ مورخ کے سامنے پیش کرتا ہے۔ آخر لارڈ کرزن کے عہد حکومت میں گورنمنٹ نے مدتوں کے بعد مہاراجہ بنارس کو سلطانی اختیارات عطا کئے۔ کہنا چاہیئے واپس کئے، لیکن بنارس کا شہر مہاراجہ کی قلمرو سے خارج رہا۔ اس وقت مہاراجہ کی ریاست کا رقبہ ۸۷۰ مربع میل ہے جس کی آبادی چار لاکھ کے قریب ہے۔

بنارس قدیم زمانہ سے ہندوؤں کا کینٹربری یعنی مذہبی مرکز ہی نہیں رہا۔ بلکہ آج تک ہندوستان کا آکسفورڈ بھی ہے۔ کوئی سنسکرت جاننے والا پورا پنڈت اور شاستری نہیں سمجھا جاتا۔ جب تک اس کی تعلیم کی تکمیل بنارس میں نہ ہوئی ہو۔ بنارس میں آج تک تعلیم کا طریق اور طلبا کا رہنا سہنا قدیم اور قرونِ وسطیٰ کے طرز کا ہے۔ تحصیلِ علم کے لئے ہندوستان کے ہر حصے سے لوگ یہاں آتے ہیں۔ مکتب یعنی پاٹھ شالائیں مختلف درجوں کی ہیں۔ کہیں محض صرف و نحو کی تعلیم ہوتی ہے، کہیں علم بیان و معانی کی۔ کہیں فلسفہ منطق اور علم ہیئت و جوتش کی۔ کہیں دھرم شاستر کہیں ویدوں کی۔ غرضکہ سنسکرت لٹریچر کی کوئی شق ایسی نہیں جس کی تعلیم کا یہاں انتظام نہو۔ اگر شام کو گنگا کے گھاٹوں پر سیر کو جائیں تو دیکھنے میں آئے گا کہ اُستاد اپنے شاگردوں کے حلقہ میں بیٹھا ہے جو فلسفہ یا منطق کے کسی مسئلہ پر سنسکرت زبان میں مباحثہ کر رہے ہیں۔ جے پور کے راجہ مان سنگھ نے جو رصدگاہ اکبر کے زمانہ میں یہاں قائم کی وہ دہلی کے جنتر منتر کے سوا اپنی نظیر نہیں رکھتی۔ اس کا نام مان مندر ہے۔ اس میں علم ہیئت کی رُو سے مختلف سیاروں کی چال وغیرہ دیکھنے کے آلات پختہ طور پر نصب کئے گئے ہیں۔ اور ایک بڑا لکچر ہال ہے۔

بنارس مذہبی تقدس کے علاوہ علم و فن کا مرکز کیونکر بنا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہاں کے راجہ اجات شترو کی جو راجہ جنک کا معصر تھا یہ خواہش ہوئی کہ متھلا کی راجدھانی کی طرح اس کی راجدھانی بھی علم و ہنر کا سرچشمہ بنے۔ لکھا ہے کہ اجات شترو خود عالم اور فلسفی تھا۔ چنانچہ اُس نے علماء اور اہل ہنر کو دور و نزدیک سے بلا کر بنارس میں رکھا۔ جب سے یہ شہر علم و ہنر کا مرکز چلا آتا ہے۔

اب یہ سوال اُٹھتا ہے کہ بدھارتھیوں یعنی طلبا کی یہ بھیڑ جو ہر طرف سے یہاں آتی ہے اس کے رہنے اور کھانے پینے کا کیا انتظام ہے۔ آج کل کے ہوسٹل یا بورڈنگ ہوس تو ان پاٹ شالاؤں سے متعلق ہیں نہیں۔ ہوتا یہ ہے کہ منتہی طلبا تو گوروکل کے قدیم طریقہ پر استادوں کے ہاں رہتے ہیں۔ باقیوں کے لئے مختلف ریاستوں اور امیروں نے چھیتر یا کھلے لنگر کھول رکھے ہیں، جہاں طلبا کو مفت کھانا ملتا ہے۔ مندروں اور دھرم سالاؤں کے باہر کے حصے اُن کی خوابگاہیں ہیں۔ ایسے ادارے بھی ہیں جہاں بہت سے طالبعلم رہتے ہیں۔

بنارس نے سنسکرت علوم کی تعلیم کا مرکز اور ندیا وغیرہ سے اعلیٰ ہونے کے باوجود دوسری زبانوں سے تعصب کا برتاؤ کبھی نہیں کیا۔ کبیر داس یہیں سے اُٹھے جن کا اثر ہندی اور اردو پر سب تسلیم کرتے ہیں۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کے مذہبی اعتقادوں کی اصلاح کی تلقین کے باوجود کبیر کی شاعری نے ورنیکولر کا ایک نیا سکول قائم کیا۔ اور مذہبی رواداری کے ساتھ ادبی اور لسانیاتی رواداری کا سبق بھی سکھایا۔ گسائیں تلسی داس نے یہیں بنارس کے ایک گھاٹ پر بیٹھ کر رامائن تصنیف کی جس کا رسوخ اور رواج ہندوستان میں عالمگیر ہے۔ گریفتھ نے یہیں والمیکی رامائن کا ترجمہ انگریزی میں کیا اور

ڈاکٹر فالن کی اردو کی دونوں ڈکشنریوں کو بھی چھپنے اور شائع ہونے کی جگہ بنارس ہی میں ملی۔

بنارس کی یہ ادبی رواداری آج کی نہیں۔ تاریخ بتاتی ہے کہ سنہ ۱۶۵۰ء کے قریب بنارس میں ایک برہمن سرستی نام تھا، وہ سنسکرت کا بڑا عالم تھا۔ شاہجہاں نے اس سے کہا کہ عام لوگوں کی زبان کی طرف بھی توجہ کیا کرو۔ چنانچہ اس نے "کبتا کلپا لتا" ایک کتاب ہندی میں لکھی۔ تلسی داس نے رامائن سے پہلے اپنی پہلی کتاب کوئی مالا جو ہندی کے پچھتر شاعروں کا تذکرہ ہے یہیں مرتب کی۔ اس کی تالیف کا سال سنہ ۱۶۵۵ء ہے۔ سنہ ۱۶۵۰ء میں ایک اور ہندی کے شاعر وید انگ رائے نے پارسی پرکاش ایک کتاب لکھی جس میں ہندو مسلمانوں کے سنوں اور مہینوں وغیرہ کے بالمقابل نقشے اور پیمانے درج تھے۔ یہ تصنیف شاہجہاں کے عہد میں ہوئی۔ ناگری پرچارنی سبھا کا مستقر بھی بنارس ہی بنا۔

اردو لٹریچر کی تاریخ میں بھی بنارس ممتاز جگہ رکھتا ہے۔ غدر کے بعد یہاں سے ایک ایسا شخص اٹھا جس نے پرانے سنگیت اور جاترا کی کایا پلٹ دی۔ یہ شخص منشی ونایک پرشاد طالب بنارسی تھا۔ اردو میں اس وقت تک ڈراما کے نام صرف مداری لال اور امانت کی اندر سبھا ہی تھی۔ طالب کی کوششوں سے اردو کو وہ تھیئٹر عطا ہوا جو ہندوستان کی ہر زبان اور صوبہ کے لئے نمونہ ثابت ہوا۔ طالب کی شہرت اس کو بمبئی کھینچ لے گئی اور وکٹوریہ ناٹک کمپنی نے اُن کو ہاتھوں ہاتھ لے لیا۔ منشی طالب ناٹک میں ایجاد اور اختراع کے علاوہ اردو کے شاعر بھی اعلیٰ درجہ کے تھے۔ جو کام طالب نے شروع کیا تھا اُسے آغا حشر نے کمال کو پہنچایا۔ حشر اگرچہ کشمیری الاصل اور امرتسر میں پیدا ہوئے تھے۔ لیکن اُن کی پرورش اور تعلیم و تربیت بنارس ہی میں ہوئی اور وہیں اُن کو ڈرامے لکھنے کا شوق ہوا۔ آج کل سینما کی چادر نے تھیئٹر کے سٹیج کی جگہ چھین لی ہے۔ سینما اور سنیریو کتنی ہی ترقی کیوں نہ کر جائے۔ طالب بنارسی اور حشر کے احسان سے سبکدوش نہیں ہوسکتا۔

مذہب، ادب اور کلچر کا مرکز ہونے کے باوجود بنارس آرٹ کا بھی مرکز رہا ہے۔ آگے ذکر آیا ہے کہ مہاتما بدھ نے سارناتھ کے عزلستان میں جو فقیری چولا پہلے پہل پہنا وہ بنارس ہی کے ریشمی کپڑے کا تھا۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ ریشم کی صنعت بنارس میں قدیم زمانے سے رائج تھی۔ زمانہ بدلتا رہا۔ حکومتیں الٹ پلٹ ہوتی رہیں۔ لڑائیاں ہوئیں۔ لُوٹ مار ہوئی۔ غرضکہ ہر قسم کے انقلاب آتے رہے لیکن بنارس نے اپنی قدیم کلچر اور آرٹ سے بیزاری کا ثبوت کبھی نہیں دیا۔

بنارس کے کمخواب، زربفت اور ریشمی کپڑے قدیم زمانے سے مشہور ہیں۔ ریشم اور سُوت کے باریک سے باریک کپڑے یہاں کی دستکاری اور صنعت کی وہ چیزیں ہیں جن کی شہرت دُور دور تک پہنچی۔ یہ کپڑے یہاں سے اسیریا اور مصر کو جاتے تھے اور وہاں سے فنیشیا کے تاجروں کے ذریعے یورپ میں پہنچتے تھے۔ سُوت اور ریشم کے ساتھ زری یعنی چاندی اور سونے کے تار کی بُناوٹ ابتدائی زمانے سے بنارس کی مشہور دستکاری رہی ہے۔ کمخواب، تاس اور بادلہ کے ساتھ سادہ ریشمی اور سُوتی کپڑے بھی یہاں کی مشہور ساخت ہے۔

زیادہ حیرت کی بات یہ ہے کہ یہ سب نفیس اور دُنیا بھر میں مشہور کپڑے صرف ہاتھوں اور ہاتھ کے اوزار سے بنائے جاتے ہیں۔ آج کل کی مشینوں اور ملوں سے نام کو بھی مدد نہیں لی جاتی۔ حقیقت یہ ہے کہ چند چھاپہ خانوں کے سوا بنارس میں کوئی کام مشین سے ہوتا ہی نہیں۔ یہ ریشم کے کارخانے سب شہر میں ہیں۔ بیسویں صدی کے پہلے دس سال کی مردم شماری میں ۲۸ ہزار سے زیادہ جولاہے بنارس میں تھے۔ شہر کے باہر دیہات امانت میں جو بُننے کا کام ہوتا ہے وہ نفیس اور باریک نہیں ہوتا۔ تن زیب جو نہایت باریک ململ ہے شہر ہی میں بُنی جاتی ہے۔ ریشم کے کارخانوں میں ایک نقشہ کش یعنی مختلف وضع کے ڈیزائن بنانے والا ہوتا ہے۔ ریشم بنگال، وسط ایشیا اور چین سے آتا ہے۔ اس آخری قسم کے ریشم کو سنگل کہتے ہیں۔ جو سمرقند اور بخارا سے آتا ہے، اور ٹسر اور زردوزی اور مکین کے کام میں استعمال ہوتا ہے۔ قصہ مختصر ہندوستان میں کس کھاتے پیتے آدمی کا گھر ہوگا جہاں بنارس کی ساخت کی چیزیں نہ ہوں۔

بُننے کے آرٹ کے سوا دھاتوں کی دستکاری بھی اعلیٰ پیمانہ پر ہوتی ہے۔ سیکڑوں سنار سونے اور چاندی کے زیور بنانے میں رات دن مصروف رہتے ہیں۔ پیتل، تانبے اور بھرت کے برتن اور پلیٹیں بھی نہایت عمدہ بنتی ہیں۔ سنگتراشوں کا ایک گروہ مورتیاں بنانے میں ہمیشہ مصروف رہتا ہے۔

سفید مال ـــــ ایک روسی افسانے کا ترجمہ

سلیم احمد

(۱)

ایسٹر قریب آرہا تھا۔ سیکساتالو پر پریشانی اور درماندگی کا عالم طاری تھا اور یہ پریشانی اور درماندگی اُس وقت سے شروع ہوئی جب گورڈشود کے یہاں اس سے یہ دریافت کیا گیا کہ آپ یہ تہوار کہاں منائیے گا۔

سیکساتالو نے بعض وجوہ کی بنا پر جواب میں تاخیر سے کام لیا، لیکن میزبان نے جو ایک توانا اور کوتاہ نظر عورت تھی اُسے اپنے یہاں فوراً مدعو کر لیا۔

سیکساتالو برہم سا ہوگیا۔ اس برہمی کا باعث وہ لڑکی تو نہ تھی جو ایک نوجوان اسسٹنٹ پروفیسر سے باتیں کر رہی تھی!۔ اپنی ماں کے الفاظ کے ساتھ اُس نے سیکساتالو پر تیزی سے ایک نظر ڈالی اور فوراً ہی پھر باتوں میں مشغول ہوگئی۔

سیکساتالو پر اکثر نوجوان لڑکیوں کی ماؤں کی نظرِ انتخاب پڑا کرتی تھی، اور یہ بات سیکساتالو کو مشتعل کر دیتی تھی۔ وہ اپنے آپ کو ایک پرانا مردِ مجرد تصور کرتا تھا۔ حالانکہ وہ صرف سینتیس ۳۷ سال کا تھا۔ اُس نے کھُرّے پن سے مختصر سا جواب دیا" شکریہ۔ میں یہ رات ہمیشہ اپنے مکان ہی پر بسر کرتا ہوں "

لڑکی نے اُس کی طرف نظر اُٹھائی، مسکرائی، اور پوچھا" کس کے ساتھ"

"تنہا" سیکساتالو نے حیرت سے جواب دیا۔

"اچھے تارک الدنیا ہیں!" میڈیم گورڈشود نے ایک تلخ تبسم کے ساتھ کہا۔

سیکساتالو آزاد رہنا پسند کرتا تھا۔ وہ اکثر اس بات پر تعجب کرتا تھا کہ کیونکر وہ ایک زمانے میں شادی پر آمادہ ہوگیا تھا، وہ اب مانوس ہوگیا تھا۔ اپنے چھوٹے سے آراستہ مکان سے، اپنے متین بڑھے نوکر فیڈٹ سے، اور اُس کی عمر رسیدہ بیوی کرتینی سے جو اُس کا کھانا پکاتی تھی، اور یہ امر کہ اُس نے شادی سے احتراز کیا اُس کے لئے اطمینان بخش تھا۔ کیونکہ وہ اپنی "پہلی محبت" سے رشتۂ وفا توڑنا نہیں چاہتا تھا۔ حقیقت یہ تھی کہ اُس کے دل کو اس کی تنہائیوں اور بے مقصد زندگی نے سرد کر دیا تھا۔ اپنی معاش کے سلسلے میں وہ کسی کا دست نگر نہ تھا۔ ماں باپ عرصہ ہوا انتقال کر چکے تھے۔ قریبی رشتہ داروں میں بھی کوئی نہ تھا۔ وہ ایک مطمئن اور پُرسکون زندگی بسر کرتا تھا۔ کسی محکمے میں نوکری کر لی تھی، موجودہ ادب اور آرٹ میں بھی اچھی نظر تھی۔ زندگی کے محاسن اُس کے لئے باعث مسرت تھے۔ لیکن زندگی خود اُس کے لئے بے معنی اور خالی نظر آتی تھی۔ اگر کبھی کبھی ایک پاکیزہ اور روشن خیال اُسے نہ دکھائی پڑتا تو اوروں کی طرح اُس کا دل بھی قطعی سرد ہو جاتا۔

(۲)

وہ کبھی کبھی شام کو اپنی پہلی اور آخری محبت کے غمناک مگر شیریں خواب دیکھتا ـــــــ وہ محبت جو بے پھُولے پھلے خزاں کی نظر ہوگئی۔ پانچ سال قبل ایک ایسی لڑکی سے اُس کی ملاقات ہوئی جس کا نقش اُس کے دل پر غیر فانی ہو کر رہ گیا۔ زرد۔ نازک، پتلی سی کمر، نیلی نیلی آنکھیں۔ پیارے

پیارے بال۔ وہ اُسے قریب قریب ایک آسمانی مخلوق سمجھتا تھا —— ہوا اور کہر کا ایک مجسمہ جسے قضا وقدر نے ایک ساعت کے لئے دنیا کی شورشوں میں بھیج دیا ہو۔ اُس کے سنجیدہ حرکات، اس کی صاف نازک آواز —— ایسی نرم۔ جیسے چشمے کی ہلکی صدا جو پتھروں پر آہستہ آہستہ رواں ہو۔

اِسے اتفاق سمجھئے یا فریب نظر سیکسالو نے جب اُسے دیکھا سفید ہی لباس میں دیکھا، سفید ہی اُس کے تصور کا ایک جزو ہو گئی تھی۔ یہاں تک کہ ٹیلاسا جو اُس کا نام تھا وہ بھی اُسے ہمیشہ سفید ہی نظر آتا —— برف کی طرح جو پہاڑیوں کی چوٹیوں پر جم جاتی ہے۔ اُس نے ٹیلاسا کے والدین سے ربط ضبط بڑھانا شروع کیا۔ کئی بار اُس نے ارادہ کیا کہ وہ الفاظ ٹیلارا کے کانوں تک پہنچا دے جو دو ہستیوں کی قسمتیں ایک دوسرے سے وابستہ کر دیتے ہیں۔ لیکن ٹیلارا ہمیشہ بچتی رہی۔ خوف اور ایک روحانی کرب اُس کی آنکھوں میں جھلکنے لگتا۔ وہ کس بات سے خوف زدہ تھی؟ سیکسالو کو اُس کے چہرے پر محبت کے وہ آثار نظر آتے تھے جو صرف لڑکیوں ہی کے لئے مخصوص ہیں۔ سیکسالو کے آتے ہی اُس کی آنکھیں چمکنے لگتیں اور ایک ہلکی سی سرخی اُس کے گالوں پر دوڑتی۔

ایک شام کا ذکر ہے —— ایسی شام جس کا بھولنا ناممکن ہے، ٹیلارا نے اُس کے الفاظ سُنے۔ موسم بہار کا آغاز تھا۔ دریاؤں میں برف کو پگھلے ہوئے کچھ زیادہ عرصہ نہیں ہوا تھا۔ اور درخت اپنی ملائم ہری عبائیں پہنے ہوئے تھے۔ ٹیلارا اور سیکسالو کھڑکی کے قریب بیٹھے ہوئے تھے۔ سامنے دریائے نیوا بہ رہا تھا۔ بغیر سوچے سمجھے کہ اُسے کیا کہنا ہے اور کس طرح کہنا چاہئے، اُس کی زبان سے میٹھے میٹھے الفاظ نکلنا شروع ہوئے۔ ٹیلارا کا چہرہ خوف سے زرد پڑ گیا۔ بے توجہی سے وہ مسکرائی، اور جانے کے لئے کھڑی ہو گئی۔ اس کا نازک ہاتھ کرسی کی پشت پر کانپ رہا تھا۔ "کل" ٹیلارا نے نرمی سے کہا اور چلی گئی۔

سیکسالو دیر تک اشتیاق بھری نظروں سے دروازے کی طرف دیکھتا رہا جس نے ٹیلارا کو اُس کی نظروں سے چھپا دیا تھا، اُس کا سر چکرا رہا تھا۔ یکایک سفید پھولوں کی ایک شاخ نے اُس کی نگاہوں کو اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ اُسے اُٹھا کر میزبانوں سے رخصت ہوئے بغیر وہ باہر چلا گیا۔

رات کو وہ نہ سو سکا۔ سفید پھولوں کی شاخ سے کھیلتے اور مسکراتے ہوئے کھڑکی سے اندھیری سڑک کو دیکھتا رہا جس کی تاریکی صبح کی آمد کے ساتھ ہلکی ہوتی جا رہی تھی۔ جب سحر اپنی روشنی لے کر آئی تو اُس نے دیکھا کہ سفید پھولوں کی پنکھڑیاں فرش پر بکھری ہوئی ہیں۔ اور یہ منظر اُسے کچھ مضحکہ خیز سا نظر آیا۔ غسل کرنے کے بعد ایک حد تک اُس کے جذبات میں سکون پیدا ہو گیا۔ پھر وہ ٹیلارا کی گھر کی طرف چل دیا۔

وہاں اُسے معلوم ہوا کہ ٹیلارا بیمار ہے۔ اُسے سردی لگ گئی تھی۔ سیکسالو اُسے پھر کبھی نہ دیکھ سکا۔ دو ہفتے کے اندر اندر وہ مر گئی۔ وہ اُس کے جنازے میں بھی نہ گیا۔ اُس کی موت کا اُس پر کچھ اثر نہ تھا۔ وہ اب یہ نہیں بتا سکتا تھا کہ آیا وہ اُس سے محبت کرتا تھا یا یہ صرف ایک وقتی لگاؤ تھا۔

بعض اوقات شام کو وہ اُس کے خواب دیکھتا۔ پھر اُس کا تصور دھندلا ہونے لگتا۔ سیکسالو کے پاس ٹیلارا کی کوئی تصویر نہ تھی۔ گذشتہ موسم بہار میں سفید پھولوں کی ایک شاخ ایک ریسٹورنٹ میں امیرانہ کھانوں کو دیکھتے ہوئے ایک کھڑکی میں بے موقع سی پڑی ہوئی تھی۔ برسوں کے بعد ٹیمارا کی یاد اُس کے دل میں پھر تازہ ہو گئی۔ اور اُس دن سے پھر وہ شام کے وقت ٹیمارا کے دھیان میں غرق رہنے لگا۔ بعض اوقات وہ اونگھنے لگتا۔ اور پھر اُسے ایسا نظر آتا جیسے ٹیمارا اُس کے سامنے بیٹھی ہوئی اُسے محبت بھری نظروں سے پیہم دیکھ رہی ہے، اور کچھ طلب کر رہی ہے۔ اور ان محبت بھری طلبگار نظروں سے اکثر اُس کے دل پر چوٹ سی پڑتی، اور وہ پریشان ہو جاتا۔

گوروڈشو کے یہاں سے جب وہ رخصت ہوا تو اُس نے دل میں ڈرتے ڈرتے سوچا کہ وہ ضرور اُسے ایسٹر کی مبارکباد دینے آئے گی۔ خوف اور تنہائیاں تکلیف دہ تھیں۔ وہ سوچنے لگا کہ آخر میں کیوں نہ شادی کر لوں۔ ایسی مبارک راتیں مجھے تنہا نہیں بسر کرنی چاہئیں۔

گوروڈشو کی لڑکی ولیریا اُس کے خیال میں آئی۔ وہ حسین تو نہ تھی۔ لیکن خوش پوش ضرور تھی۔ سیکسالو کو ایسا نظر آیا کہ وہ اُسے پسند بھی کرتی ہے۔ اور اگر وہ اُس سے شادی کی اِستدعا کرے تو وہ اِنکار بھی نہیں کرے گی۔

سڑک پر شور و غل اور بھیڑ بھاڑ نے اس کے خیالات منتشر کر دئے۔ ویرؔیا کا خیال اُس کے لئے ناقابل برداشت ہو گیا۔ مزید برآں کیا وہ ٹیمارؔا کی یاد سے بیوفائی کر سکتا تھا، خواہ کسی کی خاطر کیوں نہ ہو۔ تمام دنیا اُسے اِس قدر حقیر او معمولی نظر آنے لگی کہ وہ پھر ٹیمارا کی تمنا کرنے لگا —— صرف ٹیمارا —— آیئے اور اُس کو ایسٹر کی مبارکباد دیں دے۔

لیکن اُس نے خیال کیا کہ وہ پھر مجھ پر اپنی طلبگار نظریں جما دے گی۔ معصوم، بھولی ٹیمارا، خدا جانے مجھ سے کیا چاہتی ہے؟ کیا اُس کے نرم ہونٹ میرے ہونٹوں سے ملیں گے!۔

(۳)

ٹیمارا کا خیال ستا رہا تھا۔ سیکسالو راہگیروں کو تکتا سڑکوں پر آوارہ پھرا کیا۔ مردوں اور عورتوں کی بدنما صورتیں اُسے متنفر کر رہی تھیں۔ اُسنے خیال کیا کہ کوئی بھی ایسا نہیں جس سے وہ محبت اور مسرت کے ساتھ ایسٹر کی مبارکباد کا تبادلہ کر سکے۔ پہلے دن تو بوسوں کی بھرمار ہو گی —— کھُردرے ہونٹ۔ اُلجھی ہوئی ڈاڑھیاں۔ شراب کی مہک۔

اگر کوئی کسی کو پیار ہی کرنا چاہتا ہے تو وہ ایک بچہ کو پیار کرے۔ بچوں کی صورتیں سیکسالو کو بھلی معلوم ہونے لگیں۔

وہ بہت دیر تک گھومتا رہا۔ آخر کار سڑکوں کے شور و غل سے دور وہ ایک گرجے کے صحن میں پہنچا۔ ایک زرد لڑکے نے جو وہاں بیٹھا ہوا تھا سیکسالو کو خوفزدہ نظروں سے دیکھا۔ پھر وہ بے حس و حرکت ہو کر بیٹھ گیا اور سامنے دیکھنے لگا۔ اُس کی نیلی نیلی آنکھیں ٹیمارا کی طرح نرم اور غمگین تھیں۔ وہ اتنا چھوٹا تھا کہ اُس کی ٹانگیں لٹکنے کے بجائے بنچ کے آگے کچھ نکلی ہوئی تھیں۔ سیکسالو اُس کے پاس جا کر بیٹھ گیا۔ اور اُس کو اشتیاق اور ہمدردی کی لبریز نگاہوں سے دیکھنے لگا۔ اِس ننھے سے لڑکے میں کچھ ایسی بات تھی کہ سیکسالو کے ذہن میں پرانی باتیں پھر تازہ ہونے لگیں۔ بظاہر وہ ایک معمولی سا بچہ تھا۔ پھٹے پرانے کپڑوں میں، ایک چھوٹی سی خزکی ٹوپی تھی اُس کے چھوٹے سے نازک سر پر، اور میلے پھٹے ہوئے جوتے اُس کے ننھے پیروں میں۔

بہت دیر تک وہ بنچ پر بیٹھا رہا۔ پھر وہ اُٹھ کھڑا ہوا اور رونے لگا۔ پھر وہ پھاٹک کی طرف بھاگا۔ اور سڑک پر دوڑنے لگا۔ یکایک وہ ٹھیرا اور پلٹ کر پھر پھاٹک کی طرف بھاگنے لگا۔ پھر وہ ٹھیر گیا۔ ظاہر ہے کہ اُسے علم نہ تھا کہ کونسی راہ اختیار کرے۔ وہ دھیرے دھیرے رونے لگا۔ بڑے بڑے آنسو اُس کے گالوں سے ڈھلک کر نیچے گرنے لگے۔ لوگ جمع ہو گئے ایک سپاہی نے لڑکے سے دریافت کیا "تم کہاں رہتے ہو" "گلیکمو ہاؤس" لڑکے نے بہت ہی چھوٹے بچوں کے انداز میں جواب دیا۔

"کس سڑک پر؟" سپاہی نے پوچھا۔ لیکن لڑکا سڑک کا نام نہ جانتا تھا اور صرف یہی کہہ سکا "گلیکمو ہاؤس"۔

سپاہی جو ایک نوجوان اور خوش مزاج آدمی تھا، تھوڑی دیر تک غور کرتا رہا۔ پھر فیصلہ کن انداز میں بولا کہ قرب و جوار میں تو کوئی مکان اس نام کا ہے نہیں۔ "تم اُس کے ساتھ رہتے ہو؟" ایک افسردہ سے مزدور نے پوچھا: "کیا تمہارا باپ زندہ ہے؟" "نہیں" لڑکے نے اشک آلود آنکھوں سے مجمع کو دیکھتے ہوئے جواب دیا۔

مزدور اپنا سر ہلاتے ہوئے سنجیدگی سے بولا "اور ماں"

"ہاں، ماں تو ہے" لڑکے نے جواب دیا۔

"اس کا کیا نام ہے؟"

"ماں" لڑکے نے جواب دیا۔ پھر ایک لمحہ سوچنے کے بعد اُس نے کہا "کالی ماں"

"کالی!! کیا یہی اُس کا نام ہے؟" مزدور نے دریافت کیا

"پہلے میری ایک سفید ماں تھی اور اب کالی ماں ہے" لڑکے نے تشریح کرتے ہوئے کہا

"تمہاری باتوں سے تو کچھ پتہ نہیں چلتا" سپاہی نے کہا "میرا تو خیال ہے کہ میں تمہیں پولیس اسٹیشن لے چلوں۔ پھر ٹیلیفون کے ذریعے سے تمہارے گھر کا پتہ چل جائے گا"

سپاہی نے ایک دروازے پر پہنچ کر گھنٹی بجائی۔ ایک آدمی جھاڑو ہاتھ میں لئے ہوئے باہر آیا۔ سپاہی نے اُس نے کہا کہ لڑکے کو پولیس اسٹیشن لے جائے۔ لیکن لڑکے نے پہلے ہی کچھ سوچ لیا تھا، وہ چلایا: "مجھے جانے دو میں خود راستہ ڈھونڈ لوں گا"

کیا وہ اُس آدمی کی جھاڑو سے ڈر گیا تھا، یا اُسے کچھ واقعہ یاد آ گیا تھا؟ بہرصورت وہ اتنی تیزی سے بھاگا کہ سیکسالو کی نظروں سے

قریب قریب چھپ گیا۔ لیکن جلد ہی لڑکے کے قدم سست پڑنے لگے۔ اپنا مکان ڈھونڈنے کی ناکام کوشش میں وہ سڑک کے ایک کنارے سے دوسرے کنارے تک بھاگتا رہا۔ سیکسالو خاموشی سے اُس کے پیچھے چل رہا تھا، وہ نہیں جانتا تھا کہ بچوں سے کس طرح باتیں کی جاتی ہیں۔

آخر کار لڑکا تھک گیا، اور ایک لیمپ پوسٹ کا سہارا لے کر کھڑا ہو گیا آنسو اُس کی آنکھوں میں چمک رہے تھے۔

"کیوں میرے بچے! کیا تمہیں مکان نہیں ملا؟" سیکسالو نے پوچھا۔

لڑکے نے اپنی نرم افسردہ آنکھیں اُس کی طرف اُٹھائیں، اور یکایک سیکسالو کو اُس کا سبب معلوم ہو گیا۔ کہ وہ کیوں لڑکے کا تعاقب کر رہا ہے، اس ننھے آوارہ لڑکے کی نگاہ اور انداز میں بہت کچھ تیارا کی جھلک تھی،

"تمہارا کیا نام ہے؟" سیکسالو نے نرمی سے پوچھا۔

"لیشا" لڑکے نے جواب دیا۔

"لیشا! کیا تم اپنی ماں کے ساتھ رہتے ہو؟"

"ہاں۔ لیکن وہ کالی ماں، میری سفید ماں بھی تھی۔"

سیکسالو نے خیال کیا کہ وہ شاید کسی "نن" کو کالی ماں کہتا ہے۔

"تم راستہ کیسے بھول گئے؟"

"میں اپنی ماں کے ساتھ جا رہا تھا۔ ہم بہت دور تک چلے گئے۔ پھر میری ماں نے مجھے ایک جگہ بٹھا دیا اور کہا کہ میرا انتظار کرو۔ پھر وہ چلی گئی، مجھے ڈر لگنے لگا۔"

"تمہاری ماں کون ہے؟"

"وہ کالی ہے اور بہت غصہ ہوتی ہے۔"

"وہ کیا کرتی ہے؟"

لڑکے نے کچھ دیر غور کیا ——

"وہ کافی پیتی ہے۔" اُس نے کہا۔

"اس کے علاوہ وہ کیا کرتی ہے؟"

"لوگوں سے لڑا کرتی ہے۔" لیشا نے ذرا سے توقف کے بعد جواب دیا۔

"اور تمہاری سفید ماں کہاں ہے؟"

"اُسے لوگ اُٹھا کر لے گئے۔ اُس کو لکڑی کے بکس میں بند کر دیا گیا۔ پھر اُسے لوگ لے گئے اور میرے باپ کو بھی سب لے گئے۔"

لڑکے نے دور ایک طرف اشارہ کیا اور زار و قطار رونے لگا۔ سیکسالو سوچنے لگا کہ اِس کے لئے کیا کیا جائے۔

یکایک لڑکا پھر دوڑنے لگا۔ دو چار سڑکیں پار کرنے کے بعد اُس کی رفتار دھیمی ہو گئی۔ سیکسالو کو وہ ایک دفعہ پھر نظر آیا۔ خوف اور خوشی کے ملے جلے اثرات اُس کے چہرہ پر نمایاں تھے۔

"یہ ہے گلیکھو ہاؤس" لیشا نے ایک بدنما سی پنج منزلہ عمارت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے سیکسالو سے کہا۔

اُسی وقت گلیکھو ہاؤس کے دروازے سے ایک عورت نکلی۔ کالے کالے بال، کالی کالی آنکھیں، کالے کالے کپڑے اور سر پر ایک کالا لاڈل جس پر سفید بُندکیاں سی تھیں۔ لڑکا ڈر کے مارے پیچھے ہٹ گیا۔

"ماں" اُس نے دھیرے سے کہا۔

اُس کی سوتیلی ماں نے اُس کو حیرت سے دیکھا۔

"بدمعاش! تو یہاں کیسے آیا؟ میں نے تو وہاں تجھے انتظار کرنے کو کہا تھا۔" اُس نے قطعی لڑکے کی مرمت کر دی ہوتی۔ لیکن یہ دیکھ کر کہ ایک شریف اور سنجیدہ آدمی اُنھیں دیکھ رہا ہے۔ اُس نے آہستہ آہستہ کہنا شروع کیا۔

"کیا تو کہیں آدھ گھنٹے بھی چین سے نہیں بیٹھ سکتا۔ میں تجھے ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر تھک گئی۔ بدمعاش کہیں کا۔"

اُس نے تیزی سے لڑکے کا ننھا سا ہاتھ اپنے بڑے ہاتھ سے پکڑ لیا۔ اور کھینچتی ہوئی دروازے کے اندر چلی گئی۔

سیکسالو نے اُس سڑک کا نام لکھ لیا اور گھر کی جانب چل دیا۔

(۴)

سیکسالو اپنے لز کرفیڈٹ کی فیصلہ کُن رائے بہت پسند کرتا تھا۔ جب وہ گھر پہنچا تو سارا واقعہ فیڈٹ کو کہہ سنایا۔

"اُس نے خاص مقصد سے لڑکے کو وہاں چھوڑ دیا تھا۔" فیڈٹ نے اپنا فیصلہ سُنایا۔ "کیا ہی بدمعاش عورت ہے کہ لڑکے کو گھر سے اتنی دور لے گئی۔"

"آخر اُس نے یہ کیا کیوں؟" سیکسالو نے پوچھا۔

"یہ تو نہایت آسان ہے۔ اُس کمینی عورت نے یہ سوچا ہو گا کہ لڑکا سڑک پر آوارہ پھرتا رہے گا۔ یہاں تک کہ کوئی نہ کوئی ترس کھا کر اپنے یہاں

لے جائے گا۔ ایک سوتیلی ماں سے اور کیا توقع کی جا سکتی ہے۔ اُس لڑکے سے اُس کو فائدہ ہی کیا ہے؟"

"لیکن پولیس تو پتہ لگا ہی لیتی" سیکسا لو نے کہا

"لیکن اگر وہ شہر ہی چھوڑ دیتی تو پھر پولیس کس طرح پتہ چلاتی۔"

سیکسا لو مسکرایا۔ فیڈٹ کو تو کہیں کا منصف ہونا چاہئیے تھا اُس نے خیال کیا۔

وہ ایک کتاب لے کر لیمپ کے قریب بیٹھ گیا اور اونگھنے لگا۔ نیند کی حالت میں دیکھا کہ ٹیارا اُس کے پاس آکر بیٹھ گئی ہے۔ اُس میں اور لیشا میں کتنی حیرتناک مشابہت تھی۔ وہ اُس کو برابر اِس انداز سے دیکھ رہی تھی جیسے کچھ طلب کر رہی ہو۔ سیکسا لو کے لئے یہ بے حد تکلیف دہ چیز تھی کہ اُس کی روشن اور ملتجی آنکھوں کو دیکھے اور پھر نہ سمجھ سکے کہ آخر وہ چاہتی کیا ہے۔

وہ جلدی سے اُٹھ بیٹھا اور اُس کرسی کے قریب پہنچ کر جہاں ٹیارا بیٹھی ہوئی نظر آئی تھی اُس نے التجا آمیز انداز میں زور سے کہا "تم کیا چاہتی ہو — بولو۔"

لیکن وہ اب وہاں نہ تھی۔ یہ صرف خواب تھا، سیکسا لو نے رنجیدہ ہو کر خیال کیا۔

(۵)

دوسرے دن اکاڈمی کی نمائش سے باہر آتے ہوئے سیکسا لو کی مڈبھیڑ گورڈو شو سے ہو گئی۔ ویریا سے اُس نے لیشا کا واقعہ بتایا۔

"بیچارے لڑکے سے اُس کی سوتیلی ماں چھٹکارا پانا چاہتی ہے۔" ویریا نے ہمدردانہ لہجہ میں کہا۔

"یہ قطعی غلط ہے" سیکسا لو نے جواب دیا۔ اُسے اِس بات پر غصہ آرہا تھا کہ ویریا اور فیڈٹ ایک معمولی سے واقعہ پر حزن و ملال کا رنگ کیوں چڑھاتے ہیں۔

"یہ تو بالکل صاف بات ہے۔ لڑکے کا باپ مر چکا ہے اور وہ اپنی سوتیلی ماں کے ساتھ رہتا ہے۔ وہ اُس سے عاجز آچکی ہے اور اگر وہ کسی مناسب طور پر اُس سے نجات حاصل نہ کر سکی۔ تو وہ اُسے کسی دن ضرور نکال دے گی۔"

"تم انتہائی حزنیہ نقطۂ نظر سے دیکھتی ہو" سیکسا لو نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"تم اُسے کیوں نہیں گود لے لیتے۔" ویریا نے مشورہ دیا۔

"میں" سیکسا لو نے حیرت سے پوچھا۔

"تم اکیلے رہتے ہو" اُس نے زور دیتے ہوئے کہا: "تمہارا کوئی عزیز بھی نہیں۔ ایسٹر کے موقع پر ایک ہی ثواب کا کام کرو۔ کم از کم تم ایک دوسرے کو ایسٹر کی مبارکباد تو دے سکو گے۔"

"لیکن میں ایک بچے کی کس طرح پرورش کر سکوں گا۔"

"ایک نرس رکھ لو۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ فطرت نے یہ بچہ تمہارے ہی پاس بھیجا ہے۔"

سیکسا لو نے اُس کے شگفتہ اور پرجوش چہرے کو حیرت سے دیکھا۔

جب ٹیارا شام کو پھر خواب میں نظر آئی تو اُس کو ایسا محسوس ہوا جیسے اُسے معلوم تھا کہ وہ کیا چاہتی ہے، اور کمرے کی خاموش فضا میں یہ الفاظ اُسے مترنم نظر آئے "جو ویریا کہتی ہے وہی کرو۔"

سیکسا لو خوشی سے اُچھل پڑا اور اپنی خواب آلود آنکھیں ملنے لگا۔ میز پر سفید پھولوں کی ایک شاخ نظر آئی۔ یہ کہاں سے آئی؟ کیا ٹیارا اپنی وصیت کی یادگار چھوڑ گئی تھی۔

اور یکایک اُس کے دل میں خیال پیدا ہوا کہ ویریا سے شادی کر کے اور لیشا کو گود لے کر وہ ٹیارا کی خواہش پوری کر سکتا ہے۔ بڑی مسرت سے وہ اُن پھولوں کو سونگھنے لگا۔

تھوڑی دیر کے بعد اُسے یاد آیا کہ وہ پھول خود اُس نے اُسی روز خریدے تھے۔ لیکن پھر اُس نے سوچا کہ اِس سے کوئی فرق نہیں ہوتا، کہ پھول میں نے خریدے ہیں۔ بہرصورت شگون اچھا ہے۔ ورنہ میں انہیں خرید کر کیوں بھول جاتا۔

(۶)

صبح ہوتے ہی وہ لیشا کی تلاش میں روانہ ہو گیا۔ لڑکا اُسے پھاٹک ہی پر مل گیا۔ سیکسا لو کو اُس کی زبانی معلوم ہوا کہ اُس کی ماں کا فی پی رہی ہے۔ اور ایک لال ناک والے آدمی سے لڑائی میں بھی مصروف ہے۔

لیشا کی ماں کا انتقال اُس وقت ہوا جب وہ تین سال کا تھا۔ اُس کے باپ نے پھر اِس کالی عورت سے شادی کر لی، لیکن ایک سال کے اندر اندر وہ بھی چل بسا۔ اس کالی عورت کی گود میں ایک

سال بھر کا بچہ بھی تھا۔ اُس کی دوسری شادی بھی کچھ دنوں میں ہونے والی تھی۔ اور اس کے بعد ہی وہ کسی دوسری جگہ جانے کا عزم کئے بیٹھی تھی۔ لیشا اُس کے لئے اجنبی ہی نہیں بلکہ سدِ راہ بھی تھا۔

"اُسکا مجھے دیدو،" سیکسالو نے کہا۔

"خوشی سے،" کالی عورت نے نفرت انگیز مسرت سے جواب دیا۔ "لیکن آپ کو اس کے کپڑوں کی قیمت ادا کرنی ہوگی۔"

اِس طرح لیشا سیکسالو کے گھر میں آگیا۔

گورودوشو کی لڑکی ویریا نے لیشا کے معاملے میں سیکسالو کی بہت مدد کی اور تلاش کرکے ایک نرس کو لیشا کے لئے مقرر کرا دیا۔ اِس سلسلے میں ویریا کو اکثر سیکسالو کے مکان پر آنا پڑتا تھا۔ سیکسالو اُس کی یہ مصروفیتیں دیکھتا اور اُس کو ایک عجیب ہستی تصور کرتا۔ اُسے ایسا معلوم ہوتا جیسے ٹیآرا کی ساری خوبیاں اس میں جذب ہوگئی ہیں۔

(۷)

لیشا جب اپنی سفید ماں کا ذکر کرتا تو فیڈٹ اور اُس کی بیوی کرسچنی بہت زیادہ متاثر ہوتے۔ پیشن سنڈے (Passion Sunday) کو جب وہ اُسے سلانے لے گئے تو ایک سفید شکر کا بنا ہوا انڈا اُس کے بستر کے ایک سرے پر لٹکا دیا۔

"یہ تمہاری سفید نے بھیجا ہے،" فیڈٹ کی بیوی کرسچنی نے کہا "لیکن تم اُسے چھونا نہیں، جب تک حضرت عیسیٰ نہ اُٹھیں اور گھنٹے نہ بجنے لگیں۔"

لیشا چپ چاپ لیٹ گیا۔ بہت دیر تک وہ اِس خوبصورت انڈے کو تکتا رہا۔ اور پھر سو گیا۔

اس شام کو سیکسالو گھر پر تنہا بیٹھا رہا۔ آدھی رات کے قریب اُس پر غنودگی طاری ہونے لگی۔ وہ خوش تھا کہ وہ جلد ہی ٹیآرا کو دیکھے گا، اور وہ آئی، سفید چمکدار لباس میں، گرجے کے گھنٹوں کی مسرت انگیز صداؤں کے ساتھ، ایک حسین تبسم لئے ہوئے وہ اُس پر جھک گئی اور —— ناقابلِ اظہار مسرت —— سیکسالو کو محسوس ہوا، جیسے کسی چیز نے اُس کے لبوں کو چھو لیا —— ایک نرم سی آواز آہستہ سے اُس کے کان میں آئی: "حضرت عیسیٰ اُٹھ گئے ہیں۔"

بغیر آنکھ کھولے سیکسالو نے اپنے ہاتھ پھیلا دئے اور ایک نازک سے جسم کو اپنے سینے سے لگا لیا۔ یہ لیشا تھا جو اُس کی گود میں آکر اُسے ایسٹر کی مبارکباد دے رہا تھا۔

سیکسالو کی آنکھ کھل گئی۔ لیشا ہنس رہا تھا اور اپنا سفید انڈا ہاتھ میں لئے ہوئے تھا۔ "سفید ماں نے یہ بھیجا ہے" اُس نے کہا۔ "میں اُسے تمہیں دیتا ہوں اور تم اُسے ویریا پھوپی کو دیدینا۔ ضرور۔"

"بہت اچھا پیارے۔ میں جاکر ویریا کو دیدوں گا۔" سیکسالو نے جواب دیا۔

لیشا کو سلانے کے بعد اُس کا سفید انڈا لے کر جو اُس کی سفید ماں نے تحفتاً بھیجا تھا، وہ ویریا کے یہاں گیا۔ لیکن اُس وقت سیکسالو یہ محسوس کر رہا تھا کہ یہ تحفہ ٹیآرا کی طرف سے ہے۔

وہ آئے ہیں جی سے گزرنا ہی پڑا
جب غدرِ جفا سنا تو مرنا ہی پڑا
باوصفِ ملال و پاسِ ناموسِ جنوں
وہ ہنس کے اُٹھے تو سجدہ کرنا ہی پڑا
(جوشؔ)

اے رونقِ لالہ زار، واپس آجا
اے دولتِ برگ و بار، واپس آجا
ایسے میں کہ نوبہار ہے خلد بدوش
اے نازشِ نوبہار، واپس آجا
(جوشؔ)

شبلی اور حریفانِ شبلی

محمد اسمٰعیل خاں رزمی

علامہ شبلی مرحوم نے "موازنۂ انیس و دبیر" لکھکر ملک و قوم کے ذوقِ ادب کی حقیقی تربیت کی، اور یہ ایک ایسا احسان ہے جس میں علامہ موصوف منفرد ہیں، اور اس بابِ خاص میں اُن کا کوئی مثیل نظر نہیں آتا۔

موازنہ کا شائع ہونا تھا کہ بد مذاقی کے گھر میں زلزلہ آگیا۔ ہر ابجد خواں اور میزان منطق پڑھنے والا "کام منطق کا" کہتا ہوا نکل پڑا۔ رد الموازنہ، المیزان، حیاتِ دبیر محض اس لئے تالیف کی گئیں کہ ملک کی بد ذوقی کو قائم رکھا جائے مگر شبلی کی "ضربِ کلیم" ثابت ہوئی جس سے تربیتِ ذوق کے چشمے جاری ہوئے، اور آج تک جاری ہیں۔

ہم چاہتے ہیں کہ موازنہ کا مطالعہ المیزان اور حیاتِ دبیر کے مقابلے میں کریں اور جہاں جہاں جس جس تالیف میں جو جو کمی معلوم ہو صاف صاف اہلِ ملک کے سامنے رکھدیں۔ اگرچہ اس خیال کو عملی جامہ پہنانا ایک ضخیم مجلد کی تالیف کے اہتمام کے ہم معنی ہے۔ مگر ہم بعض اہم معرکہ آرا مضامین کو لیکر ایک مختصر سا مقالہ تیار کرنے کی کوشش کرتے ہیں جو حصولِ مقصد کے لئے نمونہ کا کام دے۔

اس سلسلہ میں سب سے پہلے بلاغت کو لینا زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے۔ شبلی نے بلاغت کے متعلق کیا سمجھا اور کیا کہا، یہ شبلی ہی سے سننا چاہیے۔

"بلاغت، انیس و دبیر کے موازنہ میں یہ فقرا ضرب المثل ہوگیا ہے کہ "میر صاحب میں فصاحت زیادہ ہے اور مرزا صاحب میں بلاغت" لیکن یہ فقرہ جس قدر مشہور ہے اُسی قدر غلط بلکہ اس سے زیادہ غلط اور بے معنی ہے، بلاغت کی جو تعریف تمام کتابوں میں مذکور ہے اور جس سے کسی کو کسی قسم کا اختلاف نہیں اُس کی رُو سے بلاغت کی پہلی شرط یہ ہے کہ کلام فصیح ہو، اس لئے فصاحت و بلاغت کو باہم حریف قرار دینا اجتماع النقیضین ہے، اگر مرزا صاحب میں بلاغت زیادہ ہے تو اس کے یہ معنی ہیں کہ فصاحت بھی زیادہ ہے، کیونکہ کلام اس وقت تک بلیغ نہیں ہو سکتا جب تک اُس کے تمام الفاظ مفردات و مرکبات فصیح نہ ہوں۔ اگر فصاحت میں کسی قسم کی کمی ہو گی تو بلاغت میں بھی کمی ہو گی۔ اِس لئے کسی کلام کی نسبت یہ کہنا کہ اس میں بلاغت زیادہ ہے اور فصاحت کم۔ گویا یہ کہنا ہے کہ فصاحت زیادہ بھی ہے اور کم بھی۔"

"بلاغت کی تعریف علمائے معانی نے یہ کی ہے کہ "کلام اقتضائے حال کے موافق ہو اور فصیح ہو" مقتضائے حال کے موافق ہونا ایسا جامع لفظ ہے جس میں بلاغت کے تمام انواع و اسالیب آجاتے ہیں۔ لیکن افسوس ہے کہ کتب معانی مثلاً مطول، ایضاح وغیرہ میں بلاغت کی جو تشریح کی ہے اور اس کے جس قدر انواع و اقسام قرار دئے ہیں وہ نہایت جزئی اور معمولی ہیں، ان تصریحات کی رو سے بلاغت اس کا نام

ہے کہ مبتدا اور خبر کہاں مقدم لائے جائیں اور کہاں موخر۔ کہاں معرفہ ہوں اور کہاں نکرہ" کہاں مذکور رہوں کہاں محذوف" "اسناد کہاں حقیقی ہوں کہاں مجازی" "جملہ کہاں جزیہ کہاں انشائیہ" دو فقروں میں کہاں وصل ہو کہاں فصل" کلام میں کس موقع پر اطناب کیا جائے اور کس موقع پر اختصار گویا بلاغت کا صرف اس قدر فرض ہے کہ جب تم کسی مطلب کو کسی خاص جملے میں ادا کرنا چاہو تو وہ یہ بتادے کہ جملہ کے اجزا کیا ہونے چاہئیں اور اُن کی ترکیب کیا ہونی چاہئے، لیکن اگر عام طور پر یہ پوچھا جائے کہ کس قسم کے مضامین کو کیونکر ادا کرنا چاہئے۔ مثلاً مدح، و ذم، فخر، ہجا، تہنیت، تعریض، شوق، محبت ان مضامین سے ہر ایک کے ادا کرنے کے کیا خاص پیرائے ہیں۔ ہر مضمون کا خاکہ کیونکر قائم کرنا چاہئے، کس قسم کے خیالات کس خاص مضمون کے ساتھ تعلق رکھتے ہیں تو موجودہ فنِ بلاغت اس کے متعلق کچھ رہبری نہیں کرسکتا، حالانکہ بلاغت کا اصلی تعلق مضامین ہی سے ہے نہ الفاظ سے۔ مثلاً یہ امر کہ ایک واعظ کو کسی بات کے ثابت کرنے کے لئے کس قسم کے مقدمات سے کام لینا چاہئے۔ اور اسی بات کو اگر ایک حکیم ثابت کرنا چاہے تو اس کے استدلال کا کیا طرز ہوگا۔ اس میں الفاظ کی حیثیت سے بحث نہیں ہوتی بلکہ صرف نوعیت استدلال کا لحاظ ہوتا ہے۔ یعنی اگر ایک حکیم کے استدلال میں واعظانہ مقدمات پائے جائیں تو کہا جائے گا کہ وہ خلافِ بلاغت ہے، کیونکہ بلاغت کے معنی مقتضائے حال کے موافق کلام کرنا ہے اور ظاہر ہے کہ ایک حکیم کو واعظانہ مقدمات سے استدلال کرنا اس کے رتبے کے خلاف ہے۔ اس سے ظاہر ہوا کہ بلاغت کو الفاظ سے چنداں تعلق نہیں۔ محض مضامین کو بلیغ یا غیر بلیغ کہا جاسکتا ہے۔ بلاغت الفاظ درحقیقت بلاغت کا ابتدائی درجہ ہے اور اصلی اور اعلیٰ درجہ کی بلاغت معانی کی بلاغت ہے۔"

"میر انیس صاحب کے کلام میں بلاغت الفاظ بھی اگرچہ انتہا درجہ کی ہے، لیکن یہ اُن کے کمال کا اصلی معیار نہیں، ان کے کلام کا اصلی جوہر معانی کی بلاغت میں کھلتا ہے۔"

(موازنہ انیس و دبیر صفحہ ۸۴)

اقتباس مندرجہ بالا سے حسبِ ذیل امور ثابت ہوتے ہیں۔

(۱) یہ مقولہ غلط ہے کہ میر صاحب میں فصاحت زیادہ ہے، اور مرزا صاحب میں بلاغت۔

(۲) بلاغت کی شرطِ اول بلا اختلاف فصاحت ہے۔

(۳) فصاحت و بلاغت باہم حریف نہیں ہیں بلکہ فصاحت بلاغت کا ایک جزوِ لاینفک ہے۔

(۴) کوئی کلام اس وقت تک بلیغ نہیں ہوسکتا، جب تک اس کے تمام الفاظ مفردات و مرکبات فصیح نہ ہوں۔

(۵) بلاغت کی تعریف۔ کلام اقتضائے حال کے موافق اور فصیح ہو۔

(۶) موجودہ فنِ بلاغت میں نقص پایا جاتا ہے یعنی وہ حذف جملے کی تعبیر بتا سکتا ہے، مبتدا و خبر کے مقامات، وصل و فصل کی ضرورت، حذف و ذکر کے مواقع وغیرہ کے متعلق رہنمائی کرسکتا ہے۔ مگر یہ بتانے سے قاصر ہے کہ کس قسم کے مضامین کو کیونکر ادا کرنا چاہئے۔

(۷) بلاغت کو الفاظ سے چنداں تعلق نہیں۔

(۸) مضامین کو بلیغ یا غیر بلیغ کہا جاسکتا ہے۔

(۹) بلاغتِ الفاظ درحقیقت بلاغت کا ابتدائی درجہ ہے، اصلی اور اعلیٰ درجہ کی بلاغت معانی کی بلاغت ہے۔

مولف المیزان بلاغت کو شروع کرتے ہیں، اور علامہ شبلی پر اعتراضات کا مینہ برسا دیتے ہیں۔ مگر ان اعتراضات کی حقیقت کیا ہے۔ یہ ناظرین خود ملاحظہ فرمالیں۔ ہم بعض اقتباسات پیش کرتے ہیں۔

"قابل مولف نے اس موقع پر اس خیال کو ظاہر کیا ہے جو ایک عرصے سے میر صاحب اور مرزا صاحب کے موازنہ میں زبانوں پر بطور ضرب المثل جاری ہے، یعنی میر صاحب میں فصاحت زیادہ ہے۔ مرزا صاحب میں بلاغت۔ مگر وہ اس جملہ کو مہمل اور بے معنی قرار دیتے ہیں کیونکہ میر صاحب میں فقط فصاحت اور مرزا صاحب میں فقط بلاغت سمجھنا بے معنی اور خلاف واقعہ بات ہے۔ لیکن مولف نے اُس کو بلحاظ معنی جو غلط اور مہمل لکھا ہے وہ ہرگز صحیح نہیں ہے، ان کی رائے کا خلاصہ یہ ہے کہ فقرہ اس وجہ سے بے معنی ہے کہ جب بلاغت کی پہلی شرط یہ ہے کہ کلام فصیح ہو۔ پھر فصاحت اور بلاغت کو باہم حریف قرار دینا اجتماع نقیضین ہے، افسوس ہے کہ لائق مولف نے اس موقع پر تعمق نظر سے کام نہیں لیا چونکہ یہ ایک دقیق اور علمی بحث ہے، اس لئے اس کے حل کرنے میں

کسی قدر تفصیل کی ضرورت ہے ...."

"سب سے پہلے یہ دیکھنا چاہیئے کہ فصاحت اور بلاغت کی تعریف کیا ہے؟ اور ان دونوں کا اپنے افراد سے کیا تعلق ہے؟"

"فصاحتِ کلام کے یہ معنی ہیں کہ کلام الفاظ ثقیلہ و غریبہ سے پاک ہو۔ یعنی جس میں تمام الفاظ فصیح و شیریں و معتاد ہوں۔ اور الفاظ ایسی خوبی کے ساتھ ترتیب و تالیف کئے گئے ہوں کہ حد سے زیادہ دلآویز و دلفریب معلوم ہوں اور حسنِ تالیف سے مزین اور تعقید لفظی و معنوی تخیل و اصطلاح وادعائے ناپسندیدہ سے بیرا ہو"

"بلاغتِ کلام یہ ہے کہ کلام مقتضائے حال کے مطابق اور استعارات یا قرائن کنایات بلیغ، مجاز ہائے پسندیدہ، تشبیہات نادرہ، غیر متبدلہ سے آراستہ ہو بشرط فصاحت، کیونکہ فصاحت بلاغت کا ایک جُز ہے۔ پس فصاحت کا تعلق الفاظ یا معنی سے ہے اور اس میں الفاظ و بندشِ الفاظ کے حسن و قبح سے بحث ہوتی ہو۔ اور بلاغت کا اصلی تعلق معنی الفاظ سے ہے۔ یعنی اس میں معنی کی خوبی اور نفاست کی نوعیت کا لحاظ رکھا جاتا ہے"

"بلاغت و فصاحت میں عموم و خصوص مطلق کی نسبت ہے، بلاغت اخص مطلق ہے اور فصاحت اعم مطلق، یعنی ہر بلیغ فصیح ہے"

"گو یہ ضرور نہیں کہ ایک کلام میں جس پائے کی بلاغت ہو اسی پائے کی فصاحت بھی ہو کیونکہ ممکن ہے کہ ہر کلام بلیغ کا ہر کلمہ فصیح تر نہ ہو (لیکن ہر فصیح کا بلیغ ہونا لازم نہیں ہے، بلکہ بعض فصیح بلیغ ہے اور بعض نہیں"

"اب دیکھنا چاہیئے کہ ان دونوں کا اپنے اپنے افراد کے ساتھ کیا تعلق ہے یعنی ان میں تشکیک ہے یا تواطو ظاہر ہے کہ دونوں میں تشکیک ہے، یعنی فصاحت و بلاغت جن دونوں کا مفہوم کلی ہے، ان کے تمام افراد مساوی نہ ہوں گے۔ مثلاً فصیح کے افراد بس قسم کے کلام ہوں تو لفظ فصیح ان سب پر یکساں طور پر صادق نہ آئے گا، کیونکہ کوئی کلام فصیح ہو گا کوئی فصیح تر، چنانچہ اطلاق افصح جو مقابل فصیح ہے ثبوت تشکیک ہے۔ یہی بلاغت کا بھی حال ہے۔ کوئی بلیغ ہو گا کوئی ابلغ تر چنانچہ کسی کو بلیغ اور کسی کو ابلغ کہنا زبان زد خلق ہے۔ اس سے ثابت ہوا کہ دونوں کے افراد میں وصف فصاحت و بلاغت کی کمی بیشی ممکن ہے۔ علمائے علم معانی و بیان نے بھی اس امر کو بصراحت ظاہر کر دیا ہے"

ان دونوں کی تعریف اور اُن کا اپنے اپنے افراد کے ساتھ جو کچھ تعلق ہے اُس کے معلوم ہو جانے کے بعد ضرب المثل کے معنی پر غور کیجئے، مرزا صاحب کی نسبت لوگوں کا یہ خیال ہے کہ ان میں بلاغت زیادہ ہے اُس کے یہ معنی ہوئے کہ ان میں ہیں تو بلاغت و فصاحت دونوں۔ مگر بلاغت زیادہ ہے۔ (فصاحت کم) نہ یہ کہ فصاحت بالکل ہی نہیں جیسا کہ آپ نے خیال کیا ہے۔ اور اسی بنا پر کہہ دیا ہے کہ لوگ فصاحت و بلاغت کو باہم حریف قرار دیتے ہیں۔ یعنی یہ کہتے ہیں کہ بلاغت ہے، فصاحت نہیں، بلاغت زیادہ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ ان کا کلام مقتضائے حال کے موافق ہوتا ہے۔ لیکن ضرب المثل والوں کی رائے میں جس پائے کی بلاغت ہوتی ہے اس کے مناسب و مطابق فصیح الفاظ نظر نہیں آتے، یا الفاظ فصیح کو حسنِ ترتیب کے ساتھ ترکیب نہیں دیا جاتا۔ اس لئے ان میں بلاغت جس کا تعلق معانی سے ہے زیادہ ہے۔ لیکن فصاحت جس کا تعلق الفاظ سے ہے اس سے کم درجہ کی ہے۔ اس تمہید کو ذہن نشین کر لینے کے بعد آپ کے تمام فقرات کی بہ آسانی رد ہو جاتا ہے۔ مثلاً آپ لکھتے ہیں (بلاغت کی پہلی شرط یہ ہے کہ کلام فصیح ہو اس لئے فصاحت و بلاغت کو باہم حریف قرار دیدینا اجتماع نقیضین ہے) یہ آپ نے کس طرح جانا کہ ضرب المثل والے فصاحت و بلاغت کو باہم حریف قرار دیتے ہیں۔ وہ یہی مانتے ہیں کہ جہاں بلاغت ہو گی فصاحت بھی ہو گی کیونکہ فصاحت الفاظ کلام بلیغ کے واسطے لازمی ہے لہٰذا بلاغت کے ساتھ اس کا اجتماع ضروری ہے۔ مگر یہ لازم نہیں کہ دونوں ایک ہی حیثیت اور شان کی ہوں....... معلوم ہوا کہ وہ لوگ ان دونوں کو حریف قرار نہیں دیتے .... تو ایک کلمے میں ان کے جمع ہونے سے اجتماع نقیضین بھی لازم نہ آیا"

"پھر آپ فرماتے ہیں کہ (مرزا صاحب میں بلاغت زیادہ ہے تو اُس کے یہ معنی ہیں کہ فصاحت بھی زیادہ ہے کیونکہ کلام اس وقت تک بلیغ نہیں ہو سکتا جب تک اس کے تمام الفاظ مفردات و مرکبات فصیح نہ ہوں۔ اگر فصاحت میں کسی قسم کی کمی ہو گی تو بلاغت میں بھی کمی ہو گی")

"یہ بالکل صحیح نہیں ہے اگر بلاغت زیادہ ہے تو فصاحت بھی زیادہ ہے،

..... بلاغت کی شرط مطلق فصاحت ہے نہ زیادتی فصاحت .....
جو یہ شبہ پیش آئے جو کلام زیادہ بلیغ ہوگا وہ لزوماً فصیح بھی زیادہ ہوگا
...... مثلاً شاعر ایک مضمون نظم کرے جو مقتضائے حال کے مطابق
ہو۔ لیکن الفاظ شیریں تر اور فصیح تر نہ ہوں تو کہا جائے گا کہ کلام بلیغ تو ہے
مگر جس درجہ کا بلیغ ہے اس درجہ کا فصیح نہیں جیسے کہا کرتے ہیں کہ فلاں
شخص نے بات اچھی سوچی ہے، مگر طرز ادا بہت ناقص ہے ......
پس یہ کہنا کہ اگر فصاحت میں کسی قسم کی کمی ہو گی تو بلاغت میں بھی کمی
ہو گی ہرگز قابلِ قبول نہیں "

"ابن خلدون لکھتے ہیں کہ (معانی کو ایسا سمجھو جیسے پانی اور الفاظ
کو ایسا سمجھو جیسے پیالہ، پانی چاہے سونے کے پیالے میں بھرلو اور چاہو
چاندی کے پیالے میں، اور چاہو مٹی کے پیالے میں، پانی کی ذات میں
کچھ فرق نہیں آتا۔ مگر سونے یا چاندی وغیرہ کے پیالے میں اس کی قدر
بڑھ جاتی ہے، اور مٹی کے پیالے میں کم ہو جاتی ہے۔ اسی طرح معانی
کی قدر ایک فصیح اور ماہر کے بیان میں زیادہ ہو جاتی ہے اور غیر فصیح
کے بیان میں گھٹ جاتی ہے) اس سے معلوم ہوا کہ معنی کا نفیس اور اعلیٰ
ہونا اس کے واسطے مناسب الفاظ فراہم نہ ہونا ممکن ہے۔ ایسی حالت
میں بلاغت یعنی معنی کی نفاست اور خوبی زیادہ پائی جائے گی۔ لیکن فصاحت
یعنی الفاظ کی پاکیزگی اس سے کچھ کم ہو سکے گی۔ اس لئے کہا جائے گا اس
کلام میں بلاغت زیادہ ہے اور فصاحت اس درجہ سے کچھ کم ہے، اس لئے
ضرب المثل والوں کا یہ قول کہ بلاغت زیادہ ہے اور فصاحت کم صحیح ہے۔

(المیزان صفحہ ۸۵ سے ۹۰ تک التقاطاً)

اقتباس محولہ بالا سے حسبِ ذیل امور مستنبط ہوتے ہیں۔

(۱) ضرب المثل کا بلحاظ واقعیت غلط ہونا درست ہے، کیونکہ میر
صاحب میں فقط فصاحت سمجھنا اور بلاغت سے معرا جاننا اور مرزا صاحب
میں فقط بلاغت ہونا اور فصاحت نہ ہونا خلاف واقعہ ہے۔ لیکن بلحاظِ
معنی غلط اور مہمل سمجھنا درست نہیں۔

(۲) فصاحتِ کلام کی تعریف۔ کلام الفاظِ ثقیلہ وغریبہ سے پاک ہو،
تمام الفاظ فصیح وشیریں معتاد ہوں جس ترتیب وتالیف سے مرتب تعقیدِ لفظی،
معنوی تخیل۔ اصطلاح وادعائے ناپسندیدہ سے مبرا ہو۔

(۳) بلاغت کی تعریف۔ کلام مقتضائے حال کے مطابق ہو بشرطِ فصاحت۔

(۴) ہر بلیغ فصیح ہوتا ہے۔ ہر فصیح بلیغ نہیں ہوتا۔

(۵) مرزا صاحب میں فصاحت وبلاغت دونوں ہیں مگر بلاغت
زیادہ ہے اور فصاحت کم۔

(۶) ضرب المثل والے فصاحت وبلاغت کو باہم حریف قرار نہیں دیتے۔

(۷) یہ نہیں مانا جا سکتا کہ اگر بلاغت زیادہ ہو گی تو فصاحت بھی
زیادہ ہو گی۔

(۸) بلاغت کا تعلق مضامین سے ہے۔

(۹) فصاحت کا تعلق الفاظ سے ہے۔

(۱۰) معانی کی مثال پانی کی ہے، اور الفاظ پیالے کی طرح پیالے
کے تغیر سے پانی کی ماہیت میں فرق نہیں آتا۔

ان دونوں پیالوں میں حسبِ ذیل امور مشترک ہیں۔

(۱) بلاغت کی شرط اول فصاحت ہے

(۲) بلاغت کلام کے مقتضائے حال کے مطابق اور فصیح ہونے کو
کہتے ہیں۔

(۳) بلاغت کو الفاظ سے تعلق نہیں۔

(۴) بلاغت کا تعلق معانی یا مضامین سے ہے۔

(۵) ہر بلیغ فصیح ہوگا۔

حسبِ ذیل امور میں علامہ شبلی اور صاحب المیزان میں اختلاف ہے۔

(۱) میر انیس میں فصاحت زیادہ ہے اور مرزا دبیر میں بلاغت۔

(۲) مولف المیزان تسلیم نہیں کرتے کہ اگر بلاغت زیادہ ہو گی تو
فصاحت بھی زیادہ ہو گی۔

(۳) مولف المیزان نہیں مانتے کہ ضرب المثل والے فصاحت وبلاغت
کو باہم حریف جانتے ہیں۔

اس ضرب المثل کی صحت وعدم صحت پر استدلال کا طریقہ جو
علامہ شبلی نے اختیار کیا ہے زیادہ سنجیدہ ہے، کیونکہ آپ نے ادب کو
متبوع قرار دیا ہے اور منطق کو اس کے تابع رکھا ہے۔ برخلاف مولف المیزان
کے کہ آپ نے ادب کو منطق کے تابع کر دیا ہے۔ اور ادبیات میں یہ قابلِ
قبول نہیں سمجھا جا سکتا۔

حقیقت یہ ہے کہ منطق اثبات صداقت یا ماہیت کے معلوم کرنے کا ایک طبی ذریعہ ہے جس کی صداقت معلوم کرنی مقصود ہے اگر اُس کو پس پشت ڈال دیا جائے اور محض اس ذریعہ ہی کو مقصود سمجھ لیا جائے جس سے صداقت کے جاننے کا امکان ہے تو یہ اصل مقصد کے بالکل منافی ہوگا۔

معلوم تو یہ کرنا تھا کہ ضرب المثل والوں کا عقیدہ بجائے خود صحیح ہے یا غلط۔ مگر مولف المیزان یہ معلوم کرنے کے بجائے تشکیک، طوالمی، عموم خصوص مطلق، اخص مطلق، کی اصطلاحات پیش کرکے معلوم نہیں کیا مظاہرہ کرنے لگے۔

مؤلف المیزان اس بات کو بھول گئے کہ شبلی ادبیات سے بحث کر رہا ہے اور ادبیات کے ایسے ایسے نکتوں کو اہلِ علم کی بارگاہ میں پیش کر رہا ہے جن تک قدما کی دقیقہ رس نگاہیں نہ پہنچ سکیں۔ جب تک ان نکات کو نہ سمجھا جائے گا مرزا صاحب کی بلاغت کی واقعیت کا اظہار ہو ہی نہیں سکے گا۔

بلاشبہ اُس بلاغت کو کچھ نہ کچھ مرزا صاحب کام میں لاتے ہیں جو قدما نے بیان کر دی ہے۔ مگر جو قدما کے بیان سے رہ گئی اور جو حقیقی بلاغت تھی اور جس کو جناب انیس کی حقیقت رس اور دقیقہ یاب نگاہیں نہ چھوڑ سکیں اس بلاغت سے مرزا دبیر اکثر نابلد نظر آتے ہیں۔

یہ ہمارا دعویٰ نہیں بلکہ شبلی کا دعویٰ ہے اور اس کی تردید صاحب المیزان کے بیان میں نہیں پائی جاتی۔

شبلی نے جہاں یہ کیا ہے کہ موجودہ فنِ بلاغت سوائے اس کے کچھ نہیں بتاتا کہ کسی منشا کو جب کسی کلام میں ظاہر کیا جائے تو اجزائے کلام اور اس کی ترکیب کی ہیئت کیا ہونی چاہیئے۔ قدما کے فنِ بلاغت پر اعتراض کیا ہے اور اس میں یہ نقص ثابت کیا ہے کہ اگر آج کسی مضمون کا خاکہ قائم کرنا چاہیں تو موجودہ فنِ بلاغت اس کی رہنمائی سے قاصر نظر آئے گا۔

اسی خیال کے نتیجہ کو شبلی نے ظاہر کیا ہے کہ جملے کی ترکیب و ترتیب مسندالیہ جز کا حذف ذکر وغیرہ دراصل یہ بلاغت کا ابتدائی مرتبہ ہے جو الفاظ سے تعلق رکھتا ہے۔

شبلی کے اس بیان سے فی الفور متبادر فی الذہن ہوتا ہے کہ اگرچہ بلاغت کا تعلق مجرد لفظ سے بالکل نہیں ہے۔ مگر جب کہ لفظ جزو جملہ ہوتا ہے تو یقیناً جزو بلاغت و مفید بلاغت ہوتا ہے۔ ایسی حالت میں کہ جب ایک لفظ کسی جملہ کا جزو ہو کر مستبدا یا خبر ہو تو حسب محل اس کو بلیغ و غیر بلیغ کہا جا سکے گا۔ اسی کے لئے کہا گیا ہے کہ بلاغتِ الفاظ درحقیقت بلاغت کا ابتدائی درجہ ہے۔ اس کی مثال:۔

خیبر شکن کے لال کی آمد ہے صف شکن　　گرتی ہے فوج فوج پہ پڑتا ہے رن پہ رن
سیفِ خدا کی تیغ کا سایہ ہے تیغ زن　　غلطاں کہیں قدم ہیں کہیں سر کہیں بدن

نہ حوصلہ نہ بغض امام حسین رہا
اب دل میں بھاگنے کے سوا کچھ نہیں رہا

اس بند میں بعض الفاظ کا بے محل ہونا یعنی غیر بلیغ ہونا صاف نظر آتا ہے۔ کیوں؟ سنیئے!

(۱) واقعہ یہ ہے کہ بہادر کے میدانِ جنگ میں آنے سے فوجوں کی وہ حالت دکھانی مقصود ہے جو اس کی آمد کے اثر سے ہوئی۔

(۲) حالت کا اظہار مکمل ہو گیا۔

(۳) مگر جس لفظ کے ذریعے سے یہ اظہار کیا گیا ہے وہ لفظ بجائے خود ایسا نہیں ہے جس سے فوجوں پر یہ اثر پڑ سکے۔

(۴) جناب مولا علی کرم اللہ وجہ کے صاحبزادے کی آمد سے دراصل یہ اثر پڑا کہ فوج پر فوج گرنے لگی۔

(۵) اس واقعہ کو اگر یوں بیان کیا جاتا کہ حضرت امام حسین علیہ السلام کی آمد سے فوج بدحواس ہو گئی یا حضرت علیؑ کے لال کی آمد ہے، صف شکن کہا جاتا تو اتنا اثر نہیں پڑ سکتا تھا جتنا خیبر شکن کے لال سے پڑتا ہے، "خیبر شکن کے لال"۔

(۶) مگر خیبر شکن کے لال میں خود مضاف یعنی لال تمام زور کو گھٹائے دیتا ہے۔ یعنی خیبر شکن سے جو ہیئت و عظمت، رعب جلال پیدا ہوتا ہے وہ لال کے لفظ پر آ کر ختم ہو جاتا ہے، اور لال کی آمد کوئی ایسی آمد نہیں تھی جو صف شکنی کے لئے زیادہ مفید ہو اور جس سے فوج پر فوج گرے اور رن پر رن پڑے۔

اسی لال کی بلاغت حسب ذیل بند میں ملاحظہ ہو۔

لایا جو حرفِ سخت زباں پر وہ بدخصال　　چھپٹا مثالِ شیر درندہ حسنؑ کا لال
گھوڑے سے بس ملا دیا گھوڑا ابعد جلال　　اتنے جھپٹے کہ گر گئی اس کی سپر سے ڈھال

اودھر لگی کہ ہوش اُڑے خود پسند کے
گھوڑے نے پاؤں رکھدئے سر پر سمند کے　　(انیس)

(نہ صرف لال بلکہ تمام بند میں ایک لفظ بلکہ ایک حرف ایسا نظر نہیں آتا جس سے دبدبۂ کلام میں تاؤ بھاؤ میں فرق آئے۔ رزمی)

باوجودیکہ حسنؑ میں وہ وصف نہیں پایا جاتا جو خیبر شکن میں ہے۔ مگر یہی حسنؑ کا لال جب مثال شیر درندہ جھپٹتا ہے تو ہیبت و رعب و عظمت کا زلزلہ آجاتا ہے۔ اور کلام میں کہیں بھی جھول نہیں پڑتا۔

"خیبر شکن کے لال" اور "حسنؑ کے لال" میں دو جگہ لفظ لال برتا گیا مگر پہلی جگہ بے محل ثابت ہوتا ہے۔ دوسری جگہ برمحل اس میں بھی ایک خاص امر قابلِ لحاظ ہے۔ جس کو بلاغت سے گہرا تعلق ہے۔ یعنی اگر قائل میدانِ جنگ میں صرف جناب امام حسین علیہ السلام کی آمد کی خبر دینا اپنا مقصود سمجھتا ہے تو خیبر شکن کے لال پر تنقید اور طرح ہو گی، اور اگر قائل کا منشا وہ منظر پیش کرنا ہے جو کسی بہادر کی آمد سے اور سپاہ مقابل کی حالت سے تعلق رکھتا ہو تو اس پر تنقید دوسرے انداز سے ہو گی۔ پہلی منشا کے مطابق "خیبر شکن کے لال" میں لفظ لال کو شاید غیر بلیغ نہ کہا جائے مگر دوسرے منشا کے مطابق لفظ لال کی بلاغت ثابت ہونی مشکل اور سخت مشکل۔

مگر چونکہ مرزا صاحب کے ہاں امر ثانی مقصود ہے۔ اس لئے اس کی تنقید میں لفظ لال کے متعلق اظہارِ خیال کا موقع نکل آیا۔

مرزا صاحب کی شان شاعرانہ سے گستاخی کی نیت سے نہیں بلکہ بلاغت کے ایک نکتہ کی وضاحت کے لحاظ سے یہ عرض کرنے کی جرأت ہوتی ہے کہ اگر مرزا صاحب کے بند میں لفظ لال کی جگہ "شیر" ہوتا تو بلیغ ہوتا یعنی اب منشا کے اظہار میں جو ایک نقص یا جھول سا ادراک محسوس کرتا ہے وہ باقی نہ رہتا، گویا مرزا صاحب کا مصرعہ اگر یوں ہوتا "خیبر شکن کے شیر کی آمد ہے صف شکن" تو بلیغ ہو جاتا۔ بلکہ واقعہ یہ ہے کہ لفظ شیر سے وہ کمی بالکل نکل جاتی جو بلاغت میں جھول پیدا کرتی ہے، کیونکہ منظر کی حالت کی تعلیل و وضاحت اور رفع شک کے لئے بہ مقتضائے مقام استعارہ ضروری ہے نہ کہ اضافت۔

یعنی اگر سامعین کے اس شک کو رفع کرنا مقصود ہے کہ ایک انبوہ کثیر

ایک فردِ واحد کی آمد سے کیونکر بدحواس ہو گیا تو اس فرد کے وہ خصوصیات زیادہ سے زیادہ مذکور ہونا ضروری ہیں۔ جن سے نتیجے پر موافق اثر پڑے ان خصوصیات کے بیان میں جتنی کمی ہو گی مدعی کا دعویٰ بھی اُتنا ہی ناقص رہے گا، مثلاً شعر زیر بحث ہی کی مفصلۂ ذیل صورتوں پر غور کرنا چاہیئے۔

(۱) حضرت امام حسینؑ کی آمد ہے صف شکن
(۲) حضرت علیؑ کے لال کی آمد ہے صف شکن
(۳) خیبر شکن کے لال کی آمد ہے صف شکن　　گرتی ہے فوج فوج پہ پڑتا ہے رن پہ رن
(۴) خیبر شکن کے شیر کی آمد ہے صف شکن
(۵) شیرِ خدا کے شیر کی آمد ہے صف شکن

موقع اور مضمون کے اعتبار سے چوتھا مصرعہ شرائطِ بلاغت کو پورا کرتا ہے، باقی ہر مصرع میں یا تمام جملوں میں کوئی نہ کوئی نقص رہتا ہے جو مضرِ بلاغت ہے۔ البتہ پانچواں مصرعہ قابلِ لحاظ رہتا ہے۔

ہم یہ کہدینا اپنا فرض سمجھتے ہیں کہ صرف اس نکتہ کو حل کرنے کے لئے کہ فنِ بلاغت کے فرائض حقیقتاً کیا ہیں۔ اور موجودہ فنِ بلاغت فی الحال کتنی ضرورتیں پوری کر رہا ہے اور بحیثیتِ موجودہ اس میں کیا کمی پائی جاتی ہے۔ ہم نے یہ مثال استاد کے کلام سے اقتباس کی ہے۔ ہمارا ذاتی مقصد مرزا صاحب کی کسرِ شان یا نقصِ کمال نہیں ہے۔

جبکہ مولف المیزان یہ نکتہ نہ سمجھ سکے کہ بلاغت الفاظ بلاغت کا ابتدائی درجہ ہے تو یہ کیسے ممکن تھا کہ وہ ضرب المثل کے مفہوم پر صحیح محاکمہ کر سکتے۔

ضرب المثل فقرے سے جو عقیدہ مترتب ہوتا ہے وہ کم سے کم ضروری نہیں ہے جو مولف المیزان نے منطقی مقدمات قائم کر کے سمجھا ہے، اس کا ثبوت خود مولف ممدوح ہی کی تحریر میں موجود ہے، وہو ہذا۔

"بعض لوگوں کا یہ خیال ہے کہ شائد جمہور کا یہ مقولہ کہ مرزا صاحب کا کلام بلیغ ہے اس لحاظ سے ہوگا کہ ان کے کلام میں مضمون آفرینی اور بلند پروازی ہوتی ہے اور وہ استعارات و تشبیہات و کنایات سے مزین ہوتا ہے اور میر صاحب کے کلام کو اس لئے فصیح کہتے ہوں گے کہ اس میں سادگی اور صفائی نظر آتی ہے۔ غالباً مرزا صاحب کے کلام کو بلیغ کہنا بہ لحاظ معنی مصطلح علم معانی نہ ہوگا، یعنی رعایت مقتضائے حال

و مقام کیونکہ اکثر لوگ اگر ان سے دریافت کیا جائے تو بلاغت اصطلاحی کے معنی اور اس کی تعریف بھی نہ جانتے ہوں گے ۔"

"ہماری رائے میں بھی یہ خیال قرینِ قیاس معلوم ہوتا ہے ......"

اس اقتباس میں لفظ جمہور کو دیکھیو اور اس کی ماہیت کو سمجھو کہ خواص و عوام میں سے کوئی بھی اس سے مستثنیٰ نہیں اور پھر اس پر غور کرو کہ وہ بلاغت کے معنی کیسے عجیب و غریب اور کتنے غلط سمجھتے ہیں۔ پھر مولف المیزان کی اُن سے ہمنوائی یہ قراین ثابت کرتے ہیں کہ شبلی نے جو ضرب المثل کا مطلب سمجھا ہے صحیح ہے اور صاحب المیزان نے جو سمجھا وہ محض غلط ہے ۔

بلاغت کے معنی غیاث میں ہیں، جوان شدن و رسیدن بہ مرتبۂ منتہا و کمال و ایراد کلام برعایت مقتضائے حال یعنی آوردن کلام مطابق اقتضائے مقام بشرطِ فصاحت ......) لغوی اور اصطلاحی معنی تو سب کو معلوم ہی تھے مگر یہ جمہوری معنی معلوم نہیں کہاں سے بیان کئے گئے ہیں ۔ لاخلاف فی الاصطلاح ایک مسلمہ کلیہ ہے اور لغت بجائے خود ایک سند ہے ۔ مگر یہ جمہوری معنی معلوم نہیں کس سند سے بیان کئے گئے ہیں۔

واقعہ یہ ہے اس علم ناآشنا جمہور نے بلاغت کے معنی شوکت الفاظ وغیرہ سمجھ لئے ہیں اور مولف المیزان نے ان کی طرفداری کی دنیا میں غلطی کا رواج ہوگیا ۔

جب یہ ثابت ہوگیا کہ جمہور نے بلاغت کے نہ لغوی معنی سمجھے نہ مسلمہ، تو کیسے تسلیم کر لیا جائے کہ ضرب المثل میں جمہور کی مراد وہی مسلمہ معنی ہیں جن کو مولف المیزان نے بزورِ منطق ثابت کرنے کی ناکام کوشش کی ہے ۔

شبلی کا یہ دعویٰ ہے کہ ضرب المثل کو صحیح ماننے کی صورت میں مرزا صاحب کے کلام میں بلاغت کے ساتھ فصاحت بھی زیادہ ماننی پڑتی ہے مولف المیزان یہ تو تسلیم نہیں کرتے البتہ یہ ضرور مانتے ہیں کہ مرزا صاحب کے بیان میں جس پایہ کی بلاغت ہوتی ہے اس پایہ کی فصاحت نہیں ہوتی۔ گویا وہ ضرب المثل والوں کے اس عقیدہ کو تسلیم کرتے ہیں کہ مرزا صاحب کے بیان میں بلاغت کے مناسب و مطابق فصیح الفاظ نہیں ہوتے۔ یا وہ الفاظ فصیح کو حسنِ ترتیب کے ساتھ ترکیب نہیں دیتے یا نہیں دے سکتے۔

کوئی ماہرِ معانی و بیان یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ اعلیٰ رتبہ بلیغ وہ ہی متکلم کہا جا سکتا ہے جس کے کلام میں الفاظ تو فصیح تر نہوں مگر مناسب محل ہوں بلاغت کا اعلیٰ رتبہ وہی ہوگا جبکہ اس میں فصیح ترین الفاظ ہوں اور محل و ضرورت کے مطابق لائے گئے ہوں۔ اگرچہ مطلق بلاغت کے لئے مطلق فصاحت کافی ہو سکتی ہے ، مگر زیادہ بلاغت کے لئے ادنیٰ درجہ کی فصاحت کسی معانی و بیان کی کتاب سے ثابت نہیں کی جا سکتی ۔

ضرب المثل والوں کا یہ عقیدہ کہ مرزا صاحب میں بلاغت زیادہ ہے یہی ثابت کرتا ہے کہ مدعی کا دعویٰ در اصل یہی ہے ان میں فصاحت بھی زیادہ ہے ، کیونکہ جیسا کہ ابھی عرض کیا گیا ، بلاغت مطلق کے لئے فصاحت مطلق کی شرط ہے ، یہ نہیں ہو سکتا کہ متکلم ہو تو ابلغ مگر کلام اس کا صرف فصیح ہو۔ اگر مرزا صاحب میں بلاغت زیادہ ہے یعنی وہ ابلغ ہیں اور کلام میں کلمات صرف فصیح ہوتے ہیں تو اس کی کوئی مثال پیش کی ہوتی ۔

اس لحاظ سے ضرب المثل والوں نے مرزا صاحب میں اتنی بلاغت کی کمی تو خود تسلیم کر لی ، جتنی فصیح ترین اور فصیح تر الفاظ کے نہونے سے متصور رہے ، نتیجہ یہ نکلا کہ منطق تو رکھی ہی رہی اور واقعہ نے صداقت کو بے نقاب کر کے ثابت کر دیا کہ ضرب المثل کا مطلب علامہ شبلی نے درست سمجھا اور صاحب المیزان مغالطہ ہی میں رہے ۔ اگر یہ نتیجہ صحیح نہیں ہے تو غور کر کے بتایا جائے ۔

۱ ۔ بلیغ ۔ معانی حسبِ حال و مقام ۔ الفاظ فصیح

۲ ۔ بلیغ ۔ معانی حسبِ حال و مقام نہوں ۔ الفاظ فصیح ہوں

۳ ۔ بلیغ ۔ معانی حسبِ حال و مقام ۔ الفاظ فصیح تر

۴ ۔ بلیغ ۔ معانی حسبِ حال و مقام ۔ الفاظ فصیح ترین

میں کس کو ابلغ کہا جائے گا ۔

ظاہر ہے کہ ۴ سب سے ابلغ ہوگا اب چونکہ ضرب المثل کے الفاظ میں "بلاغت زیادہ ہے" واقع ہے اس لئے اگر یہ ترتیب رکھی جائے کہ بلاغت ہے ، بلاغت زیادہ ہے ، اور بلاغت سب سے زیادہ ہے تو مرزا صاحب اوسط درجہ کے بلیغ ثابت ہوتے ہیں اور اگر بلاغت زیادہ ہے مراد اعلیٰ درجہ کی بلاغت ہے تو وہ خود ضرب المثل والوں کے عقیدہ ہے اور خود مولف المیزان کے یقین کے مطابق غلط ہے ۔ کیونکہ بقول ان دونوں مدعیوں کے مرزا صاحب کے الفاظ فصیح ترین نہیں ہوتے اور ان میں فصاحت اس درجہ کی نہیں ہوتی جس درجہ کی بلاغت ہے ۔ یعنی اگر کوئی ایسا شاعر دستیاب ہو جائے کہ اعلیٰ درجۂ بلاغت کے ساتھ اس کے الفاظ بھی فصیح ترین ہوں تو

وہ مرزا صاحب سے ابلغ ہوگا۔

بلاغت کے متعلق آخری شبہ یہ رہجاتا ہے کہ مدارج بلاغت میں بلیغ، زیادہ بلیغ اور سب سے زیادہ بلیغ یعنی ابلغ ہے۔ یہ ترتیب بلحاظ معنی ہے اور بلحاظ الفاظ فصیح، زیادہ فصیح اور سب سے زیادہ فصیح یعنی افصح ہے۔ اور معانی کی ترتیب کے سوا محض کلام کے اعلیٰ درجۂ فصاحت کی بنا پر کسی کو ابلغ نہ کہا جائے گا۔

جب یہ مسلمہ کلیہ ہے کہ کلام بے معنی پر فصیح کا اطلاق ہوگا تو یہ دعویٰ درست نہیں کہ کلمات یا کلام کو بلا لحاظ معنی فصیح وغیر فصیح کہا جائے گا۔

نیز یہ اصول کہ فقدانِ فصاحت مستلزم فقدان بلاغت ہے جو مؤلف المیزان کا بھی عقیدہ یہ ثابت کرتا ہے کہ فصاحت معانی سے جدا گانہ کوئی چیز نہیں ہے۔

اب رہ گیا اس شاعر کا معاملہ جو اچھی بات سوچ لیتا ہو مگر اظہار میں بیڈھنگا تو اس مثال سے زیادہ سے زیادہ یہ ثابت ہوتا ہے کہ پھوہڑ اور انگھڑ آدمی سے یہ ممکن ہے کہ وہ اچھی سوچی ہوئی بات کو بیڈھنگے پن سے کہے۔ مگر جو لوگ کائناتِ شعر کے عناصر ہیں ان سے یہ بات ممکن نہیں۔

اس کے علاوہ علامہ شبلی نے تو یہ دعویٰ کیا ہے کہ ضرب المثل کا یہ مطلب ہے کہ اگر بلاغت زیادہ ہوگی تو فصاحت بھی زیادہ ہوگی۔ شبلی کا دعویٰ یہ کب ہے کہ ایک ایسا شخص بھی فصیح و بلیغ مانا جاسکے گا جو سوچنے میں اچھا ہو۔ مگر اظہار مدعا پر قدرت نہ رکھتا ہو۔

واقعہ یہ ہے کہ ایک شخص بات اچھی طرح سوچ سکتا ہے اور اظہار مافی الضمیر میں وہ کامیاب نہیں تو وہ مخاطب بھی نہیں ہے۔ اور نہ یہاں صرف لفظی اور منطقی طوطا مینا کی ضرورت ہے بلکہ یہاں مرزا دبیر صاحب کی بلاغت سے بحث ہے۔ اس لئے ہم اس امکان پر غور کرنے کی ضرورت نہیں سمجھتے کہ ایسا ممکن ہے اور ویسا ممکن ہے۔ بلکہ یہاں تو یہ بحث ہے کہ مرزا صاحب میں بلاغت تسلیم کر لینے کے اسباب و قرائن بھی ہیں یا نہیں؟

اگر مؤلف المیزان کا یہ منشا ہے کہ مرزا دبیر ان لوگوں سے تھے جو سوچ تو اچھا لیتے ہیں مگر طرزِ ادا میں اپاہج تھے۔ تب بھی شبلی کے مقابلہ میں کلام کیا جاسکتا تھا۔ مگر جب کہ ان کا منشا محض الجھن میں ڈالنا اور الجھن میں پڑنا ہے تو اس پر التفات کی چنداں ضرورت نہیں معلوم ہوتی۔

جہاں تک اعلیٰ درجۂ بلاغت کا تعلق ہے وہ اعلیٰ درجۂ فصاحت میں منحصر ہے جبکہ بلاغت مطلق کے لئے فصاحتِ مطلق کی قید ہے تو اعلیٰ رتبۂ بلاغت میں ادنیٰ قسم کی فصاحت کا مان لینا محض فن کو بدنام کرنا ہے جبکہ ایسے بلیغ کا پایا جانا ناممکن بھی نہو جو اعلیٰ رتبہ کی بلاغت کے ساتھ اسی مرتبہ کا فصیح بھی ہو۔

ضرب المثل والوں کا عقیدہ اس ضرب المثل سے جو کچھ سمجھا جاتا ہے وہ شبلی نے بالکل ٹھیک بیان کردیا۔ تنقیح و تنقید سے بھی یہی ثابت ہوا کہ ضرب المثل والے جمہور اس فرضی بلاغت کا مرزا صاحب کو مالک سمجھتے ہیں جس کے نام سے اہلِ فن واقف بھی نہیں۔

نیز یہ کہہ کر بھی علامہ شبلی نے حقیقت کی ترجمانی کی ہے کہ بلاغت زیادہ ہوگی تو فصاحت بھی زیادہ ہوگی

اگرچہ یہ ممکن ہے کہ زیادہ بلاغت والا کم فصیح بھی ہو مگر اعلیٰ درجہ کا بلیغ فصیح بھی اعلیٰ درجہ کا ہوگا۔ اب یہ فیصلہ باقی رہ جاتا ہے کہ مرزا صاحب میں بلاغت زیادہ ہے اور فصاحت کم۔

علامہ شبلی کا خیال ہے کہ حکم اکثریت پر لگایا جاتا ہے۔ مرزا صاحب کے ہاں بلاغت اس قدر کم ہے کہ گو پائی ہی نہیں جاتی اور فصاحت کا حال اس سے بھی بدتر۔

ابن خلدون نے جو مضمون کے متعلق غلطی ہے مولانا حالی نے مقدمہ شعر و شاعری میں اس کی معقول اصلاح کردی ہے۔ جہاں اُنھوں نے کہا ہے کہ پانی اگر بھاری یا ادھن ہے تو کسی پیالہ میں بھی اس کی قدر و قیمت نہ بڑھ سکے گی یا ایسے وقت وہ پلایا جائے جب کہ پیاس نہو۔

علامہ شبلی نے بلاغت کے بارے میں بعض ضروریات پر کافی روشنی ڈالی ہے باوجودیکہ وہ تسلیم کرتے ہیں کہ بلاغت کا تعلق کلمہ سے نہیں بلکہ کلام سے ہے۔ مگر جب کہ کلمہ جزوِ کلام ہوتا ہے تو بلاغت کا تعلق کلمہ سے بھی ہوتا ہے اور ضرور ہوتا ہے۔ کیا شبلی جیسے صاحبِ مطالعہ شخص کی نسبت یہ گمان ہوسکتا ہے کہ اُس نے مطول میں یہ عبارت نہ دیکھی ہوگی۔

الفصاحت یوصف بها المفرد یقال کلمۃٌ فصیحۃٌ والکلام یقال کلامٌ فصیحٌ والمتکلم یقال کاتبٌ شاعرٌ فصیحٌ والبلاغۃ یوصف بها الاخیران، الی الکلام والمتکلم فقط دون المفرد

یقال کلام بلیغ، ورجل بلیغ ولم یسمع کلمۃ" بلیغۃ مطول یا مختصر المعانی یہ عبارت اس کی نظر سے نہ گذری ہوگی۔

"البلاغت عبارۃ عن مطابقۃ الکلام الفصیح لمقتضی الحال وظاھر ان اعتبار المطابقۃ وعدمھا انما یکون باعتبار المعانی والاغراض التی یصاغ لھا الکلام لا باعتبار الالفاظ المفردۃ والکلم المجردۃ" (مختصر المعانی)

واقعہ یہ ہے کہ بعض مقلد ذہنیتیں ایسی ہوتی ہیں کہ جو کچھ اگلے لکھ گئے خواہ وہ صحیح لکھ گئے یا غلط اس سے سرمو تجاوز کرنا فرمانِ الٰہی سے انحراف سمجھتے ہیں مگر شبلی ان لوگوں میں سے نہیں ہے جن کے لئے ہر ادا یت قرآن کا حکم رکھتی ہے۔ بلکہ شبلی تو وہ شخص ہے جس نے سقراط وارسطو تک کی غلطیاں پکڑی ہیں اور قابل قبول اصلاحیں کی ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ اس مقام زیر بحث میں تو شبلی اساتذہ معانی و بیان کی مخالفت بھی نہیں کرتا بلکہ تصدیق کرتا ہے۔ البتہ ایسے نکتہ کا اظہار کرتا ہے جو اساتذہ معانی وبیان کے اصول سے مستنبط ہوتا ہے۔ مگر صاحب المیزان ہیں کہ مطول اور مختصر المعانی کے لفظوں سے دست وگریباں ہیں چنانچہ فرماتے ہیں۔

بحث میں مولف ایک موقع پر لکھتے ہیں "بلاغتِ الفاظ درحقیقت بلاغت کا ابتدائی درجہ ہے" اِس فقرہ میں انھوں نے بلاغت کا تعلق الفاظ سے ابتدائی درجہ میں تسلیم کیا ہے۔ پھر آگے موازنہ کے صفحہ ۶۰ پر جہاں وہ میر صاحب کے اس مصرعہ کی بلاغت کا اظہار کرتے ہیں، ع

اک ذرا غور سے دیکھو تو یہ سرکس کا ہے

لکھا ہے کہ ذرا کا لفظ اور زیادہ بلیغ ہے۔ اس فقرہ میں اُنھوں نے لفظ کو بلیغ تحریر فرمایا ہے۔ حالانکہ یہ صحیح نہیں، علمائے معانی نے تصریح کر دی ہے کہ بلاغت کلمہ کی صفت نہیں ہوتی۔"

آگے چل کر علامہ شبلی پر اعتراض کرتے ہوئے آپ تحریر فرماتے ہیں۔

"اس سے معلوم ہوا کہ ان کی رائے میں الفاظ کی بلاغت بحیثیت لفظ وصوت اور معانی کی بلاغت بحیثیت مضمون دو علیحدہ علیحدہ چیزیں ہیں، سمجھ میں نہیں آتا، بلاغت الفاظ بدون لحاظ بلاغت معانی کیونکر پیدا ہوگی۔" المیزان صفحہ ۹۳

کسی چیز کا سمجھ میں نہ آنا کوئی عیب نہیں ہے۔ البتہ بغیر سمجھے اعتراض کرنا خود محل اعتراض ہے۔ بلاغت لفظ کی حقیقت پیش کی جا چکی۔ مزید وضاحت کی غرض سے ایک اور انداز سے پیش کی جاتی ہے۔

کسی بھی مجرد لفظ میں صوت وتلفظ کے اعتبار سے یہ صلاحیت نہیں ہوتی کہ وہ کسی جملہ کا فاعل یا مفعول یا مبتدا یا خبر ہو سکے۔ مگر جب کوئی لفظ جزو جملہ ہوگا تو باعتبار جزو جملہ ہونے کے بلاشبہ لفظ ہی فاعل، مفعول، مبتدا، خبر ہوگا۔ مثلاً لفظ حسن مجرد بجائے خود نہ فاعل ہے نہ مفعول نہ مبتدا ہے نہ خبر، کچھ بھی نہیں ہو سکتا مگر حسب ذیل جملوں میں

(۱) حسن شاعر ہے

(۲) عالم حسن ہے

(۳) حسن شعر کہتا ہے

(۴) خالد حسن کو بلاتا ہے۔

لفظ حسن بالترتیب مبتدا، خبر، فاعل، مفعول واقع ہوا ہے۔

تنہا سپاہی کو فوج نہیں کہہ سکتے۔ مگر کچھ شبہ نہیں کہ فوج بغیر سپاہی کے متصور نہیں ہو سکتی، اس لئے یہ بات بالبداہت سمجھ میں آتی ہے کہ سپاہی ہی فوج کی حقیقت اور فوج کا جزو ہے۔

یہی حال کلمہ کی بلاغت کا ہے۔ کوئی مجرد کلمہ محض بلحاظ تلفظ وصوت بلیغ یا غیر بلیغ نہیں کہا جا سکتا، کیونکہ اس پر حسب حال ومقام ہونے کا اطلاق نہیں ہو سکتا۔ البتہ ہر لفظ میں ...... یہ صلاحیت موجود ہے کہ حال ومقام کی مناسبت سے استعمال میں آسکے۔ اور حال ومقام کی رعایت کو معناً قبول کر سکے اس لئے جب کوئی لفظ جملہ میں استعمال کیا جائے گا تو جزو جملہ ہونے کے اعتبار سے اس پر بلیغ یا غیر بلیغ کا اطلاق قطعاً بلاشبہ درست ہوگا، کیونکہ جملہ ایک ایسا کل ہے جو اجزائے جملہ سے متشکل ہوتا ہے۔ پس جبکہ بلاغت کلام کی یعنی مجموع کی صفت ہوتی ہے تو یہ کیسے ممکن ہے کہ باعتبار و بلحاظ مجموع اجزائے مجموع اس کے اطلاق سے اس وقت بھی خارج ہوں جب کہ وہ مجموع کی حقیقت ہوں اور وجود مجموع ہی بغیر ان اجزا کے متصور نہ ہو۔

اگر بالفرض ایسا مان بھی لیا جائے کہ بلاغت کا تعلق کسی حالت میں بھی لفظ سے ممکن نہیں ہے خواہ جزو جملہ ہی کیوں نہ ہو، تو یہ ایک بالکل نیا اور انوکھا اجتہاد ہوگا اور خلاف واقع بھی۔ کیونکہ مختصر المعانی میں ہے "لا باعتبار الالفاظ

المفردۃ والکلم المجردۃ جس کا صاف مطلب یہ ہے کہ مفرد لفظ یا مجرد کلمہ بلیغ نہیں ہوسکتا۔ اس سے یہ امتناع پیدا ہی نہیں ہوتا کہ لفظ ایسی صورت میں بھی بلیغ نہیں ہوسکتا۔ جب وہ مفرد و مجرد نہ ہو اور جزو جملہ ہو۔

اس کے علاوہ اگر لفظ موضوع جزو جملہ ہونے کی حالت میں بھی بلیغ نہیں ہوسکتا تو کلمۂ مہمل و موضوع میں کیا فرق رہجاتا ہے۔

واقعہ وہی ہے جو سابق میں پیش کیا جا چکا۔ یعنی بلاغت الفاظ در اصل بلاغت کا ابتدائی درجہ ہے۔ اسی لئے علم معانی میں یہ بتایا جاتا ہے کہ کہاں جملہ میں مبتدا مذکور ہو کہاں محذوف۔ کہاں وصل ہو کہاں فصل، کہاں انشا ہو کہاں خبر، اور ظاہر ہے کہ وصل و فصل، مبتدا و خبر، خبر و انشا بغیر لفظ کے متصور نہیں ہوسکتے۔ گویا ان تمام صورتوں کا تعلق مجرد الفاظ کے استعمال سے ہے، ان کے معانی مخصوصہ و محدودہ کے اعتبار سے۔ اور یہ بلاغت کا بالکل ابتدائی درجہ ہے مفرد اور بسیط صورتوں میں جملہ کی تشکیل، الفاظ کے قبول بلاغت کی بالکل ابتدائی صورت ہے دوسرے لفظوں میں بلاغت ہی یہ بتاتی ہے کہ کس لفظ کو کس مقام پر کس حالت میں استعمال کرنا چاہیئے۔

بلاغت کا صحیح محل استعمال وہ ہے جب مفرد اور بسیط جملے بحیثیت جزو استعمال کئے جائیں کسی ایسی حالت کے بیان میں جو مرکب ہو چند در چند واقعات سے، ایسی حالت میں وہ جملے جن کی تعبیر و تشکیل کی رہنمائی علم معانی نے کی ہے محض بمنزلۂ الفاظ مفرد و کلمۂ مجرد کے ہوتے ہیں اور تمام حالت کا جزو ہونے کی حیثیت سے خود مجموعۂ کلمات بلکہ کلام ہونے کے باوجود حکم کلمہ مفرد میں داخل ہوتے۔ مثلاً ع

چمکی ادھی تو برق پکاری کہ الاماں :

یہ ایک جملہ ہے اور مرکب ہے اصل میں دو جملوں سے، جن میں ایک شرط اور دوسرا جزا ہے۔ مگر جملہ واحد ہونے کے لحاظ سے اس کا کچھ نہ کچھ تعلق بلاغت سے فرض کیا جاسکتا ہے یا حقیقی معنوں میں ہوسکتا ہے۔ حالانکہ مجرد اسی جملہ کے لحاظ سے اس جملہ کو بلیغ یا غیر بلیغ کہنا مشکل ہے، جس طرح کسی لفظ کو۔ مگر ادھی کے چمکنے کو برق سے کچھ نہ کچھ مناسبت ہے اس لئے اس کی معنویت پر کچھ نہ کچھ روشنی پڑتی ہے۔ مگر لفظوں سے یہ پتہ نہیں چلتا کہ قائل کا منشا اسی جملہ سے کیا ہے اور صحت و کذب کا امکان خبر میں مسلم ہے وہ الگ شبہ پیدا کرتا ہے کہ معلوم نہیں ادھی کے بیان میں خود فاعل صحیح بھی کہہ رہا ہے یا نہیں۔ الغرض جملۂ مرقومہ بالا پر یہ حکم نہیں لگایا جاسکتا کہ یہ حسب حال و مقام واقع ہوا ہے یا نہیں۔

لیکن اگر اسی جملہ کو اسی بند کا جزو ہونے کی حیثیت سے دیکھا جائے۔

یہ کہہ کے اپنے چھوٹے سے نیزے کو دی تکاں
چمکی ادھی تو برق پکاری کہ الاماں
اک بند باندھ کر جو فرس سے کہا کہ ہاں
ڈانڈ آئی ڈانڈ پر تو سناں سے لڑی سناں
بل کیا کرے کہ زور ہی موذی کا گھٹ گیا
غل تھا کہ اژدہے سے وہ افعی لپٹ گیا

تو قائل کا منشا صاف سمجھ میں آجاتا ہے اور ثابت ہوجاتا ہے کہ جملۂ مرقومہ بالا حال و مقام کی مناسبت سے استعمال کیا گیا ہے اس لئے نہایت بلیغ ہے،

یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ معنویت اور چیز ہے اور بلاغت اور چیز ہے، معنویت سے کوئی بھی لفظ موضوع مفرد و مجرد خالی نہیں ہے۔ مگر وہ مفید بلاغت نہیں تاوقتیکہ جز کلام نہ ہو۔ اسی طرح ہر وہ جملہ جس کی تعبیر علم معانی بتاتا ہے۔ ہمیشہ ہمیشہ مفید بلاغت نہیں۔ بلکہ صرف بلاغت کے ابتدائی مرتبہ میں ان کو بلیغ کہا جائے گا اور یہ بلاغت کسی حیثیت سے الفاظ کی بلاغت سے باہر نہیں کہی جاسکتی۔

چونکہ یہ ایک دقیق اور فلسفیانہ بحث ہے۔ اسلئے مقام کے لحاظ سے اسی پر اکتفا کی جاتی ہے۔ ورنہ ابتدائی بلاغت جو الفاظ ہی کی بلاغت ہے باعتبار واقعہ جس طرح علامہ شبلی نے کلام کیا ایک خاص موضوع بحث ہے جس پر بہت کچھ اصولی روشنی ڈالنے کی ضرورت ہے۔ مگر حسب ضرورت مقام اس موضوع پر اجمالاً کافی روشنی ڈالی جاچکی اور یہ امر اصولاً ثابت ہوچکا کہ بلاغت کا تعلق لفظ سے بھی ہے جبکہ وہ جزو کلام ہو جیسے کہ ع

اک ذرا غور سے دیکھو تو یہ سر کس کا ہے :

میں لفظ "ذرا" نہ صرف بلیغ بلکہ بلاغت کی جان ہے۔

بلاغت کی مزید وضاحت کرتے ہوئے علامہ شبلی لکھتے ہیں۔

" اس قسم کے واقعات کے بیان کرنے میں بلاغت کا پہلا فرض یہ ہے کہ جو واقعہ فرض کیا جائے وہ ایسا ہو کہ وقت اور حالت کے لحاظ سے اس کا واقع ہونا یقینی ہونے کے برابر ہو۔ اس کے ساتھ واقعہ کے جزئیات اور کیفیات جو بیان کئے جائیں وہ بالکل مقتضائے حال کے موافق ہوں

اور اس طرح بیان کئے جائیں کہ واقعہ کی صورت آنکھوں میں پھر جائے۔

یہاں شبلی نے اس کمی کو پورا کرنے کی کوشش کی ہے جو اس نے کتبِ معانی و بیان میں پائی ہے اور ایک نمونہ پیش کرنے کا ارادہ کیا ہے جس سے خام اذہان یہ سمجھ سکیں کہ متداول علم معانی و بیان میں کس قسم کے اضافہ کی ضرورت ہے۔ چنانچہ عبارت مرقومۂ بالا ہی کے سلسلہ میں اس طرح اضافہ ہوتا ہے:

"اس نکتہ کی حقیقت ایک مثال سے زیادہ واضح ہوگئی ہے مرزا دبیر صاحب نے ایک مرثیہ میں یہ واقعہ باندھا ہے کہ جب حضرت علی اکبر جوان ہوئے تو جا بجا ان کے حسن و جمال کا شہرہ ہوا۔ یہاں تک کہ بادشاہانِ وقت نے اپنے اپنے ملک سے مصور بھیجے کہ ان کی تصویر کھینچکر لائیں۔ حلب کا بادشاہ سب سے زیادہ مشتاق ہوا......"

اس کے بعد شبلی نے شاہِ حلب کی دختر کا واقعہ نقل کیا ہے، اور لکھا ہے کہ صرف نسبت ہوئی تھی نکاح نہیں ہوا تھا کہ کربلا کا واقعہ پیش آگیا اور حضرت علی اکبر شہید ہوگئے۔

شاہِ حلب اس خبر کو سنکر کربلا پہنچا جہاں اس کی غیر مخطوبہ و غیر منکوحہ لڑکی نے حضرت علی اکبر کی لاش پر نوحہ میں اپنے جذبات کا اظہار جس طرح کیا ہے حضرت دبیر اس کی تصویر یوں کھینچتے ہیں۔

آئی ہوں گھر سے بال پریشاں کئے ہوئے
دولہا اُٹھو کھڑی ہے دلہن سر لئے ہوئے

دولہا تمہاری بے وطنی پر نثار میں　　دولہا تمہاری بے کفنی پر نثار میں
دولہا تمہاری خستہ تنی پر نثار میں　　دولہا تمہاری کم سخنی پر نثار میں

مردہ کا ذکر کرتے ہیں سب شور و شین میں
ہے ہے بیاں تمہارے کروں کیا میں بین میں

خو بو سے مطلع نہیں میں سوختہ جگر　　ہے ہے میں اپنے گھر سے نہ آئی تمہارے گھر
نتھ چوڑیاں پہنے نہ پائی میں نوحہ گر　　جو آج ٹھنڈا کرتی ہیں صاحب کی لاش پر

حسرت ہی عقد کی رہی لونڈی کے باپ کو
ہے ہے بندھا نہ سہرا جو بخشوں میں آپ کو

دولہا میں ننگے سر ہوں مجھے تم ردا اُڑھاؤ　　دولہا کہاں میں بیٹھوں ٹھکانہ مجھے بتاؤ
دولہا مجھے بھی فاطمہ کے پاس لیتے جاؤ　　دولہا برابر اپنے مری قبر بھی بناؤ

دولہا مقام شرم ہے در در نہ پھرنے دو
پردہ دولہن کا رکھ لو کھلے سر نہ پھرنے دو

"مرزا صاحب نے اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ فرضی عروس کی زبانی ایک بڑا نوحہ الگ لکھکر مرثیہ کے ساتھ بطور ضمیمہ کے شامل کیا ہے جس کا مطلع یہ ہے۔

کس عادل و منصف کی میں دوں رو کے دوہائی، ہے ہے مرے نوشاہ
سنتی ہے دولہن شکل رنڈاپے نے دکھائی، ہے ہے مرے نوشاہ

یہ تمام واقعہ بالکل بلاغت اور مقتضائے حال کے خلاف ہے۔ تمام باتوں سے قطع نظر کرکے کنواری لڑکی کا بین اور نوحہ کرنا جو خود کہتی ہے کہ میں اُنکے عقد میں نہیں آئی اور پھر دولہا دولہا پکارتی ہے کس قدر بے معنی اور لغو ہے؟" موازنہ صہ ۱۵

مولف المیزان کی استقامت طبع اور رسم و رواج شرفا کے وقوف نے علامہ شبلی کے فیصلہ کو قائم رکھا ہے، مولف موصوف نے یہ تسلیم کیا ہے کہ نوحہ میں بعض لفظ ایسے آگئے ہیں جن پر سنجیدہ نگاہیں اُٹھتی ہیں اور صفائی پیش کی ہے کہ مرثیہ گو لوگوں کو ایسے واقعات سے چارہ نہیں ہے۔ چنانچہ جناب کبریٰ کی نسبت آپ نے ظاہر کیا ہے کہ وہ ایک ہی رات کی بیاہی ہوئی تھیں مگر انھوں نے حضرت قاسم اپنے شوہر پر نوحہ کیا جس کو ہندوستانی شرفا کے رسم و رواج بنظر استحسان نہیں دیکھتے۔

یہ استدلال بالکل درست اور قابل قبول ہے، غلطی غلطی ہی ہے خواہ اس کے وقوع کے اسباب کچھ بھی ہوں۔ مگر میر صاحب اور مرزا صاحب میں پھر بھی ایک نازک سا فرق ہے۔ یعنی حضرت کبریٰ منکوحہ و مخطوبہ ہیں اور دختر شاہِ حلب محض منسوبہ نکاح و خطبہ کی نوبت ہی نہیں آئی۔

اس کے علاوہ شبلی نے جو بند حضرت انیس کے پیش کئے ہیں اُن کو ملحوظ رکھنے میں مولف المیزان کا اعتراض دفع ہو جاتا ہے۔

اس مقام پر ایک امر قابل توجہ ہے علامہ شبلی نے موازنہ میں کہیں بیان کیا ہے کہ تمام مرثیہ گو شعرا نے اہل بیت نبوی کے رسم و رواج، عادات و اخلاق کو شرفائے ہند کی طرح فرض کیا ہے۔ چنانچہ اس کی تائید میں مولف المیزان شاہ حلب کی دختر کے بین کے متعلق فرماتے ہیں۔

"لیکن چونکہ مرثیہ گویوں نے تمام واقعات کو رسوم عرب کے موافق نہیں۔ بلکہ رسم و رواج ہند کے مطابق نظم کیا ہے، اس لئے بلحاظ رسوم ہند

روایت میں ہیں کے چند الفاظ کسی قدر نگاہوں میں کھٹکتے ہیں........ البتہ چند الفاظ جن کا ہیں کے موقع پر استعمال کیا گیا ہے وہ علما نا رسومِ ہند ستبعد معلوم ہوتے ہیں۔" صفحہ ۹۶ المیزان

مگر مرثیہ گویوں کی اسی پابندی کے متعلق مولف حیاتِ دبیر کا اجتہاد قابلِ ملاحظہ۔

"اب یہ بھی حسن جلئے کہ جو کلیہ مولوی صاحب نے قائم کیا ہے کہ تمام مرثیہ گویوں نے عادات و رسوم نسواں شرفائے ہند کے موافق عادات اہلِ حرم کو فرض کیا ہے۔ یہ بھی غلط ہے۔ مرثیہ گویوں نے اور خصوصاً مرزا صاحب کہیں رسومِ ہند کے موافق اور کہیں رواجِ عرب کے مطابق تخئیل فرمائی ہے۔"

حیاتِ دبیر صفحہ ۱۴۴

سبحان اللہ! گویا مرزا صاحب کی روشِ مرثیہ نگاری میں ہمواری بھی نہیں ہے، کبھی آپ ہندی ہوتے ہیں اور کبھی عرب، مگر ہم جنابِ دبیر کو اس سے بالاتر سمجھتے ہیں اور مولف حیاتِ دبیر کی غلط طرفداری کو نادان کی دوستی سمجھتے ہیں۔

فصاحت و بلاغت، و قایق علمیہ ہیں اور نہایت شفاف ذہن اور اعلیٰ ادراک چاہتے ہیں، ان کے سمجھنے کے لئے حکیمانہ دل و دماغ کی ضرورت ہے تاکہ انسان بات سے بات نکال سکے ورنہ لکیر کا فقیر رہا تو بڑا مقلد اور اندھا مینا ہے۔ اس لئے ان بحثوں میں حصہ لینا دقتوں میں پڑنا ہے۔ البتہ تنقید شعران بحثوں کے مقابلہ میں ذرا آسان سا چیز ہے۔ اس لئے ہر شخص بہت جلد شاعر ہو جاتا ہے اور میزان منشعب صرف میر اور کافیہ پڑھتے ہی عربی کا منتہی ہو جاتا ہے اور پھر بے سوچے سمجھے تنقید کرنا اپنا فرض حیات سمجھنے لگتا ہے۔ اس قسم کی تنقید کی مکمل مثال المیزان اور حیاتِ دبیر کا باب آخر ہے۔

تنقید جس قدر عام ہے اس سے کہیں زیادہ دشوار ہے۔ افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ شبلی، حالی، اور آزاد کی تالیفات کے بعد آج تک تنقید کی کوئی کتاب نظر سے نہیں گزری البتہ "ہماری شاعری" مولفہ سید مسعود حسن صاحب رضوی ادیب کو اس سے مستثنیٰ سمجھنا چاہئے۔ تنقیدی مضامین جو رسائل میں نکلتے رہتے ہیں ثابت کرتے ہیں کہ جن بیدھڑک دماغوں کی وہ پیداوار ہیں ان میں نقصِ علم نے بیبا کی پیدا کی ہے نہ کہ پیری علم نے۔

علم کے علاوہ ایک فطری چیز وجدانِ صحیح ہے جس کی تعبیر اگرچہ علم کرتا ہے مگر حقیقتہً عطیہ فطرت ہے آج کیاب نہیں بلکہ نایاب ہے۔

شبلی کے وجدانِ صحیح اور ذوقِ سلیم کی شہادت میں "شعر العجم"، "موازنۂ انیس و دبیر" پیش کی جا سکتی ہیں جو ناقابلِ استرداد شہادتیں ہیں اب اگر شبلی کو دنیا کا بڑے سے بڑا آدمی بھی بدمذاق کہے تو وہ خود نظر سے گر جائے گا اور ادنیٰ سے ادنیٰ آدمی اس کی تائید و ہمنوائی سے خوش مذاقوں میں شمار کیا جانے لگے گا۔

شبلی کے اصولِ تنقید کا ایک معمولی کرشمہ یہ ہے کہ انیس و دبیر کے موازنہ میں اس کی حیثیت ایک ادیب نقاد سے آگے نہیں بڑھتی۔ برخلاف المیزان، اور حیاتِ دبیر کے مولفوں کے کہ ان تالیفات میں ان کی حیثیت ادیب و ناقد کی نہیں ہے اور سب کچھ ہے۔

دونوں مذکورہ تالیفوں کو دیکھئے! صاف معلوم ہوتا ہے کہ ایک نہایت زبردست پابند خصوصیاتِ مذہب تشیع اپنے فرائض کی تبلیغ کر رہا ہے اور جس کو فرض کر لیتا ہے کہ فلاں میرے خلاف ہے اسی پر گالیوں کی اڑ ور وہاں توپیں داغنا شروع کر دیتا ہے۔ غرض یہ ہے کہ المیزان اور حیاتِ دبیر دراصل موازنۂ انیس و دبیر کا جواب نہیں ہیں بلکہ بزعم خود "اثنا عشریہ" کی زبردست تردید ہے۔

اگر ملک کے ریسرچ کرنے والے کسی طرح میر انیس کو سنی ثابت کر دیں تو یہ دونوں تالیفیں ٹھکانے لگ جائیں اور سب گالیاں وصول ہو جائیں۔

فرض کیجئے کہ انیس و دبیر دو امامانِ وقت ہیں اور تمام شیعوں پر ان کی پیروی فرض، تو ایسی حالت میں اگر ان کے طریقہ، ان کے مذہب ان کے خاندان یا ان کی تعلیم کی برائی کی جائے تو برائی کرنے والا کافر، دل آزار، انسانیت سے نابلد۔ اخلاق کا دشمن، مگر جب ان الوہیت آلودہ جہتوں سے کوئی تعلق ہی نہ رہے۔ اور اس چیز کے متعلق گفتگو کرے جس میں ملک کے ۷ ۳ کروڑ انسان اشتراک رکھتے ہیں تو انکی شانِ تقدیس میں ٹھیس نہیں لگ سکتی اور اگر ان کی شانِ مقدس اتنی نازک ہے کہ اس نسبت سے بھی متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتی تو ہمیں جرأت کے ساتھ اس کی کچھ پروا نہیں کرنی چاہئے۔

انیس و دبیر خواہ کتنے ہی مقتدر مجتہد یا مدعانِ امام ہوں ہم اس کے متعلق کوئی ایسی بات زبان سے نکالنے کو تیار نہیں ہیں جن سے معتقدان ہر دو ممدوح کے عقائد کو ٹھیس لگے البتہ شعر و شاعری سے جو ان کو نسبت ہے

اس میں ان کو نہیں بخشا جا سکتا۔

شعر و شاعری کا میدان مذہب سے بالکل الگ ہے۔ فرض کیجئے اگر کسی جگہ موضوعِ شاعری مذہب ہے تو ادبیات میں بھی وہ قابلِ احترام ہے اس موضوع پر کچھ کہنا خلافِ فرض ہوگا۔ البتہ اس موضوع کا ذریعۂ اظہار یعنی موضوع لہٗ شاعری پر مخالف و موافق رائے کا اظہار ادیب و ناقد کا فرضِ اولین ہے۔ زبان اور ادبیات پر ہر قسم کی تنقید کرنا فرضِ نقادی سے سبکدوش ہونا ہے۔

ایسے بزرگوں کو یا تو اردو زبان سے بالخصوص شعر و شاعری سے تعلق ہی نہیں رکھنا چاہیئے تھا اور اگر تعلق پیدا کر لیا ہے تو تنقید پر اُن کے معتقدوں کو یہ ہرگز ہرگز کہنے کا حق حاصل نہیں ہے کہ شبلی نے ہمارے جذباتِ مذہبی کو صدمہ پہنچایا۔

جب آپ کا مذہب بے انتہا وسعت کے ساتھ اتنا نازک واقع ہوا ہے کہ صرف ادیبانہ گرفتوں سے چکنا چور ہوا جاتا ہے تو آپ کو چاہیئے کہ آپ اس کو اتنا سمیٹ لیں کہ وہ ان تمام جہات سے غیر متعلق ہو جائے جن سے عوام الناس کو تعلق ہے۔

خیر یہ معاملہ تو مذہب کا تھا اب ذرا ادبی نقطۂ نظر سے دیکھنا چاہیئے کہ ان بزرگوں کو جو شبلی کی بد مذاقی کی شکایت ہے وہ صحیح ہے یا غلط۔ المیزان اور حیاتِ دبیر دونوں کتابوں میں شبلی کی متفقہ تردید کی گئی ہے۔ ہم بعض ایسے مقامات پیش کرکے بتانا چاہتے ہیں کہ شبلی کے متعلق شکایت درست بھی ہے یا نہیں۔ موازنہ میں ہے۔

حامی جو سلیمانِ دو عالم نظر آئے　　مضمون جو عنقا تھے وہ پر جوڑ کے آئے
طاؤس تصور کی طرح دل میں در آئے　　شیشہ میں پری زاد معانی اُتر آئے

یاقوت بدخشاں سے در آتے ہیں مدح کے
لعل اُگلوں گا میں طائرِ سدرہ کے دہن سے　　دبیر

"حضرت سلیمان کو عنقا سے کیا تعلق؟ تصور کی تشبیہ طاؤس سے کس بنا پر؟ اور پھر اس کے کیا معنی کہ عنقائے مضمون دل میں اس طرح اُتر آئے جس طرح طاؤسِ تصور دل میں اُترتا ہے۔ اگر تصور کے طاؤس ہونے کی بنا پر ہے تو مضمون کا عنقا خود دل میں اُتر سکتا ہے۔ طاؤس کی مشابہت کی کیا ضرورت ہے؟ شیپ میں عجب بے ربطی ہے۔ شاعر لعل اگلے گا۔ مگر طائرِ سدرہ کے دہن سے اگلیگا۔ اس کے کیا معنی؟ شاید اگلنے کو اگلوانے کے معنی میں لیا ہے؟ یا اپنے آپ کو طائرِ سدرہ قرار دیا ہے" (موازنہ)

قبل اس کے کہ ہم ان بزرگوں کے خیالات سے مستفید ہوں۔ یہ بات یاد دلانے کی ضرورت ہے کہ بلاغتِ کلام کے لئے اعتبارِ قرینہ کو ان بزرگوں نے بھی تسلیم کیا ہے جیسا کہ ہم المیزان سے نقل کر چکے مگر مزید یاد دہانی کے لئے جملہ جملہ مکرر نقل کئے دیتے ہیں اور مقام کی ضرورت کو تسلیم کر لیا جائے تو بعید از اطلاق ہوگا۔

• بلاغتِ کلام یہ ہے کہ کلام مقتضائے حال کے مطابق استعارات با قرائن کنایاتِ بلیغ ۔۔۔۔۔۔ سے آراستہ ہو۔ المیزان

اس حوالہ سے ہمارا مقصد صرف یہ یاد دلانا ہے کہ بلحاظ وجہ جامع کے مستعار منہ سے مستعار لہٗ کی طرف انتقالِ ذہن کے لئے قرینہ شرط ہے۔

نیز یہ امر بھی قابلِ لحاظ ہے کہ استعارہ سے غرض ہمیشہ دلالت کی وضاحت ہوتی ہے۔ اگر کوئی استعارہ یا تشبیہ جو کلام میں برتا گیا ہے بلحاظ دلالت مثلاً قائل کو واضح تر نہ کر سکے مہمل ہے۔ اس کی تصدیق کے لئے کتب معانی و بیان کو دیکھنا چاہیئے۔

اب شبلی کے بیان پر مولفِ المیزان کا اندازِ جواب ملاحظہ فرمائیے۔

"جواب سلیمانِ دو عالم سے مراد شاعر کے ممدوح ہیں۔ حضرت سلیمان کو جو نسبت دیو و پری، وحش و طیر سے ہے وہی تعلق عنقا سے ہے، کیونکہ وہ جن و انسان وحش و طیور کے بادشاہ تھے، بادشاہ کو جو تعلق اپنی رعایا سے ہوتا ہے وہی حضرت سلیمان کو عنقا سے ہے۔ تصور کی تشبیہ طاؤس سے اسی بنا پر جس بنا پر کہ شعرائے عجم کی تشبیہ طائرِ خیال کی تشبیہ مرغ سے، نظر کی عنقا سے دیا کرتے ہیں، جیسے متقدمین میں فیضی کے اس شعر میں ہے ؎

اے ورق رنگ و بوئے تو ز آغاز　　عنقائے نظر بلند پرواز"

بہت افسوس ہے کہ مولف کی سمجھ ایسی آسان بات سمجھنے سے قاصر رہی کہ عنقائے مضمون دل میں اس طرح اُتر آئے جس طرح، جیسے کہ طاؤسِ تصور دل میں اُترتا ہے۔ اگر جوشِ تعصب (جوشِ تعصب سنیت۔ رزمی) ذرا بھی غور کرنے کی مہلت دیتا تو اس کو نا ہی خیال کی نوبت نہ آتی۔ مدعا یہ ہے کہ جو بات مشکل سے مشکل تھی وہ آسان سے آسان طریقہ پر مجھکو حاصل ہو گئی۔ اس لئے کہ اول تو مضمون جس کا ملنا بہت دشوار، اور پھر مضمون کا بھی عنقا مضمون بڑی مشکل اور محنت سے شاعر کو ملتا ہے اور مضمون بھی وہ مضمون جو عنقا ہو اور کسی کو نہ ملا ہو،

کیا ایسے مضمون کا ہاتھ آجانا کوئی آسان بات ہے ؟ اب دوسری صورت دیکھئے
کہ طاؤس کثیر الحصول پرند ہر جگہ موجود ہوتا ہے ۔ بلند پرواز بھی نہیں ہے کہ اس
کا قابو میں لانا مشکل ہو ۔ نایاب بھی نہیں ہے کہ اس کی تلاش میں سرگردانی کرنی
پڑے ۔ پھر اس پر یہ آسانی کہ تصور کا طاؤس کسی شے کا تصور دل میں آجانا
ایسی آسان بات ہے کہ اس سے آسان تر کوئی بات ہو نہیں سکتی حتیٰ کہ انسان
کا دل کبھی تصور سے خالی ہی نہیں رہتا ۔ تلوار کی تعریف کے ایسے مضامین جو
کسی نے نہیں لکھے انسان کے ذہن میں ایسی آسانی کے ساتھ نہیں آسکتے تھے
جیسے تلوار کا تصور ۔ پس شعر کا یہ مطلب ہوا کہ مضامین کے عنقا جن کا ہاتھ آنا
بہت مشکل ہے میرے دل میں اس آسانی کے ساتھ اُتر آئے جیسے کہ تصور کا طاؤس ۔

"ٹیپ میں مطلق بے ربطی نہیں ہے ۔ مطلب شاعر کا یہ ہے کہ میں اپنے
دہن سے وہ لعل اگلونگا جو طائرِ سدرہ کے ہیں ، یعنی جو طائرِ سدرہ کے منہ سے
نکلے ہیں یعنی وہ مضامین منقبت و فضائل لکھوں گا جو حضرتِ جبریل کی معرفت
بذریعۂ وحی نازل ہوئے ہیں ۔ اس مصرع کے مخففات بریکٹ میں ظاہر کیا
جائے تو مطلب معلوم ہو جائے گا یعنی (اپنے) دہن سے (مدح اہلبیت کے وہ)
لعل اگلوں گا میں (جو) طائرِ سدرہ کے (منہ سے نکلے تھے) یہ مطلب بھی ہو سکتا
ہے کہ فضائلِ اہلبیت کے مضامین مداحانِ اہلبیت کے دل میں بذریعہ رُوح الامین
القا ہوتے ہیں جیسا کہ حضرت ابو عبداللہ سے منقول ہے قال ۔ قال نبینا
قائل بیت شعر حتی یؤید بروح القدس" یعنی حضرت نے فرمایا
ہماری منقبت میں کوئی شاعر شعر نہیں کہتا ۔ مگر یہ کہ روح القدس (جبریل علیہ السلام)
اس کی تائید کرتے ہیں ، پس ان فضائل کے لعل جو میرے دل میں بحیثیت مداح
اہلبیت حضرت جبرئیل نے القا کئے ہیں میں ان کو اپنی زبان سے ادا کروں گا"
(المیزان صفحہ ۵۳۴)

اب ذرا صبر کے ساتھ مولفِ حیاتِ دبیر کی محققِ طوسیانہ تحقیقات و
انکشافات سے مستفید ہونا چاہئے ۔ آپ نے شبلی کی عبارت مرقومہ نقل کی ہے
اور اس پر ۶ نمبر ڈالے ہیں اسی ترتیب سے آپ جواب لکھتے ہیں ، چنانچہ ارشاد
ہوتا ہے ۔

آپ ہر فقرہ کا جواب باصواب سنیئے ! (۱) حضرت سلیمان کو عنقا سے کیا
تعلق ہے ، اس کا جواب یہ ہے کہ اول تو ضرور نہیں کہ الفاظ میں گہرا تعلق ہو ، اور
جب الفاظ میں تعلق خاص ہوتا ہے تو شعرا اس کو مراعات النظیر یا رعایت لفظی کہتے
ہیں (سبحان اللہ کیا تحقیقات فرمائی ہے دنیا کی ایجادات میں مستقل اضافہ ہے
کیا مجال جو غیر شعرا اس کو مراعات النظیر کہہ سکیں ۔ رزمی) میر صاحب مرحوم کے
یہاں جابجا یہ گہرا رنگ دیکھکر مولوی صاحب جابجا اعتراض جا چکے اور کلام بے
اثر بتا چکے ، اب مرزا صاحب کے یہاں وہی تعلق ڈھونڈھتے ہیں ۔ مولوی صاحب
کو کسی پہلو قرار نہیں ہے اگر واقعی وہ ایسے تعلق کلام یا اُبھری ہوئی رعایت لفظی
کو ناپسند کرتے تھے اور انصاف سے موازنہ کرنے بیٹھے تھے تو کہیں کم سے کم
اتنا ہی لکھتے کہ مرزا صاحب مرحوم کے یہاں یہ گہرا رنگ کم ہے یا نہیں ہے ۔
اب مجھ سے سنئے ۔ مرزا صاحب نے صنعت رعایت لفظی کو کم برتا ہے (ماشاءاللہ!
اچھا ہوا احباب کی نظر سے مرزا دبیر کا کلام نہیں گزرا ۔ ورنہ آپ کو اپنے اجتہاد
پر افسوس ہوتا ۔ رزمی) یا یوں کہئے کہ جب تک بے تکلفی سے کوئی متناسب
لفظ (آپ کا مطلب مناسب سے ہے ۔ رزمی) نہیں آیا ہے اُنھوں نے نہیں
باندھا ہے ۔ اس کے وجوہ مفصل میں کتاب میں دوسرے موقع پر لکھ چکا ہوں ،
ان کو ہمیشہ یہ خیال رہتا تھا کہ الفاظ میں رعایت تعلق ایسا باریک ہو کہ غور کر
پر وہ سمجھ میں آئے ۔ یہاں بھی وہ باریک تعلق موجود ہے کہ حضرت سلیمان جن و بشر
وحش طیر کے بادشاہ تھے ۔ عنقا کل طائروں کا بادشاہ سمجھا جاتا ہے ۔ (تحقیقات ۔ رزمی)
با ایں ہمہ حضرت سلیمان کا مطیع ہے ۔ اب ایک باریک نکتہ زباندانی کا عرض کرتا
ہوں ، یہی وہ باتیں ہیں جن سے لغت کی باتیں خالی ہیں ، اور جب تک اہل زبان
نہ بتائیں ، یہ باتیں نہیں آسکتیں ، عنقا کے معنی اس موقع پر اس طائر کے نہیں
ہیں بلکہ یہاں عنقا کے معنی نایاب کے ہیں (واہ استاد زباندان کیا کہنے ہیں
قلم توڑ دئے ہیں ، وہ دادِ تحقیق دی ہے کہ محقق طوسی بغلیں جھانکنے لگ گیا ۔ اسی
کو قادر الکلام کہتے ہیں جو جی میں آتا ہے بے تکلف کہہ جاتے ہیں ، اُڑ گئے ہی نہیں
رزمی) یہ روزمرہ ہے (قطعاً ۔ اسے جو روزمرہ نہ سمجھے وہ گھامڑ اہل زبان
نہیں ۔ رزمی) کہ وہ چیز آج کل عنقا ہے یعنی نایاب ہے (کیا بات ہے ، حق
استادی ادا کیا ہے ، اور شبلی غریب کو تو یہ معنی معلوم ہی نہیں ہوئے جب
تک آپ نے یہ الہام نہ فرمایا ۔ رزمی) پس انہی معنی پر مرزا مرحوم کہتے ہیں کہ
جب سلیمانِ دو عالم (امام حسین علیہ السلام) میرے حامی ہوگئے تو جو مضمون
نایاب تھے وہ پر جوڑ کر آئے (مضمون مضمون میں جو پر جوڑے ۔ اسی کو بے پر
کی اُڑانا کہتے ہیں ۔ رزمی) پر جوڑ کر آنے کے مضمون میں بھی ایک اعلیٰ درجہ کی
بلاغت ہے ۔ وہ یہ ہے کہ طائر ہمیشہ اپنے اصلی مقام و مسکن پر ، پر جوڑ کر

ٹوٹ پڑتا ہے۔ پر جوڑ کر اترنے سے مطلب شدت سرعت سے ہے۔ مولوی صاحب! میرے معروضہ کی تصدیق منظور ہو تو کسی ایسے مقام پر تھوڑی دیر کے لئے تشریف لے چلئے جہاں کبوتر اُڑتے ہوں اور اپنی آنکھوں سے کبوتروں کو ان کے مقام پر پر جوڑ کر آتے ہوئے دیکھ لیجئے۔ مرزا مرحوم اسی مضمون کو ادا کر رہے ہیں کہ مضامین میرے گھر کو اپنا اصلی مسکن سمجھکر آتے ہیں۔ اب دوسری بات سنئے (پہلی بات تو نہایت پر مغز اور من بھر من سے ساڑھے انتالیس لغویت، باقی سب بات ہی بات بلکہ خالص بات نکلی۔ رزمی) (۲) طاؤس تصور کی طرح دل میں در آئے، طاؤس تصور ایک ایسا استعارہ لطیف ہے (ماشا اللہ کیوں نہو، شبلی بیچارہ تشبیہ اور استعارے کا فرق کیا جانے وہ تو یہ کہئے کہ جناب نے تعلیم فرمایا ہے۔ رزمی) یعنی مضامین دل میں اس طرح بے تکلف آگئے جیسے تصور آتا ہے۔ طاؤس ایک خوش رنگ خوش وضع طائر ہوتا ہے (انگریزوں کو خبر دینی چاہیئے، انکی تحقیقات ہے۔ رزمی) اس لئے اس قسم کے استعارے شعرا نظم کرتے آئے ہیں۔ چنانچہ حمد میں حکیم فیضی کا مشہور شعر ہے۔

اسے در تگ و پوئے تو ز آغاز — عنقائے نظر بلند پرواز

طاؤس بھی رنگین ہوتا ہے، مضمون بھی رنگین ہوتا ہے۔ اس لئے اس کو طاؤس تصور سے استعارہ کرکے تشبیہ دی ہے۔ (بلکہ استعارہ کرکے تشبیہ دیتے ہوئے مجازاً کنایہ میں اشارہ کیا ہے۔ سبحان اللہ کیا بیان فہمی اور معانی دانی ہے اور کیا عبارت۔ رزمی) جو کمال بلاغت کی دلیل ہے۔ طاؤس جس وقت باغ میں یا کسی اور مقام پر دیوار (خواہ وہاں دیوار ہائی بھی نہ جائے۔ خاص چھت یا درخت سے نہیں بلکہ خاص دیوار سے۔ رزمی) سے اترتا ہے تو اچھا معلوم ہوتا ہے۔ سبحان اللہ کیا کیا بلاغت کے پہاڑ ڈھائے جا رہے ہیں۔ رزمی)

اس کے بعد آپ نے چوتھے مصرع کے متعلق بہت کچھ گوہر افشانی فرمائی ہے۔ مگر چونکہ وہ خارج بحث ہے اس لئے باوجود دلچسپ ہونے کے قلم انداز کرنا پڑا۔ مگر پھر لکھتے ہیں۔

"ٹیپ کو لیجئے جس کو مولوی صاحب اپنی خوش فہمی سے بے ربط بتا رہے ہیں، ٹیپ واقعی دقیق اور قصہ طلب ہے (یا اللہ خیر۔ رزمی) مرزا صاحب کا شعر ہے

یاقوت بدخشاں سے دُر آتے ہیں عدن سے — لعل الگو لگا ہیں طوطیٔ سدرہ کے دہن سے

سخت حیرانی تھی کہ ٹیپ میں کیا تلمیح ہے اور شعر قصہ طلب کیسے ہے مگر جب باوجود غور کے سمجھ میں نہ آیا تو مطالعہ اور آگے کرنا پڑا جس سے آپ کے شدت علم علم اللہ تبحر لاعلمی پر اور بھی زیادہ تعجب ہوا۔ آپنے شعر و ادب کو چھوڑ کر یکایک محدثانہ جامہ پہن لیا ہے اور ایک نہایت طویل بیان دیا ہے جس میں ایک بڑی لمبی حدیث مع اسناد نقل کی ہے اور نتیجہ وہی نکالا ہے جو صاحب المیزان نے اخذ کیا ہے۔ آپ نے کسی شاعر دعبل خزاعی نامی کا ذکر کیا ہے اور بیان کیا ہے کہ مداحان اہلبیت کی زبان سے وہی نکلتا ہے جو حضرت جبریل ان پر القا کرتے ہیں۔ اس کے بعد آپ پھر شبلی کے بیان کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔

"اس قصہ کی طرف (جو اس زمانے کے اہل علم میں مشہور تھا) مرزا صاحب نے اس مصرع میں اشارہ کیا ہے (لعل الگو لگا ہیں طوطیٔ سدرہ کے دہن سے) سدرۃ المنتہیٰ کے نیچے حضرت جبریل کا مقام مشہور ہے۔ اس لئے حضرت جبریل کو (جن کا نام روح القدس اور روح الامین بھی ہے) (ماشاء اللہ کیا کیا افادہ فرما رہے ہیں۔ ایسی ایسی باتیں بنائی جا رہی ہیں جن سے صرف اہل زبان ہی واقف ہیں۔ رزمی) طوطی سدرہ بھی کہتے ہیں۔ مطلب مرزا صاحب کا یہ ہے کہ جبریل مداحی محمدؐ و آل محمدؐ میں میری زبان پر ناطق و گویا ہوں گے۔ ناظرین (اب ذرا ریشہ خطمیت ملاحظہ ہو۔ رزمی) آپ کو اس موقع پر مولوی شبلی صاحب کا شکر گزار ہونا چاہیئے کہ نہ وہ ایسے الٹے پلٹے استفہامیہ اعتراض فرماتے نہ میں اس طرح ہندی کی چندی کرکے سمجھاتا" حیات دبیر صفحہ ۵۳۶

غرض یہ ہے کہ آپ کا قلم رُکنا تو جانتا ہی نہیں ہے، چلا تو بس چلا، اب کس کے بس کا ہے! چنانچہ سات سو دو صفحات سے اس طرف تو دم لینا حرام ہو گیا، جس ذی علم مصنف نے شبلی جیسے سرمایۂ ناز محقق کو ایسا دنداں شکن جواب دیا ہو اس کی علمیت اور زور قلم کا کیا ٹھکانہ ہے۔

لکھنے کو تو ہم نے حیات دبیر کے مؤلف کے الہامات لکھ دئے مگر اب فکر یہ ہے کہ اس "من بدیہا" کے کلام بلاغت نا تمام کا جواب کیا دیا جائے کیونکہ آپ کے افادات عالیہ غیر متعالیہ کم از کم لا جواب ضرور ہیں۔

مؤلف المیزان کی خدمت میں تو کچھ نہ کچھ عرض کرنے کی جرات بھی کی جاسکتی ہے کہ وہ ایک ذی علم، بالغ نظر، سیر مطالعہ بزرگ معلوم ہوتے ہیں۔ سوائے اس کے کہ خصوصیات تشیع کا جواب گزارش کرنے کی گنجائش نہیں ہے ورنہ ادبا حیثیت سے کچھ اصول پیش کرنے کو جی ضرور چاہتا ہے مگر اس "من بدیہا" کی

نڑوکا پی سے سمجھنا ذرا ٹیڑھی کھیر ہے۔

اس سے پہلے کہ ان بزرگوں کے اعتراضات پر توجہ کی جائے ذرا علامہ شبلی کی ایک رائے مرزا دبیر کے متعلق قابل لحاظ ہے جو ہم نقل کرتے ہیں۔

"میر انیس اور مرزا دبیر میں اصلی ما بہ الامتیاز جو چیز ہے وہ خیال بندی اور وقت پسندی ہے اور یہی چیز مرزا صاحب کے تاجِ کمال کا طرہ ہے اس میں شک نہیں کہ مرزا صاحب کی قوتِ تخیلہ نہایت زبردست ہے۔ وہ اس قدر دور دور کے استعارات و تشبیہات ڈھونڈھ کر پیدا کرتے ہیں کہ وہاں تک اُن کے حریف کا طائرِ وہم پرواز نہیں کر سکتا۔ راست نما اور دلفریب (لیکن غلط)......"

"مختصر یہ کہ خیال آفرینی وقت پسندی، جدت استعارات، اختراع تشبیہات، شاعرانہ استدلال شدت مبالغہ، میں ان کا جواب نہیں، لیکن اس زور کو وہ سنبھال نہیں سکتے۔ اس وجہ سے کہیں خامی پیدا ہو جاتی ہے کہیں تعقید اور اغلاق ہو جاتا ہے تشبیہات کہیں پہیلیاں بن جاتی ہیں۔ کہیں محض فرضی خیال رہ جاتی ہیں۔" (موازنہ انیس و دبیر ص ۲۰۴)

شبلی کے اعتراض کا یہ جواب دیا جاتا ہے کہ حضرت سلیمانؑ چونکہ وحش و طیر جن و انس کے بادشاہ تھے اس لئے عنقا طائر ہونے کے اعتبار سے ان کی رعیت ہوا۔ لہٰذا عنقا و سلیمان میں راعی و رعیت کا تعلق موجود ہے

یہ ایسا تعلق ہے جو دنیا کی ہر چیز اور حضرت سلیمان میں پایا جاتا ہے مثلاً

حامی جو سلیمانِ دو عالم نظر آئے — مضمون جو تھے پھول مہکتے ہوئے آئے

یا — مضمون جو تھے لعل چمکتے ہوئے آئے

اب اگر کوئی اعتراض کرے کہ لعل اور پھول کو حضرت سلیمان سے کیا خاص تعلق ہے تو کہدیا جائے کہ چونکہ وہ بادشاہ تھے اس لئے لعل اور پھول پر بھی اُن کی حکومت تھی۔ اس لئے راعی و رعایا کا تعلق موجود ہے۔ مگر ظاہر ہے کہ یہ ایسا تعلق ہے جو مفید شعر نہیں۔ شعر میں تو تشبیہہ و استعارہ چونکہ اس لئے استعمال ہوتا ہے کہ جو کچھ کہنا مقصود ہے، سامع اس کو فصاحت سے سمجھ سکے۔ اس لئے مشبہ بہ مشبہ سے شہرت میں اعلیٰ و افضل ہونا چاہیئے، اس صفتِ خاص میں جو وجہ شبہ واقع ہوئی ہو، ورنہ اغلاق پیدا ہو جائیگا۔

عنقائے مضمون کا بسرعت ذہن میں وارد ہونا مسلّم سلیمانِ دو عالم کے تعلق سے قطعاً مہمل، کیونکہ حضرت سلیمان اور عنقا میں کسی خصوصیت کا اثبات نہیں کیا، ایک عمومیت البتہ بیان کی گئی ہے۔

اس کے علاوہ مرزا صاحب کے کلام میں سلیمان کے ساتھ دو عالم کی صفت کا کیا محل ہے؟ ظاہر ہے کہ دو عالم سے مراد دنیا و آخرت یا دین و دنیا ہوا کرتی ہے۔ اس بند میں وہ قرینہ کونسا ہے جو دو عالم کا مطالبہ کرتا ہو۔ لہٰذا صاف ظاہر ہے کہ دو عالم کا لفظ حشو محض ہے۔

اگر دو عالم میں حضرت سلیمان اور عنقا کا سا تعلق فرض کیا جائے اور دوسرے عالم سے عالمِ ملکوت مراد لی جائے اور عالمِ ملکوت سے حضرت جبریل کا علاقہ ثابت کیا جائے جن کے پر ہونے کی وجہ سے انہیں طائر کہا جاتا ہے اور اس طرح عنقا کے طائر ہونے سے فائدہ اُٹھایا جا کر حضرت جبریل اور عنقا میں تعلق پیدا کرکے عالمِ دنیا اور عالمِ ملکوت کا علاقہ ثابت کیا جائے تو یہ ایک عجز شاعرانہ ہوگا کیونکہ اس سے لازم آئے گا کہ اس موقع پر مرزا صاحب کو سلیمانِ ملکوت و ناسوت کہنا چاہیئے تھا تاکہ ذہن فرشتوں کی پرواز کی طرف آسانی سے منتقل ہو سکتا، اور عنقا کی تشبیہہ ذہن میں آجاتی۔

مگر چونکہ مرزا صاحب نے سلیمانِ عالمِ ناسوت و عالمِ ملکوت نہیں کہا اور سلیمانِ دو عالم ارشاد فرمایا۔ اس لئے یہ دو عالم بھی اصطلاحاً دنیا و آخرت یا دین و دنیا ہی سمجھ میں آتے ہیں، جو حصولِ مقصود کے لئے قطعاً مفید نہیں ہو سکتے۔

پھر ایسی بھی کوئی تقسیم موجود نہیں ہے جس سے اصطلاحاً یہ ماننا لازم آجائے کہ دو عالم سے مراد ایک طرف تو عالمِ ناسوت ہے اور دوسری طرف بقیہ تمام عالم جس میں عالمِ ملکوت بھی شامل ہے اور عالمِ ملکوت سے جبریل کی خصوصیت کی بنا پر بلحاظِ پرواز حضرت جبریل اور عنقا میں حسبِ خیال سابق لگاؤ ثابت ہو جائے۔

اس بحث کی لغویت کا احساس ہمیں بھی ہے مگر حضرت سلیمان اور عنقا کے تعلق نے یہ بحث پیدا کی ہے۔ ہم ناچار اس میں حصہ لے رہے ہیں ورنہ یہ محض اضاعتِ وقت ہے۔

بہرحال سلیمان کی صفت دو عالم قطعاً بے محل اور غیر ضروری ہے اور ایسا کوئی قرینہ کلام میں موجود نہیں ہے جس سے یہ سمجھ لیا جائے کہ یہاں دو عالم ہی کہنا واجب تھا۔ رہا یہ امر کہ قابل ممدوح کو سلیمانِ دو عالم ہی کہنا تھا۔

ہیں اس پر کوئی اعتراض نہیں۔ کہنا تو یہ ہے کہ کلام میں ایسا قرینہ نہیں پایا
جاتا جس سے دو عالم کی صفت بے محل نہ سمجھی جائے۔ اگر دو عالم کی صفت کی
کوئی توجیہہ قابلِ قبول نہیں پیش کی جاسکتی تو اُس کے حشو ہونے میں کیا شبہ
باقی رہ جاتا ہے۔

تصور کی تشبیہہ طاؤس سے دینے کی توجیہہ بھی ناقابلِ قبول ہے۔ خیال
و وہم کی تشبیہہ مرغ و طائر سے درست ہے۔ کیونکہ محض سرعت سیر اور پرواز
کے اظہار کے لئے مطلقاً طائر سے تشبیہہ مفید وضاحت ہے لیکن اگر خصوصیت
ملحوظ رکھی جائے تو ایسا قرینہ موجود نہیں ہے تو تشبیہہ بے معنی بن جائے گی۔
مرزا صاحب کے یہاں مضمون کی تشبیہہ میں خصوصیت کا قرینہ عنقا کی نایابی
موجود ہے۔ مگر تصور کی تشبیہہ خصوصیت سے طاؤس کے ساتھ کچھ معنی نہیں
رکھتی جیسا کہ شبلی نے صراحتہً بتایا ہے کہ جب مضمون کا عنقا خود دل میں
اُتر سکتا ہے تو تصور کی طاؤس سے تشبیہہ کا کیا محل باقی رہ جاتا ہے؟

شبلی کا اعتراض ہے کہ دل میں اترنے کی نسبت سے مضمون و
تصور یکساں ہیں اس لئے عنقائے مضمون کی موجودگی میں طاؤسِ تصور
کی کیا ضرورت ہے! یہ اعتراض بلحاظ وجہ جامع کے ہے مضمون و تصور
پر، جو فعل ہے (یعنی وجہ جامع فعل) اور جواب دیا جاتا ہے۔ تصور و
طاؤس کی رنگینی سے جو صفت ہے۔ بہ ہیں تفاوت رہ از کجاست تا بہ کجا،
اس استدلال کی لغویت اسی سے ثابت ہے کہ مستعار لہٗ اور مستعار منہٗ
میں وجہ جامع مشترک ہونا ممتنع ہے۔ یعنی طاؤس دل میں اُترنے کی اہلیت نہیں
رکھتا۔ مگر مضمون و تصور میں وجہ جامع مشترک ہے اور مفید وضاحت۔

غرض یہ ہے کہ عنقائے مضمون نے طاؤس تصور کی تشبیہہ کا محل ہی
باقی نہ رکھا۔ اس پر مزید روشنی ڈالنے کی ضرورت ہے۔ مگر پہلے فیضی
سے استشہاد کی واقعیت کو پرکھنا چاہیئے۔

فیضی کا شعر بے محل پیش کیا گیا ہے۔ کیونکہ فیضی کے ہاں نہایت واضح
قرینہ موجود ہے جو ظاہر کرتا ہے کہ نظر کو جب تک عنقا سے تشبیہہ نہ دی
جائے وضاحت منشا کا اغلاق رفع نہیں ہوسکتا۔

فیضی کہتا ہے کہ ابتدائے آفرینش سے نگاہ مشاہدۂ قدرت کر رہی
ہے۔ اس مضمون کو بیان کرنے کا انداز یہ اختیار کیا گیا کہ ذات مطلق کو
مخاطب کرکے کہتا ہے کہ ازل ہی سے نظر تیری تگ و پو میں ہے، اب نظر
کی تگ و پو کی وضاحت منظور ہوئی۔ یعنی بتانا چاہتا ہے کہ جو نظر تیری تگ و پو
میں ہے کیسی ہے اس کی بلند پروازی کے اظہار کے لئے عنقا کی تشبیہہ اختراع
کی جس کی بلند پروازی نے اُسے عالم سے پوشیدہ کر دیا ہے۔ کہنا یہاں
یہ ہے کہ نظر تیری تلاش میں عنقائے بلند پرواز کی طرح گم ہے۔ یعنی تجھے پا
نہیں سکتی۔

نظر کے نگاہوں میں ہونے سے مراد نظر کا اپنے مرکز کی طرف واپس پہنچنا
ہے جو نظر نہ آنے سے کنایہ ہے۔ علم مناظر و مرایا میں یہ طے کیا گیا ہے کہ
آنکھ سے شعاعِ نظر اس شے کی طرف بڑھتی ہے جس کو دیکھنا مقصود ہوتا
ہے۔ اور اس شے سے ٹکرا کر وہی شعاع آنکھ کی طرف رجوع کرتی ہے،
تو شے مذکور کا نقشہ آنکھ کی پتلی پر اس طرح منعکس ہوتا ہے جس طرح
تصویر میں عکس، اس وقت آنکھ اُس شے کو دیکھتی ہے۔

اگر شعاعِ بصر آنکھ سے نکل کر واپس اپنے مرکز کی طرف رجوع نہ کرے تو
آنکھ کچھ بھی نہ دیکھ سکے گی۔

اب فیضی کے شعر کو دیکھئے۔ عنقا کی بلند سے پروازی سے تشبیہہ
دے کر اس نے کنایۃً کس کامیابی سے کہہ دیا ہے کہ نظر ابتدائے آفرینش
ہی سے تیری تگ و پو میں لگی ہوئی ہے اور اپنے مرکز کی جانب اب تک
واپس نہیں ہوئی اسی لئے آنکھ تجھکو نہیں دیکھ سکتی۔

اگر نظر کو عنقا سے تشبیہہ نہ دی جاتی تو دو ضرورتیں فوت ہو جاتیں۔
اول تو نظر سے ایسی نظر نہیں سمجھی جاسکتی تھی جو حکیمانہ یعنی بلند پرواز ہو کیونکہ
صرف نظر میں تو پست سے پست عامی کی نظر بھی شامل ہے جو حشرات الارض
اور نباتات کے سامنے بھی انسان کو سربسجود کر دیتی ہے۔ دوسرے نظر کا آوارہ
اور ناکامیاب رہنا یہ بغیر عنقا کی تشبیہہ کے سمجھ میں نہیں آسکتا تھا۔

اس لئے کہا جاسکتا ہے کہ فیضی کے یہاں نظر کی تشبیہہ عنقا سے نہایت
بلیغ اور کامیاب ہے۔ مگر مرزا دبیر کے یہاں تصور کی تشبیہہ طاؤس سے مہمل
اور سخت مہمل ہے۔ کیوں؟ سنیئے!

ان دو مصرعوں سے مضمون جو عنقا تھے وہ پر جوڑ کر آئے سے طاؤس
تصور کی طرح دل میں در آئے۔ مرزا صاحب نے یہ کہا ہے کہ مجھے نایاب
مضامین آسانی سے دستیاب ہو گئے تو یہ مقصود صرف پہلے ہی مصرع سے
حاصل ہو جاتا ہے کہ نایاب مضامین جو عنقا تھے وہ پر جوڑ کر بسرعت تمام

میرے دل میں خود ہی چلے آئے، جب اپنے آپ چلے آئے تو آسانی سے دستیابی ثابت ہوگئی۔ اب کونسی گنجائش تھی جس کی وضاحت کی ضرورت پڑتی۔

مگر فرض کیجئے کہ معترض اپنی وضاحت کو ناکافی سمجھتا ہے یا مزید وضاحت کرتا ہے تو اب جو کچھ وہ کہنا چاہتا ہے اس میں وہ کامیاب ہوا یا نہیں؟

اس کے متعلق یہ عرض کرنا پڑے گا کہ کتب بیان میں یہ طے کیا گیا ہے کہ علم بیان میں اصل عبارت ہے۔ ایک معنی کو چند طرح اس انداز سے بیان کرتے ہیں کہ ایک بیان دوسرے بیان سے دلالت میں واضح تر ہو۔ اگر دونوں بیانوں میں سے ایک بیان دلالت میں واضح تر ہوگا وہ اصول بیان پر درست نہیں سمجھا جائے گا۔ یہ مسئلہ ایک مثال سے واضح ہوسکیگا۔

ایک شخص یہ کہے کہ "میں پانی پیوں گا" اور پھر کہے

"مجھے پیاس لگی ہے"

ان دونوں بیانوں میں قائل کو پانی کی ضرورت معلوم ہوتی ہے۔ مگر دونوں بیانوں میں منشا ایک ہی ہے، ایسا نہیں ہے کہ ایک بیان میں ضرورت دوسرے بیان سے زیادہ پائی جائے۔ اس لئے یہ بیان علم بیان کے دائرہ سے خارج ہے۔ البتہ ان میں سے ایک بیان اگر یوں دیا جاتا۔

"پیاس کے مارے میرے حلق میں کانٹے پڑے ہیں"

تو یہ بیان پہلے بیانوں سے دلالت میں واضح تر ہے۔ اس لئے علم بیان کے مطابق ہے۔

اب مرزا صاحب کے طاؤس تصور والے جملہ کو لیجئے اور اس کی ضرورت پر غور کیجئے تو محض بیان زائد ہی رہ جاتا ہے۔

بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ مرزا صاحب نے یہ کہنا چاہا ہے کہ نایاب مضمون لکھنا میرے لئے آسان ہوگیا ہے تو نایاب مضمون کو عنقا سے تشبیہہ دی جس سے اس امر کی وضاحت ہوگئی کہ مضمون واقعی نایاب لکھا گیا۔

اب مضمون کے دل میں اترنے کو بوضاحت کہنا چاہا تو نایاب مضمون کو تصور سے تشبیہہ دی۔ پھر تصور کے سہل الحصول یا تحصیل حاصل ہونے کی وضاحت کے لئے طاؤس کی تشبیہہ اختراع کی گئی۔ یہ وہ تاویل ہے جو حقیقتہً مرزا صاحب کی جانب سے شبلی کے خلاف کی جاسکتی ہے۔

مگر معترض نے اعتراض میں پہلے ہی کوئی گنجائش نہیں چھوڑی۔ یعنی جب مضمون کا عنقا خود بخود بسرعت تمام دل میں اُتر آیا تو جو کہنا مقصود تھا اس مضمون کو وضاحت سے بیان کردیا۔ اس لئے بعد کا مصرع بیکار ہوگیا کہ کہے ہوئے مفہوم ومنشا کی وضاحت طاؤس تصور والا مصرع کچھ بھی زیادہ نہیں کرتا۔ بلکہ دلالت میں دونوں مصرعے برابر ہیں اور زیادہ نکتہ سنجی اور تعمق نظر سے دیکھا جائے تو پہلا مصرع ہی دلالت میں مرجح ٹھیرتا ہے اس لئے بھی دوسرا مصرع بیکار ہے۔

اگر بالفرض یہ کہا جائے کہ دوسرا مصرع جداگانہ مضمون ہے جو پہلے مصرع کی وضاحت کرتا ہے تو غلط ہے۔ جیساکہ بیان کلام سے ظاہر ہے۔

اگر مضمون اور تصور کو باہم مستعارلہٗ اور مستعارمنہ فرض بھی کرلیا جائے تو وجہ جامع کیا چیز یا کونسا وصف قرار پائے گا۔ ظاہر ہے کہ دل میں آنا، یا دل میں اُترنا، یا قائل کے خیال سے متعلق ہونا ہی وجہ جامع قرار پاسکتا ہے کیونکہ یہی وصف دونوں میں مشترک ہے۔ مگر اس میں وہی خرابی واقع ہوتی ہے جس کو شبلی ظاہر کرچکا۔ یعنی جب مضمون کی تشبیہہ عنقا سے دی گئی اور مضمون خود دل میں پیدا ہوسکتا ہے۔ یعنی مضمون کا عنقا خود دل میں اُتر سکتا ہے تو اس کی دوسری تشبیہہ تصور سے یا طاؤس تصور سے محض فرضی وخیالی ہے۔ جو اسی فائدہ سے قطعاً معرا ہے۔ جو علم بیان کی خصوصیت ہے۔ یعنی استعارہ در استعارہ کی ضرورت اس وقت واقع ہوسکتی تھی جبکہ پہلے استعارہ سے وضاحت مقصودہ میں کامیابی نہوتی، اور مزید وضاحت کا امکان ہوتا۔

مزید وضاحت کا امکان ہوتا، اس کے یہ معنی ہیں کہ جب مضامین نایاب کی دستیابی آسان ہوگئی اس بیان سے کہ مضمون جو عنقا تھے وہ پر جوڑ کر آئے" تو اسی مضمون کو طاؤس تصور کی طرح دل میں در آئے کہنے سے کیا مزید فائدہ حاصل ہوا؟

جبکہ یہ تسلیم کرلیا گیا کہ عنقا والے مصرع سے ثابت ہوتا ہے کہ مضامین میرے گھر کو اپنا اصلی مسکن سمجھکر آتے تو اُن کے مشکل مضامین کے خود بخود دل میں آجانے کے بیان میں کوئی گنجائش مطلق باقی نہیں رہی۔

جب گنجائش باقی نہ رہی اور مضمون میں کسی قسم کا اضافہ بھی نہوسکا تو طاؤس تصور کی تشبیہہ نتیجۃً لغوی ماننی پڑے گی۔

اس تمام بیان کو مختصر کرکے یہ کہا جاسکتا ہے کہ مشکل مضامین میرے

دل میں تصور کی طرح آسانی سے اُتر آتے ہیں۔ اس بیان میں یہ غلطی ہے کہ مشکل مضامین کی وضاحت کے لئے جب عنقا کی تشبیہ اختراع کی گئی تو تصور کی تشبیہ کی ضرورت نہ رہی کیونکہ اگرچہ عنقا دل میں نہیں اُتر سکتا۔ مگر مضمون کا عنقا بے شبہ دل میں اُتر سکتا ہے۔ اس تشبیہ نے مشکل اور نایاب مضمون کا آسانی کے ساتھ دل میں پیدا ہو جانا بوضاحت ظاہر کر دیا لہٰذا تصور کی تشبیہ مفید نہ رہی اور طاؤس سے تصور کی تشبیہ اور بھی لغو۔

اب چوتھے مصرع کا معاملہ دیکھئے۔ (شیشہ میں پریزاد معانی اُتر آئے) شبلی نے (بقول مولف حیاتِ دبیر رحمۃ) اس حسین وجمیل و نازنین و پری پیکر مصرع پر کیوں توجہ نہ کی۔ اس کی دو وجہیں سمجھ میں آتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ جو مضامین نایاب تھے جب وہ بآسانی دل میں آگئے تو دل میں ان مضامین کی کیا کیفیت تھی؟ اس کیفیت کے اظہار کے لئے شاعر نے معانی کو پریزاد سے تشبیہ دیکر دل کو شیشہ سے استعارہ کرکے شیشہ میں اُتارا ہے۔

مضامین کا دل میں موجود ہونا مضامین کے دل کی طرف متوجہ ہونے سے قطعاً مختلف چیز ہے۔ پہلی تشبیہ مضامین کی عنقا سے ثابت کرتی ہے کہ جو مضامین نایاب تھے وہ بسرعت تمام آگئے اور جب دل میں آگئے تو بوجہ اپنی نایابی کے حسن کے چونکہ پریزاد سے مماثل تھے تو ایسے معلوم ہونے لگے جیسے شیشہ میں پریزاد اُتر آئے۔

اس تشبیہ میں خوبی یہ ہے کہ پریزاد کا شیشہ میں اُترنا اور مقید رہنا چونکہ بالطبع ان کی فطرت کے خلاف ہے اس لئے وہ شیشہ سے نکلنے کے لئے ہمیشہ بیتاب رہتے ہیں۔ اس میں کنایہ ہے کہ مضامین بھی دل سے نکلنے کے لئے بیتاب ہیں۔ ایسی حالت میں کہ مصرع شاعر کے مقصد کی وضاحت کرتا ہے شبلی کا موثر اعتراض نہیں ہو سکتا۔

دوسری بات یہ ہے کہ معانی جس چیز میں ہوتے ہیں وہ دل بھی ہو سکتا ہے اور الفاظ بھی۔ اس لئے شیشہ میں پریزاد معانی اُتر آئے۔ سے مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ معانی الفاظ میں جلوہ گر ہوئے اور پھر اُتر آئے سے مقصد یہ ہے کہ باکراہ مقید نہیں کئے گئے بلکہ بشوق و قصداً اتر آئے۔ اس صورت میں بھی شاعر کا مقصد حسب دلخواہ ادا ہو جاتا ہے۔ البتہ شیشہ کا استعارۃً بدل جاتا ہے اور دل کی بجائے الفاظ ہو جاتا ہے جو کسی طرح بھی پہلے سے کم نہیں۔

ٹیپ کی دلیل واقعی کس قدر محقق ہے کہ ان بزرگوں نے چند در چند طریقوں سے اس معنی کو بدلنے کی کوشش کی جو ٹیپ کے مصرع ثانی سے متبادر ہوتے ہیں اور جس کی ہر جہت پر شبلی نے روشنی ڈالی ہے مگر کامیابی نہ ہوئی۔

ایک صاحب فرماتے ہیں۔ لعل اُگلوں گا میں: طائر سدرہ کے دہن سے

دوسرے صاحب کا ارشاد ہے۔ لعل اُگلوں گا میں طوطیٔ سدرہ کے دہن سے

مطلب دونوں کا ایک ہے۔

صاحب المیزان کا قول ہے

(۱) میں اپنے دہن سے وہ لعل اگلوں گا جو طائر سدرہ کے ہیں

(۲) یعنی جو طائر سدرہ کے منہ سے نکلے ہیں

(۳) جو طائر سدرہ کے منہ سے نکلے تھے۔

(۴) جو میرے دل میں جبریل نے القا کئے ہیں۔

(۵) مداحانِ اہلبیت کے دل میں بذریعہ روح الامین القا ہوتے ہیں۔

مولف حیاتِ دبیر

(۶) جبریل ۔۔۔۔۔ میری زبان پر ناطق وگویا ہوں گے۔

طائر سدرہ یا طوطی سدرہ حضرت جبریل سے استعارہ ہے یہ خواہ کسی امام کی تعلیم ہو یا قرآن کا اشارہ وتلمیح یا خود شاعر کی اپج، اس میں اختلاف کی گنجائش نہیں۔

ایک سیدھا سادہ جملہ ہے ۔ لعل اگلوں گا میں طائر سدرہ کے دہن سے اس کی بے ربطی اور مہملیت جتائی جا چکی ہے، اب دیکھنا یہ ہے کہ جو کچھ اس کے مسخ کرنے کی تاویل میں کہا گیا ہے وہ درست بھی ہے یا نہیں۔ مصرع زیر بحث کے اجزائے نحویہ کی ترتیب حسب ذیل ہے۔

اُگلوں گا، فعل ۔۔۔ میں، فاعل ۔۔۔ لعل، مفعول ۔۔۔ طائر سدرہ مضاف مضاف الیہ ۔۔۔ کے ۔۔۔ اضافت ۔۔۔ دہن مضاف ۔۔۔ یہ سب طائر سدرہ کے دہن مجرور ۔۔۔ سے، حرف جار ۔۔۔ جار مجرور مل کر متعلق اگلوں گا کے ۔ فعل، فاعل، مفعول، اور متعلق مل کر جملہ فعلیہ خبریہ بنا۔

جبکہ اگلوں گا کا فاعل ضمیر متکلم ہے تو جبریل اس کا فاعل کسی طرح بھی قرار نہیں دیا جا سکتا۔ سوائے اس کے کہ حسب خیال شبلی اگلنا کو اُگلوانے کے معنی لیا جائے تو جبریل کے منہ سے لعل نکلنا درست ہوگا۔ مگر فاعل اس حالت میں بھی ضمیر متکلم ہی رہے گی۔

شاعر یہ کہتا ہے کہ میں لعل اگلوں گا۔ مگر یہ فعل اپنے منہ سے نہ کروں گا۔ بلکہ

حضرت جبریل کے دہن سے کروں گا۔

فرض کیجئے کہ لعل استعارہ ہے فضائل اہلبیت سے جبریل کے دہن سے اُگلنا جبریل کے منہ سے کہنا ہے تب بھی بیڈھنگا پن قائم رہا گویا شاعر کو ایک مضمون تو مزیدار ملا مگر اس کو کما حقہ، بیانی کے ساتھ بیان نہ کر سکا یعنی اپنی قوتِ متخیلہ کی بےراہ روی کو سنبھال نہ سکا۔

شاعر کو یوں کہنا چاہیئے تھا میں وہ لعل اگلوں گا جو طائر سدرہ یا طوطیِ سدرہ کے اُگلے ہوئے ہوں گے یا وہ لعل اگلوں گا جو طائرِ سدرہ کے منہ سے نکلنا چاہئے تھے یا وہ لعل اگلوں گا جو طائرِ سدرہ نے اُگلے تھے یا ایسے لعل اگلوں گا جیسے طائر سدرہ اُگلتا ہے یا طائرِ سدرہ نے اُگلے تھے تو مطلب بآسانی سمجھ میں آجاتا۔

مگر شاعر کا طائرِ سدرہ کے منہ سے لعل اُگلنا کسی طرح سمجھ میں نہیں آتا۔

زید اپنے مقدمہ کی پیروی بذریعہ خالد وکیل کے کرے گا یعنی خود یہ فعل نہیں کریگا، بلکہ وکیل کے فعل کو اپنا فعل سمجھے گا۔

مگر مرزا صاحب کے مصرع میں قرائن ایسے ہیں جن سے موکدہ طریقہ پر اگلنے کی تخصیص ضمیر متکلم ہی سے رہتی ہے۔ اس جملہ میں اگلوں گا کہدینا اظہار مافی الضمیر کے لئے کافی تھا مگر ضمیر متکلم کا اس پر اضافہ کرنا اگلنے کی تخصیص کرتا ہے۔ ضمیر متکلم کے ساتھ یعنی میں خود اگلوں گا جبریل نہیں اُگلے گا۔

"مقدمۂ حالی" میں ہے

صبا بلطف بگو آں غزال رعنا را
کہ سر بکوہ و بیاباں تو دادۂ ما را

کے ذیل میں جو کچھ کہا گیا ہے اس کا ملخص یہ ہے کہ ہم تیری وجہ سے کوہ و بیاباں میں سرگرداں ہیں اور کوہ و بیاباں کی سرگردانی سوائے تیرے اور کسی کی وجہ سے نہیں ہے۔ بلکہ خاص تو ہی اس کی وجہ ہے کیونکہ "دادۂ" میں خود تو کا مفہوم موجود ہے مگر ضمیر واحد حاضر کا اضافہ تاکید کے ساتھ ثابت کرتا ہے کہ تو ہی اس کا سبب ہے۔ دوسرا نہیں ہو سکتا۔

اسی طرح مرزا دبیر کے ہاں سے "لعل اُگلوں گا" میں "میں" کا مفہوم موجود ہے۔ مگر "میں" کے اضافہ کی تاکید نے موکدہ طریقہ پر اگلوں گا کی تخصیص کر دی۔ اور جبریل کا ناطق ہونا گویا بہرحال ممتنع کر دیا۔

اگر مرزا صاحب یہ فرما دیتے کہ طائرِ سدرہ میرے دہن سے لعل اُگلے گا تب بھی کچھ بات ہو جاتی۔

اب ذرا مرزا صاحب کے الفاظ پر تنقید کی گہری نظر ڈالنی چاہیئے۔ واقعہ یہ ہے کہ ذی رُوح لعل نہیں اُگلتے۔ اس لئے شاعر کا یہ کہنا کہ میں لعل اُگلوں گا۔ صاف استعارہ ہے۔ شاعر اپنے آپ کو ایسی چیز سے استعارہ کرتا ہے جو لعل اُگلتی ہو۔

وہ چیز جو کان سے لعل اگلتی ہے کان لعل یا کان جواہر ہو سکتی ہے۔ اس لئے شاعر نے اپنے آپ کو کان سے استعارہ کیا ہے۔ مگر واقعہ یہ ہے کہ کان لعل نہیں اگلتی ہے بلکہ کان سے لعل نکالے جاتے ہیں۔ اگر اُگلنے کی نسبت کان کی طرف کی جائے تو کان استعارہ در استعارہ ہو جاتی ہے۔ اور ایسی چیز سے مراد ہو جاتی ہے جس میں اُگلنے کی استعداد ہو اور اُگلنا ذی رُوح کا فعل ہے۔ اس لئے کان خود استعارہ ہو جاتی ہے، انسان سے جو ذی روح ہے اور اُگلنا سے واقعی تعلق رکھتا ہے۔

اس حد تک مرزا صاحب کے مضمون کو مشکل خیال آفرینی اور نازک خیالی کے دائرہ میں رکھا جا سکتا ہے۔ مگر جہاں یہ کہا کہ "لعل اُگلوں گا میں طائرہ سدرہ کے دہن سے" یہ استعارہ اچھی خاصی پھبتی بن گیا۔

حضرت دبیر علیہ الرحمتہ والرضوان کی قوت متخیلہ کی بلند پروازی کے منکرین کے لئے یہ بند اچھا خاصا معجزہ ہے۔ مگر سوال یہ ہے کہ متخیلہ کی یہ بلند پروازی بلحاظ شعر و ادب یا باعتبار علم بیان کار آمد ہے یا نہیں تو افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ علم و اصول اس کا جواب مرزا صاحب کی طرفداری میں نہیں دیتے۔

ان بزرگوں تو جیہاتِ باطلہ کی دوسری مثال ملاحظہ ہو۔

تم جاؤ تو جہاں سے شہِ عالی کو لے آؤ
اکبر سے میں گزری مرے عالی کو لے آؤ
دبیر

"تم جاؤ تو جہاں سے" اس مبتذل محاورے سے قطع نظر کرکے یہ امر کس قدر خلاف مقتضائے حال ہے کہ کوئی شریف عورت یہ کہے کہ میں اپنے بیٹے سے در گزری۔ میرے شوہر کو جہاں سے ممکن ہو پیدا کر دو" (موازنہ انیس و دبیر شبلی)

اس پر مولّف حیاتِ دبیر کا خیال ملاحظہ ہو۔

"اب میں مولوی صاحب سے کہتا ہوں "تم جاؤ تو جہاں سے شہ عالی کو لے آؤ" ہرگز مبتذل روزمرہ نہیں ہے۔ مگر آپ نے جو اس کا خلاصہ بیان کیا ہے کہ میرے شوہر کو جہاں سے بھی ممکن ہو پیدا کر دو" یہ الفاظ غیر مہذب ہیں اور جب کہ ان کی نسبت ایک امام کی زوجہ کی نسبت ہے (جو ایک امام کی

والدہ ماجدہ بھی ہیں جن کو ہم گروہ شیعہ اپنا دین وایمان سمجھتے ہیں) تو آپ کا ان
کریہہ الفاظ میں مطلب ادا کرنا بیشک ہمارے گروہ کی دل آزاری کا سبب
ہوسکتا ہے۔ مگر میں قانونی شکنجہ کا خیال اپنے ہم خیال کو نہیں دلانا چاہتا اور
اور الحمدللہ علی الرار والفرار کہہ کر صبر کرتا ہوں اور کہتا ہوں کہ روٹی کھاؤ،
کھانا کھاؤ، آیئے کھانا نوش فرمایئے۔ زہر مار کیجئے۔ سب کا مآل ایک ہے۔ مگر
لفظوں کے اختلاف سے ان کے اثر میں تریاق اور زہر کا ایسا فرق ہے میرے
بادشاہ (شوہر) کو ڈھونڈلاؤ دوسرا جملہ ہے۔ شوہر کو پیدا کردو دوسرا جملہ ہے
اب دوسری بات کا جواب باصواب سنئے۔ میں قبل جواب دینے کے آپ
کی توجہ ایک حدیث صحیح بخاری کی طرف دلانا چاہتا ہوں جس کا خلاصہ یہ ہے
کہ ایک مشہور صحابی نے (مولف کا مطلب حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے ہے
رزمی) حضور صلعم سے عرض کیا، کہ دوست دارم ترا از یں دوزان لیک محبوب
تر نہ از جان، جس کا جواب حضور صلعم سے جو ملا اس کا مطلب یہ ہے کہ نہیں۔ مجھے
اپنے نفس سے بڑھکر دوست رکھیگا جب تو مومن ہو سکتا ہے۔ یہ سنکر ان
بزرگوار نے بھی یہی کہا کہ ہاں تمام چیزوں سے بڑھکر دوست رکھتا ہوں اور
اپنے نفس سے بڑھکر دوست رکھتا ہوں۔ اب سمجھئے کہ ہم لوگ امام حسینؑ کو کیا
اور کیا سمجھتے ہیں۔ مختصر یہ کہ بعد رسول اللہ صلعم امام زمانہ بالکل جانشین و قائم
مقام رسول ہے۔ بس ایک وحی اُس کے پاس نہیں آتی ہے اور جو خصائص رسول
ہیں وہ ان کو حاصل نہیں۔ باقی ان بزرگوار کی وہی عزت۔ وہی عصمت، وہی
عظمت ہے جو رسول کی ہے۔ یہ تو مذہب شیعہ کی بنا پر گفتگو ہے۔ مذہب سنت
وجماعت کی رو سے امام حسینؑ نبی کے واجب التعظیم نواسہ ہیں جن کی شان
میں حضور صلعم نے ارشاد فرمایا "دمک دمی ولحمک لحمی" اے حسین تیرا
خون میرا خون ہے۔ تیرا گوشت میرا گوشت ہے۔ مذہب حضرات صوفیہ کے
مطابق سنہ ۶۰ھ کے غوث امام حسینؑ تھے۔ مختصر یہ کہ قریب قریب ہر عقیدہ کے
مسلمان کی بنا پر حضرت امام حسینؑ سے جناب شہربانو کے دو رشتہ ہوئے۔
(۱) رشتۂ زوجیت (۲) رشتہ وتعلق آقائی۔ پس رشتۂ آقائی کی بنا پر
ضرور ہے کہ وہ امام حسین کو اپنی اولاد، مال، آبرو، جان، سب چیزوں سے
بڑھکر دوست رکھیں۔ جب تو مومن ہیں ورنہ معاذ اللہ مومن نہیں۔ مرزا
صاحب جناب شہربانو (مادر امام زین العابدین) کو اعلیٰ درجہ کی مومنہ
کاملہ سمجھے ہوئے ہیں۔ اس لئے اُن کی زبان سے کہتے ہیں:

تم جا لو جہاں سے شہ عالی کو لے آؤ
اکبر سے میں گزری مرے والی کو لے آؤ

(حیات دبیر صفحہ ۵۲۶)

اس کے آگے اور اسی قسم کی گوہر افشانی فرمائی ہے جس کا نقل کرنا نفس
کشی سے بھی زیادہ ہے پڑھنا معلوم نہیں کتنا تکلیف دہ ہے، کیونکہ آپ کوئی
ایسی بات نہیں فرماتے جسے موضوع زیر بحث سے تعلق ہو اور باقی سب کچھ
بلاتکلف ارشاد فرماتے ہیں۔

صاحب المیزان تحریر فرماتے ہیں

تم جا لو جہاں سے شہ عالی کو لے آؤ — اکبر سے میں گزری مرے والی کو لے آؤ

"اعتراض۔ تم جالو جہاں سے" متبذل محاورہ ہے (۲) یہ خلاف مقتضائے
حال ہے کہ کوئی شریف عورت یہ کہے کہ میں اپنے بیٹے سے درگذری میرے
شوہر کو جہاں ممکن ہو پیدا کردو"

"جواب۔ تم جالو جہاں سے اہل زبان کا محاورہ ہے۔ محاورہ شناسی
مرزا دبیر سے زیادہ اور کس کو آسکتی ہے۔ یا حضرت بانو کا کہنا "میں اپنے
بیٹے سے درگذری، میرے شوہر کو لے آؤ۔ ہرگز خلاف مقتضائے حال نہیں،
اہلبیت علیہم السلام کو حضرت امام حسین کی زندگی اس قدر عزیز تھی کہ سب نے
اپنے اپنے فرزندوں کو امام ہمام کے قدموں پر نثار کردیا۔ پس حضرت بانو کا
یہ کہنا کہ مجھکو اپنے بیٹے سے زیادہ اپنے عالی قدر شوہر کی زندگی عزیز ہے۔ بالکل
مقتضائے حال کے مطابق اور ان کی دینداری اور وفاشعاری کا سچا نمونہ
ہے۔ حضرت بانو کا اس موقع پر ایسا کہنا صرف اسی لحاظ سے نہ تھا کہ امام
حسینؑ ان کے شوہر تھے، بلکہ وہ اُن کے امام اور دینی پیشوا بھی تھے" المیزان صفحہ ۱۵۵

شبلی کی عبارت پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس نے دبیر کے شعر پر
دو اعتراض کئے ہیں ایک لفظی دوسرا معنوی۔ (۱) تم جہاں سے۔ متبذل روزمرہ
ہے (۲) حضرت شہربانو کا مقولہ مقتضائے حال کے خلاف ایزاد کیا گیا ہے۔
دونوں بزرگوں نے ابتذال کے اعتراض کو تسلیم نہیں کیا۔ مگر اس کے ساتھ
ہی فصحا کے کلام سے اس کے جواز کی مثال بھی پیش کرنے کی جرأت نہیں کی جیسا
کہ اکثر مقامات پر اساتذہ کے کلام سے استدلال واستشہاد کیا گیا ہے۔ مرزا
دبیر اگر خود مورد اعتراض ہوتے تو ان کی سند قابل قبول تھی۔ مگر جبکہ اعتراض
خود مرزا..... پر ہے تو یہ کہدینا کافی نہیں ہوتا کہ ان سے زیادہ محاورہ شناسی

کس کو آسکتی ہے ؟ اس لئے ماننا پڑے گا کہ معترض کا اعتراض ورتی ہے جیساکہ فی الحقیقت ہے بھی۔

خلاف مقتضائے حال کلمات ۔ ۔ ۔ ۔ کا جو جواب دیا گیا ہے قطعاً بے محل ہے اگر یہ تسلیم کرلیا جائے کہ یہ دونوں بزرگ مجتہدانِ عصر ہیں تو اس سے بھی زیادہ سے زیادہ یہ نتیجہ مترتب ہوتا ہے کہ ان کو دینیات پر کماحقہ عبور ہے۔ مگر ادبیات کے بارہ میں یہ سند بیکار ہے۔

دونوں بزرگوں نے اصل اعتراض کو نہ سمجھتے ہوئے اپنے اپنے عقاید مذہبی پیش کئے ہیں۔ مگر یہ نہ سمجھے کہ مقامِ زیر اعتراض کا تعلق مذہب سے نہیں ہے بلکہ زبان اور کلام سے ہے۔

اگر شبلی یہ اعتراض کرتا کہ حضرت شہر بانو نے جناب امام حسین علیہ السلام کو اپنا امام تسلیم نہیں کیا اور اس پر فلاں فلاں قول یا کتاب شاہد ہے تو دونوں بزرگوں کے جواب قابلِ قبول سمجھ لئے جاتے۔

نیز جو تعریض مولف حیاتِ دبیر نے کی ہے بالکل بے وقت کی راگنی ہے۔ گروہ شیعہ کے جذبات کو ٹھیس لگتی اُس وقت ممکن تھی کہ حضرت شہر بانو کے الفاظ بطریق محدثین پیش کئے جاتے اور خدانخواستہ ان پر کوئی ایسا گستاخانہ اعتراض جڑا جاتا جس سے ان کے مومن ہونے پر زد پڑتی۔ مگر یہاں تو اس واقعہ اور اس حالت کو بحث میں لانے کا سوال ہی نہیں ہے۔ معلوم نہیں ان بحثوں کے پیدا کرنے سے ان بزرگوں کا کیا مطلب ہے۔

شبلی کا اعتراض تو یہ ہے کہ مرزا دبیر نے جو واقعہ فرض کیا ہے یا اصل واقعہ کی محاکات کی ہے وہ واقعہ سے قطع نظر نبھ نہیں سکی ہے۔ مرزا صاحب کے الفاظ ایسے ہیں جن سے ان کے خلاف یہ جرم ثابت ہوتا ہے وہ مرثیوں میں مناسب حال و مقام الفاظ نہ لا سکنے کی وجہ سے کہیں کہیں حدودِ ادب سے متجاوز ہو جاتے ہیں۔

تم جانو جہاں سے شہِ عالی کو لے آؤ   اکبر سے میں گزری مرے والی کو لے آؤ

ان الفاظ سے جو کچھ مطلب نکلتا ہے وہ بالکل وہی ہے جو شبلی نے سمجھا اگر اس کے علاوہ کچھ اور مطلب ہوتا تو ان دونوں بزرگوں میں سے ایک نہ ایک تو نقل کرتا۔

حضرت شہر بانو جناب امام حسین علیہ السلام کو اپنا شوہر ہونے کے علاوہ فدایا امام اور پیشوا بھی سمجھتی ہوں گی اور اپنے ننگ و ناموس مال و اولاد کو آپ پر سے قربان کر دینا اپنا فرضِ ایمانی جانتی ہوں گی۔ مگر مرزا دبیر نے ان کے جو الفاظ نقل کئے ہیں۔ ان سے وہ عقیدہ مترتب نہیں ہوتا۔

واقعہ حضرت علی اکبر کی شہادت سے پہلے کا ہو یا بعد کا اس سے کچھ بحث نہیں۔ گفتگو حضرت دبیر کے الفاظ سے ہے۔ چنانچہ مرزا صاحب کے الفاظ زیادہ سے زیادہ قائل کا یہ منشا پیش کرتے ہیں کہ اے موجود لوگو تم جہاں سے بھی چاہو میرے شوہر کو لادو میں اس کے مقابلہ میں اپنے بیٹے کی بھی پروا نہیں کرتی۔

شہِ عالی کے لفظ سے امام وقت نہیں سمجھا جاتا۔ امیر معاویہ کی طرف منتقل کر دینے سے پہلے خلافت، سلطنت حکومت جو چاہو کہہ لو اپنے گھر میں تھی اس لئے جناب امام حسین علیہ السلام شہِ عالی ہی تھے اور رہے بھی، بلکہ حقیقت میں وہ دین اور دنیا دونوں عالموں کے شہنشاہ تھے۔ اس لئے ان کو شہِ عالی کہہ سکتے تھے۔ اور آپ اس کے مخاطب صحیح تھے۔ اس لئے بھی حضرت شہر بانو کے لفظ شہِ عالی سے امامِ وقت اور پیشوائے مذہبی اور دینی آقا سمجھ میں نہیں آتے۔

اس کے علاوہ مصرعہ میں اکبر سے دستگزرنا اور اپنے والی یعنی شوہر کے لے آنے کی فرمائش کرنے میں والی کے معنی امام کے نہیں ہوتے جس سے یہ سمجھا جاسکے کہ قائل کی طلب بربنائے حسن عقیدت و اصلاح عاقبت تھی الفاظ متولہ سے صاف اور صریح طور پر مترشح ہی نہیں ہوتا۔ بلکہ ثابت ہوتا ہے کہ قائلہ کے جذبات کی ترجمانی میں الفاظ کا استعمال نہایت غیر ذمہ دارانہ طریقہ پر کیا گیا ہے جس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ایک خاتون علی الاعلان کہہ رہی ہے کہ مجھے بیٹے کی ضرورت نہیں ہے۔ میرے شوہر کو بلا دو۔

اب رہا مولف المیزان کا شبلی کے الفاظ کو غیر مہذب سمجھنا تو اس کی ذمہ دار خود ان کی عقل ہے۔ شبلی نے لے آؤ کے مفہوم کو دوسرے لفظوں میں پیدا کر کے کہہ کر ظاہر کیا ہے اور اس لفظی ترجمہ کو مولف المیزان نے درست سمجھا ہے، جب ہی اُنھوں نے "بلادو" کے الفاظ سے لے آؤ کا منشا ظاہر کیا ہے۔ غرض یہ ہے کہ صاحب المیزان کے ذہن میں وہ اعوجاج نہیں پایا جاتا جو مولف حیاتِ دبیر کا حصہ ہے۔

حقیقت یہی ہے کہ اعتراض مرزا دبیر پر ہے نہ کہ حضرت شہر بانو پر۔ یہ اور بات ہے کہ آدمی محدث ہو مفسر ہو مگر اس سے یہ تو ممکن نہیں ہے کہ ادیب

مرتفع ہوسکے۔

اس تمام بحث کا بھی نتیجہ یہی نکلتا ہے کہ شبلی کی لفظی و معنوی گرفتیں صحیح ہیں مصنف میزان نے جواب دینے کی ناکام کوششیں کی ہیں۔ مگر نتیجہ مفید برآمد نہ ہوا۔

ایک اور مقام ملاحظہ ہو

اے دبدبۂ نظم دو عالم کو ہلادے　　اے طنطنۂ طبع جز و کل کو ملادے
اے معجزۂ فکر فصاحت کو جلادے　　اے زمزمۂ نطق بلاغت کا صلہ دے
اے بائے بیاں معنیٔ تسخیر کو حل کر
اے سینِ سخن قاف سے تا قاف عمل کر　　دبیر

"طنطنہ کو جز و کل کے ملا دینے سے کیا نسبت ہے۔ زمزمۂ نطق سے بلاغت کا صلہ مانگنے کے کیا معنی؟ بیان کی "ب" کو تسخیر سے کیا خاص تعلق ہے؟ اسی طرح سخن کے "س" کو قاف سے تا قاف عمل کرنے کے لئے کیا خصوصیت ہے"

(موازنۂ انیس و دبیر شبلی)

"جواب۔ طنطنہ کے معنی ہیں کروفر شان و شوکت۔ بس مراد یہ ہے کہ اے پرنور طبیعت کے ایسے شاندار اور پُرشوکت الفاظ بیان کر کہ زمین و آسمان میں تہلکہ پڑجائے اور جز و کل میں لرزہ پیدا ہوجائے۔ (۲) زمزمہ سُریلی آواز کو کہتے ہیں۔ نطق کو ایک ذی روح چیز فرض کرلیا ہے۔ اور چونکہ ذی روح میں آواز پیدا ہوسکتی ہے۔ اس لئے شاعر کہتا ہے، اے نطق تو اپنی گویائی سے میرے فصیح و بلیغ اشعار کا صلہ عطا کر۔ یعنی دادِ سخن دے۔ باقی اعتراض کی چونکہ کوئی وجہ نہیں لکھی۔ اس لئے ہم بھی اس سے قطع نظر کرتے ہیں" المیزان صفحہ ۲۷۵

شبلی کے اعتراضات کی جزالت دیکھ کر حیرت ہوتی تھی کہ ان کا کیا جواب ہوسکتا ہے۔ مگر المیزان میں عنوان "جواب" دیکھکر اشتیاق پیدا ہوا، پڑھا، جو عبارت نظر سے گزری، ہدیۂ ناظرین کردی گئی۔

واقعہ یہ ہے کہ یہ جذبہ اور چیز ہے کہ کلام پر اعتراضات رفع کئے ہیں اور یہ حقیقت ایک جداگانہ شے ہے کہ کلام میں ایسی کمزوری پائی جائے جو بمنزلۂ جزو کلام کے ہو اور ہزار کوشش سے کبھی رفع نہ ہوسکے۔

مرزا صاحب کے بند کا پہلا مصرع لفظاً معنیً پاک صاف اور ہر طرح سے بے عیب اور عمدہ ہے اور مرزا صاحب کے عزم حوصلہ کا امین طبیعت کا کروفر طبیعت کی شان و شوکت کچھ بھی مان لینا چاہیئے اور اس پر غور غور کرنا چاہیئے کہ دبدبۂ نظم اور طنطنۂ طبع میں ترادف ہے یا نہیں، یہ تو ظاہر ہے یہ دونوں مرکب مترادف نہیں ہیں۔ نظم کا تعلق الفاظ ہی سے، اب طبع یا طنطنۂ طبع کا تعلق شاندار اور پُرشوکت الفاظ سے کیا ہے؟ یہ غور کرنے پر بھی سمجھ میں نہیں آتا۔

اور پھر شاعر تو یہ کہتا ہے کہ اے طبیعت کے کروفر جز و کل کو ملادے اور طرحدار شاندار اور پرشوکت الفاظ پیش کرتے ہیں۔

مرزا صاحب کے بند کے دوسرے مصرع میں کوئی لفظ، کوئی قرینہ ایسا موجود نہیں ہے جس سے یہ سمجھ میں آئے کہ طبیعت کے کروفر کو جز و کل کے ملا دینے سے کیا مناسبت۔ طبیعت کا کروفر زیادہ سے زیادہ یہ کرسکتا ہے کہ عارضات کو جو محل طبیعت یعنی جسم پر واقع ہوں، دفع کرسکے۔ چنانچہ کہا جاتا ہے کہ طبیعت مدبر بدن ہے۔ مگر یہ سمجھ میں آنے والی بات نہیں ہے کہ طبیعت کے کروفر سے جز و کل مل سکتے ہیں۔ شاید مرزا صاحب کا مقصد اس عام مقولہ سے ہو جو ایک خاص طبقہ میں مشہور ہے کہ فلاں شخص نے طبیعت اچھی پائی ہے۔ یعنی شعر اچھے کہتا ہے۔ اگر یہ بھی تسلیم کرلیا جائے تو اس سے زیادہ سے زیادہ یہ مستفاد ہوتا ہے کہ طبیعت کا کروفر عالم شعر پر شاعر کی حکومت قائم کردے۔ مگر اس کو جز و کل کے ملا دینے سے کیونکر تعبیر کیا جاسکتا ہے؟ چونکہ کلام میں لفظاً کوئی ایسا قرینہ موجود نہیں ہے جس سے مولف المیزان کا اجتہاد مستنبط ہوسکے۔ لہٰذا تاویل ناقابلِ قبول۔ اور اعتراض بجائے خود نہایت چسپ ماننا پڑتا ہے۔

دوسرے اعتراض کا جواب بھی صحیح نہیں۔ نطق کا استعارہ ذی رُوح سے بالکل درست، مگر اس ذی روح کی قوت زمزمہ کو پھر ذی رُوح سے استعارہ کرنا اور صرف "اے" سے اُسے مخاطب بنانا اور پھر اسی زمزمہ سے بلاغت کا صلہ مانگنا مہمل نہیں تو اور کیا ہے؟ زمزمہ کو بلاغت سے کسی طرح بھی کوئی تعلق نہیں۔ کتب معانی میں یہ کہیں نہیں کہ کلام فصیح مقتضائے حال و مقام کے مطابق کو زمزمہ میں آتا ہوا ہونا چاہیئے۔

بلاغت ایسے کلام کو کہتے ہیں جو مقتضائے حال کے مطابق ہے اور زمزمہ بقول مولف المیزان، سریلی آواز، تو اس سے تو زیادہ سے زیادہ یہ خیال سمجھ میں آتا ہے کہ مرزا صاحب مطالبہ فرماتے ہیں کہ اے زمزمہ بھیروں کے سروں میں میری بلاغت کی داد دے۔

زمزمہ سے صلۂ بلاغت کا مطالبہ کرنا بجائے خود نئی اپج ہے۔ مگر سوال یہ ہے کہ زمزمہ میں بلاغت کا صلہ دینے کی خصوصیت تسلیم کرلینے کی کیا وجہ ہے۔ اور وہ کونسا قرینۂ کلام ہے جس سے یہ سمجھا جاسکے کہ اس محل پر زمزمہ ہی سے بلاغت کا صلہ چاہنا مقتضائے حال کے مطابق ہے۔

پہلے اور تیسرے مصرع پر شبلی کی گرفت نہیں ہے۔ اس کی وجہ معلوم کرلینے کے بعد یہ حقیقت بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ دوسرے اور چوتھے مصرع اور ٹیپ پر اعتراضات کیوں صحیح ہیں۔

مرزا صاحب کے بند کا تیسرا مصرع ہے ”اے معجزۂ فکر فصاحت کو جلا دے“ اس مصرع میں معجزۂ فکر کو ذی روح سے استعارہ کرکے حکم دیا گیا ہے کہ فصاحت پر جلا کردے یا فصاحت جو مرچکی ہے اُسے زندہ کردے اور بلحاظ پہلے معنی کے فصاحت کو خود ایسی چیزوں سے استعارہ کیا گیا ہے جو قبولیتِ جلا کی قابلیت رکھتی ہو۔

یہ صرف کہنے کا اندازہ ہے۔ ورنہ قائل کا مقصود یہ ہے کہ الفاظ فصیح فکر سے بہم پہونچتے ہیں۔ اسی منشا کو ظاہر کرنے کے لئے فکر کو مخاطب کرکے کہا ہے کہ ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر ایسے الفاظ لا جو فصاحت کے مظہر اتم ہوں، ظاہر ہے کہ کلام میں بے غور و فکر جو الفاظ برتے جائیں گے وہ ہمیشہ ہمیشہ فصیح نہیں ہوسکتے۔ برخلاف اس کے اگر تفحص الفاظ میں فکر صرف کی جائے گی تو کلام نہایت فصیح ہوگا۔

الفاظ کا جو ذکر کیا گیا اس کا قرینہ کلام میں یہ ہے کہ فصاحت ہمیشہ ظاہر ہوگی کلام یا اجزائے کلام یا متکلم میں۔ یعنی دنیا میں فصاحت کا مظہر سوائے کلمہ و کلام و متکلم اور کوئی شے نہیں ہوسکتی اور ظاہر ہے کہ کلام مجموعۂ الفاظ ہے اور انہی مسلسل الفاظ کے مجموعہ متکلم تصور میں آتا ہے۔ اس قرینہ سے کس کو انکار ہوسکتا ہے۔

اس سے ثابت ہوگیا کہ فصاحت کو جلا دینے کے لئے معجزۂ فکری کو مخاطب بنانا نہایت بلیغ پیرایۂ بیان ہے۔

یہ کہے بغیر نہیں رہا جاسکتا کہ نازک خیال معنی آفرین شاعر نے معجزۂ فکر کو مخاطب کیا ہے۔ مجرد فکر کو مخاطب نہیں کیا ہے۔ کنا یہ اس میں یہ ہے کہ فصاحت کو اس طرح جلا دے کہ اس میں شانِ اعجاز پیدا ہوجائے جس سے زیادہ فصاحت ممکن ہی نہو۔ نیز معجزہ کا تعلق زندہ کردینے سے بھی نہایت مناسب ہے۔

تیسرے مصرع کے معنی اور قرائن کا دوسرے چوتھے پانچویں چھٹے مصرعوں سے مقابلہ کرنے پر مجیب صاحب کے جواب کی قلعی کھل جاتی ہے۔

اسی بنا پر یہ دعویٰ کیا جاسکتا ہے کہ طنطنۂ طبع میں نہ تو یہ اہلیت ہے کہ وہ جزو کل کو ملا دے اور نہ یہ بات مصرع میں موجود ہے کہ جزو کل کے ملا دینے سے قائل کا منشا کیا ہے؟ اور نہ کوئی قرینہ کلام میں موجود ہے جس سے مؤلف المیزان کے خیال کے مطابق پُرشان و شوکت الفاظ سمجھے جاسکیں۔ نیز یہ بات بھی ہمیں نہیں بھولنا چاہئے کہ چیستان، پہیلی، معما، اور محاکات میں زمین و آسمان کا فرق ہے اگر مرزا صاحب کے بعد میں معترض علیہ مصرعے معما یا چیستان ہیں تو ہمارے موضوع سے خارج ہیں۔

جو بیان ٹیپ کے شعر کے متعلق دیا گیا ہے وہ ایک فریب سے زیادہ نہیں ہے۔ اعتراضات کی وجہ صاف صاف موجود ہے۔ ملاحظہ ہو

(۱) اے طنطنۂ طبع جزو کل کو ملا دے۔ اعتراض شبلی۔ طنطنہ کو جزو کل سے ملا دینے سے کیا نسبت؟

(۲) اے زمزمۂ نطق بلاغت کا صلہ دے۔ اعتراض شبلی۔ زمزمۂ نطق سے بلاغت کا صلہ مانگنے کے کیا معنی؟

(۳) اے بائے بیاں معنیٔ تسخیر کو حل کر۔ اعتراض شبلی۔ بیان کی ب کو تسخیر سے کیا خاص تعلق ہے؟

(۴) اے سینِ سخن قاف سے تا قاف عمل کر۔ اعتراضِ شبلی۔ سخن کے سین کو قاف سے تا قاف عمل کرنے سے کیا خصوصیت ہے؟

چاروں اعتراضوں کی تعمیر یکساں ہے۔ پھر دوسرے اور چوتھے مصرعوں کے متعلق اعتراضات کا جواب لکھنا اور ٹیپ کے متعلق یہ کہنا کہ ”باقی اعتراضات کی چونکہ کوئی وجہ نہیں ہے۔ اس لئے ان سے قطع نظر کی جاتی“ خلاف واقعہ ہے۔ اگر اعتراض کی وجہ ہے تو چاروں مصرعوں میں یکساں ہے اور نہیں ہے تو چاروں مصرعوں میں نہیں ہے۔ یہ دعویٰ قطعاً غلط ہے کہ ٹیپ پر اعتراضات کی وجہ نہیں ہے۔ اگر بالفرض اعتراضات کی وجہ کسی کی سمجھ میں نہیں آئی ہے تو پیش کی جاتی ہے۔

بیان کی ”ب“ کو تسخیر سے کیا تعلق ہے؟ اس جملہ سے جو بات سمجھ میں آتی ہے یہ ہے کہ کسی کو موہ لینے کے اسباب میں سے قوت بیان بھی تسلیم کی جاسکتی ہے یا یوں سمجھئے کہ علم بیان کو مسخر کرنے کے کام میں لانا ممکن

ہے۔ بہرحال بیاں سے یہ بات ممکن ہے مگر لفظ بیان کی صرف "ب" سے تسخیر کا دور کا بھی تعلق عقلاً سمجھ میں نہیں آتا۔ بائے بیان بائے ابتدائے قرون بھی نہیں ہے۔ جس میں کائنات کو جمع سمجھ لیا جائے۔ اسی لئے معترض نے اپنے اعتراض میں لفظ خاص برتا ہے اور اگر یہ کہا جائے کہ بیان کی ب کو تسخیر سے خواہ مخواہ بھی تعلق ہے تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ بقیہ حرف بیان کونسا نقص ہے کہ وہ معنی تسخیر کو حل کرنے سے مجبور ہیں۔

غرض یہ ہے کہ لفظ بیان کی ب کو تسخیر سے کوئی خاص علاقہ معلوم نہیں ہوتا۔ اگر شاعر یہ کہتا کہ اے بیان تو معنی تسخیر کو حل کر تو "ان من البیان السحرا" کے حکم کے مطابق صحیح ہو سکتا تھا۔ مگر بیان کی ب کو خصوصیت سے مخاطب کرنا قطعاً لغو ہے اور ہزار وجہوں میں سے ایک وجہ بھی ایسی نہیں پائی جاتی جو بیان کی ب میں تسخیر کے حل کو ثابت کر سکے۔ اور ان بے انتہا الفاظ کی ب رہ جائے جن کی ابتدا بیان سے مشابہ ہے۔

اسی طرح سے "اے سین سخن قاف سے تا ناف عمل کر" کا معاملہ ہے یہ ممکن ہے کہ شاعر کے سخن کا شہرہ ہو جائے اور اس کی شہرت کا عمل دنیا بھر میں ہو جائے جیسا کہ مرزا دبیر کے لئے بلاشبہ مسلم بھی ہے۔ مگر صرف سین سخن سے یہ اُمید رکھنا اُمید کی غلطی ہے۔ اس کی مثال بھی بقیہ امور میں بیان کی ب کی سی ہے۔

اس تنقید کے بعد یہ فیصلہ آسانی سے کیا جا سکتا ہے کہ شبلی اور حریفانِ شبلی میں باعتبار تنقید کیا تناسب ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ علامہ شبلی کو مرزا دبیر سے دشمنی نہیں ہے۔ جہاں مرزا دبیر کی شبلی نے تعریف کی ہے میر انیس پاسنگ بھی نہیں اُترتے۔ اس کے اسباب بھی معقول ہیں اور جہاں اعتراضات جڑے ہیں وہ بھی نہایت موجہ۔ غرض یہ ہے کہ انیس و دبیر کے متعلق ضرب المثل اور ادراک شعر میں شبلی کا پلہ بہت بھاری ہے۔ صاحب المیزان اور مولف حیات دبیر کو اس پاسنگ میں بھی لانا شبلی کی توہینِ ادبی ہے۔

بے وفا دنیا

گھٹائیں اُٹھیں، مینہ برسا، سبزے اُگے، کلیاں نکلیں، پھول کھلے، طائروں نے خوشی کے ترانے گائے، دریاؤں میں خوشی کی لہریں دوڑیں۔ غرضکہ تمام دُنیا عشرتکدہ بن گئی، بعد ختم مدت برسات نے خیمے ڈیرے اُٹھائے، اور اپنی ہری بھری کھیتی کو موسم سرما کے سپرد کر کے رُخصت ہوئی۔ مگر کبھی کبھی ابر کے ٹکڑے ان کھیتوں کی نگرانی کر جایا کرتے تھے۔ موسم سرما نے شبنم کے چھینٹے دے دے کر حتی الامکان دنیا کی شادابی کو برقرار رکھا۔ مگر جب اس کی مدت ختم ہوئی اور موسم گرما آیا تو ہری بھری کھیتیوں کو دیکھکر اُس کے دل میں آتشِ حسد بھڑکی اور دم کے دم میں اُسے جلا کر خاکستر کر دیا۔ حسبِ معمول پھر ابر کے ٹکڑے آئے اور اپنی سبز و شاداب کھیتی کو تباہ و برباد دیکھکر فوراً پلٹے اور برسات کو اس واقعہ کی اطلاع کی۔ برسات نے اس خبر کے پاتے ہی اپنے سیاہ بالوں کو بکھرا دیا۔ اور چیخیں مار مار کر رونا شروع کیا۔ دنیا کی۔ دنیا کی تباہی پر تو برسات روتی ہے اور بیوفا دنیا اس کے رونے پر اظہارِ مسرت کرتی ہے۔

محسن اعظم گڈھی

محبت اور گناہ

سجاد حیدر ملیح آبادی

بعض اوقات دو پریمی محبت کے نشے میں سرشار کیفیاتِ شباب کے جھولے میں جھولتے ہوئے وہ کچھ کر بیٹھے ہیں، جسے دنیا کی اصلاح میں گناہ کہا جاتا ہے

دو معصومانِ ازلی زندگی کی شاہراہ پر ملے۔ ایک دوسرے سے ناواقف..... ایک دوسرے سے بے خبر....... مختلف ماحولوں کے تاثرات لئے ہوئے ملے...... دنیا نے انھیں دیکھا....... رشک کی نظروں سے...... حسد کی نظروں سے..... محبت کی نظروں سے..... اور بالآخر حقارت کی نظروں سے...... ملے......... ایک ہو گئے...... وابستہ ہو گئے ...... لیکن..... احساسِ گناہ نے انھیں دو مختلف راستوں پر ڈال دیا.....

مجھے یاد ہے وہ رنگین شام..... رنگین اس لئے کہ میرے فسانۂ حیات کی معراج اسی شام کو ہوئی..... دلکش شام..... دلکش اس لئے کہ فطرت نے اپنے مخفی خزانوں کا انکشاف اسی شام کو کیا..... اور..... غمگین شام..... غمگین اس لئے کہ آج تک اس کی یاد میرے دل میں کانٹے کی طرح کھنکتی ہے،

میں روز پارک میں۔ اسی بنچ پر بیٹھ کر فکرِ معیشت، غمِ حیات اور قوانین (مظاہر) فطرت پر تبصرہ کیا کرتا۔ پہروں خاموشی سے اپنے بجھتے ہوئے ولولوں کی مشعل سینہ تاریک میں فروزاں کئے بیٹھا رہتا۔ ابھی میری زندگی کا آغاز تھا۔ میں نے زندگی کی صرف اٹھارہ بہاریں دیکھی تھیں..... اٹھارہ..... آہ! کتنی خزاں آشنا بہاریں..... آج بھی جب ان لمحوں کا تصور میری آنکھوں میں پھر جاتا ہے تو میری آنکھوں میں ساون کی سہانی جھڑی کی طرح آنسو ٹپک پڑتے ہیں مجھے ان گزرے ہوئے واقعات سے اب کوئی واسطہ نہیں۔ لیکن یک لخت کسی کے قدموں کی دلفریب..... اور... پر معنی چاپ نے میرے دل کی کایا پلٹ دی۔ اور یہی وہ تلخ لیکن بہار آفریں حقیقت ہے۔ جسے میں سینے سے لگائے بیٹھا ہوں۔

ہاں! تو مجھے وہ رنگین شام آج بھی یاد ہے۔ آہ! وہ اپریل کی سہانی شام...... آسمان پر سیاہ بادل چھائے ہوئے تھے۔ سست اور تند ہوا کے جھونکے بادلوں سے کھیل رہے تھے۔ اور میرے پریشان خیالات کو منتشر کر کے ایک شفقی دنیا میں پہنچا رہے تھے۔ لیکن میں بہار نا آشنا سبزہ زار اور گلستان کی ان گوناگوں دلفریبیوں اور جنت آفرینیوں کو نظروں سے روندتا ہوا آغوشِ تخیل میں خواب کی دنیا بنائے بیٹھا تھا۔ خواب اور خیال کی پریاں میرے پہلو میں کیف آور گیت گا رہی تھیں، اور میں آسمان کی سرفراز وسعتوں میں سے گزر رہا تھا۔ میں اپنی کہنی اپنے زانو پر ٹیک کر ٹھوڑی کو تکیہ دئے ہوئے تھا، میرے بال میرے خیالات کی طرح الجھے ہوئے اور پریشان تھے۔ میری آنکھیں دیکھ رہی تھیں...... لیکن نہیں دیکھ رہی تھیں۔ اور میں پارک میں بیٹھا ہوا فضاؤں میں اڑا جا رہا تھا۔ دور...... انسان کی بھیانک اور خوفناک دنیا سے دور...... بہت دور...... جہاں روپے کی جھنکار انسان کے کانوں میں ہمدردی، اخوت یا انسانیت..... نیکی اور لطف کے خلاف روئی ٹھونس نہیں سکتی..... جہاں زمزمہ نعرۂ الست یا ہو کی آوازیں بلند ہوتی ہیں...... وہاں..... وہاں...... افق کے اس پار.............

مجھے معلوم نہیں کہ میں اس عالمِ خواب میں کب تک بیٹھا رہا..... ہاں یہ جانتا ہوں کہ جب مجھے گھر جانے کا ہوش آیا تو رات کافی بھیگ چکی تھی۔

بادل ہوا کے تھپیڑوں کی تاب نہ لاکر بھاگ رہے تھے، اور چاند...... دھلا ہوا چاند اپنی روپہلی کرنیں بساطِ ارض پر نچھاور کر رہا تھا۔ عالم مادی میں آنے کے بعد فطرت کی اس شفقتِ مادری سے ہمکنار ہوتے ہی مجھے احساس ہونے لگا کہ میرے خیالات حرفِ غلط کی طرح (کالعدم؟) ہیں۔ دنیا کتنی فرحت خیز ہے، ...۔کتنی پاکیزہ..... اس سیمیں چاند کی مانند سحر آفریں..... اور مصور کے (لوحِ تصور) نقوش کی طرح رنگین....... ہاں میرے خیالات سراسر غلط ہیں...... یہ کبھی نہیں ہو سکتا....... یہ ہوائیں....... یہ گلستان...... یہ چاند...... کیا ان سب کے ہوتے ہوئے جور واستبداد کا دور دورہ ہو سکتا ہے؟ کیا خدا کی خدائی میں ظلم اور غرور کی کارفرمائی ہو سکتی ہے؟

اور کسی نے ہلتی ہوئی شاخوں میں سے جھانک کر کہا.......

نہیں! ہرگز نہیں!!

میں پھر خیالات میں ڈوب گیا۔ سڑک پر ایک موٹر فراٹے بھرتی ہوئی میرے خیالات کی دنیا کو اپنے ساتھ لے گئی........ میں نے اپنے قرب وجوار پر نظر دوڑائی...... ایک انگڑائی لی۔ اور اس وجدانگیز منظر کو نظر سے چومتا ہوا اُٹھ کھڑا ہوا۔ مجھے محسوس ہونے لگا کہ کسی نے میرا دامن تھام لیا ہے۔ میں عالمِ مجبوری میں ٹہلنے لگا۔ وہ فوارہ جو پارک کے عین مرکز میں واقع ہے، اس طرح موتی بکھیر رہا ہے آج کتنا حسین معلوم ہوتا ہے۔ میں نے خیال کیا کہ آج تک میری توجہ اس کے حسن کی تہ تک نہ پہنچ سکی۔ میں نے اپنے آپ میں اور اپنے گردوپیش میں ایک زبردست انقلاب محسوس کیا...... آخر یہ سب کیوں ایسا تھا؟...... میں نہ سمجھ سکا، یہ ایک راز تھا۔

آج میری حقیقت آشنا بصیرت دیکھ رہی ہے......

........آہ!!

میں نے فضا میں ایک خفیف سی سرسراہٹ محسوس کی، اور اپنے پیچھے قدموں کی آواز سنی...... میں یکلخت مڑا..... اور..... ٹھٹک کر رہ گیا۔ میں نے خیال کیا میری آنکھوں کو دھوکا ہوا..... میں نے آنکھیں ملیں........ پھر دیکھا....... اور دیکھنے پر مجبور ہو گیا...... میری رگوں میں خون انتہائی سرعت سے دوڑنے لگا........

میرے کانوں میں ساز بجنے لگے۔ میرا دل دھک سے رہ گیا...... میرے احساسات نے ایک انگڑائی لی اور میں نے دیکھا کہ میرے دل میں پریشانی اور جھجک کی کشمکش سی ہو رہی ہے...... ایک نوجوان لڑکی....... ایک خوابناک حقیقت....... فرشتوں کی طرح معصوم...... فطرت کا ازلی شاہکار ......حسین لڑکی....... دوشیزہ......سفید ساری میں ملبوس ...... میرا دل لپکا.......سنہ کی طرف....... میں نے منہ پھیر لیا اور پھر اسی وجدانی کیفیت میں ڈوبنے کی کوشش کرنے لگا....... لیکن میرا متاعِ تخیل لٹ چکا تھا........ میں نے اُسے کنکھیوں سے دیکھا.... وہ میرے بالکل قریب کھڑی مجھے نہ جانے کن نگاہوں سے دیکھ رہی تھی، میری زندگی کی دلچسپی کا یہ پہلا باب تھا........

اب میں اپنی ہمت اور ضمیر کی طاقت کو مجتمع کرنے کی سعی لاحاصل کرنے لگا۔ میں نے پھر شرمگیں نگاہوں سے اُسے دیکھا....... چاندنی رات..... فوارے کی نغمہ بارتانیں....... میں اور وہ....... ہاں..... وہ وہ جس کی تخلیق پر فطرت نازاں ہے۔ سفید لباس پہنے ہوئے عین اسی طرح ...... جیسے سہانی صبح کو گرمی کے موسم میں بکھرے ہوئے شفاف پانی میں تیرتی ہوئی...... للبلیں...... عنفوانِ شباب کا عالم...... سیاہ اور چمکتی ہوئی زلفیں شانوں پر بکھری ہوئی جنھیں نرم و نازک ہوا اٹکھیلیاں کرتی ہوئی چھیڑ رہی تھی۔ آنکھیں نیم خوابی کا عالم لئے ہوئے شرابِ ارغوانی کی مستی لنڈھا رہی تھیں۔ مجھ پر بیخودی سی طاری ہو گئی...... بہت دیر تک ہم یونہیں کھڑے رہے...... وہ چند قدم اور آگے بڑھی...... حتیٰ کہ اس کی مطمئن اور گرم گرم سانس میرے چہرے سے مَس ہونے لگی۔ میں تڑپ گیا....... پُروا کی بدمست ہوا سے بل کھائی ہوئی بیلوں کی طرح لچک سا گیا۔ اور میں نے بے اختیار اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالدیں...... نظریں ملانے کی کوشش کی..... آہ! اس بدمست رات کو........

وہ جھجک گئی...... بالکل اس مور کی طرح جو تنِ تنہا جنگل میں ناچ رہا ہو اور کسی کے قدموں کی چاپ سنکر تھم جائے....... بیقرار سا... وہ جھجک گئی...... مسکرائی...... اس کی نیچی نگاہوں میں حیا کھیلنے لگی...... ایک لمحہ میں...... فقط ایک لمحہ میں...... بجلی کی طرح

آنکھوں کو خیرہ کر دینے والے لمحہ میں......... ایک لمحہ میں......... ہاں ایک لمحہ میں...... اس کا ہاتھ......... چاند کی کرنوں کی طرح لطیف ہاتھ...
...... میرے ہاتھ میں تھا۔ وہ شرما گئی......... لیکن کامراں...... اپنے ارادے میں کامیاب......... میں نے دیکھا چاند کی آوارہ کرنوں کی سحر خیز ضو میں ایک اکیلی شاخ پر دو پرندے آ بیٹھے......... ہماری طرح
...... ہو بہو...... اب میری تنہائی کا احساس معدوم ہو چکا تھا۔ اب ہم بھی دو تھے...... دو......... ساری دنیا کا مقابلہ کرنے کے لئے
دو...... دو۔ اندھیری راتوں میں تابانی بھرنے والے دو.........
دو فرشتوں سے بڑھکر معصوم......... حیوانوں سے بڑھکر ناواقف آدم
دو...... خدا کی بادشاہت میں فرشتے......... ہوس سے ناآشنا اور عین فریب ہوس کے دام میں......... دو.........

ہوا سرسرائی...... چاند مسکرایا......... اور ایک پتلی سی ریشمیں بدلی سے جھانکنے لگا......... پارک ہنسنے لگا، اور دنیا میرے ساتھ شادیانے بجانے لگی......... میرے کانوں میں شہنائیوں کی آوازیں آنے لگیں......
دنیا میری خوشی کے ساتھ کتنی طرب خیز ہو گئی تھی۔ ہاں...... وہ میرے راگ کو الاپ کر فرط مسرت سے پاگل ہو رہی تھی۔ وہ اس حسین جوڑے کو اپنے خواب...... برسوں کے خواب...... کی تعبیر سمجھنے لگی......
دنیا......... دنیا اب بدل چکی تھی۔

ہم خاموشی سے پارک کی روشوں پر ٹہلتے رہے۔ خاموش......
فضا کی طرح خاموش اور پھر اپنے محبوب بنچ پر آ کر بیٹھ گئے۔ اب بھی ہم میں قوت گویائی نہیں تھی......... اے وائے وہ خوشگوار رات......
یہاں بھی ہم کافی دیر تک خاموش بیٹھے رہے۔

اس نے اپنی جیب سے ایک کاغذ نکالا، پہلے خود دیکھا اور پھر جھجکتے ہوئے میری طرف بڑھا دیا......... میری ساز روح کا ہر تار بجنے لگا......... میں نے چاند کی روشنی میں دیکھا......... میری تصویر تھی......
میں نے اندازہ لگایا وہ آرٹسٹ ہے۔ یہ ایک پنسل اسکیچ تھا جو ابھی ابھی میری خوابیدہ کیفیت میں تیار کیا گیا تھا۔

بنچ پر بیٹھا ہوا ایک نوجوان...... بکھرے ہوئے بال، الجھی ہوئی نگاہیں، کہنی زانوں پر رکھے......... ٹھوڑی ہتھیلی پر ٹیکے ہوئے...... ایک ٹانگ دوسری ٹانگ پر رکھے...... بالکل میری طرح ایک نوجوان اور روندا ہوا......... لیکن مجھ سے کہیں زیادہ خوبصورت......... کہیں زیادہ حسین۔
.... اس نے سینہ تان کر اپنے شاہکار کی طرف دیکھا اور پھر پُرغرور اور متکبرانہ لیکن ہنستی ہوئی آنکھیں میری دلی کیفیت کا جائزہ لینے کی غرض سے میرے چہرے پر گاڑ دیں۔ میں نے اپنی نگاہیں شوخ اور آوارہ نگاہیں جھکاتے ہوئے کہا۔ "آپ بہت اچھی تصویر بناتی ہیں"۔ اس سے زیادہ تعریف میری زبان سے ادا نہ ہو سکی۔ "آپ کا حسنِ نظر ہے" اُس نے جھکتے ہوئے اور اپنے گھٹنوں پر سر رکھتے ہوئے کہا۔ کتنا دلفریب خواب ہے۔ میں نے دل میں سوچا۔ کتنی شائستہ لڑکی ہے۔ ہم دیر تک خاموش بیٹھے رہے میں نے ایک آدھ مرتبہ موسم سرما کی تعریف کرنی چاہی۔ لیکن ناکام رہا۔ اُس نے اُٹھتے ہوئے کہا "مجھے اجازت دیجئے" مجھے جھرجھری سی آ گئی۔ میرے چہرے پر اضطرار کی ایک لہر سی دوڑ گئی۔ میں نے نام دریافت کرنے کی خواہش ظاہر کی۔ اُس نے متبسم لہجہ میں جواب دیا "مجھے شیلا کہتے ہیں"۔ کتنا پیارا نام ہے۔ میں نے دل میں ایک سرور محسوس کیا۔ اس کے جانے کا خیال آتے ہی میرے دل میں سوالات کا ایک دریا اُمنڈ آیا میں نے سب ہی کچھ تو پوچھ ڈالا۔ کیا؟ کہاں؟ کب؟ کیسے؟ یہی الفاظ تھے جو بار بار دوہرائے جا رہے تھے۔ اس نے ایک ایک کر کے سب کا جواب دیا اور دوسرے دن شام کو آنے کا وعدہ کر کے چلی گئی۔ میں اُسے جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ اور وہ بھی مُڑ مُڑ کر مجھے دیکھتی رہی۔

میں اس بنچ پر بہت رات گئے تک بیٹھا رہا۔ اور اس انقلاب عظیم پر غور کرتا رہا۔ ایک ایک لفظ اس وقت جاذب نظر اور مرکز توجہ بنا ہوا تھا۔ اور جس قدر غور کرتا تھا اتنا ہی یقین ہوتا جاتا تھا کہ یہ خواب ہے حقیقت سے بہت بعید۔

یہ تھی ہماری پہلی ملاقات جس نے میری زندگی کی کائنات زیر وزبر کر دی۔

(۲)

ہم روز شام کو ملا کرتے۔ گھنٹوں باتیں ہوتیں۔ ہم بے تکلف ہوتے جا رہے تھے۔ اب ہم دنیا کی نظروں میں دو، اور اپنی نظر میں ایک تھے، میں نے اسے اپنے قالب میں حلول پایا۔ اب فراق کا ایک لمحہ کانٹا ہوئے شیر

لانے سے کم نہ تھا۔ اب ہم دونوں ہم خیال ہم مشرب اور ہم مذہب تھے۔ ہم نے دو مختلف مذہبوں کی تفریق مٹا ڈالی تھی۔ ہماری نظر میں انسانیت ہی سب سے بڑا اور عالمگیر مذہب تھا۔ ہم لمحہ لمحہ دن بدن ایک دوسرے کے قریب ہوتے جارہے تھے۔ ایک دوسرے کے دل کی کیفیت سے آشنا۔۔۔۔ ایک دوسرے کے رازوں سے آگاہ۔۔۔۔۔۔ ایک دوسرے کے دلدادہ ۔۔۔۔۔ دلنواز۔۔۔۔۔۔

اب مجھے معلوم ہو چکا تھا کہ وہ ایک مقامی اسکول میں تعلیم پا رہی ہے، اس کے والد ایک کامیاب وکیل ہیں۔ اس شب کو جب ہماری غیر متوقع ملاقات ہوئی۔ اس کے والدین کسی خاص تقریب پر جا چکے تھے۔ گھر میں سوائے ایک بوڑھی ماما کے اور کوئی نہیں تھا۔ وہ ناسازیٔ طبیعت کا بہانہ کرکے پارک چلی آئی تھی۔۔۔۔۔۔ ہائے اس فردوس نظرات کو ۔۔۔۔ اس دلکش سہانی اور۔۔۔۔۔۔۔ غمگین رات کو۔۔۔۔۔

وہ مجھے روز عجیب و غریب انداز سے بٹھا کر میری تصویر بنایا کرتی۔۔۔۔۔۔ ایک سے ایک اچھی۔۔۔۔۔۔۔ ایک سے ایک حسین، لیکن سب مجھ سے کہیں زیادہ خوبصورت ہوتیں۔ میں اکثر اس سے کہا کرتا، شیلا تم مجھ پر فطرت سے زیادہ فیاض ہو۔ کمال تو یہ ہے کہ صانع ازل نے مجھے جس خوبی کا بہرہ ور نہیں بنایا تم وہی پیدا کرتی ہو۔ کتنی فیاض ہو شیلا! وہ اب بھی جھینپ جایا کرتی، اور یہی کہتی کہ کمبخت تصویر ہر مرتبہ بگڑ جاتی ہے۔ آپ کی آنکھیں، آپ کے بال، آپ کے ہونٹ ایسے ہی کیوں نہیں کھنچتے۔ میں مسکرا دیتا۔

اس نے مجھے تصویر کھینچنا سکھایا۔ میں تنہائی میں اس کے تصور کو سامنے بٹھا کر تصویر بنایا کرتا۔ میں اُسے دکھاتا، وہ ہنس دیتی پھر اس پر فلسفیانہ تنقید ہوتی۔ یہی باتیں ہوا کرتیں۔ آج تک نہ مجھے یہ کہنے کی جرأت ہوئی کہ مجھے تم سے محبت ہے اور نہ وہ ہی کہہ سکی۔ البتہ آنکھیں اس راز کو فاش کئے بغیر نہیں رہتیں۔۔۔۔۔۔۔ ہائے وہ رس بھری آنکھیں۔

ایک دن وہ حسب معمول میری تصویر بنا رہی تھی۔ لیکن اس مرتبہ مجھے اس انداز سے بٹھایا گیا تھا جس کے لئے سنجیدگی ضروری تھی، یعنی شاعرِ عالم خیال میں۔ مگر میں اس کی اُلجھنوں اور حیرانیوں کو دیکھکر ہنس پڑتا، اور اس طرح تصویر بگڑ جاتی۔ اس نے مجھے گھور گھور کر دیکھا۔ میں مسکرا دیا۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ اس نے مجھے شوخ نظروں سے دیکھا۔ گردن کو جھٹکا دیا۔۔۔۔۔۔ ہاتھوں کو ملا۔۔۔۔ اور نظروں ہی نظروں میں وہ کچھ کہہ ڈالا کہ میں بے چین ہو گیا۔ اس نے منہ موڑتے ہوئے کہا، تم بڑے وہ ہو۔ میں نے مسکرا کر پوچھا کیسا؟ وہ ہنس پڑی۔۔۔۔۔ اور مجھے دزدیدہ نظروں سے دیکھکر لاجواب کر دیا۔ وہ کچھ دیر تک خاموش کھڑی رہی۔ اور بالآخر اس نے فیصلہ کیا کہ اب کے وہ ایسی تصویر بنائے گی جو بڑے بڑے آرٹسٹوں سے خراج تحسین حاصل کرے گی۔ ہم دونوں کھل کھلا کر ہنس پڑے۔ میں نظروں ہی نظروں میں اس کی بلائیں لینے لگا۔

(۳)

ویسی ہی ایک رنگین شام تھی۔۔۔۔۔۔۔۔ سہانی۔۔۔۔۔۔۔ رومانی۔۔۔ ۔۔۔۔ دریا کے کنارے اُن پگڈنڈیوں پر جو سبزہ زار کی مانگ نکالتی ہوئی چلی گئی تھی۔ ہم دونوں بادۂ شباب سے سرشار چلے جارہے تھے سوسج بھی دیکھکر شرمایا سا جارہا تھا، دریا کا پانی ٹکٹکی ٹکٹکی کر ہمیں دیکھ رہا تھا۔ لہریں مدھم سروں میں گا رہی تھیں۔ اور ہم باتیں کرتے کرتے ہوئے چلے جارہے تھے۔ بھولی بھالی کیف آور باتیں۔

آہ ہماری زندگیوں میں کس قدر رومان کھنچ آیا تھا۔ ہم وقت کی رفتار سے بالکل بے پروا۔۔۔۔۔۔ لاابالی طبیعتیں۔۔۔۔۔۔ آوارہ مزاج۔۔۔ ۔۔۔۔ چلے جارہے تھے۔ خراماں خراماں۔۔۔۔۔ میں اس پر فخریہ نگاہیں ڈالتا ہوا جارہا تھا۔۔۔۔۔۔۔ وہ ہاں وہ جس کے پاؤں پر دنیا سر رکھنا فخر گردانتی ہے۔۔۔۔۔۔ ہاں وہی میرے ساتھ چلی جارہی تھی۔ اُن کی تلاش میں، تصویر بنانے کے لئے۔ کاش یہ تصویر یونہیں بگڑتی رہتی وہ لجارہی تھی۔ ہائے صنف نازک کی پاکیزگی۔۔۔۔۔۔۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ ہم یونہیں چلے جائیں گے۔ زندگی کے زیر و بم سے ناآشنا۔۔۔۔ تلخیٔ جہان سے قطعی بے بہرہ۔۔۔۔۔۔ لیکن وقت۔۔۔۔۔ برق رفتار وقت۔۔۔۔۔۔ اپنے ابلق پر سوار آتشیں کوڑے برساتا ہوا مغرب کی طرف پا در رکاب جارہا تھا۔ کتنے دلوں کو روندتا ہوا۔۔۔۔ کتنوں میں امیدیں سہاتا ہوا۔۔۔۔ کتنوں کو پیغامِ حیات اور کتنوں کو فنا کے

گھاٹ اتارتا ہوا چلا جا رہا تھا۔ وقت ۔۔۔۔۔۔ ہاں وقت بیتا جا رہا تھا۔

میں نے ڈوبتے ہوئے سورج پر نظر ڈالی۔ اور پھر شیلا کے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "شیلا آؤ کہیں نکل چلیں۔ اس غم و آلام کی بستی سے دور ۔۔۔۔۔۔ دور ایسی جگہ جہاں نہ کوئی دوست ہو اور نہ کوئی دشمن ہو شیلا کہو تیار ہو؟"

انسان آہ بدبخت انسان تو عورت کی فطرت کو نہیں جان سکتا۔ آہ تجھے کیا خبر تھی کہ تیرا یہ سوال کیا رنگ لائے گا جس میٹھے میٹھے خواب کو وہ دیکھ رہی تھی۔ وہ خواب و خیال بن کر رہ جائے گا۔ لاتعبیر ۔۔۔۔۔ بے حقیقت ——— آہ!

وہ چونک پڑی ۔۔۔۔۔ اس کے ہونٹ ۔۔۔۔۔ کپکپاتے ہوئے ہونٹ کھل گئے ۔۔۔۔۔ اس کی آنکھوں سے شعلے نکلنے لگے۔ اس کا ہاتھ اٹھ کر گال تک پہنچا اور اُسے سہلانے لگا۔ اُسنے پھٹی پھٹی آنکھوں سے مجھے دیکھا۔ مجھ سے دیکھا نہ گیا ۔۔۔۔۔ میں نے مسکرانے کی کوشش کی لیکن مسکرا یا نہ گیا ۔۔۔۔۔ رونے کی کوشش کی لیکن نہ رو سکا۔ بولنے کی کوشش کی لیکن نہ بول سکا ۔۔۔۔۔ میں اپنے الفاظ پر غور کرنے لگا، میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے ۔۔۔۔۔

سورج غروب ہو رہا تھا۔

مطلع صاف تھا ۔۔۔۔۔ شام کی لطافتوں میں رنگ بھرا جا رہا تھا، چاند ——— پھیکا پھیکا چاند ۔۔۔۔۔ اپنی منزلیں خاموشی سے طے کر رہا تھا۔ دور افق پر چند اک بدلیاں خونِ شفق سے سُرخ تھیں۔ کھیتوں پر خاموشی طاری تھی۔ کبھی کبھی لمبی لمبی دُوب ہوا کے جھونکوں سے جھومنے لگتی۔ دور سڑک پر بیل گاڑیوں کے پہیوں کی آوازیں آ رہی تھیں۔ چند دیہاتی گیت گاتے جا رہے تھے۔ کبھی کبھی کوئی لہر اُٹھ کر کنارے سے ٹکراتی اور سر مار کر ناکام واپس لوٹ جاتی۔ مجھے اپنی زندگی کا سفر یاد آیا ۔۔۔۔۔ میں نے سوچا میں بھی دنیا کے بحرِ بے پایاں میں ایک موجِ حقیر کی طرح ہوں جو آزادی کی خواہش لئے ہوئے بصد دقت کنارے تک پہنچتی ہے۔ اور پھر بے نیل و مرام شکست خوردہ ہو کر اعترافِ شکست کرتی ہوئی لوٹ جاتی ہے۔

میرے ہاتھ ابھی تک اس کے شانوں پر تھے۔ وہ ابھی تک میرے سوال سے متاثر گردو نواح سے بے خبر تھی۔ ہم یونہیں دیر تک چپ چاپ کھڑے رہے۔ پھر گھاس پر بیٹھ گئے۔ میں نے دریا کی روانی کی طرف اُس کی توجہ مبذول کرانی چاہی۔ لیکن وہ خاموش رہی۔ میں نے اس کی زلفوں سے کھیلتے ہوئے دبی آواز میں کہا "شیلا" اس نے نظریں اُٹھاتے ہوئے میری طرف دیکھا۔ میں مسکرایا ۔۔۔۔۔ ایک خفیف سی مسکراہٹ اس کے لبوں پر نمودار ہوئی جس کے پیچھے ایک غیظ آلود ۔۔۔۔۔ لیکن نہایت ہی دلفریب نظر چھپی ہوئی تھی۔ اُس نے مجھے غور سے دیکھا۔ میں پھر مسکرایا۔ اس نے مسکرا کر نظریں زمین میں گاڑ دیں۔ اب میری فتح تھی ۔۔۔۔۔ میرے دل کی کلی کھل گئی۔ میں بے اختیار سا ہو گیا۔ میں نے اُس کی گردن میں بانہیں ڈال دیں۔ میرے جسم میں بجلی سی دوڑ گئی۔ دل فرطِ انبساط سے بھر آیا ۔۔۔۔ میری آنکھوں میں خوشی سے آنسو چھلک آئے۔ خوشی ۔۔۔۔۔ آہ عارضی خوشی ۔۔۔۔۔ مجھے کیا خبر تھی کہ یہ شام وہ خونیں شام ہے جس کی تہ میں میری آرزوؤں کے خون کا رنگ بھرا ہوا ہے۔

اُس نے پھر مسکراتی ہوئی نظریں اُٹھائیں ۔۔۔۔۔ میں نے پیار سے پھر کہا "شیلا" اُس نے مسکرا کر میری طرف دیکھا ۔۔۔۔۔ میں اپنا سر اس کے سر پر رکھ کر ایک وجدانی کیف محسوس کرنے لگا۔ وہ خاموش بیٹھی اپنے ہاتھوں سے ۔۔۔۔۔ مضطرب ہاتھوں سے کھیلتی رہی۔

——— ساحرہ

میں نے سر اُٹھایا ۔۔۔۔۔ اور اُس نے میری جانب دیکھا، آہ! ۔۔۔۔۔ یہی وہ دیکھنا تھا جس نے نہ معلوم مجھے کیا کر دیا۔ میں بیتاب ہو گیا۔ اضطراب کی حالت میں آنکھیں بند کئے ہوئے عالمِ پرواز میں محسوس کرنے لگا۔ میں نے ۔۔۔۔۔ میں نے اس کے لبوں میں اپنے لب پیوست کر دیئے۔ کائنات چونک اُٹھی۔ ایسا معلوم ہونے لگا جیسے سازِ طرب کی کوئی تان ٹوٹ گئی۔ جیسے ۔۔۔۔۔ جیسے کسی کے ہاتھ سے مندر میں پوجا کا تھال گر گیا ہو ۔۔۔۔۔ جیسے کوئی طلسم ساکت ہو گیا ہو ۔۔۔۔۔ میں نے دیکھا دریا کی لہریں اچک اچک کر میری طرف بڑھ رہی ہیں۔ ہوا ایک لخت بہت تیز ہو گئی ہے ۔۔۔۔۔ میں نے دیکھا پرندے میرے سر پر منڈلا کر عجیب و غریب بولیاں بول رہے ہیں۔ مچھروں نے میرے کانوں میں میری حرکت پر ایک بصارت افروز تقریر شروع کر دی۔ گویا سارا عالم مجھے گھور گھور کر دیکھ رہا تھا۔ میرا ضمیر مجھے لعنت ملامت کرنے لگا۔

بوسہ۔ بوسہ۔ اُف اتنا بڑا گناہ۔ میں نے دیکھا رات، خوفناک رات نہایت سرعت کے ساتھ بڑھتی چلی آرہی ہے۔ میرے کان بج رہے ہیں۔ دل دھڑک رہا ہے۔ میرے احساسات چونک اُٹھے۔ اور میں نے اپنا سر زمین پر ٹیک دیا۔ اُس نے مجھے جھٹکا دیا۔ ایک خوفناک درندے کی طرح میری طرف دیکھا۔ اُف میں نے آنکھیں بند کرلیں۔ اس نے کیا کہا۔ مجھے معلوم نہیں۔ ...... وہ بولتی رہی بہت دیر تک ...... اور میں دنیا کی لعن طعن کا مرکز آنکھیں بند کئے پڑا رہا۔ جب میں نے آنکھ کھولی تو فضا میں قدرے سکون پیدا ہو چلا تھا۔ ...... تارے جھلملا رہے تھے۔ چاند اب بھی مجھے گھور کر دیکھ رہا تھا۔ دریا کی لہریں ساکن ہو چلی تھیں۔ لیکن روداد الم اب تک سنا رہی تھیں اور اب تک میں وہیں بیٹھا تھا۔ لیکن ...... لیکن وہ جا چکی تھی، نہ معلوم کب کی ....

میں نے ایک بار پھر اپنی تنہائی کو محسوس کیا۔ پھر دنیا کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی اور پھر ان ہی خیالات میں ڈوب گیا۔ ابھی تک میرے لبوں میں ارتعاش پیدا تھا۔ بہت رات گئے تک میں وہیں بیٹھا رہا۔ گیدڑوں کی آوازیں آرہی تھیں۔ فضا ہولناک اور متوحش سی ہو رہی تھی۔ میں نے اُٹھنے کی سعی کی۔ لیکن لاحاصل۔ کبھی کوئی پرندہ سر پر سے اُڑ جاتا اور مجھے تنہائی کا احساس ہونے لگتا۔ دور گھاٹ پر دھوبیوں کی آوازیں آرہی تھیں اور کوئی درد انگیز لہجہ میں یہ مصرع الاپ رہا تھا ع

تیرا کس سے ہے مورکھ پیار، پیار، پیار

تیرا کون ہے۔

تعویذ

دے گا یہ مسلمان کو پیغام مرا کون؟ | اور اُدو کی خاطر نہیں قرآں کی آیات

بے ضرب کبھی قلعۂ خیبر نہیں کھلتا | بیکار ہے بیکار ہیں حجروں کی مناجات

اِن تکیہ نشینوں کے تعاویذ پہ مت ریجھ | ناپید ہیں اب ان میں بزرگانِ کرامات

بے پیر عمل کوش سے تعویذ کہ تجھ پر

انگریز کا سایہ ہے نہیں سایۂ جنات

شہید ابنِ علی

شاعرِ مغرور

میں شاعر ہوں، جہاں میرا، فلک میرا، زمیں میری
نگاہِ عام سے منزل ہے بالاتر کہیں میری

جگہ دیتا ہے آنکھوں پر مرے جذباتِ عالی کو
یہ قدر و منزلت کرتا ہے چرخِ ہفتمیں میری

مرے ہی دم سے ہے آباد اک دنیا خیالوں کی
پہونچ رہتی ہے تا خلوت گہِ عرشِ بریں میری

کیا اب تک نہ سجدہ میں نے دولت کے خداؤں کو
یہی ہے فخر جس پر ناز کرتی ہے جبیں میری

مرقع ہوں مجسم جلوۂ نیرنگِ ہستی کا
نہ پہچانے گا کوئی، ایک حالت ہے کہیں میری

کبھی بھرتا چلا آتا ہوں میں، پھولوں سے دامن کو
کبھی اشکوں سے آتی ہے نظر، تر آستیں میری

مزاجِ حسن و عشق اور میرے ابرو کے اشارے پر
وہ ہے نباضِ فطرت طبع احساس آفریں میری

ازل کے روز سے، میں رازدارِ بزمِ قدرت ہوں
ودیعت ہے محبت مجھ میں، فطرت ہے امیں میری

نکلتی ہیں تڑپ کر شعر سے جذبات کی موجیں
ترنم بن کے چھا جاتی ہے، آوازِ حزیں میری

وہ جادو ہے کہ رُک جاتی ہے دریا کی روانی بھی
اگر سنتا ہے نظمِ دلکش و سحر آفریں میری

دلِ سنگِ گراں، ہوتا ہے شق، میری نگاہوں سے
اُلٹ دیتی ہے عالم کی صفیں چینِ جبیں میری

قلم ہوتے ہیں سر، سیفِ قلم کی ایک جنبش میں
بُجھا دیتی ہے شمعوں کو ہوائے آستیں میری

مرا ہر لفظ، دیتا ہے سبق، اہلِ زمانہ کو
ہمیشہ مانتے ہیں بات، اربابِ یقیں میری

نہیں جھکتی ہے آگے کبر و نخوت کے پہاڑوں کے
قدم ذروں کے اکثر چوم لیتی ہے جبیں میری

جنم لیتا ہے شاعر اپنے کچھ ماحول سے پہلے
ابھی کیا کر سکیں گے قدر، یہ اہلِ زمیں میری

نشتر سندیلوی

مذہب اور رواداری

سید اختر علی تلہری از لکھنؤ

مذہبی جماعت کے "فکری استبداد" اور "عملی خود غرضی" نے بہت سے نئے دماغوں میں یہ خیال پیدا کر دیا ہے کہ "مذہب کی پابندی" "رواداری" (Toleration) کے جذبہ کو جو بہت سے انسانی رجحانات واحساسات کا سرچشمہ ہے نہایت نقصان پہنچاتی ہے جو لوگ کسی ایک مذہب کے اصول وفروع کے الف سے لے کر ے تک پابند ہوتے ہیں۔ وہی دوسرے مذاہب والوں کے لئے کاردبہ آستین اور خنجر بکف رہتے ہیں، "خود زندہ رہو اور دوسروں کو زندہ رہنے دو" کے "صحیح عملی تخیل" پر مذہبی انسان کبھی قادر نہیں ہو سکتا۔ دنیا میں جتنے اصطلاحی مذاہب موجود میں اُن میں سے ہر ایک کا جاننے والا اپنے دماغ میں اس عقیدہ کا محل طیار کئے ہوئے ہے کہ جنت کی تمام نشاط آفریں نعمتیں صرف اُس کے اور اُس کے ہم مشربوں کے لئے وقف ہیں اور دوزخ کی جملہ وحشتناک عقوبتیں اُس کے مخالفین کے لئے مہیا کی گئی ہیں۔ نجات کے دودھ اور شہد کی بہتی ہوئی نہروں سے صرف وہی لذت اندوز ہو سکتا ہے اور جو لوگ اُس سے الگ راستہ پر چل رہے ہیں اُنھیں اس کا ایک قطرہ بھی میسر نہیں ہو سکتا۔ انسانی دماغ میں اس عقیدہ کی تکوین کا نتیجہ یہی ہو سکتا ہے کہ "غیر رواداری" کی بھی ساتھ ساتھ نشو ونما ہوتی جائے۔

ہمیں جب نجات کے "کوثر و سلسبیل" کے تنہا حقدار ہیں اور ہمارے مخالف جتنے ہیں وہ "زمہریر آمیز آب حمیم" کے مستحق، تو پھر ہمارے دل میں "تفوق و برتری" اور "فخر و غرور" کے جذبہ کی پیدائش لازمی ہے۔ تفوق و برتری اور فخر و غرور کے نشو ونما کے ساتھ ساتھ مخالف عقیدہ رکھنے والوں سے نفرت وحقارت بھی پیدا ہوتی جائے گی۔ اور ظاہر ہے کہ یہی وہ سب چیزیں ہیں جو "غیر روادارانہ ذہنیت" کے لئے عناصر کا کام کرتی ہیں۔

مذہبی جماعت کے عقیدہ کا یہ وہ خطرناک پہلو ہے جس نے اسے دوسرے انسانوں کے مقابلہ میں ہمیشہ شمشیر بکف رکھا ہے۔ اسی غیر روادارانہ ذہنیت کے ماتحت اس نے دوسرے اپنے ہم نوع بیگناہوں کا خون بہایا ہے اور آزادانہ قوموں کو صحیح مذہب کا پیرو بنانے کے پردہ میں غلامی کی زنجیریں پہنائی ہیں۔ مذہب کی جو قومیں پابند رہی ہیں وہ دوسروں پر یوں ہی بلائیں نازل کرتی رہی ہیں اور خود بھی بلاؤں میں مبتلا رہی ہیں۔ مغربی قومیں جب تک مذہبی جھمیلوں میں مبتلا رہیں ان میں انسانی شائستگی کبھی پیدا نہ ہوئی۔ "تمدنی عروج اور سیاسی ترفع" کی منزلیں اُن سے ہمیشہ دور رہیں۔ لیکن جیسے ہی مذہبی اصولوں کی طرف سے وہ بے پروا ہوئیں، اُن کے فکر و عمل کے بازوؤں میں توانائی پیدا ہو گئی۔ سعادتیں اُن کا ہاتھ چومنے لگیں۔ اور ترقیاں اُن کے قدموں پر نثار ہونے لگیں۔ ہندوستانی قومیں اسی غیر روادارانہ ذہنیت کی وجہ سے آپس میں ایک دوسرے سے پیپل کی ایک شاخ کاٹے جانے اور مسجد کے سامنے باجا بجائے جانے پر دست و گریباں رہتی ہیں۔ دنیا کے امن و سکون کے سب سے زیادہ دشمن وہی لوگ ہیں جن کے ماتھوں پر سجدوں کے گھٹے پڑے ہوئے ہیں یا بڑے بڑے قشقے لگے ہوئے ہیں۔ آج بھی ہندوستانیوں کی تباہی کے اسباب اُنھیں ڈھونگوں اور قشقوں والوں کی آغوش میں پرورش پاتے ہیں۔ اگر ہندوستان سے اس "مذہبی غیر رواداری" کا خاتمہ ہو جائے تو بہت سے فتنوں کا سدباب

ہو جائے۔ یہ جہنم کدہ اگر بہشت بریں نہ بھی بن سکے تو بھی "اعرافی شان" ضرور پیدا کرے۔

اس میں شک نہیں کہ .... مذہب کے خلاف یہ فرد قرار داد جرم نہایت سنگین ہے اور اگر اس اعتراض میں کوئی حقیقت نکلتی ہے تو مذہب اس قابل نہیں رہتا کہ ہم اُسے پُراحترام تقدس کی مسند پر جگہ دیں، اور اُس کی عبودیت کا حلقہ کانوں میں پہن لیں۔ لیکن اطمینان کی بات یہ ہے کہ اعتراض کا تحلیل و تجزیہ کرلنے پر اس بظاہر سچ میں بہت کچھ جھوٹ بھی نکل آتا ہے۔

اس میں تو شک نہیں کہ مختلف مذاہب کے پیرؤوں کی بڑی تعداد ایسی مل سکتی ہے جن کے دامنوں پر فتنہ انگیزی و خون آشامی کے داغ نظر آتے ہیں جنھوں نے مذہب کی آڑ لے کر وہ جفائیں کی ہیں جن کے تصور سے قلب انسانی لرز اُٹھتا ہے، اور یہ بھی یقینی ہے کہ مذہب کے بہت سے حلقہ بگوش عملی رواداری سے کچھ زیادہ ذائقہ شناس نہیں ہو سکتے۔ لیکن اصلی سوال یہ ہے کہ نفسِ مذہب کو اس بارے میں کس منطق کی بنا پر قصوروار گردانا جاسکتا ہے۔

اگر "عیسائیت" کی امن پسندانہ تعلیمات کے باوجود عیسائیوں کی عملی زندگی میں تیغ و تفنگ، شمشیر و خنجر کے خونین مظاہرے نظر آتے ہیں تو اس کی ذمہ دار عیسائیت نہیں ہے بلکہ خود عیسائی ہیں۔ اسی طرح اگر وہ راستے انسانی خون کے چھینٹوں سے سُرخ ملتے ہیں جن سے مسلمان فاتحانہ پرچم اُڑاتے ہوئے گزرے ہیں تو اس میں قصور اسلام کا نہیں ہے کیونکہ اُس کی نظر میں فتنہ و فساد برپا کرنا سفک دما کا کھیل کھیلنا اور کمزور قوموں کو غلام بنانا جہنمی کام ہیں۔ ان خون آشامانہ فتوحات کا اگر الزام آتا ہے تو اُن مسلمانوں پر جو اپنے نفس کے جذبات کی تسکین کے لئے یہ خونیں کھیل کھیلے۔

اگر نفسِ مذہب اور خون آشامانہ مشغلوں میں کوئی منطقی لزوم ہوتا اور ایک دوسرے سے جدا نہ ہوسکتے تو اُن قوموں کو تو خونریزی کے ذوق سے پاک ہونا چاہئے تھا جو مذہب سے علیحدہ ہو چکی ہیں۔ بالشویک روس "لامذہبیت" کا بلند آہنگ نقیب ہے۔ مگر اُس کا ذوقِ خون آشامی کسی پرانی مذہبی حکومت سے کچھ کم ہے؟ فاشسٹ حکومتیں اٹلی۔ جرمنی وغیرہ بھی مذہب سے کوئی خاص واسطہ نہیں رکھتیں۔ مگر کیا اُن کے کارناموں سے بوئے خون نہیں آرہی ہے؟

مذہب کا پردہ ضرور اُٹھ گیا ہے مگر نتیجہ میں کوئی فرق نہیں معلوم ہوتا جو لڑائیاں مذہب کے نام سے لڑی جاتی تھیں وہ اب دوسرے ناموں سے لڑی جارہی ہیں۔

شاید کہا جائے کہ اگر لامذہبیت اور فتنہ و فساد میں کوئی مغائرت نہیں ہے تو اس کا نتیجہ یہ کب ہے کہ مذہبیت کا دامن فتنہ و فساد سے پاک ہے؟ اوّل تو دو متناقض چیزوں کا ایک ہی نتیجہ تک پہونچانا خود حیرت انگیز ہے۔ اس کے علاوہ عملی زندگی میں ہمیں اس تفرقہ کا فائدہ کیا حاصل ہوگا؟ مذہب کے حلقہ سے ہم اس لئے نکلنا چاہتے ہیں کہ فتنہ و فساد اور قتل و غارت کے جرائم سے دنیا کو محفوظ بنا دیں۔ لیکن اب جب دوسرے حلقہ میں داخل ہوتے ہیں وہ اُس سے بھی کہیں زیادہ اس نقطۂ نظر سے خطرناک معلوم ہوتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ واقعی مذاہب جن اصولوں کی تلقین کرتے ہیں اگر اُن کی صحیح ترجمانی کی جائے اور اُنھیں کے سانچے میں ہم اپنے کردار ڈھالنے کی کوشش کریں تو کبھی "غیر رواداری" کا جذبہ ہم میں نشو و نما نہیں پا سکتا۔

حقیقت میں جو مذہب مذہب کہلائے جانے کا مستحق ہے وہ لازماً "افساد فی الارض" کا شدید ترین دشمن ہوگا۔ اور اس کی یہی کوشش ہو سکتی ہے کہ وہ اُن اسباب کے قلع و قمع کی کوشش کرے جو قلب انسانی میں فتنہ و فساد کی تخم ریزی کرتے ہیں۔

اب یہ دوسری بات ہے کہ مذہب اس کوشش میں کہاں تک کامیاب ہو سکا۔ اصل یہ ہے کہ حیوانیت و بہیمیت کی چیرہ دستیاں انسانیت کو فروغ پانے کا موقع کم دیتی رہی ہیں اور انسانیت و حیوانیت کی کشمکش میں مذہب شکست خوردہ نظر آتا رہا ہے۔

اس سلسلے میں مذہبِ اسلام نے جو کام کیا ہے وہ ہمارے اس نظریہ کی صداقت کا بیّن ثبوت ہے۔

اسلام نے یہ اچھی طرح سمجھ لیا تھا کہ حیوانیت کے انسانیت پر غلبہ کے اصل سبب تین ہیں۔ زر۔ زن۔ زمین۔ اُس نے ان تینوں کے متعلق اس قسم کے اصول وضع کئے جو قطعی طور سے مائل بہ ترقی ہیں اور جو ہماری حیوانی قوتوں کو اعتدال کی حالت میں رکھ سکتے ہیں۔ اب یہ ہماری

بدبختی ہے کہ اسلام کی واضح تعلیمات کے موجود ہوتے ہوئے ہم میں ایک خطرناک چیز پیدا ہوگئی ہے، جسے "مذہبی جنون" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ یہ مذہبی جنون اُن مذہبی افراد کے تخیلات و اعمال سے پیدا ہوگیا ہے۔ جن کی عقلوں پر اوہام کے پردے پڑے ہوئے ہیں، جنھیں "فکری شعور" کا ذرا سا بھی حصہ نہیں ملا ہے۔ اور جو اپنے اُن مخصوص جذبات کے ماتحت جن کے خمیر میں "زر۔ زن۔ زمین" جیسے قوی فتنہ و فساد کے آفریدگار کہیں نہ کہیں سے دخل پائے ہوئے ہیں۔ "اسلامی تفکر و تعقل" کا مقاطعہ کرچکے ہیں۔

یہ واقعہ ہے کہ جو لوگ عقل کی نظر سے نہیں دیکھتے اور محض نقلی و روایتی دائرہ' میں اپنے خیالات کو گردش دینے کے عادی ہیں اُنھیں مشکل ہی سے اُن فرائض کا احساس ہوسکتا ہے جو انسانیت اُن پر عاید کرتی ہے۔ اُن کے مذہب کے پرستار ہونے سے اس میں کوئی فرق نہیں پیدا ہوتا۔ یہی لوگ مذہب کے وہ نادان دوست ہیں جو اپنے افکار و اعمال سے اس کی "واقعی حقیقت" مسخ کئے ہوئے ہیں۔ مذہب کے حلقہ بگوشوں کو فکر و نظر سے روکتے ہیں۔ جہاں کسی نے ذرا بھی "جسارت فکر" سے کام لیا اور اُنھوں نے اُسے ملحد و زندیق قرار دے کر اپنے خیال میں اُسے دوزخ کا ایندھن بنا دیا۔ ان کے گلے میں کتنی ہی سو دانہ تسبیحیں پڑی ہوں، ماتھے پر سجدے کے کتنے ہی ڈھٹے ہوں یا گٹھے ہوں مگر یہ تنگ نظر افراد وسیع تر فرائضِ انسانی کی انجام دہی کی صلاحیت نہیں رکھتے یہی اشخاص ہیں جنھوں نے مذہبی عقائد کی غلط ترجمانیاں کر کے ایک کو دوسرے سے متنفر بنا دیا ہے۔ دورِ وحشت کی یادگار خون آشامیوں کے مذاق کی شارح نہیں ہونے دی ہے۔

اس میں شک نہیں کہ دنیا کے جملہ مذاہب کسی نہ کسی شکل میں اپنی ہی "نجات" (Salvation) کے معتقد ہیں۔ مگر اس کو غیر رواداری کا آفریدگار سمجھنا پروازِ تخیل کی بے اعتدالی کا نتیجہ ہے۔ اس نظریہ کی تشریح میں اُن لوگوں کی طرف رجوع کرنا دانشمندی نہیں ہے جن کا مذاق انسانی بلند نظری سے فروتر ہے۔ ان مسائل کی ترجمانی کے لئے اُن افراد کی طرف رجوع کرنے کی ضرورت ہے جن کے قلب و دماغ کو فکری تربیت نے شائستہ بنا دیا ہے۔

اپنے اس نقطۂ نظر کی تشریح کے لئے دوسرے مذاہب سے قطع نظر کرتے ہوئے اسلام کو چن رہا ہوں۔

دوسرے مذاہب کی طرح اسلام بھی جن عقائد و اعمال کی تلقین کرتا ہے اُنھیں نوعِ انسانی کے لئے سرمایۂ نجات سمجھتا ہے۔ اور وہ اپنے اس یقین میں مستحکم ہے کہ اسلام ہی کے تعلیم کردہ "فکری و عملی نظریئے" انسان کو صحیح معنوں میں انسان بنا سکتے ہیں اور اُس کے خزانہ میں وہ حکیمانہ اوامر و احکام ہیں جو آدم و حوا کے بیٹوں اور بیٹیوں کی علمی و عملی تربیت اس عنوان سے کرسکتے ہیں ہیں کہ وہ مکمل طور سے شائستہ و مہذب افراد بن سکیں اور اُن کے لئے دینی و دنیوی فلاح کے راستے کھل جائیں۔

"عقیدۂ نجات" کی یہ حد تو نہایت ہی ضروری ہے۔ کیونکہ اس یقین کا فقدان ہمیں اس قابل نہیں رکھ سکتا کہ ہم کسی نظامِ عمل پر واقعی طور سے کاربند ہوسکیں۔ لیکن اس عقیدہ کا مطلب یا نتیجہ یہ کسی طرح نہیں ہوسکتا کہ دوسری قسم کے افکار و اعمال کے پابند افراد کو نفرت کی نظر سے دیکھا جائے اور اُن کی آسائشوں میں نفرت انگیز غیر روادارانہ روش سے خلل ڈالا جائے۔ اتنا بہرحال صحیح ہے کہ اس تخیل سے کہ کوثر و سلسبیل کے ہمیں مالک ہیں ایک قسم کی اطمینانی کیفیت دل میں پیدا ہونا چاہیئے۔ لیکن اگر پیشتر سے ہماری تربیت صحیح طور سے ہوچکی ہے اور اسلامی تعلیمات کے دوسرے رواداری پیدا کرنے والے عناصر نے ہماری ذہنیت سنوار دی ہے تو یہ "اطمینانی کیفیت" غرور کا قالب اختیار نہیں کرے گی اور دوسروں سے نفرت کا جذبہ پیدا نہیں ہوگا بلکہ اس کے بجائے ہمیں اُن کی حالت پر ترس آئے گا۔ اور یہ دیکھکر کہ وہ تباہی کے راستے پر جارہے ہیں اُن سے انسانی ہمدردی پیدا ہوگی اور یہی وہ کیفیتیں ہیں جو روادارانہ ذہنیت کے اصلی اجزا ہیں۔

اپنے کو ساحلِ نجات اور دوسروں کو قعرِ ہلاکت میں پاکر جذبۂ فخر و غرور کی آفرینش اور بالآخر اُس کا ڈوبنے والوں سے نفرت کی صورت میں منتقل ہوجانا "نفسی حیثیت" سے تنہا اس "نجات" کے عقیدہ کا نتیجہ نہیں ہوسکتا۔ اس میں دوسرے اور "نفسی موثرات" کی ضرورت ہے۔ یعنی جب تک کہ باہمی رقابتوں، رنجشوں اور حرص و ہوس نے تصادموں اور اسی قسم کی دوسری چیزوں کا ان اسباب میں اضافہ نہ ہوگا "عقیدۂ نجات" جارحانہ پہلو اختیار نہیں کرسکتا۔ مگر اس میں شک نہیں کہ انسانی طبائع کی عام افتاد دیکھتے ہوئے ہر وقت یہ خطرہ بہت قریب رہتا ہے۔ لیکن اگر

مذہب سے کوئی تعلق نہ رکھا جائے تو بھی اس خطرہ سے نجات نہیں ملتی، کیونکہ جس پروگرام کو بھی اختیار کیا جائے گا اس کو بہتر و برتر مان کر ہی عملی حیثیت اس کو دی جاسکے گی اور یہیں سے وہ تمام صورتیں قریب ہو جائیں گی جن کا نتیجہ اس پروگرام کے مخالفین سے نفرت نکلے گا۔ سوشلزم کے حامی فیسزم کے حامیوں کو نفرت ہی کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ اور فیسزم کے حامی سوشلزم کے حامیوں کا قلع وقمع ہی ضروری سمجھتے ہیں۔ یوروپ کا مطلع اتنا تاریک کیوں ہے! کیا اس کی تہ میں یہی چیز کام کرتی نظر نہیں آتی؟ اس کا علاج اگر ہے تو پھر مذہب ہی کے پاس ہے۔ مذہبی خیالات میں وہ "عدم تشدد" پیدا کرسکتا ہے جو اس تفوق و برتری کے احساس کو نفرت کے قالب میں ڈھلنے سے روک سکے۔

اسلام کے متعلق میں قطعی طور سے کہہ سکتا ہوں کہ اس کی اساس اولین عقلی فکر و نظر کی علمبرداری ہے۔ قرآن کریم تفکر و تعقل کی اہمیت پر جابجا زور دے رہا ہے۔ اور وہ افراد جو قرآن کے حقیقی طور سے سمجھنے والے تھے اُن سے جو حدیثیں منقول ہیں اُن میں بھی عقلی جذبہ کی تربیت کا خاص طور سے لحاظ رکھا گیا ہے کافی میں اس قسم کی بہت سی حدیثیں ملتی ہیں۔

اذا رأیتم الرجل کثیر الصلوۃ کثیر الصیام فلا تباھوا بہ حتی ینظروا کیف عقلہ

جب تم کسی شخص کو بڑا نمازی اور بڑا روزہ دار دیکھو تو اُس پر اُس وقت تک فخر نہ کرو جب تک کہ یہ نہ دیکھ لو کہ اُس کی عقل کیسی ہے۔

اس حدیث کا آخر مطلب کیا ہے؟ انسان کے عقلی جذبہ کو اتنا مضبوط و مستحکم بنانا کہ وہ نجات کے اصلی پہلو سمجھ سکے۔ اور اُس خطرہ سے محفوظ رہ سکے جو اس قسم کے تفاخر و مباہات کو دوسروں سے نفرت کے حدود میں کھینچ لاتا ہے۔

اس مقام پر ایک امر اور ملحوظ رکھنے کے قابل ہے۔ صحیح الفکر افراد کی نظر میں اسلام "عدلی المسلک" ہے۔ یعنی خدا کو عادل و منصف مانتا ہے۔ اس کا منطقی نتیجہ یہی ہے کہ وہ اُن غیر مسلموں کے لئے بھی دوزخ کا دروازہ نہیں کھول سکتا جو پوری تحقیق کے بعد مخالف عقائد کے پابند ہو گئے ہیں۔ آخر عادل خدا اُن غیر مسلموں لامذہبوں اور دہریوں کو دوزخ کا ایندھن کیونکر بنا سکتا ہے جنھوں نے واقعی عقل سے صحیح معنوں میں کام لیا۔ لیکن وہ دوسرے نظریات تک سمجھ ہو سکے۔ اُنھیں سزا دینا یقیناً انصاف کا غلط استعمال ہوگا۔

ظاہر ہے کہ یہ نظریہ رواداری کے جذبہ کو تقویت پہونچانے والا ہے اور تفوق و برتری کے احساس کو جارحانہ حدود میں داخل ہونے سے روکنے والا۔

ہندوستان کے مسلمانوں کے متعلق البتہ جو کچھ کہا جائے وہ صحیح ہے تنگ نظر افراد نے اسلام کے ان پہلوؤں کو نگاہوں سے اوجھل رکھا اور اس قسم کی باتیں سامنے رکھیں جنھوں نے اُن کے "عقیدۂ نجات" کو پورے طور سے جارحانہ بنا دیا۔ یہ لوگ غیر روادارانہ جذبات کی مختلف عنوانوں سے اُن میں نشوونما کرتے رہتے ہیں۔ اُن کے نقطۂ نظر میں اتنی وسعت پیدا نہیں ہونے دیتے۔ اُن کے مذہبی تخیل میں وہ غلو پیدا کر رہے ہیں۔ جو دوسروں کے وجود کا روادار نہیں ہے۔ ان حالات کی بدولت یہاں کے اچھے خاصے پڑھے لکھے افراد کثر قسم کے مذہبی دیوانے ہیں۔ جنھیں اپنے چند مخصوص مزعومات کی حمایت کے جوش میں نہ تو دیانت عمل کا پاس رہتا ہے اور نہ صدق بیان کا لحاظ۔ مذہب کے پردہ میں بیباکی سے جھوٹ بولتے ہیں، دوسروں کو فریب دیتے ہیں اور یہ سب کچھ اسلام کو فائدہ پہنچانے کے لئے کیا جاتا ہے لیکن حقیقت میں اسلام کو ان حرکات سے کوئی واسطہ نہیں ہے۔ وہ اپنے پیروؤں سے دیانت قول و عمل کا طلبگار ہے اور انھیں صادق القول و راستباز دیکھنا چاہتا ہے۔

مگر جو مسلمان حکیمانہ نظر رکھتے ہیں ان کا منتہج عمل یہ نہیں ہو سکتا وہ "جارحانہ نجات" کا علم بلند کرکے اپنا "مذہبی ذوق" رسوا نہیں کرسکتے۔

ہندوستان کی جمہوری زبان

امام اکبرآبادی

(۵)

اصطلاحات کا کام

انجمن ترقئ اردو کی سالانہ رپورٹ سے ظاہر ہے کہ اصطلاحات کا کام نہایت سرگرمی سے کیا جارہا ہے، اور ۱۹۲۰ء تک صرف اس ایک انجمن نے تقریباً چھ ہزار اصطلاحات وضع کیں۔ اور چونکہ اس انجمن کا تعلق سررشتۂ تالیف و ترجمہ حیدرآباد دکن کی سلطنت سے ہے۔ اس بنا پر کہا جاسکتا ہے کہ اس باب میں سرعت کیساتھ اضافہ ہو رہا ہے۔ اور عجب نہیں کہ اٹھارہ سال کے بعد اصطلاحات کی تعداد دس گنا ہو گئی ہوں۔ علاوہ ازیں برٹش انڈیا میں یہی کام دوسری انجمنیں بھی کررہی ہیں، اور انفرادی طور سے بھی یہ کام جاری ہے۔ انجمن ترقئ اردو کا ایک رسالہ مطبوعہ ۱۹۲۱ء میری نظر سے گزرا۔ اس میں یعنی صرف ایک پرچہ میں اصطلاحات کی تعداد ۱۰۱۹ تھیں۔ اسی سے اندازہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ یہ انجمن برقی سرعت سے کام کررہی ہے۔ اردو میں یہ کام سخت مشکل سمجھا جاتا تھا لیکن نہایت آسان نکلا۔

"سخت مشکل ہے کہ یہ کام بھی آساں نکلا"

مصطلحات

جدید مصطلحات وضع کرنے میں جہاں تک ہوسکے سادگی سے کام لینا چاہیئے۔ اس میں نہ تو عربیت کا غلبہ ہونا چاہیئے، نہ فارسیت کا، اور نہ ہندیت کا، بلکہ حتی الوسع عام فہم الفاظ وضع کرنا چاہئیں، تاکہ حافظہ پر بار کم پڑے۔ وضع اصطلاح میں موضوع لہٗ سے لفظاً کچھ مناسبت ضرور ہونا چاہیئے۔

بہرحال یہ کام اُن لوگوں کا ہے جو عربی، فارسی، انگریزی و سنسکرت کے عالم ہیں، یا تو اِن تمام علوم سے ایک شخص واقف ہو۔ اور یا پھر الگ الگ ایک ایک دو دو علوم کا ماہر ہو۔ تاکہ ایک دوسرے کا معاون بن سکے۔ یہ کام نہ تو عوام کا ہے، اور نہ خواص کا، نہ شاعر و ادیب کا۔ بلکہ علوم و فنون کے ماہرین کا ہے۔ مگر اس کے لئے کافی وقت اور روپیہ کی ضرورت ہے۔

انشاپردازوں سے

اردو زبان کے لئے یہ وہ نازک وقت ہے کہ نہ تو اس سے قبل کبھی آیا اور نہ اس کے بعد شاید کبھی آئے۔ اس لئے اس زبان کو کچھ مدت کے لئے آزاد چھوڑ دینا چاہیئے، اور دیکھنا چاہئیے کہ اس میں کس درجہ لوچ اور لچک ہے اس کے لئے چند باتیں ذیل میں درج کردینا چاہتا ہوں۔ اہل قلم غور کرکے ہوسکے تو اپنی اپنی رائے کا اظہار کریں۔

گزشتہ دور میں رسم اشارے کے واسطے واحد و جمع کے لئے علیحدہ علیحدہ الفاظ تھے۔ یعنی وہ اور وے۔ لیکن موجودہ دور کے ادیبوں نے اُسے متروک کردیا ہے۔ حالانکہ یہ زبان کی وسعت کا ثبوت ہے، جب لکھتے ہیں کہ یہ آم کے درخت ہیں۔ یا وہ آم کے درخت ہیں تو اسم اشارے کی جمع نہیں لکھتے۔ دوسری تمام علمی زبانوں میں اسم اشارے

کے لئے واحد و جمع استعمال کیا جاتا ہے۔ مثلاً انگریزی میں واحد کے لئے (   ) اور جمع کے لئے (   ) ہے۔ فارسی میں آیں اور اینہا اور عربی میں واحد کے لئے ہذا، تثنیہ کے لئے ہذان، اور جمع کے لئے ہٰؤلاء لکھا جاتا ہے۔ مؤنث کے لئے علیحدہ اسم اشارے ہیں۔

کسی غیر زبان کے لفظ کو اگر اردو نے اپنا کر اس کے معنی بدل دئے ہیں تو اس کو جائز سمجھ لینا چاہئے۔ جیسے "عرصہ" بمعنی میدان کے ہیں۔ لیکن اہلِ اردو اس کو مدت کے معنی میں استعمال کرتے ہیں۔ لہٰذا اس میں اختلاف کی ضرورت نہیں ہے۔

ایسے الفاظ جو اردو فارسی سے مرکب ہیں، اور جو اضافت کے ساتھ بولے جاتے ہیں، جیسے "سنسنی خیز" "لب سڑک" وغیرہ ان کو بھی رواج دینا چاہئے۔ واو عطف کا استعمال بھی اردو میں جائز کر دینا چاہئے مثلاً رہنے و بسنے والے۔ پڑھنے و لکھنے والے۔ ایسے مواقع پر لفظ "اور" کو متروک کر دینا چاہئے۔ لیکن مزید اختصار کے لئے نہ تو "اور" کی ضرورت ہے، اور نہ واو عطف کی۔

اردو کے بعض ذمہ دار و مشہور انشا پرداز، بعض الفاظ کا ترجمہ عجیب طریقہ سے کرتے ہیں، اور میں نے بھی چند دنوں اس کی تقلید کی، لیکن جب غور کیا تو مجھے یہ طریقہ غلط معلوم ہوا۔ مثلاً وہ لکھتے ہیں کہ "اس نقشے کو دکھاؤ" "کلکتے جاؤ" تو کسرہ کے ساتھ نہیں لکھتے۔ حالانکہ ایسے موقع پر یائے مجہول جمع کی صورت اختیار کئے ہوئے ہے۔ اس کی تکمیل صرف اعراب کے ذریعہ ہو سکتی ہے۔ مثلاً نقشۂ۔ کلکتہ۔

اردو میں غیر زبانوں کے الفاظ ایسے بھی ہیں جو غلط اعراب کے ساتھ لکھے پڑھے اور بولے جاتے ہیں۔ مثلاً مِشک۔ نِقاب، نِشیب وغیرہ۔ لیکن یہاں بجائے کسرہ کے بڑے بڑے اہلِ قلم و زبان فتحہ کا استعمال کرتے ہیں۔ اور میرے خیال میں یہ غلطی نہیں ہے۔

اردو ترجمہ میں بھی اختصار کی ضرورت ہے۔ مثلاً اردو میں بصورت صیغہ واحد آرٹ کا ترجمہ فن تو کرتے ہیں۔ لیکن فاعلی و معنی صورت کے لئے کوئی اختصار نہیں۔ مثلاً آرٹ بمعنی فن (   ) صاحب فن، اور (   ) فنیات کرتے ہیں۔ لیکن صورت فاعلی و معنی کے لئے صرف فنی استعمال کیا جائے تو کیا حرج ہے۔ اس سے معنی میں بھی فرق نہ آئے گا، اور اختصار بھی قائم رہے گا۔ فنی کے استعمال کا فرق عبارت کے سیاق و سباق سے بخوبی ہو سکتا ہے۔ مثلاً ایک فنی نے یہ کہا، اور اس نے ایک فنی بات کہی۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ زمانہ آزادی کا ہے۔ جس طرح انسان آزادی کے لئے بیتاب ہے زبان کے لئے بھی ضرورت ہے کہ کچھ مدت کے لئے اسے آزاد کر دیا جائے۔ سخت نقصان ہو جانے کا اندیشہ ہے۔ اگر اس وقت اردو زبان کو پابزنجیر کیا گیا، یا چند نفوسِ قدسیہ کی لونڈی و باندی[1] بنا دیا گیا۔ اردو اگر ایک طرف بھاشا و سنسکرت سے مستفیض ہو رہی ہے تو دوسری طرف عربی و فارسی سے استفادہ کرتی رہی ہے۔ اور یہ تمام طریقے جو اوپر بیان کئے گئے ہیں فارسی و عربی میں رائج ہیں، پھر جب اردو فارسی کا تتبع کرتی ہے تو مندرجہ بالا باتوں پر کیوں نہیں کر سکتی۔

دنیا میں اردو رسمِ خط ۶۰ کروڑ انسان جانتے ہیں

آخر میں اردو رسم خط کے متعلق میں پھر کہہ دوں کہ عموماً وہ ہندوستانی جو زبان کے مسئلہ میں دلچسپی لے رہے ہیں، اور خصوصاً وہ لیڈر جو بارہا یہ اعلان کرتے رہے ہیں کہ "تمام ملک کی وہ زبان ہوگی جو شمالی ہند میں عموماً بولی جاتی ہے۔ خواہ وہ دیوناگری میں لکھی جائے یا اردو حروف میں" ان کو اس مسئلہ پر دقیقہ رس نظر ڈالنا چاہئے، اور نہایت ٹھنڈے دل سے غور کرنا چاہئے کہ کس زبان کا رسم خط دنیا میں جانا پہچانا جاتا ہے؟ کونسا رسم خط ہند کے باہر رائج ہے؟ اور کونسا الخط مقبولِ عام ہے؟

یہ ظاہر ہے کہ تمام دنیا میں مسلمانوں کی تعداد تقریباً ۴۵ کروڑ ہے اور ان سب کا رسم خط وہی ہے جو اردو کا ہے۔ علاوہ ازیں تقریباً پندرہ کروڑ ہندو و دیگر اقوام ہند بھی اس رسم خط سے واقف ہیں۔ اب اگر آج ہندوستان کو حکومت خود اختیاری حاصل ہو جائے، اور غیر ولائتوں سے مراسلت کی جائے تو کس رسم خط کے ذریعہ آسانی ہوگی؟ اردو یا دیوناگری؟ ہندی خط تو صرف ہندوستان کی ایک

---

[1] واو عطف کا میں نے دانستہ استعمال کیا ہے۔

مخصوص جماعت جانتی ہے۔ اس سے باہر کوئی نہیں جانتا۔ لیکن اردو رسم خط کو تقریباً ۹ کروڑ انسان جانتے ہیں۔ اس لئے کہ جو رسم خط اردو کا ہے، وہی پشتو، فارسی، عربی، ترکی، اور مصری کا ہے۔

علاوہ ازیں اگر فارسیت و عربیت آمیز اردو لکھی جائے تو تقریباً نصف اردو و غیر ولایت کا آدمی بھی سمجھ سکتا ہے۔ کیونکہ عربی، فارسی الفاظ کے جو معنی ایک کابلی۔ ایک ایرانی، ایک عربی۔ ایک ترکی، ایک مصری اور ایک چینی فلسطینی کرتا ہے وہی ہندوستانی کرتا ہے۔

پھر کوئی ہے جو جواب دے کہ ہندوستان کی جمہوری زبان بننے کا کس کو حق ہے؟ اور غیر ولائیتوں سے مراسلت کرنے میں کس رسم خط کے ذریعہ آسانی ہو سکتی ہے؟

میں ایک کانگریسی مسلمان ہوں، اور کانگریس کو ایک باوقعت جماعت سمجھتا ہوں۔ لیکن میں اپنے ضمیر کی آواز کو بلند کرنے سے باز نہیں رہ سکتا۔ اُس وقت تک جب تک کہ کوئی معقول جواب دے کر مجھے مطمئن نہ کر دے۔ اگر جواب نہ دیا گیا تو زبان کے باب میں کانگریس کا ہر اعلان میری نگاہ میں مشتبہ رہیگا۔

مقالاتِ زریں

ارمان جس قدر زائد ہوتے ہیں اتنے ہی کم وقت میں موت آجاتی ہے۔

اے خوبصورت مطربہ! موسیقی تیرے رخساروں پر سانس لے رہی ہے۔

میں عشق کر کے اپنے تمام وجود سے موجود ہونے کا شکریہ ادا کروں گا۔

تمام دنیا کی بہترین عقلیں شاعر کے ایک جنون کی قیمت نہیں دے سکتیں۔

کام یوں کرو کہ ہر دن کو اپنا آخری دن سمجھو

ضمیر اخلاق و عادات کی نبض ہے

بدچلن کو ہر تماشہ میں ایک دوست مل جاتا ہے اور ہر ہوٹل میں ایک بیوی۔

اُس کے رُخسار گویا پنکھڑی پر شبنم کی ایک جھلک ہے

بُزدل سب سے پہلے اُس سے ملتا ہے جس سے ڈر جاتا ہے

جو آغوشِ مادر میں آدمی نہ بن سکا، پھر کبھی آدمی بن نہیں سکتا۔

خودکشی، بزدلی کا اعلیٰ ترین نمونہ ہے

زبان سے سچا اور دل سے جھوٹا ہونا کس قدر شرمناک کمین ہے۔

دوزخ کے اندر کوئی شعلہ اس قدر تیز نہیں جیسے عورت کی نفرت

جب تک مسیحائے اجل نہ آئے زندگی ایک ناقابلِ علاج مرض ہے۔

شعراء اور عشاق کبھی تجارت نہیں کر سکتے۔

کوئی تیرا کام نہیں کر سکتا مگر تو خود

کمزور دلوں میں محبت آشیانہ نہیں بناتی

شاید حباب موجوں کی ناامیدیاں ہیں۔

کلاک ٹاور کی چڑیا نہ ہو کہ ہر جھونکا گھما دے۔

میں کیونکر ہنسوں؟ میرے سینے کی کنجی تو اُس کی آنکھوں کے ساتھ چلی گئی۔

بعض اس قدر مغرور ہیں کہ راستے میں اگر خدا بھی مل جائے تو وہ سلام طلب کریں۔

مومن کا دل اس قدر صاف ہے جیسے جنّت کی ہوا

آ میرے دل میں اُتر آ، اے برسات کے بھیگے ہوئے ٹھنڈے چاند

قانع نہ ہونا بہادری کے فقدان کی ایک صورت ہے۔

بہادر، نرمی سے بات کرو تو بکری ہے، اور دھمکاؤ تو شیرِ غرّاں۔

محبت کا سب سے پہلا سبق ہے آنکھوں کو خوش کرنا۔

بزدل کی زندگی ضابطہ کی خانہ پُری کا نام ہے۔

اگر خدا بندوں کی ایجاد ہے تو کتنی بلند اور ضروری ایجاد ہے۔

اگر خدا نہیں، ہمیں متفق ہو کر ایک ایسا وجود فرض کر لینا چاہیئے

مجھے راحتِ حقیقی کا راستہ بتا دو، ٹھیک تو میں خود بخود ہو جاؤں گا۔

نااہل سے حاجت طلب کرنا جہنم سے بدتر ہے۔

رقص، شاعرانہ نقل و حرکت کا نام ہے۔

بازاری عورتوں کی مہربانیاں ہوا کی سی ہیں جو راستے میں ہر شے کو چھوتی ہے۔

مناظرِ قدرت شاعر سے باتیں کرتے ہیں۔

اُسے وعدے میں کیا باک ہے جسے ایفا کا خیال نہیں۔

(منقول از مقالاتِ زرّیں مصنفہ جوش)

زیکوسلوویکیا کا ماضی، حال، مستقبل

سید سعید جعفری مچھلی شہری ایم۔ ایس۔ سی (علیگ)

یورپ کی موجودہ سیاسی حالت ایسی ابتر اور پراگندہ ہے کہ عام لوگوں کے لئے اس کے نت نئے رجحانات اور میلانات کا جائزہ لینا کافی دشوار ہے۔ اگرچہ حیرت کی بات یہ ہے کہ سیاسی تحقیق بینوں کی پیشین گوئیاں اکثر صادق ثابت ہوتی ہیں ۱۱ مارچ ۱۹۳۸ء کو جرمنی نے آسٹریا پر قبضہ کر لیا۔ جو لوگ واقعات سے کماحقہ واقفیت رکھتے تھے ان کے لئے اس سنگین حادثہ نے تعجب کے لئے زیادہ سامان فراہم نہیں کیا کیونکہ آسٹریا کی گزشتہ بست سالہ تاریخ اسی "تاریخی ناگزیریت" کی متقضی تھی (جیسا کہ میں نے اپنے ایک مضمون جرمنی کا آسٹریا پر قبضہ مطبوعہ رسالہ کلیم ماہ مئی میں دکھانے کی کوشش کی ہے) لیکن بہرحال اس واقعہ نے کم از کم اتنا تو ضرور کیا کہ اکثر لوگوں کو خوابِ غفلت سے بیدار کر دیا۔ اور انھیں مجبور کر دیا کہ وہ سمجھنے کی کوشش کریں کہ سیاست کی یہ گوناگوں ہماہمی روز کیا نئے گل کھلاتی ہے

اس سے تو اکثر سیاسی محققوں کو اتفاق تھا کہ زیکوسلواکیا کی سیاسی حالت ایک نئے طوفان کا پیش خیمہ ہے۔ لیکن کم لوگ اس بازی لگانے کے لئے تیار ہو سکتے تھے کہ آسٹریا پر حملہ کے طوفان سے جو گرد اڑی تھی وہ ابھی زمین پر بیٹھنے بھی نہ پائے گی کہ بیس مئی کو پھر فضا گرد آلود ہو جائیگی اور قبل اس کے کہ زیکوسلواکیا اپنے دفاع کے امکانات طے کرے۔ طوفان اس کو گھیر لے گا۔ واقعات ابھی تک ایک ہل چل کی حالت میں ہیں اور یہ جاننے کے لئے کہ اس افراتفری سے کیا نتیجہ نمودار ہوگا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس چھوٹے سے لیکن لامحدود اہمیت کے ملک کے ماضی، حال اور مستقبل کا تجزیہ کیا جائے۔

زیکوسلواکیا۔ "لاتعداد سرحدوں کا چھوٹا سا ملک" ان ممالک میں سے ہے جو جنگِ عظیم کے بعد آسٹریا ہنگری کی ریاست عظمہ کے پاش پاش ہونے سے وجود میں آئی۔ جنگ عظیم کے اختتام پر خود مختاری کے چند علمبرداروں نے پریگ میں (جو اب اس ملک کا دارالخلافہ ہے) آزادی کا علم نصب کیا۔ میسارک کی پُرجوش وکالت نے پریسیڈنٹ ولسن کو رام کر لیا۔ اس ہونے والے ملک کے نوجوان نمائندے بینس (BENES) نے جمعیت اقوام کے نظریہ کی زور دار حمایت کی۔ مزید برآں یہ صورت (Clamenceam) کے نقطۂ نظر کے مطابق تھی کیونکہ مرد آسٹریا ہنگری کے اقتصادی اور صنعتی کاروبار کا ¾ حصہ اس چھوٹے سے ملک میں محدود کیا جا سکتا تھا۔ اس کی سرحد اس طرح ترتیب دی گئی کہ ہنگری چاروں جانب سے چھوٹی چھوٹی ریاستوں سے محصور ہو جائے، تاریخی نقطۂ نظر سے یہ نئی سرحد قابل اعتراض نہ تھی کیونکہ بوہیمیا کی پرانی سرحد اس میں شامل کر دی گئی۔ لیکن غضب ہوا کہ کئی نسلی اقلیتیں اس میں شامل ہونے پر مجبور ہو گئیں اور پریسیڈنٹ ولسن کے نظریہ خود اختیاری کا ایک نیا عملی "نمونہ" دنیا پر ظاہر ہو گیا۔ اور یہ باوصف اس حقیقت کے حسبِ "خداوندانِ امن" اس ملک کی قسمت کا فیصلہ کر رہے تھے اس وقت بھی کم از کم جرمن اقلیت جو اس میں شامل ہونے والی تھی صدائے احتجاج بلند کر رہی تھی۔ مگر نقارخانہ میں طوطی کی صدا کون سنتا ہے۔

اگر اس ناخوشگوار حقیقت سے قطع نظر کر لیا جائے تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ یورپ کی زمین سے اس نئے ملک کی تراش کافی کامیاب ثابت ہوئی۔ زراعتی پیداوار کی اس ملک میں کمی نہ تھی۔ اگرچہ لوہے کی درآمد کی ضرورت تھی۔ لیکن اور تمام خام اشیا کی فراوانی تھی۔ جس کے باعث مابعد جنگ عظیم میں اس ملک کی مالی حالت نہایت ہی خوش کن تھی، اور کوئلہ، مشینری، کپڑے، اون، چینی کے برتن نہایت ہی کثرت سے باہر بھیجے جاتے تھے، اور ان کے علاوہ باٹا کے جوتے تو تھے ہی جو لاکھوں کی تعداد میں بیرون ملک کو روانہ کئے جاتے تھے۔ یہ درست ہے کہ اس ملک میں جہاں بیشمار نسلیں ملتی تھیں ان کی تقسیم نہایت ہی دشوار تھی۔ لیکن کسی بات کے لابدی ہونے سے اس کی برائیوں اور کمزوریوں پر پردہ نہیں پڑ سکتا۔ کیونکہ کمزوریوں کا عجیب تکلیف دہ قاعدہ یہ ہے کہ وہ "غلط" جگہوں پر اپنی موجودگی کا اقرار کرانا چاہتی ہیں۔

ایک مشہور مصنف ڈی بیلا نے اپنی کتاب (یوروپ میں طاقت کا نیا توازن) میں جو اعداد و شمار دئے ہیں اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اگر ایک طرف زیک اور سلویاک (اکثریت) کی مجموعی تعداد (۸،۷۰۰،۰۰۰) تھی تو دوسری جانب کل آبادی کا قریب ۱/۳ حصہ اقلیتوں پر مشتمل تھا جن کی مجموعی تعداد (۴،۸۴۴،۰۰۰) تھی۔ اس مجموعی تعداد میں کئی اقلیتیں شامل تھیں، جن میں سے خاص خاص حسب ذیل ہیں۔

جرمن	۳،۰۰۰،۰۰۰	اس میں سے تقریباً ۱/۲ جرمن آبادی، اور تمام مگیار
مگیار	۷۵۰،۰۰۰	اور تمام پول ناقابل مصالحت رویہ رکھتے ہیں،
رتھینین	۵۰۰،۰۰۰	اور اکثریت کی نسل کو اپنے اوپر ایک بار گراں
پول	۱۰۰،۰۰۰	تصور کرتے ہیں۔ یہ صورت حالات ہمیشہ زیکوسلواکیا

کے اندرونی امن میں مخل رہی اور اس کا نتیجہ ایک غیر قابل رشک ہنگامی حیثیت میں ظاہر ہو رہا ہے۔ زیکوسلواکیا کے ارد گرد جتنے ممالک ہیں وہ اپنی اپنی اقلیتوں کو جذب کرنے کے لئے کوشاں ہیں۔ پولینڈ کی یہی خواہش ہے، ہنگری کا یہی رویہ ہے اور جرمنی تو خیر سارے شور و شغب کا باعث ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ اس بدنصیب ملک کی طویل سرحد کا ۱۹/۲۰ حصہ غیر ہمدرد ممالک سے ملحق ہے اور صرف رومانیا کی سرحد قدرے اطمینان بخش ہے۔

اور یہ بھی کب تک، رومانیا کا پولینڈ سے معاہدہ ہو چکا ہے۔ اور شاہ کیرول کی قیادت میں رومانیا ان تمام منازعات سے قطع تعلق کرنا چاہتا ہے۔ زیکوسلواکیا کو اپنی اس کمزوری کا ہمیشہ احساس رہا ہے، اسی لئے ۱۹۲۱ء ہی میں رومانیا، یوگوسلاویا اور زیکوسلواکیا نے ایک معاہدہ کی رو سے اس بات کا اقرار کر لیا کہ اپنی خارجی حکمت عملی میں وہ ایک دوسرے سے تعاون کریں گے۔ اس معاہدہ کو "اتحاد صغیر" سے موسوم کیا جاتا ہے۔ ۱۹۲۴ء میں فرانس سے بھی ایک دوستانہ معاہدہ ہوا۔

اب یہاں پر زیکوسلواکیا اور جرمنی کے تعلق پر ایک گہری نظر ڈالنی ضروری ہے۔ کیونکہ سارے مناقشات اسی محور پر گردش کر رہے ہیں۔ جرمنی کی ایک سرکاری کتاب میں اس کا اعادہ یوں کیا گیا ہے "زیکوسلواکیا کے دو ہزار میل کی سرحد کا تقریباً نصف حصہ جرمنی سے ملحق ہے جو زیکوسلواکیا کو تین طرف سے (یعنی شمال، شمال مغرب اور مغرب میں) گھیرے ہوئے ہے۔ سرحدی کوہ کا سلسلہ جرمنی کے قبضہ میں ہے جہاں سے زیکوسلواکیا کی سرحد کے اندر داخل ہونا نہایت ہی آسان ہے۔ ریل اور سڑک دونوں کا رخ اسی جانب ہے۔ وہ حصے جو خاص اہمیت کے مالک ہیں یعنی (صنعتی و اقتصادی) نیز وہ حصے جہاں جنگی سامان بنتے ہیں اور مزید برآں دار الخلافہ پراگ سب سرحد سے نزدیک ہیں۔ اور اس لئے زیکوسلواکیا کی زندگی و حرکت و عمل کی کنجی جرمنی کے ہاتھ میں ہے"۔

شروع ہی سے یہ بات اظہر من الشمس تھی کہ جب تک اس جرمن تعلق کا کوئی خاطر خواہ حل پیش نہ کیا جائے گا۔ اس چھوٹی سی ریاست کے امن کا مسئلہ ایک دائمی اہمیت کی نوعیت اختیار کرے گا۔ باوصف اس کے یورپ کے اکثر سیاست داں اس فریب میں مبتلا رہے کہ "ایسی دنیا میں جہاں جمہوریت کا تحفظ ہو چکا ہے" کوئی سنسنی خیز واقعہ کا ظہور ناممکن ہے لیکن ان کی خود اعتمادی کتنی بیجا تھی، حسب ذیل سطور سے آشکارا ہو جائیگا۔

شروع میں جرمن اقلیت نے حکومت سے تعاون نہیں کیا۔ زیکوسلواکیا کی اکثریت نے اس سے فائدہ اٹھایا اور کامرانی اور فتحمندی کے جوش میں بہت آگے بڑھ گئے اور حکومت کے ہر شعبہ میں گوئے سبقت لے گئے، اقلیتیں جب اس خواب سے بیدار ہوئیں اور جب اپنی پستی کا احساس ہوا۔ اس وقت ان کی غلط راہ روی کی اہمیت منکشف ہوئی۔ اس جمود

وتعطل سے کنارہ کشی کرنے کے بعد ۱۹۲۶ء میں حکومت سے تعاون کرنے کی ٹھانی، جرمن آبادی میدانِ عمل میں نہایت سرگرمی سے شریک ہوئی اور ممکن تھا کہ اگر چند سال اور صورتِ حالات امن پذیر رہتی تو پچھلے تساہل کی خامی پوری ہو جاتی، لیکن ایسے وقت میں ۱۹۲۹ء میں یورپ کا سارا اقتصادی اور معاشی نظام درہم برہم ہو گیا جس کا لازمی اثر زیکوسلواکیا پر بھی پڑا۔ شومیٔ قسمت سے اس ملک کے جو صنعتی اور کاروباری حصے ہیں وہ وہی ہیں جہاں جرمن آبادی کثیر تعداد میں مقیم ہے۔ اِس سرد بازاری اور اقتصادی انحفاض نے جرمن آبادی کو خصوصاً سخت دھکا پہونچایا۔ زیکوسلواکیا کی حکومت کسی بنیادی امداد سے معذور رہتی۔ تمدنی کشمکش تو پہلے سے موجود تھی۔ اس پر اضافہ کیجئے کہ جرمن اقلیت کو اِس وقت یہ شکایت پیدا ہوئی کہ حکومت اُن کی جانب سوتیلی ماں کا رویہ اختیار کر رہی ہے تو آپ پر ظاہر ہو جائے گا کہ رنجش بیجا کی فضا پیدا ہونے کے لئے سارے سامان موجود تھے۔ ممکن تھا کہ واقعات کوئی توازن اختیار کر لیتے۔ مگر قبل اس کے کہ ہنگامہ دور ہو ہٹلر جرمنی پر قابض ہو جاتا ہے اور اس سیاست کی بساط کا سارا نقشہ تبدیل ہو جاتا ہے۔

ہٹلر کی کامیابی کا راز اس کے پیام میں موجود ہے۔ جس نے تمام جرمن نسلوں، آبادیوں اور اقلیتوں کی روح کو بیدار کر دیا۔ یعنی تمام جرمن باشندے ایک حکومت میں شامل ہونے چاہئیں۔ ہٹلر نے ان جرمن اقلیتوں پر (جو دوسرے ممالک میں موجود ہیں) یہ واضح کرنے کی ہر ممکن کوشش کی ہے کہ جرمنی میں مدغم ہو کر وہ ایک جرمنیٔ عظیم کی بنیاد ڈالیں گے۔ جس سے جرمن قوم کی عظمت دنیا پر پھر روشن ہو جائے گی۔ ناممکن تھا کہ ایسی حالت میں جب زیکوسلواکیا کی جرمن اقلیتیں کروٹ بدل رہی تھیں یہ بانگ دہل ان کے احساسِ پستی پر تازیانہ کا کام نہ کرتا۔ چنانچہ مئی ۱۹۳۵ء میں زیکوسلوکیا میں جو انتخابات عمل میں آئے اس میں ایک نئی جرمن پارٹی منصہ شہود پر ظاہر ہوئی جس کا مخالف جرمن اقلیت کا کوئی حصہ، طبقہ یا پیشہ نہیں تھا، بلکہ جو ساری جرمن اقلیت کے نام پر اپنے مطالبات مانگتی تھی، ان کی کامیابی فوری اور دور رس تھی۔ یعنی جرمن اقلیت کا ⅔ حصہ اس میں شامل ہو گیا۔ مثل ان تعاون کرنے والی جماعتوں کے جن کا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے یہ بھی حکومت کی وفاداری کا دم بھرتے تھے۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ ان کے مطالبات بہت وسیع لیکن جائز تھے۔ یعنی وہ حکومت میں اپنا حصہ آبادی کے تناسب سے مانگتے تھے، اور حکومت سے مزید امداد کے بھی طالب تھے تاکہ ان کی پریشان حالی دور ہو، تمدنی معاملات میں کامل آزادی کے طلبگار تھے۔ یعنی ان کا مطالبہ تھا کہ تعلیم وغیرہ میں حکومت دخل نہ دے۔ لیکن ایک بنیادی فرق جو اس پارٹی کو (جس کا رہنما ہنلین تھا) دوسری جرمن پارٹیوں سے ممتاز کرتا تھا۔ وہ یہ تھا کہ وہ حکومت کی خارجی حکمت عملی میں اساسی تبدیلی کے خواہاں تھے۔

ادھر تو یہ ہنگامہ برپا تھا اور جرمنی میں ہٹلر معاہدۂ وارسائی کی دھجیاں اُڑا رہا تھا۔ چنانچہ ۱۹۳۵ء میں زیکوسلواکیا، فرانس اور روس نے مدافعت کے خلاف ایک معاہدہ کیا۔ زیکوسلواکیا کے انتخابات نے جرمنی میں کافی جوش و خروش پیدا کیا اور اُسی وقت سے جرمنی نے زیکوسلواکیا کی طرف اپنی توجہ منعطف کی۔ گویا کہ اُس وقت سے زیکوسلواکیا یورپ کی سیاسی شطرنج کا نہایت ہی اہم مہرہ ہو گیا ہے اور اس کی چالوں پر یورپ کی سیاست کا دار و مدار ہے۔ جیسا ہم نے ابھی اوپر ذکر کیا ہے، شروع شروع ہنلین کے مطالبات کافی جائز تھے۔ لیکن جیسے جیسے یورپ کی سیاسی فضا مکدر ہوتی گئی۔ جیسے جیسے جرمنی کی طاقت ترقی کرتی رہی، جیسے جیسے برطانوی حکمت عملی اپنی کمزوری کا شرمناک اظہار کرتی رہی، ویسے ہی ہنلین کے مطالبات وسیع ہوتے گئے، اور زیادہ زور سے بیان ہونے لگے۔ یہاں تک کہ جرمنی کی شہ پاکر ۲۴ را پریل ۱۹۳۸ء کو نازی خود مختار حکومت کا مطالبہ زیکوسلواکیا کے سامنے پیش کر دیا گیا ؎

ببیں تفاوتِ رہ از کجاست تا بہ کجا!

جو چیز زیکوسلواکیا کو اس مطالبہ کے ٹھکرانے پر مجبور کرتی ہے وہ اس کے ساتھ کا مطالبہ ہے کہ زیکوسلواکیا روس اور فرانس سے قطع تعلق کرے اور جرمنی کے ساتھ اپنا ناتا جوڑے۔ لیکن یہ تو خودکشی کی دعوت ہے، اور جب تک ذرا سی بھی اُمید باقی رہتی ہے خودکشی کا اقدام ممکن نہیں ہوتا۔

مندرجۂ بالا حقائق کی روشنی میں ہم زیکوسلواکیا کی اہمیت پر ایک مکمل مگر طائرانہ نظر ڈال سکتے ہیں۔ زیکوسلواکیا کا مسئلہ تین حیثیتوں کا مالک ہے۔ اول تو اندرونی مسئلہ یعنی اکثریت اور جرمن اقلیت کے تعلقات۔ دوم بیرونی مسئلہ یعنی زیکوسلواکیا اور جرمنی کے تعلقات

اور سوئم سب کے بعد۔ لیکن کسی سے کم نہیں۔ یورپی مسئلہ یعنی یورپ میں طاقت کا توازن، روم، برلن محور کا پیرس، ماسکو اتحاد سے تصادم۔ لیکن اٹلی تو اب وسط یورپ سے منہ موڑ چکا ہے۔ اس لئے سوال صرف جرمنی کے عمل اور نصب العین کا رہ جاتا ہے۔ اور اس میں کسی شبہ کی گنجائش نہیں ہٹلر کی ہمہ آفرین خود نوشت سوانح عمری میں جن بین اور واضح الفاظ میں ہٹلر کے نصب العین کی تشریح کی گئی ہے جس سے صاف ظاہر ہے کہ زیکوسلواکیا کی موجودگی ہٹلر کے راہِ عمل میں ایسا سنگِ گراں ہے جس کے ہٹائے بغیر ہٹلر دوسرا قدم نہیں اٹھا سکتا۔ انیسویں صدی میں بسمارک نے کہا تھا کہ جو کوئی بھی بوہیمیا کا مالک ہو جائے وہی یورپ کا حکمراں ہے" یہ بات اب بھی سچ ہے۔ یہ اچھی طرح سے سمجھ لینا چاہیئے کہ ہٹلر کا۔۔۔۔۔ منتہائے مقصد زیکوسلواکیا نہیں ہے بلکہ سارے وسطی اور مشرقی یورپ پر اختیار کل ہے اور زیکوسلواکیا محض وہ پہلا زینہ ہے جس کو طے کئے بغیر ہٹلر اپنی منزل پر رواں نہیں ہو سکتا۔ اس لئے ہٹلر کی پہلی کوشش تو یہی رہی کہ زیکوسلواکیا کو فرانس اور روس سے جدا کر لیا جائے۔ کیونکہ زیکوسلواکیا کے جرمنی کے زیر اثر آجانے سے یورپ کا سارا توازن بدل جائے گا۔ فرانس معذور ہو جائے گا۔ اٹلی ایسے ہی ہاتھ دھو چکا ہے۔ صرف روس مدافعت کے لئے باقی رہ جائے گا۔ اور اس وقت ہٹلر اپنی اس فیصلہ کن جنگ سے دوچار ہو سکے گا جس کے بعد فتح کی صورت میں وہ اپنے کو دنیا کا ڈکٹیٹر سمجھ سکے گا۔ مگر فرانس اور روس دونوں اس اقدام کی اہمیت سے بخوبی واقف ہیں اور اچھی طرح ظاہر کر چکے ہیں کہ وہ زیکوسلواکیا کی آزادی کو برقرار رکھنے کے لئے کسی بھی بات سے دریغ نہ کریں گے۔ پھر بھی زیکوسلواکیا کے صنعتی و مالی ذرائع اور ساڑھے تین لاکھ جرمن آبادی (یا فوج) کے اضافہ کا لالچ ایسا معمولی نہیں ہے کہ ہٹلر اس کو آسانی سے چھوڑ دیتا۔ چنانچہ مئی ۳۸ء کا ہنگامہ ہٹلر کی اسی کوشش کا مرہونِ منت ہے۔ زیکوسلواکیا کا پریسیڈنٹ (   ) اس خطرہ کو خوب پہچانتا ہے۔ چنانچہ انھوں نے حال ہی میں فرمایا "زیکوسلواکیا کے سامنے صرف دو راستے ہیں۔ آزادی اور فرانس سے اتحادِ عمل یا جرمن حکومت کے سامنے سرنگوں ہونا اور غلام بن جانا"

گذشتہ دو تین مہینے کے واقعات پر گہری نظر ڈالنا عبث ہے جس وقت ہٹلر نے آسٹریا پر ایک کاری ضرب لگائی اور برطانوی حکمت عملی کا بھلا ہو، اس پر قابض ہو گیا اسی وقت سے زیکوسلواکیا کا مسئلہ ایک نئی اہمیت کا مالک ہو گیا۔ جرمن اقلیتیں بہت اُچھلنے کودنے لگیں اور حکومت کو خائف کرنے میں کافی حد تک کامیاب ہوئیں۔ سوائے ایک قلیل اشتراکی حصہ کے ساری جرمن اقلیت ہینلین کے (جو ہٹلر کا آلہ کار ہے) زیر قیادت آگئیں۔ زیکوسلواکیا کو جرمنی کی جانب سے ہمیشہ خطرہ رہا ہے اس لئے جہاں جرمنی اور اس کی سرحدیں ملتی ہیں وہاں زیکوسلواکیا نے اپنی حفاظت کے لئے قلعہ بندی کا ایک سلسلہ تعمیر کر رکھا تھا۔ مگر چونکہ آسٹریا سے (   ) کے تحت کسی قسم کا خطرہ نہیں تھا۔ اس لئے جہاں آسٹریا کی سرحد ملتی ہے وہاں کسی قسم کی قلعہ بندی وغیرہ نہیں کی گئی تھی۔ اب جرمنی کا آسٹریا پر قبضہ ہو جانے سے جرمنی کی سرحد زیکوسلواکیا سے ایک نئے مقام پر ملحق ہو گئی، اور پرانی قلعہ بندی بیکار ہو گئی۔ کیونکہ خطرہ کا امکان ایک نئی جانب سے بھی ہو گیا۔ زیکوسلواکیا کی حکومت کو چھیڑنے کے لئے ہینلین نے دہشت انگیزی شروع کی اور جب حکومت نے جواب دینا چاہا تو ہٹلر نے نہایت کرخت الفاظ میں شکایت شروع کی کہ جرمن اقلیتوں پر ظلم کیا جا رہا ہے۔ اور اگر یہ بند نہ ہوگا تو جرمنی حملہ آور ہوگا۔ قبل اس کے کہ یہ معاملہ طے ہوتا، جرمن فوجیں سرحد کی طرف روانہ ہونے لگیں۔ لیکن ان کے نعروں نے سوتے ہوئے شیر برطانیہ کو بھی جگا دیا۔ ساتھ ہی ساتھ فرانس اور روس نے ہٹلر پر جتا دیا کہ۔۔۔۔۔ یہ جارحانہ کارروائی یہ دونوں طاقتیں کسی حالت میں بھی برداشت نہیں کر سکتیں۔ ادھر ہینلین برطانیہ گیا تاکہ وہاں جائزہ لے کہ برطانیہ کا طرز کیا ہوگا اور جب مسٹر چیمبرلین نے پہلی مرتبہ ظاہر کیا کہ شاید زیکوسلواکیا کے حملہ کی صورت پر برطانیہ فرانس کو مدد دینے پر مجبور ہو جائے تو ہٹلر نے بغیر چون و چرا کئے اپنے قدم واپس لے لئے۔ واضح رہے کہ یہ پہلا موقع نہیں ہے کہ ہٹلر کو ہزیمت اٹھانی پڑی ہے۔ پچھلے سال مراقش کے معاملہ سے بھی ہٹلر نے ایسے ہی ہاتھ دھو لیا تھا، اور تو اور ۳۴ء میں آسٹریا میں جو سازش پھیلائی تھی۔ جیسے ہی اس کے ناکامی ظاہر ہوئی ویسے ہی

ہٹلر نے اپنی مدد سے انکار کر دیا۔ لیکن یہ بھی اچھی طرح سے سمجھ لینا چاہئے کہ جس طرح ہٹلر برابر اپنی سرگرمی میں مصروف رہا اور موقعہ پا کر آسٹریا کو ہڑپ لیا۔ اسی طرح اس ہزیمت سے ہٹلر کے ارادہ کو تو اور تقویت ہوئی ہے۔ ہاں حکمت عملی البتہ بدل گئی ہے۔

اس دوران میں زیکوسلواکیا کی حکومت اپنی اقلیت کے حقوق کی تشفی کے لئے نئے اصطلاحات اور نئے قانون بنا رہی ہے۔ جس کا نتیجہ عنقریب برآمد ہوگا۔ نہیں کہا جا سکتا کہ اس سے ہنلین کی پارٹی کس حد تک مطمئن ہوگی۔ کیونکہ سوال یہ نہیں ہے کہ کیا زیک حکومت جرمن اقلیت کو تشفی بخش حقوق دے سکتی ہے۔ بلکہ یہ ہے کہ کیا ہٹلر اس صورت کو مان سکتا ہے کہ زیکوسلواکیا کی حکومت کے اندر ایک مطمئن جرمن اقلیت رہے۔ اس سوال کا جواب زیکوسلواکیا میں نہیں دیا جائے گا، بلکہ پیرس، ماسکو اور لندن میں۔ کیونکہ زیکوسلواکیا کی سرزمین میں جمہوریت اور آمریت کی کشمکش کا فیصلہ ہوگا۔ اس کی حیثیت اس وقت آمریت کے بحرِ ذخار کے وسط میں جمہوریت کے ایک چھوٹے سے جزیرہ کی ہے۔ اسی سرزمین میں یہ بھی طے ہوگا کہ آیا چھوٹی ریاستیں اس نئی چنگیزیت کے دور میں اپنی آزادی برقرار رکھ سکتی ہیں یا گیدڑ بھبکیوں اور بندوق کی آوازوں سے بندوق والے کے حصہ میں آجائیں گی۔

یورپ کا سارا سیاسی مسئلہ یہاں حل ہو رہا ہے، اور بہت ممکن ہے کہ آئندہ چند ہفتوں میں کوئی فیصلہ کن نتیجہ بروئے کار ہو یہ بھی ممکن ہے کہ اس حکومت کی طرف سے یورپ کے دوسرے ملکوں کی توجہ ہٹانے کے لئے ہٹلر بالٹک ممالک میں کوئی نیا شگوفہ چھوڑے اور اپنی ریشہ دوانیاں خفیہ طور سے زیکوسلواکیا میں جاری رکھے، امید تو نہیں ہے کہ فرانس اور روس ہٹلر کو ایسا موقعہ دیں گے مگر کون کہہ سکتا ہے کہ یورپ کے سیاسی علکس نما کا آئندہ منظر کیا ہوگا؟

۱۲ر جولائی ۳۸ء

بیکار نوجوانو جتھہ بند ہو جاؤ

بیکاری اور افلاس کا طوفان جو ہندوستان میں اپنی پوری شد و مد سے چل رہا ہے اور جس کا منتہائے مقصود نوجوانوں کی ہری بھری اور پھولتی پھلتی زندگیوں کو اپنے دستِ قہر آمیز تھپیڑوں اور طمانچوں سے تباہ و برباد کرنا ہے بمصروفِ عمل ہے۔ پھول کی طرح کھلے ہوئے نوجوان جو اپنی مہک اور خوشبو سے اس چمن کو ہرا بھرا [لالہ زار] اور گلزارِ ارم کرتے، اپنے عزیز وطن کی کھیتیوں اور باغیچوں کو سرسبز و شاداب کرتے آج بیکاری کی یلغار میں بہہ کر نیست و نابود ہو رہے ہیں۔ افلاس اور ناداری سے تنگ آکر خودکشی کرنے پر مجبور ہو رہے ہیں۔ آہ! کوئی ہمدرد و خیر خواہ نہیں۔ بے بسی اور بے کسی کے عالم میں اپنی پیاری زندگیاں موت کی جھولی میں نچھاور کر رہے ہیں۔ یہ ہے ہندوستان کے نوجوانوں کی حالت۔

بیکاری اور افلاس کا سدِ باب اُس وقت تک نہیں ہو سکتا۔ جب تک کہ نوجوان اپنے پاؤں پر کھڑے ہو کر اپنی قسمت خود نہیں بناتے، انھیں چاہئے کہ تنظیم کی لڑی میں منسلک ہو کر اپنا لائحہ عمل تجویز کریں اور متحد ہو کر بیکاری اور غلامی کو دور کرنے کے لئے میدانِ عمل و جہاد میں اُتر آئیں۔

اس مقصد و مسلک کو پیشِ نظر رکھ کر ملتان میں انجمن بیکاران کی بنیاد ڈالی گئی ہے جس کا اہم تر پروگرام ملک سے بیکاری کی لعنت کو دور کرنے کی جد و جہد کرنا ہے۔ اور روٹی لینا ہے۔ اس لئے بیکار نوجوانوں کو چاہئے کہ انجمن کے ممبر بن کر اپنے پروگرام کو عملی جامہ پہنائیں۔

انجمن کا دفتر ۸ بجے سے ۰ بجے تک کھلا رہتا ہے۔ ملتان کے تمام بیکار نوجوان بلا تمیز مذہب و ملت آکر فارم ممبری بھر سکتے ہیں۔

المشتہر۔ جنرل سکرٹری انجمن بیکاران بیرون لوہاری دروازہ، کچہری روڈ، ملتان شہر

حسین بن جانا کس قدر آسان ہوگیا ہے

میسور صندل سوپ

یہ چہرے کے رنگ کو تروتازگی، نرمی اور صحت آمیز شگفتگی بخشتا ہے

اُس کے مسامات میں اُتر جانے والے بالائی جھاگ سے مالامال



جھاگ چہرے کی جلد کو تمام آلودگیوں سے پاک کر دیتے ہیں، کیونکہ میسو صندل سوپ میسور کے شہرۂ آفاق روغن کی آمیزش ہوتی ہے اور یہی وجہ ہے تمام حسین و جمیل خواتین میسو صندل سوپ کا استعمال کرتی ہیں اسلئے کہ اُنھیں یہ بھید معلوم ہوچکا ہے کہ یہ صابون اُن کے حسن و جمال کو برقرار رکھ سکتا ہے۔ میسور صندل سوپ ہر دوکاندار سے مل سکتا ہے

گورنمنٹ سوپ فیکٹری بنگلور

عروسی

یہ ایک کامیاب علاج ہے جو بعد روغنِ عروس ترتیب دیا گیا۔ مگر وہ اصل عروسی کی کامیابی کا راز بتقاضائے خریداران طشت از بام کیا جاتا ہے، جو بمصلحت اشارہ اشتہار میں لکھا جاتا تھا۔ لیکن اس طرح پر خط و کتابت کی طوالت لوگوں کو تکلیف دہ تھی۔ تاہم دوسروں کے مقابلے میں کامیاب اور مانگ زیادہ تھی، اور صاحبِ ضرورت کو خاص طور پر لکھا جاتا تھا (کہ اگر عروسی کے سوا پیش و پس میں ناہمواری دیکھی ہو تو پہلے وہ شیشیاں جو تین ہیں بالکل اس عیب کو رفع کردیں گی، موافق ہدایات استعمال کریں جن کی قیمت مبلغ ضہ ہے۔ پھر عروسی کا استعمال طاقتِ رفتہ اُبھار کر دائمی نفع کا باعث ہوگا۔) ورنہ معمولی شکایات تو عروسی کھو دے گی۔ یہ علاج ہر موسم میں ہوسکتا ہے۔ اس کے ہمراہ چار چیزیں مومی، نباتی، کلیدی، ثعلبی اور دی جاتی ہیں۔ ایک سٹ عروسی ہفتہ بھر کو کافی ہوتا ہے۔ جس کی قیمت عہ علاوہ محصول ڈاک مقرر ہے۔ صاحبِ فرمائش نام و پتہ خوشخط تحریر فرمائیں

شفاخانہ رضویہ چاندنی محل دہلی

ناظرین رسالہ کلیم

اگر آپ ادبِ اردو کی خدمت کرنا چاہتے ہیں

اگر آپ کلیم کی خوبیوں میں خاطر خواہ اضافہ دیکھنا چاہتے ہیں

اگر آپ ملک کے بہترین شعرا اور ادبا کے حوصلے بڑھانا چاہتے ہیں

اگر آپ اپنے علمی و ادبی ذوق کو ترقی دینا چاہتے ہیں۔

اگر آپ اردو کو ہندوستان کی واحد زبان دیکھنا چاہتے ہیں۔

اگر آپ ماضی اور حال کے شعرا اور ادبا کا مقابلہ کرنا چاہتے ہیں۔

اگر آپ ایسی کتب کی ضرورت محسوس کرتے ہیں جو ملک کی ضروریات کو مدنظر رکھ کر لکھی گئی ہوں۔

اگر آپ بکفایت بہترین اخلاقی اور ادبی کتب خریدنا چاہتے ہیں

تو

کلیم بک ڈپو جینتی لواس نمبر ۱۴ دریا گنج دہلی سے خریدیئے

غازی انور پاشا شہید کی پہلی سوانح عمری

غازی انور پاشا کے کارنامے نپولین کے کارناموں سے بھی زیادہ حیرت انگیز ہیں انہیں پہلی مرتبہ غازی کے رفیق خاص ہز اکسلنسی جنرل جمال پاشا الغزی نے جمع کیا اور مولانا ملیح آبادی نے اُردو میں ترجمہ کرکے دو جلدوں میں شائع کیا ہے۔ دوسری جلد ابھی نئی نکلی ہے۔ الگ الگ ہر جلد کی قیمت ۱۲/ ہے۔ دونوں جلدوں کی مجموعی رعایتی قیمت صرف ڈھائی روپیہ علاوہ محصول ڈاک ہے۔ دونوں جلدوں میں ۹۶۴ صفحے ہیں جو لوگ پانچ روپیہ یا زیادہ کی کتابیں منگائیں گے ان سے محصول ڈاک نہیں لیا جائے گا۔

نوٹ :- مولانا ملیح آبادی کی کتابیں ملک بھر میں بہت مقبولیت حاصل کر چکی ہیں یکم جنوری ۱۹۳۹ء تک ان کی قیمتوں میں بہت کمی کر دی گئی ہے

فہرس مفت طلب کیجئے

دفتر "روزانہ ہند" نمبر ۱ اساگر دت لین کلکتہ

ادارۂ ادبیاتِ اردو کا مصور دلچسپ ادبی رسالہ

سب رس

زیر نگرانی	زیر ادارت
ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور	صاحبزادہ میکش (عثمانیہ)
پروفیسر جامعہ عثمانیہ	
سالانہ چندہ	نمونہ کا پرچہ
چار روپے آٹھ آنے (للعہ)	سات آنے

ملنے کا پتہ

خواجہ حمید الدین مہتمم سب رس

رفعت منزل خیریت آباد حیدرآباد دکن

ایک حسین دوشیزہ

باغ میں ٹہل رہی ہے ہنستی ہنستی پھولوں کے درختوں پاس پہونچ جاتی ہے وہاں کہیں چنبیلی اور کہیں موتیا کے پھولوں سے جالپٹتی ہے اور پھر وہاں سے ایک تصویر حیرت بن کر ایک ڈبہ کو اٹھا لیتی ہے۔ درختوں میں سے ایک نوجوان نکل کر اس پریجمال لڑکی سے ڈبہ چھیننا چاہتا ہے۔ عاشق و معشوق میں دست درازیاں ہونے لگتی ہیں۔ ڈبہ میں کیا چیز ہے

پری جمال صابن (رجسٹرڈ) ہے

حسن و خوبصورتی کے شیدائیو! یہ کس چیز پر عاشق و معشوق لڑ رہے تھے، یہ وہی پریجمال صابن ہے جو سالہا سال سے دنیا میں مشہور رہے حسن و خوبصورتی پیدا کرتا ہے، جھائیوں مہاسوں کو دور کرکے رنگت کو سُرخ و سفید گلاب کی پتی کی مانند بنا دیتا ہے۔ تازہ تازہ خوشبوؤں اور قیمتی ادویات سے تیار ہوتا ہے۔ فی بکس تین ٹکیہ مع صابندانی ایک روپیہ

زنانہ سنگھار بکس (رجسٹرڈ)

یہ بکس عورتوں کے لئے تیار کیا ہے۔ بکس ولایتی کا اور اس میں خوشنما آئینہ لگا ہوا ہے۔ بکس میں پانچ چیزیں اور انعام ہے (۱) پریجمال صابن ایک ٹکیہ (۲) پری بہار آئل شیشی ۲ تولہ (۳) بانکی بہار ایک ڈبیہ (۴) بال صفا صابن ایک ٹکیہ (۵) مسّی ایک تولہ اور ۶ ماشہ سرمہ انعام فی بکس ایک روپیہ

پتہ حکیم محمد یعقوب خاں مالک دواخانہ نور رتن دہلی پریجمال منزل

خریداران

سے گزارش ہے کہ خط و کتابت کرتے وقت چٹ نمبر خریداری کا حوالہ ضرور دیں۔

جواب طلب امور کے لئے جوابی کارڈ یا ایک آنہ کا ٹکٹ بھیجنا ضروری ہے۔

خط و کتابت کے وقت اتنا ضرور خیال رکھا جائے کہ عبارت صاف اور ملحق لکھیے

ورنہ عدم تعمیل کی شکایت نہ کیجئے۔ [illegible]

منیجر کلیم

مطبوعات سنہ ۱۹۳۸ء

دلی کا سنبھالا } تذکرہ دہلی مرحوم کا اے دوست نہ چھیڑ / نہ سُنا جائے گا ہم سے یہ فسانہ ہرگز { خواجہ محمد شفیع دہلوی نے دہلی مرحوم کی داستانِ الم، اس کے ایامِ عروج کی مرقع نگاری، صاحبانِ کمال کا تذکرہ اس ٹکسالی زبان میں کیا ہے جواب نابود ہے، اندازِ بیان ایسا موثر کہ دل بے اختیار ہو جاتا ہے۔ کتابت، طباعت اور تجلید کے لئے مکتبہ کا نام کافی ہے۔ صفحات ۱۵۵ قیمت فی جلد ایک روپیہ

لطائفِ غالب } مسٹر ایم اے شاہ، پی، ایس، سی، ایف، پی، ای، مرزا اسداللہ خاں غالب کی شوخیٔ بیان، خوش بیانی، خوش طبعی، اور ظرافت سے محظوظ ہونے کے لئے اسے ضرور پڑھئے۔ قیمت ۳؍

شعلۂ طور } طبع ثانی۔ شاعرِ فطرت حضرت جگر مرادآبادی کے کلام کا مجموعہ، جو حضرات شعلۂ طور پر ایک دفعہ بھی اُچٹتی ہوئی نظر ڈال چکے ہیں وہ اُسے اس طرح لئے پھرتے ہیں جیسے کہ لوگ زمانۂ انقلابِ فرانس میں معاہدۂ عمرانی لئے پھرتے تھے۔ اس ایڈیشن میں چند نئی ساحرانہ غزلوں کا اضافہ کیا گیا ہے۔ بالکل نئی ترتیب۔ از حد دیدہ زیب۔ یک رنگی سنہرا کور، اور جگر کی ایک بے نظیر تصویر۔ قیمت دو روپے آٹھ آنے۔

سبدِ چین } مرزا غالب کے کمیاب بلکہ نایاب فارسی کلام کا مجموعہ۔ اس میں قصائد۔ قطعات۔ مثنویاں، ترکیب بند۔ ترجیع بند۔ غزلیات اور رُباعیات سب کچھ شامل ہیں۔ اس کے ساتھ ہی مرزا غالب کی مکمل سوانح حیات اور تصنیفات کا تذکرہ بھی شامل کر دیا گیا ہے۔ قیمت ۱۲؍ بارہ آنے

ذکرِ غالب } مرزا اسداللہ خاں غالب کی مکمل سوانح حیات۔ اب تک مرزا صاحب کی سوانح حیات پر یادگارِ غالب، غالب اور غالب نامہ چھپ چکی ہیں۔ لیکن اس کے باوجود غالب کی زندگی کے بہت سے ایسے پہلو تھے جو تاریکی میں تھے۔ چنانچہ اس کتاب میں تمام ممکن ذرائع سے معلومات فراہم کر کے غالب کی زندگی کے تمام پہلوؤں کو اُجاگر کیا گیا ہے۔ غرض یہ کتاب اتنی جامع اور مختصر ہے کہ شعر و ادب کا ذوق رکھنے والے حضرات کے لئے عموماً اور یونیورسٹی کے طلباء کے لئے خصوصاً از بس مفید۔ قیمت آٹھ آنے

قرآن پاک کیا ہے اور اس نے کیا کر دکھایا؟ } یہ کتاب بچوں کی نفسیات، شعور اور استعداد کو مدنظر رکھ کر آسان زبان میں لکھی گئی ہے۔ قرآن پاک آنحضرت پر کس طرح اُترتا تھا۔ آپ کس طرح لوگوں تک پہنچاتے تھے کیسے اس کی حفاظت آپ نے اور آپ کے بعد صحابہ کرام نے کی۔ اور کیسے اُس نے لوگوں کے دلوں پر اثر کیا۔ بہت مفصل مع مثال۔ قیمت چھ آنے

دلی } بچوں کے لئے دہلی کی خاص عمارتوں کا دلچسپ بیان۔ جس کے پردے میں دہلی کی مختصر تاریخ بتا دی گئی۔ بلاک کی چھ تصاویر۔ اجڑی اور بسی ہوئی دلیوں کے دو نقشے۔ قیمت چار آنے۔

مکتبہ جامعہ

دہلی ــــــ نئی دہلی ــــــ لاہور

بنامِ قوت و حیات

کلیم دہلی

آئے گا نہ جانے کب زمانہ اپنا
قدرت سے ملا ہے مجھکو صد حیف یہ حکم
آگے کئی صدیوں ہے فسانہ اپنا
بہروں کو سنائے جا ترانہ اپنا

منظور شدہ
ڈائرکٹران تعلیم
ریاستہائے میسور، پٹیالہ و حیدرآباد دکن

سالانہ چندہ چھ روپے
سہ ماہی چندہ دو روپے
ششماہی چندہ تین روپے آٹھ آنے
قیمت فی پرچہ نو آنے

جلد ۷ — فہرست مضامین بابتہ ماہ ستمبر سنہ ۱۹۳۸ء — نمبر ۳

نمبر شمار	عنوان	مضمون نگار	نمبر صفحہ
۱	اشارات	جوش ملیح آبادی	۱۷۰
۲	فروغِ بادہ (نظم)	جوش ملیح آبادی	۱۷۴
۳	شباب، مرعوبِ شیب	جوش ملیح آبادی	۱۷۵
۴	رباعیات	جوش ملیح آبادی	۱۷۶
۵	سونے کی اقتصادی اہمیت	جناب .... صاحب	۱۷۷
۶	بی بی مریم کا مداری	مترجمہ جناب مخمور اکبرآبادی	۱۸۳
۷	علامہ کیفی دہلوی اور سیماب اکبرآبادی	جناب پروفیسر محمد عبد اللہ صاحب کامل ایم اے	۱۸۶
۸	آداگون	جناب ل احمد صاحب اکبرآبادی	۱۹۴
۹	دُوری (نظم)	جوش ملیح آبادی	۱۹۹
۱۰	مکاتیب غالب وغیرہ پر تبصرہ	جناب محمد ضیاء الاسلام صاحب بی اے ڈپٹی کلکٹر	۲۰۰
۱۱	سماج کی قربان گاہ پر	جناب صدیقہ بیگم صاحبہ سیوہاروی	۲۰۴
۱۲	اگر دنیا میں شاعر ہوتا تو کیا ہوتا	جناب احسن صاحب مارہروی	۲۱۱
۱۳	سیرت	جناب سید مقبول قاسم صاحب مختار حسین آباد جیلا	۲۱۵
۱۴	غالب کی توہین	جناب شاد صاحب قدوائی	۲۲۵
۱۵	برائے ہمنفسان (نظم)	جوش ملیح آبادی	۲۳۲
۱۶	ہندوستان کی جمہوری زبان	جناب امام صاحب اکبرآبادی	۲۳۳
۱۷	مقالاتِ زرین	جوش ملیح آبادی	۲۳۷
۱۸	موت کا استقبال (نظم)	جناب بسمل صاحب سعیدی ہاشمی ٹونکی	۲۳۸
۱۹	رفتارِ وقت	جناب سید سعید صاحب جعفری مچھلی شہری ایم اے	۲۴۱
۲۰	معروضِ مائل	جناب ابو البیان مائل صاحب لکھنوی	۲۴۹
۲۱	اشتہارات	مشتہرین	۲۵۱
..	..	..	..

(جوش ملیح آبادی پرنٹر و پبلشر نے محبوب المطابع برقی پریس دہلی میں چھپوا کر دفتر رسالہ کلیم دریا گنج نمبر ۴ سے شائع کیا)

اشارات

جھنڈیوں کا جنگل

جوش

مسلمانوں کے حقوق کا تحفظ اور اسلام کی بقا اِسی پر منحصر ہے کہ کانگریس سے محفوظ ترین فاصلے پر رہتے ہوئے تنظیم کی جائے، ورنہ ہندوستان میں نہ تو مسلمان ہی رہیں گے نہ اسلام۔ یہ مفہوم تھا جسے مولوی ظفر علی خاں مُدیر زمیندارؔ نے، اپنے الفاظ کے اندر، جب ہم دونوں بمبئی کے ایک ہوٹل میں ٹھہرے ہوئے تھے، ایک بڑے لیڈرانہ طمطراق کے ساتھ، ظاہر کیا تھا۔

اوّلاً تو جیسے ہی میں پنجاب کے ان سب سے زیادہ جلد جلد رائے اور روش بدلنے والے مولوی صاحب کے کمرے میں داخل ہوا تھا، اُن کے چہرے پر حیرت کے آثار کھیلنے لگے تھے، اُنھیں شاید حیرت اِس بات پر تھی کہ میں اُن سے ملنے کیوں آیا ہوں۔ اُنھیں کیا معلوم کہ میں کوئی مولوی نہیں ہوں جو ذرا سے اختلاف رائے پر یہی نہیں کہ راہ و رسم ترک کر دیتا ہے، بلکہ موقع ملے تو، اپنی حفاظت کے تمام انتظامات مکمل کر کے، اپنے کسی مذہبی مجنون عقیدت مند سے اپنے حریف کو قتل بھی کرا سکتا ہے۔

مولوی ظفر علی خاں صاحب کی مندرجۂ بالا بات سُنکر میں نے اُنکی خدمت میں عرض کیا کہ کیا یہ ممکن نہیں کہ مُسلمان، جُوق در جُوق اور کارواں در کارواں کانگریس کے حلقے میں داخل ہو کر ہندوستان کے متحدہ پلیٹ فارم پر ایک مُنظّم جماعت کی حیثیت سے، اپنے حقوق کے تحفّظ کے خود ہی ضامن بن جائیں؟

یہ سنکر مولوی صاحب مسکرائے اور داڑھی پر ہاتھ پھیر کر فرمانے لگے کہ اِس روش میں خطرہ ہے، اور سخت خطرہ، کیونکہ ہندو، مسلمانوں کو نِگل جائیں گے۔

مولوی صاحب کے اِس جواب نے مجھے اِس قدر دُکھ پہونچایا کہ میرا ماتھا مناک ہو گیا۔ میں نے کہا ایک زمانہ وہ تھا کہ مُٹھی بھر مسلمانوں نے قطبین کے اندر زلزلہ ڈال دیا تھا، اور بڑے بڑے پُر جلال شاہنشاہوں کا غرور اور بڑی بڑی سلطنتوں کا طمطراق، اُن کے ایک ادنیٰ سپاہی کے سامنے لرزہ براندام ہو جاتا تھا۔ لیکن آج ہندوستان میں مسلمان دو چار لاکھ یا پانچ چھ کرور نہیں، بلکہ چشمِ بد دُور پورے نَو کرور ہیں۔ اور اِس کے باوصف وہ ہندوؤں سے اِس طرح کانپ رہے ہیں، جیسے کوئی بھُوتوں کی قائل عورت، ڈراؤنی کہانیوں سے۔

کیا مسلمانوں کی سی بہادر مِلت، کیا مسلمانوں کا سا برق و باد سے کھیلنے والا گروہ، اور کیا مسلمانوں کی سی موت کا مذاق اُڑانے والی سُورما جماعت، جس کے لہراتے ہوئے پرچم کے سامنے حریفوں کی توپوں کے گولے قطراتِ شبنم میں تبدیل ہو جاتے تھے۔ اب اِس قدر کمزور و بُزدل ہو گئی ہے کہ محض ہندو کے قُرب کے تصوّر سے اُسے غش پر غش آنے لگتے ہیں؟

تُفو، بر تو اے چرخِ گرداں تُفو!!

مولوی ظفر علی خاں کی ڈاڑھی کے دائروں کے اوپر یہ سُنکر جھُریاں

سی نمودار ہوگئیں۔ وہ انفعال آمیز تبسّم کی تکلیف کو ضبط کرتے ہوئے فرمانے لگے کہ یہ معاملہ بہادری اور بزدلی کا نہیں، بلکہ کثرتِ آرا اور ووٹوں کا ہے، جہاں جُبن وجسارت کا کوئی دخل نہیں ہوسکتا۔

میں نے عرض کیا یہ بھی ایک سیاسی مغالطہ ہے، کوئی قوم خواہ وہ کتنی ہی پُر ہول اکثریّت میں کیوں نہو، نوکرور نفوس کو ناخوش رکھتے ہوئے کبھی اور کسی عالم میں بھی حکومت نہیں کرسکتی، حکومت کرنا تو بڑی بات ہے، وہ نوکرور کے لشکرِ جرّار کو غیر مطمئن رکھتے ہوئے جی بھی نہیں سکتی ہے ——— دُور کیوں جایئے، اپنے گھروں ہی کو دیکھ لیجئے کہ اگر گھر کا صرف ایک رُکن کسی بات پر بگڑ یا اڑ جاتا ہے، تو گھر بھر کی نیندیں حرام ہوکر رہ جاتی ہیں —— پھر یہ کیونکر ممکن ہے کہ ہندوستان کے گھر کے نوکرور ارکان غیر مطمئن رہیں، اور پھر بھی گھر کی چہل پہل قایم و باقی رہے؟

اِس کے علاوہ میں نے مولوی صاحب سے یہ بھی عرض کیا کہ دُنیا اور دین، دونوں کے معاملات جب کسی تدبیر سے بھی نہیں سلجھتے ہیں، تو اُن کا آخری فیصلہ تلوار کرتی ہے۔ اگر مسلمان بہادر ہیں، تو آئندہ فیصلہ کرنے والی چیز اُن کی تلوار ہوگی۔ جس کے سائے میں کوثر وتسنیم کی لہریں گنگنایا کرتی ہیں۔

مولوی صاحب نے یہ سُنکر اپنی داڑھی، سیدھے ہاتھ کی مُٹّھی میں لے لی، آنکھیں زیادہ کھُل کر جھپکنے لگیں۔ سر خفیف سا جھک گیا، اور جواب دینے کے لئے الفاظ تلاش کرنے لگے۔ وہ الفاظ تلاش کررہے تھے، اور اُن کا چہرہ کہہ رہا تھا کہ "یہاں تو ہم بھی قائل ہیں"۔

میں نے اِس جمُود و سکُوت کو توڑتے ہوئے مولوی صاحب کی خدمت میں یوں عرض کرنا شروع کیا کہ آپ حضرات اپنی روش کے دوسرے خطرناک رُخ پر نگاہ دوڑائیں، اور وہ رُخ یہ ہے کہ جس طرح آپ آج مسلمانوں کے تحفظ کی خاطر ایک علیحدہ جماعت بنارہے ہیں، اگر اس طرح ہندوستان کی دوسری مذہبی برادریاں بھی علیحدہ علیحدہ اپنی اپنی جماعتیں قایم کرنا شروع کردیں اور پھر اُن جماعتوں کا ہر فرقہ اپنی اپنی علیحدہ تنظیم پر اصرار کرنے لگے تو آپ خود ہی ملاحظہ فرمائیں کہ ہندوستان کی فضا کتنی بے شمار جھنڈیوں میں تقسیم ہوکر رہ جائے گی؟ اور جب ہندوستان کا کوئی ایک مشترک نشان و پرچم ہی باقی نہیں رہے گا تو ہماری فوج کس بل بُوتے پر میدانِ کارزار میں صف آرا ہوسکے گی؟

مولوی صاحب نے میری طرف یہ سُنتے ہی معنی خیز نظروں سے دیکھنا شروع کیا، اور میں نے سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا کہ مولوی صاحب! جس طرح بمبئی اسٹیشن پر مسافر اُترتے ہی ہوٹلوں کے دلالوں کے نرغے میں گھر جاتا ہے، اور کمر سے لے کر کاندھے تک دلالوں کے ٹکٹ چاروں طرف سے حلقہ کرکے مسافر بیچارے کو بوکھلا دیتے ہیں۔ اِس طرح آپ بھی مُلک میں تفریق کی ایک ایسی نظیر قایم فرمارہے ہیں کہ اگر ہندوستان کی تمام مذہبی برادریاں اپنی اپنی لال، پیلی، نیلی اور اُودی جھنڈیاں لیکر جھپٹ پڑیں تو ہندوستان بیچارے کا تو دم ہی گھُٹ کر رہ جائے گا۔

مولوی صاحب نے میری بات کاٹ کر فرمایا کہ کیا آپ چاہتے ہیں کہ مسلمان اور اسلام کے لئے کچھ نہ کیا جائے؟ میں نے عرض کیا کہ ایک خالص سیاسی سرگرمی میں آپ مذہب کو ٹھونسنے کی کوشش ہی کیوں کرتے ہیں۔

مولوی صاحب نے جواب دیا کہ "جناب اسلام میں سیاست اور مذہب دو جداگانہ چیزیں نہیں ہیں۔ مسلمان یہ بات ایک زمانۂ دراز سے کہتے چلے آرہے ہیں"۔ میں نے مولوی صاحب سے کہا "لیکن ہر بات کا ایک محل، اور ہر امر کا ایک موقع ہوا کرتا ہے۔ ہندوستان کے موجودہ سیاسی حالات میں اس قسم کی باتیں کرنا کسی طرح مناسب نہیں معلوم ہوتا"۔

"اس کے علاوہ" میں نے مولوی صاحب سے مخاطب ہوکر کہا کہ "آپ ہر بات پر اسلام اسلام فرماتے ہیں۔ میں اس بات کو سرے سے تسلیم کرنے ہی پر آمادہ نہیں ہوں کہ آپ کی مسلم لیگ کسی ایمانی یا اسلامی جذبے کے تحت وجود میں آئی ہے۔ آپ کی جماعت نے تو اسلام کو صرف ایک حیلہ بنا رکھا ہے، جس کے پس پردہ ذاتی اغراض، اور ذاتی حوصلہ مندیوں کی تشنگی بجھائی جارہی ہے۔ اور درپردہ آبیاری کی جارہی ہے اُس زہریلے درخت کی جسے حکومت کہتے ہیں۔

یہ سُنکر مولوی ظفر علی خاں صاحب مُدیر "زمیندار" طیش میں آگئے، اور فرمانے لگے کہ ہم مسلمان ہیں، اور مسلمان کسی حالت میں بھی جھوٹ نہیں بول سکتا۔

"آپ حضرات مسلمان ہیں"! میں نے آنکھوں میں آنکھیں ڈالکر

سوال کیا۔ اور اُن کے جواب کا انتظار کئے بغیر سلسلۂ کلام کو یوں جاری رکھا،

"مولوی صاحب آپ مسلمان ہیں؟ ذرا غور کرکے یہ بات زبان سے نکالئے، آپ کو معلوم نہیں کہ آپ کے اس دعوے کی زد میں کون آرہا ہے۔ اگر آپ اس دعوے میں سچے ہیں کہ آپ مسلمان ہیں تو پھر نقلِ کفر کُفر نہ باشد، نعوذ باللہ، خدا جھوٹا اور سراسر جھوٹا ہے۔"

"یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟" مولوی ظفر علی خاں نے غصّے سے بھرائی ہوئی آواز میں کہا، اور آنکھوں میں کوندا سا لپکنے لگا۔

میں نے کہا، مولوی صاحب قبلہ، ذرا صبر سے کام لیجئے، میں نے جو کچھ کہا ہے، نصِّ قرآنی سے ثابت کروں گا۔ سُنئے، قرآنِ کریم میں اللہ نے مسلمانوں سے وعدہ فرمایا ہے کہ اگر تم مومن ومسلم رہوگے تو ہم تمھیں دُنیا میں آمر و غالب رکھیں گے، اور تمھیں کسی قوم کا محکوم نہیں بنائیں گے لیکن آپ آج آمر و غالب ہونے کے عوض مامور و مغلوب ہیں۔ جس کے صرف دو ہی معنی ہوسکتے ہیں۔

(۱) یعنی یا تو آپ اس دعوے میں کہ ہم مسلمان ہیں، سچے ہیں، اور خدائے بزرگ و برتر نے جو وعدہ آپ سے کیا تھا وہ نعوذ باللہ جھوٹا تھا۔

(۲) یا یہ کہ خدا اپنے اس وعدے میں کہ ہم تمھیں کسی کا محکوم نہیں بنائیں گے، سچا ہے، اور آپ چونکہ محکوم ہیں۔ اس لئے ادّعائے اسلام میں جھوٹے ہیں۔"

"لیکن ہم مسلمان بننے کی کوشش کر رہے ہیں۔" مولوی صاحب نے عجیب گھبراہٹ کے ساتھ جواب دیا اور میرے اس جواب پر سلسلۂ گفت وشنود منقطع ہوگیا کہ جب آپ مسلم بن جائیں گے، اُس وقت آپ کو حق ہوگا، کہ "مسلم لیگ" کے نام سے ایک جماعت قائم کریں۔

اے دل تو ولے بہ پادشہاں نہ شدی
وازفعلِ بد خویش پشیماں نہ شدی
مُلا شدی و شیخ شدی و واعظ
ایں جملہ شُدی، ولے مسلماں نہ شدی

قارئینِ کلیم کی خدمت میں
مُدیرِ کلیم کا اعترافِ گناہ

غلطی کرنا، انسان کی سُنّت آبائی ہے لیکن غلطی کرکے غلطی پر اصرار کرنا اُسے صواب ثابت کرنے کی سعی کرنا، اور اُس کا اعتراف نہ کرنا سُنّتِ شیطانی ہے۔

اپنی غلطی کا اعتراف نہ کرنا دراصل ایک ایسی صنعت ہے جو دیدہ دلیر اور ڈھیٹ قسم کے ٹھگوں ہی میں پائی جاسکتی ہے۔

مجھ پر زمین و آسمان کی لعنت ہو، اگر میں اپنی غلطی، اور اپنے گناہ کا اعتراف نہ کروں۔

بیشک میں نے غلطی کی ہے، حقیقت میں مجھ سے بڑا گناہ ہوا ہے، اور میں غیر مشتبہ الفاظ، اور روشن طرزِ بیان کے ساتھ، قارئینِ کلیم کے روبرو اپنے گناہ اور اپنے قصور کا اعتراف کرتا ہوں۔

میرا گناہ اور میرا قصور یہ ہے کہ میں نے ایک اشتہاری علامہ کو

لہ جیسی کہ سیماب صاحب کی روش ہے، جو شرابخوار رہنے کے باوجود آج دیدہ دلیری کے ساتھ فرما رہے ہیں کہ اُنھوں نے کبھی شراب کو ہاتھ تک نہیں لگایا،

حالانکہ شریفانہ بات تو یہ تھی کہ وہ ایک بہادر اور راستباز انسان کی طرح اقرار کرلیتے کہ بیشک ایک زمانے میں وہ شراب پیتے تھے، اور اب ترک فرماچکے، یا ترک فرمانے والے ہیں۔ لیکن اُنھوں نے ایسا نہیں کیا۔ وہ ایسا کر بھی نہیں سکتے تھے۔ کیونکہ یہ روش ہے بڑے آدمیوں کی، کوئی چھوٹا آدمی اعترافِ قصور کی جسارت کا تصور تک نہیں کرسکتا، کیونکہ اعترافِ قصور کے محض خیال سے چھوٹے آدمی کا زہرہ آب ہونے لگتا ہے۔

اگر سیماب صاحب سچے ہیں تو میں اُنھیں چیلنج دیتا ہوں کہ وہ مجھ پر ازالۂ حیثیتِ عُرفی کا مقدمہ دائر کردیں۔ اور اگر میں اُن کی شرابخوری اور ——— اور روزِ روشن کی طرح بھری عدالت ثابت نہ کروں تو وہ مجھے جیل کی کوٹھری میں ٹھونس دیں۔ کیا سیماب صاحب، اکبرآبادی "علامہ" میرے اِس کھلے چیلنج کو قبول فرمائیں گے؟

درخورِ خطاب سمجھکر اُس پر کافی خامہ فرسائی کر ڈالی۔

ہر چند اِس سے بہت پیشتر، اور اِس اثنا میں بھی بعض تیسرے درجے کے رسالوں، اور چوتھے درجے کے اخباروں میں میرے متعلق بازاری اور سفیہانہ مضامین شائع ہوتے رہے ہیں (کیونکہ ہندوستان کی خدمت کا ہندوستانیوں کے وہاں یہی صلہ ہے) مگر میں نے ہمیشہ یہ کہہ کر کسی مضمون کا جواب نہیں دیا کہ میں ادبی گودام کے اِن چوہوں کو مُنھ لگانا نہیں چاہتا ——— لیکن میں حیران ہوں کہ میری زندگی کا وہ کون ایسا لمحۂ ضعف (　　　) تھا کہ میں نے اُن اشتہاری "علاّمہ" کا "خطبہ" پڑھتے ہی اُس کا جواب لکھ مارا، جن "علاّمہ" کو لوگ بالکل اُسی طرح پہچانتے ہیں، جس طرح کوئی گندی نالی اپنی بُو کی وجہ سے پہچانی جاتی ہے۔

یہ مختصر سی، بُوند بھر زندگی جو قدرت نے مجھے عطا فرمائی ہے میں اُس کے رنگین لمحات کو "علاّمہ" پر برباد کردوں، یہ کتنی افسوسناک بات ہے۔

اِس لئے میں نہایت کُشادہ پیشانی کے ساتھ مکرّر اپنی غلطی کا اعتراف کرتا ہوں، اپنے جُرم کو مانتا ہوں، اور اپنے گناہ کو تسلیم کرتا ہوں کہ میں نے شیخ عاشق حسین المتخلص بہ سیماب کو شایانِ خطاب اور درخورِ اعتنا سمجھکر "کلیم" کے قیمتی صفحات کو سیاہ کیا ——— اور اُسی کے ساتھ ساتھ دوبارہ اِس کا بھی اقرار کرتا ہوں کہ خواہ کچھ ہی کیوں نہو جائے۔ اب میں اِن بزرگوار کے ذکرِ خیر سے اپنے قلم کو کبھی آلودہ نہیں کروں گا۔

جس شخص کو اپنے بُرا کہنے والے پر غصہ آئے، وہ ناقص انسان ہے

میں بچپن میں بیحد محرورُ المزاج تھا، اور ذرا ذرا سی بات پر مشتعل ہو جایا کرتا تھا لیکن حکمت وحیات اور نفسیات کے مسائل پر مسلسل تفکّر و تدبّر کی بدولت مجھے اپنی ذات کے متعلق یہ حُسنِ ظن پیدا ہو گیا تھا کہ اب میں قطعی محرورالمزاج نہیں رہا ہوں، اور جذبۂ غضب پر مجھے فتحِ کامل حاصل ہو چکی ہے۔ لیکن سیماب صاحب کا بُھساولی خطبہ پڑھکر جس میں مجھ پر سب و شتم کیا گیا تھا، میں یکایک بھڑک اُٹھا۔ اور مجھے اُس وقت تک چین نہیں آیا، جب تک کہ میں نے اُس کا جواب لکھکر شائع نہیں کر دیا۔ اور یہی وہ تنہا چیز ہے جس نے مجھ پر ثابت کر دیا کہ میں نے اپنے متعلق جو رائے قائم کی تھی وہ غلط ہے، اور بچپن کا چور ابھی تک میرے دل میں چھپا ہوا ہے۔

ہر چند یہ قطعی طور پر صحیح ہے کہ سیماب صاحب کا بُھساولی خطبۂ صدارت، اُن کے تمام دیگر افکار و کردار کی طرح، سراسر بے مغز، اور کلیتہً معاندانہ تھا، لیکن اُس کا جواب لکھتے ہوئے میرے لہجے میں، میرے مذاق و معیار سے گری ہوئی جو جھلک آگئی ہے، اُس کا سبب یہ ہے کہ "علاّمہ" نے اپنے خطبے میں جابجا مجھ پر رکیک حملے کئے ہیں۔

جس کے یہ معنی ہیں کہ اگر اس خطبے میں میری ذات پر حملہ نہ کیا جاتا تو شاید میں اُس کا جواب ہی نہ دیتا، اور اگر نمائندۂ رندانِ ہند کی حیثیت سے جواب دیتا بھی، تو اس کا لہجہ تلخ نہ ہوتا — گویا بہ الفاظِ دیگر مجھے اِس پر غصہ آگیا کہ مجھے بُرا کیوں کہا گیا، اور اس طرح میں خود اپنے اس قول کی زد میں "جس شخص کو اپنے بُرا کہنے والے پر غصہ آئے، وہ ناقص انسان ہے"۔

میں دل سے پوچھتا ہوں کہ کیا اِس موقعے پر ایک فراخ دل انسان کی حیثیت سے میرا یہ فریضہ نہ تھا کہ میں سیماب صاحب کو معاف کر دیتا؟

اِس قدر مسلسل تفکّر و تدبّر کے بعد بھی، اور بارگاہِ جمال میں اِس قدر پیہم جبیں سائیوں کے باوجود، میں اپنی ذات پر حملہ کرنے والے کو معاف نہ کر سکا، یہ میرے واسطے کس حد کی شرمناک بات ہے۔

بات یہ ہے کہ بعض اوقات، انسان، اپنے بعض وقتی اعمالِ صالح سے دھوکا کھا کر اپنے متعلق اچھی رائے قائم کر لیتا ہے، میں چونکہ متعدد مواقع پر اپنے دشمنوں اور بدخواہوں کو معاف کر چکا ہوں، اُن کے واسطے دوڑ دھوپ کر کر کے اُنھیں روزگار سے لگا چکا ہوں، اور آڑے وقتوں میں اُن کے کام آچکا ہوں۔ اِسی بنا پر میں نے اپنے متعلق یہ رائے قائم کر لی تھی کہ اب میں جذبۂ غضب و انتقام پر غالب آچکا ہوں، اور پہلی سی تُندمزاجی اب مجھ میں باقی نہیں رہی ہے۔ لیکن آج معلوم ہوا کہ یہ سب فریب تھا۔ بچپن کا غصہ میرے دل میں آج بھی موجود ہے۔ یہ صحیح ہے کہ وہ نیم مُردہ حالت میں ہے۔ مگر یہ خیال تو غلط ثابت ہو گیا کہ وہ قطعی فنا ہو چکا ہے۔

آج مجھے اپنے اِس شعر کی قدر ہوئی۔

سا ہمارے حال کو دُنیا بھلا کیا جان سکتی ہے
بسا اوقات جب ہم خود غلط اندازہ کرتے ہیں

ایک دل گُردہ تھا خاندانِ رسالت کے گوہرِ شب چراغ، علی ابنِ ابی طالبؑ کا کہ وہ قتل کرتے وقت ایک دشمنِ اسلام کے سینے سے محض اس لئے اُتر آئے تھے کہ اُس نے آپ کے رُوئے مبارک پر تھوک دیا تھا ــــ

اور ایک ظرف ہے میرا کہ میں سیمابؔ صاحب کے ایک تحریری حملے کو برداشت نہ کرسکا۔

میں تو سمجھتا تھا کہ رندی، درویشی سے بڑی چیز ہے لیکن یہاں تو معاملہ برعکس ہے ــــ لیکن ممکن ہے کہ ہنوز میری رندی ہی ناقص ہو، اور میں ہنوز وہ حقیقت پناہ انسان ہی نہ بن سکا ہوں جسے رندِ کامل کہتے ہیں۔

فروغِ بادہ

چلا ہوں سُوئے خُمستاں پئے فشُردۂ تاک
نگاہ روبرُو، اے ساکنانِ عالمِ پاک

فدائے جامۂ صد چاکِ اہلِ وحشتِ بادہ
ہزار خرقۂ افکار و خلعتِ ادراک

فروغِ بادہ سے ہے خاکیوں میں طُرفہ خروش
محلِ سجدہ ہے اے نُوریانِ ہفت افلاک

فدائے ہمتِ خُدّام حضرتِ ساقی
نہ زندگی سے تعلُّق کوئی، نہ موت سے باک

ہوئے نہیں ہیں مُسخّر ہنوز شمس و قمر
ہنوز وقفِ تپش ہے ہر ایک ذرّۂ خاک

خدا شراب کو اے جوشؔ سُرخرو رکھے
بنے علاجِ لبِ خشک و دیدۂ نمناک

جوشؔ

شباب، مرعوبِ شیب

اک پیر کے پاس کچھ بجھی سی — بیٹھی ہے خموش ایک لڑکی
احساس کا خلفشار رُخ پر — پیری کے ادب کا بار رُخ پر
خامی پہ نگاہِ پختہ کاری — غنچے پہ خزاں کا رُعب طاری
پیری کے جھکے نڈھال کاندھے — دریائے طرب کا بند باندھے
طوفاں کی سحر، جمود کی رات — شعلے کی جبیں پہ برف کا ہات
افسردہ ہے دامِ جبر میں گُل — پژمُردہ ہے جیبِ خار میں گُل
تخریب کے سائے میں ہے تعمیر — نظروں میں پڑی ہوئی ہے زنجیر
بیچین ہے حُسن کی تب و تاب — کھلنے کے لئے کلی ہے بیتاب
سینے میں ہے محوِ پرفشانی — پیری سے بھچی ہوئی جوانی
عشوؤں کا لہو بہ سوگواری — عارض کے خطوط میں ہے جاری
حُسن، آتشِ غم میں جل رہا ہے — کانٹوں پہ شباب چل رہا ہے
رہ رہ کے حواس کھو رہی ہے — اینٹھن سی رگوں میں ہو رہی ہے
اُٹھنے کے لئے نظر ہے بیتاب — آنکھوں میں تڑپ رہے ہیں گرداب
بیچین ہے ذوقِ خود نمائی — ہلچل میں ہے خونِ دل رُبائی
سینے میں اُمَس سی ہو رہی ہے — بیدار ہے یُوں کہ سو رہی ہے
کاکل کے مزاج پر خدارا — اے شیب کی ریش! رحم فرما
دے اِذن کہ دام تو بچھالے — شانوں پہ مچل کے لہر کھالے

ارباب نظر پہ وار کرلے
کونین کا دل شکار کرلے

جوشؔ

رباعیاتِ جوشؔ

جیتا ہے مگر حیات ملتی ہی نہیں
دل جس سے کھلے، وہ بات ملتی ہی نہیں
تقلید ہے وہ وجع مفاصل جس سے
ملا کو کبھی نجات ملتی ہی نہیں

قدرت، غیظ و غضب میں آ ہی گیا
کی عقل نے انگشت نمائی کب کیا
مذہب کو مٹانے لگا جب آئینِ حیات
انساں کی شرارت مسکرا ہی گیا

ہاں، دل کو رہینِ بادہ خواری کر لے
رگ رگ میں طرب کی لہر جاری کر لے
اللہ رے فتنہ ہائے بیداریِ ہوش
دانا ہے تو دل پہ خواب طاری کر لے

ہاں شیخ کا ہے جوہرِ اصلی، دھوکا
دنیا ہے تو بس دل کی تسلی، دھوکا
کل زہد تر و تازہ تھے اب زاہد تک
وہ بھی دھوکا تھا، اور یہ بھی دھوکا

سونے کی اقتصادی اہمیت

کہا جاتا ہے کہ سیاسیات اور اقتصادیات ایک ہی گاڑی کے دو گھوڑے ہیں، جن میں سے کسی ایک کی کمزوری بھی منزلِ مقصود تک پہنچنے میں رکاوٹ بن سکتی ہے۔ لیکن اگر دقیق نظروں سے مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہو جائے گا کہ سیاسیات کی باگ اقتصادیات کے ہاتھ میں ہے، جس کی بہتری اور برتری پر ہی ملک کی خوش حالی اور سربلندی کا بہت کچھ انحصار ہے۔

ملک کی اقتصادی بہتری بین الاقوامی تعلقات کی خوش استواری ہے، جس میں تجارت کو سب سے بڑا دخل حاصل ہے اور تسلیم کر لیا گیا ہے کہ بین الاقوامی تجارت ہی ملک کو سرسبز اور خوش حال بنا سکتی ہے اور اس ہی کا ملک کی اقتصادیات میں سب سے بڑا حصہ ہے۔ لیکن باہمی تجارت کے لئے کسی ایسی چیز کی ضرورت تھی کہ اُسے معیار قرار دے کر آپس میں تبادلہ کیا جا سکے۔ اس کے لئے ماہرین نے سونے کو منتخب کر لیا۔

سونے کی اقتصادی اہمیت سیاست دانوں سے پوشیدہ نہیں رہی۔ اس کا احساس اس وقت بخوبی ہو گیا۔ جب جنگِ عظیم کے بعد ان حکومتوں نے جنھوں نے طلائی معیار ترک کر دیا تھا۔ اپنے تجارتی تعلقات استوار کرنے چاہے اور عملی تجربہ حاصل کیا کہ سونے کے بغیر تجارتی تعلقات کی استواری کدال سے پہاڑ ڈھانا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ ہر حکومت نے تہیہ کر لیا وہ زیادہ سے زیادہ سونا جمع کرے گی۔

طلائی تاریخ

طلائی تاریخ بڑی دلچسپ ہے۔ اور اپنے اندر ایک ایسا افسانوی پہلو رکھتی ہے۔ جس سے عجیب و غریب واقعات کا انکشاف ہوتا ہے۔ لیکن وقت کی قلت اور جگہ کی کمی کی وجہ سے میں زیادہ سے زیادہ مختصر کر کے صرف ضروری چیزوں کا بیان کروں گا۔

کم از کم سات ہزار برس سے جب سے ہمارے تمدن اور معاشرت کی بنیاد پڑی سونا ہماری زندگی کا جزِ عظیم رہا ونیز اس کے علاوہ کسی اور چیز کے حصول کے لئے اتنی کوششیں نہیں کی گئیں۔ جب سے اس کی قیمت آشکارا ہوئی لوگوں نے اُسے حاصل کرنے کے لئے اپنی جان کی بازیاں لگانی شروع کر دیں۔ اور ہر قسم کے خطروں سے آمادہ بہ پیکار ہو گئے۔

اگر ہم محققین کے بیانات کا مطالعہ کریں تو پتہ چلتا ہے کہ سونے نے سب سے پہلے اپنی چمک سے مصریوں کی آنکھیں خیرہ کیں۔ اُنھوں نے اس کی حقیقت معلوم کرتے ہی اپنی مہیں اطراف و کنار بھیجدیں۔

قرونِ اولیٰ میں جب کہ دنیا کا دور غیر متمدن تھا اور انسان کا مشغلہ صرف کھیتی باڑی کر کے اپنی بقا کا انتظام کرنا تھا، اس وقت کوڑیاں سب سے قیمتی چیز سمجھی جایا کرتی تھیں۔ یہ کوڑیاں بحرِ ہند میں پائی جاتی ہیں۔ لیکن وہ سیاح جو اس دور میں صحرائے نیوبین سے وادیٔ نیل اور وہاں سے میڈیٹیرینین گزرتے۔ یہاں سے کوڑیاں اپنے ساتھ تبرک کے طور پر لے جاتے۔ کیونکہ یہ کوڑیاں دیوتاؤں کی نشانی تصور کی جاتی تھیں اور سردارانِ قبیلہ سے عنبر لے کر تبادلہ کر لیا کرتے۔ جس میں یہ خصوصیت ہے کہ گھسنے کے بعد سوکھے پتے کھینچنے کی مقناطیسی کشش پیدا ہو جاتی ہے۔ ان کے ذریعے کوڑیاں تمام یورپ میں پھیل گئیں۔

یہ سلسلہ ہزاروں برس تک جاری رہا۔ اس متذکرہ دور میں صحرائے نیوبین میں سونے کا فرش بچھا ہوا تھا، اور سونے کے بڑے بڑے ڈلے نہایت آسانی سے دستیاب ہو جایا کرتے۔ لیکن چونکہ اس وقت بے قیمت چیز سمجھی جاتی تھی اس لئے کوئی قدر نہ کرتا تھا۔ کچھ عرصہ بعد صحرا کے ان ناشائستہ باشندوں نے سونے کو مصنوعات کی جگہ استعمال کرکے ان کی کوڑیاں بنانی شروع کر دیں اور ان کے عیوض اصلی کوڑیاں لینے لگے۔ تجار انھیں مصر لے گئے —— یہ اس وقت کا قصہ ہے جب ملک میں تمدن کی تعلیم پھیل رہی تھی۔ اس کی تصدیق ہیں ان طلائی کوڑیوں کی ساخت بھی اپنی جگہ عجیب و غریب اور دلچسپ ہے۔ آہستہ آہستہ اس دھات کی قدر شروع ہوئی جس لئے قدرت نے اسے پیدا کیا تھا اور انجام کار اس کی حیثیت سورج کی سی ہو گئی۔ جو ہر روز مخلوق کے لئے ایک نئی زندگی لاتا ہے۔ اس کی بدولت کوڑیوں کی قدر و قیمت فنا ہو گئی اور یہ اعتقاد جم گیا کہ سونا ہی انسانی زندگی کو راحت بخشنے والا ہے۔

سونے کی تلاش اور اس کی جمع فرعون کی نسلیں مدتوں کرتی رہیں اور دنیا کے لئے مثال قائم کر دی کہ بادشاہوں کی دوسری ضرورتوں میں ایک ضروری امر یہ بھی ہے کہ وہ زیادہ سے زیادہ سونا جمع کرے۔

طلائی معیار اور سکے

لیکن صدیوں تک اس کی کوئی خاص قیمت قائم نہیں کی جا سکی۔ تاکہ ایک معیار قائم کرکے اس کے ذریعے مال و اسباب کا تبادلہ کیا جاتا۔ مگر بعد میں جب اس کی اشد ضرورت محسوس ہونے لگی تو لوگوں نے اسے تبادلہ کے لئے بھی استعمال کرنا شروع کر دیا۔ شاید مصری ہی پہلے لوگ تھے جنھوں نے زراعت کے عوض اسے خریدنا شروع کر دیا۔ رفتہ رفتہ دوسرے لوگ بھی تبادلہ میں دوسری چیزیں دینے لگے۔ چنانچہ تحقیق سے یہ امر پایۂ ثبوت کو پہنچ جاتا ہے کہ مصریوں کے فوراً بعد ہی اہلِ میڈیٹرینین نے سونے سے غلّہ۔ جانور، لوہے و تانبہ کے برتن اور اسی قسم کی دوسری چیزوں کا تبادلہ شروع کر دیا۔ لیکن سونے نے ابھی تک سکّہ کی صورت اختیار نہیں کی تھی۔ یہ ضرورت مسیح سے آٹھ صدی قبل میڈاس والیٔ کیڈیا نے پوری کر دی اور سونے و چاندی کے سکّے جاری کر دئے۔ یہ سکے تمام میڈیٹرینین میں سرعت کے ساتھ پھیل گئے اور پہلی اقتصادی اہمیت کا باعث ہوئے۔

سُود خواری کی ابتدا اور اُس کے مضر اثرات

اس وقت تک قدیم یونان میں مجتہدانہ زندگی بسر کی جایا کرتی تھی۔ چھوٹے چھوٹے دہقانی کسان اپنی ضروریات کے مطابق کھیتی باڑی کرتے اور اُن کا آپس میں تبادلہ کر لیا کرتے۔ لیکن سکّہ کے رواج پاتے ہی بین الاقوامی تجارت کا موقعہ پیدا ہو گیا اور ہر چیز اسی رنگ میں رنگتی نظر آنے لگی۔ لیکن مشکل یہ پیدا ہو گئی کہ جب مال و اسباب کا آپس میں تبادلہ بند ہونے لگا تو کسان اور چھوٹے موٹے غربا اپنی ضروریات کو پورا کرنے کے لئے یہ سکّے کہاں سے پیدا کرتے؟ فوراً ہی ایک نئی جماعت منظرِ شہود پر آئی جو سودی روپے کی تجارت کرتی تھی۔ کسان اس نئی اسکیم سے گھبرائے۔ مگر انھیں مجبور کیا جانے لگا کہ وہ بھاری بھاری شرح سود پر قرض لیں اور مقررہ عرصہ میں ادائیگی نہ کرنے کا مطلب یہ تھا کہ قرض دہندہ اس کا خاندان اور اس کی تمام ملکیت قرض خواہ کی ملکیت بن جایا کرتی، اور اس سے اسی کے کھیت میں بطور غلام کے کام لیا جاتا۔ اور بقا کے لئے پیداوار کا چھٹا حصہ دیدیا جاتا —— یہ تخصیص اور مجبوریاں ہی جماعت بندی اور فرقہ بندی کرکے آپس میں بغض و عناد اور پھوٹ پیدا کر دیتی ہیں۔ شاید یہی وہ دور تھا جب سے انسانوں میں نسلی تفریق اور امتیازات پیدا ہوئے اور موجودہ خلفشار و بے چینی ظہور میں آئی۔

ان غلاموں کی بڑھتی ہوئی تعداد اور اس خطرناک دور کی پیچیدگی کو جہاں تک ریٹیکا کا تعلق ہے سولون اور پے سی ٹرے ٹس نے حل کیا اور حکم نامہ جاری کر دیا کہ پچھلے تمام قرضے منسوخ اور ہر شہری فرقہ بندیوں سے پاک ہے۔ پے سی ٹرے ٹس نے تو یہاں تک حکم دیدیا کہ یہ غلام کسان جس کھیت میں کام کر رہے ہوں وہ کھیت ان ہی کی ملکیت تصور ہو گا۔

سونے کی اہمیت دن بدن بڑھتی رہی اور اس کے ساتھ ساتھ جمع کرنے کا شوق بھی زیادہ ہوتا رہا —— دنیا میں ہر چیز کمی کی بدولت قیمتی قرار دی جاتی ہے۔ یہی سونے کے ساتھ بھی ہوا اور یہ عقیدۂ باطلہ لوگوں نے ذہن نشین ہو گیا کہ سونا ہی دنیا کی اہم ترین شے ہے۔

عقیدۂ باطلہ

ہم مدت سے عقیدۂ باطلہ کے شکار ہوتے چلے آئے ہیں۔ عقیدۂ باطلہ

وہ عقیدہ ہے جس کی کوئی بنیاد نہیں ہوتی۔ لیکن اس کی یہ کمی ہم پر اثرانداز ہونے سے نہیں رُکتی۔ یہ بھی عقیدہ باطلہ تھا کہ ہزاروں برس تک انسانی قربانی دیوتاؤں کے چرنوں پر ہوتی رہی اور اس طرح لاکھوں بندگانِ خدا ناجائز طریقہ پر موت کے گھاٹ اُتار دیئے گئے۔ یہ کتنا بھیانک عقیدہ تھا کہ دیوتا انسانی قربانی سے خوش ہو کر اپنے رحم و کرم کی بارش کرتے ہیں! ان ہی عقیدوں کی بنا پر سونا خدائی حکومت جاری رکھنے کے لئے بطور نذرانہ دیا جاتا رہا اور دیا جاتا ہے۔ یہ عقیدۂ باطلہ بادشاہوں تک میں رواج پا گیا اور آج تک کارفرما ہے۔ آج بھی تخت و تاج اور دیگر شاہانہ چیزیں اسی زرد دھات کی بنی ہوئی نظر آتی ہیں۔ سونے کے چھتر بنائے جاتے ہیں، کُرسیاں منڈھی جاتی ہیں۔ استعمال کے برتن۔ زیورات اور صدہا چیزیں لازمی نظر آتی ہیں۔ اس لئے نہیں کہ یہ سب سے زیادہ قیمتی دھات ہے۔ بلکہ اس لئے کہ اس کا رواج صدیوں سے چلا آرہا ہے۔ یہی عقیدہ اس متمدن دور میں بھی کارفرما ہے۔ اور ہم یقین کرنے پر مجبور رہیں کہ سونا صرف جمع کرنے کے لئے ہی ضروری نہیں بلکہ بین الاقوامی تجارت قائم کرنے کے لئے بھی بہت زیادہ اہم ہے۔

لیکن یہ ضروری نہیں کہ ہر ایسا عقیدہ ضرر رساں بھی ہو۔ بعض صورتوں میں یہی عقیدہ انسانی منفعت کے لئے سودمند عقیدہ کہلائے جانے کا مستحق بن سکتا ہے اور یہ حقیقت ہے کہ اعتقاد جتنا انسان پر اثرانداز ہوتا ہے اتنی کوئی چیز نہیں ہوتی۔ بعض یہی عقیدے انسانوں کو ایک ہی صف میں لا کھڑا کرتے ہیں۔ رسوم بظاہر عقیدہ باطلہ ہی ہیں۔ لیکن اپنی جگہ انسانوں کے لئے بہت سودمند ہیں۔ اسی کی بدولت آج جمعیتیں بنیں اور تقریبوں کی بنیادیں ڈالی گئیں۔ چنانچہ ہر قوم کے افراد اپنے اپنے معینہ اوقات پر ایک ساتھ رسوم ادا کر کے باہمی یکجہتی پیش کرتے ہیں۔ یہی عقیدہ باطلہ سونے کے حق میں بھی ایک حد تک سودمند ثابت ہوا۔ انسانوں کو مدت سے کسی ایسی قیمتی چیز کی ضرورت تھی جو تبادلہ کے طور پر کام آسکے۔ اور اُسے قبول کرنے میں کوئی انکاری نہ ہو۔ کیونکہ ایسی چیز بین الاقوامی تجارت کے لئے ضروری تھی۔ سونا قابلِ قبول دھات ہونے کی بنا پر آسانی کے ساتھ سکہ بن گیا اور بین الاقوامی تجارت کی بنیاد مضبوط ہو گئی اور لوگوں میں یہ عقیدہ جم گیا کہ یہ نہایت قیمتی دھات ہے جس کا وہ جب کبھی۔ جہاں کہیں اور جس چیز کے ساتھ چاہیں تبادلہ کر سکتے ہیں۔

پہلا طلائی حادثہ

صدیوں تک سونا اطمینان بخش طریقہ پر تبادلہ کے کام آتا رہا۔ اور جوں جوں زمانہ گزرتا گیا توں توں شرح میں معیاری تبدیلیاں ہوتی رہیں۔ لیکن آہستہ آہستہ اس کی حیثیت سیاسیات کے مسئلہ کی سی بھی ہو گئی۔ چنانچہ یہی وجہ تھی کہ سولہویں صدی میں جب نیا سونا بازار میں آیا تو عوام میں ایک بے چینی سی پھیل گئی اور بڑے بڑے تجار کے قدم ڈگمگا گئے۔

یہ بے چینی ایسی پیدا ہوئی کہ تعلق منقطع نہیں کیا جا سکا۔ چنانچہ اب تک دنیا اسی بے چینی میں گرفتار ہے اور نہ جانے کب تک گرفتار رہے گی؟ —— خارجی تعلقات میں سونے کو جو دخل حاصل ہے وہ کسی چیز کو نہیں۔ انیسویں صدی میں جب کہ دنیا کا دور ترقی پذیر تھا اور بین الاقوامی تجارت روز افزوں تھی سونے کی کمی کا احساس ہوا۔ لیکن ان نئی کانوں سے یہ بے چینی رفع ہو گئی جو کالیفورنیا آسٹریلیا اور کلونڈائک میں دریافت ہوئیں اور جنھوں نے اتنا سونا پیدا کر دیا کہ بڑھتی ہوئی تجارت کو برقرار رکھا جا سکے۔

سنہ ۱۹۱۰ء سے کوئی خاص کان دریافت نہیں ہوئی۔ لیکن تعلقات کی خوش استواری کی بدولت سنہ ۱۹۱۴ء تک بجائے نقد ادائیگی کے چکوں اور ہنڈیوں نے تجارتی تعلقات کو برقرار رکھا۔ اور چھوٹے موٹے حادثوں کے باوجود شرح اپنی جگہ قائم رہی۔

جنگِ عظیم کی ابتدا اور طلائی معیار کا خاتمہ

جنگِ عظیم کے شروع ہوتے ہی نفسی نفسی کی پکار مچنے لگی۔ جنگی ضرورتوں میں اقتصادیات مضحکہ خیز مسئلہ بن جاتا ہے۔ چنانچہ کیا طلا اور کیا طلائی معیار سب کچھ مفقود ہو گیا اور سوائے امریکہ کے تمام حکومتوں نے اسے ترک کر دیا۔ اس ہی لئے جنگ ختم ہونے کے بعد سوائے امریکہ کے کسی جگہ طلائی معیار نظر نہ آتا تھا۔ تمام حکومتیں اپنی فیکٹریوں۔ جہازوں اور دیگر شعبہ جات کی ضمانت پر ہنڈیاں جاری کر رہی تھیں۔ یہ ہنڈیاں اثرانداز تو ہوئیں۔ لیکن سیاسی پیچیدگیاں آپڑیں اور تمام حکومتوں کو احساس ہو گیا کہ سونا اقتصادیات ہے۔ اور اقتصادیات سونا۔ چنانچہ ہر حکومت کو سونا جمع کرنے کی دُھن سوار ہو گئی۔ اور صرف انگلینڈ ہی

نہیں بلکہ عوام کو بھی جنھیں کرنسی نوٹوں اور حکومتی ہنڈیوں پر اعتماد نہ رہا تھا۔ سونا جمع کرنے کی فکر دامنگیر ہوئی۔ ایک تو قیمت ٹھوس ہونے کے خیال سے دوسرے مستقبل میں دام بڑھ جانے کی اُمید تھی۔ فرانس اور امریکہ کو سونا جمع کرنے کا سب سے زیادہ خبط تھا۔ برطانیہ کے علاوہ صرف ان دونوں حکومتوں نے جنگِ عظیم کے کچھ عرصہ بعد ہی دنیا کا ⅔ سونا سمیٹ لیا (امریکہ نے ۲۶۸۸۰۰ من۔ فرانس نے ۱۰۱۳۱۴۴ من اور برطانیہ نے ۴۴۸۰۰ من) لیکن بعض کانوں نے سونے کی برآمد میں روزافزوں ترقی دکھائی اور آنیکا (اسپین) آزنیک روس۔ آسٹریلیا اور کالیفورنیا کی معدنیات نے اتنا سونا نکال پھینکا کہ یہ کمی پوری ہوگئی۔ ورنہ خدا جانے آج طلائی رُخ کیا ہوتا؟

طلائی کانیں اور ان کی برآمد کے دلچسپ اعداد و شمار

دنیا میں سونے کی بڑی بڑی کانیں ہیں۔ جن کی برآمد کے اعداد و شمار دیکھکر عقلِ انسانی دنگ رہ جاتی ہے۔ شمالی افریقہ کی کان سے (جس کا انکشاف ہوئے زیادہ مدت نہیں گزری) اب تک ایک ارب روپے کا سونا نکالا جاچکا ہے، اُس نے اپنے حصہ داروں میں تیس کروڑ روپے سے زیادہ رقم منافع میں تقسیم کی ہے۔ اس کی صرف ایک چٹان میں ۷۵ کروڑ روپے کا سونا انداز کیا جاتا ہے جس میں سے اب تک تقریباً آدھا سونا نکالا جاچکا ہے۔

کالیفورنیا۔ آسٹریلیا۔ انیکا (اسپین) اور روس کی کانوں آزنیک کے ذخیروں۔ کلونڈائک۔ امریکہ۔ آسٹریا اور ہندوستان کی معدنیات سے بھی متحیرکن سونے کی مقدار نکلتی ہے۔

انھیں تحیرخیز اعداد و شمار اور منافع کے لالچ میں اور ایسے ہی گنج قارون کی تلاش میں ہزاروں آدمی خطِ سرطان سے لے کر قطب تک سرگرداں ہیں۔ سب سے زیادہ محرک امر یہ ہے کہ سونے کی قیمت فی اونس ۴ پونڈ ۵ شلنگ سے سات پونڈ ہوگئی ہے۔ لیکن اس صدی میں سوائے چند چھوٹی موٹی کانوں کے کوئی ایسی کان دریافت نہیں ہوئی جس سے سونے کی برآمد پر کوئی خاص اثر پڑتا۔ ایک کان سلسلۂ کوہ نیوگنی میں دریافت ہوئی ہے۔ لیکن وہاں آمد و رفت کے لئے ہوائی جہازوں کی ضرورت ہے۔ اور سامان باربرداری لانا لے جانا سخت مشکل ہے۔

ایک کان کینیا کی نوآبادی میں سنہ ۳۲ء میں اتفاقاً دریافت ہوگئی جب دو آدمی ایک نالہ کے قریب پانی پینے گئے تو انھوں نے پانی میں کوئی زرد چیز چمکتی دیکھی۔ یہ بارہ تولہ وزنی سونے کا ڈلا تھا۔ بس قسمت جاگ اُٹھی اور نکالنے کا سامان شروع کردیا گیا۔ اب یہ کان کافی سونا دیتی ہے۔

جنگِ عظیم سے قبل دنیا میں سالانہ ۱۶۸۰۰ من سونا نکلتا تھا۔ جو سنہ ۳۵ء میں ۲۷۶۲۰ من نکلنے لگا۔ ماہرینِ طلا کا خیال ہے کہ اگر برآمد کی یہی رفتار رہی تو سنہ ۱۹۴۰ء سے ۳۵۸۴۰ من سالانہ نکالا جاسکے گا۔ صرف روس میں سنہ ۳۶ء میں ۸۵۹۵ من سونا نکالا گیا تھا۔ اندازہ لگایا جاتا ہے کہ یہ مقدار سنہ ۱۹۴۰ء میں ۱۱۶۲۰ من تک پہنچ جائے گی۔

اندازہ کے مطابق اس وقت دریافت شدہ کانوں میں تقریباً دس لاکھ من سونا ہے۔ جس میں سے زیادہ سے زیادہ ۳۳۶۱۰۰ من سونا سالانہ نکالا جاسکتا ہے اگر نئی کانیں دریافت نہ ہوئیں تو تیس سال کے عرصہ میں تمام کانیں خالی ہوجائیں گی۔

اس وقت دنیا میں کم از کم گیارہ لاکھ بیس ہزار من سونا موجود ہے جس میں سے تقریباً ۹۵۲۰۰۰ من بینکوں میں محفوظ ہے، اور بقیہ عوام کے پاس۔

سنہ ۱۹۳۱ء کا بین الاقوامی طلائی حادثہ

اس سے پہلے کہ مذکورہ بالا حادثہ پر روشنی ڈالی جائے یہ بتادینا چاہتا ہوں کہ سونے کی قیمت کس طرح متعین ہوتی ہے۔

رتشچائلڈ کے آفس واقع نیوکورٹ لندن میں چھ آدمی جو سونے چاندی کے ممتاز تجار کے نمائندے ہوتے ہیں۔ جمع ہوکر اپنی خرید و فروخت کا ایک دوسرے پر اظہار کرتے ہیں۔ اس طرح انھیں معلوم ہوجاتا ہے کہ طلائی اور نقرئی مانگ کتنی ہے؟ اور اس مانگ کو پورا کرنے کے لئے اُن کے پاس کتنا سونا اور چاندی موجود ہے۔ ان کے پاس پوری دنیا کی فرمائشیں آتی ہیں۔ کیوں کہ لندن سونا خریدنے کا سب سے معتبر مرکز تصور کیا جاتا ہے۔ یہ لوگ ان حقائق کو مدنظر رکھ کر شرح تبادلہ کی ایک قیمت مقرر کردیتے ہیں جو برقی طور پر تمام دنیا میں مشتہر کردی جاتی ہے۔ ان کے پاس فیصلہ پہونچنے کے دو آلات ہوتے ہیں ایک مانگ اور رسد (Supply.) اور دوسرے دو طلائی مرکزوں پیرس اور نیویارک میں اسٹرلنگ تبادلہ۔ مثلاً اگر آپ کو معلوم ہے کہ ایک پونڈ کی شرح تبادلہ پانچ ڈالر ہیں تو آپ اس دن کی

طلائی قیمت فوراً معلوم کرسکتے ہیں۔ کیونکہ سونے کی قیمت بصورت ڈالر مقرر ہے۔ یعنی ۳۵ ڈالر فی اونس جو برخلاف اسٹرلنگ کبھی نہیں بدلتی۔

۱۹۳۱ء کا طلائی حادثہ اقتصادی تاریخ میں ہمیشہ سیاہ نشان رکھیگا اس سال جتنی اقتصادی بے چینیاں ظہور میں آئیں اور جتنا تہلکہ بپا ہوا دیسا کبھی دیکھنے میں نہیں آیا اور نہ اقتصادی دنیا اپنی پچھلی تاریخ میں کوئی ایسی مثال پیش کرسکتی ہے۔

اس کی بہت سی وجوہ تھیں۔ لیکن سب سے بڑی اور اہم وجہ جو تھی وہ عجیب وغریب حیثیت رکھتی ہے۔

۱۹۳۱ء میں لندن کے جیولوجیکل میوزیم میں ایک بین الاقوامی کانفرنس قائم کی گئی تھی۔ جس کا افتتاح خود ملک معظم جارج پنجم آنجہانی نے کیا تھا، یہ واقعہ صرف باطل کی طرح مٹ کر ایک بھولی ہوئی داستان بن گیا ہے، بہت کم لوگوں کو یاد ہوگا کہ ایسی کوئی مجلس بھی قائم ہوئی تھی۔ اس میں تقریباً ساٹھ قوموں کے مندوبین نے شرکت کی تھی۔ بڑا لمبا چوڑا ایجنڈا تھا لیکن ان کے سامنے سب سے بڑا مرحلہ جو پیش تھا وہ یہ تھا کہ سونے کی کوئی نئی قیمت قائم کرنی چاہیئے

مشکل یہ آن پڑی کہ برطانوی قوم کا ایک نظریہ تھا۔ فرانسیسی قوم کا دوسرا اور امریکن قوم کا تیسرا لیکن ابھی جبکہ آپس میں ہی بحث ومباحثہ ہورہا تھا۔ جمہوریہ امریکہ کے صدر روز ویلیٹ نے ایک تارپیڈو چھوڑ کے کانفرنس کا تار پود بکھیر دیا اور یہ بغیر کسی نتیجے پر پہنچے ختم ہوگئی۔

حقیقت یہ تھی کہ روز ویلیٹ نے مشیر کاروں کے مشورے سے فیصلہ کرلیا تھا کہ اپنا سیاسی وقار قائم رکھنے کے لئے سونے کی قیمت بڑھا دے اور اس صورت پر عمل کرنے کے لئے ڈالر میں سے سونے کا جزو کچھ کم کردے۔ نیرو نے بھی رومن سکہ اور یس (Aureus) کے سلسلہ میں یہی حکمت عملی اختیار کی تھی۔ اس نے سکہ میں کھوٹ ملا کر قرضہ کا بوجھ ہلکا کرنا چاہا تھا۔ روز ویلیٹ نے اس کی تقلید کی۔ اس نے سوچا اگر وہ ڈالر میں سے سونے کا جز کم کردے گا تو قیمت بڑھ جائے گی۔

اس زمانہ میں سونے کی قیمت فی اونس بیس ڈالر چالیس سینٹ (۲۰-۴۰) تھی۔ کانگریس نے روز ویلیٹ کے مطالبہ پر اسے ڈالر میں سے پچاس فیصدی طلائی جز کم کردینے کا اختیار دیدیا۔ مگر اس نے صرف ۴۱ فیصدی کم کیا اور حکم دیدیا کہ فی اونس سونے کا تبادلہ ۳۵ ڈالر سے کیا جائے ـــــ اس وقت سے دنیا کے طلائی معیار کی جو چولیں ہلی ہیں تو اب تک صحیح نہیں بیٹھیں۔

اقتصادی دنیا کے لئے روز ویلیٹ کا یہ اقدام پیغام موت سے کم نہ تھا، ایک مہیب زلزلہ۔ ایک آفت تھی۔ ایسا تہلکہ بپا ہوا۔ ایسا خلفشار مچا کہ یکے بعد دیگرے کئی حکومتوں کو طلائی معیار سے ہاتھ دھونے پڑگئے اور وہاں اب تک طلائی معیار مفقود ہے۔ یہ خلفشار اور بے چینی کسی تباہ کن جنگ یا مہلک بیماری نے پیدا نہیں کی تھی۔ دنیا کا یہ دور ماضی کی بہ نسبت زیادہ ترقی پذیر تھا۔ بین الاقوامی تجارت روز افزوں تھی۔ درآمد و برآمد میں فراوانی تھی۔ اس کے علاوہ اگر سونا تجارت کے لئے ضروری ہے تو سونے کا ڈھیر بھی اتنا کبھی نہ ہوا تھا۔ لہٰذا بجائے تنزل کے دنیا کو عروج پذیر ہونا چاہیئے تھا۔ دنیا پہلے سے زیادہ مالدار ہوتی۔ بیکاری ختم ہوجاتی۔ افلاس کا نام نہ ہوتا، لیکن ہر چیز کا اُلٹا اثر ہوا۔ اور اس ناخوشگوار اقدام نے تمام کوششیں ملیامیٹ کردیں۔ اس کا کوئی اجنبی سبب نہیں تھا۔ کوئی طاقت نہیں آزادی کے ساتھ ایک دوسرے سے تجارت کرنے میں نہیں روک رہی تھی۔ یہ قصور دنیا والوں ہی کا تھا۔ یہ مصیبت مہذب قوم کی ہی پیدا کردہ تھی۔ نہ کہ قدرت کی؟

سونے کی موجودہ قیمت

طلائی معمہ دراصل سیاسی معمہ ہے اور اسی کے ساتھ وابستہ بھی ہے بعض ماہرین طلا، مدبرین۔ انجینیروں۔ بنکروں اور طلائی تجار کے بیانات سے اظہار ہوتا ہے کہ سونے کی قیمت سات پونڈ فی اونس (تقریباً موجودہ قیمت) سے کم نہ ہونی چاہیئے۔ لیکن قیمت کے اس اضافہ سے نہ سونے کی برآمد پر اب تک کوئی اثر پڑا ہے اور نہ پڑسکتا ہے۔

بعض فلسفی کہتے ہیں اگر سونے کے استعمال کو ترک کردیا جائے تو اقتصادی بے چینیوں کا بڑی حد تک سدباب ہوسکتا ہے۔ یہی نظریہ جرائم۔ منشیات اور بیکاری کے سلسلہ میں بھی پیش کیا جاتا ہے۔ مگر حقیقتاً سونا ہماری زندگی کے لئے لازم وملزوم بن چکا ہے۔ اور جب تک اس دنیا میں کسی چیز کی کمی ہی اس کی قدر وقیمت کو بڑھاتی ہو تب تک سونے کا استعمال ترک نہیں کیا جاسکتا۔

طلائی غلامی

طلائی غلامی اس دیہات کا قصور نہیں بلکہ ہمارے ان مدبرین کا قصور ہے جو طلائی ڈھانچہ میں قومی سربلندی دیکھنا چاہتے ہیں۔ جنھوں نے فیصلہ کر لیا کہ بجائے سونے کو اپنی زندگی کے سُروں پر سجانے کے اس کی برآمد کے سُروں پر خود ناچیں۔

اگر ہم کاغذی نوٹوں پر دقیق نظریں ڈالیں تو اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ جتنا نوٹوں کا استعمال زیادہ ہوتا جاتا ہے۔ اتنی ہی سونے کی اہمیت بڑھتی جاتی ہے اور یہ ناممکن نہیں کہ مستقبل میں کاغذی سکہ بالکل ہی مفقود ہو جائے اور اس کی جگہ طلائی سکہ کلیتہً لے لے۔

بینک آف انگلینڈ کے تہ خانوں میں اتنا سونا موجود ہے کہ وہ جاری کردہ نوٹوں مالیتی چھیالیس کروڑ پچاس لاکھ پونڈ کے مساوی ہو سکے۔ جمہوریہ امریکہ کی کرنسی چھ ارب ڈالر کے نوٹ جاری کر چکی ہے اور اس کے پاس بارہ ارب ڈالر کے قریب سونا موجود ہے۔ فرانس کے پاس باوجود طلائی نقصانات کے اب بھی اتنا سونا ہے جو اس کے جاری کردہ نوٹوں سے دوگنا ہے۔

ہندوستانی کرنسی

انگریزوں کا اقتدار مسلط ہونے سے پیشتر ہندوستانی نقرئی کرنسی آزاد تھی اور طلائی تبادلہ بھی اسی وقت مبسوط ہو گیا جب ۱۸۳۵ء میں اشرفی کی قیمت پندرہ روپے مقرر کر دی گئی جس کا وزن روپے کی طرح ایک ہی تولہ تھا۔ غیر ملکی کرنسیاں جن کا معیار طلائی تھا ہندوستان سے اسی شرح پر تبادلہ کیا کرتی تھیں۔ لیکن یہ شرح اس وقت قائم رہ سکتی ہے۔ جب مانگ اور رسد ہموار رہے اور نقرئی و طلائی برآمد بھی یکساں ہو۔ یہی وجہ تھی کہ جب آسٹریلیا اور امریکہ کی نئی کانیں دریافت ہوئیں تو ہندوستان کی نقرئی کرنسی کے لئے موت کا پیغام مہیا ہو گیا اور روپیہ جس کی قیمت ایک شلنگ ساڑھے دس پنس تھی گھٹ کر ایک شلنگ ڈھائی پنس رہ گئی۔

ان امور نے اس قدر سخت مشکلات پیدا کر دیں کہ ۱۸۹۳ء میں حکومت کو تبادلہ بند کر دینا پڑا اور روپیہ نے جسے ۱۸۳۵ء میں معیاری سکہ قرار دیا گیا تھا۔ (Token coin) کا نقاب پہن لیا۔ اس کی قیمت اس کی نقرئی مقدار پر نہیں رہی بلکہ طلائی معاونت پر رہ گئی۔

ہندوستانی کرنسی پھر آزاد بنائی جا سکتی تھی لیکن حکومت برطانیہ کے مفاد کے لئے اسے انگلستان کی کرنسی کا محتاج بنا دیا گیا اور اس سے ہندوستان کو جو نقصانات پہنچے وہ واقفکار حضرات سے پوشیدہ نہیں۔ لیکن اس کے خلاف آوازیں بلند کرنے اور چلّا چلّا کر گلا خشک کر لینے کے باوجود ہمارے فرنگی آقاؤں کے کانوں پر جوں بھی نہیں رینگی ——— یہ موضوع نفسِ مضمون سے علیحدہ ہے۔ اس لئے اس پر کبھی فرصت میں روشنی ڈالوں گا۔

ہندوستان کے طلائی معدنیات

ہندوستان جہاں زراعت کے لحاظ سے دنیا میں شرفِ اولیت رکھتا ہے وہیں معدنیات کے سلسلہ میں بھی امتیاز رکھتا ہے جہاں دوسری دھاتیں پیدا ہوتی ہیں وہیں سونے کی بھی کمی نہیں۔ جن کی بعض کانیں دریافت ہو چکی ہیں اور بعض کے لئے جد و جہد کی جا رہی ہے۔

۱۹۳۱ء میں طلائی معیار ختم ہوتے ہی ہر ملک نے اپنے خزانے بند کر دئے اور سونا جمع کرنے کی خواہشات دوبالا ہو گئیں۔ سرمایہ داروں نے جب دیکھا کہ سونے کی قیمت بڑھ گئی ہے تو انھیں بھی تلاش کی سوجھی اور کرۂ ارض کے ہر خطہ کو ٹٹولنا شروع کر دیا۔

ہندوستان میں بھی یہ مہمیں جاری ہوئیں اور غیر ملکی سرمایہ داروں نے یہاں کی دولت سے مستفیض ہونے میں کوئی کسر اُٹھا نہیں رکھی۔ چنانچہ صوبہ بمبئی۔ میسور۔ راجپوتانہ وغیرہ میں اب تک تلاش ہو رہی ہے۔

ہندوستان کا پہلا طلائی مرکز پنڈیلر تھا اور شاید اب اس میں سونا باقی نہیں رہا۔ میسور کی معدنیات میں اب تک سونا موجود ہے اور کافی مقدار میں نکلتا ہے۔ نیلگری میں بھی آثار پائے گئے ہیں اور وہاں بھی جد و جہد جاری ہے اور اُمید کی جاتی ہے کہ جلد ہی کوئی ایسی نئی کان دریافت ہو گی جو ہندوستان کو طلائی سلسلہ میں بھی صفِ اول میں لا کھڑا کرے گی۔

اہلِ قلم

حضرات مضمون صاف اور خوشخط تحریر فرمایا کریں۔

بی بی مریم کا مداری

فرانس کے مشہور ادیب اناطول کے ایک افسانے کا ترجمہ

مترجمہ مخمور اکبر آبادی

شاہ لوئی کے زمانے میں ایک غریب مداری تھا، جس کا نام بارنیبس تھا یہ بیچارہ کمپین کا رہنے والا تھا اور شہر شہر گھوم کر ہنر اور قوت کے کرتب دکھاتا پھرتا تھا۔

خوشگوار دنوں میں وہ ایک پھٹا پرانا قالین چوک میں بچھا دیتا تھا، اور چند دلچسپ فقرے کہہ کر جو اس نے ایک بوڑھے مداری سے سیکھے تھے، اور جنھیں کوئی لفظ بدلے بغیر وہ ہمیشہ ایک ہی طرح دوہراتا تھا۔ بچوں اور نکھٹوؤں کا ایک غول جمع کر لینے کے بعد عجیب عجیب کسرتیں شروع کر دیتا تھا اور کانسے کی ایک طشتری ناک کی پھنگی پر تولنے لگتا تھا۔ شروع شروع میں مجمع بے توجہی برتتا۔ لیکن جب وہ سر نیچا کر کے ہاتھوں کے بل کھڑا ہو کر تانبے کی چھ گیندیں اچھالنے لگتا جو دھوپ میں خوب خوب چمکتیں اور پھر پاؤں سے لپک لیتا۔ یا اس طرح لیٹ کر کہ گردن ایڑیوں سے چھو جاتی۔ ایک مکمل پہیے کی شکل بن کر بارہ چھریوں کے کرتب دکھانے لگتا تو تماشائیوں میں تحسین و آفرین کا شور اٹھتا اور اس کے قالین پر چھوٹے چھوٹے سکوں کی بارش ہونے لگتی۔

لیکن اس پر بھی کمپین کا باشندہ بارنیبس، بہت سے ان بندوں کی طرح جو اپنے ہنر کی بدولت جیتے ہیں۔ بڑی مشکل سے اپنی معاش پیدا کرتا تھا۔ چوٹی سے ایڑی تک پسینہ بہا کر روٹی کمانے میں وہ ان اذیتوں کو غالباً اپنے حصے سے زیادہ جھیلتا تھا جو باوا آدم کی حماقت کی بدولت ہم سب کو ورثے میں پہونچی ہیں۔

مگر وہ جتنا چاہتا تھا اتنا کام نہ کر سکتا تھا کیونکہ اپنے حیرت ناک ہنر کی نمائش کے لئے۔ درختوں کی طرح۔ اسے بھی سورج کی حدت اور دن کی گرمی درکار تھی۔ جاڑے میں وہ ٹنڈ سے کسی طرح بہتر نہ رہتا تھا بلکہ واقعہ یہ ہے کہ ادھمرا ہو جاتا تھا۔ یخ بستہ زمین مداری کے لئے بہت سخت ہو جاتی تھی۔ اس برے موسم میں۔ جنگیز کی طرح، جس کا ذکر میری۔ ڈی۔ فرانس نے کیا ہے وہ بھوک اور سردی کی اذیتیں سہتا تھا۔ لیکن چونکہ نیک نفس تھا۔ سب کچھ چپ چپاتے جھیلتا تھا۔

اس نے دولت کی ابتدا ریا انسانی حالات کے عدم مساوات پر کبھی زیادہ غور نہیں کیا تھا۔ اس کو پکا یقین تھا کہ یہ دنیا اگر بری ہے تو دوسری اچھی کے سوا کچھ ہو ہی نہیں سکتی۔ اور یہ عقیدہ اس کی ڈھارس بندھائے ہوئے تھا، وہ ان بیدار مغزوں میں نہ تھا جو اپنی روح میں شیطان کے ہاتھ بیچ ڈالتے ہیں۔ وہ خدا کا نام بے ضرورت نہ لیتا تھا۔ با ایمان زندگی بسر کرتا تھا۔ اور اگرچہ خود بیوی والا نہ تھا۔ لیکن پڑوسی کی بیوی پر بری نگاہ نہ ڈالتا تھا۔ کیونکہ عورت تو ہی مرد کی دشمن ہے۔ جیسا کہ ہمیں سمسون کی کہانی سے معلوم ہوتا ہے، جو مقدس کتاب میں درج۔

اس کا نفس شہوت پر ہرگز مائل نہ تھا اور ترک نسواں سے کہیں زیادہ اسے شراب چھوڑنے میں اذیت ہوتی۔ اگرچہ وہ شرابی نہ تھا۔ لیکن خوشگوار موسم میں پی لینے سے اس کو مسرت ہوتی تھی۔ وہ ایک نیکوکار تھا جو خدا سے خائف اور مقدس کنواری کا عقیدت مند پرستار تھا۔ جب وہ کلیسا میں داخل

ہوتا تھا تو مادرِ خداوند کے مجسمے کے سامنے دوزانو ہوکر یہ التجا پیش کرنا کبھی نہ بھولتا تھا۔

"پاک بی بی میری زندگی کی نگراں رہیئے، جب تک کہ خدا مجھے موت دینا چاہے اور جب میں مر جاؤں تو مجھے فردوس کی مسرتوں سے ہمکنار کر دیجئے۔"

دن بھر پانی برسنے کے بعد۔ ایک شام کو، جب وہ اپنی شعبدہ بازی کی گیندیں بغل میں دبائے۔ چھریاں پرانے قالین میں لپیٹے، بوجھ سے جھکا ہوا، رنجور و غمگین کسی خستہ حال سرائے کی تلاش میں چلا جا رہا تھا۔ جہاں بہت ممکن تھا۔ رات کا کھانا کھائے بغیر، اُسے سونا پڑتا۔ اُس نے ایک راہب کو اسی سمت جاتے دیکھا اور اُسے ادب سے سلام کیا۔ کیونکہ یہ دونوں ایک ہی سی رفتار سے چل رہے تھے۔ آپس میں باتیں ہونے لگیں۔

"دوست" راہب نے کہا "تم سرسے پاؤں تک ہرے کپڑے کیوں پہنے ہو۔ کہیں تم کسی مذہبی کھیل (ڈرامہ) میں مسخرے کا روپ بھرنے تو نہیں جا رہے!"

"نہیں ہرگز نہیں بابا" بارنیبس نے کہا "میرا نام بارنیبس ہے، اور میں مداری کا کام کرتا ہوں۔ اگر مجھے روز روٹی مل جاتی تو یہ دنیا کا بہترین پیشہ تھا"

"دوست بارنیبس" راہب نے جواب دیا "سمجھ کی بات کہو، راہب کے پیشے سے بہتر کوئی پیشہ نہیں ہے۔ پجاری۔ خدا، کنواری اور ولیوں کی مدح کرتا ہے۔ راہب کی زندگی مالک کا مستقل بھجن ہے"

اور بارنیبس نے جواب دیا، "بابا میں مانتا ہوں کہ میں نے نادانی کی بات کہی۔ میری حالت کا آپ کے حال سے بھلا کیا مقابلہ۔ اگرچہ ناچنا اور سرے پر ایک سکہ رکھ کر، چھری کو ناک کی پھلگی پر تولنا تھوڑی سی ہنرمندی بھی مگر اس کو آپ کی سعادت سے کیا نسبت۔ بابا میں چاہتا ہوں کہ آپ کی طرح میں بھی روزانہ بھجن گا سکوں۔ خصوصاً پاک بی بی مریم کا توصیفی بھجن، جس کا میں خاص طور پر عقیدت مند پرستار ہوں۔ خانقاہ میں زندگی بسر کرنے کے لئے میں بڑی خوشی سے اس فن کو خیرباد کہدوں گا۔ جس سے میں سرنؔ سے بوسے تک۔ چھ سو سے زیادہ شہروں اور گاؤں میں مشہور ہوں"

راہب پر مداری کی سادگی کا اثر ہوا اور چونکہ اس میں بصیرت کی کمی نہ تھی۔ اس نے بارنیبس کے وجود میں وہ نیک نفس پہچان لیا جس کے متعلق جناب عیسیٰ نے فرمایا ہے کہ "اطمینان دنیا میں اُن کے لئے ہے" اور اس لئے اُس نے جواب دیا۔

"دوست بارنیبس، میرے ساتھ چلو۔ میں تمہیں اسی خانقاہ میں داخل کرلوں گا جس کا میں خود رئیسِ دیر (پرائر) ہوں۔ وہی جس نے ریگستان میں مریم مصری کی رہنمائی کی۔ مجھے تمہارے آڑے لایا ہے تاکہ میں تمہیں نجات کا راستہ دکھا دوں"

اس طرح بارنیبس راہب ہوگیا۔ جس خانقاہ میں وہ داخل ہوا تھا، اس کے راہب پاک کنواری (مریم) کی پوجا کے مسلک کو بڑی شان و شوکت سے سراہتے تھے۔ ہر ایک نے اپنا سارا علم و فن جو خدا نے اُسے بخشا تھا، پاک بی بی کی خدمت کے لئے وقف کر دیا تھا۔

خود رئیس دیر (پرائر) کتابیں تصنیف کرتا تھا۔ جن میں اشراقیت کے اصولوں کے مطابق مادرِ خداوند کے سارے فضائل درج کرتا تھا۔ اخی ماربود ان صحائف کو، نہایت پاکیزہ خط میں، چمڑے کے صفحوں پر نقل کرتا تھا اور اخی اسکندر انھیں چھوٹی چھوٹی نازک تصویروں سے مزین کرتا تھا جن میں فردوس کی ملکہ سلیمان کے تخت پر جس کے نیچے چار شیروں کا پہرا تھا۔ رونق افروز نظر آتی تھی۔ اس کے سر کے گرد، جو نور کے ہالے میں تھا سات فاختہ اُڑتی نظر آتی تھیں جو روح القدس کے سات عطیے، خوف، تقویٰ۔ علم۔ قوتِ۔ عدل۔ ذکاوت اور عقل تھے۔ ان کے ساتھ چھ سنہری بالوں والی کنواریاں، عجز، فراست۔ عزلت۔ حرمت۔ عصمت اور اطاعت تھیں۔ اس کے پاؤں کے قریب دو چھوٹے چھوٹے۔ چمکیلے۔ سفید سرتاپا عریاں پیکر ملتجیانہ انداز میں کھڑے نظر آتے تھے۔ یہ روحیں تھیں جو اپنی نجات کے لئے کامیاب التجائیں کر رہی تھیں۔ ایک اور صفحے پر اخی اسکندر نے حوا کو مریم کے ساتھ پیش کیا تھا تاکہ ایک ہی وقت میں معصیت اور نجات، نسائیت کی پستی اور کنواری کی رفعت دیکھنے والے کے سامنے آجائے، اس کی تصنیف کی دوسری نہایت مقبول تصویروں میں آبِ حیات کے کنویں، چشمے۔ نیلوفر۔ ماہتاب، آفتاب اور باغ ممنوع کی تصویریں تھیں جن کا سبھی گیتوں میں خوب خوب ذکر کیا گیا ہے۔ بابِ فردوس اور مدینۃ الالٰہیہ کی بھی تصویریں تھیں۔ یہ سب کنواری کے مجسمے تھے۔

اخی ماربود بھی مریم کے عزیز فرزندوں میں سے تھا۔ وہ پتھر کے مجسمے تراشنے میں ہمیشہ اتنا مصروف رہتا تھا کہ اس کی ڈاڑھی، بھنویں اور

بال گرد سے سفید رہتے تھے۔ آنکھیں ہمہ وقت ورم آلود اور نم رہتی تھیں، لیکن وہ اس پیرانہ سالی میں بھی جفاکش اور خوش باش تھا۔ اور کوئی شبہ ہی نہ تھا کہ فردوس کی ملکہ اپنے اِس فرزند کی شامِ زندگی کی خاص طور پر نگراں تھی۔ ماربود نے اُسے (مریم کو) ممبر پر جلوہ فرما دکھایا تھا۔ اس کی پیشانی نور کے حلقے میں محصور کی تھی جو موتیوں کا ہار نظر آتا تھا۔ اُس نے بڑی جانفشانی سے اسی کے لباس کی سلوٹوں سے اس کے (مریم) پاؤں ڈھانک کر دکھائے تھے، کیونکہ اسی (مریم) کے لئے کسی نبی نے کہا ہے کہ "میرا محبوب گلستانِ ممنوع کی مانند ہے"۔

کبھی وہ اُسے ایک پُر وقار بچے کی شکل میں پیش کرتا تھا، اور اس کا پیکر زبانِ حال سے یہ کہتا معلوم ہوتا تھا" اے پروردگار تو ہی میرا پروردگار ہے"۔

خانقاہ میں شعرا بھی تھے جو لاطینی نظم میں تصنیفات کرتے اور نہایت مہربان کنواری مریم کی شان میں بھجن نظم کرتے تھے۔ ان میں ایک پکارڈی کا باشندہ بھی تھا جو پاک بی بی کے معجزوں کو لاطینی سے عام فہم فرانسیسی نظم میں ترجمہ کرتا تھا۔

مدحت کے باب میں اتنی جدوجہد اور اعمالِ حسنہ کی ایسی نفیس پیداوار دیکھ دیکھ کر بارنبس کو اپنی جہالت اور بے مائیگی کا ملال رہنے لگا۔

ایک روز جب وہ خانقاہ کے بائیں باغ میں بالکل اکیلا ٹہل رہا تھا اُس نے سرد آہ بھر کر کہا" افسوس میں کتنا بدنصیب ہوں کہ اپنے ہم مشربوں کی طرح پاک مادرِ خداوندی کی شایانِ شان مدحت نہیں کر سکتا حالانکہ اپنے قلب کی ساری محبت میں نے اسی کو نذر کر دی ہے۔ افسوس میں غبی ہوں۔ مجھے کوئی فن نہیں آتا۔ پاک بی بی آپ کے حضور میں پیش کرنے کے لئے نہ میرے پاس بصیرت افروز خطبے ہیں، نہ پاکیزہ صحیفے جو مذہبی قواعد کے مطابق بڑی خوبی سے مرتب کئے گئے ہوں۔ نہ حسین نقوش ہیں نہ نوک پلک سے درست ترشے ہوئے مجسمے، نہ اشعار ہیں جو بحر و قافیے کے اصولوں میں منضبط ہوں۔ آہ کچھ نہیں ہے"۔

اس طرح وہ آہ و زاری کرتا اور آپ ہی اپنے غم میں گھُلا کرتا تھا۔

ایک شام کو جب سارے راہب دل بہلانے کی باتیں کر رہے تھے ایک ایسے راہب کا ذکر چھڑا جو "اے مریم" کے سوا اور کچھ کہنا نہ جانتا تھا۔ اس کی جہالت کی وجہ سے لوگ اس پر ہنستے تھے۔ لیکن جب وہ مرا تو لفظ مریم کے چار حرفوں کی برکت سے چار گلاب کے پھول اس کے منہ سے نکل آئے۔ اس کا تقدس اس طرح آشکارا کیا گیا۔

یہ کہانی سن کر بارنبس کو پاک کنواری کے کرم کا دوبارہ احساس ہوا، مگر اس خوش آئند معجزے کی مثال نے اُسے سکون نہ بخشا۔ کیونکہ اس کا قلب جوش سے لبریز تھا اور وہ اپنی فردوس مکان پاک بی بی کی عظمت کا ڈنکا بجانا چاہتا تھا۔

وہ اس کا ذریعہ تلاش کرتا تھا۔ مگر ناکام رہتا تھا اور ہر روز اس کے لئے شدید تر غم کا پیغام لاتا تھا۔ آخر کار ایک صبح وہ خوشی خوشی اپنے پلنگ سے کودا اور دوڑتا ہوا کلیسا میں داخل ہو گیا۔ جہاں ایک گھنٹے سے زیادہ وہ اکیلا رہا۔ شام کا کھانا کھانے کے بعد وہ پھر وہیں چلا گیا اور اس روز سے اس کا معمول ہو گیا کہ جیسے ہی کلیسا خالی ہوتا وہ اندر گھس جاتا اور دن کا زیادہ حصہ جو دوسرے راہب علوم و فنون کے شغل میں صرف کرتے، وہاں بسر کرتا۔ اب نہ وہ افسردہ رہتا تھا نہ آہیں بھرتا تھا۔ لیکن اس نئے طرزِ عمل نے دوسرے راہبوں میں اچنبھا پیدا کر دیا۔ اُنھوں نے چرچا کیا کہ اخی بارنبس اتنی جلد ی جلدی تنہائی کیوں اختیار کرتا ہے۔ اور رئیس دیر نے جس کا فرض تھا کہ راہبوں کے سارے افعال پر نظر رکھے۔ بارنبس کو بھانپنے کا تہیہ کیا۔

اس لئے ایک روز جب بارنبس کلیسا میں اکیلا تھا، رئیس دیر دو سب سے بوڑھے دینی بھائیوں کو ساتھ لے کر داخل ہوا، تاکہ دروازے کی سلاخوں میں سے دیکھے کہ اندر کیا ہو رہا ہے۔

اُنھوں نے بارنبس کو پاک کنواری کے مجسمے کے سامنے دیکھا، اس کا سر نیچے اور پاؤں اوپر تھے۔ چھ تانبے کی گیندوں اور بارہ چھُریوں کا کرتب دکھا رہا تھا۔ پاک کنواری کی تبریک کے لئے وہ وہی کرتب دکھا رہا تھا جن سے پچھلے دنوں، اس نے اپنی انتہائی شہرت حاصل کی تھی۔ بوڑھے دینی بھائی یہ تو نہ سمجھے کہ اس طرح وہ اپنا بہترین کمال پاک کنواری کے حضور میں پیش کر رہا ہے۔ اس کو بڑی بے دینی سمجھ کر چیخ پڑے۔ رئیس دیر جانتا تھا کہ بارنبس سادہ لوح ہے۔ اس کو یقین ہو گیا کہ اس کے دماغ میں خلل آ گیا ہے۔ تینوں بڑھے ہی تھے کہ اُسے کلیسا سے باہر کر دیں۔ کنواری آہستہ آہستہ قربان گاہ سے اتریں اور اپنے نیلگوں لباس کی ایک تہ سے، پسینہ پونچھا جو مداری کی پیشانی سے بہہ رہا تھا۔ اب رئیس دیر، مرمریں فرش پر سجدے میں گر پڑا اور یہ الفاظ دوہرائے: "مبارک ہیں وہ جن کا [illegible] دل پاک ہیں کیونکہ وہ خدا کا دیدار کریں گے ——— آمین" [illegible]

علامہ کیفی دہلوی اور سیماب اکبر آبادی

پروفیسر محمد عبداللہ کامل ایم اے

۹ دسمبر ۱۹۳۶ء کو علامہ پنڈت برجموہن صاحب دتاتریہ کیفی نے اپنی گراں بہا مثنوی "جگ بیتی" کا ایک نسخہ مرحمت فرمایا۔ اس وقت میں اسے سرسری نظر سے دیکھ سکا۔ لیکن اس کے مجتہدانہ رنگ نے میرے دل پر ایسا اثر کیا کہ میں نے مصمم ارادہ کر لیا کہ فرصت کے وقت اسے غور سے دیکھوں گا اور اس پر تبصرہ لکھ کر اردو داں پبلک کو اس سے روشناس کراؤں گا۔ مگر معلوم ایسا ہوتا ہے کہ جس شاعر نے یہ شعر کہا تھا ؎

کَفَی الْمَرْءُ نَقْصًا اَنْ یُقَالُ بِاَنَّہٗ
مُعَلِّمُ صِبْیَانٍ وَاِنْ کَانَ فَاضِلاً

اس نے کچھ دیکھ بھال کے کہا تھا۔ معلمی کا پیشہ ہی ایسا ہے۔ تمام دنیا تو یہ سمجھتی ہے کہ معلم کچھ نہیں کرتے۔ حالانکہ حقیقت میں یہ ایسا جھمیلا ہے کہ اس کچھ نہیں کے سوا اور بھی کچھ نہیں کر سکتے۔ چنانچہ ۹ دسمبر سے لے کر آخر جون تک اتنی فرصت نہ ملی۔ کہ "جگ بیتی" کو اٹھا کر دوبارہ پڑھوں اور اس پر کچھ لکھ سکوں۔ اسی اثنا میں ماہنامہ شاعر (آگرہ) میں "ناظمین اردو" کے سلسلے میں علامہ کیفی پر ایک مضمون دو قسطوں میں نکلا۔ جس میں جگ بیتی کا ذکر بھی آگیا اور مضمون نگار سیماب اکبر آبادی نے جگ بیتی اور اس کے قابل مصنف کی دل کھول کر تعریف کی ہے۔ جا بجا منتخب اشعار بھی درج کئے ہیں۔ لیکن مضمون کے آخر میں چند بے بنیاد سے اعتراضات بھی جڑ دئے ہیں۔ جن کا مقصد یا تو رسالے کے صفحے پُر کرنا ہے یا اپنے شاگردوں پر رعب ڈالنا، کہ ہم ایسے ایسے شاعروں کے کلام پر بھی اعتراض کر سکتے ہیں۔

یہ اعتراضات اس قسم کے ہیں کہ نہ تو سیماب اکبر آبادی کی شان و شوکت میں ان سے کوئی اضافہ ہو سکتا ہے اور نہ علامہ کیفی کی شاعری میں اُن سے کوئی نقص واقع ہو سکتا ہے۔ قافیہ و ردیف اور زبان و محاورہ سے متعلق عام طور پر نو مشق شاعروں کے درمیان نوک جھوک ہوتی رہتی ہے۔ لیکن علامہ کیفی کے سے کہنہ مشق، قادر الکلام اور مستند اہلِ زبان شاعر کے کلام پر ایسے اعتراضات کرنا گویا اپنی ہنسی اُڑانا ہے۔ علاوہ ازیں سیماب اور علامہ کیفی کے باہمی تعلقات اس بات کے متقاضی تھے کہ اگر واقعی ان کے دل میں کسی قسم کے خدشات تھے تو علامہ موصوف سے رجوع کرتے۔ اور اگر وہ ان کا اطمینان نہ کر سکتے تو پھر ان کو شائع کر دیتے۔ لیکن سیماب نے عجلت میں اتنا بھی نہیں کیا کہ کوئی لغت اور فن کی کتاب یا عروض و قافیہ کی کتاب اُٹھا کر دیکھ لیتے۔ غالباً ان کو یہی خیال ہوگا کہ رسالے کے پڑھنے والے ہمارے شاگرد ہی تو ہیں۔ جو کچھ ہم لکھیں گے وہ اُسے آیت و حدیث سمجھ کر آمنّا و صدّقنا کہہ اُٹھیں گے۔ ورنہ وہ ایسے بودے اعتراضات ہرگز شائع نہ کرتے۔ کیونکہ ان اعتراضات کی حقیقت ہی کچھ نہیں۔ دو چار زبان و محاورہ کی غلطیاں نکالی ہیں اور دس پندرہ اشعار کے قافیے غلط کہے ہیں۔ قافیہ کا مسئلہ چونکہ فنی ہے اس لئے میں پہلے اسی کو لیتا ہوں۔

قافیہ کی بحث میں پڑنے اور ان چند قافیوں کو صحیح یا غلط ثابت کرنے سے پہلے میں مضمون نگار کی توجہ اس امر کی جانب مبذول کرانا چاہتا ہوں کہ یہ مثنوی اصلاحی غرض سے لکھی گئی ہے۔ اس لئے ضروری تھا کہ

جن پابندیوں کو علامہ موصوف زبانِ اردو کے لئے غیر مفید خیال فرماتے ہیں اُن کے جکڑ بند توڑ ڈالیں، اور دوسرے شاعروں کے لئے راستہ صاف کر دیں، تاکہ وہ اس مفید صنفِ نظم کو کثرت سے استعمال کریں اور اس سے قوم و ملک کی خدمت کر سکیں۔ اس سلسلے میں سب سے پہلے اس مثنوی کا وزن قابلِ غور ہے۔ اس سے پہلے اردو زبان میں جتنی مثنویاں ہیں سب میں بائے بسم اللہ سے لے کر تائے تمّت تک ایک ہی وزن ہوتا ہے۔ لیکن جگ بیتی کے ہر ایک باب کا وزن الگ الگ ہے۔ چنانچہ حضرتِ مصنف آغازِ کتاب میں خود فرماتے ہیں ؎

ہر فصل کی ہے بحر نئی اس سے ہے مقصود
بے لطفیِ یک آہنگی کی ہو نظم سے مفقود

اب اگر کوئی پرانی لکیر کا فقیر یہ اعتراض کرے کہ اس مثنوی میں ایک کے سوا باقی تمام بحریں غلط ہیں تو اس کا کیا علاج۔ بعینہٖ یہی حالت جگ بیتی کے قافیوں کی ہے۔ علامہ موصوف نے قافیئے کے باب میں بھی کچھ وسعت پیدا کرنے کی کوشش فرمائی ہے۔ جس کی طرف خود ہی یوں اشارہ فرماتے ہیں ؎

ہے قافیے کے باب میں کہنی یہی اک بات
وہ قاعدہ کیا جس کا تخالف میں ہو اثبات

لیکن اس تصریح کے باوجود سیماب اکبر آبادی یہ فرماتے ہیں کہ فلاں فلاں قافیے غلط ہیں۔ جس کا مطلب اس کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتا کہ قافیے کے باب میں اس قدر اصلاح کی گئی ہے۔ کیا ہی اچھا ہوتا۔ اگر سیماب اس بات کو اسی پیرائے میں بیان کرتے۔ لیکن اُنھوں نے ان قافیوں کو غلط لکھ کر نہ صرف اپنے آپ کو اصلاح پسند لوگوں کی نظروں میں گرایا ہے۔ بلکہ اپنے رسالے کے قارئین کو بھی گمراہ کرنے کی کوشش کی ہے۔

اس تمہید کے بعد میں چاہتا ہوں کہ قافیہ کے متعلق چند ضروری باتیں عرض کر دوں۔ کیونکہ یہاں اصلاح کا سوال پیدا ہو گیا ہے، اور جب تک قارئینِ کرام قافیہ کے اصول و ضوابط کو اچھی طرح ذہن نشین نہ کر لیں اس وقت تک وہ ان اصلاحات کو کما حقہٗ سمجھ نہیں سکتے۔ قافیہ اور اس کے قواعد عربی سے ماخوذ ہیں اور فارسی سے ہو کر اردو میں آئے۔ تقلید کوئی بُری چیز نہیں۔ اگر سلیقے سے کی جائے۔ لیکن شامت یہ ہے کہ تقلید کرنے والے ہمیشہ وہی لوگ ہوتے ہیں۔ جو نقل را چہ عقل کے اصول پر کاربند ہوں۔

عربی زبان میں مترادف الفاظ کی کثرت ہے۔ ایک خیال کو ادا کرنے کے لئے ہزاروں الفاظ مل سکتے ہیں اس کے علاوہ چند اوزان مقررہ کے سانچے میں ہر ایک مادے کو ڈھالا جا سکتا ہے۔ اس لئے مماثل الفاظ کی اس قدر کثرت ہے کہ وہ لوگ قافیے کے باب میں جس قدر پابندیاں چاہیں نباہ سکتے ہیں لیکن ان تمام باتوں کے باوجود ان کے ہاں قافیے میں کافی آزادی ہے۔ لیکن فارسی اور اردو میں یہ دونوں لسانی خصوصیتیں نہیں پائی جاتیں۔ اس لئے یہاں ہم قافیہ الفاظ کی نسبتاً بہت قلت ہے۔ اس وجہ سے چاہیئے تو یہ تھا کہ عربی اصول کو کچھ نہ کچھ ڈھیلا کرتے تاکہ ناظم کو اپنے خیالات قلم بند کرنے میں کسی قسم کی تکلیف نہ ہوتی۔ لیکن اُنھوں نے ایسی ایسی پابندیاں عاید کر رکھی ہیں، جو عربوں کے ہاں بھی نہیں، جیسا کہ قواعد ذیل کے مطالعہ سے واضح ہو جائیگا۔

قافیہ عروضیوں کی اصطلاح میں بیت کے آخری حصّے کو کہتے ہیں۔ خلیل کے نزدیک آخری دو ساکن حروف اور ان کے درمیانی متحرک حروف کو ملا کر قافیہ کہا جاتا ہے۔ آخری دو ساکنوں کے درمیانی فاصلے کے لحاظ سے قافیہ کا نام بھی بدلتا رہتا ہے۔ اگر ان کے درمیان کوئی حرف متحرک نہ ہو تو ایسے قافیے کو مترادف کہتے ہیں۔ ایک متحرک حرف ہو تو متواتر۔ دو ہوں تو متدارک تین ہوں تو متراکب اور چار ہوں تو متکاوس۔

حروفِ قافیہ ۔ چھ ہیں۔ روی۔ وصل۔ خروج۔ ردف۔ تاسیس اور دخیل۔ جن میں سے روی تو ہر قافیے میں ہوتا ہے۔ باقی حروف میں سے کبھی کوئی ہوتا ہے۔ کبھی نہیں ہوتا۔ لیکن جو صورت ایک قافیے میں ہو وہی سب قافیوں میں ہونی چاہیئے۔

روی۔ وہ حرف ہے جس پر قافیے کی بنیاد ہوتی ہے اور اسی حرف کی نسبت سے قصیدے کو پکارا جاتا ہے۔ یعنی جس قصیدے میں ب روی ہو اُسے بائیہ کہتے ہیں۔ جس میں ل ہو اُسے لامیہ۔

وصل۔ وہ حرف ہے جو روی کے بعد واقع ہو، خواہ اصلی ہو۔ جیسے عصا میں خواہ اشباعی جیسے تَنْفَعُوْ (جو اصل میں تَنْفَعُ ہے) اردو میں مثلاً ڈالے اور والے اگر قافیے ہوں تو لام روی ہے، اور ے وصل۔

خروج وہ حرف ہے جو بعد وصل کے آئے۔ جیسے مَقَامُھَا میں م روی۔ ہ وصل اور الف خروج ہے۔

رِدْف۔ وہ حرف ہے جو روی سے پہلے آئے۔ مثلاً حالُ اور مالُ میں الف۔ ہند اور سِند میں نون۔

تاسیس۔ اس الف کو کہتے ہیں جو روی سے ایک حرف پہلے آئے۔ جیسے حاصل اور کامل میں الف۔

دخیل۔ جو حرف روی اور تاسیس کے درمیان ہوتا ہے، اُسے دخیل کہتے ہیں۔ جیسے حاصل میں ص۔ اور کامل میں م۔

حرکاتِ قافیہ۔ بھی چھ ہیں۔ رَس۔ اشباع۔ حذو۔ توجیہ۔ مجری اور نفاذ۔

رَس۔ تاسیس کے الف سے پہلے حرف کی حرکت کو کہتے ہیں جیسے حاصل میں ح کا زبر۔

اشباع دخیل کی حرکت کو کہتے ہیں جیسے حاصل میں ص کا زیر

حذو۔ ردف سے پہلے حرف کی حرکت کو کہتے ہیں۔ جیسے لَمْ یُقِلُ میں ق کا پیش اور دلبر میں ب کا زبر۔

توجیہ۔ ساکن روی سے پہلے حرف کی حرکت کو کہتے ہیں جیسے لَمْ یُقُلُ میں ق کا پیش اور دلبر میں ب کا زبر

مجری روی کی حرکت کا نام ہے جیسے مَنْزِلُ میں ل کا پیش۔

نفاذ حرف وصل کی حرکت کا نام ہے جیسے منازَھا میں ہ کا زبر۔

عیوبِ قافیہ۔ دو قسم کے ہیں۔ اوّل تو وہ جو حرف روی اور اس کی حرکت مجری سے متعلق ہیں، اور وہ تعداد میں چھ ہیں۔

(۱) اِکْفَاء یہ ہے کہ حرف روی کسی قریب المخرج حرف سے بدل جائے۔ جیسے

بُنَیَّ انّ البِرَّ شیٌٔ هَیِّنٌ　　المنطق اللیّنُ والطعَیِّمُ

(یہ مطلع ہے اور یہاں نون کو میم سے بدلا گیا ہے جو قریب المخرج حروف ہیں)

اِذا ازْمَعا جالٌ وفارق جیرةٌ　　وصاحَ غرابُ البَیْنِ اَنْتَ حَزِیْنُ

تنادوا باعلی صخرةٍ وتجاوبتْ　　هوادِرُ فی حافاتِهم وصَهِیلُ

یہاں حرف روی نون ہے جسے لام سے بدلا گیا ہے اور یہ دونوں حرف قریب المخرج ہیں۔

(۲) اجازت۔ یہ ہے کہ حرف روی کو بعید المخرج حرف سے بدلا جائے۔ جیسے:۔

خلیلَیَّ سِیْرا واترکا الرحل اننی

بمهلکةٍ والعاقبات تَدُوْرُ

فبیناه یُشْری رحلَهُ قالَ قائِلٌ

لِمَنْ جَمَلٌ رخو الملاطِ نَجِیْبُ

یہاں تَدُوْرُ اور نَجِیْبُ کو ہم قافیہ استعمال کیا گیا ہے اور عربوں کے نزدیک (العجیز السلوبی) اس میں صرف یہی عیب ہے کہ حرف روی ر کو ب سے بدلا گیا ہے۔ کیونکہ اس سے پہلی واؤ کا ہے سے بدلنا معمولی بات ہے۔

(۳) اِقْوَاءُ حرف روی کو حرکت یعنی مجری کو پیش کی بجائے زیر سے یا زیر کی بجائے پیش سے بدلنے کا نام ہے۔

زیر اور پیش عربی میں قریبی حرکات سمجھی جاتی ہیں۔ مثال

سَقَطَ النَّصِیْفُ ولم تُرِدْ اسقاطه

فتناولتهُ واتّقتنا بالیدِ

بمخضّبٍ رخصٍ کانّ بنانه

عَنَمٌ یکادُ من اللطافة یُعْقَدُ

ان ابیات میں مجری زیر دوسرے بیت میں پیش آگیا ہے۔

زَعَمَ البوارحُ اِنّ رحلتنا غداً

وبذاكَ اخبرنا الغرابُ الْاَسْوَدُ

لَامرحباً بغدٍ ولا اهلاً بهِ

ان کان تَفریق الاحبّهِ فی غدِ

یہاں مجری پیش ہے۔ دوسرے بیت میں زیر سے بدل گیا ہے۔

(۴) اِصْرَاف۔ مجری کو پیش یا زیر کی بجائے زبر سے بدلنا یا اس کا عکس۔ عربی میں زیر اور پیش سے زبر حرکت بعیدہ سمجھی جاتی ہے مثال

لَاتنکحنَّ عجوزاً او مطلّقه

ولا یسوقنّها فی حبلك القدَرُ

فَاِنّ اتوكَ وقالوا انها نصف

فَاِنّ اطیبَ نصفیها الّذی غبَرَا

(۵) اِیطاء۔ ایک ہی قافیہ کو دو بار لانا۔ جیسے

اوا ضعَ البیت فی خرساءَ مظلمۃٍ
تقید العین لا یسری بھا الساری
لا یخفض الزرعَ عن ارضٍ الّم بھا
ولا یضل علی مصباحہ الساری

اگر لفظ ایک ہی ہوں لیکن معنی مختلف ہو جائیں تو یہ عیب نہیں ہوتا۔ ایسے اگر دونوں بیتوں میں سات شعروں کا فرق آجائے تو بھی کوئی عیب نہیں سمجھا جاتا۔

(۶) تضمین یہ ہے کہ ایک بیت کے قافیہ کا معنوی تعلق دوسرے بیت کے ساتھ ہو۔ جیسے

وھم وردوا الجفار علی تمیم
وھم اصحاب یوم عکاظ اِنّی
شَہِدْتُ لھم مواطن صادقاتٍ
شَہِدْنَ لھم بصدق الودّ مِنّی

یہاں لفظ اِنّی دوسرے بیت سے متعلق ہے۔

عیوب قافیہ کی دوسری قسم سناد کہلاتی ہے اور وہ روی سے پہلے حروف وحرکات سے متعلق ہے۔ اور اس کی پانچ قسمیں ہیں۔

(۱) سناد ردف یہ ہے کہ ایک قافیہ میں ردف ہو اور دوسرے میں نہ ہو۔ جیسے

اِذا کُنتَ فی حاجۃٍ مُرسِلاً
فارسل حکیما ولا توصِہٖ
وَاِن بابُ اَمرٍ علیکَ التویٰ
فشاوِر لبیبًا ولا تعصِہٖ

اس نظم میں ص روی ہے اور اس سے پہلی واو ردف۔ لیکن دوسری بیت میں ردف کوئی نہیں۔

(۲) سناد تاسیس۔ یہ ہے کہ کسی قافیے میں تاسیس کو چھوڑ دیں۔ جیسے

اِذا الارضُ لم تجھل علیّ فروجھا
واذلی عن دار الھوانِ مراغمٌ
لو انّ صدور الامر یبدون للفتی
کاعقابہ لم تلقہ یتندّم

دوسرے قافیے میں تاسیس نہیں ہے۔

(۳) سناد اشباع۔ دخیل کی حرکت یعنی اشباع کو تبدیل کردینا۔ جیسے

وکنّا کغصنَی بانۃٍ لیس واحدٌ
یزول علی الحالاتِ عن رایِ واحدِ
تبدّل بی خِلّاً فخاللتُ غیرہٗ
وَخلّیتُہٗ لمّا اراد تباعُدی

(۴) سناد حذو۔ ردف سے پہلے حرف کی حرکت کو تبدیل کرنا۔ جیسے

کأنّ سیوفنا منّا ومنھم　　مخاریقٌ بایدی لاعبینا
کأنّ متونھنّ متون غُدرٍ　　تصفّقھا الریاح اِذا جرَینا

(۵) سناد توجیہ۔ توجیہ کے اختلاف کو کہتے ہیں۔ جیسے

کأنّ المُدامَ وصوبَ الغمامِ　　وریحَ الخزامیٰ ونشرَ القطرْ
یُعلّ بھا بردُ اَنیابھا　　اِذا غرّدَ الطائرُ المستحِرْ
وقد رابنی قولھا یاھنا　　ہُ ویحکَ الحقتَ شرًّا بشرّ

یہ اختلاف اشعار عرب میں اکثر پایا جاتا ہے۔ اور اسے عیب نہیں سمجھتے۔

عیوب قافیہ کو میں نے اس لئے توضیح سے بیان کیا ہے کہ اردو داں اصحاب یہ سمجھ لیں کہ ہم نے قافیہ کے باب میں کس قدر پابندیاں عائد کر رکھی ہیں اور ابھی تک اس میں کس قدر ترمیم واصلاح کی گنجائش ہے۔ اول تو ہمیں چاہئے کہ عربی کے مقابلے میں اردو کی تنگ دامنی پر نظر کرتے ہوئے قافیہ کے اصول وضوابط میں بہت کچھ سہولتیں بہم پہنچائیں اور اگر اس معاملے میں ہم لوگ بخل سے کام لینا چاہیں تو کم از کم عربی سے آگے تو نہ بڑھیں۔ قافیہ میں جس قدر عیب اوپر گنائے گئے ہیں وہ سب عربی کے بڑے بڑے شاعروں کے کلام میں پائے جاتے ہیں۔ کیونکہ وہ لوگ عیب اسی کو سمجھتے ہیں جو کسی نہ کسی مستند شاعر سے سرزد ہو۔ ایسا نظر آتا ہے کہ وہ اخلاق کی طرح ادب میں بھی انسانی کمزوریوں کے قائل ہیں۔ چنانچہ شاعر کہتا ہے۔ ؎

مَن ذا الّذی ما ساءَ قطّ　　ومَن لہُ الحُسنیٰ فقط

بلکہ ان کے خیال میں کسی شخص کی ذات میں چند عیوب کا موجود ہونا اس کی شرافت کے منافی نہیں، جیسا کہ ایک شاعر کا قول ہے۔ ع

کفَی المرءَ نُبلاً اَن تُعدَّ معایبُہٗ

نیز وہ لوگ یہ بھی بخوبی جانتے ہیں کہ اصول و قواعد شعراء کے کلام سے ماخوذ ہیں۔ اور زیادہ سے زیادہ ان کی رہنمائی کے لئے ہیں۔ یہ نہیں کہ شاعر ان کی پابندی پر مجبور ہوں۔ اس لئے انھوں نے یہ کلیہ قاعدہ مقرر کر رکھا ہے **یجوز للشاعر مالا یجوز لغیرہ۔**

عربوں کی تو یہ حالت تھی اور اب تک ہے۔ لیکن فارسی والوں اور ان کے بعد اردو والوں نے ان عیوب کو گناہ کبیرہ سمجھنا شروع کر دیا۔ اور جہاں کسی شعر میں کوئی عیب پایا گیا اسے فوراً غلط ٹھیرا دیا۔ اور اس طرح سے شاعر کی آزادی کو آہستہ آہستہ سلب کرتے چلے گئے۔ دوسری طرف لزوم مالایلزم کے طور پر انھوں نے قافیے کے باب میں چند اختراعات کا اضافہ کرنا شروع کر دیا۔ جن میں سے سب سے زیادہ ضروری ردیف ہے۔ جو اردو و فارسی میں آہستہ آہستہ قافیے کا جزو لاینفک ہو گئی ہے۔ بعض بعض وقت تو شاعر ردیف کے پیچھے ایسے پڑتے ہیں کہ سارے کی سارا بیت ہی ردیف ہو جاتی ہے۔ مثلاً

مومن ؎ کیا مناسب تھے یہ بے باک سخن ✣ نامناسب تھے یہ بے باک سخن

ناسخ ؎ عشق بد ہے اے دلِ ناداں سمجھ ✣ یہ سند ہے اے دلِ ناداں سمجھ

گم نہ ہو ظلماتِ کاکل میں نہ جا ✣ نابلد ہے اے دلِ ناداں سمجھ

درد ؎ اے درد بہت تُو نے ستایا ہم کو ✣ بے درد بہت تو نے ستایا ہم کو

ظفر ؎ صنما ہم کہیں تو کیا کہویں ✣ بخدا ہم کہیں تو کیا کہویں

مدعی کہنے ہی نہیں دیتے ✣ مدعا ہم کہیں تو کیا کہویں

بعض بعض غزلوں کی ردیف ایسی مشکل رکھی جاتی ہے کہ شاعر کی تمام تر توجہ اسی کو نباہنے میں صرف ہو جاتی ہے اور ساری کی ساری غزل میں ایک قسم کی ادبی ورزش کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا۔ اس قسم کی چند مثالیں یہاں درج کی جاتی ہیں ؎

انشاء ؎ گر ہوں افلاک و عقول اور نظر بیسوں ایک
مدرکات اور معقولاتِ عشر بیسوں ایک

فروغِ مے سے نہ کیونکہ ہووے ایاغ روشن مراد حاصل
مثل یہ مشہور ہے جہاں میں چراغ روشن مراد حاصل

کیا ہوا در پہ ترے گرچہ ہے ابجد کا قفل
کھول دیتے ہیں سکندر کی بھی یاں سد کا قفل

مومن ؎ وہ گردن دیکھ یہ حالت ہوئی تعبیر شیشے کی
کہ تھمتی ہی نہیں ہچکی ہوئی ہے دیر شیشے کی

ذوق ؎ بلبل ہوں صحنِ باغ سے دور اور شکستہ پر
پروانہ ہوں چراغ سے دور اور شکستہ پر

آتش ؎ پری پسند طبیعت یہ ہے نہ حور پسند
ہمارے بندے ہیں ہم ہم کو ہیں حضور پسند

غالب ؎ رحم کر ظالم کہ کیا بودِ چراغ کشتہ ہے
نبضِ بیمارِ وفا دودِ چراغ کشتہ ہے

ردیف کے علاوہ دوسری اختراعات کے نمونے حسبِ ذیل ہیں

(۱) ذوالقافیتین :-

اے رزمگارِ رم تو شدہ در جہاں خبر انگندہ از سیاستِ تو آسماں سپر

انشاء ؎ سے پئے قشقہ دیئے کعبہ میں ناقوس لئے
اے دل آئے ہیں ہم اب فائدہ افسوس کئے

(۲) تکرار قافیہ :-

انشاء ؎ وہ چارسُن کے تیرے سخن ہم کڑے کڑے
اُٹھتے ہیں کوئی در پہ ترے جب اڑے اڑے

(۳) تکرار قافیہ بطرز خاص :-

مولانا جامی ؎ اے بالبِ تو طوطیٔ شیریں زباں زبوں
کردی عناں زپنجۂ سیمیں براں بروں
با حُسنِ التفاتِ تو معتاد کشتہ ایم
برما مکن عبور تغافل کناں کنوں

انشاء ؎ جب تک کہ خوب واقفِ رازِ نہاں نہوں
میں تو سخن میں عشق کے بولوں نہاں نہوں
خلوت میں تیری بار نہ جلوت میں مجھ کو ہائے
باتیں جو دل میں بھر رہی ہیں سو کہاں کہوں

زیادہ مثالوں کی ضرورت نہیں۔ کسی شاعر کا دیوان اُٹھا کر دیکھ لیں۔ ایسی بہت سی مثالیں آپ کو مل جائیں گی۔ میری غرض صرف یہ واضح کرنا ہے کہ شعراء فارسی و اردو کی طبیعت کا میلان ہمیشہ اسی طرف آرہا ہے کہ شاعر کے رستے میں نئی نئی مشکلات ڈالتے جائیں۔ اس سے یہ فائدہ تو ضرور

ہوا کہ جن لوگوں کو زبان پر پوری پوری قدرت حاصل نہ تھی وہ شاعری کا دم نہ بھر سکے۔ لیکن ایک طرف تو اس سے اردو ادب کو یہ نقصان پہونچا کہ شاعری کی آزادی سلب ہو گئی اور بسا اوقات اس کو الفاظ اور زبان کی خاطر معنی اور حقیقت کو قربان کرنا پڑا۔ اور دوسری طرف شاعری کا حلقہ محدود ہوتا گیا، اور ایسے بے شمار اشخاص کے خیالات سے اردو شاعری محروم رہ گئی جو اعلیٰ تخیل رکھتے تھے۔ تکلفات کو نباہ نہیں سکتے تھے۔ اب اگر کوئی ملک و قوم اور زبان و ادب کا درد رکھنے والا بزرگ ان کمزوریوں کو محسوس کرے اور شاہد اردو کے ہاتھ پاؤں ان زنجیروں میں سے نکالنے کی کوشش کرے تو اس میں اعتراض کی کون سی بات ہے، اور پھر علامہ کیفی تو ایسے محتاط بزرگ ہیں کہ معقول وجہ اور ریختہ سند کے بغیر کبھی کوئی اقدام نہیں کرتے۔ اس لئے ان کے کلام پر اعتراض کرنے سے پہلے معترض کو دو بار کیا چار بار سوچنا ضروری ہے۔ بہر حال اب اُن تمام اصول و قواعد کے مطالعہ کے بعد علامہ کیفی کے ان قوافی کو سن لیجئے جن پر سیماب نے انگلی رکھی ہے۔

(۱) سماں وہ شام کا دلکش تھا اور سہانا تھا
وہ چھٹ پٹا تھا کہ فطرت کے رُخ کا بُرقا تھا

(۲) بتاؤ وہ تھے کون سے واقعات
جنھوں نے کیا ذہن کا انضباط

(۳) مستوجب اس کا ہے کہ سزا اس کو دیں دراز
میرا نہ اس کی عمر کا کچھ بھی کریں لحاظ

ان اشعار پر سیماب کو یہ اعتراض ہے کہ ان کے "قوافی بالصوت قائم کئے گئے ہیں" حالانکہ یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ قافیہ ہمیشہ سے صوت پر مبنی ہے۔ اور جہاں کتابت اور صوت میں اختلاف ہو وہاں صوت ہی قابلِ اعتبار سمجھی جاتی ہے۔ اردو فارسی میں ع کا تلفظ الف کے مطابق ہے۔ اسی طرح ط اور ت کا تلفظ ایک ہی ہے۔ ز۔ ذ۔ ظ وغیرہ بھی ایک ہی آواز دیتے ہیں۔ اور شعراء اردو فارسی کے کلام میں اس کی مثالیں بھی موجود ہیں۔ مثلاً

سعدی یک طاس ہریسہ صباحی بہتر ز ہزار مرغ و ماہی
(حارحطی کا ہا رہوز کے ساتھ قافیہ)

(فردوسی) چو گفت آں خداوندِ تنزیل و وحی * خداوند امر و خداوند نہی
(حارحطی کا ہا رہوز کے ساتھ قافیہ)

(سعدی) کہ اے شاہِ آفاق کسریٰ بعدل * اگر من نماندم تو ماندی بفضل
(یہاں ض کو عربی تلفظ کے لحاظ سے د کے مقابلے میں لایا گیا ہے)

(سرمد) سرمد لقبا رِ عشق بازی نہ برند * تا سر ندہی بہ سرفرازی نہ برند
اے خور مے خور اگر حضوری خواہی * ناکردہ گناہ پیشِ قاضی نہ برند
(یہاں ض کو عجمی تلفظ کے لحاظ سے ز کے مقابلے میں رکھا گیا ہے)

(حالی) اے شعر دل پذیر نہ ہو تو تو غم نہیں * پر تجھ پہ حیف ہے جو نہ ہو دل گداز تو
ہوتی ہے سچ کی قدر پہ بے قدریوں کے بعد * اس کے خلاف ہو تو سمجھ اس کو شاذ تو
(ز اور ذ کا قافیہ صوتی ہے)

(سودا) نہایت اک کنیز کہنہ عصر کہ دلکش نظم سے جس کی ہر اک نثر
(یہاں ص اور ث کو ہم قافیہ کیا ہے)

(") چنانچہ میں جو یہ قصہ کیا نظم کہ ہووے تا قیامت رونق بزم
(ظ۔ ذ)

(انیس) بے سر تھا ازل سے تھی خطا اصل میں جس کی
مارا اُسے ویندار نہ تھا نسل میں جس کی
(اصل۔ نسل)

اگر سیماب اکبرآبادی کے پیشِ نظر ان مشاہیر حضرات کی یہ مثالیں ہوتیں تو میرے خیال میں وہ ان قافیوں پر ہرگز اعتراض نہ کرتے لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آپ کا مبلغ علم بھی "کما حقہ" کی سرحد سے اِدھر ہی رہ جاتا ہے اور جس الزام کا مورد وہ دوسروں کو ٹھہراتے ہیں اس سے خود بھی بری نہیں۔ ان کے الفاظ یہ ہیں: "اگر ادارۂ اردو، خود فنِ عروض سے واقف نہ تھا تو اسے یہ کتاب کسی ایسے شخص کو دکھا لینی تھی جو علم سے کما حقہ واقف ہو۔"
اس کے علاوہ سیماب نے ٹگ بیتی سے چند ایسے بیت جمع کئے ہیں، جن قافیوں میں حرف روی یا اس سے ماقبل کی حرکات میں اختلاف ہے۔ اس کی عربی مثالیں اوپر آ چکی ہیں۔ اگر ان سے اطمینان نہ ہوا ہو تو فارسی اور اردو مثالیں بھی حاضر ہیں۔

(حافظ) ایں من و ایں من کہ درین کالب است
ہیچ مگو جنبش ایں قالب است

(سعدی) باز آ و مرا مکش کہ پیش مردن * بہتر کہ پس از تو زندگانی کردن

(سودا) زہے تقدیر ہے اس کی سراسر ✦ ہے کیا دانش جو ہووے اس پہ دائرٌ

(میرحسن) وہ ظاہر میں ہر چند ظاہِر نہیں ✦ پہ ظاہر کوئی اُس سے باہَر نہیں

(باہَر اردو میں ہٰ کی زبر سے ہے)

(سودا) ایک دن مرزا گئے کرنے کو سَیر ✦ ہو گئی ٹک اس میں اک لمحہ کی دیر

(میرحسن) کھلے اس کنوئیں کے یکایک نصیب ✦ کہ آیا وہ اس میں مہ دلفریب

(ناسخ) ہم نمازوں میں جو تا دیر کھڑے رہتے ہیں ✦ سامنے یہ بتِ بے پیر کھڑے رہتے ہیں

(دبیر)
خاموش دبیر اب نہیں لکھنے کا ہے مقدُور
دن میں ہیں بہتر شہدا بے کفن و گور

(سودا) اُٹھ گیا افسوس اپنے عَصر سے کم نہ تھا وہ بھی عزیز مِصر سے

(میر) نہ لک لک نہ تیتر رہا دَشت میں نہ غمخوار اک آیا نظر کشت میں

ان کے علاوہ فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں خود ردی کی حرکت کا اختلاف بھی کثرت سے پایا جاتا ہے۔ اور اس میں استادوں نے ایسی ایسی خوبیاں پیدا کی ہیں کہ ان پر ہزاروں قاعدے قربان کئے جائیں تو بجا ہے۔ سنیئے

(حافظ) صلاح کار کجا و منِ خراب کجا ببیں تفاوتِ رہ از کجاست تا بہ کجا

(مومن) میں اگر آپ سے جاؤں تو قرار آجائے پر یہ ڈرتا ہوں کہ ایسا نہ ہو یار آجائے

ساری غزل میں قرار، یار وغیرہ قافیے ہیں۔ جن کی را ساکن ہے لیکن مقطع میں فرماتے ہیں۔

حسنِ انجام کا مومن مرے بارے ہے خیال
یعنی کہتا ہے وہ کافر کہ تو مارا جائے

یہاں مارا میں ر متحرک ہو گئی ہے۔ لیکن مذاقِ سلیم کہتا ہے کہ یار آجائے اور مارا جائے میں کوئی فرق نہیں۔ اور پھر اُستاد کی اس ایک جنبشِ قلم سے قافیہ کا میدان کس قدر وسیع اور پُرفضا ہو سکتا ہے۔

اگلی مثال استاد ناسخ کے کلام سے لی گئی ہے۔ ناسخ قواعد کے پابند ہی نہیں بلکہ قواعد بنانے والے ہیں۔ اور ان کا کلام ہر جگہ سند مانا جاتا ہے۔ فرماتے ہیں۔

کر دئے خط نے ترے عارضِ پُر نُور سیاہ
ہو گیا مشک کی مانند یہ کافور سیاہ

ساری غزل میں حُور، طُور، وغیرہ قافیے ہیں اور سیاہ ردیف۔ لیکن مقطع میں قافیہ اور ردیف کو اس طرح ملایا ہے کہ قواعد کی کورانہ تقلید کرنے والوں کی عقل چکرا جائے۔ ارشاد ہے

پاس جو بیٹھ کے پڑھتے تھے غزل وہ گئے دن
اب تو ناسخ کبھی کر آتے ہیں ہم دور سے آہ

اب سیماب ذرا گوشِ ہوش وا کر کے سنیں کہ خدائے سخن حضرت میر تقی رحمتہ اللہ علیہ کہاں تک پہنچے ہوئے ہیں اور پھر اپنے دل میں غور کریں کہ وہ ہمیں کن کن پابندیوں میں دھکیل رہے ہیں۔ میر تقی کی غزل ہے

اثر ہوتا ہماری گرد عا میں لگ اُٹھتی آگ سب ارض و سما میں

اسی غزل میں ارشاد ہوتا ہے۔

کفن کیا عشق میں میں نے ہی پہنا کھچے لوہو میں بہتیروں کے جامے

چند شعروں میں سیماب کے نزدیک ایطا کا عیب ہے۔ لیکن یہ عیب ایسا ہے جس کا ارتکاب اردو کے ہر مستند شاعر کے دیوان میں پایا جاتا ہے اور وہ بھی غزل کے مطلع میں جہاں ایک ہی مطلع کافی ہوتا ہے۔ مثنوی میں تو سارے مطلع ہوتے ہیں۔ جو عیب غزل کے مطلع میں جائز قرار دیا جا سکتا ہے وہ مثنوی میں بدرجۂ اولیٰ جائز ہونا چاہیئے۔ اب ایطا کی مثالیں سنئے۔

(مومن) پھر دل میں مرے لگی ہے آتش نالے سے برس رہی ہے آتش

(آتش) جب وادیٔ وحشت میں گزر میرا ہوا ہے ہر ایک بگولا پئے تعظیم اُٹھا ہے

(بحر) دو پٹا وہ گلنار دکھلا گئے نئے سر سے پھر آگ بھڑکا گئے

(جلال)
پہلو میں کس کو بزم میں اس نے بٹھا لیا
کیوں اے اجل ہمیں نہ جہاں سے اُٹھا لیا

(داغ) سبق ایسا پڑھا دیا تو نے دل سے سب کچھ بھلا دیا تو نے

یہ چند شعر مثال کے لئے انتخاب کئے گئے ہیں۔ ورنہ اس قسم کے سینکڑوں شعر اساتذہ کے دیوانوں میں موجود ہیں۔ میرے خیال میں ایطا کو عیب سمجھنا ہی بڑا عیب ہے، کیونکہ اس عیب سے کوئی شاعر بری نہیں۔

ان مثالوں کا مطالعہ کرنے کے بعد سیماب اکبرآبادی شاید یہ خیال کریں کہ یہ قافیے مستثنیات میں شامل ہیں۔ لیکن ان کو یاد رکھنا چاہیئے کہ یہ مستثنیات ایسی ہیں جن سے قاعدے ثابت ہوتے ہیں۔ اور علمی دنیا میں ایسی مستثنیات قاعدوں سے زیادہ ضروری ہوتی ہیں اور پھر یہاں تو سوال ہی اور ہے۔ جس وقت ایک مصلح اور ریفارمر کسی فن میں اصلاح کرنے

بیٹھتا ہے تو وہ پرانے اصول کی کورانہ پابندی کو لازم نہیں سمجھتا۔ ورنہ وہ اصلاح کیا خاک کرے گا۔ ہاں البتہ قابلِ غور بات یہ ہے کہ جو اصلاحات وہ کرتا ہے مذاقِ سلیم پر ناگوار تو نہیں گزرتیں۔ اور اس بات کا ثبوت اساتذہ کے کلام سے بہم پہنچ چکا ہے۔ لیکن یہ ضرور ہے کہ بصر تعصب کی عینک اتار کر اُن پر نظر ڈالے۔ علاوہ ازیں اگر کسی مبتدی کے قلم سے ایسے قافیے نکل جائیں تو محلِ اعتراض بھی ہو سکتا ہے۔ لیکن جس وقت ایک مستند اہلِ زباں مسلم الثبوت محققِ فن اور قادر الکلام شاعر ایسے قافیوں کو استعمال کرے، تو دوسرے لوگوں کو اس کا شکر گزار ہونا چاہیئے کہ ان کے لئے ایک دشوار گزار رستے کو صاف کر دیا۔ کیونکہ ایسے استاد کا کلام ان کے لئے سند ہے۔ اور اگر کسی کا احسان ماننا ان کی طبیعت کے خلاف ہو تو یہ حق ان کو ہرگز حاصل نہیں کہ وہ خواہ مخواہ ایسے مصلحین اور محسنینِ علم و ادب کے کلام پر اعتراض کریں۔

خوشی کا مقام ہے کہ سیماب اکبرآبادی اس بات کو خود بھی محسوس کرتے ہیں۔ اور ان قافیوں کو غلط کہنے کے بعد فوراً ہی ان کی سمجھ میں آگیا کہ میں نے غلطی کی ہے۔ اور ان الفاظ میں عذرِ گناہ پیش کیا ہے " اگر میرا خیال غلط نہیں تو ایک ماہرِ فن بزرگ سے قوافی میں اتنی غلطیوں کا امکان محیر العقول ہے۔ اس سے میرا مقصد اعتراض یا تنقیص نہیں بلکہ اپنے اندیشے کی ترجمانی ہے " میں سیماب کی خدمت میں عرض کروں گا کہ آپ کا خیال بالکل غلط ہے اور آپ کا اندیشہ سراسر بے بنیاد ہے۔ علامہ کیفی طفلِ مکتب نہیں کہ قافیہ کے ساتھ قافیہ نہ جوڑ سکیں۔ وہ مصلحِ ادب ہیں اور جس طرح اُنھوں نے اردو زبان اور اردو ادب میں ہزاروں اصلاحات کی ہیں۔ وہیں قافیئے کے باب میں بھی چند اصلاحات ملک اور قوم کی رہنمائی کے لئے جگ بیتی میں پیش کر دی ہیں۔

قافیے کے علاوہ چند شعروں کی زبان پر بھی سیماب کو اعتراض ہے جس کا جواب اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے ؎

چو بشنوی سخنِ اہلِ دل مگو کہ خطاست
سخن شناس نۂ دلبرا خطا اینجاست

اگر دہلی سے باہر رہ کر بھی دہلی والوں کی زبان پر کسی کو اعتراض کرنے کا حق حاصل ہے تو سیماب بالکل حق بجانب ہیں۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ دہلی سے بڑھ کر اور کوئی سند ہمارے پاس موجود نہیں۔ جو پیش کر سکیں میں اگر غالب۔ ذوق اور مومن کے کلام سے کوئی سند پیش کر دوں تو ممکن ہے سیماب کو یہ اعتراض ہو کہ وہ بھی آخر بشر ہی تھے۔ دہلوی ہوئے تو کیا۔ اور اس کا جواب میرے پاس کچھ نہیں۔ لیکن اس سے یہ فائدہ ضرور ہو گا کہ اردو داں پبلک کو جس مغالطے میں سیماب نے ڈالنے کی کوشش کی ہے وہ دور ہو جائے گا۔ بہرحال اُن کے اعتراضوں کے جواب سنئے۔

(۱) نہ کھنڈت تو میری ریاضت میں کر

سیماب کو اعتراض ہے کہ کھنڈت کرنا غلط ہے۔ کھنڈت ڈالنا چاہیئے۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ سیماب کے دادا استاد حضرت ذوق بھی کھنڈت کرنا ہی لکھتے ہیں۔ چنانچہ ان کا ارشاد ہے۔

کبھی یہ آگہی شاستر و بید پر اں
کروں اک بات میں پنڈت کی کتھا میں کھنڈت

(۲) بامن سے کل یہ کہتے تھے نکلے بیاہ جلد

سیماب کو بیاہ نکلنا کی جگہ بیاہ ٹھہرنا زیادہ پسند ہے۔

حالانکہ یہ دو باتیں ایک دوسرے سے بالکل الگ ہیں۔ بیاہ ٹھہرنا تو لڑکی والوں اور لڑکے والوں کے درمیان ہوتا ہے۔ لیکن بیاہ نکلنا سے یہ مراد ہے کہ برہمن اپنے جوتش کے حساب سے بیاہ کی شبھ گھڑی نکالے، اگر سیماب کو خود یہ بات معلوم نہ تھی تو کسی ہندو شاگرد سے دریافت فرما لیتے۔

(۳) ٹھاک کی چال کو سیماب ٹھاٹ چال یا ٹھٹکے کی چال فرماتے ہیں یہ غالباً پورب کی زبان ہوگی جس طرف سیماب کے ادبی دورے اکثر ہوا کرتے ہیں۔ مقالہ بہت طویل ہو گیا ہے۔ اس لئے بالفعل یہیں ختم کیا جاتا ہے۔

(خدا سیماب صاحب کو عقل دے ——— مُدیر)

ہم دیکھ کے بدتمیزیوں کو کیا کہتے ہیں
زنا ہی کہ سب ضلعِ علی [illegible] کہتے ہیں
لیکن یہ علامہ زرِ [illegible]
متوقع [illegible] کہتے ہیں

(رضیہ)

آواگون

ل۔ احمد

زندگی میں خوش گپی اور ہنسنا ہنسانا، اس دورِ تمدن میں ضروری سمجھا جاتا ہے۔ مگر ایسا دور بھی آچکا ہے کہ فکر و تامل، گیان دھیان ہی شرفِ انسانیت کا ثبوت سمجھا جاتا تھا۔ اگر یہ کہا جائے کہ ہر زمانے میں یہ دونوں خیال جاری وساری رہے ہیں تو بھی شاید غلط نہو۔ بلکہ اگر یہ سمجھا جائے کہ ہنسنا ہنسانا فطرتِ انسانی میں داخل ہے، اور تدبر و تفکر ہی سے انسان انسانیت کے مدارج طے کرسکتا ہے، تو شاید زیادہ صحیح ہو۔

اس تمثیل میں صرف یہ بتایا گیا ہے کہ انسان کتنی عجیب مخلوق ہے اُسے کیا بننا چاہیئے تھا اور کیا بنگیا ہے۔ یعنی اس دنیا میں انسانی زندگی کا ناسور کیا ہے۔

اب چونکہ ہم حیاتِ انسانی کا تجزیہ کرنا چاہتے ہیں۔ اس لئے اگر آپ کو بھی تماشا دیکھنا ہے تو ہمارے ساتھ وہاں چلیئے جہاں نہ دنیا ہے نہ عقبیٰ۔ جہاں ان دونوں کے ڈانڈے ملتے ہیں۔ جہاں ایک سمت عالمِ خاکی کی خشک و سیاہ چٹانیں ہیں اور دوسری جانب عالمِ ارواح کی سفید و نورانی چوٹیاں۔

دنیا عقبیٰ کے اس سرحدی ناکے پر محافظ فرشتہ بیٹھا تھا کہ ایک رُوحِ نامولود، گرتی پڑتی، داہنی جانب سے نمودار ہوئی جو خود ہی سے کہتی سنائی دی۔

"میں بھٹک گئی، راستہ بھول گئی۔ اب جاؤں کدھر کو؟ راستہ کونسا ہے؟ کیا اندھا دھند چلی جاؤں؟ یا واپس ہو جاؤں؟ اور جاؤں تو کدھر؟ سامنے دو قدم بھی تو راستہ سجھائی نہیں دیتا —— کہیں یہ بات تو نہیں کہ میں نور کے اندر سے چلی آرہی ہوں، اس لئے اندھیرا زیادہ تاریک نظر آرہا ہے؟ شاید ذرا دیر میں نگاہیں اس کی عادی ہو جائیں .... ٹھیک، یہی بات تھی۔ اب کچھ کچھ دکھائی دینے لگا۔ ہاں، یہ ایک درہ ہے۔ ایک طرف نیلگوں چوٹیاں اور وادی کا سبزہ و گلزار ہے اور دوسری طرف سیاہ چٹانیں۔ کیا سچ مچ میں اتنی نیچے اُتر آئی ہوں۔ اور اتنی جلدی؟ شاید انسان کی دنیا اب زیادہ دور نہ ہوگی۔ جہاں میں پہلے ہو آئی ہوں، اور ہو سکا تو آج پھر پہنچ جاؤں گی۔

"میرا حافظہ تو دھوکا نہیں دے رہا۔ یا واقعی انسان کی دنیا میں پہنچ کر میں اُس سے زیادہ حُسن و خوبی دیکھوں گی جتنا میری آنکھیں دیکھ سکتی ہیں؟ کیونکہ مجھے یاد پڑتا ہے، یا کم از کم میرا خیال ہے کہ مجھے یاد ہے، کہ گہرے سبز دشت زار، صاف شفاف بادل۔ سمندر کی موجوں پر آفتاب صبحگاہی کی شعاعوں کے ہیرے ہوا میں باغِ جنت کے تحلیل ہو جانے کے مناظرِ عذب، اور سرد و خرم، مہرآگین و ذہین، مرد و عورت! اوہ۔ ایک دفعہ پھر دنیا میں پہنچکر ایک مرد یا ایک عورت بنوں گی! لیکن دنیا کا راستہ کونسا ہے؟ یہ کیسے جانوں؟

محافظ فرشتہ —— دنیا یہاں سے ایک دن کی منزل ہے!

نامولود روح —— کون؟ کوئی فرشتہ؟

محافظ فرشتہ —— ہاں، دربان فرشتہ!

نامولود روح —— میں چونکہ ابھی سماویت سے قریب ہوں۔ اس لئے میں ملکوتی طریق پر سلام کرتی ہوں، جہاں میں کل تک چل پھر رہی تھی۔

فرشتہ آگے بڑھکر آیا اور دونوں نے ایک دوسرے کا بوسہ لیا۔

نامولود روح —— تمہیں معلوم ہے کہ مجھے دنیا میں جانے کا حکم ہوا ہے،

راستہ کونسا ہے؟

فرشتہ — تمہیں زندگی کی خواہش ہے؟ کیا سماوی مسرت ناکافی تھی؟

نامولود — میں ایک ظرف ہوں۔ جسے خدا نے محبت سے بھر دیا ہے، اور جب وہ محبت چھلکنا چاہتی ہے تو میں اس میں کسی دوسرے کو شریک کیوں نہ کروں؟ میرے حافظے میں اگرچہ دنیا کی یاد خوشگوار ہے۔ لیکن اکثر باتیں بھول بھی گئی ہوں گی۔ حال کے پلٹے ہوؤں کی زبان سے یہ سنکر میرا خیال اُلجھتا ہے کہ انسان دنیا کو ابھی تک ویسا حسین نہیں بنا سکا جیسی کہ جنت ہے، مگر یہ اُمید ہوسکتی ہے کہ دنیا میں ہنوز محبت کی گنجائش ہے — ہوسکتا ہے کہ میرا یہ گمان خود بینی پر مبنی ہو۔ لیکن اگر میں غلطی پر نہیں تو میری رہنمائی کرو۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ بعض روحیں دنیا میں جاتے ڈرتی ہیں۔ مگر مجھے تو ولادت سے کوئی خوف محسوس نہیں ہوتا!

فرشتہ — آؤ، اس چوٹی پر سے زمین کا کرہ دیکھا جاسکتا ہے۔

نامولود — زمین کونسی ہے! یہ تو بہت سے سیارے ایک کائناتی رات کے سمندر میں بلبلوں کی طرح تیرتے نظر آرہے ہیں! ان میں دنیا کونسی ہے؟ وہ آگ کا گولا تو نہیں، جس میں سے شعلے لپک رہے ہیں!

فرشتہ — نہیں، زمین اتنی تابناک نہیں ہے۔ زمین تو ایک چھوٹا ذلیل سا کرہ ہے۔ اور جو سما کے آفتابوں کے ہجوم میں مشکل سے نظر آتا ہے، وہ دیکھو، وہ جو ایک بہت زبردست گیند دکھائی دے رہا ہے (انسان اُسے عطارد کہتا ہے) جس میں قزحی رنگوں کی چادر کی طرح بہت سے رنگ دمک رہے ہیں! اُس کے مشرقی جانب کہکشاں کے اُس طرف دیکھو۔

نامولود — کہکشاں کے اُس طرف تو مجھے کچھ دکھائی نہیں دیتا — وہاں تو بالکل اندھیرا ہے۔

فرشتہ — پھر غور سے دیکھو۔

نامولود — وہ، وہ چھوٹی چنگاری سی جو چمک رہی ہے! یہی دنیا ہے؟

فرشتہ — نہیں، وہ دنیا نہیں، مگر اُس کے قریب ہی ہے۔ یہ چھوٹی چنگاری انسان کا باصرہ سوز آفتاب ہے!

نامولود — ہاں، اس چنگاری کے آس پاس چھوٹی چھوٹی ٹکیاں اُس کے گرد چکر لگاتی دکھائی دیتی ہیں — یا پھر میری ہی آنکھوں میں چند ذرّے جا پڑے ہیں۔

فرشتہ — نہیں، تمہاری آنکھوں میں کچھ نہیں پڑگیا ہے۔ تیسری ٹکیا دکھائی دیتی ہے؟

نامولود — ہاں ---------

فرشتہ — یہی ہے تمہاری دنیا۔ دیکھا! کتنی حقیر و کس قدر تاریک ہے! لیکن ہاں ہم وہاں بڑی خوبصورتی دیکھوگی، ساتھ ہی بڑی مصیبت بھی جو برداشت نہ ہوسکے!

نامولود — یہ ولادت ہوتی کیسے ہے؟

فرشتہ — ایک تدریجی انتشار کی صورت میں — جیسے آہستہ آہستہ نیند آتی ہو۔ قوت کے ایسے زوال کی طرح جیسے دریا کا اُتار، کہ رکے نہیں رُکتا۔ اور جب تم اُس زندگی میں غرق ہوکر جاگوگی تو بس احتیاج اور رونے کے لئے جاگوگی!

نامولود — اب جو بھی ہو، میرا ارادہ نہیں بدل سکتا۔ جب تک وہ زندگی رہے گی، محبت کے لئے ہوگی!

فرشتہ — بیشمار روحیں جب دنیا میں جاتی ہیں تو اسی ارادے کو لے کر جاتی ہیں — ہوسکتا ہے کہ تم میں استحکام کی طاقت زیادہ ہو لیکن میں تمہیں آگاہ کئے دیتا ہوں کہ دنیوی ولادت کے ساتھ آسمانوں کے برابر وسیع نفس و دماغ بھی ملتا ہے!

نامولود — کوئی اور بات رہ گئی ہو تو وہ بھی بتادو۔

فرشتہ — مگر اس وقت مجھے ایک اور خدمت انجام دینا ہے۔

نامولود — وہ کیا؟

فرشتہ — اس وقت مجھے ایک عورت کی رُوح کا انتظار ہے جو ابھی ابھی مری ہے۔ انسانی روح جب جسم کو چھوڑتی ہے تو وہ اُسے مرنے سے تعبیر کرتے ہیں۔ تمام روحیں اسی راستے سے گزرتی ہیں۔ جب وہ آسمانوں سے دنیا میں جاتی ہیں تو تمہاری طرح سادہ لباس میں ہوتی ہیں۔ لیکن وقت کے ساتھ ساتھ ان کے دماغوں کی پھڑپھڑاہٹ شخصی تفاخر اور ذاتی انتفاع کی صورت اختیار کرلیتا ہے، جسے ان کی فانی نگاہیں نہیں دیکھ سکتیں، اور اتنی مدت دنیا میں اس لباس کو پہنے رہنے کی ایسی عادت ہوجاتی ہے کہ پھر اسے اُتار نہیں سکتیں۔ بلکہ اُسی کو واقعی لباس سمجھ لیتی ہیں۔ میرا فرض منصبی یہ ہے کہ جب وہ دنیا سے پلٹیں تو اُن کو بتادوں کہ اُن کا یہ وجود ثانی فنا ہونا لازمی ہے۔

اس کی تعمیل کر کے وہ پھر تمہاری طرح سادہ پوش ہوجاتی ہیں۔

نامولود ـــــ میری ایک درخواست ہے!

فرشتہ ـــــ وہ کیا؟

نامولود ـــــ یہ کہ محبت کے باب میں میں نے کوئی شیخی نہیں ماری ہے۔ تم اپنا فرضِ منصبی ادا کرنے کی مجھے اجازت دیدو، تاکہ اس عورت سے میں اُس کا مصنوعی لباس اتروا دوں!

فرشتہ ـــــ بادی النظر میں یہ کام جتنا مشکل ہے، واقعاً اُس سے زیادہ دشوار ہے!

نامولود ـــــ وہ کیونکر؟ کسی سے ایک لباس اتروا دینا اتنا دشوار تو نہیں ہوسکتا۔

فرشتہ ـــــ اچھا، میں تمہیں مجاز کرتا ہوں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ وہ دیکھو، وہ آرہی ہے۔ نیم خفتہ و نیم بیدار۔ دنیوی فکروں میں ہنوز محو ـــــ ایک ایسے شخص کی طرح محو، جس کا خواب ابھی ختم نہ ہوا ہو۔ چلی آرہی ہے!

بائیں جانب سے ایک روح آتی دکھائی دیتی ہے جس کا لباس نہایت پر تکلف اور پیچیدہ وضع قطع کا تھا، اور اُس کی حرکتِ رفتار ایک خوابیدہ انسان کی سی تھی۔

مردہ روح ـــــ نہیں، تم ابھی ٹھیرو! مجھے اکیلا مت چھوڑو ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ میرے سر میں اب درد نہیں، اور بخار بھی اتر گیا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ مجھے یقین نہیں ہوتا کہ میں ابھی تک بستر پر سو رہی ہوں۔ بلکہ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ میں بلندی پر چڑھ رہی ہوں۔ اور اگر رُکنا چاہوں تو نہیں رُک سکتی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ میں بہت تھکی ہوئی ہوں۔

یہ کہہ کر وہ مردہ روح ایک جگہ بیٹھ گئی۔

فرشتہ ـــــ (نامولود روح سے) دیکھا؟ اُس کے خیالات ابھی تک صاف نہیں، اور اُسی زندگی میں اُلجھے ہوئے ہیں جسے چھوڑ آئی ہے۔

مردہ روح ـــــ تم ذرا یہاں آؤ، مجھے کچھ کہنا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ سُنتے ہو؟ مجھے اپنی بہن کا کچھ قرض ادا کرنا ہے۔ اُسے اندیشہ ہے کہ میری بیماری اگر طول پکڑ گئی تو اُس کا روپیہ وصول نہ ہوگا۔ مہربانی کرکے ذرا اُسے سمجھا دو کہ میں مرتی نہیں۔ اور اُس کی پائی پائی ادا کردوں گی۔ جلدی اچھی ہوجاؤں، کیوں نا! ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ جواب نہیں دیتے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ کیا میں سو رہی ہوں؟

فرشتہ ـــــ (نامولود سے) اس کے حافظے کی یہ خرابی جس نے اُس کے قویٰ کو معطل کر رکھا ہے رفتہ رفتہ درست ہوجائے گی۔

مردہ روح ـــــ سب چیزیں ایک خواب سا بن گئی ہیں! یہ پہاڑ کی سیاہ چٹانیں، ابر میں چھپ کر آدتے آسمان کو موتیوں میں بدل دینے والا بلند آفتاب، اور وہ کاغذی پھولوں کی طرح کا سبزہ و گلزار! ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ نزدیک آجاؤ۔ میری بہن آج پھر تقاضا کرے تو اُسے یقین دلا دینا کہ میں اچھی ہوتے ہی بیباق کردوں گی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ تم کہاں چلے گئے؟ ہزاروں میل دور نظر آرہے ہو ـــــ یہ لو، وہ خواب میں نظر آنے والی چٹانیں پھر نظر آنے لگیں! اب چلنا چاہیئے۔ مگر بڑی نقاہت معلوم ہو رہی ہے۔ لباس کا بوجھ بھی سہارا نہیں جاتا۔

یہ کہا اور وہ چلنے کے لئے اُٹھی۔

فرشتہ ـــــ اب وہ جاگ گئی ہے۔ آگے بڑھ جاؤ۔ اُس کی مدہوشی دور کرو۔ تاکہ وہ اس لباس کو اتار سکے۔

وہ روحِ نامولود داہنی طرف کو چلی گئی

نامولود ـــــ (مردہ روح سے) میں کچھ مدد کروں؟ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

مردہ ـــــ کیا مجھے کسی کی امداد کی ضرورت ہے؟ مجھے فخر ہے کہ میں نے کبھی کسی کا سہارا نہیں تکا ـــــ ہاں سچ، تم ہو کون؟

نامولود ـــــ میں ایک نامولود روح ہوں!

مردہ ـــــ ایسی شے کا تو وجود نہیں۔

نامولود ـــــ تمہارا یہ خیال صحیح کیسے ہوسکتا ہے؟ میری طرف دیکھو ـــــ میں یہ کیا موجود ہوں۔

مردہ ـــــ شکل (جسم) کے بغیر روح کا وجود محال ہے، جیسے تار کے بغیر موسیقی کا وجود محال ہے ـــــ مگر تمہاری ایک شکل ہے تو سہی!

نامولود ـــــ اس وقت میں جس شکل میں ہوں وہ دنیا والوں کے جسم کا نمونہ ہے۔

مردہ ـــــ یعنی زمین والوں کا جسم!

نامولود ـــــ آج ہی میری وہاں کو روانگی ہے۔

مردہ ـــــ اگر تمہارا بیان سچ ہے تو یہ کیسے ہوسکتا ـــــ میرے جسم کے متعلق کیا رائے ہے؟

نامولود — تمہارا جسم ابھی مرا ہے۔

مردہ — میں — مرگئی؟ اگر یہ سچ ہے تو انسان نے کچھ نہیں سیکھا۔ اس کہانی کو تو وہ مدت ہوئی کہ بھلا چکا ہے۔

نامولود — واقعی، عجیب ماجرا ہے۔ کیونکہ میں خود بھی انسان کی دنیا کا تصور نہیں کرسکتا ہوں!

مردہ — تمہارے بیان کو سچ سمجھا جائے تو یہ جنّات میں دوسری دنیا ہیں؟

نامولود — نہیں — دوسری دنیا ابھی دور ہے: فرشتے کے قول کے مطابق یہ درہ دونوں دنیاؤں کی حدِ فاصل ہے۔

مردہ — خوب! تو یہاں سے ایک راستہ ضرور جنت کی طرف گیا ہے۔ بشرطیکہ جنت کہیں ہو بھی — اب میں وہیں جاؤں گی!

نامولود — تم شاید اپنے پرانے جسم کے ساتھ ہی نیا جنم لینا چاہتی ہو؟ دوسری دنیا میں نیاوی جسم کو لے کر داخل ہونا چاہتی ہو؟

مردہ — اور نہیں تو کیا؟

نامولود — دنیوی زندگی میں جن کا ایک مصرف ہوتا ہے ایسے بہت سے قویٰ اس زندگی میں گنّے کی ہیچ کچھ کا درجہ رکھتے ہیں!

مردہ — یعنی میرے مرنے کے بعد میری دولت۔ شہرت، میرا غیر متزلزل ارادہ جس سے مرد خوف زدہ رہتے تھے۔ میرا علم کہ ہزاروں کتابیں پڑھ ڈالیں، یہ سب کچھ بیان بیکار محض ہے۔ اور مجھ میں اور بے گنتی انسانوں میں کوئی فرق نہیں ہے؟ اگر یہ سچ ہے تو پھر مجھے اور کیا کرنا پڑے گا کہ دوسری دنیا میں داخل ہو جاؤں؟

نامولود — سب سے پہلے تمہیں اپنا یہ لباس اتار دینا چاہیئے۔

مردہ — لیکن اسے تو میں نے عمر بھر میں بیسیوں قسم کے تار و پود سے طیار کر پایا ہے۔ اس کی طرز و وضع قطع میری شناخت ہے کہ میں کیا ہوں! دنیا میں، ممکن ہے کہ اتنے عمدہ لباس وضع ہوئے ہوں۔ لیکن ایسا ڈھونڈے نہ ملے گا۔ جو اس لباس کی برابری کر سکے۔

نامولود — یہ لباس کتنا بھی اعلیٰ ہو۔ لیکن اُس کو اُتار پھینکے بغیر تم اس دنیا میں داخل نہیں ہو سکتیں۔

مردہ — میں کیسے یقین کروں — اس کے بغیر میں رہ ہی کیا جاؤں گی!

نامولود — مگر یہ ایک لباس ہی تو ہے!

مردہ — نہیں — یہ خالی لباس نہیں، لباس سے بہت اونچی چیز ہے! یہ میری شخصیت ہے جسے میں اتنی مدت زیبِ ذات کئے رہی، یہ میری یادِ ماضی ہے، وہ سب کچھ ہے جو میں رہ چکی ہوں! اسے اُتار پھینکوں تو اس کے معنیٰ کیا ہوں گے؟ یہ کہ میرا شخص و امتیاز فنا ہو جائے گا، اور ان گنت انسانوں میں ایک میں بھی ہوں گی۔ جیسے آفتاب کے اندر ایک حقیر سی لو اُٹھ رہی ہو! تم دنیا میں اگر یہ خیالات لے کر جا رہے ہو۔ اس معیار پر اگر زندگی حاصل کرنے جا رہے ہو تو یقیناً تمہاری توقعات بہت پست و ادنیٰ ہیں!

نامولود — یعنی؟

مردہ — یہ کہ اگر زمین پر پہنچکر تم نے کوئی ایسا لباس نہ پہنا جس سے دوسروں کو مرعوب و متاثر کرسکو تو تم ساری عمر ذلیل و خوار رہو گے۔ اور ہر آدمی تمہیں دھکیل کر راستے سے ہٹا دے گا!

نامولود — اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ انسان ایک دوسرے کی مدد نہیں کرتا!

مردہ — کیا حقیقت میں تم اتنے جاہل ہو؟ اور اسی پر میری رہنمائی کرنے آئے ہو؟ سن رکھو! تم سے لوگوں کو دنیا میں نہایت تلخ سبق دیا جاتا اور احمق نام ملتا ہے!

نامولود — سخت حیرت ہے کہ باہمی لطف و رافت جسے عام ہونا چاہیئے دنیا میں اتنی نایاب ہو! اور وہاں محبت کا کیا چرچا ہے؟ انسان محبت کا تو قدر شناس ہوگا؟

مردہ — اُس دنیا میں محبت ایک جھلملاتا تارہ ہے جو نظر پڑتا اور چھپ جاتا ہے۔

نامولود — کیا انسان اب جنگ و جدل سے دست بردار ہو گیا ہے — دنیا پرانی بھی بہت ہو گئی ہے؟

مردہ — سونے کی قلیل مقدار یا زمین کا چھوٹا سا ٹکڑا، بڑی جنگوں کا موجب بن جاتا ہے۔

نامولود — اچھا جب لڑائی ختم ہو جاتی ہے — امن امان کے دنوں میں؟

مردہ — اُس وقت ہر متنفس ذاتی ترقی کی دُھن میں لگ جاتا ہے۔

نامولود ــــ دوست دوست کے خلاف ؟ تو دنیا بڑھ کیسے سکتی ہے!

مردہ ــــ دنیا اول تو بڑھ نہیں سکتی، اور اگر بڑھ سکتی ہے تو انسان کے ارادے اور خواہش سے نہیں بلکہ محض اتفاقی وجوہ سے بڑھ سکتی ہے۔

نامولود ــــ میرا گمان تھا کہ انسان رحمدل اور انصاف پسند ہوتا ہے،

مردہ ــــ اس کی انسان کو کیا ضرورت ہے۔ جب کہ وہ اپنے آپ کو خاک اور خاک سے پیدا سمجھتا ہے!

نامولود ــــ لیکن انسان روح بھی تو ہے؟

مردہ ــــ ہاں، مگر انسان بیشتر زندگی کا صرف بیجا کرتا ہے۔ احمقانہ افعال یا فتنہ و فساد میں گزارتا ہے۔

نامولود ــــ افسوس! یہ اگر سچ ہے تو دنیا خوفناک جگہ ہے ــــ مجھے تو اپنی ولادت سے ڈر لگ رہا ہے۔

مردہ ــــ تم اگر دنیا میں ایسے ہی سادہ لوح رہے اور محبت کو ہی "مکان" کی بالاتر قوت سمجھتے رہے تو بالیقین انسانوں کو وہی پاؤگے جس سے تمہیں ڈر لگ رہا ہے۔ ایک چالاک و بے رحم مخلوق! جو بے درد اور قوی کو برتر مقام پر بٹھاتی اور ضعیف و ناتواں کو بلاکشی پر مجبور کرتی ہے! ذرا ہوشیار رہنا۔ اپنے لئے ایک پناہ اور ایک بہروپ ضرور طیار کرنا پڑے گا۔ یہ سمجھ لو کہ یا تو تمھیں دوسروں کی مرضی پوری کرنا پڑے گی یا اُن پر اپنی مرضی کو ساری کرنا پڑے گا۔ اور اگر شروع ہی سے تم نے رحم و کرم دل سے نہ نکال پھینکا، اور اپنی غرض و مقصد کو سامنے رکھ کر دوسروں کو ڈھکیلتے ہوئے اُس مقصد کو جھپٹ نہ لیا تو لازمی طور پر تم خوش و خرم نہ رہ سکوگے، اور پھر دنیا کی زندگی ایک پُرمسرت کھیل نہ رہے گا۔ اُس کا بس یہی ایک طریقہ ہے۔

نامولود ــــ تمہاری باتیں سننے سے قبل میں انسان کے لئے محبت لے جانا چاہتا تھا!

مردہ ــــ کرۂ ارض پر محبت اور سادہ لوحی کی کوئی قیمت نہیں۔

نامولود ــــ اسی لئے تم نے یہ لباس طیار کیا تھا؟

مردہ ــــ ہاں، اب تم بات کی تہ کو پہنچنے لگے، اور اس لباس کی قدر سمجھے۔ میرا راستہ کونسا ہے؟ یہاں تو سب راستے ایک ہی سے ہیں اور سیدھے چلے گئے ہیں۔

مردہ ــــ اوہ، اب تم چالاکی کرنے لگے۔ تم اس لباس کی خوبی جان کر اپنے لئے حاصل کرنا چاہتے ہو! ترکیب تو خوب نکالی۔ تم راستہ نہیں بتاؤگے تو میں کسی بھی راستے پر ہولوں گی۔ خیر باد!

مردہ روح داہنی جانب کو بڑھی مگر ایک فرشتے نے آکر راستہ روک لیا

فرشتہ ــــ کہاں جاؤگی؟

مردہ ــــ عقبیٰ کے عالم میں!

فرشتہ ــــ پہلے تمہیں اس انانیت کو ترک کرنا پڑے گا کہ تم "تم" ہو!

مردہ ــــ تم بھی وہی کہنے لگے۔ گویا آسمانوں پر ہماری شخصیتیں ــــ

فرشتہ ــــ ارضی خوابوں سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتیں۔

مردہ ــــ لیکن ذہن و تعقل؟

فرشتہ ــــ عالم بالا میں ہم انسانی عقل و علم کے مقابلے میں کہیں زیادہ تیز اور نازک طریق پر علم حاصل کرسکتے ہیں۔

مردہ ــــ مگر میرا یہ لباس تو خود میری ذات ہے ــــ اور تم کہتے ہو کہ میں اس کے ساتھ داخل نہیں ہوسکتی؟

فرشتہ ــــ ہاں، تم اس کو نہیں لیجاسکتیں ــــ اپنی انانیت کو نکال پھینکو!

مردہ ــــ نہیں!

فرشتہ ــــ تو پھر یہاں اُس وقت تک ٹھیرو کہ تمہیں خود سمجھ آجائے اور اپنے آپ ہونے سے تنگ آجاؤ!

مردہ ــــ مگر میں انتظار بھی نہیں کرسکتی ــــ

فرشتہ ــــ تو یہ لباس اُتار دینا پڑے گا۔

مردہ ــــ میرا خوف اور میری خواہش ہم وزن ہیں۔۔۔۔ نہیں، خوف ہوا کرے۔ مجھے جانا ہے تو اسے اتار دینا ہی چاہیئے۔۔۔۔

مردہ روح نے بندِ قبا کھول دئے۔ اور لباس کو پس پشت ڈال دیا۔

اب وہ بھی اُس نامولود روح کی طرح سادہ ہوگئی، اور پکار اُٹھی۔

مردہ ــــ اوہ! میں آزاد ہوں! میں محسوس کر رہی ہوں کہ حقیقی مسرت کیا شے ہے ــــ میں بڑی مدت کے بعد وطن کو واپس آئی ہوں۔ معلوم ہوتا ہے کائنات میرے نغمے کی سنگت دے رہی ہے۔ کائنات اور میں ایک دوسرے کی سنگت دیتے ہوئے ایسے بہہ رہے ہیں جیسے سمندر اور سمندر کا گت؛ اب دوسری چوٹی پر ــــ

فرشتہ ـــــ (نامولود سے مخاطب ہوکر) اور تم، خیرباد!

محافظ فرشتہ اور مردہ روح داہنی طرف کے راستے پر روانہ ہوگئے، نامولود روح ایک لمحے کے لئے کھڑی ہوئی۔ ان کو جاتے دیکھا کی، اور پھر جو دیکھا تو مردہ روح کا لباس نظر پڑا۔

نامولود ـــــ (اپنے آپ سے) میرا راستہ کٹھن ہے۔ مردہ روح میری سادہ وضعی پر ہنستی تھی، اور کہتی تھی کہ انسانی دنیا مجھے اپنے تسخر کا آلہ بنائے گی ـــــ اب میں کیا کروں؟ دوسرے انسانوں کے مقابلے میں مجھے زیادہ قوی بننا، اور زیادہ تیز و چالاک بننا چاہیئے، سب سے زیادہ قوی ہونا نہایت ضروری ہے! کسی سے کمزور ہرگز نہ رہنا چاہیئے ... ـــ بیشک میں یہی کروں گی! اس لباس کو ضرور پہن لینا چاہیئے۔

یہ کہہ کر اُس نے وہ لباس اُٹھایا اور پہن لیا، اور پھر کہنے لگی۔

ایسا کون ہوگا جو دسترخوان کی جھوٹن چنتا رہے۔ میں دنیا کی لذتوں اور مسرتوں کے تمام خزانے خالی کر دوں گی! میں محکوم نہیں حاکم بن کر رہونگی! لدونگی نہیں لادوں گی۔ اور ساری دنیا کو بتا دوں گی کہ "میں" ہوں!

نامولود روح یہ کہہ کر بائیں طرف کے راستے پر گامزن ہو گئی۔ محافظ فرشتہ پلٹ کر آیا تو دُور سے اس کی پشت دیکھی۔ وہ کہنے لگا۔

آخر اُسے پھنسنا ہی تھا .... وہ لباس غائب ہے! (دور سے کسی کو آتے دیکھکر) لیکن اب یہ کون آرہا ہے؟ اور اس آنے والے کا کیا انجام ہوگا۔ میں نے بعض روحوں میں تبدیلئ حالت کے وقت محبت کے شعلے کی لَو بھی دیکھی ہے ـــــ یہ لَو اُس انسان کو اپنی اصل کی یاد دلاتی رہتی ہے۔

(مختار)

دُوری

یہ بُعد ہے سراسر، یہ محض فاصلہ ہے
جلوؤں کو جو یہاں کے رنگیں بنا رہا ہے

دنیا کی ہر وہ صورت دل کو لُبھا رہی ہے
جو دُور سے تجلّی اپنی دکھا رہی ہے

ہر چند کچھ نہیں ہے اُفتادگی کی ہستی
جب دُور ہو زمیں سی، دل کھینچتی ہے پستی

ہر دُور کی صدائیں، اک دُھن ہے، ایک گت ہے
اِس بُعد کو نہ جانے، کس سے مناسبت ہے

اہلِ خرد کی باتیں کب رِند مانتے ہیں
رازِ اِس کشش کا ہم تو اتنا ہی جانتے ہیں

پردے میں اِس کشش کے اک پاک آرزو ہے
انساں میں یہ خدا کی، پوشیدہ جستجو ہے

جوش ملیح آبادی

"مکاتیبِ غالب" "مجموعۂ استفسار و جواب" اور "جامِ طہور" پر تبصرہ

محمد ضیاء الاسلام
ڈپٹی کلکٹر

(۱) مکاتیبِ غالب از مرزا اسد اللہ خاں غالب مرتبہ مولوی امتیاز علی عرشی ناظم کتب خانہ ریاست رامپور۔ مطبوعہ مطبع تیمہ۔ بمبئی۔ حجم ۲۱۸۔ قیمت مجلد للعہ

(۲) مجموعۂ استفسار و جواب۔ جلد سوم از نیاز فتحپوری پبلشر نگار بک ایجنسی لکھنؤ مطبوعہ مختار پرنٹنگ ورکس۔ قیمت ہے

(۳) جامِ طہور۔ از خواجہ عبد السمیع پال آثر صہبائی۔ ناشران تاج کمپنی۔ ریلوے روڈ لاہور

مرزا غالب کے خطوط کا مجموعہ اردو میں خاص چیز ہے۔ اردو نثر میں غدر ۱۸۵۷ء کے بعد جو تغیر اور تبدل ہوا اس کا سہرا مرزا غالب کے سر رہے گا۔ اگر ہم کو ان کے دو شعروں کا مرکب بنانے کی اجازت ہو تو ہم یہ کہیں گے کہ

قدرِ نثرِ من بہ گیتی بعدِ من خواہد شدن
ایں مے از قحطِ خریداری کہن خواہد شدن

غالب پر پچھلے سال کئی پائے کی تصانیف شائع ہو چکی ہیں۔ مولانا غلام رسول مہر ایڈیٹر انقلاب کی سوانح عمری غالب جس میں اُنھوں نے غالب کی زندگی کے حالات ان کے فارسی اور اردو نظم و نثر کے مجموعہ سے تیار کی ہے۔ قابلِ قدر چیز ہے۔ اسی طرح شیخ محمد اکرام آئی سی۔ ایس کا غالب نامہ، جس میں غالب کے کلام کی تاریخی ترتیب کی گئی ہے۔ خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ مولوی امتیاز علی کے مرتبہ خطوط اب تک منظرِ عام پر نہیں آئے تھے۔ اُنھوں نے دربارِ رامپور کی سرپرستی میں غالب کے وہ خطوط جو انھوں نے نواب یوسف علی خاں فردوس مکانی۔ نواب کلب علی خاں خلد آشیانی والیانِ رامپور اور دیگر متعلقین دربار کی خدمت میں ارسال کئے یکجا کر کے شائع کئے ہیں۔ یہ غالب کی زندگی پر ایک نئی روشنی ڈالتے ہیں۔

غدر ۱۸۵۷ء کے بعد صاحبانِ فضل و کمال جگہ جگہ سے آکر دربار رامپور کی سرپرستی میں زندگی گزارنے لگے۔ کچھ ایسے بھی تھے جو رامپور آئے ٹھیرے اور چلے گئے۔ لیکن رامپور کے قدرشناس فرمانرواؤں نے ان کی امداد اور سرپرستی اپنا فرض سمجھا۔ موخر الذکر میں غالب خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ مولانا فضل حق خیرآبادی کی وساطت سے نواب یوسف علی خاں غالب سے فنِ شعر میں مشورہ لینے لگے۔ اس رشتہ کی بدولت ۱۸۵۷ء سے ۱۸۶۹ء تک دربار رامپور اور غالب کے درمیان سلسلۂ مراسلت جاری رہا۔ غالب کے وہ مراسلات جو محکمہ دار الانشا رامپور میں محفوظ تھے غالب کے وفات کے ۶۸ سال بعد اب شائع ہوئے ہیں۔

مکاتیبِ غالب، غالب پر جو لٹریچر ہے اس میں ایک نئے باب کا اضافہ ہے۔ مولانا غلام رسول مہر کی 'غالب' اور مسٹر محمد اکرام کے غالب نامہ میں غالب کے تعلقات رامپور پر جو ان کی آخری زندگی کا ایک اہم باب ہے کما حقہ روشنی نہیں ڈالی گئی۔ جس کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ ان کو کافی مواد دستیاب نہ ہو سکا۔

اس حیثیت سے یہ کتاب قابل قدر ہے۔ اور قابل مصنف کے ۱۸۴ صفحہ کے طویل دیباچہ نے جس میں انھوں نے غالب کی سوانح۔ غالب کے آرٹ اور غالب کی پرائیویٹ زندگی پر سیر حاصل بحث کی ہے اس کو اور بھی قابل قدر بنا دیا ہے۔

ان مراسلات میں غالب نے درباری زبان اور درباری انداز اختیار کیا ہے۔ انھوں نے نواب یوسف علی خاں کی خدمت میں ایک قصیدہ ارسال کیا جس کا مطلع ہے۔

ہمانا اگر گوہر جاں فرستم   بہ نواب یوسف علی خاں فرستم

از روئے احتیاط اس کو بیرنگ بھیجا۔ کچھ دن انتظار کیا۔ لیکن جب کچھ شنوائی نہیں ہوئی تو لکھا۔

"جناب عالی اطرفہ معاملہ ہے۔ خدا کا شکر ہے اور اپنی قسمت کا گلہ ہے۔ خدا کا شکر یہ کہ باوجود تعلق قلعہ کسی طرح کے جرم کا بہ نسبت میرے احتمال بھی نہیں۔ یہ نومبر ۱۸۵۹ء انیسواں مہینہ ہے۔ گویا بن کھائے جینا ہے۔ کہتے ہیں کہ جنوری شروع سال میں پنشن داروں کو روپیہ ملے گا۔ دیکھیے کیا نیا گل کھلے گا۔ پہلی نومبر کو یہاں اشتہار عام ہو گیا ہے کہ اب قلمرو ہندوستان میں عمل ملکۂ معظمۂ عالی مقام ہو گیا ہے۔ میں پہلے سے مداحوں میں اپنا نام لکھوا چکا ہوں۔ اور وزرائے ملکۂ والا دربان کے دو سارٹی فکٹ پا چکا ہوں۔ اگر اس اجمال کو بہ تفصیل معلوم کیا چاہیے تو اسی کتاب موسوم بہ دستنبو میں دیکھا جائے۔

خوشنودی کا طالب، غالب

لیکن کوئی شنوائی نہیں ہوئی تو صاف صاف لکھا

"جو آپ بن مانگیں دیں۔ اس کے لینے میں مجھکو انکار نہیں۔ اور جب مجھکو حاجت آپڑے تو آپ سے مانگنے میں عار نہیں۔

بار گراں غم سے پست ہو گیا ہوں۔ آگے تنگ دست تھا، اب تہی دست ہو گیا۔ جلد میری خبر لیجئے۔ اور کچھ بھجوا دیجئے۔

عنایت کا طالب، غالب

قصیدہ میں غالب کی خوددار طبیعت نے حسن طلب سے بھی کام نہیں لیا، دوسرے خط میں اپنی حالت کی طرف اشارہ کیا۔ تیسرے خط میں صرف مطلب زبان پر لائے۔

زیادہ تر مکاتیب میں یا تو تنخواہ کی رسید ہے یا تنخواہ کا تقاضا۔ نواب خلد آشیانی کے نام مندرجہ ذیل خط غالب کی بیچارگی کی ایک اچھی تصویر پیش کرتا ہے۔

"حضرت ولی نعمت، آیۂ رحمت، سلامت

بعد تقدیم مدارج تسلیم معروض ہے۔ میں نے ہنڈوی ملفوفہ کے ذریعے سے بابت تنخواہ اگست ۱۸۶۶ء سو روپیہ وصول پایا۔

کہوں آپ سے تو کس سے کہوں   مدعائے ضروری الاظہار

پیر و مرشد! حسین علی خاں کے سسرال والوں کا بڑا تقاضا ہے۔ زندگی مشکل ہو گئی ہے۔ سوال مختصر یہ ہے کہ جو حضرت کے مزاج میں آوے وہ عطا کیجے۔ اور حسین علی خاں کے نام جداگانہ تنخواہ مقرر کر دیجئے۔ لیکن یہ دونوں امر جلد صورت پکڑ جائیں۔

تم سلامت رہو ہزار برس   ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار

زیادہ حد ادب۔   عرضداشت دولت خواہ، اسد اللہ

ان مکاتیب سے غالب کے بے تکلفی اور اخلاص ظاہر ہوتا ہے۔ نواب فردوس مکانی سے ان کا تعلق برابر خلوص پر مبنی تھا۔ اس لئے اگر روپیہ کی ضرورت ہوتی تو مرزا صاحب بلا تکلف سرکار سے مانگ لیا کرتے تھے۔ قرض سے ان کو نفرت تھی۔ لیکن وہ عمر بھر مقروض رہے۔ مرزا صاحب قرض کا بار بہت محسوس کرتے تھے اور چاہتے تھے کہ جلد از جلد اس بلا سے نجات حاصل ہو جائے۔ ایک خط میں لکھتے ہیں۔

"ان دنوں میں متفرقات کے قرضخواہ سرگرم تقاضا بلکہ آمادۂ شور و غوغا ہیں۔ دو سو روپیہ کی ہنڈوی صراحئ آب حیات ہو گئی۔ دام مرگ سے نجات ہو گئی۔"

غالب کے لوازم امارت اس قسم کے تھے کہ وہ قرض سے کبھی سبکدوش نہ ہو سکے۔ اور اگرچہ

قرض کی پیتے تھے مے لیکن سمجھتے تھے کہ ہاں
رنگ لائے گی ہماری فاقہ مستی ایک دن

انھوں نے زندگی آرام سے گزاری۔ ان کے پرستار اور قدردان برابر ان کی خدمت کرتے رہے۔ غالب نے بعض مکاتیب میں اپنی وفاداری، خلعت وخطاب کا ذکر بڑے افتخار اور ناز سے کیا ہے۔ ان کی شاعری میں تصوف کے مسائل بکھرے پڑے ہیں۔ لیکن وہ اپنی زندگی میں بلند نظری کا ثبوت پیش نہ کر سکے۔

اُنکا تصوف امیروں کے آستانہ کی ناصیہ فرسائی اور درباروں میں
جبیں سائی کرتا رہا۔ ان سے ایک آزاد و گرفتار و تہی کیسہ و خورسند مرد کا
یہ نعرۂ مستانہ بلند نہ ہو سکا۔

نگاہِ فقر میں شانِ سکندری کیا ہے   خراج کی جو گدا ہو وہ قیصری کیا ہے

لیکن ان میں ایک شانِ خود داری تھی۔ جیسا کہ ان کے ایک خط سے معلوم ہوتا
ہے کہ گو مرزا صاحب نواب صاحب کو ولی نعمت اور آیۂ رحمت سمجھتے تھے لیکن
ادبی معاملات میں ان کے سامنے بھی سررشتۂ خودی نہ چھوڑتے تھے۔ واقعہ یہ
ہے کہ فارسی فرہنگ نویسوں پر غالب نے کچھ اعتراض کئے۔ جس پر نواب صاحب
کے اہلِ دربار نے اعتراض کئے اور نواب صاحب نے بھی ناخوشی کا اظہار کیا،
اس پر مرزا صاحب نے جواب دیا۔

"ان باتوں کو میں نے مانا۔ لیکن نہ فرہنگ لکھنے والوں کے موجب بلکہ
اپنے خداوند کے حکم کے مطابق"

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اُفتادگی اور بے چارگی کے حالت میں بھی
اقلیم ادب کے اس بادشاہ کو یہ گوارا نہ تھا کہ کم از کم اس کی اپنی اقلیم میں کسی
نااہل کا سکہ چل سکے۔

مرزا نے گیسوئے اردو کو طرح طرح سے سنوارا۔ واقعہ یہ ہے کہ وہ شیخ
سعدی کی گلستان کی طرح اس قدر سہل معلوم ہوتی ہے کہ انسان سمجھتا ہے کہ
میں بھی ایسا لکھ سکتا ہوں۔ لیکن جب لکھنے بیٹھتا ہے تو ایک جملہ بھی نہیں لکھ
سکتا۔ مرزا ادب فارسی کے بے بدل ماہر تھے۔ اُنھوں نے زبانِ فارسی کے وہ
تمام محاسن جو کئی ہزار نادرہ کار دماغوں کی گیارہ سو برس کی جانفشانی سے
بہم پہونچے تھے۔ اردو جیسی کم عمر اور تہی مایہ زبان میں بھر دئے۔

مرزا کو خطوط سے تفریح ہوتی تھی۔ وہ دماغ سوزی اور جگر کاوی کے
لئے خطوط نہیں لکھتے تھے۔ اُنھوں نے اردو کو اسی لئے اپنے خطوط کے واسطے
اختیار کیا۔ ان کے اردو مکاتیب ان کے تفریحی مشغلوں کا جز بن گئے تھے۔
ان کی ظرافت طبیعت نے سونے پر سہاگے کا کام کیا اور ان کے خطوط کو خلوص
یگانگی اور بے تکلفی کا مرقع بنا دیا۔

مرزا تخاطب میں وہی انداز اختیار کرتے ہیں جو مکتوب الیہ سے ملاقات
کے وقت زیبا ہوتا۔ اُنھوں نے اپنے تمام خطوط کو مکالمہ بنا کر اس میں طبعی ظرافت
کی تخم ریزی کی۔ مرزا حاتم علی مہر کے نام ایک خط میں فرماتے ہیں۔

"مرزا صاحب۔ میں نے تو وہ انداز ایجاد کیا ہے کہ مراسلہ کو مکالمہ بنا
دیا ہے۔ ہزار کوس سے بزبانِ قلم باتیں کیا کرو۔ ہجر میں وصال کے مزے
لیا کرو"

مکاتیبِ غالب کا یہ مجموعہ ادبی حلقوں میں قدر کی نگاہ سے دیکھا
جائے گا۔

---

(۲) نیاز فتحپوری اردو نثر کے باکمال صاحب طرز ہیں۔ آپ کا رسالہ
یقیناً اس شہرت کا مستحق ہے کہ جو اس کو حاصل ہے۔ اس رسالے کے ہر نمبر میں
ایک مضمون سوال و جواب کے عنوان سے ہوتا ہے۔ استفسار و جواب، جس کی
اب تیسری جلد شائع ہوئی ہے۔ انھیں سوالات و جوابات کا مجموعہ ہے۔

نیاز کی وسیع معلومات کا اندازہ اس سے بخوبی ہو سکتا ہے کہ آپ نے ہر
قسم کے معاملات پر جو مختلف موضوع پر مشتمل ہیں۔ نہایت سلجھی ہوئی بحث کی
ہے۔ آپ کے استفسار و جواب میں شاید ہی کوئی ایسا موضوع بچا ہو جس
پر کچھ نہ کچھ اظہارِ خیال نہ کیا گیا ہو۔ شعر و ادب۔ مذہب۔ تاریخ۔ جغرافیہ
پولٹکس۔ تعلیم و تعلم۔ تصوف۔ فلسفہ۔ نجوم۔ غرض کوئی ایسا مسئلہ نہیں جو آپکی
کتاب میں کمی یا زیادتی کے ساتھ نہ پایا جاتا ہو۔

استفسار و جواب، کو ہم ایک قسم کی انسائیکلو پیڈیا کہہ سکتے ہیں۔ فرق
صرف اتنا ہے کہ انسائیکلو پیڈیا میں ہر موضوع مختلف ابواب میں منقسم ہوتا
ہے۔ لیکن استفسار و جواب میں اس چیز کو ملحوظ نہیں رکھا گیا کہ کتاب مختلف
ہیڈنگس پر مرتب کی جاتی۔

یہ نہیں کہا جا سکتا کہ جس رائے کا نیاز نے مختلف مباحث کے سلسلہ
میں اظہار کیا ہے، ہر جگہ اور ہر موقعہ پر صائب ہو۔ لیکن اس میں کوئی شک
نہیں کہ انھوں نے ہر مسئلہ پر ایک غیر جانبدارانہ نظر ڈالی ہے اور جہاں تک
ممکن ہوا ہے نہایت صاف طریقہ سے اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے جواب
پر اعتماد کرنا ہر شخص کے اپنے خود کے اعتقاد پر منحصر ہے۔

جو چیز نیاز کے افسانوں میں زیادہ پائی جاتی ہے یعنی نامانوس الفاظ
اور عجیب ترکیبیں۔ ان کی بھرمار اس کتاب میں اتنی نہیں۔ وہ ابوالکلام سے
اس خصوصیت میں ملتے ہیں۔ لیکن ان میں اور ابوالکلام میں نمایاں فرق
یہ ہے کہ ابوالکلام کو اپنے موضوع۔ مذہب کی بناپر سنجیدگی اختیار کرنی

پڑتی ہے۔ نیاز کا موضوعِ ادبیات اس قید سے آزاد ہے اور یہی وجہ ہے کہ ان کی زبان میں شوخی، رنگینی اور رعنائی جھلکتی نظر آتی ہے۔

استفسار و جواب اپنی قسم کی پہلی کتاب ہے اور اس امر کو مدنظر رکھتے ہوئے کہ اس میں بعض اہم مسائل پر ایک جرنلسٹ اور نقاد نے سیر حاصل بحث کی ہے۔ ہر تعلیم یافتہ شخص کی میز پر رہنے کی مستحق ہے۔

---

(۳) **جامِ طہور**۔ عبدالسمیع پال اثر صہبائی کی رباعیات و قطعات کا مجموعہ ہے۔ عمر خیام کا اثر شروع کی رباعیات پر بہت گہرا ہے۔ اثر صہبائی عمر خیام سے اس امر پر متفق ہیں کہ گردشِ زمانہ کسی چیز کو اپنی جگہ پر مستحکم رہنے نہیں دیتی۔ انسان آزاد نہیں ہے۔ اندوہ و غم کے بادل اس کے سر پر برابر منڈلاتے رہتے ہیں۔ دنیوی زندگی عارضی ہے اور موت کا کوئی چارہ نہیں لیکن وہ کہتے ہیں کہ ان سب کا علاج تعیش کی زندگی نہیں بلکہ تزکیۂ نفس ہے جس کو قرآنی اصطلاح میں ذکرِ الٰہی کہا گیا ہے۔ ہم یہ ماننے کے لئے تیار ہیں کہ جو علاج وہ بتلاتے ہیں وہ ایک حد تک ٹھیک ہے۔ لیکن یہ کہنا درست نہیں کہ عمر خیام کے نزدیک اس کا علاج تعیش کی زندگی تھا۔ غالب اور عمر خیام کا فلسفۂ زندگی کچھ ملتا جلتا ہوا تھا۔ غالب کا عقیدہ تھا کہ

مے سے غرض نشاط ہے کس روسیاہ کو
اک گونہ بیخودی مجھے دن رات چاہیئے

اور عمر خیام کا

مے خوردنِ من نہ از برائے طرب است ÷ نے بہر فساد و ترکِ دین و ادب است
خواہم کہ بے خودی برآرم نفسے ÷ مے خوردن و شاد بودنم زین سبب است

عمر خیام کے رنگ میں ڈوبی ہوئی چند رباعیاں ملاحظہ ہوں۔

حورانِ بہشت کی تمنا بے سود	ہنگامِ شراب زہد و تقویٰ بے سود
لبریز نشاط ہے خمستانِ حجاز	یادِ غمِ دوش و فکرِ فردا بے سود

تاریکیٔ اندوہ ہے باقی ساقی	ہاں بادۂ دلفروز ساقی ساقی
یہ رنگ یہ محفلیں رہیں یا نہ رہیں	ہے عہدِ شباب اتفاقی ساقی

عمر خیام کے بعد اثر صہبائی نے برگسان، گوتم بدھ اور شنکر اچاریہ کے فلسفۂ حیات کا ایک عمیق مطالعہ کیا جس کا نتیجہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ مادی خوشی کا طلسم توڑنے میں کامیاب ہوئے اور کہنے لگے کہ

نیرنگ طلسم زندگی کو پایا	آلودۂ غم ہر اک خوشی کو پایا
تسکیں ہے اگر تو ذکرِ یزداں میں اثر	سرچشمۂ بے خودی اسی کو پایا

جام و مینا سے تنفر اس فلسفیانہ تصوف کا نتیجہ معلوم ہوتا ہے

اے کاش ہر ایک آنکھ بینا ہوجائے	ہر سینہ فروغِ برقِ سینا ہوجائے
لذت کشِ جامِ عشق ہوجائے دل	بیگانۂ ذوقِ جام و مینا ہوجائے

فلسفۂ حیات و موت اثر صہبائی کے یہاں ہر رنگ میں ملتا ہے۔ دو مختلف جذبات دو رباعیوں میں دیکھیے۔

رازِ عدم و وجود پایا نہ گیا	یہ پردۂ مرگ و زیست اٹھایا نہ گیا
انکار بھی مجھ سے ہوسکا نہ ہمدم!	ایماں بھی مگر خدا پہ لایا نہ گیا

لیکن پھر صحیح راستہ پر آگئے اور کہا کہ

ہر شے ہے فنا پذیر جز جلوۂ حق	ہر نغمہ ہے شورِ خام جز جلوۂ حق
ہر کیف و سرور کا ہے انجام خمار	بے رنج و غم و خمار ہے بادۂ حق

ساتھی جھوٹے ہیں سب کے سب حق کے سوا ÷ ہوتا ہے کسی کا کوئی کب حق کے سوا
اے دوست نہ چھوڑنا کبھی دامنِ حق ÷ ہر چیز ہے بے ثبات! حق کے سوا

اثر کے یہاں اقبال کی شوخی ملتی ہے۔ مثلاً

پیدا کیا اہرمن تو کیا تجھ کو ملا	ہاں خوب جواب برملا تجھ کو ملا
آدم بھی ہوا ہے اب اسی کا ہمدم	خمیازہ کئے کا اے خدا تجھ کو ملا

اور:—

اک شے کو ادھر وجود میں لاتا ہے	اک شے کو ادھر عدم میں پہنچاتا ہے
تخلیق ہے دم میں اور دم میں تخریب	اس کھیل میں تجھکو کیا مزا آتا ہے

اثر حسرت موہانی کے بلند مقام تک جا پہنچے ہیں۔ کہتے ہیں

نظارہ ہو نہ سکا جلوۂ حقیقت کا	بیان ہو نہ سکا مدعا محبت کا
زبان بولتی اور آنکھ دیکھتی ہی رہی	مگر وہی ہے ابھی تک مقام حیرت کا

اثر کے کلام میں رنگینی، لذت، سوز اور عشق سب ہی کچھ ہے۔ ان کی لطیف رباعیات اور قطعے بڑے پُر اثر ہیں۔

دل سے جو بات نکلتی ہے اثر رکھتی ہے

(یہ تقریر آل انڈیا ریڈیو اسٹیشن لکھنؤ سے نشر کی جا چکی ہے اور ڈائرکٹر صاحب کی اجازت سے شائع کی جا رہی ہے)

سماج کی قربان گاہ پر......

صدیقہ بیگم سیوہاروی

(۱)

غروب ہوتے ہوئے آفتاب کی آخری کرنیں فرشِ زمین پر منقش بکھیرنے میں مشغول تھیں۔ پرندے اپنے سریلے نغموں سے نونہالانِ چمن کو اپنی جانب متوجہ کر رہے تھے...... ایسے حسین وقت میں معصوم پریمی نے اپنے ننھے ننھے نازک ہاتھوں سے پھولوں کا ایک خوشہ توڑا اور ایک لاپروا نگاہ جانب مشرق ڈالتے ہوئے گلاب کے اس شاداب تختہ پر پہونچ گئی جہاں سوہن دیر سے اس کا منتظر بیٹھا تھا۔ پریمی نے شرارت سے کچھ پھول سوہن پر ڈالے۔ لیکن سوہن نے نفرت سے منہ پھیر لیا——

"سوہن کیا تم روٹھ گئے؟" معصوم پریمی نے اندازِ محبت سے سوہن کی گردن میں باہیں ڈالتے ہوئے کہا۔

—— سوہن بدستور خاموش تھا ——

"میرے اچھے سوہن میں تو مذاق کر رہی تھی۔ کیا سچ مچ تم مجھ سے نہ بولو گے —— اچھا سوہن میں تمہیں سے بیاہ کروں گی —— اب خوش ہو —— نا"

نادان سوہن کھلکھلا کر ہنس پڑا۔ اس کے چہرہ پر مسرت کی ایک لہر دوڑ گئی۔ لبوں پر ایک خندہ بے محابا مچلنے لگا——

"کیا سچ مچ تم مجھ ہی سے بیاہ کروگی؟ اچھا وعدہ کرو"۔ سوہن نے ملتجی نظروں سے پریمی کو دیکھا۔

"ہاں سوہن میں وعدہ کرتی ہوں۔ مگر تم بھی وعدہ کرو کہ تم میری گڑیا کا گھر تو نہ توڑ دوگے"

آہ —— کس قدر بھولے اور معصوم فقرے تھے۔ دونوں بچوں کے چہرے خوشی سے چمکنے لگے۔ پریمی نے چمپا کے پھولوں کا ہار گوندھا اور معصومانہ انداز سے سوہن کے گلے میں ڈال دیا۔ فلک نے تختۂ زمین کے اس بھولے نظارے کو دیکھا اور ایک زہرآمیز قہقہہ لگایا——

(۲)

دن تیزی سے گزر رہے تھے۔ سوہن اور پریمی ایک دوسرے کے قریب تر ہوتے جارہے تھے۔ اب وہ دن دور نہ تھا جبکہ ان دونوں کی انسانیت محبت کے آہنی تاروں میں جکڑ جائے اور کیوپڈ ان کے سر پر تاجِ محبت پہنائے۔ مگر آہ ان کو کیا خبر تھی کہ جوں جوں دن گزر رہے تھے۔ سماج کے ظالم ہاتھ ان کو ایک دوسرے سے جدا کرنے میں برابر کوشاں ہیں——

زمانے نے کروٹ بدلی۔ ہر طرف بہار کی آمد آمد کا شور ہوا، بیلا —— چمبیلی —— جوہی سب ہی بھرپور جوانی پر تھے۔ پریمی اب وہ پریمی نہ تھی بلکہ ایک حسین و جمیل مست شباب ہرنی۔ اس کے رخساروں پر شباب کی سرخی دوڑ رہی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا گویا دو بلوری ساغروں میں ہلکی گلابی شراب بھری ہوئی ہے۔ اس کی آنکھوں میں شوخی اور شرارت کا دریا بہہ رہا تھا۔ اس کے لبوں پر تبسم گل کھیل رہا تھا —— پو پھٹنے سے پہلے پریمی شیوجی کی پوجا سے فارغ ہو کر مندر سے نکل رہی تھی۔ قریب ہی باغ میں پھولوں سے لدے ہوئے درخت پر پپیہا دردناک

آوازیں شور مچا رہا تھا۔ اس کی آواز پریمی کے دل کو چیرتی ہوئی نکل گئی۔ اُسے اپنا گزشتہ زمانہ یاد آگیا۔ دفورِ الم سے اس کا دل چیخ اُٹھا۔ آنکھوں میں شوخی اور شرارت کی جگہ حسرت و یاس کا دریا موجیں مارنے لگا۔ گلگوں رخسار پژمردہ پھولوں کے مانند مرجھا گئے ـــــ

اب اسے اپنی کمزوری کا احساس ہو چکا تھا۔ زمانہ کی پے در پے کروٹوں نے اسے خوب سمجھا دیا تھا کہ اب وہ سماج کی آہنی زنجیروں میں جکڑی جا چکی ہے۔ وہ اپنے کو ایسی دنیا میں محسوس کر رہی تھی جہاں محبت ایک بے پناہ آگ سمجھی جاتی تھی۔ جہاں زندگی کی تمناؤں اور آرزوؤں کی چتا بنتی تھی۔ وہ اپنی دردناک زندگی کے انجام کو سمجھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ دفعتاً ایک مترنم اور دلکش آواز سامعہ نوازی کرتی ہوئی اس کے کانوں میں گونجی۔

"پریمی ـــــ کہاں ہو؟" پریمی کو اپنی غفلت کا اس وقت احساس ہوا جب کہ سوہن کی باہیں اس کی گردن میں حائل ہو چکی تھیں ـــــ پریمی اس باغ میں سوہن کے پہلو میں بیٹھ گئی جہاں وہ بچپن میں "دلہن" اور "دولہا" بنا کرتے تھے۔

قدرت کے فیاض ہاتھوں نے سرو قدانِ گلشن کو خلعتِ حسین پہنا کر آراستہ و پیراستہ کر رکھا تھا۔ گلہائے رنگا رنگ اپنی بھینی بھینی خوشبو سے مشامِ جان کو فرحت پہونچا رہے تھے۔ اور طائرانِ خوش نوا بہار کی آمد پر ـــــ پُرسرور نغمے الاپ رہے تھے۔ پریمی کی دوربین نگاہوں نے پہلے چمن کا جائزہ لیا اور پھر ایسا محسوس کیا گویا چمن کا ذرہ ذرہ اُسے مخاطب کر کے کہہ رہا ہے۔ مصرع

وعدہ آسان ہے وعدے کی وفا مشکل ہے

اس کا سر چکرانے لگا۔ دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ اس نے سوچا کہ سوہن سے کہدوں "میری نسبت شیام سے ہو چکی ہے" لیکن یہ سوچ کر کہ اس کا یہ جملہ سوہن کے لئے خنجرِ خونخوار سے کم نہ تھا وہ خاموش ہو گئی ـــــ اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کے چند قطرے زمین پر گرے اور ریت میں جذب ہو گئے۔ لیکن جذبات کو پوشیدہ رکھتے ہوئے اس نے اپنے چہرے پر مسکراہٹ پیدا کرنے کی کوشش کی۔ لیکن اس کا تبسم ایک دردناک جھلک لئے ہوئے تھا۔ سوہن اس کی افسردگی سے متاثر ہو کر بولا۔

"بھولی پریمی آج تم اداس کیوں ہو؟ کیا ماتا جی نے تم کو کچھ کہا ہے؟" پریمی کھلکھلا کر ہنس پڑی گویا اس کو کوئی غم ہی نہیں۔ بلکہ سوہن کو پریشان کرنے کے لئے یہ المناک ایکٹنگ کیا گیا ہے۔ کاش سوہن سمجھ سکتا کہ اس مسرت کے پردہ میں آنسوؤں کی ایک لامتناہی کہانی چھپی ہے۔ ان مسکراتے ہوئے لبوں کے پیچھے غم کی بے پناہ لہریں انگڑائیاں لے رہی ہیں۔ پریمی نے متبسم نظروں سے سوہن کو دیکھتے ہوئے کہا "دیکھو سوہن طائرانِ چمن کیسے اچھے پریت بھرے راگ الاپ رہے ہیں ـــــ"

"لیکن پریمی تمہارے نغمے ان سے کہیں زیادہ دلکش اور محبت بھرے ہیں" سوہن نے شوخی سے جواب دیا۔ پریمی تڑپ اُٹھی ـــــ یہ لفظ نہ تھے بلکہ ایک تیر تھا جو اس کے سینہ کو برماتا ہوا دل میں پیوست ہو گیا ـــــ اس کے دل کی دردناک چیخیں سکونِ حیات کو تار تار کئے دیتی تھیں۔ لیکن آہ ـــــ سوہن ان چیخوں کو نہ سن سکا۔ اور سنتا بھی کس طرح جبکہ مصنوعی فلک شگاف قہقہہ ان کے کانوں میں گونج رہے تھے ـــــ

"اچھا پریمی! کیا آج گانا نہ سناؤ گی" سوہن نے پریمی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ پریمی کو اپنی زندگی میں کبھی ایکٹ کرنے کا موقع نہ ملا تھا۔ مگر اس وقت وہ دنیا کی بہترین ایکٹریس کو بھی شرمندہ کر رہی تھی۔ اور ایک خوشگوار۔ مسرور کن زندگی کا پارٹ کمال خوش اسلوبی سے ادا کر رہی تھی۔ وہ ایک بسمل کر دینے والی ادا کے ساتھ مصروفِ نغمہ ہو گئی۔

آئی پیا کی یاد ـــ سکھی پھر آئی پیا کی یاد
ڈال بیٹھا بولے پپیہا ـــ بن میں بولے مورا
امبوا پہ بیٹھی کوئلیا کوکے، رہ رہ مچاوے شور
کس سے کروں فریاد + سکھی پھر ----
اُمنڈ گھمنڈ کر بادل آئیں، ناؤ پڑی منجدھار
من کی نیا پریم کا ساگر کیسے ہو بیڑا پار
کیسے ہو بیڑا پار + کون ہے کھیون ہار ----

پریمی کی آواز بھرا گئی ـــــ سوہن اس دردناک نغمے سے بےحد متاثر ہوا۔ اُس کی آنکھوں میں بھی آنسو ڈبڈبا آئے۔ پریمی دفعتاً سنبھلی اور مسکرانے لگی۔ لیکن اس کا تبسم غیر لطیف اور مصنوعی تھا۔

"اچھا سوہن اب اجازت دو۔ ماتا جی انتظار کر رہی ہوں گی" یہ کہکر

پرتیمی رخصت ہو گئی اور سوہن تکتا رہ گیا ـــــــــــ

(۳)

دوپہر کا وقت تھا۔ سوہن مطالعہ کے کمرے میں بیٹھا کتاب کی ورق گردانی کر رہا تھا کہ ڈاکیہ نے ایک رنگین لفافہ میز پر رکھا ـــ لفافہ کے کونے پر لکھا تھا "مرسلہ پرتیمی" سوہن نے بے چینی سے خط چاک کیا اور پڑھنا شروع کیا ـــــــ خط میں تحریر تھا۔

بمبئی ۱۷ ردسمبر ۱۹۳۷ء

"اسی جگہ ہوئی منزل جہاں پہ ٹوٹی آس
تھکائے ڈالتی ہیں گردشیں زمانہ کی"

میرے حسین دیوتا ـــــــ اپنی بدنصیب پجارن کا سلام قبول کرو۔ آج دس بجے خلاف امید تمہارا محبت نامہ ملا۔ تمہاری افسردگی کے احساس نے دل میں غم آگین ارتعاش پیدا کر دیا ـــــــ دیر سے سر بہ گریبان ہوں۔ دماغی کیفیتیں کچھ نہ پوچھو ـــــــ مسلسل چار گھنٹہ کی خاموشی کے بعد قلم میں ہلکی ہلکی لرزش پیدا ہو رہی ہے۔ پیارے سوہن یہ خط نہیں ہے بلکہ میری تلخ زندگی کی حسرتناک ٹریجیڈی ہے ـــــــ حیات کی المناکیوں سے بھری ہوئی ایک المناک داستان ہے۔ تم نے میری اس طویل خاموشی کو سراسر غلط سمجھا۔ میرے بھولے دیوتا اپنی بھولی آنکھوں کی قسم تم ہی سچ بتاؤ۔ کیا کوئی اپنے حسین قاتل سے نفرت کر سکتا ہے۔ تو شائد میں بھی تم سے نفرت کرنے لگوں ـــــــ میری جان یہ دل تم پر مٹنے والا جذبہ رکھتا ہے ـــــــ فنا کا جام پی کر بھی میری روح شائد تم پر قربان ہونے کے لئے عالم بالا سے آئے ـــــــ

غالباً کل صبح تم مجھ سے ملنے آئے تھے۔ لیکن کسی نامعلوم جذبہ نے مجھے تم سے ملنے سے روک دیا ـــــــ میں گنہگار ہوں ـــــــ گنہگار ـــــــ پاپ کر رہی ہوں۔ اچھا! مجھے معصیت کی اس آگ میں جل جانے دو۔ اچھا ہے، میرے کئے کی سزا مجھے اس دنیا میں ہی مل جائے۔ اب رات کے گیارہ بج چکے ہیں۔ سماج کے خونخوار درندے سب سو چکے ہیں۔ ہر طرف بلا کا سکوت چھایا ہوا ہے۔ آؤ! آؤ!! میں اس وقت تم کو ایسا دردناک گیت سناؤں جس سے دریائے محبت کا ذرہ ذرہ کانپ اُٹھے۔ جذبات دل کی چیخوں سے زمین اور آسمان لرزنے لگیں۔ جان آرزو سوہن آج میرے مقدمے کا سنگین فیصلہ سنا دیا گیا ـــــــ ہائے جس نے دم کے دم میں میرا شیرازۂ محبت بکھیر دیا ـــــــ اُف جذبات دل کی تڑپ سے قلم کی لوح بھی کانپ رہی ہے ـــــ آہ ـــــ کس طرح زندگی کی اس دردناک کہانی کو صفحۂ قرطاس پر پھیلاؤں۔ ہائے سماج کے بے رحم قصابوں نے میری تمناؤں اور آرزوؤں کو ذبح کر ڈالا۔ اور میرے تڑپنے کا ہنس ہنس کر تماشہ دیکھتے ہیں۔۔۔۔۔۔ میرے لئے ایک سن رسیدہ شریک حیات منتخب کر لیا گیا ـــــــ اس کا نام "شیام" ہے، شاید تم بھی جانتے ہو کہ وہ بہت دولت مند ہے اور میں اس دولت کی بھینٹ چڑھائی جا رہی ہوں۔۔۔۔۔۔۔ اس سے زیادہ مجھکو بھی اپنے متعلق اور کچھ نہیں معلوم ـــــــ

میرے نادان ـــــــ اور بھولے سوہن! تم مجھے بیوفا اور خودغرض سمجھ رہے ہو ـــــــ کیا تفرقہ انگیز وقت ہے؟ میں اور تمھیں فریب دینے کی کوشش کروں۔۔۔۔۔۔۔ آہ۔۔۔۔۔۔ تم کو کیا معلوم کہ میں محبت کا چراغ لئے فراق کے تاریک غار میں ٹھوکریں کھا رہی ہوں اور بادسموم کے جھونکے شمع محبت بجھانے پر تلے ہوئے ہیں۔ تمہارے یہ جملے کس قدر دلخراش اور مایوس کن ہیں۔ "پرتیمی تم نے پہلے ہی کہدیا ہوتا۔۔۔۔۔۔۔ مجھے تم سے محبت نہیں۔۔۔۔۔۔۔" پیارے سوہن کیا تمھیں یقین ہے کہ مجھے تم سے محبت نہیں۔۔۔۔۔۔۔ آہ۔۔۔۔۔ کن الفاظ سے تمھیں سمجھاؤں۔۔۔۔۔۔۔ کیا میرے دل میں یہ آرزو نہیں کہ تم میرے ہوتے۔ لیکن۔ ع

تقدیر جو دکھائے سو ناچار دیکھنا

دلنواز سوہن۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ مجھے وہ زمانہ بھی خوب یاد ہے جب ہم دونوں کشمیر کے شالامار باغ میں اپنی معصومیت کے دن گزارتے تھے۔ خوبصورت باغوں میں بلبلوں کے پریت بھرے راگ سنتے تھے۔۔۔۔ تم دیوتا بنتے اور میں تمہاری پوجا کے لئے محبت کے پھول چنتی۔ آہ۔۔۔۔ وہ بھی کیا دن تھے۔ غم فردا سے آزاد! ہمیں ہر طرف پریم ہی پریم۔ اپنے ذریں لباس میں ٹہلتا ہوا نظر آتا۔۔۔۔۔۔۔۔۔ کائنات کا ذرہ ذرہ پریم محبت کے نشے میں جھومتا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ آہ۔۔۔۔۔۔ وہ لمحے میری زندگی کے انتہائی مسرور کن تھے۔ اُف زمانہ کس قدر جلد رنگ

بدلتا ہے ---------- وہ زمانے اب خواب و خیال ہوگئے۔

"یادِ ایامِ عشرتِ فانی"

میری جان میں نے "انتقام پر قربانی" کو ترجیح دی اور اپنے جذبات کی دنیا کو غم کے ہاتھوں سے تھپک تھپک کر -------- ہمیشہ کے لئے سلا دیا ------ کاش تمہیں معلوم ہو کہ پریمی اب وہ پریمی نہیں ہے جسے تم شریر پریمی کہا کرتے تھے۔ وہ اب اس بت کے مانند ہے جس کے جسم سے ہر وقت یاس و حسرت کے شعلے نکلتے ہیں --------

تم پوچھتے ہو "کون خوش نصیب تمہاری ہم صحبت ہے؟" اے میرے محبوب یقین جانو -------- نہ اب حسین و نازک پھول میری صحبت سے لطف اندوز ہوتے ہیں -------- اور نہ اب شوخ ------ خوش رنگ تیتریاں آکر میرے بکھرے ہوئے پریشان بالوں کو چھیڑتی ہیں... ------ نہ بہار کی رعنائی و شادابیٔ چمن میرے مغموم دل کے لئے کوئی کشش رکھتی ہے۔

میری جان اب میں پریم محبت کی دنیا پر حکمرانی کر چکی آہ ------- وہ حسین زمانہ ایک خواب تھا ------- جس کا تصور فلم کی طرح دماغ کے پردہ پر آیا اور ایک آن کی آن میں نظروں سے اوجھل ہوگیا۔ ع

خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سنا افسانہ تھا

آہ ---- عزیز سوہن تم نے یہ معلوم کرنے کی کوشش کی ہے کہ میں کیا کرتی ہوں اور میرا کیا مشغلہ ہے ------- جانتے ہو قندیلِ مسرت کی جھلملاہٹ دیکھکر روتی ہوں -------- اور محبت کے بھڑکتے ہوئے شعلوں سے ہنس ہنس کر کھیلتی ہوں ------ اگر تمہارا جی چاہے تو تم بھی دور سے کھڑے ہو کر میرا یہ انوکھا کھیل دیکھ لو -------

میرے حسین دیوتا ------ اگر اس طرح اس دلِ ناکام کو فریب نہ دوں تو ----- تم ہی بتلاؤ ----- کہ پھر کیا کروں ----- کدھر بھاگ جاؤں ----- کیونکر اس فریبی دنیا سے نجات حاصل کروں ---- ہر لمحہ صبر شکن ہے ------- غم کے خار بری طرح "چادرِ حیات" کو چھلنی کئے دیتے ہیں -------- یاس کا دھواں دم گھونٹے دیتا ہے ------- نقاہت کی تنگ آغوش کروٹ تک نہیں لینے دیتی ------- جی چاہتا ہے "شمعِ حیات" گل کر دوں -------- میں نہیں کہہ سکتی کہ تمہارے خیال کی دنیا یا قبر کی خوفناک تاریکی مجھے زندہ رہنے پر مجبور کرتی ہے --- ہائے تم کس دل سے کہتے ہو "پریمی شادی کے بعد کے لمحات حسین و جاں نواز بن کر گزریں گے۔ دولت کی فراوانی اور مسرت کی ہنگامہ خیزیوں میں تم سب کچھ بھول جاؤ گی ------ " پیارے سوہن مجھے افسوس ہے کہ تم میری محبت کی گہرائیوں تک نہیں پہونچ سکتے۔ تم کیا جانو کہ میں تم سے کس قدر پریم کرتی ہوں -------- لیکن

یہ جانتی ہوں کہ میں تجھکو پا نہیں سکتی
ہر ایک سانس میں ہے پھر بھی آرزو تیری

پیارے سوہن ------ سماج کے نزدیک ہندوستانی عورت کا فرض یہ ہے کہ جل جائے اور اُف تک نہ کرے ------- اچھا سوہن میں اس فرض کے ادا کرنے کے لئے --- ہمہ تن تیار ہوں -------

بیس نومبر کو تمہارا خط والد صاحب کے نام موصول ہوا ------

ہائے سوہن کس دل سے لکھوں ------ قلم کانپ رہا ہے ------ انگلیوں میں ارتعاش پیدا ہو رہا ہے۔ آہ ------ کیونکر لکھوں کہ تمہاری درخواست کو سماج کے بے رحم کتوں نے حقارت سے ٹھکرا دیا -------- اس لئے کہ تم ایک شودر کی اولاد ہو اور میں خاندانِ برہمن سے تعلق رکھتی ہوں ------ میرے جاں نواز سوہن جی چاہتا ہے کہ سماج کی آہنی زنجیروں کو جذبۂ آزادی کے قوی ہاتھوں سے توڑ کر ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالوں ----- لیکن پھر خاموش ہو جاتی ہوں --------- اس لئے کہ میں ایک ہندوستانی عورت ہوں ---------- میرا فرض ہے کہ اپنی شومیٔ قسمت پر بجائے رونے کے ہنسوں اور خوب ہنسوں ----- یہاں تک کہ اپنی روح کو ان قہقہوں میں تحلیل کر دوں -------- ہائیں -------

سوہن! --------- تم رو دیئے، ابھی تو زمانے نے ایک ہی کروٹ بدلی ہے -------- اس زندگی میں ابھی نہ جانے کتنے انقلاب اور آئیں گے ---------- میری جان سر زانوئے فکر سے اُٹھاؤ ------- تدبیر بھی کوئی چیز ہے ------- تم جیسے باہوش انسان کے لئے یہ بزدلی اور کم ہمتی اچھی نہیں ------- مردانہ استقلال چادرِ تفکر کی دھجیاں اُڑا سکتا ہے ------

میرے دیوتا! ------ کہاں سے ایسے قیمتی الفاظ لاؤں جو تمہارے لئے تسکین کا باعث ہوں ----- اے کاش مجھ میں اتنی قدرت ہوتی

کہ اپنے محبوب کو سماج کے خونخوار چنگل سے چھڑا سکتی۔ اُف .... یہ زندگی کس کام کی؟ جو تمہاری ہمدردی کا اظہار تک نہیں کر سکتی......... میری بھولیا سمجھتی ہیں کہ میں خوش ہوں ——— مگر آہ! ——— اگر وہ واقعات کا گھونگٹ سرکا کر دیکھیں تو ان کو معلوم ہو کہ میری کشتیٔ حیات دریائے اشک میں ہمیشہ کے لئے غرق ہو چکی ہے ——— آہ! ——— جب میں اپنے ہونے والے پتی کا تصور کرتی ہوں تو میری روح کانپ اٹھتی ہے، جذبات دل کی فریاد سنکر زمین اور آسمان لرزنے لگتے ہیں ——— آہ! میں یہ نہیں کہہ سکتی کہ میرا سہاگ کتنے دن یا کتنے گھنٹہ باقی رہے گا ——— لیکن عزیز سوہن یہ تصورات میرے دل پر اب اثر پذیر نہیں ہو سکتے ——— اس لئے کہ اب مجھے اس فریبی دنیا سے کچھ مطلب اور نہ دنیا والوں سے۔ اور اب مجھے یہ بھی احساس نہیں کہ میں کہاں ہوں اور کیا کرتی ہوں ؎

اپنی حالت کا کچھ احساس نہیں ہے مجھکو
میں نے اوروں سے سُنا ہے کہ پریشان ہوں میں

میری بعض خوش نصیب سہیلیاں جو اتفاقیہ سماج کے دستِ ظلم سے بچ گئی ہیں۔ مجھ سے کہتی ہیں "پریمی تم کو اور کیا چاہئے ...... ایشور نے تم کو سب کچھ دیا ہے"! میرے حسین دیوتا ——— کیا کہوں؟ مجھے کیا چاہئے! اور وہ کونسا غم ہے۔ جو مار آستیں بن کر میرا خون چوس رہا ہے......... کیا تم بتلا سکتے ہو کہ عورت کو کیا چاہئے؟ .... اور اس کی بے چین نگاہیں چمنستانِ عالم میں کس چیز کی متلاشی ہوتی ہیں؟ .... میرے دلنواز سوہن اس کو "پریم" کہتے ہیں۔ عورت جسے یہ دولت حاصل ہوتی ہے ہر مصیبت میں ہنستی رہتی ہے .... مگر آہ .... جو اس دولت سے محروم ہے وہ عشرت خانوں میں بھی مغموم اور افسردہ رہتی ہے .... پریمی .... بدنصیب پریمی کو بھی اسی دولت کی تلاش ہے۔ ؏

تلاش جس کی ہے وہ زندگی نہیں ملتی

سمجھ میں نہیں آتا کہ کس کو موردِ الزام ٹھیراؤں۔ اپنی قسمت کو یا گھر والوں کو۔ جنھوں نے دولت کی فراوانی دیکھکر میری آنکھیں بند کر کے غم واندوہ کے تاریک غار میں بے رحمی سے دھکیل دیا......... ستم ہے کہ جس کی زندگی اور موت کا مسئلہ درپیش ہو وہی اس امر سے بالکل بے خبر رکھا جاوے۔ اس سے زیادہ بڑھ کر اور کیا ظلم ہو سکتا ہے کہ زندگی انقلاب کے گہوارہ میں ڈالی جا رہی ہے۔ لیکن اس کے حسرت ناک انجام پر کوئی بھی غور نہیں کرتا۔ میرے پیارے کیا تم جانتے ہو کہ ایسا کیوں کیا جاتا ہے۔ آہ..... اس لئے کہ معاشرت و تمدن کے ڈاکوؤں کے خود ساختہ قانون رسوا نہ ہوں۔

مظہر محبت سوہن! .... رات کے دو بج چکے ہیں .... برسات پھولوں کا مینہ برسا رہی ہے .... سرد ہوا کے لطیف جھونکے میرے بکھرے ہوئے پریشان بالوں کو نہ جانے کیوں چھیڑ رہے ہیں.... درخت مست میخوار کی طرح جھوم رہے ہیں...... ہلکی...... ہلکی پھوار جذبات میں ایک پُرکیف ہیجان پیدا کر رہی ہے .... فضا کا ذرہ ذرہ جوشِ مستی کا پیمانہ چھلکا رہا ہے .... پیارے سوہن مجھے اس وقت اپنا گزشتہ زمانہ یاد آ رہا ہے۔ میری آنکھوں سے آنسوؤں کا سیلاب جاری ہے .... یاس و نا امیدی کی گھنگھور گھٹائیں دلِ افسردہ کے چرخ پر جھوم جھوم کر چھا رہی ہیں......... ہر طرف باغوں میں جھولے پڑ رہے ہیں۔ نوجوان لڑکیاں جھوم جھوم کر بلند آواز میں گا رہی ہیں.... ایک طرف سے "بالم آن بسو مورے من میں"......... کی پُرکیف صدائیں کانوں میں گونجتی ہیں......... آہ!......... کوئی میرے ناکام دل سے پوچھے۔ جس کی ہر تڑپ کے ساتھ یہی صدا آتی ہے......... "تم بن سیاں کچھ نہ بھائے"......... اے کاش ایسے سہانے وقت میں تم میرے پاس ہوتے .... میری جان بتلاؤ! .... سچ بتلاؤ!! جب تمھیں اپنی مصروفیتوں سے فرصت ملا کرے گی تو کیا کبھی تم مجھ بدبخت کو بھی ایسے لطیف موسم میں یاد کرو گے ....

میرے سوہن! .... اگر تمھیں اپنی پریمی عزیز ہے تو اس کی آخری آرزو قبول کرو۔ وہ یہ کہ تم اپنی زندگی کے طوفانی لمحات کو حسین و جاں نواز بنانے کے لئے "شریک حیات" منتخب کر لینا، اور جب کبھی اس حسین آغوش سے فرصت ملے تو میرے دیوتا .... اپنی بدنصیب پجارن کو بھی یاد کر لینا۔ تم جہاں رہو میرے تخیل سے دُور نہیں......... بس میری یہی آرزو ہے .... یہی تمنا ہے کہ ایک بار اپنی زندگی میں تمہارے یاقوتی لبوں سے مسرت کے پھول جھڑتے دیکھ لوں۔ تاکہ میری بے چین روح تمہاری مسرت کا احساس کر کے سکون حاصل کر سکے۔ رات زیادہ گزر چکی ہے۔ اب رخصت کی اجازت دو۔ خوف ہے کہ کہیں سماج کے خونخوار

ورندے نہ جاگ اُٹھیں۔ اچھا خدا حافظ۔

کبھی یہ دل تماشاگاہ تھا عیش و مسرت کا
اب اس میں حسرت و یاس وتمنا سیر کرتے ہیں"

تمہاری۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

بدنصیب پریمی

سوہن نے اس خط کا جواب صرف ایک دردناک آہ سے دیا۔ اور پھر کتاب کی ورق گردانی میں مصروف ہوگیا۔۔۔۔۔۔۔۔

اب پریمی کی شادی کو دو سال کا عرصہ گزر گیا تھا۔ اس کی آرزوؤں اور امیدوں کی دنیا فنا ہو چکی تھی۔۔۔۔۔۔ وہ اب بیسوا تھی۔۔۔۔۔۔ دھن دولت اُس کے چرنوں کی پوجا کرتے تھے۔ ایک عالی شان خوبصورت کوٹھی جو بہترین سامانِ آرائش سے مزین تھی، ریشمین زرنگار پردہ، مخملین صوفے۔۔۔ ایرانی قالین۔۔۔۔۔۔ کشمیر کی منقش چادریں۔۔۔۔۔۔ جنھوں نے کمرہ کی آرائش میں اور چار چاند لگا دیئے تھے۔ غرض اس کی دلچسپی اور آرام و راحت کا کافی سامان مہیا تھا۔۔۔۔۔۔ لیکن پریمی سکھی نہ تھی۔ اُسے کسی کی تلاش تھی جب کوئی دروازہ پر آواز دیتا تو پریمی کی متلاشی نگاہیں اُٹھتیں۔ لیکن پھر مایوس ہو کر خود بخود جھک جاتیں۔ اُس کا دل ڈوب جاتا۔ جیسے کنول کے ساغرِ سیمیں میں شبنم کے آنسو۔۔۔۔۔۔ اُس کی آتما سدا رویا کرتی تھی۔۔۔۔۔۔ اُسے کسی کروٹ چین نہ آتا تھا۔ وہ اب بیسوا تھی۔۔۔۔۔۔ بیسوا۔۔۔۔۔۔ بیسواؤں کی زندگی تو تمناؤں اور آرزوؤں کی دہکتی "ہولی" ہوتی ہے۔

ہر شام کو اس کے یہاں آلامِ حیات کے ستائے ہوئے انسان زندگی کے تھپیڑوں کو موسیقی کے دلنواز سروں میں کھو دیتے۔۔۔۔۔۔ اور ٹھٹھرے ہوئے قلوب کو آتشی سیال کے ایک گھونٹ سے گرما دینے کے لئے جمع ہوتے۔۔۔۔۔۔

لیکن خود اس کی روح برف سے زیادہ سرد پتھر سے زیادہ سخت تھی جس پر نہ آتشِ سیال کا اثر ممکن تھا اور نہ ساز کے نغمات کا۔ لوگ اس کے رقص و سرود کی تعریف میں لغت کے تمام حسین الفاظ ختم کر دیتے۔ لیکن پریمی ان کلماتِ تحسین کے پردہ میں خلوص و صداقت کے بجائے حرص و ہوا اور ہوس کے خوفناک نقوش کی جھلک دیکھتی تھی۔ جب کبھی وہ اپنی اس ذلیل زندگی پر غور کرتی تو اس کا دل تڑپ اُٹھتا۔ اس کی روح بےچین ہو جاتی۔۔۔۔۔۔ وہ اس معصومیت کا گلا گھونٹ دینے والی فضا سے نکل کر بھاگ جانا چاہتی تھی۔۔۔۔۔ اور اپنی بدنصیبی پر آٹھ۔۔۔۔۔۔ آٹھ آنسو بہاتی۔

اس طرح سے پریمی کی زندگی کے بیش بہا لمحات گزرتے رہے۔ وہ اب اپنی زیست سے عاجز ہو چکی تھی۔۔۔۔۔۔ رفتہ رفتہ اس کی حالت خراب ہوتی گئی۔ ایک روز رات کے گیارہ بج چکے تھے۔۔۔۔۔۔ ہر طرف خوفناک سکوت چھایا ہوا تھا۔ پریمی بسترِ مرگ پر بےحس پڑی تھی۔ چاند کی سیمیں کرنیں اس کے گھونگر والے بالوں سے اٹکھیلیاں کر رہی تھیں۔ ڈاکٹر اس کو ہوش میں لانے کی ہر ممکن کوشش کر رہا تھا۔ دفعتاً پریمی نے کروٹ بدلی۔ اور عالمِ مدہوشی میں زیرِ لب بڑبڑاتے ہوئے کہا "سوہن۔۔۔۔۔۔ سوہن۔۔۔۔۔ تم کہاں ہو؟ کیا پیارے سوہن اب آخری وقت میں بھی اس بدنصیب پریمی کو اپنے درشن نہ دوگے۔ آؤ۔۔۔۔۔۔ آؤ۔۔۔۔۔"

یہ کہتے کہتے وہ خاموش ہوگئی۔ ڈاکٹر اس کے ٹوٹے پھوٹے جملوں سے کوئی مطلب نہ نکال سکا۔ وہ پریشان تھا کہ پریمی کس کو بلا رہی ہے؟ کیا اُسے کسی سے محبت ہے؟ مگر نہیں۔۔۔۔۔۔ وہ بیسوا ہے۔ وہ محبت کرنا کیا جانے؟ بیسواؤں کو تو دولت کی ضرورت ہوتی ہے۔ وہ دولت ہی کی پوجا کرتی ہیں۔۔۔۔۔۔ پھر وہ کس سوہن کو بلا رہی ہے؟ طرح طرح کے عجیب و غریب خیالات ڈاکٹر کے دماغ میں چکر لگا رہے تھے۔ اتنے میں گھنٹہ کی آواز نے کمرے کے عمیق سکوت کو توڑا۔۔۔۔۔۔ رات کے دو بج چکے تھے۔

"ڈاکٹر صاحب کیا آپ ابھی تک نہیں سوئے"؟ پریمی نے کراہتے ہوئے کہا اور ایک بے پروا نگاہ دروازے کے باہر باغ کی جانب ڈالی۔ جہاں مولسری کے درخت پر پپیہا دردناک آواز میں۔۔۔۔۔۔ پی کہاں۔۔۔۔ پی کہاں۔۔۔۔۔۔ کی گت لگائے تھا۔

"ڈاکٹر صاحب یہ پرند کیوں چیخ رہا ہے۔۔۔۔۔۔ کیا اس کا پی اس کے پاس نہیں ہے؟ یا سماج کے ظالم ہاتھوں نے اس کے "پی" کو بھی اس سے چھین لیا ہے"

پریمی نے آہستہ سے پوچھا اور نقاہت کے باعث زیادہ نہ بول سکی۔

ڈاکٹر واقعات کی تہ تک پہونچ چکا تھا اُس نے بات کا رُخ بدلتے ہوئے کہا "دو بج چکے ہیں۔ لو اب دوا پی لو۔۔۔۔۔۔ اور پھر آرام کرو"

”نہیں......ڈاکٹر صاحب.......آپ میرے بچانے کی کوشش نہ کریں۔ اب میرا وقت پورا ہو چکا ہے.......اور اب میں قدرت کی آغوش میں ابدی نیند سوؤں گی.......“ یہ کہتے ہوئے پریمی کی آواز بھرا گئی، اور وہ خاموش ہو گئی۔

”پریمی! تم بہت جلد اچھی ہو جاؤ گی.......گھبرانے کی کوئی بات نہیں“ ڈاکٹر نے تسلی آمیز لہجے میں کہا۔

”لیکن.......میں اب جینا نہیں چاہتی.......“

”پریمی! تم کیسی بہکی بہکی باتیں کر رہی ہو۔ ابھی تم نو عمر ہو۔ تم نے ابھی دنیا میں دیکھا ہی کیا ہے؟“

”ڈاکٹر صاحب.......یہ آپ کا خیال ہے۔ میں نے وہ دیکھ لیا جس کے دیکھنے کی مجھے توقع بھی نہ تھی۔ البتہ آپ کو ابھی اس فریبی دنیا سے واسطہ نہیں پڑا۔“

وہ ایک ساعت کے لئے خاموش ہو گئی.......اور پھر ڈاکٹر کی طرف متوجہ ہوئی۔

”یہ دنیا دیکھنے میں قوس و قزح کی طرح خوش رنگ اور نظر فریب لیکن حقیقت میں یہ جگہ سکھ اور شانتی سے خالی ہے.......میں نے اس چھوٹی سی عمر میں اس دنیا کا بغور مطالعہ کیا ہے۔ مجھے اس زندگی کا خوب علم ہے۔ جسے دنیا ”شباب“ و ”جوانی“ کی زندگی کہتی ہے۔ ڈاکٹر صاحب آپ میری ان خشک باتوں سے گھبرا گئے ہوں گے.......“

دفعتاً پریمی خاموش ہو گئی اور باہر کی جانب بغور تکنے لگی.......

باغ کی جانب سے کسی کے گانے کی پُر درد آوازیں آ رہی تھیں۔

”ڈاکٹر صاحب!.......یہ شخص کون ہے.......کیا آپ اس کو یہاں بلا سکتے ہیں۔ اس بیچارے کی رودادِ غم بہت ہی حسرتناک معلوم ہوتی ہے.......شاید اس کے پُرسوز نغموں سے میرے قلب کو کچھ سکون حاصل ہو.......“

ڈاکٹر نے ایک آہ سرد بھری اور آہستہ سے کمرے سے باہر نکل گیا۔ تھوڑی دیر بعد دروازہ کا پردہ ہٹا۔ ڈاکٹر اور ایک پاگل اجنبی اندر داخل ہوئے۔ اجنبی ایک نوجوان شخص تھا.......اسے اپنے تن بدن کا قطعی ہوش نہ تھا.......کپڑے پھٹے ہوئے تھے.......جسم گرد آلود.......ڈاکٹر پاگل فقیر کو لئے پریمی کے قریب پہونچا.......پریمی نے اپنی آنکھیں کھولیں۔ اور ایک سکوت کے عالم میں کچھ دیر تک فقیر کو بغور دیکھتی رہی.......پھر ایکبارگی زور سے چلائی۔

”سوہن.......پیارے سوہن.......میں بہت خوش نصیب ہوں کہ آخری وقت میں تم میرے پاس موجود ہو.......اچھا موت بھی اطمینان سے آئے گی.......“

اجنبی فقیر بھی دیوانہ وار.......”پریمی.......پریمی.......“ کہتا ہوا اس کو لپٹ گیا.......

کمرے میں ہر طرف خاموشی چھا گئی.......ڈاکٹر اُن پر مایوس نظریں ڈالتا ہوا کمرہ سے باہر چلا گیا۔

کیا عشق کا بھی اثر ہے، اللہ، اللہ
اپنے سے وہ بے خبر ہے، اللہ، اللہ
سر زمیں کے زانو کو ہے ارماں جس کا
قدموں پہ پڑے وہ سر ہے، اللہ، اللہ

جوش

نقشِ فرقت ابھار دے گا دل پر
سارا غصہ اُتار دے گا دل پر
اس ڈر سے اُٹھاتا نہیں آنکھیں تو واہ
پھیل گیا تو ڈنک مار دے گا دل پر

جوش

اگر دنیا میں شاعر نہ ہوتا تو کیا ہوتا؟

احسن مارہروی

اب سے دو ڈھائی ہزار برس پہلے افلاطون نے یونان کے لئے جمہوری سلطنت کا جو خیالی ڈھانچہ بنایا تھا، اُس میں شاعروں کے سوا ہر پیشے اور ہر فن کی ضرورت تسلیم کی تھی۔ اگر اس کی تجویز شعراء کی جلا وطنی کے لئے پاس ہو جاتی تو آج اس سوال کی ضرورت ہی باقی نہ رہتی۔ شاعروں کے خلاف یہ بنیادی پتھر خشتِ اوّل کی صورت میں ایسا ٹیڑھا رکھا گیا کہ "تا ثریا می رود دیوار کج" کا مصداق نظر آتا ہے۔ چنانچہ فنونِ لطیفہ میں قاعدہ کلیہ کی طرح شاعری منحوس سمجھی جاتی ہے۔ اس میں کمال پیدا کرنے والا اکثر محتاج دیکھا جاتا ہے۔ شاعری میں کمال کے لئے نحوست اس قدر لازمی سمجھی گئی ہے کہ پیٹ بھرے کو شاعر سمجھنا، پیٹ بھر کے احمق بننا ہے۔ خود شعراء کی زبان سے اقرارِ نحوست کی اتنی شہادتیں سنی جاتی ہیں کہ اُن کے ہوتے ہوئے ڈپٹی کلب حسین خاں نادرؔ کا یہ شعر کوئی وزن نہیں رکھتا۔ یعنی

لوگ کہتے ہیں کہ فنِ شاعری منحوس ہے
شعر کہتے کہتے میں ڈپٹی کلکٹر ہو گیا

لیکن حقیقت یہ ہے کہ جس طرح شعر و شاعری، غیر معمولی انہماک۔ صنائع بدائع کی رنگینیوں۔ تکلف پسندی کی افراط کو ظاہر کرتی ہیں اسی طرح معاشر کے ہر جزو میں کمی و بیشی سے مفید، یا مضر نتائج نکلتے رہتے ہیں۔ مگر پھر بھی تکلفات ایسی چیز نہیں کہ مطلقاً ترک ہو سکیں۔ مثلاً غذا و خوراک میں ثقیل غذائیں مضرِ صحت ہو جاتی ہیں۔ لیکن لطیف اور مختلف غذاؤں کا وجود مفقود نہیں ہو سکتا۔ یا لباس میں فی نفسہٖ تکلف پسندی لازمی ہے۔ مگر جاڑوں میں شربتی کا انگرکھا زیبِ تن فرمانا اور گرمیوں میں ولائتی موسم کے کپڑے استعمال کرنا تکلف نہیں بلکہ حماقت و نادانی ہے۔

اس اصول کو پیشِ نظر رکھکر دیکھا جائے تو اس سوال کے جواب دو حصوں میں تقسیم ہو سکتے ہیں۔ پہلے حصے کو تخئیلی سمجھیے، اور دوسرے کو تحقیقی۔ مثلاً

اگر شاعر نہ ہوتا تو شاعری نہ ہوتی۔

اگر شاعری نہ ہوتی تو اہلِ ادب ذی شعور نہ ہوتے۔

اگر ذی شعور نہ ہوتے تو بے وقوفوں کا ظہور ہوتا۔

شعراء کے شعور کی تائید میں ایک لطیف اور نتیجہ خیز حکایت یاد آگئی۔ سنئے! اور شاعر کے شعور کی داد دیجئے۔

ایک شاعرِ عز احسن کی ذہانت و ذکاوت کا تمام دنیا میں غلغلہ تھا، اپنی مسلمہ فضیلت کے لحاظ سے مستند مانا جاتا تھا۔ مگر اسی کے ساتھ وہ اپنی خباثتِ نفس، رذالتِ طبع، اور بد اعمالیوں میں بھی شہرۂ آفاق تھا۔ اُس کی عمر کا پورا زمانہ رندانہ صحبتوں میں گزرا، اور سارا عہد پیمانہ و ساغر کی نذر ہوا۔ عمرِ طبعی کو پہونچ کر دنیا سے رخصت ہوا۔ ظاہر بین نگاہوں کو ایسے عصیاں شعار کا ٹھکانا، دوزخ کے سوا اور کہاں نظر آسکتا تھا۔ مگر خلافِ توقع اس کے ایک دوست نے خواب میں دیکھا کہ وہ جنّت کے بہتر سے بہترین کاخ میں رونق افروز ہے۔ دوست یہ دیکھکر بہت متحیر ہوا اور شاعرِ مرحوم سے پوچھا کہ یہ مرتبہ کس طرح ہاتھ آیا۔ شاعر ہنسا اور کہنے لگا۔ کہ جب تم لوگ مجھ کو ہزاروں من مٹّی میں دبا کر تنہا چھوڑ گئے تو ذرا دیر بعد وہ دو فرشتے آتشیں گرز لئے ہوئے میری قبر میں نازل ہوئے جن کی شان میں کبھی میں نے یہ شعر کہا تھا۔

نہ باز آئیں گے مرقد میں نکیرین اپنی کرنی سے ✤ کہ بن آئی ہے آج اُنکی وہ دو ہیں میں اکیلا ہوں

یہ تقریر یکم اگست کو نشر کی گئی تھی۔

۔معلوم یہ شعر اُنھوں نے میرے اعمال نامے میں، جو کراماً کاتبین کے پاس امانتہً رہتا تھا، دیکھ لیا، یا شیطان الرجیم کی غمازی سے اُنھیں اس کا علم ہو گیا، غرض کچھ ہوا ہو، جب اُنھوں نے میرے مرنے کی خبر پائی تو جوشِ انتقام سے بے قابو ہو کر تہیہ کر لیا کہ اس نابکار کو جی کھول کر تنگ کیا جائے گا۔ اس غرض اور تکبر کا جذبہ لئے ہوئے وہ میری قبر میں آئے اور آتے ہی مَنْ رَّبُّکَ وَ مَنْ دِیْنُکَ کے بندھے ٹکے سوال کرنے لگے۔ قادرِ مطلق نے مجھے بھی اُس وقت ایسی جرأت وہمت عطا کی کہ میں اس پوچھ گچھ پر ذرا بھی نہ جھجکا۔ اور بے دھڑک جواب دیا۔ کہ تم بچوں کے سے سوال مجھ سے کیا کرتے ہو۔ میرا رب وہی ہے جس نے تم کو میرے پاس بھیجا ہے۔ اور میرا دین اسلام ہے۔ یہ جواب پا کر وہ بہت سٹ پٹاتے ہوئے چلے گئے۔ اور اللہ میاں کے سامنے گڑگڑائے اور کہا کہ تو علیم و دانا ہے۔ فلاں بندہ جس نے دنیا میں بُرائی کے سوا کوئی بھلائی نہیں کی، وہ مر چکا ہے۔ ہم اُس کی قبر میں اپنا فرض ادا کرنے کے لئے گئے تھے۔ مقررہ سوالوں کے جواب اُس نے بالکل صحیح دئے ہیں۔ مگر واقعہ یہ ہے کہ اُس نے دنیا میں تیرے احکام کی ذرہ برابر بھی تعمیل نہیں کی۔ اب ہم پوچھنا چاہتے ہیں کہ اُس کے لئے کیا حکم ہوتا ہے۔ بارگاہِ الٰہی سے فرمان ہوا کہ پھر جاؤ اور اُس سے کہو کہ تو جھوٹا ہے۔ تیری عصیاں شعاری مسلم ہے۔ اور تو بڑی سے بڑی سزا کا سزاوار ہے۔ چنانچہ وہ فرشتے ہیبت ناک صورت بنائے ہوئے پھر آئے اور یہ قہاری حکم سنایا۔ مگر میں اُن کی غضبناکی سے ذرا بھی مرعوب نہیں ہوا، اور کہا کہ اگر میرے گناہ اور قصور مسلم اور ثابت ہیں تو اُن کے ثبوت کے لئے جب تک گواہ نہ لاؤ گے تمہارا کہنا ہرگز قابلِ تسلیم نہیں ہو سکتا۔ میرا یہ جواب سنکر وہ لاجواب ہوئے اور پھر احکم الحاکمین کی خدمت میں حاضر ہوئے اور میری تقریر دُہرائی۔ جبار و قہار کا ارشاد ہوا کہ پھر جاؤ اور اُس سے کہو کہ تیرے تمام اعضا تیری گنہگاری کے گواہ ہیں۔ وہ دوبارہ پھر آئے اور اس مرتبہ بہت زیادہ سختی سے پیش آئے۔ مگر میں اُن کے تنے ہوئے گرزوں اور چڑھے ہوئے تیوروں سے اب بھی نہیں دبا اور فوراً جواب دیا کہ تم جن کو میرے گناہوں کا گواہ بنا رہے ہو وہ سب تو میرے دشمن اور مدعی ہیں۔ یہ ہاتھ جن کو تم میرے خلاف اُٹھا رہے ہو ان کو میں نے ہمیشہ تکلیفیں دی ہیں سینکڑوں ہزاروں ضعیفوں، یتیموں، اور اپاہجوں کی مدد میں مصروف رکھا ہے۔ اور انھیں ہاتھوں سے کلام اللہ اور حدیثوں کے دفتر کے دفتر لکھے ہیں، اور تہجد کے نوافل سے عشا کے فرائض تک برابر ہزاروں تسبیحوں کے دانے دانے کو پہروں پھیرتا رہا ہوں۔ اسی طرح یہ پاؤں جنھیں تم میری مخالفت میں کھڑا کر رہے ہو، ان سے کبھی غلط راہ نہیں چلی ہے۔ عمر بھر آدھی رات تک گھنٹوں وقار و سکون کے ساتھ نمازیں پڑھی ہیں۔ جس سے اکثر یہ متورم رہا کئے ہیں، یہ آنکھیں کبھی بُری طرف نہیں اُٹھائیں۔ ان کانوں سے کبھی کوئی بُری بات نہیں سُنی۔ اس زبان سے کبھی کوئی گالی نہیں بکی۔ غرض کہ تمام اعضا نے زندگی بھر مجھ سے اذیتیں پائی ہیں۔ اُن کی گواہی میرے موافق کب ہو سکتی ہے، کیونکہ یہ سب تو میرے مدعی ہیں اور بقولِ مشہور

باطل است آنچہ مدعی گوید

ایسے مدعیوں کے علاوہ ایسے گواہ لاؤ جو بالکل بے لاگ ہوں اور کسی مخالف جذبے کے ماتحت نہ ہوں۔ میری اِن گرفتوں سے معصوم فرشتے ایسے گھبرائے کہ بے کچھ کہے سنے چلے گئے، اور دربارِ خداوندی میں پہونچ کر ساری رُوداد سُنائی۔ وہاں سے حکم ہوا کہ پھر جاؤ اور اُس جھوٹے باتونی سے کہو کہ تو غلط بکتا ہے۔ تیرے گناہوں کا شاہد خود خدا ہے۔ یہ فرمان پا کر وہ دونوں فرشتے تیسری بار جس جھلاہٹ اور جھنجھلاہٹ کے ساتھ آئے اُس کا اظہار الفاظ میں نہیں ہو سکتا۔ خلاصہ یہ کہ وہ بھرے ہوئے تھے کہ آتے ہی گرزوں کے دو ایک ہاتھ چاروں طرف اس طرح جھاڑے کہ مجھے فشارِ قبر کا دھوکا ہونے لگا۔ نہایت تیزی اور بے حد برہمی کے تیور دکھا کر کہنے لگے کہ او جھوٹے مکار، اب بتا کیا کہتا ہے، تیری بے انتہا خطاؤں، تیرے بے شمار قصوروں کا گواہ اور شاہد خود خدائے ذوالجلال ہے۔ کیا اس کے بعد بھی تیرے جرموں کے ثبوت میں کسی شہادت کی ضرورت باقی ہے۔

سچ کہتا ہوں کہ فرشتوں کے پیش کئے ہوئے اس آخری ثبوت سے میں گھبرا گیا، اور ایک آن کے لئے ہوش و حواس پراگندہ ہو گئے۔ مگر معاً قدرتِ خدا سے میری ذہانت و ذکاوت نے مدد کی، اور ایسا برجستہ جواب خیال میں آیا کہ بیڑا پار ہو گیا۔ میں نے بہت نرمی اور سنجیدگی سے کہا کہ واقعی یہ شہادت ثبوت کے لئے بڑی اہم اور ناقابلِ انکار ہے۔ لیکن اُسی خدائے عادل و منصف نے اپنے رسولِ مقبول کی معرفت اپنے بندوں کے لئے جو قانونِ شریعت بھیجا ہے اور جس کی پابندی بندوں پر لازمی ہے، وہ یہ ہے کہ کوئی دعویٰ ثابت نہیں ہو سکتا، جب تک ایک حیثیت کے دو گواہ

پیش نہ کئے جائیں۔ لہٰذا دوسرا گواہ ایسا ہی اور لاؤ جو خدائے برتر کی تمام صفات کے ساتھ وحدہٗ لاشریک بھی ہو۔ جب تک ایسا دوسرا گواہ نہ لاؤ گے، قانونِ شریعت کے مطابق میری گناہ گاری اور سیہ کاری کا دعویٰ ثابت نہیں ہو سکتا۔ اس کا جواب الجواب ناممکن تھا۔ نہایت پریشان اور بغایت پشیمان ہو کر فرشتے غائب ہو گئے، اور بارگاہِ رحمت میں اس عاجز و بےکس کا ماجرا بیان کیا۔ ارشاد ہوا کہ کیوں تم نے میرے گندے بندے کے شعور و شعار کا اندازہ کیا۔ اور اپنے غرور و پندار کا نتیجہ دیکھا، جو اُس کی بازپرس کو جاتے وقت تم نے اپنے دلوں میں جما لیا تھا۔ جاؤ اور اُس کو بہشتِ بریں کے بہترین محل میں داخل کر دو۔

اس تمثیلی حکایت کے تخئیلی مفروضات پر نظر نہ ڈالئے بلکہ نتیجے کو دیکھئے۔ جس سے ایک ذی شعور اور بلند شعار شاعر کی ذہانت و ذکاوت کا ادنیٰ ثبوت ملتا ہے۔

"بد اچھا بدنام بُرا" یہ مثل سیاسیات میں پولس پر، اور ادبیات میں شاعری پر جتنی چسپاں ہوتی ہے اور کسی شعبے پر نہیں ہوتی۔ لیکن انصاف کیا جائے تو جس طرح پولس کی ضرورت تحفظِ مخلوق کے لئے از روئے سیاست ضروری ہے۔ اسی طرح شاعری کی ضرورت از روئے قواعدِ تنظیم ادب کے لئے لازمی ہے۔

عقل خدا کی دی ہوئی ایک بے بہا نعمت ہے۔ مگر بہت لوگ اس کو مکر و فریب اور شر و فساد میں استعمال کرتے ہیں۔ اسی طرح شجاعت ایک عطیۂ الٰہی ہے۔ گو بعض اوقات وہ قتل و غارت اور رہزنی میں صرف کی جاتی ہے، تو کیا اس سے عقل کی شرافت اور شجاعت کی فضیلت میں کچھ فرق آ سکتا ہے، ہرگز نہیں۔ اسی طرح ملکۂ شعر کسی کے بُرے استعمال سے بُرا نہیں ٹھہر سکتا۔

شاعر کو مصورِ کائنات اور ترجمانِ حقیقت کے موزوں و مناسب القاب دئے گئے ہیں۔ مگر کائنات اور اُس کی حقیقت پر نظر ڈالی جائے تو معلوم ہو گا کہ اُس میں مختلف مذاق، مختلف مزاج کے لوگ شامل ہیں۔ اور یہ رات دن کا مظاہرہ و مشاہدہ ہے کہ بازار میں جس چیز کی مانگ ہوتی ہے اُسی قسم کی جنس لائی جاتی ہے۔ جاڑوں میں برف کی دوکان کھول کر بیٹھ جانا، اور گرمیوں میں شال دوشالے لئے پھرنا اُلٹی گنگا بہانا ہے۔ جب شاعر کو مصورِ کائنات کہا جاتا ہے تو یقیناً سوسائٹی کے جس قدر خیالات۔ اُس کی رائیں۔ اُس کی عادتیں۔ اُس کی رغبتیں اور اُس کا مذاق بدلتا جائے گا، اُسی قدر شعرا کی حالت بدلتی رہے گی۔ اور یہ تبدیلی بالکل نامعلوم طریقے سے ہوتی ہے۔ کیونکہ سوسائٹی کی حالت دیکھکر شاعر قصداً اپنا رنگ نہیں بدلتا۔ بلکہ سماج کے ساتھ خود بخود بدلتا رہتا ہے۔

عُبید زاکانی ایک مشہور ہزل گو کا نام ہے۔ یہ شخص بہت سے علوم و فنون کا ماہر تھا، اُس نے ایک کتاب فلسفۂ عزیمت پر لکھی، اور اُسے لے کر شیراز پہنچا جب شاہ ابواسحاق انجو کے دربار میں جانا چاہا تو معلوم ہوا کہ بادشاہ مسخروں میں مشغول ہے کسی سے ملنے کی فرصت نہیں۔ عُبید نے کہا کہ اگر مسخرگی سے بادشاہ کی قربت حاصل ہو سکتی ہے تو علم حاصل کرنا فضول ہے۔ اُسی روز سے اُس نے ہزل گوئی اختیار کی اور اس میں ایسا مشہور ہوا کہ آج اُس کی بیشمار فضیلتوں کو کوئی جانتا بھی نہیں۔

شاعر اپنے ملک اور اپنی قوم کا نمائندہ ہے۔ ایک شاعر کے وجود سے تمام ہم عصروں اور ہم جنسوں کا حال معلوم ہو سکتا ہے۔ شاعر کے بیان میں خدا نے وہ تاثیر بخشی ہے کہ اِدھر اُس کے مُنھ سے ایک موزوں بات نکلی، اُدھر سارے جہان میں پھیل گئی۔ شاعر نے بڑے بڑے نازک موقعوں پر اپنی رسائی فکر اور طباعی سے اہم کاموں کو باتوں باتوں میں خوش اسلوبی سے طے کر دیا ہے۔

نادرشاہی، ہنگامۂ قتلِ عام، محمد شاہی عہد کا مشہور سانحہ ہے، کہ جب سنہری مسجد میں بیٹھکر جھوٹی افواہ پر اُس نے ہزاروں بے قصور انسانوں اور معصوم جانوں کو خاک و خون میں ملوا دیا تھا۔ اس ہنگامے کے فرو کرنے کی تدبیر نظر نہیں آتی تھی کسی کی جرأت نہیں ہوتی تھی کہ نادر کے سامنے لب ہلا سکے۔ بمشکل تمام نظام الملک نے ہمت باندھی اور سامنے پہنچا۔ مگر سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کس طرح بات شروع کی جائے، آخر ذہن کی رسائی اس آڑے وقت میں کام آئی اور اُس نے ایک شعر کی یاد دلائی۔ آگے بڑھا اور بے ساختہ یہ شعر پڑھا۔

کسے نماند کہ اورا بہ تیغ ناز کشی
مگر کہ زندہ کنی خلق را و باز کشی

یہ شعر کڑی کمان کے تیر کی طرح دہان سے نکلا، اور ٹھیک نشانے پر جا بیٹھا، نادر یہ برجستہ شعر سن کر اُٹھ کھڑا ہوا اور قتلِ عام بند ہو گیا۔ ان تخئیلی جوابوں کے بعد تحقیقی جواب یہ ہے کہ شاعر کے دم قدم سے تمام علوم و فنون کی ترتیب و تنظیم جس عمدہ سلیقے اور بہتر طریقے سے قائم ہوئی ہے، ایسی کامل جامعیت کسی دوسرے منتظم یا مرتب کے نصیب میں نہیں آئی۔ اگر ادب اور لٹریچر سے قوموں کا بننا بگڑنا وابستہ ہے تو یہ کام صرف شاعر کا ہے کہ وہ ادب اور لٹریچر کو اس قابل بناتا ہے، جو بازاری اور پہاڑی خود رو بولیوں سے بڑھکر علمی اور ادبی لٹریچر

بن سکے۔ تحفظِ زبان کی اہم خدمت شاعری نے انجام دی ہے اور ہمیشہ دیتا رہے گا۔ اگر شاعر نہ ہوتا تو آج ہماری ہندوستانی اردو زبان دو تین سو برس پہلے کی نظم کا تمسخر آفریں نمونہ ہوتی۔ جس کی دو چار مثالیں سنئے:۔ مرزا رفیع سودا لکھتے ہیں:۔

"مضمون سینے میں بیش از مرغ اسیر نہیں کہ ہو بیچ قفس کے، جس وقت
زبان پر آیا فریاد ہے واسطے گوشِ دادرس کے"

انشاء اللہ خاں کی گفتگو یہ ہے۔

"ابتدائے سنِ صبا سے تا اوائلِ ریعان اور اوائلِ ریعان سے الی الآن اشتیاقِ مالا یطاق تقبیلِ عتبۂ عالیہ نہ بجنسہ تھا کہ سلکِ تحریر و تقریر میں منتظم ہو سکے۔ لہٰذا بے واسطہ و وسیلہ حاضر ہوا ہوں"

ان نثروں سے پہلے کی نظم سنیئے۔

گر بعینۂ زاغ کسے در زیرِ سیمرغے نہد
از اصلِ خود ناید بروں آخر گلیلا ہوئے پر

ایک اور صاحب فرماتے ہیں:۔

ہمنا تم کو دل دیا تم دل لیا اور دکھ دیا | ہم یہ کیا تم وہ کیا ایسی بھلی یہ پیت ہے
سعدی کہ گفتہ ریختہ، در ریختہ، دُر، ریختہ | شیر و شکر آمیختہ ہم شعر ہے ہم گیت ہے

ان پرانے تبرکات کے مقابل میں ذیل کے تکلماتِ شعری دیکھیئے، اور انصاف کیجیے کہ یہ صفائی۔ یہ دل کشی۔ یہ ترکیب اور یہ طرزِ ادا کس کی کاوشوں اور کاہشوں سے پیدا ہوئی۔ اگر شاعر نہ ہوتا تو کیا نظم، نثر سے بہتر ہو سکتی تھی، اور کیا ایسے نمونے مل سکتے تھے۔

تھمتے تھمتے تھمیں گے آنسو | رونا ہے یہ، کچھ ہنسی نہیں ہے
در پہ بیٹھے ہیں ترے بے زنجیر | یہ عجب طرح کی پابندی ہے
ابھی پامال کر گیا ہے مجھے | وہ جو دامن اٹھائے جاتا ہے

ترے کوچے ہر بہانے ہمیں دن سے رات کرنا
کبھی اس سے بات کرنا کبھی اُس سے بات کرنا

دمِ نزع آخر نکل آئے آنسو | کہاں جا کے چوکے وفا کرنے والے

شاعری، انسان اور فطرت کی تصویر ہے اور شاعر ایک ایسی طبیعت رکھتا ہے جو غائب سے، بالکل اُسی طرح متاثر ہوتی ہے، جس طرح کہ حاضر سے۔ شاعر ایک ایسا انسان ہے، جس کو زندہ احساس۔ جوش۔ لطافت، فطرتِ انسانی کا علم۔ اور وسعتِ دل، اُسی مقدار سے جو عام بنی نوعِ انسان میں مشترک خیال کی جاتی ہے۔ بدرجہا زیادہ بخشی گئی ہے۔

شاعری کو انسانی زندگی سے اس طرح وابستہ سمجھنا چاہیئے، جس طرح ناخن کو گوشت سے۔ حنا کو رنگ سے۔ اور نگاہ کو اچھی شکل سے۔

بالآخر بطورِ نتیجۂ کلام کہا جاتا ہے کہ اگر دنیا میں شاعر نہ ہوتا تو خدا کی خدائی نہ ہوتی، اور جب خدا کی خدائی نہ ہوتی تو خدا ہی خدا ہوتا۔

نہ تھا کچھ تو خدا تھا، کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا
ڈبویا مجھکو ہونے نے نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا

(والسلام)

صدموں میں سجائے نالہ ہائے خوں بار
جیسے ہی کہ لب ہوئے تبسم سے دوچار
کھنچی ہوئی دوڑی مری جانب یہ خبر
کس بات پہ مسکرا رہے تھے سرکار؟
جوش

خواہش کا فریب کار نکلا وہ بھی
بے غرضِ احسان شعار نکلا وہ بھی
انساں کے ارادے کو کیا جب تحلیل
اک نوع کا اضطرار نکلا وہ بھی
جوش

غالب کی توہین

شاد قدوائی

ہر بوالہوس نے شعر پرستی "شعار کی
آبروئے شیوۂ اہلِ ہنر گئی

نومبر ۳۵ء کے رسالہ کنول آگرہ میں جناب عطاء اللہ پالوی نے ایک مضمون سپردِ قلم فرمایا ہے جس میں غالب اور سیماب کے کلام کا موازنہ کرکے یہ ثابت کرنے کی فضول سعی فرمائی ہے کہ "خدائے سخن" "نجم الدولہ" دبیر الملک مرزا غالب مرحوم کے صحیح جانشین مولانا سیماب اکبر آبادی ہیں۔

اس لاحاصل اور پریشان کن کوشش کہ مرزا غالب کے اشعار مطالعہ کرلینے اور سمجھنے کے بعد خواہ مخواہ مولینا سیماب کے اشعار "کنول" کے پورے پندرہ صفحات پر دعوتِ مطالعہ دیتے ہیں۔ مگر حق تو یہ ہے کہ کہاں مرزا کا وہ فلسفہ۔ رفعتِ تخیل۔ کہاں سوز و گدازِ عشق۔ معاملہ بندی۔ کہاں بلند نظری، اور پھر بندش ایسی کہ اگر ایک لفظ کا ہیر پھیر کیا جائے، شعر کا لطف جاتا رہے۔

ایڈیٹر صاحب کنول نے سچ کہا ہے کہ بیشتر اشعار کے متضاد و مختلف الفاظ و مطالب میں یکسانی پیدا کرنے کی جو کوشش کی گئی ہے، وہ کامیاب نہیں۔ ایک ہی ردیف و قافیہ کے اکثر اشعار میں مولانا سیماب کا مفہوم کچھ اور ہے، اور مرزا غالب کا کچھ اور۔ دکھانا صرف یہ تھا کہ ایک ہی ردیف و قافیہ میں دونوں استادانِ فن نے کس قسم کے خیالات کی ترجمانی کی ہے۔

اگر محض ہم ردیف و ہم قافیہ اشعار کو یکجا کردینے کے بعد جناب پالوی اُن کی تشریح خود نہ فرماتے تو قارئین کو اشعار کے موازنے میں زیادہ آسانی ہوتی۔ "دو مختلف الگ الگ زمانوں کے دو شعرا کا موازنہ فنِ شعری و حسنِ خیال کے لحاظ سے کسی طرح نہیں کیا جاسکتا۔ البتہ رنگِ تغزل اور اسلوبِ بیان کے لحاظ سے ممکن ہے"

اب جس کی نسبت خود ایڈیٹر کنول کی رائے یہ ہے وہ بھلا کہاں تک قبولِ عام حاصل کرسکتی ہے۔ میرے خیال میں اس کے اظہار کے لئے کنول کے صفحے کے صفحے سیاہ کرنا بلند نظر اور پایہ شناس حضرات کے دلوں میں اپنی اور اپنے ممدوح کی طرف سے اور بھی نفرت کا جذبہ پھیلانا ہے۔ جنابِ سیماب کی استادی کا سکہ منوانے کے بجائے اُن کی شہرت و آبرو کو گنوانا ہے۔ "آگرہ اسکول" زمانہ سے خصوصاً دنیائے ادب سے بالاتر اُمیدیں قائم کرتا ہے، جو ناممکنات میں سے ہیں۔ یہ خیال کبھی بھی دل میں نہ لانا چاہیئے کہ "آگرہ اسکول" محض پروپیگنڈے کی بنا پر اپنا سکہ جما کر رہیگا۔ وقت خود اس کا ذمہ دار ہے، اور سب سے بڑا منصف ہے۔ جس حد تک جو کوئی قابلِ قدر ہے اتنی اُس کی قدر ہوگی۔ "زمانہ خود اُسے ہاتھوں ہاتھ لے گا اور خاطر خواہ داد دے گا۔" "آگرہ اسکول" یہ نہیں سمجھتا کہ ادبی محتسب بھی اپنے فرائض سے غافل نہیں ہیں۔ ایڈیٹر صاحب کنول نے اپنے والد بزرگوار مولانا سیماب کی حمایت میں صفحے کے صفحے فضول

بحث میں پڑکر سیاہ کر دیئے۔ بہتر تھا کہ یہ موازنہ کسی دوسرے رسالہ میں شائع ہوتا جس سے ایڈیٹر کنول پر طرفداری کا الزام عاید نہ ہوتا۔

مولانا سیماب کو مرزا غالب کا جانشین قرار دینے کی اُپچ میں جناب پالوی نے علامہ اقبال کو بھی نظر انداز کر دیا ہے جس کا فلسفہ خیالات کی بلند آہنگی۔ جذبات کی لطافت۔ سوز و گداز۔ زورِ کلام۔ الفاظ کی برجستگی۔ اندازِ بیان کی مدبرانہ موزونیت وغیرہ مسلم اور ان تمام محاسن کا شہرہ ہندوستان سے نکلکر یورپ و ایران، اٹلی، یونان تک جا پہنچا ہے۔ علامہ اقبال کا اندازِ بیان مرزا غالب کی پیروی میں فلسفیانہ ہے وہ ہر شے کو اسی نظر سے دیکھتے ہیں۔ طلوعِ صبح کا ذکر ہو یا شفقِ شام کا، کوہسار کا منظر ہو یا سبزہ زار کا۔ موسم بہار کا تذکرہ ہو یا خزاں کا کشمکشِ زیست کا سوال ہو یا افسردگیٔ مرگ کا۔ وہ اِن چیزوں کو دیکھتے ہیں اور اُن میں محو ہو کر حقیقت کی تہ تک پہنچنا چاہتے ہیں۔ اربابِ شعر و ادبائے ملک کی رائے صحیح ہے کہ اقبال مرزا غالب کے رنگ میں پچھتر فیصدی کامیاب اور اُن کے مقابلے میں مولینا سیماب[1] پچیس فیصدی سے زیادہ نہیں۔ قارئین کرام پر واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ یہ میری ذاتی رائے نہیں بلکہ دَورِ حاضرہ کے تمام اہلِ ذوق کی رائے ہے۔ پس اگر مرزا غالب کا کوئی جانشین ہو سکتا ہے تو وہ اقبال ہے۔ مرزا غالب اردو اور فارسی دونوں زبانوں کے ماہر شاعر تھے۔ غالب کو زیادہ مرغوب فارسی زبان تھی۔ اُسی طرح اقبال کو بھی زیادہ مرغوب فارسی زبان ہے، اور اُن کی تصنیفات شاہد ہیں کہ وہ فارسی ادب کی شاعری کے دامن پر بیش بہا موتی بکھیر رہے ہیں۔

مرزا غالب نے عودِ ہندی۔ دیوانِ اردو۔ اُردوئے معلّٰی لکھکر ادب اُردو پر احسانِ عظیم کیا ہے۔ جن سے اربابِ فن آج تک فیضیاب ہو رہے ہیں۔ طالبانِ ذوقِ تفنی کے انہی چند چھوٹے موٹے مجموعوں سے استفادہ کرتے رہے ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ دورِ حاضرہ کے تمام کی نظم و نثر میں ادبِ عالیہ غالب کے نظم سے مضامین سے متاثر نظر آتے ہیں۔ اور خود مولانا سیماب بھی ان کی تصانیف اردو جن کی تعداد ۲۸۴[2] بقول پالوی صاحب ہے

تو میں یہ کہنے کی جرأت کروں گا کہ سب میں رنگِ غالب پیدا کرنے کی کوشش کی گئی۔ تاہم کامیابی نہ ہو سکی۔ جب پوری تسلی نہ ہو سکی تو ایک ایک غزل کے دو دو تین تین اشعار لکھکر موازنہ کیا جاتا ہے۔ مگر سچ تو یہ ہے کہ پھر بھی وہ بات پیدا نہ ہوئی جو مرزا کے کلام میں ہے۔ حق یہ ہے کہ یہ مرزا غالب ہی کا حصہ اور اُنہی کا کام تھا۔ مرزا کے بعد بہت سے شعراء اور بزعمِ خود اُستادانِ فن "مثلاً یاس یگانہ لکھنوی نے اپنی اپنی استادی اور جانشینی کی بڑ ہانکی، مرزا غالب پر فضول اعتراضات بھی کئے۔ مگر زمانہ کے ہاتھوں منہ کی کھائی۔

میری رائے میں مرزا جیسے استادِ فن کی غزلوں پر غزلیں اور شعر پر شعر لکھنا مرزا کی توہین اور اُن کی پاکیزہ روح کو اذیت پہنچانا ہے۔ جانشینی کا دعویٰ تو الگ رہا۔ اور ممکن ہے کہ ایک شاگرد کسی شعر میں مشق کرتے کرتے اُستاد سے بڑھ جائے۔ اُس کی یہ معنی نہیں ہو سکتے کہ شاگرد اُستاد سے "بہتر رنگ" بڑھ گیا ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہو سکتا، زبردستی اپنے اُستاد کو اپنے سامنے زانوئے ادب تہ کرائے۔ یا اپنے اُستاد کی ہمسری اور جانشینی کا دعوے کرنے۔ بلکہ خوش قسمتی سے اگر کوئی خوبی ایسی پیدا ہو جائے کہ شاگرد اپنے اُستاد سے بہتر و نمایاں قابلیت کا ثبوت دے، اور یہ بات اربابِ جہاں پر روشن ہو جائے تو تب بھی ہمسری کا دعویٰ زیبا نہیں۔ بلکہ یہ عین اُس کا فیضانِ خاص سمجھنا چاہیئے۔

یہ چیز قابلِ لحاظ ہے کہ نئی زمین تیار کر کے اُس میں بیل بُوٹے اُگانا نہایت مشکل ہے۔ بہ نسبت اس کے کہ زمین بھی تیار ہو اور بیج بھی مہیا ہو اور معمولی سی محنت سے شاخوں اور پھولوں کو پیدا کر لیا جائے۔

جناب پالوی خود معترف ہیں کہ اِس دَور کے مشہور شعراء میں اقبال کا نام سب سے روشن ہے۔ اور اُس کی یہ شہرت صرف ہندوستان ہی تک محدود نہیں۔ بلکہ دنیا کے ہر گوشے میں پہنچ چکی ہے۔ اور جب ہم اس شہرت کی اصل وجہ پر غور کرتے ہیں تو ہمیں صرف اُن کا فلسفہ یا اُن کی فارسی شاعری باعثِ شہرت معلوم ہوتی ہے۔ یورپ و ایران اگر دلدادہ

---

[1] پانچ فیصدی بھی نہیں۔ میرے خیال میں غالبِ اعظم کے ساتھ سیماب کا ذکر کرنا ذہنِ انسانی کی سب سے بڑی بے بہری اور دنائت ہے۔ (ساحر)

[2] یہ غلط ہے۔ مولانا سیماب کی تصانیف ۸۴ بھی نہیں ہیں مشکل سے دس بیس کتابوں کے مصنف ہوں گے۔ جن میں زمانہ لبستہ مقتم کی پرائمری تصنیفات بھی شامل ہیں۔ "س"

تو صرف اُن کی فارسی تصنیفات اور فارسی کلام کے، اقبال خود (غالب کی طرح) فارسی کو ترجیح دیتے ہیں۔ اور اردو کلام میں بیشمار فارسی ترکیبیں، اور فارسی مصرعے استعمال کرتے ہیں۔ اور اُن پر جو "غالبیت" چھائی رہتی ہے اُس کا تو پوچھنا ہی کیا۔ اب آیئے سیماب صاحب کی طرف ان کی تصنیفات پر جن کی تعداد ۲۸۴ ہے جب ہم نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں کل کی کل اُردو میں نظر آتی ہیں، اور جو کلام متفرق رسالوں میں نظر آتا ہے وہ بھی تقریباً سب اُردو ہی میں ہوتا ہے، سو پچاس اشعار فارسی کے بھی ہوں تو وہ نفی کے برابر ہیں۔ اس لئے نتیجہ یہ نکلا کہ فارسی (اور اُردو) شاعری میں غالب کا صحیح جانشین اقبال ہے۔"

آگے چل کر جناب پالوی جب مولینا سیماب سے اُردو شاعری میں غالب کی جانشینی کی نسبت سوال کرتے ہیں تو مولانا کے لبوں پر ایک شعر تھرک کر رہ جاتا ہے ؎

ستاسی سال بعد ہے تخلیق غالب کی
یہی وقفہ ہے میری اور غالب کی ولادت میں

مولینا سیماب کا یہ شعر اس بات کی دلیل نہیں ہوسکتا کہ واقعی مولانا سیماب غالب کے جانشین ہیں۔ جب دو شاعروں کے اوصاف الگ۔ شاعری الگ۔ خیالات و زبان الگ۔ زمانے مختلف۔ اُن کے تخیلات میں زمین و آسمان کا فرق۔ نیک و بد میں تمیز کی قوت جدا جدا ہے، تو کیونکر ایک دوسرے کا جانشین یا ہم پلہ قرار دیا جاسکتا ہے۔

اس کے بعد جناب پالوی نے اقبال کے وہ الفاظ نقل کئے ہیں، جو مولینا سیماب کی تصنیف "کارِامروز" میں تبصرہ کے طور پر چھپے ہیں اور جن سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ سیماب واقعی غالب کے جانشین ہیں۔ مگر جناب پالوی یہ نہ سمجھے کہ اقبال نے مرزا غالب سے مولینا کا صرف استفادہ ظاہر کیا اور مولینا سیماب کی حوصلہ افزائی کی ہے۔ پالوی صاحب اس کے بعد کے وہ الفاظ قصداً نظر انداز کر گئے ہیں جو بجنسہٖ درج ذیل ہیں۔

"لیکن سیماب جہاں اپنے اسلوبِ بیان اور انتخابِ الفاظ میں غالب کے انداز پر چلے ہیں وہاں مضمون آفرینیوں میں اُنھوں نے اکثر جگہ اقبال کی ہمنوائی کی ہے۔ یہ اشتراکِ تخیل اس وجہ سے ہے کہ دونوں کی طبیعت فلسفہ کی طرف مائل ہے اور دونوں غالب کی شاعری سے متاثر ہیں۔ "کارِامروز" کی متعدد نظموں میں صاف اقبال جھلک رہا ہے۔ اِن میں نوائے تجدید۔ شعلۂ احساس صبح محبت۔ شادی۔ میری ہستی۔ حُسن کو دعوتِ سکون۔ خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔"[لہ]

اب اس امر کا فیصلہ آسان ہے کہ مولینا سیماب کے کلام میں اقبال اور غالب کا رنگ ہے یا نہیں، پھر مرزا غالب کے صحیح جانشین حضرت اقبال ہوسکتے ہیں یا مولانا سیماب۔

جانشینی ایک الگ چیز ہے۔ اہلیت اور قابلیت بلحاظِ زمانہ الگ چیز ہے۔ ایک لائق بزرگِ کامل کا نااہل پیرو کبھی جانشین نہیں ہوسکتا۔ ایک نالائق بیٹا بھی اپنے لائق باپ کی جانشینی کا اہل نہیں ہوسکتا۔ مرزا غالب مرحوم یکتائے روز تھا۔ اُنھوں نے آج سے ایک صدی پہلے دامنِ ادب پر وہ آبدار موتی اور وہ لعلِ بے بہا بکھیرے ہیں جن کو دیکھکر اہلِ ذوق کی آنکھیں خیرہ ہوگئیں۔ اور اب سے تا ابد غالب کے رنگ و اسلوبِ بیان کو مشعلِ راہ بنا کر قصر الادب کی بلندیوں پر پہنچیں گے اور "خدائے سخن" کی بارگاہِ ادب میں باریابی حاصل کریں گے۔ مرزا غالب نے اُس وقت وہ چیزیں لکھیں جو اُس وقت اور کوئی لکھنا نہ جانتا تھا۔ مرزا غالب کی معنی آفرینیاں، درد کے ساتھ شوخی۔ حُسنِ بیان۔ عوام سے بچ کر ہر بات کہنا، سادہ کلام میں سادگی کا کمال مگر معنی بلند۔ لطافتِ خیال۔ فلسفہ۔ ندرتِ بیان وغیرہ کو سامنے رکھکر اگر آج تقریباً ایک صدی بعد مرزا غالب کے ایک "عقیدتمند" مولانا سیماب اکبرآبادی اگر اُنھیں خیالات و مضامین کا چربہ اتارنا چاہتے ہیں۔ اور پھر بھی ناکام رہتے ہیں تو میرے خیال میں اُن کو جانشینی کے دعوے کا کوئی حق نہیں۔ خاصکر ایسی صورت میں جب کہ کلام میں زمین و آسمان کا فرق ہے، اور یہ گمانِ سیماب۔

"چندے بتصرف" ؎

داغ و میر و میرزا کی کچھ بڑھا دی عمر اور "میں نے" اس انداز سے آغازِ افسانہ کیا

ذیل کے اشعار جنابِ پالوی نے جنابِ نقوی بی اے کے نقل کئے

[لہ] یہاں مضمون نگار کو غلط فہمی ہوئی ہے "کارِامروز" کا دیباچہ پروفیسر اقبال نے تحریر فرمایا ہے نہ علامہ اقبال مرحوم نے۔

ہیں، جو غالباً "سیمابی دنیا" میں ہونے کے باعث پاؔلوی صاحب کے ہمزبان ہو گئے ہیں۔ مگر واقعات اور حقائق سے ہٹ کر اندھا دھند تقلید اچھی نہیں ہوا کرتی۔ فرماتے ہیں :-

۱۔ تین شاعر سرزمینِ تاج سے پیدا ہوئے — میرؔ و غالبؔ مر چکے اس دَور میں سیمابؔ ہے
۲۔ ہو تناسخ کا جو قائل کیوں نہ کہدے بیدھڑک — میرؔ غالبؔ بن گیا تھا، غالبؔ اب سیمابؔ ہے

اللہ، اللہ!! یہ شعر غالباً "دیگر" برادرانِ وطن "کے قائل کرنے کے لئے سپردِ قلم کئے گئے ہیں ---------

میں اِس ضمن میں مولانا سیمابؔ کے دوست اور غالباً ہموطن محترم جناب مولانا حامد حسن صاحب قادری پروفیسر سینٹ جانسن کالج آگرہ کے مضمون "میرؔ۔ غالبؔ۔ اقبالؔ" مطبوعہ نیرنگِ خیال اقبالؔ نمبر کا تھوڑا سا اقتباس کے طور پر درج کرتا ہوں۔ جس سے ثابت ہوتا ہے کہ تخلیقِ اقبالؔ میں قدرت نے میرؔ و غالبؔ دونوں کو ایک کر دیا۔ فرماتے ہیں۔

"انگلستان کے ایک مشہور شاعر ڈرائیڈن نے دوسرے زندۂ جاوید شاعر ملٹن کی تعریف میں تین شعر لکھے ہیں۔ تحسین کا پیرایہ بالکل جدید ہے اور حُسنِ تخیل کا نہایت حسین نمونہ۔ اُن کا ترجمہ درجِ ذیل ہے:"

ترجمہ: "تین بعید زمانوں میں تین شاعر یونان۔ اٹلی اور انگلستان میں پیدا ہوئے۔ پہلا رفعتِ تخیل میں سبقت لے گیا۔ دوسرا شوکت و شان میں، اور آخری دونوں میں قدرت اس پر اضافہ نہیں کر سکتی تھی۔ اِس لئے تیسرے کو بنانے کے لئے اِس نے پہلے دونوں کو ایک ذات میں جمع کر دیا:"

میں نے اس کی تقلید میں یہی طرزِ تحسین اختیار کیا ہے۔ اس کی نظر عرب و ایران کی شاعری پر نہ تھی۔ اس لئے تمام دنیائے شاعری میں سے تین شاعر منتخب کرنے ہیں۔ میرے لئے اتنی جسارت مشکل ہے۔ البتہ ہندوستان ہی کے تین اُردو شاعروں کا انتخاب کیا ہے۔ مجھے محاسنِ شاعری کے حصر میں اُن سے اختلاف ہے۔ میرے اشعار یہ ہیں :- قطعہ

تین شاعر مختلف اوقات میں پیدا ہوئے — جن کے فیضِ طبع نے اُردو کو گنج زر دیا
ایک اثر میں بڑھ گیا اک رفعتِ تخیل میں — تیسرے کی ذات میں دونوں کو حق نے بھر دیا
کائناتِ شاعری ہیں بس یہی دو نوں کمال — تیسرے میں اس نے دونوں کو یکجا کر دیا

اب بتائیے مولانا سیمابؔ کے ایک معصر فاضل پروفیسر صاحب اقبالؔ کو میرؔ و غالبؔ کا جانشین ٹھیرا رہے ہیں۔ اس بات میں اُن کے اور بہت سے اربابِ ذوق اُن کے ہمزبان ہیں ---------- پھر جناب پاؔلوی کی آواز کون سنتا ہے۔ کہ "نہیں میرؔ و غالبؔ کے جانشین مولانا سیمابؔ ہیں"

مرزا غالبؔ کی موجودہ شہرت بجا ہو یا بے جا۔ اِس سے بحث نہیں، لیکن یہ واقعہ ہے کہ ہندوستان کے اُردو شاعروں میں جو آوازۂ قبول غالبؔ کو نصیب ہوا۔ وہ اُس وقت تک کسی دوسرے شاعر کو نہ ہو سکا مشرق میں عام طور پر کسی کتاب یا تصنیف کی شہرت و مقبولیت کا اندازہ صرف اس سے کیا جاتا ہے کہ اُس کے کتنے ایڈیشن شائع ہوئے اور کتنی زبانوں پر اس کا نام جاری ہے۔ مغرب میں بھی اعتراف کی یہ صورت جزوِ مشترک کی حیثیت رکھتی ہے۔ لیکن چونکہ وہاں دولت ہے، علم ہے ذوق ہے، اور فنون کی ترقی اوجِ کمال کو پہنچ گئی ہے۔ اس لئے وہاں تنقید اور موازنے بھی بہت ہیں۔ اور اعترافِ کمال کی صورتیں بھی مختلف۔ ہم اگر کسی چیز کو پسند کرتے ہیں۔ تو اس کے حصول کی خواہش بھی قوت سے فعل میں نہیں آتی۔ اور وہاں اس کے حاصل کرنے کے لئے بازار مسابقت قائم ہو جاتا ہے۔ جس میں دولت و زَر کی نمائش سے زیادہ ذوق کا مظاہرہ ہوتا ہے، پھر یہ ہنگامہ اسی جگہ ختم نہیں ہو جاتا۔ بلکہ اس جوش کو متلاطم رکھنے کے لئے اور احساسِ اعتراف کو نمایاں کرنے کے لئے ہر شخص اپنے اپنے ذوق سے اس میں نئی نئی روح پھونکنا چاہتا ہے۔ یہاں تک کہ اگر ہر شخص کا نقطۂ خیال جدا اگانہ دیکھیں گے۔ تو آں کے مختلف مناظر آپ کے سامنے آ جائیں گے۔ ہر منظر آپ کو بجائے خود ایک مستقل چیز معلوم ہو گا، گویا وہ فانوسِ خیال ہے کہ ایک ہی شمع کو آغوش میں لئے ہوئے اپنی گردش سے ہر پہلو میں ایک جدید صورت پیش کر رہا ہے۔ یہاں کسی شاعر کے حُسنِ کلام کا انتہائی اعتراف وہ ہے جسے ہم زیادہ سے زیادہ "سر دھننا" سے تعبیر کرتے ہیں۔ لیکن وہاں کے اعتراف کی حقیر ترین صورت بھی "ہلچل مچا دینے" سے کم نہیں ہوتی۔ ہم اگر کسی اچھے شاعر کے دیوان کو دیکھیں گے تو زیادہ سے زیادہ دس پانچ مرتبہ سر کو جنبش دے کر رہ جائیں گے۔ لیکن وہاں ایک شعر مختلف مجلسوں میں پہونچ کر مختلف صورتیں اختیار کر لیتا ہے۔ مغنی اُسے گاتا ہے۔ رقاص اس پر رقص کرتا ہے۔ نقاش اُسے نقش کرتا ہے، اور

اس طرح گویا ایک داستان کے ٹکڑے ٹکڑے کرکے ہر ٹکڑے کو ایک مستقل داستان بنا دیتے ہیں۔ مثلاً خیام ہی کو لیجئے۔ ہر چند حافظ نے یہ شعر اپنے ہی لئے کہا تھا کہ ؎

زشعرِ حافظِ شیراز مے گویند و مے رقصند
سیہ چشمانِ کشمیری و ترکانِ سمرقندی

مگر وہ صادق آتا ہے خیام اور اہلِ مغرب پر جہاں خیام کا اعتراف "مے گویند و مے رقصند" کی منزل سے بھی آگے بڑھا ہوا نظر آتا ہے۔ مختصراً یوں سمجھئے کہ ہمارا اعترافِ حسن و کمال صرف "آہ" ہے اور اُن کا "واہ"۔

اِس میں شک نہیں کہ مغربی تعلیم، اور مغربی اصولِ تنقید کے مقابلے میں اپنی کمی کا احساس یہاں کے لوگوں میں بھی پیدا ہو گیا ہے۔ لیکن ابھی تک کوئی ایسی عملی تحریک پیدا نہ ہو سکی۔ جس پر ہم بجا طور پر "لقائے دوام" کے نظریہ سے عمل پیرا ہو سکیں۔ مرزا غالب کے دیوان کو یہاں ایک فلسفی نے دیکھا تو اُسے ایک "الہامی کتاب" کہہ دیا۔ ہر چند کہ یہ طفلانہ جسارت سے زیادہ نہیں تاہم ایک فلسفہ طراز کی جانب سے اعتراف کی صورت یہی ہو سکتی تھی۔ ایک صوفی نے جب یہاں اس کا مطالعہ کیا تو "مطالب الغالب" کو "فصوص الحکم" کا ہم پایہ قرار دیا۔ یقیناً یہ تقلید تنقید" "تنک ظرفیٔ منصور" سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتی۔ تاہم ایک متصوف اِس سے زیادہ اور کیا کہہ سکتا ہے۔ اِسی ضمن میں "پنجاب" کے ایک نوجوان نقاش جناب عبدالرحمٰن چغتائی اُٹھے اُنھوں نے اپنے موقلم سے "سخنہائے گفتنی" کی تشریح اور اپنے اعترافِ خلوص کو بعض خطوط و نقوش کی صورت میں پیش کیا۔ اہلِ جہاں کو مرزا غالب کے ساتھ اپنی دلی قدر و منزلت دکھادی۔ یہی اُن سے ممکن تھا۔ اور یہی اُن کا ایک بہت بڑا کارنامہ ہے۔

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ مولانا سیماب کے کلام میں کوئی ایک شعر بھی ایسا ہے جس کو نقش یا دوسری صورت میں لاکر ہندوستان میں یا بیرونِ ہند قدر و منزلت کی حد تک پہنچایا گیا ہو۔ اِس کا جواب یقیناً نفی میں ہے، تو پھر فرمائیے مولٰینا سیماب کس حد تک غالب کی جانشینی کے اہل ہیں اور جب کہ اُن کے کلام میں اور مرزا غالب کے کلام میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ میرے خیال میں مرزا غالب کے ساتھ سیماب کا تخلص لکھ کر بھی غالب ایسے "خدائے سخن" اور "استادِ فن کی بے ادبی کے جرم کا ارتکاب کرنا ہے۔ ع

چہ نسبت خاک را با عالمِ پاک!

قارئینِ کرام خاص کر "یوپی" حضرات مجھ پر الزام لگائیں گے کہ میں نے وطنیت کا حق ادا کرتے ہوئے حضرتِ اقبال کو غالب کا جانشین قرار دیا ہے۔ مگر یہ قطعی غلط ہے۔ غالب اُردو اور فارسی دونوں زبانوں کا ماہر شاعر تھا۔ بالکل اُسی طرح اقبال بھی دونوں زبانوں کا ماہر شاعر ہے۔ اقبال کے کلام میں بھی نمایاں طور پر وہی رنگ اور چیزیں ہیں جو غالب کے یہاں پائی جاتی ہیں۔ اور جب یہ بات پایۂ ثبوت کو پہونچ جاتی ہے تو اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ کہ غالب کے صحیح جانشین اقبال ہیں۔ اور اگر پھر بھی یہ الزام مجھ پر رہے، نیز حضرتِ اقبال اس معیار پر بھی پورے نہ اُتریں تو میں اُنھیں بھی نظر انداز کرتا ہوں، اور مرزا غالب کا جانشین ماننے سے الگ رہتا ہوں۔ "یوپی" کے ایک مشہور، سہارنپور کے ایک کہنہ مشق شاعر حضرت ابوالاحسان حکیم آزاد سہارنپوری کو غالب کا جائز جانشین تجویز کرتا ہوں جو اس وقت اپنی عمر کی چھیاسٹھویں منزل طے کر رہے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ وہ ایک خاموش اور گمنام زندگی بسر کرنے کے سبب زیادہ مشہور نہیں، پھر بھی اہلِ فن، زمانۂ حال کے ادبا و شعرا اُن کے کلام سے محظوظ ہوتے رہتے ہیں۔ وہ مولانا بیدل مرحوم اور حالی کے حلقۂ تلامذہ میں سے ہیں۔ اُن کا سلسلۂ شاعری دونوں واسطوں سے غالب مرحوم پر منتہی ہوتا ہے۔ ان کے کلام پر تنقید کرنا مجھ ایسے کم استعداد شخص کا کام نہیں۔ مگر قارئین کے سامنے پیش کرکے فیصلہ اُنھیں پر چھوڑتا ہوں۔

جب سے آنکھیں فائزِ انوارِ جاناں ہو گئیں ۔۔۔ سرمدی جلووں کی شمعیں دل میں تاباں ہو گئیں
اب کسی کی جستجوئیں فرض ہیں تا زیست فرض ۔۔۔ اب کسی کی آرزوئیں دین و ایماں ہو گئیں
لو وہ اُس مہرو نے قصدِ جلوہ آرائی کیا ۔۔۔ لو وہ عینی طلعتیں انوار افشاں ہو گئیں
اے خدا کی شان آخر تیری کافر کیشیاں ۔۔۔ اصلِ مہر و دیں بن گئیں، عینِ ہراماں ہو گئیں
پھر کوئی رشکِ چمن سیرِ گلستاں کو اُٹھا ۔۔۔ پھر گلستاں کی بہاریں گل بداماں ہو گئیں
چارہ سازِ زخمِ دل، درمانِ زخم اچھا کیا ۔۔۔ زخم کی سب لذتیں مجروحِ درماں ہو گئیں

غالب کی زمین میں آزاد کی یہ غزل سوز و گداز میں ڈوبی ہوئی ہے۔ دیگر اوصاف کے علاوہ دیکھنے کے قابل یہ بات ہے کہ اِس میں رنگِ غالب کس قدر جھلک رہا ہے۔ آپ اکثر رنگِ غالب میں اشعار کہہ جاتے ہیں اور لطف یہ کہ

اپنے مخصوص انداز کا رشتہ بھی ہاتھ سے نہیں چھوڑتے۔ آگے چل کر چند اشعار میں کس قدر رازہائے سربستہ کہہ گئے ہیں کہ سبحان اللہ۔ فرماتے ہیں۔

جانتے ہیں قادرِ ہر کار تم، بیکار ہم — مانتے ہیں فاعلِ مختار تم، ناچار ہم
اب نہیں جب دیکھئے، ہم شاغلِ تسبیح وقت — اب نہیں جب پوچھئے، محوِ خیالِ یار ہم
آج فرصت مل گئی ہے آرزوئے زیست سے — آج رخصت چاہتے ہیں اے غمِ دلدار ہم
یہ بھی الفت کوئی الفت ہے کہ یکرنگی نہیں — یہ بھی نسبت کوئی نسبت ہے کہ گل تم خار ہم
المدد اے رہنمائے راہِ الفت المدد — یہی منزل ہے، اور اس پر موت سے دوچار ہم
جب صدا آئی کہ بارِ عشق اٹھا سکتا ہے کون — ہم بڑھے اور بیڑہ مہلک بولے کہ ہم سرکار ہم

دوستوں کو وحشتیں ہیں دشمنوں کو نفرتیں
یار پر بھی بار ہم اغیار پر بھی بار ہم

ایک نمایاں خصوصیت

آزاد سہارنپوری کے کلام میں تقابلِ الفاظ کی عمدہ اور خوش آئند خصوصیت ہے، اور کثرت سے ہے۔ مگر مختلف صورتوں میں، کہیں تو یہ ایک ہی شعر کے دونوں مصرعوں میں، اور کہیں دو دو شعروں میں۔ یعنی انگریزی نظموں کی طرح پہلے مصرع کا تقابل تیسرے مصرعے سے اور دوسرے کا چوتھے سے، اور پھر یہ تقابل کہیں تو اکہرا ہوتا ہے اور کہیں دوہرا، کہیں تہرا، کہیں اس سے بھی زیادہ ہے۔ جس سے عجیب حیرت خیز کیف پیدا ہو جاتا ہے، مثالیں ملاحظہ ہوں:۔

اب کسی کی جستجوئیں فرض ہیں تا زیست فرض
اب کسی کی آرزوئیں دین و ایماں ہو گئیں

اُدھر دل طولِ حسرت سے بحالِ زار شیون میں
اِدھر میں دل کی اس گت سے پریشانی میں اُلجھن میں

تمہارا رنجِ فرقت ہے کہ طاری ہے مرے دل پر
تمہارا دردِ الفت ہے کہ ساری ہے مرے تن میں
جلا دے حزنِ حسرت دکھا کر جلوۂ تاباں
بجھا دے آتشِ فرقت لگا کر آگ تن من میں

ایک قومی نظم کے دو شعر اور ملاحظہ ہوں۔ جن میں تقابل اور بھی شدت سے پایا جاتا ہے۔

بڑھے اور ہر طرف اعدا کی چڑھتی فوج کو روکا
بڑھے اور جنگ کے دریا کی بڑھتی موج کو روکا
وہ ضربیں دیں کہ دشمن ہر جگہ قائل نظر آیا
وہ جنگیں کیں کہ حسنِ صلح کا سائل نظر آیا

باوجود اس حیرت خیز التزام کے نہ روانیٔ کلام میں سرِ مو فرق آیا اور نہ جوشِ جذبات میں ذرہ بھر کمی واقع ہوئی بلکہ وہ چند لطف لطفِ کلام بڑھ گیا۔

غرضیکہ کوئی کہاں تک اُن کے زورِ کلام کی تعریف کرے۔ میں اُنکے کلام سے چند اور اشعار پیش کرتا ہوں۔ اہلِ ذوق ملاحظہ فرمائیں اور بتائیں۔ کہ وہ رنگِ غالب میں کیا کچھ نہیں فرماتے ہیں۔

ظاہر ہے کہ بیکس ہوں ثابت ہے کہ بے بس ہوں
جو ظلم کیا ہوگا، برداشت کیا ہوگا
بیدل بھی ہوں شاداں بھی شاکی بھی ہوں نازاں بھی
جو داغ دیا ہوگا، دلچسپ دیا ہوگا

وہ ربطِ عشق جس کو خبطِ عرضِ حالتِ دل تھا
اُسے بیزارِ عرضِ حالتِ دل دیکھتے جاؤ
وہ طالب جو کبھی بہرِ طلب سرتا بپا دل تھا
اُسے سو بیدلوں کا ایک بیدل دیکھتے جاؤ

فصلِ بہار آئی ہے، نذر کو پھول لائی ہو — لو تمھیں پھول نذر ہیں بہرِ قبول نذر ہیں

مطربِ نغمہ کار ہو، ساقیٔ بادہ خوار ہو — سرخوشیٔ خمار ہو کیفِ وصالِ یار ہو
نامِ خدا جدھر گئے، دل میں اُتر اُتر گئے — خنجرِ آبدار ہو، دشنۂ تابدار ہو
کون جگر مکیف رہے، کون ترا ہدف رہے — کون اُمیدوار ہو، کون ترا شکار ہو
پھول نثار کیوں نہوں، لوٹ کے ہار کیوں نہوں — میسر گلعذار ہو، غیرتِ صد بہار ہو

ایک حمدیہ غزل کے دو اشعار ملاحظہ ہوں۔

بڑا کہنا تجھے شایاں، خدا کہنا تجھے زیبا بڑائی بھی ترا حصہ، خدائی بھی ترا حصہ
تری ذات اطہر و اقدس، تری شان ارفع و اعلیٰ قیود فہم سے باہر، حدود وہم سے بالا

اُمید سو وہ مفقود، ارمان سو وہ معدوم اے وائے دلِ مرحوم، صد وائے دلِ مغموم
طالب ہوں مگر ناکام، سائل ہوں مگر محروم تقدیر مری تقدیر، مقسوم مرا مقسوم
اب دل کی نہ کچھ پوچھو، اب دل کا خدا حافظ مانوس نہ کچھ مایوس، مسرور نہ کچھ مغموم

کبھی دوستوں کی خبر تک نہ لینا یہیں تک خیالِ دلِ دوستاں ہے؟
بہارِ چمن اس طرف بھی گزر کر چمن کا چمن پائمالِ خزاں ہے

وہ کمالِ کرم وہ غائتِ قرب وہ وصالِ بہم وہ رازِ دنیاز

کسی دن کھلا روئے زیبا دکھا چھپا کر دکھانے سے کیا فائدہ
اُٹھا پردۂ شرم بیجا اُٹھا حقیقت چھپانے سے کیا فائدہ

بس اے فتنۂ قامتِ یار بس بہت سر اُٹھانے سے کیا فائدہ
بس اے جلوۂ محشر آثار بس بہت قہر ڈھانے سے کیا فائدہ

ستم اے گردشِ چشم مخمور ستم پیالے پلانے سے کیا فائدہ
حجابات اُٹھاتے ہی میدان ہے حجابات اُٹھانے سے کیا فائدہ

وہ دل جس میں تمنا کی خوشی تھی اُسے صرفِ تمنا دیکھتا ہوں

آہ مجھ سے مرے ارمان بھرے دل کے سلوک
وہ بھی دن ہوں گے کہ ارمان نہ ہوگا کوئی

آپ نے درد سن لیا ہوتا درد کی کچھ دوا نہیں نہ سہی
دولتِ دردِ دل تو حاصل ہے دولتِ دوسرا نہیں نہ سہی

ترکِ حاجت بھی ممکنات سے ہے کوئی حاجت روا نہیں نہ سہی

غزل میں علوِ تخیل کے ساتھ علمی اصلاحات کا استعمال۔

وفا بھی کوششِ ترکِ وفا بھی بے اثر نکلی بڑی اُمید افزا مبتدا کی یہ خبر نکلی

اُٹھا ہوں اور بشکلِ درد اُٹھا ہوں کسی مہلک خبر کا مبتدا ہوں

مرض ہے اور یہ دعویٰ کہ درماں بن کے دم دوں گا
عرض ہے اور یہ سودا کہ ہم افعالِ جوہر ہو

پرستش کے قابل ہو تحقیق ہے تصور کے ہمراہ تصدیق ہے
وہ مجھ سے قریب، اور میں اُن سے دُور مری جمع بھی رشکِ تفریق ہے

بخوفِ طوالت حضرتِ آزاد سہارنپوری کا کلام اِس سے زیادہ پیش کرنے سے قاصر ہوں۔ صاحب نظر حضرات کی خدمت میں اُن کے مجموعۂ کلام کے مطالعہ فرمانے کے لئے گزارش و سفارش کرتا ہوں۔

حضرتِ آزاد سہارنپوری کو مرزا غالب مرحوم کے صحیح جانشین ماننے میں اہلِ انصاف اب بھی تامل فرمائیں تو خیر میں مجبور نہیں کرسکتا۔ اور جب کوئی بھی اس قابل نہیں تو میں ادب دوست اور غالب پرست حضرات کی طرف سے یہ اعلان کر دینا چاہتا ہوں کہ مرزا غالب مرحوم کا صحیح جانشین نہ کوئی ہے اور نہ کوئی ہوگا۔ حقیقت میں مرزا غالب کی ارفع و اعلیٰ ہستی اپنی جانشینی اور نظیر سے ہمیشہ ہمیشہ بے نیاز و بلند تر رہے گی۔

آخری گذارش

جناب بالوی کی ذاتی رائے کے مقابلہ میں میری مذکورہ رائے اور بعض قابل حضرات کی ہے۔ اس لئے میں اپنے محترم دوست جناب منظر ایڈیٹر کنول آگرہ کی خدمت میں گزارش کروں گا کہ بقول ادارۂ شاعر آگرہ "کورانہ تقلید کے اس محشر میں اگر ایک آواز بھی قدامت کے خلاف سُنائی دے تو اُس کو غنیمت جاننا چاہیئے" کے تحت میرا یہ مضمون مُلک کے سامنے

برائے تصفیہ پیش کر دیجئے۔ اپنے خیال کے موافق میں نے اُسی ادب واحترام کو ملحوظ رکھا ہے جو مجھے آجتک حضرت مولانا سیماب اور جناب منتظر سے دیرینہ مراسم کی وجہ سے رہا ہے۔ کہیں زبان کی غلطی ہو تو طالبِ معافی ہوں۔ میں تسلیم کرتا ہوں کہ مولانا سیماب استادِ فن ہیں۔ اُن کا قلم ہر اصنافِ سخن پر حاوی ہے۔ مگر میں اُن کو یہ مخلصانہ مشورہ دوں گا کہ

حضرت مرزا غالب علیہ الرحمتہ کے بعد اب تک اُن کی جانشینی کا کوئی شخص اہل نہیں اور ایمانداری کی بات یہ ہے

ابداً الآباد تک ہمیں "جائے استاد خالی است" ہی کہنا پڑے گا۔"

جنابِ بریالوی نے بغرض موازنہ جو اشعار پیش کئے ہیں اُن میں جو زمین آسمان کا فرق نمایاں ہے وہ ذوقِ سلیم پر بار آور بے حد پریشان کن ہے۔ انشاء اللہ آئندہ کسی صحبت میں یہ بتاؤں گا کہ مرزا غالب نے اپنے پاکیزہ اشعار میں کیا کہا ہے اور مولٰینا سیماب کیا فرماتے ہیں معنویت اور رفعیتِ تخیل وغیرہ کے لحاظ سے کیا دونوں میں فرق ہے۔

برائے ہمنفساں

خُدا کا شکر کہ دَورِ خزاں میں بھی اے جوشؔ
زبانِ دہر پہ افسانۂ بہار ہوں میں

ہر ایک آہ کو، سازِ طرب نہ کیوں سمجھوں
کہ فطرتِ غمِ گیتی کا راز دار ہوں میں

جو غم کی گرم چٹانوں سے پھوٹ نکلا ہے
زمینِ دل پہ خوشی کا وہ آبشار ہوں میں

سَموم نے جسے پالا ہے وہ گلستاں ہوں
خزاں نے جس کو سنوارا ہے وہ بہار ہوں میں

نگاہِ حق میں ہوں روشن ضمیر و پاک نہاد
مذاقِ شیخ میں بدکیش و ہرزہ کار ہوں میں

بڑی دلیل ہے یہ بھی مری بلندی کی
کہ پیشِ زُہد و ورع مستحقِ دار ہوں میں

جو ایک ہات پہ کُرسی، تو ایک ہات پہ عرش
زمیں کے فرش پہ وہ آسماں وقار ہوں میں

غرورِ عصمتِ کرّوبیانِ ہفت افلاک
قدم پہ جس کے جُھکے وہ گناہگار ہوں میں

دھڑکتا ہے مرے سینے میں دل رسالت کا
اگرچہ کافر و مست و شراب خوار ہوں میں

نہیں، شراب کی حاجت نہیں مجھے واللہ
کہ اپنی ذات سے صہبائے مشکبار ہوں میں

مگر فقط پئے تہذیبِ نفسِ ہمنفساں
شریکِ محفلِ رندانِ بادہ خوار ہوں میں

جوشؔ

ہندوستان کی جمہوری زبان

امام اکبرآبادی

(۵)

یہ مضمون جناب امام صاحب اکبرآبادی کے مسلسل مضمون کی آخری قسط ہے جو ضائع ہو گیا تھا، اور وقت کی تنگی کی وجہ جناب ممدوح نے ایک مختصر مضمون جو گذشتہ ماہ ناظرین کی نظر سے گزر چکا ہے دوبارہ لکھکر بھیج دیا تھا۔ لیکن بعد میں یہ مضمون بھی مل گیا تھا۔ اس کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مطبوعہ قسط (۴) میں وہ چند خاص اور ضروری باتیں رہ گئی جن کا ناظرینِ کلیم تک پہنچنا ضروری ہے جو اس مضمون میں موجود ہیں۔ اس لئے ہدیۂ ناظرین کیا جاتا ہے۔

اُردو ہے جس کا نام ہمیں جانتے ہیں داغ
سارے جہاں میں دھوم ہماری زباں کی ہے

اُردو کے وہ انشا پرداز و ادیب جو کہتے ہیں کہ اردو میں علوم وفنونِ جدیدہ کے لئے الفاظ نہیں ملتے۔ اِس کا دائرۂ زبان و مصطلحات تنگ ہے، غلط ہے۔ اُن کے اس اعتراض سے متبادر ہوتا ہے کہ خود معترضین کی معلومات وسیع نہیں۔ اُردو کی بیتی و بیکسی کا ماتم کرنا۔ اپنی کوتاہ نظری کا ثبوت دینا ہے۔ معترضین کے روبرو حیدر آباد کی مثال پیش کردینا کافی ہے۔ کیا وہ نہیں دیکھتے کہ وہاں کیا ہو رہا ہے؟ یہی اردو ہے جس میں ڈاکٹری۔ انجنیری۔ بیرسٹری۔ سائنس وغیرہ کی تعلیم ہوتی ہے، اور ہر ہر شعبہ کے لئے الفاظ وضع کئے جا چکے ہیں۔ پھر برٹش انڈیا میں کیوں نہیں ہو سکتا؟

وہ گروہ جو یہ اعتراض کرتا ہے کہ اُردو میں عربی مصطلحات یا عربی الفاظ کی کیوں بھرمار کی جاتی ہے؟ اور کیوں ضروری سمجھا جاتا ہے کہ اردو ادبیات میں عربی کے الفاظ کثرت سے استعمال کئے جائیں؟ غلط ہے۔ اس لئے کہ اول تو اس زبان میں بھاشا کے الفاظ روپیہ میں بارہ آنے بھر ہیں۔ دوسرے یہ کہ ہر ماتحت زبان، علمی زبان سے ہمیشہ استفادہ کرتی رہتی ہے۔ اور اردو چونکہ چھوت چھات کو پسند نہیں کرتی۔ لہٰذا اس نے جہاں سنسکرت سے استفادہ کیا، وہاں یہ عربی و فارسی سے بھی فیض حاصل کر سکتی ہے۔ ورنہ کیا وجہ کہ بھاشا کے الفاظ تو اردو میں ہوں؟ اور عربی فارسی کے نہوں؟ ناگری۔ بنگالی۔ گجراتی، اور مرہٹی وغیرہ بھی فرعی زبانیں ہیں۔ لیکن جب ان کے لئے اصطلاحات وضع کئے جاتے ہیں، یا نئے الفاظ لئے جاتے ہیں تو کیوں دستِ سوال سنسکرت ہی کی طرف دراز کیا جاتا ہے؟ صرف اس لئے کہ سنسکرت علمی زبان ہے اور اہلِ ہند سے قریبی رشتہ ہے۔

دنیا کی تمام زبانوں کا یہی حال ہے کہ جب اُن کو ضرورت اصطلاحات والفاظ کی درپیش ہوتی ہے، تو وہ علمی زبانوں کے خزانے تلاش کرتی ہیں۔ عربی نے انگریزی سے، انگریزی نے عربی لاطینی و یونانی سے بہت کچھ حاصل کیا اور کرتی رہتی ہیں۔ جب کبھی انگریزی کو ضرورت ہوتی ہے تو وہ روما اور ایتھنز کی بوسیدہ لغات ہی کی محتاج نظر آتی ہے۔ پھر اگر اردو غریب بھی عربی فارسی سے استفادہ کرتی ہے تو کیا گناہ ہے؟ البتہ بے ضرورت دوسری زبان کے الفاظ کا استعمال ہرگز نہیں کرنا چاہیئے۔ اور نہ بلا ضرورت الفاظ ڈھالنا چاہیئے۔ مثلاً اکسیجن

نیسٹروجن، ہائڈروجن، کیمسٹری، وغیرہ الفاظ کے معنی ہر شخص سمجھتا ہے۔ اب ان کی جگہ اردو الفاظ ڈھالنا غیر ضروری ہیں۔

ہر زبان کو اپنی تکمیل کے لئے تین منزلوں سے گزرنا پڑتا ہے۔ پہلی منزل میں زبان اپنے اندر بلند مضامین کی طاقت نہیں رکھتی۔ بلکہ نہایت سادہ الفاظ میں اظہارِ مطالب کرسکتی ہے۔ دوسری منزل میں حسنِ معاشرت کی نزاکت۔ وسعتِ تخیل کی پرواز، اور تہذیب و تمدن کا ارتقا مجبور کرتا ہے کہ زبان ہر بات اور ہر کام میں اعلیٰ تخیل کا ثبوت پیش کرے، اور تیسری منزل میں ادراک پیدا ہو جاتا ہے، جس سے علوم و فنون کی نشر و اشاعت و اختراعات و ایجادات کے تراجم کا کام لیا جاتا ہے۔

چنانچہ اردو پہلی منزل ختم کرچکی۔ دوسری منزل میں ادبیات کے باب میں اردو نے جو کچھ پیش کیا اور کر رہی ہے وہ ہندوستان کی کسی فرعی زبان کو ابتک نصیب نہیں ہوا۔ بلکہ اس باب میں اردو علمی زبانوں کے مدِ مقابل نظر آتی ہے۔ تیسری منزل میں علوم و فنون جدیدہ کا کام بھی شروع کردیا ہے، اور شمالی و جنوبی ہند میں یہ کام نہایت شد و مد سے جاری ہے۔

اب اگر علوم و فنون کی تحصیل اردو زبان میں لازمی نہوئی تو اس کا ارتقائی اقدام یہیں رُک جائے گا۔ اور مسلمانوں کو، بلکہ ہندوستانیوں کو اس سے سخت و شدید نقصان پہونچ جائے گا۔ اس لئے کہ ملکی زبان سے ہمیشہ اقتصادی مسئلہ وابستہ رہا ہے۔ ہر اہلِ کمال فطرۃً اپنے کمال کا معاوضہ چاہتا ہے۔ ہر محنت کے بعد راحت طلبی کی ضرورت ہوتی ہے۔ اور دماغ سوزی کے بعد سکونِ قلب کی خواہش ہوتی ہے ہر ملک کیوں اپنی زبان سے محبت کرتا ہے؟ اور کیوں اس کی تکمیل چاہتا ہے؟ صرف اس لئے کہ اس کے حصول میں آسانی اور منفعتِ مادی حاصل ہو۔

مگر یہاں ویسی زبان کے حصول کے بعد خاطر خواہ کوئی معاوضہ نہیں ملتا۔ یہی وجہ ہے کہ غیر زبان کے حصول کے لئے لوگ عمریں گزار دیتے ہیں۔ اس لئے کہا جاتا ہے کہ زبان کا تنزل قوم کی موت کا باعث ہے۔ کانگریس کے ذمہ دار لیڈر بارہا اعلان کرچکے ہیں کہ ہندوستانی زبان ملکی زبان ہوگی۔ اور ہندوستانی زبان کی ہمیشہ یہ تعریف کرتے ہیں کہ وہ زبان جو خواہ ناگری رسم الخط میں لکھی جائے یا اردو رسم الخط میں۔ لیکن ہندوستانی زبان کا اطلاق ناگری رسم الخط پر نہیں ہوتا بلکہ اردو رسم الخط پر ہوتا ہے۔ اس لئے کہ ہندوستان کے گوشے گوشے میں یہی زبان عمومیت کے ساتھ لکھی پڑھی جاتی ہے۔ اور اگر کانگریس کی تعریف میں دونوں رسم الخط آتے ہیں تو پھر بتایا جائے کہ اُس کے دفاتر میں کونسا رسم الخط استعمال کیا جاتا ہے؟ آیا دونوں یا ایک؟ جہاں تک مجھے علم ہے کانگریس اس باب میں قولاً و فعلاً متفق نہیں۔ اس کے دفاتر میں عمومیت کے ساتھ ناگری رسم الخط استعمال ہوتا ہے۔ اور تمام کارروائیاں اسی خط میں ہوتی ہیں۔ اردو برائے نام کبھی کسی موقع پر محض مسلمانوں کو تسلی دینے کے لئے استعمال کی جاتی ہے۔ گویا ہاتھی کے دانت کھانے کے اور ہیں، اور دکھانے کے اور۔ قول کچھ ہے اور فعل کچھ اور۔ دل میں کچھ ہے۔ اور زبان پر کچھ اور۔ اس کا سبب یہی ہے کہ مسلمان کانگریس سے دُور بھاگتے ہیں۔ اگر یہ اسی مقصد سے کانگریس میں شریک ہوجائیں تو اردو زبان مٹنے سے بچ سکتی ہے۔

کچھ انشا پردازوں سے

یوں تو اردو کی نشر و تعلیم کے لئے ملک میں اکثر انجمنیں قائم ہیں۔ حیدرآباد میں عثمانیہ یونیورسٹی یوپی میں مسلم یونیورسٹی۔ اس کے علاوہ پنجاب سرحد دہلی اور بہار وغیرہ میں اردو کی کافی اشاعت ہو رہی ہے۔ اخبار و رسائل بھی کافی تعداد میں چھپتے ہیں۔ تصنیف و تالیف کا بھی زور ہے۔ لیکن صحیح اُردو لکھنے اور بولنے والوں کی پھر بھی کمی ہے۔ اور غالبًا یا تو یہ اس لئے ہے کہ کوئی مرکزی ادارہ نہیں جو احتسابِ زبان سے وابستہ ہو۔ یا اس لئے کہ زبان کا مسئلہ چند نفوسِ قدسیہ تک محدود کردیا گیا ہے۔ زبان کے باب میں اس نوع کی جکڑ بندیاں نقصان دہ ہوتی ہیں۔ اگر کوئی مرکزی ادارہ قائم ہوجائے ایسا جس کے عہدہ دار صرف رسمی سند کے حامل نہوں بلکہ ملک کے مشہور و مسلّم ادبا و اہلِ قلم بھی شریک ہوں۔ اور ہر ہر صوبہ سے ماہرینِ لسانیات حصہ لے سکیں تو یہ زبان مٹنے سے بچ سکتی ہے۔ مگر اس کے قیام کے لئے کافی سرمایہ کی ضرورت ہے، اور تاوقتیکہ سرمایہ دار اس طرف توجہ نہ کریں، کام چلنا ناممکن ہے۔

اردو کے متعلق چند ضروری باتیں ہیں جن کی بنا پر اس گروہ کو اُس کی امداد کرنا ہی چاہیئے۔ ایک یہ کہ قوموں کی ذہنی و دماغی ترقی اور تہذیب و معاشرت کا عنصر زیادہ تر مادری زبان ہی سے وابستہ ہوتا ہے۔

زبان ہی قومی حیثیت کی علمبردار ہوتی ہے، اور زبان ہی سے قوم بنا کرتی ہے۔
دوسرے یہ کہ اردو زبان کے لئے یہ زمانہ ایسا خطرناک زمانہ ہے کہ نتو اس
سے قبل کبھی آیا اور نہ اس کے بعد آسکتا ہے۔ اردو اس وقت موت وحیات
کی کشمکش میں مبتلا ہے۔ اگر ہم نے طلب صادق وعزم واستقلال سے کام نہ
لیا تو نتیجہ سامنے ہے۔ سختیاں و دشواریاں پیش نظر ہیں۔ کنویں اور جال
بچھا دئے گئے ہیں۔ اپنے گھروں سے اردو کو نکالا جارہا ہے۔ اپنی زبانوں
پر اس کا لانا حرام کیا جارہا ہے۔ اور اپنے دفتروں پر اس کے لئے تلے
جڑ دئے گئے ہیں۔ پس ہمیں چاہئیے کہ ہم خالی قلموں سے کام نہ لیں۔ بلکہ عملی
اقدام کریں کہ ؎

نوارا تلخ ترمی زن چو ذوق نغمہ کمیابی
حدی را تیز ترمی خواں چو محمل را گراں بینی

انجمن ترقی اُردو

انجمن ترقی اردو اورنگ آباد کی سالانہ رپورٹ سے ظاہر ہوا
کہ اصطلاحات کا کام نہایت سرگرمی سے کیا جارہا ہے، اور ۱۹۳۰ء تک
صرف اس ایک انجمن نے تقریباً چھ ہزار اصطلاحات وضع کیں۔ اور چونکہ
اس انجمن کا تعلق سررشتۂ تالیف وتراجم حیدرآباد کی سلطنت سے ہے،
اس لئے اس مدت میں عجب نہیں کہ اصطلاحات کی تعداد سہ چند وچہار
چند تک پہونچی ہو۔ کیونکہ اُردو رسالہ اورنگ آباد کے ایک ہی نمبر
میں ۷۰۴ جدید اصطلاحات درج تھیں۔ اس سے عام ماہرین لسانیات
کو اور چھوٹے بڑے اداروں کو سبق لینا چاہیئے۔ بہرحال یہ کام اُن لوگوں
کا ہے جو اُردو زبان کی حقیقت سے واقف ہیں۔ اور جو عربی، فارسی،
انگریزی و سنسکرت کے عالم ہیں۔

چند اشارات

گزشتہ دور میں اسم اشارے کے واسطے واحد جمع کے لئے علیحدہ
الفاظ تھے یعنی وہ۔ وے۔ یہ۔ یے۔ لیکن موجودہ دور کے ادیبوں
نے اُسے متروک کرکے زبان کے دائرے کو تنگ کر دیا۔ حالانکہ دوسری
تمام علمی زبانوں میں اسم اشارہ کے لئے واحد وجمع کا استعمال کیا جاتا ہے
مثلاً انگریزی میں (This) اور (These) فارسی میں آں اور
آنہا، اور عربی میں ہذا، ہذان، صیغہ تثنیہ کے لئے۔ اور ھٰؤلاء جمع
کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔ نیز مؤنث کے لئے علیحدہ اسم اشارے ہیں۔

کسی غیر زبان کے لفظ کو اگر اردو نے اپنا کر اس کے معنی بدل دئے ہیں
تو اس کو بھی جائز سمجھنا چاہیئے۔ جیسے عرصہ بمعنی میدان، اور غریب بمعنی
عجیب۔ بدل کر "قدرت" اور "مفلس" کے معنی میں استعمال کئے جاتے ہیں۔

ایسے الفاظ جو اردو فارسی سے مرکب ہیں، اور جو اضافت کے
ساتھ لکھے اور بولے جاتے ہیں۔ جیسے "لب سڑک" وغیر ان کو بھی صحیح
مان لینے میں کوئی حرج نہیں کہ علمی زبانوں میں اس کی مثالیں ملتی ہیں۔

اردو کے دو لفظوں کے درمیان اگر واؤ عطف کا بھی استعمال
کیا جائے تو کیا حرج ہے؟ مثلاً "رہنے وسہنے والے" "چیخ و پکار" وغیرہ
بغیر واؤ کے بھی ٹھیک ہے۔ لیکن اس طرح لکھنے میں اختصار نہیں ہے کہ
رہنے اور سہنے والے۔ لفظ اور کو اگر متروک کر دیا جائے تو بہتر ہے۔

وہ الفاظ جو اردو فارسی یا اردو عربی سے مرکب ہیں۔ اور
زبان و قلم سے نکلتے ہی جن کے معنی عوام کے ذہن و دماغ پر مسلط ہوجاتے
ہیں۔ مثلاً "سنسنی خیز" "فوق البھڑک" وغیرہ کو بھی قبول کر لینا چاہیئے۔

اُردو کے لئے وہ زمانہ آگیا ہے کہ اُس کو پابہ زنجیر نہیں کرنا
چاہیئے۔ اور نہ چند لوگوں کے ہاتھ میں دے کر اُس کو محدود کرنا
چاہیئے، اردو چونکہ فارسی و عربی سے استفادہ کرتی رہی ہے، اور
چونکہ مندرجہ صدر طریقے اُن دونوں زبانوں میں رائج ہیں۔ پھر اردو
کو اُس کا تتبع کیوں نہیں کرنا چاہیئے؟

اسی طرح تراجم میں بھی اختصار کی ضرورت ہے۔ مثلاً اردو میں
بصورت صیغہ واحد فن تو لکھ سکتے ہیں، لیکن فاعلی و صفی صورت
کے لئے کوئی اختصار نہیں۔ مثلاً آرٹ کا ترجمہ فن (artist)
کا صاحب فن، اور (Artistic) کا فنیات کیا جاتا ہے۔
لیکن اگر صورت فاعلی و صفی کے لئے صرف فنی استعمال کیا جائے تو
ایسا ممکن ہے اور اختصار بھی ہو سکتا ہے۔

فنی کا استعمال عبارت کے سیاق وسباق سے بخوبی ہو سکتا ہے،
مثلاً ایک فنی نے کہا: "اُس سے ایک فنی بات کہی۔"

اُردو کے بعض ذمہ دار و مشہور ادیب بعض الفاظ کا املا عجیب طریقہ سے کرتے ہیں۔ مثلاً "اُس نقشے کو لاؤ" "کلکتے جاؤ" یعنی اعراب کو چھوڑ کر یائے مجہول جو جمع کی صورت اختیار کئے ہوئے ہے۔ استعمال کرتے ہیں۔ حالانکہ ایسے الفاظ کی املائی تکمیل صرف اعراب لگانے سے ہو جاتی ہے، اور اسی میں اختصار ہے۔

اُردو میں غیر زبانوں کے اکثر الفاظ ایسے بھی ہیں جو غلط اعراب کے ساتھ لکھے پڑھے جاتے ہیں۔ مثلاً شُکَست۔ نقاب۔ نشتر وغیرہ وغیرہ۔ اگرچہ یہ الفاظ کسرہ کے ساتھ لکھنے اور بولنے چاہئیں۔ مگر چونکہ اُردو والے فتح کے ساتھ اُن کا استعمال کرتے ہیں۔ اور اُردو نے اِن کو اپنا لیا ہے۔ اس لئے فتحہ کے ساتھ استعمال کرنا بھی جائز سمجھنا چاہیئے۔

غرضکہ اُردو زبان اِس وقت اُس منزل سے گزر رہی ہے جو منزل آزادی کی سمجھی جاتی ہے۔ اس وقت زبان کو آزاد کر دینا چاہیئے۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ مہمل الفاظ کا استعمال بھی جائز ہو۔ بلکہ مدعا یہ ہے کہ جو الفاظ اردو نے اپنا لئے ہیں، اور غلط اعراب کے ساتھ استعمال کئے جاتے ہیں، اور وہ الفاظ جو اہلِ اردو نے خود گڑھ لئے ہیں، لیکن زبان سے نکلتے ہی ان کے معنی ذہن نشین ہو جاتے ہیں مثلاً فوق البھڑک وغیرہ کو جائز سمجھ لینا چاہیئے۔

عوام سے

اُردو سے دلچسپی رکھنے والے حضرات کو خواہ وہ ہندو ہوں یا مسلمان، پارسی ہوں یا عیسائی، سکھ ہوں یا کوئی اور، اُردو کی اشاعت کے لئے قدم بڑھائیں کہ یہ زبان تنہا مسلمان کی زبان نہیں ہے۔ بلکہ ہند کی تمام اقوام کی مادری زبان ہے۔

دفتروں میں اس کو جگہ دی جائے، کاغذات اسی زبان کے رسم الخط میں چھپوائے جائیں۔ کتابیں اسی خط میں لکھی جائیں، بنک سے، پوسٹ آفس سے، اور عدالتوں سے اردو رسم الخط کے فارم طلب کئے جائیں، ہر ہر دوکان پر اردو کا سائن بورڈ نظر آنا چاہیئے۔ ہر خط کا پتہ اردو میں لکھنا چاہیئے، اور ہر کھاتہ و ہر خط اردو میں لکھنا چاہیئے۔

یہ کام صرف ادبا و شعرا ہی کا نہیں ہے، بلکہ عام پبلک کا ہے۔ انشا پرداز تو لسانیات کا کام کریں۔ لیکن پبلک اس کی نشر و تعمیم میں حصہ لے۔ عمل کا وقت ہے، اب چیخ[1] پکار سے کام نہیں چلے گا۔ انشا پرداز سے لیکر، دوکاندار، تجار اور عوام سب مل کر اردو کی خدمت کریں گے، تب مقصد کی تکمیل ہوگی۔ ورنہ نہیں۔

کانگریس سے

کانگریس کے ذمہ دار حضرات کو اِن باتوں پر ٹھنڈے دل سے غور کرنا چاہیئے کہ دنیا میں ہمیشہ غیر انصافی نے انسانوں نقصان پہونچایا ہے۔ ہندی رسم الخط ہندوستان کے صرف ایک مخصوص طبقہ میں رائج ہے۔ لیکن اردو رسم الخط کو تقریباً ساٹھ کروڑ انسان پہچانتے ہیں۔ اگر آج ہندوستان کی حکومت، دنیا کی حکومتوں سے اردو میں خط و کتابت کرنے لگے تو زیادہ دقت کا سامنا نہیں ہوگا لیکن ہندی رسم الخط کو ہند کے باہر کون پہچانتا ہے؟ اگر آپ نے ہندی و اردو رسم الخط میں دفاتر کا کام کیا تو کیا دوگنا کام نہیں ہو جائے گا؟ اور کیا اس سے اقتصادیات کے مسئلے میں مشکل پیدا نہیں ہوگی؟ دو قسم کے رسم الخط کو حکومت کا رسم الخط قرار دینا مضحکہ خیز بات ہے۔ اور طفلانہ حرکت سے زیادہ نہیں۔ البتہ یہ ہونا چاہیئے کہ ہر صوبہ کی زبان اُس صوبہ کے لوگوں کے لئے قائم رہے۔ لیکن اردو زبان اردو رسم الخط کے ساتھ لازمی قرار دی جائے۔

کانگریس کی تمام ماتحت کمیٹیاں ناگری رسم الخط میں کام کر رہی ہیں۔ اردو رسم الخط نام کو نہیں۔ کیا اسی کا نام انصاف ہے؟ ہاتھ میں طاقت آنے سے قبل ہی قدم ڈگمگانے لگے؟ کیا اردو کا "ہندوستانی" نام اسی لئے رکھا گیا تھا کہ وہ ناگری رسم الخط میں لکھی جائے؟

کہاں ہیں گاندھی جی۔ نہرو جی۔ اور سوبھاش چندر بوس جی، جواب دیں کہ کیا شمالی ہند میں عمومیت کے ساتھ "ناگری رسم الخط کا نام "ہندوستانی" ہے؟ یا اردو رسم الخط کا؟

کس زبان میں اخبار و رسائل زیادہ چھپتے ہیں؟ اور کونسی

---

[1] چیخ و پکار کے درمیان واؤ عطف دانستہ لکھا ہے۔

زبان بولی جاتی ہے؟ کس زبان پر "ہندوستانی" کا اطلاق ہوتا ہے؟ اور کونسی زبان ہند کے گوشہ گوشہ میں سمجھی جاتی ہے؟

ترے وعدے پر ستم گر ابھی اور صبر کرتے
اگر اپنی زندگی کا ہمیں اعتبار ہوتا

(نوٹ) میرا یہ مضمون کانگریس کی مخالفت میں نہ سمجھا جائے۔ بلکہ میں اپنی فہم کے اور ضمیر کے مطابق حق و انصاف کی بات کہنے پر مجبور ہوا ہوں۔ اور تا وقتیکہ کانگریس میں ضمیر کی آواز بلند نہ کی جائے گی، خالی کانگریسی ہونے سے ملک و قوم کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ ہر مسلمان کو اپنے ضمیر کی آواز بلند کرنے کے لئے کانگریس میں شریک ہونا نہایت ضروری و لازمی ہے۔

(امام اکبرآبادی)

مقالاتِ زرّیں

وہ نیند کیسی رحیم ہے جو ظالموں کے دماغ پر چھائی رہے۔

تمام دنیائی مسرتیں شاعر کو غافل نہیں بنا سکتیں۔

حسین پیشانی کا بل، تمام دنیا کے شگفتہ چہروں سے بہتر ہے۔

جو سچائی کو چھوڑ دیتا ہے پھر کوئی گناہ نہ چھوڑے گا۔

ہماری کوئی شے نہیں، اور نہ ہم ہی اپنے ہیں۔

نالائق کا ہمسفر ہونا، دوزخ کا سفر ہے۔

خزانہ "انسانیت" کا مقبرہ ہے

آسانیاں، در اصل بھیس بدلے ہوئے "مشکلیں" ہی ہیں۔

کاہل کے خیالات، گھڑی کی سوئیاں ہیں۔

پٹھان جہادِ نفس کے بعد بھی تُند خو ہے۔

گرمی کی دوپہر عورت کے غصّے کی طرح تیز اور شور انگیز ہے۔

مُفلسوں سے دوستی رکھنا اعلیٰ ترین عبادت ہے۔

محبت اور تجارت، خوش تقریری کے کرشمے ہیں۔

محبت تلوار کے بغیر ذبح کرنے کی صناعی ہے۔

اپنی ماں کی نگاہ میں کوئی بڈھا نہیں۔

کاش یہ بات آسانی سے سمجھ میں آسکتی کہ موت سب سے زیادہ شیریں چیز ہے۔

سامانِ آسائش کا مہیا ہو جانا، بالکل ایسا ہی ہے جیسے راستے میں کوئی نازنین دھوپ سے چکرا کر اتفاقیہ کسی کے آغوش میں گر پڑے۔

اگر ہم غور سے پیچھے (ماضی) مڑ کر دیکھیں، تو ہمارے سامنے (مستقبل) کے راستے خود بخود روشن ہو جائیں۔

اے دنیا کی رنگینیوں پر مرنے والے! جب تو باغوں سے گزرتا ہے خشک پتیاں تیرا مضحکہ اُڑاتی ہیں۔

اے استقلال کے دشمن! اپنے گھوڑے کو اس قدر جلد جلد نہ موڑ کہ اُس کا مُنہ زخمی ہو جائے۔ اور وہ چکرا کر گر پڑے۔

بعض اس قدر کاذب و یاوہ گو ہوتے ہیں کہ ان کے لبوں کے گرد جھُوٹی قسمیں پپیوں کی طرح گھوما کرتی ہیں۔

خاموش ہو جا، اور تیرے متفکل سینے کی آواز کائنات کے تمام حجاب توڑتی ہوئی نکل جائے گی۔

جوانی، راحت کی تلاش میں ہے۔ اور راحت "محبت" کے آلام ڈھونڈھ رہی ہے۔

بعض ایسے جھوٹے ہیں کہ زلزلہ آیا ہوا ہے اور قسمیں کھا کھا کر کہتے ہیں کہ زمین نہیں ہل رہی ہے۔

سچی محبت ایک ایسی عجیب چیز ہے کہ دو اس طرح ایک ہو جاتے ہیں گویا اصل میں وہ ایک ہی تھے، اور خود سے دو ہو گئے۔

قطرۂ باراں زمین پر آتا ہے، اور یہ کہتے ہی سو جاتا ہے "پیاری ماں تیری سیرابی میرا سکون ہے"۔

سچا عذر وہی ہے، جب چہرہ کی ہر شکن میں انفعال کا خون دورہ کر رہا ہو۔

(جوش)

(ماخوذ از مقالاتِ زرّیں مطبوعہ ۲۱ء)

موت کا استقبال

سُن، اے خمخانۂ ہستی میں جامِ مرگ کے ساقی
جہاں تک رہ سکے انسانیت انسان میں ساقی

جہاں تک جوہرِ غیرت کو قائم رکھ سکے انساں
جہاں تک نفس کی عزت کو قائم رکھ سکے انساں

جہاں تک عظمتِ انسانیت کو وہ نہ کھو بیٹھے
جہاں تک اپنے انسانی شرف کو وہ نہ رو بیٹھے

اُسے حق ہے وہ جی سکتا ہے انسانوں کی بستی میں
مثالِ شمع رہ سکتا ہے وہ فانوسِ ہستی میں

زمانہ، آدمیت کا تحمل کر سکے جب تک
مئے الفت سے جامِ دل کو انساں بھر سکے جب تک

رہے ماحولِ انساں پاک جب تک بیوفائی سے
محبت کر سکے دنیا میں جب تک بھائی بھائی سے

جِسے بے لوث جب تک خانۂ امروز و فردا میں
رہے محفوظ جب تک آبروِ انساں کی، دنیا میں

بصد عیش و طرب لیل و نہارِ زندگی دیکھے
ریاضِ دہر میں انساں بہارِ زندگی دیکھے

اگر افعالِ انسانی بہائم سے نہ شرمائیں
اگر انسان سے اوصافِ انسانی نہ چھن جائیں

اگر انساں کی خودداری نہ ہو شرمندۂ ہستی
اگر اوجِ شرافت ہو نہ پامالِ غمِ پستی

بشر سے دُور گر احساس کا جوہر نہ ہو جائے
جہاں میں زندگی گر موت سے بدتر نہ ہو جائے

تو حقِ زندگی انسان کو حاصل ہے دنیا میں
اُسے حق ہے مرے بھی وہ تو جینے کی تمنا میں

مگر انساں سے انسانیت جب دُور ہو جائے — مگر انسان جب حالات سے مجبور ہو جائے

مگر جب زندگی غیرت کا استیصال کر ڈالے — مگر جب زندگی اخلاق کو پامال کر ڈالے

مگر جب زندگی محتاجِ لطفِ ما و تُو کر دے — مگر جب زندگی انساں کو بے آبرو کر دے

مگر جب زندگی اکالِ ایثار و مروت ہو — مگر جب آدمی دُنیا میں ننگِ آدمیت ہو

مگر جب پاسِ ننگ و نام کی طاقت نہ ہو دل میں — حمیت بھی اگر ہو دل میں تو حالت نہ ہو دل میں

مگر جب زندگی ہو مہلکِ اوصافِ انسانی — مگر جب زندگی ہو اک ندامت، اک پشیمانی

مگر جب تنگ ہو دنیا کی وسعت زندگانی پر
تو پھر اک بار کیا سَو بار لعنت زندگانی پر

اگر لیں زندگی کا جائزہ ہندوستاں والے — خصوصاً جس جگہ دُوہری مصیبت ہے وہاں والے

بہیمیت پر انساں جس جگہ مجبور ہوتا ہے — مرتب غیر انسانی جہاں دستور ہوتا ہے

جہاں مفقود ہوں اسباب سارے زندگانی کے — جہاں مسدود ہوں ابواب سارے زندگانی کے

جہاں اپنے اور اپنوں کے سوا سب جانور ٹھیریں — طلبگارِ حقوقِ زندگی دریوزہ گر ٹھیریں

زیادہ ہو جہاں ایمان سے قانون کی قیمت — جہاں پانی سے کم ہو آدمی کے خون کی قیمت

جہاں مستثنیاتِ خاص کے احکام جاری ہوں — اصولِ عدل اپنی غیر آئینی سے عاری ہوں

جہاں محنت زیادہ لے کے تھوڑی مزد ملتی ہو — جہاں اوروں کی عُریانی سے پوشاک اپنی سلتی ہو

غلط جذبہ شرافت کا جہاں رہنِ غلامی ہو — نمکخواری کی لعنت داخلِ ذہنِ غلامی ہو

جہاں ہو فرض، صَرفِ امتیازِ ما و تُو رہنا — مدارِ آبرو ہو جس جگہ بے آبرو رہنا

جہاں انساں نہ سمجھا جائے فاقے کرنیوالوں کو
غم و غصہ کھلایا جائے بھُوکے مرنے والوں کو

جہاں مجبور کر کے، جنکی خود ترغیب دی جائے
اُنھیں جرموں پہ کمبختوں کی دار و گیر کی جائے

جہاں تاثیر سے فریاد کی محروم ہو انساں
محبت سے جہاں اولاد کی محروم ہو انساں

نہ تعلیم اُن کی ممکن ہو نہ ممکن تربیت اُن کی
جہالت ہو سرشت اُن کی غلامی ذہنیت اُن کی

جہاں افلاس و بدحالی کے پردے اتنے حائل ہوں
کہ رشتوں کے برتنے کے مواقع بھی نہ حاصل ہوں

دعا مقبول اور مسموع نالہ ہی نہ ہو کوئی
جہاں فریادیوں کی سُننے والا ہی نہو کوئی

اگرچہ گریہ و زاریٔ محزوں بے اثر نہ شود
"مگر در میکدہ" ایں حادثہ اصلا خبر نشود"

معاذ اللہ۔ اِن حالات میں جب زندگی گزرے
کہ جن میں زندگی خود منفعل ہے جینے والوں سے

تو اے پیکِ اجل، اے ساقیٔ جامِ فنا آجا
پیامِ زندگیٔ آبرو دیتا ہوا آجا

پلا دے وہ شرابِ تُند جس کو موت کہتے ہیں
کسلمند اِن ہستی آرزو میں جس کی رہتے ہیں

چھپا دے خاک کے دامن میں انسانی معائب کو
سُلا دے موت کی آغوشِ راحت میں مصائب کو

خدارا ختم کر دے زندگی کی لعنتیں آ کر
سکونِ مرگ کی ہم کو عطا کر رحمتیں آ کر

نہ رکھا زندگی نے آہ دنیا میں کسی قابل
نہیں سامان اپنی مَوت کے بھی گو ہمیں حاصل

گوارا ہم کو بے گور و کفن لاشوں کا سڑنا ہے
مگر منظور دامن موت کا، چھروں پہ پڑنا ہے

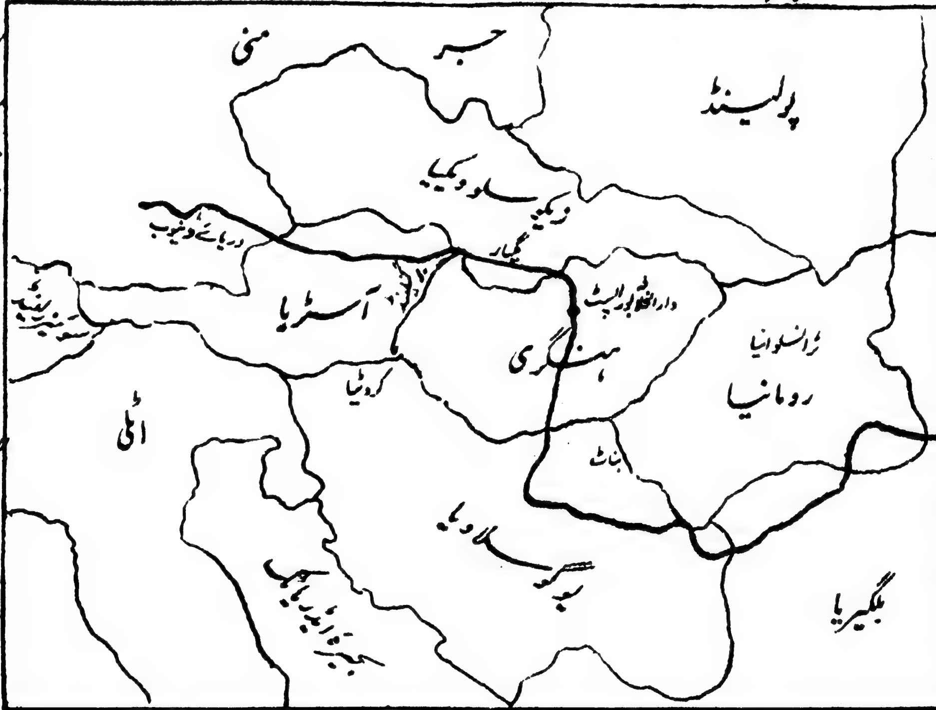
بصد جاں، تیرا استقبال ہم کرنے کو بیٹھے ہیں
ہمیں جینا نہیں ہے راس ہم مرنے کو بیٹھے ہیں

بسمل سعید ہاشمی
ٹونک راج

رفتارِ وقت

ہنگری کی سیاسی اہمیت

سید سعید جعفری مچھلی شہری۔ ایم۔ ایس۔ سی (علیگ)



آج یورپ کی سیاست اتنی پیچیدہ ہے کہ اکثر اوقات ہم واقعات کا صحیح جائزہ لینے میں ٹھوکر کھاتے ہیں۔ بات یہ ہے کہ جنگِ عظیم کے بعد معاہدۂ وارسائی کی رو سے وسطِ مشرقی یورپ کو اس طرح "بلکنائز" کیا گیا ہے یعنی وسطِ یورپ کو چھوٹے چھوٹے حصوں میں اس طرح منقسم کیا گیا ہے کہ ان تمام ریاستوں کا نام ہی یاد رکھنا دشوار ہے۔ ان کی منفرد سیاسی اہمیت کے صحیح اندازہ کا تو ذکر ہی کیا۔ لیکن ہوتا ہے کہ ایک خوشگوار (یا منحوس؟) صبح کو ہم اخبار اٹھاتے ہیں اور کسی چھوٹی سی ریاست میں گڑبڑ کی اطلاع دیکھتے ہیں۔ اب قبل اس کے ہم واقعہ کی خصوصیت پر غور کر پائیں۔ یہی واقعہ ایک سنگین صورت اختیار کر لیتا ہے اور ہم انگشت بدنداں رہ جاتے ہیں کہ کیا ہوا۔ یورپ کی سیاست جس نازک دور سے گزر رہی ہے اس میں بڑی برائی تو یہ ہے کہ ہر ایسے واقعہ میں امن کو ختم کرنے کے امکانات پوشیدہ رہتے ہیں۔ اور تیقن سے بالکل حکم نہیں لگایا جا سکتا کہ ان میں سے کوئی واقعہ ایک نئے طوفان کا پیش خیمہ ثابت ہوگا یا کہ محض یورپ کے بحرِ سیاست پر خفیف سی لہر کا ذمہ دار ہوگا۔ اس لئے لازم ہے کہ ہم کو "خطرہ کے مقامات" کا علم رہے تاکہ ہم اس سیاسی گورکھ دھندے کو دیکھ کر اچنبھے میں نہ پڑ جائیں۔ ان مضامین کے سلسلہ کے پہلے دو نمبروں میں ایسے دو ممالک پر روشنی ڈالنے کی کوشش کی گئی ہے جن کی سیاسی اہمیت ہر سمجھدار و غیر سمجھدار شخص پر ظاہر ہے، کیونکہ "آسٹریا پر جرمنی کے قبضہ نے ہمارے اطمینان کو ضرب کاری لگائی ہے اور اس کے بعد "زیکوسلواکیا کا مستقبل" ایک مستقل سوالیہ نشان بنا ہوا ہے، اور اس کے صحیح جواب میں یورپ کی سیاست کا حل مضمر ہے۔ آج کی صحبت میں ہنگری کی اہمیت پر روشنی ڈالنا مقصود ہے، کیونکہ مجھے یقین ہے کہ مستقبل قریب میں ہنگری بہت اہم اور وقیع حیثیت کا مالک ثابت ہوگا اور یورپ کے سیاسی ڈرامہ میں اس کا مفروضہ کام بہت معنی خیز ہوگا۔

ادھر بیس سال سے ہنگری کی خارجہ حکمت عملی کچھ ایسی مبہم رہی ہے کہ اس کی اہمیت کا صحیح اندازہ کرنے میں اکثر دشواری ہوتی۔ واقعات کچھ ایسی صورت اختیار کئے ہوئے تھے، کہ یہ نہیں کہا جاسکتا تھا کہ اونٹ کس کروٹ بیٹھے گا، اگر آسٹریا میں جمہوریت برسرِ اقتدار ہوگئی ہوتی تو بہت ممکن تھا۔ وہ اتحادِ صغیر (زیکوسلواکیا، رومانیا اور یگوسلاویا) میں شامل ہوجاتا اور ایسی حالت میں ہنگری بھی اس اتحاد کا ایک جزو ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا تھا، اور اس اتحادِ صغیر کے مدِمقابل ایک ڈینوبین گروہ بندی کا خیال ترک کرنا ہی پڑتا، یا پھر یہ ممکن تھا کہ چند بڑے ممالک کی شہ پاکر آسٹریا عودِ شاہی میں پناہ ڈھونڈھتا، اور اس حالت میں بھی ہنگری اسی کے نقشِ قدم پر چلنے پر مجبور ہوتا۔ صرف یہی نہیں بلکہ یہ بھی ممکن تھا کہ گزشتہ بیس سال میں جرمنی آسٹریا پر قبضہ کرنے کی جو کوشش کر رہا تھا وہ آسانی سے ممکن نہ ہوتی، اور ایک جنگِ عظیم چھڑ جاتی، ایسی صورت میں ہنگری عجیب مخمصہ میں پڑجاتا، لیکن اب جرمنی اور آسٹریا کے انضمام نے شکوک اور شبہات پر سے پردہ ہٹا دیا ہے اور ہنگری رفتہ رفتہ ایک طے شدہ راہِ عمل اختیار کر رہا ہے، مگر یہ واقعات پر پیش از وقت بحث کرنا ہے۔ اس لئے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ہنگری کی گزشتہ بیس سالہ کی ہنگامی تاریخ پر ایک سرسری نظر ڈالی جائے،

جنگِ عظیم نے سارے وسطی و مشرقی یورپ کی سیاسی عمارت کو اس طرح متزلزل کر دیا تھا کہ اس کے اختتام پر تقریباً ہر ملک کو انقلابات کی آگ میں سے گزرنا پڑا۔ روس نے زار کا نام صرف کالعدم کر دیا اور اشتمالیت کی بنیاد رکھی، سلطنتِ عثمانیہ کا خاتمہ ہوا اور مصطفےٰ کمال نے ترکی کو ایک نئی زندگی بخشی۔ صلح ہونے سے قبل ہی ایسا معلوم ہوتا تھا کہ برلن (جرمنی) ویانا (آسٹریا) اور بوداپسٹ (ہنگری) میں اشتراکیت اپنا خیمہ گاڑ دے گی۔ مگر قوت اور زبردستی بہت کچھ کرسکتی ہے، اور دولِ یورپ اس حادثہ کے لئے کسی طرح تیار نہیں ہوسکتے تھے، نیچے کی سطور سے واضح ہوجائے گا کہ اُنھوں نے کس طرح دخل در معقولات کیا اور ہنگری کو کیسے کیسے کچوکے دئے۔

اصل واقعہ ہے کہ شاید ہی کبھی کسی قوم کو ایسی کرب و ایذا برداشت کرنی پڑی ہو جیسی جنگِ عظیم کے اختتام کے بعد کئی سال تک ہنگری کے حصہ میں آئی۔ ہنگری اس عظیم الشان سلطنت آسٹریا ہنگری کا ایک حصہ تھا جو جنگ سے قبل مشرقی و وسطی یورپ پر چھائی ہوئی تھی لیکن جنگِ عظیم نے اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر دئے۔ یہ ہزیمت بجائے خود اس کے لئے دردناک اور شرمناک تھی مگر جب محکوم ریاستوں نے اپنی محکومی کا طوق پھینک کر چٹکیاں لینی شروع کیں تو جو روحانی تکلیف اس کے پلے پڑی اس کا اندازہ دشوار نہیں۔ ہنگری کے پاس سوائے اس کے کوئی چارہ نہ تھا کہ دولِ یورپ کو اپنی قسمت حوالہ کردے۔ چنانچہ اس نے ایسا ہی کیا۔ شاہی خاندان کے رکن شاہ کارل کو معزور ہونا پڑا اور ہنگری کے باشندوں نے اپنی کارگزاری جتانے کے لئے وزیرِاعظم کاؤنٹ ٹسزا کو قتل کرڈالا۔ صرف یہی نہیں بلکہ ہر اُس شخص سے بھی جو گذشتہ جنگ کا حامی یا اس میں شرکت کا باعث تھا قطع تعلق کرلیا۔ مقتول وزیرِاعظم کی جگہ انھوں نے ایک نہایت ہی نکمّے شخص میکائل کیرولائی کو وزیرِاعظم منتخب کیا جس کے حق میں صرف یہی کہا جاسکتا ہے کہ وہ صلح جو اور امن پسند تھا اور اس وقت ہنگری کا انداز نہایت ہی امن پسندانہ تھا۔ قصہ مختصر ہنگری کے باشندوں نے وہ سب کچھ کیا جو دولِ یورپ کی خوشنودی اور رضاجوئی کے لئے کیا جاسکتا تھا۔ اس لئے ان کی یہ اُمید بالکل بجا تھی، کہ دولِ یورپ اُن کے ساتھ منصفانہ برتاؤ کریں گے اور وہ بھی جلد از جلد۔ ع

اے بسا آرزو کہ خاک شدہ

فرانس اور برطانیہ کو اور بہت سے ممالک کی قسمت ٹھکانے لگانی تھی، اور پھر ہنگری کو سزا دینا ذرا چال بازی کا مقتضی تھا اور ظاہر ہے کہ اس میں دیر لگتی ہے۔ اور اگر اس تساہلی سے ہنگری پر مصیبت کے پہاڑ ٹوٹ پڑیں تو اس میں دولِ یورپ کا کیا قصور ہے! چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ دسمبر آیا اور چلا گیا، جنوری آیا اور اپنی زندگی کی میعاد پوری کرگیا۔ مگر پیرس سے کوئی اُمید افزا خبر نہیں آئی۔ بہرحال انتظار کی کوفت تو برداشت کی جاسکتی تھی۔ اگر پیٹ بھرنے کا سہارا ہوتا اور آگ تاپنے کو کوئلہ یا کم از کم کوئی تازہ مصیبت نہ وارد ہوئی ہوتی۔ مگر شہنشاہیٔ ثنیہ (آسٹریا ہنگری کی متحدہ سلطنت) کی محکوم اقوام بھلا کب چوکنے والے تھے، ٹرانسلوانیا، بناٹ اور زیکوسلواکیا کے لوگ

علاقوں میں خونریزی اور غارتگری کا بازار گرم تھا۔ خدا خدا کر کے مارچ کے مہینہ میں خبریں آہستہ آہستہ فاش ہونی شروع ہوئیں اور نئی سرحدوں کا تعین ہونے لگا۔

صدر ولسن کے دعوے خود اختیاری کی مجوفیت پہلے ہی سے ظاہر ہو رہی تھی اور جب ۴ر جون ۱۹۲۰ء کو ٹرائنسن معاہدہ ہنگری سے ہوا اس وقت ان بلند بانگ دعاوی کی حقیقت بخوبی ظاہر ہو گئی۔ ہنگری کی مخصوص قومیت "گمیار" ہے اور اگر خود اختیاری کے دعوے میں کچھ بھی اصلیت تھی تو تمام گمیار آبادی کو ایک ریاست میں شامل کر دینا چاہئے تھا۔ آسٹریا اور زیکوسلواکیا کی اقلیتوں کی حالت کے برخلاف یہ کوئی مشکل کام نہ تھا مگر کون انصاف اور سچائی کو جذبہ انتقام کے بدلہ قبول کرنے کے لئے تیار تھا اس لئے وہی ہوا جس کی ایسی صورت میں امید تھی۔ گمیار قومیت کے تقریباً ½ حصہ کو غیر اقوام میں شامل ہونے پر مجبور کر دیا گیا۔ یعنی قریب قریب ۰۰۰، ۰۰۰، ۳ کی گمیار آبادی کو دوسری ریاستوں کے حوالہ کر دیا گیا۔ رومانیا کو ٹرانسلوانیا ملا۔ (نقشہ دیکھئے) یوگوسلاویا کو بناٹ کا علاقہ دیدیا گیا اور زیکوسلاویکیا کے حصہ میں بھی کافی آبادی آئی۔ گویا کہ ۱۲۵ ہزار مربع میل کی ملکیت کو ۳۵ ہزار مربع میل محدود کر دیا گیا جس کی آبادی ۲۱ ملین باشندوں کی بجائے ۸ ملین ہو گئی۔ اس قطع و برید میں سب سے ناجائز بات یہ کی گئی کہ رو تھینیا کا ہنگرین علاقہ زیکوسلواکیا میں شامل کر دیا گیا۔ اگرچہ اس علاقہ کی تمام و کمال آبادی ہنگری کی گمیار قوم سے متعلق ہے اور گمیار قوم کے اعلیٰ طبقوں کی زمینوں پر مشتمل ہے مگر اس حرکت کی وجہ نقشہ پر ایک نظر ڈالنے سے واضح ہو جاتی ہے۔ فرانس کا مقصد یہ تھا کہ نہ صرف ہنگری کو ایک بے بس اور کمزور ریاست میں تبدیل کر دے بلکہ یہ بھی کہ اس کی اس طرح محاصرہ بندی کی جائے کہ وہ ہر چہار جانب سے ایسی ریاستوں سے گھر جائے جو فرانس کے ہمدرد تھے۔ یعنی زیکوسلواکیا کی سرحد رومانیا سے ملا دی جائے۔ اس محتاط منتقمانہ کارروائی کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہنگری ایک قطعاً زراعتی ملک ہو گیا اور اس کی آمدنی کا واحد ذریعہ غلہ اور شکر کی برآمد قرار پایا۔

لازم تھا کہ ہنگری ایک زبردست ازالہ وہم کا شکار ہو۔ دول یورپ کے (بے بنیاد) انصاف پر جو اعتماد قائم کیا گیا تھا اس کو بے معنی ثابت ہونا تھا۔ ساری قربانیاں بیکار ہوئی تھیں اور تسلیم و رضا کا جذبہ مضر ثابت ہوتا تھا۔ اس مایوسی کے عالم میں بیلاکن کی قیادت میں اشتمالی جماعت امید و کامرانی کا پیغام سناتی ہے۔ بیلاکن ہنگری کی نئی زندگی کا نمائندہ تھا۔ ہنگری کے اس جذبہ مدافعت کا نمائندہ تھا جو دول یورپ کی شاطرانہ چالوں کے ردعمل کے لئے معرض وجود میں آیا تھا۔ نہایت ہی متحیر العقل سرعت کے ساتھ بیلاکن برسر اقتدار ہو گیا۔ اس نے ہنگری میں قومیت کی ایک نئی لہر دوڑا دی، مظلوم طبقوں کو ایک نئی جان بخش دی، اور اصلاحات کا ایک نیا باب کھول دیا جس کا مقصد تعلیم کی فراوانی، مزدوروں اور کسانوں کو مراعات کی بخشش، بے روزگاری کا سد باب اور نسلی اقلیتوں کے مطالبات کو پورا کرنا تھا۔ لیکن طاقت حاصل کرنے کے لئے اور برقرار رکھنے کے لئے اس نے بھی ایک قسم کی وحشت انگیز فوجی حکومت قائم کر رکھی تھی۔ بہرحال جون میں نئے دستور کا نفاذ ہوا جو بالشویک دستور کا چربہ تھا قبل اس کے کہ اُس پر عمل درآمد ہوتا بیلاکن ایسے نامساعد مشکلات اور زبردستی سے دوچار ہوا کہ اس کو ہنگری سے فرار ہونا پڑا۔ ادھر تو ہنگری نئی زندگی حاصل کرنے کے لئے ہاتھ پیر مار رہا تھا اور ادھر دول یورپ کے اطمینان میں ہلچل پڑ رہی تھی کیونکہ ہنگری کی زندگی دول یورپ کے لئے موت کی مترادف تھی اس لئے ہنگری کو آزادی اور خود اعتمادی کی "مصیبت" سے بچانے کے لئے ہر قسم کا اقدام عمل جائز سمجھا گیا۔ رومانیا کی فوج کو ہنگری کے دار الخلافہ بوداپسٹ پر حملہ کرنے کے لئے چھوڑ دیا گیا اور تقریباً ۳ مہینہ تک قتل، غارتگری اور لوٹ مار کے جو مظاہرے پیش کئے گئے وہ انسانی حیوانیت اور بربریت کی تاریخ میں ایک "درخشندہ" باب سے تعلق رکھتے ہیں اور یہ لوٹ اس وقت تک جاری رہی جب تک کہ فرانس کو یقین نہ ہو گیا کہ ہنگری میں اب کوئی سکت باقی نہیں رہ گئی اور پھر وہ کسی قسم کی حرکت ناشائستہ نہ کر سکیگا۔ محض اسی پر اکتفا نہیں کیا گیا بلکہ اقتصادی ناکہ بندی سے ہنگری کو قطعاً بے بس کرنا مقصود تھا۔ اس ہنگامہ میں آئندہ کے لئے بہت سے امکانات پوشیدہ تھے۔ اور اسی قسم کی مذبذب اور غیر متیقن صورت حالات سے فسطائیت کی پیدائش ہوتی ہے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا اور ایک شخص نے جس نے جنگ عظیم کے زمانہ میں آسٹریا کی بحری فوج کی سرداری کی تھی، ہنگری میں آمریت کی بنیاد ڈالی۔ اس شخص کا نام ایڈمرل ہارتی ہے۔ لیکن اس نے اپنی آمریت کو شہنشاہیت کے قالب میں چھپانا چاہا اور غیر حاضر بادشاہ کی جگہ

جگہ اپنے کو محض ولی بادشاہ (قائم مقام حکمران) قرار دیا۔ یہاں پر یہ بات جاننی دلچسپ ہے کہ فروری ۲۰ء میں دول یورپ نے ایک اعلان کے ذریعہ یہ ظاہر کر دیا تھا کہ "ہم یہ ماننے کے لئے کسی حالت میں بھی تیار نہیں ہیں کہ ہیپسبرگ خاندان کا عود شاہی محض ہنگری قوم سے تعلق رکھتا ہے بلکہ یہ اچھی طرح سے سمجھ لینا چاہیے کہ ایسا حادثہ معاہدہ کی بنیادوں کے خلاف ہوگا اور دول یورپ کسی حالت میں بھی نہ تو اس کو مان سکتا ہے اور نہ برداشت کر سکتا ہے۔" اس واضح اور بین اعلان کے بعد تعجب معلوم ہوتا ہے کہ ہاردی ایسے شہنشاہیت پرست شخص کو کس طرح ہنگری کی عنان حکومت لینے کا موقع دیا گیا۔ لیکن اس کی وجہ صاف ظاہر ہے۔ ہاردی اشتمالیت یا اشتراکیت کے خلاف ایک فصیل کا کام دے سکتا تھا اور جہاں تک اس کے شہنشاہیت پرست جذبہ کا تعلق تھا اس کو قابو میں رکھنا کچھ دشوار نہ تھا۔ اور ہوا بھی ایسا ہی۔ ۱۹۲۱ء کے دوران میں شاہ کارل نے (جن کا ذکر اوپر آ چکا ہے) بوداپسٹ میں داخل ہونے کی کوشش کی مگر یہ سعی شرمندہ کامیابی اس لئے نہیں ہونے پائی کہ فرانس کی شہ پا کر زیکوسلواکیا اور یوگوسلاویا نے ہنگری کی سرحد پر فوج کا اجتماع شروع کر کے ہنگری کی آزادی کو ختم کرنے کی دھمکی دی۔

بہر حال ان چار ہنگامی سالوں میں ہنگری نے جو کچھ ترقی کی تھی وہ بیکار ثابت ہوئی اور جمہوریت کا قلع قمع کرنا ہاردی کا منتہا قرار پایا۔ چنانچہ وزیر اعظم بتھلین کی مدد سے ہاردی نے سامنتی اور جاگیرداری نظام کو دوبارہ قائم کرنا شروع کیا اور کھلم کھلا فسطائیت کے طریقوں پر عمل کر کے جمہوریت کو ختم کرنے کا بیڑا اٹھایا۔ رائے دہندگی کی طاقت عوام سے سلب کر لی گئی۔ ایک ذرا سی مثال سے اس حکومت کی خصوصیت کا اندازہ ہو جائیگا۔ تقریباً ۷۵ فی صدی آبادی ایسی تھی جس کے پاس زمین بالکل نہ تھی اور اسکے مقابل میں ۴۰ فی صدی زمین ایسے زمینداروں کے ہاتھ میں تھی جن میں سے ہر ایک کم از کم ڈیڑھ ہزار ایکڑ زمین پر قابض تھا۔ چونکہ یہ حکومت جمعیتہ الاقوام کے زیر سایہ عاطفت وجود میں آئی تھی اس لئے قرضوں اور دیگر مالی امداد سے اس کو زندہ رکھنے کی ہر ممکن کوشش کی گئی۔ اور اسی وقت سے ہنگری کو بھی جمعیتہ اقوام میں شریک کر لیا گیا۔

۱۹۲۵ء سے ۱۹۲۹ء تک کا زمانہ یورپ کے لئے سرسبزی اور برومندی کا زمانہ تھا مگر ۱۹۲۹ء سے جو سرد بازاری شروع ہوئی اُس نے ہنگری کو زیادہ نقصان نہیں پہونچا کیونکہ ۱۹۲۱ء سے قبل کی گرم بازاری سے بھی وہ کوئی خاص مستفید نہیں ہوا تھا۔ ۱۹۳۱ء سے ہنگری کی وزارت کی باگ ڈور ذرا جلد جلد ہاتھ بدلتی رہی۔ ۳۱ء میں بتھلین کو مستعفی ہونا پڑا۔ کیونکہ فرانس کسی اور کو وزیر بنانا چاہتا تھا۔ لیکن یہ صورت بھی زیادہ دیر قائم نہ رہی کیونکہ اٹلی بھی میدان عمل میں شریک ہو چکا تھا اور اس کی ریشہ دوانیاں اس طرح صورت پذیر ہوئیں کہ گمبوس برسر وزارت جلوہ گر ہوا۔ بہر حال یہ اندرونی ہنگامے کسی خاص اہمیت کے مالک نہ تھے کیونکہ اس دوران میں ہنگری کی خارجی حکمت عملی کی تشکیل ظہور پذیر ہو چکی تھی۔

مندرجہ بالا واقعات کی روشنی میں اب ہمارے لئے ممکن ہے کہ ہنگری کی سیاسی اہمیت کا صحیح اندازہ کر سکیں۔ اتنا جاننا اور ضروری ہے کہ اتحاد صغیر کے محاصرہ کی وجہ سے ہنگری ان ممالک کے متعلق ایک بنیادی اہمیت کا مالک ہے۔ نہ صرف یہ کہ دریائے ڈینیوب کا ایک معتدبہ حصہ ہنگری میں سے ہو کر گذرتا ہے بلکہ یہ بھی کہ زیکوسلواکیا کو جو ریلوے لائنیں رومانیا اور زیکوسلاویا سے ملاتی ہیں وہ ہنگری میں سے ہو کر گذرتی ہیں۔

ہنگری کی سیاست میں تین جذبے خصوصیت سے کار فرما رہے ہیں۔ ہاردی کی حکومت قائم ہونے کے وقت سے یہودیوں کے خلاف برابر کارروائیاں ہوتی رہی ہیں۔ جس وقت یہ حکومت وجود میں آئی تھی اُس وقت یہودی ہزاروں کی تعداد میں تہ تیغ کر دیئے گئے تھے۔ لیکن یہودیوں کی قوم کچھ ایسی سخت جان واقع ہوئی ہے کہ سخت سے سخت مصیبت کے باوجود وہ اپنی تجارت کو خیرباد کہنے کے لئے آسانی سے تیار نہیں ہوتی چنانچہ ان تمام مصائب کے باوصف یہودی کافی تعداد میں بوداپسٹ میں مقیم رہے اور اب بھی تجارت اور صنعت کا کافی حصہ ان کے قبضہ میں ہے۔ لیکن مابعد جنگ عظیم ہنگری کی ریاست کی وسعت میں جو تنسیخ ہوا اس کی وجہ سے ہنگری کے نوجوانوں کے لئے کافی ملازمتیں نہیں باقی رہ گئیں۔ اس لئے وہ اب یہودیوں کے کاروبار پر للچائی ہوئی نظریں ڈالتے ہیں اور اس کو غصب کرنے کی فکر میں ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ یہودیوں کے خلاف جذبہ منافرت اب بھی برسر کار ہے فسطائیت کی یہ خصوصیت ہے کہ اندرونی مفلسی سے توجہ ہٹانے کے لئے وہ قوم میں اور ضروری باتوں کے خلاف جذبہ کو بھڑکاتے ہیں۔ جرمنی میں یہی سوال ہوا اور ہو رہا ہے۔ نیم فسطائی ہنگری میں بھی ایسا ہی ہونا چاہیے تھا۔

ہم اوپر کہیں ذکر کر چکے ہیں کہ ہنگری میں زمین کی غیر مساوی تقسیم بہت مشکلات پیدا کرتی ہے اور کسان بہت بیزار ہیں۔ اِس لئے ضروری تھا کہ اُنکی توجہ ہٹانے کے لئے یہودیوں کے خلاف جو جذبہ ہے اُس کو ترقی دیجائے ہنگری میں بھی وسطی یورپ کے دیگر ممالک کی طرح ایک روز افزوں جماعت ہے جو جرمنی کی نازیوں کی ہمنوا یا ان کا آلۂ کار ہے۔ جس طرح جرمنی میں کسانوں کو بڑی زمینداریوں پر قبضہ کا لالچ دلا کر نازی جماعت میں شامل کر لیا گیا تھا اسی طرح ان کسانوں کو اپنانے کے لئے ہنگری کے نازی بھی یہی طریقہ اختیار کر رہے ہیں لیکن ڈر یہ ہے کہ کہیں جرمنی ہی کی طرح برسرِ اقتدار ہونے پر یہ دعاوی فراموش نہ کر دئے جائیں بہرحال اس سال کے شروع میں حالات ذرا نازک صورت اختیار کر رہے تھے اور نئے وزیرِ اعظم بیلا امریڈی نے عنانِ حکومت ہاتھ میں لیتے ہی اس مسئلہ کا حل کرنا چاہا۔ لیکن اُنہوں نے بھی وہی آزمودہ نسخہ استعمال کیا۔ یعنی یہودیوں کے خلاف ایک قانون بنایا جس سے متوسط طبقہ کے لوگوں کو خوشی حاصل ہوئی، ایک معتدل قانون اراضی بھی منظور کیا جس کی رو سے کسانوں اور چھوٹے زمینداروں کو چند مراعات عطا ہوئیں۔ لیکن فوج کی طرف سے بھی خطرہ تھا کہ وہ کہیں اس کشاکش میں شریک نہ ہو جائے اِس لئے فوج کی توجہ کو اسلحہ بندی کی طرف مبذول کر دیا۔

جن لوگوں کو جرمنی اور آسٹریا کی سیاست کا علم ہے وہ ہنگری کی موجودہ اندرونی سیاست کا مقابلہ جرمنی یا آسٹریا سے کئے بغیر نہیں رہ سکتے اور بہت حد تک ہنگری کی موجودہ حالت اس وقت کے مماثل ہے جب جرمنی میں ہنڈنبرگ کی صدارت میں فان پین وزارت کے فرائض انجام دے رہا تھا۔ ہنگری کے موجودہ وزیر اعظم امریڈی کی حالت فان پین سے ملتی جلتی ہے۔ یا دور کیوں جائیے۔ آسٹریا سے کیوں نہ مثال لیجئے۔ جو حیثیت شسنگ کی ۱۹۳۶ء میں تھی وہی امریڈی کی آج ہنگری میں ہے اور یہ خوف بے بنیاد نہیں ہے کہ وہی صورت حالات یہاں بھی رونما نہ ہو۔ امریڈی کو وزارت دینے سے پہلے ہی ہاردی ہنگری کی نازی جماعت کو سخت تنبیہ کر چکا تھا مگر جس طرح آسٹریا میں ڈولفس جمہوریت کی بیخ کنی کر کے نازی جماعت ہی کے ہاتھ میں کھیلا تھا اسی طرح ہنگری کی فسطائی جماعت (جو برسرِ حکومت ہے) نازی جماعت کی حکمت عملی کا شکار ہوتی معلوم ہوتی ہے۔ اور پھر ان دونوں جماعتوں میں زیادہ فرق نہیں۔ دونوں ایک ہی نظام کے خواہاں اور ایک ہی مقصد کے علمبردار ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ موجودہ حکومت اپنی آزادی کو برقرار رکھنا چاہتی ہے اور اگر نازی جماعت کا بس چلے تو وہ ہنگری کو بھی جرمنیٔ اعظم میں مدغم کر دے۔ گذشتہ سال نازیوں نے اپنے لیڈر میجر زلاسی کے زیرِ قیادت ایک ناگہانی تغیر کرنا چاہا تھا۔ مگر جس طرح آسٹریا میں وہ پہلی بار ناکام رہے یہاں بھی ان کو ناکامی کا مُنہ دیکھنا پڑا۔

بہرحال جرمنی کے آسٹریا پر قبضہ نے اور زیکوسلاوکیا پر حملہ کے امکانات نے ایسی صورت پیدا کر دی ہے کہ اس سے ہنگری کی بہت سی اُمیدیں وابستہ ہیں۔ ہم اوپر ذکر کر چکے ہیں کہ جنگ عظیم کے بعد جو ریاست ہنگری بنائی گئی اس کے بہت سے قدرتی حصے غیر ممالک کے سپرد کر دئے گئے۔ اور اس میں سے کافی حصہ زیکوسلاوکیا کے حصہ میں آیا۔ اب ہنگری کی گیارہ آبادی کو برابر یہ اُمید ہے کہ اگر زیکوسلاوکیا کے جرمنی باشندے جرمنی کے سپرد کر دئے گئے تو زیکوسلاوکیا کی گیارہ آبادی ہنگری میں کیوں نہ شامل کر دی جائے گی۔ اس طرح ہنگری کی سیاسی اہمیت بالکل روشن ہو جاتی ہے ہنگری بھی ان ریاستوں میں سے ہے جو جرمنی کے زیرِ قیادت معاہدہ وارسائی کی نظرِ ثانی کے متمنی ہیں۔ اور ہنگری کی ہمیشہ سے یہ شکایت رہی ہے کہ اِس معاہدہ کی رو سے ان کے اوپر ظلم اور بے انصافی کے پہاڑ ٹوٹ پڑے ہیں۔ ان کا مطالبہ ہے کہ ان کی سرحد کی اس طرح توسیع کی جائے کہ زیکوسلاوکیا اور بناٹ کی گیارہ آبادی اس میں شامل ہو جائے اور ٹرانسلوانیا کو خود مختار ریاست بنا دیا جائے۔ چونکہ یہ مطالبے فرانس وغیرہ کو پریشان کرنے میں بہت حد تک کارگر ثابت ہوتے ہیں اِس لئے جرمن حکمت عملی کا یہ نہایت ہی اہم جزو رہا ہے کہ ہنگری کے ان مطالبات کی حمایت کی جائے۔ صرف یہ ہی نہیں بلکہ اور بہت سے وجوہ ہیں جو ہنگری کو جرمنی کے ساتھ ایک رشتہ میں منسلک کئے ہوئے ہیں۔

آسٹریا کی شمولیت سے جرمنی ڈینوبی ممالک کے بہت قریب ہو گیا ہے اور اس کے لئے اب زیادہ آسان ہو گیا ہے کہ ان زرعی ممالک پر اپنا اثر جمائے۔ ہنگری کے لئے تو قریب قریب ناممکن ہو گیا ہے کہ جرمنی کے معاشی مفاد کے ساتھ اپنے کو وابستہ نہ کرلے اور پھر اِس وابستگی سے اپنا بھی مفاد مقصود ہے۔ ہنگری کی خام اشیاء اور غلوں کی نکاسی

کے لئے جرمنی ہی سب سے اچھا بازار ثابت ہوسکتا ہے اور دیگر ممالک سے بھی تجارت کا راستہ جرمنی ہی کے اندر سے ممکن ہے۔ ساتھ ہی ساتھ گذشتہ چند مہینوں کی سیاست سے یہ نتیجہ ظاہر ہوا ہے کہ ہنگری کے سامنے اپنی سیاسی اہمیت کو ترقی دینے کے لئے کئی نئے راستے کھل گئے ہیں۔ کاونٹ بتھلن (سابق وزیر اعظم ہنگری) کے تازہ ترین الفاظ یہ ہیں: "اگر ہم نئی صورت حالات سے پوری طرح کام لے سکیں، تو یہ مناسب صورت ایسی برمحل ہے کہ ہمارے لئے ممکن ہوگیا ہے کہ ٹرائنن کی ہزیمت کو دور کرسکیں اور ایک بار پھر ڈینیوب کی وادی میں ایک اہم حیثیت کے مالک ہو جائیں"۔ اب تک تو اتحاد صغیر ایک طرح سے ہنگری پر حاوی تھا اور موخر الذکر کے لئے کبھی ممکن نہ ہوسکا کہ اول الذکر اتحاد کی مرضی کے خلاف کوئی قدم اُٹھائے۔ لیکن جرمنی اور آسٹریا کے اتصال نے اس توازن کو درہم برہم کر دیا ہے۔ اب زیکوسلاویکیا کو خود لینے کے دینے پڑ گئے ہیں۔ اس میں اتنی ہمت کہاں کہ ہنگری کی روز افزوں اہمیت کو روک سکے۔ اب تو ہنگری خود زیکوسلاویکیا کی چٹکیاں لینے کے قابل ہوگیا ہے۔ ہنگری اس وقت کا خواب دیکھ رہا ہے جب برلن روم محور کی مدد سے وہ ڈینیوب وادی کا سب سے اہم ملک قرار پائیگا۔ لیکن ایک اور بات ہے جو اس ملک میں خلل انداز ہوتی ہے اور جو اس خواب کے شرمندۂ تعبیر ہونے میں مانع ہے اور وہ ہے جرمنی کا آخرالامر ارادہ۔

خواہ جرمنی کوئی چال چلے جب تک اُس میں ہمت اور طاقت ہے وہ سارے مشرقی و وسطی یورپ پر اپنا اختیار کلی قائم کئے بغیر نچلا نہیں بیٹھنا چاہتا۔ جرمنی کے نقطۂ نظر سے آج یا کل ہنگری کو بھی جرمنی کے زیر حکومت آنا پڑے گا۔ ہنگری میں جو نازی جماعت ہے اُس کا مقصد بھی یہی ہے ورنہ یہ تو ظاہر ہی ہے کہ ہنگری سے صلح قائم رکھنے میں جرمنی کا فائدہ ہی فائدہ ہے۔ زیکوسلاویکیا کے مدمقابل ہنگری کو استعمال کیا جاسکتا ہے، ہنگری سے سارے تجارتی و معاشرتی فوائد حاصل کئے جاسکتے ہیں اور اس کو اپنا دشمن بنانے میں سراسر نقصان ہی ہے۔ ایسے تو برطانیہ اور فرانس بھی ہنگری کی قسمت کے متعلق بے توجہی نہیں برت سکتے کیونکہ اول مشرقی یورپ میں طاقت کا توازن قائم رکھنے کے لئے ہنگری کا وجود ازبس ضروری ہے، اور ثانیاً یہ کہ برطانیہ کے ذاتی تجارتی اغراض ہنگری کی آزادی پر مبنی ہیں۔ ڈر یہ ہے کہ اپنی طاقت کے زعم میں جرمنی تاریخ سے دانستہ اغماض برتتے ورنہ گذشتہ کئی صدیوں کی تاریخ اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ جب کبھی بھی جرمن قوم نے کسی غیر قوم کے خلاف زبردستی سے کام لینا چاہا تو موخر الذکر میں قومیت کا ایسا شدید جذبہ عود پذیر ہوتا ہے کہ جرمن قوم کو قطعی کامیابی کبھی حاصل نہ ہوسکی۔ بہرحال جرمنی ان سب تلخ حقائق سے چشم پوشی نہیں کرسکتا۔ اس لئے یہ تو ممکن نہیں کہ اگر کامیابی کے امکانات بہت قوی نہ ہوں تو بھی نازی جماعت ہنگری میں شورش پیدا کرے۔ اس وقت تو ہنگری کی اخلاقی اور غیر اخلاقی ہمدردی کو استعمال کرنا ہے تاکہ زیکوسلاویکیا کے لئے جائے مفر بالکل نہ رہ جائے۔ یہ تو یقینی ہے کہ اگر جرمنی اور زیکوسلاویکیا میں جنگ چھڑ گئی تو ہنگری جرمنی کا ساتھ دے گا۔ یا کم از کم غیر جانبدارانہ رویہ تو قطعی اختیار کرے گا۔ یہ بات بہت سے لوگوں کو نہیں معلوم ہے کہ ستمبر ۳۵ء میں رمنٹز میں ایک اجتماع ہوا تھا جس میں جرمنی، ہنگری، پولینڈ اور بلگیریا کے نمائندے شریک تھے اور جس میں غیر سرکاری طور سے یہ طے پایا تھا کہ ان ممالک کا ایک اتحاد قائم کیا جائے۔ بہت ممکن ہے کہ اگر زیکوسلاویکیا پر حملہ ہو تو یہ اتحاد اپنا اثر دکھائے۔

یورپ کی سیاست پر تبصرہ کرنے میں یہ دقت پیش ہوتی ہے کہ امکانات پر حکم لگاتے وقت متعدد بار "اگر" کو استعمال میں لانا پڑتا ہے یعنی اگر ہٹلر نے ہنگری پر زبردستی قبضہ کرنا چاہا اور نازی جماعت کو فروغ دینے کی کھلم کھلا کوشش کرنے لگا تو یہ لازمی ہے کہ ہنگری بھڑک جائے گا اور نہ صرف جرمنی سے اپنا تعلق قطع کرلے گا بلکہ اپنے وجود کو قائم رکھنے کے لئے جرمنی کے مخالف اقوام سے اپنا ناتا جوڑلیگا۔ اور اگر ہٹلر بدستور اپنی موجودہ حکمت عملی پر عمل پیرا رہا جس کے ذریعہ ہنگری کو اپنے تجارتی اور اقتصادی محور میں شریک کرلینا مقصود ہے اور جس کے ماتحت ہنگری کے مطالبات میں مدد دینا بھی شامل ہے تو ہنگری جرمنی کے ساتھ برابر شریک رہیگا اور فسطائی گروہ بندی کے استحکام میں اپنا حصہ پیش کرنے سے دریغ نہ کرے گا۔ بہرحال یہ تو امر قطعی ہے کہ آئندہ چند ہفتوں یا مہینوں میں زیکوسلاویکیا کی قسمت کا فیصلہ ہوگا۔ اور کچھ نہیں تو کم از کم اس قسمت کے فیصلہ سے ہنگری کا بہت قریبی تعلق ہے۔ پس ہنگری بھی منجملہ ان ممالک کے ہے جنکی مٹھی میں یورپ کا امن ہو۔ لیکن چونکہ ہنگری جرمنی کے اشاروں پر چل رہا ہے اس لئے اسکی مستقبل کی حکمت عملی کا فیصلہ برلن ہی میں ہوگا۔

۱۲ راگست ۳۸ء

زیکوسلاویکیا اور نازی جرمنی کی رفتار سیاست

(ف۔ س۔ ج)

آسٹریا پر نازی جرمنی کے قبضہ کے بعد بھی یہ خیال کرنا کہ زیکوسلاویکیا کی سیاسیات میں پیچیدگیاں نہیں ہوئی ہیں۔ سیاسی نبض سے بڑی بے خبری ہوگی۔ آج واقعات کیا کہہ رہے ہیں؟ —— جرمنی سے اتحاد کا جذبہ عالمگیر ہوتا جارہا ہے۔ ہنگامی وطنیت کے سیلاب میں اقتصادیات کو فراموش کر دیا گیا ہے۔ معمولی شکایات کو بھلاوے دیئے جارہے ہیں۔ اور پریگ گورنمنٹ کی بے لاگ تجاویز کو ہر لمحہ ٹھکرایا جارہا ہے۔

بہت ساری شکایات تو ہینلن پارٹی کی اپنی پیدا کردہ ہیں۔ ۱۹۳۷ء تک ایک جرمن کو زیکوسلاویکیا میں جرمنی کے بہ نسبت زیادہ آزادی حاصل تھی، آج وہی آزادی جکڑ بندی میں ہے، مگر اس میں حکومت کی زیادتی کس طرح ہوسکتی ہے۔ آج حکومت کو پہلے سے زیادہ امن اور نظم کی ضرورت ہے، انگلستان میں ہوم سکریٹری نے حالات کی نزاکت کو دیکھکر اکثر فسطائی جلوسوں پر حکم امتناع لگایا۔ آسٹریا کے واقعہ کے بعد جذبات وحشیانہ طور پر ابھرے ہیں، یہی وجہ ہے کہ پریگ حکومت نے مستقبل کی الجھنوں اور پریشانیوں سے بچنے کے لئے ابھی زیکوسلاویکیا میں ایسے قوانین بنائے۔ یہ قانون اٹل نہیں ہیں اور کوئی وجہ نہیں ہے کہ اگر جرمن چاہیں اور یہ ختم نہ ہوں۔ البشر ۱۹۳۸ء کے موقع پر حکومت نے قیدیوں کو بغیر کسی تفریق اور پابندی کے عائد کئے رہا کردیا، یہ حکومت کی دریادلی کا کم ثبوت نہیں ہے۔

ہر ہینلین نے یورپ کی ایسی نازک حالت کے موقع پر جیسے ہنگامے پیدا کئے ہیں اُن کو دیکھتے ہوئے ان کی شخصیت کو امن عالم کی راہ میں کانٹا تصور کرنا حکومت کی بھول نہیں ہے۔ یہ خیال بھی صحیح نہیں ہے کہ جھگڑا رہنماؤں (لیڈروں) کے درمیان ہے۔ جھگڑے ہمیشہ مقامی سرکاری عہدے داروں اور نام نہاد پارٹی لیڈروں کے درمیان شروع ہوتے ہیں

پھر نازی پارٹی کے عروج پاتے ہی زیکوسلوویکیا میں ایسی تیز طبع پارٹیوں کا ابھرنا کوئی اچنبھے کی بات نہیں ہے۔

آسٹریا پر نازی تسلط سے پہلے ہینلین اور ہوزدا کے درمیان سمجھوتے کی صورت معلوم ہوئی تھی۔ انہی دنوں میں ہینلین نے پریس کو ایک بیان دیتے ہوئے کہا تھا "لیڈروں کے درمیان کوئی ذاتی مخاصمت نہیں ہے۔ جھگڑے چھوٹے افسروں کے مابین ہیں۔ یوں یہ کسے معلوم نہیں ہے کہ جرمن اور زیکس اقوام کے ایک ساتھ گھل ملکر رہنا ہے"۔ مگر یہ بات آج نہیں ہے اور آج بات ایسی سیدھی بھی نہیں ہے کہ صرف بات چیت سے طے ہوسکے اب یہ وطنیت کا بھوت ہے جو سروں پر سوار ہے، شان کی تڑپ ہے جو دماغوں میں سمائی ہوئی ہے۔ یہ بھوت اور یہ تڑپ صرف زیکوسلوویکیا کی جرمن قوم سے متعلق نہیں ہے بلکہ جرمنی خود سیماب ہورہا ہے فخر اور غرور کی موجیں ہیں جو وطنیت کے ساحل پر خودداری اور صداقت کی کشتیوں سے ٹکریں مار رہی ہے۔ ہٹلر کے پہلے وعدہ کی تکمیل اُس دن ہوئی جب ستر لاکھ آسٹرین "آزاد" کردیے گئے" دوسرا آماجگاہ زیکوسلاویکیا ہے اور اس موقع پر یورپ کا اختلاجی کیفیت میں ہونا بے معنی سی بات نہیں ہے۔

موجودہ حالات کی صورت میں سب سے نمایاں بات زیکس اور سلوکس قوموں میں اطمینان کا پایا جانا ہے، رائے عامہ یہ ہے کہ نہ ہٹلر اور نہ ہینلین سیاسی اتحاد کی موافقت میں ہے، ڈاکٹر ہوزدا وزیر اعظم نے جرمن قوم کو بہت سے مراعات کا یقین دلانے کی کوشش کی اور وعدہ کیا کہ ان کی بائیس فی صدی آبادی کا تناسب آبادی کے لحاظ سے ہی کیا جائے گا۔ اور جرمن اضلاع کے لئے خاص آسانیاں بھی پیدا کی جائیں گی وہ اور کیا کرسکتا تھا۔

برساتی کیڑوں کی طرح جنگ عظیم کے بعد پیدا ہوجانے والی حکومتوں کا یہ خیال ہوا کہ وہ دشمنوں میں گھری ہوئی ہیں اور اُن کی بقا کا انحصار اُن کی اپنی طاقتوں پر ہے۔ یہی وجہ تھی کہ حکومت کے نظم و نسق کو حکومت کے مرکزی مقام سے متعلق کیا گیا۔ آج ضرورت ہے کہ اس پالیسی میں تبدیلی کی جائے۔

زیکوسلوویکیا میں ایک آزاد جرمن حکومت کا ہونا ناممکن سی بات ہے جغرافی طور پر بھی اور سیاسی طور پر بھی۔ البتہ جرمن شکایات کو اس طرح دور کیا جاسکتا ہے کہ زیکوسلوویکیا کو برطانیہ کے کونٹی کونسلوں کی طرح مختلف اضلاع میں تقسیم کردیا جائے۔ یہ بظاہر بڑی آسان ترکیب ہے مگر یہ آسٹریا پر نازی

تسلّط سے پہلے ضرور مؤثر ہوسکتی تھی۔ اب نہیں۔ اس لئے کہ اگر آج ایسا ہوجائے تو ہنیلین پارٹی کے نوّے فی صدی مطالبات خاک میں مل جائیں۔ یوں میونسپلٹیوں کو کافی طاقت حاصل ہے اور ان کو آسانی سے دیہاتی اضلاع میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

دوسری ترکیب صلح کی یہ بھی ہوسکتی ہے کہ جرمنی کو شمالی مغربی اور شمالی مشرقی کنارے نذر کردئے جائیں اور تبادلہ میں گھیینز کا چھوٹا سا زیکس ضلع لے لیا جائے۔ لیکن کیا جرمنی اس پر بھی رضامند ہوسکے گا؟ اس سوال کا جواب تو اُسی وقت معلوم ہو جب جرمنی کے ارادے معلوم ہوں۔ آخر جرمنی چاہتا کیا ہے؟ صرف ہنیلین کے چاہنے سے کیا ہوتا ہے؟ معلوم تو یہ ہونا چاہئے کہ ہٹلر کیا چاہتا ہے؟ زیکوسلوویکیا تو بڑے مسئلے کی ایک معمولی سی کنجی ہے۔ بہ حقیقت ہے کہ ہٹلر کا مقصد ان تمام جھگڑوں میں حصہ لینے سے صرف یہ ہو کہ یورپ کے جنوبی مشرقی شاہراہ پر نازی تسلّط ہو جائے۔ یہاں بھی یہ بات سوچنے کی ہے کہ اگر غلبہ تجارتی ہے تو پھر ڈرنے کی زیادہ بات نہیں ہے۔ کیونکہ جنوبی مشرقی راستہ سے ہی جرمنی تجارت کو فروغ دیا جاسکتا ہے۔ لیکن اگر غلبہ سیاسی یا غیر عمرانی ہے پھر البتہ معاملہ نازک ہو جاتا ہے۔

ہٹلر کہتا تو یہ ہے کہ اُسکا مقصد صرف یہ ہے کہ جرمن قوم پر جرمنی سے باہر بھی اس کا تمدنی تسلّط ہو۔ ایسی حالت میں وہ کسی قدر عمرانی استحکام کی بھی خواہش کرے گا۔ لیکن اگر اُس کا مقصد یورپ کے جنوبی مشرقی علاقہ کی باگ اپنے ہاتھ میں لے لینے سے ہے پھر خواہش میں سیلاب کا سا بھاؤ پیدا ہوجانیکا اندیشہ ہے اور رکاوٹ کہیں بھی نظر نہیں آتی۔

موجودہ دنوں میں تو جرمنی کا ذمہ دار حلقہ زیکوسلوویکیا پر حملہ کے خیال پر بھی مضحکہ اُڑاتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ وہ جو چاہتے ہیں پُرامن سمجھوتہ سے ہی حاصل ہو جائے گا۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ وہ اس فکر میں ہیں کہ زیکوسلوویکیا کو سیاسی طور پر بے یار و مددگار کردیا جائے۔ فرانس اور روس سے تعلقات ختم ہوجائیں۔ میں نہیں سمجھتا کہ "پُرامن سمجھوتہ" سے یہ بات کس طرح حاصل ہوسکتی ہے، یہ کون نہیں جانتا کہ جرمنی زیکوسلوویکیا کے اندرونی معاملات میں برابر دخل انداز ہو رہا ہے۔

زیکوسلوویکیا میں زکیس اور جرمن کے درمیان ایک مسلسل رسّہ کشی ہو رہی ہے۔ یہ رسہ کشی اسلحہ جات جنگی کے لئے نہیں ہے بلکہ زمین کی ملکیت کے لئے ہے۔ اگر کوئی زکیس یا جرمن فریق مخالف سے زمین قیمتاً بھی حاصل کرلیتا ہو تو اپنی قوم اور پارٹی کا ہیرو بن جاتا ہے۔ یہ رسّہ کشی صدیوں سے ہو رہی ہے یہی وجہ ہے کہ اتنی محنت اور جہد کے بعد حاصل کی ہوئی ملکیت کو آسانی سے چھوڑنے کے لئے تیار نہیں ہوتا۔

مگر جرمنی کا کہنا یہ ہے کہ زیکوسلوویکیا میں رہنے والی جرمن قوم سے اُس کا تعلق خون اور نسل کا ہے۔ آباؤ اجداد کے خون کی حرارت ہے جو دونوں بچھڑے بھائیوں کو ملاپ کی گرم گرم دعوت دے رہی ہے۔ مثلاً اگر آئرلینڈ جنگ عظیم میں جرمنی کا ساتھ دیتا اور "اسٹر" پر قبضہ کر لیتا۔ کیا انگلستان اور اسکاٹ لینڈ اس وقت تک چین سے بیٹھ سکتے تھے جب تک کہ وہ "السٹر" دوبارہ واپس نہ لے لیتے۔

پھر بھی میرے نزدیک زیکوسلوویکیا اپنے رویّہ کے لئے حق بجانب ہے؛ آخر وہ ہٹلر اور اسکی وطنی خودداری پر اپنے تاریخی قلعوں کو کیوں بھینٹ چڑھا دے؟ وہ چند الدار صنعتی و حرفتی اضلاع ایک غیر حکومت کی نذر کیوں کردے؟ یہ وہ اضلاع ہیں جنکی صنعت و حرفت زیکوسلوویکیا کی بیکاری کی بڑی حد تک دور کرسکتے ہیں اور ان سے جرمنی کو صرف معمولی سا فائدہ پہونچ سکتا ہے ــــ ہزاروں اور لاکھوں کی تعداد میں زکیس کیوں جرمن طاقت کے زیر نگیں ہوجائیں؟ اپنی روایات کو صرف اس خیال پر کہ اپنے بچے جرمن کہلائے جائینگے کیوں فنا کردے؟ ــ جبکہ یہ ڈر بھی ہو کہ کل کو یہی بچے ملک کو ایک دائمی غلامی کے پھندے میں پھنسانے کے لئے آلہ کار بنائے جائیں گے؟ ــــ کیا یورپ کا کوئی اور ملک ہے جس نے اقلیت کے ساتھ اس قدر مراعات کی ہیں؟

میں ڈوب کے عمق میں سرگرانی نہ رہی
سیلاب اٹھا جب میں پانی نہ رہی
سمجھا جو حیات کو تو ہستی ہی موت
جب موت عطا ہوئی تو فانی نہ رہا
انجم

ہاں مرگ و حیات سے سمجھتا ہے نہیں ہے راز
آغاز انجام ہے تو انجام ہے آغاز
دنیا ہے زمانہ جب اجل کی بھی
دل سے آتی ہے شہنائی کی آواز
انجم

معروضِ مائل

(۱)

کہاں کا لڑکپن کہاں کی جوانی سراپا الم ہے مری زندگانی
پریشاں ہنوز ہوں کے میری کہانی کہاں تک پرستاریٔ نقشِ فانی
ہٹاؤ، ہٹاؤ
مجھے! بھول جاؤ

(۲)

مجھے ڈھونڈھنے پر نہ پانے سے پہلے مرے ہجر میں تلملانے سے پہلے
مرے غم میں آنسو بہانے سے پہلے زمانے میں وہ وقت آنے سے پہلے
یہ کرلو، بچاؤ
مجھے، بھول جاؤ

(۳)

کہاں میں! کہاں تم! کہاں ہمنشینی یہ گل چینیوں کے عوض خار چینی
کہے گا اسے کوئی بھی دُور بینی یہ توہین ہے حُسن کی اک یقینی
نظر سے گراؤ
مجھے! بھول جاؤ

(۴)

بقائے بشر درحقیقت فنا ہے مسافر ہوں میں اور یہ دنیا سرا ہے
کسی کو یہاں کوئی بھی پوچھتا ہے ہاں کسمپرسی سمجھیں کیا ہوا ہے
محبت گھٹاؤ ——— مجھے بھول جاؤ

(۵)

عبث ہے زمانے سے دُوری کا شکوہ زمانہ کبھی بھی ہوا ہے کسی کا
مری ذات پر اور اتنا بھروسا بھلا ایک پردیسی کی پیت ہی کیا
بس اب باز آؤ
مجھے: بھول جاؤ

(۶)

یہ خاموش نالے بقصد رازداری تبسم کے پردوں میں چھپ چھپ کے زاری
مرے واسطے زحمتِ خط نگاری بڑے جھنجھٹے ہیں کہا مانو پیاری
نہ دل کو کڑھاؤ
مجھے: بھول جاؤ

(۷)

یہ رازِ محبت چھپائے چھپے گا؟ یہ پیمانِ الفت بنا ہے بنے گا؟
تمھاری محبت پہ عالم ہنسے گا؟ کوئی کچھ کہے گا، کوئی کچھ کہے گا؟
مری مان جاؤ
مجھے! بھول جاؤ

(۸)

خدا کے لئے جاؤ اور جا کے سوؤ تمھاری بلا سے کوئی جاگتا ہو
یہ کس نے کہا ہے کہ شعلوں سے کھیلو مری آرزو کو مری جستجو کو
نہ اتنا بڑھاؤ ——— مجھے! بھول جاؤ

(۹)

نہ میں صورتاً کوئی ایسا حسیں ہوں — نہ میں نازپیکر نہ میں نازنیں ہوں
یہ مانا کہ میں اک خیال آفریں ہوں — مگر یاد رکھنے کے قابل نہیں ہوں

بھلاؤ، بھلاؤ
مجھے! بھول جاؤ

(۱۰)

غموں سے نہ ٹھکراؤ۔ دل کی خوشی کو — بدلتی ہو کیوں آنسوؤں سے ہنسی کو
مجھے سونپ دو میری ہی بیکسی کو — گنوانا ہی مقصود ہے زندگی کو

تو پھر یوں گنواؤ
مجھے! بھول جاؤ

(۱۱)

مرے پاس عزت ہے دولت نہیں ہے — مصیبت ہے زحمت ہے راحت نہیں ہے
لیاقت نہیں ہے حکومت نہیں ہے — غرض جب کوئی قدر و قیمت نہیں ہے

تو دھوکا نہ کھاؤ
مجھے! بھول جاؤ

(۱۲)

تمھیں حسن کی شوخیوں کی قسم ہے — تمھیں شب کی مدہوشیوں کی قسم ہے
تمھیں دن کی سرگوشیوں کی قسم ہے — تمھیں خود فراموشیوں کی قسم ہے

ترس خود پہ کھاؤ
مجھے! بھول جاؤ

(۱۳)

تمھیں واسطہ میرے ناشادجی کا — تمھیں واسطہ میری اس بیخودی کا
تمھیں واسطہ اور کیوں دل کسی کا — تمھیں واسطہ میری ہی شاعری کا

یہ جھگڑا مٹاؤ
مجھے! بھول جاؤ

(۱۴)

یہ پُردرد منظوم معروض مائل — وفاریز جذباتِ فرقت کا حاصل
نہیں ہے مگر دل سے سننے کے قابل — یہ سب کہہ کے بھی میں نہیں اسکا قائل

کہ تم قہر ڈھاؤ
مجھے! بھول جاؤ

(ابوالبیان مائل لکھنوی)

انصاف! بتوں کی چاہ دینے والے
حسن اُن کو، مجھے نگاہ دینے والے
کس منہ سے مجھے حشر میں دے گا تعزیر
دل کو ہوسِ گناہ دینے والے

اپنے ہی دماغ و دل کا مقصود نہیں
خود اپنے ہی دل میں اپنا مسجود نہیں
واقف ہوں کہ سوچنے میں ہی کافر ہوں
کیا سچ یہ سوچتے ہیں معبود ہوں میں

گورنمنٹ میسور

سلک فیکٹری



کی بنی ہوئی جارجٹ، کریپ یا ساٹن ملاحظہ فرمائیے یقیناً آپ اُنکی عمدہ بناوٹ اور خوبصورتی کو دیکھکر ہندوستانی صنعت پر متحیر رہ جائیں گے کیونکہ وہ بالکل ایسی ہی عمدہ بنی کارآمد، دیرپا اور مضبوط مال سے تیار کی جاتی ہیں، جیسے ولائتی کثیر تعداد میں نئی قسم اور جدید ترین ڈیزائن کے نمونے ملاحظہ فرمائیے، یہ خالص اور صرف خالص ریشم سے تیار کی گئی ہیں، اس میں کسی قسم کی ولائتی یا نقلی آمیزش نہیں ہے۔

گورنمنٹ سلک فیکٹری میسور

ایجنٹ برائے دہلی اور صوبجات متحدہ

میسرز گوکل چند کھنہ اینڈ کمپنی سودیشی کلاتھ مرچنٹس

دہلی کلاتھ مارکیٹ، لکشمی بازار گیٹ، کوئنس روڈ دہلی

عروسی

یہ ایک کامیاب علاج ہے جو بعد روغن عروس ترتیب دیا گیا ہے۔ مگر دراصل عروسی کی کامیابی کا راز بتقاضائے خریداران طشت از بام کیا جاتا ہے، جو بمصلحت اشارہ اشتہار میں لکھا جاتا تھا۔ لیکن اس طرح پر خط و کتابت کی طوالت لوگوں کو تکلیف دہ تھی۔ تاہم دوسروں کے مقابلے میں کامیاب اور مانگ زیادہ تھی، اور صاحب ضرورت کو خاص طور پر لکھا جاتا تھا (کہ اگر لاغری کے سوا پیش و پس میں ناہمواری و کجی ہو تو پہلے دو شیشیاں جو تین دن میں بالکل اس عیب کو رفع کر دیں گی، موافق ہدایات استعمال کریں۔ جن کی قیمت مبلغ ۵ ہے۔ بعدہٗ عروسی کا استعمال طاقت رفتہ اُبھار کر دائمی نفع کا باعث ہوگا) ورنہ معمولی شکایات تو عروسی کھو دیگی۔ یہ علاج ہر موسم میں ہو سکتا ہے۔ اس کے ہمراہ چار چیزیں مومی، نباتی، کلیدی، ثعلبی اور دی جاتی ہیں۔ ایک سٹ عروسی ہفتہ بھر کو کافی ہوتا ہے۔ جس کی قیمت ۵؎ علاوہ محصول ڈاک مقرر ہے۔ صاحب فرمائش نام و پتہ خوشخط تحریر فرمائیں۔ عروسی کے استعمال سے کامیاب ہونے والے حضرات کے بیشمار سارٹیفکٹ موجود ہیں جو بوجہ طوالت درج نہیں کئے جاتے۔

شفاخانہ رضویہ چاندنی محل دہلی

ناظرین رسالہ کلیم

اگر آپ ادب اردو کی خدمت کرنا چاہتے ہیں۔
اگر آپ کلیم کی خوبیوں میں خاطر خواہ اضافہ دیکھنا چاہتے ہیں۔
اگر آپ ملک کے بہترین شعراء اور ادباء کے حوصلے بڑھانا چاہتے ہیں۔
اگر آپ اپنے علمی و ادبی ذوق کو ترقی دینا چاہتے ہیں۔
اگر آپ اردو کو ہندوستان کی واحد زبان دیکھنا چاہتے ہیں۔
اگر آپ ماضی اور حال کے شعراء اور ادباء کا مقابلہ کرنا چاہتے ہیں۔
اگر آپ بکفایت بہترین اخلاقی اور ادبی کتب خریدنا چاہتے ہیں۔

تو

کلیم بک ڈپو ایجنسی لو اس نمبر ۴ دریا گنج دہلی سے خریدئیے

شاعرِ انقلاب حضرتِ جوش ملیح آبادی

کی

چار (۴) پُرانی تصانیف

حضرتِ جوش نے ایک مدت ہوئی چار چھوٹے چھوٹے رسائل طبع کرائے تھے۔ لیکن اُن کی شاعرانہ بے نیازی نے اس کی اجازت نہ دی کہ اُنھیں شائع کرتے اتفاق سے یہ چیزیں میری نظر سے گزریں تو مناسب معلوم ہوا کہ اُن کی قیمت غیر معمولی طور پر کم کرکے اُنھیں شائقین کے ہاتھوں تک پہنچا دیا جائے۔

(۱) **جذباتِ فطرت**} حضرتِ جوش کی وہ معرکہ آرا نظم ہے جس میں مظاہرِ قدرت کی طرف سے شعرائے اُردو کی خدمت میں یہ اپیل کی گئی ہے کہ وہ پُرانی روش کو ترک کر دیں۔ قیمت ۱۲ر رعایتی ار

(۲) **اوراقِ سحر**} یہ حضرتِ جوش کے اُن لطیف چھوٹے چھوٹے جملوں کا مجموعہ ہے جس میں سحر خیزی کے محاسن بہت لطیف پیرایہ میں بیان کئے گئے ہیں۔ قیمت ۵ر رعایتی ۲ر

(۳) **آوازۂ حق**} یعنی معرکۂ تسلیم و رضا کے سب سے زبردست اور عدیم المثال ہیرو اور جنگِ حق و باطل کے سب سے بڑے سادات حسینؑ ابن علیؑ کے خونِ ناحق اور صبر و استقلال کا ایک عظیم الشان مرقع اور آپ کی اخلاقی اور روحانی تعلیم کا ایک نہایت درخشاں آئینہ۔ قیمت ۸ر رعایتی ۳ر

(۴) **مقالاتِ زرّیں**} یہ حضرتِ جوش کے نادر کلمات فلسفیانہ اقوال اور ادبی لطائف کا دلچسپ اور کارآمد مجموعہ ہے۔ قیمت ۱۱ر رعایتی ۴ر

پورے سٹ کی رعایتی قیمت ۱۰ر محصول ڈاک ۲ر وی پی منگانے کی زحمت نہ فرمائیں۔ بلکہ ڈاک کے ٹکٹ بھیج کر طلب کریں۔

ملنے کا پتہ

منیجر کلیم بک ڈپو۔ چشتی نواس نمبر ۴ دریا گنج دہلی

خریداران

سے گزارش ہے کہ خط و کتابت کے وقت نمبر خریداری کا حوالہ ضرور دیں۔ جواب طلب امور کے لئے جوابی کارڈ یا ایک آنہ کا ٹکٹ بھیجنا چاہئے خط و کتابت کے وقت اتنا ضرور خیال رکھیں کہ مضمون اور اپنا نام و پتہ صاف تحریر کیا جائے اس میں آپ کا اور ہمارا نقصان ہے ورنہ عدم تعمیل کی شکایت معاف۔

نیازمند منیجر کلیم

بنام قوت وحیات

کلیم دہلی

آئے گا نہ جانے کب زمانہ اپنا
قدرت سے ملا ہے مجھکو صد حیف یہ حکم

آگے کئی صدیوں ہے فسانہ اپنا
بہروں کو سنائے جا ترانہ اپنا

منظور شدہ
ڈائرکٹران تعلیم
ریاستہائے میسور، پٹیالہ، وحیدر آباد دکن

سالانہ چندہ چھ روپے
ششماہی چندہ تین روپے آٹھ آنے

سہ ماہی چندہ دو روپے
قیمت فی پرچہ نو آنے

جلد ۷ | نمبر ۴

فہرست مضامین بابتہ ماہ اکتوبر ۱۹۳۸ء

نمبر شمار	عنوان	مضمون نگار	نمبر صفحہ
۱	اشارات	مدیر	۲۵۸
۲	فتنۂ حرم (نظم)	جوش ملیح آبادی	۲۶۳
۳	مسلمانوں کی سیاسیات میں ذہنی انتشار	جناب عبداللطیف صاحب اعظمی	۲۶۵
۴	برادری	جناب تقی صاحب مہرولی	۲۷۳
۵	بصیرت (نظم)	جوش ملیح آبادی	۲۷۵
۶	کانگریسی وزارت اور مسلمانوں کی الجھن	شعبۂ اطلاعات سیاسی ومعیشی آل انڈیا کانگریس کمیٹی	۲۷۶
۷	بہر طور لازم ہے مشہور ہونا (نظم)	جناب بیکش صاحب اکبر آبادی	۲۷۸
۸	مچھلی شہر کی علمی حیثیت	جناب مہدی جعفری صاحب مچھلی شہری	۲۷۹
۹	ہم سو شلسٹ ہیں	جناب	۲۸۵
۱۰	فدائے قوم	جناب ظفر صاحب واسطی شاہ آبادی	۲۸۷
۱۱	اس طرف اور اس طرف (نظم)	جناب عسکری صاحب طباطبائی	۲۹۶
۱۲	ایک شاہی مہمان کے چودہ گھنٹے	شاہی مہمان	۲۹۷
۱۳	پیغام آزادی	جناب محمد غوث صاحب مرحوم	۳۰۱
۱۴	تحائف	مترجمہ جناب گل سعید خاں صاحب	۳۰۲
۱۵	مجھے کس سے محبت ہے	جناب سجاد وحید رضا خاں صاحب آفریدی ملیح آبادی	۳۰۷
۱۶	اقبال اور مزدور	جناب علامہ ڈاکٹر نجم الدین احمد صاحب جعفری	۳۰۸
۱۷	عالمگیر جنگ اور کانگریس کی پالیسی	شعبہ اطلاعات سیاسی آل انڈیا کانگریس کمیٹی	۳۱۰
۱۸	آزادی کا علمبردار	جناب عبدالواسع صاحب عصری چکلوری	۳۱۲
۱۹	برطانیہ عظمیٰ کا زبردست مشرقی رقیب جاپان	جناب محمود صاحب بریلوی	۳۲۸
۲۰	غداروطن کے نام (نظم)	جناب صادق نیازی صاحب کاشمیری	۳۳۰
۲۱	تصور	جناب محمد حسام الدین صاحب عوزی	۳۳۱
۲۲	ہندوستان کا شاعر (نظم)	جناب مائل صاحب نقوی	۳۳۵
۲۳	شاعر اور شاعری	جناب	۳۳۶
۲۴	لیڈر بکس (نظم)	جناب مسیح الحسن صاحب آبا نقوی	۳۳۹

(جوش ملیح آبادی پرنٹر و پبلشر نے محبوب المطابع برقی پریس دہلی میں چھپوا کر دفتر کلیم [illegible] سے شائع کیا)

اشارات

کچھ کانگریس کے متعلّق

مدیر

جو لوگ میرے کلام، اور "کلیم" کا مطالعہ کرتے رہتے ہیں، اِس حقیقت سے بخوبی واقف ہیں کہ میں کانگریس کا کس قدر حامی ہوں۔ اور کانگریس کی طرف خصوصیت کے ساتھ، مسلمانوں کو کس طرح پکارتا رہتا ہوں۔

نیز اس امر سے بھی میرے اہلِ ملک بخوبی واقف ہیں کہ میرا ضمیر اُس رُوحانی جُذام سے قطعی طور پر پاک ہے، جسے فرقہ وارانہ ذہنیت کے مکروہ ترین نام سے پُکارا جاتا ہے ـــــ اور اِسی وجہ سے میں اِس وقت جو کچھ تحریر کروں گا، اُس کے متعلق مجھے، کم سے کم، اِس قدر تو اطمینان ضرور ہے کہ اُسے فرقہ پروری خیال نہیں کیا جائے گا۔

دہلی میں میرے چند مخلص دوست ایسے ہیں جو مجھ پر سبّ وشتم کیا کرتے ہیں اِس جُرم پر کہ میں کانگریس کا زبردست حامی ہوں۔ اُن کا قول ہے کہ

(۱) کانگریس سرمایہ داروں کی جماعت ہے۔

(۲) کانگریس اپنی سوشلسٹ جماعت کو اُبھرنے کا موقع نہیں دیتی۔

(۳) کانگریس عدمِ تشدّد پر کاربند ہے، جو انسانی فطرت کے خلاف ہے۔ اور جس سے قوم میں بُزدلی کے عناصر کی پرورش ہوتی ہے۔

(۴) کانگریس کی اکثریت پر ہندو مہاسبھائی ذہنیت کا غلبہ ہے جس سے اُردو زبان، اور اسلامی ثقافت (Culture) کو سخت خطرہ ہے۔

(۵) کانگریس حکومت کے نشے میں جھوم اور لڑکھڑا رہی ہے، جس سے خود کانگریس کا مستقبل تاریک نظر آ رہا ہے۔

(۶) اور کانگریس کامل آزادی نہیں، بلکہ صرف ہندوستان کے خزانوں کی کنجیاں چاہتی ہے۔ اور اُس کی دلی تمنا یہ ہے کہ انگریز یہاں سے رخصت ہو، اور ایک سنتری کی طرح اُس کے خزانوں کا پہرہ دیتا رہے۔

میں ہنوز مکمل اور صحیح ترین معلومات کی اُس منزل تک نہیں پہونچا ہوں کہ اِن متذکرۂ بالا الزامات کے متعلق، ضمیر کے کامل اطمینان کے ساتھ، خالص انکار، یا اقرار کی شکل میں اپنی کوئی رائے ظاہر کر سکوں۔

البتہ انتہائی دیانت، اور کامل دلیری کے ساتھ اِس قدر ضرور عرض کروں گا کہ بعض اوقات میں سخت پریشان ہو جاتا ہوں، بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ بغلیں جھانکنے لگتا ہوں کہ کانگریس کے مخالف مسلمانوں کے عاید کردہ الزامات کا کیا جواب دوں ـــــ کیونکہ کانگریس کے اندر بعض چیزیں خود مجھے ایسی نظر آتی ہیں جو حد درجہ اندوہناک ہیں، اور کانگریس کے بعض نمایاں افراد وکردار ایسے معلوم ہوتے ہیں، جن سے متذکرۂ بالا الزامات کی تائید کے پہلو نکلتے رہتے ہیں۔

پہلا الزام کہ کانگریس، سرمایہ داروں کی جماعت، یا سرمایہ داروں کے ہات میں کھیلنے والی جماعت ہے۔ افسوس کہ ایک بڑی حد تک درست معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ کانگریس کے مقتدر، اور نمایاں اربابِ حلّ وعقد کے

زمرے میں وہی حضرات پیش پیش نظر آتے ہیں جو بڑے بڑے کارخانوں اور ملوں کے مالک ہیں، جن کے کپڑے، اگر غریبوں کے خون سے نہیں، تو کم سے کم اُن کے پسینے سے تو ضرور ہی دھوئے جاتے ہیں ـــــ اور یہی وجہ ہے کہ کانگریس میں ابھی تک اُن ارکان کی کوئی آواز نہیں ہے۔ جو سوشلسٹ خیالات کے حامی وحامل ہیں۔ اور جب یہ سوشلسٹ جماعت کوئی آواز اُٹھاتی ہے تو کانگریس کا سرمایہ دار طبقہ، پوری قوت کے ساتھ اس طرح چیخنے لگتا ہے کہ ان بیچاروں کی آوازیں دب کر رہ جاتی ہیں ـــــ جس کی تمامتر ذمہ داری، میں نہایت بیباکی اور دلیری سے کہوں گا کہ .... مہاتما گاندھی، اور مہاتما گاندھی کے اُن رُفقائے خاص پر ہے جو سرمایہ داری کے نظام کو اس ملک میں قائم وباقی رکھنے پر تُلے ہوئے ہیں۔ اور جنھوں نے سرمایہ داروں اور رؤسا کو آزاد چھوڑ رکھا ہے۔

مہاتما گاندھی کے سیاسی احسانات سے صرف وہی انکار کرسکتا ہے جو عقلی اعتبار سے مادر زاد اندھا ہو، لیکن ہندوستان کے موجودہ سیاسی حالات میں اُن کا اوتارانہ وجود عہد پارینہ کا صرف ایک تبرک ہے جسے سر آنکھوں سے لگا کر معطر صندوقچے میں بند کردینا ہی سب سے بڑی سیاسی دانشمندی ہے۔

کانگریس پر تیسرا الزام عدم تشدد کا ہے۔ اس میں ذرہ برابر شک نہیں کیا جاسکتا کہ بعض خاص حالات میں عدم تشدد، سب سے بڑا ہتھیار، اور ایک نہایت ہی مفید فلسفہ ہے۔ لیکن اس عدم اشتداد کو ایک اٹل اور ابدی قانون، یا پروردگارِ سیاست کا آخری پیغام تسلیم کرلینا، اُس جذبہ سپہگری اور اُس جوہرِ مردانگی کے حق میں موت سے بدتر ہے، جس کے بغیر کوئی قوم زندہ ہی نہیں رہ سکتی۔

اسی عدم تشدد کو لے کر حضرت مسیح بھی اُٹھے تھے، لیکن نوعِ انسانی کی فطرت نے اُسے قبول کرنے سے انکار کردیا، اور نتیجہ یہ ہوا کہ حضرت مسیح، خدا کے "اکلوتے بیٹے" ہونے کے باوجود، اپنے مشن میں فیل ہوکر رہ گئے۔

عدم تشدد۔ راست بازی۔ اپیا مدار۔ رحم وکرم اور معدلت گستری یہ تمام چیزیں اپنی جگہ نہایت ہی اچھی ہیں، لیکن ایک ایسے دورِ فتنہ و فساد میں جب انسانوں کی جماعتیں چوروں۔ ڈاکوؤں۔ قاتلوں، اور بھیڑیوں کی شکل میں تبدیل ہوچکی ہوں، ان زریں اصولوں پر عمل کرنا، انتہائی حماقت کے ساتھ اپنے کو دوسروں کی خوراک بنادینا ہے۔

اسے کبھی فراموش نہ کرنا چاہیے کہ قدرت نے دوسری چیزوں کے دوش بدوش ہمیں جذبہ غضب بھی ودیعت فرمایا ہے، اور اس اعتقاد کو بھی اُوجھل ہونے نہ دینا چاہیے کہ قدرت نے انسان کو کوئی ایسی شے مرحمت نہیں فرمائی ہے۔ جو اس قابل ہو کہ اُسے معطل یا شل کردیا جائے۔

چوتھا اعتراض کانگریس پر یہ ہے کہ اس کے اکثر ارکان مہاسبھائی ذہنیت کے مریض ہیں، سو یہ الزام بھی قریب قریب درست معلوم ہوتا ہے۔

ابھی کل کی بات ہے کہ دہلی میں ہندو مہاسبھا کے دشمن ملک صدر جناب ساورکر مدظلہ العالی کا جلوس بڑے طمطراق سے نکالا گیا تھا، اور یہ کس قدر ماتم کی بات ہے کہ اُس فرقہ پرور شخص کی جلو میں کانگریسی حضرات بھی شریک تھے۔ اور ساورکر صاحب کے فرقِ مبارک پر کانگریس کا پرچم بھی لہرارہا تھا۔

اس کے علاوہ یہ بھی اکثر دیکھنے میں آتا ہے کہ کانگریس کے مہاسبھائی وضع کے ہندو، مسلمانوں کے معاملات میں تو خاموش رہتے ہیں، اور ہندوؤں کے معاملات میں بے خوف وخطر کود پڑتے ہیں ـــــ

مثال کے طور پر مسجد شہید گنج لاہور، اور شیو مندر دہلی ہی پر نظر ڈالیے، جس کا قضیہ بڑے زور شور سے آج کل چل رہا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ دونوں شورشیں قطعی بے بنیاد اور مفسدانہ ہیں۔ لیکن شہید گنج کے معاملے میں کانگریس نے سانس تک نہیں لی۔ اور شیو مندر کے ہنگامے میں کانگریس کے رُکن دہلی سے شملے تک گرد اُڑاتے پہونچے ـــــ شہید گنج کے مسئلے میں، کم سے کم، عمارت کی شکل میں ایک مسجد کا وجود تو ثابت تھا، لیکن شیو مندر تو، جیسا کہ خود دہلی کا بچہ بچہ جانتا ہے، محض ایک فرضی شے ہے۔ اور محض اس ضد میں یہ ہنگامہ برپا کیا گیا ہے، کہ کمیٹی اُس جگہ مسلمانوں کو زمین کا ایک قطعہ مسجد کے واسطے دے چکی ہے۔ جہاں پانچوں وقت نماز ہوتی ہے، اور ہندو مسلم قتال کے واسطے اس کی شدید ضرورت ہے کہ مسجد کے بالمقابل ایک مندر ضرور ہی تعمیر کردیا جائے ـــــ آخر یہ بات کیا ہے کہ شہید گنج کے معاملے میں تو کانگریس خاموش رہی، اور شیو مندر کے معاملے میں پُرخروش ہے؟

اسی کے ساتھ ساتھ یہ صورتِ حال بھی انتہائی قلق آمیز اضطراب

کے ساتھ محسوس کی جا رہی ہے کہ "ہندوستانی زبان" کے نام سے جس زبان کو در پردہ فروغ دیا جا رہا ہے، وہ دراصل ہندی۔ بلکہ سنسکرت آمیز ہندی ہے ــــ

ہر چند کہا تو یہ جاتا ہے کہ اردو، اور ہندی دونوں کو "ہندوستانی" کے نام سے باقی رکھا جائے گا، لیکن عمل کیا جاتا ہے اُس کے سراسر خلاف۔

کانگریسی وزرا ہندی کی تبلیغ کرتے ہیں، اور جب اُنھیں ٹوکا جاتا ہے تو وہ بڑے بھولے اور معصومانہ پن کے ساتھ فرماتے ہیں کہ "ہندی" سے اُن کا مقصد "ہندوستانی" ہے۔ اِن حضرات کو معلوم ہونا چاہئیے کہ اِن طفل تسلیوں سے اب کام نہیں چلنے کا ــــ

ذیل میں ہم کانگریسی اخبارات کے چند الفاظ، اور جملے پیش کرکے دریافت کرتے ہیں کہ اگر "ہندوستانی" یہی ہے تو پراکرت اور سنسکرت کو کیا لقب دیا جائے گا؟

ملاحظہ ہوں الفاظ:۔

تلانجلی، پرسیدھ، الوچنا۔ دھن سنگرہ، اتساہ۔ سنچارج، درآلا، لیلا، لوبھ، لابھ، وجے۔ پرگتیا، وشو وجے، سورن۔ سہتیا، اتم، ویرتا، سویکار۔ شردھانجلی۔ اُدّھن۔ بھاؤ۔ اچھاس۔ اندولن۔ سبھاؤ۔ سہائتیا، سہیوگ۔ سنھاپنا۔ سنکلپ۔ وکشنا۔ ابھیان۔ بلیدان۔ بیدی۔ شما، سنتھا۔ شری یُت، نیتا۔ برہمچریہ۔ آدرش۔ سنسکار۔ پرانت۔ شتابدی، دہانت۔ انت کال۔ کرمچاری۔ شو بھا سنکوچ۔ دلت جاتی۔ شردھا۔ کرتویہ۔ نویدن۔ ایکتا۔ پراپت۔ سنگھیا۔ پردھان، دھنیہ باد، کامنا، پرانتا۔ سارو جنک۔ پرشنسا۔ مہاورن۔ آدھیاتک۔ جاگرتی۔ اسنتوش، وشواش۔ پرگٹ۔ جنتا۔ آدر۔ نرآدر۔ آتم نرنے۔ وگھن، چناؤ، مرتیو، شوک پرستاؤ۔ انترجاتیہ۔

اب جملے ملاحظہ ہوں:۔

وہ دیش کے پرسدھ نیتا ہیں۔ بڑی بھاری دنگل کی الوچنا ہم لکھ کی ادّھن ملتی ہے۔ اِن کٹھناؤں کو سامنے رکھکر۔ اِن بیس ورشوں کی تاریخ اتہاس لکھدی جائے۔ ہم کچھ گھٹناؤں کی طرف اشارہ کریں گے۔ حکومت کے ادھیکاروں میں حصہ لینا چاہئیے۔ مزدوروں کی جاگرتی بھارت کو بدل دے گی۔ ہم اس اندولن کا سواگت کرتے ہیں۔ جن کے ہاتھ میں آرتھک ہے۔ سنتوش پرگھٹ کیا۔ کل رات شری سوامی سیتانندجی کی اپنشدوں کی کتھا سننے کا سوبھاگیہ پراپت ہوا۔ اُنھوں نے دہلی نواسیوں کی پرارتھنا پر کتھا کرنا سویکار کیا۔ لالہ جی کے اوجیہ دھرم بھاؤ کا نتیجہ ہے کہ اُن کا دان اتنے اوجیہ کاریہ میں لگا ہے۔ آپ نے لالہ نرائن دت جی کی دھرم پرائنتا اور سار وجنک سیوا کی بہت پرشنسا کی۔ آپ نے مہا ورنن کرتے ہوئے بتلایا۔ کہ کس پرکار سنت کمار جی نے کایا کلپ دوارے بڑی لمبی آیو پراپت کی تھی۔ آپ نے اُپنشدوں کو دُنیا کے اونچے سے اونچے آدھیاتمک دیا کے گرنتھ بتلاتے ہوئے آریہ جنتا سے انورودھ کیا کہ وہ اُن کا سوادھیائے کیا کریں۔ کتھا پانچ سماپت ہوگی۔ یہاں دھرم پریمیوں کو زیادہ سنکھیا میں پہونچکر لابھ اُٹھانا چاہئیے۔ ہندوستان جیسے کرشک پردھان دیش میں۔ شرادھ نی بہت اتساہ کے ساتھ منائی جائے۔ مویشی چرانے کے لئے زیادہ پرشرم نہیں کرنا پڑتا۔ اتہاسک روپ میں بھی اِس تیوہار کا مہتو بہت ہے۔ تمام ہندو جاتی کو اپنے اِس پرن کے کرنے کا یہ شبھ اوسر ہے کہ ہم ابلاؤں کی رکشا کریں۔ کاش ہم اس کے تہوار پہچانیں۔

یہ ہے وہ زبان جو ملک میں رائج کی جا رہی ہے، اور جسے "ہندوستانی" کہا جاتا ہے۔

یہ لے یہاں تک بڑھ چلی ہے کہ آنے جانے کے عوض "آر۔ جار" جاگنے کے عوض "جاگرتی" برس کے عوض "ورش" دکان کے عوض "ہٹی" دیاسلائی کے عوض "دیپک شلاکا" یا "دھرم شلاکا" لفافہ کے عوض "لاگو" اور صوبہ متحدہ کے عوض "جُٹ صوبہ" کو کھلم کھلا ترجیح دی جا رہی ہے۔ اگر یہ کھلی ہوئی عفونت انگیز بدنیتی نہیں تو اور کیا بلا ہے؟

دہلی ہی کو دیکھئے کہ یہاں کے تمام ہندو مسلمانوں کی زبان اُردو ہے۔ لیکن یہاں کے پاور ہاؤس کے دروازے پر "عام راستہ نہیں" کے بدلے لکھا ہوا ہے "رستو نہ آہی" نفریں اِس تعصب پر!

دُور کیوں جائیے، آل انڈیا کانگریس کا جب عام اجلاس ہوتا ہے تو وہاں ہندی کے علاوہ ایک بورڈ بھی اُردو میں نہیں ہوتا۔ اور یہی وہ چیزیں ہیں جو مسلمانوں کو کانگریس سے نافر بناتی رہتی ہیں۔

میں یہاں تک لکھ چکا تھا کہ ہمارے محلّے کی ایک ہندو خاتون، جو گزشتہ سال بھی ہم سے کانگریس کی ممبری کا چندہ لے گئی تھیں تشریف

لائیں۔ اور دہلی میں جو کانگریس کا اجلاس ۲۴-۲۶ ستمبر ۳۸ء کو ہونے والا ہے اُس کا وزیٹرز کارڈ خرید لینے کی مجھ سے فرمائش کی۔ میں نے دیکھا تو مجھے حد سے زیادہ قلق ہوا، اور میں نے اپنے دل میں کہا کہ وہ کانگریس جو مسلم عامۃ الناس کو اپنی طرف بلا رہی ہے، ابھی تک اُس کے دل میں اتنی وسعت بھی پیدا نہیں ہوئی ہے کہ وزیٹرز کارڈ پر جہاں انگریزی اور ہندی لکھی ہوئی ہے وہاں غریب اُردو کو بھی تھوڑی سی جگہ دے دیتی ——— اوّل تو کارڈ پر انگریزی کی قطعی ضرورت ہی نہیں تھی۔ کیونکہ کوئی انگریز کانگریس کے اجلاس میں شریک نہیں ہو رہا ہے، اور اگر اس غلامانہ ذہنیت کا اظہار ضروری طور پر ہو ہی گیا تھا، تو اس میں کیا حرج واقع ہو جاتا کہ انگریزی اور ہندی کے دوش بدوش بیچاری اُردو کو بھی جگہ دے دی جاتی۔ دیکھنے میں یہ باتیں چھوٹی چھوٹی ہیں، مگر انھیں چھوٹی چھوٹی باتوں سے ذہنیتوں کا پتا چلتا ہے، اور بڑے بڑے نتائج اخذ کئے جاتے ہیں۔

پانچواں اعتراض کہ کانگریس کو غرورِ حکومت کے ناگ نے ڈس لیا ہے، اور وہ نشۂ وقار میں جھوم اور لڑکھڑا رہی ہے۔ وہ اعتراض ہے جسے مہاتما گاندھی تک نے ایک سے زیادہ مرتبہ تسلیم کیا ہے۔

غرور، جہاں کہیں بھی، اور جس شکل میں بھی پایا جائے ایک نہایت ہی حقیر اور قابلِ نفرت چیز ہے، اور یہ مرض صرف اُنھیں افراد اور اُنھیں جماعتوں کو اپنا شکار بناتا ہے جو کھوکھلی، اور اوچھی ہوتی ہیں۔ اور یہ ایک حقیقتِ کبریٰ ہے کہ اوچھے اور کھوکھلے افراد کسی ملک کو آزادی نہیں دلا سکتے۔

اب رہا آخری الزام کہ کانگریس کی اکثریت مہاسبھائی ذہنیت پر مبنی ہے، اور بنیا قسم کے افراد آزادیٔ کامل نہیں، بلکہ تجوریوں کی چابیاں طلب کرتے ہیں اور انگریز سے درخواست کرتے ہیں کہ وہ انھیں بے دست و پا چھوڑ کر چلا نہ جائے، بلکہ ایک سنتری کی طرح اُن کے خزانوں کا پہرہ دیتا رہے، بہت ممکن ہے یہ الزام بھی صداقت پر مبنی ہو۔

میں جو کچھ لکھ رہا ہوں، میرے دل کو اُس سے شدید صدمہ پہونچ رہا ہے، اور میری اس تحریر کو پڑھکر جن حضرات کو دُکھ ہوگا، میں اُنھیں یقین دلانا چاہتا ہوں کہ میرا دل اُن سے کہیں زیادہ درد محسوس کر رہا ہے ——— مگر سچی بات کا بیان نہ کرنا اپنے بھائیوں کو تاریکی میں رکھنے کے برابر ہے، اور سچی بات کے کہنے سے جھجکنا بے ایمانوں اور بزدلوں کا شیوہ ہے۔

میں جواہرلال اور بوس سے نہایت ہی شدومد اور انتہائی اضطرار آمیز خلوص کے ساتھ درخواست کرتا ہوں کہ اگر ہندوستان کے بنے بنائے کھیل کو بگاڑنا منظور نہیں ہے تو تمام دوسرے کام چھوڑ کر روحِ کانگریس کی جلد سے جلد خبر لی جائے۔ مہاسبھائی ذہنیت کے افراد کو کانگریس سے خارج کیا جائے، سرمایہ دار طبقے کو مٹا دیا جائے۔ اور کانگریس کی باگ سوشلسٹ جماعت کے ہاتھ میں دے دی جائے۔ کہ فلاح و خیر کا یہی ایک واحد راستہ ہے۔

اسی کے ساتھ ساتھ میں کانگریس کی آڑ میں مہاسبھائیت اور سرمایہ داری پھیلانے والے افراد کو آگاہ کرتا ہوں کہ کانگریس کی رکنیت اُن کی غداریوں اور حکومت پرستیوں کو پوشیدہ نہیں رکھ سکی ہے، اُنھیں اچھی طرح پہچان لیا گیا ہے، اور ہم آمادہ ہوگئے ہیں انھیں سرِ بازار رُسوا کرنے پر، کیونکہ وہ جو کھیل، کھیل رہے ہیں، اگر اُس میں وہ کامیاب ہوگئے تو ہندو مسلمان، دونوں فنا ہو جائیں گے، اور حکومت کا پرچم ہماری لاشوں پر، ہماری زندہ لاشوں پر یونہیں لہراتا رہے گا۔

لیکن اسی کے دوش بدوش میں مسلمانوں کی خدمت میں بھی یہ عرض کر دینا چاہتا ہوں کہ وہ کانگریس کے بعض سرمایہ پرست اور مذہب گزیدہ ارکان کی حرکتوں کی بنا پر کانگریس سے بددل نہ ہو جائیں ——— اُنھیں معلوم ہونا چاہیئے کہ خود رسولِ اکرم کی صحبتِ مبارک میں بھی کافی منافق موجود تھے۔ تو کیا محض اس بنا پر کہ خود رسولِ اکرم کی بارگاہِ معرفت پناہ میں منافق موجود تھے، کوئی شخص دینِ اسلام پر کوئی الزام لگانے کی جرأت کر سکتا ہے؟ ——— اس طرح بعض کانگریسیوں کی غداریوں اور غلط رویوں کی بنا پر کیا یہ بات قرینِ عدل و انصاف ہوگی کہ ہم نفسِ کانگریس کو بُرا بھلا کہنا شروع کر دیں؟

واضح رہے کہ کانگریس کے اندر جو سرمایہ داری، اور مہاسبھائی عنصر پایا جاتا ہے اُس کے دو اسباب ہیں۔

(۱) پہلا سبب تو ہے مہاتما گاندھی کا وجودِ مبارک۔ جو سرمایہ پرستوں کے مربی اور سخت قسم کے کٹر مذہبی آدمی ہیں ——— اور یہ اُنھیں کے

نفسِ قدسی کا نتیجہ ہے کہ ایک طرف تو کانگریس میں سوشلسٹ طبقے کو اُبھرنے کا موقع نہیں ملتا، اور دوسری طرف اُن کی مہاسبھائیت کے زیرِ سایہ، پست ذہنیت رکھنے والوں کو مذہبی منافرت پھیلانے کے بے شمار مواقع مل رہے ہیں۔

(۲) اور دوسرا سبب ہے مسلمانوں کی کانگریس بیزاری ——— مسلمان ایک شریف اور بھولی ملت ہے۔ اُس کے خود غرض، خود پسند، خود رائے، خودنما، اور خود پرست قائدانِ اعظم نے اُسے "اللہ اکبر" کے مصلحت آمیز نعروں سے اس درجہ بوکھلا دیا ہے کہ وہ من حیث القوم کانگریس سے علیحدہ رہنے ہی کو اپنی نجات کا ذریعہ سمجھنے لگی ہے ——— جس کا نتیجہ اس شکل میں نکلا ہے کہ مسلمانوں کی غیر موجودگی کے باعث مذہب گزیدہ سرمایہ پرست ہندوؤں کو کانگریس میں مہاسبھائیت پھیلانے کا کھلا ہوا میدان مل گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ جب آفتاب غروب ہو جاتا ہے، تاریکیوں کے دامن پھیل جاتے ہیں۔

اس لئے مسلمانوں کا یہ ایک سیاسی فریضہ ہونا چاہیئے کہ وہ سرمایہ داری اور مہاسبھائیت کا زور توڑنے، اور ریاکاری و غداری کا بیڑا غرق کرنے کی خاطر جوق در جوق، اور کارواں در کارواں کانگریس کے حلقے میں داخل ہو جائیں۔ داخل ہی نہ ہو جائیں کانگریس کے زمین و آسمان پر چھا جائیں اور اور معطل و شل کر دیں اُن قوتوں کو، اُن ناپاک قوتوں کو جو سرمایہ داری اور مذہبی منافرت کا جال پھیلائے ہوئے ہیں۔ اور اس طرح درپردہ ہماری محکومی کی عمر کو ہر آن بڑھاتی ہی چلی جا رہی ہیں۔ آخر میں رفعِ اشتباہ کی خاطر میں اپنی آواز کی پوری گرج کے ساتھ یہ اعلان کرتا ہوں کہ کانگریس ہی ہندوستان کی واحد نمائندہ جماعت ہے۔ کیونکہ اس کی بنیاد فرقہ پروری پر نہیں متحدہ قومیت پر ہے، اور اس مذہب کا کلمہ تفریق و تقسیم نہیں بلکہ اجتماع و اتحاد ہے، اور میرا ایمان ہے اس بات پر کہ جس وقت کانگریس کی سوشلسٹ جماعت برسرِ اقتدار آجائے گی اُس وقت ہندوستان کا آسمان، اُس آفتاب سے جگمگا اُٹھیگا، جسے آزادی کا آفتاب کہتے ہیں۔

میں سوشلسٹ جماعت کا اس لئے اور بھی معتقد ہوں کہ یہ جماعت "بیدین" ہے، اور "بیدینی" ہی وہ طاقت ہے، جو ہندوستان کی غلامی کے پہاڑ کو سفوف میں تبدیل کر کے ہواؤں میں اُڑا دینے پر کامل قدرت رکھتی ہے۔

دین نے بھی، یاد ش بخیر، ایک زمانے میں نوعِ انسانی کی بہت خدمت کی تھی۔ مگر اب وہ خالص دین اور وہ بے لوث دینداری، غلاموں کی اس سرزمین پر لعنت بھیج کر آسمانوں کی طرف پرواز کر چکی ہے۔ ——— اور یہ "دین" جو آج کل ہندو مسلمانوں کے سروں پر منڈلا رہا ہے، دراصل "دین" نہیں۔ بلکہ سرمایہ داری کے شیطان کا پالا ہوا مردار خوار گدھ ہے، جو زندہ لاشوں کو نوچ نوچ کر اپنے پیٹ کی آگ بجھایا کرتا ہے۔

ربّ العزت کی قسم کہ عصرِ حاضر کی "دینداری" شرارت اور چھچھورا پن ہے، وہ شرارت آمیز چھچھورا پن جو غلام قوتوں کے اندر ہمیشہ پایا جاتا ہے۔ اور جو حق کے عوض باطل کے ہاتھ اپنی روح فروخت کر دیتا ہے۔

یہ موجودہ "دین" سرمایہ پرست، فتنہ پرداز اور خون ریز "دین" بیمار، بے مغز، مقلد اور پا بزنجیر "دین" ہے جسے دشمن اپنے اغراض کی تکمیل کے واسطے مولویوں اور پنڈتوں کے ذریعے سے بڑی چالاکی کے ساتھ استعمال کیا کرتے ہیں۔ سوشلسٹ "بیدینی" سے آنکھ ملانے کی جرأت نہیں کر سکتا۔ کیونکہ سوشلسٹ "بیدینی" کا سینہ چوڑا، اور نظر وسیع ہے۔ اس کی بارگاہِ بذل و سخا میں ہندو، مسلم، یہودی، نصرانی، کسی کی کوئی قید نہیں۔ یہ "بیدینی" سب کے ساتھ انصاف کرتی ہے، سب کی خدمت کو اپنے پر فرض سمجھتی ہے۔ اور کسی کی بیجا حمایت نہیں کرتی، اس لئے کہ بیجا حمایت کر ہی نہیں سکتی۔ اس کے قوانین میں ایسے استثنائی دفعات کا کہیں وجود ہی نہیں ہے جن کے سہارے زید کو بکر پر ترجیح دی جاتی ہے۔

اے عصرِ حاضر کی کفر بردوش، اور غداری برکف "دینداری" تیرا وجود، راہبرانِ حق کی سعیِ راہنمائی، اور خلاقِ عالم و عالمیان کے ذوقِ ربوبیت کی کھلی ہوئی توہین ہے۔ تو کب تک ہمارا تعاقب کرتی رہے گی، کب تک دشمنوں کے ایما سے ہمیں آپس ہی میں ٹکرا ٹکرا کر پاش پاش کرتی رہے گی؟ اور تاکے گائے باجے اور مسجد و مندر کی ڈگڈگی پر رقص فرماتی رہے گی؟

اگر آج تو ہندوستان کو چھوڑ کر چلی جائے، تو کل ہم آزاد ہو جائیں گے۔ اے "دین" اے آزادی کے راستے کے سب سے اونچے پہاڑ شق ہو جا۔ ورنہ ہم تجھے "بیدینی" کی بارود سے اُڑا دیں گے۔ ——— تیرا رخصت ہونا بہت مشکل معلوم ہوتا ہے۔ دشمنوں کے خزانے، اور اوباشوں کے دماغ، تیری پشت پر ہیں۔

ہاں تو رخصت ہو سکتی ہے، اگر ہندوستان کی نیشنل کانگریس کا وہ "بیدین" سوشلسٹ طبقہ جس کے دل میں انسانی ہمدردی کا سمندر لہریں لے

رہا ہے، برسرِ اقتدار آجائے ——— لیکن کروڑوں روپے کی ملوں کے مالک، اور اُن ملوں کے مالکوں کے روحانی و مادی اوتار مہاتما گاندھی جنہیں اب آسمانوں سے آوازیں آنے لگی ہیں، راستہ روکے کھڑے ہیں، اپنی پوری قوت کے ساتھ راستہ روکے کھڑے ہیں ——— مگر اس کے باوجود میں دیکھ رہا ہوں کہ کانگریس کی شاندار و بلند محراب میں شگاف پڑ گیا ہے، اور اُس شگاف کے اندر سے سوشلسٹ جماعت کا آفتاب طلوع ہو رہا ہے۔

فتنۂ حرم

اک دن جو بہرِ فاتحہ اک بنتِ مہر و ماہ — پہونچی نظر جھکائے ہوئے سوئے خانقاہ
زہاد نے اُٹھائی جھجکتے ہوئے نگاہ — ہونٹوں میں دب کے ٹوٹ گئی ضربِ لا اِلٰہ
برپا ضمیرِ زہد میں کہرام ہو گیا
ایماں، دلوں میں لرزہ براندام ہو گیا

یوں آئی ہر نگاہ سے آوازِ الاماں — جیسے کوئی پہاڑ پہ آندھی میں دے اذاں
دھڑکے وہ دل کہ رُوح سے اُٹھنے لگا دھواں — ہلنے لگیں شیوخ کے سینوں پہ داڑھیاں
پرتو فگن جو جلوۂ جانانہ ہو گیا
ہر مرغِ خلد، حسن کا پروانہ ہو گیا

اُس آفتِ زمانہ کی سرشاریاں، نہ پوچھ — نکھرے ہوئے شباب کی بیداریاں، نہ پوچھ
رُخ پر ہوائے شام کی گل باریاں، نہ پوچھ — کاکل کی ہر قدم پہ فسوں کاریاں، نہ پوچھ
عالم تھا وہ خرام میں اُس گلعذار کا
جیسے نزول، رحمتِ پروردگار کا

گردن کے لوچ میں، خمِ چوگاں لئے ہوئے — چوگاں کے خم میں گوئے دل و جاں لئے ہوئے
رُخ پر لٹوں کا ابرِ پریشاں لئے ہوئے — کافر گھٹا کی چھاؤں میں قرآں لئے ہوئے
آہستہ چل رہی تھی عقیدت کی راہ سے
یا لو نکل رہی تھی دلِ خانقاہ سے

آنکھوں میں آگ عشوۂ آہن گداز کی — لہریں، ہر ایک سانس میں، سیلابِ ناز کی
لپٹیں ہوا کے دوش پہ، زُلفِ دراز کی — آئینے میں دمک، رُخِ آئینہ ساز کی
آغوشِ مہر و ماہ کی، گویا پلی ہوئی
سانچے میں آدمی کے، گلابی ڈھلی ہوئی

ساون کا ابر، کاکلِ شبگوں کے دام میں — موجیں شرابِ سرخ کی، آنکھوں کے جام میں
رنگِ طلوعِ صبح، رُخِ لالہ فام میں — چلتا ہوا شباب کا جادو خرام میں

انساں تو کیا، یہ بات پری کو ملی نہیں
ایسی تو چال کبکِ دری کو ملی نہیں

ڈوبی ہوئی تھی جنبشِ مژگاں شباب میں   یا دل دھڑک رہا تھا محبت کا خواب میں
چہرے پہ تھا عرق، کہ نمی تھی گلاب میں   یا اوس موتیے پہ شبِ ماہتاب میں
آنکھوں میں کہ رہی تھیں یہ موجیں خمار کی
یوں بھیگتی ہیں چاندنی راتیں بہار کی

ہات اُس نے فاتحہ کو اُٹھائے جو ناز سے   آنچل ڈھلک کے رہ گیا زُلفِ دراز سے
جادو ٹپک پڑا نگہِ دل نواز سے   دل ہِل گئے جمال کی شانِ نیاز سے
پڑھتے ہی فاتحہ جو وہ اک سمت پھر گئی
اک پیر کے تو ہات سے تسبیح گر گئی

فارغ ہوئی دُعا سے جو وہ مشعلِ حرم   کانپا لبوں پہ سازِ عقیدت کا زیر و بم
ہونے لگی روانہ بہ اندازِ موجِ یم   انگڑائی آ چلی تو بہکنے لگے قدم
انگڑائی فرطِ شرم سے یوں ٹوٹنے لگی
گویا صنمکدے میں کرن پھوٹنے لگی

ہر چہرہ چیخ اُٹھا کہ ترے ساتھ جائیں گے   اے حُسن، تیری راہ میں دُھونی رمائیں گے
اب اِس جگہ سے اپنا مُصلّےٰ اُٹھائیں گے   قُربانگاہِ کُفر پر ایماں چڑھائیں گے
کھاتے رہے فریب بہت خانقاہ میں
اب سجدہ ریز ہوں گے تری بارگاہ میں

سورج کی طرح، زُہد کا ڈھلنے لگا غرور   پہلوئے عاجزی میں مچلنے لگا غرور
رہ رہ کے کروٹیں سی بدلنے لگا غرور   رُخ کی جوان لَو سے پگھلنے لگا غرور
ایماں کی شان عشق کے سانچے میں ڈھل گئی
زنجیرِ زُہد سُرخ ہوئی، اور گل گئی

پل بھر میں زُلفِ لیلیٰ تمکیں بگڑ گئی   دم بھر میں پارسائی کی بستی اُجڑ گئی
جس نے نظر اُٹھائی، نظر رُخ پہ گڑ گئی   گویا ہر اک نگاہ میں زنجیر پڑ گئی
طوفانِ آب و رنگ میں زُہاد کھو گئے
سارے کبوترانِ حرم ذبح ہو گئے

زاہد، حُدودِ عشقِ خُدا سے نکل گئے   انسان کا جمال جو دیکھا، مچل گئے
ٹھنڈے تھے لاکھ، حُسن کی گرمی سے جل گئے   کرنیں پڑیں تو برف کے تودے پگھل گئے
القصہ دین، کُفر کا دیوانہ ہو گیا
کعبہ ذرا سی دیر میں بُت خانہ ہو گیا

جوشؔ

مسلمانوں کی سیاسیات میں ذہنی انتشار



عبداللطیف اعظمی

سیاسی لامرکزیت

پچھلے دنوں، جواہرلال نے، اپنے دورِ صدارت میں، اپنی مختلف تقریروں اور تحریروں میں کہا تھا کہ "مسلمانوں میں انتہائی انتشار اور پراگندگی ہے۔ ان کے یہاں نہ کوئی ایسی جماعت ہے اور نہ کوئی ایسا لیڈر، جسے مسلمانوں کی بھاری اکثریت کا نہ سہی معمولی اکثریت ہی کا اعتماد حاصل ہو۔" جواہرلال کے اس بیلاگ تبصرہ پر مسلمان بہت ناراض ہوئے تھے۔ لیکن اگر محض ناراض ہونے سے، غم و غصہ کے اظہار سے، اخبارات میں تند و تیز تحریروں کے لکھنے سے حقیقت پر پردہ نہیں ڈالا جا سکتا تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ جواہرلال نے جو کچھ کہا تھا: مسلمانوں کی حالت اس سے کہیں زیادہ ابتر اور منتشر ہے۔ مسلمانوں کی سیاسی لامرکزیت ایک ایسی روشن اور واضح حقیقت ہے جس سے انکار کرنا سورج پر خاک ڈالنا ہے۔ ممکن ہے مسلمانوں کو کچھ عرصہ تک اور دھوکہ میں رکھا جاتا اور بعض جماعتیں اپنے کو مسلمانوں کی مسلمہ نمائندہ ظاہر کرتیں مگر جدید دستور کا برا ہو کہ اس نے اس نام نہاد نمائندگی کو بھی ختم کر دیا۔

کھلتا کسی پہ کیوں مرے دل کا معاملہ

"سیٹوں" کے انتخاب نے رسوا کیا مجھے

یوں تو مسلمانوں میں، انجمنوں اور جماعتوں کی کمی نہیں۔ کوڑیوں موجود ہیں۔ لیکن مسلم لیگ ایک ایسی سیاسی جماعت ہے، جو پورے ہندوستان کے مسلمانوں کی نیابت کا دعویٰ رکھتی ہے۔ اس کا یہ دعویٰ کہاں تک صداقت پر مبنی ہے۔ اس کا اندازہ گزشتہ سال کے انتخابات کے نتائج سے کیا جا سکتا ہے۔ ذیل کی جدول ملاحظہ ہو۔

نام صوبہ	کل مسلم نشستیں	مسلم لیگ کو جتنی ملیں	نام صوبہ	کل مسلم نشستیں	مسلم لیگ کو جتنی ملیں
یو۔ پی	۶۴	۲۷	اڑیسہ	۴	۰
مدراس	۲۸	۱۰	آسام	۳۴	۹
سی پی	۱۴	۰	پنجاب	۸۴	۱
بمبئی	۲۵	۲۰	سرحد	۳۶	۰
بہار	۳۵	۰	بنگال	۱۱۷	۵۰
سندھ	۳۳	۰	کل	۴۸۱	۱۱۷

(اس نقشہ میں بعد کے ضمنی انتخابوں کے نتائج شامل نہیں ہیں)

یعنی کل ۴۸۱ نشستوں میں مسلم لیگ کے صرف ۱۱۷ امیدوار کامیاب ہوئے۔ متعدد صوبے ایسے ہیں، جہاں مسلم لیگ کی مطلق آواز نہیں ہے۔ مثلاً بہار، اڑیسہ، سرحد، سندھ، سی پی وغیرہ۔ حتیٰ کہ پنجاب میں بھی اُن کا مطلق اثر نہیں ہے۔ جہاں مسلمانوں کی اکثریت ہے۔ اکثر صوبے ایسے ہیں، جہاں ایسے نمائندے تعداد میں زیادہ کامیاب ہوئے، جو کسی جماعت سے تعلق نہیں رکھتے تھے۔ مثلاً یو۔ پی میں ذاتی طور پر کامیاب ہونے والے اُمیدواروں کی تعداد ۲۹ ہے۔ اور مسلم لیگ کے ٹکٹ پر کامیاب ہونے والے صرف ۲۷ ہیں۔ اسی طرح آسام میں مسلم لیگ کے صرف ۹ نمائندے کامیاب ہوئے، اور غیر متعلق نمائندوں کی تعداد ۱۴ ہے۔ البتہ بمبئی اور بنگال میں اسے نمایاں کامیابی ہوئی ہے۔ بمبئی میں، تو ہونی ہی چاہئیے تھی۔ اُسے مسلم لیگ کے مرکز کی حیثیت حاصل ہے۔ مگر بنگال کا یہ حال ہے کہ مسلم لیگ کے ۵۰ نمائندوں کے مقابلے میں غیر مسلم لیگیوں کی تعداد ۶۷ ہے۔ اس تفصیل کے بیان کرنے کا مدعا یہ ہے کہ مسلمانوں کی یہ اس جماعت کا حال ہے، جسے "آل انڈیا" اور "واحد نمائندہ" ہونے کا دعویٰ ہے۔

قیاس کن زگلستان من بہار مرا

انھیں حالات سے متاثر ہو کر، ایک قوم پرست مسلمان نے حال میں لکھا تھا کہ اس کی تنظیم جس قدر ناقص، اس کی لیڈرشپ جس قدر بودی اور پھسپھسی اس کا نصب العین جس قدر کورا، اس کے عناصر جس قدر غیر ہم آہنگ، اس کی رکنیت اور حلقۂ اثر جس قدر محدود اور غیر یقینی، اس کی آواز جس قدر کمزور اور اس کی جد و جہد جس قدر بے اثر ہے وہ شاید آل انڈیا اسٹوڈنٹس فیڈریشن کے لئے بھی باعث شرم ہے۔" اس کے علاوہ جمعیتہ علمائے ہند، مجلس احرار اور بعض دوسری جماعتیں بھی ہیں جو مسلمانوں کی سیاسی اور ملی خدمات انجام دیتی ہیں۔ لیکن اس کے باوجود کروڑوں مسلمان ایسے ہیں، جن کو ان میں سے کسی جماعت کے ساتھ بھی وابستگی نہیں ہے۔ پھر یہ ابتری و پراگندگی اور سیاسی لامرکزیت نہیں تو اور کیا ہے؟ اس لامرکزیت اور انتشار کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ مسلمانانِ ہند کے پیشِ نظر کوئی معین نصب العین اور کوئی واضح اور روشن منزل نہیں ہے جس کے حصول کے لئے وہ ایک علم کے نیچے جمع ہو کر اور ایک آواز

ہو کر جدوجہد کریں۔ کوئی دمشق کے تخت وتاج کا خواب دیکھ رہا ہے۔ کوئی خلافت راشدہ کے قیام کا متمنی ہے۔ کوئی پاکستان کی تجویز پیش کرتا ہے۔ جب مقاصد اس قدر مختلف ہوں تو جدوجہد میں شیرازہ بندی اور مرکزیت کیونکر پیدا ہو سکتی ہے؟

اس ذہنی انتشار کے باوجود۔ اگر مسلمانوں کے لیڈروں، رہنماؤں اور ان کے مفکروں کے خیالات وافکار کا تفحص کیا جائے تو تین قسم کی جماعتیں نظر آئیں گی۔ ایک جماعت وہ ہے جو ملیت کا حامی ہے۔ دوسری کے پیش نظر پاکستان کی تحریک ہے اور تیسری متحدہ ہندوستانی قومیت کو بروئے عمل لانے کے لئے کوشاں ہے۔ اب آیئے ان کا تجزیہ کرکے دیکھیں کہ مجوزہ علاجوں میں سے کونسا علاج، اس نیم جان مریض کے لئے مفید اور کارگر ہوگا۔ سب سے پہلے ملیت کو لیجئے۔

ملیت

ملیت کے حامیوں اور علمبرداروں میں سب سے زیادہ اہمیت علامہ سر اقبال کو حاصل ہے موصوف کے نزدیک متحدہ ہندوستانی قومیت مسلمانان ہند کی موت کے مرادف ہے۔ ان کے نزدیک اقلیت کو اپنی تنظیم اور ملی وسیاسی اصلاح کے لئے ایک سیاسی جماعت بنانی چاہیئے۔ چنانچہ فرماتے ہیں کہ "مسلمانان ہند کسی ایسی سیاسی تصوریت کا شکار نہیں بنیں گے جو ان کی تہذیبی وحدت کا خاتمہ کر دے گی۔ اگر ان کی تہذیبی وحدت محفوظ ہو جائے تو ہم اعتماد کرسکتے ہیں کہ وہ مذہب اور حب الوطنی میں ہم آہنگی پیدا کرلیں۔"

(ختم نبوت اور قادیانیت صفحہ ۴۰)

ڈاکٹر اقبال کے خیالات وافکار کا اگر بامعانِ نظر مطالعہ کیا جائے تو اس میں عجیب قسم کا تضاد نظر آئے گا۔ ایک طرف تو وہ یہ فرماتے ہیں کہ "اسلام ہئیت اجتماعیہ انسانیہ کے اصول کی حیثیت میں کوئی لچک اپنے اندر نہیں رکھتا اور ہئیتِ اجتماعیہ انسانیہ کے کسی اور آئین سے کسی قسم کا راضی نامہ یا سمجھوتہ کرنے کو تیار نہیں بلکہ اس امر کا اعلان کرتا ہے کہ ہر دستور العمل جو غیر اسلامی ہو، نامعقول ومردود ہے" دوسری طرف ترکی نے جو کچھ کیا ہے یا کر رہی ہے اُسے عین اسلام کے مطابق سمجھتے ہیں۔ چنانچہ جواہر لال کے ایک مضمون کے جواب میں فرماتے ہیں "اتاترک نے وہ کام کیا جس سے ابن تیمیہ یا شاہ ولی اللہ کا دل مسرت سے لبریز ہو جاتا ہے ---------- اس کے اسلامی ضمیر کی روشنی نے اس اہم ترین معاملہ میں اس کے میدانِ عمل کو منور کر دیا ہے"

(ختم نبوت اور قادیانیت صفحہ ۴۳)

ایک طرف تو یہ تشدد کہ مسلمانانِ ہند، برادرانِ وطن سے سیاسی اور معاشی معاملات میں سمجھوتہ بھی نہیں کرسکتے اور دوسری طرف یہ آزادی کہ ترک جو چاہیں کریں۔ ان کے لئے اسلامی ہئیتِ اجتماعیہ میں ہر قسم کی لچک پیدا ہو جاتی ہے۔ ہندوستان میں متحدہ قومیت سے تہذیبی وحدت خطرے میں پڑ جاتی ہے۔ اور ترکی میں خطرے کا سوال نہیں بلکہ ختم کر دی جاتی ہے تو نہ صرف اس کو جائز قرار دیا جاتا ہے بلکہ اس کی تحسین وتوصیف میں قصیدے کہے جاتے ہیں۔

ببیں تفاوت رہ از کجاست تا بکجا

ابھی حال میں مولانا حسین احمد کے جواب میں ڈاکٹر اقبال صاحب نے قومیت سے متعلق ایک مفصل بیان دیا ہے۔ اس پر ایک ممتاز اور موقر مذہبی رسالہ[1] نے تبصرہ کیا ہے۔ مسئلہ کی تنقیح کے لئے اس کے چند ٹکڑے یہاں ہم پیش کرتے ہیں۔ اس سے واضح ہوگا کہ برادرانِ ہند سے کوئی سیاسی اور معاشی معاہدہ کرنا ہندوستانی قومیتِ اسلام کے منافی نہیں ہے۔

وہ لوگ بھی عجیب مخلوق ہیں جو یا تو دمشق کا تخت لیں گے یا پھر ہندوستان کی ذلیل غلامی انگریزوں کی محکومی میں رہ کر اونٹ بھی نگل جائیں گے۔ مگر جب یہ کہا جائے کہ سیاسی ومعاشی معاملات میں ہندوؤں کے ساتھ اتحاد کیجئے، تو مچھر کو بھی چھاننے کی کوشش کریں گے۔

علامہ اقبال فرماتے ہیں اسلام ہئیتِ اجتماعیہ کے اصول میں کوئی لچک اپنے اندر نہیں رکھتا۔ اور مثال میں ابولہب اور ابوجہل کے ساتھ اسلام کے طرزِ عمل کو پیش کرتے ہیں۔ لیکن شاید وہ بھول جاتے ہیں کہ اس راہ میں ایک واقعہ صلح حدیبیہ کا بھی پیش آیا تھا۔ مدینہ کے یہود وغیرہ سے آپ نے جو معاملہ کیا وہ بھی معلوم ہے۔ پھر غیر مسلموں کی تمام جماعتوں کے ساتھ اسلام کا معاملہ یکساں نہیں۔ اہلِ عرب کے لئے صرف اسلام یا تلوار کی راہ تھی اور یہود ونصاریٰ، مجوس یہاں تک کہ شاید بربروں کے ساتھ بھی اس سے بالکل مختلف معاملہ ہوا۔ پھر بعض جماعتوں کے ساتھ ان سے بھی مختلف شکل اختیار

---

[1] الاصلاح، سرائے میر اعظم گڈھ۔ زیر ادارت مولانا امین احسن صاحب اصلاحی

کر لی گئی۔ مثلاً نصاریٰ بنی تغلب جزیہ دینے میں ہتک محسوس کرتے تھے۔ اس لئے وہ عرب چھوڑ کر رومیوں کے پاس چلے گئے۔ حضرت عمرؓ سے عرض کیا گیا کہ یہ بڑے بہادر ہیں۔ دشمن ان سے آپ کے خلاف فائدہ اُٹھا سکتا ہے اور جزیہ دینے میں یہ ہتک سمجھتے ہیں۔ حضرت عمرؓ نے اُن کو واپس بلا لیا اور جزیہ کے بجائے اُن پر صدقہ عاید کر دیا۔ البتہ مقدار میں مسلمانوں کے لحاظ سے زیادہ۔ حالانکہ اس باب میں اسلام کی تعلیمات بالکل بے لچک ہیں، اور معلوم ومشہور۔

حبشہ کے معاملہ میں باوجود سطوت واقتدار مسلمانوں نے جو فیاضی کی وہ بھی اس ذیل میں لحاظ کے قابل ہے۔

بعض لوگ سینہ پر صلیب کا نشان زنگنائی، لگانے میں بھی شاید کوئی عار نہ سمجھیں۔ لیکن ہندوؤں اور مسلمانوں کی مشترکہ مجالس کی بعض چھوٹی چھوٹی بے ضرر باتوں پر ایسے ماوراء النہری تشدد کا اظہار کرتے ہیں کہ حیرت ہوتی ہے۔ اور اس کو اپنی دانست میں بڑی دینداری سمجھتے ہیں۔ حالانکہ فاروق اعظمؓ جن کا دینی معاملات میں تشدد ضرب المثل ہے، وہ بھی اتنے متشدد نہ تھے۔ شام کا واقعہ شاید سب کو معلوم ہو کہ آپ نکلے تو اذرعات کے باشندے اپنے دستور کے مطابق گاتے بجاتے اسلحہ اور پھول وغیرہ لے کر استقبال کو نکلے۔ آپ نے ابوعبیدہ سے کہا ان کو روک دو، ابوعبیدہ نے عرض کیا یہ ان کے ہاں کا دستور ہے اگر آپ روک دیں گے تو یہ نفس معاہدہ کے متعلق بدگمان ہو جائیں گے۔ آپ نے فرمایا تب کچھ ہرج نہیں، چھوڑ دو۔

یہ اس عہد کا حال تھا جب تمام مصالح وموانع بآسانی مغلوب کئے جا سکتے تھے اور کوئی وجہ نہ تھی کہ اسلام کی ہیئت اجتماعیہ کے ضوابط بدلیں، لیکن ان کے لچکنے کی اتنی مثالیں پیدا ہو گئیں کہ علمائے ان کو جمع کر کے اصول وفروع مستنبط کئے جو ہماری کتابوں میں موجود ہیں اور یہاں اُن سے تعرض کا موقع نہیں۔ حضرت سید احمد بریلویؒ اور مولانا اسمٰعیل شہیدؒ وغیرہ دین کے ان رموز سے بے خبر نہ تھے اور اسلامی سطوت کے جاہ وجلال کا سماں اُن کی نظروں میں ہم سے زیادہ بسا ہوا تھا۔ تاہم جب سکھوں کے خلاف ان لوگوں نے جہاد کیا تو صاف کہا کہ ہمارا مقصد ان کا ملک لینا نہیں ہے ہم دینی معاملات میں مسلمانوں کے لئے آزادی چاہتے ہیں۔ یقیناً ان کی اس بات نے اسلام کی ہیئت اجتماعیہ کو نہ صرف لچکا دیا۔ بلکہ بہت زیادہ جھکا دیا لیکن وہ جانتے تھے کہ حالات اس سے زیادہ کے لئے سازگار نہیں ہیں۔ اگر اُنھیں آرام کرسی پر بیٹھکر فلسفہ بگھارنا ہوتا تو وہ بھی وہی کہتے جو علامہ اقبال نے فرمایا۔ لیکن اُنھیں تلوار سے گرہ وا کرنا تھا اور مشکلات کو تا بہ حد امکان حل، اور اُس وادی میں ایسے موڑ بہت سے آتے ہیں جہاں آدمی کو پیادہ ہونا پڑتا ہے۔

مولانا حسین احمد بھی اُنھیں لوگوں میں ہیں۔ وہ صرف زندگی کے جمالیاتی پہلو کو دیکھنے والے شاعر نہیں ہیں بلکہ مجاہد فقیہہ اور سیاست داں ہیں اور چاہتے ہیں کہ موجودہ مشکلات کے اندر مسلمانوں کو جتنا اُٹھا سکتے ہیں، اُٹھا دیں۔ اگر مغلوں اور عباسیوں کا دور نہ سہی تو کم از کم مسلمان ملک کے اندر ایک باعزت اور غیور قوم کی زندگی تو بسر کریں۔ یقیناً یہ تخیل خلافت راشدہ کے تخیل سے بہت کم ہے مگر اس خلافت کے دلدل سے بدرجہا بہتر ہے جس میں ہم آج لوٹ رہے ہیں۔ اُن کی جدوجہد کم سے کم اس کے لئے ہے کہ مسلمانوں کو مذہبی معاملات میں پوری آزادی حاصل ہو اور سیاسی ومعاشی معاملات میں دوسرے اہل ملک کے ساتھ مساوات۔ رہ گیا اصلی تخیل تو وہ بھی انشاء اللہ مٹے گا نہیں۔ علامہ اقبال کی شاعری دلوں کو گرماتی رہے گی اور کیا عجب کہ اس منزل تک پہنچکر اس کے عملی احیا کے لئے بھی کوئی راہ پیدا ہو جائے۔ ولیس ذالک علی اللہ بعزیز۔

علامہ اقبال کو اندیشہ ہے کہ قومیت اور وطنیت کے تصور سے اسلامی وحدت پارہ پارہ ہو جائے گی۔ اور مسلمان ملحد وبے دین ہو جائینگے۔ ممکن ہے ان کے پاس ایسے دلائل موجود ہوں، جن سے ان اندیشوں کی تصدیق ہوتی ہو۔ لیکن سوال یہ ہے کہ یہ "وحدت اسلامی" کی "کمر" ہے کہاں، جسے "کس کے باندھنے" کا وہ مشورہ دے رہے ہیں۔ اسلامی دنیا ایک طویل زمانہ سے "فی کل بلد خلیفۃ ومنبر" کی مصداق ہے۔ ادھر کچھ دن ہوتے ہیں سلطان عبدالحمید نے ایک صدا اُٹھائی تھی۔ لیکن اولاً تو وہ صدا بصحرا تھی۔ ثانیاً کلمۃ حق ارید بہ الباطل کا ایک مخفی فریب، اور علامہ اقبال غالباً اس امر سے انکار نہیں کر سکتے کہ اس رشتہ کے توڑنے میں ہم کو کوئی دخل نہیں ہے۔ وہ مغربی قوموں کی سازش سے ٹوٹا یا خود بخود، بہرحال ٹوٹ چکا۔ اب وہ صرف ایک لذیذ یاد کی حیثیت سے رہ گیا ہے۔

اور ثمرات و نتائج بالکل مفقود ہیں۔ اگر آج بھی "واعتصموا" کے نعرے میں کچھ زور ہوتا تو ہم اپنی مشکلات میں ان سے مدد لیتے۔ لیکن جب یہ چیز آج موجود نہیں ہے تو ہم کیا کریں؟ اور افسوس ہے کہ جس طرح ہم کو اس کے توڑنے میں دخل نہیں، اسی طرح موجودہ حالات کے اندر اس کے جوڑنے میں بھی کچھ دخل نہیں ہو سکتا۔ پس اس کے لئے ہم یہ تو کر سکتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ سے دعا کریں کہ وہ یوسف گم گشتہ واپس آجائے۔ مگر یہ نہیں کر سکتے کہ اس لذیذ تخیل کے لئے اپنے تمام دھندے ترک کر دیں۔ اگر یہ محض عقیدہ کی قسم کی کوئی چیز ہوتی تو اس کو عقیدہ کی حیثیت سے محفوظ رکھتے۔ مگر یہ تو سیاسی اور اجتماعی مصلحت تھی جو افسوس ہے کہ آج مفقود ہو چکی ہے۔

پھر علامہ اقبال کا یہ خیال بھی صحیح نہیں معلوم ہوتا کہ قومی اور وطنی عصبیت اسلامی وحدت کے منافی ہے۔ اسلامی وحدت قومی اور وطنی عصبیتوں کو مٹاتی نہیں بلکہ ان کو قائم رکھ کے ان کو باہم گر جوڑتی ہے۔ قوموں اور جماعتوں کی اپنی اپنی عصبیات ایک حقیقت کی حیثیت رکھتی ہیں۔ ان کا مٹانا تقریباً ناممکن ہے۔ اسلام کا ابتدائی دور جو دینی رنگ کے استیلاء کا بہترین دور تھا۔ اس میں بھی یہ امتیازات معدوم نہ ہوئے تھے۔ مگر دینی وحدت کا نظام بنیان مرصوص کی طرح قائم رہا۔ اصل یہ ہے کہ اسلام نسل، وطن، قوم کسی چیز کا دشمن نہیں، صرف ان کی تنگ نظریوں اور تعدیوں کا دشمن ہے، اسلام ایک دین فطرت ہے، وہ ایک فطری چیز کا دشمن کیسے ہو سکتا ہے۔ البتہ وہ یہ ضرور چاہتا ہے کہ انسان کو ان رشتوں سے ایک زیادہ وسیع رشتہ دیدے اور وہ ایمان و اسلام کا رشتہ ہے۔ اگر نسلی اور وطنی عصبیات کی کوئی حقیقت نہ ہوتی تو حضور "الائمۃ من قریش" نہ فرماتے۔ پس ہر قوم کی نسلی اور وطنی عصبیت ایک اصل راسخ ہے۔ اس کے تعاضد و تناصر کا سنگ بنیاد اور سیاسی و اجتماعی نظام کا پہلا حجر اساسی اسی پر قائم ہوتا ہے۔ البتہ دینی وحدت کا رشتہ اس کو دوسری قوموں اور جماعتوں سے جوڑتا ہے۔ اگر مسلمانوں نے یہ راز جلد نہ بھلا دیا ہوتا اور ملوکیت کا رنگ طبائع پر نہ غالب ہو گیا ہوتا تو اسلامی تاریخ کی بہت سی طوائف الملوکیاں نہ برپا ہوتیں اور مسلمانوں کا اجتماعی رشتہ زیادہ محکم بنیادوں پر قائم ہوتا مگر ہوا یہ کہ ایک عصبیت تمام دنیا کی عصبیتوں پر حکمراں بننے کی خواہش مند ہو گئی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بہت جلد شیرازہ میں پراگندگی اور عرب و عجم اور ترک و عرب کی خانہ جنگیاں برپا ہو گئیں اور قومیں اس وحدت کے خیال سے ایسا کھٹکنے لگیں کہ ان کو اس کے فوائد کا سمجھنا مشکل ہو گیا۔

یورپ میں مسیحی اتحاد صلیبی جنگوں کے زمانہ میں موجود تھا۔ مگر وہ کس طرح ٹوٹا؟ رومن امپائر نے اس اتحاد کو آڑ بنا کر تمام یورپ کو رومن عصبیت کا محکوم رکھنا چاہا اور دوسری عصبیتوں کا پنپنا اس نے برداشت نہ کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ قوموں نے اس عذاب سے چھوٹنے کے لئے الگ الگ قومیتوں کو جگایا اور مسیحی اتحاد کے پرزے اڑا دئے۔ حالانکہ اگر دوسری عصبیتوں کو انگیز کرکے اور ان کو شہ دے کر رشتۂ اتحاد قائم کیا جاتا تو یہ افراتفری نہ پیدا ہوتی۔

جنگ عظیم کے زمانہ میں ترکوں کی مختلف ممالک اسلامیہ سے پسپائی بھی تنہا مغربی قوموں کی سازش سے نہیں ہوئی۔ بلکہ ایک طرف تو اُن کی گرفت بالکل ڈھیلی ہو چکی تھی۔ ثانیاً شام، عرب، مصر وغیرہ پر اُن کا استیلا نرا ترکی عصبیت کا استیلا تھا اور دوسری عصبیتوں کا استیلا بذات خود تباہ ہونے والی چیز ہے۔ اگر ترکوں نے ان عصبیتوں کو خود الگ الگ بڑھنے کا موقع دیا ہوتا اور پھر ان میں اسلامی وحدت کی اجتماعیت پیدا کرتے تو وہ پین اسلام ازم کی صحیح شکل ہوتی۔ بہرحال اسلامی وحدت، نظری قومیت و وطنیت کے منافی نہیں بلکہ اس کو مضبوط بنیادوں پر قائم کرنے کے لئے اس کے سوا کوئی شکل ہی نہیں کہ قوموں کی انفرادیت کو باقی رکھکر یہ رشتہ قائم کیا جائے۔

پس اگر آج ہمارے سیاسی مصالح متقاضی ہیں کہ ہم سیاسی و معاشی معاملات میں ہندوؤں سے وطنی و قومی بنیادوں پر معاملت کریں تو اس سے اسلامی رشتۂ وحدت سے ہم الگ نہ ہو جائیں گے۔ یہ ہماری انفرادیت کا پہلو ہے جس کو ہماری اسلامی وحدت سے کوئی تعلق نہیں۔ اس کے لئے ہمارا دہنا ہاتھ خالی ہے"۔

تحریک پاکستان

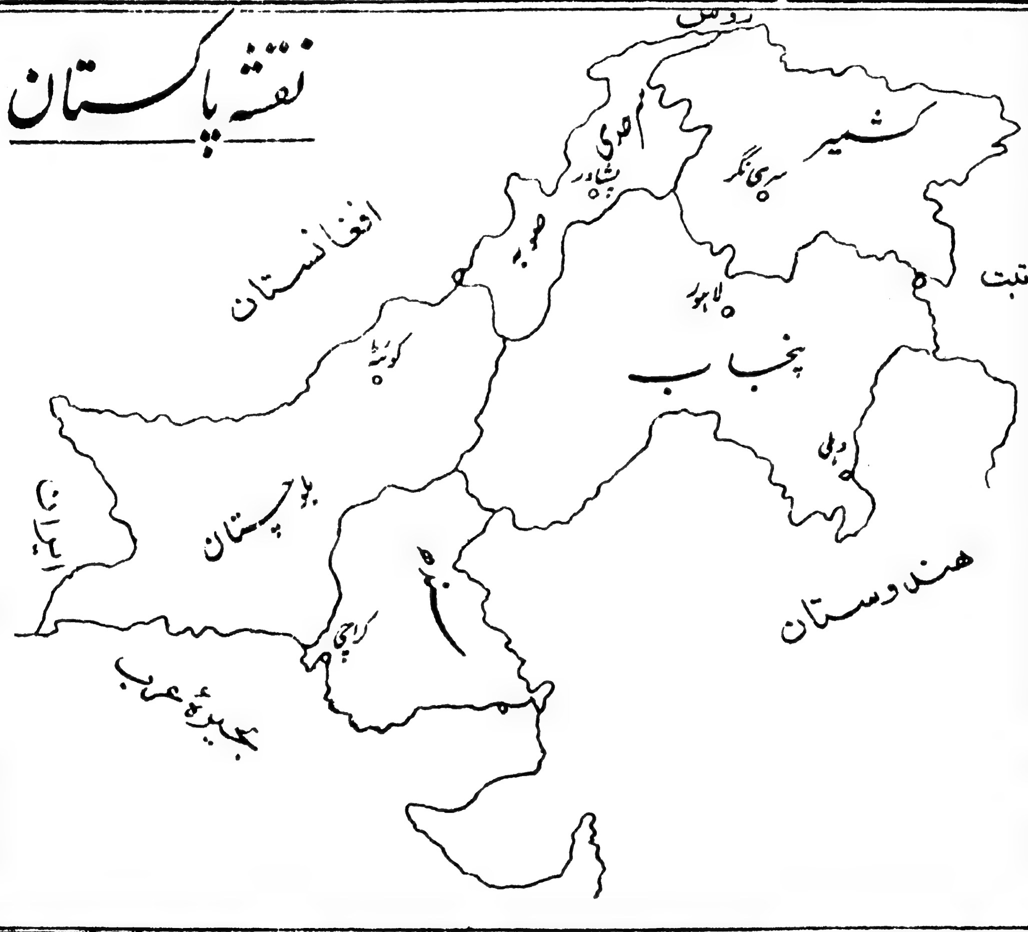
پاکستان کی تحریک ایک مستقل اسلامی ملیت کی شکل میں پیش کی جاتی ہے۔ اس کے قیام کے لئے کشمیر، شمالی مغربی سرحدی صوبہ، بلوچستان، پنجاب اور سندھ منتخب کئے گئے ہیں۔ اس کے معتقدین یا بانی کا خیال ہے کہ۔

ہندوستان اور پاکستان دو ایسے خطے ہیں، جن کے باشندے ایک دوسرے سے نمایاں طور پر ممتاز ہیں۔ ان کی تہذیبیں علیحدہ علیحدہ ہیں، ان کے مذہب، اُن کی معاشری اور تاریخی روایات میں ابتدا سے کوئی باہمی یگانگی اور ہم آہنگی نہیں پائی جاتی۔ ان دونوں علاقوں میں ایک ہی قوم کے دو فرقے آباد نہیں ہیں بلکہ دو مختلف قومیں آباد ہیں، ان کے مسائل کا حل فرقہ وارانہ سمجھوتوں سے نہیں بلکہ بین الاقوامی معاہدوں سے ممکن ہے۔" (جامعہ دسمبر ۳۵ء)

اس تحریک کے بانی کیمبرج یونیورسٹی کے ایک طالب علم چودھری رحمت علی ہیں۔ علامہ اقبال بھی اس تحریک کے حامی ہیں۔ اُنھوں نے الہ آباد میں مسلم لیگ کے اکیسویں اجلاس منعقدہ دسمبر ۱۹۳۰ء میں مسلمانوں کے سامنے جو اسکیم پیش کی تھی وہ بالکل تحریک پاکستان کے مطابق تھی در اصل علامہ موصوف ہی کی تائید اور حمایت سے عام طور پر لوگ اس تحریک سے روشناس ہوئے۔ ورنہ اس سے پہلے بہت کم لوگ واقف تھے۔ اسی وجہ سے بہت سے لوگ غلطی سے اس تحریک کا بانی علامہ اقبال کو سمجھنے لگے۔

اس تحریک کے حامیوں کی تعداد بہت محدود ہے۔ یہاں تک کہ ان صوبوں میں بھی جو مجوزہ پاکستان کے حصے بنیں گے۔ مثلاً پنجاب جہاں مسلمانوں کی اکثریت ہے اس تحریک کے حامیوں کی تعداد انگلیوں پر گنی جا سکتی ہے۔[1]

گو یہ تخیل نہایت ہی مبہم اور غیر واضح ہے لیکن جس شکل میں منظر عام پر آیا ہے اس کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ناممکن العمل ہے۔ مسلمانوں کی اکثریت اپنی قدیم ملکیتوں اور جائدادوں کو چھوڑ کر کسی دوسری جگہ جانے کے لئے تیار نہ ہوگی۔ سندھ کے مسلمان معاشی، تعلیمی اور سیاسی حیثیت سے اس قدر پست ہیں کہ وہ اپنے پیروں پر کسی طرح کھڑے نہیں ہو سکتے۔ انکی فلاح وبہبود اقلیت کے ساتھ رہنے ہی میں مضمر ہے۔ بفرضِ محال اگر مسلمانوں کے یہ احساسات اور جذبات، طاقِ نسیاں کے نقش ونگار نہ ہوجائیں اور وہ یہ سمجھکر کہ اُن کا "الہامی مذہب" اور "الہامی تہذیب وتمدن" کے تحفظ وبقا کی صرف یہی ایک صورت ہے تو ممکن ہے وہ ہر قسم کی قربانی کے لئے تیار ہوجائیں۔ لیکن اس کی کیا ضمانت ہے کہ ان صوبوں کی اقلیت اپنے مالوف وطن کو چھوڑنے کے لئے راضی ہوگی جو پاکستان میں شامل ہیں۔ سندھ کی اقلیت اگر تیار بھی ہوجائے تو پنجاب جیسے زرخیز صوبہ کے سکھ اور ہندو دوسری جگہ آباد ہونے پر کیوں کر راضی ہوں گے۔ اور یہ ظاہر ہے کہ ان کثیر التعداد خوشحال اور برسر اقتدار اقلیتوں کی مرضی کے بغیر یہ تحریک کسی طرح برسرِ عمل نہیں لائی جا سکتی۔



[1] یہ تحریک تقریباً مردہ ہو چکی تھی۔ مگر آج کل اس کے احیا کی کوشش کی جا رہی ہے۔ پنجاب کے بعض اخبارات میں اسکی حمایت میں مضامین شائع ہو رہے ہیں۔ ابھی حال میں اس کے بانی چودھری رحمت علی صاحب کا بھی ایک مضمون شائع ہوا ہے۔ میں نے ان مضامین کو پڑھا ہے۔ ان میں کوئی نئی چیز نہیں ہے، وہی پرانے قصے ہیں۔

ہندوستانی قومیت

اس کے بعد محض ہندوستانی قومیت رہ جاتی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ حصولِ آزادی کے لئے ہندوستانی قومیت کا ہونا نہایت ضروری ہے۔ یہ صرف میرا ہی خیال نہیں ہے۔ بلکہ جب سے ہندوستان کی سیاسی بیداری شروع ہوئی ہے مسلمانوں کی بہت بڑی تعداد جن میں علماء پیش پیش تھے، متحدہ قومیت کی حامی رہی ہے اور اُس زمانہ میں جبکہ سرسید کانگریس کی نہایت شدومد کے ساتھ مخالفت کر رہے تھے۔ علماء نے کانگریس کی حمایت کی۔ سرسید کی مخالفت ممکن ہے خلوص پر مبنی رہی ہو۔ لیکن اُن کی مخالفت سے ہندوستان کو ناقابلِ تلافی نقصان پہونچا۔ ان کے اس میلان سے مسٹر بیک نے جو کانگریس کے شدید مخالف تھے، بہت فائدہ اُٹھایا، انھیں لارڈ رپن اور دوسرے لبرل انگریزوں کی پارٹی سے علیحدہ کروا کر کنزرویٹو جماعت کا پُرجوش حامی اور مددگار بنا دیا جو ہندوستانیوں کو حکومت کے لئے نااہل قرار دے کر، ان کی ترقی میں روڑے اٹکایا کرتی تھی[1]۔ اس سلسلہ میں سرسید کی زبان وقلم سے ایسی ایسی باتیں نکلیں کہ دیکھکر تعجب ہوتا کہ کیا "اسبابِ بغاوتِ ہند" کا مصنف اس قسم کی باتیں بھی کہہ سکتا ہے؟ لیکن سرسید کی تحریروں کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ غالباً وہ آخر میں متحدہ قومیت کے حامی ہو گئے تھے۔ چنانچہ اُن کے مجموعۂ لیکچر میں یہ عبارت بھی ملتی ہے۔

"قوم کا اطلاق ایک ملک کے رہنے والوں پر ہوتا ہے
.... یاد رکھو ہندو اور مسلمان ایک مذہبی
لفظ ہے۔ ورنہ ہندو، مسلمان اور عیسائی بھی جو اس ملک
کے رہنے والے ہیں اس اعتبار سے سب ایک قوم ہیں،
جب یہ سب گروہ ایک قوم کہے جاتے ہیں تو ان سب کو
ملکی فائدہ میں جو ان سب کا ملک کہلاتا ہے، ایک ہونا چاہئے
.... اب وہ زمانہ نہیں کہ مذہب کے خیال
سے ایک ملک کے باشندے دو قومیں سمجھی جائیں"

یہ عجیب بات ہے کہ باوجود اس کے کہ تمام ممتاز علماء اور مسلمانوں کی جماعتیں، متحدہ قومیت کی حامی ہیں۔ لیکن پھر بھی ایک جماعت اسلامی لحاظ سے اسے شک وشبہ کی نگاہ سے دیکھتی ہے۔ شیخ الہند مولانا محمود الحسن صاحب، مولانا عبید اللہ صاحب، مولانا حسین احمد صاحب، مولانا سید سلیمان صاحب ندوی، مولانا ابو الکلام صاحب آزاد اور خلافت تحریک کے لیڈروں وغیرہ نے نہ صرف یہ کہ اس کی حمایت کی ہے بلکہ اس کے قیام کے لئے کوششیں کی ہیں۔ جمعیۃ العلماء اور مجلس احرار کی کارروائیوں اور روداووں کو دیکھئے اُنھوں نے ہمیشہ اس کی تائید کی ہے۔ اس کے باوجود اگر شک وشبہ کی گنجائش باقی رہے تو اس کے سوا اور کیا کہا جا سکتا ہے۔

دے اور دل ان کو جو نہ دے مجکو زباں اور

مولانا حسین احمد صاحب نے ابھی حال میں، قومیت کے متعلق جو بیان دیا ہے اُسے آپ تمام حضرات نے پڑھا ہوگا۔ اُنھوں نے نہایت ہی واضح اور غیر مبہم الفاظ میں ہندوستانی قومیت کی پُرزور حمایت کی ہے۔ فرماتے ہیں

"آزاد ہونا اور ملک وملت کی زندگی اور بہبودی کی فکر
اور سعی کرنا ہر حیثیت سے سب کا فرض ہونا اظہر من الشمس
ہے۔ اگرچہ اس پردیسی خونخوار قوم سے نجات کے اور بھی
ذرائع عقلاً ممکن ہیں۔ مگر جس قدر قوی اور موثر ذریعہ
تمام ہندوستانیوں کا متفق اور متحد ہو جانا ہے، اور
کوئی ذریعہ نہیں ہے۔ اس کے آگے ——— اس
حکومت کے جملہ اسلحہ اور تمام قوتیں بالکل بیکار ہیں اور
بغیر نقصانِ عظیم ہندوستانی اپنے مقصد میں کامیاب
ہو سکتے ہیں۔ لہٰذا اشد ضرورت ہے کہ تمام باشندگان
ملک کو منظم کیا جائے اور اُن کو ایک ہی رشتہ میں منسلک
کر کے کامیابی کے میدان میں گامزن بنایا جائے ہندوستان
کے مختلف عناصر اور متفرق ملل کے لئے کوئی رشتہ اتحاد
بجز متحدہ قومیت اور کوئی رشتہ نہیں جس کی اساس
محض وطنیت ہی ہو سکتی ہے۔ اس کے علاوہ اور کوئی دوسری
چیز نہیں ہے"

ایک اور واقعہ سنئے۔ لکھنؤ میں آل مسلم پارٹیز کانفرنس ہو رہی تھی برادرانِ وطن سے اتحاد واتفاق کے لئے شرائط طے ہو رہی تھیں۔ چار

[1] مسلمانوں کا روشن مستقبل صفحہ

روز گزر چکے تھے۔ مگر ابھی تک کوئی فیصلہ نہیں ہو پایا تھا۔ اسی اثنار میں کسی نے مولانا حسین احمد صاحب سے پوچھا کہ حضرت! آپ فرمائیے کہ اس بارے میں جمعیۃ العلمار کی کیا رائے ہے۔ آپ نے بڑے سکون کے ساتھ فرمایا کہ ہمارا تو ایک مطالبہ ہے جو ہم کانگریس سے کر چکے ہیں۔ وہ یہ کہ ملک کو اختیارات ملنے پر مسلمانوں کو اپنے مذہبی معاملات طے کرنے کے لئے قاضی مقرر کرنے کا حق دیا جائے اور ہم نے کہدیا ہے کہ جب تک کہ ملک کو آزادی حاصل نہو ہم تو خاموشی کے ساتھ آزادی کی جنگ میں شریک رہیں گے۔ البتہ آزادی ملنے پر ہمیں یہ حق نہ ملا تو پھر اُس وقت اگر ہم میں قوت ہوگی تو ہم اسے منوالیں گے[1]

حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن صاحب، بلا امتیاز مذہب و ملت کے خالص ہندوستانی حکومت قائم کرنی چاہتے تھے۔ آپ حضرات سے یہ واقعہ مخفی نہ ہوگا کہ مولانا نے ایک تحریک شروع کی تھی جس کی وجہ سے مع رفقار کار مالٹا میں نظربند کئے گئے تھے۔ اس تحریک کے صدر ایک غیر مسلم یعنی راجہ مہندر پرتاب سنگھ تھے۔ چنانچہ "مسلمانوں کا روشن مستقبل" کے مصنف ایک جگہ لکھتے ہیں "حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب دیوبندی کے پیش نظر ہندوستان کی جمہوری حکومت تھی۔ جس کی صدارت کے لئے موصوف نے راجہ مہندر پرتاب سنگھ کو تجویز کیا تھا[2]" مہندر پرتاب سنگھ ضلع متھرا کے ایک رئیس تھے اور ۱۹۱۴ء میں یورپ چلے گئے تھے اور برطانیہ کی مخالف سلطنتوں سے تعلق رکھتے تھے۔ مولانا محمود الحسن صاحب کی ان تمام کوششوں میں مولانا عبید اللہ صاحب برابر کے شریک تھے، اور ان کی رائے سے قطعی متفق۔ مولانا محمد علی مرحوم، مولانا ابوالکلام صاحب آزاد اور مولانا سید سلیمان صاحب ندوی کے متعلق غالبًا کچھ کہنے کی ضرورت نہیں، ان لوگوں نے ہندوستانی قومیت اور برادرانِ وطن سے اتفاق و اتحاد پر اس قدر زور دیا ہے اور اس کے متعلق اس قدر لکھا اور کہا ہے کہ ان کے خیالات روز روشن کی طرح عیاں ہیں۔ اس کے متعلق کچھ کہنا تحصیل حاصل ہے۔ اول الذکر دو بزرگوں کی تو پوری زندگی اسی میں صرف ہوئی ہے۔

غالبًا اب یہ واضح ہو گیا ہوگا کہ تمام ممتاز علمائے اسلام، ہندوستانی قومیت کے حامی ہیں، اور اسی کے ساتھ یہ حقیقت بھی روشن ہو گئی ہوگی کہ ہندوستان کی آزادی و ترقی اور فلاح و بہبود کے لئے متحدہ قومیت کا ہونا ازبس ضروری ہے۔

یقین جانئے، جب تک ہندوستان میں فرقہ وارانہ جذبات و احساسات اور فرقہ وارانہ تنظیم اور مختلف قومیتیں اور عصبیتیں پائی جائینگی، اُس وقت تک غلامی کی اس دلدل سے نکلنا محال نہیں تو مشکل ضرور ہے۔

حضرات! ہم تو ہندوستان کے اس مستقبل کے منتظر ہیں، جب اس ملک کے تمام افراد ایک رشتہ میں منسلک ہوں گے۔ ہندو قومیت اور مسلمان قومیت، بنگالی قوم اور گجراتی قوم۔ ہندو تہذیب اور مسلم تہذیب برہمن کلچر اور غیر برہمن کلچر کی سی آوازیں ختم ہو جائیں گی، مسلمانوں کی زندگی کی شکل ہی کچھ اور ہو گی "مرکز اسلام ہوگا، مگر اس میں ہندوستان کی قومی تہذیب کا وہ رنگ ہوگا جو عام انسانی تہذیب کے رنگ میں کھپ جائے، اس کی بنیاد اس عقیدے پر ہوگی کہ مذہب کی سچی تعلیم ہندوستانی مسلمانوں کو وطن کی محبت اور قومی اتحاد کا سبق دے گی۔ اور ہندوستان کی ترقی و عروج میں حصہ لینے پر آمادہ کرے گی۔ اور آزاد ہندوستان اور ملکوں کے ساتھ مل کر دنیا کی زندگی میں شریک اور امن و تہذیب کی خدمت کرے گا"

مرے دل میں ہے غالب شوقِ وصل و شکوۂ ہجراں
خدا وہ دن کرے جو اس سے میں یہ بھی کہوں وہ بھی

رازِ کون و مکاں کا محرم ہوں میں
بیتاب ہوں، بے چین ہوں، پیہم ہوں میں
مجھ سے پاتے ہیں پرورش ارض و سما
گہوارۂ طفلک دو عالم ہوں میں
[illegible]

---

[1] مسلمانوں کا روشن مستقبل صفحہ ۴۹۱
[2] مسلمانوں کا روشن مستقبل صفحہ ۴۸۲

برادری

تقی - مہرولی

مذہب! ——— مذہب!! ——— مذہب!!!

گئو شالہ کو دو ہزار روپیہ دان دئے، اس میں بھی مذہب، غریب ہونہار لڑکوں کے وظیفے مقرر کئے اس میں بھی مذہب۔ مفلس و نادار والدین کی کنیاؤں کے ہاتھ پیلے کردئے اس میں بھی مذہب، اور اب میری لڑکی کی تعلیم کا معاملہ ہے سو اس میں بھی مذہب کو ٹھونسا جارہا ہے ———

آخر میں پوچھنا چاہتا ہوں کہ یہ دل آزاری، تعصب، حسد اور جہالت جس کا تم نے مذہب نام رکھ چھوڑا ہے کیوں میرے نجی معاملات میں دخل انداز ہوتا ہے، میں تمہارے کسی کام میں دخل نہیں دیتا۔ تم پانچوں وقت کی نماز پڑھتی ہو۔ تسبیح و مصلّے کا جنون ہر وقت سوار رہتا ہے۔ مولود و وعظ کی محفلیں آئے دن منعقد ہوتی رہتی ہیں، ہٹے کٹے نفس پرست پیروں، ملاؤں اور مجاوروں کی ضیافتوں کا بل ہر ماہ مجھے ادا کرنا پڑتا ہے۔ والدصاحب عُرسوں کی بدعت، بوسیدہ قبروں کی مرمت اور ناکارہ مسجدوں پر سفیدی اور چراغاں کرانے پر روپیہ برباد کرتے رہتے ہیں۔ نذر و نیاز اور فاتحہ سے اُنھیں فرصت ہی نہیں ملتی۔ زندوں سے زیادہ مردوں کی قدر کی جاتی ہے۔ مذہب نے بھائی اور بھابی صاحبہ کو اولاد کی پرورش سے سبکدوش کردیا ہے۔ بچہ بیمار ہے تو ہوا کرے۔ روتا ہے تو رویا کرے۔ اس کے کپڑے غلیظ ہیں تو انھیں کیا؟ مہینوں نہائے ہوئے ہوگئے تو بھی کچھ پروا نہیں۔ نہ اس کی غذا کا خیال ہے اور نہ تعلیم و تربیت کا۔ دن رات اللہ اللہ کے سوا اور کچھ کام ہی نہیں۔ صبح ہوئی اور طوطے کی طرح رٹے ہوئے قرآن کو دوہرانا شروع کردیا۔ مگر مجھے کیا؟ تمہارے مرض کا میرے پاس کوئی علاج نہیں۔ اور ہو بھی کیسے۔ تعلیم کے تم لوگ پاس نہیں، عقل و فراست پر ایمان نہیں۔ لاعلمی کو علمیت سمجھتے ہو۔ اخلاق و محبت کے وعظ تم نے نہیں سُنے۔ تمہارا ایمان جنت، دوزخ، عذاب، ثواب، عرش کرسی اور اسی قسم کی فرسودہ اور خیالی چیزوں کا نام ہے۔ تمہاری دنیا گھر کی چار دیواری تک محدود ہے۔ تمہارے نزدیک جو کچھ کرتا ہے خدا کرتا ہے۔ انسان اس کے آگے بالکل بے بس و مجبور ہے۔ اگر آج میں انسانی عقل کے کارنامے اور سائنس کی حیرت انگیز ترقی کے چند واقعات بتادوں۔ اور یہ کہوں کہ انسان نے تمہارے خدا کے ساتھ جنگ چھیڑ دی ہے اور وہ بہت جلد اس پر فتح پالے گا تو نہ معلوم تم اور تمہارے ہمخیال مجھے کیا کیا کہہ ڈالیں۔

آخر تمہارا منشا کیا ہے! ایکبار نہیں ہزار بار کہہ چکا ہوں کہ افروز مکتب میں داخل نہیں کی جاسکتی۔ میں نہیں چاہتا کہ وہ ہر چھینک پر الحمدللہ کہے۔ اعلیٰ تعلیم و تربیت دینا میرا فرض ہے۔ اس کے بعد اُسے حق ہوگا کہ اپنے لئے جو راہ مناسب سمجھے اختیار کرے۔ مگر میں جہالت کے سے ناقابلِ تلافی گناہ کا مرتکب نہیں ہوسکتا۔ میں اسے موجودہ زمانہ کے لحاظ سے تعلیم دلاؤں گا۔ وہ میری اکلوتی لڑکی ہے۔ میری اُمیدوں کا سہارا۔ میں نے جو کچھ کمایا ہے اس کے لئے، اس کی تعلیم کے لئے۔ مجھے معلوم ہے مغربی تعلیم آگ پر تیل کا کام کرے گی۔ برادری والے مجھ سے بدظن ہیں۔ اس وقت

وہ میری جان کے دشمن ہو جائیں گے۔ اسلام خطرہ میں نظر آنے لگے گا۔ اوباش اور عامہ لوگوں کی بن آئے گی، اور جس وقت وہ اسلامی تہذیب و تمدن کا خون ہوتے دیکھیں گے اُس وقت بیچاری افروز کا جینا ناممکن ہو جائے گا —— مگر یاد رکھو میرت پر جو مصیبت آئے گی اس میں تمھیں ضرور شریک ہونا پڑے گا۔ میری لامذہبیت اور دہریت کا انتقام مجھ سے زیادہ تم سے لیا جائے گا۔ کیونکہ سماج صرف اُسے کچلتی ہے جو اس سے دبکر رہتا ہے، —— اس لئے بہتر یہی ہے کہ ایک نیک کام کے لئے برادری کا جم کر مقابلہ کیا جائے۔ میں کل افروز کو نیشنل پبلک سکول میں داخل کرا دوں گا۔ میں نے اپنی کوشش اور اس کی محنت سے اس کے چھ سال بچا لئے ہیں، اور اب وہ ساتویں جماعت میں داخل ہونے کے لائق ہے۔

مسٹر سمیع یہ سب کچھ کہنے کے بعد کچہری چلے گئے۔ ان کے جانے کے بعد گھر میں چہ میگوئیاں شروع ہو گئیں۔ ہر ایک نے افروز کی تعلیم کے بارے میں مختلف طریقوں سے اختلاف کیا۔ مگر بلی کے گلے میں گھنٹی کون باندھے، اتنی جرأت کسی میں نہ تھی —— مسٹر سمیع ان لوگوں میں سے تھے جن کے پائے استقامت کو زمانہ کی تیز و تند آندھیاں کبھی نہ ہلا سکتی تھیں۔ جو ایک دفعہ سوچ لیتے تھے اُسے پورا کر کے چھوڑتے تھے۔ دوسروں کے اختلاف کی کوئی وقعت ان کے دل میں نہ تھی۔ طبیعت میں جدت، استقلال، اور عزم و ارادہ کی خوبیاں موجود تھیں۔ جو بعض اوقات "بزرگوں" سے گستاخی اور بے ادبی کا باعث ہو جاتی تھیں۔ برادری اُن کے نزدیک عمیق دلدل تھی جس میں دھوکے اور فریب کاریوں کا جال بچھا ہوا تھا۔ مذہب کے پیچیدہ مسائل کے عوض زندگی کے سیدھے سادے اصول کی پیروی کرتے تھے۔ جو کچھ سوچتے اور کرتے وہ صرف ایک ہندوستانی کی حیثیت سے۔ مذہب کو اس میں ذرا دخل نہ ہوتا تھا، یہی وجہ تھی کہ عام لوگوں میں ان کی لامذہبیت کے چرچے ہوا کرتے تھے۔ چند جوشیلے اور کٹر لوگوں نے کئی بار ان کے مقابل آنے کی کوشش کی، مگر ہمیشہ کچھ مصلحت سمجھ کر خاموش ہو گئے۔ وہ لوگ جنھیں مسٹر سمیع سے کسی نامعلوم وجہ کی بنا پر پرخاش تھی یا جو ان کی صفات اور جاہ و حشمت سے خدا واسطے کا بیر رکھتے تھے۔ پس پردہ ان کے خلاف سازشیں کرنے لگے۔ ان کی کوششیں بہت جلد رنگ لانے لگیں۔ افروز کی تعلیم نے تمام برادری میں غم و غصہ کی لہر پیدا کر دی، اس کا اسکول میں داخل کرانا گویا برادری کو چڑانا تھا۔ لوگوں کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو چکا تھا۔ وہ اب مسٹر سمیع الدین کی بے دینی کو زیادہ برداشت نہ کر سکتے تھے۔ گھر والوں پر تو اُن کا زور تھا۔ اس لئے وہ اُنھیں دبا لیا کرتے تھے۔ مگر برادری کو کیا ضرورت تھی کہ وہ اُن سے دبکر رہتی۔ اور خاص کر اس موقع پر جب دین کی عزت و حرمت کا سوال تھا۔ افروز کا بے پردہ رہنا، لڑکوں کے دوش بدوش مغربی تعلیم حاصل کرنا، رقص و موسیقی سے دلچسپی کا اظہار کرنا اور ان سب سے زیادہ مذہبی احکام کو نظر انداز کرنا، مسٹر سمیع الدین کو ملزم ٹھیرانے کے کافی ثبوت تھے۔ اس لئے حالات کی نزاکت کو مدنظر رکھتے ہوئے ایک پنچایت کا اعلان کر دیا گیا —— یہ اجتماع قصبہ کی تاریخ میں ایک غیر معمولی اجتماع تھا، وہ لوگ جنھوں نے شاید عید کے روز بھی مسجد کی شکل نہ دیکھی تھی۔ آج دین ہدیٰ کی لاج رکھنے جوق در جوق چلے آ رہے تھے۔ مسجد پر شاہی محلسرا کا دھوکہ ہو رہا تھا۔ اس کے طمطراق کو دیکھکر بوسیدہ جھونپڑوں میں رہنے والوں کی نظروں میں اسلام کی عظمت و بزرگی کی تصویر پھر رہی تھی۔ ادبار و نحوست میں دبے ہوئے انسانوں کو اس کا بالکل احساس نہ تھا کہ خدا صرف امیروں کا ہوتا ہے۔ اور اُسے غریبوں سے حد درجہ نفرت ہے۔ افلاس و تنگدستی نے اس کے احساسِ خودداری کو بالکل ضائع کر دیا تھا۔ اور وہ یہ بھول چکا تھا کہ اس کی عبادت و ریاضت کا ثمرہ امیروں کو عطا ہوتا ہے۔ جن کی ہر لغزش اور گناہ قابلِ عفو ہے اور جن کی سیہ کاریوں اور ظلموں پر مذہب کوئی بازپرس نہیں کرتا۔ کریہہ منظر چہرے، ماتھوں پر سجدوں کے داغ، ڈاڑھیوں کے گھناؤنے اُلجھے ہوئے بال، پسینے کی بُو میں بسے ہوئے کپڑے، ٹخنوں سے اونچے پائجامے، اجتماع کی خاص خصوصیات تھیں۔ کارروائی کا آغاز مسٹر سمیع کی ہجو سے شروع ہوا۔ قدرت کی ستم ظریفی دیکھئے کہ منظر عام پر استنجا کرنے والے، خانقاہوں اور مزاروں پر عفونت آب اور عقیدت مند عورتوں کو گھورنے والے آج مسٹر سمیع کی تہذیب اور کیرکٹر پر رکیک اور کمینہ حملے کر رہے تھے۔ غیروں کے ساتھ مل کر اپنے بھائی کا گلا گھونٹنے والے۔ مسجدوں اور مزاروں پر غاصبانہ قبضہ کرنے والے۔ بیواؤں، یتیموں اور مظلوموں کی زندگی تلخ تر بنانے والے اور سُود کی بھاری رقمیں لینے والوں کو آج مسٹر سمیع کی آنکھ کا تنکا نظر آ رہا تھا، اور صرف اللہ سے ڈرنے والی قوم کے افراد آج ان پر یہ الزام لگا رہے تھے کہ ہم نے آج تک انھیں کسی حاکم کی چوکھٹ پر جبیں سائی کرتے نہیں دیکھا اور اُنھوں نے کسی صاحب کو فرشی سلام کرنے میں اپنا سر نہیں جھکایا۔

ملوکیت پرستوں یعنی مسلم لیگیوں کا کہنا تھا کہ کھدر کی نوکیلی ٹوپی سے اسلام کی دل آزاری ہوتی ہے۔ اور مسٹر سمیع قرآن کی تعلیم اور اسلامی شان کے بالکل برعکس بادشاہ وقت سے سرکشی اور بغاوت کو اپنا شعار بنائے ہوئے ہیں۔ اور حضور ملک معظم کی حکومت کے خلاف لوگوں کے دلوں میں نفرت وحقارت کے جذبات پیدا کرتے ہیں۔ ہندوستان کفرستان کو جنت نشان کہکر مقاماتِ مقدس کی توہین کرتے اور غیر مسلموں سے رسم و راہ بڑھا کر اسلامی روایات کو نظر انداز کرتے ہیں —— الزام تراشیوں کا سلسلہ شام تک قائم رہا۔ اصل مسئلہ کے علاوہ ہر دیگر امر پر اچھی طرح روشنی ڈالی گئی۔ مسٹر سمیع کی ہر نقل و حرکت کو مذہب کی کسوٹی پر پرکھا گیا۔ اور آخر کار فتوؤں کی امداد سے فیصلہ کیا گیا کہ "سمیع الدین کا ہر قول و فعل دینِ حق اور شریعتِ محمدیہ کی تعلیم کے منافی ہے۔ اپنی لڑکی کو تعلیم دلانا مشرکین کا اتباع اور مذہب سے برگشتہ کرنے کے مترادف ہے۔ -------

یہ پنچائت متفقہ طور پر اُنھیں برادری سے خارج کرتی ہے۔ -------

ہر مسلمان کو لازم ہے کہ پنچائت کے فیصلہ پر عمل کرے -------

مسٹر سمیع سے کسی قسم کا تعلق رکھنے والے کے خلاف پنچائت مناسب کارروائی کرے گی"

پنچائت کے فیصلے کی خبر جب مسٹر سمیع تک پہونچی تو اُنھوں نے ایک زوردار قہقہے کے ساتھ اس کا خیر مقدم کیا۔ عمل و عزم کی ایک نئی روح نے ان کے چہرے پر مزید تازگی و شگفتگی کے آثار پیدا کر دیئے۔

بصیرت

کیوں کر نہ زندگی ہو سعادت مرے لئے
ہر جنبشِ نظر ہے عبادت مرے لئے

جس کی ہر ایک سطر ہے اک راہِ مستقیم
اُترا ہے وہ صحیفۂ قدرت مرے لئے

اسما پہ ہے نگاہ، نہ اشکال پر نظر
یعنی مجاز بھی ہے حقیقت مرے لئے

ظاہر کروں تو کفر کے فتوے لگائے خلق
اُتری ہے عرش سے وہ شریعت مرے لئے

جب ذہن کے اُفق پہ چمکتی ہے برقِ فکر
آتا ہے گھر کے ابرِ ہدایت مرے لئے

تابندہ جس مقام پہ ہے وجہ ذوالجلال
مختص ہے وہ فرازِ بصیرت مرے لئے

شکرِ خدا کہ ہر سحر و شامِ زندگی
لاتی ہے ایک تازہ بشارت مرے لئے

ہر آن ہے نزولِ ملائک مرے حضور
ہر سانس ہے نویدِ رسالت مرے لئے

اپنے ضمیرِ زندہ و خلّاق کی قسم
اک حرفِ پوچ ہے بشریت مرے لئے

جس کی چمک سے جیبِ مشیّت ہے تابناک
مخصوص ہے وہ گوہرِ حکمت مرے لئے

جوش

کانگرسی وزارت اور مسلمانوں کی کلچرل ترقی

مرتبہ
شعبۂ اطلاعات سیاسی و معیشتی، آل انڈیا کانگریس کمیٹی۔ الہ آباد

اب سے پہلے ہم کانگرسی وزارتوں کے ان کاموں کا اعداد و شمار کے ساتھ تذکرہ کر چکے ہیں جن سے براہِ راست مسلمانوں کو اور خاص کر کے غریب مسلم عوام کو فائدہ پہونچ رہا ہے۔ آج کل کانگریس اور اس کی وزارت کے خلاف عام طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ یہ دونوں مسلمانوں کے دشمن ہیں، اور مسلم تمدن و معاشرت کو مٹا دینا چاہتے ہیں۔ اس زہریلے پروپاگنڈے کی کوئی حقیقت نہیں۔ اگر آپ ہماری وزارتوں یا کانگریس کمیٹیوں کی روزمرہ کی کارروائیوں کو دیکھیں اور اچھی طرح غور کریں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ کانگریس اور اس کی وزارت مسلم اقلیت کی بہترین رفاقت اور دوستی کا ثبوت دے رہی ہے اور موجودہ حالات میں ان کی تمدنی اور ذہنی، سماجی، سیاسی اور اقتصادی ترقی کے بہترین اور ہر ممکن سامان فراہم کر رہی ہے۔

آج ہماری کلچرل اور ذہنی ترقی کا وسیلہ اسکول، مدرسے، مکتب، کتب خانے اور انجمنیں ہیں۔ اور تمدن کے مرکز یہ بڑی بڑی خانقاہیں۔ امام باڑے۔ مقابر، مساجد وغیرہ۔ کانگریسی وزارت نے مذہبی اوقاف کو زراعتی ٹیکس سے مستثنیٰ کر کے اپنی مسلمان دوستی کا ثبوت دے دیا ہے۔

ہم ذیل میں صوبہ متوسط (سی۔ پی) کی کانگرسی وزارت کے ان کارناموں کا خلاصہ دیتے ہیں۔ جس سے معلوم ہوگا کہ مسلم عوام کی ذہنی ترقی کے کیا کیا سامان ہوئے ہیں۔

تعلیمی وظیفے

(۱) تین روپے ماہانہ فی طالب علم کے حساب سے ۹ وظیفے ——— مڈل اسکول کے طلبا کے لئے۔

جو طالب علم آس پاس میں اسکول نہ ہونے کی وجہ سے دوسری جگہوں میں جا کر پڑھنے کے لئے ہوسٹلوں میں رہتے ہیں اُنھیں تین روپے ماہانہ کی رقم وظیفے کے علاوہ دی جاتی ہے۔

(۲) پانچ روپے ماہانہ آٹھ طالبانِ علم کو ——— ہائی اسکول کے طلبا کے لئے۔

جو لڑکے ہوسٹلوں میں رہتے ہیں اُنھیں آٹھ روپے ماہانہ ملتا ہے۔

(۳) پانچ روپے ماہانہ کے چودہ وظیفے ——— اردو نارمل اسکول سے متعلق پریکٹسنگ اسکول کے طلبا کے لئے۔

(۴) عورتوں کے گورنمنٹ نارمل اسکول جبلپور میں اردو زبان میں ٹریننگ کرنے والی لڑکیوں کے لئے دس دس روپے کے دس وظیفے۔

(۵) اردو نارمل اسکول امراؤتی میں ۱۳۔ ۱۳ روپے کے ساٹھ وظیفے۔

(۶) اس کے علاوہ عام مقابلہ کے ذریعے مسلم طلبا کو علیحدہ وظیفے مل سکتے ہیں (اور ملتے ہیں)

مسلمانوں کی تعلیم کا خاص انتظام

صوبہ میں اس وقت ۳۰۲ تعلیمی اسکول ہیں جو صرف مسلمانوں کے لئے

مخصوص ہیں۔ ان میں ۲۲۸ پرائمری اسکول ہیں ۱۶ انگلو ورنیکلر مڈل اسکول ۲۲ ورنیکلر مڈل اسکول۔ ۱ نارمل اسکول۔ اور ۶ ہائی اسکول۔ ان میں چھ سرکاری اسکول ہیں۔ ان مخصوص اسکولوں میں ۱۳۵ و ۲۹ لڑکے ۳۶ء میں فارغ التحصیل ہو چکے ہیں۔ اور اس وقت ان کی تعداد اور بھی زیادہ بڑھ رہی ہے۔

تعلیمی اداروں کی مالی امداد

اس وقت مندرجہ ذیل ادارے کانگریسی حکومت کی طرف سے مالی امداد پا رہے ہیں۔

ادارہ	رقم
(۱) انجمن اسلامیہ ہائی اسکول۔ ناگپور	۶,۰۷۸ روپیہ
(۲) رابرٹسن انجمن اسلامیہ ہائی اسکول جبلپور	۷,۷۵۰ "
(۳) حکیمیہ کروئیشن ہائی اسکول۔ برہان پور	۳,۷۲۲ "
(۴) صدر بازار انجمن پرائمری اسکول۔ جبلپور	۸۵۰ "
(۵) انجمن اسلامیہ پرائمری اسکول۔ مرداره	۸۴۰ "
(۶) بورن فالہیان اردو پرائمری اسکول۔ کندیلی	۵۵۰ "
(۷) انجمن ہائی اسکول۔ کھام گاؤں	۴۱,۳۰۹ "
(۸) انیگلو ورنکلر مڈل اسکول بشیگاؤں	۷۵۰ "
(۹) دولت خاں انیگلو ورنیکلر مڈل اسکول پوساد	۲,۱۰۰ "
(۱۰) انیگلو اردو اسکول۔ یوتمل	۱,۰۰۰ "

لڑکیوں کے اسکول

ادارہ	رقم
(۱۱) انجمن گرلز اسکول۔ کٹنی	۳۰۰ روپیہ
(۱۲) انجمن اسلامیہ گرلز اسکول بھم تلیہ	۲۵۵ "
(۱۳) مسلم گرلز اردو اسکول۔ خاندوا	۵۲۵ "
(۱۴) مدرستہ البنات پرائمری اسکول	۳۰۴ "
(۱۵) انجمن اسلامیہ اردو گرلز اسکول۔ بلاس پور	۳۶۳ "
(۱۶) انجمن اصلاح المسلمین اردو گرلز اسکول چھندواڑہ	۲۲۵ "
(۱۷)	۲۶۹ "
(۱۸) اردو گرلز اسکول۔ نرسنگھ پور	۲۴۵ "
میزان	۲۹,۰۳۷ روپیہ

ان تمام اداروں میں لڑکوں کی مجموعی تعداد تقریباً ۵۵ ہزار ہے، اور لڑکیوں کی تقریباً ۱۲ ہزار۔

وزیر اعظم نے اپنے مدخاص سے پانسو کی رقم حال ہی میں انیگلو اردو مسلم گرلز اسکول جبلپور کو عطا کی ہے۔ ایسے عطیات کی تفصیل اور اعداد و شمار ہم اکٹھا کر رہے ہیں۔ اور بہت جلد انھیں بھی شائع کریں گے۔

جو منزلت انتساب ہو جاتے ہیں
اک رنج سے گھر خراب ہو جاتے ہیں
انسان کے سینے میں ہنر کے ہمراہ
کچھ عیب بھی باریاب ہو جاتے ہیں

جوش

دریا کے تموّج میں حبابوں کو نہ دیکھ
اوراقِ چمن الٹ، کتابوں کو نہ دیکھ
بکھرے ہوئے اک ذرۂ خاکی کے حضور
ڈوبے ہوئے لاکھ آفتابوں کو نہ دیکھ

جوش

بہرطور لازم ہے مشہور ہونا

(۱)

نہ حکمت نہ دانش نہ دولت نہ طاقت نہ دیں کی طہارت نہ رندی کی رفعت
نہ ظاہر نہ باطن نہ صورت نہ سیرت نہ ہو کچھ مگر چاہیئے پھر بھی شہرت
بہرطور لازم ہے مشہور ہونا

فقیہوں میں احمق، ادیبوں میں جاہل محبت سے خالی، حسینوں سے غافل
حقیقت کے معیار پر وہم باطل نہیں کچھ مگر فنِ شہرت میں کامل
بہرطور لازم ہے مشہور ہونا

رئیسوں کی خدمت میں مٹھیں زمیں پر ملے ہاں میں ہاں اور نہیں ہو نہیں پر
غریبوں میں ہوں جلوہ گر شہ نشیں پر سیاست پہ ہو نقد، تقریر دیں پر
بہرطور لازم ہے مشہور ہونا

مدیروں سے رہتا ہے لو پیار اِن کا کہ لکھدیں کہیں نام اخبار اِن کا
لگے فرشِ کاغذ پہ دربار اِن کا غرض نام چھپ جائے اک بار اِن کا
بہرطور لازم ہے مشہور ہونا

نہ گر ہو سکو تم کسی فن میں ماہر (۲) سہولت اِسی میں ہے بن جاؤ شاعر
حماقت بہ باطن، تفلسف بہ ظاہر مسلمان مندر میں کعبے میں کافر
بہرطور لازم ہے مشہور ہونا

جو ہو طبعِ سامی لطافت سے عاری تو کیا غم ہے کر ڈالو مضمون نگاری
کہیں کا گدھا اور کسی کی عماری نکل جائے اک روز یوں بھی سواری
بہرطور لازم ہے مشہور ہونا

رسالہ لکھو کوئی تاریخِ دیں پر چلاؤ زمانے کو شرعِ متیں پر
یہی کام آسان ہے اِس زمیں پر کرو تم بھی احسان دینِ مبیں پر
بہرطور لازم ہے مشہور ہونا

کہیں سے کرو یاد، لکھوا کے لاؤ کرو ایسی تقریر دھوم مچاؤ
جو ہو جائے کام اس کو اپنا بتاؤ سیاست یہ ہے صرف نوبت بجاؤ
بہرطور لازم ہے مشہور ہونا

میکش اکبرآبادی

مچھلی شہر کی علمی حیثیت

مہدی جعفری مچھلی شہری

کسی سرزمین کی تمدنی اور اجتماعی حالات کے اندازے کے لئے اس کے عروج و ارتقاء کے مدارج معلوم کرنے کے واسطے اس بلاد کے ماحول سے بڑھ کر کوئی بیّن شہادت نہیں ہو سکتی۔ ملک اور شہر، قصبہ یا تعلقہ ہر ایک کی تاریخ کا پورا دارومدار اہلِ مقام اور اس کے رہنے بسنے والے افراد کے سوانح حیات اور زندگی کے واقعات پر، وہاں کی مقتدر اور محکوم بلند رتبہ اور پست حیثیت ہستیوں کے کارناموں اور علمی و عملی خصوصیات پر ہے۔

اسلامی عہد میں ہندوستان جس تابناک مدنیت و عمران اور لوازم شوکت و شان سے گزرا ہے، اس کے نہ مٹنے والے نشان، اور تاریخوں کے اوراق اور آثارِ باقیہ کے مناظر سے صداقت شعار دلوں میں اعتراف کی لہریں پیدا ہوئے بغیر نہیں رہتیں۔

اسی عہد کی ایک خصوصیت تاریخی شہادتوں سے یہ ظاہر ہوتی ہے کہ دارالسلطنت اور صدر مقامات، صوبہ اور ضلع کی تنظیم اور اصلاح کے ساتھ ساتھ قصبے اور دیہات جو صوبہ اور ضلع سے ملحق ہوتے تھے اور پرگنہ کہلاتے تھے اُن کی تنظیم اور اصلاح کے لئے ان میں تمدن کی روح اور تعلیم کی روشنی پھیلانے کے واسطے صنعت و حرفت کے رواج و ترقی کی خاطر زمینداروں اور تعلقداروں کی محدود و آزاد حکومت جسے "تولیت" کے نام سے موسوم کیا جاتا تھا، اہم نظام کے ماتحت قائم ہوا کرتی تھی۔ اُس کا متولی علم و عمل، اقتدار و رسوخ، نظم و نسق، انسانیت و سلوک میں بلند حیثیت کا مالک ہوتا تھا۔ فرائضِ منصبی اور تعمیل منشا رشاہی کے لحاظ سے برگزیدہ شخصیت والا ہوتا تھا۔ اس لئے کہ صیغۂ عدالت کی اہم ذمہ داری اس کے سر ہوتی تھی، فصلِ قضایا کا کام سر انجام دیتا تھا۔ قصبہ کے بسنے والوں کے معاملات اور اُن کی زندگی کے نشیب و فراز کا پاسدار، اور جان و مال کا نگراں ہوتا تھا۔ ضلع کے حکامِ بالا سے براہِ راست اِس کا علاقہ ہوتا اور یہی محاصل و آمدنی کا جواب دہ رہتا تھا۔ اہلِ قصبہ اور پرگنہ کے بسنے والوں پر اپنے "متولی" کی اطاعت و فرماں برداری ضروری ہوتی تھی۔ اس محدود مگر ذمہ دار تولیت کے سایہ تلے قصبہ اور پرگنہ کے بسنے والے وہ پرسکون زندگی گزارتے تھے جس کی نظیر ملنی دشوار ہے۔ ہر طبقہ میں میل جول اتحاد و اتفاق، ہم آہنگی و یک جہتی پوری طرح کارفرما ہوتی۔ اور انکی زندگی کے ہر شعبہ میں فارغ البالی نمایاں ہوتی تھی۔ فیاضیوں کی روایات، داد و دہش کے قصے، اعانت و امداد کے نمونے، انسانیت و سلوک کی مثالیں ہمت و بلند حوصلگی کے فسانے، کنبہ پروری کے حقوق کی پاسداری۔ مسافر و محتاج کی دست گیری کی حکایتیں اس عہد کی اجتماعی زندگی کے خط و خال کو نمایاں کر رہی ہیں۔

صوبہ اور ضلع کے تابع علاقوں اور پرگنوں میں متولیوں ہی کے ذریعے سے علوم کی روشنی، مصنوعات کا شوق، ضروریاتِ زندگی میں تراش خراش، زبان اور طرزِ معیشت میں تبدیلی، اخلاق و طبائع میں لطافت پیدا ہوئی۔ اور انھیں نے اسلامی حکومت کے اثرات کو وہاں تک پہنچایا،

اور اُنھیں کے اختلاط سے مدنیت کے نقشہ میں کچھ ستھراپن آگیا۔ اس نظام کی تفصیل کی یہاں گنجائش نہیں۔ قصبوں کی زندگی پر مختلف حیثیت سے نظر ڈالی جاسکتی ہے۔ جس سے تاریخِ ہند کے اہم شعبوں پر سیر حاصل اضافے ہو سکتے ہیں۔ یہاں عنوان اور موقع کا لحاظ کرتے ہوئے اسے دوسرے موقع کے لئے چھوڑتے ہیں۔

جونپور جو یوپی کا اس وقت ایک ضلع ہے، اور جس کی بنیاد سلطان فیروز شاہ الموسوم بہ سلطان جونان خاں کے عہد میں اسی کے حکم سے ۷۷۲ھ میں ڈالی گئی۔ "شہر جونپور" سے بنائے تاریخ نکلتی ہے۔ سلاطینِ شرقیہ کی شوکت و ابہت سے شہرتِ تام حاصل کی۔ علوم و فنون میں صنائع و بدائع میں کمال کا درجہ پایا، اور علماء و فضلاء کی آماجگاہ بنا، اسی کے مضافات میں ایک قصبہ "مچھلی شہر" ہے، جو عہدِ شرقی میں سرکارِ جونپور کا پرگنہ تھا، اور گھیسوہ کے نام سے موسوم رہا۔ آج بھی مچھلی شہر ایک پرگنہ اور قصبہ کی حیثیت میں ہے اور اس کا قدیم نام گھیسوہ بھی کاغذات میں کہیں کہیں مندرج رہتا ہے،

تاریخی آثار سے مستنبط ہوتا ہے کہ مچھلی شہر جونپور کی بنیاد ۷۷۲ھ سے قبل بلند حیثیت میں تھا۔ سلطان محمود غزنوی کے عہد سے یہاں دارالقضا کا قیام ہوا، اور ہر عہد میں اس کی یہ حیثیت برقرار رہی اور یہ اپنے اس امتیاز سے عہدِ برطانیہ تک ممتاز رہا فرامینِ شاہی جو اس وقت تک باقی ہیں اس کی اس حیثیت کے ثبوت پر شاہد ہیں۔

مچھلی شہر کے عہدۂ قضا پر سب سے پہلے ثناء الملتہ والدین مخدوم قاضی ثناء الدین بن مخدوم قاضی نظام الدین جعفری غزنوی کا تقرر ہوا، جو علم و فضل ظاہری و باطنی میں یکتائے زمانہ تھے۔ ان کے بعد مخدوم موصوف کی اولاد مسلسل مچھلی شہر کے منصبِ قضا، تولیت، خطابت پر ممتاز ہوتی رہی، اور اس عہدۂ جلیلہ کے مشاغل کے باوجود یہ خاندان تعلیم و تفہیم اور تصنیف و تالیف سے بھی وطن اور اہلِ وطن کو فیضیاب کرتا رہا۔

مخدوم موصوف کی اولاد عہدِ عالمگیری میں جو اجلاء علماء میں شمار ہوئی۔ ان میں سے قاضی شیخ محمد ماہ رحمۃ اللہ علیہ ہیں۔ جن سے چھ پشت اوپر مخدوم قاضی ثناء الدین علیہ الرحمۃ ہیں۔ آپ کے عہدۂ قضا کا شاہی فرمان خاندان میں موجود ہے۔ تذکرۃ العلماء مصنفہ مولوی خیر الدین الہ آبادی کے فصل دوم میں آپ کے متعلق تحریر ہے۔

"از اعاظم بزرگان عہدِ عالمگیر بادشاہ شیخ محمد ماہ است در واقعات عالمگیری مسطور است کہ اورنگ زیب عالمگیر بادشاہ خود عالم باعمل و عامل باعلم بود قدر دانئ علماء بیش از بیش می نمود و از عہدِ شاہزادگی منظور داشت تا جونپور مثل زمان سلاطینِ شرقیہ از کثرتِ فضلا و مشائخان و انبوہ و ہجوم طلبۂ علوم و کاسبانِ فیوض رونق پذیر باشد چوں بر سریر سلطنت نشست یرلیغ واجب التبلیغ بناظم جونپور جہت ترقیم احوال مدرسان و مشائخان این شہر صادر گردانید و سوانح نگاران و وقائع نویسان را احکام تہدید امر برائے تحقیقات کوائف بود و باش این گروہ فرستاد، القصہ جونپور در عہدِ آنحضرت نمونہ گلزار ارم شد و در تمام شہر و قصبات نواحی آں مدرسہائے قدیم تاسیس یافتند، از عمدۂ مشائخان آں وقت شیخ محمد ماہ است بدر آسمان کمال و سرآمد اقران و امثال بود، در جمیع علوم درسی دستگاہے کلی داشت، و اوقاتِ گرامی او منقسم بچہار جز ساخت، جزوے برائے تقدیم عبادتِ مولا، جزوے برائے تعلیم شاگردان، و جزوے برائے ارشاد کاسبان و جزوے برائے ادائے حقوق اقارب و احباب"

صاحبِ دربار عالمگیری کا بیان ہے کہ آپ کو مخدوم الملک کا خطاب تھا، دوسری جگہ مولوی خیر الدین صاحبِ تذکرۃ العلماء کا بیان ہے "مشہور است کہ سلطان بادراک فطانت و فراست وے استدعائے قبولِ منصب وزارت نمود و گفت غرض این است کہ سالہائے بسیار بر روئے روزگار یادگار باشد کہ در عہدِ سلطان ہمچو شیخ بود کہ بادشاہ او را منصبِ وزارت بخشید۔ چوں این پیغامِ سلطان بشیخ رسید معذرت پیش آمد"

اسی دودمان بزرگ کی دوسری جلیل القدر ہستی اورنگ زیبی عہد میں قاضی ثناء الدین علیہ الرحمۃ کے نبیروں میں قاضی جلال الدین ہیں جو فتاویٰ عالمگیر کے جامعین کے زمرہ میں ہیں۔ فتاویٰ عالمگیری کا مسودہ جو ان کے حصہ میں پڑا، خاندان کے قدیم کتب خانہ میں موجود ہے، جس پر یہ عبارت ثبت ہے۔

مسودہ فتاوی عالم گیری

"مالکہ جلال الدین بن عبد الرشید بن علاء الدین بن محمد شاہ بن فتح اللہ بن صدر الدین بن ذکریا بن احمد بن محمد بن قاضی ثناء الدین الجعفری الہاشمی القرشی غفر اللہ لہم"

اس کے متعلق جدنا المکرم سند الوقت مولٰنا شیخ محمد محدث اعلیٰ اللہ مقامہٗ اپنی تالیف سلالۃ الکرام میں تحریر فرماتے ہیں: "دبر مجلدے از فتاوائے عالمگیری کہ از کتاب ادب القاضی است و در عشائر و قبائلِ ما بتواتر و استفاضہ منقول شد کہ این نسخہ مسودہ است کہ تالیفش بحصہ مولانا جلال الدین جعفری افتادہ و از وقت تالیف تا زمانِ این تحریر (سنہ ۱۲۶۹ھ) بدست بزرگان رابعن جد یادگار ماندہ و بر ورق اولین آں مہر مولانا سعد الدین بن مولینا عبد الرشید ثبت است کہ سنہ ۱۰۹۳ھ ہجری در ان نقش کردہ اند و سنہ ۲ جلوس"

سنہ ۱۱۴۶ھ کی ایک اہلِ قلم شخصیت القاضی العلامہ المحقق محمد ولی الجعفری کی ہوئی ہے، آپ کے علمی تبحر و دستگاہ کا اندازہ آپ کے ان حواشی و شروح سے ہوتا ہے جو آپ نے بحر الحکمۃ ملا محمود جونپوری کی کتابوں پر جو آپ کی دستی قلمی ہیں تحریر فرمائی ہیں۔ ہمارے جدِ محترم محدث و قاضی مولانا شیخ محمد مرحوم آپ کے ترجمہ میں فرماتے ہیں۔ "ہر چند بوجہ خمول از ذکر و تذکار حالات قدسی صفات خود حرفے نہ نگاشتہ اند، اما بتحقیقاتِ ارجمند و حقائق و معارف بلند کہ بر کتب درسیہ در حل و انکشاف مضامینش نگاشتہ یادگار روزگار گزاشتہ اند شاہدِ حال را باکمال الیشان ست"

پھر ان کے ہاتھ کی قلمی کتابوں کا جس پر حواشی اور شرحیں ہیں دوسری جگہ ذکر کرتے ہوئے تحریر فرمایا ہے: "فمنہا الشمس البازغۃ تصنیف ملا محمود الجونفوری رحمۃ اللہ تعالیٰ والکتاب جمیعہ وشروحہ بخط القاضی العلامہ المحقق محمد ولی الجعفری القاضی فی قصبہ کھیسوہ المشہور بجھلی شہر من توابع جونفور فی خاتمہ الشمس البازغۃ بخطہ وفیہا تاریخ کتابتہا قد جف لسان القلم من تحریر ہذا الکتاب المسمی بالشمس البازغۃ للعالم النحریر المدقق الخبیر بحر الحکمۃ المحمود الجونفوری یوم الجمعہ سادس محرم الحرام سنہ الف ومایۃ وستۃ واربعین من ہجرۃ خاتم النبیین علیہ وعلی آلہ والصلوٰۃ والسلام ببلدۃ لکھنؤ لا زالت مجمع الافاضل والاعلام بید اضعف الانام الراجی رحمۃ ربہ ذی الجلال والاکرام محمد ولی غفر اللہ لہ ولجمیع المومنین وادخلہم دار السلام"

"ومنہا رسالۃ الجبر والاختیار از مصنفات ملا محمود جونفوری موصوف است کہ ہم بخط قاضی محمد ولی مرحوم است کہ در آخر نسخہ "شمس بازغہ" است" اسی مجموعہ میں ملا محمود کا دوسرا رسالہ ھیولا ہے۔ یہ بھی قاضی موصوف الصدر کا مکتوبہ اور مشرحہ ہے۔

سنہ ۱۱۶۵ھ میں حضرت شاہ باب اللہ جعفری کی بلند صفات ہستی ہوئی۔ آپ کا نام نامی فقیر باب اللہ تھا، لیکن شاہ باب اللہ سے مشہور تھے۔ آپ کے والد ماجد مولینا قاضی کمال الدین جعفری تھے، جو قاضی جلال الدین جامع فتویٰ عالمگیریہ کے حقیقی بھائی تھے۔ شاہ باب اللہ صاحب نے اپنے چچا قاضی جلال الدین سے درسیات کی تکمیل کی، کمالاتِ ظاہری اور علوم و فنون کی تحصیل فرمائی۔ جدنا المحترم مولوی شیخ محمد اعلیٰ اللہ مقامہٗ "سلالۃ الکرام" میں آپ کے ترجمہ میں تحریر فرماتے ہیں "تحصیل کمالات ظاہری از اقسام علوم و مدارک فہوم از عم بزرگوار خود کردہ اند و اکتساب فیوض و برکات باطنی از حضرت شاہ دوست محمد دارند کہ قادری المشرب و زیبِ مسند ارشاد قصبہ منورۃ؛ صنی طیب بودند و از شاہ عبد الصبور قدس سرہٗ کہ نسبت اویسیۃ داشتند اخذ فیوض و برکات نمودہ اند، ہر چند زہد و خمول اشتغال بہ باطن مقتضی بود کہ از علوم ظاہر منزوی باشند تاہم چندین نسخ از کتبِ درسیہ بکمال ضبط و صیانت نوشتہ اند کہ باعثِ حیرت ناظرین می گردد و کتابے مبسوط در پارسی زبان تالیف فرمودہ اند، مشتمل بر عقائدِ دینیہ و مسائل شرعیہ ضروریہ کہ نامزد بہ فقہ شاہ باب اللہ است"

اسی صدی ہجری میں مولوی علی بن محمد بن باب اللہ جعفری کی شخصیت بلند ہوئی آپ عالم علوم جامع فنون تھے تحصیلِ علوم اپنے جدِ بزرگوار شاہ باب اللہ رحمۃ اللہ علیہ سے کی اور وہ درجہ ارجمند حاصل کیا کہ "مولوی گر" کے لقب سے یاد کئے جانے لگے۔ قاضی دائرسائر یعنی سارے صوبہ بہار کے قاضی القضاۃ ہوئے۔ آپ کی علمی یادگار میں سے خلاصۃ النحو عربی ہے، اور اصول اکبری شرح فصولِ اکبری منطق میں بھی آپ کے رسائل ہیں۔

آپ کے بڑے صاحبزادے مولوی عبد القدیر نے علوم ظاہری و

باطنی میں شہرتِ تام حاصل کی۔ آپ نے دہلی جاکر حضرت شاہ محمد آفاق قدس سرہٗ سے مراتبِ سلوک حاصل فرمایا۔ مولٰینا قاضی شیخ محمد جعفری مرحوم تحریر فرماتے ہیں "حضرت شاہ عبد القدیر نخستیں بیعت از بزرگے کردند وسلوک طریقہ مجددیہ بجد وجہد وبنہایت ترک وتجرید نمودند وقبل ازیں کہ بمراتب ارشاد وتلقین مریدین وطالبین رسند پیر بیعت ایشان رحلت کردند وبقیہ مراتب تکمیل وتربیت از حضرت مرشد السالکین واسوۃ العارفین شاہ محمد آفاق قدس سرہ فراگرفتند وخلعتِ خلافت واجازت ارشادہم ازایشان حاصل ساختند تا اینکہ ارادہ بالجزم حضرت شاہ محمد آفاق قدس سرہ براں قرار یافت کہ عقدِ صبیہ صلبیۂ خود بالیشان بربندند وجانشینِ خود سازند وایشان ہم برائے حصولِ اجازتِ عقد بخدمت والدماجد خود مولانا علی بن محمد جعفری از دہلی بمچھلی شہر وطنِ اصلی خود بہنفدت کردند واجازت نا حاصل شدہ بقضاۂ داعیٔ اجل را لبیک گفتند وبے عقد نکاح فوت کردند —— وبعد ایں واقعۂ جانکاہ پیرِ طریقت ایشاں حضرت شاہ محمد آفاق قدس سرہٗ بمدت منتظر شدند تا اینکہ بذاتِ خاص خویش مشاق سفر گوارہ کردہ بسواری محفہ تشریف فرمائے مچھلی شہر شدند و چندروز رونق افروز آں مرزبوم شدند۔"

آپ کے چھوٹے بھائی مولوی علی کبیر بن مولوی علی بن محمد جعفری بن شاہ باب اللہ نے بھی دنیاوی جاہ وجلال کے ساتھ علم وفضل میں رفعت بلند حاصل کی۔ علامہ تفضل حسین خاں لکھنوی کے خاص شاگردوں میں سے تھے۔ فلکیات میں آپ کو عبور خاص تھا۔ علمِ ریاضی میں یدطولی حاصل تھا۔ اور انھیں فنون کی نادر قلمی کتابوں کا آپ کا کتب خانہ ایک خزینہ تھا۔

۱۲۱۱ھ میں علامہ فہامہ مولٰنا محمد مشکور بن شیخ امانت علی بن قاضی محمد لواز جعفری کی وہ درخشاں شخصیت ہوئی جس کی علمی تابش نے مچھلی شہر ہی کو منور نہیں کیا بلکہ قرب وجوار کے شہروں میں علم کا نور پھیلا دیا۔ تعلیم کی فضیلت سے انبوہ خلائق کو بلند رتبہ پر پہنچا دیا۔ جہالت ولاعلمی کی گمراہ کن بندشوں سے اعلیٰ سے لے کر پست طبقہ کو آزاد بنا دیا۔ لفظ "تاریخ" آپ کی ولادت کا مادہ تاریخ ہے۔ ابتدائی تعلیم آپ نے اپنے نانا مولٰنا علی بن محمد ملقب بمولوی گرؔ سے حاصل فرمائی۔ ان سے موافق ملا عضد پڑھ رہے تھے کہ مولوی علی بن محمد صاحب نے فضل وکمال کی تابش کو بڑھتے ہوئے محسوس کرکے وطن سے باہر تحصیل علوم کی اجازت دی۔ چنانچہ مولانا مشکور اپنے ماموں مولوی علی کبیر بن مولوی علی محمد کی رائے سے طلبِ علم کے لئے دار العلم دہلی روانہ ہوگئے۔ علامہ رشید الدین خاں دہلوی سے پوری طرح علوم وفنون کی تکمیل کی۔ امام المفسرین سند المحدثین شاہ عبد العزیز دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کے درس میں شریک ہوئے اور مولانا رفیع الدین رحمۃ اللہ علیہ سے خاص طور سے مجسطی کا درس لیا اور سند واجازت علم وفضیلت لے کر وطن واپس آئے۔

یہاں پہونچتے ہی عہدۂ افتا صدر امینی پر آپ کا تقرر ہوا۔ اگرچہ آپ کو اس سے سخت انکار تھا۔ لیکن اعزہ واقربا کے اصرار سے قبول کرلیا۔ اس وقت اسلامی دور ختم ہوچکا تھا۔ انگریزی حکومت کی ابتدا تھی مسلمان کے لئے اس عہدہ سے بڑھ کر کوئی ممتاز کرسی نہ تھی۔ صدر امینی کے سلسلہ میں آپ جہاں رہے۔ طالبان علوم کا ہجوم آپ کے گرد رہتا تھا۔ اور درس وتدریس کی مجلس گرم رہا کرتی تھی۔ ملازمت سے بہت جلد آپ ایک قانونی مسئلہ کے سلسلہ میں اپنی رائے وشریعت کے حکم کی مخالفت سے مستعفی ہوگئے۔ اس کے بعد آپ مچھلی شہر میں تعلیم وتفہیم درس وتدریس میں مشغول رہے۔ کئی بار اپنے اعزہ ومتوسلین کی کثیر جماعت ساتھ لے کر حج بیت اللہ کے لئے تشریف لے گئے اور اسی دوران میں علماء دہلی سے تحصیل وتکمیل مراتبِ علمیہ کے باوجود آپ نے علامہ سلیمان میرداد حنفی امام مسجد الحرام سے صحیح البخاری کی سند لی۔ اور علامہ سید محمد کتبی مفتیٔ مکہ سے روایت فقہ اور اجازتِ فتویٰ حاصل کی۔ علامہ کتبی بلاواسطہ علامہ طحطاوی کے شاگرد ہیں، اور دلائل الخیرات کی روایت واجازت شیخ الدلائل سید محمد بن احمد بن عبد الرحمٰن الشریف الحسنی المغربی المدنی اور علامہ علی حریری سے حاصل کی۔

آپ کی علمی وقلمی یادگاریں یہ چند کتابیں ہیں۔ برہان الرائق شرح کنز الدقائق عربی۔ شرح مقامات ہندیہ۔ حواشی بر مقامات حریریہ۔ طوطی نامہ عربی۔ حل ابیات فرائد ملا محمود جونپوری۔ کفایۃ المبتدی نحو۔ تحقیقات عامضہ بر مقامات مختلفہ میر زاہد وملا جلال عربی۔ حاشیہ بر رسالہ علم عروض مولوی شاہ رفیع الدین دہلوی۔ حاشیہ فصولِ اکبری۔ رسالہ منطق بزبانِ اردو ملخص از عنصر چہارم۔ معنفہ مولوی علی بن محمد جعفری۔ وقائع سفر حجاز فارسی، مکاتیب عربیہ جو مولٰنا اور انکے اساتذہ کے خطوط کا مجموعہ ہے۔ اور عجب العجائب کے مساوی ہے۔

آپ کے سب سے چھوٹے بھائی ابو محمد عبد العزیز المعروف بباب اللہ جعفری بھی علوم و فنون میں یکتا ہوئے۔ آپ نے درسیات کی تحصیل اپنے نانا "مولوی گر" مولوی قاضی علی محمد صاحب اور ماموں مولوی علی کبیر اور بڑے بھائی مولوی محمد شکور علیہم الرحمۃ سے کی۔ اور اُنھیں سے علوم و فنون میں کمال حاصل کیا اور وہ رفعت علمی اور جوہر لائق پیدا کیا کہ صدر الصدوری کے بلند و ممتاز عہدہ پر سرفراز ہوئے۔ آپ کے علمی آثار میں دو رسالے ملتے ہیں۔ ایک علم الحساب ہے، دوسرا علم فرائض پر۔ طلوع و غروب شمس و قمر کی صد سالہ جنتری بھی آپ نے مرتب فرمائی ہے۔

انھیں اسلاف کرام کے ماحول اور دودمانِ ثنائی جعفری میں ۱۲۵۲ھ میں وہ شخصیت پیدا ہوئی جس کو ایک وقت میں الوسی زادہ مفتیٔ بغداد "القاضی الفاضل والمنسی بفصاحتہ ذکر سحبان وائل" کے عنوان سے یاد کرتے ہیں۔ آپ کا نام محمد ہے اور شیخ محمد کے نام سے پکارے جاتے تھے۔ اپنی تحریروں میں آپ اپنا نام المعتصم بحبل اللہ الصمد محمد بن عبد العزیز جعفری المدعو شیخ محمد تحریر کرتے ہیں۔ اور سندوں پر جو مہر ثبت کرتے تھے اس کا نقش شیخ محمد بن عبد العزیز الہاشمی الجعفری والفاطمی الزینبی ہے۔ ابتدائی تعلیم کے لئے میاں جی فصیح الدین غوری ساکن مچھلی شہر مقرر ہوئے۔ پھر علوم درسیہ کی تکمیل اپنے چچا مولوی محمد شکور مذکور الصدر علیہ الرحمۃ سے کی۔ مشکوٰۃ المصابیح کا درس اپنے والد ماجد سے لیا۔

۱۸۵۳ء میں افتا و وکالت کی ڈگری فورٹ ولیم کالج کلکتہ سے حاصل کی اور پھر ۱۸۵۶ء میں بورڈ آف سول جسٹس کا امتحان کامیاب کیا۔ ابتدا نائب تحصیلدار ہوئے۔ لیکن اس سے بہت جلد مستعفی ہو گئے اس کے بعد سر جیمس رابرٹ ریڈ لیسز ممبر بورڈ کے ہمراہ جن کو آپ نے عربی اور اردو اور عبرانی زبانیں سکھائی تھیں۔ بندوبست ضلع اعظم گڑھ کے سلسلہ میں تاریخی امداد اور معاونت کے لئے رہتے تھے اور انھوں نے اعظم گڈھ کی جو تاریخ مرتب کی اس کی تدوین و تحقیق میں بڑا ہاتھ جد نا المحترم مولانا شیخ محمد ہی کا رہا۔ اس زمانہ میں کہ آپ کا قیام بریلی میں تھا والی بھوپال نواب والاجاہ سید صدیق حسن خاں نے مولوی عبد الرشید صاحب کو مچھلی شہر روانہ فرمایا اس لئے کہ مولوی صاحب ہی کے زبانی نواب صاحب مولٰنا الشیخ کے علمی تبحر اور اتباعِ سنت سے شغف اور علوم حدیث میں کامل دستگاہ کی تعریف سن چکے تھے۔ تاکہ بھوپال لائیں۔ لیکن مچھلی شہر میں قیام نہ ہونے کے باعث مولوی عبد الرشید صاحب سے ملاقات نہ ہوسکی۔ مگر اطلاع پاکر آپ بھوپال پہنچے اور ۱۲۹۷ھ میں قائم مقام قاضی مقرر ہوئے۔ اور ایک سال کے بعد مستقل قاضی القضاۃ ریاست بھوپال ہو گئے۔

آپ نے اپنی خاندانی تعلیم سے متبحر ہونے کے باوجود علماء ہند سے علم حدیث کا درس لیا، اور اس اشرف علوم میں اسلاف کے صحیح نمونہ ہوئے۔ اتباعِ سنت کے آپ شیدا تھے۔ اور ہر فعل و عمل کو اسی اسوۂ حسنہ کے تحت رکھنے پر سعی بلیغ فرماتے تھے۔ وذالک فضل اللہ یوتیہ من یشاء۔ حج بیت اللہ سے متعدد بار جس کی صحیح تعداد کا علم نہیں مشرف ہوئے۔ اور اسی دوران میں علامہ شیخ محمد عطاری اور مسند الوقت علامہ عبد الحق محمدی بنارسی مدفون مسجد خیف مکہ سے مکہ معظمہ میں اور نخبۃ اسلاف شاہ عبد الغنی صاحب سے مدینہ منورہ میں علوم حدیث کا درس لیا اور ان کی سندیں اور روایات کی اجازت حاصل، علامہ عبد الحق بنارسی نے اتحاف الاکابر للشوکانی کی سند دی اور یہ سند و اجازت اپنے ہاتھ کے لکھے ہوئے اس نسخہ پر دی جس پر اُنھیں خود علامہ شوکانی نے اجازت دی تھی۔ اور یہ متبرک نسخہ آپ کے کتب خانہ میں خاکسار کے پاس محفوظ ہے۔ اس سند کے لحاظ سے مولٰنا الشیخ ایک واسطہ سے علامہ شوکانی سے روایت کرتے ہیں۔

آپ نے علم حدیث مولوی میر محبوب علی جعفری دہلوی۔ مولوی شیخ محمد تھانہ بھون، مولوی مخصوص اللہ دہلوی جیسے جلیل القدر ہندی علماء سے بھی حاصل فرمایا اور ان سے روایت کرتے ہیں۔

درس و تدریس کی مجلس آپ کے یہاں بھی گرم رہتی تھی خصوصاً "بلوغ المرام" کا درس زیادہ ہوتا تھا۔ اور اس کے لئے اقطارِ عالم سے علماء و طلباء آپ کی خدمت میں حاضر ہوا کرتے تھے۔ چنانچہ ریاض سے اسحٰق بن عبد الرحمٰن بن حسن بن الشیخ محمد النجدی سنہ ۱۳۱۲ھ میں اور سید عبد اللہ بن سعد بن محمود النجدی بلدہ نہر مار سے سنہ ۱۳۱۱ھ میں درس حدیث کے لئے مچھلی شہر وارد ہوئے۔ اسی طرح سے آپ کی اس فہرست میں جس میں آپ کی مرویات کے اجازت یافتہ اسماء ہیں اس میں سعد بن احمد بن عتیق النجدی اور محمد بن ناصر بن مبارک النجدی کے نام آتے ہیں جن کو مسلسل بالاولیۃ کی اجازت سنہ ۱۳۲۳ھ میں دی ہے۔ لیکن یہ معلوم نہ ہوسکا کہ ان دونو

ب نے کہاں سے سند لی۔ یہ خود ہندوستان آئے یا جدی مرحوم سے کہیں بلاد اسلامیہ میں سند حاصل کی۔

آپ کے سوانح حیات پر بسیط روشنی کا دوسرا موقع ہے۔ اس مختصر صحبت سے قصبہ مچھلی شہر کی علمی حیثیت پر ایک روشنی ڈالنی مقصود ہے۔

آپ کی علمی اور فکری یادگاروں میں کثیر التعداد و بلند پایہ چیزیں ہیں۔ اور ہوتیں اگر عمر نے اور وفا کیا ہوتا۔ مثلاً نعم البالغہ، شرح حجۃ اللہ البالغہ۔ طبقات المحدثین۔ وسائل الحسنات، یہ کتابیں بالکل نامکمل رہ گئیں۔ مکمل تالیفات میں کتاب الاحکام۔ کتاب الصلوٰۃ والسلام علی سید الانام۔ رفع الیدین فی الصلوٰۃ۔ وضع الایدی علی الصدور، الروایات المصحفہ فی اثبات رفع المسبحہ، تعلیقات علی مقامات لعلامہ جزری، خاندانِ جعفری کے سلسلہ میں کئی رسائل اور جامع تذکرہ آپ کی تالیفات میں ہیں۔

بسیط و جامع تذکرہ عجالۃ العبقریہ فی سلالۃ الجعفریہ عربی زبان میں ہے۔ یہ حدیث و رجال کے لحاظ سے بھی ایک چیز ہے۔ اسی کے مختصرات میں سے الازہر المطالب فی نسب آل جعفر بن ابی طالب، اور سلالۃ الکرام و علالۃ الائمۃ العظام فارسی زبان میں ہیں۔

عربی و فارسی ادبیات میں آپ کے منظوم عربی و فارسی خطوط ایک خاص چیز ہیں۔ جس سے آپ کے نظم و شاعری کے طبعی میلان پر پوری روشنی پڑتی ہے۔ عربی خطوط زیادہ تر زبدۃ المحدثین شیخ یعقوب صاحب محدث دہلوی مہاجر مکی کے نام کے ہیں۔ اور فارسی منظوم مکتوب مولوی علی کبیر عرف میر سجان الہ آبادی کے نام ہیں۔ مولوی میر سجان کے منظوم جوابی خطوط بھی محفوظ ہیں۔

جدنا المحترم اعلی اللہ مقامہٗ سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت رؤیا سے سرفراز ہوئے ہیں تو ایک مثنوی موسوم بہ رشف الرضاب ملقب بہ نعم الوصول ۲۶۰ اشعار کی اس کیفیت سے متاثر ہو کر نظم فرمائی ہے۔ جس کے کچھ اشعار پیش کئے جاتے ہیں۔

بنامِ پاک آں یکتا یگانہ کہ یکساں نیست بر وے ہر زمانہ
نہ از ماضی بر و حالے ہویدا نہ مستقبل نہ او را خوف پیدا
تعالی اللہ عجب پاک است ذاتش کہ بے مثل است ذات و ہم صفاتش
نہ گردش وہم را باشد گزرگاہ زخاشاکِ خیالِ آں پاک درگاہ

بمدحش جملہ عالم گر سرایند سر موئے ز حقش بر نہ آیند

پھر چند شعروں کے بعد کا شعر ہے۔

شبے در خواب دیدم مصطفےٰ را رسول اللہ ختمِ انبیا را
صلوٰۃ و ہم سلام و با د پیہم بروحِ پاک وے بر آل وے ہم
چناں بینم کہ شہرے ہست آباد سراپا کہنہ و فرخندہ بنیاد
در و دیوار آں جملہ ز سنگ است نطاقِ نطق در وصفش بہ تنگ است
دراں معمورہ بود آں مہرِ تاباں نشستہ بر یکے در نور افشاں
رسول اللہ را آنجا چو دیدم بجائے پاک از دیدہ دویدم
رسیدم ذرہ آسا پیشِ خورشید رہا از بند و بیروں از ہمہ قید
نہادہ بود نزدیکش بخاری اصح از ہر کتب جز صحفِ باری

پھر تفصیلات اور طلبِ دعا کی خواہش و التجا کے بعد کے شعر ہیں۔

قبول از پیشگاہش عرضِ من شد قدر افزا بہائے عرضِ من شد
نہادہ بر لبم ہر دو لبِ خویش لعابش شد دوائے این دلِ ریش
لعابِ پاک آں دہنِ معطر ز شہد و انگبیں شیریں و خوشتر
نصیبم گشت چوں از پردۂ غیب چنیں بے عیب نعمت بیشک و ریب
ز شہدِ پاک آں چنداں مکیدم کہ افزوں در شکم زاں جا ندیدم
شدم بیدار پر بود ایا غم معطر بود از خوشبو دماغم

پھر کئی شعروں کے بعد تاریخ کا شعر ہے اور اس مثنوی کے بابتہ خیال کا اظہار ہے۔

اگر تاریخ ہم خواہی عجیب است بجو با فکر آں زاں زیں غریب است
(۱۲۷۹ھ)

ز شعر و شاعری من دور بودم لبِ خود بر رخش ہرگز نسودم
کمر در خدمتِ این فن نہ بستم نشد انجام کارے آں ز دستم
نہ شعر و نظم پیشہ از پئے من نہ شیرم ہم نہ بیشہ از پئے من
مگر از سوز دایں چند اشعار بروں از سینہ کردم با دلِ زار

پھر کئی اشعار کے بعد صلوٰۃ و سلام کو پیش کرتے ہوئے آخر میں فرماتے ہیں۔

رسد از جعفری ایں تحفہ دائم کہ تا بنیاد یادش ہست قائم
نگارش کرد تا اینجا چو قلم زبانش بند شد واللہ اعلم

(رجاء حقوق بحقِ مکتبہ سعدی محفوظ ہیں)

✻

ہم سوشلسٹ ہیں

ہم لوگ سوشیلسٹ ہیں —— ذاتی ملکیت کے دشمن —— سرمایہ داری ایک دوسرے میں نفاق پیدا کرتی ہے۔ بغض و عناد کے بیج بوتی ہے، اور کبھی نہ طے ہونے والی تنازع المفواد کا باعث بنتی ہے۔ سب کو ظاہر داری، ریاکاری اور معصیت کی تعلیم دیتی ہے۔

ہم لوگوں کا خیال ہے کہ وہ سوسائٹی جو انسان، کو حصولِ دولت و زر کا آلۂ کار سمجھتی ہے جذبۂ انسانی سے معرّا ہے —— اس کے رگ و پے میں حیوانیت کا خون دوڑ رہا ہے —— ایسی جماعت کے خدوخال مکروہ ہوتے ہیں۔ ہم کبھی کبھی اُس کے پست اخلاق، اُس کی ظالمانہ پالیسی اور اُس کے انسانی جذبۂ تنفر سے متفق نہیں ہو سکتے —— ہر متنفس کیساتھ اس کا ظالمانہ رویہ ہم لوگوں کے لئے لائقِ تعزیر ہے۔

ہم لوگ جنگ کرنا چاہتے ہیں اور کرتے ہی رہیں گے —— ہم لوگ ہر اُس فرد سے لڑیں گے جو اپنے مفاد کے خاطر ہماری اخلاقی اور جسمانی غلامی کی تشکیل کا باعث بنا ہے۔

ہم لوگ مزدور ہیں، وہ مزدور جن کی اَنتھک محنتوں اور عرق ریز جانفشانیوں نے ہر چیز کو بنایا —— عظیم الشان آلات سے لیکر بچوں کے کھلونے تک —— پھر بھی اپنے وقار آدمیت کی خاطر ہم سے حقوق طلبی کی جنگ کا حق سلب کر لیا گیا ہے۔ ہر شخص ہم کو آلۂ کار بنانے کی فکر میں لگا رہتا ہے۔ وہ ہم کو استعمال کر سکتا ہے —— حصولِ مدعا کیلئے۔

اب ہم لوگ آزادی کے خواہاں ہیں —— اتنا جتنا زمانہ فتحیابی کا موقع دے —— ہم لوگوں کا نعرہ "جمہوری طاقت زندہ باد" ہے —— ہم لوگوں سے جو کاشت کرانے اور اہم کام انجام دینے کا کام لیا جاتا ہے، اُسے ہم لوگ ذاتی ملکیت کے ساتھ دفن کر دیں گے۔ تم نے دیکھ لیا نا کہ ہم لوگوں کا کام بغاوت کرنا نہیں ہے!! --------

---

ہم لوگ انقلابی ہیں، اور اُس وقت تک رہیں گے جب تک کہ ذاتی ملکیت کا وجود باقی ہے۔

ہم لوگ اُس جماعت کے خلاف غلغلہ بلند کر رہے ہیں جو ہمارے مفاد کی سخت دشمن ہے۔ ہم سے اور اُن سے میل ملاپ اُس وقت تک ناممکنات میں سے ہے۔ جب تک کہ فتح کا سہرا ہمارے سر نہ بندھے —— فتح و نصرت ہماری ہے، غریبوں اور مزدوروں کی —— تمہاری جماعت جس قدر اپنے کو ذی اقتدار سمجھے بیٹھی ہے فی الحقیقت نہیں ہے۔ تم کو جائداد کے تحفظ کے لئے سعیٔ پیہم کی ضرورت ہے —— وہی جائداد جس کی نگہداشت کے لئے کروڑوں انسان موت کے گھاٹ اُتار جاتے ہیں —— (اگر یقین رکھئے) کہ جس خون کے جمود نے کل ہم کو مغلوب و مفلوج بنایا تھا آج اُس میں حرکت پیدا ہو گئی ہے —— ہم سارے بند توڑ کر اپنے کو صفِ اول میں لانا چاہتے ہیں۔

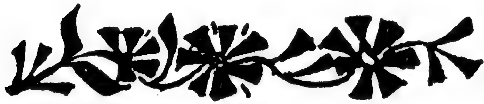
درحقیقت ہمارے حاکم ہم سے زیادہ محکوم ہیں۔ ان کے ضمیر تک کو غلام بنالیا گیا ہے ——— فرق یہ ہے کہ اُن لوگوں کو رُوحی طور پر اور ہم لوگوں کو جسمانی طور پر غلام بنایا گیا ہے ——— وہ لوگ قلبی طور پر اس تعصب اور کشیدگی سے عہدہ برآ نہیں ہوسکتے ——— اور یہی وہ وزن ہے جو اُن کی روح کو کچلے ڈالتا ہے ——— ہماری روحانی آزادی میں کوئی شے حائل نہیں ہوسکتی (اس انقلاب میں) تمہارے ان غیر دانشمندانہ رویوں سے جنھوں نے ہمارے ضمیروں پر حکمرانیاں کی ہیں زیادہ محرک وہ چیزیں ہیں جو زہر کے گھونٹوں کی طرح ہمیں پینا پڑی ہیں۔ یہ زہر مزدوروں کے دلوں کو جلاتا جھلساتا ہوا اچھلا گیا ہے ——— جب شعلے بھڑک اُٹھتے ہیں تو وہ اپنے ارد گرد کے فضاؤں کو بھی گرم کردیتے ہیں اور خنک ہواؤں کو اپنے میں جذب کرلیتے ہیں ——— پس تمہاری روحانی طاقتیں صحیح و توانا اجسام بھی اُس میں جذب ہوگئے۔

کیا تم نے ابھی یہ نہیں سمجھا کہ ہماری طاقت سے تمہاری جنگ ایک خیالی ہے ——— تم نے دلائل کی ساری عمارتیں انصاف کا گلہ گھونٹنے کے لئے کھڑی کی ہیں ——— تم کسی نئے خیال کے موجد نہیں ہو۔ — تمہاری روحیں یکسر ویران ہیں۔

ہم لوگوں کے خیالات شاداب ہیں ——— وہ ہمیشہ آنکھوں کو خیرہ کردینے والے روپ میں جلوہ گر ہوتے ہیں۔

ہم لوگ عوام کو منظم کرکے آزادی کے جنگ کے لئے تیار کررہے ہیں۔ ہماری اسکیم تمام دنیا کے مزدوروں کو ایک پرچم کے نیچے کھڑا کردیگی۔

تمہارے پاس کوئی ایسی صورت نہیں ہے جس کے ذریعے سے اس تجدید زندگی میں کسی طرح کی رُکاوٹ پیدا کرسکو ——— بے رحمی اور نفرت وحقارت کرنے کے سوا ——— لیکن تمہاری مذموم حرکات ہم لوگوں پر صاف عیاں ہیں ——— تمہارا ظلم واستبداد ہم لوگوں کو بھڑکانے کے لئے کافی ہے۔ (یہ یاد رکھو کہ) کہ تمہارے وہ ہاتھ جو ہمارا گلہ گھونٹنے کے لئے بڑھتے ہیں کل آشتی و محبت کی درخواست کے لئے بڑھیں گے، ——— تمہارے بیہودہ حرکات اور سونے اوگلنے والے کارخانے ہماری تمہاری کشیدگی کو اور زیادہ بڑھائے جارہے ہیں ——— ایسے گروہ پر جو دوسرے کو نگل جانے کو دہانہ پھاڑے تیار ہے لعنت ہے۔ لعنت ہزار بار لعنت ——— کرور مرتبہ لعنت۔



یہ بات ہے پیشتر اس سے کہ سمجھ سکیں ہم؟
جینے کے لئے بنا ہے مرتا کیوں ہے؟
سر زمین کے ساتھ کھیل اے طفل حیات
سر زمین جو وار کھیل ہے اڑتا کیوں ہے؟
جوش

گھٹ کر کوئی نہ کوئی بڑھ کر نکلا
ہستی میں نہ یوں نہ شان سے بہتر نکلا
دنیائے غم و خوشی کو تولا جس وقت
میزان میں پلہ ہر دو برابر نکلا
جوش

فدائے قوم

ظفر واسطی شاہ آبادی

بیمار عابد کی چارپائی کے ایک طرف غمگین زاہد بیٹھا تھا۔ اور دوسری طرف اداس امینہ۔ دونوں میاں بیوی نے دو دن سے کچھ نہیں کھایا تھا، عابد ان کا اکلوتا لڑکا تھا اور وہ اُسے جان سے زیادہ عزیز رکھتے تھے۔ اس سے پہلے اُن پر بہت سی مصیبتیں آچکی تھیں مگر وہ صبر اور شکر سے برداشت کرتے رہے تھے۔ زاہد کے والدین چل بسے تو اُن دونوں نے صبر کر لیا۔ پھر امینہ کا بھائی داغِ مفارقت دے گیا تو بھی بیچاروں نے صبر سے کام لیا۔ حالانکہ زاہد کو اپنے سالے سے جو اُس کا ماموں زاد بھائی بھی تھا بہت زیادہ محبت تھی۔ ویسے بھی ماموں اور ممانی کی ایک وہی نشانی تھی اور امینہ کا تو تھا ہی حقیقی بھائی۔ پھر زاہد ملازمت سے برطرف کر دیا گیا تو بھی میاں بیوی چپ ہو رہے۔ لیکن اب عابد کی بیماری پر دونوں تڑپ اُٹھے۔ یوں بیمار ہونے کو عابد کئی دفعہ بیمار ہو چکا تھا۔ لیکن اس مرتبہ آثار اچھے نہ تھے، دو دن سے دونوں اُس کی چارپائی کے گرد بیٹھے تھے خاموش اور دلحزیں۔ کبھی کبھی جب نگاہیں ملتی تھیں تو دونوں کی آنکھوں میں آنسو بھر آتے تھے۔ اور دونوں نظریں نیچی کر لیتے تھے۔ ڈاکٹر کو تین بار بلا چکے تھے۔ وہ اپنی فیس لے کر چلتا بنا۔ کمبخت سے اتنا نہ ہو سکا کہ دل شکستہ والدین کی کچھ تسلی کر دیتا۔ ہر دفعہ اس نے دوا بدلی۔ لیکن کچھ فائدہ نہ ہوا۔ عابد اُسی طرح آنکھیں بند کئے لیٹا رہا۔ آنکھیں بند کئے لیٹا رہا— بیہوش اور بیخبر۔

امینہ بے اختیار ہو کر اُس پر جھک پڑی۔ اس کی پیشانی کو، دیکھتے ہوئے انگاروں کی طرح گرم پیشانی کو چوما، اور پھر زاہد کی طرف حسرت بھری نگاہوں سے دیکھنے لگی۔ زاہد پہلے ہی اُس کی جانب دیکھ رہا تھا۔

"کسی اور ڈاکٹر ہی کو بلا لاؤ۔ اس کی دوا تین دن سے دے رہے ہیں۔ کچھ فرق تو ہوا نہیں"۔

"کوئی اور ڈاکٹر ہی آ کر کیا کرے گا۔ خدا کی مرضی"۔ دل گرفتہ زاہد نے بغیر سوچے سمجھے یہ جملہ کہدیا۔

امینہ نے زاہد کی طرف ایسی رحم طلب نگاہوں سے دیکھا جیسا کہ پرندہ گولی کھانے کے بعد شکاری کی طرف دیکھتا ہے۔ اور ساتھ ہی اُس کی آنکھوں سے آنسو گرنے لگے۔ گو خود وہ بھی عابد کی حالت سے بے خبر نہ تھی۔ لیکن شوہر کی زبان سے یہ الفاظ سنکر اُس کے ہاتھ سے ضبط کا دامن چھوٹ گیا۔ وہ رونے لگی اور روتی رہی۔ حتیٰ کہ ہچکی بندھ گئی۔ زاہد نے نہ اُسے سمجھانے کی کوشش کی نہ خاموش کرنے کی۔ وہ خود بھی رونے لگا۔ دو دن سے اُس کا جی بھر بھر آتا تھا۔ مگر امینہ کی وجہ سے ضبط کر لیتا تھا۔ اُس کا خیال تھا یہ عورت ہے۔ مجھے روتا دیکھکر اور زیادہ پریشان ہو جائے گی۔ لیکن جب امینہ ہی رونے لگی تو وہ بھی ضبط نہ کر سکا۔

میاں بیوی خوب رو چکے تو زاہد نے عابد کی نبض پر ہاتھ رکھا۔ اور بولا "تو کسی اور ڈاکٹر کو بلا کر لاؤں"؟

امینہ نے کچھ جواب نہ دیا۔ اُسے یاد آگیا تھا کہ صرف چار روپے باقی بچے ہیں۔ اُس کی آنکھوں میں ایک بار پھر آنسو بھر آئے۔ مگر اس دفعہ وہ اُنھیں پی گئی—— ہاں اُن آنسوؤں کو پی گئی جو عسرت اور افلاس کی شکایت سے آنکھوں میں بھر آئے تھے۔ اُس کی نظروں کے سامنے وہ

وقت پھر گیا جب زاہد سے دو ہزار روپے کا بیگ کھو گیا تھا اور پولیس لاہور میں اُن کے مکان کی تلاشی لینے آئی تھی۔ گو گھر سے کوئی مشتبہ چیز نہ نکلی تھی۔ پھر بھی اُس پر مقدمہ چلا یا گیا۔ وہ تین دن قید میں رہا۔ غریب اکیلی تھی کیا کرتی۔ آخر جا کر ہمسایہ کی منت سماجت کی تو وہ زاہد کو ضمانت پر رہا کرا کے لایا۔ جو کچھ روپیہ اور زیور پاس تھا وہ سب مقدمے میں خرچ ہو گیا۔ زاہد قید سے تو بچ گیا۔ مگر محکمے نے اُسے برخاست کر دیا۔ وطن میں کوئی ایسا قریبی رشتہ دار نہ تھا جو ایسے آڑے وقت میں اُنکی مدد کرتا۔ اور وہ تھے بھی خوددار، اُنھوں نے معمولی رشتہ داروں سے مدد مانگنی مناسب بھی نہ سمجھی۔ مقدمہ کا فیصلہ ہونے کے ایک مہینے بعد تک وہ اور لاہور میں ٹھیرے۔ اپیل نامنظور کر دی گئی۔ تعصب کی ہوا ایسی چل رہی تھی کہ حق و ناحق میں کوئی تمیز نہ کرتا تھا جس کا بس چلتا تھا۔ دوسرے کے گلے پر تعصب کی چھری پھیر دیتا تھا۔ ہر جگہ ملازمت کی تلاش کی مگر کہیں نہ ملی۔ آخر تنگ آ کر ارادہ کیا کہ وطن چلیں۔ وہاں کم از کم مکان کے کرائے سے تو بچ جائیں۔ اور جو کچھ بیگھے زمین ہے اُسے بیچ کر زاہد کوئی کاروبار شروع کر دے گا۔ ویسے بھی گھر آنا تھا ضروری۔ کیونکہ جو رشتہ دار اُن کے گھر کی دیکھ بھال اور زمین کا انتظام کیا کرتا تھا وہ بھی چل بسا تھا۔ اپنے شہر میں اُنھوں نے کسی کو اپنی مصیبت کی کہانی نہیں سنائی۔ جس نے پوچھا کہہ دیا کہ چھٹی لے کر آئے ہیں۔

عابد کو ریل ہی میں بخار چڑھ گیا تھا۔ گھر پہنچتے پہنچتے اُس کی حالت اور بہت زیادہ خراب ہو گئی۔ بیچارے میاں بیوی کو یہ اور مصیبت آئی۔ جو کچھ روپے سفر کے اخراجات سے بچے تھے وہ ڈاکٹر کی فیس اور دوا میں خرچ ہونے لگے۔

یہ سب باتیں امینہ کو بڑی تیزی سے یاد آئیں۔ زاہد کو اس بات کا احساس تک نہ ہو سکا کہ امینہ کے دل اور دماغ میں اس وقت کیا خیالات آ رہے ہیں۔ اُس نے دوبارہ دریافت کیا۔

"تو کسی اور ڈاکٹر کو بلا کر لاؤں"۔

"اگر ہو سکے تو عابد ہی کو لے جاؤ"۔

"عابد ہی کو لے جاؤں۔ تمھیں اس کی حالت دکھائی نہیں دیتی"۔

"دکھائی کیوں نہیں دیتی۔ لیکن ڈاکٹر کی فیس اور خدا نہ کرے"۔

امینہ کا جی پھر بھر آیا۔ اور زاہد کا بھی۔ دونوں کی آنکھوں سے ایک بار پھر آنسو بہہ نکلے۔ وہ ماں باپ ہو کر کیا سوچ رہے تھے۔ لیکن تنگدستی میں کرتے بھی کیا۔

زاہد نے عابد کو گود میں اُٹھایا اور گلے سے لگا لیا۔ امینہ نے چادر کی تہ کر کے اُس پر اُڑھا دی۔ زاہد ہیم صدمات کی وجہ سے بہت کمزور ہو گیا تھا۔ جب اُس نے لڑکے کو اُٹھایا تو اُس کے قدم ڈگمگائے۔ عابد کم و بیش دس گیارہ برس کا تھا اور ماشاء اللہ تھا بھی موٹا تازہ۔ گو اُس وقت بیماری سے بالکل نڈھال ہو رہا تھا۔ لیکن اُس سے پہلے اس کے ماں باپ نے اُسے ایک دن بھی نہ بتایا کہ اُن پر کیا بیت رہی ہے۔ اُس کے روزانہ کے جتنے پیسے بندھے تھے برابر اُسے ملتے رہے اور خود اُنھوں نے خواہ کچھ کھایا اور خواہ کچھ پہنا۔ لیکن اُس کی خوراک اور پوشش میں فرق نہ آنے دیا۔

"اگر نہیں لے جا سکتے تو لٹا دو اور ڈاکٹر ہی کو بلا لاؤ"۔ امینہ بولی۔

زاہد نے کچھ جواب نہ دیا اور باہر چلا گیا۔ اسپتال پہونچ کر معلوم ہوا کہ ڈاکٹر صاحب ابھی اوپر کی منزل میں آرام فرما رہے ہیں۔ زاہد نے کہلا کر بھیجا کہ میرا بچہ سخت بیمار ہے۔ خدا کے واسطے ذرا سی دیر کی خاطر آ کر دیکھ لیجئے۔ لیکن ڈاکٹر صاحب ایسی باتیں سنتے سنتے بہرے ہو گئے تھے، اُنھوں نے اُس کی درخواست پر ذرا بھی توجہ نہیں کی اور جواب دے دیا کہ ہم چار بجے آئیں گے۔ زاہد نے سامنے کا ٹائم پیس دیکھا۔ سوا تین بجنے میں ایک منٹ باقی تھا۔ بیچارے نے لڑکے کو بینچ پر لٹا دیا۔ اور خود ایک اسٹول اُس کے قریب کھینچ کر بیٹھ گیا۔ ڈاکٹر صاحب ٹھیک چار بجے نازل ہوئے، زاہد نے کھڑے ہو کر سلام کیا، اور پھر درخواست کی کہ میرے لڑکے کو دیکھ لیجئے۔ لیکن ڈاکٹر صاحب نے دو اور آدمیوں کے نسخے پڑھے اُن سے بیماروں کا حال پوچھا اور خوب غور کر کے ایک آدھ دوا کا اضافہ کیا یا کمی کی، پھر اتفاق سے کمپاؤنڈر اُس وقت موجود نہیں تھا، خود ہی اُنھیں دوا بنا کر دی۔ اس میں دس پندرہ منٹ اور لگ گئے۔ زاہد بیٹھا ہوا دل میں غریبی اور امیری کا تفاوت سوچتا رہا۔ باتوں سے ظاہر تھا کہ وہ دونوں آدمی امیروں کے ملازم تھے اور یا تو اُن کے آقا کو کچھ معمولی سی تکلیف تھی یا اُن کے آقا کے کسی بچے کو۔ ڈاکٹر نے اُس طرف سے فراغت حاصل کر کے عابد کو دیکھا۔ اچھی طرح دیکھنے بھی نہ پایا تھا کہ بولا۔

"کب سے بیمار ہے؟"

"آج تیسرا دن ہے"۔

"کسی اور کی دوا دی؟"

"جی ہاں پنجابی ڈاکٹر کی دوا دی تھی۔ لیکن کچھ افاقہ نہیں ہوا۔"

"اب بھی اسے پنجابی ڈاکٹر ہی کے پاس لے جاؤ۔ اب میں اسے کیا دوا دوں۔ جب ختم ہونے کے قریب ہوا تو میرے پاس لے آئے۔" ڈاکٹر نے ناخوشی سے کہا۔ پنجابی ڈاکٹر کا نام سُنتے ہی وہ آگ بگولا ہو جاتا تھا۔

زاہد کو ایسا محسوس ہوا کہ کسی نے دونوں ہاتھوں سے اُس کا دل دبوچ لیا۔ ڈاکٹر کے رویے سے اُسے پہلے ہی رنج ہو رہا تھا۔ یہ فقرہ سُنکر اور زیادہ رنج پہنچا۔ جی میں آیا کہ لڑکے کو اُٹھا کر چلدے لیکن عابد کے چہرے پر نظر پڑتے ہی سارا غصہ فرو ہو گیا۔ اُس نے لجاجت سے کہا۔

"ڈاکٹر صاحب میں بہت غریب آدمی ہوں ——"

"غریب امیر کا سوال نہیں" ڈاکٹر درمیان ہی میں بول اُٹھا۔ "—— یہ لڑکا زیادہ سے زیادہ ایک گھنٹے کا مہمان ہے۔ اب اس پر کوئی دوا کارگر نہ ہوگی —— تم لوگ یہ نہیں دیکھتے کہ وہ پنجابی ڈاکٹر کتنے مریضوں کو موت کے گھاٹ اُتار چکا ہے۔"

زاہد نے ڈاکٹر کے الفاظ کو اس طرح سُنا جیسے کوئی ناکردہ گنہگار جج کی زبان سے پھانسی کا حکم سُنتا ہے۔ نظر اُٹھا کر دیکھا وہ کرسی پر بیٹھ کر اخبار کے مطالعہ میں محو ہو چکا تھا۔ زاہد نے اپنے گرد و پیش حسرت بھری نگاہ ڈالی۔ آنکھوں میں آنسو کھیل رہے تھے۔ لڑکے کو اُٹھا کر گلے سے لگایا اور چل کھڑا ہوا۔ ڈاکٹر نے اخبار پر سے نظر اُٹھائی اور اُس کے ڈگمگاتے ہوئے قدم اور اُس کی آنکھوں کو جھکی ہوئی گردن دیکھی تو کچھ رحم آ گیا۔ بولا

"اچھا ایک دوا لے جاؤ۔ آدھ آدھ گھنٹے کے بعد ایک ایک خوراک دے دینا۔"

زاہد نے دوا کی پڑیاں لیں اور جیب میں ڈال لیں۔

تمام راستے اُسے طرح طرح کے خیال آتے رہے۔ ہر خیال پر وہ چونک پڑتا اور دعا مانگتا کہ اے خدا میرا بچہ اچھا کر دے۔

مکان پہنچا تو دیکھا کہ دروازے کے آگے شہر کے چار پانچ معززین اور ایک اور مولانا صاحب کھڑے ہیں۔ اُس نے سلام کیا۔ ان میں سے ایک نے لڑکے کے متعلق پوچھا کہ کیا تکلیف ہے۔ اور دوسرے نے کہا اسے اندر لٹا کر ذرا باہر آنا۔

امینہ اُس کے انتظار میں کھڑی تھی۔ جیسے ہی اُس نے گھر میں قدم رکھا تو بولی۔

"ڈاکٹر نے کیا کہا؟"

زاہد نے لڑکے کو چارپائی پر لٹا دیا اور امینہ کی بات کا کچھ جواب نہ دیا۔ اُس نے پھر پوچھا۔

"ڈاکٹر نے کیا کہا؟"

زاہد خاموش کھڑا رہا۔ خاموش کھڑا رہا۔ اور سوچتا رہا کہ ڈاکٹر نے جو کچھ کہا ہے امینہ سے سچ سچ بتا دے کہ نہیں۔ امینہ پھر بولی۔

"دوا نہیں لائے؟ ڈاکٹر نے کیا کہا؟"

"نہیں وہ کہتا ہے اب اسے دوا کی ضرورت نہیں۔ اب یہ دوا کے بغیر ہی اچھا ہو جائے گا۔"

یہ بات کہہ کر زاہد باہر چلا آیا۔ اُس نے امینہ کی طرف نظر اُٹھا کر نہیں دیکھا کہ اُس پر اس بات کا اثر کیا ہوا۔ اگر وہ دیکھ لیتا تو باہر جانے کے عوض وہ امینہ کو تھام کر چارپائی پر لٹاتا اور پنکھا جھلنے لگتا۔ دہلیز پر سے گزرتے ہوئے اُس نے رومال سے اپنے آنسو خشک کئے۔

اہلِ شہر میں سے ایک نے مولانا کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"یہ مولانا فدائے قوم ہیں۔ ان کی تمام عمر قومی اور ملی خدمتوں میں گزری ہے۔ اُن کے کارناموں سے ہندوستان کا بچہ بچہ واقف ہے۔ اب انھوں نے "انجمن اتفاق" کی داغ بیل ڈالی ہے۔ اسی سلسلے میں ہمارے شہر میں بھی قدم رنجہ فرمایا ہے۔ آپ بھی جو کچھ آپ سے ہو سکے عنایت کر دیجئے۔"

دوسرے صاحب بولے۔

"یہ فہرست ہے آپ جو کچھ عنایت فرمانا چاہیں اس میں لکھدیں اور دیدیں۔"

زاہد نے یہ سب کچھ سنا اور خاموش کھڑا رہا۔ اُس نے فہرست ہاتھ میں ضرور لی۔ لیکن یہ تک نہ دیکھ سکا کہ کس نے کتنا چندہ دیا۔ اُسے محسوس ہوا کہ اُس سے ایسا سوال کیا گیا ہے جسے نہ پورا کئے بن پڑتی ہے

نہ بغیر پورا کئے۔ اُسے معلوم تھا کہ صرف چار روپے باقی بچے ہیں اور گھر میں بیمار لڑکا پڑا ہے۔ اور ایسا بیمار جس کے متعلق ڈاکٹر یہ کہہ چکا ہے کہ ایک گھنٹے کا مہمان ہے۔

وہ یہی سوچ رہا تھا کہ فدائے قوم بولے۔

"میاں کیا سوچ رہے ہو۔ جلدی سے لے آؤ۔ ہمیں ابھی اور بہت جگہ جانا ہے۔ زاہد نے فہرست پر نگاہ ڈالی۔ اُس میں کم سے کم چندہ پانچ روپے لکھا ہوا تھا۔ اُس کی سمجھ میں یہ نہ آسکا کہ جن کے نام لکھے ہوئے ہیں اُنھوں نے واقعی کم از کم پانچ روپے دئے ہیں یا صرف دوسروں کو دھوکہ دینے کے لئے نام لکھدئے ہیں۔

"آپ دوسری جگہ ہو آیئے اور واپسی میں یہاں سے بھی لیتے جایئے"۔ اُسے کوئی اور جواب بن نہ پڑا۔

"واپسی اس طرف سے نہیں ہوگی"۔ اہل شہر میں سے ایک بولا۔

"جو کچھ ہو ابھی دیدیجئے"۔ مولانا نے ارشاد فرمایا

کیا دیدوں زاہد نے دل میں سوچا۔ ان لوگوں کو کسی کی حالت کی خبر نہیں۔ یہ قوم کی خدمت کرتے ہیں یا قوم کا خون چوستے ہیں۔ یہ دیدہ دانستہ اندھے ہوگئے۔ انھیں معلوم ہے کہ ان کی قوم کیسی غریب ہے پھر یہ ہر روز ایک نہ ایک نئی طرح چندہ جمع کرنے کی ایجاد کرتے رہتے ہیں۔ پھر خیال آیا کہ میری ظاہرا حالت اچھی ہے۔ اُنھیں کیا معلوم کہ مجھ پر کیا بیت رہی ہے۔ سب سے اپنی مصیبت کا ذکر کرنا مناسب نہ سمجھا۔ خیال کیا کہ مولانا سے عرض کروں شاید انھیں رحم آجائے۔ لہٰذا اُس نے مولانا کو ایک طرف لے جاکر بہت مختصر الفاظ میں اپنی بپتا سنائی اور درخواست کی کہ مجھے معاف کریں۔ مولانا نے شہر کے معززین سے کہا کہ بھئی یہ کہہ رہے ہیں کہ ان کا روزگار چھوٹ گیا ہے اور یہ عجیب مصیبت میں ہیں۔ لڑکا سخت بیمار ہے اور گھر میں صرف چار روپے باقی بچے ہیں۔

زاہد کو فدائے قوم پر بے انتہا غصہ آیا۔ غصہ میں اُس کی عقل بھی بیکار ہوگئی۔ کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ کیا کرے۔ اُس نے مولانا کو الگ لے جاکر اس لئے اپنی مصیبت کی کہانی سُنائی تھی کہ یہ پردیسی ہیں دو ایک دن رہ کر چلے جائیں گے۔ اور یہ راز کسی تیسرے کو معلوم نہ ہوگا۔ اور مولانا نے سب سے صاف صاف کہدیا اور ظاہر تھا اُن میں سے کسی نے بھی اس کی بات کا اعتبار نہ کیا تھا۔ اس سے زاہد کو اور زیادہ رنج ہوا کہ وہ سب اُسے جھوٹا سمجھ رہے ہیں۔ وہ مکان میں چلا گیا۔ امینہ عابد پر جھکی ہوئی رو رہی تھی۔

"ان چار روپوں میں سے دو روپے لے آؤ"۔

"یہ لوگ کون تھے جو آوازیں دے رہے تھے"۔

"یہ بھیڑیئے ہیں جو غریب انسانوں کا خون چوستے ہیں"۔

"یہاں کیوں آئے ہیں"۔

"ہمارا خون چوسنے"۔

امینہ کی سمجھ میں نہ آیا اُس نے نظر اُٹھا کر زاہد کی طرف دیکھا۔ زاہد نے تشریح کرنے کے لئے کہا۔

"یہ لوگ فدائے قوم کے ہمراہ چندہ لینے آئے ہیں"۔

"چندہ لینے! تم نے انکار نہ کردیا۔ تم نہیں جانتے کہ صرف چار روپے باقی بچے ہیں"۔

"میں نے انکار کردیا تھا مگر وہ کسی کا انکار نہیں سنتے انھیں چندہ چاہیئے اور بس"۔

"ہم چندہ کا ایک پیسہ بھی نہیں دے سکتے"۔

"میاں زاہد" باہر سے آواز آئی۔

امینہ بولی۔

"چیخ چیخ کر خود چلے جائیں گے۔ خاموش بیٹھے رہو"۔

"میاں زاہد" پہلے سے زیادہ بلند آواز آئی۔

"امینہ میں کہہ رہا ہوں کہ روپے لے آؤ ——— خدا ہمارا امتحان لے رہا ہے۔ ہمیں ثابت قدم رہنا چاہیئے"۔ زاہد نے کہا۔

امینہ چپ چاپ اُٹھی۔ الماری میں سے روپے نکالے اور زاہد کو دے دیئے۔ شوہر کی حکم عدولی کرنا، یا اُس کی مرضی کے خلاف کچھ کہنا اس کے آئینِ شوہر پرستی سے باہر تھا۔ زاہد روپے لے کر جانے لگا۔ پھر اُسے اُن لوگوں کے سامنے جاتے شرم آئی جو اُسے جھوٹا سمجھ چکے تھے اور روپے دینا خود کو اور زیادہ جھوٹا ثابت کرنے کے مرادف تھا۔ لہٰذا اُس نے امینہ سے کہا کہ تم یہ روپے دے آؤ۔ امینہ دہلیز کی دیوار کے قریب جاکر دروازے کے پاس پہنچی۔ ایک کواڑہ بند کیا، پھر دوسرا اور پھر کواڑوں میں سے ہاتھ نکال کر روپے پھینک دئے۔ مولانا بولے

"شکریہ! خدا تمہاری مشکلیں آسان کرے۔"

امینہ واپس آکر عابد کے پاس بیٹھ گئی۔

دونوں میاں بیوی خاموش بیٹھے عابد کی حالت دیکھتے رہے معصوم عابد پر جانکنی کی سختی دیکھ کر اُن کا کلیجہ منہ کو آنے لگا۔ اور آنکھوں سے آنسوؤں کی بارش ہونے لگی۔ اُنھوں نے سُنا تھا اور پڑھا بھی تھا کہ گنہگار انسان کی جان بڑی مشکل سے نکلتی ہے۔ لیکن عابد تو معصوم تھا ——— معصوم اور عبادت گزار۔ اس ننھی سی عمر میں اُس نے کبھی نماز قضا نہ ہونے دی تھی صبح کو اپنے باپ سے پہلے اُٹھتا اور جماعت کے ساتھ نماز پڑھتا ایسے ہی پانچوں وقت باپ سے پہلے مسجد میں پہنچ جاتا تھا۔ مجبور اور مصیبت زدہ والدین سے جب اُس کی حالت نہ دیکھی گئی تو اور زیادہ بیقرار ہو کر رونے لگے اور دعا مانگنے لگے کہ اے خدا تیری امانت ہے تو لے لے۔ مگر اس غریب کی مشکل آسان کر دے۔

آدھ گھنٹہ گزر گیا مگر عابد کی حالت میں فرق نہ آیا۔ غریب امینہ اُس پر جھکتی ہوئی بولی "میرے لعل ——— میں نے تجھے اس دن کے لئے پالا پوسا تھا۔" پھر زاہد کو مخاطب کرکے کہنے لگی۔

"پنجابی ڈاکٹر ہی کو بلا کر لاؤ" ہسپتال والے کی پڑیوں سے تو کچھ فائدہ نہ ہوا۔ اور تکلیف بڑھ گئی۔"

زاہد بغیر کچھ جواب دیئے چلا گیا اور کچھ دیر میں ڈاکٹر کو لے آیا۔

ڈاکٹر صاحب نے عابد کو دیکھا۔ انجکشن کیا اور فیس لے کر چلتا بنا، انجکشن سے عابد نے ذرا سی دیر کے لئے سنبھالا لیا۔ مایوس والدین کو اُمید کی کچھ جھلک دکھائی دی۔ لیکن فوراً ہی اُس کی حالت بگڑ گئی، آہ آخر اُسے آخری ہچکی آئی اور اُس کی رُوح قفسِ عنصری سے پرواز کر گئی۔

میاں بیوی اتنا رو چکے تھے کہ اُن کی آنکھیں خشک ہو گئی تھیں، عابد کی موت پر اُن کی آنکھوں سے ایک آنسو بھی نہیں نکلا۔ چادر سے اُس کا مُنہ ڈھانپ دیا، اور دونوں چپ چاپ بیٹھے سوچتے رہے، بیٹے کی موت کا رنج کچھ کم نہیں ہوتا، اور اُس پر یہ مصیبت کہ تجہیز و تکفین کے لئے والدین کے پاس کچھ بھی نہ ہو۔ کون دل ہے جو ان پے بہ پے آفتوں کو برداشت کر سکے۔ اُنھوں نے اُس کی موت کی اطلاع کہیں نہیں بھیجی۔ غریبوں نے سوچا کہ پہلے روپوں کا بندوبست کر لیں پھر اطلاع دیں گے، بہت سے رشتہ داروں کو تو عابد کی بیماری کی خبر بھی نہ تھی۔ چند عورتیں جو امینہ سے ملنے آئی تھیں اُنھیں معلوم تھا کہ عابد بیمار ہے۔ لیکن وہ بھی اُس کی بیماری کو اس قدر خطرناک نہ سمجھی تھیں کہ جس سے جان پر بن جائے۔

امینہ کے پاس زیور کوئی نہ تھا کہ زاہد اُس پر روپے لے آتا برتن تھے اور کپڑے تھے۔ لیکن برتنوں کو اپنے شہر میں بیچنے لے جانا یہ وہ کسی صورت گوارا نہ کر سکتا تھا۔ اس کام پر وہ موت کو ترجیح دیتا تھا۔ گو کچھ دیر میں رات ہونے والی تھی اور رات کی تاریکی میں اُسے کوئی برتن بیچتا نہ دیکھتا یا اگر دیکھتا بھی تو توجہ نہ کرتا۔ مگر مشکل یہ تھی کہ بیچے کس کے ہاتھ۔ اگر کسی جاننے والے کے پاس لے جائے تو یہ اُس کے بس کا کام نہ تھا۔ اُس کے نزدیک اس ذلیل زندگی سے بہتر موت تھی۔ اور اگر کسی اجنبی کے پاس لے جائے تو وہ کیوں لینے لگا۔ اُسے شبہ ہوگا کہ چوری کا مال تو نہیں۔ وہ کچھ تحقیق کرنے کی کوشش کرے گا تو پھر وہی پہلی سی مصیبت۔ وہ بیٹھا سوچتا رہا۔ سوچتا رہا اور بیٹھا رہا۔ حتیٰ کہ رات ہو گئی۔ آخر غریب کی سمجھ میں یہ آیا۔ کہ ایک رشتہ دار سے جا کر سوال کرے۔ لہٰذا ان کے یہاں گیا وہاں جا کر دیکھا اُن کے بیٹھک کے آگے دس بارہ آدمی مع فدائے قوم کھانا کھا رہے ہیں اور وہ رشتہ دار اور اُن کے لڑکے خاطر و مدارات میں لگے ہوئے ہیں۔ چپ چاپ چلا آیا۔ اگر ان میں سے کسی کی نظر پڑ گئی تو یہ سمجھیں گے کہ جان بُوجھ کر کھانے کے وقت آیا ہے۔ اس کے علاوہ روپوں کے سوال کرنے کی ہمت بھی جواب دے چکی تھی۔ گھر واپس آ رہا تھا کہ سوچا گھر جا کر کیا کرونگا۔ اُس کے دل سے ایک اُبال سا اُٹھا اور اس اُبال نے اُس کے دماغ میں پہنچ کر دماغ کو بیکار کر دیا۔ عقل پہلے ہی جواب دے چکی تھی۔ اُس نے جنگل کا رُخ کیا۔ راستے میں اُسے اِکّا دکّا آدمی ملتا تو اُس کے جی میں آتا کہ جب انسان کو انسان سے ہمدردی نہیں تو میں اُسے مار کر اس کا مال کیوں نہ چھین لوں۔ پھر خیال آیا کہ کیا معلوم اس کے پاس کچھ ہو اور ہے بھی کہ نہیں اور کیا معلوم یہ بھی کوئی میرا ہی سا مصیبت زدہ ہو۔ وہ وحشت میں بڑھا چلا گیا۔ آخر دریا کا پُل آ گیا اور وہ پُل پر بیٹھ گیا۔ بیٹھے بیٹھے خیال آیا کہ اپنی زندگی کا خاتمہ ہی کیوں نہ کر ڈالوں۔ اُس نے نیچے جھُک دیکھا۔ تاریکی میں پانی نے عجیب ہیبت ناک صورت اختیار کر رکھی تھی۔ وہ پُل کی دیوار پر چڑھ گیا تاکہ دریا میں کود پڑے، پھر اُسے امینہ کا خیال آیا۔ دلوا

سے نیچے اُترا اور گھر کی طرف چل دیا۔ رنج اور غم کی وجہ سے قدم نہ اُٹھتے تھے۔ شہر میں داخل ہوکر اُس نے اپنی رفتار ذرا اور تیز کردی۔ گو بہت زیادہ رات نہ گئی تھی۔ لیکن اکثر و بیشتر دوکانیں بند ہو چکی تھیں اور بازار اور گلیاں سنسان پڑی تھیں۔ وہ چلا جارہا تھا کہ اُس کے کانوں میں کسی کے تقریر کرنے کی مدہم سی آواز آئی۔ وہ سمجھ گیا کہ آج مولانا فدائے قوم کی تقریر ہے۔ لہٰذا اُس نے جلسہ گاہ کا رُخ کیا۔ خیال آیا کہ شاید وہاں اللہ کا کوئی ایسا بندہ مل جائے جو اس مصیبت میں کچھ مدد کرسکے۔ وہاں جاکر دیکھا چاروں طرف گیس کے ہنڈے روشن ہیں اور مولانا فدائے قوم گھوم گھوم کر اُچھل اُچھل کر دونوں ہاتھ پھیلا پھیلا کر تقریر کر رہے ہیں۔ ہزاروں آدمی خاموش بیٹھے ان کے مُنہ سے نکلے ہوئے ایک ایک لفظ سے متاثر ہو رہے ہیں۔ عورتوں کے لئے الگ پردے کا انتظام ہے۔ مگر اس کے باوجود چاروں طرف مکانوں کی چھتیں عورتوں سے بھری پڑی ہیں۔ زاہد بھی ایک طرف کھڑا ہوگیا۔ مولانا فرمارہے تھے "میں اُس وقت تک چین نہ لوں گا جب تک اُن کا قلع قمع نہ کردوں۔ مسلمانوں تمھیں قسم ہے تمہارے پیدا کرنے والے کی کہ تم بھی چین سے نہ بیٹھنا جب تک کہ اُنھیں دنیا سے نہ مٹا دو۔ عام مسلمان اُنھیں مسلمان سمجھتے ہیں۔ لیکن دراصل یہ مسلمان نہیں ہیں۔ جو لوگ اُنھیں مسلمان سمجھتے ہیں اُن کے ایمان کمزور ہیں"۔

مولانا بڑے گرم الفاظ میں تقریر کر رہے تھے اور ہزاروں سامعین بُت بنے سُن رہے تھے۔ زاہد سوچنے لگا کہ یاالٰہی یہ عجب فدائے قوم ہے، یہ فدائے قوم بجائے اس کے کہ قوم میں اتفاق کراتا۔ اُس کی دوسری بُرائیاں دور کرتا۔ اُن میں نفاق ڈلوانے کے درپے ہے اور انجمن نفاق کی داغ بیل ڈال رہا ہے۔ ایک فرقے کو دوسرے فرقے کے خلاف اُبھار رہا ہے۔ یہ اچھا فدائے قوم ہے۔ جب تک قوم میں ایسے ایسے فدائے قوم موجود ہیں قوم کبھی ترقی نہیں کرسکتی۔

مولانا نے اپنی دھواں دھار تقریر جاری رکھی، اور کچھ دیر میں مجمع میں سے دوسرے فرقے پر لعنت کے نعرے بلند ہونے لگے۔ جب مولانا نے دیکھا کہ اب مجمع اچھی طرح متاثر ہوگیا ہے، تو چندے کا سوال کر دیا۔ اور ساتھ ہی دن والا واقعہ بھی سنا دیا کہ آج ہم ایک صاحب کے یہاں چندہ مانگنے گئے تو اُنھوں نے یہ بہانہ تراشا کہ ملازمت جاتی رہی اور

تمام روپیہ چونکہ یہ بات مجھ سے علیحدگی میں کہی تھی۔ اس لئے مجھے شبہ ہوا میں نے اُن صاحبان سے کہا جو میرے ساتھ تھے اُنھوں نے اُسے شرم دلائی تو وہ خاموشی سے مکان میں چلا گیا۔ اور پھر اُس کی بیوی دہلیز میں آکر دو روپے دے گئی۔ اس سے میرا یہ مطلب ہے کہ اگر سب لوگ جھوٹ بول بول کر چندہ دینے سے بچنا چاہیں تو قوم کبھی زندہ نہیں رہ سکتی۔ آپ کو معلوم ہونا چاہیئے کہ وہ قوم زندہ رہتی ہے اور وہ قوم ترقی کرتی ہے جس کے زیادہ سے زیادہ فرزند جان و مال کی قربانی دینے کے لئے تیار ہوں، اور نہ صرف تیار ہوں بلکہ درحقیقت قربانی دیں۔

مولانا کی تقریر کا بڑا اثر ہوا۔ ذرا سی دیر میں مجمع کی جیبیں خالی ہوگئیں اور آدمیوں نے جی کھول کھول کر چندہ لکھوایا۔ پردہ نشین عورتوں نے اپنے زیور اُتار اُتار کر دیدیئے۔ جب مولانا نے زاہد کا ذکر کیا تو اُسے بے انتہا غصہ آیا۔ اُس پر پے بہ پے مصیبتیں آرہی تھیں۔ عزیزوں کی موت ملازمت سے علیحدگی۔ جیل کی سختی۔ پھر مقدمہ کی پریشانیاں یہ سب باتیں ایسی تھیں جنھوں نے اُسے زندگی سے بیزار کردیا تھا۔ ان سب پر مستزاد لڑکے کی بیماری اور موت اور اس پر مستزاد لڑکے کی نعش بے گور و کفن گھر میں پڑی تھی، اور اُس کے پاس پیسے نہ تھے کہ اُس کی تجہیز و تکفین کا بندوبست کرسکے۔ دو روپے مولانا اور اُن کے ہمراہیوں کے بھینٹ چڑھ چکے تھے، اور باقی ڈاکٹر کی فیس اور دوا میں خرچ ہوگئے تھے۔ اور فدائے قوم فرمارہے تھے کہ اُس نے بہانہ تراشا تھا۔ وہ جھوٹ بولا تھا۔ حالانکہ اُس نے صاف الفاظ میں اپنے غم کی کہانی سنا دی تھی۔ اُس کا خیال تھا کہ یہ فدائے قوم ہیں اُن کے پہلو میں دردمند دل ہوگا۔ اُنھیں ضرور مجھ پر رحم آجائے گا اور شاید مدد کرنے پر بھی تیار ہوجائیں، لیکن وہ اُسے جھوٹا سمجھتے تھے اُنھوں نے اُس کی بات تک کا اعتبار نہیں کیا تھا۔

زاہد کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ اُس کا سر چکرانے لگا۔ وہ جہاں کھڑا تھا وہیں بیٹھ گیا۔ فدائے قوم کے پاس سینکڑوں روپے جمع ہو چکے تھے۔ زیور اُن کے علاوہ تھا۔ زاہد کے چکرائے ہوئے دماغ میں خیال آنے لگا کہ یہ چندہ زیادہ تر غریب آدمیوں کی جیبوں سے نکلا ہے۔ اُن غریب آدمیوں کی جیبوں سے جو بڑی مشکل سے گزارا کرتے ہیں۔ جن میں سے اکثر کو دو وقت کھانے کو بھی نہیں ملتا اور یہ روپیہ

خرچ کہاں کیا جائے گا۔ قوم کو درہم برہم کرنے کے لئے، مسلمانوں کو آپس میں لڑانے کے لئے اور ذاتی امیرانہ اخراجات پورا کرنے کے لئے ——— مسلمان اسے فدائے قوم کہتے ہیں۔ اس کے اشاروں پر ناچتے ہیں۔ اس کے ایک ایک لفظ پر جان و مال قربان کر دیتے ہیں۔ یا خدا اس قوم کا انجام کیا ہوگا جس میں ایسے ایسے فدائے قوم موجود ہیں" وہ سوچتا رہا۔ پھر اُسے گھر کا خیال آیا اور وہ اُٹھ کر گھر کی طرف چل دیا۔ اُن کا گھر وہاں سے کچھ زیادہ دور نہ تھا۔ دروازے کا کھٹکا کھول کر اندر داخل ہوا تو گھر میں اندھیرا ہو رہا تھا۔ اُس نے خیال کیا کہ شاید لالٹین میں تیل نہ ہو۔ اس لئے امینہ نے نہیں جلائی۔ اُس نے آواز دی "امینہ! امینہ" کوئی جواب نہ ملا۔ وہ گھبرا گیا۔ لیکن پھر خیال آیا کہ شاید غریب کی آنکھ لگ گئی ہو۔ کیونکہ دو تین رات سے وہ متواتر جاگ رہی تھی۔ اُس نے دیا سلائی تلاش کر کے لالٹین روشن کی۔ امینہ کو دیکھکر اُس پر بجلی سی گر پڑی۔ فرش پر اوندھی پڑی تھی۔ زاہد نے قریب جا کر اُس کی نبض دیکھی۔ بہت آہستہ آہستہ چل رہی تھی۔ اُس نے بمشکل اُسے زمین پر سے اُٹھا کر چارپائی پر لٹا دیا، اور خود قریب بیٹھ گیا۔ اس کا دماغ پھر چکرانے لگا۔ سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا کرے۔ کچھ دیر یونہی بیٹھا رہا۔ پھر اُٹھ کر اُس کے چہرے پر ٹھنڈے پانی کے چھینٹے دئے۔ لیکن کچھ اثر نہ ہوا۔ پھر ٹرنکوں میں سے ڈھونڈھ کر عطر کی شیشی نکال کر لایا، اور اُسے سونگھائی۔ مگر وہ ہوش میں نہ آئی۔ جی میں آیا کہ ڈاکٹر کو بلا لائے۔ پھر خیال آیا کہ اُس کی فیس کہاں سے دوں گا۔ گھر میں تو ایک پیسہ بھی نہیں۔ وطن آئے تین دن گزر رہے تھے۔ اُدھار کس سے مانگتا، اور کیونکر مانگتا۔ دس گیارہ برس کے بعد گھر آئے تھے۔ اور کسی کو یہ نہ بتایا تھا کہ اُن پر کیا گزر رہی ہے۔ اور جب گھر سے گئے تو رشتہ داروں سے لڑ کر گئے تھے۔ اتنے عرصہ تک وطن واپس نہ آنے کے جہاں اور وجوہ تھے وہاں ایک یہ لڑائی بھی تھی۔ پھر پھر اُس کا خیال فدائے قوم پر ہی جما کہ اُن سے سوال کیا جائے۔ اُن کے پاس بہت سا چندہ جمع ہو گیا ہے۔ شاید کچھ عنایت کر دیں۔ لہٰذا اُٹھا اور دروازے کی باہر کی کنڈی لگا کر پھر جلسہ گاہ کی طرف چل دیا۔ جب وہ وہاں پہنچا جلسہ ختم ہو چکا تھا۔ آدمی اپنے اپنے گھر جا رہے تھے۔ مولانا فدائے قوم ایک طرف کھڑے چند نوجوانوں سے خوش گپیاں ہانک رہے تھے۔ اُس نے قریب جا کر مولانا کو علیحدہ بُلایا اور سارا ماجرا کہہ سنایا۔ مگر مولانا کو یقین نہ آیا اور اُنھوں نے مدد کرنے سے قطعی انکار کر دیا۔ پھر اُس نے اپنے دو روپے واپس مانگے اس پر اُنھوں نے کہا کہ وہ روپے میرے پاس نہیں ہیں۔ وہ فلاں وکیل صاحب کے پاس ہیں۔ اس نے پھر گڑگڑا کر عرض کیا تو اس بات پر وہ بہت خفا ہوئے اور جیب سے دوّنی نکال کر دیتے ہوئے کہا "تم جیسے مستنڈوں نے قوم کو برباد کر دیا۔ محنت کرتے نہیں اور پیٹ بھرنے کے لئے کیسے کیسے بہانے تراشتے ہیں۔ شرم نہیں آتی"

زاہد نے دوّنی مولانا کے سینے پر دے ماری اور واپس چلا آیا۔ اُس کے کانوں میں مولانا کے الفاظ گونج رہے تھے "تم جیسے مستنڈوں نے قوم کو برباد کر دیا۔ محنت کرتے نہیں اور پیٹ بھرنے کے لئے کیسے کیسے بہانے تراشتے ہو شرم نہیں آتی" وہ سوچنے لگا کہ یہ مولانا کتنے ذلیل ہیں۔ اُنھیں اتنا خیال نہ آیا کہ جو شخص اُنھیں چندے کے دو روپے دے سکتا ہے وہ دو چار آنے کی خاطر بہانے تراشے گا۔

مولانا پھر اُن نوجوانوں سے باتیں کرنے لگے۔ اُن میں سے ایک نے پوچھا یہ شخص کون تھا، اور کیا کہتا تھا۔

مولانا نے ارشاد فرمایا۔ یہ وہی شخص تھا جس کا میں نے چندہ مانگنے سے پہلے ذکر کیا تھا۔ اس نے دیکھا ہوگا کہ چندہ بہت جمع ہو گیا۔ ان سے پندرہ بیس دن کا خرچ حاصل کرنا چاہیئے۔ بھیک مانگنے آیا تھا۔ کہتا تھا لڑکا مر گیا بیوی بیہوش پڑی ہے"

سب ہنسنے لگے۔ ایک بولا کہ اس کے ساتھ چل کر دیکھنا چاہیئے تھا اگر اس کا بیان سچ ہوتا تو وہ واقعی امداد کا مستحق تھا۔

ان میں سے کوئی بھی اُسے نہ پہچانتا تھا۔ کیونکہ وہ دس بارہ برس کے بعد وطن آیا تھا اور جب وہ وطن سے گیا تو وہ سب بہت چھوٹے تھے۔

زاہد دل گرفتہ اور زندگی سے بیزار زاہد پھر اپنے گھر میں داخل ہوا۔ دیکھا امینہ پانی کے مٹکوں کے قریب زمین پر پڑی ہے۔ دوڑ کر اس کے پاس پہنچا۔ اُس کا بدن چھوا بالکل سرد تھا۔ نبض دیکھی بالکل ساکت تھی۔ بڑی مشکل سے اُٹھا کر پلنگ پر ڈالا۔ سمجھ گیا اگر روپے مانگنے نہ جاتا تو شاید نہ مرتی۔ اُسے ہوش آیا تو پیاس لگ رہی ہوگی، اُٹھکر پانی پینے گئی کہ گر پڑی۔

گھر میں ایک چھوڑ دو دو لاشیں پڑی تھیں اور زاہد اکیلا بیٹھا سوچ رہا تھا کہ کیا کرے۔ جب انسان پر اُس کی برداشت سے زیادہ مصیبتیں آتی ہیں تو اُس کی قوتِ حس فنا ہو جاتی ہے۔ اور دفعہ اُسے بالکل احساس نہیں ہوتا۔

کہ اس پر کیا بیت رہی ہے۔ زاہد بیٹھا سوچتا رہا کہ کیا تھا اور کیا ہو گیا۔ پھر اُسے مولانا فدائے قوم کا خیال آ گیا اور اُس کے ساتھ اپنے اور غریب بھائیوں کی یاد بھی آ گئی کہ یہ غریبوں ہی کی جیبوں سے روپے حاصل کرتا ہے، اور پھر اُنھیں کی پرواہ نہیں کرتا۔ اُنھیں کی گردنیں کٹواتا ہے۔ اُنھیں پر گولیاں چلواتا ہے۔ جہاں کوئی موقعہ ہوتا ہے اُنھیں آگے کر دیتا ہے۔ اور خود انتہائی عیش کی زندگی بسر کر رہا ہے۔ اچھا کھاتا ہے، اچھا پہنتا ہے۔ اور سیکنڈ کلاس سے کم درجے میں سفر نہیں کرتا۔ اسے کسی بیوقوف نے فدائے قوم کا لقب دے دیا۔ وہ سوچتا رہا۔ پھر اُس نے بچے اور بیوی کی لاشوں پر نظر کی۔ اور اُنھیں دیکھکر اُس پر کچھ ایسی وحشت طاری ہوئی کہ گھر سے نکل کھڑا ہوا۔ تقریباً ایک بج چکا تھا۔ اور رات بھی اندھیری تھی۔ مگر اُس نے کچھ پرواہ نہ کی۔ وہ چلتا رہا۔ اگر اندھیری رات نہ بھی ہوتی تو بھی اُسے کچھ سُوجھائی نہ دیتا۔ پیہم مصیبتوں سے اُس کے ہوش و حواس کھو گئے تھے۔ اُس کی عقل کی آنکھیں پھوٹ چکی تھیں۔

وہ تمام رات جنگل کی سنسان اور ویران پگڈنڈیوں پر مارا مارا پھرا۔ ایک طرف تیزی سے چلا جاتا۔ پھر اس سے بھی زیادہ تیزی کے ساتھ واپس آتا۔ درخت پر چڑھ کر بیٹھ جاتا۔ پھر اُترتا اور بھاگنے لگتا۔ پھر وہ ایک ٹیلے پر چڑھ گیا اور درختوں کو، ستاروں کو، آسمان کو، زمین کو مخاطب کر کے تقریر کرنے لگا۔ اُس نے ان سب چیزوں کو زندہ سمجھ لیا تھا۔ وہ اس طرح تقریر کر رہا تھا جس طرح بڑے بڑے لیڈر ہزاروں آدمیوں کے مجمع کو مخاطب کر کے تقریر کرتے ہیں۔

انہی بے تابیوں اور بے چینیوں میں صبح ہو گئی۔ سورج کی صورت دیکھتے ہی اُس نے شہر کا رُخ کیا۔ شاید اُس کی عقل کچھ راہِ راست پر آ گئی تھی یا یہ حرکت بھی وحشت ہی کے زیرِ اثر تھی۔ ابھی وہ شہر میں داخل نہ ہوا تھا کہ اُس نے دیکھا مسلمانوں کا جمِ غفیر اللہ اکبر کے نعرے بلند کرتا ہوا اسٹیشن کی طرف جا رہا ہے۔ وہ سمجھ گیا کہ مولانا کو سوار کرانے جا رہے ہیں۔ لہٰذا اُس نے بھی اسٹیشن کا رُخ کیا۔ وہاں جا کر اُس نے دیکھا کہ مولانا کی گردن پھولوں کے ہاروں سے لدی ہوئی ہے۔ اور مولانا بڑے کروفر سے ایک کرسی پر تشریف فرما ہیں۔ دور سے کھڑا اُنھیں دیکھتا رہا اور اپنا اور اُن کا مقابلہ کرتا رہا۔ ایک میں ہوں جسے کوئی نہیں پوچھتا۔ جس کے گھر میں ایک جھونپڑا دو دو لاشیں بے گور و کفن پڑی ہیں۔ ایک یہ ہیں جن کی لوگ اتنی عزت کرتے ہیں جن کے ایک اشارے پر مسلمان اپنی جانیں دیدیتے۔ لیکن در اصل یہ اس قابل نہیں ہیں۔ یہ بڑے عیار ہیں۔ اُنھوں نے ایک سے زیادہ دفعہ قوم فروشی کی ہے۔ لیکن اپنی عیاری کی وجہ سے ہر دفعہ قوم کو دھوکے میں رکھا۔ اُن کے افعال پر ابھی اُن کی عزت اور شہرت پردہ ڈالے ہوئے ہے۔ لیکن وہ دن دور نہیں، جب یہ اپنے اصلی روپ میں نظر آئیں گے۔ اُس نے سوچا کہ میں ہی کیوں نہ انھیں بے نقاب کر دوں۔ تیزی سے بڑھا اور میز ایک طرف کھینچ کر اُس پر چڑھ گیا۔

لوگوں نے اُس کی یہ حرکت حیرت سے دیکھی، اور ابھی وہ کچھ کہنے نہ پائے تھے کہ اُس نے بولنا شروع کر دیا۔

"حضرات"! وہ رُکا۔ اپنے منتشر حواس جمع کئے۔ پھر بولا "حضرات! آپ میں سے اکثر مجھے نہیں جانتے۔ لیکن مجھے یہ کہنا ہی نہیں چاہیئے۔ آپ جانتے ہوں یا نہ جانتے ہوں۔ لیکن جو کچھ میں کہنے والا ہوں اُسے غور سے سُنئے اور سوچئے کہ وہ کہاں تک درست ہے"!

آدمی اُس کے ارد گرد جمع ہونے لگے۔ اُس نے اپنی تقریر جاری رکھتے ہوئے کہا۔

"کون نہیں جانتا کہ ہماری قوم تباہی کے غار میں گر رہی ہے بلکہ میں تو یہ کہوں گا کہ ڈھکیلی جا رہی ہے۔ آپ پوچھیں گے کہ کون ڈھکیل رہا ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ ہمارے لیڈر ہمارے قومی رہنما ہماری تباہی کا اصلی سبب ہیں۔ آہ کتنے افسوس کا مقام ہے کہ اتنی بڑی قوم ایک بھی بے لوث اور سچی خدمت کرنے والا لیڈر پیدا نہ کر سکی۔ آج ہمیں جواہر لال اور بوس کا سا بے غرض اور دیانتدار لیڈر چاہیئے ——

ان لیڈروں سے بچئے جو آپ سے چندہ مانگ مانگ کر عالی شان محل تیار کر رہے ہیں۔ امیرانہ شان سے زندگی گزارتے ہیں اور اپنا وقار قائم رکھنے کے لئے اپنی عزت بڑھانے کے لئے آپ لوگوں کو آپس میں لڑاتے رہتے ہیں۔ ان کا جادو غریبوں پر بہت چلتا ہے کیونکہ وہ جاہل اور غریب ہوتے ہیں وہ ان کی چالوں کو نہیں سمجھتے۔ وہ اُن کے جھانسوں میں آ جاتے ہیں۔

زاہد تقریر کر رہا تھا۔ لوگ خاموش کھڑے سُن رہے تھے اور مولانا فدائے قوم کو غصہ آ رہا تھا کہ کیا بک رہا ہے۔ وہ بڑی حقارت کی نظر سے اُسے دیکھ رہے تھے۔

"ہمارے قصبے کی بدقسمتی سے کل ایک فدائے قوم صاحب یہاں بھی لوگوں کی جیبیں کاٹنے آئے تھے۔ اگر آپ کو یہ معلوم ہو جائے کہ یہ فدائے قوم کتنی مرتبہ چاندی کے چند کھوٹے سکوں کی عوض قوم فروشی کر چکے ہیں تو ———"

ابھی وہ اپنا جملہ ختم نہ کرنے پایا تھا کہ مولانا جوش میں اُٹھے اور زاہد کو اس زور سے دھکا دیا کہ بیچارہ بُری طرح گرا۔ قریب ہی پتھر تھا۔ اُس سے سر ٹکرایا اور لہو لہان ہو گیا۔

آدمی یہی سوچ رہے تھے کہ کیا کریں۔ یہ سب باتیں بڑی سُرعت سے وقوع پذیر ہوئی تھیں۔ اتنے بڑے مجمع میں زاہد کے حامی بھی پیدا ہو گئے تھے۔ اور مولانا کی حرکت بہتوں کو ناگوار گزری تھی کہ اتنے میں ریل آ گئی۔ دو چار آدمیوں نے زاہد کو اُٹھا کر ایک بنچ پر لٹا دیا۔ اور مولانا جلدی سے ریل میں سوار ہو گئے۔ چند لوگوں نے اللہ اکبر اور مولانا زندہ باد کے نعرے بلند کئے۔ لیکن وہ اپنے کئے پر پشیمان تھے اور سوچ رہے تھے کہ جو کچھ زاہد نے کہا ہے کیا وہ سچ نہیں ہے۔ ریل روانہ ہو گئی لیکن وہ اپنے خیالات سے نہیں چونکے۔ وہ سوچتے رہے کہ کیا میں قوم کی بے لوث خدمت کر رہا ہوں۔ کیا میں قوم فروش نہیں ہوں۔ کیا میں مسلمانوں کو آپس میں نہیں لڑاتا۔ کیا میں نے قوم کا رُخ بدلنے کے عوض روپے نہیں کھائے۔ اُن کے ضمیر سے گناہ کی سیاہی کے پردے اُٹھنے لگے اور اُنھیں ایک روشنی سی دکھائی دینے لگی۔ تمام راستے اپنے اعمال پر نظر کرتے رہے۔ بڑے بڑے اسٹیشنوں پر لوگ اُن سے ملنے آتے تھے۔ مگر وہ بڑی بے توجہی سے ملتے تھے۔ اُن کی خواہش تھی کہ لوگ اُنھیں اُن کے خیالات میں محو رہنے دیں۔ اُنھیں رہ رہ کر یہ خیال آ رہا تھا کہ میں نے قوم کی کتنی خدمت کی اور قوم نے میری کتنی خدمت کی۔ اُن کے خیالات نے ایک دفعہ اور پلٹا کھایا اور وہ اپنے ہر فعل کی تاویل کرنے لگے۔ آخر وطن پہنچتے پہنچتے اُنھوں نے اپنے ہر فعل کو درست اور راستی پر مبنی سمجھ لیا۔ اگر وہ ایک فرقے کو دوسرے فرقے کے خلاف اُبھارتے تھے تو اس میں بھی مذہب کی خدمت تھی۔ اگر اُنھوں نے قوم کا رُخ بدلنے کے لئے ہزاروں روپے لئے تو اس میں کوئی برائی کی بات نہیں۔ مصلحتِ وقت کا تقاضہ یہی تھا کہ رُخ بدل دیا جائے۔ خدا نے اگر اس بات میں روپے بھی دلا دئے تو کوئی گناہ نہیں۔ رُخ تو بہر صورت بدلنا ہی تھا۔

اِدھر مولانا اپنے افعال کی تاویلیں کر رہے تھے اور اُدھر زاہد ہسپتال میں پڑا دم توڑ رہا تھا۔ اب اس کے بہت سے ہمدرد پیدا ہو گئے تھے۔ اور وہ سب اُس کے گرد جمع تھے۔ لیکن ان میں سے کسی کو بھی یہ معلوم نہ تھا کہ جتنا وہ سمجھ رہے ہیں زاہد اُس سے کہیں زیادہ مصیبت رسیدہ ہے۔ وہ آنکھیں بند کئے خاموش لیٹا تھا۔ ڈاکٹر اُس کے پلنگ کے قریب کرسی پر خاموش بیٹھا تھا۔ اور قریب ہی دو نرسیں خاموش کھڑی تھیں۔

زاہد نے یکایک آنکھیں کھولیں اور بہت خفیف آواز میں بولا۔ "کاش مولانا راہِ راست پر آ جائیں۔ گو اُن کی گردن پر تین خون ہیں۔ لیکن میں نے اُنھیں معاف کیا۔ میرا خدا بھی اُنھیں معاف کرے ———"

ڈاکٹر نے اُسے خاموش ہونے کے لئے کہا۔ اُس نے ڈاکٹر کی طرف دیکھا اور ہمیشہ ہمیشہ کے لئے خاموش ہو گیا اور مولانا "فدائے قوم" فدائے قوم ہی رہے۔

افسوس تجھے بیچتے ہیں دنیا [illegible] دیتے ہیں
سب تیری عقیدت کا صلا دیتے ہیں
تجھ کو نہیں [illegible] لگاتے ہیں گلے
منعم [illegible] تیری جیب لگا دیتے ہیں

ادیب

اُس طرف اور اِس طرف

اُس طرف عیش و طرب سے سازگاری ہائے ہائے　　اِس طرف رنج و محن سے ہمکناری ہائے ہائے

اُس طرف جشنِ شباب و غمزہ و ناز و ادا!　　اِس طرف مرحوم دل کی سوگواری ہائے ہائے

اُس طرف ساز و سرود و بربط و چنگ و رباب　　اِس طرف مضرابِ غم، شُعلہ باری ہائے ہائے

اُس طرف حُسن و جوانی کی ستم آرائیاں　　اِس طرف عشق و جنوں کی پاسداری ہائے ہائے

اُس طرف بے اعتنائی، سرد مہری، بے رُخی　　اِس طرف لُطف و کرم کی خواستگاری ہائے ہائے

اُس طرف دلجوئی و دل گرمی و دل بستگی　　اِس طرف بڑھتی ہوئی حسرت شعاری ہائے ہائے

اُس طرف کبر و غرور و ناز و تمکین و عتاب!　　اِس طرف عرضِ نیاز و خاکساری ہائے ہائے

اُس طرف ہر ہر نگہ میں اک پیامِ دلفروز!　　اِس طرف ہر لحظہ تازہ بیقراری ہائے ہائے

واں مئے گلرنگ سے شادابیٔ کشتِ نشاط　　یاں لہو سے باغِ دل کی آبیاری ہائے ہائے

اُس طرف اُن مدبھری آنکھوں میں گردش جام کی　　اِس طرف بھولی ہوئی توبہ کی خواری ہائے ہائے

اُس طرف شغلِ چراغانِ کنارِ آبجو!　　اِس طرف تنہائی و اختر شماری ہائے ہائے

اُس طرف ہنگامۂ سیرِ چمن اور اِس طرف　　چشمِ خونابہ فشاں کی لالہ کاری ہائے ہائے

اُس طرف عُریانیٔ رازِ طرب کے ولولے　　اِس طرف ناموسِ غم کی پردہ داری ہائے ہائے

اُس طرف تدبیر کی عینِ ظفرمندی، اِدھر!　　سربسر تقدیر کی ناسازگاری ہائے ہائے

قلقلِ مینا اُدھر، گلخندۂ ساغر اُدھر!　　اور اِدھر چپکے ہی چپکے اشکباری ہائے ہائے

مختصر یہ ہے خُدا اور کُل خُدائی اُس طرف!

اِس طرف بس ایک نااُمیدواری ہائے ہائے!

عسکری طباطبائی

ایک شاہی مہمان کے چودہ گھنٹے

قبل اس کے کہ میں اپنے چودہ گھنٹے کے تلخ تجربات قلمبند کروں، یہ بتادینا چاہتا ہوں کہ ہماری دیسی ریاستوں میں دو قسم کے مہمان خانے ہوتے ہیں، ایک تو "انگلش گیسٹ ہاؤس" کے رعب آفریں نام سے منسوب ہوتا ہے۔ اور دوسرا "دیسی مہمان خانہ" کہلاتا ہے۔

"انگلش گیسٹ ہاؤس" میں انگریز، اور انگریزوں کی قبیل کے مہمان، اور "دیسی مہمان خانے" میں صرف ہندوستانی شرفاء ٹھہرائے جاتے ہیں اور ان دونوں مہمان خانوں میں وہی فرق ہوتا ہے جو حاکم و محکوم کے درمیان پایا جاتا ہے۔

کیا کوئی اس سچے مضمون سے عبرت حاصل کرے گا؟ ہائے غلامی!

رات کو ریاست .... پہونچا۔ موٹر کے عوض گھوڑا گاڑی نے، جس کا ایک گھوڑا مرضِ ضیق النفس میں مبتلا تھا۔ میرے جسم کو کھینچ کر اُس دار العذاب میں لاکر ڈال دیا۔ جسے "دیسی مہمان خانہ" کہتے ہیں۔ اس سے قبل[1] میں "انگلش گیسٹ ہاؤس" میں ٹھہرایا گیا تھا، اور میری سواری کے لئے موٹر آیا تھا—— خیر۔ رات کے وقت دیسی مہمان خانے میں پہونچا تو کیا دیکھتا ہوں کہ صرف ایک گوشے کے سوا تمام اطراف کا سیاہی احاطہ کئے ہوئے ہے۔ اور بے ترتیب لانبی لانبی گھاس کے نیچے زہریلے سانپوں کا تصور رینگتا پھر رہا ہے—— نوکر چاکر سب محوِ خواب ہیں۔ حالانکہ اُس وقت زیادہ سے زیادہ رات کے نو بجے ہوں گے——

میری گاڑی کے کوچ مَین نے، جس کی داڑھی اُلجھی ہوئی، اور جس کی بوسیدہ وردی صرف ایک بٹن سے وابستہ تھی، ایک سامنے سوئے ہوئے ملازم کو جگایا—— ملازم تیوری پر بل ڈالتا ہوا بیدار ہوا۔ اُس نے میری جانب ناپسندیدگی کے ساتھ دیکھا۔ سر کھجایا۔ اور پھر اُونگھنے لگا۔ میرے گاڑی بان نے، جو مجھ سے بہت جلد مخلصی حاصل کرنا چاہتا تھا، قدرے بلند آواز کے ساتھ مہمان خانے کے نیم خوابیدہ ملازم سے کہا یہ سرکاری مہمان ہیں۔ ان کے لئے چارپائی بچھا دو—— ملازم جواب دیئے بغیر ایک کمرے کی طرف اور گاڑی بان اصطبل کی جانب روانہ ہوگیا۔ اور میں اُس تاریک اور خوفناک بَن کو دیکھنے لگا جو مہمان خانے کا احاطہ کئے ہوئے تھا——

اِتنے میں ملازم نے ایک گھنے درخت کے سائے میں ایک ٹوٹی ہوئی "شہیدِ مرد" کی قبر کے پاس میری چارپائی بچھادی۔ اور اپنی چارپائی کو ایک نہایت ہی کرخت آواز کے ساتھ کھینچتا ہوا میری آنکھوں سے اوجھل ہوگیا۔

شاہی مہمان خانے میں نہ کھانا ہی موجود تھا، نہ ٹھنڈا پانی—— میں نے اِس عالم میں چاروں طرف نظر دوڑائی، اور صورتِ حال

---

[1] مجھے دیسی مہمان خانے میں محض اس لئے ٹھہرنا پڑا تھا کہ ریاست کے جن اعلیٰ ترین حاکم کو میں نے تار دیا تھا۔ وہ تار اُن کے عوض، اُن کے کسی ماتحت کے ہاتھ پڑ گیا تھا، اور اُس نے مجھے نہ پہچانتے ہوئے دیسی مہمان خانے میں ٹھہرا دیا تھا۔

لیکن میں خوش ہوں کہ اس غلطی کی بناء پر مجھے اِس کا تجربہ ہوگیا کہ دیسی رئیس اپنے دیسی مہمانوں کے ساتھ کیا سلوک روا رکھتے ہیں۔

کا اندازہ کرکے یہ فیصلہ کرنے پر مجبور ہو گیا کہ آج کی رات بُھو کا پیاسا ہی سونا پڑے گا۔

چنانچہ میں بستر پر دراز ہو گیا۔ یا یوں کہئے میں نے اپنے قدرے بھاری جسم کو بستر پر گرا دیا ــــــ اور کئی سو کروٹوں کا عذاب برداشت کرتے ہوئے دو بجے رات کے قریب سو گیا۔

صبح آنکھ کھلی، یا یوں کہئے کہ غشی سے ہوش آیا تو کافی دھوپ نکل چکی تھی۔ طبیعت سخت بے کیف تھی۔ جلدی جلدی حسبِ عادت، کلیاں کیں، غرارے کئے، اور ایک گلاس پانی پی کر ٹہلنے لگا۔ پانی جو میں نے پیا تھا کافی گرم تھا۔ وہ ٹھنڈا پانی جو بھکاریوں کی جھونپڑیوں میں بھی آسانی کے ساتھ میسر ہو جاتا ہے۔ اِس "شاہی" عمارت میں فراہم نہ ہو سکا۔

پانی پی کر ابھی ٹہل ہی رہا تھا کہ ایک صاحب سے، جو مجھ سے واقف تھے، ملاقات ہو گئی۔ وہ غریب بھی اسی دار المحن میں ٹھہرے ہوئے تھے۔

اُنھوں نے مجھ پر ترس کھاتے ہوئے، مہمان خانے کے ملازم سے کہا کہ آپ کے ناشتے کے لئے اِسی وقت ٹیلیفون کر دو، ورنہ آپ کو بیحد تکلیف ہوگی۔

یہ سُنتے ہی میں پریشان ہو گیا "کیا یہاں کوئی سامان موجود نہیں ہے؟" میں نے گھبرا کر پوچھا۔ "جی نہیں، یہاں تو پینے کا پانی تک نہیں رہتا، ہر شے انگلش گرٹ ہاؤس سے آتی ہے" اُنھوں نے شرمائی ہوئی آواز سے جواب دیا۔

میں چونکہ غسل کے بعد فوراً ناشتے کا خوگر ہوں۔ اور ناشتے میں دو منٹ کی تاخیر بھی میرے واسطے شدید عذاب کا حکم رکھتی ہے۔ اِس لئے میں نے بھی ملازم سے گھبرا کر کہا اِسی وقت ٹیلیفون کر دو اور کہہ دو کہ پندرہ منٹ کے اندر اندر ناشتہ آجائے۔ آدمی نے اُسی وقت فون کر دیا، اور میں نے بکس سے کپڑے نکالے، دُھلی ہوئی شیروانی میں خلافِ عادت خود ہی بٹن لگائے۔ اور خط بنانے کی میز پر جا بیٹھا۔ بیٹھتے ہی خیال آیا کہ ناشتے کے لئے پھر ٹیلیفون کرا دوں تو بہتر ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ میں جس وقت غسل کر کے نکلوں، میز پر ناشتہ موجود نہ ہو۔ میں نے خط بنانے کی میز ہی سے بیٹھے بیٹھے آدمی کو آواز دی کہ ناشتے کے لئے دوبارہ فون کر دے۔ آدمی نے دوبارہ فون کر دیا اور میں خط بنانے میں مصروف ہو گیا۔

خط بنانے کے بعد، اور غسل خانے میں داخل ہونے سے پیشتر میں نے آدمی کو پھر آواز دی کہ ناشتے کے لئے سہ بارہ فون کر دے، چنانچہ اُس نے سہ بارہ فون کر دیا۔ اور میں غسل میں مصروف ہو گیا ــــ میں دیر تک نہاتا رہا۔ اِس خیال سے کہ ناشتہ آجائے۔ اثنائے غسل میں میں نے اپنے کمرے میں بار بار جھانک کر دیکھا۔ مگر ناشتے کا کہیں پتا بھی نہ تھا۔ آخر کار میں غسل کر کے باہر آگیا۔ اور انتہائی کرب کے عالم میں آدمی سے پوچھا، "ناشتہ آیا؟" "جی نہیں" اُس نے سر جھکا کر جواب دیا۔ اور دوسری طرف روانہ ہو گیا۔ "دیکھو خدا کے بندے" میں نے چیخ کر کہا "پھر ٹیلیفون کر دو کہ ناشتہ اِسی وقت آجائے"۔ چنانچہ ٹیلیفون کر دیا گیا۔

پانچ منٹ، دس منٹ، پندرہ منٹ بیس منٹ، میں انتظار کرتا رہا۔ انتظار کرتا رہا۔ برابر انتظار کرتا رہا۔ پیہم انتظار کرتا۔ لیکن ناشتہ نہ آنا تھا، نہ آیا ــــ میری زبان میں کانٹے پڑنے لگے، سر چکرانے لگا، اور متلی سی ہونے لگی۔ لیکن کرتا تو کیا کرتا۔ کمرے میں ایک سرے سے دوسرے سرے تک شدید ترین کرب کے ساتھ ٹہلتا رہا۔ ٹہلتا رہا۔ اور پھر آدمی سے درخواست کی کہ ناشتے کے لئے فون کر دے۔ آدمی نے مجھے معنی خیز نگاہوں کے ساتھ دیکھا۔ شاید میں عجیب انسان تھا ــــ اور اُس نے پھر فون کر دیا ــــ لیکن اُس کے پندرہ بیس منٹ کے بعد بھی جب ناشتہ نہیں آیا تو میں نے اپنی تسکین کی خاطر، ایک سوکھا سا پان جو میری ڈبیا میں موجود تھا۔ کھا لیا ــــ اور آرام کرسی پر دراز ہو گیا، اور سوچتا رہا کہ میں کس عذاب میں مبتلا ہو گیا۔ یہ سوچتے سوچتے میری آنکھ لگ گئی ــــ عادت بُری چیز ہوتی ہے ــــ

غالباً میں آدھ گھنٹے سویا ہوں گا کہ ایک کرخت آواز نے مجھے چونکا دیا۔ انگلش گرٹ ہاؤس کا آدمی میرے سامنے ناشتے کی کشتی لئے کھڑا تھا۔ میں نے آنکھیں ملتے ہوئے دیکھا۔ اُس کے ہاتھوں پر ایک چھوٹی سی میلی کشتی تھی۔ جس پر ایک پتیلیوں کا پوچھنے والا داغدار کپڑا پڑا ہوا تھا ــــ

میں نے کپڑے کو ہٹایا۔ اندر بھی ایک بوسیدہ اور ملگجا رومال

سجا ہوا تھا۔ چائے ٹھنڈی تھی۔ اور توسٹ ضرورت سے زیادہ سخت۔ شاید کئی دن کے باسی تھے۔ لیکن مرتا کیا نہ کرتا۔ دُور دور کسی ہوٹل کا بھی پتا نہ تھا۔ چار و ناچار مجھے وہ فعل کرنا ہی پڑا، جسے ناشتہ کرنا کہتے ہیں۔

ناشتے سے فارغ ہوتے ہی ایک دوسرے مساوی قسم کے عذاب میں فوراً مبتلا ہو جانا پڑا۔ یعنی ناشتے کے ساتھ پان نہیں آئے تھے —— حالانکہ ٹیلیفون کے ذریعے سے تاکید کر دی گئی تھی کہ پان بھی ضرور آئیں۔

کیا کرتا، میرے ساتھ پاندان تھا، کتھا چونا چاٹ کر ڈلی کے ساتھ تمباکو پھانک لیا ——

ہاں میں یہ کہنا بھول گیا کہ ناشتہ لانے والے نے جب میری طرف دیکھا تھا، اُس وقت اُس کی لانبی لانبی مونچھیں ہوا میں اُڑ رہی تھیں اور اُس کے چہرے پر ایک ایسی شکر یہ طلب بُردباری برس رہی تھی، گویا وہ کسی خیرات خانے میں روٹیاں تقسیم کرنے آیا ہے —— یا یتیم خانہ کو مہتمم بچوں کو عید کی خیراتی سوئیوں کا مژدہ سنا رہا ہے۔

ڈیڑھ گھنٹے کے بعد

بدقسمتی سے پیاس محسوس ہوئی۔ آدمی کو آواز دی۔ برف اور سوڈا لاؤ۔ آدمی نے غیر افسوسناک آواز میں نہایت اطمینان سے کہا "یہ دونوں چیزیں یہاں موجود نہیں ہیں" اور یہ کہکر کمرے سے باہر جانے لگا —— اُس کے نزدیک کسی آدمی کی تشنگی بجھانے کے واسطے اُس کا یہ جواب، اور اُس کی یہ روشنی، ضرورت سے زیادہ کافی تھی۔

شہری زندگی میں برف سوڈا ایسی پیش پا اُفتادہ چیزیں ہیں کہ تانگے والے تک اِن سے بہرہ یاب ہو جاتے ہیں، مگر شاہی مہمان خانے میں ایسی عام اور اِس قدر معمولی چیزیں بھی موجود نہیں تھیں۔ میں نے مُنہ موڑ کر جاتے ہوئے آدمی سے کہا فُون کر کے برف سوڈا منگالو۔ آدمی نے بڑی ہی متانت کے ساتھ فُون کر دیا —— لیکن جب تشنگی ناقابل برداشت ہو چلی تو میں نے آدمی کو بُلا کر پوچھا "ٹھنڈا پانی ہے؟" "جی نہیں، پانی تو ابھی ابھی بھرا ہے" آدمی نے جواب دیا —— میں یہ سُنتے ہی اُٹھ کھڑا ہوا غسل خانے کا نل کھولا، اور پیاس کی آگ پر گرم پانی چھڑک کر ٹھنڈی سانس لی، اور دوبارہ آرام کرسی پر دراز ہو گیا ——

ایک گھنٹے کے بعد

فُون آیا کہ ...... صاحب بہادر بیدار ہو چکے ہیں۔ آدمی سے کہا سواری منگاؤ۔ اُس نے جواب دیا کم سے کم ڈیڑھ گھنٹے میں سواری آئیگی۔ ناچار ...... صاحب بہادر سے ملنے کے لئے پیدل ہی روانہ ہو گیا۔

دو گھنٹے کے بعد

..... صاحب بہادر کے وہاں سے ابھی ابھی آیا ہوں، جس طرح چلچلاتی دُھوپ میں اُن کے دولت کدے تک پیدل گیا تھا۔ اُسی طرح دُھوپ میں بھُنتا ہوا پیدل ہی آیا ہوں۔ یہ کمبخت مقام، شہر سے اتنی دُور ہے کہ کوئی کرائے کی سواری مل ہی نہیں سکتی ہے —— سر سے لیکر پاؤں تک پسینے میں نہایا ہوا ہوں ——

بیس منٹ کے بعد

یکایک سخت تشنگی معلوم ہوئی۔ آدمی سے پوچھا "برف آئی؟" جواب ملا "نہیں، سوڈا تو آگیا ہے، برف ابھی شہر سے نہیں آئی ہے"

خیال آیا خالی سوڈا ہی پی لوں۔ لیکن جیسے ہی برف کی بوتل کو چھُوا تو معلوم ہوا کہ اس کا درجۂ حرارت تو دہکتے ہوئے انگاروں سے بھی بڑھا ہوا ہے —— ناچار دوبارہ پیاس کی آگ پر نل کا گرم پانی چھڑک کر خاموش ہو گیا ——

اب کھانے کا وقت آرہا ہے۔ خدا خیر کرے۔ دیکھیے کیا گل کھِلتا ہے۔

تقریباً سوا گھنٹے کے بعد

معلوم ہوا کہ پان اور برف دونوں چیزیں آگئی ہیں۔ برف کیا پیتا، نل کے گرم پانی سے مالش ہو رہی تھی۔ البتہ پان خود اپنے ہات سے بنا کر کھا لیا۔ مجھے بہرحال صبر کرنا چاہیئے ——

پندرہ منٹ کے بعد

ایک بوڑھے تجربہ کار آدمی نے جس کی ڈاڑھی مہندی سے

رنگی ہوئی سی کمرے میں داخل ہو کر کہا کہ میں اپنا پاندان صرف ایک دن کے لئے کسی دوسرے مہمان کو مستعار دے دوں۔

دن میں پچاس ساٹھ پانوں سے زیادہ کھانے والا، اپنا کھانا تو دوسروں کو دے سکتا ہے، مگر پاندان کو کیونکر جدا کر سکتا ہے ——— اس لئے میں نے پیر مرد سے معذرت کی۔ اور وہ مجھے نہایت ہی بری آنکھوں سے دیکھتا ہوا کمرے سے باہر چلا گیا۔

ایک گھنٹے کے بعد

کھانا آیا۔ میز پر چن دیا گیا۔ لیکن جیسے ہی میں نے اور میرے رفیقِ طعام نے نوالہ توڑا مہمان خانے کا آدمی غائب ہو گیا ——— اثنائے طعام میں پیاس لگی۔ اِدھر اُدھر دیکھا، نہ پانی ہی تھا، نہ پانی پلانے والا۔ ایک حرف کہے بغیر میں میز سے اٹھا تاکہ اپنے کمرے کے نل سے پانی پی آؤں، کہ اتنے میں میرے رفیقِ طعام نے میرا دامن پکڑ لیا اور اپنے پھیپھڑوں کی پوری طاقت کے ساتھ آدمی کو آواز دی۔

دو منٹ کے بعد آدمی خراماں خراماں آیا، پوچھا کیا چاہیئے، جواب دیا گیا۔ "پانی" آدمی نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر کہا۔ "پانی!" اور باہر چلا گیا۔ شاید اُس کے نزدیک اثنائے طعام میں پانی پینا حرام ہو گا۔

خیر ——— تھوڑی دیر کے بعد، جب کہ نوالے گلوں میں اٹکے ہوئے تھے، آدمی آیا، اور ہم نے وہ پانی پیا جس میں برف کا ایک ننھا سا ستارہ چمک رہا تھا۔

کھانے کے متعلق ایمانداری کے ساتھ صرف اِسی قدر کہا جا سکتا ہے کہ اُس میں اگر انتہائی فراخ دلی کے ساتھ کوئی خوبی تلاش کی جا سکتی تھی تو وہ یہ تھی کہ وہ اتنی مقدار میں تھا کہ ہم دو کے عوض چار آدمی اُسے کھا سکتے تھے، لیکن کھانے کی اِس خوبی سے کم سے کم میں تو کوئی فائدہ اٹھا نہیں سکتا تھا، کیونکہ میں اُن ناطق حیوانوں میں سے ہوں جو پیتے زیادہ ہیں اور کھاتے کم ہیں۔

اب رہیں اُس کی دوسری خوبیاں۔ سو تین عدد خوبیاں بہت اُجاگر تھیں۔ اولاً تو اُس کا درجۂ حرارت صفر سے بھی نیچے تھا۔ یہ کہنا بھی رعایت ہے، اس لئے کہ اُس کی سردی، کرۂ زمہریر کی سردی سے ملتی جلتی تھی۔

دوسرے اُس کھانے کا پکانے والا غالباً کوئی نہایت ہی رقیق القلب انسان تھا، جس نے ترس کھا کر غریب بکری کے گوشت کو کم سے کم گل جانے کے عذاب سے ہر طرح محفوظ رکھا تھا۔

تیسرے یہ کہ اُس کا گھی، ہر نوالے میں اپنا شجرۂ نسب یوں بیان کرتا تھا کہ میں ایک اونچے درخت کے خاندان سے ہوں اور میرے مقدس باپ کو عرفِ عام میں ناریل کہا جاتا ہے۔ ع

یہ مہمانِ عزیز اترا تھا کس اجڑے ہوئے گھر میں

(ایک ہندوستانی مہمان)

آہ غلامی!

یہ ایک ترکی شاعر کے خیالات ہیں جو ہمارے دیہاتوں پر بڑی حد تک صادق آتے ہیں۔ غوث

"لوگ مجھ سے پوچھتے ہیں کہ تم نے مشرق کی اتنے عرصے تک سیاحت کی ہے۔ آخر تم نے کیا دیکھا۔ میں کیا بتاؤں کیا دیکھا۔ میں نے اِس سرے سے اُس سرے تک ویران بستیاں، بے سری قومیں، ٹوٹے پھوٹے پل۔ بند نہریں۔ سنسان سڑکیں دیکھیں۔ میں نے جھریاں پڑے ہوئے چہرے۔ جھکی ہوئی کمریں، خالی دماغ، بے حس دل۔ اُلٹی عقلیں دیکھیں۔ میں نے ظلم، غلامی، خستہ حالی، ریاکاری، قابلِ نفرت برائیاں، طرح طرح کی بیماریاں، جلے ہوئے جنگل، ٹھنڈے چولہے، بنجر کھیت، میلی صورتیں، نکمّے ہاتھ پاؤں دیکھے ——— میں نے بے جماعت کے امام دیکھے۔ بھائی کو بھائی کا دشمن دیکھا۔ دن دیکھے جن کا کوئی مقصد نہیں۔ راتیں دیکھیں۔ جن کی کوئی صبح نہیں۔

(محمد غوث مرحوم)

پیغامِ آزادی

محمد غوث مرحوم

حضرات! مجھے لوگ دیوانہ کہتے ہیں۔ مگر میں جس قسم کا دیوانہ ہوں، اُس پر ہزاروں ہوشمندوں کی عقلیں قربان کی جاسکتی ہیں۔

بیشک میں فلسفی، شاعر یا لیڈر نہیں ہوں، مگر آزادی کا دیوانہ ہوں۔ میں بھی تمہارا سا ایک غلام ہوں۔ مگر فرق اتنا ہے کہ میں غلامی سے آزاد ہونے کے لئے سینے میں ایک بیتاب دل رکھتا ہوں۔ یہ آزادی کی چنگاری میرے قلب کو منور کر رہی ہے۔ اس سے سارے وطن کو روشن کرنا چاہتا ہوں یہی چنگاری میرے وطن کو غلامی کو خاکستر بنا دینے والا جہنم بنا دے گی! کیوں؟

اس لئے کہ میں ایک نوجوان دل رکھتا ہوں جس کی بہترین پیداوار جذبۂ آزادیٔ وطن ہے اور میں اِس مقدس پیغام کو ہر نوجوان کے گوشِ دل تک پہونچا دینا چاہتا ہوں۔

اُٹھو! میرے دوستو! اٹھو! زمانے نے کروٹ لی ہے اور اک انقلاب آچکا ہے۔ غلامی کی ناپاک زنجیروں کے ٹکڑے ٹکڑے اُڑا دو۔ بہت دیر تک تم مدہوش سو چکے، خوابِ مرگ سے اُٹھو! جس سردیٔ دل نے تمہارے جسم کو اک تودۂ برف بنا دیا ہے۔ جذبۂ آزادی کی حرارتِ حیات اُسے پھر برق و آتش میں بدل دے سکتی ہے۔ ہاں اس میں وہی گرمی پیدا کردو جو حرارتِ حیات تھی۔ دنیا میں اعلان کر دو کہ ہماری قوم بھی ایک غیور اور زندہ قوم ہے۔

تم نے بہت دیر تک غیروں کی غلامانہ خدمتگزاری کی اور اپنے ساتھ غدارانہ سلوک کیا۔ تم وہ ہو جنھوں نے ہزاروں وطن پرستوں کو جیل کی ہوا کھلائی۔ سینکڑاوں کو موت کے گھاٹ اُتار دیا۔ کیوں؟ اس لئے کہ تم زمانے کی ہوا پر چلنے والی بزدلانہ پالیسی کے قائل ہو اور تم وہ ازلی مجرم ہو جو "سویا وہ کھویا" کی ضرب المثل کے مصداق ہو۔ مگر ہم کوشش کر رہے ہیں، اور ضرور کامیاب ہوں گے، جب کہ تم دھتکارے جاوگے اور غداران وطن کہلاؤ گے۔ غور کرو! اُس وقت تمہارا کیا نقشہ ہوگا۔ وقت نکل جائے گا اور تم پچھتاؤ گے مگر بے سود۔

اے میرے عزیز ہندوستانی بھائیو! تم نے خوب تعصب کی آگ کو بھڑکایا اور خوب ایک دوسرے کی نعشوں کو روندا، کیوں؟ مذہب کی وجہ سے! ایسے ناشدنی مذہب کو سلام! اُٹھو، اور اپنے لامذہب ہونے کا آوازہ بلند کردو! آؤ! صحت کا غسل کرلیں۔ آؤ میرے نشانِ آزادی کے نیچے جمع ہو جاؤ، اور وطنِ مقدس کے لئے آزادی کی قسم کھاؤ! کہ ہم آپس میں بھائی بھائی ہیں۔ یہ سرزمین ہماری مادرِ وطن ہے، اور ہمارا اولین فرزندانہ فریضہ یہ ہے کہ اپنی وطنی ماں کے طوقِ غلامی کو توڑ کر پھینکدیں۔

آؤ! یہ عزم کرلیں کہ ہم آزادیٔ وطن کے لئے اپنی جانیں نثار کر دیں گے۔ پھر ہم ایثارِ نفس کے کرشمے دنیا کو دکھلا دیں گے۔ پھر آزادی کا آفتاب ہمارے سروں پر نور پاش ہوگا۔

آؤ دوستو! آستینوں کو چڑھالو اور ہمتِ مردانہ کی شمشیریں نیاموں سے نکالو اور غلامی کے ناپاک دیو کا ناپاک سر قلم کرکے جہنم میں جھونک دو!!

تحائف

مترجمہ گُل سعید خاں

جان دی ہم نے جس اُمید پہ وہ بھی نہوا!

ایک ڈالر اور ستاسی سنٹس ——— !

یہ تھی اُن کی پونجی ——— اور تمام عمر کا جمع کیا ہوا سرمایہ جس میں سے ساٹھ سنٹس کے سکے پینیز میں تھے۔ یہ وہ پینیز تھیں جو بازار سے سودا سلف لاتے وقت۔ کنجڑے۔ قصاب۔ شیر فروش۔ اور پنساری سے نہایت کنجوسی سے لڑجھگڑ کر پس انداز کی گئی تھیں۔ ڈیلا اِس رقم کو صبح سے تین مرتبہ گن چکی تھی۔ مگر بے سود کیونکہ وہ جتنی تھی اُتنی ہی رہی۔

اور کل بڑا دن تھا ——— !

غریب ڈیلا مایوس سی ہوگئی۔ کیونکہ ایسے مواقع پر اِتنی قلیل رقم انسان کو تسلی دینے کے عوض طرح طرح کے مایوس کُن خیالات میں غرق کر دیا کرتی ہے، اِس سے شاید آپ اتفاق نہ کریں۔ مگر اُن سے دریافت فرمایئے جو اس حالت کے شکار ہیں یا ہو چکے ہوں۔ اُس کی آنکھوں میں آنسوؤں کا سیلاب اُمنڈ آیا۔ اور ایک آرام کرسی پر دراز ہوگئی۔ اُس کے دماغ میں طرح طرح کے خیالات جمع ہو رہے تھے۔ اور آخر اِس تمام ماحول سے جو نتیجہ اُس نے اخذ کیا۔ وہ یہ تھا کہ انسانی زندگی صرف سسکیوں۔ آنسوؤں۔ نااُمیدی و ناکامی۔ پریشانی اور روحی کرب کا نام ہے۔ یا پھر اُن قہقہوں کا جو دُنیا اُس کی سی ہستی کی حالت پر اکثر لگایا کرتی ہے۔ "یہ کیوں"؟ اُس نے اپنے آپ سے سوال کیا ——— "کیا صرف ہمیں دُنیا میں اِن تکالیف کو برداشت کرنے کے لئے پیدا ہوئے ہیں جو ہماری ارواح پر چرکے لگا رہی ہوں۔

آج کا دن ——— اور کل یوم مسرت آنے والا ہے۔ کرسمس، جب تمام خوش ہوں گے اور ایک دوسرے کو تحائف پیش کریں گے۔ محب و محبوب ایک دوسرے کے لئے جان سے عزیز تحائف لائیں گے!

حالات غریب ڈیلا کو غربت اور افلاس کی طرف لئے جا رہے تھے، بیچاری ایک آٹھ ڈالر کے کرایہ کے مکان میں جوں توں کر کے غربت کے دن کاٹ رہی تھی۔ مکان کا اندرونی نقشہ گو ایک امریکن بھکاری کی کُٹیا کا ماحول تو پیش نہ کرتا تھا۔ تاہم بیرونی حالت ضرور اِس پر شاہد تھی کہ یہ ضرور ایک بھکاری کا مکان ہے۔ نیچے محراب میں ایک لیٹر بکس لگا ہوا تھا، جس میں شاید ہی آج تک کوئی خط موصول ہوا ہو، یا ایک بجلی کی گھنٹی کا بٹن، جسے کبھی اِنسانی ہاتھ نے چھُونے کی کبھی جسارت نہیں کی تھی۔ اُن کے ساتھ ہی ایک چھوٹا سا تختہ "مسٹر جیمز ڈھنگام ینگ" کے نام سے مزین تھا۔

ڈھنگام کا لفظ جب اُس کا مالک اچھی حالت میں تھا، کافی عزت کا حامل رہا تھا۔ مگر جب سے جیمز کی آمدنی بیس ڈالر فی ہفتہ رہ گئی تھی۔ یہ کچھ غیر موزوں سا معلوم دینے لگا تھا۔ دونوں میاں بیوی نے بھی ایک دو مرتبہ اِس کو محسوس کیا کہ ڈھنگام کی بجائے صرف ڈی کا حرف اب زیادہ بہتر اور موزوں ہوگا۔ مگر گھر کے دھندے بکھیڑے میں اِتنا وقت کہاں کہ وہ اپنے ارادہ کو تکمیل دے سکتے۔ جیمز جب گھر آتا تو اُس کی رفیقۂ حیات ڈیلا اُسے صرف جم کے نام سے پکارتی ——— اور یہ تھا بھی ایک موزوں اور پیارا نام ——— !

ڈیلا کچھ دیر تو یونہی پڑی رہی۔ مگر فوراً کسی خیال کے زیر اثر کرسی سے اُٹھی۔ آنسوؤں کو دامن سے پونچھ اپنے رُخساروں پر غازہ لگانے لگی۔

اور اس سے فارغ ہو کر کھڑکی کے پاس جا کھڑی ہوئی۔ غیر شعوری طور پر اس نے اپنی نظریں کھڑکی میں سے دور سفید احاطے میں سفید باڑ پر ایک سفید بلی پر جما دیں۔ "کل کرسمس ہے، اور جم کے لئے تحفہ لانے کے لئے اُس کے پاس صرف ایک ڈالر اور ستاسی سینٹس ہیں؟" اُس کے دماغ میں ابھی تک ایسے خیالات چکّر لگا رہے تھے۔ بیچاری دیر سے اسی دن کے لئے نہایت کنجوسی سے کام لیتے ہوئے رقم جمع کر رہی تھی ــــــ مگر آج اُسے اپنے حصولِ مقصد میں کامیابی نظر نہ آئی تھی۔

اور پھر آپ ہی اندازہ لگائیے۔ بیس ڈالر فی ہفتہ آمدنی سے بنتا بھی کیا ہے۔ اور امریکہ ایسے ملک میں۔ ڈیلا کے اندازہ سے اخراجات تجاوز کر چکے تھے۔ اور ہمیشہ ایسی حالت میں یونہی ہوا کرتا ہے۔ شاید اسی وجہ سے بے چاری اتنی قلیل رقم پس انداز کر سکی۔ رقم جس سے جم کے لئے کوئی تحفہ خریدا جا سکے۔ آہ۔ اس کا جم ــــ! پیشتر ہر روز گھنٹوں وہ اسی تحفہ کے متعلق سوچا کرتی تھی کہ کونسا تحفہ جم کو پسند آئے گا، اور اُس کی ہستی کے شایانِ شان ہوگا۔ مگر ــــــ؟

مکان کی کھڑکیوں کے درمیان ایک ایسا آئینہ لگا ہوا تھا، جو شاید آپ نے بھی آٹھ ڈالر کرایہ کے مکانات میں ملاحظہ کیا ہو۔ اِسمیں صرف ایک پتلا دُبلا اِنسان ہی اپنا عکس دیکھ سکتا ہے۔ ڈیلا چونکہ دُبلی تھی اس لئے اُسے کوئی دقت محسوس نہ ہوئی۔ دوسرے لمحے مُڑتے ہوئے وہ آئینہ کے سامنے تھی۔ اُس کی آنکھوں میں حسبِ معمول وہی نُور اور چمک تھی۔ مگر چہرے کا رنگ صرف بیس سیکنڈ کے عرصہ میں زرد ہو چکا تھا، تاہم اُس نے اپنی زلفوں کو جلد جلد کھولتے ہوئے نیچے ڈال دیا۔

اُن دونوں کا سرمایۂ حیات صرف دو اشیا تھیں۔ ایک جم کی طلائی گھڑی جو اُس کے باپ دادا کی ملکیت رہی تھی، اور دوسرے ڈیلا کی سنہری زلفیں۔ اور اِن پر اُنھیں انتہائی فخر حاصل تھا۔ یہاں تک کہ اگر اس فلیٹ میں ملکۂ سبا بھی سکونت پذیر ہوتی تو ڈیلا تب بھی ہر روز حسبِ معمول اپنی دراز اور سنہری زُلفوں سے پانی کے آبدار قطرات جھٹرنے کے لئے اُنھیں اپنی کھڑکی میں سے نیچے لٹکاتی، اور اگر شاہِ سلیمانؑ بھی اپنے تمام خزائن کے ساتھ اُن پر وہاں محافظ ہوتا تو جم ہر جگہ ٹھہرتے ہوئے اپنی گھڑی ضرور اپنی جیب سے نکال کر وقت دیکھتا کہ وہ جل بُھن کر رہ جائے۔

ڈیلا اُسی طرح اپنی زلفیں بکھیرے آئینہ کے بالمقابل کھڑی رہی۔ اُن کی چمک ایک آبشار کا منظر پیش کر رہی تھی، اور وہ اتنی دراز تھیں کہ اُس کے ٹخنوں تک پہنچتے ہوئے بجائے خود لباس کا کام دے سکتی تھیں۔ ایک مرتبہ اور اُس نے اُنھیں جنبش دی۔ اور آئینہ میں دیکھنے لگی، ایک یا دو منٹ کے بعد اُس کی بڑی بڑی نیلی آنکھوں سے آبدار قطرات ٹپ ٹپ قالین پر گرنے لگے! اسی طرح جلد جلد اپنے پُرانے جیکٹ اور بھورے ہیٹ میں ملبوس ہو کر عجیب طور پر بل کھاتے ہوئے آنکھوں میں بے پناہ نُور لئے۔ دروازہ سے گزر کر، سیڑھیاں عبور کرتے ہوئے، وہ نیچے بازار میں گامزن ہو گئی۔

جہاں پہنچ کر اُس نے دم لیا وہاں "میڈم سوفرونی۔ ہر قسم کے بالوں کا سامان" کا بورڈ لگ رہا تھا۔ ڈیلا ایک ہی سانس میں بالائی منزل پر جا پہنچی۔ اور سانس کو قابو میں کرتے ہوئے بلا توقف اُس نے دراز قد اور انتہا سفید رنگ کی مالکہ سے استفسار کر دیا "کیا آپ میری زلفیں خرید کریں گی ــــــ؟"

"ہاں میں یہی بیوپار کرتی ہوں" میڈم نے مذبذب لہجہ میں کہا اور زلفوں کو اپنے ہاتھ میں لیکر قیمت کا اندازہ لگانے لگی۔

"اچھا جلدی کیجئے، لائیے دام" ڈیلا مسرت سے چلا اُٹھی۔

اور وہ ــــــ

اور دوسرے دو گھنٹے سرعت سے گزر گئے۔ پرانی باتیں فراموش کر دی گئیں۔ اب وہ اسٹورز میں جم کے لئے تحفہ خریدنے میں مشغول گھوم رہی تھی۔

آخر اُسے ایک تحفہ مل ہی گیا، جو درحقیقت اُس کے خیال میں صرف جم کے لئے تیار کیا گیا تھا۔ دوسرے اسٹوروں میں کوئی اُس کا ثانی نہ تھا۔ کیونکہ تحفہ کی تلاش میں ایک ایک کو باہر نکلوا کر دیکھتی رہی تھی۔ یہ پلاٹینم کی ایک زنجیر تھی گھڑی کے لئے۔ جو بہت سادہ، خوبصورت اور دلکش دکھائی دیتی تھی۔ اُس کی دلفریبی میں نقش و نگار کو دخل نہ تھا، بلکہ سادگی اور اصلیت کو ــــــ جیسا کہ تمام اشیا کے حُسن کا معیار ہونا چاہیئے۔ پھر گھڑی کے لئے وہ تھی بھی بیحد موزوں۔

اور جب اُس نے اُسے دیکھا تو اُسے یقین واثق ہوگیا کہ جِم کے لئے صرف یہی تحفہ ہو سکتا ہے۔ کیونکہ ـــــ سادگی اور اصلیت دونوں ہر دو کی خصوصیت تھی۔ قیمت اکیس ڈالر وصول کی گئی۔ یعنی ڈیلا ستاسی پینس بچاتے ہوئے فوراً گھر لوٹ آئی۔ "اب جم کو کسی سوسائٹی میں بھی وقت دیکھنے میں شرم محسوس نہ ہوگی۔ کیونکہ زنجیر گھڑی کی مانند شاندار ہے" اُس نے خیال کیا: "جیسے کہ پیشتر وہ چرم کے تسمے کو دیکھ کر بعض اوقات خشمگین ہو جایا کرتا ہے"۔

گھر میں قدم دھرتے ہی ڈیلا کی تمام خوشی اور مسرت ایک کرب آمیز غم میں تبدیل ہوگئی۔ جنگلے کو عبور کرتے ہوئے اُس نے گیس روشن کیا، اور پھر اپنے ننھے ننھے گنگھرالے بالوں کو سنوارنے میں مشغول ہوگئی چالیس منٹ کے بعد اُس کا سر ننھے ننھے گھنگروں سے ایک آوارہ سکول کے لڑکے کی طرح آراستہ ہوگیا۔ کچھ دیر بغور وہ اُسے آئینہ میں ملاحظہ کرتی رہی۔

"جم کہیں مجھے مار ہی نہ ڈالے۔ پیٹنے ہی نہ لگے" اُس نے خوف کے زیرِ اثر بڑبڑاتے ہوئے کہا: "جونہی کہ اُس کی نظر مجھ پر پڑے گی۔ وہ یہی کہے گا کہ میں ساحلِ سمندر کی رقاصہ اور گانے والی لڑکیوں کی مانند معلوم ہوتی ہوں ـــــ اوہ میرے خدا۔ مگر میں کیا کر سکتی تھی۔ آہ۔ ایک ڈالر اور ستاسی سینٹس سے ہوتا بھی کیا ہے۔۔؟"

سات بجے کافی تیار کی گئی۔ اور فرائنگ پان گوشت بھوننے کے لئے گرم کر دیا گیا۔ جم کبھی دیر سے نہ آتا تھا۔ اِس لئے وہ زنجیر کو ہتھیلی میں دبائے اُس دروازہ کے قریب میز کے پاس جا بیٹھی، جہاں سے معمولاً وہ داخل ہوا کرتا تھا۔ جب اُس نے جم کے قدموں کی چاپ پہلے زینہ پر سنی تو اُس کا رنگ فق ہوگیا۔ اُس کی عادت تھی کہ وہ روز مرّہ کی معمولی باتوں کے لئے بھی دُعا کرتی تھی۔ اس لئے اب بھی مُنہ ہی مُنہ میں بڑبڑانے لگی: "اے میرے پروردگار، جم مجھے اس حالت میں بھی حسین ہی سمجھے۔"

دروازہ کھلا۔ اور جم نے اندر داخل ہوتے ہوئے اُسے دوبارہ بند کر دیا۔ اُس کے چہرے سے تھکن اور سنجیدگی ٹپک رہی تھی، ـــــ غریب ـــــ بے کس ابھی بائیس سال کی عُمر تھی۔ مگر ازدواجی بوجھ نے اُسے بُری طرح کمزور کر دیا تھا ـــــ اُس کا اوورکوٹ بوسیدہ ہو چکا تھا، اور پھر ایسی سردی میں ایک جوڑا دستانوں تک کا اُسے میسّر نہ تھا۔ دروازہ بند کرتے ہوئے وہ یوں خاموش کھڑا ہوگیا۔ جیسے ایک شکاری کُتّا اپنے شکار پر۔ نظریں ڈیلا پر گڑی ہوئی تھیں۔ اُن میں کچھ ایسا راز پنہاں تھا کہ ڈیلا اُسے پڑھنے میں کامیاب نہ ہو سکی۔ اور گھبرا سی گئی۔ نہ تو اُن میں غصہ تھا نہ حیرانی و سراسیمگی۔ نہ خوف و ہراس، اور نہ وہ کچھ جس کا اُسے ڈر تھا۔ بلکہ وہ ایک خاص بناوٹ سے اُسے متواتر گھورے جا رہا تھا۔

ڈیلا میز پر سے ہٹ کر اُس کے قریب چلی گئی۔

"جم۔ پیارے جم" اُس نے کھُل کر بات کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا: "میری طرف یوں مت دیکھو۔ میں نے اپنے بال صرف اس لئے فروخت کر دیئے ہیں کہ میں یہ برداشت نہ کر سکتی تھی کہ تمھیں کرسمس پر بھی کوئی تحفہ نہ دوں۔ یہ تو پھر جلد ہی بڑھ آئیں گے۔ چلو غصہ کو جانے دو۔ اوہوں، کہتے کہتے وہ بچوں کی مانند ہنس دی" مجبوراً بال کٹوانے پڑے۔ مگر میرے بال تو فوراً بڑھ آئیں گے۔ اچھا کرسمس مبارک ہو۔ بولو ـــــ بولو نہ جم۔ دیکھو ہمیں خوش ہونا چاہیئے۔ یہ شام تو سراپا مسرت ہے۔ تمھیں کیا معلوم میں تمہارے لئے کتنا نفیس تحفہ لائی ہوں"۔

"تو تم نے اپنے بال کٹوا دیئے!" جم نے بمشکل استفسار کیا۔ جیسے ابتک وہ اِس امر سے لاعلم تھا۔ باوجود اتنی دماغی جدوجہد کے۔

"ہاں کٹوا دیئے، اور فروخت کر دیئے" ڈیلا نے ذرا افسردہ لہجہ میں جواب دیا: "تو کیا ـــــ کیا تم بغیر بالوں کے مجھے محبت نہیں کرتے۔ میں تو بغیر زُلفوں کے بھی وہی ہوں۔ ہوں نہ جم ـــــ؟"

اِس پر جم نے کمرے میں ایک معنی خیز نظر دوڑائی۔

"تمہارا مطلب ہے کہ تمہاری زُلفیں ختم ہو چکی ہیں" جم نے دوبارہ خالی نظروں سے تکتے ہوئے استفسار کیا۔

"اس کے متعلق زیادہ پریشان نہ ہو" ڈیلا محبت بھرے لہجے میں بولی: "کیونکہ اب وہ جا چکیں، دیکھو یہ شام کرسمس ہے۔ بس مجھے پیار کرو۔ میری جان ـــــ! کیونکہ یہ سب کچھ صرف تمہاری محبت کے

لئے کیا گیا۔ اگر میرے سر گنجی کے بال بھی ہوتے تو تب بھی میں اُنھیں تمہاری محبت کی نظر کرنے پر گریز نہ کرتی۔ میری محبت کا اندازہ کوئی نہیں لگا سکتا۔"

"گوشت پلیٹ میں ڈالوں جم؟"

جم اپنے پریشان کن خیالات سے یک لخت چونک پڑا۔ اور ڈیلا کو اپنے سینہ سے لگا لیا ——— آہ ——— !بیس ڈالر فی ہفتہ ہوں یا بیس لاکھ ——— محبت میں کیا فرق آسکتا ہے؟ ایک ماہر ریاضی یا عالم آپ کو اس کا غلط جواب دے گا۔ مگر محب و محبوب سے دریافت کرو ——— ماجی حضرت عیسیٰؑ کے لئے عجیب و غریب تحائف لائے۔ مگر اُن کی تہ میں یہ قربانی اور ایثار کہاں تھا ——— ؟

جم نے اپنے کوٹ کی جیب سے ایک پیکٹ نکال کر میز پر پھینک دیا۔ "میرے متعلق غلط فہمی میں مبتلا ہونے کی ضرورت نہیں ڈیل" جم نے کہا "میرا خیال نہیں کہ بال کٹوانا۔ حجامت یا شامپو میری اُس محبت میں حائل ہو سکیں جو مجھے تم سے ہے۔ ہاں اگر تم اُس پیکٹ کو کھول کر دیکھو" اُس نے اُنگلی سے پیکٹ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بسلسلۂ کلام جاری رکھا "تو تمھیں یہ بھی معلوم ہو جائے گا کہ میں تم سے پہلے گھر سے باہر کیوں گیا۔؟"

ڈیلا کی مرمریں انگلیوں نے جلد جلد پیکٹ کے دھاگے اور کاغذ کو علیحدہ کر دیا۔ اُس کے لبوں سے مسرت کی ایک چیخ نکل گئی ——— مگر افسوس! اُس کی نازک آنکھیں آنسوؤں سے تر ہو گئیں۔ کیونکہ تحائف صرف بالوں کے کلپ تھے۔ جن کے لئے ڈیلا جب وہ شہر کے درمیانی حصہ میں مکین تھے،

تب سے اتنی بے قرار رہی تھی، اتنے خوبصورت کلپ! خالص کچھوے کی ہڈی کے بنے ہوئے! نگینوں سے مزین۔ بالکل بالوں کے رنگ سے ملتے ہوئے۔

کلپ قیمتی تھے۔ یہ وہ جانتی تھی ——— اور پھر آج تک اُنھیں حاصل کرنے کے لئے وہ کتنی آرزومند رہی تھی۔ اس کی بھی اُسے خبر تھی۔ مگر اب! ——— اب جب وہ مہیا ہوئے تو وہ زلفیں نہ رہیں۔

اس پر بھی اُس نے اُنھیں اپنے سینہ سے لگا لیا۔ شاید کہ وہ اُس کے محب کی طرف سے تحفہ تھے، اور بمشکل لبوں پر تبسم لاتے ہوئے۔ جبکہ آنکھیں آنسوؤں سے لبریز تھیں، بولی "میرے بال فوراً بڑھ آئیں گے جم" اور پھر بلی کی مانند کو دتے ہوئے چلا کر بولی۔ "اوہ! اوہ ——— !

شاید اس لئے کہ جم نے ابھی تک اُس کا تحفہ نہ دیکھا تھا۔ اُس نے فوراً اپنی کھلی ہتھیلی اُس کے سامنے بڑھا دی۔ سُرخ اور گداز ہتھیلی پر سادہ زنجیر اپنی اصلی آب و تاب سے چمک رہی تھی۔

"جم کیا یہ خوبصورت ہے ——— ؟ میں نے اِسے ڈھونڈنے میں تمام شہر چھان مارا ——— دیکھا کتنا نفیس تحفہ لائی میں ——— ہے نا نفیس، اب تو تم دن میں کئی بار وقت دیکھا کرو گے۔ اچھا لاؤ مجھے اپنی گھڑی دو، دیکھیں اس پر کیسی سجتی ہے ——— ؟"

جم اُس کے حکم کی پروا نہ کرتے ہوئے، ایک صوفے پر دراز ہو گیا، اور اپنا ہاتھ سر کے پیچھے ڈالتے ہوئے مُسکرانے لگا۔

"ڈل" اُس نے محبت بھرے لہجہ میں کہا "ان تحائف کو ایک طرف دھر دو، اور اسی طرح پڑا رہنے دو کیونکہ اُن کے استعمال کے لئے یہ وقت موزوں نہیں ——— میں نے بھی اپنی گھڑی رقم حاصل کرنے لئے کہ تمہارے لئے کلپ خرید سکوں، فروخت کر دی ——— اچھا اب گوشت لاؤ۔

پیچ چشمک سے آئینہ گر گیا
ہر فارِ زلف ان کے گل تر سے گر گیا
چہرے کا مرے گریۂ شب سے پتہ نہیں
بیتی ہوئی رات کی سحر سے گر گیا

انجم

ہر پھول کو صہبا کا جام پلانے والے
ہر ذرے میں حسن بنانے والے
سمجھا آب زنان طاجار گل ہے پیشوا
اے عالم آب و گل میں لانے والے

انجم

نہ بینی کہ از قسمتِ کار زیست — سراپا چمن میشود خار زیست

اگسٹس کہتا ہے کارگاہِ عالم کا نظام اسی طرح قائم ہے کہ ایک کار فرما ہو، ایک کارساز آقا سے خدمتگذاری نہیں ہوسکتی۔ خدمتگذاری سے آقائی کے فرائض انجام نہیں پاسکتے۔ اس لئے اپنی اپنی اہلیت کے مطابق دونوں میں تقسیمِ کار ہوجانی چاہیئے۔ اس باہمی تقسیمِ کار سے خار زارِ زیست سراپا گلزار بن جائے گا۔

یہ اصول اس میں شک نہیں کہ اگر عدل و انصاف اور صداقت و دیانت کے ساتھ کارفرما ہو تو اسلامی تعلیم کے خلاف نہیں۔ لیکن دورِ موجودہ میں اس کی اصلی صورت مسخ ہوگئی اور یہ محض ایک سرابِ فریب بن کر رہ گیا۔ اس لئے علامہ اقبال اس کی تردید کرتے ہوئے فرماتے ہیں،

بدوشِ زمیں بار سرمایہ دار — ندارد گرشت از خور و خواب کار
جہاں راست بہروزی از دستِ مزد — ندانی کہ ایں ہیچکار است و دزد
بے جرم او پوزش آوردۂ — بایں عقل و دانش فسوں خوردۂ

اس میں کیا شک ہے کہ جو سرمایہ دار محض عیش و عشرت اور خواب و خور میں محو ہو اُس کا سامان وجود دوشِ زمیں پر بار ہے (اسلام بھی اس کا حامی نہیں) مزدور کو ہیچکارہ و دزد کی طرح نہیں سمجھنا چاہیئے، بلکہ یہ حقیقت ہے کہ مزدور کی محنت و دستکاری سے دنیا کی بہت کچھ فلاح و بہبود وابستہ ہے۔ ان اشعار میں اقبال نے مزدور کی عظمت و اہمیت کو بڑی خوبی سے سرمایہ دار کے ذہن نشین کرنے کی کوشش کی ہے اور یہی اسلامی تعلیم کا حاصل ہے۔ ایک اور موقع پر ظریفانہ انداز میں کہتے ہیں۔

سنا ہے میں نے کل یہ گفتگو تھی کارخانے میں
پرانے جھونپڑوں میں ہے ٹھکانہ دستکاروں کا
مگر سرکار نے کیا خوب کونسل ہال بنوایا
کوئی اس شہر میں تکیہ نہ تھا سرمایہ داروں کا

کونسل ہال جس کا کام منصفانہ قانون وضع کرنا ہے اُس پر سرمایہ داروں کے غلبہ و تسلط کے اندیشہ سے علامہ اقبال نے کس بلیغ انداز میں ممبران کونسل کو متنبہ کیا ہے۔ وہ اس کے روادار نہیں کہ کونسل ہال میں سرمایہ داروں کے مقابلہ میں جائز حقوق و مطالبات کے متعلق مزدوروں کی صدائے احتجاج نقار خانہ میں طوطی کی آواز کا مصداق ہوجائے۔

اس کے بعد علامہ مرحوم نے دورِ حاضرہ کے سرمایہ دار و مزدور کی حالت کا ایک دوسرے سے موازنہ کیا ہے۔ فرماتے ہیں۔

غوغائے کارخانۂ آہنگری زمن — گلبانگِ ارغنونِ کلیسا از آنِ تو
نخلے کہ شہ خراج بروے می نہد زمن — باغِ بہشت و سدرہ و طوبیٰ از آنِ تو
تلخابہ کہ درد سر آرد از آنِ من — صہبائے پاک آدم و حوا از آنِ تو
مرغابی و تدرو و کبوتر از آنِ من — ظلِ ہما و شہپرِ عنقا از آنِ تو
ایں خاک و آنچہ در شکمِ او از آنِ من — وز خاک تا بعرشِ معلیٰ از آنِ تو

چونکہ اس تفاوتِ بیجا کا اسلام روادار نہیں اور عہدِ حاضر میں یہ رنگِ تفاوت پوری طرح نمایاں ہے۔ اسی لئے علامہ اقبال مرحوم اگسٹس کو للکارتے ہیں کہ تو عقل و دانش کے باوجود مبتلائے فریب ہو کر سرمایہ دار کے حرم کی عذر خواہی کر رہا ہے۔ کیا تیرے اصولِ تقسیمِ کار کے پردہ میں ایسے روح فرسا نتائج پیدا ہوتے ہوئے بھی خار زارِ زیست سراپا گلزار بن سکتا ہے؟

اسی تفاوتِ مذمومہ کو ایک دوسری نظم "نوائے مزدور" میں بڑے پُردرد انداز سے ظاہر فرماتے ہیں۔

زمزدِ بندۂ کرپاس پوشِ محنت کش — نصیبِ خواجۂ ناکردہ کار رختِ حریر
زخوں فشانیٔ من لعلِ خاتمِ والی — زاشکِ کودکِ من گوہرِ ستامِ امیر
زخونِ من چو زلو فربہی کلیسا را — بزورِ بازوئے من دستِ سلطنت ہمہ گیر

خرابہ اشکِ گلستاں زگریۂ سحرم
شبابِ لالہ و گل از طراوتِ جگرم

اسلام اس تفاوت کا ہرگز روادار نہیں کہ جس مزدور طبقہ کی محنت کشی، عرق ریزی سے خواجۂ ناکردہ کار کو رختِ حریر امراء و حکام کو لعلِ خاتم اور دُرۃ التاج نصیب ہوں جس کی خوں فشانی سے کلیسا کو فربہی اور جس کے زورِ بازو سے سلطنتوں کو ہمہ گیری میسر ہو۔ جس کے گریۂ سحری اور طراوتِ جگر سے ویرانے اشکِ گلستاں ہوجائیں اور لالہ و گل کا شباب قائم ہو وہ ٹاٹ اور پلاس کی گدڑی میں ملبوس رہے، اور اُس کے بچے بھوک سے بلکتے رہیں۔ اس لئے علامہ اقبال کا دل اُس کی حالتِ زار پر خون کے آنسو روتا ہے۔ اور وہ سرمایہ داری کے اس عروج اور مزدوروں کے اس زوال پر فریاد کرتے ہیں۔

جب وہ مزدوروں کی رگِ احساس نشترِ بیداری سے متحرک کردیتے ہیں اور اُنھیں نظر آتا ہے کہ مزدوروں میں جذبۂ احساس و ترقی پیدا ہوگیا ہے۔ اور وہ اپنی حق تلفی اور سرمایہ دار کی سخت گیری پر صدائے احتجاج بلند کرنے لگا ہے۔ آزادی خواہ جماعتیں اُس کی حمایت پر مائل ہوچکی ہیں۔ اور حکومتوں میں انقلاب ذہنیت کی ایک لہر دوڑ رہی ہے۔ اُس کی امیدوں کا چراغ روشن ہوتا نظر آتا ہے تو علامہ اقبال پورے جوش و طاقت کے ساتھ جدوجہد سے سرمایہ داروں کو عدل و انصاف پر مجبور کردو۔ فرماتے ہیں ؎

بیا کہ تازہ نوا می تراود از رگِ ساز ۔۔۔ مئے کہ شیشہ گدازد بہ ساغر اندازیم

مغان و دیرِ مغاں را نظام تازہ دہیم ۔۔۔ بنائے میکدہ ہائے کہن براندازیم

ز رہزنانِ چمن انتقام لالہ کشیم ۔۔۔ بہ بزمِ غنچہ و گل طرح دیگر اندازیم

بطوفِ شمع چو پروانہ زیستن تاکے

ز خویش از ہمہ بیگانہ زیستن تاکے

پھر تمام حامیانِ عدل و انصاف کو پیغامِ عام دیتے ہیں کہ ؎

کہ مزدور خوش دل کند کار بیش

اُٹھو مری دنیا کے غریبوں کو جگا دو ۔۔۔ کاخِ امرا کے در و دیوار ہلا دو

گرماؤ غلاموں کا لہو سوزِ یقیں سے ۔۔۔ کنجشک فرومایہ کو شاہیں سے لڑا دو

جس کھیت سے دہقاں کو میسر نہ ہو روزی ۔۔۔ اُس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلا دو

لیکن یہ سمجھنا صحیح نہیں کہ اقبال مطلقاً سرمایہ داری کے خلاف ہیں۔ اور مزدور کے ہر طرح حامی، یہ رائے اُن کے متعلق قطعاً غیر منصفانہ ہوگی۔ اُن کے اس تمام کلام کا ماحصل یہ ہے کہ سرمایہ دار اُن مزدوروں کے ساتھ انصاف و ہمدردی سے سلوک کریں۔ جن کی ہمتِ بازو سے اُن کی سرمایہ داری قائم ہے وہ چاہتے ہیں کہ مزدوروں اور سرمایہ داروں میں انسانی مساوات قائم ہو، اُنھیں عزت و ذلت کی خلیج حائل نہ رہے جس طرح ایک خاندان کے چھوٹے بڑے، بالادست اور زیر دست افراد ہوتے اور اُن کے وقار و لحاظ کی مختلف حیثیت ہوتی ہے۔ لیکن پھر بھی ایک خاندان کے افراد کی حیثیت سے ان کا درجہ مساوی سمجھا جاتا ہے۔ اور اُن کے حقوق کی نگہداشت اور حفاظت کو نظر انداز نہیں کیا جاتا۔ اسی طرح سرمایہ دار و مزدور کے تعلقات قائم ہوں، اور اسی میں اُن کا فائدہ بھی۔

مجھے کس سے محبت ہے

مجھے محبت ہے اس تاروں بھری رات سے، جس کی خنک روشنی میں حسین پریاں محوِ خواب ہوتی ہیں۔۔۔۔ مجھے محبت ہے ان نیم خواب آلودہ تاروں سے جو نیند کے خمار سے صبح کے آخری لمحوں میں آنکھیں جھپکانے لگتے ہیں۔۔۔۔ مجھے محبت ہے اور بے انتہا محبت ــ اس شیریں اور پُرکیف منظر سے جو صرف صبح صادق کے دھندلکے ہی میں نظر آسکتا ہے۔۔۔۔ جب پُرسکون، بدمست اور مدہوش رات آخری سانسیں لیتی ہوتی ہے۔۔۔۔ جب تارے آسمان کے لامحدود خلا میں گم ہونا شروع ہوتے ہیں، اور جب تاریکی سفیدی سے دست و گریبان نظر آتی ہے۔۔۔۔ میں محبت کرنے لگتا ہوں مجھکو محبت ہوجاتی ہے۔۔۔۔ ان بیشمار قدرت کی رنگینیوں اور لطافتوں سے۔۔۔ ان بیشمار غیر معمولی چیزوں سے۔۔۔۔ جن کا یقینِ وجود خواب سے زیادہ ناپائدار اور غیر مسلسل ہوتا ہے۔۔۔۔ میں محبت کرتا ہوں انسان سے انسان کی فرضی محبت سے زیادہ۔۔۔۔ پُرسکون، پُرکیف اور لطیف! ـــــ محبت وہ محبت، جس میں ناکامی کی سیاہ اور بھیانک شکل دیکھنا نہیں پڑتی۔۔۔۔ محبت وہ محبت جس سے ساری زندگی جی نہیں بھرتا۔۔۔۔ محبت وہ محبت جو پہاڑوں کی طرح مضبوط پائدار اور قانونِ قدرت سے زیادہ اٹل ہے، محبت وہ محبت جس میں شیطانی جذبات کے لئے ذرہ بھر گنجائش نہیں۔ محبت وہ محبت جس میں ہجر و وصل بے معنی الفاظ ہیں۔

ہاں تو میں محبت کرتا ہوں، ہاں! محبت کرتا ہوں۔ بلند بہت بلند۔ جو کرۂ خاکی کے ناپاک لوگوں کی پست محبت سے بہت بلند ہے، مجھے محبت ہے اور دنیا کی ہر اُس چیز سے جو فطرت سے قریب ہے۔ مجھے گلاب کی نرم سُرخ پتیوں سے اس لئے محبت ہے کہ اُس میں قدرت کا گاڑھا اور سُرخ خون بھرا ہوا ہے۔ محبت ہے، مجھے محبت ہے اور ضرور ہے، لیکن فطرت سے، فطرت کی اِن گوناگوں رنگینیوں سے، آپ کو معلوم ہوا کہ مجھے کس سے محبت ہے؟

سجاد حیدر (افریدی)

اقبال اور مزدور

علامہ ڈاکٹر سید نجم الدین احمد جعفری

سرمایہ دار اور مزدور کے الفاظ ممکن ہے تخیلاتِ حالیہ کی پیداوار ہوں۔ لیکن اس حقیقت سے انکار ناممکن ہے کہ امیر و غریب کا طبقہ تمدن کے ہر دور میں رہا ہے اور رہے گا۔ مرورِ زمانہ سے ان دونوں طبقوں میں ایک کی تن آسانی اور دوسرے کی جانفشانی، یا ایک کی بالادستی اور دوسرے کی زیردستی سے تفریق و امتیاز کی خلیج حائل اور وسیع ہوتی چلی گئی۔ اس خرابی کو دنیا کے ریفارمرس اور مصلحین کی نظر نے محسوس تو کیا اور دنیا کو اس طرف توجہ بھی دلائی۔ مگر اس کا ثبوت دستیاب نہیں ہوا کہ اسلام سے پہلے کسی مذہب یا تمدن نے عملی نقطۂ نظر سے اس پر غور کیا ہو۔

اسلام نے اس ضروری الاصلاح امر کو ابتدا ہی میں محسوس کر لیا، اور اس کو عملی جامہ پہنانے کی سعی جمیل بر روئے کار آنے لگی۔ یہ تو ناممکن تھا اور ہے کہ تمام دنیا کی اقتصادی حالت ایک سطح پر کر دی جائے۔ لیکن تفریق و تفاوت باہمی کی اس وسیع خلیج کو بہت کچھ تنگ کیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ مال و اسباب کے متعلق اسلام نے جتنے اصول وضع کئے اُن میں دو پہلو خاص طور پر ملحوظ رکھے۔

(۱) ایک تو یہ کہ تمول یا سرمایہ دار اپنے تمول و سرمایہ سے صرف خود ہی متمتع اور جالبِ منفعت نہ ہو بلکہ قوم کے ضعیف الحال اور پسماندہ و غریب افراد کو بھی نفع پہنچائے۔ وہ اپنی سرمایہ داری کے نشہ میں بے سرمایہ اور زبوں حال بنی نوع انسان کو نہ بھول جائے، ان کو ذلت کی نظر سے نہ دیکھے (۲) دوسرے یہ کہ اپنی طاقتِ سرمایہ سے ناجائز فائدہ اُٹھا کر کمزوروں کو نہ دبایا جائے۔ اُن سے مفت یا زبردستی اور طاقت سے زیادہ کام نہ لے، مناسب حق المحنت اور واجبی اجرت میں کمی نہ کرے۔ ایک مسلم سرمایہ دار کو اسلام ان اصول کی تعلیم دیتا، اور ان کی پابندی کو لازم ٹھیراتا ہے۔

قرآن کریم کی بہت سی آیتوں میں والدین، اعزہ و اقارب، اولاد و افراد خاندان کے ساتھ ساتھ ہمسایوں۔ غلاموں۔ محلہ داروں۔ شہر والوں، غریبوں، محتاجوں۔ بیماروں۔ مسافروں۔ قیدیوں۔ یتیموں اور بیواؤں کی پوری امداد و خبرگیری کی تاکید فرمائی گئی ہے، ہم مشتے نمونہ از خروارے چند مختصر آیات پیش کریں گے۔

ارشاد ہوتا ہے۔

(۱) وآتوھم من مال اللہ الذی اتاکم۔ خدا کے دئے ہوئے مال میں سے ان کو بھی دو۔

(۲) انفقوا من طیبٰت ما کسبتم۔ اپنی حاصل کی ہوئی عمدہ چیزیں (راہِ خدا میں) خرچ کیا کرو۔

(۳) ما انفقتم من خیرٍ فللوالدین والاقربین والیتمٰی والمساکین وابن السبیل الخ۔ "والدین واقربین۔ یتامیٰ و مساکین اور مسافرین وغیرہ پر اپنا مال خرچ کرو۔"

دنیوی معیشت کے مدارج کا اختلاف فطری اور نیچرل ہے۔ اسی لئے اسلام نے بھی اس کو برقرار رکھا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے۔

نحن قسمنا بینھم معیشتھم فی الحیٰوۃ الدنیا ورفعنا بعضھم فوق بعضٍ درجٰت لیتخذ بعضھم بعضاً سخریا۔

بنی نوع انسان کی زندگی کی روزی کو ہم نے تقسیم کیا ہے۔ ہم ہی نے بعض کو بعض پر رفعت و فوقیت کے مدارج دے رکھے ہیں۔ تاکہ ایک دوسرے

سے کام لیتا رہے الخ"

یہ آیت بہت لمبی ہے۔ اسمیں سب انسانوں کی حالت یکساں نہ کرنے کی حکمت بیان کرنے کے بعد متمول اور سرمایہ داروں کو نصیحت کی گئی ہے کہ دنیوی ساز و سامان، زندگی کی چند روزہ کامرانی ہے۔ آخرت کی بہبودی و فلاح خدا سے ڈرنے والوں ہی کے لئے ہے۔ اس لئے اگر تم کو بلند مدارج حاصل ہو جائیں تو مغرور و ظالم نہ ہو جانا اور اپنے سے نیچے درجے کے لوگوں کو حقیر و کمزور یا اپنا دست نگر سمجھکر اُن پر زیادتی یا حق تلفی نہ کرنا۔

ایک دوسری جگہ غیر سرمایہ دار کو سرمایہ داری کی ہوس اور متمول پر حسد کرنے سے ممانعت فرما کر آئندہ بتایا گیا ہے کہ یہ تفریق مدارج پیدائشی نہیں ہیں۔ تم بھی اپنی سعی بازو سے تمول حاصل کر سکتے ہو۔ حسرت و افسوس اور حسد کی ضرورت نہیں۔ اس تفاوت مدارج سے اُس کی آزمائش مقصود ہے کہ عطیات قدرت کے ذریعے امورِ خیر میں کون مسابقت کرتا ہے۔

اسلام نے مال و دولت کو اعزاز و اکرام کی بنیاد نہیں قرار دیا۔ معیارِ فضیلت صرف تقویٰ ہے غرض امدادِ باہمی اور مساوات کے وہی اصول فطری ثابت ہوتے ہیں جو اسلام نے بتائے ہیں۔ ان اصول کا پابند سرمایہ دار یقیناً ایک رحمت ہے نہ موجبِ زحمت۔ افسوس ہے کہ اس موقعہ پر تفصیل کی گنجائش نہیں۔ اس لئے مختصراً مزدور اور اُس کی مزدوری کے متعلق چند آیات کے ارشادات سن لیجئے۔

لا تاکلوا اموالکم بینکم بالباطل۔ تم آپس میں ایک دوسرے کا مال ناجائز طور پر نہ کھاؤ۔

اذا اکتالوا علی الناس یستوفون و اذا کالوھم او وزنوھم یخسرون

"ناپ تول میں (یا مبادلہ و معاوضہ میں) کمی کرنے والوں کے لئے بڑی خرابی ہے، تم کو ہرگز ایسا نہ کرنا چاہیئے، کہ خود تو پورا پورا لو اور دوسروں کو کم دو۔"

ان دونوں آیتوں میں ضمناً مزدور کا حق محنت و اجرت بھی شامل ہے۔ اگر مزدور کی اجرت نہ دی گئی یا کم دی گئی تو گویا اُس کا مال ناجائز طریق پر کھایا گیا۔ اسی طرح ناپ تول کے اصول میں معاوضہ بالمثل کی تمام فروعات آجاتی ہیں۔ مزدور سے محنت تو پوری لینا اور معاوضہ کم دینا خسرانِ مبین کا موجب ہے۔

پیغمبر اسلام علیہ السلام نے فرمایا ہے کہ مزدور کو اُس کی پوری مزدوری اُس کا پسینہ خشک ہونے سے پہلے پہلے دیدو۔

اسی اسلامی تعلیم کی بنا پر اسلام کے قرونِ اولیٰ میں شاید ہی کوئی مثال مل سکے گی کہ ایک شخص اپنے جسم و دماغ سے کام لئے بغیر محض دوسروں کی محنت و مزدوری سے فائدہ اُٹھا کر امیر بن گیا ہو۔ آپ اسلام کے اس دور کی تاریخ پڑھ جائیے۔ جو لوگ آپ کو متمول یا سرمایہ دار نظر آئیں گے اُن کی تاریخ ترقی و تمول جسمانی و دماغی محنتوں، دست و پا کی عملی حرکتوں اور صحیح و جائز جد و جہد کے کارناموں سے معمور نظر آئے گی۔ البتہ مرورِ ایام اور مسلمانوں پر غیر اقوام کے اختلاط سے بعد کے لوگوں نے اس چیز کو ایک حد تک نظر انداز کر دیا۔ یہاں تک کہ دنیا کی سرمایہ داری و مزدوری نے وہ رنگ اختیار کر لیا جو موجودہ دور میں ہر جگہ پر مسلط ہے۔

علامہ اقبال نے اس غیر اسلامی سرمایہ داری کی تباہ کاریوں کو پوری طرح محسوس کیا اور اُس کی اصلاح و مخالفت کا بیڑا اُٹھایا۔ وہ ایسے سرمایہ داروں سے سخت بیزار ہیں، جو مزدوروں کے جائز و واجب حقوق کی نگہداشت اور اُن کے مصائب و مشکلات کی پروا نہیں کرتے، چنانچہ وہ اُن کے مخالف اور مزدوروں کے حامی ہو گئے۔ اُنھوں نے اندازہ کیا کہ سرمایہ پرستوں کی سخت گیری و غیر منصفی کی اصلاح اُس وقت تک نہیں ہو سکتی جب تک افسردہ دل اور خائف و پست خیال مزدوروں میں اپنی ذلت و مصیبت کا احساس کامل پیدا نہ ہوگا چنانچہ اُنھوں نے ایک درد بھری آواز بلند کی اور طبقہ مزدور کی بیداری کے لئے پہلا صور پھونکا۔

شاخِ آہو پر رہی صدیوں تلک تیری برات　مکر کی چالوں سے بازی لے گیا سرمایہ دار
اہلِ دولت جیسے دیتے ہیں غریبوں کو زکات　دستِ دولت آفریں کو مزد یوں ملتی رہی
انتہائے سادگی سے کھا گیا مزدور مات　ایک تجھ کو کھا گیا سرمایہ دارِ حیلہ گر

ان اشعار میں حیلہ گر اور چالاک سرمایہ دار کے غرور و نخوت کا نقشہ کھینچکر، مزدور کے خوابیدہ احساس کو بیدار کیا ہے۔ ایک موقعہ پر السٹس کے نظریۂ تقسیم کار کو ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں۔

نیاید ز محمود کارِ ایاز　یکے کار فرما یکے کارساز

عالمگیر جنگ اور کانگریس کی پالیسی

آل انڈیا کانگریس کمیٹی - الہ آباد

کانگریس نے اپنے سالانہ اجلاس منعقدہ مدراس ۱۹۲۷ء میں ملک کی توجہ کو سامراجی جنگ کے خطرہ کی طرف مبذول کیا تھا، اور اس جنگ میں ہندوستان کے سامراجی اغراض کا آلۂ کار بنائے جانے کے امکان کا بھی اظہار کر دیا تھا، اور ہندوستانی قوم کے اس حق کا بھی اعلان کر دیا تھا جس کی رو سے وہ اس طرح کی جنگ میں اپنی مرضی اور خواہش کے مطابق شرکت کرنے سے انکار کر سکتے ہیں۔ تب سے جنگ کا یہ خطرہ بڑھتا گیا، اور آج اس نے تشویشناک صورت اختیار کر لی ہے۔ فاشسٹ ڈکٹیٹرشپ کے قیام، حبشہ پر اٹلی کے حملہ، شمالی چین و منگولیا میں جاپانیوں کے روز افزوں حملے، بڑے بڑے سامراجی طاقتوں کے تصادم اور مناقشوں اور اسلحہ جات کا شدت اور بدحواسی کے ساتھ بڑھایا جانا، ان سب کی وجہ سے جنگ کا خطرہ روز بروز بڑھتا ہی جاتا ہے، اور آج دنیا پر جنگ کے خوفناک بادل منڈلا رہے ہیں، ایسی جنگ میں یہ ظاہر ہے کہ ہندوستان کو کھینچنے اور اُس کے وسائل کو استعمال کرنے کی پوری کوشش ہوگی۔ جس کا خاص مقصد برٹش سامراج کو فائدے پہنچانا اور ہندوستان کو زک دینا ہے۔ اس لئے کانگریس اپنے پرانے ارادہ کا پھر سے اعلان کرتی ہے، اور اس خطرہ کی طرف سے ہندوستانی قوم کو متنبہ کرتی ہے اور سامراجی جنگ میں ہندوستان کی شرکت کی پُرزور مخالفت کرتی ہے۔ (تجویز انڈین نیشنل کانگریس اجلاس لکھنؤ ۱۹۳۶ء)

کانگریس نے ماضی میں بار بار سامراجی جنگ کے روز افزوں خطرے کی طرف توجہ دلائی ہے، اور اس امر کا اعلان کیا ہے کہ ہندوستان کو اس جنگ سے کوئی تعلق نہیں ہوگا۔ کانگریس کے گزشتہ اجلاس کے بعد سے یہ خطرہ بہت بڑھ گیا ہے۔ آج فاشسٹوں کے حملے اور غارتگری تیزی سے بڑھتی جاتی ہے، فاشسٹ طاقتیں یورپ اور ساری دنیا پر چھا جانے کی فکر میں اور سیاسی اور سماجی آزادی کی تخریب کے ارادہ سے آپسی اتحاد اور جماعت بندی میں مصروف ہیں۔ کانگریس کو اس عالمگیر خطرہ کا سامنا کرنے کی ضرورت کا پورا پورا احساس ہے۔ اور وہ محسوس کرتی ہے کہ اس کا سامنا دنیا کی ترقی پسند قوموں اور عوام کے تعاون اور خاص کر کے ان قوموں اور عوام کے تعاون سے ہی ہو سکتا ہے جو سامراج اور فاشیزم کے محکوم ہیں۔ عالمگیر جنگ کے وقوع پذیر ہونے کی صورت میں اس بات کا شدید خطرہ ہے کہ ہندوستان کے باشندے اور اُس کے قدرتی وسائل معاش برٹانی سامراج کے مفاد میں استعمال کئے جائیں گے۔ اس لئے کانگریس کے لئے ضروری ہے کہ وہ ملک کو اس خطرہ کی جانب سے متنبہ کر دے اور سامراجی جنگ کے لئے ہندوستان اور اس کے باشندوں کے استحصال کو روکنے کے لئے مناسب کارروائی کرے۔ ایسی جنگ کے لئے کسی طرح کے قرضہ کی حمایت میں ووٹ نہیں دینا چاہئے۔ نہ ہی جنگی مالیات اور جنگی چندوں کی حمایت میں ووٹ دینا چاہئے۔ نہ ہی جنگی مالیات اور جنگی چندوں کی حمایت کی جائے، اور ہر طرح کی جنگی تیاریوں کو روکا جائے۔

(تجویز انڈین نیشنل کانگریس اجلاس فیض پور دسمبر ۱۹۳۶ء)

آج دنیا پر جو تباہ کن جنگ منڈلا رہی ہے اُس کے پیش نظر کانگریس

ہندوستانی قوم کے خارجی تعلقات اور جنگ کے متعلق اپنی پالیسی کا پھر سے اعلان کر دینا ضروری سمجھتی ہے۔

ہندوستان کے باشندے اپنے ہمسایوں اور دوسرے تمام ملکوں کے ساتھ امن اور دوستی کی زندگی بسر کرنا چاہتے ہیں اور اس مقصد کے لئے وہ جنگ و جدال کے تمام اسباب کو دور کرنا چاہتے ہیں۔ وہ ایک قوم کی حیثیت میں اپنی آزادی اور گلو خلاصی کے لئے جد و جہد کرتے ہوئے دوسروں کی آزادی کی قدر کرتے ہیں، اور بین الاقوامی اتحاد اور تعاون کی بنیاد پر اپنی قوت کی تعمیر کرنا چاہتے ہیں۔ ایسا اتحاد ایک عالمگیر نظام پر ہی قائم ہو سکتا ہے جس میں آزاد ہندوستان بھی خوشی خوشی شرکت کرے گا۔ اور تخفیف اسلحہ اور اجتماعی تحفظ کی حمایت کرے گا۔ لیکن اس عالمگیر تعاون اور اتحاد کا حاصل ہونا اس وقت تک ناممکن ہے، جب تک بین الاقوامی کشمکش کی جڑ باقی اور قائم ہے۔ جب تک ایک قوم دوسرے کے سر پر سوار ہے اور سامراج کا دور دورہ ہے۔ اس لئے دنیا میں ایک دیرپا اور مضبوط بنیاد پر امن قائم رکھنے کے لئے سامراج اور ایک قوم کا دوسری قوم کے ہاتھوں استحصال کا خاتمہ ضروری ہے۔

گزشتہ چند برسوں سے بین الاقوامی تعلقات میں ایک قابلِ افسوس کشیدگی تیزی سے پیدا ہو رہی ہے، فاشسٹی لوٹ اور غارتگری تیزی سے بڑھتی جا رہی ہے۔ بین الاقوامی ذمہ داریوں کی شرمناک مخالفت فاشسٹ طاقتوں کی خاص پالیسی ہو گئی ہے۔ برطانیہ اپنی مبہم اور پیچ در پیچ خارجی پالیسی کے ذریعے جرمنی کی اور اسپین اور مشرق بعید میں فاشسٹ طاقتوں وجود حمایت کرتی رہی ہے۔ اس لئے بین الاقوامی صورتِ حال کے بگڑانے اور ہونے کی ذمہ داری اسی کے سر ہے۔ اس پالیسی کے ذریعے وہ آج بھی نازی جرمنی سے سمجھوتہ کرنا چاہتی ہے۔ اور باغی اسپین سے ایک نزدیکی رشتہ قائم کر چکی ہے۔ وہ عالمگیر سامراجی جنگ کے دھاروں کو طاقت پہنچا رہی ہے۔

ہندوستان اس طرح کی سامراجی جنگ کا شرکت دار نہیں ہو سکتا۔ اور نہ وہ اس جنگ میں برطانوی سامراج کے مفاد کی خاطر اپنے باشندوں اور دوسرے وسائل کو ہی استعمال ہونے دے گا اور نہ ہندوستان اپنے عوام کی واضح رضامندی کے بغیر جنگ میں شریک ہو سکتا ہے۔ اس لئے کانگریس ان تمام جنگی تیاریوں کو جو اس وقت ہندوستان میں ہو رہی ہیں بالکل ہی ناپسند کرتا ہے۔ وہ ناپسند کرتا ہے ان جنگی مظاہروں اور ہوائی حملوں سے حفاظت کی ان تدبیروں کو بھی جن کے ذریعے اس سرزمین میں آنے والی جنگ کی فضا پیدا کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ اگر ہندوستان کو اس جنگ میں کھینچنے کی کوشش کی گئی تو اس حالت میں اس کا پوری قوت سے مقابلہ کیا جائے گا۔



ہر گام پہ تیرہ لیوں دام میں لاتا نہ ہمیں
ہستی کے فریب میں پھنساتا نہ ہمیں
ہم اپنے زوال پر ہیں کہ جو ہوتا مقدور
شیطان زمیں کھا کے ستاتا نہ ہمیں

جوش

ہر دل ہے چراغِ زیرِ داماں افسوس
ہر سانس ہے ایک طرفہ طوفاں افسوس
رونا بھی ہے جرم، تجھ پہ ہنسنا بھی ستم
افسوس ہے اے غریب انساں افسوس

جوش

آزادی کا علمبردار

عبدالواسع عصری چکمگلوری

افرادِ ڈراما

نوّاب ۔ ایک ریاست کا فرمانروا	شہنشاہ ۔ شاہِ اٹلی
آفتاب ۔ فرمانروا کا بیٹا	موسیو ۔ وزیر
بہجت ۔ آفتاب کا دوست	جولیو ۔ شہنشاہ کی بیٹی
قمر ۔ گورنر	شاہِ ترکی
گلشن ۔ قمر کا مقربِ خاص	ترکی کمانڈر　وغیرہ

ایکٹ اوّل

منظر اوّل

عالی شان محل کی خوابگاہ، نوّاب صاحب پلنگ پر بیٹھے ہوئے اپنے وزیرِ اعظم اور چند مصاحبوں سے ملکی معاملات پر گفتگو کر رہے ہیں۔ شہزادۂ آفتاب کے آنے کی خبر پاکر نوّاب صاحب اپنے مصاحبوں اور وزیرِ اعظم کو تخلیہ کا حکم دیتے ہیں اور وہ باہر چلے جاتے ہیں۔ آفتاب آکر آداب بجالاتا ہے، اور دست بستہ داہنے جانب کھڑا ہوجاتا ہے۔

آفتاب۔ قبلۂ عالم! نصیب دشمناں آج کیا بات ہے جس نے حضور کے آرام میں خلل ڈالا ہے، اور چہرۂ انور پر اُداسی چھائی ہوئی ہے!

نوّاب۔ کیا کہوں عزیز فرزند! ملکی معاملات بالکل ٹیڑھے ہوتے جارہے ہیں۔ اِن گتھیوں کا سُلجھانا گویا جوئے شیر لانا ہے۔

آفتاب۔ ابّا جان! حضور کی دانائی اور دُور اندیشی خاص و عام میں مشہور ہے، اور عزیز رعایا کیا ہندو کیا مسلمان ہمیشہ پروانے کی طرح جاں نثار ہے تو پھر خوف کس بات کا ہے؟

نواب۔ بیٹا آفتاب! یہی تو خدا کی سب سے بڑی دین ہے، جو کسی ہمعصر راجہ یا نواب کو میسر نہیں، اور ہمیشہ سے میری یہی کوشش ہے کہ اپنی رعایا کو خوش رکھوں، میں اُن کے مفاد کی خاطر سب کچھ لٹانے کے لئے تیار ہوجاتا ہوں۔ آفتاب! یاد رکھو۔ بادشاہ اپنی رعایا کا شفیق استاد ہوتا ہے۔ وہ چمن کا مالی ہے جو چھوٹے بڑے پودے کو آبِ باراں کی طرح برابر پانی دیتا اور سورج کی روشنی کی طرح دن رات اُن کی پرورش میں مشغول رہتا ہے۔ مگر آہ ——— !

آفتاب۔ کیوں ابّا جان! یہ آہ کیسی؟

نواب۔ آج کل راعی اور رعایا کے تعلقات کشیدہ ہو رہے ہیں ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہوتے جارہے ہیں۔ غریب رعایا کا خون جونکوں کی طرح چوسا جارہا ہے۔

آفتاب۔ اس کی وجہ۔

نواب۔ صرف اپنے ملک و مال کا فائدہ مدّنظر ہے، محکوم قوم کے بچوّں کی ذہنیت درسی کتابوں کے ذریعے سے بگاڑ دی گئی ہے اور بگاڑی جارہی ہے۔ دونوں قوموں ہندوؤں اور مسلمانوں میں باہمی ہمدردی کے بجائے تعصب پیدا کردیا گیا ہے۔ اتفاق کے عوض اُن کے سادہ دلوں میں نفاق کا بیج بو دیا گیا ہے، آزادی جو روحِ رواں ہے سلب کردی گئی ہے؟ یہی وجہ ہے کہ آج کل کی نئی پود آزاد نہیں بلکہ نہایت تنگ خیال ہے۔

آفتاب ۔ ابا جان! آپ یہ کیا فرما رہے ہیں۔ میں نے کئی جلسوں میں سرکاری حاکموں کو آزادی کا سبق اور اتفاق کا درس دیتے ہوئے سنا ہے۔

نواب ۔ ہاں بیٹا! یہ سب سیاسی چالیں ہیں۔ آج کل دل اور زبان ایک نہیں ہیں۔

آفتاب ۔ یہ سیاست کیا بلا ہے؟

نواب ۔ اس زمانے کی سیاست، غلام قوم کے لئے شامت و مصیبت ہے۔ ہمارے ملکی بھائی اس میں پھنس کر اپنی قوتیں برباد کر رہے اور خود تباہ ہو رہے ہیں۔ بد اخلاقی کا دوسرا نام سیاست ہے۔ یہ انسان کی فطرت کو بدل دیتی ہے۔ انسان اس میں اُلجھ کر شطرنج کا مہرہ بن جاتا ہے۔ ہمدردی، ایثار، رحم کے بجائے غداری، ظلم، بزدلی اور خود غرضی پیدا کر دیتی ہے، اسی سیاست کے سبب انسان بظاہر انسان تو ہیں لیکن ان کی زندگیاں کتوں سے بھی بدتر ہو گئی ہیں۔ اور ہر جماعت دوسری جماعت کو پھاڑ کھانے کے لئے تیار ہے۔

آفتاب ۔ واقعی ابا جان! ہمارے دل خلوص اور محبت سے لبریز نہیں رہے ہیں۔ ہم ایک دوسرے کی تکلیف پر نہیں کڑھتے ہیں۔ یہ کیا ہو گیا ہے، خاقان کے سادہ دل لوگوں کی طبیعتوں کی یہ کیا کایا پلٹ ہو گئی ہے؟

نواب ۔ یہی چیز تو میری ہلاکت کا باعث ہو رہی ہے۔ ہم کو اور ہمارے وطنی بھائیوں کو دانے ڈال ڈال کر بھولے کبوتروں کی طرح سیاست کے خوبصورت جال میں پھانسا جا رہا ہے۔ دیکھنے اور کہنے کو تو ہم نواب ہیں۔ لیکن حقیقت میں اُن غلاموں سے بھی بدتر ہیں جن کی گردنیں ہمیشہ سولی کے نیچے رہی ہیں۔

آفتاب ۔ ابا جان! کیا آپ اس قدر بے بس و ناچار ہیں؟

نواب ۔ ہم اُس بے کس چڑیا کی طرح ہیں جس کے دل میں ہزاروں حسرتیں اور ارمان ہیں۔ لیکن صیاد کے دام میں پھنس کر آزاد فضاؤں پر ایک نگاہِ حسرت ڈالتی ہوئی پھڑک کر مر جاتی ہے۔

آفتاب ۔ آخر آپ ایک ملک کے مالک ہیں نا ابا جان!

نواب ۔ ہاں ہیں۔ کہنے کے لئے۔ دکھلانے کے لئے۔ نام و نمود کے لئے۔ مگر ہم پر جو پابندیاں عاید ہیں، ہماری نقل و حرکت پر جو نگرانی مسلط ہے، اُس نے ہماری زندگیوں کو گوشۂ قبر میں سونے والوں سے کہیں بڑھ کر مجبور بنا دیا ہے۔ جن کو اپنے لاکھوں جرموں کی پاداش کے باوجود شفاعت کی توقع ہے۔

آفتاب ۔ اگر ایسا ہے تو ابا جان! ایسی نوابی پر تین حرف۔ یہ تو بتائیے کیا آپ نے خراج ادا کر دیا؟

نواب ۔ آفتاب! سالانہ خراج تو برابر بھیجا جا رہا ہے۔ لیکن اس دفعہ کچھ اور ہی گُل کھلنے والا ہے۔

آفتاب ۔ وہ کیا ابا جان!

نواب ۔ (فکرمند ہو کر) کیا بتاؤں۔

آفتاب ۔ ابا جان! آپ کے روئے مبارک پر فکر کی گھٹائیں کیوں چھا رہی ہیں۔ میرا جی بیچین ہوتا ہے۔

نواب ۔ بیٹا! میں آنے والی آفت سے متاثر ہو رہا ہوں۔

آفتاب ۔ وہ کونسی آفت ہے؟

نواب ۔ خراج دگنا کیا جا رہا ہے۔ اور اپنے ملک کے بڑے مرتبے والے حاکموں کی جگہ پر ——

آفتاب ۔ ابا جان! یہ بھی کوئی آفت ہے؟

نواب ۔ میرے معصوم بچے! تم نے ابھی دیکھا ہی کیا ہے! ان باتوں کو تم ابھی نہیں سمجھ سکتے۔

آفتاب ۔ آنے والی اصلاحات سے آپ کا کیا بگڑتا ہے؟

نواب ۔ بگڑتا تو کچھ نہیں۔ مگر امن میں ضرور خلل ہوگا۔ قوموں میں حسد و عناد کی آگ بھڑکے گی۔ آج جو تھوڑا بہت اتفاق تم ان دونوں قوموں میں دیکھتے ہو وہ رفوچکر ہو جائے گا، اور نوبت یہاں تک کہ ہم نالائق سمجھے جائیں گے اور ہماری برطرفی کا اعلان ہوگا۔

آفتاب ۔ اس کا تدارک؟

نواب ۔ رشوت اور خوشامد!

آفتاب ۔ یہ تو بیوقوں کی غذا ہے، کیا آپ نے سالِ رواں کا خراج بھیج دیا؟

نواب ۔ آج کل میں بھیجنے والا ہوں۔

آفتاب ۔ تو کیا مجھے اس کے لے جانے کا فخر حاصل ہوگا؟

نواب ۔ ابھی تم نادان ہو۔

آفتاب۔ اگر اِن معاملات میں میری شرکت بھی ہو تو غالبًا ——

نواب۔ اُلّو بنائے جاؤ گے۔ یہاں تو معلّم الملکوت بھی اپنے کان پکڑتا ہے۔

آفتاب۔ کچھ بھی ہو۔ میری یہ دلی آرزو پوری کر دی جائے۔

نواب۔ مگر

آفتاب۔ مگر کیا۔

نواب۔ تمہاری آرزو تو پوری ہو گی۔ لیکن اُس شرط پر کہ جو حضورؑ فرمائیں اُس کے جواب میں "بجا" "ارشاد" "یقینًا" کہتے رہنا۔ اس کے سوا اور کچھ بھی زبان سے نہ نکلے۔

آفتاب۔ ابا جان! کیا یہ میری آرزو پوری ہونے کا طریقہ ہے۔

نواب۔ تمہاری آرزوؤں کا نہیں بلکہ تمہاری خاندانی وجاہت کا۔

آفتاب۔ کیا سکندر کی ملک گیری کا راز، جمشید کے پیالے کا ناز، فرعون کے تکبّر کی علّت، نمرود کی خدائی کا سبب، انھیں تین لفظوں میں مضمر تھا؟

نواب۔ بزرگوں کا قول ہے کہ "حاکم کے پیچھے، فرصندار کے آگے" اسی پر تم بھی عمل کرو۔ معاملات کو ہنسی میں نہ ٹالو۔

آفتاب۔ یہ حاکم خدائی فوجدار تھوڑی ہیں کہ اُن کی ہر بات پر مہر تصدیق ثبت کروں (باپ کو بگڑتے ہوئے دیکھکر) خیر مجھے تو آپ کے حکم کی تعمیل کرنی ہے۔ میں وہی کروں گا جو ارشاد ہو گا۔

نواب۔ اسی میں سعادت ہے۔ اچھا جاؤ۔ کل خراج لے کر میر منشی کے ہمراہ روانہ ہو جاؤ (آفتاب جاتا ہے)

منظر دوسرا

ایک بڑا اور وسیع کمرہ جس میں قیمتی ایرانی قالین بچھے ہیں، دیوار کے قریب مخملی گاؤ تکیے لگائے گئے ہیں۔ درمیان میں ایک حقہ رکھا ہے آفتاب اور اُس کا دوست بہجت آمنے سامنے بیٹھے بات چیت کر رہے ہیں۔

آفتاب۔ کیوں بہجت تم بھی ہمارے ساتھ چلو گے

بہجت۔ کہاں سرکار؟

آفتاب۔ شہنشاہ کے دربار میں

بہجت۔ حضور! میں نے ابھی اپنی عمر کی بیس ہی بہاریں دیکھی ہیں۔ جوانی کے مزے تو خیر، دنیا کا لطف بھی نہیں اُٹھایا۔ نمازی کا دعویٰ کر کے غدّاری کا ٹیکا ماتھے پر نہیں لگایا۔ ناصح بن کر مکر کا جال لوگوں پر نہیں پھینکا۔ جنتی حور کا فریب دے کر ارضی حور کو بغل میں نہیں دبایا ہے۔ حضور! اگر مجھ سے یہ پوچھا جائے کہ تو کیا لایا؟ تو بتاؤں گا کیا؟ لوگ آج کل مرتے ہیں تو گناہوں کے ساتھ۔ مگر اُن کے گناہوں کا اثر پڑتا ہے اُن پر جو اِن مرنے والوں کو قبروں میں پہنچاتے ہیں۔ آپ مجھے لے جا کر عذاب میں ——

آفتاب۔ ارے بھئی! میں نے تو تم کو ملک کے فرمانرواکے دربار میں جانے کے لئے کہا تھا۔ مگر تم نے معرفت کے چودہ طبق روشن کر دیئے۔

بہجت۔ میرا مطلب بھی تو یہی تھا حضور! یہاں تو وہی رسائی حاصل کرتا ہے، جس نے برائیوں کے کالج سے جعلسازی کا سرٹیفکٹ، مکاری کی ڈگری۔ غدّاری کی پگڑی، اور خود غرضی کی سند حاصل کی ہے۔

آفتاب۔ خوب یہ ایک ہی کہی۔ مگر تم بھی میرے ہمراہ ہوئے تو لطف آجائے گا۔

بہجت۔ آقا! آپ کو لطف آجائے گا، سعادت نصیب ہو گی۔ اور میری حماقت ظاہر ہو گی۔

آفتاب۔ یعنی؟

بہجت۔ دربانی!

آفتاب۔ دربانی بھی تو ایک سعادت ہے۔

بہجت۔ حضرت! میں بندر تو ہوں نہیں کہ اشاروں پر ناچتا پھروں۔

آفتاب۔ دیکھو بہجت! اتنی آزادی بھی اچھی نہیں۔

بہجت۔ حضور! جس کا خدا آزاد جس کا مذہب آزاد، اور کائنات کا ہر ذرہ آزاد ہو تو پھر اس میں بسنے والا آزاد کہلائے تو اس میں کیا شک ہو سکتا ہے۔

آفتاب۔ جانتے بھی ہو آج کل کی اصطلاح میں آزاد کس کو کہتے ہیں۔

بہجت۔ اتنی دور کی تعلیم ماں باپ نے نہیں دی۔ بتایئے تو حضورؑ۔ اس کا کیا مطلب ہے؟

آفتاب۔ آزاد اُسے کہتے ہیں لُچے کو، سمجھے بھی کہ نہیں؟

بہجت۔ بیشک، اور جو آزادی کی تعلیم دے کر غلامی کی زنجیر

میں جکڑے، وہ ــــــ

آفتاب۔ بہجت اِن فلسفے کی اُلجھی ہوئی باتوں کو چھوڑو۔ بہ ہر حال تمھیں میری دوستی کا حق ادا کرنا پڑے گا۔

بہجت۔ وہ کس طرح حضور؟

آفتاب۔ میرے ہمراہ چل کر۔

بہجت۔ کیا موت سے پہلے؟

آفتاب۔ پھر وہی مذاق۔

بہجت۔ شہنشاہ کے دربار میں مجھے لے چلنے سے پہلے ذرا اور سوچ لیجئے حضور! کیونکہ بہجت کا ساتھ بدبختی کی علامت ہے۔

آفتاب۔ میں نے ایک بار نہیں کئی بار سوچ لیا ہے۔

بہجت۔ اگر کچھ واقعہ یا حادثہ ــــــ خدا نہ کرے پیش آئے تو

آفتاب۔ ہم بھگتیں گے۔ تم پر کوئی ذمہ داری نہیں۔

بہجت۔ یہ تو وہی ہوا ع ہم تو ڈوبے ہیں صنم تم کو بھی لے ڈوبیں گے۔

آفتاب۔ جو کچھ ہو ــــــ مگر ہم (ملازم آتا ہے) کون ہے۔

ملازم۔ جی سرکار ــــــ غلام

آفتاب۔ کیا چاہتے ہو۔

ملازم۔ اچھا چلو، ابھی آتے ہیں۔ (ملازم چلا جاتا ہے) (بہجت سے) اچھا تو سامانِ سفر تیار کرلو۔ کل آفتاب کی کرن پھوٹنے سے پہلے ہم یہاں سے روانہ ہوجائیں گے۔ سمجھتے ہو

بہجت۔ جی ہاں! سمجھ گیا ــــــ دونوں چلے جاتے ہیں۔

تیسرا منظر

صحرا کالق ودق میدان، ایک چھوٹا سا چشمہ، اور چشمہ کے قریب دو چار پڑاؤ ہیں، دو آدمی پڑاؤ کے پاس بیٹھے ہوئے حقہ پی رہے ہیں۔ سامنے دو گھوڑے بندھے ہیں، ان میں ایک آقا اور ایک غلام معلوم ہوتا ہے۔

قمر۔ (غلام سے) کیوں گلشن خیر تو ہے؟

گلشن۔ آقا! بڑی منحوس گھڑی ہے نہ کوئی شکار ملتا ہے اور نہ کوئی قافلہ گزرتا ہے۔

قمر۔ کیا تم نے جستجو کی؟

گلشن۔ ذرہ ذرہ چھان مارا۔

قمر۔ مگر

گلشن۔ سراب ہی سراب ہے، یہاں تو چڑیا بھی پر نہیں مارتی۔

قمر۔ کیوں نہ ہو، جہاں پناہ کی حکومت ہے نا ــــــ

گلشن۔ آقا! کیا اتنی سختی، ایسا خوف، اور یہ ہُو کا عالم۔

قمر۔ بھولے گلشن! اس ملک والے بچھو کے ڈنک ہیں، تمھیں معلوم ہے سانپ سے کھیلنا، کتوں کو آزادی دینا کیا ہے؟ اسی سبب سے جہاں پناہ نے اُن کی گردنوں میں طوقِ غلامی ڈالا ہے۔

گلشن۔ بجا فرمایا آقا! لیکن کتے تو وفادار ہوتے ہیں۔

قمر۔ کب تک؟ جب تک اِن کے سامنے جھوٹے کھانے پڑے ہوں۔

گلشن۔ یہ جھوٹے کیا ہیں؟

قمر۔ وفادار گلشن! یہ وہی تو عزت کے تمغے حقیقت میں غلامی کے طوق ہیں۔

گلشن۔ میرے آقا! تو عزت میں ذلت کیسی؟

قمر۔ دلوں کا راز معلوم کرنے کے لئے، اِن ملکیوں کی اندرونی حالت کا پتہ لگانے کے لئے، نااتفاقی کا بیج بو کر حکومت کرنے کے لئے۔

گلشن۔ وہ کیسے؟

قمر۔ تمھیں معلوم نہیں یہ بھولے آدم کی اولاد غلامی کی زنجیر کو فخر سے قبول کرلیتی ہے، اور اپنی ذلت کو اقبال سمجھتی ہے۔ اور اپنے وطنی بھائیوں کے تمام بھیدوں کو، خفیہ سازشوں کو، آقائے عالم کے سامنے ظاہر کردیتی ہے۔ اس وقت ہمیں موقع ہاتھ آتا ہے، اور ہماری حکومت مستحکم ہوجاتی ہے۔ اسی طرح ہم اِن لوگوں کو اُلّو بنا رہے ہیں۔ ورنہ یہ لوگ ہماری اینٹ سے اینٹ بجا دیتے اور ہم بھوکوں مرتے۔

گلشن۔ آقا! یہ تدبیر تو بہت ہی اچھی ہے۔ لیکن رعایا کی بھلائی بھی تو کوئی چیز ہے؟

قمر۔ گلشن کیا کہیں دشمنوں سے بھی نیکی کا برتاؤ ہوسکتا ہے؟ اس زمانے میں ہمدردی کیسی! نیکی کس کا نام ہے؟ پہلے تو اپنا جسم ڈھانکو۔ بعد دوسروں کا خیال کرو۔ یہی بڑی عقلمندی ہے۔

گلشن۔ لیکن انسانی تقاضا تو یہ ہے کہ حکومت محبت کے ساتھ ہو،

قمر۔ ہم کو دیکھو کسی سے ملتے ہیں. تو ہنستے ہوئے ملتے ہیں، تکلیف پر

افسوس کرتے ہیں، مظلوم کی فریاد سنتے ہیں، تشفی اور دلاسا دیتے ہیں۔

گلشن۔ کیا اسی کا نام محبت اور خلوص ہے میرے آقا!

قمر۔ پھر کیا۔

گلشن۔ یہ تو غداری اور ظلم ہے۔ اس کا نام تو منافقت ہے۔

قمر۔ پھر دنیا کیا، اور دنیا کی حکومت کیا ہے؟

گلشن۔ کیا غداری کا دوسرا نام حکومت ہے؟

قمر۔ پھر تم نے اب تک سمجھا کیا تھا؟

گلشن۔ تو کیا حضور! ان سیاہ فاموں کے حق میں مخبر ہیں؟

قمر۔ جبھی تو ہمارا پیٹ بھر رہا ہے۔ ہمارے وطن میں خوشحالی ہے، ارے دیکھو وہ گرد کیسی؟ شاید کوئی آ رہا ہو۔

گلشن۔ (دیکھکر) آقا! کوئی قافلہ آرہا ہے

قمر۔ مگر گھنٹے کی آواز نہیں آتی۔

گلشن۔ قافلہ فاصلے پر ہے۔

قمر۔ اچھا جاؤ۔ اس کا پتہ لگاؤ۔ (گلشن گھوڑے پر جاتا ہے۔ قافلے سے تھوڑی دور پر ٹھہر کر دیکھتا ہے اور آکر قمر سے کہتا ہے)

گلشن۔ (آداب بجا لاکر) میرے آقا! ایک چھوٹا قافلہ ہے۔

قمر۔ میر قافلہ کون ہے؟

گلشن۔ ایک خوبرو نوجوان۔

قمر۔ اس کے ساتھ کتنے آدمی ہیں؟

گلشن۔ کوئی چار

قمر۔ کچھ سپاہی بھی ہیں؟

گلشن۔ سب ملا کر کوئی بیس تیس آدمی ہوں گے۔

قمر۔ شاید یہ خراج کا روپیہ لا رہے ہیں —— کنیزیں بھی ساتھ ہیں یا نہیں۔

گلشن۔ نہیں سرکار، عورت کوئی نہیں معلوم ہوتی۔

قمر۔ گلشن! (سپاہیوں کو بتاکر) تم ان سپاہیوں کے ہمراہ جاؤ اور ان لوگوں کو میرے سامنے حاضر کرو۔

گلشن۔ بہت اچھا آقا۔ (جاتا ہے اور اپنے تمام سپاہیوں کے ساتھ قافلہ کو راستے میں گھیر لیتا ہے۔ آفتاب گھبرا کر پوچھتا ہے۔)

آفتاب۔ آپ کون لوگ ہیں؟

گلشن۔ کیا تم نے اطاعت منظور کر لی۔

آفتاب۔ ہاں! لیکن یہ بتاؤ کہ تم ہو کون؟

گلشن۔ آزاد قومیں غلاموں کے سوال کو کتے کی قے سمجھتی ہیں۔

بہجت۔ (آفتاب سے آگے بڑھکر) حضور! میں نے نہیں کہا تھا کہ مجھے اپنی ہمراہی میں لینا موت کے ساتھ کھیلنا ہے۔ موقع کو دیکھئے اور کوئی حرف زبان پر نہ لائیے۔ چپ چاپ ان جنگلی ڈاکوؤں کے اشاروں پر ناچتے رہیے۔

آفتاب۔ (گلشن سے) بتائیے! اب آپ ہم کو کہاں لے چلیں گے۔

گلشن۔ اُتر جاؤ گھوڑوں پر سے —— (آفتاب کے سارے ساتھی گھوڑوں پر سے اُتر جاتے ہیں۔ گلشن سپاہیوں سے کہتا ہے)

لے چلو ان کو —— (سپاہی ان سب کو قمر کے پاس لے جاتے ہیں۔ قمر کرسی پر بیٹھا ہے، گلشن آتا ہے، اور سپاہیانہ آداب بجا لاکر سامنے کھڑا ہو جاتا ہے)

قمر۔ کیوں گلشن، کیا حال ہے؟

گلشن۔ آقا! قسمت بحال ہے؟

قمر۔ (مسکراتے ہوئے قافلے کے لوگوں کو دیکھکر) کیا یہی صحرائی شیروں کا شکار ہیں؟

گلشن۔ میرے آقا! مال ہے تھوڑا، لیکن مزیدار بہت ہے۔

قمر۔ خوب! (آفتاب سے) کہو اے خوبصورت نوجوان صحرا میں کیسے پہنچے؟ ——

آفتاب۔ آزاد فضاؤں کا لطف اُٹھانے کے لئے۔

قمر۔ صحرا میں آزادی کا لطف! خوب! (ہنستا ہے)

آفتاب۔ مجھے معلوم نہ تھا کہ یہاں گرگ بھی بستے ہیں۔

قمر۔ (اکڑکر) اچھا اب معلوم ہو گیا ہوگا۔

آفتاب۔ جی ہاں

بہجت۔ (موقع کو بگڑتے دیکھکر سامنے آتا اور کہتا ہے) حضور! ہم نواب یار جنگ کے غلام ہیں اور (آفتاب کی طرف اشارہ کرکے) آپ نواب صاحب کے فرزند ارجمند ——

قمر۔ یہاں کیوں آئے۔
بہجت۔ شہنشاہ کے حضور میں ہمیں خراج پہنچانا ہے، وہیں جا رہے ہیں۔
قمر۔ کتنا روپیہ ساتھ ہے؟
آفتاب۔ کوئی تیس لاکھ۔
قمر۔ بس اتنا ہی۔
آفتاب۔ تو کیا قارون کا خزانہ چاہیے۔
قمر۔ میاں! تم جانتے ہو کہ اس وقت کس کے سامنے کھڑے ہو؟
آفتاب۔ ہاں! صحرائی ڈا ——— ڈا ——— (بہجت فوراً حاضر ہوتا ہے)
بہجت۔ معاف فرمائیے حضور! آج کل رعیت بہت تکلیف میں ہے۔ ہم تو صرف ایک مصیبت میں مبتلا ہیں، لیکن ہماری رعایا کئی آفتوں میں گھری ہوئی ہے۔
قمر۔ وہ کونسی مصیبتیں ہیں؟
بہجت۔ حاکموں کا ظلم، بارش کا دھوکا، اربابِ حکومت کی رشوت ستانی، سرکاری ملازموں کی حق ناشناسی۔
قمر۔ نواب کی حکومت اور یہ ظلم!
آفتاب۔ نواب کا نہیں بلکہ اُس کا جو نواب پر حکومت کرتا ہے میٹھی چھُری بن کر ذبح کرتا ہے۔ کاش نواب اور اُن کی رعایا آزاد ہوتی۔
قمر۔ میاں تم بہت مغرور معلوم ہوتے ہو۔ یاد رکھو یہ ترقی کے آثار نہیں۔
آفتاب۔ جناب! معاف فرمائیے۔ مجھے بھیگی بلی بننا نہیں آتا۔ میں اس دنیا میں، اس حاکم کے سایہ میں۔ مرتبے کو۔ خطابوں کو۔ نمائشی عزت و عظمت کو۔ مکاری کا سنہری جال۔ نوابی کو بدکاریوں کا دوزخ، اور آپ کی شیریں بات چیت کو قند آمیز زہر سمجھتا ہوں۔
قمر۔ اگر یہ بات ہے تو تم سمندر میں حباب ہو۔ جو خود ہی شوق سے اُٹھتا ہے اور اپنی زندگی کو ایک لمحے میں ہوا کے تھپیڑے کے حوالے کر دیتا ہے۔
آفتاب۔ شیر کی ایک لمحے کی زندگی گیدڑوں کے سو سال پر بھاری ہے۔
قمر۔ گلشن! سُنی اس بدمعاش کی گفتگو؟
گلشن۔ ہاں حضور بہت مغرور ہے۔
قمر۔ اس کی سزا؟
آفتاب۔ جناب! آخر ہم بھی مرد ہیں۔ دل رکھتے ہیں اور دل میں حوصلہ۔
گلشن۔ (غصّہ سے) شہزادے صاحب! ہوش کی باتیں کیجئے۔
آفتاب۔ گلشن! تمہیں معلوم ہے کہ اکثر غلام بیوقوف ہوتے ہیں اور تمہارا حال بھی ———
گلشن۔ کیا کیا ——— کہے جائیے۔
بہجت۔ (مسکراتے ہوئے) بندر کے ہاتھ میں ڈگڈگی ——— اور کیا۔
گلشن۔ (قمر سے) حضور! ایسی ذلّت!
قمر۔ ہاں ہاں، میں خوب سمجھ رہا ہوں۔ اے نوجوان! مجھے تیری جوانی پر رحم آتا ہے۔ ورنہ ابھی تیری دلیری کا مزہ چکھا دیتا۔
آفتاب۔ قصاب اور رحم!
قمر۔ زبان کو لگام دے بے وقوف، ورنہ ابھی ——— (گلشن سے) کس لو اُس کی مشکیں اور لے چلو دربار میں۔
گلشن اور اُس کے ساتھی مشکیں باندھتے ہیں۔ اور سب کے سب پایۂ تخت کی طرف روانہ ہوتے ہیں۔

دوسرا ایکٹ

پہلا منظر

شہنشاہ روم کا دربار۔ عالی شان قصر میں شاہ روم تخت پر بیٹھا ہے۔ اور اُس کے برابر میں اُس کی بیٹی جولیو۔ قصر شاہی ملکی صنعت سے آراستہ ہے۔ تمام حاضرین دربار اپنے خاص ملکی لباس میں موجود ہیں، ذرا بلندی پر ملکیوں کے لئے الگ الگ نشستیں بنائی گئی ہیں۔ غیر ملکی نمائندوں کے لئے تھوڑے فاصلے پر چھوٹی چھوٹی نشستیں ہیں، قمر داخل ہوتا اور اپنی خاص جگہ پر بیٹھ جاتا ہے۔ شہنشاہ قمر کی طرف دیکھکر کہتا ہے۔
شہنشاہ۔ بول اے مشرق کے نجیب! کیا ہماری حکومت سے تیری وحشت دُور نہیں ہوئی؟
قمر۔ (خوشامدانہ لہجے میں) حضور کے فیض نے ہمارے ملک و قوم میں زندگی کی لہر دوڑا دی ہے۔ رعیت اتنی شاد ہے کہ حضور کو دعائیں دیتی ہے۔ ہر طرف امن اور راحت کی گرم بازاری ہے۔
شہنشاہ۔ اچھا کیا خبر لائے ہو؟

قمر۔ چند سیاسی مجرموں کو حضور میں پیش کرنا چاہتا ہوں۔

شہنشاہ۔ (گھبرا کر) سیاسی مجرم! یہاں لانے کی وجہ؟

قمر۔ یہ رعیت کو بادشاہ سے منحرف اور ملک میں بغاوت کا علم بلند کرتے ہیں۔

شہنشاہ۔ شاباش میرے وفادار غلام شاباش! اچھا ان کو حاضر کرو۔ (قمر گلشن کو اشارہ کرتا ہے، اور گلشن اُن سب کو حاضر کرتا ہے۔ قمر آفتاب کی طرف اشارہ کرکے کہتا ہے) حضور! یہی اس مختصر قافلے کا لیڈر ہے۔

شہنشاہ۔ اُن کی مشکیں کھولدو اور وہاں بٹھاؤ جہاں تمہاری ملکی نشستیں بنی ہیں۔

موسیو۔ (وزیر ملکی) عالیجاہ! غیر ملکی اور وہ بھی غلاموں کی اتنی عزت! شہنشاہ کی شان کے خلاف ہے۔

شہنشاہ۔ تم جانتے ہو کہ اُن کو وہی جگہ دی گئی ہے جو ان کے قابل ہے

موسیو۔ (اٹھکر) آپ کو بیٹھنے کا حکم ہے۔

آفتاب۔ میں اس کے قابل نہیں ہوں۔

موسیو۔ پھر چاہتے کیا ہو۔

آفتاب۔ یہ سوال اُس سے (قمر کو بتا کر) کیا جائے جو آپ کا پروردہ ہے۔

موسیو۔ پھر تم کون ہو؟

آفتاب۔ ایک غریب مسافر (موسیو شہنشاہ کی طرف اور شہنشاہ موسیو کی طرف دیکھتے ہیں۔)

موسیو۔ بتاؤ جہاں پناہ تم پر بہت رحم کھاتے ہیں۔

آفتاب۔ میں اس بے وجہ رحم کا مستحق نہیں ہوں۔

موسیو۔ آخر تمہارا مدعا کیا ہے؟

آفتاب۔ تعجب تو اس بات کا ہے کہ آخر کس گناہ کے سزا میں مجھسے یہ سوالات ہو رہے ہیں۔

موسیو۔ قمر سے معلوم ہوا کہ تم باغی ہو۔

آفتاب۔ کیا یہ دعویٰ صحیح ہے؟

موسیو۔ (قمر سے) کیوں قمر؟

قمر۔ بالکل صحیح۔ اس نوجوان نے حضور کی شان میں گستاخانہ الفاظ کہے۔ اور ــــــــ

شہنشاہ۔ اور کیا ــــــــ

قمر۔ حاکموں کی بے عزتی کی، آئینِ حکومت پر اعتراض کیا، قوانینِ ملکی کو ٹھکرایا اور عوام کے جذبات کو بھڑکایا۔

موسیو۔ (آفتاب سے) سن لیا تم نے؟

آفتاب۔ جھوٹے الفاظ جھوٹوں کے دربار میں رسائی حاصل کرتے ہیں، ملمع سازی سونے کا فریب دیتی ہے۔ ایسے کارخانوں میں کھرے کھوٹے کی تمیز کم ہوتی ہے۔ میرے کان ایسے الفاظ کے متحمل نہیں ہوسکتے۔

قمر۔ عالی جاہ! جس شخص کو چار کروڑ انسانوں کی زندگی اور موت کا مالک بنا دیا گیا ہے۔ اور اُس پر بھروسا کرکے حکومت کی باگ جس کے ہاتھ میں دیدی گئی ہے آج اُس شخص کے الفاظ ایک معمولی شخص کے لئے کیا صحیح نہیں سمجھے جاتے۔ عالی جاہ! کیا میری وفاداری کا یہی صلہ ہے! وہ شخص جس نے اپنے وطن میں آپ کی حکومت کا جھنڈا لہرایا اور وطن کے تمام حالات سے واقف کرایا، دشمنوں سے بچایا، وطن سے غداری کرکے اپنی جان و مال کا حاکم بنایا۔ آج اُس کی یہ عزت، اُف۔

شہنشاہ۔ قمر! مجھے تمہاری کوششوں کا علم ہے۔ تم ہی میری شہنشاہی کا تاج ہو! کہو، کیا چاہتے ہو۔

قمر۔ آقا! کچھ نہیں۔ سانپ کا بچہ وفادار نہیں ہوتا۔ اس کی رسائی ہلاکت کا باعث ہوتی ہے، لہٰذا یا تو اسے قتل کردیا جائے یا زندگی بھر قید میں رکھا جائے۔

شہنشاہ۔ اگر ایسا ہے تو تم ہی اس کی زندگی کی بہار لوٹ سکتے تھے، یہاں لانے کی زحمت کیوں کی۔

قمر۔ میں اپنی وفاداری کا ثبوت پیش کرنا چاہتا تھا اور اس نوجوان کے دل پر شہنشاہ کی عظمت کا سکہ بٹھانا چاہتا تھا۔

جولیو۔ ابا جان! یہ سنہری دھوکا ہے۔ ایک نوجوان کی زندگی کی بہار یوں سستے دام نہیں لُوٹی جاتی۔ آہ! کتنا خوبصورت۔

شہنشاہ۔ تو چاہتی کیا ہے؟

جولیو۔ اس نوجوان کو میرے حوالے کر دیجئے۔ میں اس کی ذمہ دار ہوں۔

شہنشاہ۔ ایک مشرقی، وحشی غلام اور مغرب اس کی حمایت میں۔ بیٹی!

مغرب سے مشرق کو بہت دور کا واسطہ ہے۔ آقا اور غلام ایک جگہ نہیں بیٹھ سکتے، تمہارا یہ سلوک ہماری شرافت اور تہذیب پر بدنما دھبا ہے۔ اپنی ضد سے باز آؤ، تمہارا باپ اور تمہاری ہر آرزو کو پورا کرنے کے لئے تیار ہے۔

جولیو۔ ابا جان! مغرب کی تہذیب کا دعویٰ، اخلاق و علم پر ناز، شرافت اور خاندان پر فخر، محض غرور اور جہل کا شیش محل ہے۔ جو صرف ایک معمولی ٹکر میں ڈھا دیا جا سکتا ہے۔

شہنشاہ۔ نادان جولیو! مغرب ہی نے ان سیاہ فام بھیڑیوں کو ظلمات کے غار سے نکالا۔ درندوں کو انسان بنایا، خونخوار اور وحشیوں کو تہذیب کا سبق پڑھایا۔ زندگی کا راز بتایا، حکومت کرنا سکھایا۔ تو نہیں جانتی کہ اُن کی حالت کس قدر افسوسناک تھی؟ کیا یہ انسان کہلانے کے قابل تھے؟

جولیو۔ ابا جان! عالی ظرف لوگ اپنی بڑائی نہیں کرتے۔ اپنے احسانات جتانا اِن کے ماتھے پر کلنگ کا ٹیکا ہے۔ آپ کا ارشاد تصویر کا دوسرا رُخ ہے، اور میں نہیں سمجھ سکتی یہ کس حد تک اپنے اندر صداقت رکھتا ہے۔

شہنشاہ (غصّہ سے) غدّار جولیو! تجھے یہ غداری کس نے سکھائی؟

جولیو۔ مغرب نے

شہنشاہ۔ تو انسانیت کا خون کر رہی ہے۔

جولیو۔ میں نہیں۔ آپ کا مغرب کر رہا ہے۔

شہنشاہ۔ تیری زبان درازی شرم و حیا کی حد سے بڑھتی جا رہی ہے۔

جولیو۔ ابا جان! میں بے حیا اور زبان دراز نہیں بلکہ آپ کی مغربی خواتین۔

شہنشاہ۔ جولیو! کیا تو اپنی شرافت۔ خاندانی عظمت اور اپنے بلورین حُسن کو ایک مشرقی غلام کے ہاتھوں میں دیدینا چاہتی ہے۔

جولیو۔ یہ الفاظ آپ کے اُس مغربی حُسن مرمریں کے لئے زیبا ہیں جو ہزاروں عاشقوں کے آغوش کا زینت ہو رہے ہیں۔ میں اپنی عصمت کو اس طرح بیچ نہیں رہی ہوں جس طرح مغرب کی ——

موسیو۔ شہزادی صاحبہ! اپنے ملک پر بدنامی کا دھبا لگانا کونسی دانائی ہے؟

جولیو۔ تہذیب و اخلاق کا دعویٰ کرکے اقوامِ عالم کو عریانی سکھانا کونسی شرافت ہے۔ کمزور پر ظلم کرنا، درندوں کی طرح چیرنا پھاڑنا اور ٹکڑے ٹکڑے بانٹ لینا، روپے کے لالچ میں بے گناہوں کا خون بہانا، عزت والوں کو بے عزت کرنا، خوش حالوں کو گداگر بنا دینا پھر ان کی بیچارگی اور بے مائگی پر ہنسنا، کسی کو تخت سے اُتار کر جلاوطن کرنا، امن میں خلل ڈالنا، کیا حکومت اور شرافت کے یہی معیار ہیں؟ ہوش میں آؤ، عقل سے کام لو۔ تمہاری کارروائیاں تمہاری موت کا سامان تیار کر رہی ہیں۔ شرافت اسی میں ہے کہ مغرب کو مشرق سے ملا دیا جائے۔ حقداروں کے حقوق کی پوری نگہداشت کی جائے۔ غلام قوم و وطن کو آزاد کر دیا جائے، اور اُن کے ساتھ شیر لینانہ، انسانیت کا برتاؤ ہو۔

شہنشاہ۔ جولیو! آج کیا تیرے سر پر بھوت سوار ہے؟

جولیو۔ بھوت میرے سر پر کیوں سوار ہوتا۔ آپ اپنے مغربیوں کی حالت کا مطالعہ فرمائیے۔ ان پر رحم کھائیے۔ افسوس کیجئے کہ انسان درندے بن رہے ہیں۔ سرمایہ داری کی چکی میں غریبوں کو دانوں کی طرح پیس رہے ہیں۔ کیا یہ طوفانِ بے تمیزی نہیں ہے۔ گلا آپ کاٹیں اور خون کا الزام مشرقیوں پر، واہ کیا اچھوتا انصاف ہے۔

موسیو۔ عالی جاہ! یہ زبان ہے یا قینچی جو کپڑے کو کترتی چلی جا رہی ہے۔

جولیو۔ کپڑے کو نہیں بلکہ تمہاری مکاری کی چادر کو، یاد رکھو، ڈھول کا پول ایک روز کھل جائے گا۔ آج مشرق بے زبان ہے۔ ناچار ہے۔ گونگا ہے۔ کل وہ دن بھی آئے گا کہ یہی مشرق تمہارے نرم و نازک جالوں کو جلا کر خاک سیاہ کر دے گا۔

شہنشاہ۔ بس بس۔ جولیو! اپنی حماقت کا اس طرح اظہار نہ کر۔

جولیو۔ یہ حماقت نہیں ابا جان! حقیقت ہے حقیقت۔

شہنشاہ۔ سمجھتی بھی ہے کہ تو کیا کہہ رہی ہے۔

جولیو۔ میں نہیں بلکہ میرا دل بول رہا ہے۔

شہنشاہ۔ آخر تو چاہتی کیا ہے۔

جولیو۔ انصاف کا تقاضا یہی ہے کہ یہ نوجوان رہا کر دیا جائے۔

شہنشاہ۔ یہ اصولِ سلطنت کے خلاف ہے۔

جولیو۔ بتائیے تو! آپ کا کونسا اصول، کونسا قاعدہ سیدھا ہے۔

شہنشاہ۔ معلوم ہوتا ہے کہ موت تیرے سر پر منڈلا رہی ہے، اب کچھ بولنے کی جرأت کی تو ——

جولیو۔ یہ زبان، یہ الفاظ اور یہ شہنشاہی غرور میری موت کا سرٹیفکٹ نہیں ہو سکتے؟ جو قوم، جو بادشاہ خدا کو بھول جاتا ہے، اس کے لئے یہ الفاظ البتہ خوف کے قابل ہیں۔

شہنشاہ۔ (موسیو اور قمر کی طرف اشارہ کرکے) لے جاؤ، اس نوجوان اور اس کے ساتھیوں کو قید خانے میں ——— میں دیکھ لوں گا کہ یہ پلتی مینا کیا کر سکتی ہے؟ (موسیو سپاہیوں کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ سپاہی آفتاب اور اس کے ساتھیوں کو قید خانے لے جاتے ہیں، دربار برخاست ہوتا ہے)

منظر دوسرا

جیل خانے کی ایک کوٹھڑی۔ آفتاب سلاخدار دریچے سے جھانک رہا ہے۔ قمر آتا ہے۔

قمر۔ کیوں آفتاب! آزادی کی بُو دماغ سے نکل گئی۔ بول! کیا آزادی اچھی ہے یا صحرا کی غوں غوں۔

آفتاب۔ ظالم! یاد رکھ! مجھ سے تو ہر ایک چیز چھین سکتا ہے۔ لیکن میری فطرت کو نہیں بدل سکتا!

قمر۔ قید کی سختیوں میں بھی وہی بھنبھناہٹ ———

آفتاب۔ آزاد طبیعت تیرے کنگال، دولت مند۔ تاج و تخت والے کی کب پروا کرتی ہے۔ تو تو غلاموں کا غلام ہے۔ سُن اور غور سے سُن! میرے جسم کے ہر ایک عضو پر قبضہ کرلے۔ لیکن یاد رکھ! میرا دل، میری روح، تیری طاقت سے باہر، تیرے قہر سے دور اور تیرے عذاب سے بالاتر ہے۔

قمر۔ ارے بدبخت، اپنی جان کے دشمن! جانتا ہے یہ کیا چیز ہے؟ (ایک کاغذ دکھاتا ہے)

آفتاب۔ ہاں! یہ تیری بدکاریوں کی فہرست۔ غلامی کا ثبوت، اور تیرے مظالم پر لعنت کا سرٹیفکٹ ہے؟

قمر۔ نہیں نہیں۔ یہ تیری موت کا پروانہ ہے ——— دیکھ ——— یہ دیکھ ——— اپنی آنکھوں سے دیکھ ——— یہ حاکم کا فیصلہ ہے۔ اس پر عدالت کی مہر ہے اور میں اس وقت تیری موت و حیات کا مالک ہوں ——— بول اب کیا چاہتا ہے۔

آفتاب۔ تجھکو اور تیری عدالت کے فیصلے کو ٹھوکر مارتا ہوں اور تیرے اس پروانے پر تھوکتا ہوں۔

قمر۔ (غضبناک ہوکر) کوئی ہے؟ (پہرہ دار آتا ہے) نکالو اس پاگل کو حجرے سے۔ (پہرہ دار آفتاب کو حجرے سے باہر لاتا ہے، اور قمر لپک کر تلوار نکالتا اور چلّا کر کہتا ہے) بتا! اب تجھکو کون بچا سکتا ہے؟

آفتاب۔ خدا جو تیرا اور میرا دونوں کا نگہبان ہے۔

قمر۔ (چلّا کر) خدا ——— دولت اور طاقت کے سامنے خدا ——— بے وقوف! یہ دیکھ ——— تلوار سے وار کرنا چاہتا ہے۔

آفتاب ایک لات اُس کے سینے میں مارتا ہے۔ قمر نیچے گر جاتا ہے۔ وہ جلدی سے اُٹھکر عدالت کا کاغذ اور تلوار اُٹھانا چاہتا ہے، وہیں اُس کو ایک پرچہ ملتا ہے۔ فوراً اُسے اُٹھا کر پڑھنے لگتا ہے: "ہوشیار! شہزادی صفا آرہی ہیں۔ تم جس راستے سے یہاں آئے ہو، اُسی راستے سے نکل جاؤ۔ ورنہ ———"

قمر۔ (تعجب سے) شہزادی جیل میں اور ایک قیدی کی حمایت میں۔ (پھر سوچ کر) یہ تو دھوکا ہے ——— (پہرہ دار کی طرف اشارہ کرکے) بند کرو اس کو حجرے میں، اور آدھی رات کو، اس نابکار کو تہ خانے میں بدل دو ———

قمر جیل سے باہر نکل جاتا ہے ———

منظر تیسرا

تہ خانہ۔ آفتاب ایک پتھر سے ٹیک کر بیٹھا ہوا ہے۔ پاؤں میں بیڑیاں۔ ہاتھوں میں زنجیریں پڑی ہیں۔ داروغہ آتا ہے۔

داروغہ۔ بول اے نوجوان! کیا تیری آزادی کا نشہ ہرن ہو چکا کیا تو نے اپنے ریت کے ذرّوں کی طرح پریشان خیالات پر قابو پالیا۔ تیری دیوانگی عقل و ہوش سے بدل لی یا ابھی نہیں؟

آفتاب۔ اے آدم خور! بیکس و ناچار کے زخموں پر نمک چھڑکنا شیر کو پنجرے میں بند کرکے تیروں کا نشانہ بنانا کیا یہی صلیبی بھیڑیوں کی دلیری ہے۔ میری زنجیر کو توڑ اور پھر دیکھ کہ میرا نشہ ہرن ہو چکا ہے یا تیرا۔ یاد رکھ، آفتاب شبنم کے لئے موت کا پیغمبر ہے۔

داروغہ۔ حضور! مغرب تو آفتاب کا مدفن ہے۔

آفتاب۔ اب تمہارے دفن کا وقت بھی قریب ہے۔

داروغہ۔ واہ میاں۔ زندہ درگور! اس پر ناز۔ یہاں سے بچ کے تو نکلو۔ پھر زندگی کا خواب دیکھنا۔ میاں! یہ دوزخ ہے۔ یہاں جو آیا پھر واپس نہیں گیا۔ سمجھتے ہو۔

آفتاب۔ خدا میرا مددگار ہے —— دیکھا جائے گا۔

داروغہ۔ یہی تو مشرقیوں کی ذہنیت ہے۔

آفتاب۔ مشرقیوں کی ذہنیت نہیں بلکہ مغربیوں کی ابلہ فریبی ہے،

داروغہ۔ ہوش کی خبر لے نابکار! (جولیو سپاہی کے لباس میں چور دروازے سے تہ خانے کے اندر آتی ہے۔ اور داروغہ کو دیکھکر سپاہیانہ سلام کرتی اور کہتی ہے "وزیر اعظم نے یاد فرمایا ہے"! (داروغہ گھبرا کر تہ خانہ سے باہر جاتا ہے۔ جولیو قفل کو توڑتی اور آفتاب کی زنجیروں کو کاٹتی ہے۔ آفتاب بڑے تعجب سے پوچھتا ہے)

آفتاب۔ بتا اے رحم دل سپاہی! تو میری زنجیریں کاٹ رہا ہے یا میری زندگی کی گرہ کھول رہا ہے۔

سپاہی۔ (انگلی کے اشارے سے) خاموش! زبان سے کوئی لفظ نہ نکلے۔ (زنجیریں کاٹ کر دبی آواز سے کہتا ہے) اے نوجوان! جلدی کر اور میرے ساتھ اس تہ خانہ سے باہر نکل آ۔

سپاہی آفتاب کو تہ خانہ سے باہر لاتا ہے۔ دونوں چور دروازے سے ایک قریب کے باغ میں سے گزرتے ہوئے سڑک پر پہنچتے ہیں، وہیں ایک بگھی منتظر نظر آتی ہے۔ سپاہی اور آفتاب بگھی میں سوار ہو کر اور ایک محل کی طرف روانہ ہوتے ہیں۔

چوتھا منظر

ایک وسیع اور دلکش باغ۔ باغ کے بیچ میں ایک عالی شان محل۔ محل میں ایک طویل دالان۔ دالان میں کئی دروازے۔ اور اُن پر عمدہ ریشمی پردے اور چلمنیں پڑی ہوئی ہیں۔ بیشمار قیمتی کرسیاں بچھی ہیں۔ دالان کے سامنے چمن اور چمن میں ایک حوض ہے۔ آفتاب دالان میں تنہا بیٹھا ہوا نظر آتا ہے۔ تھوڑی دیر بعد پریشان ہو کر حوض کے کنارے آکر بیٹھتا ہے)

آفتاب۔ خدایا تیرے کرم کی بارش زنجیروں کو گلِ تر بنا دیتی ہے۔ میرے اللہ نہیں معلوم یہ کیا راز ہے کہ کل تک میں موت کی چراگاہ میں بکریوں کی طرح ہانکا گیا تھا، اور انسانی برادری میرے خون سے ہولی کھیلنا چاہتی تھی۔ آج یہ حال کہ ایک عالی شان محل میں قسمت کا دھنی بن کر زندگی کا لطف اُٹھانے کے لئے لایا گیا ہوں۔ خدایا کیا یہ میری قسمت کا پھیر ہے، یا میری آنکھوں کا دھوکا —— کیا میں موت کا نظارہ کر رہا ہوں؟ (تھوڑی دیر سوچ کر) وہ سپاہی کون تھا؟ رضوانِ جنت یا موت کا فرشتہ —— مجھے بیٹھنے کا اشارہ کیا اور غائب ہو گیا، —— آہ جیل —— جیل سے تہ خانہ —— تہ خانہ سے محل —— اُف عجیب راز ہے۔ (گھبرا کر) نہیں یہ میرا آخری وقت ہے —— شاید میں اس قصر کی بھینٹ چڑھانے کے لئے لایا گیا ہوں۔ واللہ کتنی اچھی فضا ہے —— کاش میں اور چند دن زندہ رہتا ——

(جولیو اپنا لباس بدل کر بہترین لباس پہنے ہوئے دالان میں آتی ہے، اور اور آفتاب کو نہ پا کر چمن کی طرف بڑھتی ہے، اور آفتاب کے الفاظ ایک درخت کی آڑ میں چھپ کر سنتی ہے، اور وہیں سے جواب دیتی ہے)

آواز۔ تم زندہ ہو اور زندہ رہو گے۔

آفتاب۔ (چونک کر) ایں یہ آواز —— کیسی! کس کی! —— (سوچکر) واقعی —— موت کی —— آہ دھوکا —— موت غربت میں۔ بے چارگی میں۔ تنہائی میں —— آہ یہاں میرا کوئی نہیں افسوس —— (مایوسانہ گھبرا کر) اے خدا! اگر تو سچا مسلمانوں کا خدا ہے اور اگر تجھ میں کچھ قوت ہے، غیرت ہے تو اپنی قدرت کا کرشمہ —— ارے توبہ۔ توبہ۔ میں یہ کیا واہیات بک رہا ہوں —— (خاموش ہو جاتا ہے)

آواز۔ کہے جاؤ، کہے جاؤ۔ آنکھیں بند کر کے موت کا دروازہ کھٹکھٹاؤ۔

آفتاب۔ ارے پھر وہی آواز —— خدایا —— یہ الفاظ ہیں یا آتش فشاں پہاڑ کے شعلے —— باغ میں آدم کو دھوکا، اُف یا تیری قدرت (آگے بڑھ کر ایک درخت کے سائے میں بیٹھ جاتا ہے۔ جولیو بھی قریب ہے۔ لیکن نظر نہیں آتی)

آواز۔ شعلے نہیں۔ یہ مغربی رقاصہ کے کیف آور نغمے ہیں۔

آفتاب۔ (پھر چونک کر) نغمے —— وہ بھی کیف آور —— کس کے؟ —— مغربی رقاصہ کے —— واہ سنہری دھوکا، انھیں نغموں نے تو آدم کو بہکایا تھا۔

آواز۔ آدم کو نہیں مشرق کے پاگلوں کو

آفتاب۔ (خوفزدہ ہوکر) خدایا! کیا آج موت کو شرارت سوجھی ہے —— کیا مشرق کے پاگلوں کو؟ مغرب کے ٹیلیفون سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں موت بھی سپید ہنس بن گئی ہے۔

آواز۔ یہاں تو بحث کوّدن کی ہے۔

آفتاب۔ (ہاتھ جھٹک کر) کیا بات کہی! کیسا طعن مارا ہے، پھر وہی زہریلی بحث۔ افسوس میرا دم تہ خانے ہی میں نکل جاتا تو اچھا تھا، خداوندا یہ کیا معاملہ ہے؟ صاف چھپتے بھی نہیں سامنے آتے بھی نہیں۔

آواز۔ مغربی سورماؤں کا وار، بجلی کا کام نہیں کرتا بلکہ دیرپا اور کاری۔

آفتاب۔ اسی کا نام تو مکاری ہے۔

آواز۔ عقل سلیم کہیے۔

آفتاب۔ لعنت ہے ایسی عقل سلیم پر (غصے سے لال پیلا ہوکر اٹھتا ہے۔ مڑکر دیکھتا ہے تو جولیو سامنے نظر آتی ہے، حسن کا رعب آفتاب کے دل پر چھا جاتا ہے، آفتاب سر جھکا دیتا ہے۔ تھوڑی دیر تک دونوں طرف خاموشی رہتی ہے۔ آفتاب پیچھے ہٹ کر کہتا ہے)

آفتاب۔ بتاؤ تم موت کی خوفناک دیوی ہو یا زندگی کے نغمہ کی مادھری؟

جولیو۔ (دبی زبان سے) پریم کی بھکارن۔

آفتاب۔ خدایا یہ جادو ہے یا تیری قدرت کا کرشمہ۔ آگ گلزار، خار گل، تہ خانۂ زندان محل، عجیب راز ہے۔ کیا کوا بھی ہنس سے دوستی کرسکتا ہے؟

جولیو۔ محبت میں کسی کی تمیز نہیں۔

آفتاب۔ کیا مشرق مغرب سے آنکھ ملا سکتا ہے۔

جولیو۔ ہاں سمتیں جدا ہیں لیکن مرکز ایک ہے۔

آفتاب۔ کیا خار سے گل کو کوئی نسبت ہے۔

جولیو۔ خار گل کا محافظ ہے۔

آفتاب۔ یہ کہاں ممکن کہ ایک شہزادی غلام سے ——

جولیو۔ ذرے سے آفتاب بنتا ہے۔

آفتاب۔ آنے والی دشواریوں کا مداوا؟

جولیو۔ پریم کی شمشیر۔

آفتاب۔ وطن کی آزادی۔

جولیو۔ ہمت و کوشش اور سچی خدمت سے

آفتاب۔ کیا یہ محبت کی پینگ ہے یا فلسفے کی گتھی۔

جولیو۔ محبت ہی فلسفہ کی بنیاد ہے۔

آفتاب۔ تو مغربیوں کے دل و دماغ اس سے کیوں خالی ہیں۔

جولیو۔ نہیں۔ اسی سے تو انھوں نے ترقی کی —— مگر

آفتاب۔ مگر کیا

جولیو۔ حرص، لالچ اور سرمایہ داری کی بھنگ نے اُن کے دماغ خشک کردئے ہیں۔

آفتاب۔ جس دل میں محبت کا لطیف جذبہ نہیں اُس سے وفا کی اُمید ——

جولیو۔ نادانی ہے۔

آفتاب۔ تو پھر آپ سے

جولیو۔ سب کو ایک ہی لکڑی سے ہانکنا۔

آفتاب۔ بے وقوفی ہے۔

جولیو۔ پھر آپ ——

آفتاب۔ (مسکراتے ہوئے) ہا ہا —— مار لیا۔

جولیو۔ ہنستی ہے

آفتاب۔ میرے احباب کہاں ہیں۔

جولیو۔ قید خانہ میں تمہاری بے رُخی کا نوحہ پڑھ رہے ہیں۔

آفتاب۔ آہ اے شریف خاتون! انسانی ہمدردی کا تقاضا یہی تھا کہ تم اُن کو ——

جولیو۔ افسوس۔ اب ہوش آیا۔ یہ الفاظ اُس وقت کہاں تھے جب تہ خانے کی زنجیریں ——

آفتاب۔ (آبدیدہ ہوکر) بیشک میں مجرم ہوں۔ غدار ہوں، کیا یہ اب ممکن ہے۔

جولیو۔ اب بھی ممکن ہے، بشرطیکہ تم ——

آفتاب۔ (جولیو کے چہرے پر نظر ڈالتے ہوئے) کیا میں اپنے پیارے وطن کو آزاد نہ کراؤں۔

جولیو۔ یہ ٹیڑھی کھیر ہے۔

آفتاب۔ آہ شہزادی! یہ محبت کے امرت میں یاس کے زہر کے کڑوے گھونٹ (مایوس ہوکر) خدایا ان ریشمی ڈوروں سے فولادی زنجیریں کہیں بہتر تھیں۔

جولیو۔ اوہو۔ اتنی سی بات اور ہتہ پانی ——— اُٹھو۔ ہمت نہ ہارو۔ (خادمہ حاضر ہوتی اور کہتی ہے)

خادمہ۔ بادشاہ سلامت اندر آنے کی اجازت چاہتے ہیں۔

جولیو۔ ایں، بادشاہ سلامت، ٹھیرو (آفتاب کو جلد محل کے بالائی حصے پہنچا دیتی ہے۔ دالان سے جاتے وقت جلدی میں آفتاب کی انگوٹھی ایک کرسی کے قریب گر جاتی ہے۔ بادشاہ سلامت آتے ہیں)

بادشاہ۔ بیٹی! خیریت تو ہے۔

جولیو۔ سایۂ پدر میں خوش ہوں۔ شکریہ

بادشاہ۔ آج کل ترکوں نے ——— (اپنی چھڑی کو زمین پر مارتا ہے)

جولیو۔ کیا فرمایا ابا جان ——— ترکوں نے

بادشاہ۔ اتحاد قائم کرلیا ہے۔ وہ بہت جلد طہران میں مجلس سلم اقوام قائم کرنے والے ہیں۔ امید ہے (پھر بید کو زمین پر مارنا شروع کرتا ہے)

جولیو۔ فرمایئے۔ فرمایئے۔

بادشاہ۔ بحیرۂ روم پر بھی وہ قبضہ جمالیں گے۔

جولیو۔ تو کیا ہوگا۔

بادشاہ۔ کیا خبر (فکرمند ہو جاتا ہے)

جولیو۔ تدبیر

بادشاہ۔ پارلیمنٹ کے ممبروں کے ذریعے مجلسِ اقوامِ عالم کی وساطت سے۔

جولیو۔ اور آپ

بادشاہ۔ عضوِ معطل، بیکار وجود

جولیو۔ لعنت ہے ایسی بادشاہی پر۔ آپ کی پارلیمنٹ مکاروں کی بھی اور لیگ چوروں کی جماعت ہے۔ کیا آپ ان پر بھروسا کر رہے ہیں۔

بادشاہ۔ اس کے سوا چارہ کیا ہے؟

جولیو۔ کیا آپ کی عقل کے گھوڑوں کے پاؤں اور تدبیر کے پر کتر دیئے گئے ہیں۔

بادشاہ۔ میں اُن کے ہاتھوں میں کٹ پتلی ہوں (ایک آہ سرد کھینچتا ہے۔ پھر اُٹھنا چاہتا ہے۔ مگر اس کی نگاہ زمین پر پڑی ہوئی انگوٹھی پر پڑجاتی ہے۔ اسے اُٹھا کر غور سے دیکھتا ہے۔ نگینے پر کندہ کئے ہوئے نام کو پڑھتا اور غصے سے چلاتا ہے) اُس کمبخت کو بھاگے ہوئے مدت گزر گئی ——— ایک فراری رذیل کا نگینہ اور میرے محل میں (جولیو کی طرف غصہ سے دیکھتا ہے اور کہتا ہے) کیا تونے اُسے فرار کیا ہے؟

جولیو۔ کس کو ابا جان۔

بادشاہ۔ وہی غلام جس کی تونے حمایت کی تھی۔

جولیو۔ حمایت کرنا تو بشریت کا تقاضا تھا اور ہے۔

بادشاہ۔ جولیو! تیری حمایت میری بربادی اور شامت ہے۔

جولیو۔ اپنے خود ساختہ، مردم آزار وزیروں کی حماقت کہئے،

بادشاہ۔ سچ بتا! کیا اُس غلام کو تونے پناہ دی ہے۔

جولیو۔ صرف اس محل ہی میں نہیں بلکہ اُسے اپنے دل میں بھی جگہ دی گئی ہے۔ کیا مظلوم کی مدد کرنا گناہ ہے ابا جان!

بادشاہ۔ اری بدکار! معلوم ہوتا ہے تو موت سے کھیل رہی ہے۔

جولیو۔ ابا جان! عقل سے کام لیجئے۔ تعصب کی عینک اپنی آنکھوں سے ہٹا کر واقعات کو دیکھئے اور ٹھنڈے دل سے ان پر غور کیجئے۔

بادشاہ۔ او ذلیل لڑکی! چھوٹا منہ بڑی بات۔

جولیو۔ ابا جان! وہی نازیبا کلمات۔

بادشاہ۔ (غصے سے) دیکھ! جہاں میرے سر پر بربادی کے بادل منڈلا رہے ہیں، وہاں اپنی موت کا بھی نظارہ کرلے۔

(فوراً ریوالور نکالتا ہے۔ آفتاب دیکھتا ہے، بالا خانے کی پہلی سیڑھی پر سے کود کر جولیو کو اپنی پیٹھ کے پیچھے لیتا اور کہتا ہے)

آفتاب۔ جہاں پناہ! ایک معصوم کی جان لینے سے پہلے اُس ظالم کی شاخ حیات کو کاٹ دیجئے جس نے غلامی کے ظلم و ستم سہ کر اپنے قدرتی

جذبات کو کھو دیا ہے۔

بادشاہ۔ (گھبرا کر ریوالور ہٹاتے ہوئے) تو چاہتا کیا ہے۔

آفتاب۔ آزادی کا پروانہ اور رسئے حیات کا پیمانہ (جو لیو کو بتاتا ہے)

بادشاہ۔ آہ..... قدم قدم پر دھوکا ــــ فریب (غصے کو پی کر) اپنا سوال پارلیمنٹ میں پیش کرو۔

(چلا جاتا ہے)

تیسرا ایکٹ

منظر اول

بادشاہ کا دربار۔ موسیو، قمر اور دوسرے وزرا بیٹھے ہیں۔

بادشاہ۔ (قمر کی طرف اشارہ کرکے) فراری کے ساتھی کہاں ہیں،

قمر۔ (اُٹھکر، ادب سے) قید خانے کی زندگی کا لطف اُٹھا رہے ہیں،

بادشاہ۔ اُن کو فوراً حاضر کرو (اشارہ کے منتظر سپاہی بہجت اور منشی کو حاضر کرتے ہیں)

بادشاہ۔ (بہجت کی طرف دیکھکر) کیا تمہیں اپنی آزادی مطلوب ہے؟

بہجت۔ میری آزادی سے پہلے میرے وطن کی آزادی افضل۔

بادشاہ۔ تم کو اور تمہارے وطن کو آزاد کر دیا جائے گا بشرطیکہ ــ

بہجت۔ کس شرط پر۔

بادشاہ۔ اس شرط پر کہ تم اُس نواب کے بیٹے کی شمعِ حیات گل کرو۔ اور ہماری جنگی ضروریات میں پورا پورا ہاتھ بٹاؤ۔

بہجت۔ اس کا صلہ

بادشاہ۔ تم کو وہ ملک بخش دیا جائے گا اور پوری آزادی حاصل ہوگی،

بہجت۔ خوب۔ ایک جان کی نجات کے صلے میں لاکھوں نوجوانوں کا شکار ــــ (سوچتا ہے)

بادشاہ۔ کیا یہ منظور ہے؟

بہجت۔ (منشی کو دیکھکر) ہاں منظور ہے۔

بادشاہ۔ (خوش ہوکر) شاباش میرے وفادار! جاؤ اور پارلیمنٹ سے آزادی کا پروانہ لکھوالو۔ جاؤ دیر نہ کرو۔

بہجت۔ بہت اچھا۔ (آگے بڑھتا ہے، لیکن زخمی سپاہی، حیران و پریشان دربار میں داخل ہوتا ہے۔ آگے بڑھکر بادشاہ کے تخت کے سامنے گر جاتا ہے۔ بادشاہ تخت سے اُتر کر سپاہی کو دیکھتا ہے۔ تمام حاضرینِ دربار اس کے گرد جمع ہو جاتے ہیں۔ زخمی سپاہی ہوش سنبھال کر کہتا ہے) "عالی جاہ! سِسلی پر ترکوں کا عَلم لہرا رہا ہے۔" (بادشاہ پر حالتِ جنون طاری ہو جاتی ہے۔ اور کہتا ہے)

بادشاہ۔ غدار وزیرو! دیکھا اپنی بربادی کا منظر ــــ اُف اب تمہارا بھی وقتِ آخر ہے۔ آہ! صلیبی سورما گاجر مولی کی طرح کٹیں گے۔ اس وقت کا منظر کتنا دردناک ہوگا۔ موسیو! جاؤ لیگ کو اس واقعے کی خبر کر دو۔ کمانڈر کو حکم دو کہ ساحل پر فوجوں کو پھیلا دے۔ لڑو۔ مارو۔ اپنے خون کا آخری قطرہ تک بہا دو۔ مگر یاد رکھو! روم کی مقدس زمین دشمنوں کے ناپاک قدم سے میلی ہونے پائے (سب حیران، پریشان ہوکر بھاگتے ہیں۔ دربار برخواست ہوتا ہے)

منظر دوسرا

پارلیمنٹ ہاؤس۔ پارلیمنٹ کے تمام ممبر جمع ہیں۔ ملکی اور غیر ملکی نمائندے بھی اپنی اپنی جگہوں پر بیٹھے ہیں۔ آفتاب بھی اُن کے درمیان میں بیٹھا ہوا نظر آتا ہے۔ اسٹیج پر موسیو۔ قمر۔ بہجت۔ منشی۔ خلعتِ شاہی پہنے ہوئے موجود ہیں۔ موسیو بادشاہ کا فرمان سناتا ہے۔

"خاقان کے نواب کی بدعنوانیوں کی وجہ سے اُس کو تخت سے اُتار کر، اُسی کے ملک کے، ایک نوجوان بہجت کو نواب اور منشی کو اُس کا وزیر بنایا جاتا ہے۔"

(حاضرین شاہی فرمان کا تالیوں سے خیر مقدم کرتے ہیں۔ آفتاب اس فرمان کو سنکر آگ بگولا ہو کر اُٹھتا ہے۔)

آفتاب۔ کس گناہ کی پاداش میں یہ سازش کی گئی ہے۔ (تمام پارلیمنٹ والے اُس کی طرف دیکھتے ہیں) بہجت کون ہے!

بہجت۔ (فوراً اُٹھکر) وہی تمہارا وفادار دوست۔

آفتاب۔ ارے نمکحرام

موسیو۔ یہ تکرار کا موقع نہیں۔ آؤ جلد اس کاغذ پر دستخط کر دو۔

آفتاب۔ یہ کام میرے بس کی بات نہیں۔

موسیو۔ زیادہ تکرار کا نتیجہ بُرا ہے۔

آفتاب۔ بندہ حاضر ہے۔

موسیو۔ موت کا سامان بھی تیار ہے۔

آفتاب۔ مسلمان موت سے نہیں ڈرتا۔

موسیو۔ اچھا تو تیار ہو جاؤ۔

جولیو۔ کیا اسی کا نام بہادری اور تہذیب ہے۔ مردم آزار، حق ناشناس۔

موسیو۔ (بے پروائی سے) بہجت! تم اپنی مہر لگا دو۔

بہجت۔ (غصہ سے) کیا مجھے اپنے آقا سے بے وفائی، وطن سے غداری کرنے کا سبق دیا جا رہا ہے۔

موسیو۔ تم کو ہمارا حکم ماننا پڑے گا۔

بہجت۔ اور تم بھی آفتاب کو نواب ——

موسیو۔ ارے غدار

بہجت۔ ارے صلیبی بھیڑیئے! تو سمجھتا ہے کہ مسلمان غدار اور بے وفا ہے، یاد رکھ اسلام کے مذہب میں وفا ایمان کی پہلی شرط ہے۔ (خلعت اُتار کر) یہ لے اپنا مکاری کا لباس، اور یہ بے حیائی کا تاج۔ اُن بے غیرت اور غلام ذہنیت رکھنے والوں کو پہنا جو اپنے بھائیوں کے گلے گھونٹ کر عزت و مرتبے کو خدائی سرٹیفکیٹ سمجھتے ہیں۔ میں نادار ہوں، غریب الوطن ہوں مگر مسلمان ہوں۔ تیری طاقت کو۔ تیرے مرتبے کو، اور تیرے جاہ و جلال کو ٹھوکر مارتا ہوں۔

(شاہی خلعت و تاج کو اسٹیج پر پھینک کر آفتاب کے قریب آتا ہے تمام حاضرین پر خوف کے آثار چھا جاتے ہیں)

بہجت۔ (آفتاب سے) آقا! غلام کی خطاؤں کو معاف کر دیجئے۔ (آفتاب کے قدموں میں بیٹھ جاتا ہے۔ آفتاب اس کو اُٹھا کر اپنے گلے سے لگا لیتا ہے۔ اتنے میں بادشاہ حیرت زدہ ہو کر پارلیمنٹ میں آتا ہے اور موسیو سے پوچھتا ہے۔)

بادشاہ۔ کیا لیگ کو خبر کر دی گئی ہے؟ کچھ جواب آیا؟

جولیو۔ ابا جان! آپ لیگ، لیگ کا وظیفہ بار بار کیوں پڑھ رہے ہیں۔ وہ تو دھوکے کی ٹٹی ہے۔

موسیو۔ حضور! کر دی گئی۔ تار آیا ہے کہ قریب میں اجلاس ہونے والے ہیں۔

بادشاہ۔ کیا کایا پلٹ جانے کے بعد —— اُف۔ جنگ کے میدان کی کیا خبر ہے؟

موسیو۔ ابھی فون سے معلوم ہوا کہ ساحل پر ترکوں —— ل —— ل کا ——

بادشاہ۔ (گھبرا کر) جلد کہو

موسیو۔ قبضہ ہو چکا —— (سر کو جھکا دیتا ہے)

بادشاہ۔ ہائے افسوس —— روم —— آزاد روم —— تیری شان، تیری عظمت مٹی اور اُبھری۔ پھر اور —— کیا خبر —— (مغموم ہو کر سر جھکا دیتا ہے) کیا لیگ مدد نہیں دے گی؟

موسیو۔ (رُکتی ہوئی آواز سے) ابھی اس کا فیصلہ نہیں ہوا۔

جولیو۔ (باپ کے قریب جا کر) کاش! آپ ان ٹکڑاموں پر بھروسا نہ کرتے (بم گرنے کی آواز آتی ہے۔ موسیو گھبرا کر پکارتا ہے) کیا بم کی آواز۔ ہائیں کیا دشمن پہنچ گئے؟

بادشاہ۔ آہ روم لُٹ گیا۔ برباد ہو گیا —— آہ خون ریز قتلِ عام —— (دوسرے بم کی آواز آتی ہے) او ہو! موسیو! لیگ کو خبر کر دو کہ ہمارا دیوالہ نکل گیا —— مدد —— مدد —— (تمام پارلیمنٹ کے ممبروں پر خوف چھایا ہوا ہے۔ حیران، پریشان اِدھر اُدھر پھرتے ہیں۔ اتنے میں چند فوجی افسر لال وردی پہنے ہوئے اپنے سپاہیوں کے ساتھ ہاؤس میں داخل ہوتے ہیں۔ کمانڈر سب کو قید کرنے کا حکم دیتا ہے اور بادشاہ کے قریب پہنچ کر سپاہیانہ سلام کرتا ہے۔ جولیو کا سر چکراتا ہے وہ نیچے گرتی ہے اور آفتاب آگے بڑھ کر اٹھاتا ہے۔ بہجت اور منشی بھی اُس کے پاس پہنچتے ہیں۔ کمانڈر شاہِ روم سے کہتا ہے۔

ترکی کمانڈر۔ ملک پر ترکی علم لہرا رہا ہے، اور آپ ایک مغلوب بادشاہ کی حیثیت میں شاہی پڑاؤ میں ——

شاہِ روم۔ آہ —— مجھے زندہ لے جانے سے پیشتر اسی مقدس زمین پر میرا خون بہا دو۔

کمانڈر۔ شاہی فرمان کی خلاف ورزی میرے امکان سے باہر ہے۔

شاہِ روم۔ تم کون ہو؟

کمانڈر۔ ترکی فوج کا کمانڈر۔ آپ کا قدیم وفادار۔

شاہِ روم۔ کیا معنی

کمانڈر۔ وہی قدیم وفادار جس کو تخت چھوڑنے کا حکم دیا گیا تھا۔

شاہِ روم۔ (تعجب سے) کون! ابن ــــ خاقان کا نواب!

کمانڈر۔ جی ہاں ــــ (آفتاب اُسے بغور دیکھتا اور ابا ــــ ابا کہکر باپ کے قدموں پر گرتا ہے۔ کمانڈر بیٹے کو گلے لگاتا ہے۔ اور سب کو اسیر کرکے شاہی پڑاؤ میں لے جاتا ہے۔)

تیسرا منظر

شاہی کیمپ، دربار۔ شاہی کیمپ سجا گیا ہے۔ خوشی کے شادیانے بج رہے ہیں۔ فتحیاب فوجیں صفیں باندھے کھڑی ہیں۔ شاہِ ترکی تخت پر رونق افروز ہے۔ حاضرینِ دربار جمع ہیں۔ رتبوں اور عہدوں کے موافق خلعت، خطابات اور انعام بٹ رہے ہیں۔ تمام قیدی ہاتھوں میں زنجیریں پہنے ہوئے کھڑے ہیں۔ شاہی خیمے کے قریب ایک موٹر آکر رُکتی ہے۔ شاہِ روم، اُس کی بیٹی، اور آفتاب ترکی کمانڈر کے ساتھ دربار میں داخل ہوتے ہیں۔

ترکی کمانڈر۔ (آداب بجا لاکر) عالی جاہ! شاہِ روم اور اُن کی دختر نیک اختر حاضرِ خدمت ہیں۔

(سلطانِ ترکی، شاہِ روم کو مرصع کُرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کرتا ہے مگر شاہِ روم نہیں بیٹھتا)

شاہِ روم۔ میں تخت کے بجائے تختے کا سزاوار ہوں۔

شاہِ ترکی۔ مذہبِ اسلام شاہ و گدا میں تفریق کی اجازت نہیں دیتا۔ آپ بے کھٹکے تشریف رکھئے۔

شاہِ روم۔ نہیں، اس لئے کہ میں مجرم ہوں۔

شاہِ ترکی۔ آپ مجرم نہیں، بلکہ ایک بہادر جرنیل ہیں آپ کے ساتھ وہی سلوک ہوگا جو ایک بادشاہ دوسرے بادشاہ کے ساتھ کرتا ہے (آفتاب کو بتا کر) یہ کون ہیں؟

شاہِ روم۔ آپ کے کمانڈر اور میرے قدیم وفادار کا فرزند۔

شاہِ ترکی۔ (کمانڈر کی طرف دیکھکر) میں یہ کیا سُن رہا ہوں۔

شاہِ روم۔ عالی جاہ! یہ حقیقت ہے۔ لیکن آہ میں نے اس پر بھروسا نہ کیا اور آج اس کا نتیجہ دیکھا۔ (زار زار روتا ہے)

شاہِ ترکی۔ آپ روتے کیوں ہیں۔ یہ تو ڈھلتی چھاؤں ہے۔ بہادروں کو کبھی تخت ملتا ہے کبھی تختہ۔ مگر بہادر وہی ہیں جو ہر حال میں راضی بہ رضا ہیں۔ اچھا وہ کیا حقیقت ہے۔

شاہِ روم۔ عالی جاہ! کیا بتاؤں (قمر کو بتاتے ہوئے جو قیدیوں میں صف میں کھڑا ہے) اس دغاباز، نمکحرام کے دام میں آکر میں نے آپ کے کمانڈر کو تخت چھوڑنے کا حکم دیا (دہاڑیں مار مار کر روتا ہے) یہی میں نے بُرا کیا ــــ

شاہِ ترکی۔ ہمارا کمانڈر آپ کا کون ہے۔

شاہِ روم۔ میرے ایک مقبوضہ علاقہ خاقان کا نواب۔

شاہِ ترکی۔ آپ کا نواب اور میری فوج کا کمانڈر (کمانڈر کی طرف دیکھتا ہے۔)

کمانڈر۔ (آداب بجا لاکر) میرے آقا نے جو کچھ فرمایا ٹھیک ہے، بات یہ ہے کہ جب مجھے تخت چھوڑنے کا حکم ملا تو میں اپنے ملک و وطن کا تمام کاروبار اپنے وزیر کے ذِمّے کرکے، پیارے وطن کو ہمیشہ کے لئے خیرباد کہہ کر چلا آیا۔ ترکی پایۂ تخت میں پہنچکر حضور کی فوج میں ایک معمولی افسری کے کام پر مامور ہوا۔ حضور نے میری قابلیت، جاں نثاری اور بہادری کو دیکھکر کمانڈر کے عہدے سے سرفراز کیا۔ اور اس نمک حلالی کا سہرا آج ــــ

شاہِ ترکی۔ بہت خوب میرے بہادر! تم اب وطن نہیں جاؤگے؟

کمانڈر۔ میں نے عہد کیا تھا کہ اس غلام وطن میں ہرگز قدم نہ رکھونگا۔

شاہِ ترکی۔ اب تو تمہارا ملک غلام نہیں ہے۔

کمانڈر۔ یہ خدا کی شان ہے۔

شاہِ ترکی۔ (آفتاب کی طرف دیکھکر) بتاؤ تم یہاں کیوں کر آئے۔

آفتاب۔ ظلّ اللہ! والدِ بزرگوار نے مجھے خراج ادا کرنے کے لئے روانہ کیا تھا۔ لیکن راستے میں (قمر کو بتا کر) اس شخص نے مجھ پر بغاوت کا الزام لگاکر روپیہ لُوٹ لیا۔ مجھے اور میرے ساتھیوں کو قید خانے بھجوا دیا۔ مگر اس شریف خاتون نے (جولیو کو بتا کر) قید سے چھڑایا، اور اپنے محل میں پناہ دی۔

شاہِ ترکی۔ (جولیو کی طرف مخاطب ہو کر) کیا یہ سچ ہے بیٹی؟

جولیو۔ بالکل ٹھیک ہے عالیجاہ! میں ہمیشہ ان بے ایمان وزیروں کی سازشوں، مکاریوں، دغابازیوں سے نالاں تھی۔ اپنے والد کو بار بار ان کے فریبوں سے آگاہ کرتی رہی۔ لیکن افسوس —— میں سمجھتی ہوں کہ بادشاہوں کو برائیوں کے غار کی طرف لے جانے والے یہی لوگ ہیں۔ مگر حوا نے صرف آدم کو دھوکا دیا تھا مگر یہ وزیر بادشاہوں کو فریب دیتے ہیں۔

شاہِ ترکی۔ کتنی عقیل و شکیل بچی ہے۔ ماشاء اللہ۔ اچھا! خوف نہ کر بیٹی! خدا حافظ اور مددگار ہے (بادشاہ وزیر کی طرف اشارہ کرتا ہے اور وزیر شاہی فرمان پڑھتا ہے)

"مابدولت سلطانِ ترکی روم کے بادشاہ کو معزول فرماتے ہیں اور قیدیوں کو آزادی عطا کرتے ہیں۔ خاقان کے سابق نواب اور ہمارے کمانڈر کو پھر اُس علاقے کی نوابی سے سرفرازی دیتے ہیں۔ آفتاب کو روم کی گورنری دی جاتی ہے۔ معزول شاہِ روم کے غدار وزیروں کو پھانسی کی سزا دی جاتی ہے۔ روم کی تمام رعایا کو پوری مذہبی آزادی ہے۔ معزول شاہِ روم کو قسطنطنیہ کے ایک عالیشان قصر میں رہنا ہوگا، اور ترکی گورنمنٹ ان کے تمام اخراجات کی ذمہ دار ہے۔"

شاہِ ترکی۔ (شاہِ روم کی طرف اشارہ کرکے) کیوں جناب منظور ہے؟

شاہِ روم۔ (سر جھکا کر) جی ہاں منظور ہے۔ لیکن ایک آرزو ہے حضور!

شاہِ روم۔ جولیو کا آفتاب سے رشتہ۔

شاہِ ترکی۔ کیا لڑکی کو بخوشی منظور ہے۔

شاہِ روم۔ دریافت فرمالیں حضور

شاہِ ترکی۔ کیوں بیٹی؟ (جولیو شرم سے آنکھیں نیچی کرلیتی ہے۔ دربار میں ہر طرف سے جوش، مسرت اور تالیوں کی آواز بلند ہوتی ہے۔ سکوں کے بعد شاہِ ترکی آفتاب اور جولیو کی شادی کردیتا ہے۔ غمزدہ باپ، بیٹی اور داماد کو مبارکباد دیتا اور خدا حافظ کہتا ہوا قسطنطنیہ کو روانہ ہوتا ہے۔)

(فضا سے یہ آواز سنائی دیتی ہے۔

بس ظلم کا ہے انجام بُرا، اور صبر کا پھل میٹھا بابا ٭ دُکھ جس نے دیا برباد ہوا، حق پر جو چلا جیتا بابا

مقصودِ کمال کیا ہے کس سے پوچھیں
تعمیرِ زوال کیا ہے کس سے پوچھیں
دانا مبہوت ہیں، ہیں سب خاموش
ہستی کا مآل کیا ہے کس سے پوچھیں

جوش

کچھ بھی نہیں ایں و آں، ہیں الا افسوس
افسوس ہے اے نظامِ دنیا افسوس
غم ہی کا نتیجہ غم ہو، اتنا ہی نہیں
نغمۂ سروری کا بھی نتیجہ افسوس

جوش

برطانیہ عظمیٰ کا زبردست مشرقی رقیب جاپان

محمود بریلوی

آج ایک سال کی مسلسل جنگ و جدل کے بعد جاپان ۔ چین کے اٹھارہ صوبوں میں سے صرف چار پر کلیتہً قابض ہو سکا اور دیگر چار صوبوں کے مختلف حصص پر اپنا اقتدار قائم کر سکا ہے۔ جاپان نے اِس جنگ میں چین کے جتنے حصۂ ملک پر قبضہ کیا ہے اُس کا رقبہ قریباً تین لاکھ پچاس ہزار مربع میل یعنی برطانیہ عظمیٰ سے چار گنا زیادہ ہے۔ بایں ہمہ چین اب بھی اس سے تین گنا زیادہ ملک پر قابض ہے۔ وہ صوبے جن پر جاپان کا اس طرح برائے نام قبضہ و تسلط ہے یہ ہیں۔ ہوپی۔ کیانگسو شانٹنگ اور شانسی اور جن چار صوبوں کے حصوں پر وہ قابض ہے وہ یہ ہیں۔ انہوئی۔ سوئی یان۔ چکیانگ اور ہونان۔ دراصل جاپان ویاڈ اور ریلوے لائن کے ہر دو جانب پانچ پانچ میل تک اور اہم شہروں کے ارد گرد دس یا بیس میل دور تک مسلط ہے اور بس۔ جاپان نے اِس ایک سال کے اندر چین کے دس مشہور شہروں اموئے۔ شنگھائی۔ نانکنگ۔ سنگ تاؤ۔ چیفو۔ ٹینٹسن اور پی پنگ وغیرہ ریلوے لائن کے تین ہزار پانسو میل کے ٹکڑے پر اور قریباً ایک ہزار تین سو میل کے بحری و دریائی ساحل پر قبضہ کر لیا ہے۔

چین کے قبضہ میں اب بھی بارہ مشہور شہر ہینکو۔ چنگ کن۔ کینٹن۔ سواتو۔ فوچو، کاشنگ اور لینگ پو وغیرہ ہیں۔ دو ہزار چار سو میل لمبی ریلوے لائن اور ایک ہزار پانسو میل لانبا بحری و دریائی ساحل ہے، مالِ غنیمت میں علاوہ متذکرہ صدر علاقہ کے جاپان نے شمالی چین کی کوئلہ کی کانوں پر بھی قبضہ کر لیا ہے جو دنیا میں تیسرے درجہ کی سب سے بڑی کوئلہ کی کانیں شمار ہوتی ہیں۔ علاوہ ازیں جاپان اندرونِ منگولیا کے اُن موبجات شانٹنگ اور کیانگسو کی تمباکو، شانٹنگ کی افیون اور شنگھائی کے سوتی اور ریشمی کارخانوں اور ریلوں پر بھی قابض ہو گیا ہے۔ اِس کے برخلاف چین کے قبضہ میں اب بھی تمام ملک کی چار بڑی پیداوار، مغربی جنگلات کا نباتاتی تیل اور ٹین کی کانیں ہیں۔ چین اب بھی کل ملک کی کپاس کی پیداوار کے پانچ حصوں میں سے چار پر قابض ہے، اور جنوب میں اُس کے پاس گو نسبتاً مختصر، کوئلہ کی کانیں بھی ہیں۔ گو جاپان کو متواتر جنگی کامیابیاں نصیب ہوتی رہی ہیں۔ مگر کوئی لڑائی آج تک ایسی نہ ہوئی جو اِس بدنصیب قضیہ کا خاتمہ یا چین کی قسمت کا فیصلہ کر سکتی۔ اِس لئے بیرونی دنیا چین جیسی غیر منظم سلطنت کا لحاظ کرتے ہوئے جاپان کی اِن کامیابیوں کو فتح کا نام نہیں دیتی۔ ہر چند کہ دونوں طرف کے جانی اتلاف کا صحیح اندازہ نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن تخمینہ کیا گیا ہے کہ جاپان کی طرف سے اب تک قریباً ایک لاکھ جانیں ضائع ہو چکی ہیں اور چار لاکھ آدمی زخمی ہو چکے ہیں۔

اِس میں کوئی شک نہیں کہ چین کا جانی نقصان جاپان کے مقابلہ میں بہت زیادہ ہوا۔ اُن چینیوں کے علاوہ جو لڑائی میں مارے گئے ہزاروں چینی ایسے بھی جان سے گئے جو جنگ سے کوئی تعلق نہ رکھتے تھے، اور شہروں اور قصبوں کی بے ضرر رعایا تھے۔ یہ لوگ جاپانی ہوائی حملوں کا شکار ہوئے۔

ہزاروں چینی بھوکے مرگئے۔ سینکڑوں دریاؤں کی طغیانی کی نذر ہو گئے وغیرہ۔
آج ملک چین میں دس لاکھ سے زاید جاپانی سپاہی سرگرم پیکار ہیں۔
اس تعداد میں ہوائی یا بحری فوج شامل نہیں ہیں۔ نہ وہ تین لاکھ جاپانی
عسکر جو منچوریا میں سوویٹ روس کی نقل و حرکت کا معائنہ کر رہے ہیں۔

موجودہ جنگ چین و جاپان سے پیشتر چین کی حکومت کی دعویدار
تین پارٹیاں تھیں (۱) جنرل چیانگ کے شیک، بہ شہر نانکنگ میں (۲)
جنوبی صوبے اور (۳) شمالی چین کے اشتراکی۔ اب جاپان کے خلاف
یہ ہر سہ طاقتیں متحد ہو چکی ہیں۔ جاپان کے مقابلہ میں چین کے پاس
لڑنے کے لئے آدمیوں کی تعداد بیشمار ہے۔ ملک چین کی وہ مسلمان
آبادی جس کی تعداد پانچ کروڑ سے اوپر ہے اور جو ہمیشہ چین کی مرکزی
حکومت کی مخالف رہی اب جنرل چیانگ کے شیک کی طرفداری میں
جاپان کے خلاف لڑ رہی ہے۔ مسلمانوں کے علاوہ تبت اور برہما کی
سرحد کی طرف کے جنگلی باشندے بھی ہزاروں کی تعداد میں چینی فوج
میں بھرتی ہیں۔ اور جاپان سے لڑ رہے ہیں۔ اس لئے جاپان کو
چین پر مستقبل قریب میں قبضہ کرنے کا خیال دل سے نکال دینا پڑے گا،
اور بہت ممکن ہے کہ جب تک چین پر وہ اپنا مکمل تسلط قائم کر سکے اس
وقت تک جاپان کی نصف سے زائد آبادی جنگ چین و جاپان کی
نذر ہو چکی ہو۔

قریباً دس سال ہوئے کہ اُس وقت کے وزیر اعظم جاپان بیرن
تناکا نے جاپان کے ایشیائی تسلط پر اپنی حکومت کی پالیسی کا اعلان
کیا تھا جس کا لب لباب مختصراً یہ ہے۔

"ہمارا منچوریا اور منگولیا پر قبضہ کرنا ازبس ضروری ہے تاکہ
ہم چین کی عسکری سیاسی و اقتصادی طاقت کو برباد کر سکیں۔ چین
کے اندر سے ہو کر اور اُس کی وساطت سے ہم ہندوستان، مجمع الجزائر
ملایا، ایشیائے کوچک، وسط ایشیا۔ بلکہ یورپ کو بھی فتح کر سکیں گے۔"

ان عزائم کو سامنے رکھکر جاپان نے ملک سیام میں "خاکنائے
کرا" کو کاٹ کر ایک ایسی نہر بنانے کا ارادہ کیا ہے جس میں جہاز رانی
ہو سکے، اور جو مشرق کی نہر سویز کہی جا سکے۔ جیسے کہ برطانیہ نے سنگاپور
کو قلعہ بند کر کے ایک عظیم الشان بحری مرکز بنایا ہے، جاپان جزیرہ نمائے
ملایا کے آرپار ایک نہر کھودنے کا منصوبہ قائم کر رہا ہے اور یہ منصوبہ عارضی
طور پر موجودہ جنگ چین و جاپان کے باعث معرض التوا میں پڑ گیا ہے۔
سنگاپور کے اوپر جزیرہ نمائے ملایا کے اُس حصہ میں جو سیام کے قبضہ
میں ہے اور جسے "خاکنائے کرا" کہتے ہیں۔ اگر جاپان مجوزہ نہر بنا سکا تو
نتیجتاً جاپان اور ہندوستان کے درمیان بحری راستہ قریباً چھ سو
میل کے کم ہو جائے گا۔ اور مدت مسافت قریباً چار دن کے مختصر ہو جائے
گی۔ "خاکنائے کرا" قریباً پچیس میل چوڑی ہے۔ اس کی نہر سیاسی
حیثیت سے سنگاپور کی اہمیت کو ختم کر دے گی۔ اور برطانیہ کو دوسری
تجاویز سوچنا پڑیں گی۔ اپنے اس مقصد کو حل کرنے کے لئے جاپان
کچھ عرصہ سے سیام کی دوستی حاصل کرنے کی سعی کر رہا ہے، اور اگر
سیام کی حکومت راضی ہو گئی تو مشرق کی یہ "نہر سویز" بن کر رہے گی۔ "نہر کرا"
کے بننے کی شکل میں برطانیہ کو جزیرہ "سینٹ میتھیو" کو جو خاکنائے کرا کے
متصل واقع ہے۔ قلعہ بند اور مضبوط کرنا پڑے گا، اور شاید راس وکٹوریہ
پوائنٹ کو بھی۔ "نہر کرا" تجارتی نقطۂ نظر سے "نہر سویز" اور "نہر پناما" سے
کسی طرح غیر اہم ثابت نہ ہو گی، ملک سیام کا قصبہ کرا جس کے متصل نہر کرا
بننے کی تجویز ہے سنگاپور سے سات سو میل اوپر ہے۔ برطانی مدبرین کا
خیال ہے کہ جزیرہ سینٹ میتھیو جو برطانی مقبوضات میں سے ہے مجوزہ
"نہر کرا" کے دہانہ پر واقع ہونے کی وجہ سے برطانی ہاتھوں میں حفاظت
خود اختیاری کا نہایت اہم آلہ ہے۔ مزید برآں برما کے انتہائی جنوب میں
"راس وکٹوریہ پوائنٹ" جو خلیج بنگال پر واقع ہے برطانی ہوائی جہازوں
کا مشہور مستقر ہے۔ اور کرا کے قریب واقع ہونے کی وجہ سے برطانیہ
کے اطمینان کا باعث ہے۔ نہر کرا کی تجویز آج تک عظیم الشان اخراجات
کے باعث معرض التوا میں پڑی رہی۔ کیونکہ جاپان کو پناما، سویز اور
جرمنی کی "نہر کیل" کے بے پناہ اخراجات کے حالات معلوم تھے۔ مگر حال ہی
میں معلوم ہوا ہے کہ نہر کرا پر نسبتاً بہت کم خرچ ہو گا کیونکہ علاوہ اس امر کے کہ
خاکنائے کرا کی چوڑائی صرف پچیس میل ہے۔ وہاں نہ تو چٹانیں کاٹنا پڑیں گی
اور نہ سمندر میں بند باندھنا پڑیں گے۔ کیونکہ خاکنائے کرا کے ہر دو جانب
سمندر کی سطح یکساں ہے۔ ایسا سنا گیا ہے کہ اگر سیام جنگ کے وقت مامون
و مصئون رہ سکا اور اُس کی مستقل حیثیت غیر جانبدار تسلیم کر لی گئی تو وہ نہر کرا کی اجازت

غدّارِ وطن کے نام

(ایک وطن دوست دوشیزہ کا مکتوب)

لکھا ہے تم نے مجھے از رہِ خلوص و وفا　　کہ تجھ پہ میں دل و ایماں نثار کرتا ہوں
ہر ایک صبح کو رہتا ہوں تیری یاد میں گم　　ہر ایک شب کو ترا انتظار کرتا ہوں
ترے خیال، تری دُھن، ترے تصوّر سے　　تسلّیٔ دلِ اُمیدوار کرتا ہوں
تری اُمیدِ کرم کے خیال میں دن رات　　غمِ فراق کی گھڑیاں شمار کرتا ہوں
تری شبیہ سے دیتا ہوں رُوح کو تسکیں　　ترے خیال سے کسبِ قرار کرتا ہوں
ترے نقوشِ خد و خال پر نظر کر کے　　ستائشِ قلمِ کردگار کرتا ہوں
تری طلب کا تری مستقل محبت کا　　خود اپنی روح سے قول و قرار کرتا ہوں

یقین کر کہ میں ہم رنگِ روزگار نہیں
مرا مزاج تلوّن کا رازدار نہیں

بجا کہ، مجھ سے تمھیں دعوئے محبت ہے　　بجا کہ تم کو حقیقت میں مجھ سے اُلفت ہے
بجا کہ، دلکش و رنگیں ہیں خدّ و خال مرے　　بجا کہ حُسن مرا بہترین صنعت ہے
بجا کہ، میرا تبسّم ہے انبساط انگیز　　بجا کہ میرا تصوّر نویدِ راحت ہے
بجا کہ، تم کو مرے بُعد سے ہے بیتابی　　بجا کہ تم کو مرے قُرب کی ضرورت ہے
بجا کہ، میرا تغافل ہے آتشِ دوزخ　　بجا کہ میرا تلطّف بہارِ جنّت ہے
تم اپنے عشق کا لیکن مجھے یقیں نہ دلاؤ　　تمھارے ذوقِ غلامی سے مجکو نفرت ہے
جو اپنی قوم کا ہمدرد و غمگسار نہ ہو　　وہ مجھ سے عشق کرے، یہ مری اہانت ہے

وہ مردِ حُبِّ وطن سے جو بیقرار نہیں
جہاں میں اُس کی محبت کا اعتبار نہیں

صادق نیازی کاشمیری

قصور!

محمد حسام الدین خاں غوری

"یقیناً ظلم ہو رہا ہے۔ ان سرمایہ داروں کے دل میں غریب انسانوں کے لئے کوئی جگہ نہیں، دنیا میں کس چیز کی کمی ہے۔ پھر بھی لوگ محروم و محتاج ہیں۔ فاقوں پر فاقے کرتے ہیں۔ حالانکہ ان کے چاروں طرف بے اندازہ دولت ہے۔ زندگی بسر کرنے کے تمام ذرائع ہیں۔ خدا کی زمین کتنی وسیع ہے۔ اس کے باوجود لوگ جگہ نہ ملنے کی وجہ سے کس قدر تنگی سے زندگی بسر کرتے ہیں۔ آخر یہ سب کچھ کیوں ہو رہا ہے۔ جب ہر چیز اس قدر افراط کے ساتھ موجود ہے تو غریب فاقوں سے کیوں دم توڑ رہے ہیں وہ بھی تو خدا کے بندے ہیں۔ ان کو بھی دنیا میں زندہ رہنے کا حق ہے۔ اگر دنیا سے سرمایہ داری کا خاتمہ کر دیا جائے تو واقعی زندگی کا تاریک، مجہول، اور خوفناک چہرہ زیادہ سادہ۔ زیادہ مشفقانہ اور زیادہ روشن ہو جائے گا۔۔۔۔۔۔"

یہ اور اسی قسم کے بہت سے خیالات مظفر کے دماغ میں گشت لگا رہے تھے۔ مظفر کو بمبئی آئے تین ہفتے گزر چکے تھے، اس عرصہ میں اُس نے بمبئی کا چپہ چپہ چھان مارا۔ لیکن کہیں کوئی کام نہ مل سکا۔ بمبئی آنے سے پہلے اُس کا خیال تھا کہ بمبئی کے سے تجارتی شہر میں ملازمت کا مل جانا کوئی مشکل بات نہیں۔ وہ "بی اے" کامیاب تھا، اور اُس کو بی اے کی سند پر بڑا اعتماد تھا۔ اس لئے وہ سمجھے ہوئے تھا کہ کہیں نہیں تو کسی دفتر میں چالیس پچاس روپیہ ماہوار کی ملازمت تو آسانی سے مل جائیگی مگر جب میدانِ عمل میں قدم رکھا تو نہایت تلخ حقیقت بے نقاب ہوئی اور اُس کو معلوم ہو گیا کہ وہ سند جس پر اس کو اس قدر اعتماد تھا بالکل بیکار ہے۔

دسمبر کا مہینہ بمبئی میں بڑی چہل پہل کا ہوتا ہے۔ خوشگوار موسم سیاحوں کی کثرت، تفریح گاہوں میں ہجوم۔ چوپاٹی اور باب الہند پر تو شام کے وقت "رومان" برسنے لگتا ہے۔ خواب آفریں فضا میں گم ہو کر ساحلِ بحر پر سیر کرنے سے بھلا اور کونسی چیز زیادہ فرحت افزا ہو سکتی ہے۔ شام کی خوشگوار اور لطیف ہوا میں بسی ہوئی ہزار ہا خواب آسا مسرت انگیز امیدیں دماغ میں ایک دوسرے سے برسرپیکار ہوتی ہیں اور دل کی گہرائیوں میں ایک ایسی خواہش پیدا ہو جاتی ہے جو سیر کے ساتھ ساتھ بڑھتی جاتی ہے۔ ساحل پر پھرتے ہوئے جوڑوں کی بات بات سے شادمانی ٹپکی پڑتی ہے۔ زندہ دل نوجوان بن سنور کر لڑکیوں کی تاک میں اِدھر اُدھر گشت لگاتے ہیں۔ اور جہاں کہیں کوئی تنہا لڑکی دیکھ پاتے ہیں اُس کا تعاقب کرتے ہیں۔

آج بھی جب مظفر دن بھر کی کوچہ گردی کے بعد شام کو مایوس لوٹا تو "باب الہند" پر اس کے ارد گرد کی فضا لطیف قہقہوں سے گونج رہی تھی، لیکن اس کا دل کہیں دور تاریکی میں بھٹک رہا تھا، اُسے آدمیوں کے ہجوم سے ایک وحشت سی ہونے لگی۔ وہ ساحل سے دور تنہائی میں جا بیٹھا۔

اُس کی زندگی بالکل بے کیف گزر رہی تھی۔ ہر روز صبح بستر سے

اُٹھتے ہی منہ ہاتھ دھو کر تلاش روزگار میں نکل پڑتا۔ اور دن بھر بمبئی کی گلیوں کی خاک چھان کر واپس آتا۔ یہی روز کا معمول تھا۔ وہ گیٹ وے آف انڈیا ہوٹل میں ٹھہرا ہوا تھا۔ لیکن اس کے پاس آئندہ ہفتہ کا کرایہ ادا کرنے کے لئے دام نہ تھے۔ اس کو کسی دوسری جگہ انتظام کرنا پڑے گا ـــــ لیکن کہاں؟ وہ بہت پریشان تھا۔ جس طرح ایک بھٹکا ہوا مسافر دم لینے کے لئے کھڑا ہو کر سوچتا ہے کہ کس قدر راستہ طے کر کے وہ یہاں تک پہونچا ہے۔ لیکن اب کدھر جائے گا؟ کیا کرے گا؟ کیا ساری زندگی یوں ہی بھٹکتے گذر جائے گی۔

اس طرح مظفر کے دل میں اپنی زندگی کے متعلق مختلف سوالات پیدا ہو رہے تھے۔ لیکن کوئی بات سمجھ میں نہ آتی تھی۔ وہ سخت ذہنی کرب میں مبتلا تھا۔ سرمایہ داری کے خلاف اس کے دماغ میں خیالات کا ایک طوفان بپا تھا۔ انسانی عقل ہمیشہ خواہشوں کی غلام رہی ہے۔ ہمارے دلائل ہمیں انہیں فیصلوں کی طرف رہنمائی کرتے ہیں۔ جن کی حقیقت تسلیم کرنے کو ہمارا جی چاہتا ہے۔ اور ہمارا طائر خیال انہیں چیزوں کے گرد پرواز کرتا ہے جس سے ہماری خواہشوں کو تسکین ہوتی ہے۔ دوسری چیزوں کے لئے ہم آنکھ رکھتے ہوئے اندھے ہو جاتے ہیں۔

زمانۂ تعلیم میں مظفر اشتراکی تحریک کی ہنگامہ خیز کارروائیوں اور پرجوش انقلابی لٹریچر سے آشنا ہو چکا تھا۔ مگر اس نے کبھی اس کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔ آج اس کو معلوم ہوا دنیا کو اشتراکیت کی کس قدر ضرورت ہے۔ اگر اس کا بس چلتا تو ایک پل میں دنیا سے سرمایہ داری کا خاتمہ کر دیتا۔ مظفر کے چہرے کا رنگ بدلنے لگا۔ وہ مٹھیاں کس کر کھڑا ہو گیا۔ اس وقت اس کی آنکھوں سے غصے کے شعلے نکل رہے تھے۔ یکایک اس کے سامنے ایک موٹر آکر رک گئی۔ مظفر کو اپنے ماحول کی خبر ہوئی۔ وہ طوفان جو اس کی روح کی گہرائیوں میں بپا ہو رہا تھا کمزور ہونے لگا۔ کچھ دیر بعد ایک لڑکی موٹر سے اتری اور انجن سے چھیڑ چھاڑ کرنے لگی۔ اس کی ظاہری شکل و شباہت سے تو یہی اندازہ ہوتا تھا کہ وہ ایک حسین لڑکی ہے۔ اس کے سر کا آنچل گر کر ہوا میں اڑ رہا تھا۔ اور اس کا اُمڈا ہوا شباب دیکھنے والی نگاہوں کو گناہ کی ترغیب دے رہا تھا۔ مظفر کچھ دیر تک دیکھتا رہا۔ پھر قریب جا کر بولا۔

"کیا میں آپ کی کچھ مدد کر سکتا ہوں"؟

"شکریہ" لڑکی نے مظفر کو ایک نظر دیکھ کر کہا "معلوم نہیں کیا بات ہوئی۔ انجن چلتا چلتا یکایک رک گیا ہے۔ اور اب حرکت ہی نہیں کرتا" اس کے لبوں پر مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔

مظفر نے اور قریب جا کر انجن کا معائنہ کیا تمام پرزے بالکل ٹھیک تھے۔ بظاہر کوئی خرابی نظر نہ آتی تھی۔

"اچھا آپ اسٹارٹ کیجئے" مظفر بولا

لڑکی موٹر میں بیٹھ کر اسٹارٹ کرنے لگی محض آواز پیدا ہوئی لیکن مشین نے حرکت نہ کی۔ اس سے صاف ظاہر تھا کہ پٹرول کی نالی میں کچھ پھنس گیا ہے۔ اور پٹرول نہیں پہونچ رہا ہے۔ مظفر نے پٹرول کی نالی کھول کر دو تین پھونکیں ماریں اور رفٹ کر دیا۔ اس عمل سے موٹر اسٹارٹ ہو گئی، وہ فاتحانہ انداز میں لڑکی کو گھورنے لگا۔ لڑکی نے اس کی نگاہوں کا استقبال اپنی متوالی آنکھوں کی سحر آفریں جنبش اور لبوں کی معنی خیز مسکراہٹ سے کیا اور شکریہ ادا کر کے چلی گئی۔ اس وقت مظفر اپنے آپ میں ایک عجیب تغیر محسوس کر رہا تھا۔ وہ لڑکی کتنی حسین۔ کتنی جمیل تھی۔ یہی خیالات مظفر کے دماغ میں گردش لگا رہے تھے۔ اس کو رات میں بڑی دیر تک نیند نہ آئی۔ بار بار اس کی نگاہوں کے سامنے وہی لڑکی کھڑی ہوئی ہوتی جس کی ہر سانس محبت کی دعوت دیتی معلوم ہوتی تھی۔ معلوم نہیں اس رات مظفر کب تک جاگتا رہا اور کب سویا۔

دوسرے دن جب آنکھ کھلی تو اس کا دل بدستور پریشان تھا اور وہ مسرت انگیز خواب آسا خیالات دماغ سے محو ہو چکے تھے۔ حسب معمول چائے پیکر "ٹائمز آف انڈیا" میں ضرورت ہے کا کالم بڑے انہماک سے پڑھنے لگا۔ اس میں کوئی نئی جگہ تقرر طلب نظر نہ آئی۔ جن تقرر طلب جگہوں کی نسبت اس میں اعلان کیا گیا تھا وہاں سے مظفر پہلے ہی مایوس ہو چکا تھا۔ یکایک ایک کونہ میں اس کی نظر پڑی "ضرورت ہے ایک اردو داں کی" یہ اعلان "نیشنل فلم کمپنی" "لیمنگٹن روڈ بمبئی" کی جانب سے کیا گیا تھا۔ مظفر قسمت آزمائی کے لئے فوراً روانہ ہو گیا۔

نگار خانہ پہونچا تو گیٹ پر ایک سندھی چوکیدار نے اُسے اندر داخل ہونے سے روک دیا۔ مظفر کو بڑا غصہ آیا۔ لیکن سوائے ضبط چارہ نہ تھا۔ بڑی مشکلوں سے سندھی اس کا وہ پرچہ اندر لے جانے پر رضامند ہوا جس پر اس نے اپنا نام اور ملاقات کی غرض لکھدی تھی۔ بہت دیر تک

اس کو باہر انتظار کرنا پڑا۔ آخر کار چوکیدار اُس کو منیجر کے کمرے میں لے گیا جہاں ایک پارسی عینک لگائے بیٹھا تھا اُس نے مظفر کو سر سے پیر تک بغور دیکھکر انگریزی میں سوال کیا۔

"تم ملازمت کے سلسلہ میں آئے ہو؟"

"جی ہاں" مظفر بھی انگریزی میں بولا

"اس سے پہلے کہاں کام کیا ہے؟"

"میں اسی سال بی اے میں کامیاب ہوا ہوں"

"ہم کو بی اے کی ضرورت نہیں معمولی منشی چاہیئے"

"میں بھی اس کام کو بخوبی انجام دے لوں گا"

"بیس روپیہ تنخواہ لوگے"

"بہت تھوڑی ہے"

"اس سے زیادہ نہیں مل سکتی"

منیجر میز پر سے اخبار اٹھا کر پڑھنے لگا۔ مظفر تھوڑی دیر تک سوچتا رہا۔ اس کی جیب بالکل خالی ہو چکی ہے۔ ہوٹل کا کرایہ بھی ادا کرنا ہے۔ بیس روپیہ ہی قبول کر لینے میں مصلحت نظر آئی۔ مظفر بولا۔

"مجھے فی الحال بیس روپیہ منظور ہیں"

"تو درخواست لکھکر دیدو" منیجر اخبار سے نظر اٹھائے بغیر بولا "اور کل سے کام شروع کردو" مظفر نے اسی وقت درخواست لکھکر دیدی۔

دوسرے دن سے وہ کام پر جانے لگا۔ فلم کمپنی کا پبلسٹی منیجر ایک بنگالی تھا۔ اس کو اردو نہ آتی تھی۔ اس لئے اردو اشتہارات کا کام مظفر کے سپرد کیا گیا۔ دن گزرتے رہے۔ بیس روپیہ اُس کے لئے ناکافی تھے۔ وہ نہایت تنگی سے گزارہ کر رہا تھا۔

ایک دن شام کو مظفر کام ختم کرکے مکان جانے کی تیاری کر رہا تھا کہ مالک کمپنی "نگارخانہ" میں آئے۔ اُن کا نام نفضل بھائی ہے۔ لوگ عرفِ عام میں سیٹھ کہتے ہیں۔ یوں تو ہر روز وہ ایک مرتبہ نگارخانے آتے تھے، لیکن آج وہ تنہا نہ تھے۔ ان کے ہمراہ ایک لڑکی بھی تھی۔ مظفر اُس کو دیکھکر چونکا۔ یہ وہی لڑکی تھی جس کی موٹر ایک شام "باب الہند" کے قریب رُک گئی تھی۔ جب وہ اُس کے قریب سے گزری تو دونوں کی آنکھیں چار ہوئیں۔ وہ مسکرائی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ مظفر کو پہچان گئی ہے اُس نے مظفر کی طرف اشارہ کرکے سیٹھ صاحب سے کچھ دریافت بھی کیا۔ معلوم نہیں اس کے متعلق کیا گفتگو ہوئی۔ پہلے تو مظفر سمجھا کہ وہ بحیثیت ایکٹرس کمپنی میں شریک ہوئی ہے۔ لیکن ایک ایکٹر نے بتایا کہ اس کا نام ثریا ہے اور وہ سیٹھ صاحب کی اکلوتی لڑکی ہے۔ جسے سیٹھ صاحب بے حد عزیز رکھتے ہیں۔

دوسرے دن سیٹھ صاحب نے مظفر کو اپنے دفتر میں بلوایا اور یہ خوشخبری سنائی کہ اس مہینہ سے اُس کی تنخواہ چالیس روپیہ کردی گئی ہے۔ مظفر نے رسمی طور پر شکریہ ادا کیا۔ اُس کو تنخواہ میں اضافہ ہونے کی خوشی ضرور ہوئی۔ لیکن دل سینہ میں دھڑکنے لگا۔ معلوم نہیں کیوں؟

اب مظفر دل لگا کر کام کرنے لگا تھا۔ اس نے اشتہارات سے کچھ ایسے ذرائع اختیار کئے کہ فلموں کی آمدنی روز بروز بڑھنے لگی۔ سیٹھ صاحب اُس کے کام سے خوش تھے۔ لیکن پبلسٹی منیجر کے دل کو اُس کی اس ترقی سے سخت دھکا لگا تھا۔ وہ مظفر کے خلاف ہو گیا اور موقع پاکر سیٹھ صاحب سے اُس کے کام کی شکایت بھی کرنے لگا لیکن سیٹھ صاحب پر اس کی شکایت کا کچھ اثر نہ ہوتا تھا وہ مظفر کے کام سے مطمئن تھے۔

مظفر، حسین تو نہیں، لیکن بدصورت بھی نہ تھا۔ عمر کوئی پچیس برس ہوگی داڑھی مونچھ منڈی ہوئی، دوہرا بدن۔ فراخ سینہ۔ صحت بہت اچھی اور چہرہ پر خون کی سُرخی۔ اس کے علاوہ ایک خاص انداز کی بے نیازی، شرمیلا پن اور جوش، اس کی وہ خصوصیات تھیں جو صنفِ نازک کے لئے ہمیشہ کشش کا باعث رہی ہیں۔

اگر ثریا کو مظفر میں دلفریبیاں محسوس ہو رہی تھیں اور وہ اس سے ملاقات بڑھانا اور اس کو معقول نوجوان سمجھکر اپنا ہمراز بنانا چاہتی تھی تو کوئی تعجب کی بات نہیں تھی۔ ثریا اکثر نگارخانہ میں آتی۔ مظفر سے گفتگو کرنے کا موقع نکالتی۔ اس کو اپنے ہمراہ سینما دیکھنے اور سیر کرنے کی دعوت دیتی۔ غرض وہ روز بروز مظفر کی طرف کھنچی ہی چلی آرہی تھی۔

مظفر کی تنخواہ میں اضافہ ہونے لگا ۵۰ — ۶۰ — ۷۰ — ۸۰ — ۹۰ — ۱۰۰ — کس قدر سرعت کے ساتھ اس کی ترقی ہو رہی تھی۔ تمام کمپنی کے ملازم اس کو رشک کی نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔ اور بعضوں کو حسد بھی پیدا ہو گیا تھا۔ خصوصاً پبلسٹی منیجر کا حسد

تو اُس کی ترقی کے ساتھ ساتھ بڑھ رہا تھا۔

مظفر کو ثریا کی محبت کا احساس تھا۔ اس کی دلی آرزو تھی کہ محبت کا جواب محبت سے دیا جائے۔ اور ثریا کو اپنا ہمراز بنائے۔ اُس کے لیل و نہار ثریا ہی کے خیال میں گزر رہے تھے۔ ثریا دل و دماغ میں بسی ہوئی تھی۔ اس کے باوجود وہ اپنے آپ کو ثریا سے دور رکھنے پر مجبور پا رہا تھا۔ لیکن یہ عجیب بات تھی کہ مظفر جس قدر دور رہنے کی کوشش کرتا ثریا اسی قدر قریب آتی جا رہی تھی۔

کئی مرتبہ ثریا نے مظفر کو مختلف مقامات پر ملنے کے لئے لکھا لیکن مظفر نہ گیا۔ ثریا نے جب کبھی شکایت کی مصروفیت کا بہانہ کر دیا۔ مظفر کے دل میں ایک تلاطم خیز طوفان روز بروز زور پکڑ رہا تھا۔ اُسے بعض وقت ایسا محسوس ہوتا کہ وہ پاگل ہو جائے گا۔ مکان پر رہتا تو ثریا کا خیال اس کے ہمراہ رہتا۔ دفتر جاتا تو ثریا اُس کے پیشِ نظر ہوتی۔ تمام دن ایک ہیجان میں مبتلا رہتا، اور رات ناقابل بیان خواہش اور کرب میں گزرتی۔ بھوک اور نیند دونوں اُڑ گئی تھیں۔ جس وقت کھانا کھانے بیٹھتا یہ معلوم ہوتا کہ کھانا منہ سے اُگلا آتا ہے۔ نرم بستر کانٹوں کا بچھونا بن گیا۔ جس پر تڑپنے کے سوا راحت کہاں؟

آج مظفر بہت بے کل تھا۔ رات زیادہ گزر چکی تھی۔ لیکن اُسے نیند نہ آئی دماغ میں عجیب عجیب خیالات پیدا ہو رہے تھے۔ ثریا کا طویل خط ـــــ خط کے حروف اُس کی نگاہوں کے سامنے ناچ رہے تھے۔ کس قدر تاثرات محبت میں ڈوبا ہوا تھا وہ خط! معلوم ہوتا تھا کہ کسی رسالے سے نقل کیا گیا ہے۔ اس میں مظفر کی بے اعتنائی پر شکایت آمیز غصہ کا اظہار رحم و کرم کی التجا۔ دل کی داستان ـــــ عریاں بالکل عریاں۔ اور سب سے آخر میں دور بہت دور۔ جہاں دو محبت کرنے والی ہستیوں کے سوا کوئی نہ ہو گا، چلے جانے کا مشورہ۔ ثریا نے لکھا تھا۔

"مظفر چلو، وہاں جہاں ہم دونوں، پھولوں سے جھکے ہوئے پھلوں سے لدے ہوئے باغوں میں سایہ دار درختوں کے نیچے اعتراف محبت کریں گے اور کوئی ہماری محبت میں خلل انداز نہ ہو سکے گا۔ جب ہمارے اب ایک دوسرے سے پیوست ہونے پر دو پیاسی روحیں متصل ہونگی تو مولسری کی لمبی شاخیں ہم دونوں کے سروں پر لہراتی ہوئی وہی اپنا قدیم راگ گائیں گی جو قدرت نے ازل سے اِن درختوں کو محب و محبوب کے وصال پر گانے کے لئے عطا کیا ہے۔ وہ وقت کس قدر خوشگوار ہو گا مظفر جب کہ ہماری روحوں کی طرح جسم بھی ایک دوسرے کی آغوش میں ہوں گے۔ ہم ایک دوسرے کی گرم سانسیں اپنے رخساروں پر محسوس کریں گے اور ایک دوسرے کے لمس سے بدن میں سنسنی دوڑ جائے گی۔ کیا تم کو اس کا احساس نہیں۔ میرا دل محسوس کر رہا ہے اور میں تمہیں بھی اس احساس میں شریک سمجھتی ہوں۔

تم کہو گے جیسا ہمیشہ کہہ دیا کرتے ہو کہ میں غلطی پر ہوں۔ میں کہتی ہوں غلطیاں سب سے ہوتی ہیں۔ مگر وہ غلطیاں جو زندگی کو وابستہ کر دیں زندگی میں اُن کا سرزد ہونا ہی بہتر ہے۔ تاکہ زیست کا بہترین مقصد حاصل ہو جائے۔

اچھے مظفر کیا تم نہ چاہو گے کہ ثریا تمہارا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیکر ایک ایسی دنیا میں چلی جائے جہاں محبت ہے۔ مسرت ہے۔ دائمی مسرت!"

مظفر کا دل چاہتا تھا کہ ثریا کے ساتھ محبت کی اُس بستی میں جا بسے، لیکن فرض کا احساس! آہ ـــ محبت کی مجبوریاں!! وہ محسوس کر رہا تھا۔ لمحہ بہ لمحہ اس کی زندگی ایسے تاریک راستے پر جا رہی ہے، جہاں رہبری کے لئے روشنی کی ایک کرن تک نہیں۔ وہ سوچنے لگا۔ اب اُسے کیا کرنا ہو گا۔ لیکن کوئی فیصلہ نہ کر سکا۔ اس کی زندگی میں یہ پہلی مشکل تھی، جس میں وہ کسی سے مشورہ نہ لے سکتا تھا۔ اس کے نفس اور ضمیر میں شدید کشمکش ہو رہی تھی۔ آج مظفر شراب پینا چاہتا تھا۔ سرور حاصل کرنے کے لئے نہیں کشمکش سے نجات پانے کے لئے۔

وہ اٹھا اور اپنی جیب میں ثریا کا خط تلاش کرنے لگا۔ لیکن خط غائب تھا ادھر اُدھر سارا گھر تلاش کیا، کچھ پتہ نہ چل سکا۔ تھک کر مایوس ہو گیا۔ صبح ہو رہی تھی، پلنگ پر لیٹتے ہی آنکھ لگ گئی۔

جب مظفر کی آنکھ کھلی تو کافی دن چڑھ آیا تھا۔ وہ غسل اور ناشتہ سے فارغ ہو کر بارہ بجے دفتر پہونچا۔ آج پبلسٹی منیجر اس کو دیکھکر مسکرا رہا تھا، اس کے لبوں پر فاتحانہ مسرت کھیل رہی تھی۔ مظفر حسب معمول اپنے کام میں مشغول ہو گیا۔ تھوڑی دیر بعد ایک چپراسی نے اطلاع دی کہ سیٹھ صاحب اُسے بُلا رہے ہیں۔ وہ سمجھا کہ آج پھر کوئی خوشخبری

سنائی جائے گی۔ لیکن جب وہ سیٹھ صاحب کے دفتر میں پہونچا تو اُن کا خوفناک چہرہ دیکھکر دل دھک دھک کرنے لگا۔ وہ مظفر کو نفرت سے گھور رہے تھے۔ اُن کی آنکھوں سے غصے کے شعلے نکل رہے تھے۔ آخر وہ اپنے مشتعل جذبات کو ضبط کرکے بولے۔

"جاؤ اپنا منہ کالا کرو۔ اب میں تمہاری صورت دیکھنا نہیں چاہتا۔"

مظفر حیران تھا اُس کی سمجھ میں کچھ نہ آیا یہ کیا ہو رہا ہے۔ اُس نے سیٹھ صاحب سے پوچھا۔

"میرا کوئی قصور؟"

"قصور! قصور!!" سیٹھ صاحب نے گرج کر دانت پیستے ہوئے کہا "شہدا کہیں کا۔ شرم تو نہ آئی، پوچھتے ہوئے اپنے کرتوت؟" یہ کہتے ہوئے وہ خط مظفر کے آگے بڑھا دیا، جو اس کو ثریا نے تحریر کیا تھا۔

اس وقت مظفر کو وہاں کی ہر چیز گردش کرتی ہوئی نظر آئی اور اُس کی سانس رُکنے لگی۔ وہ خاموش نگار خانے سے باہر چلا گیا۔

آج شام کو جب مظفر "باب الہند" پر سے گزر رہا تھا، اُس کے دماغ میں پھر وہی اشتراکی خیالات کا ہجوم تھا اور شدت کے ساتھ اشتراکیت کی ضرورت محسوس ہو رہی تھی۔

شاید یہ اُس کی عقل کا قصور تھا۔ ——————

ہندوستان کا شاعر

چمن میں محوِ دلِ داغدار ہے جو شخص
غریقِ اشکِ لبِ جوئبار ہے جو شخص

عزیز پر نہ تصرف نہ غیر پر قابو
ہر ایک طور سے بے اختیار ہے جو شخص

امینِ رازِ دو عالم ہے جو زمانے میں
نگاہِ خلق میں بے اعتبار ہے جو شخص

ہزار منزلیں طے کرکے علم و حکمت کی
رہینِ گردشِ لیل و نہار ہے جو شخص

سنوار کر خمِ گیسوئے شاہدِ فطرت
ہلاکِ کشمکشِ روزگار ہے جو شخص

دکھاکے اہلِ ترقی کو شاہراہِ وقار
اسیرِ پیچ و خمِ رہگزار ہے جو شخص

جہانِ غم کو عطا کرکے عشرتِ جاوید
تردداتِ والم کا شکار ہے جو شخص

نوائے شعر سے عالم کو پُرسکوں کرکے
فگار و مضطرب و بیقرار ہے جو شخص

بس اِس خطا پہ کہ اس دور میں ہے صرفِ کمال
خراب و خستہ و رُسوا و زار ہے جو شخص

قصور یہ ہے کہ ہے تاجدارِ ملکِ ادب
جہاں میں مستحقِ قتل و دار ہے جو شخص

ہر ایک شخص پہ ہے جس کے نطق کا احسان
ہر ایک شخص کا منت گزار ہے جو شخص

وہ، باغِ دل کا جسے عندلیب کہتے ہیں
اُسی کو شاعرِ حسرت نصیب کہتے ہیں۔

مائلِ نقوی

شاعر و شاعری

مضرابِ الم سے تارِ نفس کو چھیڑتے ہیں ہم راتوں میں
آساں نہ کہو آسان نہیں، الہام کے نغمے باتوں میں (نہال)

شاعری عبارت ہے درحقیقت اُس الہام آمیز ناگزیر کیفیات سے جو قلبِ انسانی میں چراغِ روحانیت روشن کرتی ہیں۔ وہ محض حسنِ قافیہ پیمائی کا نتیجہ نہیں ہوتی بلکہ بقولِ حافظ ؎ اُوانچہ اُستادِ ازل گفت ہمی می گویم
پر مبنی ہے، اور خود شاعر عالمِ تخیل کا بادشاہ۔ اپنے ادب کا حاکم، ٹوٹے ہوئے دل کی صدا۔ دُکھے ہوئے دل کا مرہم اور ترجمانِ جذبات ہے۔ وہ شاہکارِ فطرت، خسرِ واقلیمِ لطافت۔ ہمرازِ قدرت اور مخبرِ کائنات ہے۔ وہ حق کا آئینہ بردار اور حُسن کی لامحدود رنگینیوں کا مصورِ اعظم ہے۔ وہ ہر جمال میں ازلی اور ابدی حسن کا نظارہ کرتا ہے۔ جب وہ کسی حسین چیز کو دیکھتا ہے تو تمام کائنات اُس کے سامنے رقص کرنے لگتی ہے۔ کونین کی ہر شے اُس کو رنگین نظر آتی ہے اور اُس کو دعوتِ بیخودی دیتی ہے اور تا آنکہ وہ ؎ خلوتِ یا دِ یار میں کوئی خیال رہ نہ جائے
کو اپنا مسلک بناکر دنیا و مافیہا سے بیخبر ہو جاتا ہے۔ گم ہو جاتا ہے اور رندِ ہوش ہو جاتا ہے اور اس عالمِ لطیف میں پرواز کرنے لگتا ہے ؎

جہاں خلش کو سکونِ عظیم کہتے ہیں
جہاں نگاہ کو برقِ کلیم کہتے ہیں (رشن)

اور جہاں تمام فضائے بسیط میں ایک بحرِ لطافت موجزن ہے، اور جب یہ طوفانِ جذبات کم ہو جاتا ہے امواج حدودِ ساحل سے تجاوز کرنے سے قاصر ہو جاتی ہیں، طغیانی مائل بہ سکون ہو جاتی ہے۔ تو شاعر گرداب سے ایک درِ شہوار لیکر بلند ہوتا ہے، اور دُنیا کے سامنے ایک نایاب تحفہ پیش کرتا ہے۔ اسے دنیا والے مختلف طریقوں سے تعبیر کرتے ہیں، بعض اس سے متفق ہیں ؎

حُسن آئینۂ حق اور دل آئینۂ حُسن
دلِ انساں کو ترا حسنِ کلام آئینہ (اقبال)

اور چونکہ "طبعِ سلیم فضل است ارثِ پدر نباشد" اس لئے بعض قلوب ایسے بھی ہیں جو اُسکی لطافت کو محسوس کرنے سے قاصر ہیں، اور اُس کو محض "شاعرانہ خیال" "خللِ دماغ" اور "مشغلۂ بیکاری" سے تعبیر کرتے ہیں۔ اگر کوئی جاں بہ لب ہو اور آبِ حیات کو سمِ قاتل خیال کرے، مجروح ہو اور مرہم کو نمک سمجھے تو یہ سمجھنے والے کی غلطی ہے نہ کہ مرہم اور آبِ حیات کا قصور۔ اُن کا یہ عقیدہ ہے کہ متقدمین میں سب اور متاخرین میں بعض شعراء "خمِ کاکل" اور اپنے "ذہنی محبوب" کے ظلم و ستم میں ایسے پھنسے ہیں کہ اس سے اُنکی گلو خلاصی کبھی نہیں ہوتی، اور اس لئے جو کچھ وہ کہتے ہیں، عالمِ تخیل ہی تک محدود ہے اور عملی زندگی کے لئے بیکار محض، اس خیالِ خام کی تردید کے لئے حضرتِ غالب کا صرف ایک شعر کافی ہے۔ ؎

ترے تیرِ نیم کش کو کوئی میرے دل سے پوچھے
یہ خلش کہاں سے ہوتی جو جگر کے پار ہوتا

بادی النظر میں یہ شعر ایک اچھا تخیل ہو سکتا ہے مگر ایک پرجوش پیغامِ عمل ہرگز نہیں کہا جا سکتا۔ لیکن کسی چیز پر سطحی نظر ڈال کر اُس کے حُسن و قبح کا فیصلہ کرنا عقلمندی کا شیوہ نہیں، اگر اُس کا غائر مطالعہ کیا جائے تو یہ ظاہر ہو گا کہ شاعر نے اسمیں آلامِ روزگار کا مقابلہ کرنیکی بہترین تعلیم دی ہے۔ وہ یہ کہتا ہے کہ بغیر مشکلاتِ زندگی ایک پھول ہے بے رنگ و بو۔ ایک ساز تہی از نغمہ و سوز اور ایک گوہر بے آب و تاب ہے۔ آپ خود ہی غور فرمایئے۔ اگر آپ کی تمام خواہشات پوری ہو جائیں تو چند روز تک اُن سے لطف اندوز ہونے کے بعد آپ کی طبیعت سیر ہو جائے گی اور تمام دنیا آپکی نظر میں پھیکی پڑ جائیگی۔ شاعر اس بے لطفی کا سخت دشمن ہے۔ آپ کو اپنی کسی اُمید کے بر آنیکی اصلی خوشی اُسی وقت ہو گی جبکہ آپ نے اُس کو کافی عرقریزی اور جانفشانی کے بعد حاصل ہو۔ اگر دُنیا میں مشکلات نہ ہوتیں تو خواہشات اور حسرتیں بھی مفقود ہو جاتیں، اب آپ یہ کہیں گے کہ ان سب باتوں کو وہ سادہ الفاظ میں ادا کر سکتے تھے۔ آپ کا کہنا سر

آنکھوں پر، مگر یہ خیال رہے کہ ؎

ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو — بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر (غالب)

کتنا ہی خشک مسئلہ کیوں نہو اگر اس میں تھوڑی سی رنگ آمیزی کر دی جائے تو وہی سحرِ کلام ہونے لگتا ہے اگر حضرت غالب بھی اس موضوع پر ایک مقالہ لکھ دیتے تو یہی مسئلہ وبالِ جان ہو جاتا اور اُس کی تمام ادبی خوبیاں مفقود ہو جاتیں۔ درحقیقت شعر ایک آئینہ ہوتا ہے جس میں ہر غور کرنیوالے کو اپنے ضمیر اور نفس کی اچھی اور بُری شکلیں نظر آتی ہیں، اور شعر کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ سامعین کو بھی اپنے رنگ میں رنگ دے۔ اسی طرح ان عمیق مسائل کو جنھیں فلسفی اور مدبرینِ روزگار مختصر اور پُراثر انداز میں حل نہ کر سکے۔ ایک شاعر سلاست اور روانی کیساتھ ادا کرتا ہے۔ اُس کے ثبوت میں چند اشعار سن لیجئے ؎

کچھ میری نظر نے اُٹھ کے کہا کچھ اُنکی نظر نے جھک کے کہا
جھگڑا جو نہ چکتا برسوں میں طے ہو گیا باتوں باتوں میں (آرزو لکھنوی)

فلسفہ تا ایں دم "افتادہائے عشق" کی توضیح کرنے میں قاصر رہا۔ لیکن شاعر اسے بھی نہایت پُرلطف اور پُراثر انداز میں بیان کرتا ہے۔ حضرتِ جگر فرماتے ہیں ؎

یہ عشق نہیں آساں اتنا ہی سمجھ لیجئے — اک آگ کا دریا ہے اور ڈوب کے جانا ہے

حضرت میر نے ایک ہی شعر میں فلسفۂ حیات و ممات کو حل کیا ہے ؎

زندگی ماندگی کا وقفہ ہے — یعنی آگے چلیں گے دم لے کر

رُوح کے متعلق مذہب ہمیں یہ بتاتا ہے کہ رُوح ترکیب ہے اُس حکم سے جو اللہ تعالیٰ نے روزِ ازل پیکرِ انسانی میں جان پڑنے سے پیشتر صادر فرمایا تھا۔ حشر میں رب العلمین انسان سے (یا یوں کہئے کہ خود اپنے حکم یا اپنی ذات سے) دریافت کرتا ہے "مَنْ رَبُّکُمْ" ایسے مُعمّے شاعر ہی حل کرتا ہے۔ چنانچہ فانی صاحب فرماتے ہیں ؎

خطابِ روزِ حشر کی صدائے بازگشت ہو — جوابِ بے سوال ہوں سوالِ لاجواب کا

روزِ ازل جب انسان کی تخلیق ہو چکی اور شیطان راندۂ درگاہ ہو چکا تو اُس نے بارگاہِ الٰہی میں عرض کی کہ "اے پروردگار تیری یہی مخلوق تجھکو بُرا کہے گی، تجھے اپنا خالق نہیں ملنے گی اور تیری ہمسری کا دعویٰ کریگی"۔ پس اِس اعتراض کا جو رد کیا گیا اُسے بھی شاعر ہی بتا سکتا ہے، اُس کے متعلق ارشادِ جگر ہے ؎

دل کے لئے الفت کی قیدیں ہی مناسب تھیں — دیوانہ یہ ایسی ہی زنجیر کے قابل تھا

اسی طرح جبر و قدر کے مسئلہ کو حل کرنیکی کوشش بڑے بڑے جلیل القدر فلسفیوں اور جید علماء حدیث نے کی۔ مگر اُن کی ساری کاوشیں نقش بر روئے آب اور تمام مساعی لاحاصل ثابت ہوئیں۔ آخر "ہمراز قدرت" نے اس حوصلہ شکن اور ظرف طلب عقدہ کو بھی حل کر دیا۔ جنابِ فانی کا ارشاد ہے ؎

قلب و دماغ۔ ادراک اور حواس — مجھ سے منسوب ہیں مجھ سے مغلوب

اب مخالفینِ شاعری کے طبلِ تہی کا بھرم صرف اس بات پر ہے کہ جب کسی قوم کی شاعری کا آفتابِ عروج اپنے نصف النہار پر ہوتا ہے تو اُس وقت قوم قعرِ مذلت میں مسکون ہوتی ہے۔ مگر یہ محض اُس کا سُوئے ظن ہے۔ ذرا ٹھنڈے دل سے غور فرمائیے کہ کیا یہ انسانی دماغ کا خاصہ نہیں ہے کہ جب وہ اپنی لقائے حیات کی لازمی چیزوں سے فارغ ہو جاتا ہے تو ان متعلقاتِ بعیدہ کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔ جن کی اُسکی موجودہ زندگی سے کوئی براہِ راست تعلق نہیں۔ اب اس قوم میں تہذیب و تمدن علوم و فنون کا دور دورہ ہوتا ہے اور جبکہ قوم اپنے تمام ارتقائی منازل طے کر چکی ہے اُس وقت شاعری معارضِ وجود میں آتی ہے اور چونکہ قومی ارتقاء اُس وقت اپنے معراجِ کمال پر ہوتا ہے اس لئے اُس کا "ہر کمالے را زوالے" سے مفر ناممکن ہو جاتا ہے اور جوں جوں یہ قوم زوال پذیر ہوتا رہتا ہے آفتابِ شاعری مائل بہ عروج ہوتا جاتا ہے، تا آنکہ وہ ساعت آجاتی ہے جبکہ قوم تحت الثریٰ اور شاعری عرش پر متمکن نظر آتی ہے۔

اس لئے یہ کہنا کہ شاعری قوم کے لئے باعثِ زوال ہے سراسر ہٹ دھرمی ہے۔ اس نازک وقت میں بھی اگر کوئی ہستی ایسی ہو سکتی ہے جو کشتیٔ قوم کو گرداب سے نکالے تو وہ شاعری ہے اگر اس دورِ نزع میں اہلِ قوم شاعر سے مدد حاصل کرلیں تو یہ کشتیٔ طوفان زدہ پھر آسودۂ ساحل ہو جائے۔ مگر ہمارے مصلحین کی عقلوں پر تو ایسے پتھر پڑ گئے ہیں کہ وہ شاعری کو شجرِ زندگی کی ایک شاخِ بریدہ تصور کرتے ہیں۔

الامان والحفیظ! شاعری جس کی رسائی نفسِ باطن تک ہے، جو احساسات کیفیات اور تحریکاتِ باطنی کو عالمِ وجود میں لے آتی ہے اُسے انسانی زندگی سے کوئی تعلق ہی نہیں ـــ گویا رُوح کو جسم سے اور دل کو جان سے بے تعلق کر دیا ؎

بریں عقل و دانش بباید گریست

یہ ہے فنِ لطیف کی قدر و منزلت جس پر تہذیبِ جدید کو ناز ہے۔ لیکن یہ خود اپنے ہی عمل سے شاعر کو عضوِ معطل اور غیر ذمہ دار ہستی قرار دیتی ہے جس کی بناء پر آج وہ ایسا ہوا باز ہو گیا ہے کہ سوائے پروازِ عالمِ بالا کے اسے دنیائے عمل سے کوئی تعلق ہی نہیں رہا۔

اخلاقی کتابوں میں ریاکاری کی مذمت میں دفتر کے دفتر بھرے پڑے ہیں۔ لیکن جو اثر عمر خیام کی ایک رُباعی کا ہو سکتا ہے وہ اِن ضخیم تصانیف کے

پڑھنے سے بھی نہیں ہو سکتا ؎

زاہد بہ زنِ فاحشہ گفتہ مستی — کز خیر گسستی و بہ شر پیوستی
زن گفت چنانکہ می نمایم ہستم — تو نیز چنانکہ می نمائی ہستی

اب ایک سوال یہ ہے کہ آخر شاعر اتنا موثر کیوں ہوتا ہے۔ اول تو یہ کہ شاعری محاکات کا نام ہے۔ اور محاکات کے متعلق مولانا شبلی فرماتے ہیں:" یہ ایک مسلم امر ہے کہ اگر کوئی چیز بذات خود مکروہ ہو مگر جب کوئی مصور اُس کی تصویر اُتارتا ہے تو وہ کتنی بھلی معلوم ہوتی ہے۔ دوسرے یہ کہ دنیا کی کل فلسفہ اور سائنس نہیں چل رہی ہے۔ بلکہ یہ مبنی ہے محض جذبات پر۔ پھر شاعری نام ہے جذبات کا، یہ اس مثال سے اور واضح ہو جاتا ہے کہ اگر کسی کا جوان بیٹا مر جائے تو فطری امر یہ ہے کہ وہ نوحہ کرے گا۔ مگر جب وہ اس واقعہ کے متعلق سائنس سے رائے لے گا تو یہی جواب ملے گا کہ دفعتاً حرکتِ قلب بند ہو گئی یا اعضا نے اپنا کام بند کر دیا، جو ایک ناگزیر واقعہ ہے۔ اس لئے رونا دھونا محض بیکار ہی نہیں بلکہ بزدلی کی دلیل ہے۔ لیکن کیا کوئی سائنسداں یا دنیا میں کوئی شخص بھی اس پر عامل ہو سکتا ہے۔ اور اگر یہ حالت ہو بھی جائے۔ تو دنیا قالب بیجان، گل بے رنگ اور شراب بے کیف ہو کر رہ جائے"

جلوۂ اوبے کلیم شعلۂ اوبے خلیل

شاعر انقلاب کا دلدادہ ہے۔ اُس کو کسی کروٹ قرار نہیں۔ وہ "ہر جلوہ" میں کلیم ڈھونڈھتا ہے۔ اور ہر شعلہ میں ایک "خلیل" مانگتا ہے۔ اُس کی روح بے چین ہے، وہ خود بے چین ہے۔ وہ ہر اُس چیز کا جو مائل بہ انحطاط ہے دشمن ہے، وہ زخموں سے کلیجے کو بھر دے برباد سکونِ دل کر دے" کی صدائیں لگاتا رہتا ہے۔ وہ ہمہ تن اضطراب ہے ؎

ہر جگر ہنگامۂ محشر بزن — شیشہ بر سر دیدہ بر نشتر بزن (اقبال)

پر عامل ہے اور دنیا کو بھی اسی پر عامل دیکھنا چاہتا ہے۔ جس کو دنیا سکون کہتی ہے وہ اُسے "مردنی" سے تعبیر کرتا ہے۔ جسے دنیا خللِ دماغ کہتی ہے وہ اُس کو حاصلِ زندگی سمجھتا ہے جو دنیا کی نظروں میں قہر ہے وہ اُس کے معیارِ نظرت میں عین رحم ہے جس کو دنیا رحم کہتی ہے وہ اس کے نزدیک ننگِ انسانیت ہے جس کو دنیا بربادی قرار دیتی ہے وہ اُس کے لئے سامانِ دلبستگی ہے ؎

بہلانہ دل نہ تیرگیٔ شامِ غم گئی — یہ جانتا تو آگ لگاتا نہ گھر کو میں (فانی)

دنیا جسے دعا کہتی ہے وہ اُس کو "خالق پر ایک اعتراضِ پنہاں" کہتا ہے وہ تو یہ دعا مانگتا ہے ؎

اپنے دیوانے پر اتمام کرم کر یارب — درو دیوار دیئے اب اُنھیں ویرانی دے

(خدا کی پناہ! بخدا شعر لکھتے وقت ہاتھ کانپ گیا۔ دل کی اب بُری حالت ہے مضمون کا اب خدا حافظ ہے) اب اگر اس شاعری کو بھی کوئی فن سے تعبیر کرے تو یقیناً دنیائے لطافت میں اس سے زیادہ مکروہ گنہگار اور کوئی نہیں ہو سکتا ہے۔ یہ کتنی بڑی غلطی ہے کہ جذبات کو فن ٹھہرایا جاتا ہے۔ اس میں موازنہ کیا جاتا ہے اُن کو محض ایک فنی نقطۂ نظر سے جانچا جاتا ہے۔

شاعر کی زندگی نام ہے مسلسل نزع اور دائمی اضطراب کا۔ اُس کا یہ یقین واثق ہے کہ ؎

ہم جلائے گئے ہیں مرنے کو — اس کرم کی سہار کون کرے

بعض کوتہ بیں اور تنگ ظرف یہ اعتراض کرتے ہیں کہ آخر شاعر اکثر ہمہ تن آلام اور مرثیہ متشکل کیوں رہتا ہے! اور اس ہر وقت کی آہ و زاری اور نالہ و فریاد کے کیا معنی؟ وہ حضرات ذرا غور کریں کہ کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ دنیا میں مسرت سے زیادہ کوئی لغو لفظ موجود نہیں۔ کیا یہ صحیح نہیں کہ نشاط تمہید الم ہے۔ کیا یہ درست نہیں کہ خوش وقتی ناپائیدار ہے اور غم ازلی و ابدی ہے؟ کیا وہ اس سے منکر ہیں کہ صحیح مسرت کا دنیا میں فقدان ہے اور الم کی ہر جگہ بہتات۔ کیا وہ اس سے متفق نہیں کہ زندگی خود ایک مرثیہ ہے عالم وجود میں آنے کا جو وقت تولید سے تا ہنگام نزع جاری رہتا ہے۔ کیا حقیقت نہیں کہ دنیا میں اضطراب سے مفر ناممکن ہے۔ اور کیا وہ اس سے انکار کرتے ہیں کہ سکونِ قلب دنیا میں عنقا ہے۔ ہرگز نہیں۔ اس کا اعتراف ناگزیر ہے۔ پھر آپ ہی انصاف کریں کہ ایک شاعرِ سنجیدہ ایسے وہمِ باطل کی جستجو کیسے کر سکتا ہے وہ تو فطرت کا علمبردار ہے۔ اور حقیقت کا جویاں۔

اب رہا یہ کہ شاعر کی تغیر طلبی اور ہنگامہ پسندی تہذیب و تمدن، سائنس، اور علوم کے اُٹھتے ہوئے طوفان کی کہاں تک حریف ہو سکے گی۔ یہ بحث فرصت طلب ہے۔ شاعر بہر حال اپنا کام کر رہا ہے اور دنیا کو پیغام حق دے رہا ہے۔ اُس کو اس سے بحث نہیں کہ آپ کیا سمجھے اور کیا نہیں۔ وہ تو ایک حساس فطرت کے نقوش بے بہا پھینک رہا ہے۔ اور اپنے فرض سے سبکدوش ہو رہا ہے۔ شاعر کی نگاہوں میں بیم و خوف انسان کے لئے گناہ ہے۔ بدترین ارذل ترین، اسفل ترین "اثم عظیم کبیرہ" اس لئے وہ اس معصیت کو

بند کرکے ضمیر انسانی میں چراغ آرزو روشن کرنا چاہتا ہے۔ ~

ضمیر لالہ میں روشن چراغ آرزو کر دے
چمن کے ذرّے ذرّے کو شہید جستجو کر دے
(اقبال)

ہر دفعہ نئے لباس میں شاعر کی رُوح نویدِ عمل لے کر آتی ہے، اور ہر مرتبہ مُردۂ حیات پہ پیغمبر دیتا ہے اور یوں صورِ بیداری پھونک دیتاہے ~

اسرارِ ازل جوئی بر خود نظرے وا کن
یکتائی و بسیاری پنہانی و پیدائی
برخیز کہ فروردیں افروخت چراغِ گل
برخیز و دمے بنشیں، با لالۂ صحرائی
(اقبال)

لیکن اس نام نہاد تمدنِ حاضرہ کے دورِ ابتذال میں جبکہ ایک نحوست قلبِ انسانی پر مسلط ہے۔ اگر شاعر کی صدائے حق بہ سُنی بھی گئی تو بھی آپ نہیں کہہ سکتے کہ وہ اپنے فرض سے غافل ہے، وہ اب بانگِ عمل دیتا ہے ~

اُٹھ کہ ظلمت ہوئی پیدا اُفقِ خاور پر
بزم میں شعلہ نوائی سے اُجالا کر دیں
(اقبال)

اہلِ محفل کو دکھا دیں اثرِ صیقلِ عشق
سنگِ امروز کو آئینۂ فردا کر دیں
(اکبر مرزا)

لیٹر بکس

غور کر. ہاں غور کر، اے دوست لیٹر بکس پر
اس کے پہلو میں نہاں ہیں رازہائے خیر و شر

اس کے سینے میں ہیں وہ وہ داستانیں دل خراش
جن کو سُن کر سنگ و آہن کا بھی دل ہو پاش پاش

اس میں وہ افسانہائے بے بسی پوشیدہ ہیں
جن کی ہیبت سے زمین و آسماں لرزیدہ ہیں

اس میں ہیں بیواؤں آہیں یتیموں کی فغاں
آنسوؤں کی مشعلیں ہیں آہ کی چنگاریاں

اس میں ہے دوشیزگی کی داستانوں کا لہو
کیف میں ڈوبے ہوئے رنگیں فسانوں کا لہو

اس میں ہیں وہ وہ قیامت آفریں راز و نیاز
جس کے سوزِ غم سے ہو فولاد کا سینہ گداز

اس میں ناکاموں کی آہیں ہیں پریشانوں کے حال
فاقہ مستی کے فسانے بیوگی کی قیل و قال

نو عروسی اُلجھنوں کے رازہائے دل خراش
پارہ پارہ دل ہیں جن کے اور کلیجے پاش پاش

خون میں لتھڑی اُمیدیں درد میں ڈوبی اُمنگ
جن کے ہر پہلو سے ظاہر صبر ایوبی کا رنگ

نغمۂ شادی بھی ہے حالِ دلِ بیتاب بھی
ایک ساغر میں آتش بھی ہے اور سیماب بھی

قہقہوں کی اس میں کثرت اس میں غم کا جوش ہے
یہ مگر لب ہائے فطرت کی طرح خاموش ہے

مسیح الحسن بقا نقوی

نو مشقی کے اثرات سے قطع نظر کرتے ہوئے شاعرانہ تخیل کے لحاظ سے ملاحظہ فرمائیے

انشائے لطیف

ادیب العصر حضرت لطیف الدین احمد اکبرآبادی کے افسانے

اردو ادب میں صاحبِ "لالہ رُخ" کا نام محتاجِ تعارف نہیں اور افسانہ نویسی کا جو معیار ل احمد نے پیش کیا ہے وہ اپنی جگہ تنہا ایک مثال ہے۔ اُن کا افسانہ علم و حکمت، جذبات، واردات، اور نفسیاتِ حسن و عشق کے نازک ترین اشارات کا حامل ہوتا ہے۔ اِن کا طرزِ انشا شعریت اور تفلسف اردو ادب میں مستقل اضافات ہیں۔ ل احمد صاحب کے افسانے بلا شائبہ تغلیط ترقی یافتہ زبانوں کے مقابلے میں رکھے جاسکتے ہیں۔ انشائے لطیف ل احمد صاحب کے پندرہ شہ پاروں کا مجموعہ ہے جو اکثر نگار اور دیگر مجلاتِ علمیہ و ادبیہ میں طبع ہو کر مقبولیتِ دوام حاصل کر چکے ہیں۔ اس لئے اگر آپ کو سلاست و نفاستِ زبان کے ساتھ نفسیاتِ شباب اور جذباتِ حسن و عشق کی صحیح نقاشی سے کوئی خاص لگاؤ ہے۔ اگر آپ ادب و شعریت کا ذوقِ سلیم رکھتے ہیں تو اس مجموعہ میں آپ کو اپنی طلب و تشنگی کے لئے مکمل سامانِ سیرابی نظر آئے گا۔ طباعت و کتابت روشن و بہترین ہونے کے ساتھ کراؤن سائز پر تقریباً ڈھائی سو صفحات کی ضخامت۔ نفیس جلد اور قیمت صرف دو روپے عار

نغمات

نثر کی شاعری

ادبِ اردو میں جناب ل احمد کی تنہا وہ ہستی ہے جس نے حسن و عشق کی واردات و نفسیات کو انتہائی مطالعۂ فکر کے ساتھ اپنی ذاتی تاثرات و تکیفات کے ماتحت شعریت موسیقی یا موسیقیتِ شعر کی صورت میں صفحاتِ سادہ کو فردوسِ خیال بنا دیا ہے۔ اس مجموعہ میں جنابِ لطیف کے ساٹھ مختصر ترین فسانے اور ادب پارے شامل ہیں جنھیں نثر کی شاعری کے شہ پاروں کا ایک وجد آفرین کارنامہ کہا جا سکتا ہے۔ یہ کتاب بھی مکمل ترتیب و تہذیب کے بعد تیار ہو چکی ہے۔ اگر آپ اپنی زبان کی نزاکت و لطافت کا اندازہ کرنا چاہتے ہیں تو اس کتاب کو ضرور منگائیے قیمت صرف ۱۲ علاوہ محصول ڈاک

منیجر کلیم بک ڈپو حسینی لو اس نمبر ۴ دریا گنج دہلی سے منگائیے

شاعرِ انقلاب حضرتِ جوش ملیح آبادی

کی

چار پرانی تصانیف

حضرتِ جوش نے ایک مدت ہوئی چار چھوٹے چھوٹے رسائل طبع کرائے تھے لیکن اُن کی شاعرانہ بے نیازی نے اس کی اجازت نہ دی کہ اُنھیں شائع کرتے اتفاق سے یہ چیزیں میری نظر سے گزریں تو مناسب معلوم ہوا کہ اُن کی قیمت غیر معمولی طور پر کم کر کے اُنھیں شائقین کے ہاتھوں تک پہنچا دیا جائے۔

(۱) جذباتِ فطرت حضرتِ جوش کی وہ معرکہ آرا نظم ہے جس میں مظاہرِ قدرت کی طرف سے شعرائے اردو کی خدمت میں یہ اپیل کی گئی ہے کہ وہ پرانی روش کو ترک کر دیں۔ قیمت ۳ رعایتی ۱ر

(۲) اوراقِ سحر یہ حضرت جوش کے اُن لطیف چھوٹے چھوٹے جملوں کا مجموعہ ہے جس میں سحر خیزی کے محاسن بہت لطیف پیرایہ میں بیان کئے گئے ہیں۔ قیمت ۵ر رعایتی ۲ر

(۳) آوازۂ حق یعنی معرکۂ تسلیم و رضا کے سب سے زبردست اور عدیم المثال ہیرو، اور جنگِ حق و باطل کے سب سے بڑے سادنت حسینؓ ابنِ علیؓ کے خونِ ناحق اور صبر و استقلال کا ایک عظیم الشان مرقع اور آپ کی اخلاقی اور روحانی تعلیم کا ایک نہایت درخشاں آئینہ، قیمت ۸ر رعایتی ۳ر

(۴) مقالاتِ زریں یہ حضرت جوش کے نادر کلمات، فلسفیانہ اقوال اور ادبی لطافت کا دلچسپ اور کار آمد مجموعہ ہے۔ قیمت ۱۱ر رعایتی ۴ر

پورے سٹ کی رعایتی قیمت ۱۰ر محصول ڈاک ۲ر وی پی منگانے کی زحمت نہ فرمائیں۔ بلکہ ڈاک کے ٹکٹ بھیج کر طلب کریں۔

ملنے کا پتہ

منیجر کلیم بک ڈپو۔ حسینی نو اس نمبر ۴ دریا گنج دہلی

مکتبہ جامعہ کی نئی شاخ

مکتبہ جامعہ کی بنا دعلی گڑھ میں ایک دوکان کی حیثیت سے رکھی گئی تھی۔ لیکن اللہ کے فضل وکرم، کارکنوں کی پیہم جدوجہد اور اربابِ ذوق کی ہمت افزائیوں کی بدولت اب وہ ہندوستان میں اردو کتابوں کی اشاعت کا ایک اہم مرکز بن گیا ہے، پہلے اس نے ایک شاخ دہلی میں شہر والوں کی سہولت کے لئے کھولی۔ لاہور میں اہلِ پنجاب کی خاطر مستقل انتظام کیا گیا، اور اب صوبۂ متحدہ کے پایۂ تخت (امین آباد) لکھنؤ میں بھی ایک شاخ یکم اگست سے کھول دی گئی ہے۔ امید ہے کہ اودھ اور خصوصاً لکھنؤ کے اربابِ ذوق اس سے فائدہ اُٹھاکر ہماری ہمت افزائی فرمائیں گے۔

صدر دفتر: مکتبہ جامعہ۔ نئی دہلی

شاخیں: دہلی — لاہور — لکھنؤ

بنام قوت وحیات

کلیم دہلی

آئے گا نہ جانے کب زمانہ اپنا
قدرت سے ملا ہے مجھکو صد حیف یہ حکم

آگے کئی صدیوں ہے فسانہ اپنا
بہروں کو سنائے جا ترانہ اپنا

منظور شدہ
ڈائرکٹران تعلیم
ریاستہائے میسور، پٹیالہ وحیدرآباد دکن

سالانہ چندہ چھ روپے
ششماہی چندہ تین روپے آٹھ آنے

چندہ سہ ماہی دو روپے
قیمت فی پرچہ نو آنے

جلد ۷ | فہرست مضامین بابتہ ماہ نومبر سنہ ۱۹۳۸ء | نمبر ۵

نمبر شمار	عنوان	مضمون نگار	نمبر صفحہ
۱	اشارات	مدیر	۳۴۶
۲	انسان کا مستقبل (نظم)	جوش ملیح آبادی	۳۵۲
۳	قوائے ذہنی کے سربستہ راز الخ	"ناظر"	۳۵۳
۴	ظالم سماج	جناب مجید امجد صاحب بی اے مدیر عروج جھنگ	۳۵۵
۵	دو بچے	مترجمہ جناب محمد رضا صاحب انصاری	۳۵۶
۶	تصور جمال	جناب ل احمد صاحب اکبرآبادی	۳۵۷
۷	سرمایہ دار سے خطاب (نظم)	جناب اشک صاحب قریشی	۳۵۹
۸	ایک شرط	مترجمہ جناب مخمور صاحب بی اے اکبرآبادی	۳۶۰
۹	دیوالی ہے آج (نظم)	جوش ملیح آبادی	۳۶۴
۱۰	اشتراکیت اور اس کی مخالفت	جناب عبداللطیف صاحب اعظمی	۳۶۵
۱۱	ایک نگاہ (نظم)	جناب میر افق صاحب کاظمی امروہوی	۳۷۴
۱۲	زندگی کے مرثیے	جناب حکیم عبدالوالی صاحب لکھنوی	۳۷۵
۱۳	وینڈٹ نے ہر فسانہ حقیقت بنا دیا	جناب عطاءاللہ صاحب پالوی	۳۷۸
۱۴	اشتراکیت اور سرمایہ داری	جناب اقبال نیازی صاحب	۳۸۳
۱۵	مجھے معلوم نہ تھا (نظم)	جناب بسمل صاحب سعیدی ہاشمی ٹونک	۳۸۹
۱۶	سبق آموز آزادی	جناب قاضی زاہد علی صاحب شہرزی	۳۹۰
۱۷	وطن پرستی کا غلط استعمال	جناب سید ہادی حسین صاحب جعفری بی	۳۹۴
۱۸	قربانی	جناب سجاد حید ر صاحب آفریدی	۳۹۶
۱۹	شاہی اور عاشقی (نظم)	جناب رزمی صاحب صدیقی	۳۹۹
۲۰	بھوک (نظم)	جناب رضا صاحب نقوی	۴۰۰
۲۱	شانتا	جناب تقی صاحب بہرولی بی اے	[illegible]
۲۲	کچھ قافیہ کی بابت	جناب عندلیب صاحب شادانی ام اے پی ایچ	۴۰۹
۲۳	معمہ	جناب مسکین صاحب اکبرآبادی	۴۱۵
۲۴	ٹکڑ بڑخاں	جناب سید نذیر حسین صاحب بی اے	[illegible]
۲۵	خواب کی سی رات (نظم)	جناب اعظم صاحب خسروی جے پوری	[illegible]
۲۶	رادھا کی شادی	جناب محمد حسام الدین خاں صاحب غوری سکندرآبادی	[illegible]
۲۷	چین کا آہنی انسان	جناب رابط صاحب مونگیری	۴۲۷
۲۸	اشتہارات	مشتہرین	۴۳۰

(جوش ملیح آبادی پرنٹر و پبلشر نے محبوب المطابع برقی پریس دہلی میں چھپوا کر دفتر کلیم نمبر ۹ دریا گنج دہلی سے شائع کیا)

اشارات

مدیر

نوعِ انسانی کا تابناک مستقبل

جہالت سے علم، اور علم سے جہالت۔ وحشت سے تمدن اور تمدن سے وحشت۔ تنزل سے ترقی اور ترقی سے تنزل ـــــ عروج سے زوال اور زوال سے عروج۔ محکومی سے حکومت، اور حکومت سے محکومی ـــ ضعف سے طاقت، اور طاقت سے ضعف ـــــــ یہ ہے ہماری اس دُنیا کا نظام جس میں ہم چند نفس کے واسطے زندگی بسر کرنے کے لئے آتے ہیں۔

ایک پہیا ہے جو ہمیشہ پھرتا رہتا ہے۔ کبھی اوپر جاتا ہے، کبھی نیچے آتا ہے۔ اور کبھی کسی حالت میں بھی نہیں ٹھہرتا۔

ایک جاہل اور کھُردری قوم اُٹھتی ہے، اور حریر و پرنیاں میں لپٹی ہوئی مہذب و ذی علم قوم کی گردن میں ہات دے کر آراستہ محلوں سے نکال دیتی ہے ـــــــ لیکن چند روز کے بعد وہی جاہل اور کھُردری قوم، تہذیب و علم کے منازل طے کرکے ایک ایسے نقطۂ عروج پر پہونچ جاتی ہے۔ جہاں وہ ایک تازہ جاہل اور وحشی قوم سے ٹکرا کر خود بھی پاش پاش ہو جاتی ہے ـــــ اور یہ سلسلۂ عمل ہمیشہ جاری رہتا ہے ـــــ اور اِسی مندرجۂ بالا سلسلۂ فتح و ظفر اور ہنگامۂ تعمیر و تخریب کے باعث، وحشت، تمدن میں، تمدن وحشت میں ـــــ جہالت، علم میں، اور علم، جہالت میں۔ ضعف، قوت میں، اور قوت، ضعف میں ـــ محکومی، حکومت میں، اور حکومت، محکومی میں تبدیل ہوتی رہتی ہے۔

اِسی طرح ایامِ جہالت میں ایک مصلح اُٹھتا ہے، اور حیات کے پُر شور سمندر میں علم و بصیرت کے منارے تعمیر کرکے رخصت ہو جاتا ہے ـــــــ اُس کے بعد، ایک گروہ جھنڈیاں لئے ہوئے نمودار ہوتا ہے، جو اپنے کو اُس مرحوم مصلح کی اُمت کہتا ہے، اور اپنے اعمال و اقوال کے ذریعے سے اُن علم و بصیرت کے روشن مناروں کو جہل و وہم کے تاریک تُودوں میں تبدیل کرکے رکھدیتا ہے ـــــ غرضکہ ہمارے مادّی اُمور ہوں کہ ذہنی، سب کے سب، پہیے کی طرح گردش میں رہتے ہیں۔ اور ہمیشہ اپنی اپنی ضدوں میں تبدیل ہوا کرتے ہیں ـــــــ

ہمارے مساعی کا یہ مآل، اور ہماری جانکاہوں کا یہ انجام کتنا ہولناک ہے ـــ کس حد کا عبرتناک!

لیکن ایک نہایت ہی باریک، اور انتہائی لطیف سر رشتۂ اُمید، اِس مایوسی کے عظیم الشان اور ڈراؤنے انبار کے اندر ازل کی صبح سے چھپا ہوا ہے ـــــــ وہ سر رشتۂ اُمید، یا یُوں کہو کہ جسمِ عالم کی وہ رگِ جہندہ اِس قدر حیرتناک طور سے لطیف واقع ہوئی ہے کہ اُسے عقل و ذہانت کی چٹکی سے معلوم نہیں کیا جا سکتا۔ خواہ وہ چٹکی کتنی ہی باریک کیوں نہو ـــ لیکن اگر حکمت کا متوازن تفکر و تصور پُوری سعی کرے تو اُسے ناخن کے ذریعے سے محسوس کیا جا سکتا ہے۔

وہ لطیف رگِ جہندہ کیا ہے؟ وہ رگِ جہندہ اِس کاروانِ عالم کی مجموعی رفتار ہے، وہ رفتار، جس کا رُخ، ابتدائے عالم سے، ترقی اور رفعت

ترقی کی طرف ہے —— بلندی، اور صرف بلندی کی طرف ہے —— ہرچند اِس
عالم کی مجموعی رفتار، اِس شدت کے ساتھ سست ہے کہ بڑے بڑے عقلاء
تک اُسے محسوس نہیں کرسکتے۔ اور جو محسوس کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ وہ بھی
اُس کی بے پایاں سستی کو دیکھکر تھک جاتے، اور بعض اوقات ایک ایسی حالت
میں مبتلا ہوجاتے ہیں جسے مایوسی سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔

لیکن یہ ایک حقیقت ہے، ایسی حقیقت جس کا کوئی تاریخ وحیات
کا صحیح ترین مطالعہ کرنے والا انکار نہیں کرسکتا کہ کاروانِ عالم کی مجموعی رفتار
اپنی بے اندازہ سست گامی، اور بے حد نہایت مُردہ خرامی کے باوجود،
جارہی ہے۔ بلندی کی طرف، تواتر و تسلسل کے ساتھ جارہی ہے بلندی
کی طرف۔

بعض اوقات ہماری، اس روزمرہ کی، زندگی کے سانحے، اور
ہماری، اِس پیچھے ہٹ ہٹ کر آگے بڑھنے والی، دُنیا کے حوادث، کاروانِ
عالم کی اس مجموعی رفتار کو سست سے سست تر، اور سست تر سے سست
ترین بنا دیتے ہیں۔ اِس قدر سست کہ ایک لنگڑی چیونٹی بھی دوڑ میں
اُس سے بازی لے جاسکتی ہے؛ مگر اِن تمام موانع و حوادث کے باوصف
کاروانِ عالم مسلسل و متصل طور سے بلندی ہی کی طرف بڑھتا چلا جارہا ہے۔
ہمارے بہت سے عقلاء، کاروانِ عالم کی اِس سست، لیکن دائماً
رُو بہ ترقی، مجموعی رفتار کا اندازہ نہ لگا سکنے کے باعث، بعض اوقات مایوسی
کے کلمات نکالنے کا شاید حق بھی حاصل ہے —— اِس لئے میں اُنھیں بُرا
نہیں کہتا، میں اُنھیں بُرا کہنے کی جرأت ہی نہیں کرسکتا —— کیونکہ دراصل
ہماری دُنیا کا نظم ونسق ہی کچھ ایسا واقع ہوا ہے کہ بیوقوف تو "مقدر" کی چھاؤں
میں تڑاپ تڑاپ کر سو جاتے ہیں، اور عقلاء کو شدتِ آلام سے نیند نہیں آتی
—— اور بعض اوقات تو ہماری اِس دنیا کی تلون و تنوع اور تعمیر و تخریب
کی یک حالی - یہ ہمالہ پہاڑ سے زیادہ اونچی یک حالی (Monotony
اِس قدر گھبرا اور تھکا دیتی ہے کہ ہمارے حکیم مزاج ودانا بھی ع

اِیں چہ حیرت خانۂ امروز و فردا ساختی!

کے نعرے لگانے لگتے ہیں —— لیکن اِن تھک اور گھبرا جانے والوں کو
کسی طرح بھی بُرا نہیں کہا جاسکتا —— اور کسی حالت میں بھی ان کی شان میں
گستاخی نہیں کی جاسکتی —— اس لئے کہ، جیسا کہ عرض کیا جاچکا ہے، ہمارا یہ
کارخانہ ہی ایسا واقع ہوا ہے کہ بڑے بڑے گمراہ ہو سکتے ہیں، ہوتے رہے
ہیں، ہو رہے ہیں، اور ہوتے رہیں گے ——

لیکن میں اِن تمام گھبرا گھبرا کر شکایتیں کرنے والوں - اور تھک تھک
کر مایوس ہو جانے والوں کی خدمت میں یہ مژدہ سنانے پر اپنے کو مجبور
و مامور پاتا ہوں کہ ہماری مجموعی رفتار، اپنی تمام سست گامیوں کے باوصف
غیر مشتبہ اور غیر منقطع طور سے رُخ کئے ہوئے ہے۔ بلندیوں کی طرف ——
ناپیدا کنار بلندیوں کی طرف ——

کاروانِ عالم کی مجموعی رفتار —— کیا یہ چیونٹی کی طرح دیوار
پر پھسل پھسل کر بار بار چڑھنے، اور آخرِ کار دیوار پر چڑھ جانے کا سا معاملہ
ہے؟

یا یہ ایسی رفتار ہے جس کا سلسلہ تمام ہولناک مُردہ خرامیوں کے
باوجود کبھی اور کسی وقت بھی منقطع نہیں ہوتا اور ہمیشہ جاری ہی رہتا ہے؟
معلوم نہیں حقیقی صورت کیا ہے —— صورت کوئی بھی ہو، مگر اس
میں کون شبہ کرسکتا ہے کہ ہم مجموعی طور سے اُوپر کی طرف بڑھتے چلے جارہے
ہیں، اور ہمارے کارواں کے واسطے یہ مقدر ہو چکا ہے کہ وہ ایک انچ بھی
پیچھے نہ ہٹے نہ آنکھوں نے دیکھا ہے، نہ کانوں نے سُنا ہے، اور نہ تخیل
ہی تصور کرسکتا ہے۔ اُس مستقبل کا جو انسان کا انتظار کر رہا ہے۔
انسانی دماغ کی وہ کاوشِ پیہم، جو ترقی کی طرف اُسے لئے چلی جارہی
ہے، رفتہ رفتہ تمام موانع کو فنا کردے گی۔ اور انسان، آدم کا بانکا بیٹا،
فطرت کے تمام شعبوں پر حکومت کرنے لگے گا۔
ہر شئے، ایک عظیم مقصد کی طرف بہتی چلی جارہی ہے۔ اور ہر جُزو،
کُل بن جانے کے لئے ہر آن سرگرمِ عمل ہے —— یہاں تک کہ وقتی اور
مقامی تباہ کاریاں بھی، جو قدرت کے ہاتھوں رونما ہوکر ہمیں لرزہ براندام
کرتی رہتی ہیں - دراصل چند مدّیں ہیں اُس حساب کی جس کی "میزانِ کل" مجموعی
خیر کا پیش خیمہ بننے والی ہے۔

پہلے جو چیز عناصر کی ایک نہایت ہی مبہم و ناقابلِ فہم گرہ تھی، اب
وہ رفتہ رفتہ ایک کشادہ چادر کی صورت میں تبدیل ہو رہی ہے۔

اِس لئے ہر صاحبِ فکرِ انسان کو اِس کا یقین رکھنا چاہئے کہ ایک
نہ ایک دن، آدم کے بچے، وہ "چیز" بن جائیں گے، جس چیز کے بننے کی اُنھیں

ازل کے روز سے تمنا ہے، اور تمنا کے باوصف، آج تک جس "چیز" کا ہمیں نام تک معلوم نہیں ہے ——— ہم کچھ بننا تو ضرور چاہتے ہیں، لیکن وہ "کچھ" کیا ہے، ہمیں اب تک اُس کا مطلق علم نہیں ہے۔ ہمیں اِس کا کامل یقین ہے کہ ارتقار کی درمیانی منزلوں کے طے ہوتے ہی، اور انتہائی منزلوں کے قریب پہونچتے ہی ہم اُن گرانقدر کنجیوں کے گچھے کو حاصل کرلیں گے۔ جن سے عظیم الشان اسرارِ حیات کے خزانوں کے قفل کھُل سکتے ہیں ——— اور ہم اُس رُوحِ اعظم سے بھی اگر وہ کوئی خاص نوعیت کا وجود رکھتی ہے، دوچار ہوجائیں گے، جیسے اِس نظامِ شمسی کی اصلیت واثاث کے جلیل القدر خطاب سے یاد کیا جاتا ہے ———

مگر یاد رکھنا چاہیے کہ معاملہ یہیں تک ختم نہیں ہوجائے گا۔ یہ فتحمندیاں تو ہمیں اُس وقت حاصل ہوں گی، جب ہم ارتقار کی درمیانی منزلوں سے گزر کر آخری منزلوں کے قریب جائیں گے ——— لیکن آخری منزل پر ہمیں کیا ملے گا؟

معلوم نہیں یہ کون ناممکن الفہم وعجیب قوّت ہے جو اس وقت میرے کان میں یہ کہہ رہی ہے کہ ارتقا کی آخری منزل پر پہونچ کر "کچھ بننے" کا سوال ہی باقی نہیں رہے گا۔ بلکہ نوعِ انسانی کے "کچھ سے کچھ ہوجانے" کا وقت آجائے گا۔ وہ "کچھ" کیا ہوگا؟ جیسا کہ ابھی کہہ چکا ہوں، مجھے نہیں معلوم، لیکن مجھے کامل سے بھی زیادہ یقین ہے نوعِ انسانی کے دل میں جو "کچھ" بن جانے کی قدیم ترین تمنا ہے وہ اُس منزل پر پوری اور ضرور پوری ہوجائے گی۔

لکھدوں اگر تو کفر کے فتوے لگائے خلق
وہ ارتقائے نوعِ لبشر دیکھتا ہوں میں

ہندوستان کی وبائیں

جہاں تک ہندوستان کی سچی محبت اور ہندوستان کی کامل آزادی کا تعلق ہے، ہر طرف اندھیرا ہی اندھیرا آرہا ہے۔

ہندوستان کی خاک میں یہ تاثیر ہے کہ یہاں کے باشندے انتہا درجے کے تنگ خیال وتنگدل ہوتے ہیں۔ اس خطۂ پاک میں انفرادی اغراض کا اِس قدر زور وشور ہے کہ اجتماعی مفاد کا کسی دماغ میں تصوّر ہی نہیں پیدا ہوتا۔

جو حضرات اِس بدبخت ونامراد ملک کی تاریخ کا ذوق رکھتے ہیں وہ اس شرمناک اور تلخ حقیقت سے واقف ہیں کہ اس ملک کی تمام سلطنتیں صرف اِس وجہ سے تباہ ہوئی ہیں کہ یہاں قومی یا اجتماعی تصوّر کبھی نہیں رہا ہے۔ اور ہر شخص نے اپنے ذاتی مفاد کی خاطر اپنے ملک کے تخت وتاج کو بڑی آسانی کے ساتھ ہمیشہ فروخت کرڈالا ہے۔

عصرِ جدید کو دعا دیجئے کہ اُس نے ہم میں ایک بڑی حد تک تبدیلی پیدا کرنا شروع کردی تھی۔ پہلے ہم لوگ صرف اپنے اہل وعیال سے محبت کرتے تھے۔ پھر ہم میں اپنے خاندان کا شعور پیدا ہوا، اور اُس کے بعد قومی احساس کی بنا پڑ ہی چلی تھی کہ نہیں معلوم کس سمت غیب سے ایک ایسی زہریلی آندھی آئی کہ ہماری قومیت کے تصوّر کا ہرا بھرا پودا جڑ سے اُکھڑ کر دریائے ٹیمز میں جاکر ڈوب گیا۔

اب قوم کے معنی ہمارے ملک میں ان معنوں سے بالکل مختلف ومتضاد ہیں جو دنیا کی تمام زندہ قوموں کے اندر پائے جاتے ہیں۔

اب ہماری قومیت ملک ووطن سے رُوگردانی کرکے، مذہبی بنیادوں پر قائم ہوچکی ہے جس نے ہندوستانی قومیت کو پارہ پارہ کرکے ملک کو ہزاروں قوموں کے اندر تقسیم کرکے رکھدیا ہے۔ اور جس کے باعث آج ہندوستان میں مختلف جماعتیں اپنے اپنے کرتب دکھاتی نظر آرہی ہیں۔

اِن جماعتوں میں آپ سب کچھ پائیں گے۔ لیکن نہیں پائیں گے تو ہندوستان اور صرف ہندوستان کو۔

یہ ہمارے حریفوں کے واسطے کتنی مبارک فال ہے! اِس وقت میں تین جماعتوں یعنی "مسلم لیگ" "ہندو مہاسبھا" اور "کانگریس" کا ذکر کروں گا۔

(۱) مسلم لیگ: ———

مسلم لیگ، ہندوستان میں خلافتِ راشدہ، یا پھر مغل امپائر قائم کرنا چاہتی ہے ——— اُس کی آنکھیں ڈھونڈتی ہیں اُس پرچم کو جو دہلی کے لال قلعے پر لہرایا کرتا تھا ——— اور اُس کا دل بیتاب ہے اُس طنطنہ وطمطراق کے لئے جو اورنگ زیب کی شکل سے نمودار ہوا کرتا تھا۔

(۲) ہندو مہاسبھا: ———

ہندو مہاسبھا، ہندوستان میں رام راج کے خواب دیکھ رہی ہے۔
اُس کی آنکھیں ڈھونڈتی ہیں اُس چتر کو جو کرشن بھگوان کے سر پر چکر کھاتا
رہتا تھا ——— اور اُس کا دل بیتاب ہے اُس کلغی کے لئے جو سیواجی کی
پگڑی کے اوپر اپنی بہار دکھایا کرتی تھی ———

(۳) اب رہی کانگریس، سو موجودہ صورتِ حال پر نظر کرتے
ہوئے انتہائی افسوس کے ساتھ یہ کہنا پڑ رہا ہے کہ اِس جماعت کی ہندو
اکثریت بھی در پردہ مہاسبھائی ذہنیت سے آلودہ نظر آرہی ہے ———
اِس میں کوئی شک نہیں، جیسا کہ متعدد بار "کلیم" میں عرض کیا
جاچکا ہے، کہ کانگریس ہی ہندوستان کی وہ جماعت ہے جو اپنے اصول
و مقاصد کے لحاظ سے ملک کی واحد نمائندہ جماعت کہی جاسکتی ہے ——
لیکن اِس حقیقت کو کب تک بے نقاب نہ کیا جائے گا کہ مسٹر
نائیڈو، نہرو، اور بوس کے سے چند خالص افراد کو مستثنیٰ کردینے کے بعد
اِس جماعت کی ہندو اکثریت بھی دل ہی دل میں مسٹر مونجے اور جناب
ساورکر کی مُرید معلوم ہو رہی ہے۔

کیا یہ آزادی اور سرفرازی کے لچھن ہیں؟ کیا کوئی قوم اِسی قدر
مختلف جماعتوں میں تقسیم ہو کر اپنے کو محکومی سے نجات دلا سکتی ہے؟ اور کیا
کوئی جسم، پارہ پارہ ہو چکنے کے بعد حرکت کرنے پر قادر ہو سکتا ہے؟
میں دریافت کرتا ہوں کہ کیا مسلم لیگ، مہاسبھا، اور کانگریس
کی سرمایہ پرست ہندو اکثریت، یہ تینوں گروہ، علیحدہ علیحدہ ہندوستان کی
زنجیریں کاٹ سکتے ہیں؟ ——— یہ ایک ایسی موٹی بات ہے، جسے بچے
تک سمجھ سکتے ہیں۔ مگر نہیں سمجھتے تو ہماری جماعتوں کے بالغ افراد ———

مسلم لیگ تو صرف یہ چاہتی ہے کہ اپنی گم شدہ میرزائیت کو
واپس بُلائے۔ اور مہاسبھا اور کانگریس کی ہندو اکثریت کی یہ تنہا خواہش
ہے کہ سڑکوں پر موٹی موٹی گائیں اِس طرح اینڈتی پھریں کہ سواریوں کی
آمد و رفت بند ہو جائے، اور ہر گلی میں گوبر کی بڑی بڑی پہاڑیاں اِس
طرح قائم کردی جائیں کہ ہوا کے جھونکے "معطر" ہو کر جائیں۔
مسلمان چاہتا ہے بڑی بڑی داڑھیاں، جو آگے اُڑ رہی ہوں
——— ہندو چاہتا ہے لانبی لانبی چٹیاں، جو پیچھے ناچ رہی ہوں۔
مسلمان چاہتا ہے اللہ اکبر کے نعرے ——— اور ہندو چاہتا ہے
"جے رام کی" اور "ٹن ٹن پوں" ———
یہ ہیں ہمارے مقاصدِ عالی ——— اور یہ ہے ہمارا تصورِ
قومیت ———

سچی بات سُننے کے لئے کوئی تیار نہیں ——— سچی بات کہنے والے
کے دونوں دشمن ہیں ———
سچی بات کا اعلان کرنے والے کو ہندو بھی ہلاک کرنا چاہتا ہے۔
اور مسلمان بھی ——— ہندو، مکان کی چھت سے پتھر مار کر ——— اور مسلمان
راستے گلی میں چھُری بھونک کر ———
کون اِن لوگوں کو سمجھائے کہ تم مجنون ہو، تمہارا وجود ہندوستان
کے حق میں ایک وبا ہے، ایک چلتا پھرتا ہیضہ، اور سانس لیتا ہوا طاعون ہے۔
اے وطنِ عزیز کی پشت کے "دیندار" اور "دھرماتما" سرطانو! ہوشیار
——— کہ "بیدین، سوشلسٹ جماعت کا خار اشگاف نشتر تمہاری تواضع
کے واسطے بہت جلد حرکت میں آنے والا ہے ——— ابھی اپنی مغفرت کی
دعائیں مانگ لو۔

"پاپ" یا "پن"؟

تو بہ خویشتن چہ کردی؟

اخبارات نے مسٹر رام کشن ڈلمیا کی سخاوت کو سراہا ہے کہ اُنھوں نے
اکاون ہزار روپے کی خطیر رقم مرحمت فرمائی ہے تحفظِ گاؤ کی خاطر ——— اور حصار
کے ایک جلسے میں دوسروں کو بھی اِس کام میں فراخدلی کے ساتھ شریک
ہونے کا مشورہ دیا ہے ——— اثنائے کلام میں ڈلمیا صاحب نے یہ بھی فرمایا
ہے کہ حصار اور مضافاتِ حصار میں قحط کی وجہ سے مویشیوں کی حالت
نہایت خراب ہے جس کی جانب بہت جلد توجہ مبذول کرنا چاہیے ———
جس کی بھگت نند کشور اور پنڈت نیکی رام نے پُر زور تائید کرتے ہوئے
عامۃ الناس سے اِس کارِ خیر میں ہاتھ بٹانے کی اپیل کی ہے۔
چنانچہ اِس سلسلے میں خدمتِ گاؤ کے واسطے ایک کمیٹی بھی وجود
میں لائی گئی ہے، اور سرجو پور ضلع بلند شہر میں ایک وسیع چراگاہ کا بھی
انتظام کیا گیا ہے، جہاں اندازاً دس ہزار گائیں چر سکیں گی ——— چنانچہ

دس ہزار گائیں وہاں پہونچا بھی دی گئی ہیں۔ اور دس ہزار کا ایک اور گلا عنقریب روانہ کیا جائے گا۔

اِس خبر کو پڑھکر بہت سے آدمی خوش ہوں گے اور دلمیا صاحب کو ایک "بڑا دانی" سمجھکر اُن کی شان میں قصیدہ خوانی کریں گے —— میں یہ نہیں کہتا کہ یہ کوئی بُرا کام ہے —— میں بھی جانوروں سے ہمدردی رکھتا ہوں، اور میرے نزدیک بھی گائے نوعِ انسانی کے واسطے ایک نہایت ہی مفید حیوان ہے —— اِس قدر مُفید حیوان ہے کہ اگر میں ہندوستان کا آمر ہو جاؤں تو گاؤکُشی کو قانوناً بند کر دوں —— صرف گائے ہی نہیں، میرے جذبات کا تو یہ تقاضا ہے کہ کسی حیوان کو بھی خوراک کے لئے نہ ذبح کیا جائے۔ اس لئے کہ یہ فعل ایک نہایت ہی ظالمانہ فعل ہے —— مگر ہندوستان کی موجودہ حالت پر نگاہ کرکے کم سے کم میں تو دلمیا صاحب کی اِس خیرات کو سراہ نہیں سکتا —— اُنھوں نے بیشک ایک اچھا کام کیا ہے، لیکن اِس اچھے کام سے زیادہ ایک دوسرے اچھے کام کو نظر انداز کر دیا ہے ——

ہندوستان کا ہر باشندہ اِس المناک صورتِ حال سے واقف ہے کہ ہندوستان کے باشندے آج کل بھوکوں مر رہے ہیں۔ نہ اِن غریبوں کے تن پر کپڑا ہے، نہ پیٹ بھرنے کو روٹی —— اور اس بات سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ آدمی، کم سے کم، گائے سے زیادہ افضل مخلوق ہے۔ پھر سمجھ میں نہیں آتا کہ دلمیا صاحب نے اپنے بھوکے بھائیوں کے پیٹ بھرنے کے سب سے بڑے فریضے کو فراموش کرکے گائے کی طرف کیوں توجہ مبذول فرمائی؟

کیا ہندوستان کے ہر صوبے کی طرف سے اُن کی خدمت میں یہ اعلان پہونچا دیا گیا تھا کہ وہاں کے باشندے اب روٹی کی طرف سے مطمئن ہو چکے ہیں؟ یا کم سے کم حصار نے اُنھیں یہ اطمینان دلا دیا تھا کہ وہاں کے لوگ اِس قدر آسودہ ہو چکے ہیں کہ اب اُن میں ایک شخص بھی بھوکا نہیں رہا ہے؟

اگر ایسا ہے تو اپنی لاعلمی پر پشیمانی کا اظہار کرتے ہوئے میں دلمیا صاحب کی اِس خیرات پر اپنے اظہارِ ملال کو واپس لے کر اُن سے معافی کا طالب ہوں ——

اور اگر معاملہ اِس کے قطعی برعکس ہے تو میں اس بات پر اپنے کو مجبور پاتا ہوں کہ دلمیا صاحب کی اِس خیرات پر اپنے دلی قلق کا اظہار کروں۔

اور اُن سے یہ دوستانہ شکوہ کروں کہ اُنھوں نے چوپاؤں کی خاطر، انسانوں کے حقوق کو پامال کر دیا ہے، اور موجودہ سیلاب زدہ انسانوں کی زندگیوں کو چوپاؤں کی خاطر موت کے سپرد فرما کر اپنی عقل کے گاؤ خرد ہو جانے کا ثبوت پیش کیا ہے۔

اوروں کو جانے دیجئے، صرف اپنے تعلیم یافتہ نوجوانوں ہی کو لیجئے۔ کیا آپ میں سے ہر فرد اِس عبرتناک حقیقت سے واقف نہیں ہے کہ ہمارے تعلیم یافتہ نوجوان دفتروں کے دروازے کھٹکھٹا کھٹکھٹا کر خودکشیاں کر رہے ہیں؟ اور کتنی تازہ و شگفتہ زندگیاں ہیں، ہمارے نوجوانوں کی جو آئے دن بھوک کی قربانگاہ پر چڑھا کرتی ہیں۔

اِن حالات میں ہم سب کا فرضِ اولیں یہ ہونا چاہیئے کہ ہم کم سے کم اپنے نوجوانوں ہی کی زندگیوں کو، جو ہمارے مستقبل کی تمنائیں ہیں، ختم ہونے سے بچا لیں —— لیکن ہم اِس طرف متوجہ ہونے کے عوض، چوپاؤں کی سیوا کرنے کے خبط میں مبتلا نظر آتے ہیں ——

اِس ملک میں صرف گائے ہی پر لاکھوں روپیہ صرف نہیں ہو رہا ہے، بلکہ بے شمار مذہبی مراسم، اور لاتعداد مندروں اور مسجدوں کی جدید تعمیر وں پر بھی کروڑوں روپیہ پانی کی طرح بہایا جا رہا ہے —— اور عقل سے خالی افراد، اِن حق تلفیوں اور نادانیوں کو "کارِ خیر" کا لقب دے دے کر سراہتے رہتے ہیں۔

افسوس کہ ہمارا دماغی توازن بگڑ چکا ہے —— آپ کیا کہیں گے اُس شخص کو جو اپنے اہل و عیال کی پرورش کے حقوق سے بے اعتنائی روا رکھتے ہوئے بلبلوں اور کوئیلوں کے تحفظ پر اپنی تمام دولت صرف کر دے؟

کیا دلمیا صاحب نے یہی نہیں کیا ہے؟ ؎

تو کارِ زمیں را نکو ساختی :
کہ با آسماں نیز پر داختی ؟

کیا یہ کوئی عاقلانہ اور ہمدردانہ فعل ہے کہ ہیرے کے ٹکڑے کیچڑ میں پڑے رہیں اور گوبر کو شیشے کی الماریوں میں رکھا جائے —— موتی رہگزار میں پامال ہوتے رہیں، اور بکری کی مینگنوں کو ریشم کے ڈوروں میں پرو دیا جائے —— آدم کے بچے ایڑیاں رگڑیں، اور سانڈوں کی نسل کلیلیں کرتی پھرے؟

یہ ہے ہم ہندوستانیوں کی عقل، جسے "مذہب" سے چڑ گیا ہے ——— اگر انسان کو بھوک کے حوالے کر کے حیوان کا پیٹ بھرنا کوئی "پُن" ہے، تو پھر کوئی خدا کے لئے بتائیے کہ "پاپ" اور "مہا پاپ" کس چیز کو کہا جائے گا؟

دُنیا میں ہم چلے نہ کبھی آدمی کی چال
یا بجوذی کی چال چلے، یا خووی کی چال

"ہندوستانی" یا سنسکرت؟

سمپورانند صاحب وزیرِ تعلیمات صوبۂ متحدہ عرف "جُبٹ صوبہ" کا ضمیر جب اُنھیں ملامت کرتا ہے تو وہ خود اپنے کو فریب دینے کی خاطر یہ اعلان کرنے لگتے ہیں کہ "میں اپنے طرزِ عمل سے مطمئن ہوں، اور مجھے یقین ہے کہ میں "ہندوستانی" کے معاملے میں کانگریس کے اُصول سے انحراف نہیں کر رہا ہوں" ——— لیکن سمپورانند صاحب، اور زبان کے مسئلے میں اُن کے "پُشت پناہ" مہاتما گاندھی کو معلوم ہونا چاہیئے کہ وہ اب زیادہ دن تک دھوکا نہیں دے سکتے، اور اب سب کے علم میں یہ بات آچکی ہے کہ وہ مُلک میں مرحوم سنسکرت کو اُس کی قبر سے کھود کر نکالنا چاہتے ہیں ———

ابھی حال ہی میں سمپورانند صاحب نے، اپنے ضمیر کو مکرر فریب دینے، اور کانگریس کے شائستہ ارکان کے اعتراضات سے بچنے کی خاطر "ہندوستانی" کی تشکیل کے متعلق مہاتما گاندھی کو خط لکھا تھا، جس کے جواب میں مہاتما گاندھی تحریر فرماتے ہیں کہ وہ "ہندوستانی" کی تشکیل کے باب میں اُن سے بالکل متفق ہیں ——— اور اُسی کے دوش بدوش مہاتما جی یہ بھی فرماتے ہیں کہ کانگریس نے اِس زبان کو ایک نام تو ضرور دیا ہے، مگر اُس پر کسی قسم کی پابندیاں عاید نہیں کی ہیں۔

مسٹر سمپورانند کا "ہندوستانی" کی تشکیل کے متعلق یہ خیال ہے کہ:-

(۱) "ہندوستانی" میں سنسکرت اور عربی کے الفاظ کی درآمد ہونا چاہیئے۔

(۲) "ہندوستانی" سے مروّجہ الفاظ کو خارج نہ کیا جائے۔

لیکن آگے چل کر جو ارشاد ہوتا ہے اُس کے اندر فرقہ وارانہ زہر بھر دیا گیا ہے ——— چنانچہ فرماتے ہیں کہ "علمی نقطۂ نظر سے "ہندوستانی" میں سنسکرت مادّے کے الفاظ کا کثرت سے استعمال کیا جانا بہت ہی ضروری امر ہے، تاکہ بنگالی، مرہٹے، گجراتی، اور مدراسی اِسے قومی زبان کے لحاظ سے بہ آسانی قبول کر سکیں"۔

ایک طرف تو یہ کہا جاتا ہے کہ "ہندوستانی" میں عربی اور سنسکرت الفاظ کی درآمد بند کر دی جائے، اور دوسری طرف یہ ارشاد ہوتا ہے کہ ہندوستانی میں سنسکرت مادّے کے الفاظ کثرت سے استعمال کئے جائیں۔

ایک طرف تو یہ اصول وضع کیا جاتا ہے کہ "ہندوستانی" سے مُروّجہ الفاظ کو خارج نہ کیا جائے، اور دوسری طرف "علمی نقطۂ نظر" کی بنا پر سنسکرت مادّے کے الفاظ کے کثرت سے استعمال کئے جانے پر زور دیا جاتا ہے تاکہ "عملاً" فارسی اور عربی کے الفاظ خود بخود متروک ہو جائیں۔

اِسی کے دوش بدوش جب کبھی سمپورانند صاحب، یا اُن کے لسانی پیشوا مہاتما گاندھی "ہندوستانی" کا لفظ استعمال فرماتے ہیں تو فوراً گھبرا کر اُس کے ساتھ "ہندی" یعنی "ہندوستانی" بھی کہنے لگتے ہیں، جس کے صریحی معنی یہ ہیں کہ وہ زبان جسے کانگریس نے "ہندوستانی" کا لقب دیا ہے، "ہندی" کے سوا اور کوئی زبان نہیں ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ اب ہم "ہندی" کو "ہندوستانی" کہنے لگے ہیں ——— اور اُس "ہندی" کو اب ہم سنسکرت بھی بنا دینا چاہتے ہیں۔

یہی وہ صورتِ حال ہے جس کے خلاف کانگریس کی آل انڈیا ورکنگ کمیٹی کے اجلاس منعقدۂ دہلی میں کانگریس کے ایک مخلص و سرگرم رُکن ڈاکٹر اشرف نے صدائے احتجاج بلند کرتے ہوئے کہا تھا کہ اگر ہندی ہندوستانی کا یہی زور رہا تو مجھے خوف ہے کہ مجھے "اُردو ہندوستانی" کی طرف بھاگنا پڑے گا ——— لیکن اِس سچی اور مخلصانہ آواز کو بھی کانگریس کی ہندی پرست اور سنسکرت نواز اکثریت نے ووٹوں کی قوّت سے پامال کر دیا تھا۔

ہندوؤں کو خدا جانے کس دشمن ملک نے یہ بادی سمجھا دی ہے کہ اردو زبان تمہارے دَورِ محکومی کی یادگار ہے۔

اُردو، اور ہندوؤں کے دَورِ محکومی کی یادگار ——— یہ بات جس قدر مفسدانہ ہے اتنی ہی غلط بھی ہے۔

ہندوستان کی تاریخ کا ایک معمولی طالب علم بھی اس بات سے آگاہ ہے کہ اسلامی سلطنت کی دفتری زبان، اُردو نہیں، بلکہ فارسی تھی۔

اُردو زبان کی بنیاد تو اُس وقت پڑی تھی، جب ہندوؤں اور مسلمانوں کے قلوب ایک دوسرے کے قریب آگئے تھے، اور ان دونوں نے ایک دوسرے سے محبت کرنا شروع کر دیا تھا۔

حیرت ہوتی ہے اس عقل پر کہ وہ زبان جو ہندو مسلم اتحاد کی ایک مقدّس یادگار ہے، اُسے غلامی کی یادگار سمجھکر فنا کر دینے کی سعی کی جا رہی ہے اور کس موقع پر جب کہ کانگریس مسلمانوں کو کانگریس میں داخل ہو جانے کا آوازہ شدّت کے ساتھ بلند کر رہی ہے۔

اگر یہی لیل و نہار ہے تو مجھے اندیشہ، اور سخت اندیشہ ہے کہ کانگریس میں تازہ مسلمانوں کا داخلہ تو کیا، پرانے کانگریسی مسلمان بھی کانگریس سے باہر آ جانے پر مجبور ہو جائیں گے ——— میرا دل پناہ مانگتا ہے، اُس منحوس گھڑی سے ——— جب کانگریسی مسلمان بھی کانگریس کو خیرباد کہدینے پر مجبور ہو جائیں، یا مجبور کر دئے جائیں گے۔ کیونکہ اس کے باعث کانگریس نے [illegible] سال کی کاوش جو عمارت تعمیر کی ہے اُس کی چھت پر بجلی گر پڑے گی، اور اغیار کے کاشانوں کی بنیادیں محکم سے محکم تر ہو جائیں گی۔

یہ سچ ہے کہ بیجا تعصّبات اور ناپاک تنگدلی، کانگریس کے صرف اُن ارکان میں پائی جاتی ہے جو ہنوز مذہب کے چھوٹے بندھنوں کو توڑ نہ سکنے کے باعث متحدہ قومیت کے تصور سے بیگانہ ہیں ——— مگر یاد رکھنا چاہیئے کہ تالاب کو ایک ہی مچھلی گندا کر دیتی ہے۔

اس لئے میں نہایت ہی شدّت کے ساتھ کانگریس کے اُس قابلِ ناز طبقے کو جسے سوشلسٹ کہا جاتا ہے اس سیاسی خطرے سے پہلے ہی آگاہ کئے دیتا ہوں، تاکہ اس خوفناک کھیل کا روزِ اوّل ہی خاتمہ کر دیا جائے۔

ابھی چشمۂ ناپاکی تازہ تازہ پھوٹا ہے، جسے سُوئی کی نوک سے بہ آسانی بند کیا جا سکتا ہے۔ لیکن اگر جلد خبر نہ لی گئی تو پھر یہ ناپاک و ہولناک چشمہ دس کروڑ ہاتھیوں کے پاؤں سے بھی بند نہیں ہو سکے گا۔

میں پھر عرض کروں گا کہ میں کانگریس سے ہرگز مایوس نہیں ہوں۔ یا کم سے کم میں ابھی تک کانگریس سے مایوس نہیں ہوا ہوں ——— اور میں خوب واقف ہوں کہ مذہبی اور لسانی تعصبات کے پھیلانے والے کانگریس کے وہ چھوٹے چھوٹے رُکن ہیں جو اپنے کو "مہاشہ" اور "مہنت" کہلاتے اور اپنی پیشانیوں کو نیلی پیلی لکیروں سے دیوالی کی کلھیا بناتے رہتے ہیں۔ مگر کیا کیا جائے کہ یہی چھوٹے چھوٹے حقیر افراد، کانگریس کے پاؤں ہیں، اور ہم اُس سر کو محفوظ نہیں سمجھ سکتے جس کے پاؤں اس قدر کمزور اور بودے ہوں۔

کانگریس دراصل ایک خوشنما مور ہے، لیکن یہ "مذہب گزیدہ" افراد اُس مور کے پاؤں ہیں ——— کیا کانگریس اپنے پاؤں دیکھکر شرماتی نہیں ہے؟

انسان کا مستقبل

بصیرتوں پہ ہے عکس افگن، بصارتوں سے چھپا ہوا ہے
وہ بابِ مستقبلِ درخشاں، جو بہرِ انساں کھُلا ہوا ہے

تمام اجزا رواں دواں ہیں ازل ہی کے دن سے کُل کی جانب
لگی ہیں اک عمر سے نگاہیں ہر ایک کانٹے کی گُل کی جانب

مُطیع ہونے کی عنصروں میں خود اس طرح کشمکش ہے جاری
ملیگی انساں کو رفتہ رفتہ دیارِ قدرت کی شہریاری

فرشتے چُومیں گے پائے انساں، قدم پہ جُھک جائیگا دو عالم
ضمیرِ انسانیت کے اندر مچل رہی ہے وہ سعیِ پیہم

ہر ایک پتّی، ازل کے دن سے نظر کے کانٹے پہ تل رہی ہے
ہر ایک موجِ نفس کے اندر، گرہ حقائق کی کھُل رہی ہے

ابھی تک انساں ہے طفلِ باطل، ابھی موافق فضا نہیں ہے
کہاں پہونچ کر رہے گا انساں، یہ کھُل کے کہنا روا نہیں ہے

دبیرِ کون و مکاں بنے گا؟ امیرِ ارض و سما بنے گا!
گرہ نہ کھُلنے پہ تو بشر ہے، گرہ کھُلے گی تو کیا بنے گا؟

جوش

قوائے ذہنی کے سربستہ راز پر ایک سرسری نظر

ناظر

یہ کون نہیں جانتا کہ ادراک کا ذریعہ حواس ہیں یعنی بیرونی عالم سے ہمارا التعلق حواس کے ذریعہ سے ہے۔ اور یہ عمل اس طرح ہوتا ہے کہ خارجی وجود ہمارے حواس پر اثر انداز ہوتا ہے۔ اس اثر اندازی میں لذت یا الم کی کیفیات شامل ہوتی ہیں۔ اور ان کیفیات کے لحاظ سے دماغی فعل عمل میں آتا ہے۔ اگرچہ وجود ذہنی اور وجود خارج کا مسئلہ فلسفہ والوں میں موضوع بحث رہا ہے، اور یہ بات محلِ نظر ہے کہ جس چیز کو وجود فی الخارج کہا جاتا ہے وہ ذہن سے علیحدہ کوئی ہستی رکھتی ہے یا نہیں۔ بہرحال ہمارے وقوف اور آگہی کا منبع ہمارے حواس ہی ہیں۔ مگر ایسی مثالیں بھی مشاہدے میں آتی ہیں جہاں قوت مدرکہ حواس کی وساطت کے بغیر عمل کرتی ہے۔ مثلاً دوسرے آدمی کا مافی الضمیر معلوم کرنا۔ ایک جگہ بیٹھ کر دوسری جگہ کے حالات و واقعات کو دیکھ لینا۔ مستقبل کے متعلق پیش گوئی کرنا۔ ایسی مثالوں سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض ایسی مخفی ذہنی قوتیں ہیں جن کی توجیہہ معلومہ طبعی قوانین کی بنا پر نہیں ہوسکتی۔ بعض دفعہ ہم کسی چیز کا خیال کرتے ہیں اور وہ سامنے آجاتی ہے۔ بعض دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ ہم کوئی واقعہ ظہور پذیر ہوتے ہوئے دیکھتے ہیں اور معاً یہ محسوس ہوتا ہے کہ ہمارا ذہن اس سے پہلے مطلع ہو چکا ہے۔ ایک شخص اپنے دوست کا تصور کرتا ہے جو ہزاروں میل پر ہے۔ اور اسی وقت یکایک راستے میں اس سے ملاقات ہو جاتی ہے۔ ایک شخص ریل میں سوار ہوتے وقت دل کی آواز سنتا ہے کہ راستے میں ریل کی ٹکر ہو گی اور پھر واقعی ریل لڑ جاتی ہے۔ بعض دفعہ کوئی چیز دل کے اندر سے یہ کہتی ہے کہ فلاں مکان (جو کہ بظاہر اچھی حالت میں ہے) چھوڑ دینا چاہیئے کیونکہ یہ منہدم ہونے والا ہے، اور کچھ روز بعد وہ مکان واقعی گر پڑتا ہے۔ ایک شخص تین ہزار میل کے فاصلے سے اپنے دوست کا مکان جلتا ہوا دیکھ لیتا ہے اور پھر اخبار میں یہ خبر شائع ہو کر اس کی تصدیق کر دیتی ہے۔ ایک شخص اپنے مرنے سے بہت قبل اپنی موت کا دن۔ تاریخ اور ساعت ٹھیک ٹھیک بتا دیتا ہے۔ ایک شخص اپنے آپ کو ایک خاص لباس میں (جو اس نے کبھی نہیں دیکھا تھا) گھوڑے پر سوار دیکھتا ہے اور پھر کئی برس بعد وہ فوج میں بھرتی ہوتا ہے اور خیالی تصویر واقعیت کا جامہ پہن لیتی ہے۔ ایک شخص اپنے گم شدہ مضمون کی تلاش میں چلا جا رہا ہے کہ ایک شخص پیچھے سے آکر وہی مضمون یہ کہہ کر اس کے ہاتھ میں دیدیتا ہے کہ میں اتنے عرصے سے اس کی حفاظت کر رہا تھا اب آپ کے مل جانے پر آپ کے سپرد کرتا ہوں۔ ایک شخص کئی ہزار میل سے ایک قصبے میں بخارات اٹھتے ہوئے دیکھتا ہے اور پھر کئی برس بعد وہاں آتش فشاں پہاڑ پھٹتا ہے۔ ایک شخص بازار میں جاتے ہوئے کسی اندرونی وسوسے سے مجبور ہو کر ایک خاص گلی میں مڑ جاتا ہے۔ جہاں مدتوں کے بچھڑے ہوئے ایک دوست سے یکایک ملاقات ہو جاتی ہے۔ ان تمام باتوں کا جواب ایک منکر کی طرف سے یہ ہوگا کہ یہ محض اتفاقی امور ہیں جو قابلِ اعتنا نہیں۔ ایسی متوحش باتوں کا وقوع پذیر ہونا نہ تو تعجب خیز ہے اور نہ کوئی قانونِ قدرت اس سے شکست ہوتا ہے۔ وہ علیحدہ علیحدہ اور غیر متعلق باتوں کا وقت اور مقام کے لحاظ سے منطبق ہو جانا اتفاق کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے۔ ان بیشمار خیالات میں سے جو دماغ میں آتے جاتے رہتے ہیں اگر کوئی ایک اتفاقاً ٹھیک نکل آئے تو اس سے کسی مخفی دماغی قوت کا سراغ نہیں لگتا۔ یہ انسانی خاصہ ہے کہ اگر کوئی ایک بات ٹھیک نکل آئے تو اس سے متاثر ہوتا ہے اور جو بے شمار باتیں، غلط نکلتی ہیں ان کو نظر انداز کر دیتا ہے، جب تک اس

قسم کے واقعات پر قابو نہ ہو یعنی اپنی مرضی سے جا ہے جب یہ عمل کر سکیں اور صحیح نتائج پیدا کر سکیں اُس وقت تک یہ کہنا غلط ہوگا کہ فوق الحواس ادراک کی قوّت ذہن میں موجود ہے۔ اِس اعتراض کے یہ معنی ہوئے کہ ذہن کی وہ اضطراری کیفیات جو ہم کو غیب پر بعض دفعہ مطلع کرتی ہیں، جب تک مستقل اور دائمی نہوں ہم کسی غیر معمولی قوت کے مدعی نہیں بن سکتے۔ لیکن لا تعداد تجربوں سے یہ بات پایۂ ثبوت تک پہونچ گئی ہے کہ بعض آدمیوں میں اس قسم کا ملکہ مستقل طور پر ہوتا ہے۔ مثلاً تاش کے پتّوں کو بغیر دیکھے ٹھیک ٹھیک بتا دینا۔ دوسرے کا ما فی الضمیر معلوم کر لینا۔ آئندہ واقعات کی اطلاع دینا۔ کسی حادثہ کے متعلق قبل از وقت پیشین گوئی کرنا۔ وغیرہ۔ اِن شواہد کی توجیہہ سے معلومہ قوانین طبعی عاجز ہیں۔ حرارت اور روشنی کی لہریں۔ ریڈیو کا تموّج۔ مقناطیسی کشش۔ برقی رَو۔ کہربائی قوت۔ اِن چیزوں میں سے کوئی چیز تسلی بخش حل بہم نہیں پہنچاتی۔ یہ سب چیزیں طبعی قوانین کی پابند ہیں۔ جتنی قسم کے تموّج ہیں وہ فاصلے کے ساتھ کمزور ہوتے جاتے ہیں۔ اور ایک حد پر جا کر ختم ہو جاتے ہیں۔ مگر جس ذہنی قوت کا ذکر کیا جا رہا ہے وہ فاصلے کی درازی یا وقت کے بُعد سے متاثر نہیں ہوتی۔ وہ مکان اور زمان کے قیود سے بالکل آزاد ہے، وہ اِن نام نہاد قوانینِ فطرت کے علی الرغم عمل کرتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انسانی ذہن میں فاصلے کی چیزوں کو دیکھنے اور سُننے کی استعداد اب بھی باقی ہے۔ جو کہ قدیم انسان میں زیادہ نمایاں تھی۔ مگر اب مادّی رُجحانات کے باعث بہت کم ہو گئی ہے۔ پہلے زمانے کے وحشی انسان اپنی بیماری موت اور دوسرے پیش آنے والے حادثات سے لبا اوقات مطلع ہو جاتے تھے۔ ان ذہنی کمالات کی ایک توجیہہ یہ پیش کی جاتی ہے کہ تمام کائنات میں ایک عالمگیر یا مجموعی ذہن ہے اور ہمارے انفرادی ذہن اس کے اجزا ہیں اور اس تعلق کو جس قدر بڑھایا جائے گا اور عالمگیر ذہن سے ربط پیدا کیا جائیگا اتنا ہی ماضی۔ حال اور مستقبل ہم پر منکشف ہوتا جائے گا۔ مگر یہ توجیہہ نہیں ہے بلکہ ایک صوفیانہ مفروضہ ہے۔ اس سے زیادہ اس کے متعلق اور کچھ نہیں کہا جا سکتا۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ ذہنی قوت کوئی غیر معمولی شے نہیں ہے، بلکہ خاص خاص صورتوں میں کم و بیش سب انسانوں میں پائی جاتی ہے۔ دیگر نفسیاتی اعمال کی طرح یہ بھی ایک عمل ہے۔ جس کو سائنس نے اب سے قبل درخورِ تحقیق نہیں سمجھا۔ جس طرح مسمریزم وغیرہ کو خرافات سمجھا جاتا رہا۔ سائنس اگر ایسے فوق الحواس مدرکات کو تسلیم کرنے سے انکار کرتی رہی تو اس کی وجہ یہ تھی کہ ایسے شواہد کو کائنات کے اُس مسودے میں کہیں جگہ نہیں دی جا سکتی تھی جو سائنس نے بزعم خود تصور کر رکھا تھا۔ آئنسٹائن اور موجودہ دَور کے دیگر سائنسدانوں اور محققین نے قدیم طبعی نظریئے کی دھجیاں اُڑا دی ہیں۔ مادہ۔ قوت۔ علت و معلول۔ مکان و زمان کا آج وہ مفہوم نہیں رہا جو گزشتہ صدی میں تھا۔ پہلے کائنات عبارت تھی مکان۔ زمان اور مادے سے۔ گویا یہ تینوں چیزیں ایک دوسرے سے مختلف اور علیحدہ علیحدہ تھیں۔ مگر اس زمانے کے سائنسدانوں مثلاً اڈنگٹن۔ رسل۔ آئنسٹائن وغیرہم نے ان تینوں چیزوں کو ملا کر ایک کر دیا۔ حرکت۔ تسلسل۔ تقدم و تاخر۔ علت و معلول زمان و مکان۔ مادّہ و قوّت یہ سب اپنے محدود اطلاق میں ٹھیک اور درست ہیں۔ یعنی روزمرّہ کی زندگی میں عام طبعی مشاہدات کی توجیہہ ان قوانین کے ذریعے سے خاطر خواہ ہو سکتی ہے۔ لیکن جب ہم اِن حدُود سے متجاوز ہوتے ہیں تو عالم مطلق میں یہ سب نام نہاد قوانینِ قدرت شکست ہو جاتے ہیں؟ جب ہم ذرّے کا (جو پہلے مادّے کی انتہا سمجھی جاتی تھی) تجزیہ کر کے دیکھتے ہیں، یا خلا کی دُور دراز وسعتوں کا مطالعہ کرتے ہیں، تو یہ عام اصُول جن کو قانونِ قدرت کے نام سے پُکارا جاتا ہے ٹھیک نہیں اُترتے Relativity کے نظریئے میں جہاں زمان اور مکان ایک دوسرے میں مدغم ہو جاتے ہیں مستقبل اور حال میں کوئی فرق نہیں رہتا۔ اس نئے نظریئے کے بموجب وقت ایک چادر کی طرح پھیلا ہوا ہے اور ماضی۔ حال۔ مستقبل بیک وقت موجود ہیں۔ واقعات یکے بعد دیگرے پیدا نہیں ہوتے۔ بلکہ وہ سب پہلے سے موجود ہیں۔ ہم اُن پر ٹھوکریں کھاتے رہتے ہیں۔ اس کے یہ معنی ہیں کہ وہ واقعات جن کو ہم ماضی یا مستقبل سے منسوب کرتے ہیں وہ سب حال میں موجود ہیں۔ اور نفسی بصیرت سے اُن کا فی الحال مشاہدہ کیا جا سکتا ہے۔ تینوں زمانوں کی بجائے اصل میں ایک ہی زمانہ ہے یعنی حال۔ ماضی بھی حال ہے اور مستقبل بھی حال ہے، اور اسی طرح فاصلہ بھی اضافی چیز ہے۔ اصل میں وقت اور فاصلہ علیحدہ علیحدہ چیزیں نہیں ہیں۔

یہ بات یاد رکھنی چاہیئے کہ سائنس مصنوعی چیز ہے جو انسانی دماغ کی ساختہ و پرداختہ ہے۔ جس چیز کو ہم نیچر کہتے ہیں وہ ہمارے ذہن کی صنعت

ہے۔ ہم اپنے محدود تجربے میں اشیاء کو دیکھتے ہیں کہ وہ کیونکر عمل کرتی ہیں اور اس طرح ہم کچھ اصول اور قواعد و ضوابط مستنبط کر لیتے ہیں۔ اِن کو ہم عمومیت عطا کر کے قوانین قدرت کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ ان کی کارفرمائی کا دائرہ محدود ہوتا ہے اور اِس تعمیم کی خامیاں اُس وقت آشکار ہوتی ہیں جب ہمارے مشاہدے کا دائرہ عام مظاہرِ فطرت کے معینہ حدود سے آگے بڑھتا ہے۔

آج مادّے اور ذہن کی قدیم تفریق مٹ چکی ہے۔ بقول رسل اصلیت میں کوئی ایسی شے ہے جو نہ مادہ ہے اور نہ ذہن۔ ایک ہی چیز ایک حیثیت سے ذہن ہے اور دوسری حیثیت سے مادّہ ہے۔ ترتیب کے اختلاف سے بظاہر دو مختلف چیزیں معلوم ہوتی ہیں۔

سائنس کی موجودہ تحقیقات کی روش اور افتاد سے اندازہ ہوتا ہے کہ ایک صدی بعد بہت سے نفسیاتی مسائل حل ہو جائیں گے جو آج محیر العقول ہیں۔ مگر اس وقت بھی وہ زمانہ آگیا ہے جب کہ ہم اِن غیر معمولی شواہد کو نامعقول کہہ کر برطرف نہیں کر سکتے۔ ہمارے غیر معمولی تاثرات۔ ہماری وجدانی کیفیات۔ نغمات کے اثر سے ہمارا رقص۔ صبح و شام کے مناظر سے ہماری بصیرت افروزی۔ ایک شاعر کے جذبات کی گہرائی۔ ایک مذہبی شیدائی کا شوقِ شہادت، ہماری ہنگامی مجذوبیت اور مجنونیت، یہ تمام کیفیات مادّے اور ذہن کی مصنوعی مفارقت اور زمان و مکان کے مصنوعی گورکھ دھندے سے خلاصی حاصل کرنے کی اضطراری اور نیم کامیاب کوششیں ہیں۔

"ناظر"

ظالم سماج

اِس جہاں میں دو محبت کرنیوالے پاک دل — رہتے ہیں محرومِ لطفِ انبساط و ابتہاج

اُن کی پاکیزہ اُمنگوں کو کچلنے کے لئے — گھات میں رہتے ہیں اس دنیا کے شیطانی رواج

اُن کی آہوں اور کراہوں کو کوئی سنتا نہیں — اُن کی فریادوں کو رہتی ہے اثر کی احتیاج

اُن کی بربادِ تمنا زیست کا حاصل ہے کیا — ایک سوزِ جانگداز اور ایک دردِ لاعلاج

اُن کے جذبِ اندروں کی قدر کیا سمجھے بھلا — سیم و زر کی مورتی کو پُوجنے والا سماج

ہے محبت اس گناہستاں میں اک جرمِ عظیم — یہ گناہستاں کہ جس میں ہے ہوسکاری کا راج

یاں محبت کے مقدس جرم کی پاداش میں — چھوڑنے پڑتے ہیں شاہوں کو بھی اپنے تخت و تاج

سینکڑوں دل تیرے قدموں کے تلے پامال ہیں
لعنت اے بیدرد تُف ہے اے ظالم سماج

مجید امجد بی، اے

دو بچے

مترجمہ محمد رضا انصاری

تصویر کے دو رُخ

اپنے عالیشان محل کی برجی پر کھڑے ہو کر، اُس نے عظیم الشان مجمع کی طرف، جو اُس کے پائیں باغ میں کھڑا ہوا تھا، خطاب کرتے ہوئے کہا۔

"میں تم لوگوں کو، اور تمام اہالیان ملک کو مبارکباد دیتا ہوں اور خوشخبری سُناتا ہوں کہ میری ملکہ نے بچہ جنا ہے، جو میرے محترم خاندان کی عزت کو زندہ کرے گا۔ تم لوگوں کے لئے قابلِ فخر اور پشت پناہ ہوگا، اور اُن تمام چیزوں کا وارث ہوگا جو میرے نامور اجداد بطور میراث چھوڑ گئے ہیں۔ خوش ہو اور شکر ادا کرو۔ تمہارا مستقبل ایک نجیب الطرفین بچے سے وابستہ ہو گیا ہے"!

مجمع نے پُرزور نعرے لگائے۔ فضا خوشی اور مسرت کے نغموں سے گونج اُٹھی۔ اس خیال سے کہ بچہ ناز و نعمت کی گود میں پرورش پائے گا، اور اعزاز و احترام کے منصب پر جوان ہوگا۔ اس کے بعد مخلوقِ خدا پر حاکمِ مطلق ہو جائے گا، اُن کے جسموں کا حقدار اور جانوں کا مالک ہوگا۔ اس لئے لوگ خوشیاں منا رہے ہیں، مسرت کے گیت گا رہے ہیں، اور خوشی کے جام پر جام لنڈھا رہے ہیں۔

عین اُس وقت ـــــ جبکہ اہالیانِ شہر "سلوت و جبروت" کے گُن گا کر اپنی ذلت کا اعلان کر رہے تھے اور ملائکہ اُن کی حقارت پر آنسو بہا رہے تھے ـــــ ایک معمولی بوسیدہ مکان میں ایک عورت بسترِ مرگ پر پڑی ہوئی، اپنے سلگتے ہوئے سینے سے اپنے نوزائیدہ بچے کو، جو چند سڑی گلی دھجیوں میں لپٹا ہوا تھا، چمٹائے ہوئے تھی۔

یہ ایک لڑکی ہے جو مفلسی اور بدبختی کا شکار ہے۔

یہ ایک مظلوم کی بیوی ہے جس کو ظالم کے ظلم نے تباہ کر ڈالا ہے۔ یہ عورت اکیلی ہے، اِس کے پاس آج کل کی رات "دنیا کے پالنے والے" نے ایک چھوٹا سا رفیق بھیجدیا ہے جس نے محنت اور مزدوری کی طرف سے اسکے ہاتھ باندھ دیئے ہیں۔

جب سڑکوں پر شور و غل ختم ہو چکا تھا، غریب لڑکی نے اپنے بچے کو گود میں اُٹھا لیا اور اُس کی چمکتی ہوئی آنکھوں کو دیکھکر رونے لگی گویا وہ اپنے گرم آنسوؤں سے اُس کو بپتسمہ دینا چاہتی ہے، ایک دلخراش آواز میں اُس نے کہا۔

"لختِ جگر! تو عالم ارواح کو چھوڑ کر کس لئے یہاں آیا ہے؟ کیا میری تلخ زندگی میں حصہ بٹانے کے لئے؟ یا میری بیکسی پر رحم کھانے کے لئے؟! ملائکہ اور وسیع فضا کو چھوڑ کر، اس تنگ اور ذلت و بدبختی سے بھری ہوئی زندگی کو تو نے کیوں اختیار کیا؟

اے میرے اکلوتے بچے! میرے پاس گرم آنسوؤں کے سوا اور کچھ نہیں ہے! کیا تو دودھ کے بدلے اُسی کو غذا بنائے گا؟ کیا میری ننگی باہیں دیبا اور اون کے بجائے تیرا لباس ہوں گی؟

آہ! چوپاؤں کے بچے گھاس چرتے ہیں اور اپنی جھاڑیوں میں چین سے رات بسر کرتے ہیں۔ پرندوں کے بچے دانا چگتے ہیں، اور شاخوں کے درمیان بہت آرام سے سوتے ہیں، مگر ـــــ اے میرے بچے! تیرے لئے ٹھنڈی آہوں کے سوا اور کچھ نہیں ہے!

اُس نے بچے کو اپنے سینے سے بہت بھینچ کر چمٹا لیا، گویا وہ دونوں جسموں کو ایک کرنا چاہتی ہے۔ اپنی آنکھیں اوپر اُٹھائیں اور زور سے چلائی۔

رحم! اے پروردگارِ عالم!! رحم!!!

جب چاند سے بادل چھٹ گئے۔ ایک لطیف شعاع جھروکے سے اندر داخل ہوئی اور دو بےحس و حرکت جسموں پر پھیل گئی۔ یہ ہے خدائی!!

(خلیل جبران)

تصوّرِ جمال

(IDEA OF BEAUTY)

ل۔ احمد

تہذیب و تمدن کا تقاضا ہے کہ فنونِ لطیفہ کو عروج ہو، اور فنونِ لطیفہ کا مقصد ہے کہ حسن و جمال کا اظہار ہو۔ حکمائے یونان کے عہد سے علوم و فنون نے جو ترقی کے مدارج طے کئے ہیں اس کا ماحصل یہ ہے کہ آج ہر شے کا ایک علم یا فن مدون اور ہر علم یا فن کا ایک فلسفہ مرتب ہو گیا ہے۔

جمالیات کا مخترع اور مدون حکیم ارسطو تھا، اور اگر پروفیسر آیبر کومبی کا قول معتبر ہے تو ارسطو نے جو اصول ترتیب دے دئے اُن پر تا حال کوئی وزنی اضافہ نہیں ہو سکا ہے۔ کروس بینیڈیٹو (Croce Benidito) جمال کا دقیقہ سنج فلسفی تھا، اُس نے اپنی تصنیف "جمالیات" میں صناعت کو مابعد الطبیعات اور سائنس پر ترجیح دی ہے۔ اس کی نظر میں سائنس افادۂ جمال کا نعم البدل نہیں۔ وہ کہتا ہے کہ سائنس ہمیں حقیقت سے جدا کر کے ایسی دنیا میں لے جاتا ہے جو ریاضی کے ترقی پذیر مجردات کی دنیا ہے، اور جس کے مہمات نتائج میں کوئی عملی اہمیت نہیں ہوتی۔ اس کے برخلاف صناعت ہمیں کسی شخصِ خاص یا واقعۂ مخصوص سے روشناس کراتی ہے جو اپنی شکل میں، ایک فرد واقعی کی حیثیت سے، فلسفیانہ طریق پر ایک کائناتی جبلت [illegible] رکھتا ہے۔

علم کی دو صورتیں ہیں۔ علمِ جبلی اور علمِ منطقی۔ جبلی علم کا ذریعہ تخئیل ہے اور منطقی علم کا ذریعہ دماغ۔ بالفاظِ دیگر ایک افراد کا علم ہے، دوسرا کائنات کا۔ یعنی منفرد اشیاء کا علم اور اشیاء کے باہمی تعلق کا علم۔ علمِ افراد کا نتیجہ اشکال و اجسام ہیں اور باہمی تعلقِ اشیاء کے علم کا نتیجہ خیالی وادراک (concept) ہے۔ چنانچہ صناعت پر تخئیل کی حکمرانی ہے جس کا طریقہ طرفہ و عجیب ہے۔ صناعت کا تنہا سرمایہ اشکال ہیں۔ صناعت اپنے موضوع ([illegible]) کی تقسیم نہیں کرتی، اِس کے حقیقی یا خیالی ہونے کا اعلان بھی نہیں کرتی، نہ اُس کے اوصاف بیان کرتی اور نہ اس کی تعریف قائم کرتی ہے۔ بلکہ وہ صرف اس کے احساس کو پیش کر دیتی ہے۔ اس لئے کہ تخئیل فکر کا پیش رو اور فکر کے لئے مستلزم ہے۔ نفس کا صناعانہ مشغلہ شکل طرازی منطق کے مشغلۂ شکل طرازی پر مقدم و مرجح ہے۔ انسان جب تخئیل کرنے کے قابل ہو۔ صناعت کی ابتدا وہیں سے ہے، اور انسان کو استدلال کرنے سے بہت پہلے تخئیل حاصل ہو چکتی ہے۔ مائیکل اینجلو کا خیال ہے کہ نقش ہات سے نہیں بنتا۔ بلکہ اُسے نفس بناتا ہے۔ لیونارڈو کہتا ہے کہ ایک اعلیٰ منطق جب بظاہر کچھ نہیں کرتا اُس وقت اُس کا نفس بہت زیادہ مشغول ہوتا ہے۔

مختصراً یہ کہ جمالیاتی مشغلے کا جوہر اس حقیقت میں ہے کہ صناع ایک مکمل شکل کے تصور کی خموش سعی کرتا ہے جو بالآخر اس کے معبودِ ذہنی کا اظہار کرتی ہے۔ یعنی جبلت کا وہ پہلو جس میں صوفیانہ معرفت کو دخل نہیں ہوتا۔ بلکہ کامل نظر، مکمل تصور اور کافی تخئیل بروئے کار آتے ہیں۔ اور اس جوہر کو مرئی بنا دینا سکان کی ٹکنیک یعنی بس حرفتی ہنر رہی ہے۔

کروس دوسری جگہ کہتا ہے کہ جب ہم "اندرونی لفظ" پر حاوی ہو جاتے ہیں، جب ہم واضح طور پر ایک شکل کا تصور کر لیتے ہیں، جب ہم موسیقی کی طرز یا راگ باندھ لیتے ہیں، تو "اظہار" مرئی ہو جاتا اور مکمل ہو جاتا ہے۔ یعنی جب ہم کچھ کہتے، کچھ کرتے، یا کچھ گاتے ہیں تو وہ کہنا، کرنا، یا گانا پہلے اندرونی طور پر وجود میں آ چکتا ہے۔ قلم جب کاغذ پر رواں ہوتی ہے، پنسل جب بساط پر چلتی ہے، انگلیاں جب ستار یا پیانو پر دوڑتی ہیں، تو یہ ہمارے

ارادے کا نتیجہ ہوتا ہے، یعنی ہمارے یہ افعال محض عملی مشغلہ ہوتے ہیں۔ ورنہ جمالیاتی مشغلہ تو اِن اعمال کے وجود میں آنے سے پہلے ہمارے اندر ہو چکتا ہے۔ اِن افعال کی یہ توجیہ بھی ہو سکتی ہے کہ وہ در اصل اُن اجمالی اعمال کے جو ہمارے بطون میں ہو چکے ہیں، تفصیلی اعمال ہیں۔

"جمال کیا ہے؟" اپنے جواب کے لئے یہ سوال حیرانیوں سے معمور ہے۔ کروچے نے اُس کا یہ جواب دیا ہے کہ ذہن کے اندر کوئی ایسی شکل یا ایک ایسا سلسلۂ اشکال قائم کرنا جس کے اندر شئے مشہودہ کا جوہر ہو، جمال ہے۔ کیونکہ جمال کا تعلق "اندرون" سے ہے۔ "بیرون" سے نہیں۔ اشکال کو جب اندرونی طاقت ملتی ہے تو وہ مرتب ہو جاتی اور موضوع کا اظہار کرتی ہیں۔ حسِ جمال بھی اصلاً غور و انہماک کا نام ہے نہ کہ تخلیق کا، اور وہی اندرونی یا بطونی اظہار بھی ہے، چنانچہ اس قدیم سوال کا جواب یہی ہو سکتا ہے کہ "جمال اظہار ہے!"

فلسفۂ جمال یعنی جمال کی بحث میں اس اصولی نکتے کو سمجھ لینے کے بعد اب دیکھنا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ عام انسانوں کو احساسِ جمال عملاً کیونکر ہوتا ہے؟

"حسن یا جمال" کا لفظ مختلف اوصاف اور خصوصیات کے ساتھ استعمال ہوتا ہے، یعنی شکل و جسم کی خوشنمائی۔ ذہنی و خیالی بلندی۔ کرداری و اخلاقی عمدگی، وغیرہ کی صفت کے طور پر مستعمل ہے۔ غور و توجہ سے ہم اس نتیجے تک پہنچتے ہیں کہ حسن یا جمال کے اصلی و اساسی مفہوم اور عمومی معانی کا تعلق اِن اشیاء سے ہے جن کو آنکھ دیکھ سکتی ہو اور جو مرئی ہوں جس طرح "شیریں" اور "لذیذ" کا تعلق اصلاً کام و دہن سے ہے، "خوش آہنگی" کا سامعہ سے، نرمی کا لمس سے، اور حرارت کا حس سے ہے۔ لیکن احیاناً "حسین و جمیل" کی صفت حواسِ انسانی کے دوسرے موضوعات کے ساتھ بھی استعمال کی جانے لگی ہے۔ آواز کو نرم اور شیریں کہا جاتا ہے اور ایسے علم تناسب کے ساتھ بھی اس صفت کا استعمال جائز ہو گیا ہے۔ جیسے حسین نغمہ وغیرہ۔ تو اس صورت میں کہ "حسن و جمال" یا "حسین و جمیل" کی صفات کا احیاناً استعمال اُس سے زیادہ ہو۔ جتنا کہ "نرم" یا "شیریں" اسمائے صفت کا ہوتا ہے، تو اُس کی وجہ یہی ہے کہ مقابلتاً اُن موضوعات کی کثرت ہے جنھیں آنکھ دیکھتی ہے۔

چنانچہ اس سہل و سادہ اصول کے تحت کہ جمال کا تعلق بیشتر باصرہ سے ہے۔ اور اس اصول کی مطابقت میں، ہم اس نتیجے تک پہنچ جاتے ہیں کہ جمال کا عنصر یہ ادنیٰ رنگوں سے مستخرج ہے، بچہ جب اس قابل ہوتا ہے کہ وہ اشکال و حرکات کی خوبصورتی سے انبساط حاصل کرے، اس سے بہت پہلے شوخ یا تیز روشنی اُسے لبھانے لگتی اور خوش کر سکتی ہے، اس لئے کہ شکل اور حرکت سے انبساط حاصل کرنے میں خیال اور توجہ کو کوشش کرنا پڑتی ہے۔ بچوں کے علاوہ ایسے بالغ انسان جن کے ذوق کی تربیت نہیں ہوتی یا ناقص ہوتی ہے۔ ان کے اندازۂ جمال میں رنگوں کا حسن، صورت کی شکل و جسم کی خوبصورتی پر مرجح ہوتا ہے۔ بلکہ غیر ذی روح اشیاء میں سے تو خوش رنگی کے سوا کوئی دوسری چیز ایسے انسان کو متاثر کرتی ہی نہیں یا وہ متاثر نہیں ہوتا۔

رنگوں کے حسن سے متاثر ہو سکنے کے بہت بعد انسانی باصرہ بتدریج شکل و صورت کے حسن کی قدر کرنا سیکھتا ہے، اور شروع میں ایسی اشکال سے متاثر ہوتا ہے جن کا تناسب بہت واضح ہو۔ اس طور کے مذاقِ حسن کو بالعموم "طفلانہ" کہا جاتا یا "بچپنے" سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اوپر کے استدلال کی یہ ایک مزید دلیل ہے، اور مذاقِ حسن کا یہ دور افراد اور اقوام میں یکساں طور پر وقوع پذیر ہوتا ہے۔

جب رنگوں کے حسن کے ساتھ خارجی تناسب بھی موجبِ انبساط ہو تو فطری طور پر جو جذبہ ہمارے اندر بیدار ہو گا وہ مخلوط ہو گا۔ مگر ہمارا شعور اس کی تمیز نہیں کر سکتا، اور ہمیں وہ ایک سادہ و غیر مرکب جذبہ ہی معلوم ہو گا۔ احساسِ جذبہ کی حالت میں کوئی متنفس نہیں کہہ سکتا کہ اس کے جذبے یا انبساط کی علت یا سبب خاص خوش رنگی ہے یا تناسبِ صوری۔ البتہ فلسفی اپنی تحقیق و مشاہدہ کرتا رہے گا تاکہ وہ معلوم کر سکے کہ اُس انبساط میں حسنِ رنگ کو کتنا دخل تھا اور حسنِ صورت کو کتنا۔

حسن یا جمال حرکت کی صفت ہو تو وہ بھی ایک نوعِ حسن ہے، فطری شکل یا جسم میں کوئی ترمیم یا تبدیلی کر کے اُسے حسین بنایا جا سکتا ہے جو حرکت کی صورت میں ہمارے سامنے ہوتا اور ایسی شکل پیش کرتا، یا دیکھنے والے کے خیال سے پیش کرتا ہے، اور وہ شکل انبساط آفریں ہوتی ہے۔ ترمیم یا تبدیلی کے علاوہ بھی حسن حرکت میں ایک خاص دلکشی ہوتی ہے اور وہ خصوصیت اُس صورت میں پیدا ہوتی ہے جب صاحبِ حرکت [illegible] ذی روح اور

بالخصوص ہماری نوع کا فرد ہو، اِس صورتِ خاص میں حسن حرکت وہ قوی اثر پیدا کرتا ہے جس کی نامعلوم علت کو ہم نے رعنائی کا نام دیدیا ہے۔ اور یہ قوی اثر زیادہ تر اُس دلچسپی پر منحصر ہوتا ہے جو صاحبِ حرکت کو اپنی پرآن و آنی شکل یعنی اس دلکشی سے ہو جو غائب ہوگئی۔ جس کی یاد سے شوق مسحور رہتا اور توقع سے آنکھ مسرور رہتی ہے کہ اب کیا شکل سامنے آنے والی ہے۔ اس کی مثال رنگین پرچم کے لہرانے اور دھوئیں کے چڑھنے والے پیچ وخم میں یا اندھیری رات کی آتش بازی میں بخوبی نظر آجاتی ہے۔

لیکن انسانی اعضار کی حرکات، ان کی رعنا و شان آفریں حرکات کے سحر کا راز ان کے زندہ اظہار میں ہوتا ہے۔ انسانی اعضا کی حرکات خوش ذوقی اور ذہنی علو و برتری کو پیش کرتی ہیں، اور یہ ایک ایسا اظہار ہوتا ہے جو ہر لحظہ نیا اور متنوع ہوتا ہے۔

رنگ، شکل، اور حرکت کے امتزاج سے کتنے ہی مخلوط نتیجے رونما ہوجاتے ہیں۔ مگر ان نتائج کے اندر ان تینوں عناصر کے اثر کو متعین کرنا محال ہوتا ہے، اس پر ہمیں حیرت نہ ہونا چاہیے کہ لفظ "حسن یا جمال" جو اصلاً صرف رنگ سے متعلق تھا بتدریج اور غیر محسوس طریق پر کتنے وسیع معنی کا حامل بن گیا ہے، حسن یا جمال میں یہ وسعتِ معنی اس وجہ سے پیدا نہیں ہوئی ہے کہ خود رنگوں، شکلوں، اور حرکات کے اندر کوئی وجہِ مشترک ہے۔ بلکہ یہ تینوں عنصر صرف اس حد تک ایک دوسرے کے معاون و مددگار ہیں کہ دیکھنے والے کو انبساط ملے۔ مگر یہ یاد رکھنا چاہیے کہ ان تینوں عناصر کی انبساط آفرینی کے اسباب اصلاً مختلف ہیں۔ گو کہ اُن کا اشتراکِ اثر آفرینی ناقابلِ امتیاز ہے۔ یہ عناصر باہمی تعاون سے جو دلخوش کن اثر پیدا کرتے ہیں، اُن کا دیکھنے والا ایک ہی عضو یعنی آنکھ ہے۔ اور وہ بیک وقت دیکھتی ہے۔ حالانکہ اس انبساط آفرینی میں تین مختلف عناصر شامل ہوتے ہیں۔

سرمایہ دار سے خطاب

اے تونگر! زندگی کا دوسرا پہلو بھی دیکھ؛
دیدۂ نادار سے بہتے ہوئے آنسو بھی دیکھ!

اے طلسمِ عشرت و سرمایہ داری کے اسیر!
"عشرت و ادبار" کا چلتا ہوا جادو بھی دیکھ!

اے ضیائے تابشِ رُوئے مسرّت کے امیں!
"کلفت و آلام" کے بکھرے ہوئے گیسو بھی دیکھ!

شہپرِ دولت کے بل پہ اُڑنے والے مایہ دار!
"غربت و افلاس" کے ٹوٹے ہوئے بازو بھی دیکھ!

تُو نے دیکھا ہے خمِ ابروئے دولت کا جلال
آج ناداری کے بَل کھائے ہوئے ابرو بھی دیکھ

سُن پیامِ اشک اور رزمِ حیات و مرگ دیکھ
جس سے دنیا لے رہی ہے درسِ عبرت تو بھی دیکھ

اشک قریشی

ایک شرط

مترجمہ حضرت مخمور بی، اے، ال ال بی

(روس کے مشہور ادیب چیکوو کے ایک افسانے کا ترجمہ)

وہ رات، خزاں کی اندھیری رات تھی۔ بوڑھا مہاجن اپنے دفتر کے ایک سرے سے دوسرے تک ٹہلتا اور وہ پارٹی یاد کر رہا تھا جو اُس نے آج سے پندرہ برس پہلے، خزاں کے موسم میں دی تھی۔ پارٹی میں بہت سے قابل آدمی شریک تھے، اور بڑی دلچسپ گفتگو ہوئی تھی۔ ان لوگوں نے جن چیزوں پر باتیں کیں ان میں ایک موت کی سزا تھی۔ مہمانوں نے جن میں عالموں اور نامہ نگاروں کی کمی نہ تھی، موت کی سزا کو زیادہ تر ناپسند کیا۔ ان سب نے اُسے پرانی چال کا طریقۂ سزا، عیسائی حکومت کے لئے نامناسب اور اخلاق کے خلاف بتایا۔ ان میں بعض کا خیال تھا کہ موت کی سزا کی بجائے ہر جگہ جنم قید رائج ہونی چاہیئے۔

"مجھے آپ حضرات سے اتفاق نہیں" میزبان نے کہا "مجھے خود نہ موت کی سزا کا تجربہ ہے نہ جنم قید کا، لیکن اگر قیاس سے فیصلہ کیا جاسکے تو میری رائے میں موت، قید سے زیادہ دردمندانہ اور قرینِ اخلاق ہے، پھانسی فوراً مار ڈالتی ہے، جنم قید رفتہ رفتہ جان لیتی ہے۔ بتائیے کون زیادہ رحمدل جلاّد ہے، وہ جو چند سکنڈوں میں مار ڈالے، یا وہ جو ستر اسّی برسوں تک جسم سے روح کھینچتا رہے"

"دونوں یکساں اخلاق کے خلاف ہیں" مہمانوں میں سے ایک نے کہا "کیونکہ دونوں کا مقصد ایک ہی ہے، یعنی جان لینا۔ حکومت پروردگار نہیں ہے، اُسے وہ چیز لے لینے کا کوئی حق نہیں، جسے اگر وہ چاہے تو واپس نہ کرسکے"

اس صحبت میں ایک وکیل بھی تھا جو کم و بیش پچیس سال کی عمر کا نوجوان انسان تھا۔ جب اس کی رائے لی گئی تو اُس نے کہا "موت کی سزا اور جنم قید دونوں یکساں اخلاق کے خلاف ہیں۔ لیکن اگر مجھے ان دونوں میں سے انتخاب کا اختیار دیا جائے تو میں یقیناً دوسری کو منتخب کروں۔ بالکل نہ جینے سے کسی نہ کسی حال میں جینا بہتر ہے"

اس پر بڑی گرم جوشی سے بحث ہوئی، مہاجن کو، جو اُس وقت مقابلتاً کم عمر اور زیادہ تنک مزاج تھا، یکایک غصہ آگیا۔ اُس نے دھڑ سے میز پر گھونسا مارا اور جوان وکیل کی طرف رُخ کرکے چلّا اُٹھا۔

"یہ غلط ہے۔ میں بیس لاکھ کی شرط بدتا ہوں۔ تم پانچ برس بھی کال کوٹھری میں نہیں رہ سکتے"

"اگر تم سچے ہو" وکیل نے جواب دیا "تو میں بدتا ہوں۔ پانچ نہیں پندرہ سال رہوں گا" "پندرہ، اچھا ہو گئی" مہاجن نے چلّا کر کہا "صاحبو، میں بیس لاکھ لگاتا ہوں" "راضی، تم بیس لاکھ لگاتے ہو، میں اپنی آزادی لگاتا ہوں" وکیل نے جواب دیا۔

اس طرح یہ بے تکی، تمسخر انگیز شرط بدلی گئی۔ مہاجن جس کے پاس روپیہ اس وقت اَن گنتی تھا، جس کا دماغ چلا ہوا اور مزاج متلون تھا، جوش میں آپے سے باہر تھا۔ شب کے کھانے کے دوران میں اس نے وکیل سے مذاق کے لہجے میں کہا۔

"میاں صاحبزادے، وقت نکل جانے سے پہلے ہوش میں آجاؤ۔ بیس لاکھ میرے لئے کچھ نہیں ہے۔ لیکن تم اپنی زندگی کے بہترین زمانے میں سے تین چار سال کھو بیٹھنے کے پیچھے پڑے معلوم ہوتے ہو۔ میں تین چار اس لئے کہتا ہوں کہ تم اس سے زیادہ برداشت نہ کر سکوگے۔ ارے بدنصیب، یہ یاد رہے کہ خود اختیاری قید، جبری سے بہت زیادہ سخت ہوتی ہے۔ یہ خیال کہ اپنے کو چھڑا لینے کا ہر وقت حق حاصل ہے، کال کوٹھری میں تمہارے سارے اوقات تلخ کرکے رکھدے گا۔ مجھے تم پر رحم آتا ہے۔"

اور اب اس مہاجن کو ایک سرے سے دوسرے تک ٹہل ٹہل کر، یہ سب باتیں یاد آگئیں اور اُس نے اپنے آپ سے پوچھا۔

"میں نے یہ شرط کیوں بدی۔ اس سے کیا فائدہ ہوا۔ وکیل کی زندگی کے پندرہ برس غارت ہوئے اور میرا بیس لاکھ روپیہ پھنکا۔ کیا اس سے لوگوں کو یقین آجائے گا کہ موت کی سزا حبسِ قید سے بدتر یا بہتر ہے۔ نہیں نہیں، یہ سب حماقت اور بیہودگی ہے۔ میری حرکت پیٹ بھرے کا خبط تھی۔ وکیل کی خالص دولت کا لالچ۔"

اس کو اور آگے یاد آیا کہ اس ایوننگ پارٹی کے بعد کیا ہوا تھا۔ یہ قرار پایا تھا کہ مہاجن کے پائیں باغ والے قطعے میں، وکیل اپنی قید کی مدت سخت ترین نگرانی میں بسر کرے گا۔ یہ طے ہوا تھا کہ اس مدت میں وہ دروازے کی چوکھٹ پار کرنے، آدمیوں سے ملنے جلنے، انسانی آواز سننے، خطوط اور اخبار پڑھنے کے حق سے محروم رہے گا۔ اس کو ایک باجا رکھنے، کتابیں پڑھنے، خط لکھنے، شراب اور تمباکو پینے کی اجازت تھی۔ معاہدے کی رُو سے، وہ بیرونی دنیا سے ایک کھڑکی میں ہوکر جو اسی غرض کے لئے بنائی گئی تھی، صرف خاموشی کے ذریعے، مراسلت کر سکتا تھا، وہ کھڑکی سے رقعہ بھیج کر ضرورت کی ہر چیز، کتابیں، باجا، شراب جتنی مقدار میں چاہے منگا سکتا تھا، معاہدے میں وہ تمام چھوٹی چھوٹی تفصیلیں درج تھیں جو اس قید کو سخت ترین قید تنہائی بناتی تھیں، اور وہ وکیل کو پابند کرتا تھا کہ ۱۴ر نومبر ۱۸۷۰ء کے بارہ بجے سے ۱۵ر نومبر ۱۸۸۵ء کے بارہ بجے تک پورے پندرہ برس قید رہے۔ شرائط کو توڑ کر، وقت سے صرف دو ہی منٹ پہلے نکل بھاگنے کی ذرا سی کوشش بھی مہاجن کو بیس لاکھ کی ادائیگی کے بار سے سبکدوش کرتی تھی۔

جتنا کچھ اس کے مختصر رقعوں سے اندازہ کیا جاسکا یہ ہے کہ قید کے پہلے سال میں وکیل کو تنہائی اور بے شغلی سے سخت اذیت ہوئی۔ اس کے محبس سے دن رات پیانو کی آواز آیا کرتی تھی۔ شراب اور تمباکو اس نے ترک کردی تھی۔ "شراب" اس نے لکھا "خواہشیں اُبھارتی ہے اور خواہشیں قیدی کی خاص دشمن ہیں۔ اس کے علاوہ اچھی شراب تنہا پینے سے زیادہ بدمزہ کوئی کام نہیں ہے اور تمباکو کمرے کی ہوا خراب کرتی ہے۔" پہلے سال وکیل کو سہل کتابیں بھیجی گئیں۔ ان میں محبت کی پیچیدہ کہانیوں والے ناول، جرم اور بلند پروازی کے افسانے۔ طربیہ اور اسی قسم کی دوسری کتابیں تھیں۔

دوسرے سال، پیانو بند ہوگیا اور وکیل نے صرف ادب القدما مانگا۔ پانچویں سال موسیقی پھر سنی گئی اور قیدی نے شراب مانگی۔ نگرانوں نے بیان کیا کہ اس پورے سال میں وہ صرف کھاتا، پیتا اور بستر پر لیٹا رہا۔ اکثر وہ انگڑائیاں لیتا اور آپ ہی آپ غصے ہونے لگتا تھا۔ کتابیں بالکل نہ پڑھتا تھا۔ کبھی کبھی راتوں کو لکھنے بیٹھ جاتا تھا۔ بڑی دیر تک لکھتا رہتا تھا، اور صبح ہوتے ہوتے سب پھاڑ ڈالتا تھا۔ ایک مرتبہ سے زیادہ اُسے روتے سُنا گیا۔

چھٹے سال کے دوسرے نصف میں، قیدی نے بڑے شوق سے زبانوں، فلسفے اور تاریخ کا مطالعہ شروع کیا۔ ان مضامین پر وہ ایسا بھوکے کی طرح ٹوٹا کہ مہاجن کو اس کے لئے پوری کتابیں منگانا مشکل ہوگیا۔ چار برس کی مدت میں، اس کی درخواست پر تقریباً چھ سو جلدیں خریدی گئیں۔ اسی زمانے میں جب کہ اس پر یہ بھوت سوار تھا، مہاجن کو قیدی کا یہ خط ملا "مائی ڈیر جیلر، میں یہ سطریں چھ زبانوں میں لکھ رہا ہوں۔ انھیں ماہروں کو دکھا دو۔ وہ انھیں پڑھ لیں۔ اگر انھیں ایک بھی غلطی نہ ملے، تو براہ کرم، تم اپنے حکم سے باغ میں ایک بندوق چلوا دینا۔ اس شور سے میں سمجھ لوں گا کہ میری محنت ضائع نہیں ہوئی۔ سارے زمانوں اور تمام ملکوں کے فطین مختلف زبانوں میں اظہار خیال کرتے ہیں۔ لیکن اُن سب کے یہاں ایک ہی شعلہ روشن ہے۔ کاش اب جب کہ میں اُن کو سمجھ سکتا ہوں تمھیں میری فردوسی مسرت کا اندازہ ہوسکتا۔" قیدی کی خواہش پوری کردی گئی۔ مہاجن کے حکم سے باغ میں دو مرتبہ بندوق سر کردی گئی۔

اس کے بعد، دسواں سال گزرنے پر، وکیل اپنی میز کے قریب ساکت بیٹھا نیا عہد نامہ (انجیل) پڑھا کرتا تھا۔ مہاجن کو اس پر تعجب تھا کہ وہ شخص

جس نے چار سال میں چھ سو دقیق جلدوں پر عبور کر لیا، ایک ایسی کتاب پڑھنے میں جس کا سمجھنا نہایت آسان ہے اور جو کسی طرح ضخیم بھی نہیں ہے۔ کیونکر ایک سال لگا سکتا ہے۔ نئے عہد نامے کی جگہ آخر، مذہبوں کی تاریخ اور فقہ نے لیلی۔

قید کے آخری دو سال کی مدت میں، قیدی نے، غیر معمولی مقدار میں بالکل بے سر و پا، مطالعہ کیا۔ کبھی وہ طبیعیاتی علوم میں منہمک ہو جاتا تھا، کبھی بائرن یا شیکسپیر کا کلام پڑھنے لگتا تھا۔ اُس کے رقعے برابر آتے تھے۔ جن میں، وہ ایک کتاب علم کیمیا کی، ایک درسی طب کی۔ ایک ناول، اور کچھ فلسفے اور الٰہیات کے صحیفے، بیک وقت بھیجنے کے لئے لکھتا تھا۔ اس کا مطالعہ اس طرح کا تھا جیسے وہ شکستہ جہاز کے ٹکڑوں کے درمیان سمندر میں تیر رہا ہو، اور جان بچانے کی خواہش میں، کبھی ایک کبھی دوسرا ٹکڑا بڑے شوق سے پکڑ لیتا ہو۔

مہاجن کو یہ سب یاد آگیا، اور اُس نے سوچا۔

"کل بارہ بجے وہ آزاد ہوا جاتا ہے۔ معاہدے کی رُو سے مجھے اس کو بیس لاکھ ادا کرنے پڑیں گے۔ اگر میں ادا کرتا ہوں تو میرا خاتمہ ہے، ہمیشہ کے لئے تباہ ہوتا ہوں۔۔۔۔۔۔"

پندرہ سال پہلے اس کے پاس اَن گنتی تھا۔ لیکن آج اپنے آپ یہ پوچھتے ہوئے اُس کا جی دہلتا تھا کہ اس کی دولت زیادہ ہے یا قرضہ۔ اسٹوک اکسچینج میں جوا کھیلنے، خطرناک سٹا لگانے اور بے دردی سے لُٹانے کی خُو نے، جس سے وہ بوڑھاپے میں بھی چھٹکارا نہ پا سکا تھا۔ رفتہ رفتہ اس کے کاروبار کو بگاڑ دیا تھا۔ اور وہ بے دھڑک، پُر اعتماد، مغرور، کاروباری انسان، ایک معمولی مہاجن ہو کر رہ گیا تھا جو بازار کے ذرا ذرا سے گرنے اور چڑھنے سے کانپ کانپ جاتا تھا۔

"وہ منحوس شرط" بوڑھے نے مایوسی میں اپنا سر پکڑ کر کہا۔۔۔۔۔ "مر دک مر کیوں نہ گیا۔ اس کی عمر صرف چالیس سال کی ہے۔ وہ میری کوڑی کوڑی گنوا لیگا۔ شادی کرے گا۔ زندگی کے مزے لُوٹے گا اکسچینج میں جوا کھیلے گا اور میں ایک حاسد فقیر کی طرح تکوں گا، اور روز اُس کے منہ سے یہی ایک بات سنوں گا: میں اپنی زندگی کی خوشیوں کے لئے آپ کا ممنون ہوں۔ لائیے میں آپ کی مدد کروں، نہیں، یہ برداشت کے قابل نہیں، دیوالے اور ذلت سے بچنے کی صرف یہی ایک تدبیر ہے کہ وہ مر جائے"

گھڑی نے ابھی تین بجائے تھے۔ مہاجن سُن رہا تھا۔ گھر میں ہر شخص پڑا سو رہا تھا، صرف باہر کے برف سے لدے ہوئے درختوں کی سنسناہٹ کھڑکیوں میں ہو کر سنائی دیتی تھی اس طرح کہ آہٹ نہ ہو۔ اُس نے تجوری سے، اس دروازے کی کنجی نکالی جو پندرہ سال سے نہ کھولا گیا تھا۔ اپنا اُوور کوٹ پہنا اور گھر سے نکلا۔ باغ پر تاریکی اور سردی چھائی ہوئی تھی۔ بدن میں تیر کی طرح گھس جانے والی مرطوب ہوا۔ باغ میں دہاڑ رہی تھی، اور پیڑوں کو چین نہ لینے دیتی تھی۔ وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہا تھا مگر اُس کو نہ زمین دکھائی دیتی تھی نہ سفید مجسمے۔ نہ بائیں باغ والا قطعہ نہ درخت۔ بائیں باغ والے قطعے کے قریب پہونچ کر، اُس نے چوکیدار کو دو مرتبہ پکارا۔ کوئی جواب نہ تھا۔ ظاہر تھا کہ چوکیدار ایسے سخت موسم سے پناہ لے کر، باورچی خانے یا گرین ہاؤس (شیشے کا ایک مکان جس میں نازک پودے حفاظت کے لئے رکھے جاتے ہیں) میں کہیں سو رہا ہوگا۔

"اگر میں جرأت کر کے اپنا ارادہ پورا کر ڈالوں" بوڑھے نے سوچا "تو سب سے پہلے چوکیدار پر شبہ ہوگا"

اندھیرے میں، سیڑھیاں اور دروازہ ٹٹول کر، وہ بائیں باغ والے قطعے کے ہال میں داخل ہوا۔ پھر ایک سکڑے راستے میں گھسا اور ایک دیا سلائی جلائی۔ وہاں چوہے کا بچہ بھی نہ تھا۔ کسی کا پلنگ جس پر بستر نہ تھا وہاں کھڑا تھا اور کونے میں لوہے کی ایک ٹھنڈی انگیٹھی دھندلی دھندلی نظر آرہی تھی۔ دروازے کی مہریں جس سے قیدی کے کمرے میں داخل ہوتے تھے، سالم تھیں۔

جب دیا سلائی بجھ گئی، تو بوڑھے نے گھبراہٹ میں کانپتے ہوئے چھوٹی کھڑکی میں جھانکا۔

قیدی کے کمرے میں ایک دھیمی موم بتی جل رہی تھی قیدی خود میز کے سہارے بیٹھا ہوا تھا۔ صرف اُس کی پیٹھ، سر کے بال، اور اس کے ہاتھ نظر آتے تھے۔ کھلی ہوئی کتابیں میز، دونوں کرسیوں اور میز کے قریب قالین پر، اِدھر اُدھر بکھری پڑی تھیں۔

پانچ منٹ گزر گئے اور قیدی نے ایک مرتبہ بھی جنبش نہ کی۔ پندرہ سال کی قید نے اُسے ساکت بیٹھنا سکھا دیا تھا۔ مہاجن نے اُنگلی سے کھڑکی پر کھٹکا کیا، لیکن قیدی نے جواب میں کوئی جنبش نہ کی۔ اب مہاجن نے نہایت

احتیاط سے دروازے کی بجریں توڑ دیں۔ اور کنجی قفل میں ڈالی۔ زنگ آلود تالے میں کرکراہٹ ہوئی اور دروازہ چرچرایا۔ مہاجن کو فوراً تعجب کی ایک چیخ، اور قدموں کی آہٹ سننے کا اندیشہ پیدا ہوا۔ تین منٹ گزر گئے اور اندر اب بھی اتنی ہی خموشی تھی جتنی پہلے۔ اُس نے اندر گھسنے کا ارادہ کر لیا۔

میز کے سہارے ایک آدمی بیٹھا تھا جو معمولی انسان سے مشابہ نہ تھا۔ وہ ایک ڈھانچہ تھا۔ جس کی کھال بدن سے چپٹی ہوئی تھی۔ عورت کے سے لمبے گھونگر والے بال تھے۔ اور ڈاڑھی گھنی تھی۔ اس کے چہرے کا رنگ مٹیلا زرد تھا۔ گال پچک گئے تھے۔ پیٹھ لمبی اور سکڑی ہوئی تھی۔ اور ہاتھ جس پر وہ اپنا بالوں دار سر جھکائے ہوئے تھا۔ اتنا پتلا اور دُبلا تھا کہ اُسے دیکھ کر اذیت ہوتی تھی۔ اُس کے بالوں میں بھی سفیدی آ چلی تھی۔ میز پر، اس کے۔ جھکے ہوئے سر کے سامنے کاغذ کا ایک صفحہ پڑا تھا۔ جس پر باریک حرفوں میں کچھ لکھا ہوا تھا۔

"بیچارہ، بدنصیب" مہاجن نے سوچا "سو رہا ہے اور غالباً ملین لاکھ خواب میں دیکھ رہا ہے۔ مجھے تو اس مردہ مرّی شے کو صرف اُٹھا کر پلنگ پر پٹک دینا ہے۔ اور ایک منٹ تک تکیے سے اس کی گردن دبائے رکھنی ہے۔ اور نہایت دقیق معائنے پر بھی، غیر فطری موت کا کوئی نشان نظر نہ آئے گا۔ لیکن پہلے پڑھ تو لوں کہ اس نے یہ لکھا کیا ہے"؟

مہاجن نے وہ ورق میز پر سے اُٹھا لیا اور پڑھنے لگا۔

"کل رات کو بارہ بجے، مجھے اپنی آزادی اور لوگوں سے ملنے جلنے کا حق حاصل ہو جائے گا۔ لیکن اس کمرے سے نکلنے اور روشنی دیکھنے سے قبل، میں تم سے کچھ باتیں کہنا ضروری سمجھتا ہوں۔ اپنے پاک ضمیر کو گواہ کر کے اور خدا کو حاضر و ناظر جان کر جو مجھے دیکھ رہا ہے، میں تمہیں آگاہ کرتا ہوں کہ میں آزادی، زندگی، صحت اور تمام ان چیزوں سے جنھیں تمہاری کتابیں دنیا کی نعمت کہتی ہیں، نفرت کرتا ہوں۔

پندرہ سال تک میں نے بڑی جانفشانی سے دنیاوی زندگی کا مطالعہ کیا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ میں نے نہ ملک دیکھے نہ آدمیوں سے ملا۔ لیکن تمہاری کتابوں کی دنیا میں، میں نے خوشبودار شرابیں پیں۔ گیت گائے، صحراؤں میں ہرن اور جنگلی سُور کا شکار کھیلا، عورتوں سے محبت کی۔ اور حسین عورتیں جو بادلوں کی طرح ملکوتی ہیں، جنھیں تمہارے شاعروں کی فطانت کے جادو نے پیدا کیا ہے۔ راتوں کو مجھ سے ملتی تھیں اور عجیب عجیب کہانیاں جو مجھے مست کر کر دیتی تھیں، میرے کانوں میں پھونکتی تھیں۔ میں تمہاری کتابوں کی دنیا میں کوہ البرز اور کوہ بلینک کی چوٹیوں پر چڑھا ہوں، اور وہاں سے میں نے دیکھا ہے کہ سورج، صبح کے وقت کس طرح نکلتا ہے اور شام کو کس طرح آسمان، سمندر اور پہاڑ کے ڈھالوں کو ارغوانی رنگ سے لبریز کر دیتا ہے۔ میں نے وہاں سے دیکھا ہے کہ کس کس طرح بجلی چمکی اور بادلوں کو پارہ پارہ کر گئی۔ میں نے سرسبز و شاداب صحرا۔ میدان۔ دریا۔ جھیلیں، شہر دیکھے ہیں۔ میں نے سمندری پریوں کا نغمہ اور جنگل کے دیوتا کی بانسری سنی ہے۔ میں نے اُن حسین شیاطین کے بازو مس کئے ہیں، جو میرے پاس خدا کا ذکر کرنے اُڑتے ہوئے آئے ہیں۔۔۔۔۔۔ تمہاری کتابوں کی دنیا میں، میں نے اپنے آپ کو بے تھاہ غاروں میں گرایا ہے۔ معجزے دکھائے ہیں۔ شہروں کو جلا کر خاک میں ملایا ہے۔ نئے مذہبوں کی تلقین کی ہے۔ پورے پورے ملکوں کو فتح کیا ہے۔

تمہاری کتابوں نے مجھے حکمت بخشی ہے، وہ سب، جو اَن تھک انسانی تخیل نے صدیوں میں خلق کیا ہے، ایک چھوٹا سا لوتھڑا بن کر میری کھوپڑی میں سما گیا ہے۔ میں جانتا ہوں کہ میں تم سب سے زیادہ عاقل ہوں۔

اور میں تمہاری کتابوں سے نفرت کرتا ہوں، ساری دنیاوی نعمتوں اور حکمت سے نفرت کرتا ہوں۔ ہر چیز بے معنی۔ فانی۔ خیالی اور سراب کی طرح دھوکے کی ٹٹی ہے۔ تم کتنے ہی مغرور۔ عاقل اور حسین سہی، لیکن بلوں کے چوہوں کی طرح موت تمھیں صفحۂ ہستی سے مٹا کر رہے گی، اور تمہاری نسلیں۔ تمہاری تاریخ۔ تمہارے اہل فطانت کی لقائے دوام، بجھے ہوئے کوئلے کی طرح کرۂ ارض کے ساتھ جل کر راکھ ہو جائے گی۔

تم دیوانے ہو اور غلط راستے پر چل رہے ہو۔ تم جھوٹ کو سچ اور قبح کو حسن سمجھے ہوئے ہو۔ تم کو کتنا تعجب ہو اگر سیب اور نارنگی کے درختوں میں اِن پھلوں کی بجائے یکایک مینڈک اور چھپکلیاں لگنے لگیں اور گلاب میں گھوڑے کے پسینے کی بُو آنے لگے۔ مجھے تم لوگوں پر اتنا ہی تعجب ہوتا ہے، تم پر جنھوں نے دنیا کو عقبےٰ کے بدلے خرید رکھا ہے۔ میں تمھیں سمجھنا نہیں چاہتا۔

چنانچہ اِس چیز سے اپنی عملی بیزاری ظاہر کرنے کے لئے جس کے

سہارے تم لوگ جیتے ہو۔ میں اُس بیس لاکھ کی رقم سے دست بردار ہوتا ہوں، جس کو میں کبھی جنت کی طرح خواب میں دیکھا کرتا تھا اور جس سے میں اب نفرت کرتا ہوں۔ اور اپنے آپ کو اس رقم کے حق سے محروم کرنے کے لئے، میں مقررہ وقت سے پانچ منٹ پہلے یہاں سے باہر نکل آؤں گا اور اس طرح معاہدہ کو توڑ دوں گا۔"

جب وہ پڑھ چکا تو مہاجن نے کاغذ میز پر رکھدیا، اس حیرت انگیز انسان کا ماتھا چُوما اور رونے لگا۔ مکان سے باہر نکل آیا۔ اس سے پہلے کبھی یہاں تک کہ ایکسچینج پر شدید نقصانات اُٹھانے کے بعد بھی، اُسے اپنے آپ سے اتنی نفرت محسوس نہ ہوئی تھی جتنی اس وقت ہو رہی تھی۔

گھر آکر وہ بستر پر پڑ رہا۔ لیکن اضطراب اور آنسوؤں نے اُسے بڑی دیر تک سونے نہ دیا۔..........

دوسرے روز صبح، چوکیدار بیچارہ اس کے پاس دوڑتا ہوا آیا اور کہنے لگا کہ باغ والے قطعے میں جو شخص رہتا تھا اُسے لوگوں نے کھڑکی میں ہوکر باغ میں کودتے دیکھا۔ وہ پھاٹک تک گیا اور وہاں سے غائب ہوگیا۔ مہاجن اپنے نوکروں کو ساتھ لے کر فوراً اس قطعے میں گیا اور قیدی کے بھاگ جانے کی تصدیق کی۔ بیجا افواہوں سے بچنے کے لئے اس نے دست برداری میز پر سے اُٹھالی، اور واپسی پر اپنی تجوری میں بند کردی۔

دیدنی ہے آج

پہلو میں تابِ حُسنِ جواں دیدنی ہے آج
نُورِ چراغِ خلوتیاں، دیدنی ہے آج

ہر ایک شے پہ چھائی ہوئی ہے رُبودگی
بارش کا گلستاں میں دھواں دیدنی ہے آج

کشتی رواں ہے نغمۂ ساقی کی لَے کے ساتھ
موجِ خرامِ آبِ رواں، دیدنی ہے آج

آرائشوں کی فکر، نہ زیبائشوں کا ہوش
وارفتگیٔ لالہ رُخاں، دیدنی ہے آج

دمسازِ ابرو باد ہے رِندانہ بانکپن!
طرفِ کُلاہِ پیرِ مُغاں، دیدنی ہے آج

حُسنِ جواں، شرابِ کہن، موجِ بر شگال
عشرت سرائے بادہ کشاں، دیدنی ہے آج

جوش

اشتراکیت اور اُس کی مخالفت

عبد اللطیف اعظمی

کئی مہینے ہوئے صدق میں، اشتراکیت کی مخالفت میں، ایک مولوی صاحب کا مضمون شائع ہوا تھا، اس کی مخالفت نہ صرف عقلاً کی گئی تھی بلکہ نقلاً بھی۔ کلام پاک کی آیات اور غالباً احادیث سے بھی اسلام اور اشتراکیت میں، تضاد دکھلایا گیا تھا، اور اس مضمون کے پڑھنے والوں کو یقین دلایا گیا تھا کہ ایک شخص مسلمان ہوتے ہوئے اشتراکی نہیں ہوسکتا، یا دوسرے لفظوں میں ایک اشتراکی مسلمان نہیں ہوسکتا۔ یہ کوئی پہلا مضمون نہیں تھا۔ جسے پڑھکر، اشتراکیت کے متعلق، بلکہ جدید علوم کے متعلق، ہمارے علماء کرام کے ذہنی افلاس پر حیرت یا ماتم کرنا پڑا ہو۔ ہمارے علماء کرام کی طرف سے اشتراکیت کی مخالفت میں، وقتاً فوقتاً مضامین چھپتے رہتے ہیں، دو ایک پمفلٹ بھی شائع کئے گئے ہیں۔ ان کے دیکھنے کے بعد یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ ان کی مخالفت سراسر ناواقفیت پر مبنی ہے۔

مولوی حضرات اشتراکیت کے متعلق غلط معلومات پیش کرکے، غالباً سمجھتے ہوں گے کہ اس طرح لوگ اشتراکیت سے برگشتہ ہوجائیں گے اور اس شجرِ ممنوعہ کے قریب جانے سے اجتناب کرنے لگیں گے۔ مگر یہ محض خام خیالی ہے۔ جاہل عوام تو اس دام میں آسکتے ہیں، مگر تعلیم یافتہ طبقہ اس فریب میں کبھی نہیں آئے گا۔ بلکہ بہت ممکن ہے کہ وہ افراد جو ابھی تک متشکک تھے، ان غیر منطقی اور غیر واقعی دلائل کو دیکھکر اشتراکیت کی حمایت کرنے لگیں یہ صرف ظن ہی ظن نہیں ہے بلکہ اس قسم کی بہت سی مثالیں بھی موجود ہیں۔

اشتراکیت کا بغیر مطالعہ کئے ہوئے، اس پر رائے زنی کرنے میں، صرف علماء ہی جرأت بیجا سے کام نہیں لیتے۔ بلکہ اس مرض میں بہت سے جدید تعلیم یافتہ افراد بھی مبتلا ہیں۔ شاید آپ کو سنکر حیرت ہو۔ مگر یہ واقعہ ہے۔ گزشتہ سال عربک کالج (دہلی) میں اشتراکیت پر مباحثہ تھا۔ اس میں شرکت کے لئے مقامی کالجوں کے طلباء کے علاوہ، علی گڑھ اور لکھنؤ یونیورسٹی کے طلبا بھی آئے تھے۔ تقریروں کے اختتام پر آصف علی صاحب نے اس پر نہایت رنج محسوس کیا کہ اتنی تقریروں کے بعد بھی یہ نہ معلوم ہوسکا کہ اشتراکیت کس چڑیا کا نام ہے "یہ تبصرہ تھا اس جلسہ کی تقریروں کے متعلق، جس کے شرکا کسی عربی مدرسہ کے طالب علم، یا کسی خانقاہ کے مُلا نہ تھے، بلکہ کالج اور یونیورسٹی کے وہ طالب علم تھے، جن کی پونجی صرف علوم جدیدہ ہے۔ اور جنھیں جدید مسائل کے سمجھنے کا بہت غرہ ہے۔

اس قسم کی بہت سی مثالیں، عالمِ تحریر میں بھی ملتی ہیں۔ لوگ اشتراکیت کی مخالفت میں، قلم اُٹھاتے ہیں۔ مگر اصل موضوع سے بہت کم بحث کرتے ہیں۔ پورا مضمون غیر متعلق باتوں سے بھرا ہوتا ہے۔ معمولی پڑھا لکھا آدمی بھی جانتا ہے کہ اشتراکیت ایک معاشی نظام کا نام ہے اس کو دنیا کی دوسری چیزوں سے کوئی دُور کا بھی واسطہ نہیں۔ اس لئے اس کی مخالفت جب کی جائے تو مضمون نگار کو چاہیئے کہ اس کا تجزیہ کرکے۔ اس کی غلطیاں دکھلائے اور اس کے عملی کی خرابیاں واضح کرے۔ مگر ایسا نہیں کیا جاتا۔ لوگ اس کی مخالفت میں، چند باتیں ہیں، انھیں کو دوہراتے رہتے ہیں، یعنی اشتراکیت، مذہب اور اخلاق کو ختم کردینا چاہتی ہے، روس میں بالکل ناکام رہی وغیرہ۔ اس کی تازہ ترین مثال دیکھنی ہو تو سنگاپور کے ایک رسالہ Genuine Islam) میں ملاحظہ فرمائیے۔ محمد فضل الرحمٰن صاحب انصاری، بی اے نے اشتراکیت

کی مخالفت میں ایک مضمون لکھا ہے معلوم نہیں، موصوف کے اختیاری مضامین
میں، معاشیات بھی داخل تھی یا نہیں۔ لیکن اگر نہ بھی رہی تو بھی انگریزی سے
واقفیت کی وجہ سے۔ انھیں سوشلزم کے مطالعہ کے مواقع زیادہ حاصل ہیں۔
اس لئے توقع تھی کہ موصوف نے، چاہے مخالفت کی ہو یا موافقت۔ علمیت
کا ثبوت دیا ہوگا۔ اور قارئین کو کسی صحیح نتیجہ پر پہونچنے میں مدد دی ہوگی۔ مگر
اس کو پڑھکر، اس سے زیادہ حیرت ہوئی جو صدق یا مولوی حضرات کے
دوسرے مضامین سے ہوئی تھی۔ مولوی حضرات کے لئے یہ مضمون نعمت غیر
مترقبہ سے کم نہ تھا۔ شائع ہوتے ہی اسے اردو میں منتقل کرکے شائع کیا گیا،
اور اخبارات نے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ "السابقون الاولون" میں
داخل ہونے کی سعادت، ترجمان القرآن کے حصہ میں آئی۔ جو ہندوستان
کے "دارالسلام" سے شائع ہوتا ہے۔ یہ دارالسلام بھی عجیب شے ہے۔ ناظرین
کلیم کو اس سے واقفیت از بس ضروری ہے، مگر کسی اور صحبت میں انشاءاللہ۔
اس وقت ہم جناب فضل الرحمٰن صاحب انصاری کے مضمون کا تجزیہ کرکے
دیکھنا چاہتے ہیں کہ یہ حقانیت پر کہاں تک مبنی ہے۔

اشتراکیت کا مقصد

فاضل مضمون نگار نے، ابتدا میں ایک مختصر سا وعظ کہا ہے۔ وہی
پرانا وعظ کہ "اسلام اور اشتراکیت میں بعد المشرقین کی نسبت پائی جاتی ہے،
اشتراکیت عین ضد اسلام ہے" اشتراکیت کی مخالفت میں جب کبھی کوئی مسلمان
قلم اٹھاتا ہے تو ابتدا انھیں الفاظ سے کرتا ہے۔ کیونکہ مسلمانوں کو کسی شے سے
متنفر یا کسی چیز کی طرف راغب کرنے کے لئے مذہب کی آڑ بہت مفید ثابت
ہوتی ہے۔ شیطان کے بہکانے کے مختلف راستے ہیں۔ جن میں مذہب کی راہ
سب سے زیادہ کارگر اور مفید ہے۔ ایک شخص مذہب کی قبا اوڑھکر، جو چاہے
کرڈالے حتیٰ کہ نص صریح کے خلاف کرڈالے، مگر اس سے کوئی نہیں پوچھتا کہ
تمہارے منہ میں کتنے دانت ہیں۔ مسلمانوں کی تحریکوں کی تاریخ اٹھاکر دیکھئے تو
ان میں ایسے ایسے واقعات ملیں گے جن کو دیکھکر حیرت ہوتی ہے۔ آج بھی ایسی
تحریکیں موجود ہیں، جو قرآن کا نام لے کر ان چیزوں کی مخالفت، نہایت واضح
اور کھلے الفاظ میں کر رہی ہیں۔ جن پر مسلمان ساڑھے تیرہ سو سال سے عامل
ہیں۔ قربانی، زکوٰۃ اور بعض دوسرے مسائل کے ساتھ اہل قرآن کا جو طرز
عمل ہے۔ اس سے دنیا واقف ہے۔ مگر ان سے کوئی پوچھنے والا نہیں کہ یہ
تم کیا کر رہے ہو انھیں نہ صرف مسلمان کہنے کا حق ہے بلکہ دوسروں پر کفر کا
فتویٰ بھی دینے کا پورا حق ہے۔

اس "حمد و ثنا" کے بعد، موصوف نے، اشتراکیت کے مقاصد اور
اس کی تاریخ کی طرف توجہ کی ہے۔ اشتراکیت کے مقاصد کے بیان کرنے میں
فاضل مضمون نگار کو قدم قدم پر ٹھوکریں کھانی پڑی ہیں۔ مضمون کے اس حصہ
میں سب کچھ موجود ہے۔ اگر کوئی چیز نہیں ہے تو وہ اشتراکیت کے مقاصد
ہیں۔ اشتراکیت کے مقاصد کیا ہیں، یا اشتراکی کیا چاہتے ہیں؟ اس میں اس قدر
اینچ پینچ نہیں کہ جس کے سمجھنے میں اس قدر ٹھوکریں کھانی پڑیں۔ اسے نہایت
آسانی سے سمجھا اور نہایت مختصر اور سیدھے سادے الفاظ میں بیان کیا
جاسکتا ہے۔

اشتراکیت جن حالات کے ماتحت عالم وجود میں آئی ہے، اور اس
کے جو مقاصد ہیں، اس پر متعدد مضامین اردو میں بھی شائع ہوئے ہیں،
اگر مضمون نگار ان کا مطالعہ کرلیتے تو اس قسم کی غلطی نہ کرتے۔ الاصلاح (اعظم گڈھ)
میں اشتراکیت پر ایک مضمون شائع ہو رہا ہے، دو قسطیں شائع ہوچکی ہیں اور
ابھی باقی ہے۔ اس میں اشتراکیت کے مقاصد اور اس کی تاریخ نہایت وضاحت
سے بیان کی گئی۔ ذرا ملاحظہ ہو۔

"اقتصادی عدم مساوات دنیا کی پوری تاریخ میں ہمیشہ نمایاں رہی
ہے۔ لیکن اس کی موجودہ شکل انیسویں صدی کی صنعتی ترقیوں کا نتیجہ قرار
دی جاتی ہے، وہ ترقی جس نے سوسائٹی میں دو بڑے طبقے نمایاں کرئے
ایک طبقہ سرمایہ داروں کا جو بے انتہا منافع سمیٹ رہا ہے۔ دوسرا طبقہ
مزدوروں کا جو بازار کے تمام جزر و مد اور اتار چڑھاؤ کا ہدف ہے اور
تجارت وصنعت پر جو بُرے اثرات طاری ہوتی ہیں ان کی ساری مضرتیں
اسی کے حصہ میں آتی ہیں۔

سرمایہ داری کے پیدا ہونے کے دو بڑے اسباب بتائے جاتے ہیں۔

(۱) وہ اقتصادی اصول جن کی علمائے اقتصادیات نے اٹھارہویں
صدی میں اشاعت کی اور جو یورپ میں انیسویں صدی کے نصف اول
سے عملی صورت اختیار کرنے لگے۔

(۲) وہ حیرت انگیز صنعتی ترقیاں جو انیسویں صدی میں اختراعات

وایجادات کے جلو میں منو دار ہوئیں، اور جن کی حمایت میں علمائے اقتصادیات نے
تجارتی وصنعتی آزادی کا وعظ کہا۔ لیکن اس آزادی کا تمام فائدہ صرف سرمایہ
داروں کو حاصل ہوا۔ مزدور اس سے بالکل محروم رہے۔ کیونکہ وہ غریب اس
قابل نہیں تھے کہ سماج کے اندر اپنا پوزیشن قائم کرکے اس آزادی سے فائدہ
اُٹھاسکیں۔ اور اپنے حقوق اور اپنے مستقبل کو محفوظ کرسکیں۔ نتیجہ یہ ہوا
کہ اس صنعتی ترقی نے جتنی دولت اگلی وہ سب کی سب ان چند سرمایہ داروں
کے صحنوں میں جاکر جمع ہوگئی۔ جو کارخانے قائم کرسکتے تھے، آلات خرید سکتے
تھے، مال تیار کراسکتے تھے۔ یا تجارتی مقابلوں کی گھوڑ دوڑ میں بڑی بڑی
بازیاں لگاسکتے تھے۔ اس طرح ان کو آپ سے آپ، اس بات کا موقع
مل گیا کہ مزدوروں کو طرح طرح سے ستائیں۔ ان کی مزدوریاں گھٹائیں،
کام کے اوقات بڑھا دیں، یہاں تک کہ سوسائٹی کا یہ سب سے بڑا حصہ بالکل
ایک گرفتار قفس ہوکر، صرف نالہ وشیون کے لئے وقف ہوکر رہ گیا۔

حکومت جو امن وعدل اور قیام توازن کی اصلی ذمہ دار ہے، آزادی
تجارت وصنعت کے اصول کو تسلیم کرکے اب ان معاملات میں مداخلت کے
حق سے بالکل دستکش ہوچکی تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جو طبقہ اس آزادی تجارت کی
تیغ سے نیم بسمل تھا، اُس نے یہ محسوس کرنا شروع کردیا کہ صنعت وتجارت کی یہ
آزادی اس کے حق میں سم قاتل ہے۔ بس یہ تخیل ہماری اس سرزمین پر اشتراکیت
کا پہلا بیج ہے جو بویا گیا۔ اس اشتراکیت نے سب سے پہلے وقت کی اقتصادیات
کے اس آزادیٔ صنعت وتجارت والے اصول کی دھجیاں اڑائیں اور اصل
کے انحطاط، انتظام کی خرابی اور اقتصادی واجتماعی پراگندگی کی تمام ذمہ داریاں
اسی اصول کے سر تھوپ دیں۔ پھر اس کے بعد اس نے تنقید کا دوسرا قدم اُٹھایا
اور نفسِ نظامِ سرمایہ داری پر تنقید شروع کردی جو تمام نفع اُٹھاکر چند آدمیوں
کے ہاتھ میں دیدیتا ہے۔ اور کاریگروں اور مزدوروں کو فقر وفاقہ میں سسکنے
کے لئے چھوڑ دیتا ہے۔

اشتراکیت کے تخیل کا ابتدائی نقطہ یہ ہے، لیکن ہم کو اس کے اندر
کی حقیقت اس سے زیادہ وضاحت سے سمجھ لینی چاہیئے۔

اشتراکیت کا بنیادی تخیل یہ ہے کہ فرد کو جماعت کے مفاد کے لئے
قربان کردیا جائے، اس پہلو سے یہ "انفرادیت" اور اقتصادی آزادی کے
تخیل سے ٹکراتی ہے۔ "انفرادیت" فرد کے شرف اور اس کی شخصیت کے قیام
وحفاظت کی علمبردار ہے اور یہ چیز صحیح طور پر اسی وقت تک محفوظ رہ سکتی ہے،
جب تک اقتصادی آزادی جو نظامِ اجتماعی کی اساس اور انفرادی جدو
جہد کا اصلی سرچشمہ ہے۔ قائم رہ سکے۔ انفرادیت حکومت کو اس زحمت میں مبتلا
نہیں کرتی کہ وہ افراد کی خوش بختی وبدبختی کی کلی طور پر ذمہ دار ہوجائے بلکہ
یہ چاہتی ہے کہ حکومت ایسی ضمانتیں مہیا کردے کہ افراد اپنے دائرہ کے
اندر زیادہ سے زیادہ آزادی کے ساتھ اپنے کاموں میں مشغول رہ سکیں،
یہ چاہنے کی علت محض یہ نہیں ہے کہ وہ فرد کی آزادی اور اس کے مفاد
کو خود غرضانہ، زیادہ سے زیادہ محفوظ دیکھنے کی خواہش مند ہے۔ بلکہ اس
کی اصلی وجہ یہ ہے کہ اس کے نزدیک ہیئتِ اجتماعیہ کی تمام کامیابی در
حقیقت افراد کی کامیابی پر منحصر ہے۔ پس اس بنا پر کوئی وجہ نہیں ہے کہ
ہیئتِ اجتماعیہ کو ترجیح دے کر افراد کو اس کی قربان گاہ پر نذر چڑھادیا
جائے بلکہ انصاف یہ ہے کہ ایک اعتدال کے ساتھ دونوں کو شہ دینے
اور بڑھانے کی کوشش کی جائے۔ کیونکہ ایک کی ترقی دوسرے کی ترقی اور
ایک کی بربادی دوسرے کی بربادی ہے۔ اشتراکیت یا اجتماعیت (ان
دونوں میں سے جونام بھی موزوں سمجھا جائے) حکومت یا بادشاہ کی امداد
وحمایت پر بھروسا نہیں کرنا چاہتی۔ یہ اپنی حفاظت اور اپنی طاقت دونوں
ایک زبردست اجتماعی تغیر کے ذریعے حاصل کرنا چاہتی ہے۔ اس اجتماعی
تغیر کے بہت سے طبعی، اقتصادی اور نفسیاتی عناصر ہیں۔ جن پر بحث
کرنے کی یہاں گنجائش نہیں ہے۔ شاید ہم آگے اس پر کچھ روشنی ڈال سکیں۔
یہاں اشتراکیت کا نقطۂ نظر سمجھنے کے لئے بالاجمال ان کو یہ خیال سامنے
رکھنا چاہیئے کہ وہ کہتے ہیں کہ اب سوسائٹی کا ہر نظام لازماً بدلتا رہتا ہے
اور اس تبدیلی کا بہت کچھ تعلق سوسائٹی کی عقلی جدوجہد اور اجتماعی علوم
کی ترقی اور ان کی عملی تطبیق سے ہے۔ پس جس رفتار سے یہ علوم ترقی کرتے
جائیں گے اور زندگی عملاً اس کے سانچے میں ڈھلتی جائے گی۔ اسی رفتار سے
زندگی کے تمام وضعی قوانین اور اُن کے تمام معروف ضوابط بدلتے جائیں
گے۔ یہاں تک کہ عقل اجتماعی ترقی کے آخری زینہ پر قدم رکھدے گی اور
اس وقت زندگی کے مختلف نظاموں میں سے صرف وہ نظام باقی رہ سکے گا،
جو "انسب" (FITTEST) ہوگا اور ظاہر ہے کہ وہ انسب نظام یہ موجودہ
نظام نہیں ہوسکتا، جس نے دنیا کے بہت بڑے حصہ کو صرف مٹھی بھر سرمایہ دارو

کا غلام بنا رکھا ہے یہ نظام بالکل فاسد ہے۔ زندگی کی فطری وضع اس کو ہرگز قبول نہیں کر سکتی۔ ضروری ہے کہ یہ بدل جائے، کیونکہ یہ حق اور مساوات کے بالکل منافی ہے۔ (الاصلاح ماہ جولائی)

یہ عبارت کسی اشتراکی یا حامی اشتراکیت کی نہیں ہے۔ بلکہ ایک اشتراکیت کے مخالف مگر دیانتدار کے قلم کی مرہونِ منت ہے۔

میرے خیال میں مذکورہ اقتباس، اشتراکیت کے مقصد کو سمجھنے کے لئے کافی ہے۔ لیکن اگر مزید توضیح کی ضرورت ہو تو اشتراکیت کی مستند کتابوں کا مطالعہ کرنا چاہیئے۔ اس محدود مضمون میں اس سے زیادہ تفصیل ممکن نہیں۔ اردو میں ڈاکٹر منوہر لال لوہیا وغیرہ کے مضامین بھی اس کے مقاصد سمجھنے میں مدد دے سکتے ہیں مگر بہتر ہے کہ ان حامیانِ اشتراکیت کے مضامین بجائے خود اشتراکیت کے بانیوں کے مضامین پڑھنے چاہئیں۔

عرصہ ہوا، جرمنی کے کیمونسٹ مرکز اشاعت نے کیمونزم کے اصول و مبادیات پر ایک سلسلہ مطبوعات شائع کرنا شروع کیا تھا، اسی سلسلہ کی پہلی جلد کارل مارکس کے منتخب مضامین پر مشتمل ہے۔ ان میں نہایت وضاحت سے اشتراکیت کے مقاصد بیان کئے گئے ہیں۔ بعض مضامین کے ترجمے اکتوبر ۳۸ء کے الہلال میں شائع ہو چکے ہیں۔ اگر مخالفینِ اشتراکیت ان کو پڑھکر لکھنے کے لئے قلم اُٹھائیں تو شاید اتنی ٹھوکریں کھانی نہ پڑیں۔

اشتراکی نظام میں بیوی کی حیثیت

مضمون نگار کا خیال ہے کہ:۔

"اشتراکی سوسائٹی میں مرد و عورت کے تعلق کو نکاح کی قید سے آزاد کر دیا گیا ہے۔ نکاح میں کوئی اہمیت اور کوئی تقدس باقی نہیں۔ آزادانہ شہوانی تعلقات کو نہ صرف جائز بلکہ پسند کیا جاتا ہے اور اس تخیل کو دماغوں سے نکال دینے کی کوشش کی جاتی ہے کہ ایک شخص کسی عورت کو اپنی بیوی قرار دے اور صرف اپنے لئے مخصوص کر کے رکھنا چاہے۔ انسانی ضروریات کے تمام وسائل جس طرح اسٹیٹ کی ملکیت اور سب باشندوں میں مشترک ہیں اسی طرح شہوانی خواہشات کو پورا کرنے کا ذریعہ بھی، بہر حال انسانی ضروریات سے تعلق رکھتا ہے۔ اس کو بھی اسٹیٹ کی ملکیت اور تمام باشندوں میں مشترک ہونا چاہیئے۔ نہ بیوی سب کی بیوی ہے اور شوہر سب کا شوہر ہے کسی کو کسی کے لئے مختص بالذات نہیں کہا جا سکتا۔" (ترجمان القرآن جلد ۱۲ عدد ۴)

کاش مضمون نگار اس کو لکھنے سے قبل مارکس کی اس تحریر کو پڑھ لیتے تو وہ یہ نہ لکھتے۔ مارکس کے نزدیک خود سرمایہ دار بیوی کی عمومیت کو جائز رکھتے ہیں۔ کیمونزم اس کو ختم کرنا چاہتی ہے۔ ملاحظہ ہو۔

"ایک ہی طرح کے سر میں تمام سرمایہ دار یہ راگ الاپ رہے ہیں کہ چونکہ سرمایہ دار اپنی بیوی کو بھی پیداوار کا ایک آلہ تصور کرتا ہے اس لئے جب کبھی سنتا ہے کہ آلات پیداوار عام ملکیت ہو جانے والے ہیں، تو قدرتی طور پر خیال کرتا ہے کہ عورتوں پر بھی اس کا اثر پڑے گا۔ اسے کبھی یہ خیال نہیں گزرتا کہ کیمونسٹوں کا مقصد تو صرف اس قدر ہے کہ عورت پیداوار کا محض ایک آلہ نہ سمجھی جائے۔ وہ عورتوں کی موجودہ حیثیت بدل دینی چاہتے ہیں۔ ہمارے سرمایہ داروں کے اس عیارانہ خوف سے زیادہ کوئی چیز مضحکہ انگیز نہیں جس کی وہ اس باطل دعوے میں نمائش کر رہے ہیں۔ کیمونسٹوں کو عورتوں کے عام بنانے کی کیا ضرورت ہے، جب کہ ان کی یہ صورتِ حال تقریباً ہمیشہ موجود رہی ہے اور آج بھی موجود ہے۔

ہمارے سرمایہ دار بزرگ کیا کر رہے ہیں؟ اپنے مزدوروں کی عورتوں اور لڑکیوں کو اپنے قبضہ و تصرف میں رکھنے سے سیر نہ ہو کر، نیز باضابطہ عصمت فروشی پر بھی قانع نہ ہو کر، وہ اب آپس میں ایک دوسرے کی بیوی سے علانیہ تعلقات پیدا کر رہے ہیں اور یہ تعلقات سرمایہ دار سوسائٹی کی بہترین معاشی دلچسپی ہے۔

خود سرمایہ دارانہ شادی بھی درحقیقت عورتوں کی عمومیت ہی ہے۔ کیمونسٹوں کو زیادہ سے زیادہ الزام یہ دیا جا سکتا ہے کہ وہ عورتوں کی موجودہ ریاکارانہ اور خفیہ عمومیت ختم کر دینی چاہتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ پیداوار کے موجودہ نظام کی منسوخی کے ساتھ اس کا نتیجہ یعنی عورتوں کی عمومیت بھی معدوم ہو جائے گی۔ اور اس وقت عام عصمت فروشی کا بازار بھی گرم نہیں ہو سکے گا۔ (الہلال، اکتوبر ۳۸ء)

اشتراکیت اور مذہب

فاضل مضمون نگار نے اعتراض کیا ہے کہ اشتراکیت مذہب کی سخت ترین

مخالف ہے۔ وہ صرف معاشی انقلاب نہیں چاہتی ہے بلکہ اس کی یہ بھی کوشش ہے کہ دنیا میں کسی مذہب کا وجود باقی نہ رہے۔ یہ اعتراض کوئی نیا اعتراض نہیں ہے۔ بہت قدیم ہے اور اسی کے ساتھ بہت کارگر۔ مخالفینِ اشتراکیت کا یہی سب سے بڑا حربہ ہے جس کے ذریعے عوام کو اس کے خلاف بھڑکایا جاتا ہے۔ لیکن عنقریب وہ زمانہ آنے والا ہے کہ اس کی حقیقت سے تمام دنیا واقف ہو جائے گی اور سرمایہ داروں

میں اس کے سمجھنے سے قطعی قاصر ہوں کہ مذہب کی مخالفت، اشتراکیت کے مقاصد میں کہاں سے داخل ہو گئی۔ اشتراکیت کی تعریف میں یہ نظر نہیں آتی۔ اس کے مقاصد میں اس کا کہیں وجود نہیں۔ اشتراکیت کے مقاصد کے سلسلہ میں، ایک مخالف اشتراکیت کی تحریر ہم نقل کر چکے ہیں۔ اس میں اشتراکیت کی تاریخ اور اس کے مقاصد بیان کئے گئے ہیں۔ مگر اس میں بھی اس کا کہیں تذکرہ نہیں۔ پھر یہ کہاں سے آ گئی!! لیکن حیرت و تعجب کرنے کی ضرورت نہیں۔ وہ قوم جو دار وصا اسکیم میں مذہب کی مخالفت نکال سکتی ہے جس کا مصنف ایک مسلمان ہے۔ مذہب کا حامی ہے۔ اپنی قوم کی فلاح و بہبود کا طالب ہے اور جس نے اپنی خدمات اور قربانیوں سے قوم پر بہت بڑا احسان کیا ہے، وہ نہایت آسانی سے اس نظام میں، مذہب کی مخالفت نکال سکتی ہے جس کے بانی و خاتم سب کے سب لامذہب تھے۔

اشتراکیت کو مخالف مذہب ثابت کرنے کے لئے عام طور پر دو طریقے اختیار کئے جاتے ہیں۔ ایک بانیانِ اشتراکیت کے اقوال اور تحریروں سے۔ دوسرے روس کے حالات سے۔

پہلے طریقِ اول کو لیجئے۔ مارکس، مذہب کے متعلق ایک جگہ لکھتا ہے۔

"رہے باقی الزام جو کمیونزم پر مذہبی فلسفی اور نظری نقطۂ نظر سے لگائے جاتے ہیں، وہ اس قدر لوچ ہیں کہ کسی سنجیدہ بحث کے محتاج نہیں۔ کیا اس حقیقت کو سمجھنے کے لئے کسی گہری بصیرت کی ضرورت ہے کہ مادی حالاتِ زندگی اور اجتماعی نظام کی تبدیلی کے ساتھ انسان کے خیالات نظریئے۔ تصورات حتیٰ کہ وجدان تک بدل جاتا ہے؟" (الہلال اکتوبر)

اس تحریر سے ظاہر ہوتا ہے کہ مارکس وغیرہ محض معاشی انقلاب چاہتے تھے۔ مذہب کی مخالفت ان کے مقاصد میں داخل نہیں تھی۔ چاہے وہ ذاتی طور پر، مذہب کے متعلق جو بھی رائے رکھتے رہے ہوں۔ مگر ان کا نظریہ اور نظامِ مذہب کی مخالفت سے قطعی آلودہ نہیں تھا۔ لیکن اس کے باوجود، اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ بانیانِ اشتراکیت کی تقریروں تحریروں میں، کہیں کہیں، مذہب کی مخالفت نظر آتی ہے۔ جناب انصاری صاحب نے اس سلسلہ میں جتنے اقتباسات نقل کئے ہیں وہ سب تو صحیح نہیں ہیں۔ بیشتر سرمایہ داروں کے ڈھکوسلے ہیں لیکن بعض کی صحت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن یہ بھی معلوم ہے کہ انھوں نے کس مذہب کی مخالفت کی ہے؟ اس کی نہیں جو ظالمانہ سرمایہ داری کا مخالف ہے۔ مظلوموں اور غریبوں کا حامی ہے؛ بلکہ اس کی مخالفت کی ہے جو اس کے بالکل برعکس ہے۔ مولانا عبدالرزاق صاحب ملیح آبادی نے اس حقیقت کو نہایت اچھی طرح واضح کیا ہے۔ ملاحظہ ہو۔

تجاہل عوام کو یہ کہہ کر بھی اُبھارا جاتا ہے کہ دیکھو سوشیلزم کے بڑے بڑے لیڈر، کارل مارکس۔ لینن۔ اسٹالن، مذہب کے دشمن ہیں۔ اور چونکہ دشمن ہیں اس لئے تمہیں چاہیئے کہ اس سے نفرت کرو۔

سرمایہ داروں اور ان کے دلالوں کو جھوٹ بولنے اور مغالطہ دینے میں کمال حاصل ہے۔ یقیناً مارکس نے اور لینن وغیرہ نے مذہب کی مذمت کی ہے اور اُسے مٹانے کی تلقین کی ہے۔ مگر یہ بھی تو بتاؤ کہ کس مذہب کی؟ یہ نہیں بتاتے۔ کیونکہ بتائیں گے تو جھوٹ کا بھانڈا پھوٹ جائیگا۔

سب جانتے ہیں کہ مارکس اور لینن نے، جس مذہب کی مذمت کی ہے وہ سرمایہ داروں کا مذہب ہے، یقیناً وہ مذہب نفرت انگیز ہے جو ظلم اور لوٹ کو جائز ہی نہیں، ضروری قرار دیتا ہے۔ جس مذہب کی یہ تعلیم ہو وہ مذہب ہی نہیں ہے۔ بلکہ ڈاکوؤں اور چوروں کی من گھڑت ایجاد ہے۔ جس کے ذریعے وہ اپنے جرائم جاری رکھنا چاہتے ہیں۔ ہر انسان کا فرض ہے کہ ایسے مذہب سے نفرت کرے اور اس کو مٹانے میں اپنی پوری کوشش صرف کر دے۔ کارل مارکس اور لینن یہودی تھے۔ یہودی احبار نے حضرت موسیٰ کی تعلیمات کی جیسی مٹی پلید کی ہے، سب کو معلوم ہے۔ سود خواری یہودیوں نے اپنا مذہبی فرض سمجھ رکھا ہے۔ دنیا میں کوئی قوم نہیں ہے جس میں یہودی قوم کی جیسی اقتصادی عدم مساوات موجود ہو۔ کچھ یہودی اتنے بڑے مالدار ہیں کہ اپنی دولت کا خود بھی حساب کر نہیں سکتے اور کچھ اتنے غریب ہیں کہ سوکھی روٹی کا ٹکڑا بھی نہیں پاتے۔

یہودی اخبار نے اس ظلم کو بالکل جائز رکھا۔ اگر مارکس اور لینن ایسے مذہب کی مذمت کریں تو کیا بےجا ہے ؟

اب عیسوی چرچ کا مذہب لیجئے۔ حضرت عیسیٰ کمیونزم کے علمبردار تھے۔ مگر پادریوں نے ان کی تعلیمات سے کیا سلوک کیا ؟ مسیحیت کو بادشاہی کا پشت پناہ بنا دیا اور بادشاہوں اور سرمایہ داروں کے مظالم کا ساتھ دینے لگے۔ انقلاب سے پہلے فرانس، روس، اسپین میں چرچ کی حالت کیا تھی ؟ کس طرح وہ شاہ پسندوں اور سرمایہ داروں کے ساتھ مل کر عام باشندوں کو پامال کر رہا تھا ؟ کیا ایسے مذہب کی مخالفت کرنا ہر انسان کا مقدس ترین فرض نہیں ہے ؟“ (ہند ہفتہ وار ۲۰ جولائی ۱۹۳۸ء)

اب آیئے، اس اعتراض کی دوسری شق پر غور کریں۔

یہ صحیح ہے کہ روس کے انقلاب میں مذہب سے تصادم ہوا۔ لیکن اس وجہ سے نہیں کہ اشتراکیت، مذہب کی مخالف ہے اور وہ مذہب کو اس کی بیخ و بن سے اکھاڑ کر پھینک دینا چاہتی ہے۔ بلکہ اس کی وجہ اور ہے۔

اصل یہ ہے کہ جب کہیں انقلاب ہوتا ہے تو جو چیز انقلاب کی راہ میں سب سے زیادہ حایل ہو گی انقلاب کے بعد، اسی پر سب سے زیادہ اثر پڑے گا۔ ایسا ہر انقلاب میں ہوتا ہے، چاہے وہ اشتراکی انقلاب ہو یا فسشسٹ۔ اس کلیہ کو سامنے رکھئے اور انقلابِ روس پر غور کیجئے۔ وہاں انقلاب کی راہ میں سب سے بڑا روک مذہب تھا۔ سرمایہ داروں نے مذہب کی آڑ لے کر انقلاب کو روکنے کی کوشش کی تھی۔ اس کی راہ میں مشکلات پیدا کی تھیں اور عوام کو مذہب کے نام پر اس کے خلاف ابھارا تھا، اس لئے جب انقلاب کو کامیابی ہوئی تو اس کے لیڈروں نے مذہب کو ترقی کی راہ میں حائل دیکھکر، سب سے پہلے اس کی طرف توجہ کی اور اس کی قوت کو پارہ پارہ کر دیا۔

ایسی صورت جہاں کہیں بھی پیش آئے گی تو مذہب سے تصادم یقینی ہے۔ چاہے انقلابی، اشتراکی ہوں یا غیر اشتراکی۔ مثلاً ترکی ہی لیجئے۔ ترکی کا انقلاب نہ تو اشتراکیوں کے ہاتھوں ہوا، اور نہ وہاں اشتراکی نظام قائم ہے۔ مگر کیا وہاں مذہب سے تصادم نہیں ہوا ؟ مضمون نگار کے لکھنے کے مطابق، روس میں انقلاب سے لے کر ۱۹۳۴ء تک یعنی کل سترہ سال میں صرف ۱۴۲ بشپ اور پیشوایانِ دین قتل ہوئے۔ مگر ترکی میں صرف چند سالوں میں، اس سے کہیں زیادہ تہ تیغ کر دیئے گئے۔ ترکی میں جدید حکومت نے، اپنے پروگرام پر عمل کروانے کے لئے عوام پر جس قدر مظالم کئے ہیں وہ روس سے زیادہ نہیں تو کم بھی نہیں ہیں۔ کیا شریف عورتوں کے سر سے برقعے نہیں پھاڑے گئے اور انھیں کھلے منہ چلنے پر مجبور نہیں کیا گیا ؟ کیا تلوار کی انی سے لوگوں کو مغربی لباس اختیار کرنے پر مجبور نہیں کیا گیا ؟ اسی طرح مسجد اور ملک کی دوسری اصلاحات کے سلسلے میں، انھیں ہر قسم کی جائز اور ناجائز قوت استعمال کرنی پڑی۔ انصاری صاحب اور اگر ان تک یہ آواز نہ پہونچ سکے تو مودودی صاحب فرمائیں۔ جنھوں نے انصاری صاحب کے مضمون کو نہایت فخر سے ترجمہ کر کے شائع کیا ہے۔ اور جن کا خیال ہے کہ علماء میں ان کے سوا اور کسی نے اشتراکیت کو نہیں سمجھا ہے کہ کیا یہ بھی ”اشتراکی فرشتوں“ ہی کے کارنامے ہیں ؟ اصل یہ ہے کہ انقلاب کی راہ میں جو عناصر حائل ہوں گے انھیں پاش پاش کر دیا جائے گا۔ چاہے وہ مذہب ہی کیوں نہ ہو۔ یہ فی نفسہ برا ہو یا اچھا، مگر ایسا ہی ہوتا ہے۔ اور غالباً ہوتا رہے گا۔ روس میں بھی یہی ہوا تھا۔ انقلاب کی راہ میں چرچ پہاڑ بنے ہوئے تھے۔ انھیں دور کئے بغیر منزلِ مقصود تک پہونچنا مشکل تھا۔ اس لئے سب سے پہلے راہ کے اسی کانٹے کو دور کیا گیا۔ ایک عالمِ دین حامیٔ اشتراکیت کی رائے بھی سن لیجئے۔

”جہاں کہیں بھی ایسی صورت ہو گی کہ مذہب سیاسی یا اقتصادی ظلم کا ساتھ دے رہا ہے تو وہاں لازمی طور پر سوشلزم اس سے ٹکرائے گا۔ اور اس کی طاقت کو توڑنے کی کوشش کرے گا۔ روس میں یہی صورتِ حال تھی۔ اس لئے مذہب کا سوشلزم سے تصادم ہوا۔“[1]

مگر چونکہ اشتراکیت کو مذہب سے کوئی خاص پرخاش نہیں ہے اس لئے کامیابی کے بعد اس سے کشمکش بھی جاتی رہی، اور مذہب کے متعلق لوگوں کو مکمل آزادی دیدی گئی۔ مولانا ملیح آبادی صاحب لکھتے ہیں۔

”جب چرچ میں، ظلم کا ساتھ دینے کی قوت باقی نہ رہی تو سوشلزم نے بھی اس سے کشمکش موقوف کر دی۔ آج روس میں ہر باشندے کو پوری آزادی حاصل ہے کہ جس مذہب کو چاہے اختیار کرے اور جس طرح چاہے عبادت کرے۔“[2]

---

[1] ہند ہفتہ وار ۲۰ مارچ ۱۹۳۸ء از مولانا ملیح آبادی۔ [2] ایضاً

ملیح آبادی صاحب، اشتراکیت کے بہت بڑے حامی ہیں۔ اس لئے بہت ممکن ہے ان کی اس تحریر کو محض پروپگنڈا سمجھا جائے۔ اس لئے ذیل میں ایسے شخص کا بیان درج کیا جاتا ہے جو نہ تو اشتراکی ہیں اور نہ جن کے متعلق غلط بیانی کا شبہ کیا جاسکتا ہے۔ امیر شکیب ارسلان سے ہندوستان کا پڑھا لکھا طبقہ یقیناً واقف ہوگا۔ اُنھوں نے سیف و قلم دونوں سے اسلام کی بہت بڑی خدمت کی ہے۔ عالم اسلام میں موصوف کا نام بلند ترین شخصیتوں کے ساتھ لیا جاتا ہے۔

انقلاب روس کے بعد جون ۳۱ء میں موصوف روسی مسلمانوں کے حالات معلوم کرنے کے لئے روس تشریف لے گئے۔ وہاں کے ایک جید عالم عبدالودود فتاح الدین سے ملاقات کی اور نہایت تفصیل کے ساتھ وہاں کے حالات معلوم کئے۔ عبدالودود صاحب تمام روسی مسلمانوں کے قاضی اور محتسب[1] ہیں۔ امیر شکیب نے ان سے پوچھا کہ

"سابق قیصری حکومت اور موجودہ بالشویکی حکومت میں کیا فرق ہے؟"

قاضی عبدالودود صاحب نے موجودہ حکومت کی بہت تعریف کی اور فرمایا کہ "مذہبی معاملات میں پوری آزادی ہے، بالشویکی عقائد کے متعلق قطعی نہیں پوچھتے۔ وہ صرف لفظ "روسی" جانتے ہیں، انھیں اس سے کوئی مطلب نہیں کہ کوئی شخص کسی مذہب یا کسی ملت سے تعلق رکھتا ہے۔ گزشتہ دور حکومت میں اسلام قبول کرنا ممنوع تھا۔ مگر موجودہ حکومت اس سے مطلق تعرض نہیں کرتی۔ چنانچہ ان دو سالوں میں بہت سے لوگ میرے ہاتھ پر اسلام لاچکے ہیں۔

زار کے دور حکومت میں قازان کے قرب وجوار کے سیکڑوں دیہات کے مسلمانوں کو زبردستی نصرانی بنا دیا گیا تھا۔ اور مسجدوں کو کنیسوں میں تبدیل کر دیا گیا تھا۔ یہ لوگ اسلام پر قایم رہے۔ مگر حکومتِ وقت کے خوف سے اسلام کا اظہار نہیں کرسکتے تھے۔ لیکن جب زار کی حکومت کا خاتمہ ہوا، اور بالشویکی حکومت قائم ہوئی تو وہ لوگ پھر مسلمان ہو گئے اور مسجدوں کو واپس کر دیا گیا"[2]

یہ گفتگو بہت طویل ہے۔ اور پڑھنے کے قابل ہے۔ اس میں نہایت وضاحت سے روسی مسلمانوں کے حالات بیان ہوئے ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مولانا ملیح آبادی کا یہ ارشاد بالکل صحیح ہے کہ "آج روس میں ہر باشندے کو پوری آزادی حاصل ہے کہ جس مذہب کو چاہے اختیار کرے اور جس طرح چاہے عبادت کرے" روس کی مذہبی حالت کے متعلق یورپ کے مشہور رسالوں سے بھی اقتباسات پیش کئے جاسکتے ہیں۔ مگر میں سمجھتا ہوں کہ حق پسند طبائع کے لئے امیر شکیب ارسلان کی تحریر بالکل کافی ہے، اور رہے مکابر تو ان کے لئے دفتر کے دفتر ناکافی ہیں۔

اشتراکیت کے ثمرات

"اشتراکیت کے ثمرات" کے ماتحت مضمون نگار نے لکھا ہے کہ:

"دنیا میں خونریزی و بدامنی پھیلانے والے جتنے عناصر ہیں ان میں خود اشتراکیت کا نمبر سب سے پہلا ہے ------ میں صرف ان بلند آہنگ اشتراکیوں کی اخلاقی جسارت کی داد ہی دینے پر اکتفا کروں گا جو معصوم حامیانِ امن کی صورت میں ہمارے سامنے آکر مذہب کی خونریزیوں کا شکوہ کرتے ہیں۔ درآنحالیکہ خود ان کی اپنی تاریخ خون اور آگ کے افسانے سے بھری پڑی ہے۔ اور اُنھوں نے صرف بیس سال کی مختصر مدت میں اتنا انسانی خون بہایا ہے کہ مذہب غریب صدیوں میں بھی نہ بہا سکا"

اس کے بعد موصوف نے ایک اخبار سے ۳۲ء تک کے ہلاک شدگان کی فرقہ وار فہرست دی ہے، اگر موشگافی کی جائے تو اس پر بہت سے اعتراضات وارد کئے جاسکتے ہیں۔ لیکن ہم اس کو صحیح فرض کر لیتے ہیں مگر "فیشسٹ فرشتوں" کے متعلق کیا فتویٰ ہے؟ حبش میں جتنی جانیں ضائع کی گئیں ان کی تعداد بھی معلوم ہے؟ چین میں اس وقت جو کچھ ہو رہا ہے کیا یہ بھی "اشتراکی فرشتوں" کے کارنامے ہیں؟ درحقیقت اس میں اشتراکیت کا کوئی قصور نہیں ہے۔ موجودہ تہذیب و تمدن کا قصور ہے۔ اور آئندہ کی جنگیں اس سے کہیں زیادہ ہولناک اور تباہ کن ہوں گی چاہے وہ سرمایہ داروں کی ہوں یا اشتراکیوں کی اور چاہے مذہب پرستوں کی!

آپ کا یہ حسنِ ظن کہ روس میں بیس سال میں جتنا خون بہایا گیا ہے، اتنا مذہب نے صدیوں میں نہیں بہایا قطعی غلط ہے۔ جس قدر اعداد و شمار دئے گئے ہیں اتنے مذہبی جنگوں کے سلسلہ میں محض چند سال میں موت کے گھاٹ اُتار

---

[1] روس کے مسلمانوں میں "محتسب" اس شخص کو کہتے ہیں جس کے ذمہ تمام مذہبی معاملات کی نگرانی ہو۔ آئمہ مساجد بھی اسی کے ماتحت ہوتے ہیں۔ [2] الحاضر العالم الاسلامی جلد اول

دیے گئے ہیں۔

اتنی نہ بڑھا پاکیٔ داماں کی حقیقت
دامن کو ذرا دیکھ ذرا بندِ قبا دیکھ!

روس اور ڈکٹیٹرشپ

فاضل مضمون نگار نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ "روس میں اشتراکیت کو ناکامی ہوئی ہے، اور ناکامی بھی نہایت شرمناک"۔ اس سلسلہ میں موصوف نے چند سوالات قائم کئے ہیں، اور اس کے بعد لکھتے ہیں" ڈھٹائی کے ساتھ زبانی دعوے جس قدر چاہیں کئے جاسکتے ہیں۔ مگر واقعات اور حقائق سے ان سوالوں کا جواب اثبات میں نہیں دیا جاسکتا۔" میں موصوف کو یقین دلانا چاہتا ہوں کہ ان سوالات کا جواب اثبات میں دیا جاسکتا ہے۔ اور واقعات اور حقائق سے خود مضمون نگار، اگر سرمایہ داروں کے پروپیگنڈے میں نہ آئیں اور وہ انصاف کی نظر سے روس کے حالات کا مطالعہ کریں تو انھیں تسلیم کرنا پڑے گا کہ روس کی موجودہ حالت پہلے سے بہت اچھی ہے۔ روس کے متعلق جون کے (Pacific Affairs) میں Hubbard (L. E.) کا ایک مضمون شائع ہوا ہے۔ مضمون نہایت مفصل اور مدلل ہے۔ اس میں روس کی گزشتہ حالت کا موجودہ حالت سے مقابلہ کیا گیا ہے اور اعداد وشمار سے ثابت کیا گیا ہے کہ موجودہ حالت پہلے سے بہت اچھی ہے اور دونوں میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ پورا مضمون پڑھنے کے لائق ہے محض اقتباسات کافی نہ ہوں گے۔ اس لئے انشاء اللہ کسی آئندہ صحبت میں اس کا ترجمہ پیش کروں گا۔ ابھی حال میں ہندوستان (لکھنؤ) میں "روس کا پنجسالہ پروگرام" کے عنوان سے کئی قسطوں میں ایک مضمون شائع ہوا ہے۔ اس سے بھی اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ روس ترقی کی طرف کس قدر تیزی سے قدم بڑھا رہا ہے۔

مضمون نگار نے روس میں اشتراکیت کی منجملہ اور ناکامیوں کے یہ ناکامی بھی دکھلائی ہے کہ وہاں جمہوریت کے بجائے ڈکٹیٹرشپ قائم ہے، اور اسٹالن روس کا مطلق العنان فرمانروا ہے۔ مودودی صاحب نے اس کی مزید تائید کی ہے۔ اور اس کی ایک جدید توجیہہ کی ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے کہ:۔

"ڈکٹیٹرشپ کا قیام لینن یا اس کے جانشین اسٹالن کی ذاتی حرص کا نتیجہ نہیں، جیسا کہ بادی النظر میں ایک شخص خیال کرے گا۔ بلکہ در اصل اشتراکی نظام ایک شدید آہنی گرفت کے بغیر نہ قائم ہوسکتا ہے، نہ قائم رہ سکتا ہے۔ اس لئے خود اشتراکی نظام کی فطرت ہی ایک جابر و قاہر ڈکٹیٹر کی طالب ہے۔ وہ ہر وقت ایک ایسی طاقت کا تسلط چاہتی ہے جو ملک کے باشندوں کو لوہے کی زنجیروں میں جکڑ کر رکھے اور قتل وغارت گری کے لئے ہر وقت مستعد رہے۔ کیونکہ اشتراکیت دراصل انسانی فطرت سے جنگ ہے۔ انسان جب تک انسان ہے وہ ہمیشہ ایسے غیر فطری نظام کے خلاف آمادۂ بغاوت رہے گا۔ اس بغاوت کو ہولناک طریقوں سے کچلنے کی طاقت اگر موجود ہے تو اشتراکی نظام قائم رہ سکتا ہے۔ جہاں یہ طاقت ہٹی اور اس نظام کا تار و پود بکھرا۔"

مجھے افسوس کے ساتھ لکھنا پڑتا ہے کہ مضمون نگار اور نوٹ نگار دونوں حضرات نے روس کے دستور کا مطالعہ نہیں کیا ہے۔ ورنہ وہ روس پر یہ الزام نہ لگاتے۔ آج کل بہت سے ممالک میں جمہوری نظام رائج ہے۔ مگر تقریباً ہر جگہ عملاً دولت مندوں کی حکومت (Plutocracy) ہے۔ لیکن روس کے دستور میں اس کی بھی گنجائش نہیں ہے۔ لاہور سے (Contemporary India) کے نام سے ایک ماہی رسالہ نکلتا ہے۔ پہلے اور دوسرے نمبر کی مجموعی اشاعت میں "سوویٹ روس ڈکٹیٹرشپ یا ڈیماکریسی؟" کے عنوان سے راج ہنس کرشنا کا ایک مضمون شائع ہوا ہے۔ اس میں دستورِ روس سے ثابت کیا گیا ہے کہ روس میں جمہوریت اپنی اصلی شکل میں قائم ہے۔ مضمون نہایت مدلل اور عالمانہ ہے۔ ایک پیراگراف کی تلخیص ذیل میں درج کی جاتی ہے۔ اس سے ناظرین کو معلوم ہوسکے گا کہ دستور روس میں اسٹالن کو کیا حیثیت حاصل ہے۔ انشاء اللہ بہت جلد پورا مضمون ناظرین کلیم کی خدمت میں پیش کیا جائے گا۔

"کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ سوویٹ یونین پر صرف ایک آدمی، اپنی مرضی کے مطابق حکومت کرتا ہے اور وہ جوزف اسٹالن ہے۔ لیکن واقعہ اس کے خلاف ہے۔ مسولینی۔ ہٹلر یا کسی ڈکٹیٹر کی طرح اسٹالن کو آئینی اختیارات حاصل نہیں ہیں۔ اسٹالن کو اس قدر بھی اختیارات حاصل نہیں ہیں جتنے حکومت امریکہ نے عارضی طور پر روز ولٹ کو دیے تھے یا عام طور پر امریکن دستور،

چار سال کے لئے، اپنے ہر صدر کو دیتا ہے۔

اسٹالن کو نہ تو سوویٹ یونین میں سب سے بڑے افسر کی حیثیت حاصل ہے اور نہ کمیونسٹ پارٹی ہی میں، وہ نہ تو اس وقت صدر الصدور[1] ہے جس پر آج کل (Kalinin) فائز ہے اور نہ کبھی تھا۔ نہ صرف یہ کہ وہ (People's Commissar) نہیں ہے بلکہ کسی ماتحت ریاست[2] کا معمولی ممبر بھی نہیں ہے۔

۱۹۲۲ء میں وہ صدر الصدور کی مرکزی مجلس انتظامیہ کا ممبر منتخب ہوا تھا اور اس سے قبل محض (Labour and Defence) کمیٹی کے دس ممبروں میں سے ایک ممبر تھا۔

کمیونسٹ پارٹی میں بھی بلند ترین عہدہ یعنی پارٹی کی مرکزی مجلس انتظامیہ کی صدارت اُسے حاصل نہیں ہے۔

اسٹالن صرف پارٹی کا جنرل سکرٹری ہے، اور پارٹی کے فنڈ سے اپنی تنخواہ لیتا ہے اور پارٹی کی مرکزی کمیٹی کے مشورہ کے مطابق کام کرتا ہے۔ ہٹلر سے مقابلہ کرکے دیکھا جائے تو پارٹی میں اسٹالن کی جو پوزیشن ہے وہ بالکل واضح ہو جائے گی۔ ہٹلر کو صحیح معنی میں جرمنی کا ڈکٹیٹر کہا جا سکتا ہے کیونکہ اُسے غیر محدود اختیارات حاصل ہیں۔ وہ چانسلر اور (Reichstag) کے صدر کی حیثیت سے منتخب لیجسلیچر کے فیصلوں کو نامنظور کر سکتا ہے۔ ہٹلر کو جرمنی کے شہریوں پر تحریری آئینی اختیارات حاصل ہیں اور اسٹالن ان چیزوں سے قطعی محروم ہے۔"

یہ ہے اسٹالن کی آئینی پوزیشن جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ سوویٹ یونین کا مطلق العنان فرمانروا ہے۔

خاتمۂ کلام

چونکہ علماء عام طور پر انگریزی سے ناواقف ہوتے ہیں۔ اور اگر کچھ لوگ تھوڑی بہت جانتے ہیں تو معاشیات اور اقتصادیات جیسے اہم فنون سے ناآشنا ہوتے ہیں۔ اس لئے صحیح معنی میں نہ تو اشتراکیت کو سمجھ سکتے ہیں اور نہ بقول مودودی صاحب اشتراکیت کے اصل ماخذ تک پہونچ سکتے ہیں؟ لہٰذا خود مودودی صاحب کے الفاظ میں، اُن سے عرض کرنے کی جرات کروں گا کہ پہلے علم حاصل کریں۔ پھر زبان کھولنے کی جرات کریں؟

مودودی صاحب کے متعلق تو نہیں کہا جا سکتا ہے کہ وہ انگریزی نہیں جانتے۔ وہ اپنے مضامین میں جا وبیجا، انگریزی الفاظ لکھکر اپنی انگریزی دانی کا اعلان کرتے پھرتے ہیں۔ مگر چونکہ وہ ایک رسالہ کے ایڈیٹر اور "دارالاسلام" کے خلیفہ یا کم از کم ہونے والے خلیفہ ہیں۔ اس لئے ان کے مشاغل اس قدر متنوع اور کثیر ہیں کہ وہ اشتراکیت وغیرہ مضامین کے لئے زیادہ وقت نہیں دے سکتے۔ اس لئے اُن سے میری درخواست ہے کہ جن مسائل کے لئے وہ وقت دے سکتے ہیں اُنھیں تک وہ اپنے قلم کی جولانی محدود رکھیں۔ اگر وہ جمعہ کے لئے اچھے خطبے اور "تنزل وتاویل" کے لئے عمدہ مضامین لکھ لیتے ہیں تو کوئی ضروری نہیں کہ اقتصادیات ومعاشیات اور تعلیمی مسائل میں بھی یہ ویسی ہی دستگاہ رکھتے ہوں۔ "دارالاسلام" میں بیٹھکر میکائیلے وغیرہ کے خطابات، ہر شخص تقسیم کر سکتا ہے۔ مگر "دارالحرب" ہندوستان میں کام کرنا ذرا مشکل ہے۔

جناب انصاری صاحب نے مضمون کے آخر میں لکھا ہے کہ "اسلام ظالمانہ سرمایہ داری کا مخالف ہے اور مظلوموں اور غریبوں کا حامی ہے اور خود اپنا ایک معاشی لائحۂ عمل رکھتا ہے؟"

اس سے قبل بھی اس قسم کے وعدے کئے گئے ہیں۔ مولوی صاحبان جب کبھی اشتراکیت کی مخالفت میں قلم اُٹھاتے ہیں تو یہ ضرور لکھتے ہیں کہ اسلامی نظام دنیا کے تمام نظاموں سے اچھا ہے۔ اشتراکیت جن امراض کا علاج چاہتی ہے اُن کے لئے اسلامی نظام کا نسخہ سب سے زیادہ مفید ہے۔ مگر یہ محض دعویٰ ہی دعویٰ ہے جس پر کوئی ایمان نہیں لا سکتا۔ ضرورت اس کی ہے کہ اس اسلامی نظام کو اسی طرح دنیا کے سامنے پیش کیا جائے جس طرح اشتراکی یا دوسرے نظام پیش کئے گئے ہیں۔ مگر اس کو

---

[1] President of Presidium of the central Executive committee.
[2] Constituent republics.

کرے کون؟ صرف علمار کرسکتے ہیں۔ مگر وہ نہ تو دورِ حاضر اور جدید تعلیم یافتہ طبقہ کی زبان سے واقف ہیں اور نہ اُن کی آرام طلبی اور بے عملی اس کی اجازت دیتی وہ صرف اعتراض کرنا جانتے ہیں اور بس، اور ایسے لوگوں کا انجام بالکل واضح ہے۔

آخر میں، میں اپنی پوزیشن واضح کردینا ضروری سمجھتا ہوں۔ میں اشتراکیت کا نہ مبلغ ہوں نہ حامی۔ میں طالب علم ہوں اور اس کو سمجھنا چاہتا ہوں۔ اس لئے مخالفینِ اشتراکیت کے مضامین خاص طور پر پڑھتا ہوں۔ مگر انھیں پڑھنے کے بعد مجھے ہمیشہ مایوسی ہوئی۔ میری نظر سے مخالفت میں کوئی ایسا مضمون نہیں گزرا جس میں دیانت کے ساتھ نفسِ مسئلہ پر بحث کی گئی ہو۔ مذہب وغیرہ کو بحث میں لانا، میں بیکار اور علمار کی کمزوری سمجھتا ہوں۔ وہ نفسِ مسئلہ پر لکھ نہیں پاتے تو غیر متعلق باتوں میں عوام کو الجھانا چاہتے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ اگر اشتراکیت کے علمبردار اور مبلغ مذہب پرست ہوں گے تو مذہب کو کوئی نقصان نہیں پہونچے گا۔ اور اگر یہ تحریک کلی طور پر ان لوگوں کے ہاتھ میں چلی گئی جنھیں مذہب عزیز نہیں ہے تو یقیناً وہی ہوگا جو انقلابِ روس میں ہوا۔ اگر اشتراکیت کے اصول ٹھیک نہیں ہیں اور وہ جس ماحول میں، جن امراض کے علاج کے لئے تجویز کی گئی ہے، اس کے لئے مفید نہیں ہے تو اسے ثابت کیا جائے۔

چونکہ روس میں اشتراکی نظام کا تجربہ ہو رہا ہے۔ اس لئے وہاں کے واقعات عموماً مخالفت اور موافقت میں پیش کئے جاتے ہیں۔ گو ہندوستانی سوشلسٹ، روس کی خرابیوں کی ذمہ داری، سوشلزم پر ڈالنے کے لئے تیار نہیں اور یہ ٹھیک بھی ہے۔ جس طرح کسی مسلم حکومت کی خرابی کی ذمہ داری اسلام پر نہیں ڈالی جاسکتی ہے، اسی طرح سوشلزم روس کی خرابیوں کی ذمہ دار نہیں ہے۔ لیکن اس کے باوجود میں چاہتا ہوں کہ اشتراکیت پر غور کرتے وقت روس کے واقعات اور حالات کو پیشِ نظر رکھا جائے اور وہاں جو خرابیاں ملیں ان پر غور کیا جائے کہ اس کا اصل سبب کیا ہے سوشلزم یا وہاں کے منتظمین، اس سلسلہ میں میں اشتراکیت پر کچھ لکھنے سے قبل روس کے متعلق مستند مضامین کے ترجمے پیش کرنا چاہتا ہوں، اس کے بعد اشتراکیت پر لکھوں گا۔ اس کام کو ہند اور ہندوستان بہت اچھی طرح انجام دے رہے ہیں۔ اگر مخالفینِ اشتراکیت لکھتے وقت انھیں پیشِ نظر رکھیں تو ہمارا بہت سا وقت فضول مباحث میں صرف ہونے سے بچ رہے

کب تک؟

بلائیں روز نازل ہونگی اس پر نا گہاں کبتک — مصیبت میں رہے گا مبتلا ہندوستاں کبتک؟

لڑے جائیں گے آپسمیں کہاں تک ہندو و مسلم — جہالت سے رہیں گی باہمی خونریزیاں کبتک؟

کہاں تک مشتعل جذبات ہونگے اب تعصب کے — عداوت سے رہیں گی ہند کی بربادیاں کبتک؟

کہاں ہے اب وہ سعیِ اتحادِ ہندو و مسلم — بہی خواہانِ مُلک و قوم! یہ خوابِ گراں کبتک؟

کہاں تک خامشی اے رہبرانِ ہندو و مسلم
تماشائے فساد انگیزیٔ ہندوستاں کبتک؟

میر افق کاظمی امروہوی

زندگی کے مزے

حکیم عبد الوالی لکھنؤ

(۱)

وامق کا واقعہ

نفیس بانو کاغذ سامنے رکھے دانت میں قلم دبائے لکھنے کے لئے کچھ سوچ رہی ہے۔ آنکھیں آسمان کی طرف ہیں مصنفین اکثر مضمون کی تلاش خلا بالا میں کرتے ہیں۔ کیا واقعی مضامین انسان کے دماغ میں عالم بالا سے آتے ہیں؟ کچھ تو ہے کہ نئے مضمون کی تلاش میں نظر اوپر کی جانب اٹھتی ہے۔ کوئی ذہنی گتھی سلجھانا ہو تو اس فکر میں نظر نیچے کی طرف ہوتی ہے بلکہ آنکھ بند کرنے کی طرف رجحان ہوتا ہے۔ برخلاف اس کے نئے مضمون کے القا کے وقت آنکھ بلندی کو دیکھتی ہے۔ نفیس بانو ایک چھوٹا قصہ ایک رسالے کے ایڈیٹر کی فرمائش پر لکھنے بیٹھی ہے۔ ایسا قصہ جو ختم ہونے پر کوئی مسئلہ یا سوال پیدا کر دے۔ معقول معاوضہ کی لالچ نے فکر میں اور اضافہ کر دیا ہے۔ انسانی زندگی کے مصائب میں شاید سب سے زیادہ ناقابل برداشت مصیبت یہ ہے کہ کوششیں بآسانی بارآور نہیں ہوتیں۔ نفیس بانو بہت اچھی فسانہ نگار ہے۔ صورتنگر ذہن اور خیال آفریں دماغ رکھتی ہے۔ مگر اس وقت دماغ کی کوئی قوت کام نہیں دے رہی ہے۔ عجیب الجھن میں ہے۔ اتفاقاً زلیخا بھی مکان کے اسی گوشے میں دل بہلانے کے لئے آنکلتی ہے۔ صبح کا وقت۔ گرمی کا زمانہ۔ مغربی رُخ کا برآمدہ جس کے سامنے باغ کا ایک خوشنما حصہ ہو اسے چھوڑ کے کون کمرے میں جاکے بیٹھے گا؟ بانو کو سوچ و فکر میں دیکھکر زلیخا اس کے پاس جاتی اور پوچھتی ہے "کس سوچ میں ہو؟" بانو مایوسی کی سانس لیتی اور کہتی ہے" کیا بتاؤں گھنٹوں سے بیٹھی سوچ رہی ہوں۔ کوئی خیال دماغ میں نہیں آتا۔ کسی واقعہ زندگی کی تصویر ذہن میں نہیں آتی، کہ ایک قصہ بناؤں۔ رسالوں کے ایڈیٹر بڑے ظالم ہوتے ہیں۔ روپیہ کا لالچ دیتے ہیں اور اسی کے ساتھ شرطیں بھی لگا دیتے ہیں۔ کہ قصہ ایسا ہو اور ویسا ہو۔ خیال نہ روپیہ کا محتاج ہے نہ شرطوں کا پابند اس کی اپنی رَو ہوتی ہو۔ ایڈیٹر "پرتوستان" کی فرمائش ہے کہ ایسا مختصر قصہ لکھا جائے جو انسانی زندگی کا کوئی دلچسپ واقعہ پیش کر کے ایک ایسا حل طلب مسئلہ پیدا کر دے۔

زلیخا۔ مسئلہ وسئلہ تو میں جانتی نہیں، میں اپنا ایک قصہ اگر تم سننا چاہو تو سنا دوں۔ اسے اپنی دلکش زبان میں لکھو لو" پرتوستان" والوں کو شاید پسند آجائے۔

بانو۔ تم نے کوئی قصہ لکھا ہے۔

زلیخا۔ میں قصے وصے نہیں لکھتی۔ خود اپنے قصے انسان کے کیا کم ہیں۔ کہ خیالی قصے بنائے۔

بانو۔ اگر واقعہ ہے تو قصے سے زیادہ دلچسپ ہوگا۔

زلیخا۔ دنیا قصوں سے زیادہ اصلی واقعات کی دلچسپیوں سے بھری پڑی ہے۔ مگر ایسے واقعات وہ لوگ کہتے جھجکتے ہیں جن پر گزرتے ہیں۔ اگر نڈری سے کہنے لگیں تو فسانے ختم ہو جائیں۔ لیکن کہیں تو کیسے کہیں سننے والوں کی ثقاہیت کو ٹھیس لگنے اور اس آبگینہ کے ٹوٹنے کا اندیشہ پیدا ہوتا ہے۔ لوگوں کے شیرازۂ اخلاق بکھرنے کا ڈر لاحق ہو جاتا ہے۔ میں

صنعت وصناعی سے متنفر ہوں۔ زندگی اپنی اصلی شکل وصورت میں مجھے بھلی معلوم ہوتی ہے۔ زندگی کی تصویروں میں کیا رکھا ہے۔ تصویر پھر تصویر ہے بے جان بے حقیقت۔

بانو۔ میں تمہارا قصہ سننا چاہتی ہوں۔ صنعت وصناعی کے متعلق تمہاری رائے نہیں دریافت کرتی۔ صنعت وصناعی زندگی کی تصویریں نہیں۔ زندگی کا پرتو ہیں۔ اگر زندگی حقیقی شے ہے تو اس کا پرتو بھی اسی قدر حقیقی ہے۔ صناع کی پوری اور اصلی جان اس کی صنعت میں ہوتی ہے۔ اگر صنعت میں صناع کی جان نہ ہو تو وہ صنعت پوچ اور لچر ہے۔ غالب کا کلام غالب کی جان ہے۔ اقبال کی شروع کی شاعری اس کی جان تھی۔ آخری حصہ کلام فلسفہ اور کسب کی ہوئی چیزیں ہیں۔ اپنی جگہ چاہے کتنی اچھی ہوں۔ اقبال کی جان کی دہکتی ہوئی آگ اس میں نہیں ہے۔ جوش کے کلام میں اور کیا ہے سوائے اس کے کہ اس کی متحرک اور محترق جان اس میں ہے۔ خیر اس قصہ کو چھوڑو۔ اپنا قصہ سناؤ۔ تمہاری زندگی میں خود اتنی صناعی ہے کہ اور دوسری صنعتوں کے شوق کی فرصت تمہیں نہیں ملتی۔ تم چلنے، بات چیت کرنے ہنسنے بولنے میں وہ وہ صناعیاں کرتی ہو کہ دوسرے صناع دنگ ہو جائیں۔

زلیخا۔ اچھا میرا پیچھا نہ لو۔ قصہ سنو۔ وامق کا اور میرا۔

بانو۔ کون وامق؟ (متحیر ہو کر)

زلیخا۔ کوئی پریشانی کی بات نہیں۔ متحیر نہ ہو۔

بانو۔ اچھا!! تو یہ کہو تمہارا اور انکا بھی کوئی قصہ ہو چکا ہے۔

زلیخا۔ تمہارے سوالوں کے جواب دوں یا قصہ کہوں؟ پہلے یہ طے کرو۔

بانو۔ نہیں، نہیں قصہ کہو۔ اب تم سے کوئی سوال نہ کروں گی۔

زلیخا۔ نہیں؛ میرا دل جل جاتا ہے۔ ہر عورت یہ خیال کئے بیٹھی ہے کہ میاں ماں کے پیٹ سے اس کا عشق لئے آیا ہے۔ ہر مرد اس اطمینان میں مست ہے کہ بیوی نے کبھی کسی مرد کو آنکھ اٹھا کے نہیں دیکھا۔ گزرا زمانہ فسانہ ہے۔ تمہیں موجودہ حالت اور صورت سے غرض ہونی چاہیے۔ وامق نے تم کو جاننے کے پیشتر شادی سے پہلے کیا کیا، اس سے تمہیں کیا مطلب۔

بانو۔ ہاں ہاں کہتی تو ہوں اب کچھ نہ پوچھوں گی۔ قصہ ہی سنوں گی۔

زلیخا۔ اور چہرے کی رنگت نہ بدلے گی۔ تیوری پر بل نہ آئے گا؟ قصہ سننے کے بعد وامق سے جو ملاقات ہوگی تو منہ سوجا پھولا نہ ہوگا؟

بانو۔ اب بنو نہیں۔ سیدھی طرح واقعہ بیان کرو۔

زلیخا۔ کیسے بیان کروں۔ تم اس بیچارے کی جان کے پیچھے پڑ جاؤگی جھاڑ کا کانٹا ہو کے لپٹ جاؤگی۔ آخر اس غریب نے تمہاری کیا خطا کی،

بانو۔ زلیخا مجھے دیوانہ نہ بنا۔ کہنا ہو تو کہہ نہیں تو دور ہو۔ میرا وقت ضائع نہ کر۔

زلیخا مجھے اپنے وامق پر ترس آتا ہے تو اس سے لڑے گی اور اسے شرمانا اور سر جھکانا پڑے گا۔

بانو۔ ترس آتا ہے تو اس گزرے ہوئے واقعہ کو خواب سمجھو اور تعبیر دینے کے لئے ان کے گلے لپٹ کے سو رہو۔

زلیخا۔ کبھی کبھی دل تو چاہتا ہے مگر خسرو کا خیال روک دیتا ہے۔

بانو۔ اچھا خیر اب بہت سخری نہ بنو قصہ بیان کرو۔

زلیخا۔ یہیں خالہ باجی کے یہاں تمہیں معلوم ہے میں رہتی تھی۔ وامق ان کے یہاں اکثر آیا کرتے تھے۔ دلچسپ آدمی تو ہیں ہی ہیں۔ ہر شخص کو گھر میں ان سے لطف تھا۔ جہاں اور مشغلے تھے ایک مشغلہ ان کا عشقبازی بھی تھا۔ میری جانب توجہ ہوئی۔ یہ میں ضرور کہوں گی۔ محبت اس پیارے انداز سے کرتے تھے کہ جس سے محبت کریں وہ سمجھنے لگے میں بھی کوئی چیز ہوں حسن وعشق کی زندگی کا پورا مزہ اسے آجائے۔ افسوس میرے دل کو وامق سے کوئی لگاؤ نہ تھا۔ نہیں تو میں بھی مزے اٹھاتی وہ مجھے للچائی نظر سے دیکھا کرتے تھے۔ مگر ایسی ظالم کہ یہ معلوم ہوتا تھا کہ ذرا غافل ہوں تو جھپٹا مار کے مجھے لے بھاگیں۔ جسم کا کوئی حصہ ان کی آنکھ کی زد سے نہیں بچتا تھا۔ سر کے بالوں پر نظر ہے۔ اتفاق سے کوئی لٹ گالوں پر آپڑی فوراً نگاہیں اس کا لطف اٹھانے لگیں۔ نظریں اس درجہ رازگو اور بھید بتانے والیں کہ دل سے جو جو لطف اٹھائے جو جو حسن محسوس کئے نظریں فوراً اگل اٹھیں کہ یہ یہ ہوا ـــ بالوں کو چھوڑا تو آنکھوں کی طرف توجہ ہوئی۔ ان کی بناوٹ پر ان کی دکھاوٹ پر فریفتگی، آنکھوں سے پیچھا چھٹا تو نظریں سینے پر آکے جم گئیں، اور کپڑوں کو گویا ہٹا ہٹا کے سینے بھر کا جائزہ لینے لگیں۔ نظریں تھیں کہ معلوم ہوتا تھا کوئی ہاتھ سے ٹٹول رہا ہے۔ سنسنیاں

اور گدگدیاں تک ہونے لگتی تھیں۔ ظالم نظروں کو اس سے بھی سیری نہ ہوتی تھی تو کچوٹ اور نیچے تک پہنچ جاتی تھیں۔ یہ ضرور تھا کہ میں بھی موقع دیتی تھی، مگر صرف ستانے کے لئے شوق کو تیز کرنے کے لئے یہ تو جانو عورت کی کمزوری ہے کہ مرد کے شوق کو بڑھاتی ہے۔ نیت میں کوئی خرابی ہو یا نہ ہو۔ میں سچ کہتی ہوں میرے دل کو کوئی لگاؤ اُن سے نہ تھا۔ نظر بازی کا مزا ہاں بیشک اُٹھاتی تھی۔ یہ نظر بازی کے تماشے مہینوں جاری رہے۔ ایک روز یکایک ان کا خاتمہ ہو گیا۔ مگر ایک یادگار سین کر کے ختم ہوئے۔

وہ سین بیان کروں؟ ہے ہے بہت بُرا سین تھا! کبھی نہ بھولے گا! میں اسی سامنے والے کمرے میں منہ دھو کے کنگھی کرنے گئی۔ اسی برآمدہ سے گئی تھی۔ دراز کے اوپر آئینہ اور سب سامان لگا تھا۔ بال کھول کے میں اپنی صورت دیکھنے لگی۔ اکیلے میں آدمی جو چاہتا ہے کرتا ہے۔ میں اپنے کو ہر انداز میں دیکھ دیکھ کے خوش ہو رہی تھی، کبھی بال چہرے پر ڈالتی تھی کبھی ہٹاتی تھی۔ مجھے مطلق خبر نہ تھی کہ غسل خانے میں کون ہے۔ نہ مجھے دروازہ کھلنے کی ذراسی بھی آواز آئے۔ آئینہ میں میں نے یکایک دیکھا کہ وامق میرے پیچھے کھڑے ہیں۔ عورت تو عورت میں سٹپٹاسی گئی۔ اس کا فائدہ اُنھوں نے اُٹھایا یا اپنے قابو میں نہ رہے، جو کچھ ہو ڈھٹائی سے مجھے گھسیٹ کے اپنے سینے سے لگالیا، لمحہ کے لمحہ مجھے ان کی یہ حرکت ناگوار سی ہوئی۔ مگر پہلے پیار کے بعد یہ معلوم ہوا ہتھیار میرے ہاتھ سے گر گئے۔ میں بے بس تھی۔ ناگواری کا سوال ہی باقی نہ رہا۔ دماغ معطل ہو گیا۔ میں نہیں جانتی تھی میں کیا کر رہی ہوں۔ یا میرے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔ میری باہیں اُن کے گلے میں تھیں۔ ان کا داہنا ہاتھ اوپر سینے والے حصے کو گھیرے ہوئے اور بایاں کمر کے گرد تھا۔ جسم اُن کے جسم سے لپٹا ہوا۔ چند لمحوں میں نہ معلوم کتنے پیار اُنھوں نے کر ڈالے۔ اچھائی بُرائی کا خیال آگے پیچھے کا دھیان کسی بات کو جسم کے اس وقتی راج میں قریب تک جانے کی جرأت نہ تھی۔ کتنے خوشگوار وہ لمحے تھے! کتنے مزے کا وہ تھوڑا سا وقت تھا۔ آناً فاناً یہ سب کچھ ہوا۔ آہٹ سی کچھ ہوئی۔ دونوں الگ ہو گئے۔ میرا دل اندر سے بولا۔ "کیسا مزا آتا ہے۔" وامق کا چہرہ بتارہا تھا کہ ان کا دل بھی کہتا ہے "کیسا مزا آیا ہے۔" مجھے نہ اُس وقت اُن سے محبت تھی نہ اب ہے اور میرا خیال ہے ان کو بھی نہ مجھ سے اُس وقت محبت تھی نہ اب ہے۔ ہم دونوں شرمندہ سے ہو گئے۔ اس واقعہ نے نظر بازی کے سلسلہ کو بھی ختم کر دیا۔

کیا کوئی جرم ہوا؟ اگر ہوا تو کون مجرم ہے؟ میں یا وامق؟ یا دونوں؟ ہیں تو کیوں؟ نہ میں نے کوئی موقعہ ڈھونڈا، نہ وامق نے، عمداً نہ میں نے کوئی حرکت کی نہ وامق نے، اتفاق کا کون ذمہ دار ہے۔ ہم دونوں تنہا جگہ پر کیوں ملائے گئے۔ کہنے والے یہ بھی کہتے ہیں کہ اتفاق مشیت کا تابع ہے۔ مشیت کیوں جرم کراتی ہے۔ اگر یہ جرم ہے؟ کیا اُسے بھی وہی مزا آتا ہے جو مجھے اور وامق کو آیا تھا۔ مجھے تو مشیت سے کوئی شکایت نہیں، اخلاق گر اور شریعت ساز سوسائٹی کو ہو تو ہو۔

نفیس بانو سکتے کے عالم میں بیٹھی قصہ سناکی۔ جب قصہ ختم ہوا، اور زلیخا نے کہا "بس یہ قصہ ہوا" تو بولی "زلیخا! کیا یہ واقعہ سچا ہے؟" "اگر سچا ہوتا تو تم کبھی نہ کہتیں" زلیخا نے جواب دیا "یہ تمہارا حسن ظن یا بدظنی ہے۔ میں نے تو قصہ کہہ سنایا، سچ سمجھو یا جھوٹ، یہ تمہارا کام اور طبیعت کی خوشی ہے۔ اچھا اب وامق سے پوچھنا: ایسا ایسا قصہ میں نے سنا ہے، سچ ہے یا جھوٹ۔"

بانو۔ میرا تو دل کہتا ہے کہ گڑھا ہوا قصہ ہے۔

زلیخا۔ عورت عجیب مخلوق ہے، اپنے میاں کی بابتہ انتہائی بدظن بھی ہوتی ہے اور جب اُس کا واقعہ کوئی سنایا جاتا ہے تو یقین کرنے میں تامل کرتی ہے۔

بانو۔ عورت عجیب مخلوق ہے۔ اپنے میاں کی بابتہ انتہائی بدظن بھی ہوتی ہے اور جب اُس کا واقعہ کوئی سنایا جاتا ہے تو یقین کرنے میں تامل کرتی ہے۔

بانو۔ عورت عجیب مخلوق ہو یا نہ ہو۔ لیکن تم واقعی عجیب عورت ہو کہ تمہاری کوئی تھا نہیں پا سکتا۔ سچی ہو یا جھوٹی۔ نیک ہو یا بد۔

مضمون نگار حضرات اپنا نام و پتہ مضمون کے پہلے صفحے یا آخری صفحے پر صاف اور واضح لکھا کریں۔ ورنہ مضمون بغیر نام کے شائع کر دیا جائے گا بشکایت منع۔

دنیا نے ہر فسانہ حقیقت بنا دیا
ہم نے حقیقتوں کو بھی افسانہ کر دیا

(جوشؔ)

عطاء اللہ پالوی

بھائی شبیر! آپ لوگ بڑے موقع سے تشریف لائے ہیں۔ ابھی ابھی میں نے ایک افسانہ مرتب کیا ہے۔ اور خیال کر رہا تھا کہ کوئی سنجیدہ اور اہل دل و صاحبِ نظر انسان مل جائے تو اُسے سنا کر اپنی جدّت اور اپنے کمالات کی داد لوں"......... میں نے بھائی شبیر اور میاں حسین کی طرف کرسی بڑھاتے ہوئے کہا۔

شبیر۔ تمہاری اِن حرکتوں سے اب مجھے نفرت سی ہونے لگی ہے، کیا تمھیں مضمون لکھنے اور سنانے کے علاوہ اور کوئی کام ہی نہیں؟

میں۔ بھائی صاحب! اس میں خفا ہونے کی تو کوئی بات نہیں، کیا آپ نے امیر مینائی کا یہ شعر نہیں سنا ہے! ؎

شاعر کو مست کرتی ہے تعریفِ شعر امیرؔ
سَو بوتلوں کا نشہ ہے اس واہ واہ میں

شبیر۔ لیکن شعر بھی ہو؟ تمہارے تو تمام مضامین "تنقیدی" ہوا کرتے ہیں، اور چونکہ میں ایسے "فضول گوئی" سے زیادہ باوقعت نہیں سمجھتا۔ اس لئے مجھے اس قسم کے مضامین سے سخت نفرت ہے۔

میں۔ میں تنقیدی مضمون کہاں سنانا چاہتا ہوں؟ میں نے تو پہلے ہی عرض کیا کہ آج میں نے ایک مختصر افسانہ "مرتب" کیا ہے۔

شبیر۔ اچھا ہے کہ میں تمہارا "افسانہ" بھی نہ سنوں اور بہتر ہے کہ مجھے کوئی افسانہ نہ سناؤ۔

میں۔ کیوں؟

شبیر۔ میرا مطالعہ مجھے بتاتا ہے کہ اردو کے مختصر افسانے باوجود اس قدر عروج حاصل کرنے کے بھی ہنوز پستی میں ہیں۔ اور اِن میں اب بھی لغویت و فرسودیت کی اتنی کثرت ہوتی ہے کہ پڑھنے اور سننے سے دل و دماغ کو تکلیف ہونے لگتی ہے۔

حسین۔ تو کیا آپ کے نزدیک اردو کے تمام افسانے قطعی لغو اور اردو زبان کے تمام فسانہ نگار پست خیال اور مہمل گو ہیں؟

شبیر۔ میری یہ مجال نہیں کہ میں تمام افسانہ نگاروں کے متعلق ایسا کہوں اور نہ میں وسعتِ مطالعہ کا اس درجہ مدّعی ہوں کہ ہر افسانہ کے متعلق ایسا دعویٰ کردں۔ البتہ یہ ضرور کہہ سکتا ہوں کہ فی زمانہ افسانہ نگاری نے جو عالمگیر عروج حاصل کیا ہے وہ اِس بات کا مقتضی تھا کہ اردو افسانہ نگاری ایک بلند مرتبہ حاصل کر لیتی۔ لیکن ایسا نہیں ہے۔ اس وقت چار یا پانچ سو

افسانہ نگاروں میں گنتی کے صرف چند ہی مرتبہ افسانہ نگار ایسے نکلیں گے جن کے افسانے نہ صرف زبان، بیان اور خیال بلکہ ہر لحاظ سے اچھے نظر آتے ہیں، ورنہ باقی جتنے ہیں اُن کے متعلق بجز اس کے اور کیا عرض کیا جا سکتا ہے کہ "نہیں" اور ایسے ہی ہیں کہ افسانہ نگار مشہور ہیں۔

میں۔ آخر اِس "لغویت" کی کوئی دلیل بھی ہے یا "خدا کو بے دلیل مان" کی طرح آپ نے "اردو افسانوں کو ذلیل مان" کسی سے سُن لیا ہے اور اُسی پر عامل ہیں؟

شبیر۔ کیا ایسی بیّن حقیقت کے لئے بھی کسی دلیل کی ضرورت ہے؟ کیا تمھیں اس سے انکار ہے کہ اردو افسانوں کے ذخیرے کا نصف حصۂ عشقیہ افسانوں پر مشتمل ہے؟

میں۔ ممکن ہے ایسا ہی ہو۔ میں نے شمار نہیں کیا ہے۔

شبیر۔ ممکن نہیں، یہ حقیقت ہے۔ اُردو کے باستثنائے چند تمام افسانہ نویس زیادہ تر رومانی یا عشقیہ افسانے لکھتے ہیں، اور ان افسانوں کا حال یہ ہے کہ نہ صرف یہ خلاف مقتضائے وقت ہیں بلکہ ان میں جو چیزیں پیش کی جاتی ہیں وہ سب مقررہ ہیں۔ مثلاً ہیرو اور ہیروئن کا (جو نوّے فیصدی کسی نہ کسی رشتے سے آپس میں بھائی بہن یا زیادہ سے زیادہ ترقی ہوئی تو دیور، بھاوج یا چچی بھتیجا وغیرہ ہوتے ہیں) غیر معمولی طور سے حسین ہونا (حسن کی تفسیر کے لئے بھی نہ صرف یہ کہ الفاظ مقرر کئے ہیں۔ بلکہ تمام اعضا کی تشبیہات بھی متعین ہیں) لڑکپن ہی سے اُن کے مزاجوں کا عاشقانہ اور رومان پسند ہونا (ان میں اسّی فیصدی افسانے اس بات کے دعویدار نظر آتے ہیں کہ اُن کے ہیرو اور ہیروئن لڑکپن میں ایک ہی بستی۔ جگہ یا مکان میں رہتے۔ ایک ہی مکتب، کالج میں پڑھتے اور ساتھ ہی کھیلتے کودتے تھے) سن شعور کو پہونچتے پہونچتے ایک دوسرے پر اُن کا فریفتہ ہو جانا۔ ہیرو اور ہیروئن کا ایم اے اور بی اے پاس ہونا، ہیرو اور ہیروئن کا امتحان کے موقعے پر امتیازی سندیں حاصل کرنا۔ وغیرہ۔ رومانی افسانوں کے بعد افسانوی ذخیرے کا بقیہ نصف حصہ جو بچتا ہے اُس میں بھی نصف سے زیادہ مذاحیہ افسانے ہیں۔ اور بقیہ نصف میں اصلاحی، معاشری سماجی اور جاسوسی غرض اور دیگر تمام قسم کے افسانے نظر آتے ہیں، اور سب سے "زیادہ قابلِ افسوس بات یہ ہے کہ تقریباً یہ تمام قسم کے افسانے زیادہ تر انگریزی زبان (جس میں خود انگریزی اور دیگر تمام بڑی زبانوں کے انگریزی ترجمے شامل ہیں) سے ماخوذ ہوتے ہیں۔ بالفاظِ دیگر ان افسانوں کا کم و بیش تمام خیال یا پلاٹ دوسری زبانوں سے ماخوذ ہوتا ہے۔ اکثر افسانے ایسے بھی دیکھنے میں آئے ہیں جو ہیں تو کلیتاً ترجمہ۔ لیکن ستم ظریفی سے کسی جگہ یہ نہیں بتایا گیا ہے کہ وہ ترجمہ ہیں۔

میں۔ لیکن جہاں تک میں نے افسانوں کے ترجمے دیکھے ہیں میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ زیادہ تر اُن کے ترجمہ ہونے کا اقرار کیا گیا ہے۔

شبیر۔ ممکن ہے میری ہی نظر کا قصور ہو۔ لیکن میں نے افسانوں کے جتنے ترجمے دیکھے ہیں اُن کا ۳/۴ حصہ صرف لفظ "ماخوذ" یا "ترجمہ" کا حامل نظر آیا ہے اور وہ ۱/۴ حصہ جس میں مصنف کا نام ظاہر کیا گیا ہے، اُس کا حال یہ ہے کہ اُس میں مترجم کا نام تو جلی حروف میں اوپر اور مصنف کا خفی خط میں نیچے لکھا گیا ہے۔ گویا اصل چیز "تخلیق" نہیں بلکہ "ترجمہ" ہے۔

میں۔ فرض کیجئے کہ ایسا ہی ہے۔ لیکن اس سے تو انکار نہ ہونا چاہیئے کہ اِن تمام افسانوں اور ترجموں کے ذریعے "اردو ادب" میں بہت کچھ اضافہ ہوا ہے؟

شبیر۔ اگر "ادب" نام ہے صرف افسانوں میں زیادہ سے زیادہ صفحوں کے سیاہ ہونے کا۔ تو بیشک مجھے اعتراف ہے کہ اردو ادب میں بہت کچھ اضافہ ہوا۔ لیکن اگر "اضافۂ ادب" کا مطلب یہ ہے کہ اُس زبان میں زیادہ سے زیادہ ہر قسم کا مطلب ادا کرلینے والے الفاظ اور بلند سے بلند خیالات پر دسترس حاصل کرنے والے ذرائع پیدا ہو جائیں۔ تو کہنا پڑے گا کہ افسانوی ادب نے ابھی کوئی بلند درجہ حاصل نہیں کیا ہے۔ اور افسانوں کے ذریعے سے اردو ادب میں کوئی قابل فخر اضافہ نہیں ہوا ہے۔

حسین۔ تو آپ کے معیار کے مطابق اِس وقت اردو زبان میں افسانہ یا افسانہ نگار موجود ہے یا نہیں؟

شبیر۔ ضرور ہے۔ اور بیشک ہیں۔ لیکن ہزاروں افسانہ اور سیکڑوں افسانہ نگار کی رَو میں وہ بھی بہے ہوئے ہیں نہ تو خود اُن کو اتنا موقع ملتا ہے کہ وہ اُبھریں اور نہ عوام کو "خرافات" میں سے —

انھیں علیحدہ کرنے کی فرصت ملتی ہے۔ اس وقت تو افسانوں اور افسانہ نگاروں کا حال یہ ہے کہ ہر طرف سے اُمڈے پڑ رہے ہیں۔ پھر اسی سیلِ بے پناہ میں اُن کا کہاں ٹھکانا؟

حسین۔ لیکن اب اس سیلِ بے پناہ کی روک تھام شروع ہوگئی ہے۔ اور اب افسانہ نگاروں یا افسانہ نویسی کی اصلاح کی طرف خاص طور سے لوگ متوجہ ہو رہے ہیں۔ چنانچہ افسانہ نویسی سے متعلق بے شمار مضامین اور متعدد تصانیف تخلیق ہوئی ہیں۔

شبیر۔ افسوس ہے کہ میں یہاں بھی تمہارا ہم خیال نہیں۔ یہ درست ہے کہ "افسانہ نگاری" پر متعدد مقالات شائع ہوئے ہیں اور اکثر کتابیں لکھی گئی ہیں۔ لیکن نہ صرف یہ کہ وہ سب ایک دوسرے کی تفصیل واجمال ہیں۔ بلکہ وہ میری دانست میں بڑی حد تک "تشنہ" بھی ہیں۔ مثلاً کسی مصنف یا مضمون نگار نے اس امر کی طرف کوئی توجہ نہیں دلائی ہے کہ یہ دور افسانہ نگاری کے لئے موزوں ہے بھی یا نہیں۔ اور اگر ہے تو اس وقت کس قسم کے افسانوں کی ملک کو ضرورت ہے۔ یا یہ کہ افسانوں کا مقصد محض دل بہلانا ہے یا اس کے ذریعے سے کچھ ملّی و ملکی کام لینا بھی؟ اگر صرف اول الذکر مقصد ہے تو پھر اردو زبان میں طویل افسانے کیوں لکھے جاتے ہیں۔ اور چاہے خیالات دقیق نہ ہوں۔ لیکن ادق الفاظ کیوں استعمال کئے جاتے ہیں؟ اور اگر ثانی الذکر مقصد اہم ہے تو عشقیہ افسانوں کی اتنی کثرت کیوں ہے؟ نیز کسی اہلِ قلم نے یہ بھی نہیں تحریر فرمایا ہے کہ افسانہ نگاری وافسانہ خوانی آزادوں کا کام اور مصروفوں کا مشغلہ رہا ہے۔ یا غلاموں اور بیکاروں کا؟ غرض اس قسم کی اکثر بظاہر معمولی اور بہ باطن نہایت اہم باتیں ہیں۔ جن کی طرف اُن کا ذہن منتقل نہیں ہوا ہے۔ اور اس لئے یہ کہا جاسکتا ہے کہ اُن کی موجودگی نے کوئی قابلِ ذکر فائدہ نہیں پہونچایا۔

میں۔ شبیر صاحب! جہاں تک مجھے یاد ہے میں نے شاید آپ سے اردو افسانہ نگاری پر اظہارِ خیال کی "فرمائش" نہیں۔ بلکہ صرف ایک افسانہ سننے کی "درخواست" کی تھی۔

شبیر۔ بلاشبہ تم نے صحیح کہا ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ جب میں اردو افسانوں کی طرف سے اتنا مایوس ہوں یا بالفاظِ دیگر جانتا ہوں کہ فی زمانہ افسانہ نگاروں کے ایک گرانقدر حصے کی دنیا صرف منقولات " تک محدود ہے تو میں یہ کیسے یقین کروں کہ تمہارا افسانہ "تخلیقی" اور معقولات پر مبنی ہوگا۔ اور اس لئے سننے کے قابل بھی؟

میں۔ مگر میں آپ کو اطمینان دلاتا ہوں کہ آپ نے اب تک جتنی قسم کے افسانوں کا تذکرہ کیا ہے اُن سب سے میرا افسانہ علیحدہ ہے۔

شبیر۔ یعنی؟

میں۔ یعنی یہ کہ میں نے انقلابی افسانہ کی قسم کا ایک افسانہ مرتب کیا ہے۔

شبیر۔ افسوس ہے کہ تمہاری اس جدت نے مجھے یہ کہنے پر بھی مجبور کر دیا ہے کہ انگریزی زبان سے فیضیاب ہونے کے بعد بھی اردو زبان میں انقلابی افسانوں کا فقدان۔ ایک ایسی لعنت ہے جس کا طوق بہت بھاری ہو چکا ہے۔ آج اردو زبان میں "نقالوں" کو چھوڑئیے۔ کتنے صحیح معنوں میں افسانہ نگار موجود ہیں۔ مگر کوئی افسانہ نگار اس طرف توجہ نہیں کرتا۔ کیوں؟ اس لئے کہ ہندوستانی ادیبوں کی رُوح ناقابلِ بیان حد تک مجروح مضمحل اور مفلوج ہو چکی ہے۔ نہ تو ان کے دماغ میں اتنی سکت رہی ہے کہ دنیا فضا اور ماحول کو دیکھکر یہ سوچنے اور سمجھنے کی کوشش کریں کہ یہ موقع کس قسم کے افسانے لکھنے کا ہے۔ اور نہ اُن کے قلم میں اتنی ہمت وجرأت ہے کہ وہ رومانی افسانوں کے بجائے انقلابی افسانے لکھیں یا لکھنے کی کسی کو دعوت دیں۔

میں۔ لیکن میں نے تو آج لکھا ہے۔

شبیر۔ خدا کرے کہ ایسا ہی ہو۔ مگر مجھے یقین نہیں آتا کیونکہ جب ہماری زبان کے افسانہ نویس عشقیہ افسانوں میں کوئی جدت اور تنوع نہیں پیدا کرسکتے۔ یا بغیر ادھر اُدھر جھانکے تاکے لقمہ نہیں توڑ سکتے۔ تو پھر تم طفلِ مکتب نے کب بغیر کسی مدد کے انقلابی افسانہ لکھا ہوگا؟

حسین۔ اگر ان کا یہ افسانہ کسی جگہ شائع ہوگیا تب تو آپ یہ مان لیں گے نا کہ افسانہ اچھا تھا؟

شبیر۔ استغفر اللہ۔ آج کل اردو افسانہ لکھنا اور اُس کا کہیں نہ کہیں چھپ جانا بھی کوئی بات ہے؟ آخر یہ اتنے افسانہ نویس جو پیدا ہوگئے ہیں وہ کیسے؟

میں۔ اچھا صاحب جانے دیجئے اس ناگوار بحث کو۔ میں نہیں چاہتا کہ ادبی بحث کے سلسلے میں کسی قسم سے باہمی مناقشت کی صورت اور ذاتیات کی بحث چھوڑ کر اردو کی بقاء و ترقی میں کسی طرح کی کوئی رُکاوٹ پیدا ہوجائے۔

شبیر۔ بے وقوف! یہ تو ذاتی خیال تھا جو صحافتی تذکرے کے سلسلے میں ظاہر کیا گیا۔ اس کے ذریعے نہ تو کہیں کی تنقیص و تفضیح مد نظر ہے نہ تحقیر و تذلیل۔ نہ کسی کا عیب نمایاں کرنا ہے۔ نہ اپنے بے عیب ہونے کا ثبوت پیش کرنا۔ نیز ؎

اپنے میں دیکھتا ہوں جو سو سو ہزار عیب
کس منہ سے دوسروں کو بھلا پھر بُرا کہوں

پھر باہمی منافشت کا کیا سوال؟ رہا تمہارا افسانہ تو اب میں اُسے ضرور سنوں گا۔ آخر دیکھوں تو سہی کہ تم نے اپنی چال چھوڑ کر جو ہنس کی چال اختیار کی ہے تو اس میں کہاں تک اس میں کامیابی ہوئی ہے۔

میں۔ (خوش ہو کر) اچھا تو سُنئے۔

"اساڑھ کا مہینہ تھا، اور اگرچہ تمازتِ آفتاب اپنی قاہرانہ طاقتوں سے زمین کو تانبے کا پتر بنا ڈالنے پر تلی ہوئی تھی۔ پھر بھی اِدھر اُدھر ابر کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے اکثر دوڑتے ہوئے نظر آجاتے تھے اور بدلیوں کے اِن چھوٹے چھوٹے تالابوں میں آفتاب کی سنہری کشتی اِس طرح غوطے کھا کھا کر اُبھرتی نظر آتی تھی جس طرح افلاس و غربت میں کسی شریف کی آبرو۔ مگر جب خود پیٹ میں آگ لگی ہو تو نہ کوئی دلفریب منظر آنکھوں کو روشنی اور دلوں کو حظ پہونچا سکتا ہے نہ کوئی آگ یا گرمی جسم کو نقصان۔ چنانچہ میں بھی اِن تکلفات سے بے نیاز ہو کر مزدوری کی تلاش میں دوپہر ڈھلتے ہی بستی کے اُس بڑے بازار کی طرف چل پڑا۔ جو آبادی سے بہت دور بستی کے ہجوم ہنگامہ کو لگا کرتا تھا۔ بازار کا راستہ بستی سے اُدھر ہو کر تھا۔ میں نے ایک راہگیر سے بازار کا راستہ دریافت کیا اور اس امید میں چل کھڑا ہوا کہ شاید وہاں کوئی کام مل جائے۔ راہ میں اکثر عمارتیں گری پڑی نظر آرہی تھیں۔ اور اُن کے بگڑے ہوئے نقشے بتا رہے تھے کہ کسی زمانہ میں یہ بستی امرا کی جگہ رہی ہوگی۔ بیچ بیچ میں اکثر چھوٹے چھوٹے مکانات بھی نظر آتے تھے۔ مگر وہ بھی کوئی اچھی حالت میں نہ تھے۔ میں چاروں طرف جھلسی ہوئی نظروں سے مکانوں کی ویرانی دیکھتا اور مکینوں کی گزشتہ عظمتوں کا دھندلا سا خاکہ تیار کرتا چلا جارہا تھا کہ اچانک میرے قدم رک گئے اور آنکھیں ایک خاص مقام پر جم کر رہ گئیں۔ سامنے ایک عالیشان قصر کا بگڑا ہوا نقشہ اپنے مکینوں کی خفتہ بختی کا نمونہ بنا ہوا اس طرح نظر آرہا تھا جس طرح کوئی قافلہ راستے سے بھٹک گیا ہو۔ اُس کی اُداسیاں زبانِ حال سے کہہ رہی ہیں کہ اگرچہ میرے مکین اب وہی ہیں جو پہلے تھے۔ لیکن آہ ایک مدت ہوئی کہ میں نے اُن کے وہ قہقہے نہیں سنے ہیں جو کبھی دن رات مجھ میں گونجا کرتے تھے۔ زمانہ ہوا کہ میری وہ چہل پہل ختم ہو گئی جو کبھی میری زیست کا باعث تھی۔ اور عرصہ ہوا کہ میرا سہاگ لٹ گیا جو کبھی کسی زمانہ میں ضرب المثل تھا۔ عظیم الشان قصر کی تمام بالائی منزل کے ساتھ ساتھ تمام چھتیں بھی نیچے پڑی تھیں۔ البتہ صرف وہ مقام کسی قدر محفوظ اور ثابت نظر آتا تھا جو زمانۂ عروج میں غلاموں کی جائے قیام رہا ہوگا۔ یہ ایک مختصر سا سائبان تھا جس کی دیواروں کی پپڑیاں چھوٹی ہوئی تھیں۔ سائبان میں ایک طرف مٹی کا چولہا رکھا تھا جس کی پھیکی راکھ اور سرد صورت صاف کہہ رہی تھی کہ میں نے کئی دن سے آگ کی صورت نہیں دیکھی۔ اور اب میرا دم نکلا ہی چاہتا ہے۔ آتشدان کے پاس ہی دیوار میں طاق تھا، اور طاق پر کڑوے تیل کا سویا ہوا سا مٹی کا چراغ رکھا تھا۔ اس شان سے کہ کہیں اُس پر تیل کا کوئی نشان نہ تھا۔ گویا چراغ ببانگِ دہل اس بات کا اعلان کر رہا تھا کہ مجھ میں کبھی بھی اتنا تیل نہیں پڑا جو چھلک کر باہر گرے اور اس کا نشان پایا جائے۔ مکان کے دیگر ساز و سامان میں دیوار سے لٹکی ہوئی ایک الگنی نظر آرہی تھی۔ جس پر یادگار آدم و حوا چند بوسیدہ کپڑے پڑے تھے ایک گوشہ میں تھوڑا سا پیال پڑا ہوا تھا جس پر دو ٹکڑے دری کے اور ایک صد پارہ شال رکھی تھی۔ دری کے ٹکڑے اور شال دونوں کے بگڑے ہوئے، مضمحل اور دھندلے نقش و نگار اس بات کے دعویدار تھے کہ پرانی چیزوں میں صرف ہم ہی دونوں ایسے ہیں جو اب تک حقِ رفاقت ادا کر رہے ہیں۔ سائبان کی دوسری جانب ایک ٹوٹی ہوئی بوریا پڑی تھی اور ایک شکستہ حال چوکی۔ چوکی پر ایک گدڑی میں لپٹی ہوئی عورت بیٹھی تھی۔ جس کے چہرے پر فاقے موجیں مار رہے تھے۔ پاس ہی زمین پر ایک چار سالہ خوبصورت بچہ مٹی کی چند چھوٹی چھوٹی ڈھیروں سے کھیل رہا تھا۔ بوریا پر فاقہ زدہ عورت کا مفلس شوہر، تہیدست اور کمھلائے ہوئے بچے کا بے روزگار باپ اور ویران دتباہ شدہ قصر عالی کا نادار والی سرنگوں بیٹھا ہوا شاید اپنی پامالی اور تیرہ بختی کا دل ہی دل میں جائزہ لے رہا تھا۔ اور اُس کی فاقہ زدہ سرد پیشانی پر اگرچہ اُس کے مضمحل دل کا دھواں چھایا ہوا تھا۔ پھر بھی اُس میں شرافت کی چنگاریاں غلطاں نظر آرہی تھیں اور جھک جھک کہہ رہی تھیں کہ یہ شریف فلاں اس وقت افلاس، فقر اور بے بسی کی اس منزل میں ہے جب چہرے کی آب اور

صبر کی تاب رختِ سفر باندھ لیتی ہے۔ یہ وہ کٹھن وقت ہے کہ اس وقت کوئی یار و مددگار نہیں رہتا۔ دوست تھکنے کا موقع نہیں دیتے۔ بیٹا باپ کا احترام ترک کر دیتا ہے اور خود شریکِ زندگی رُوح سے بیزار ہو جاتی ہے۔ نہ صرف یہی بلکہ کہ اپنے ہنر خود اپنی نظروں میں عیب نظر آنے لگتے ہیں۔ خود اپنا چہرہ ڈراؤنا، خود اپنی وضع رکیک، اور خود اپنا سچ جھوٹ نظر آنے لگتا ہے۔ یہ وہ وقت ہے جب زندگی زیر و زبر ہو جاتی ہے۔ شرافت دم توڑنے لگتی ہے۔ اور روح آمادۂ پیکار نظر آتی ہے۔ میرے مطالعے کا سلسلہ یہیں تک پہونچا تھا کہ ایک کنجڑا آم کا ٹوکرا سر پر رکھے بازار کی طرف جاتا ہوا نظر پڑا۔ معلوم نہیں کنجڑے کی آواز ہی ایسی پر درد تھی یا قصداً اُس نے آواز میں درد پیدا کر کے میرے نزدیک پہونچتے ہی "لے آم" کی ایک ایسی باٹ دار آواز لگائی کہ تمام فضا گونج اُٹھی۔ آم والے کی آواز سن کر کھیلوں میں بہلا ہوا بچہ یکایک اُچھل پڑا۔ اُس نے زور سے اس طرح سانس لی گویا اُس کی چھاتی پر ایک سِل سی رکھی ہوئی ہے۔ اس کے خوابیدہ احساسات جاگ اُٹھے مضمحل ولولوں میں جوش پیدا ہو گیا اور اگلی ضدیں یاد آگئیں۔ بچے نے مٹی کے ڈھیریوں سے اپنی معصوم اور التجا بھری نظریں ہٹا کر ماں کے چہرے پر ڈالیں۔ آم والے کی قہر توڑنے والی آواز اور اپنے بچے کی جھجکتی ہوئی نگاہیں تخت نشین عورت کی چشم و گوش سے بیک وقت متصادم ہوئیں۔ دماغ سُن سا ہو گیا۔ ہاتھ پیر بے جان سے ہو گئے اور ہوش حواس زائل سا ہوتا ہوا معلوم ہوا۔ عورت نے ایک نگاہِ یاس بچے پر ڈالی اور آنکھوں ہی آنکھوں میں کہہ دیا کہ۔ ع

"ہائے میرے لال! میرے پاس تو کچھ بھی نہیں"

ماں کی یاس آگیں نظریں دیکھتے ہی بچے کا دل چھن سے ٹوٹ گیا۔ اُس کی انگھڑیوں میں آم کی سرخی "خون" اور تخئیل میں آم کی مٹھاس "زہر" ہو کر رہ گئی۔ ہونٹ کانپنے لگے۔ ہاتھ مٹی کے ڈھیروں سے علیحدہ ہو گئے منہ میں زبان تھرانے لگی۔ دل بیٹھ گیا اور آم کا تصور مادی شکل اختیار کر کے آنسوؤں کی صورت میں ٹپ ٹپ گرنے لگا۔ بچے کی اِس دل ہلا دینے والی اشک ریزی نے "ماں" کے اوسان کھو دیئے۔ اُس کی آنکھوں سے آنسوؤں کا سیلاب اُمڈ آیا۔ اور وہ انتہائی بیچارگی سے شوہر کی طرف دیکھنے لگی۔ دونوں کی نظریں چار ہوئیں اور خود بخود جھک گئیں۔ اللہ اکبر! میری آنکھیں اِس دلفگار نظارہ کی تاب نہ لا سکیں، اور میرے قدم اُکھڑ گئے۔ میں بازار کی بجائے اپنے فرودگاہ کو لوٹا اور آتے ہی اپنے "جھلنگے" پر گر پڑا کہ یکایک نیند ٹوٹ گئی۔ دیکھا تو اپنی مکلّف چوکی پر دراز ہوں۔ اور دل دھڑک رہا ہے:

حسین۔ سبحان اللہ! کیا لاجواب افسانہ لکھا ہے۔ واللہ آپ نے تو کمال کر دیا۔

شبیر۔ (مسکرا کر) کیوں نہیں، بھائی! ایک تم کیا اس وقت اتنے جو افسانہ نگار پیدا ہو گئے ہیں اُن سب کا یہی حال ہے۔ مغربی ادبا کو تو چھوڑیئے، جب مشرقی اور زندہ جاوید نہیں بلکہ ٹیگور وغیرہ کے سے زندہ ادیبوں کے افکار اِس وقت افسانوی شکل میں پیش کئے جاتے ہیں تو پھر تم نے اگر جوش ملیح آبادی کی ایک مشہور نظم کو لفظ بہ لفظ نثر کر کے اپنے نام سے اور اپنی پرکھارت بتا کر سنا دیا تو کونسا گناہ کیا۔ رہی تمہاری محنت تو بیشک! ع

این کار از تو آید و مرداں چنیں کنند

شبیر صاحب کا یہ چُبھتا ہوا جملہ نشتر کا کام کر گیا۔ حسین ہکا بکا ہو کر میری طرف دیکھنے لگے۔ اور میں اپنی چوری فوراً پکڑی جانے پر یکایک اُچھل پڑا۔ آنکھ کھل گئی تو دیکھا کہ استغفر اللہ۔ نہ کوئی افسانہ ہے نہ کوئی شبیر، نہ کوئی حسین ہے اور نہ کوئی تسطیر۔ صرف شبیر حسین جوش ملیح آبادی کی کتاب "شعلہ و شبنم" بغل میں کھلی پڑی ہے جس کو دیکھتے دیکھتے میں سو گیا تھا۔

قطعہ

پیڑ جنگل کی گھنی شاخوں سے [illegible] ہیں

جھٹپٹے وقت [illegible]

سہ پہر [illegible] کی درازی کا غرور

جس طرح [illegible] بن جاتا ہے اک ناگ سیاہ

[illegible]

جوشؔ

اشتراکیت اور سرمایہ داری

اقبال نیازی

آج دولت و ثروت کا وہ طلسم جو گذشتہ صدی تک دنیا میں قائم تھا، ٹوٹ چکا ہے۔ کرۂ ارض کے گوشے گوشے سے سرمایہ داری کے خلاف آوازیں بلند ہو رہی ہیں۔ تمام دنیا پر روشن ہو چکا ہے کہ علوم و فنون کی ترقی اور ایجادات اور اختراعات کے اس سیلاب عظیم کو اس وقت تک انسانی ترقی سے تعبیر نہیں کیا جا سکتا۔ جب تک ان کا نتیجہ انفرادی عیش و کامرانی اور اجتماعی تباہی و بربادی ہے۔

اتنے مدارجِ ارتقاء طے کرنے کے بعد بھی اگر انسان کی خواہشات اُسی قدر خود غرضانہ ہیں جس قدر ہزاروں برس پہلے تھیں اور صدیوں کی ترقی کے باوجود بھی اگر انسانی دل و دماغ میں اجتماعی احساس پیدا نہیں ہوسکا تو پھر آج کل کے متمدن اور قرون اولیٰ کے غیر مہذب انسان میں کیا فرق رہ گیا۔ اگر دنیا آج بھی حسب سابق چند کے لئے خلدِ بریں اور باقی کے لئے جہنم زار بنی ہوئی ہے تو کیا اُس کی ترقی کو ترقی کہا جا سکتا ہے۔

صدیوں کے تجربے سے یہ بات واضح ہو چکی ہے کہ دنیا میں بدامنی اور مفلسی کا اصل باعث سرمایہ داری کی خود غرضانہ قارونی ذہنیت ہے چنانچہ وہی علوم و فنون جن سے استحکام سرمایہ داری کا کام لیا جا رہا تھا آج اس کے خلاف علم بغاوت بلند کئے ہوئے ہیں۔ لیکن اس عالمگیر بیداری کے باوصف ہندوستان میں بے روزگاری اور مفلسی کو مقدرات سے تعبیر کیا جا رہا ہے۔ اور ابھی تک رانڈوں کی طرح تقدیر کے دُکھڑے اور قسمت کے رونے روئے جا رہے ہیں۔ بالخصوص مسلمانوں میں یہ خیال عام ہے کہ رزق کا دینے والا خدا ہے۔ اور جس قدر اُس نے مقدر میں لکھدیا ہے وہ ضرور ملے گا۔ یہی خیال مسلمانوں کی قوتِ عمل کو مضمحل بنائے ہوئے ہے۔ اسی کی وجہ سے اُنھوں نے کبھی آج تک رزق نہ ملنے کی وجہ پر غور نہیں کیا۔ وہ تقدیر پر تکیہ لگائے ہاتھ پر ہاتھ رکھے بیٹھے رہے۔

دراصل خدا کو رازق ٹھیرانے سے مقصد انسانی اخلاق کو بلند کرنا تھا۔ دنیا کے کاروبار کا مالک و مختار ہر چند انسان ہی ہے۔ لیکن بانیانِ مذہب نے یہ خیال کرتے ہوئے کہ مبادا روٹی کے لئے (جس کا ہر شخص برابر کا حقدار ہے) انسان اپنے ہم جنسوں کے سامنے نہ جھکے اور اس طرح پست ہمتی کا ثبوت نہ دے، یہ اعلان کیا تھا کہ رزق کا دینے والا خدا ہے۔ اور اس کے لئے کوشش کرنا انسان کا فرض ہے۔ مدعا یہ تھا کہ درسِ اخلاق کے ساتھ ساتھ دعوتِ عمل بھی دی جائے۔ دنیا دارالعمل ہے۔ اس میں محنت لازمی ہے۔ ہر شخص بلا کسی امتیاز کے محنت کرے، اور معاش حاصل کرے۔ یہ تھا اشتراکیت کا سب سے بڑا اصول جو اسلام نے چودہ سو برس پہلے بتا دیا تھا۔ افسوس ہے کہ اسی مذہب کے پیرو جس نے محنت کو فرض قرار دے کر دنیا کو پیغامِ عمل دیا۔ آج خدا کے رازق ہونے کی آڑ میں سست اور کاہل زندگی بسر کر رہے ہیں۔

زمانہ کی ترقی نئی نئی صورتیں پیدا کر رہی ہے۔ لیکن ہمارے دماغوں میں ابھی تک عہدِ طفلی کے خیالات جاگزیں ہیں۔ ہم اسی خیال میں ہیں کہ جن داروں کے تحت ہم زندگی بسر کر رہے ہیں وہ موسم یا آب و ہوا کی طرح قدرتی ہیں۔

ہمیشہ سے ایسے ہی ہیں اور ہمیشہ اسی طرح رہیں گے۔ ہماری خستہ حالی کی وجہ ہماری یہی ناواقفیت ہے۔ ہمارے ملک میں (Civic Sense) کی کمی تعلیمی کمی سے بھی بڑھی ہوئی ہے۔ یعنی ہمارا تعلیم یافتہ طبقہ بھی غلط فہمیوں کا شکار ہے۔ اور اس کی وجہ ہماری ناقص تعلیم ہے۔ جو غیر ملکی حکومت اپنے استحکام کے لئے دے رہی ہے۔ اگر آج ہمیں اپنے افلاس کی اصل وجہ معلوم ہو جائے تو ہندوستان میں فرانس سے بھی زیادہ شدید انقلاب برپا ہو۔

اس دورِ ترقی میں اقوامِ عالم خیالاتِ خام اور روایاتِ کہن کو پامال کرتی ہوئی ارتقا کے سدرۃ المنتہیٰ تک پہونچ چکی ہیں۔ لیکن ہم عرصۂ دراز سے ایک ہی حالت پر قائم ہیں۔ اس جمود کی وجہ ہماری جہالت اور سیاسیات کی طرف سے غفلت شعاری ہے۔ ہم ہنوز اسی خیال میں کہ ملکی سیاسیات کا ہماری زندگی پر کوئی اثر نہیں پڑتا اور سیاسیات بیکاروں کا شغل ہے۔ اس سے وہی لوگ دلچسپی رکھ سکتے ہیں جن کے گھر میں کھانے کو کافی ہے۔

ہمارے ذہن میں سیاسیات کا تخیل ممالکِ غیر سے رابطۂ اتحاد قائم کرنے اور ملکی درآمد و برآمد کے مسائل حل کرنے کے سوا کچھ نہیں۔ ہم سمجھتے ہیں کہ اس کا اثر کسی قدر ملک کی اجتماعی زندگی پر پڑتا ہے۔ افراد کی انفرادی زندگی سے اُسے دور کا بھی واسطہ نہیں۔ اسی غلط فہمی کے باعث آج سرمایہ داروں کا طبقہ میدانِ سیاست میں پیش پیش نظر آتا ہے۔ یہاں تک کہ مجالسِ آئین ساز میں عمال کی نمائندگی سرمایہ دار کر رہے ہیں۔ پھر ایسی صورت ۔ ۔ ۔ ۔ میں کیا ہمارے عوام کی حالت ناگفتہ بہ ہونا تعجبات سے ہے۔

مالیات کے متعلق ہر ایک نیا قانون کسی نہ کسی جیب سے روپیہ لے لیتا اور کسی نہ کسی کو دیدیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ الیکشن میں کھڑے ہونے والے نئے قوانین بنوانے یا پرانے قوانین بدلوانے کے وعدے کیا کرتے ہیں۔ ہمیں چاہیئے کہ ملکی سیاسیات کا بغور مطالعہ کریں اور ہر سیاسی مسئلہ کے متعلق اپنی ایک مستقل رائے رکھیں۔ نظام حکومت یا قوانین میں جن تبدیلیوں کی ہم ضرورت محسوس کرتے ہیں اُن کے لئے ہمیں مجالس قانون ساز اور پبلک میں کوشش کرنی چاہیئے۔ کیونکہ جس طرح مفید قوانین کی موافقت کرنا اور اُن کو بخوشی و جبراً تسلیم کرنا ایک اچھے شہری کا فرض ہے،

اسی طرح غیر مفید قوانین کے خلاف آواز بلند کرنا بھی اس کا اخلاقی فرض ہے۔

مالیات میں سب سے اہم مسئلہ ملکی دولت کی تقسیم کا ہے۔ ہماری زندگی پر سب سے زیادہ اثر ہماری مالی حالت کا پڑتا ہے۔ چنانچہ ملکی دولت کی تقسیم کے متعلق ہماری خود ایک رائے ہونی چاہیئے۔ ہمیں غور کرنا چاہیئے کہ آیا موجودہ تقسیم درست ہے یا نہیں۔ اگر نہیں تو دوسری تقسیم رائج ہونی چاہیئے۔

ہمارے زیرِ غور یہ مسئلہ نہیں کہ ملکی دولت تقسیم ہونی چاہیئے یا نہیں۔ کیونکہ ملک کی دولت ہر وقت تقسیم ہو رہی ہے اور ہوتی رہے گی۔ جب تک دو آدمی آپس میں تقسیم کرنے کے لئے موجود ہیں۔

کوئی شخص تقدیر کی وجہ سے امیر یا غریب نہیں بنتا بلکہ حکومت، جس کے ہاتھ میں ملکی آمدنی ہے وہ اُسے اس طرح تقسیم کر رہی ہے کہ ایک آدمی کو دس ہزار سالانہ ملتا ہے اور دس کو زندہ رہنے کے لئے روٹی۔ ہم اپنی ناواقفیت کی وجہ سے یہ خیال کرتے ہیں کہ اول الذکر کی تقدیر اچھی ہے اور آخر الذکر دس آدمیوں کا مقدر خراب ہے۔

موجودہ حکومت کے زیرِ اثر ایک محنتی آدمی دس روپیہ پاتا ہے اور کاہل دس ہزار۔ اگر محنتی آدمی کاہل رئیس کے دس ہزار میں سے دس بھی لے لے تو پولس اُسے مجبور کرے گی کہ وہ دس روپیہ معہ ہرجانے کے داخل کرے۔ کیونکہ قانون یہی کہتا ہے کہ کاہل آدمی کا حصہ دس ہزار روپے اور محنتی جفاکش کا دس روپے ہے۔ یعنی ہمارے ملک میں روپے کی تقسیم کا کوئی خاص انتظام نہیں۔ جو شخص جس قدر چاہے رکھ سکتا ہے۔

تقسیم دولت کی اس اندھیر نگری کے خلاف عام بیزاری پھیلی ہوئی ہے اور ہر شخص سوائے ان کے جو اس سے فائدہ اُٹھا رہے ہیں اس بدنظمی کا مخالف نظر آتا ہے۔ ایسے شخص جو اس کے حامی ہیں اور اس سے فائدہ اُٹھا رہے ہیں صرف پانچ فی صدی ہیں۔ لیکن ایک بڑی تعداد ایسے احمقوں کی ہے جو اپنے دماغ سے کام نہیں لیتے اور ہر چند خرابیاں دیکھتے ہیں۔ مگر تبدیلیوں کے جھگڑوں میں پڑنا نہیں چاہتے۔ ہمیں چاہیئے کہ ان قدامت پرستوں کو ان کے حال پر چھوڑیں جیسا عقلمند لوگ زمانہ سابق سے کرتے آئے ہیں۔ کیونکہ احمق ہر زمانہ میں موجود رہتے۔

دولت اور تقسیم دولت پر بحث کرنے سے پہلے ہمیں اس پر غور کرنا چاہیئے۔

کہ دولت آتی کہاں سے ہے۔ دولت اصل میں نتیجہ ہے محنت کا۔ محنت کرنے کے بعد جو کچھ ہمیں حاصل ہوتا ہے اُسے دولت کہتے ہیں۔ خواہ وہ اشیائے خوردنی کی شکل میں ہو خواہ روپیہ کی۔ کوئی شخص بغیر دولت کے زندہ نہیں رہ سکتا۔ اور دولت بغیر محنت کے حاصل نہیں ہو سکتی۔ تو معلوم ہوا کہ بغیر محنت کے زندگی بسر نہیں کی جا سکتی۔ اس دنیا میں قدرت نے ہم پر محنت فرض قرار دی ہے۔ اگر ہمارے بچے محنت نہیں کرتے تو اُن کے لئے ہمیں محنت کرنی پڑتی ہے۔ جب یہ بات ثابت ہو چکی کہ محنت ضروری ہے اور دولت محنت کا نتیجہ ہے تو ضروری ہوا کہ اس کی تقسیم بھی اسی طرح کی جائے جس طرح دولت کی۔

ایک آدمی اگر کم و بیش بارہ گھنٹے محنت کرے تو اتنا کما سکتا ہے کہ اس کے تمام اخراجات پورے ہونے پر بھی اس کے پاس کچھ نہ کچھ بچ جائے اگر ایسا نہ ہو تو بوڑھے اور بچے کس طرح زندہ رہ سکتے ہیں جو اپنی گزراں کے لئے دوسرے کے دست نگر ہوتے ہیں۔

آج کل مشینوں کی وجہ سے محنت میں بچت ہو گئی ہے محنت کی اس بچت سے فرصت حاصل ہوتی ہے۔ ظلم ہو گا اگر ہم ایجادات کا فائدہ مزدور کو نہ اٹھانے دیں اور اس سے حسب سابق محنت لیں۔

اشتراکیت یا اجتماعیت ایک اسکیم ہے ملک کی محنت دولت اور فرصت کی تقسیم کی۔ آپ خود غور کیجئے کہ ملک کی محنت دولت اور فرصت کس طرح تقسیم ہونی چاہئیں۔ ممکن ہے کہ جو راہِ عمل آپ بنائیں وہ زیادہ مفید ہو۔

محنت دولت اور فرصت کو تقسیم کرتے وقت بہتر ہو گا اگر آپ اپنا اپنے عزیزوں اور دوستوں کا خیال ذہن سے ذرا سی دیر کے لئے دور کر دیں۔ ورنہ ممکن ہے کہ آپ کسی صحیح نتیجہ پر نہ پہونچ سکیں۔ کیونکہ تقسیم کرتے وقت اگر کسی ایک کو آپ زیادہ دیدیں گے تو کسی دوسرے کو کم دینا پڑے گا۔

ہمارے سامنے اس وقت ملکی محنت دولت اور فرصت کی تقسیم کا مسئلہ ہے جو بیحد اہم ہونے کے ساتھ ساتھ از حد دشوار بھی ہے اتنے دشوار مسئلہ کے متعلق یہ نہیں کہا جا سکتا کہ ہم عمیق غور و فکر کے بعد بھی کوئی قطعی فیصلہ کر سکیں گے جو بالکل درست ہو گا۔ پھر بھی ہمیں بہتر سے بہتر رائے پیش کرنی چاہئے۔

ہم جو اسکیم اس وقت پیش کریں گے اُسے اشتراکی اسکیم کہتے ہیں۔

اشتراکیت یا اجتماعیت ہمارے لئے نئی اصطلاحیں ہیں حالانکہ انھیں کے اصولوں پر ہم اپنے گھروں میں عمل کرتے ہیں۔ ایک شخص روپیہ کماتا ہے اور اپنی بیوی کو لاکر دیدیتا ہے۔ بیوی اس کو سب پر مساوی طور پر خرچ کرتی ہے۔ اس کے علاوہ ہر چھوٹے بڑے شہر میں اجتماعیت کے اصول پر عمل کیا جاتا ہے۔ مثلاً ہر شخص شہر کی صفائی، روشنی، سڑکوں کی مرمت اور پولس وغیرہ کے لئے ایک ٹیکس ادا کرتا ہے۔ اور ان چیزوں سے مساوی طور پر مستفیض ہوتا ہے۔

کیا آپ نے کبھی اس پر غور کیا ہے کہ اشتراکیت یا اجتماعیت محض ادیبوں کی خیالی دنیا کے نقش و نگار ہونے کی بجائے بیحد مفید اصولوں پر مبنی ہیں۔ جن پر روس میں نہایت کامیابی سے عملدرآمد ہو رہا ہے۔

اجتماعیت ہی ترقی کا اصل معیار ہے جس ملک کا تمدن جس حد تک ترقی یافتہ ہو گا وہاں اسی حد تک اجتماعیت زیادہ ہو گی۔

اگر سڑکوں اور پلوں سے گزرنے کے لئے ٹیکس مقرر کر دیا جائے تو کس قدر دقتیں پیش آئیں۔ اس وقت ہم سڑکوں اور پلوں سے بے روک ٹوک گزرنے کے عادی ہیں اور جس طرح ہم اور دوسری باتوں کے متعلق جن کے ہم عادی ہیں کبھی غور نہیں کرتے۔ اسی طرح سڑکوں اور پلوں کے متعلق بھی ہم کبھی نہیں سوچتے کہ یہ کس کے روپیہ سے تیار کئے جاتے ہیں۔ بلکہ بعض لوگ تو بچوں کی طرح یہ خیال کرتے ہیں کہ سڑکیں اور پل قدرتی ہیں اور ہمیشہ سے اسی طرح ہیں۔ لیکن اگر پلوں کو گرنے دیا جائے اور ہمیں نالوں اور ندیوں کو عبور کرنے کا انتظام خود کرنا پڑے تو ہمیں معلوم ہو کہ اشتراکیت کس قدر مفید اور ضروری ہے اور بہتر ہو اگر دنیا کی ہر چیز اس کے تحت آ جائے۔ خصوصاً روٹی کہ جس کی ہر شخص کو یکساں طور پر ضرورت ہے۔ لیکن اجتماعی صرف انھیں اداروں یا چیزوں کو بنایا جاتا ہے جن کی ضرورت ہر شخص محسوس کرتا ہے یا جو ہر شخص کے لئے مفید ہیں۔ یا جن کے متعلق اختلاف آرا نہیں ہے۔ مثلاً سڑکیں۔ ریل۔ پولس۔ فوج وغیرہ۔ لیکن وہ چیزیں جن کی ہر شخص کو ضرورت نہیں یا جن کو ہر شخص ضروری نہیں خیال کرتا۔ اجتماعیت کے زیر اثر نہیں لائی جا سکتیں۔ مثلاً عبادتگاہوں

کو لیجئے اگر اُن کا انتظام اسی روپیہ سے کیا جائے جو پبلک سے بذریعہ ٹیکس وصول کیا جاتا ہے تو بہت سے لوگ معترض ہوں گے کیونکہ اکثر لوگ معبدوں کو غیر ضروری خیال کرتے ہیں۔ لیکن ساتھ ہی ایسے لوگ بھی ملیں گے (اگرچہ انکی تعداد تعلیمی ترقی کے ساتھ ساتھ کم ہوتی جا رہی ہے) جو ان اوہام پرستی کے اڈوں کے قیام کے لئے مصر ہیں۔ اسی طرح اور بہت سے دوسرے مسائل کے متعلق اختلاف آرا ہونا ممکن ہے۔ مثال کے طور پر تفریحی چیزوں کو لیجئے اب ہر شخص کا مذاق دوسرے سے جداگانہ پائیں گے۔ اگر ہم چند آدمیوں سے یہ پوچھیں کہ تم تحفہ کے طور پر کیا چیز لینی قبول کروگے تو ہر شخص اپنے مذاق کے مطابق بتائے گا۔

بعض چیزیں ایسی ہیں کہ گو ہر شخص اُن سے فائدہ نہیں اُٹھاتا لیکن ان کی ضرورت کو ضرور محسوس کرتا ہے۔ مثلاً عجائب خانہ۔ کمپنی باغ۔ لائبریری وغیرہ۔ ان چیزوں کا وجود تہذیب و تمدن کی نشانی سمجھی جاتی ہے اور ہم سب کا یہ خیال ہے کہ یہ چیزیں ضروری ہیں۔ لیکن ہم میں سے بہت ایسے ہیں جو یہ نہیں جانتے کہ اُن کے قیام کے لئے ہم گورنمنٹ کو ٹیکس ادا کرتے ہیں بلکہ یہ سمجھتے ہیں کہ گورنمنٹ نے عام افادہ کے لئے یہ چیزیں تعمیر کرائی ہیں۔ اس طرح ہم اجتماعیت سے بغیر اُسے سمجھے فائدہ اُٹھاتے ہیں۔

ہم اگر پکچر گیلری یا لائبریری میں بغیر کچھ دیئے داخل ہو جاتے ہیں تو اس کے یہ معنی نہیں کہ یہ عمارتیں سڑک کے کنارے زمین سے خود بخود اُبھر آئی ہیں۔ جن سے ہر شخص فائدہ اُٹھا سکتا ہے۔ یا گورنمنٹ نے اُنھیں اپنے پاس سے تعمیر کرایا ہے۔ گورنمنٹ کے پاس روپیہ کہاں سے آیا، اس کے پاس کوئی دفینہ نہیں بلکہ وہ ہمیں سے بذریعہ ٹیکس روپیہ وصول کرتی ہے اور ان کاموں پر صرف کرتی ہے جو سب کے لئے مفید ہیں۔

غریب سے غریب آدمی جو سڑکوں پر سو کر ہاؤس ٹیکس سے بچ جاتا ہے جب کوئی چیز کھانے کی خریدتا ہے تو گورنمنٹ کو ٹیکس ادا کرتا ہے اگر اس غریب کو یہ معلوم ہو جائے کہ کھانے کا سامان خریدتے وقت وہ لائبریرین کی تنخواہ کے لئے کچھ دیتا ہے تو وہ سخت برہم ہو۔ لیکن وہ اپنی ناواقفیت کی وجہ سے مطلوبہ خوردنی اشیا کی گرانی کی وجہ امساک باراں خیال کرتا ہے۔ اس سے پتہ چلا کہ ہم اجتماعیت سے بے خبر ہیں۔ لیکن اس سے فائدہ اُٹھا رہے ہیں۔ ہمارے سامنے جب کوئی اشتراکیت یا اجتماعیت کا نام لیتا ہے تو ہم یہ سمجھتے ہیں کہ یہ ایک خیالی اسکیم ہے جو حاسد مفلسوں نے اُمرا کو برباد کرنے کے لئے بنائی ہے۔ اور جس پر کبھی عمل درآمد نہیں ہو سکتا ہم اپنی ناواقفیت کی وجہ سے یہ نہیں سمجھتے کہ اجتماعیت کے بہت سے اصولوں پر عمل ہو رہا ہے اور ہم اس سے مستفیض ہو رہے ہیں۔

لیکن جیسا پہلے عرض کیا جا چکا ہے اجتماعیت کے تحت وہی ادارے یا چیزیں لائی جا سکتی ہیں جن سے ہر شخص فائدہ اُٹھاتا ہے یا جن کے متعلق اختلاف رائے نہیں ہے۔ جن چیزوں کے مفید ہونے کے متعلق رایوں میں اختلاف ہے انھیں ہمیں شخصی قوتِ فیصلہ پر چھوڑنا پڑے گا۔ یعنی ہمیں لوگوں کو روپیہ دینا پڑے گا۔ تاکہ روپیہ سے لوگ ان چیزوں کو حاصل کر سکیں جن کو وہ اپنے لئے ضروری سمجھتے ہیں۔

روپیہ دنیا کی بہترین ایجاد ہے۔ جتنی آسانیاں اس کے ذریعہ سے پیدا ہوئی ہیں اور جتنی ترقی تہذیب و تمدن کو اُس نے دی ہے اتنی کسی ایجاد نے نہیں دی۔ دنیا کی ہر ایجاد کسی بہتر ایجاد کی وجہ سے بیکار ہو سکتی ہے۔ لیکن روپیہ ہمیشہ اسی طرح جاری رہے گا۔ کیونکہ اس سے بہتر کسی دوسری ایجاد کی توقع نہیں۔ روپیہ کی جب ہم ضرورت محسوس کرتے ہیں اور یہ خیال کرتے ہیں کہ روپیہ کو بدستور جاری رکھنا پڑے گا تو اس کی تقسیم کا سوال درپیش ہوتا ہے۔

تقسیم کے وقت کن اصولوں کو مدنظر رکھا جائے؟ یہ سوال زیرِ غور ہے۔ ذیل میں روپیہ کی تقسیم سات ممکن طریقوں سے کی جاتی ہے۔

تقسیم کی سب سے پہلی اسکیم یہ ہے کہ جو جس قدر پیدا کرے اُسے اُسی قدر ملنا چاہیئے۔ ایک حد تک یہ بات معقول معلوم ہوتی ہے لیکن مشکل یہ ہے کہ بہت سے لوگ محنت کرتے ہیں لیکن پیدا کچھ نہیں کرتے۔ مثلاً ایک شخص ایک باغ کے گرد دیوار تعمیر کرتا ہے۔ وہ ایک چیز بناتا ہے جسے ہر شخص دیکھ سکتا ہے۔ لیکن دوسرا شخص باغ میں شور مچا کر جانوروں کو پھل کھانے سے باز رکھتا ہے۔ کیا وہ اپنی محنت سے کچھ پیدا کرتا ہے یا اپنی محنت دکھا سکتا ہے۔ باغ کے لئے جس حد تک دیوار ضرور تھی اسی حد تک اس آدمی کا شور و غل بھی۔ اس اسکیم میں ایسی ہی اور بھی بہت سے خامیاں ہیں جنھیں دیکھکر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اسکیم ناکامیاب رہے گی۔ اس اسکیم میں یہ ممکن ہے کہ ہم روپیہ کو وقت کی مقدار کے مطابق دیں۔

لیکن اس صورت میں یہ دقت پیش آتی ہے کہ مختلف پیشے کے لوگوں میں تقسیم کس طرح کی جائے۔ کیا ایک ڈاکٹر کو، اور ایک معمولی مزدور کو ایک ہی وقت کا یکساں معاوضہ دیا جائے۔ علاوہ ازیں ایک ہی پیشے کے لوگوں میں بھی بعض کم اجرت لیتے ہیں اور بعض زائد۔ آپ یہ کہیں گے کہ درحقیقت ایک ہوشیار ڈاکٹر کا ایک گھنٹہ ایک معمولی ڈاکٹر کے گھنٹہ سے زیادہ قیمتی ہے۔ لیکن جب آپ سے یہ سوال کیا جائے گا کہ کس قدر تو آپ صحیح جواب نہ دے سکیں گے۔

دوسری اسکیم دولت کی تقسیم کی یہ ہے کہ ہر شخص کو اس قدر ملنا چاہیئے جس قدر کہ وہ مستحق ہے۔ اس کے متعلق اکثر لوگ اور خصوصاً وہ جو فارغ البال ہیں یہ کہیں گے کہ آج کل یہی ہو رہا ہے کہ محنتی ایماندار اور نیک چلن لوگ خوشحال ہیں۔ اور کاہل، بدمعاش اور بے ایمان مفلس ہیں۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ بعض کمزوریاں انسان کو مفلس اور نادار بنا دیتی ہیں۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ بعض دوسری کمزوریاں مالدار بنا دیتی ہیں۔ مثلاً کنجوسی۔ خودغرضی۔ چالبازی وغیرہ برخلاف اس کے فیاض نیک نیت اور دوست پرست لوگ ہمیشہ تنگ دستی کی زندگی بسر کرتے ہیں۔ اس زمانہ میں ذاتی خوبیوں کو روپیہ کی تقسیم سے کوئی تعلق نہیں بلکہ بعض لوگ امیر پیدا ہوتے ہیں۔ اور بعض غریب (عموماً) اس کے معنی یہ ہوئے کہ قبل اس کے کہ ہمارا کوئی کیرکٹر ہو، ہم امیر یا غریب بن جاتے ہیں۔ اس لئے اگر یہ کہا جائے کہ موجودہ تقسیم ذاتی خوبیوں کی بنا پر ہے تو قطعاً غلط ہوگا۔ ممکن ہے آپ یہ کہیں کہ اگر نہیں ہے تو ہونی چاہیئے۔ یعنی دولت کی تقسیم میں کیرکٹر کی خوبیوں کا لحاظ رکھنا چاہیئے لیکن یہ بات قطعی ناممکنات سے ہے۔ سب سے بڑا اعتراض تو اس اسکیم پر یہ ہوگا کہ انسانی خوبیاں روپیہ میں تولی جانا ناممکن ہیں۔ اس کے علاوہ تقسیم کے وقت کن خوبیوں کا ہمیں زیادہ لحاظ رکھنا چاہیئے، اور کیوں؟ اور ان خوبیوں کے لئے روپیہ کی کیا تعداد مقرر کرنی چاہیئے۔ نیز یہ کہ ہم لوگوں میں برائیاں اور خوبیاں کس طرح معلوم کر سکتے ہیں۔ خوبیوں کے لحاظ سے تقسیم ناکام رہتی ہے۔ اب آیئے برائیوں پر غور کریں۔ فرض کیجئے کہ ایک شخص جھوٹی قسمیں بہت کھاتا ہے۔ اور کبھی کبھی شراب بھی پی لیتا ہے۔ اس کے برخلاف ایک پادری نہایت متقی اور پرہیزگار ہے لیکن ساتھ ہی ریاکار بھی ہے۔ اب آپ فیصلہ کیجئے کہ جھوٹی قسمیں کھانے والے اور ریاکار پادری میں تقسیم کا کیا تناسب رکھا جائے۔ یقیناً کبھی بھی کوئی قطعی فیصلہ نہ ہو سکے گا۔ جسے ہر شخص تسلیم کر سکے۔ کیونکہ ہم بعض برائیوں کو بہت زیادہ برا سمجھتے ہیں اور بعض کو کم۔ ریاکاری چونکہ آج کل عام ہے، اس لئے زیادہ برا نہیں سمجھا جاتا۔ بہ نسبت دوسری برائیوں کے غرضیکہ ذاتی خوبیوں یا برائیوں کی بنا پر تقسیم قطعی ناکام رہے گی کیونکہ ہر شخص برابر حیثیت رکھتا ہے۔

تیسری اسکیم یہ ہے کہ جو شخص جس قدر حاصل کر سکے کرے، اور جتنا روپیہ چاہے رکھے۔ گورنمنٹ کوئی مداخلت نہ کرے گی۔

تقسیم دولت جیسے اہم مسئلہ میں گورنمنٹ کی عدم مداخلت اور بےتعلقی نہایت حیرت ناک ہے۔ یہ عجیب بات ہے کہ اس دور ترقی میں بھی ہماری تہذیب کے بعض پہلو زمانۂ قدیم کے تمدن سے مطابقت رکھتے ہیں یعنی جس طرح زمانۂ سابق میں قاعدہ تھا کہ طاقت ور کمزور سے خراج حاصل کرتا تھا۔ طاقتور کو حق حاصل تھا کہ کمزور کو دبا کر اس کے مال پر دست تطاول دراز کرے۔ اسی طرح دور حاضر میں بھی چالاک آدمی کو حق حاصل ہے کہ وہ اپنی چالبازی کو کام میں لاکر معمولی ذہانت کے لوگوں کو جس طرح چاہے فریب دے۔ اور جتنا چاہے ٹھگے۔ عہد قدیم اور دور جدید میں فرق صرف اتنا رہ جاتا ہے کہ اس زمانہ میں لوٹ و غارتگری کے پرانے طریقے متروک و منسوخ قرار دیئے گئے ہیں یعنی ایک دوکاندار کے لئے آپ کی جیب کاٹنا ممنوع ہے۔ لیکن وہ آپ سے ایک چیز کی قیمت اس کی اصل قیمت سے پانچ گنی وصول کر سکتا ہے۔ آپ کا کرایہ سکاندار مکان کا کرایہ بڑھا کر آپ کی جیب کاٹ سکتا ہے جب منشا روپیہ رکھنے اور جس قدر چاہے بے ایمانی کرنے کی اس کھلی آزادی نے دولت جمع کرنے کی ہوس ہر شخص میں پیدا کر دی ہے۔ تقریباً ہر متنفس کی یہی خواہش ہے کہ وہ جس طرح ممکن ہو سکے دولت حاصل کرے اور اس زرپرستی اور ساہوکارانہ ذہنیت کی خرابیاں اظہر من الشمس ہیں۔

تقسیم دولت کی چوتھی اسکیم یہ ہے کہ دس آدمیوں میں سے ایک آدمی کو بلامحنت کئے روپیہ دے دیا جائے اور باقی نو آدمیوں سے اس آدمی کے بدلے کی محنت لی جائے اور اس محنت کے معاوضہ میں ان نو

آدمیوں کو صرف اس قدر دیا جائے کہ وہ زندہ رہ سکیں۔ یعنی دوسرے الفاظ میں یوں سمجھ لیجئے کہ ان ۹ آدمیوں کو زندہ رہنے کے لئے اس وجہ سے نہیں دیا جاتا کہ زندہ رہنے کا انھیں بھی بحیثیت انسان حق حاصل ہے۔ بلکہ اس لئے دیا جاتا ہے کہ یہ اس دسویں آدمی کے خصہ کی محنت کریں اور اپنی محنت سے اس کی عیاشی کے لئے روپیہ فراہم کریں۔ یہ اسکیم وہ ہے جس پر آج کل عمل ہو رہا ہے۔ اس اسکیم کا فائدہ یہ بتایا جاتا ہے کہ اس کی بدولت ہمارے ملک میں امرا کی ایک جماعت موجود ہے جو اپنے آپ کو اعلیٰ تعلیم دلا کر ملک کا انتظام کرتی ہے۔ آرٹ اور سائنس کو ترقی دیتی ہے۔ تہذیب و تمدن کو قائم رکھتی ہے اور اپنی شان و شوکت سے عوام کو مرعوب رکھتی ہے۔ سب سے بڑا فائدہ اس اسکیم کا یہ بتایا جاتا ہے کہ اس طرح ۹ آدمیوں کو کم دے کر ہم ایک آدمی کو سرمایہ اکٹھا کرنے کا موقع دیتے ہیں۔ جو ریلوں اور سڑکوں وغیرہ کی تعمیر کے لئے سخت ضروری ہے۔ اگر سرمایہ نہ ہو تو نہ صرف ریلوں اور سڑکوں کی تعمیر بند ہو جائے بلکہ آرٹ اور سائنس بھی فنا ہو جائیں۔ اگر ہم اس روپیہ کو جو امرا کو دیا جاتا برابر سب پر تقسیم کر دیں تو غریبوں کی حالت کچھ بہتر ہو جائے۔ لیکن ملک میں سرمایہ کا نام بھی باقی نہ رہے۔

فی الحقیقت تہذیب و تمدن کے مٹنے اور تمام آبادی کے ایک متوسط طبقہ میں تبدیل ہونے سے تو یہی بہتر معلوم ہوتا ہے کہ چند آدمیوں کو امیر رہنے دیا جائے اور باقی اُن کے لئے محنت کرتے رہیں۔

لیکن اس اسکیم میں اس قدر خرابیاں ہیں کہ آج دنیا اس سے تنگ آچکی ہے۔ سب سے پہلا اعتراض تو اس اسکیم پر یہ ہوتا ہے کہ ایک آدمی کو ہم نو آدمیوں کی محنت دے دیتے ہیں۔ لیکن اس کی ضمانت نہیں لیتے کہ یہ اس محنت یا بالفاظِ دیگر دولت کو ہمارے حسبِ منشا صرف کرے وہ جس طرح چاہے اور جہاں چاہے اس دولت کو صرف کر سکتا ہے۔ ہم اسے کس طرح مجبور کر سکتے ہیں۔ ملکی معاملات میں بھی امرا اسی فرعونیت کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ جو اُن کی زندگی کے دوسرے شعبوں کی طرۂ امتیاز ہے۔ وہ برسرِ اقتدار ہو کر اپنی طاقت کو دولت حاصل کرنے میں صرف کرتے ہیں۔ وہ عیش پرستی میں زیادہ دولت خرچ کرتے ہیں۔ اور آرٹ اور سائنس کے لئے بہت کم روپیہ دیتے ہیں۔ بلکہ تعلیم کو اپنا اقتدار قائم رکھنے کے لئے خراب کر دیتے ہیں تاکہ بہتر دماغ پیدا نہ ہو سکیں۔ ان سب خرابیوں کے باوجود بھی یہ کہا جاتا ہے کہ اگر دولت سب پر تقسیم کر دی گئی تو اپنے اخراجات پورے ہونے کے بعد کسی کے پاس اس قدر روپیہ نہ پہنچے گا وہ اُسے جمع کر سکے۔ لہٰذا سرمایہ جس سے بڑے پیمانہ پر کاروبار ہوتا ہے مفقود ہو جائے گا۔ اس کے متعلق یہ عرض کیا جائے گا کہ کروڑوں انسانوں کو اس لئے بھوکا رکھنا کہ چند آدمیوں کو اربوں دیدیا جائے تاکہ وہ عیاشی کر سکیں اور مشینیں بنوا سکیں کون سی عقلمندی ہے۔

سرمایہ کے متعلق ہم آئندہ بحث کریں گے اور بتائیں گے کہ کن ذرائع سے سرمایہ حاصل ہو سکتا ہے۔ یہاں صرف اس قدر عرض کر دینا کافی ہے کہ گورنمنٹ عوام کے ذاتی اخراجات کو گھٹا کر سرمایہ حاصل کر سکتی ہے اور وہ اس سرمایہ کو یقیناً بہتر طور پر صرف کرے گی بہ نسبت ان عیاش رؤسا کے۔

دولت کی تقسیم کی پانچویں اسکیم یہ ہے کہ ہر شخص کو اگرچہ کام کرنا چاہئے۔ لیکن معاشرہ (سوسائٹی) کو اتنی جماعتوں میں منقسم ہونا چاہئے جتنے کے پیشے ہیں۔ اور مختلف جماعتوں کو مختلف مشاہرے ملنے چاہئیں۔ مثلاً خاکروب۔ خانساماں اور شاگرد پیشہ وغیرہ کو ڈاکٹر، معلم وکیل سے کم ملنا چاہئے، اور ڈاکٹر، معلم وغیرہ کو ججوں، مشیروں اور ایلچیوں سے کم۔ آپ یہ فرمائیں گے کہ آج کل یہی ہو رہا ہے۔ لیکن فرق یہ ہے کہ کوئی قانونی پابندی نہیں کہ جس کی وجہ سے اس نظام کے خلاف مثال ملنی مشکل ہو۔ آج کل بہت سے قابل آدمی مفلس ہیں اور بہت سے معمولی لیاقت کے لوگ مالدار۔

آپ کو اس غلط فہمی کو دل سے نکال دینا چاہئے (اگر آپ اس میں مبتلا ہیں۔ اگر نہیں تو میں اس بدگمانی کی معافی چاہتا ہوں) کہ بعض آدمیوں کو زندگی بسر کرنے کے لئے زیادہ روپیہ کی ضرورت ہے۔ جتنی خوراک مزدور کی ہے اسی قدر ایک کروڑپتی کی۔ اگر آپ کسی شخص کی آمدنی کو دگنا کر دیں تو اس کی خوراک دگنی نہیں ہو جائے گی۔ پھر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ہم بعض آدمیوں کو زیادہ کیوں دیتے ہیں اور بعض کو کم کیوں۔ اس کا جواب یہ ہے کہ وہ خود حاصل کر لیتے ہیں۔ کیونکہ تقسیم کا کوئی خاص انتظام نہیں ہے۔ لیکن بعض عہدے داروں کو ہم زیادہ تنخواہیں دیتے ہیں اس لئے کہ ان کی شان و شوکت سے عوام پر ان کا رعب رہے۔ لیکن تجربہ یہ بتاتا ہے کہ دبدبہ اور رعب کا انحصار آمدنی پر نہیں ہے۔ کروڑپتی لوگ ڈیلر

اور رولس رائس میں ایک معمولی سپاہی کا حکم مانتے ہیں۔

چھٹی تجویز تقسیم کے بارے میں یہ ہے کہ حالات کو ان کے حال پر چھوڑ دیا جائے۔ حمقاً کا گروہ اس کی موافقت میں ہے۔ کیونکہ وہ تبدیلیوں سے گھبراتے ہیں۔ لیکن تبدیلیاں ہونی لازمی ہیں۔ حالات کبھی بھی ایک حالت پر قائم نہیں۔ انسان کی ذہنیت ہمیشہ بدلتی رہتی ہے۔ ملکی انتظام کے متعلق انسان کی ذہنیت میں گزشتہ ایک صدی سے حیرتناک انقلاب ہوا ہے۔

اس زمانہ میں بجلی اور دیگر ایجادات کی بدولت اتنی سہولتیں ہو گئی ہیں کہ ہم اپنا کام آدھے دن میں ختم کر سکتے ہیں اور باقی آدھا دن آرٹ اور سائنس کے مطالعہ میں صرف کر سکتے ہیں۔ لیکن دولت کی غلط تقسیم کی وجہ سے روپیہ ایک خاص طبقہ میں چلا گیا۔ اور ایجادات کی وجہ سے بے روزگاری بڑھ گئی۔ چنانچہ ایک ایسی تعداد پیدا ہو گئی کہ جس کے پاس نہ تو روپیہ ہے اور نہ روزگار ہے۔ یہ نتیجہ ہے حالات کی طرف سے آنکھیں بند کرنے کا، اور واقعات کو اُن کے حال پر چھوڑنے کا۔

ہم نے اشتراکی اسکیم کے علاوہ چھ اسکیموں پر غور کیا۔ پیشتر اس سے کہ آپ کے سامنے اشتراکی نظریہ پیش کیا جائے۔ یہ بہتر معلوم ہوتا ہے کہ ان اسکیموں کا جائزہ لیا جائے جو بیان کی جا چکی ہیں۔

ہم نے دیکھا کہ ذاتی خوبیوں کے اعتبار سے تقسیم کامیاب نہیں ہوتی۔ کیرکٹر کے لحاظ سے بھی تقسیم ناکام رہتی ہے۔ پیداوار کے لحاظ سے بھی تقسیم فیل ہو جاتی ہے۔ جب ہم محنت اور روپیہ میں تناسب قائم کرنا چاہتے ہیں تو بھی ہم ناکام رہتے ہیں۔ اور جب تنگ آکر حالات کو ان کے حال پر چھوڑ دیتے ہیں تو صورتِ حال بد سے بدتر ہو جاتی ہے۔

اس لئے اب یہ غور کیجئے کہ کونسی اسکیم مفید اور قابلِ عمل ہو سکتی ہے۔ آپ فرمائیں گے کہ وہی جو مفلسی کو مفقود کر دے۔ اچھا آیئے اب غور کریں کہ مفلسی کیا ہے اور اس کے کیا اسباب ہیں۔

(باقی)

مجھے معلوم نہ تھا

غیر ممکن بھی ہے ممکن، مجھے معلوم نہ تھا
ایک روز آئے گا یہ دن، مجھے معلوم نہ تھا

اور کچھ میں ترے ظاہر سے سمجھتا تھا تجھے
اور کچھ ہے ترا باطن، مجھے معلوم نہ تھا

اپنے دامانِ تصنع میں چھپا سکتے ہیں
اِن معائب کو محاسن، مجھے معلوم نہ تھا

دشمنوں کے لئے مخصوص ہے جو طرزِ عمل
دوستوں سے بھی ہے ممکن، مجھے معلوم نہ تھا

خبثِ باطن کے گلے تھے مجھے اک کافر سے
جب یہ حالِ دلِ مومن، مجھے معلوم نہ تھا

آہ، ہو سکتی ہے بیداد مائل وہ نظر
جو ہو الطاف کی ضامن، مجھے معلوم نہ تھا

عمر بھر صبر نہ آئے گا مجھے جس کے بغیر
چین پائے گا وہ مجھ بن، مجھے معلوم نہ تھا

باہمہ گرمیٔ دل نبضِ محبت اک دن
ہو کے رہ جائے گی ساکن، مجھے معلوم نہ تھا

آہ اِس عمرِ محبت میں کبھی اے بسملؔ
ایک روز آئے گا اک دن مجھے معلوم نہ تھا

بسملؔ سعیدی ہاشمی

سبق آموز آزادی

قاضی زاہد علی بلہوری

اگر حسن کی کوئی انتہا ہے۔ اگر رعنائیاں کہیں ختم ہوتی ہیں۔ اگر خوبصورتی کسی جگہ اختتام پذیر ہوتی ہے تو وہ ہے نسیم لاج۔ اس وقت اس سے زیادہ حسین ہوجاتا سامری کے سحر یا خلیل کے گلزار سے بڑھ جانا ہے۔ قدرت کے خزینۂ لطیف کا سارا حسن شاید ان سُرخ وسفید پھولوں کو دیدیا گیا ہے جو اس کوٹھی کو اپنی آغوش میں لئے ہوئے ہیں۔

بچوں کی معصومیت۔ بزرگوں کی سنجیدگی، اور دوشیزہ لڑکیوں کی قہقہہ نوازیاں ان تمام چیزوں کو سورج کی تھرتھراتی کرنیں بڑھ بڑھ کر اپنی آغوش میں لے لینا چاہتی ہیں۔ لیکن جتنا ہی وہ بڑھنا چاہتی ہیں، اتنا ہی گھٹتی جا رہی ہیں۔

شمیم کا نتیجہ آگیا تھا۔ اُس نے ایم اے فرسٹ ڈویژن میں پاس کرلیا تھا جس کی خوشی میں اس کے باپ نسیم نے اپنے اعزا اور آس پاس کے زمینداروں کو دعوت دی۔ شمیم باغ کے ایک پُرفضا گوشے میں بیٹھا ہوا ممتاز سے باتیں کر رہا تھا۔

ممتاز بھی شمیم کی طرح ایک زمیندار کا لڑکا تھا۔ ان دونوں خاندانوں میں کافی ربط وضبط اور رسم و راہ تھی۔ پھر اب تو یہ ایک دوسرے کے اور بھی قریب ہونے والے تھے۔ کیونکہ ممتاز کی بہن فہمیدہ شمیم کی بیوی بننے والی تھی۔ ممتاز کا اصرار تھا کہ وہ کل واپس چلا جائے گا۔ شمیم کی ضد تھی کہ ابھی وہ ہفتہ بھر اس کے ساتھ رہے گا۔ آخر شمیم نے اپنے الفاظ پر زور دیتے ہوئے کہا "آپ کیوں مجھے مٹی کے ان دس پانچ گھروں کے درمیان اکیلا چھوڑ دینا چاہتے ہیں۔ میں یہاں چھٹیوں میں کیا خاک اُڑاؤں گا؟" اگر خاک اُڑانا نہیں چاہتے تو میرے ساتھ چلو۔ کام کرو۔ لیکن کام ہے بڑا سخت۔ ان مٹی کے گھروں کو سونا بنانا پڑے گا" ممتاز نے جواب دیا۔

"میں اس کا مطلب نہیں سمجھا"

"میرا مطلب ہے کہ آپ میرے ساتھ مل کر کانگرس کا کام کیجئے۔ گاؤں گاؤں پھرئیے۔ ان ظلم سے کچلے ہوئے انسانوں میں رُوح پھونکئے۔ ان کو بتائیے کہ آزادی سر بفلک عمارتوں میں رہنے والوں اور پُرتکلف کھانا کھانے والوں کے یہاں نہیں۔ بلکہ ان ٹوٹی ہوئی جھونپڑیوں کے مکینوں اور گرد آلود چہرے والوں کے قدموں پر لوٹتی ہے" ممتاز یہیں تک کہنے پایا تھا کہ شمیم نے کہا، "بس بس رہنے دیجئے۔ معلوم ہوگیا کہ آپ بھی ان تازہ واردانِ بساطِ جنون میں سے ہیں" شمیم نے ہنستے ہوئے کہا۔

"آپ یہ مہاشے کب سے بن گئے ہیں"

"شمیم مجھے افسوس ہے کہ تمہارا سا تعلیم یافتہ انسان بھی جاہلوں کی طرح ان باتوں کا مضحکہ اُڑا رہا ہے۔ لیکن خیر رسول کو بھی لوگ پہلے جاہل اور پاگل ہی سمجھتے تھے۔ شمیم کیا تم کو ذرا سی بھی ذلت محسوس نہیں ہوتی کہ یہ مٹھی بھر سفید انسان تمہاری روحوں کو مجروح اور تمہاری گردنوں کو کچلے دے رہے ہیں۔ اور تم کہ زمین پر پڑے ہوئے ایک شکست خوردہ انسان کی طرح کہہ رہے ہو۔ ہم ہیں عمرؓ و خالدؓ کی اولادیں۔ ہم ہیں شیواجی اور پرتاب کے سپوت۔ اف تم آزادی کی دلنوازیوں کا تصور بھی نہیں کرسکتے" ممتاز خاموش ہوگیا۔ شمیم بھی اب سنجیدہ ہو چکا تھا۔

"میں ان آزادی پکارنے والوں میں سے نہیں جو رام راج کے

خواب دیکھ رہے ہیں۔ ایسا خواب جو کبھی شرمندۂ تعبیر ہی نہ ہوسکے گا۔ ممتاز جانتے ہو آزادی نام ہے اس جگہ کا جہاں خونِ مسلم نے گلکاریاں کی ہیں۔ پھر ہم سے زیادہ اور کون آزادی چاہے گا۔ لیکن ہم ایسی آزادی نہیں چاہتے جو ہم سے ہمارا مذہب۔ معاشرت اور زبان سب کچھ چھین لے۔ ممتاز بتاؤ کیا کانگرس ایسی ہی آزادی نہیں چاہتے جو ہم سے ہمارا مذہب۔ معاشرت اور زبان سب کچھ چھین لے۔ ممتاز بتاؤ کیا کانگرس ایسی ہی آزادی نہیں چاہتی ہے؟"

"شمیم کانگرس کو بدنام ڈکرو۔ بزدل سپاہی ہوا میں تلوار چلا کر اور ڈینگیں مار کر ہی بہادر بننا چاہتا ہے۔ شمیم بتاؤ کانگرس نے ایک کیا ایک ہزار مرتبہ یہ نہیں کہا ہے کہ اقلیتوں کے سارے حقوق خواہ وہ معاشری ہوں یا تمدنی۔ مذہبی ہوں یا اقتصادی پوری پوری طرح محفوظ ہیں۔ تم ان کو صرف زبانی جمع خرچ کہدوگے۔ لیکن اب اگر کوئی نیم کو املی ہی کہے جائے۔ تو اس کا کیا علاج۔ میں تم سے پوچھتا ہوں ان لیڈروں نے کہ جو اپنے کو آزادی کا سب سے بڑا علمبردار۔ وقت کا سب سے بڑا قائد۔ حال کا بہترین مدبر اور ساتھ ہی ساتھ مذہب و زبان کا جاں نثار محافظ سمجھتے ہیں، کیا کیا، سوائے اس کے کہ آزادی کی راہ کو اور بھی خاردار بنا دیا شمیم ٹھنڈے دل سے غور کرو۔ نازک گدّوں کو مسلنے والے مٹیلی زمین کی تاب لاسکیں گے؟ زرلبفت و کمخواب کو تار تار کرنے والے اُلجھے ہوئے دھاگوں کو برداشت کرسکیں گے۔ مرغ و ماہی کی لذت جاننے والے سوکھے ہوئے ٹکڑوں کو ہضم کرسکیں گے؟ شمیم بتاؤ عطر و عنبر کی جاں بخشیاں دیکھے ہوئے ہل اور ٹھیلہ سے نکلے ہوئے پسینہ کی بُو سونگھ سکیں گے؟ وہ ہرگز ایسا نہ کرسکیں گے۔ وہ جو کچھ کر رہے ہیں یا جو کچھ تم کو نظر آرہا ہے، سحر سا[illegible] سے زیادہ نہیں۔ اس زرنگاری کے پیچھے جو کچھ ہے وہ تار[illegible] تاریکی ہے۔ جس میں بھونکوں کی چیخیں اور کیڑوں کی دھ[illegible] کچھ بھی نہیں۔"

"ممتاز صاحب میں اس تقریر کی دا[illegible] بغیر نہیں رہ سکتا۔ کانگرس کی یہ رحمت ضرور ہے کہ اُس نے [illegible] بہترین بنا دیا لیکن خیر اب آپ وہ بھی سُن لیجئے جس سے [illegible] ناآشنا ہیں۔ کانگرس آپ کے مطابق [illegible] مرحوا اصولِ جمہوریت پر قائم ہے۔ لیکن کیا یہ اصولِ جمہوریت ہے کہ ایک شخصیت کے آگے سرِتسلیم خم کردیا جائے۔ میں پوچھتا ہوں کیا یہ مسولینی اور ہٹلر آمرانہ اصول نہیں کہ گاندھی کا ہر اشارہ کانگرس کا اولین فرض بن کر رہ جاتا ہے۔

مدراس میں ہندی کے لازمی قرار دینے کو آپ کیا کہیں گے۔ کیونکہ اسے آپ مہاسبھائیت تو کہہ نہ سکیں گے۔

کانگرس مسلمانوں کے لئے چیخ رہی ہے۔ لیکن اُس نے چند ناانصافیوں کے سوا جسے اس نے قومیت اور ترقی کے پردہ میں چھپا دیا کوئی فراخ دلی دکھائی ہے۔

کانگرس آئین کو پارہ پارہ کردینے کا دعویٰ کرتی ہے۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ وہ اسے کس خوبی سے چلا رہی ہے۔ اُس نے اس سے تعاون کرلیا جس سے اُسے دست و گریباں ہونا تھا۔ میں پوچھتا ہوں کہ کیا یہی شاہراہِ آزادی ہے؟ اگر ہے تو میں نہیں جانتا کہ بجھے ہوئے کوئلوں میں کیسے شرارے ہوتے ہیں۔" شمیم یہیں تک کہنے پایا تھا کہ ملازم آیا۔ اُس نے کہا کہ سب لوگ کھانے پر بیٹھ گئے ہیں۔ یہ دونوں بھی اُٹھ کر چلے گئے اور یہ پُرلطف بحث ختم ہوگئی۔

ممتاز دوسرے دن واپس چلا گیا اور شمیم اکیلا رہ گیا۔ اس کا سلوا وقت مطالعۂ کتب یا سیر شکار میں صرف ہوتا تھا۔ کبھی اِدھر اُدھر نزدیک کے گاؤں میں زمینداروں سے ملنے چلا جاتا تھا۔ اس [illegible] وہ دیہات میں حاصل ہی کیا کرسکتا تھا۔

ایک [illegible] سے نکلا۔ گاؤں کے پاس ہی [illegible] ہی۔ جس میں علی الصباح گاؤں کی عورتیں پانی [illegible] جاتی تھیں شمیم اتفاقیہ ادھر ہی چلا آیا۔ ابھی پوری طرح صبح نہیں ہوئی تھی بلکہ یہ معلوم ہو رہا تھا کہ کوئی بہت تکلف کے ساتھ تاریکی پر رنگ کا ڈل رہا ہے۔ نسیم کی شاہد نوازیاں ایک ہلکی سی سرسراہٹ پیدا کرتے ہوئے لہروں کو مرتعش کرتی ہوئی نکل جاتی تھیں۔ شمیم ندی کے کنارے کھڑے ہوکر قدرت کی عریانیوں سے لطف اندوز ہونے لگا۔ پاؤں کی ایک ہلکی سی چاپ نے اس کی توجہ اپنی طرف کرلی۔ اس نے دیکھا کثیف سی چادر میں لپٹا ہوا ایک مجسمۂ رنگ و بُو، جو ایک گھڑا لئے ہوئے ندی کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اس کے گھنگھروؤں کی ہلکی سی آواز نے شمیم کی روح کو لرزا دیا۔ اس نے دیکھا اور

دیکھتا ہی رہا حتیٰ کہ وہاں ندی کے خاموش ترنم کے سوا کچھ بھی نہ رہ گیا۔ "زہرہ کی ساری رعنائیاں پھر ایک دفعہ فانی وجود میں منتقل ہوگئیں۔ اُف صبح کی ساری سباحتیں، ایک مجسمۂ ملیح بن کر میرے سامنے سے گزر گئیں۔ آہ اس کے گھنگرو کی موسیقی میرے سازِ ہستی کے تار تار کو توڑ گئی"۔ یہ تھے حامد کے تاثرات، اس کے دماغ کو پراگندہ کئے ہوئے تھے۔ اُس نے ایک ٹھنڈی سانس لیکر کہا "کاش وہ میری طرف ایک نگاہ ڈال دیتی۔ صرف ایک غلط انداز نگاہ ڈال دیتی"۔ وہ کچھ دیر یہاں کھڑا ہوا۔ اس قسم کے خیالات کا آماجگاہ بنا رہا۔ پھر جب سورج کی کرنیں ذرا تیز ہوگئیں تو وہ ایک لٹے ہوئے سوداگر کی طرح گھر واپس آیا۔

اب شمیم روز علی الصباح ندی کے کنارے جاتا۔ کچھ دیر انتظار کرتا کہ وہی سراپا ناز، حسن و رنگ کی ایک سکر آفریں دنیا لئے ہوئے آتی۔ اسی شانِ استغنا سے آتی اور پانی بھر کر چلی جاتی۔ شمیم نے اس کے متعلق ساری تحقیقات کرلی تھی۔ اُس نے معلوم کرلیا تھا کہ وہ بڈھی مالتی کی نواسی چمپا تھی جو کچھ دن کے لئے اپنی نانی کے پاس آئی تھی۔

شمیم اس کی سرد مہری سے تنگ آچکا تھا۔ "اگر حسن اتنا ہی بے پروا ہے تو وہ کتنا خراب ہے"۔ کبھی وہ کہنے لگتا۔ آخر اس نے چمپا کو چھیڑنا ہی شروع کیا۔ کبھی کنکریاں پھینکتا۔ کبھی ایک آدھ بات کہدیتا۔ ایک دن تو وہ بالکل اس کے قریب پہونچ گیا۔ چمپا گھڑا بھرے ہوئے آرہی تھی کہ شمیم اس کے سامنے کھڑا ہوگیا، وہ کانپنے لگی، شمیم نے بے اختیار اس کا ایک ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔ اُس نے "چمپا" ہی کہا تھا کہ گھڑا زمین پر آرہا۔ سارا پانی بہ گیا۔ چمپا جھینک گئی۔ شمیم نے ہاتھ چھوڑ دیا۔ لیکن اس نے دیکھا چمپا کی آنکھوں سے آنسو نکل کر بالوں میں غائب ہوگئے۔ تھوڑی دیر وہ کانپتی رہی۔ پھر اُس نے اوپر نگاہ کی۔ "اُف بھگی ہوئی آگ سے شرارے نکل رہے تھے"۔ "اگر میں بھی آپ کی طرح ہوتی تو بتاتی، ایسے برتاؤ کا کیا جواب ہے، لیکن آہ میں غریب ہوں"۔ اس کا چہرہ دہکتے ہوئے انگارے کی طرح ہو رہا تھا، اور بادہ فشانی کرنے والی آنکھیں شعلہ فشانی کر رہی تھیں: "میں غریب ہوں اور غریبوں کی آبرو امیروں کے کھیلنے کے لئے ہوتی ہے۔ ظالموں کی ہوس پوری کرنے کے لئے سمجھی جاتی ہے۔ اے کاش میں ان خون چوسنے والوں کو بتاسکتی کہ غریبوں کا کتنا ہولناک انتقام ہوتا ہے۔ لیکن اُف

میں نہیں کرسکتی۔ میں ــــ میں مظلوم ہوں اور تم ــــ تم ظالم"۔ وہ غصہ میں آگے بڑھ گئی۔ شمیم کو ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے اس کے کانوں میں پگھلا ہوا سیسہ ڈالا جارہا ہے۔ وہ وہیں کا وہیں کھڑا رہا۔ جیسے کسی نے اُسے جامد کردیا ہو۔ جب اُس نے منہ پھیر کے دیکھا تو چمپا جاچکی تھی۔ وہ ایک عجیب بیخودی کے سے عالم میں گھر واپس آیا۔ اور اپنے کمرے میں ایک چارپائی پر گر پڑا۔ "وہ کہتی تھی وہ غریب ہے، میں امیر ہوں، اور اسی لئے میں اس کی آبرو لینا چاہتا ہوں۔ لیکن میں تو اس سے محبت کرتا ہوں۔ محبت کیسی محبت؟ میں تو اُس سے مل جانا چاہتا تھا۔ میں نے اُس کا ہاتھ پکڑ لیا تھا۔ لیکن میں نے کتنی محبت سے اُس کا ہاتھ پکڑا تھا۔ صرف ہاتھ ہی تو پکڑا تھا، پھر کیا؟ لیکن ہاتھ پکڑنے کے بعد میں کیا کرنا چاہتا تھا؟ اُف کچھ بھی نہیں۔ کچھ نہیں۔ ارے میرے خدا کچھ بھی نہیں۔ میں تو اس سے محبت کرتا تھا؟" اس نے اپنا منہ بھینچ کر ہاتھوں سے چھپا لیا۔ اُس کا دماغ سُن ہوگیا۔ لیکن اُسے ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے اس میں کوئی انگارے بھر رہا ہے۔ تھوڑی دیر تک وہ اک عجیب اضطرابی کیفیت میں لیٹا رہا۔ پھر اُس نے کہنا شروع کیا: "میں نے اُس کا راستہ روک لیا تھا۔ میں نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا تھا۔ کیوں؟ میں نے ایسا کیوں کیا؟ مجھکو کیا حق حاصل تھا؟ پھر اگر وہ میرے منہ پر طمانچہ ماردیتی۔ وہ غریب تھی۔ اُس نے جوش سے ملی ہوئی کس مایوسی سے کہا تھا۔ اے کاش میں ان خون چوسنے والوں کو بتاسکتی کہ غریبوں کا کتنا ہولناک انتقام ہوتا ہے۔ "انتقام" ہولناک انتقام"۔ وہ مجھ سے لیگی، کیسے لیگی؟ اُس نے کہا تھا "میں مظلوم ہوں اور تم ظالم" میں ظالم۔ میں نے اُس کا ہاتھ پکڑ لیا اس لئے کہ میں پکڑ سکتا تھا۔ وہ مظلوم۔ وہ اپنا ہاتھ چھڑا نہ سکی۔ اس لئے کہ وہ چھڑا نہ سکتی تھی۔ وہ غریب جس کا ہاتھ پکڑ لیا گیا۔ میں امیر جس نے ہاتھ پکڑ لیا۔ میں امیر تھا۔ میں امیر تھا، اُف میں امیر تھا۔ میں امیر نہ رہوں گا"۔ تلاطم انگیز جذبات نے ایک لمحہ کے لئے اسے پھر چپ کردیا۔ لیکن تھوڑی دیر کے بعد اُس نے پھر کہا "چمپا کہتی تھی کہ غریبوں کی آبرو امیروں کے کھیلنے کے لئے ہوتی ہے۔ اچھا اے غریبوں کی آبرو سے کھیلنے والے انسان اب یہ کھیل جان کی بازی پر کھیلا جائے گا۔ میں ہر غریب عورت کو چمپا بنادوں گا۔ اور پھر ہر چمپا امیروں کو وہی جواب دے گی جو میری چمپا نے دیا"۔ شمیم اسی طرح کہتا رہا، حتیٰ کہ اس پر غنودگی طاری ہوگئی۔ پھر جب

وہ اُٹھا تو گوشت پوست کا وہی امتزاج تھا۔ لیکن روح بدل چکی تھی۔

اب شمیم گاؤں گاؤں پھرتا۔ کسانوں کے بڑے بڑے جلسوں میں تقریریں کرتا۔ اُن کی وذلت دکھاتا۔ اور پھر اُنھیں آزادی کے لئے ایک تڑپتی ہوئی روح دیدیتا۔ اُنھیں اتحاد کی تلقین کرتا۔ آس پاس کے سینکڑوں گاؤں کو اُس نے گوندھے ہوئے ہار کی طرح کر دیا۔ اس اتحاد کی بدولت اُس نے بڑے بڑے خودسر زمینداروں کے سروں کو نیچا کر دیا۔ اور اُن کے تمام ظلم وجبر کو مفقود کر دیا۔ ہر گاؤں میں اُس نے چھوٹے چھوٹے مدرسے اور پنچایتیں قائم کیں۔

ممتاز شمیم کی اس تبدیلی کو معجزہ سمجھتا تھا۔ اُس نے اپنے گاؤں میں ایک جلسہ کا انتظام کیا۔ اور شمیم کو تقریر کرنے کی دعوت دی۔ شمیم کا نام سنکر دور دور سے سینکڑوں کسان آئے۔ شمیم نے تقریر کی۔ تقریر کیا کر رہا تھا، خون کے قطرے ٹپکا رہا تھا۔ اس نے ہندوستان کی مفلسی کا اتنا صحیح خاکہ کھینچا کہ ہزاروں کی آنکھوں سے آنسو نکل پڑے۔ پھر اس نے یہ بھی بتایا کہ اگر وہ ایک دوسرے کو بھائی بھائی سمجھنے لگیں۔ ہندو مسلم اور مذہب کی آڑ میں ذاتی اغراض پوری کرنے کے بجائے خلوص دل سے کام کرنے لگیں تو یہ ساری مصیبتیں کافور ہو جائیں گی۔

اُس نے اپنی تقریر کو ختم کرتے ہوئے کہا "بھائیو! آزادی میرے پاس نہیں۔ گاندھی کے پاس نہیں۔ کانگرس کے پاس نہیں۔ دیکھو آزادی [illegible]ن ہے، ان موتیوں میں ہے جو پسینہ کی بوند بن کر تمھاری پیشانی سے ٹپک رہے ہیں"۔ جلسہ زندہ باد کے نعروں میں ختم ہو گیا۔ اور شمیم ممتاز کے ساتھ اُس کے گھر چلا آیا۔

دوسرے دن علی الصباح شمیم باغ میں ٹہلنے چلا گیا۔ اس کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب اُس نے دیکھا کہ تھوڑے فاصلہ پر چمپا پھول چن رہی ہے۔ جب شمیم نے پہلی مرتبہ دیکھا تھا تو وہ چھاؤں میں ہیرا تھی، لیکن اس وقت تو وہ آفتاب میں ہیرا معلوم ہو رہی تھی۔ وہ ایک ہلکی سُرخ ریشمی ساری پہنے ہوئے تھی۔ جو ہوا میں لہرا رہی تھی۔ شمیم بیتابانہ آگے بڑھ گیا۔ اور اس کے پاس پہونچ کر حیرت زا لہجہ میں کہا "چمپا" اُس نے مڑ کر دیکھا اور پھر خوفزدہ ہو کر پیچھے ہٹ گئی۔ "چمپا! تم یہاں کہاں؟" شمیم نے پھر کہا۔ اُس نے بے انتہا آہستگی سے کہا "میں ممتاز کی بہن فہمیدہ ہوں"۔ شمیم حیرت واستعجاب کا مجسمہ بن کر رہ گیا۔

"فہمیدہ! لیکن چمپا! مجھ سے غلطی ہوئی۔ معاف فرمائیے۔" کہتا ہوا وہ مڑا۔ وہ گھوما ہی تھا کہ ایک قہقہہ کی آواز اُس کے کانوں میں آئی۔ اُس نے مڑ مڑ کر دیکھا۔ لڑکی کا سر اٹھا ہوا تھا اور وہ ہنس رہی تھی۔ اُس نے آگے بڑھتے ہوئے کہا "میرا نام چمپا بھی ہے"۔ مسکراتے ہوئے اُس نے اپنی آنکھیں شمیم کی آنکھوں میں ڈال دیں۔ وہ بالکل اُس کے قریب آ گئی۔ اس نے اپنا سر شمیم کے شانہ پر ڈال دیا۔ "شمیم میں چمپا بھی ہوں وہی بوڑھی ماتی والی چمپا۔ فہمیدہ چمپا ہو گئی تھی شمیم"۔ شمیم نے انتہائے مسرت میں فہمیدہ کو گود میں اُٹھا لیا۔ "لیکن ایسا کیوں کیا؟"

"شمیم تم کو یاد ہو گا کہ ایک دن بھائی جان اور تم ملکی حالت پر بحث کر رہے تھے۔ تم نے بھائی جان کا مذاق اُڑایا تھا۔ میں یہ سب سن رہی تھی۔ میں نے سوچا کہ تم عملی طور پر دیکھ لو، امیر غریبوں پر کتنا ظلم کرتے ہیں۔ میں نے چمپا بنکر ایک تودۂ خاک کو جس میں شرارے تھے حرکت دے دی اور بس"۔

ممکن ہے کہ چلتی ہوئی آندھی بھی رک جائے
ممکن ہے کہ گرتی ہوئی بجلی بھی رک جائے
لیکن یہ محال ہے کہ جوشِ غم سے
آنکھوں سے امنڈتی ہوئی ندی بھی رک جا[ئے]

(رشیدہ بیگم ہما)

اب بھی ترے ارمان نکل سکتے ہیں
سب رنج مسرت میں بدل سکتے ہیں
مایوس نہ ہو اے دلِ ناشاد ذرا
غم تاب سے غنچے بھی ابھی کھل سکتے ہیں

(رشیدہ بیگم ہما)

وطن پرستی کا غلط استعمال

سید ہادی حسین جعفری بی اے

یہ عالمِ نقش و نگار جب سے صورت پذیر ہوا ہے اس میں انسان، درندے اور اِن کے علاوہ ذی روح اپنے مزاج اور ضروریات کی حیثیت سے تلاشِ مقام میں کوشاں رہے ہیں۔ انسان اپنی حکمتِ عملی اور ذہنی کمال کی وجہ سے ہمیشہ ان اہلِ زندگی اور مخلوقِ خدا سے آگے رہا ہے۔ چرند اور پرندنے تو اپنے آپ کو انسانی عقل کا ایک ادنیٰ سا شکار سمجھکر جنگلات اور پہاڑوں کے سایہ میں اپنی بود و باش کا سامان ہمیشہ ہمیشہ کے لئے مہیا کر لیا۔ انسانی آبادی میں بیفکری اور بے نیازی سے رہنا ان بندگانِ فطرت کو موت کا منظر نظر آتا ہے۔ اس لئے ابتدائے زمانہ سے یہ امر مسلمہ ثابت ہو گیا کہ بہترین اور عمدہ مقامات انسان کے لئے وقف ہو جائیں۔ لہٰذا یہ حقیقت خوب روشن ہے کہ دنیاوی اور قدرتی دولت اس اشرف المخلوقات یعنی انسان کے آرام اور بہبود کا ذریعہ ہیں۔ اور یقینِ کامل ہے کہ صورت گرِ عالم کو بھی یہی بات بھلی لگی ہو گی کہ اس مجموعۂ عناصر کو اس کائنات کا کلی اختیار دیدیا جائے تاکہ وہ اپنی شمعِ عقل کے ذریعے سے اس دنیائے راز کا ہر ذرہ معلوم کر سکے۔ اُس کو اجازت ہے کہ وہ سینۂ زمین چاک کر کے اپنی رفیقۂ حیات کی آرائش کے لئے نہایت قیمتی اور چمکدار معدنیات برآمد کرے اور پھر اِن کو اپنے خود ساختہ ذریعوں سے صاف اور صیقل کر کے اپنی زینتِ پہلو کے بدن کو دیدہ زیب اور حسین بنائے۔ انسان اپنے ہر فعل کا اختیار رکھتا ہے۔ اگر وہ چاہے تو فطرت کی ہر قوت کو اپنے قبضے میں کر لے اور پھر اس فتح کے بعد اپنی جائے قیام کو فردوس کا نمونہ بنائے۔ پانی سے بجلی پیدا کر کے بھیانک رات کو ایک نہایت خوشگوار چیز میں تبدیل کر دے۔ انسان نقاشِ ازل کی ایک معجز نما صنعت ہے۔ اس وجود میں خالق نے وہ قوتیں جمع کر دی ہیں کہ اگر یہ فطرت کا شاہکار اِن کا استعمال پوری قابلیت اور اعتدال سے کرے تو مہر و پروین اُس کی ایک جست میں اُس کے اسیر ہو جائیں۔ شک کو اس مقام پر بالکل دخل نہیں۔ وجہ نہایت سادہ اور عیاں ہے۔ انیسویں صدی کے انسانی کمالات اور کارہائے بلند سے قطعِ نظر موجودہ صدی نے کائناتِ انسان میں ایک عجیب اور نمایاں تبدیلی دیکھی۔ ریڈیو اس حقیقت کا بڑا آئینہ دار ہے۔ ذرا اس ناپائدار ہستی یعنی انسان کی تاب و تواں تو ملاحظہ فرمائیے کہ ایک دنیا کی آواز دوسری دنیا میں کس آسانی سے منتقل کر دیتا ہے۔ یہ پہلے عرض کر چکا ہوں کہ انسان میں ہر قوت جو عالم کی کسی چھوٹی یا بڑی چیز میں پوشیدہ ہے نظر آتی ہے۔

انسان میں ایک اور خاصہ بھی موجود ہے جو ایک نقصان دہ چیز ہے۔ اگر اِس کو بے پروائی اور خود پسندی کے تحت برتا جائے۔ یہ خاصیت تقریباً ہر ذی روح میں ملتی ہے۔ اِس کو خود غرضی کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ اگر یہ شوق صحیح معنوں میں انسانی عمل کا راہبر رہے تو کوئی وجہ نہیں کہ ہر انسان اپنی روحانی اور جسمانی قوتوں کو اچھی طرح پیدا نہ کر سکے۔ اور اس عالمِ رنگ و بو میں اپنے کمال کا سکہ نہ بٹھا دے۔ لیکن افسوس اس بات کا ہے کہ انسان جو کام کرتا ہے وہ درجۂ اعتدال سے گرا کر یا بڑھا کر کرتا ہے۔ نتیجہ اس فعل کا اپنی اور دوسروں کی بربادی۔ کوئی کام ایک ذات تک محدود نہیں رہتا۔ بلکہ اُس کے اثرات اچھے ہوں یا بُرے دوسروں پر یقیناً اثر انداز ہوتے ہیں۔ جب یہ کمی ایک فرد میں دکھائی دیتی ہے تو بلاشبہ

یہ تصور کرنا پڑتا ہے کہ وہ قوم یا وہ ملک جس کا وہ ایک جزو ہے ضرور اس مرض میں گرفتار ہے۔ یہ خود غرضی زیادہ بڑھنے پر ایک بڑی ہیبت ناک صورت اختیار کرلیتی ہے جس سے تمام انسانیت زغے میں آجاتی ہے۔ قوم جس کو حب بلغت میں نیشن کے نام سے موسوم کرتے ہیں جب اس شوق کی علمبردار ہوجاتی ہے تو اُس کے اعصاب پر جنگ کی دیوی سوار ہوجاتی ہے۔ پھر وہ اس بات کا اندازہ قطعاً نہیں لگاتی کہ کتنی عورتیں بیوہ اور کتنے بچے یتیم ہوجائیں گے۔ بس پھر تو سامان جنگ اُس کے واسطے ہر وقت تیار رہنا چاہئے۔ تاکہ وہ اپنی عزیز خواہش کی اچھی طرح تسلی کرسکے۔ آپ دنیا کی کسی جنگ کی تاریخ لے لیجئے اور اُس کے فلسفہ پر نگاہ نکتہ چیں ڈالئے۔ آپ کو معلوم ہوگا کہ یہ جنگ محض اس لئے معرض وجود میں آئی کہ دونوں حریفوں میں سے ایک نہ ایک ضرور اپنی خود غرضی کی بنا پر دوسرے کی دولت پر قبضہ کرنا چاہتا تھا۔ ضروری امر ہے کہ دونوں میں سے ایک اپنی ترقی اور بہبود کا راز اس میں ہی سمجھا ہوگا کہ غیر کی چیز پر قبضہ کرلیا جائے اور پھر اُس کو اپنے ملک کے لئے ذریعۂ راحت بنایا جائے۔ پانی پت کی تیسری لڑائی جو احمد شاہ ابدالی اور ہندوستان کے مرہٹوں کے درمیان ہوئی اس بات پر اچھی طرح روشنی ڈالتی ہے۔ احمد شاہ ابدالی اور اُس کے ساتھی یہ خیال ذہن نشین کئے ہوئے تھے کہ ہندوستان فتح کرنا قوم اور ملک کی ثروت اور شان و شوکت کو چار چاند لگا دینا ہے۔ وطنیت نے کیا شکل اختیار کی اور کس طرح وہ قوموں کے افراد کے جانی اور مالی نقصان کی ذمہ دار ٹھیری۔ وطنیت اس وقت تک کوئی شے ہے جس وقت تک یہ ایک قوم کے سنوارنے میں مشاطہ کا کام دے۔ اگر اس فطری جذبہ کو اتنی نمو دی جائے کہ پھر یہ اپنا اصل مفہوم کھو کر غیر کے مال و زر پر نظر رکھے تو اس کا فنا کردینا ہی انسانیت کو مصیبت سے نجات دینا ہے۔ اس جذبے کی پرورش انسان کو ہرگز خوش نہیں آتی۔ جب یہ خوب پروان چڑھ جاتا ہے تو اس کو پھر انسانی خون سے پرورش کرنا پڑتا ہے اور یہ فعل انسانیت کے لئے مرگ مفاجات ہے۔ وطنیت کی پرستش جنگ اور بربادیٔ خلق کی تمہید ہے۔ وطنیت ایک نہایت محدود دائرہ ہے۔ یہ انسانیت کو بہت چھوٹے چھوٹے حصوں میں منقسم کردیتی ہے۔ انسانوں کو اس امر کی تعلیم دیتی کہ اپنے ایک چھوٹے سے ملک کی اتنی خوبی سے نگہداشت کرو کہ قرب کے ممالک پر بھی اپنا قدم جنگ کے ذریعے سے جما لو۔ اس ملک کے باشندوں پر جس پر تم نے قبضہ کیا ہے اپنی شاہنشاہی کا سکہ بٹھاؤ، اور اُن کے گلے میں طوقِ غلامی ابد تک کے لئے پہنا دو۔ اُن کی زبان بند کردو۔ اُن کی تحریریں تمہاری تعریف میں صرف ہوں۔ اُن کا جان و تن تمہارا حلقہ بگوش ہوجائے۔ اُن کا خیال اُن کے دل و دماغ میں گھٹ کر مرجائے۔ لیکن تحریر یا تقریر کے آئینے میں اپنی صورت نہ دیکھ سکے۔ اُن کے تہذیب و تمدن میں اپنا رنگ اُن کے دماغ کو کمزور کرکے ضرور نمایاں کرو۔ اس قوم کے بچے تم کو اپنا رازق تصور کریں۔ اور اُن کی طبیعت ہمیشہ کے لئے پست اور گندہ ہوجائے۔ یہ ہیں وطنیت کے کمالات، جو وہ کسی قوم کے ذہن میں نقش کردیتی ہے، اور اُس قوم کو ایک درندوں کی جماعت بنا دیتی ہے۔

ذرا آپ ٹھنڈے دل سے سننے پر آمادہ ہوں تو میں وطنیت کی داستان سناؤں کہ زمانۂ ماضی میں کیوں کر اُس نے اپنے ہاتھوں کو انسانی خون سے حنائی بنایا۔ مغرب کی سیر کراؤں یا مشرق کی۔ خیر دونوں کے ساتھ انصاف کرنا لازمی ہے۔

اُس وقت کو یاد کیجئے جب سلطنتِ روما کا عروج و کمال زمانے کی آنکھ کو خیرہ کئے دیتا تھا۔ مغربی تہذیب و تمدن دوسرے ملکوں کے رسم و رواج پر خندہ زن تھے۔ وطن پرستی نے اپنا بہترین نمائندہ (Caesar) کی ہستی میں پایا۔ اور خوب انسانی خون سے ہاتھ رنگے۔ ہر صبح ایک جنگ کا پیغام لاتی تھی۔ عجیب عجیب قسم کے آلاتِ جنگ تیار کئے جاتے تھے۔ فوج کی ترتیب روز بروز خوبی سے ہوتی تھی۔ یہ سامان کس واسطے تھے۔ وطن پرستی کی خاطر داری کے لئے، اور دوسرے ممالک کو صدمہ اور نقصان پہنچانے کے لئے۔ مشرق کی طرف آئیے اور تیمور لنگ اور چنگیز خاں کے کارنامے دیکھئے کہ کیونکر چند روز میں لاکھوں انسانوں کا خون ہوجاتا تھا۔ صرف ایک انسان کے جذبے کے احترام کے واسطے جسے بادشاہ کہتے ہیں ہزاروں انسان تلوار کے گھاٹ اتار دئے جاتے تھے۔ انسان وہ انسان جس کو بنا کر قدرت خود ناز کرتی ہے۔ وہ انسان کہ اگر ایک بھی بے وقت فوت ہوجائے تو قیامت تک انسانیت اس نقصان کی تلافی نہیں کرسکتی۔ کیا ممکن نہیں کہ یہ مرجانیوالا خود اور اس کی نسلیں اس دنیا کے لوگوں کو گراں قدر فائدے پہنچا سکتے۔ ممکن تھا کہ یہ جنگ میں جان دینے والے دنیا کے ادب، سائنس اور دیگر علوم میں بے مثال اضافے کرتے۔ اور یہ دنیا اُن کے کمالات سے منور ہوجاتی۔ لیکن تھا کہ یہ مرگِ مفاجات کے شکار عالم ایجاد میں بڑی ترقی کرتے۔ دنیا کی تجارت

کو فروغ دیتے اور نہیں معلوم کیا کیا کرتے۔ مگر یہ سب امکانات جنگ نے جو وطن پرستی کا آئینہ ہوتی ہے۔ اُن کی غیر وقت موت کے ذریعے سے ختم کر دیئے۔ اور انسانیت کو سینکڑوں کمالات سے محروم کر دیا۔

یہ تو زمانۂ ماضی کے واقعات ہیں۔ اِن کے آئینہ میں اچھی طرح آج بھی وطن پرستی کے صحیح نقش و نگار بخوبی نظر آسکتے ہیں۔ انسانی تدابیر جو انسان کی قوتِ خیال کا حاصل ہیں اس صد رُخ تصویر کو مزیّن بنانے میں صرف کی جاتی ہیں۔ ادب کیا سائنس کیا اور فلسفہ کیا جس شعبۂ علم کی جانچ پڑتال کیجئے۔ یہی نتیجہ برآمد ہوتا ہے کہ دنیائے انسان حب الوطنی اور وطنیت کو ہر ساعت جامۂ دوام پہنانے کی خاطر ہر امکانی کوشش صرف کرتی ہے۔ کیا قدرت کی انسان کی تخلیق سے یہ بے پناہ تقسیم مراد تھی، کہ امریکہ اور امریکہ کا زر و مال صرف اہلِ امریکہ تک محدود رہے۔ اُس نے انسان کو دل عطا فرمایا جس میں ہمدردی۔ رحم۔ محبت۔ جذبۂ خدمت اور نفیس صفات نہاں ہوسکتی ہیں۔ اگر اسٹریلیہ میں گندم بکفایت پیدا ہوتا ہے تو اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ صرف اہلِ ملک ہی اس خدائی نعمت کا لطف اُٹھائیں اور آنکھیں بند کر کے اِس کو صرف میں لائیں اور غیر ممالک قحط کی جاں گزیں تکلیف سے قریبِ مرگ ہو جائیں۔ ان کے ننھے بچے اور عورتیں محرومِ غذا کر دئے جائیں۔ عقل اور انسانی شعار اس امر کے مقتضی ہیں کہ بغیر طلب کئے امریکہ اور آسٹریلیا ان ناگوار حالات کی خبر پاتے ہی اُن آفت رسیدہ انسانوں کی حاجت روائی کریں۔ یہ کہاں کی انسانیت ہے کہ جاپان بغیر کسی جرم و گناہ کے چین کی قسمت کا آئینہ پاش پاش کر دے۔ مالی نقصان ہو۔ جانیں تلف ہو جائیں۔ اور انسانی آنکھ وہ منظر دیکھے کہ زمین تھرا اُٹھے۔ کونسا مذہب۔ کون فلسفہ۔ کون پیغمبر یا راہبر جاپان کی اس تجویز کو اچھی نظروں سے دیکھے گا۔ جاپان کا موجودہ طرزِ عمل صرف وطن پرستی کا تجویز کردہ منصوبہ ہے۔ اگر حقیقت اِس کے خلاف ہے تو جاپان کو کیا ضرورت پیش آئی تھی کہ ایسی عظیم الشان مہم اپنے ذمہ لے اور انسانیت کا دل ہلا دے۔ جاپان کو اپنے باشندوں کے لئے مقام اور میدانِ عمل کی ضرورت تھی تو دوستانہ طور اور معقول ذرائع سے ان مقاصد کی تکمیل کر سکتا تھا۔ کتنی دولت موجودہ اقوام نے آلاتِ جنگ کے مہیا کرنے میں صرف کر دی ہے۔ یہ وہ دولت ہے کہ بے حس و حرکت اقوام کے اسلحہ خانوں اور متعدد چھاؤنیوں میں اُن کے شکوک اور بے اطمینانی کی ڈھال بنی ہوئی ہے۔ اگر یہ زر و مال انسانوں کی تعلیم۔ سامانِ آرائش۔ غریبوں کی مدد کے لئے صرف کیا جائے تو اس دنیا سے بیماری، افلاس اور پریشانی کم و بیش غائب ہو جائیں اور یہ دنیا بہشت کا نمونہ بن جائے، لیکن آہ انسانی تغافل ہمیشہ بری سوجھتی ہے۔ وطنیت کو مذہب بنا لیا۔ اور یہ کبھی جنگِ ایبے سینیا کی صورت میں ظاہر ہوا۔ کبھی ہٹلر کے ارادوں میں صورت پذیر ہوا۔ کبھی کچھ۔ کبھی کچھ۔ غرض انسانی فارغ البالی کی بنیادیں جب ہلیں تو وطن پرستی کے طفیل۔

یہ تمام تر بحث اس امر پر دلالت کرتی ہے کہ وطنیت کو جب نوازا گیا انسانیت کو برے اور پریشان خواب دیکھنے پڑے۔ یہ امر مسلمہ ہے کہ جب کسی ملک کے باشندے وطن پرستی کی حمایت کا خیال کرتے ہیں تو خود غرضی اور نفس پرستی اُن کی عقلوں پر قبضہ کر لیتی ہے۔ اور پھر ملک کے افراد کی عزیز تمنا یہ ہوتی ہے کہ غیر کا راحت و آرام ضبط کر لیا جائے۔ اس ملک کی معدنیات ارضی پیداوار۔ شاندار عمارات اور وہ تمام کائنات جس کے ذریعے سے وہ ملک بے نیازی اور بہبود کی زندگی بسر کر رہا ہے، ہمارے تصرف میں آجائیں۔ اس خیال اور اس عقیدہ کا عوام کے دل و دماغ میں گھر کر لینا۔ جہانبانی کا جو صورت گرِ جنگ ہے نقشِ اولیں ہے اور جہاں جنگ کی دیوی جلوہ گری کر رہی ہو وہاں امن و امان اور انسانی ترقی دائرۂ خیال سے باہر ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ انسان مستقل سرمایہ اپنے قبضہ میں رکھنا چاہتا ہے تاکہ سوسائٹی کا نظام اور اپنے متعلقین کی پرورش و نشوونما ممکن رہیں۔ ورنہ اگر یہ سلسلۂ ذاتی ترک ہو جائے تو پھر انسان فطرت کے آئین کے خلاف چلتا نظر آئے۔ اور عالمِ امکان میں یہ گھر بار اور لین دین کی ہنگامہ آرائی ہی فوت ہو جائے۔

موجودہ اقوام تو سیاست کا کمال اس میں دیکھتی ہیں کہ غیر کا مال و زر۔ اُس کا خیال اور تہذیب و تمدن اُن کا زر خرید غلام ہو جائے اور وہ اور اُن کے شریکِ عمل خوب لطفِ زندگی اُٹھائیں۔ دولت کی چھاؤں میں بے فکر زندگی گزاریں۔ اور اُن کے دوسرے بھائی کانٹوں پر شب و روز تڑپتے رہیں۔ صاحبِ عقل احباب میں اس عقیدہ کا پرچار نہیں کرتا کہ اپنے ملک کی بہبود کو نظر انداز کر دیا جائے۔ بلکہ وسعتِ نظر کی حدود سے آگے بڑھ کر یہ نقطۂ نظر پیش کرتا ہوں کہ وطنیت معشوقۂ علم سیاست نہ ہونی چاہیے۔ انسان کو انسان سمجھ کر وہ تعلقات اور رشتے ہونے چاہئیں کہ بگڑی میں ایک کا دوسرا کھیون ہار ہو۔ اور کسی قوم کی ناؤ مشکلات کے بھنور میں پھنس گئی ہو تو مال و جان۔ خیال اور انسانی تدبر کی مدد سے اس کو پار لگانے کی امکانی کوشش کی جائے۔

قربانی!

سجاد حیدر آفریدی ملیح آبادی

ہر چند سلیم کا زیادہ وقت شیلا کے ساتھ گزرتا۔ لیکن وہ اپنے دل میں زبیدہ کے لئے زیادہ گنجائش پاتا تھا۔ یہ نہ تھا کہ زبیدہ، شیلا سے زیادہ حسین یا تعلیم یافتہ تھی۔ بلکہ ایک قدرتی اور فطری جذبہ سلیم کو زبیدہ سے محبت کرنے پر اکسا تا رہتا تھا، اور وہ شیلا کے ساتھ برسوں رہنے کے باوجود بھی زبیدہ کو ہر طرح سے زیادہ ترجیح دیتا۔ اکثر شیلا کو سلیم کی خشک باتوں سے تکلیف ہوتی۔ لیکن وہ ان تمام باتوں کو نظر انداز کر دیتی۔ بلکہ بھینٹ چڑھا دیتی، محبت کے دیوتا پر ۔۔۔۔۔۔۔

سلیم سوچتا یہ کیا ماجرا ہے کہ میں شیلا سے کھنچتا ہوں اور زبیدہ مجھ سے الگ رہنے کی کوشش کرتی ہے۔

ابھی وہ یہ سوچ ہی رہا تھا کہ شیلا کی آواز سنائی دی "سلیم صاحب کیا میں آسکتی ہوں؟" ۔۔۔۔۔۔ "آئیے!" سلیم نے کہا" ۔۔۔۔۔ "آپ پڑھ رہے تھے۔ میں حارج تو نہیں ہوئی" شیلا نے مسکراتے ہوئے کہا" ۔۔۔۔ "نہیں تو آپ اتنی اتنی سی باتوں کا خیال کریں گی تو ۔۔۔۔۔۔۔ ہنستے ہوئے ۔۔۔۔۔ میں کہہ رہا تھا کہ اگر آپ اتنی اتنی سی باتوں کا خیال کریں گی تو دونوں کے لئے وقت کاٹنا دوبھر ہو جائے گا۔ سلیم نے سنبھلتے ہوئے کہا" "آپ اچھی طرح جانتے ہیں میں تکلف نہیں کرتی" شیلا نے بیٹھتے ہوئے کہا" ۔۔۔۔ "کہئے اس وقت کیسے چلی آئیں۔ کیا کالج نہیں گئیں؟" سلیم نے کہا" "گئی تو تھی۔ مگر واپس ۔۔۔۔۔۔ (رک گئی) ۔۔۔۔ "جی ہاں مگر واپس کیا؟" سلیم نے پوچھا۔" "ہاں کالج گئی تو تھی مگر وہاں آپ کو نہ پاکر واپس آگئی ۔۔۔۔۔ بات بناتے ہوئے ۔۔۔۔۔ مجھے آپ سے کچھ باتیں کرنا تھیں اس لئے اور بھی چلی آئی" شیلا نے کوشش سے مسکراتے ہوئے کہا۔ "تعجب ہے اب تک آپ نے کہا کیوں نہیں۔ کیا اتنی مدت تک ساتھ رہنے کے بعد بھی شرم نہیں گئی ۔۔۔۔ مجھے دیکھئے میں کتنا بے تکلف ہوں" سلیم نے کہا"

"تھوڑی دیر سوچ لینے کی اجازت دیجئے ۔۔۔۔۔۔ منہ ہاتھ دھولوں پھر کہوں گی" شیلا نے کہا" ۔۔۔۔۔ "منہ ہاتھ کیا نہا لیجئے پھر تو کہئے گا" سلیم نے مسکراتے ہوئے کہا" ۔۔۔۔۔۔ "کالج میں زبیدہ ملی تھیں کیا آپ کو؟" ۔۔۔۔۔ اس سوال پر شیلا کا چہرہ زرد پڑ گیا ۔۔۔۔۔ اس پر بجلی سی گر پڑی ۔۔۔۔ اس نے مشکل تمام جواب دیا۔ "ہاں ملی تھیں۔ جب میں واپس ہو رہی تھی" شیلا یہ کہتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی، اور ایک کرب و مصیبت کے عالم میں اپنے کمرے میں چلی گئی ۔۔۔۔۔ سلیم شیلا کو جاتے ہوئے تعجب سے گھورتا رہا۔ اور پھر عادت کے مطابق سوچنے لگا ۔۔۔۔۔۔

(۲)

سلیم ایک خوشحال گھرانے کا نیک لڑکا تھا۔ اس کی ابتدائی تعلیم ناگپور میں ہوئی۔ جب وہ کچھ بڑا ہو گیا تو باپ نے تعلیم کے لئے حیدر آباد بھیج دیا۔ سلیم چونکہ ذہین تھا بہت جلد ترقی کر گیا۔ اب اس کا بی اے کا آخری سال تھا۔ شیلا کے والد نہ امیروں میں تھے نہ غریبوں میں۔ بلکہ عام طور پر لوگ ان کو بگڑے رئیسوں میں شمار کرتے تھے۔ حالانکہ ان کا اپنا خیال ایسا نہ تھا۔ انگریزی تعلیم کے وہ نہ تو اتنے خلاف تھے کہ ان کو جاہل کہا جاتا اور

نہ اتنے موافق کہ موجودہ تعلیم کے دیوانے۔ بلکہ اعتدال کی چال کو وہ زیادہ محفوظ اور مفید سمجھتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ وہ شیلا کو دسویں کلاس سے زیادہ نہ پڑھائیں گے۔ لیکن اپنے بھائی کے اصرار اور شیلا کی کوششوں سے مجبور ہو کر وہ شیلا کو حیدرآباد بغرض تعلیم روانہ کرنے پر تیار ہو گئے۔

زبیدہ بہت امیر گھر کی لڑکی تھی۔ اس کے والد حیدرآباد کے جاگیرداروں میں شمار کئے جاتے تھے۔ زبیدہ کی والدہ کا انتقال جب وہ چھ برس کی تھی ہو گیا تھا۔ لیکن باپ نے ماں کو یاد کرنے کا موقع ہی نہیں دیا۔ وہ زبیدہ کے لئے ہر چیز مہیا کر دیتے جو اُسے درکار ہوتی۔ بہرحال زبیدہ ہر طرح امیر اور خوش قسمت کہلانے کی مستحق تھی۔ اُسے باپ نے یہ سوچنے کا موقع ہی نہیں دیا کہ غم کیا ہے۔ وہ صرف راحت جانتی تھی۔

(۳)

زبیدہ سے سلیم کی پہلی ملاقات خود زبیدہ کی اٹھارہویں سالگرہ میں ہوئی تھی، جب کہ اُس نے سالگرہ کی خوشی میں اپنی کلاس کی طالبات کو دعوت دی تھی۔۔۔۔۔۔۔

"کیا آپ میری طرف سے دعوت قبول فرمائیں گی؟" یہ وہ پہلا جملہ تھا جو سلیم نے زبیدہ سے کہا تھا۔ "میں دعوت میں ضرور شریک ہوں گی"، اور یہ زبیدہ تھی۔

دعوت کے بعد زبیدہ اور سلیم میں اکثر ملاقات ہوتی رہی۔ کالج میں کم وقت ملتا اس لئے ہفتے گزر جاتے۔ لیکن چھٹیاں زیادہ تر ساتھ ہی گزرتیں۔ نامعلوم طریقے پر دونوں ایک دوسرے کے گرویدہ ہوتے گئے۔

شیلا پر جب یہ راز کھلا کہ سلیم کو زبیدہ سے محبت ہے تو اُس کے دل کو ایک نامعلوم صدمہ پہنچا اور وہ روز بروز کمزور ہوتی گئی۔ نہ وہ سلیم سے شکایت ہی کر سکتی تھی اور نہ اظہار محبت ہی۔ کبھی وہ سوچتی کہ سلیم سے کہہ دے مجھے تم سے محبت ہے۔ مجھے ٹھکرا کر میری زندگی نہ برباد کرنا۔ اور کبھی سوچتی کہ زبیدہ سے اظہار کرے۔ میری چیز مجھ سے نہ چھینو۔ میں سلیم کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی۔ اور ساتھ ساتھ اس کو اس کا یقین بھی تھا کہ وہ ایسا نہ کر سکے گی۔

ایک رات شیلا نے زبیدہ اور سلیم کی عہد و پیمان کی گفتگو سنی تو بیہوش ہو گئی۔ جب اس کو ہوش آیا تو وہ دونوں کہیں جا چکے تھے۔

شیلا نے اپنے دل میں عہد کر لیا تھا کہ وہ اب حتی الامکان زبیدہ اور سلیم کے معاملات میں حایل ہونے سے بچے گی۔ اور اس رات کے بعد شیلا کو بہت مدت تک سلیم کے کمرے میں جاتے کسی نے نہیں دیکھا۔ سلیم نے اُس سے نہ آنے کی کئی مرتبہ شکایت بھی کی مگر ہر مرتبہ وہ ناسازیٔ طبع کا بہانہ کر کے خاموش ہو گئی۔ سلیم کے پاس اس سے زیادہ شکایت کی گنجائش بھی نہ تھی۔

سلیم کو خود بھی اس کا احساس تھا کہ شیلا اب کس لئے نہیں آتی۔ لیکن وہ یہ جانتے ہوئے بھی مجبور تھا۔ وہ یہ بھی جانتا تھا کہ اگر میں نے شیلا کو ٹھکرا دیا تو وہ جان دیدے گی۔ کیونکہ پہلے بھی وہ اس کا اقدام کر چکی تھی۔ جس سے سلیم اب تک خائف تھا۔ گو سلیم پر یہ تو ظاہر نہیں کیا گیا تھا کہ اُس نے ایسا کیوں کیا۔ لیکن سلیم بچہ نہ تھا۔ وہ شیلا کی ایک ایک ادا سے اندازہ لگا سکتا تھا۔

نہ جانے زبیدہ کو یہ کیسے معلوم ہو گیا کہ شیلا سلیم سے بے انتہا محبت کرتی ہے۔ اور سلیم کے بغیر اُس کی زندگی خاک میں ملی جا رہی ہے۔ اُسے اُس کی زبوں حالی پر ترس سا آ گیا۔ جب وہ خیال کرتی جس طرح سلیم کو نہ دیکھنے سے اُس کی اپنی حالت ہوتی ہے تو لازمی شیلا پر بھی وہی گزرتی ہو گی جیسے اکثر اس کی راتیں سلیم کو نہ دیکھنے سے جاگ کر گزرتی ہیں۔

اس نے شیلا سے ملنے کی ٹھانی۔ ہرچند سلیم اُسے روکتا رہا۔ مگر اُس نے ایک نہ سنی اور شیلا کے کمرے میں چلی گئی۔ اسے بہت تعجب اور صدمہ ہوا، جب اُس نے شیلا کو تکیئے میں منہ ڈالے روتے دیکھا، وہ اس بغیر ملے چلی آئی۔

دوسرے دن اس نے سلیم کو سمجھانے کی بہت کوشش کی لیکن سلیم خود ایک ایسے خطرناک دور سے گزر رہا تھا۔ جس سے نکلنا ناممکن تو نہیں مگر مشکل ضرور تھا۔ وہ اپنی ہستی کو فنا کر دینے کے بعد بھی زبیدہ کو چھوڑنے پر تیار نہ تھا۔ اس نے زبیدہ کی آخری تلخ اور ترش باتوں کو شیریں خواب سے تعبیر کیا۔ اور بغیر نتیجہ کو سوچے آنکھیں بند کئے آگے بڑھتا گیا۔ یہاں تک کہ اُس نے ٹھوکر کھائی اور قریب تھا کہ تاریکی اور نا اُمیدی کے غار میں گر جاتا۔ لیکن قدرت کی طرف سے شیلا نے اُسے تھام لیا۔ اور جو کچھ اُس کے امکان میں تھا کیا۔

زبیدہ نے امتحان ہی کے زمانے میں کالج کو خیرباد کہا۔ البتہ اُس کا ایک خط جواب دونوں کی توجہ کا مرکز ہے۔ ہر وقت اور خاصکر ہر روز

سمجھ کو پاک چیز کی کھول کر پڑھا جاتا ہے۔

خط:۔

بہن شیلا زندہ اور خوش رہو!

میں وہاں جا رہی ہوں جہاں تمہاری رسائی وقت سے پہلے ناممکن ہے اور نہ تم مجھکو تلاش کرنے کی کوشش کرنا۔ کیونکہ جب یہ خط تم تک پہنچے گا میری روح آسمان کے نیلے پردوں کو چیر کر غائب ہو چکی ہوگی۔ میں یہ ہرگز نہیں چاہتی تھی کہ تم کو میری وجہ سے تکلیف پہنچے۔ اور دوسرے یہ کہ اگر میں سلیم کو اپنا بنا لیتی تو اس کے سوا کیا سلیم اور مجھکو ایک وقتی خوشی ہوتی کچھ حاصل نہ تھا۔ لیکن شیلا اگر تم سلیم کو اپنا بنانے میں کامیاب ہوگئیں تو ایک اشتراکی مذہب کی بنیاد پڑتی ہے جو ہماری آئندہ نسلوں کے لئے مفید ثابت ہوگی۔

تم حیران تو ہوگی کہ میری خودکشی کو اور اشتراکی مذہب سے کیا تعلق۔ سنو! میں زندہ رہتی تو ناممکن تھا کہ سلیم مجھے حاصل کرنے کی کوشش نہ کرتے، اور سچ پوچھو تو میں بھی زندگی اور ہوش میں سلیم سے جدا ہونے کی کوشش نہ کرتی۔ کئی مرتبہ میرے دل نے تمہارے خلاف آواز بلند کی لیکن میں نے کوشش کی اور اتفاق سے ہر مرتبہ کامیاب رہی۔

معلوم نہیں مرنے کے بعد مجھے کیا کیا سزائیں دی جائیں۔ کیونکہ میں ایک ایسے جرم کی مرتکب ہوں جسے مذہب قانون اور سوسائٹی جرم قرار دیتی ہے۔ میں نے زندگی بھر خدا کو بھولے سے یاد نہیں کیا۔ مگر اس وقت جب کہ زندگی کے چند منٹ اور باقی ہیں اُس کے وجود کا یقین ہوتا جا رہا ہے۔

میری پہلی اور آخری آرزو صرف اتنی سی ہے کہ تم دونوں مل کر رہنا۔ میرا مرنا سوارت ہو جائے۔ یہی پیغام سلیم کو بھی پہنچا دینا۔ میرا ہاتھ کانپ رہا ہے۔ سر چکرا رہا ہے۔ شاید میں اور نہ لکھ سکوں۔ دل اس وقت بھی باغی ہوا جا رہا ہے۔ مجھے مرنے کا تو افسوس نہیں۔ مگر دنیا میں کچھ نہ دیکھنے، اور سلیم سے آخری مرتبہ نہ ملنے کا قلق ضرور ہے۔

تمہاری آخری بہن، زبیدہ

یہ وہ خط تھا جس نے سلیم کی دنیا بدل دی۔ اب بھی لوگ اکثر دو آدمیوں کو جنگل کی طرف پھول لے جاتے ہوئے دیکھتے ہیں۔

(یہ وہ کہانی ہے جو میں نے ایک گاؤں میں ایک کسان سے سنی تھی)

شاہی اور عاشقی

صاحبِ تاج کو افواج کی تلوار پہ ناز
جاں ستانی کے ذریعوں پہ ہے سلطاں کو گھمنڈ
مایۂ فخر اُسے شورشِ دربار و جلوس
وہ جواہر پہ نظر ڈال کے اِتراتا ہے
اُس کو دشمن کی شکستوں کے یقیں سے فرحت
والیٔ ملک کو شمشیر کی "سن سن" پہ غرور
گردنِ شاہ کی راحت کے لئے بالشِ پر

کُشتۂ حُسن کو ہے ابروئے خمدار پہ ناز
اور طالب کو دل و جاں کے طلبگار پہ ناز
اِس کو خاموشیٔ خلوت کدۂ یار پہ ناز
اِس کو محبوب کی گفتارِ گہربار پہ ناز
اِس کو ہوتا ہے اُمیدِ کرمِ یار پہ ناز
قیدیٔ عشق کو زنجیر کی جھنکار پہ ناز
سرِ دیوانہ کو ہے سنگِ درِ یار پہ ناز

حُسنِ تدبیر ہے ایواں کے شبستاں میں مگن
وحشتِ عشق کو ہے وادیٔ کہسار پہ ناز

رزمی صدیقی

بھوک

علی الصباح، کہ دنیا تھی محوِ خواب ابھی — چھپا ہوا تھا پردۂ مشرق میں آفتاب ابھی
فلک پہ انجمنِ شب کا تھا اثر باقی — گھرا ہوا تھا ستاروں میں ماہتاب ابھی
فضائیں گم تھیں دھندلکے میں آخرِ شب کے — عروسِ صبح کے چہرے پہ تھی نقاب ابھی
لیا نہ تھا ابھی سورج نے بوسۂ گیتی — عروسِ صبح کا نکھرا نہ تھا شباب ابھی
نہ آئی تھی ابھی سُرخی اُفق کے چہرے پر — شفق نے چرخ پہ چھڑکی نہ تھی شراب ابھی

غنودگی میں فضائیں تھیں سر جھکائے ہوئے
میں جا رہا تھا سڑک پر قدم بڑھائے ہوئے

مگر تھا پیشِ نظر اک مرقعِ ادبار — دلِ غریب کی صورت اداس تھا بازار
وہ کوٹھیاں، وہ طرب خانہ ہائے دولت و عیش — جہاں تھے آخرِ شب تک حیات کے آثار
وہاں بھی موت کے بیٹھے تھے ہر طرف پہرے — نہ شمع تھی، نہ پتنگے، نہ بزم تھی نہ بہار
گداگروں کے کئی قافلے بحالِ تباہ — پڑے ہوئے تھے سرِ راہ نیند میں سرشار

یکایک ایک طرف اُٹھ گئی جو میری نظر
عجب طرح کا نظر آیا سامنے منظر

گلی کے موڑ پہ اک آدمی پریشاں حال — کہ جس کا روزِ جوانی تھا سوگوارِ زوال
جھکی جھکی ہوئی نظریں، رُندھا رُندھا ہوا دل — دھنسی دھنسی ہوئی آنکھیں، سُتے ہوئے گال
برہنہ جسم، خمیدہ کمر، رمیدہ حواس — بدن نڈھال، طبیعت نڈھال، رُوح نڈھال
زبانِ لغزشِ پا پر فسانۂ شب و روز — سطورِ چینِ جبیں میں حدیثِ ماضی و حال
سمجھ گیا میں اسے دیکھتے ہی حال اُس کا — کہ اُس کی شکل بیک وقت تھی جواب و سوال

میں اِس مہیب نظارے کی تاب لا نہ سکا
قدم جمے کے جمے رہ گئے اُٹھا نہ سکا!

رضا نقوی

شانتا!

تقی، مہرولی

پنڈت ہردے نرائن ایک تعلیم یافتہ روشن خیال اور آزاد طبع انسان تھے اس سال کی مردم شماری میں انہوں نے اپنے آپ کو اور اپنی اولاد کو لامذہب لکھوایا تھا قدامت پسند طبقہ انہیں اچھی نظر سے نہ دیکھتا تھا۔ اس کی ہردم یہ کوشش رہتی تھی کہ پنڈت جی مذہب اور سماج کی زنجیروں میں بدستور جکڑے رہیں۔ مالی کمزوری اور خانگی حالات نے پنڈت جی کے جذبات اور خیالات کو ابھرنے نہ دیا۔ ان کی زبانی بخشش اور نکتہ چینیاں کوئی عملی صورت اختیار نہ کرسکیں۔ اپنی پوزیشن اور ماحول کا صحیح اندازہ انہیں اسوقت ہوا۔ جب ان کی لڑکی شانتا کو مقامی سکول کی منتظمہ کمیٹی نے داخل کرنے سے انکار کر دیا۔ پنڈت جی کے سے علم دوست انسان کے لئے یہ وقت بہت کٹھن تھا۔ انہیں اتنی فرصت نہ تھی کہ اپنی لڑکی کو خود تعلیم دیتے۔ مقامی کانگریس کمیٹی کے صدر اور گرام سدھار سبھا کے رکن ہونے کی وجہ سے وہ اس طرف بالکل توجہ نہیں کرسکتے تھے۔ ان کا سارا وقت مختلف تحریکات میں صرف ہوتا تھا تعلیم کو اپنے ہاتھ میں نہ لینے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ پنڈت جی اپنے آپ کو آزاد نہ سمجھتے تھے۔ انہیں ہر وقت اپنی گرفتاری کا خدشہ رہتا تھا۔ وہ کئی بار سزا بھگت چکے تھے۔ مگر اسوقت شانتا بچی تھی۔ اس کے بڑے پن نے پنڈت جی کو ایک کشمکش میں مبتلا کر دیا اس کی تعلیم کے لئے گھر پر ان کی موجودگی اشد ضروری ہوگئی۔ اور اس کے لئے انہیں اپنی تمام سرگرمیاں بند کرنی پڑیں وہ تعلیم کو کسی حالت میں چھوڑنے کے لئے تیار نہ تھے وہ مستقبل کا خواب دیکھ رہے تھے جب ان کی شانتا ہندوستان کے سیاسی سٹیج پر ہیروئن کی حیثیت سے نمودار ہوگئی۔ غلام ہندوستان کی تمام امیدیں اس سے وابستہ دکھائی دیتی تھیں۔ پنڈت جی کو جب موقع ملتا وہ ننھی شانتا کو قومیت کی سلجھی ہوئی باتیں بتانے۔ سے دنیا کے رہنماؤں اور بہادروں کی تصویریں بطور کھلونوں کے مہیا کرتے اور چڑے چڑیا کی فرسودہ کہانیوں کی بجائے رانی جھانسی اور جون آف آرک کے کارناموں کو دلچسپ پیرائے میں بیان کرتے تھے۔ شانتا کو تاریخ کا زیادہ شوق تھا اور پنڈت جی بھی زیادہ تر اسی پر زور دیتے تھے کچھ تو اس لئے کہ وہ اقوام عالم کی جدوجہد آزادی اور ان کے عروج و زوال کا نقشہ شانتا کے ذہن نشین کرانا چاہتے تھے دوسرے ان کی دلی خواہش تھی کہ شانتا ہندوستان کی موجودہ جدوجہد آزادی میں حصہ لینے سے پہلے اس کے ماضی کے شاندار کارناموں سے واقف ہو اور اس کی تہذیب و تمدن اور اخلاق کا مطالعہ کرے اس کے دل پر ہندوستانی عظمت کا سکہ جمانے کے لئے پنڈت جی سال میں تین چار مشہور تاریخی اور قابل دید مقامات کی سیر کرانے میں صرف کرتے تھے۔ کبھی اجنٹا اور ایلورا کے

غاروں کو دکھاتے اور کبھی مہنجو دارو، ہڑپا اور ٹیکسلا کی نو برآمد شدہ بستیوں کا مشاہدہ کراتے اور کہتے۔ بیٹی! یہ سب گذری ہوئی کہانیاں ہیں یہ اسو قت کی باتیں ہیں۔ جب ہمارے دیش پر ہمارا اپنا راج تھا۔ شہد اور دودھ کی نہریں بہتی تھیں۔ یہاں کی خاک پر من برستا تھا۔ لکشمی اپنے گھر کی باندی تھی ہماری صحتیں اچھی تھیں۔ ہمارے دماغ اچھے تھے اور ان سب سے اہم ہمارا کیریکٹر تھا مگر بیٹی! آج کا ہندوستان کل کا ہندوستان نہیں رہا! اب وہ مصیبتوں اور دکھوں کا گھر ہے۔ غلاموں کی زنجیروں نے اسے بری طرح کس رکھا ہے۔ سارے دیش پر افلاس اور نحوست کی گھٹائیں چھا رہی ہیں۔ اس کے چھوٹے چھوٹے بچے بلک بلک کر ماؤں کی گودوں میں دم توڑتے ہیں اور مرنے پر بھی ان کی نگاہیں ماں کی دودھ سے خالی اور خشک چھاتیوں کو تکتی رہتی ہیں نوجوانوں کے دن جوانی کی جولانیوں اور امنگوں سے خالی ہیں۔ ان کے پژمردہ چہرے جھلسی ہوئی رنگتیں اور بگڑے ہوئے سے خط و خال ہند کے افلاس کا ایک بھیانک منظر پیش کرتے ہیں۔ ان کے خیال میں پستی اور کم ہمتی، دماغوں میں نحوست اور چھچھوراپن اور دلوں میں کدورتیں قبضہ جمائے ہوئے ہیں بیکاری نے ان کی بری گت کر رکھی ہے۔ ارجن و بھیم جیسے عالی ہمت سورما اب کہاں؟ افلاس نے چن چن کر سب کو ختم کر دیا۔ وقت سے پہلے ہی ہماری عورتیں خوبصورتی کی اصلی شان کھو بیٹھتی ہیں رنج و غم اور آئے دن کی مصیبتیں انہیں کچھ اور سوچنے کا موقع ہی نہیں دیتیں جہالت نے ان کے قوائے عقلی کو بیکار کر دیا ہے۔ اور وہ توہمات اور بیہودہ رسم و رواج کا شکار ہو کر رہ گئی ہیں۔ نوخیز دوشیزائیں جنکی بدمست اور مدبھری آنکھوں میں شباب اور جوانی اور سمندر ٹھاٹھیں مارتا ہے بھوک سے تنگ آ کر مزدوری کرتی ہیں ان کے نرم و نازک ہاتھوں میں چھالے پڑ جاتے ہیں۔ ان کا پھول سا چہرہ بیساکھ اساڑھ کی جھلستی ہوئی دھوپ میں کملا کر رہ جاتا ہے۔ ان کی سیاہ بکھری ہوئی زلفیں اور نکھرے ہوئے رخسار راہ کے کثیف گرد و غبار کا بار اٹھاتے ہیں۔ پتھر توڑنے میں چوڑیوں کی ہر صدا آنکھ میں آنسو بن جاتی ہے۔ وہ سڈول بانہیں اور کلائیاں جن میں جوشن اور کنگن زیب دیتے ہیں بالکل عریاں نظر آتی ہیں خندہ پیشانی پر غور و فکر اور التجاؤں کی شکنیں نمایاں رہتی ہیں۔ بدیشی حکومت نے ہم پر مصیبتوں کے پہاڑ توڑ رکھے ہیں۔ ہمارا کسان جو ہمارے دیش کی ریڑھ کی ہڈی ہے ٹیکسوں کے بوجھ سے دبا پڑا ہے ہمارا مزدور جو اس صنعتی دور میں مال و دولت کی کنجی ہے سرمایہ داروں کا شکار ہے سرمایہ داری نے اس کی دنیا تنگ کر رکھی ہے۔ وہ کسان اور مزدور جو دولت پیدا کرتا ہے خود دو وقت کی روٹی سے ترستا ہے اغیار اس کا سب کچھ چھین لیتے ہیں۔ اس کے پہننے کو نہ کپڑا ہے اور نہ کھانے کو روٹی۔ وہ اپنا اور اپنے بیوی بچوں کا پیٹ کاٹ کر "بڑے آدمیوں" کی نذر کرتا ہے۔ پنڈت جی کے دماغ میں معاشی ہند کا تصور تھا۔ وہ شورایہ روس کے نظام حکومت کو ہند کی آب و ہوا اور ماحول کے موافق سمجھتے تھے۔ اس لئے تاریخ کا سبق پڑھاتے وقت وہ ہندوستان کے ان حکمرانوں اور خصوصاً مسلمان بادشاہوں پر سخت نکتہ چینیاں کیا کرتے تھے۔ جن کا نظام حکومت شخصی تھا اور جس میں عوام کی نمائندگی کو ذرا دخل نہ ہوتا تھا۔ روضہ تاج محل کی وقعت ان کی نظر میں اس لئے نہ تھی کہ وہ قحط زدہ رعیت کی کمائی سے بنایا گیا تھا اور وہ اس کی مثال موجودہ اجیر لی سٹی سے دیا کرتے تھے۔

شانتا ہونہار تھی۔ اس میں جہاں عورتوں کی تمام خوبیاں موجود تھیں۔ وہاں قدرت نے اسے مردوں کے عزم و استقلال اور قوت عمل سے سرفراز کیا تھا۔ کارل مارکس کے فلسفہ سوشلزم اور ٹراٹسکی کے نظریہ کمیونزم کے مطالعہ سے اس کے دماغ کی نشوونما ہوئی جس نے اس کی جد و جہد کے لئے ایک وسیع میدان عمل پیدا کر دیا۔ ہندوستان جیسے ملک میں اسے سب سے بڑی دشواری اپنے ہم خیال ساتھی تلاش کرنے میں پیدا ہوئی۔ اسے یہ دیکھ کر سخت تعجب ہوا کہ اس قدامت پسند بزرگوں، سرمایہ پرستوں اور مذہب کے حامیوں کے علاوہ مفلوک الحال اور نوجوان طبقہ بھی اس کا ہمنوا نہ تھا۔ اس وجہ سے شانتا کو کچھ پژمردہ کر دیا۔ اسے ہر وقت چند باعمل ساتھیوں کی تلاش رہنے لگی ——— اپنے ارادے میں کامیابی کی کوئی صورت نہ دیکھتے ہوئے۔ اسے ایک نیا راستہ اختیار کرنا پڑا۔ اس نے قصبہ کے بچوں کی ایک تربیت گاہ قائم کی۔ ظاہرا اسکا طریقہ تعلیم وہی تھا جو دوسرے تعلیمی اداروں کا۔ مگر وہ خفیہ طور پر اشتراکی خیالات بچوں کے ذہن نشین کراتی تھی۔ اس کی کوششیں اس بات پر صرف ہوتی تھیں کہ یہ نئے دماغ اعلیٰ تربیت پا کر ہندوستان کے موجودہ معاشی نظام کا تختہ الٹ دیں۔ یہ راستہ جو شانتا نے

اختیار کیا۔ گو دیر طلب ضرور تھا مگر اس میں کامیابی ہی کامیابی نظر آتی تھی وہ جانتی تھی کہ اوائل عمر میں دیا ہوا سبق ہمیشہ یاد رہتا ہے اور بچہ کو شروع میں جس سانچے میں ڈھالو ڈھل جاتے ہیں۔ اس لئے وہ اپنی پوری کوشش "مذہب انسان کے لئے افیون ہے" "سرمایہ داری دنیا کی موجودہ بے چینی اور انتشار کا باعث ہے" کے مفہوم سمجھانے پر صرف کرتی تھی۔ اس کے خلوص اور محبت نے تمام بچوں کو اس کا گرویدہ بنا دیا تھا۔ اور وہ بھی ان سے ماں کی طرح محبت کرتی تھی۔ اپنے آپ کو بچوں میں گھرا دیکھکر اس کی خوشی کی انتہا ہوتی تھی۔ اس کا سب سے پہلا سبق ہندوستان کی پوجا سے شروع ہوتا تھا۔ تمام بچے دو زانو ہو کر قومی گیت گاتے اور اپنی جنم بھومی کو آزاد کرانے کی قسم کھاتے تھے۔ وہ کہتے "ماں! ہم تیری پوجا کرتے ہیں۔ ماں! ہم غلام ہیں۔ ہماری کمزوری نے تجھے نڈھال کر دیا ہے مگر اب ہم اپنے کو منظم کر رہے ہیں ماں! اب ہم میں شکتی آتی چلی ہے اب وہ دن دور نہیں ماں! جب ہم تجھ سے تمام تکلیفوں اور ذلتوں سے رہا کریں گے۔ رہا کریں گے ــ رہا کریں گے ــ تیری عظمت کی قسم ماں! ہم تجھے رہا کریں گے۔ اس کے بعد وہ انہوں اخلاق و محبت کی تعلیم دیتی۔ وہ کہتی "انسان انسان سب برابر ہیں۔ محبت اور ما رتفاعِ انسانی سے بلند کوئی مذہب نہیں۔ ہماری اپنی چیزوں میں دوسروں کا بھی حصہ ہونا چاہیئے۔ مذہب ہمارے "مذہب" ایک مہا پاپ ہے۔ یہ چالاک آدمیوں کا بنا ہوا ایک جال ہے۔ یہ ہماری ترقی میں ایک زبردست رکاوٹ ہے۔ یہ ایک بدرو ہے جہاں تمام گندگیاں جمع ہوتی ہیں۔ نہ ہم ہندو ہیں اور نہ مسلمان ہمارا کسی مذہب سے کوئی تعلق نہیں۔ ہم سب ہندوستانی ہیں اور صرف ہندوستانی ہندوستان ہی ہمارا دھرم ہے اور ہندوستان ہی ہمارا بھگوان۔

جغرافیہ پڑھاتے وقت وہ کہتی "ہمارا ملک ایک بہت بڑا ملک ہے دنیا کا کوئی ملک اس کی برابری نہیں کر سکتا۔ یہاں گنگا جیسے بڑے بڑے دریا ہیں۔ جو ہماری دھرتی کو سینچتے ہیں۔ ہمالیہ جیسے عظیم الشان پہاڑ ہیں۔ جو بارش برساتے اور ہمیں دشمنوں سے محفوظ رکھتے ہیں زرخیز میدان ہیں جہاں کی زمین سونا اگلتی ہے۔ پرکیف وادیاں اور سرسبز وادیاں اور سرسبز مرغزار ہیں جن کے قدرتی نظارے وجدانی کیفیت طاری کر دیتے ہیں۔ ہمارے دیش میں دنیا کی تمام چیزیں پیدا ہوتی ہیں۔ قیمتی معدنیات نایاب جانور اور بہترین اشیائے خوردنی کا مکمل ذخیرہ ہے۔ یہاں کے موسم یہاں کی آب و ہوا یہاں کے گرم سرد اور معتدل طبقے قدرت کے بیش بہا تحفے ہیں۔ بسنت اور برسات کے مہینے ہمارے دلکشی کی شوبھا ہیں۔" تاریخ کے سبق میں وہ انگریزوں کو دغاباز اور بزدل کے ناموں سے پکارا کرتی انکے ظلموں کو کہانیوں اور قصوں کے پیرائے میں بیان کرتی بیان کرتے وقت اس کے غصہ کی انتہا ہوتی تھی۔ انتقام کے جذبہ سے اس کا چہرہ تمتما اٹھتا تھا بچے بھی اس کے ہم زبان ہو کر انتقام پکارنے لگتے تھے۔

یہ سب کچھ خفیہ ہوتا تھا۔ بچوں کے والدین کو اس کا ذرا علم نہ تھا اور اگر کسی کو کچھ معلوم بھی تھا تو وہ شانتا کے دلی ارادوں سے ناآشنا تھے۔ انہیں اس انقلاب کا ذرا علم نہ تھا جو شانتا ان بچوں کے ہاتھوں سرزمین ہند میں رونما کرانا چاہتی تھی۔ اس کی منہمک کوششوں سے درسگاہ نے بہت جلد ایک مستحکم صورت اختیار کر لی۔ بچوں کے کیرکٹر اور اخلاق نے لوگوں کے دلوں کو موہ لیا وہی بچے جو اپنا سارا وقت کھیل کود اور شرارتوں میں گذارتے تھے اب شانتا کی تربیت سے صلح جو اور امن پسند شہری بن گئے تھے۔ لیکن سرکاری طور پر منظور شدہ نہ ہونا درسگاہ کا سب سے بڑا نقص تھا۔ اور اسی نقص کی وجہ سے والدین اپنے بچوں کے زیادہ سال اس پر برباد نہ کرتے تھے اس نقص نے شانتا کی سکیم کو ایک زبردست دھکا پہنچایا۔ مگر اس نے ہمت نہیں ہاری بلکہ اس کی تکمیل کے لئے رات کا وقت ان بچوں کے لئے صرف کرنے لگی جو سرکاری مدرسوں میں داخل ہو جایا کرتے تھے۔

ایک دن جب شانتا حسب معمول بچوں کی تعداد کا جائزہ لے رہی تھی اس نے نسیم کو غیر حاضر پایا۔ رخصت کی کوئی درخواست نہ پاکر اس نے نسیم کو بلا بھیجا نسیم آج غیر معمولی طور پر خوش تھا۔ روزمرہ کی نسبت آج کا لباس بھی زیادہ رنگین تھا وہ آتے ہی شانتا کی گود میں بیٹھ گیا اور کہنے لگا ماں! بڑے بھائی آئیں گے ہم سب لوگ باہر جا رہے ہیں۔ یہ کہہ کر اس نے اپنی رخصت کی درخواست شانتا کے ہاتھ میں دیدی۔ اس میں لکھا تھا۔ نسیم کا بڑا بھائی روس سے واپس آ رہا ہے میں اسے اپنے ساتھ

بھی لئے جا رہا ہوں۔ اس لئے چار روز کی معافی دی جائے —— روس تمہارے بھائی روس سے واپس آ رہے ہیں؟۔ روس سے؟ ! شانتا نے ننھے نسیم کی پیشانی کو چومتے ہوئے کہا۔ اس کے تمام جسم میں ایک برقی رو دوڑ گئی۔ اس کا دل اضطراب اور بے چینی کے ساتھ ساتھ ایک قسم کی خوشی بھی محسوس کرنے لگا۔ وہ کچھ زیادہ پوچھنا چاہتی تھی مگر نسیم کی جلدی نے اسے اس کا موقع نہ دیا۔ اور اسے اپنے تمام سوالات پانچویں روز کیلئے ملتوی کرنے پڑے۔ اس عرصہ میں اس نے اپنے دل سے ہزاروں سوالات پوچھ ڈالے۔ مختلف خیالات نے اس کے دماغ پر تسلط جما لیا کبھی کہتی روس کی مقدس سرزمین سے آ رہا ہے۔ اسے میرے سے زیادہ وہاں کے معاشی اور صنعتی نظام کا علم ہوگا۔ اس کے نفاذ میں کیا دقتیں اور دشواریاں پیش آئیں ان سب کو وہ خوب جانتا ہوگا۔ اور وہ یہ بھی جانتا ہوگا کہ ہندوستان میں سوشلزم کا تجربہ کہاں تک کامیاب ہو سکتا ہے مذہب کی کسمپرسی اور درگت کو اس نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہوگا۔ اور ہاں مجھے بھی تو چند ہم خیال ساتھیوں کی تلاش ہے کیا وہ میرا ہم خیال ہوگا۔ وہ میرا ہم خیال نہ ہوا تو کیا ہوگا —— کیا نام ہے! روس کس واسطے گیا وہاں کتنے عرصہ ٹھہرا! ان میں سے مجھے کچھ بھی تو معلوم نہیں۔ نہیں نہیں! مجھے قبل از وقت کوئی رائے قائم نہیں کرنی چاہیے میں اس کی شکل تک سے واقف نہیں۔ اس کے عادت واطوار اور خو بو کا پہلے مجھے علم ہونا چاہیئے! —— مگر وہ تو روس سے آ رہا ہے! اسی ادھیڑ بن میں اس نے اپنا سارا دن گذار دیا۔ اپنے آپ کو زیادہ تیار کرنے کے لئے Land of no Religion اور Soviet Russia جیسی ضخیم کتابوں کا جنہیں وہ کئی بار پڑھ چکی تھی مطالعہ کر ڈالا۔ اسی رات باپ بیٹیوں میں کافی دیر تک سیاسی حالت پر گفتگو ہوتی رہی۔ دوران گفتگو میں اس کے بتانے سے پنڈت جواہر لعل نہرو کے اس طویل خط کا ذکر کیا جس میں انہوں نے مخلوط شادیوں کی حمایت کی تھی۔ انہیں پنڈت جی کے خیالات سے پورا اتفاق تھا۔ وہ خود مخلوط شادیوں کے حق میں تھے اور باہمی میل جول اور محبت کی شادیوں کو بڑی وقعت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ ان کے بس کی بات ہوتی تو وہ سوئمبر کی قدیمی رسم کا ہندوستان میں نفاذ کرا دیتے۔

مگر شانتا شادی بیاؤں کے معاملہ میں کچھ بے حس واقع ہوئی تھی وہ اسے ضروری خیال کرتی تھی۔ سوشلزم کے خشک فلسفہ نے اس کے خیالات کو بھی خشک بنا دیا تھا اور وہ محبت اور پریم کی باتوں کو فضول تضیع اوقات اور رومانٹک تزنی خیال کرنے لگی تھی۔ جب کبھی پنڈت جی اس سے شادی کے بارے میں کچھ کہتے تو وہ صاف انکار کر دیتی اور اگر وہ زیادہ اصرار کرتے تو "دیکھا جائیگا" کہکر ٹال دیتی تھی۔ اس لئے وہ اب اس معاملہ میں کچھ نہ کہتے تھے۔ لیکن جب شانتا کی زبانی انہوں نے نسیم کے بھائی بابت سنا تو ان کی پرانی خواہش پھر عود کر آئی۔ وہ شانتا کو سمجھانے لگے۔ بیٹی! تیرا پتا بوڑھا ہوا۔ اب کوئی دن کا مہمان ہے۔ تیرا گھر آباد ہو یہ اس کی سب سے بڑی اچھا ہے تو اکیلی ہے۔ سارا سماج تیرا ویری ہے۔ چاہتا ہوں کہ اپنی زندگی میں تیرا ہاتھ کسی شریف عالی خاندان اور باہمت شخص کے ہاتھ میں دیدوں۔ جو میرے بعد تیری دیکھ بھال کر سکے تجھے خوش رکھ سکے۔ بیٹی! خاندان کا نام تجھ سے ہے۔ تو نے شادی نہ کی تو خاندان کا چراغ گل ہو جائیگا۔ میری آشاؤں پر پانی پھر جائے گا اور میری آتما کو کبھی شانتی نصیب نہ ہوگی پتا کے وچاروں نے شانتا کو دلی صدمہ پہنچایا۔ مگر وہ اپنے ارادہ میں کسی قسم کی تبدیلی نہ کر سکی وہ اس بات پر مجبور تھی کہ شادی نہ کرے۔ اسے خیال تھا کہ شادی ہو جانے پر میں ملک و قوم کے لئے زیادہ مفید نہ رہونگی۔ میری تمام سرگرمیاں مدہم پڑ جائیگی۔ خانگی فرائض اور اولاد کی پرورش مجھ پر دوسری ذمہ داریاں عائد کر دینگے۔ اور میں اپنے دلی آرادوں کی تکمیل نہ کر سکوں گی پتا کے مقابلہ میں میں اپنے دیش کی پکار کو پہلے سنوں گی۔ اور ہاں اگر شادی کی بات ہے تو مجھے نسیم کے بھائی کا خیال بھی چھوڑنا پڑے گا۔

انہیں خیالات میں سوچتے ہوئے شانتا کو نیند آ گئی۔ صبح اٹھتے ہی اپنے روزمرہ کے کاموں میں مشغول ہو گئی۔ آج مطلق اس نے نسیم کے بھائی کا خیال نہیں کیا۔ دوسرے دن بھی وہ اٹھی اشنان اور کھانے سے فارغ ہو کر جانے کی تیاری کرنے لگی۔ کہ اتنے میں پنڈت جی صبح کی سیر سے واپس آ گئے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ

آج وہ آدھے راستہ سے لوٹ آئے ہیں ان کے ہاتھ میں اخبار کا پرچہ
تھا۔ پژمردہ چہرہ خوشی کے آثار نمایاں تھے۔ اس خیال سے کہ کہیں پتاجی
پھر شادی کی بات نہ چھیڑ دیں شانتا فوراً دوسرے دروازے سے چلی
گئی۔ اس سے کسی قسم کی ترش روئی کی نسبت ان کی آنکھوں سے اوجھل ہوجانا
زیادہ مناسب سمجھا۔ پنڈت جی نے اسے نہ پاکر زمرد کی طرح اخبار سکول
بھیج دیا۔ پوجا شروع ہوگئی تھی۔ نوکر نے اخبار میز پر ڈال دیا پوجا کے بعد شانتا
دوسرے کاموں میں مشغول ہوگئی سبق دیتے وقت اس کی نظر میز پر پڑی۔ اخبار
میں چھپے ہوئے فوٹو ایک نوعمر شخص تھا جس کی کشادہ پیشانی پر غور و تدبیر کی
شکنیں پڑی ہوئی تھیں۔ اعضا کا تناسب اور سڈول جسم اس کی خوبصورتی
کی ضمانت دے رہا تھا۔ بڑی بڑی آنکھیں اس کے جلال اور غضب کا
مظاہرہ کر رہی تھیں۔ اس کی نکھری ہوئی رنگت اس کے ظاہر و باطن
کو دکھا رہی تھی۔ اور اس کا دراز قد یہ ثابت کر رہا تھا کہ یہ شخص بہادر ہے
اس کے بشرے سے رعب بلند خیالی اور عزم و استقلال کی خوبیاں نمایاں
تھیں۔ وہ سر سے پانک انگریزی لباس پہنے ہوئے تھا۔ تصویر کی دلکشی اور
خوبصورتی نے شانتا کو سبق چھوڑنے پر مجبور کر دیا اس نے تصویر سے
متعلق اخبار کی عبارت کو پڑھنا شروع کیا۔ جوں جوں زیادہ پڑھتی جارہی
ووں ووں اس کی آواز زور پکڑتی جارہی تھی۔ اور اس میں جوشیلا پن
آتا جا رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو ڈبڈبائے آتے تھے۔
آخر ایک خاص لمحہ پر اس سے نہ رہا گیا۔ اس نے اپنی پوری طاقت سے
انقلاب زندہ باد اور سلیم زندہ باد کا نعرہ لگایا بچے حیرت سے شانتا
کا منہ تک رہے تھے۔ ان کی کچھ سمجھ میں نہ آتا تھا۔ ان کو سمجھانے کے لئے
اس نے یوں پڑھنا شروع کیا۔ مشہور کمیونسٹ مسٹر سلیم اختر کی آمد۔
آپ دس سال پہلے بغرض تعلیم روس تشریف لے گئے تھے اسکو
یونیورسٹی سے تعلیم کی اعلیٰ ڈگری لینے کے بعد آپ نے روس میں مستقل
بود و باش اختیار کر لی .... امریکہ سے واپسی پر حکومت روس
نے شعبۂ نظم ونسق کا افسر اعلیٰ مقرر کر دیا جسے صاحب موصوف نے پانچ
سال تک بخوبی انجام دیا .... آپ کے ایما اور امداد پر چین
کی کمیونسٹ پارٹی نے چینی حکومت کے خلاف جاپان سے صلح کرنے پر
ایک زبردست ایجی ٹیشن شروع کیا .... ترکستان کی سرحد کے
کے معاملہ میں آپ میں اور حکومت روس میں کچھ اختلاف ہوگیا جس کی بنا پر
آپ نے اپنے عہدہ سے استعفا دے دیا۔ مگر آپ کیونسٹ پارٹی کے لیڈر کی
کی حیثیت سے مجلس شوریٰ میں برابر کام کرتے رہے اور کر رہے ہیں۔ صدر
کا ارادہ کانگریس کے سالانہ اجلاس میں شرکت کرنے کا ہے۔ کل وائسرے
آف انڈیا جہاز سے بمبئی اتریں گے۔ شاندار استقبال کی تیاریاں مکمل ہوچکی
ہیں اس کے بعد شانتا نے سلیم کی زندگی پر ایک مکمل دیباچہ پڑھکسنایا
اسے اب نسیم کے بھائی کی اصلیت کا علم ہوگیا تھا۔ اور وہ اب کوئی بات
پوچھنا نہ چاہتی تھی۔ اسے ضرورت تھی تو اس بات کی کہ سلیم کی شکل دیکھے
اس سے بات کرے اور اس کے خیالات کو سمجھے اس نے نہایت بے چینی
سے دوسرے دن کے اخبار کا انتظار کیا۔ دوسرے دن کے پرچے میں
سلیم کے شاہانہ سواگت کی کیفیت اور مختلف سوسائیٹیوں اور باشندگان
بمبئی کی جانب سے دئے ہوئے سپاسناموں کی تفصیل درج تھی۔ اور
یہ بھی لکھا تھا کہ آج شام کی گاڑی سے وہ اپنے وطن روانہ ہو جائیں گے۔ یہاں
سلیم کے استقبال کی تیاریوں کا اسے پہلے سے علم تھا سارا انتظام اس کے
پتا کے ہاتھ میں تھا۔ اور وہ بڑے انہماک سے اس کی تیاریوں میں مصروف
تھے عوام سلیم کی آمد کا بڑی بے چینی سے انتظار کر رہے تھے۔ سارا شہر
دلہن کی مانند سجایا گیا تھا۔ باشندگان شہر کی جانب سے ایڈریس دینے کا
شرف شانتا نے اپنے ذمہ لیا اور اس نے اپنی پوری کوششیں ایڈریس
کی تیاری میں صرف کر دیں۔ دوسرے دن صبح مقررہ وقت سے کئی گھنٹے
پہلے اسٹیشن پر عوام کا ہجوم ہونا شروع ہوگیا۔ گاڑی کے آتے ہی فضا
انقلاب زندہ باد ہندوستان زندہ باد اور سلیم زندہ باد کے نعروں سے
گونج اٹھی۔ سب سے پہلے شانتا نے کھدر کے سرخ پھولوں کا ہار سلیم کے
گلے میں ڈالا۔ دونوں کی نگاہیں دوچار ہوئیں اور ان دوربین نگاہوں نے
ایک دوسرے کو پہچان لیا۔ مزدور اور کسانوں نے سلیم کو اپنے
کاندھوں پر اٹھا لیا اور لوگوں نے اسے سر سے پانک عقیدت کے پھولوں
سے لاد دیا مشہور اشخاص سے تعارف کے بعد جلوس روانہ ہوا۔ جلوس
کی ترتیب نہایت سلیقہ سے کی گئی تھی۔ چار گھوڑوں کی گاڑی کو خوب
سجایا گیا تھا۔ اس میں سلیم کے علاوہ شانتا شانتا کے پتا اور سلیم کے
والد بیٹھے ہوئے تھے۔ مشہور بازاروں سے گذر کر جلوس ایک وسیع پنڈال

میں آکر ختم ہوا۔ جہاں شانتا نے اپنے ایڈریس پڑھ کر سنایا اور سلیم نے شکریہ ادا کرتے ہوئے اس کا جواب دیا۔ دوسرے دن اہل شہر کی طرف سے سلیم کو ایک پارٹی دی گئی جس میں شانتا نے سلیم کی صحت کا جام تجویز کرتے ہوئے کہا، ”دیش کو اس وقت آپ جیسے نیتاؤں کی سخت ضرورت ہے ہماری آپ سے پرارتھنا ہے کہ آپ اپنی باقی زندگی ہندوستان کی سیوا میں گذاریں۔ آپ کسی بات کی چنتا نہ کریں ہم آپ کی ہر آگیا کا پالن کرینگے۔

گو سلیم نے اپنی زندگی کا بڑا حصہ روس میں گذارا تھا۔ اس نے مکمل طور پر روسی معاشرت اختیار کرلی تھی۔ مگر وہ ہندوستان کو نہ بھولا تھا اس کی دلی خواہش تھی کہ روس سے زیادہ دیش کی سیوا کروں۔ مگر بعض واقعات نے اسے مجبور کر رکھا تھا۔ وہ اکثر سوچا کرتا تھا کہ اگر مزدوروں اور کسانوں کو شوسلزم کا صحیح مفہوم سمجھا دیا جائے اور انہیں اپنی کمزوری کا احساس دلایا جائے تو حالات بہت جلد بدل سکتے ہیں۔ مگر اس کیلئے اسے چند ہم خیال ساتھیوں کی تلاش تھی۔ گو وہ خفیہ طور پر ہندوستان میں کمیونسٹ پروپیگنڈا کرنیوالی پارٹی کی رہنمائی کرتا تھا۔ مگر وہ اس سے زیادہ مطمئن نہ تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ میں خود ہندوستان میں رہکر شوسلزم کے لئے زمین ہموار کروں ——— اپنی آمد پر اس نے ہندوستان کو بہت بدلا ہوا پایا عوام کی بے چینی اور افلاس نے اس کی ڈھارس بندھائی ملک پر کانگریس کے زبردست اثر و اقتدار نے اسے اس بات پر مجبور کر دیا کہ وہ اپنی آئندہ زندگی ہندوستان کی سیوا میں گذارے۔ اس کی نظر انتخاب سب سے پہلے شانتا پر پڑی۔ وہ اس کی ہم خیال تھی۔ باعمل تھی۔ اس کی طرح سماج و مذہب سے بیگانہ تھی خوبصورت تھی جوان تھی اور سب سے زیادہ یہ کہ سلیم شانتا کو چاہتا تھا اور شانتا بھی سلیم سے پریم کرتی تھی۔ اس نے سلیم کی خاطر اپنی ”ضد“ ترک کردی تھی اور اپنے پتا کا آشیرباد حاصل کرلیا تھا۔ سلیم اس کے لئے ایک سندر سپنا تھا منوہر کو تیا اور مہا سنگیت تھا۔ وہ اب اسے کسی طرح چھوڑنے کے لئے تیار نہ تھا۔ سلیم کا خیال اس کے ارادوں کی تکمیل تھا اس کے بغیر اسے اپنی اسکیم ادھوری نظر آتی تھی۔ دونوں ایک دوسرے سے بہت ہل مل گئے تھے ——— گورنمنٹ سلیم کی سرگرمیوں سے بے خبر نہ تھی۔ وہ پہلے ہی اس کی نظر میں چڑھ چکا تھا۔ مگر اس خیال سے کہ ہندوستان میں سلیم کا قیام عارضی ہے۔ وہ خاموش تھی۔ اب جب سلیم نے ہندوستان میں رہنے کا مکمل ارادہ کرلیا۔ تو اسے بھی خدشہ پیدا ہوا۔ اور سب سے پہلا کام جو اس نے سلیم کی سرگرمیوں کو روکنے کے لئے کیا وہ یکے بعد دیگرے اس کی دو کتابوں ”آج کا ہندوستان“ اور ”شہنشاہیت“ کو ضبط کرنا تھا ملک میں جو بھی دہشت انگیزی کا واقعہ ہوتا گورنمنٹ کی مشکوک نگاہیں سلیم پر ضرور پڑتی تھیں اکثر بار تو ایسا ہوتا تھا کہ ادھر کوئی واقعہ ہوا اور سلیم کی گھر کی تلاشی شروع ہوگئی۔ سیاسی سرگرمیوں کے علاوہ گورنمنٹ اس کے پرائیویٹ معاملات میں بھی دخل در معقولات دخل اندازی کرتی تھی۔ مگر یہ سب باتیں سلیم کو گوارا تھیں۔ وہ ایک کمیونسٹ کی حیثیت سے یہ سب کچھ جانتا تھا۔ البتہ شانتا کو اس کی کڑی نگرانی بری معلوم ہوتی تھی مگر وہ بھی رفتہ رفتہ اس کی عادی ہوگئی اور اس نے پریشان ہونا چھوڑ دیا۔ اور سچ تو یہ ہے کہ دونوں کو ایک دوسرے کی موجودگی میں پریشان ہونیکی کوئی ضرورت بھی نہ تھی۔

ایک رات شانتا اپنے مطالعہ کے کمرے میں نہ معلوم کن خیالات میں غرق تھی (شاید آنے والے واقعات کا تصور تھا)۔ کہ سلیم نے دروازہ کھول کر اندر آنے کی اجازت چاہی۔ شانتا نے تبسم آمیز نگاہوں کو جھکاتے ہوئے کہا۔

اور اگر اجازت نہ دوں تو؟!

سلیم۔ تو کچھ بھی نہیں، جب تک اجازت نہ ملے گی نہ آؤں گا۔

شانتا۔ اور اگر کبھی بھی اجازت نہ دوں تو؟!

سلیم۔ تو پھر..... کبھی...... نہ آؤں گا..... نہیں نہیں آؤں گا۔ مگر..........

شانتا۔ مگر کیا۔ پھر کبھی نہ آؤ گے... کیا ہم سے ناراض ہو جاؤ گے؟!

سلیم۔ ناراض! سلیم تم سے کبھی ناراض نہیں ہوسکتا شانتا تم جانتی ہو...... مگر پہلے مجھے آنیکی اجازت تو دیدیجئے۔

شانتا۔ اجازت! آپ داسی سے اجازت مانگ رہے ہیں

سلیم۔ داسی!

شانتا۔ ہاں داسی۔ آپ کی داسی۔ سلیم کی داسی ایک مہارشی

کی داسی ۔ آپ سے ہاتھ جوڑ کر کہتی ہے کہ آپ اندر تشریف لے آئیں ۔ آجائیے ۔ مجھے شما کیجئے ۔

سلیم کو بے اختیار ہنسی آگئی ۔ جسکا جواب شانتا کے تبسم ہونٹوں نے دیا ۔ سلیم برابر کی کرسی پر بیٹھ گیا ۔ شانتا اس سے اپنی اسکیم کے بارے میں تبادلہ خیالات کرنے لگی وہ کہتی تھی کہ مجھے اپنے مقصد میں توقع سے زیادہ کامیابی ہو رہی ہے ۔ شاید تمہاری مدد کے بغیر میری یہ سکیم ادھوری رہجاتی اور میرے ارادے پورے نہ ہوتے یہاں تک اب تم آگئے ۔ میری تمام امیدیں بر آئیں ـــ انسان کتنا مجبور واقع ہوا ہے ۔ کل تک میں جس بات پر پتاجی سے جھگڑا کرتی تھی آج اسی بات کی اقراری ہوں ۔ میرا تمام شریر لرز رہا ہے کہیں ایسا نہ ہو کہ میں راہ بھٹک جاؤں ۔ میرا مقصد فوت ہو جائے ۔ میری سکیم عملی جامہ نہ پہن سکے ، تم میرے جیون کی آشا ہو سلیم ! ولیش کی آزادی کی جھلک مجھے تم میں نظر آ رہی ہے ، اب تک اس دل کی مالک تھی ، آج اُسے تمہارے سپرد کرتی ہوں ۔ اس کی حفاظت کرنا اُسے روشنی دکھانا ۔ دیکھنا ! کہیں وہ اپنا مقصد نہ کھو بیٹھے ۔ ہاں اس مقصد سے مادر ہند کی امیدیں وابستہ ہیں ،

شانتا کی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آئے ، اس نے اپنا سر سلیم کے قدموں پر رکھ دیا ، سلیم نے اس کی پیشانی کو چوما ، رومال سے آنسو خشک کئے اور کہا دیوی ! سلیم تیری پوجا کرتا ہے ، ولیش سے پریم کرنے والی دیوی کی اور دیوی کے مہا آدرش کی پوجا کرتا ہے اس کے بعد دونوں مادر ہند کی تصویر کے آگے دو زانو ہو گئے اور کہنے لگے ، ماتا ہماری رکھشا کرنا ، ہمیں راہ دکھانا ، ہمارا مقصد ایک بڑا مقصد ہے ایسا نہ ہو کہ کہیں اسے بھول جائیں ۔

مادر ہند نے تمہاری پکار سن لی ، اب تم نسچنت رہو ، میرا آشیرباد تمہارے ساتھ ہے ، پنڈت ہردے نرائن نے کہا ۔

سلیم نے رخصت چاہی ، شانتا پنڈت جی کہنے لگی ۔

پتا جی !

پنڈت جی ۔ جی بیٹا !

شانتا ۔ اب آپ کی آتما کو شانتی نصیب ہو گی ؟

پنڈت جی ۔ ہاں بیٹا

شانتا ۔ اور آپ کی آشائیں پوری ہونگی ؟ !

پنڈت جی ، ہاں بیٹا !

شانتا ۔ مگر پتا جی ....

پنڈت جی ۔ مگر کیا بیٹا ! ۔

شانتا ۔ میرا .... میرا مقصد ؟ !

پنڈت جی ۔ تیرا مقصد ۔ بیٹا سچا پریم پن ہے ، اس میں مقصد کبھی نہیں کھویا جا سکتا ، یہ زندگی بھر تمہاری رہنمائی کریگا ۔

شانتا ، رہنمائی کریگا ! ـــ پتا جی آپ آرام کیجئے آپ میں بالکل ست نہیں رہا ، بخار نے آپ کو بہت کمزور کر دیا ہے کہیں ایسا نہ ہو ....

پنڈت جی ۔ نہیں نہیں بیٹا ، میں اپنی آنکھوں سے تیرا شبھ وواہ دیکھوں گا ۔ تیری ماں کے نصیب میں یہ نہ تھا ۔ وہ تو تیری جوانی کی آمد کا انتظار کئے بغیر ہی چلی گئی ، مگر میں ! ـــ میں کتنا خوش نصیب ہوں ! ـــ کتنا ! ! ـــ بیٹا ! آج ڈاکٹر سے کہنا کہ میری طبیعت اچھی ہے ، اور یہ بھی کہنا کہ اگر مناسب سمجھیں تو کوئی طاقت کی دوا تجویز کر دیں ، میرا دل بہت دھڑکتا رہتا ہے ، اور بعض وقت تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے نبض چلتے چلتے رک گئی ہو ، ان سے کہنا کہ نبض کل تک ضرور چلتی رہنی چاہیئے ، کل کا دن ایک شبھ دن ہے ، پریم کی وجے کا دن ہے ، میری شانتا کے وواہ کا دن ہے ، آہ ! میرے دل میں پھر درد شروع ہو گیا ذرا شیشی لادو بیٹا ۔ میں اپنی دوسری خوراک بھی پی لوں ، اس سے طبیعت ٹھیک ہو جائیگی ۔

دوا پینے کے بعد پنڈت جی لیٹ گئے ، شانتا نے لحاف اوڑھا دیا اور ان کے تلوے سہلانے لگی ، تھوڑی دیر میں پسینہ آکر طبیعت کو سکون ہوا ۔ اور کہنے لگے ۔

بیٹا ! معلوم ہے کل کیا ہو گا ۔

شانتا ۔ ہاں ! معلوم ہے ، کل میری شادی کا دن ہے ۔

پنڈت جی ۔ اور یہ بھی معلوم ہے کہ تمہیں کیا کرنا ہو گا ۔

شانتا ۔ مگر شادی تو سول میرج ایکٹ کے ماتحت ہو رہی ہے

پتاجی! ہندو مسلم رسم و رواج سے ہمیں کیا واسطہ؟! میں مذہب کی حامی نہیں، اور سلیم مجھ سے بھی زیادہ مذہب کا بدخواہ ہے۔

پنڈت جی۔ تم نہیں سمجھیں بیٹا۔ میرا مطلب ہے تمہارے سنگار سے

شانتا۔ سنگار؟!

پنڈت جی۔ ہاں سنگار۔

شانتا۔ اچھا پتا جی!!

پنڈت جی۔ بتاؤ تو کیا کیا کروگی؟۔

شانتا۔ خوشبو میں بسی ہوئی ساڑی پہنوگی، ماتھے پر چندن کا ٹیکہ ہوگا، اور مانگ میں سندور، ریشمی موباف سے گندھی ہوئی زلفیں دونوں شانوں پر ڈال لونگی، رنگین چوڑیاں!! اور کیا ہاتھ بھی رچاؤں بابا؟! مجھے تو زیور کا شوق نہیں مگر جب تم کہتے ہو تو پیروں میں پازیب اور باہوں میں جوشن باندھ لوں گی۔

پنڈت جی۔ اور کیا بیٹا؟!

شانتا۔ اور کیا! میرے ہاتھوں میں پھولوں کی جے مالا ہوگی میری نیم باز آنکھیں تسلیم و رضا کا اقرار کرینگی اور میں اپنے خاموش لبوں سے نمسکار کہتے ہوے جے مالا سلیم کے گلے میں ڈال دونگی۔

پنڈت جی، پھر کیا ہوگا۔ بیٹا؟!

شانتا، ہمارا آتم اور شن چلے گا، دو دل یکجا ہوکر دیش کی سیوا کریں گے۔

پنڈت جی۔ ایشور کرے وہ گھڑی جلد آئے!

رات زیادہ جا چکی تھی، پنڈت جی کو نیند آگئی، وہ سو گئے، مگر شانتا جاگتی رہی اسے ان کی بے چینی کے خیال نے نہ سونے دیا۔

صبح ہونے میں کچھ دیر تھی، مگر اندھیرا بالکل نہ تھا، چاند کی نکھری ہوئی چاندنی ہر چیز کو نمایاں کر رہی تھی، ندی کا صاف پانی آئینہ بن رہا تھا۔ دریائی پرندے اجالے کے خوف سے پہاڑوں پر جانے کی تیاریاں کر رہے تھے، درختوں کی سبک شاخیں ہوا میں جھولا جھول رہی تھیں، نسیم سحر ہر مخمور کلی کو غنچہ بنانے میں مصروف تھی اور کلیوں نے اپنی چٹک سے تمام فضا کو معطر کر رکھا تھا، شانتا دائمی مسرت کے خیال میں مست صبح کی آمد کا انتظار کر رہی تھی،

اس کی انگڑائی اور اس کا ہر تبسم کائنات کو روشنی اور گویائی میں تبدیل کر رہا تھا۔ اور وہ مسرت آمیز کپکپی کے ساتھ کہنے لگتی تھی، آج کا دن ملاپ کا دن ہے! اور آج کی رات ملاپ کی رات ہوگی!!

—— پتاجی! آپ یہ سب دیکھنے کیلئے زندہ رہیں، شانتا ہوگی اور سلیم ایک پران دو کایا! اب ہم کبھی جدا نہ ہونگے۔

اب ہم کبھی نہ ملیں گے!

اب ہم کبھی جدا نہ ہونگے!

اب ہم کبھی نہ ملیں گے! سلیم نے دوبارہ کہا۔

کیوں؟! کون؟ سلیم!

ہاں سلیم! مجبور و بیکس سلیم!

یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟!

اپنی گرفتاری کی خبر سنا رہا ہوں۔

گرفتاری؟!

ہاں گرفتاری، جلا وطنی

جلا وطنی؟!! کیوں؟!

یہ سب کچھ بعد میں معلوم ہو جائیگا، مجھے جانیکی اجازت دو! رخصت شانتا!

آپ جا رہے ہیں؟!

تمہاری یاد کو لئے ہوئے، کوسوں دور! مگر تم سے قریب!!

ذرا ٹھہر جاؤ! پتاجی کہتے تھے کہ آج مجھے سنگار کرنا ہوگا، تم نے بہت جلدی کی! ابھی تو میں نے کپڑے بھی نہیں بدلے! اشنان بھی نہیں کیا! ذرا بیٹھو اتھوڑا سا صندل ہی گھس لوں!! اور ہاں ابھی جے مالا بھی تو نہیں گوندھی! دیکھونا! مجھے کیا کیا کرنا ہے سکھیاں آجاتیں تو کام بٹ جاتا!۔ ارے! تم تو سچ مچ جا رہے ہو!

میرے پاس زیادہ وقت نہیں شانتا۔ مجھے آج صبح ہی شہر چھوڑ دینا پڑیگا

تو پھر ہم کبھی نہ ملیں گے؟!

جبتک دیش آزاد نہ ہو جائے!

دیش آزاد ہوگا!۔ تمہارے جانے سے؟!

ہاں، مجھے پورا یقین ہے۔ میری یہ جلا وطنی اور بدیشی حکومت کا یہ ظلم میرے ہموطنوں کو جگا دیگا۔ انتقام کی آگ ان کے سینوں میں

بھڑک اٹھے گی، اور سامراج کا جوا اپنے کاندھوں پر سے اتار پھینکیں گے، اور...... بس اب وقت نہیں رہا سپاہی نے ہاتھوں میں ہتھکڑی ڈالتے ہوئے کہا، شانتا کی چیخ اور گرنے سے پنڈت جی کی آنکھ کھل گئی لیکن انہوں نے بہت جلد پھر آنکھیں بند کرلیں، مگر ٹھہری ہوئی پتلیوں کیساتھ، سلیم نے آخری بار دونوں کیطرف دیکھا اور۔

کچھ قافیہ کی بابت

عندلیب شادانی

ستمبر ۳۸ء کے "کلیم" میں پروفیسر محمد عبد اللہ کامل ایم اے نے "علامہ کیفی[1] اور سیماب اکبر آبادی" کے عنوان سے ایک طویل مضمون تحریر فرمایا ہے، موصوف کا بیان ہے کہ :۔

"ماہنامہ شاعر (آگرہ) میں ناظمینِ اردو کے سلسلہ میں علامہ کیفی پر ایک مضمون دو قسطوں میں نکلا جس میں (اُن کی مثنوی) "جگ بیتی" کا ذکر بھی آگیا اور مضمون نگار سیماب اکبر آبادی نے "جگ بیتی" اور اُس کے قابل مصنف کی دل کھول کے تعریف کی ہے .... لیکن مضمون کے آخر میں چند بے بنیاد سے اعتراضات بھی جڑ دئے ہیں"۔

انھیں "چند بے بنیاد سے اعتراضات" کی تردید کی غرض سے پروفیسر صاحب نے یہ مقالہ سپردِ قلم فرمایا ہے۔ سیماب صاحب نے "جگ بیتی" پر دو قسم کے اعتراضات کئے ہیں۔ ایک وہ جن کا تعلق قوافی سے ہے اور دوسرے وہ جو زبان سے متعلق ہیں۔ دوسری قسم کے اکثر اعتراضات غالباً پروفیسر صاحب کے نزدیک بھی صحیح ہیں۔ اس لئے آپ نے اُن کی تردید نہیں کی۔ صرف تین اعتراضوں کا جواب دیا ہے اور اس ضمن میں سب سے زیادہ اہم بات جو آپ نے کہی ہے وہ یہ ہے کہ دہلی سے باہر رہ کر دہلی والوں کی زبان پر اعتراض کرنے کا حق کسی کو حاصل نہیں۔ اگر آپ کا یہ نظریہ صحیح تسلیم کر لیا جائے تو یقیناً سیماب صاحب کو یہ حق نہیں کہ کیفی صاحب پر اعتراض کریں اس لئے کہ "علامہ" کیفی دہلوی ہیں اور سیماب صاحب صرف اکبر آبادی۔ مگر مشکل یہ ہے کہ کبھی کبھی دلّی سے باہر رہنے والوں کی بات بھی صحیح ہوتی ہے۔ مثلاً "علامہ" کیفی نے "ٹھمک کی چال" لکھا اور یقیناً خلافِ محاورہ اور غلط لکھا۔ اور سیماب صاحب نے "ٹھمک چال" کہا اور بلاشبہ صحیح کہا۔ پروفیسر صاحب کا خیال ہے کہ "ٹھمک چال" غالباً پورب کی زبان ہے۔ مگر سید احمد دہلوی صاحب، فرہنگِ آصفیہ نے بھی "ٹھمک چال" ہی لکھا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ "ٹھمک چال" پورب کی زبان نہیں بلکہ خاص دہلی کی زبان ہے۔

سیماب صاحب نے "جگ بیتی" کے قوافی پر جو اعتراضات کئے ہیں اُن کی تردید کے لئے پروفیسر صاحب نے اپنے مقالہ کے شروع میں تقریباً وہ سب کچھ نقل کر دیا ہے جو قافیہ کے متعلق اس فن کی بعض عربی کتابوں میں درج ہے۔ لیکن افسوس ہے کہ آپ کی اس "توضیح و تشریح" سے مسئلۂ زیرِ بحث اور زیادہ اُلجھ گیا اور ناواقفوں کے لئے غلط روی کا ایک نیا راستہ کھل گیا۔ سطورِ آئندہ میں جن امور سے بحث کی گئی ہے اُنھیں اچھی طرح ذہن نشین کرنے کے لئے پہلے فنِ قافیہ کی بعض اصطلاحوں کا سمجھ لینا ضروری ہے۔

اس میں شک نہیں کہ اہلِ ایران نے اصولِ قافیہ عربوں سے لئے ہیں۔ لیکن خود بھی ان میں کمی بیشی کی ہے۔ مثلاً اہلِ عرب کے نزدیک حروفِ قافیہ صرف چھ ہیں۔ لیکن ایرانیوں کے یہاں نو ہیں۔ چنانچہ کسی معلم نے اپنے طلبہ کی سہولت کے لئے اُنھیں ایک شعر میں نظم بھی کر دیا ہے۔

رِدْی و رِدْف و دگر قید بعد ازاں تاسیس
دخیل و وصل و خروج و مزید و نائرہ دال

---

[1] پنڈت برجموہن دتاتریہ صاحب کیفی دہلوی

اِن میں سے چار (یعنی ردف۔ قید۔ تاسیس۔ دخیل) "روی" سے پہلے آتے ہیں۔ اور باقی چار "روی" کے بعد۔ اردو میں خروج، مزید اور نائرہ[1] نہیں آتے، موجودہ بحث کے لئے صرف روی۔ قید۔ تاسیس اور دخیل کی تعریف جان لینا کافی ہے۔

روی۔ وہ حرف ہے جس پر قافیہ کا مدار ہوتا ہے بلکہ اصل قافیہ اسی کو کہنا چاہیئے۔ جو لفظ کسی مصراع یا بیت کے آخر میں واقع ہوا ہو (یعنی قافیہ) اُس کے آخری حرف کو "روی" کہتے ہیں۔ مثلاً قبر اور صبر میں حرف "ر" روی ہے۔ روی کے لئے ضروری ہے کہ وہ حرفِ اصلی ہو (جیسے قبر اور صبر میں)۔ اصلی کا یہ مطلب ہے کہ اگر اُسے علیحدہ کرلیں تو باقی کلمہ بے معنی ہو جائے۔ مثلاً اگر قبر اور صبر کی "ر" علیحدہ کرلی جائے تو "قب" اور "صب" باقی رہے گا جس کے کوئی معنی نہیں۔ لہٰذا "ر" اصلی ہوئی۔ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ جن دو لفظوں کو باہم قافیہ قرار دیا جاتا ہے ان میں سے ایک لفظ میں "روی" اصلی ہوتی ہے اور دوسرے میں زائد۔ ایسی صورت میں حرفِ زائد کو حرفِ اصلی کے حکم میں قرار دیتے ہیں۔ مثلاً بندی اور ہندی میں "ی" حرفِ روی ہے۔ لیکن بندی کی "ی" اصلی ہے اور ہندی کی "ی" نسبتی زائد۔[2]

قید۔ حروفِ علت کے علاوہ وہ حرف ساکن، بلا فاصلہ، روی کے قبل واقع ہوا ہو اُسے "قید" کہتے ہیں۔ مثلاً مرد اور سرد میں حرفِ "ر" قید ہے، اور "د" حرفِ روی۔ ابر اور صبر میں "ب" حرف قید ہے اور "ر" حرفِ روی۔ ("و" اور "ی" اگرچہ حروف علت ہیں لیکن یہ بھی حروفِ قید ہوسکتے ہیں۔ بشرطیکہ ان کے پہلے کا حرف مفتوح ہو جیسے دَور اور غَور کا واو۔ اور دَیر اور غَیر کی "ی" دَور اور دَیر کی دال اور غور اور غیر کی "غ" مفتوح ہے)

دخیل اور تاسیس۔ یہ دونوں حرف ساتھ ساتھ آتے ہیں اس لئے دونوں کی تعریف ایک ساتھ بیان کی جاتی ہے۔ حرف روی کے پہلے اگر کوئی حرف متحرک ہو اور اس متحرک کے قبل حرفِ الف واقع ہو تو اُس الف کو "تاسیس" کہتے ہیں اور اس الف اور روی کے درمیان والے متحرک حرف کو "دخیل" کہتے ہیں۔ (حرفِ تاسیس صرف الف ہی ہوتا ہے) مثلاً خادر اور یادر میں حرفِ "ا" تاسیس ہے اور "د" دخیل۔ اسی طرح مائل اور سائل میں حرفِ "ا" تاسیس ہے اور ہمزہ دخیل۔

اب ہم اصل بحث کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ کیفی صاحب کے یہ اشعار:-

> سماں وہ شام کا دلکش تھا اور سہانا تھا
> وہ جھٹپٹا تھا کہ فطرت کے رُخ کا بُرقا تھا

> بتاؤ وہ تھے کون سے واقعات　　جنھوں نے کیا ذہن کا انضباط
> مستوجب اس کا ہے کہ سزا اس کو دیں دراز
> میرا نہ اس کی عمر کا کچھ بھی کریں لحاظ

نقل کرنے کے بعد پروفیسر صاحب لکھتے ہیں۔ کہ

"ان اشعار پر سیماب صاحب کو یہ اعتراض ہے کہ ان کے قوافی بالصوت قائم کئے گئے ہیں۔ حالانکہ یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ قافیہ ہمیشہ سے صوت ہی پر مبنی ہے۔ اور جہاں کتابت اور صوت میں اختلاف ہو، وہاں صوت ہی قابلِ اعتبار سمجھی جاتی ہے۔ اردو فارسی میں "ع" کا تلفظ "ا" مطابق ہے۔ اسی طرح ط اور ت کا تلفظ ایک ہی ہے۔ ز۔ ذ۔ ظ وغیرہ بھی ایک ہی آواز دیتے ہیں اور شعرائے اردو فارسی کے کلام میں انکی مثالیں بھی موجود ہیں:

پروفیسر صاحب کا یہ کہنا یقیناً درست ہے کہ قافیہ ہمیشہ سے صوت پر مبنی ہے (لیکن سیماب صاحب کے اعتراض کا مطلب بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ کیفی صاحب نے ایسے الفاظ کو قافیہ کیا ہے جن کے حرفِ روی اگرچہ اردو میں ہم آواز سمجھے جاتے ہیں مگر در اصل وہ ہم آواز نہیں ہیں اور اسی وجہ سے فارسی اور اردو کے شعرا نے کبھی ایسے الفاظ کو ہم قافیہ قرار نہیں دیا جن میں حرفِ روی مختلف ہو)

مگر کیفی صاحب کے قافیوں کو صحیح ثابت کرنے کے لئے پروفیسر صاحب کا یہ دعویٰ یکسر بے بنیاد ہے کہ شعرائے فارسی اور اردو کے کلام میں ایسی مثالیں موجود ہیں جن میں مختلف حروف کو آواز کی مشابہت کی بنا پر قافیہ کیا گیا ہے۔ لطف یہ ہے کہ پروفیسر صاحب نے اپنے دعوے

---

[1] خروج۔ مزید۔ نائرہ اردو میں بھی آتے ہیں۔ بعض کے نزدیک خروج و مزید تو اردو میں آتے ہیں مگر نائرہ نہیں آتا۔ مگر میرے خیال میں نائرہ بھی اردو میں پایا جاتا ہے۔　　آزاد انصاری

[2] بندی کی یا بھی اصلی نہیں ہے بلکہ یائے تانیث ہے۔ مگر بندی اور ہندی کو ہم قافیہ کرنا درست ہے کیونکہ دونوں کی ی مختلف المعنیٰ ہے۔ یعنی بندی کی ی یائے تانیث اور ہندی کی ی یائے نسبتی۔

کے ثبوت میں جو اشعار مثال کے طور پر پیش کئے ہیں انمیں یہ خصوصیت موجود ہی نہیں۔ دراصل موصوف کو مغالطہ ہوا ہے اور اس کا سبب فنِ قافیہ سے ناواقفیت ہے جیسا کہ سطورِ آئندہ کے مطالعہ سے قارئین پر واضح ہوجائیگا۔

پروفیسر صاحب کا خیال ہے کہ فردوسی کے اس شعر میں:-

چہ گفت آں خداوندِ تنزیل و وحی
خداوندِ امر و خداوندِ نہی

وحی کی "ح" اور نہی کی "ہ" قافیہ ہے۔ مگر درحقیقت ایسا نہیں ہے۔ وحی اور نہی میں مدارِ قافیہ (یعنی روی) حرف "ی" ہے۔ "ح" اور "ہ" حرفِ قید ہیں۔ اور حرفِ قید کا اختلاف اہلِ فن کے نزدیک جائز اور اساتذہ کے یہاں مروج ہے۔ البتہ قُربِ مخرج کا لحاظ رکھا جاتا ہے۔ مثلاً سعدی کے اس شعر میں:-

چہ مصر و چہ شام و چہ برّ و چہ بحر
ہمہ روستایند و شیراز شہر

اب بھی اگر پروفیسر صاحب یہ فرمائیں بحر کی "ح" اور شہر کی "ہ" قافیہ ہے تو کسی تجربہ کار بزرگ کے قول کے مطابق ہمارے لئے "خموشی" کے سوا چارہ نہیں۔ اس لئے کہ بحر اور شہر میں مدارِ قافیہ (یعنی حرفِ روی) "ر" ہے۔ جس کا اختلاف اہلِ فن کے نزدیک کسی طرح جائز نہیں۔

حائے حطی اور ہائے ہوز کے قافیے کی دوسری مثال پروفیسر صاحب نے یہ پیش کی ہے:-

یک طاس ہریسۂ صباحی بہتر ز ہزار مرغ و ماہی (سعدی)

یہاں بھی پروفیسر صاحب نے دھوکا کھایا ہے کہ صباحی کی "ح" اور ماہی کی "ہ" کو قافیہ سمجھا ہے۔ حالانکہ مدارِ قافیہ یعنی روی صباحی اور ماہی کی "ی" ہے۔ "ح" اور "ہ" یہاں حرفِ دخیل ہے۔ اور حرفِ دخیل کا اختلاف جائز ہے۔ سعدی کے اس شعر سے:-

کہ اے شاہِ آفاق، کسریٰ بعدل اگر من نہ مانم تو مانی بفضل

پروفیسر صاحب نے یہ استدلال کیا ہے کہ عدل کی "د" کو فضل کی "ض" کے ساتھ (جو عربی تلفظ کے لحاظ سے "د" کی ہم آواز ہے) قافیہ کیا گیا ہے۔ مگر یہاں بھی پروفیسر صاحب کو مغالطہ ہوا ہے۔ دراصل مدارِ قافیہ (روی) اس شعر میں عدل اور فضل کا "ل" ہے۔ اور "د" اور "ض" حرفِ قید ہیں، جن کا اختلاف جائز ہے اس شعر میں "د" اور "ض" کو قافیہ کی ضرورت سے ہم آواز فرض کرنا قطعاً غیر ضروری ہے۔

"ض" کو (عجمی تلفظ کے لحاظ سے) "ز" کا ہم قافیہ ثابت کرنے کے لئے پروفیسر صاحب نے سرمد کی یہ رباعی نقل کی ہے۔

سرمد بتمامِ عشق بازی نہ برند تا سر ندہی لبسر فرازی نہ برند
مے خورمے خور اگر حضورِ حق ٰ اہی تا کردہ گناہ پیشِ قاضی نہ برند

آپ کے نزدیک سرمد نے "قاضی" اور "بازی" میں "ض" اور "ز" کو قافیہ کیا ہے۔ مگر ایسا سمجھنا سرمد بچارے پر تہمت لگانا ہے اس لئے کہ بازی اور قاضی میں "ز" اور "ض" حرفِ دخیل ہیں[1]، مدارِ قافیہ یعنی روی نہیں ہیں، اور دخیل کا اختلاف جائز ہے جس کی ایک مثال سطورِ بالا میں نقل کی جاچکی۔ سودا کے اس شعر میں:-

نہایت اک کنیزِ کہنہ عصر کہ دلکش نظم ہے جس کی ہر اک نثر

پروفیسر صاحب کے نزدیک عصر کا "ص" اور نثر کی "ث" قافیہ ہیں۔ مگر یہاں بھی وہی حرفِ قید سے ناواقفیت کا سامنا ہے۔ دراصل "ص" اور "ث" یہاں حرفِ قید ہیں جن کا اختلاف جائز ہے۔ مدارِ قافیہ (روی) اس شعر میں عصر اور نثر کی "ر" ہے نہ کہ "ص" اور "ث"۔ اسی طرح سودا کے اس شعر میں:-

چنانچہ میں جو یہ قصہ کیا نظم کہ ہووے تاقیامت رونقِ بزم

پروفیسر صاحب نے نظم کی "ظ" اور بزم کی "ز" کو قافیہ سمجھا ہے اور غلط سمجھا ہے کیونکہ یہ حرفِ قید ہیں اور مدارِ قافیہ (روی) "م" ہے۔

"س" اور "ص" کو ہمقافیہ ثابت کرنے کے لئے آپ نے میر انیس کا یہ شعر پیش کیا ہے:-

ہے سر تھا ازل سے تھی خطا اصل میں جس کی
ماما اُسے دیندار نہ تھا نسل میں جس کی

مگر یہاں بھی آپ کا قیاس غلط ہے۔ مدارِ قافیہ (روی) اصل اور نسل کا

---

[1] یہاں "ض" اور "ز" دخیل ہرگز نہیں بلکہ حروفِ روی ہیں۔ اگر ان کو حروفِ دخیل مان لیا جائے تو اول شعر کے دونوں مصرعوں میں عیب ایطا پیدا ہو جائے گا۔ اس رباعی میں سرمد نے بالصرحت قافیے استعمال کئے ہیں۔ (آزاد انصاری)

"ل" ہے۔ "ص" اور "س" حرفِ قید ہیں جن کا اختلاف اساتذہ کے نزدیک جائز ہے۔

بسطورِ بالا کے مطالعہ کے بعد قارئین خود فیصلہ کرسکتے ہیں کہ فردوسی، سعدی، سرمد، سودا اور میر انیس میں سے کسی نے بھی قافیہ میں حرفِ روی کا اختلاف جائز نہیں رکھا، جیسا کہ کیفی صاحب نے کیا ہے۔ ان اساتذہ کے کلام سے پروفیسر صاحب نے جو مثالیں پیش کی ہیں وہ ان کے دعوے کو ثابت کرنے کے بجائے باطل کر دیتی ہیں۔

اس ضمن میں آپ نے صرف ایک مثال البتہ ایسی پیش کی ہے جو کسی حد تک آپ کے مفیدِ مطلب کہی جاسکتی ہے اور وہ مولانا حالی کے یہ دو شعر ہیں۔

اے شعر دلپذیر نہ ہو تو تو غم نہیں ہر تجبہ حیف ہے جو نہ ہو دلگداز تو
ہوتی ہے سچ کی قدر یہ بیقدریوں کے بعد اس کے خلاف ہو تو سمجھ اسکو شاذ تو

ان اشعار میں بلاشبہ "ز" اور "ذ" کو اردو میں ہم آواز ہونے کی بنا پر قافیہ قرار دیا گیا ہے۔ مگر یہ صرف مولنا حالی کی اصلاحی جدت ہے جو خود شاذ کا حکم رکھتی ہے اور اس سے یہ بات کسی طرح ثابت نہیں ہوتی کہ اردو فارسی کے اکثر اساتذہ مختلف حروف کو (اپنی زبان میں ہم آواز ہونے کی بنا پر) قافیہ قرار دیتے تھے، اس لئے کہ اردو اور فارسی کے اساتذہ کے کلام سے جو مثالیں پیش کی گئی ہیں اُن میں سے کسی ایک میں بھی مدارِ قافیہ یعنی حرفِ روی کا اختلاف موجود نہیں۔ فنِ قافیہ سے ناواقفیت کی بنا پر اگر پروفیسر صاحب نے حرفِ قید اور حرفِ دخیل کو روی سمجھکر مختلف حروف کا ہمقافیہ ہونا جائز قرار دیدیا تو اساتذہ کا اسمیں کیا قصور۔

اب رہا یہ سوال کہ جو حروف عربی میں مختلف الصوت ہونے کے باوجود اردو میں ہم آواز ہوگئے ہیں۔ اُنھیں قافیہ قرار دیا جاسکتا ہے یا نہیں۔ مثلاً صباح اور سیاہ۔ نبات اور نشاط۔ نماز اور لحاظ۔ شاذ اور راز۔ طرز اور فرض۔ استاد اور فیاض۔ تعویذ اور تقریظ۔ خبیث اور خسیس۔ اناث اور خواص۔ اخلاص اور افلاس۔ برقع اور خرقہ وغیرہ، کو آپس میں قافیہ کرنا چاہیے یا نہیں؟ تو جب قافیہ کا مدار ہر حالت میں صوت ہی پر ٹھہرا تو میرے نزدیک ہماری موجودہ مصلحتیں اس امر کی متقاضی ہیں کہ اب اس قسم کے قوافی کو جائز تسلیم کرکے رواج دینا چاہیئے، اور آج سے نہیں بلکہ سنہ ۱۹۳۰ء سے میں اس خیال کا حامی ہوں جبکہ پہلی پہل طہران (پایۂ تختِ ایران) کی ایک ادبی مجلس میں مجھے اس موضوع پر تقریریں سننے اور اظہارِ خیال کرنے کا اتفاق ہوا تھا۔ ایران کے نوجوان شعراء کی ایک کثیر جماعت فارسی زبان میں اس اصلاح کو رائج کرنے کی کوشش کر رہی ہے۔ چنانچہ اُسی مجلس میں جس کا میں نے ابھی ذکر کیا متعدد شعرا نے اپنی نظموں میں اس قسم کے قافیئے استعمال کئے تھے۔ ایک نظم کا صرف پہلا شعر مجھے یاد رہ گیا ہے۔

روزے من و دلدار، کجا؟ در کمر کوہ
کردیم درِ شکوہ و بابِ گلہ مفتوح

ہاں یہ ضروری ہے کہ جب تک ہمارے موجودہ رسم الخط میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی لفظ کی ہیئتِ اصلی کو برقرار رکھا جائے۔ ورنہ املا کی تبدیلی سے الفاظ کے مسخ ہو جانے کا اندیشہ ہے۔ مثلاً برقع کو خرقہ کی رعایت سے برقہ یا زیبا کی رعایت سے برقا لکھنا کسی طرح صحیح نہیں۔ قوافی میں الفاظ کی مکتوبی شکلوں کا اختلاف ابتداءً نظر کو اجنبی معلوم ہوگا۔ مگر رفتہ رفتہ آنکھیں اس کی عادی ہو جائیں گی۔

"جگ بیتی" میں اُن تین شعروں کے علاوہ جو مضمون کے ابتدائی حصہ میں نقل کئے جاچکے ہیں۔ تیرہ شعر ایسے اور بھی ہیں جن کے قوافی سیماب صاحب کے نزدیک غلط ہیں۔ پروفیسر صاحب نے اپنے مضمون میں اُن اشعار کو نقل نہیں کیا تاکہ معترض کے اعتراض کی اہمیت اور اپنے جواب کی کمزوری قارئین پر کھلنے نہ پائے۔

قابلِ اعتراض اشعار نقل کرکے سیماب صاحب نے سب کے متعلق صرف یہ کہا ہے کہ ان تمام اشعار کے قوافی میرے نزدیک غلط ہیں۔ عیوب کی کوئی تشریح نہیں کی۔ مگر ہمارے فاضل پروفیسر صاحب نے ذرا وضاحت سے کام لیا ہے اور قابلِ اعتراض اشعار کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا ہے۔

(۱) وہ اشعار جن کے قافیوں میں حرفِ روی یا اس سے ماقبل کی حرکت میں اختلاف ہے!

(۲) وہ اشعار جن میں سیماب (صاحب) کے نزدیک ایطا کا عیب ہے۔

ایطا کی تعریف پروفیسر صاحب نے اس طرح بیان کی ہے۔

"ایطاء۔ ایک ہی قافیہ کو دوبارہ لانا" اور مثال دینے کے بعد مزید تشریح کے لئے اتنی عبارت اور بڑھائی ہے کہ "اگر لفظ ایک ہی ہوں لیکن معنی مختلف ہو جائیں تو یہ عیب نہیں رہتا۔

آگے چل کر آپ نے ایطا کے متعلق خود اپنی رائے کا اظہار فرمایا ہے،

"لیکن یہ عیب (ایطا) ایسا ہے جس کا ارتکاب اردو کے ہر مستند شاعر کے دیوان میں پایا جاتا ہے .... میرے خیال میں ایطا کو عیب سمجھنا ہی بڑا عیب ہے۔ کیونکہ اس عیب سے کوئی شاعر بری نہیں"

پروفیسر صاحب کا یہ بیان حد درجہ مغالطہ انگیز ہے۔ اول تو آپ نے ایطا کی جو تعریف بیان کی ہے وہ اس درجہ مجمل ہے کہ اہل فن کے سوا دوسرے لوگ اس سے ایطا کی نوعیت کو صحیح طور پر نہیں سمجھ سکتے۔ اس کے علاوہ آپ کا یہ کہنا کہ ایطا (اپنے پورے اصطلاحی مفہوم کے ساتھ) تمام مستند شعرا کے یہاں پایا جاتا ہے، سراسر خلاف واقع ہے۔ ایطا کی بعض صورتیں اس درجہ معیوب ہیں کہ اساتذہ تو کیا مبتدی بھی اُن سے گریز کرتے ہیں۔ اور اگر انھیں جائز قرار دیا جائے تو پھر قافیہ کا وجود ہی غیر ضروری ہو جاتا ہے۔

جیسا کہ پروفیسر صاحب نے بیان کیا ایطا تکرار قافیہ کا نام ہے۔ مطلع میں اس کا استعمال کسی طرح جائز نہیں کیونکہ ایسا کیا جائے تو قافیہ کی غرض ہی فوت ہو جائے گی۔ کاش پروفیسر صاحب کسی مستند شاعر کا کوئی مطلع ایسا پیش کرتے جس میں قافیہ کے پورے لفظ کی تکرار موجود ہوتی۔ میرا خیال ہے کہ اس کی مثال۔ علامہ کیفی کی "جگ بیتی" کے سوا اور کہیں نہیں مل سکتی۔ کیفی صاحب فرماتے ہیں:-

ابھی تم کو دلی میں لے جائیں گے　　　　وہاں نوٹ کے عقدے کھل جائیں گے

پروفیسر صاحب ازراہِ کرم بتلائیں کہ اس شعر میں "جائیں گے" کو قافیہ مانا جائے یا "لے" اور "کھل" کو۔ اگر "جائیں گے" قافیہ ہے تو ضرور ایطا ہے۔ کیا پروفیسر صاحب اردو کے کسی مستند شاعر کے کلام سے اس قسم کے ایطا کی مثال پیش کر سکتے ہیں؟ اگر نہیں تو پھر آپ کا یہ بلند بانگ دعویٰ کس طرح تسلیم کیا جائے کہ ایطا اردو کے ہر مستند شاعر کے دیوان میں پایا جاتا ہے۔ اسی قسم کا ایک اور شعر سیماب صاحب نے "جگ بیتی" سے پیش کیا ہے وہ یہ ہے۔

ویسے وہ شریف آدمی ستھے　　　　لکھے پڑھے، نیک وہ بڑے تھے

اب اس میں یا تو "آدمی" اور "بڑے" کو قافیہ مانئے جو سراسر لغو ہے یا "تھے" کو قافیہ قرار دیجیے، اگر اسی کا نام قافیہ ہے تو پھر قافیہ کی ضرورت ہی کیا ہے؟ قافیہ کے پورے لفظ کی تکرار (جس کی مثال میں کیفی صاحب کے دو شعر پیش کئے گئے) ایطا کی ایک شکل ہے۔ اس کے بعد ایطا کی دو قسمیں کی گئی ہیں،

(۱) ایطائے خفی (۲) ایطائے جلی۔

ایطائے خفی۔ جب کلمہ کی تکرار خوب ظاہر نہ ہو تو اُسے ایطائے خفی کہتے ہیں جیسے دانا اور بینا۔ حالانکہ ان دونوں لفظوں میں "ا" زائد اور مکرر ہے۔ مگر کثرتِ استعمال کے باعث جزوِ کلمہ معلوم ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اکثر اساتذہ نے ایطائے خفی کے استعمال میں مضائقہ نہیں کیا۔ میری ذاتی رائے یہ ہے کہ ایطائے خفی کو جائز سمجھنا چاہیے۔ خصوصاً جبکہ وہ فعلِ ماضی کا کوئی صیغہ ہو۔ جیسے "لگی" اور "رہی"۔ مومن:-

پھر دل میں مرے لگی ہے آتش　　　　نالے سے برس رہی ہے آتش

علمِ ہندسہ کا ایک مسلّمہ اصول ہے کہ "جو چیزیں کسی ایک خاص چیز کے برابر ہوتی ہیں وہ آپس میں بھی برابر ہوتی ہیں" مثلاً زید اور بکر ہم سن ہیں، اور عمرو اور بکر بھی ہم سن ہیں تو زید اور عمرو بھی ہم سن ہوں گے۔ اسی طرح جو الفاظ کسی ایک خاص لفظ کے ساتھ قافیہ کئے جا سکتے ہیں انھیں آپس میں بھی قافیہ قرار دیا جانا چاہیے۔ مثلاً "لگا" اور "خدا" ہم قافیہ ہیں۔ "رہا" اور "خدا" بھی ہم قافیہ ہیں تو "لگا" اور "رہا" بھی ہم قافیہ ہوئے۔ یہی وجہ ہے کہ صیغۂ ماضی کے قافیے اساتذہ کے یہاں عام طور پر ملتے ہیں۔

ایطائے جلی۔ جب کلمہ کی تکرار خوب ظاہر ہو تو اُسے ایطائے جلی کہتے ہیں۔ مثلاً ہمارے دوست لالہ دمودر داس صاحب گلشن کے اس شعر میں،

مٹایا تو نے سارا لطفِ صحبت خشم گیں ہو کر
چلا ہوں تیری محفل سے بہت اندوہ گیں ہو کر

خشم گیں اور اندوہ گیں میں کلمہ "گیں" کی تکرار نہایت واضح ہے۔ اس کے بعد جو کچھ رہتا ہے یعنی خشم اور اندوہ، اس میں باہم قافیہ ہونے کی صلاحیت موجود نہیں۔ لہٰذا خشمگیں اور اندوہگیں کا قافیہ حد درجہ معیوب ہے۔ اسی قبیل سے ہیں درد مند اور حاجت مند۔ ستم گر اور افسوں گر۔ سیمیں اور زرّیں وغیرہ۔ اس صورت کے علاوہ ایطائے جلی کی اور بھی کئی شکلیں ہیں مثلاً (۱) اسم کے بعد علامتِ جمع "ان"۔ جیسے دشمنان اور دوستان میں۔ لالہ دمودر داس گلشن:-

ہے تجھے کتنا خیال دشمناں　　　　کچھ تو کر ظالم لحاظِ دوستاں

(۲) اسم کے بعد علامتِ جمع "ون" جیسے پھولوں اور کانٹوں میں:-

لالہ دمودر داس گلشن :-

نہ اُس کو بَیر کانٹوں سے نہ اُس کو چاہ پھولوں کی
حقیقت ایک ہو جس کے لئے پھول اور کانٹوں کی

(۳) اسم کے بعد علامتِ جمع "یں" جیسے کتابیں اور میزیں۔

لالہ دمودر داس گلشن :-

ڈالیں پہ لگی ہوئی تھیں میزیں
میزوں پہ چُنی ہوئی کتابیں

اس قسم کے تمام قافیے حد درجہ معیوب ہیں۔ بلکہ انھیں قافیہ سمجھنا ہی غلطی ہے۔ کیا پروفیسر صاحب اس قسم کے قوافی اساتذۂ اردو کے کلام سے پیش کر سکتے ہیں۔ کیا اسے ایطا نہیں کہتے۔ کیا اس قسم کے ایطا کا ارتکاب اردو کے ہر مستند شاعر کے دیوان میں پایا جاتا ہے۔ کیا اسی اصلاح کو آپ اور علامہ کیفی اردو میں مروج کرنا چاہتے ہیں؟

شعر کے لئے وزن اور قافیہ دو چیزیں ضروری سمجھی گئی ہیں اور اس کا مقصد شعر میں آہنگ و موسیقی پیدا کرنا ہے۔ جن لوگوں سے قافیہ کی قید نہیں نبھ سکتی اُنھیں چاہیئے کہ نظم مُعریٰ BLANK VERSE لکھیں اور اگر وزن کی قید بھی گراں ہو تو پھر نثر میں طبع آزمائی فرمائیں۔ تاکہ اردو زبان "ان بیشمار اشخاص کے خیالات سے محروم نہ رہے جو اعلیٰ تخیل رکھتے ہیں اور تکلفات کو نباہ نہیں سکتے۔"

اب رہا ماقبل حرکت روی کا اختلاف (جبکہ روی ساکن ہو) جیسے مشکل اور کاکل میں تو اس سے بھی شعر کے آہنگ و موسیقی کو معتد بہ صدمہ پہونچتا ہے۔ البتہ اگر حرفِ وصل کے آجانے سے روی متحرک ہو جائے تو حرکتِ ماقبلِ روی کا اختلاف سماعت پر چنداں گراں نہیں گزرتا۔ اسی وجہ سے اساتذہ نے اسے جائز رکھا ہے۔ مثلاً اگر مسافر اور جوہر کا قافیہ ہو تو معیوب کیونکہ یہاں حرف روی یعنی "ر" ساکن ہے اور اگر مسافری اور جوہری قافیہ ہو تو جائز، کیونکہ یہاں حرف وصل یعنی "ی" کے آجانے سے "ر" متحرک ہو گئی، اور دونوں لفظوں میں "ری" کی تکرار سے آہنگ پیدا ہو گیا۔ فہو المقصود۔

خاتمہ کلام پر "جگ بیتی" کے متعلق ایک بات عرض کرنا چاہتا ہوں کیفی صاحب نے اس مثنوی میں مختلف بحریں اختیار کی ہیں تاکہ "یک رنگی" (monotony) کی بے لطفی جاتی رہے۔ یہ مسئلہ کہ یہ جدت کس حد تک قابلِ قبول ہے ایک جداگانہ بحث کا محتاج ہے مگر ایک بات یقینی ہے کہ یہ چیز اتنی نئی نہیں ہے جتنی پروفیسر صاحب سمجھتے ہیں۔ امیر خسرو علیہ الرحمۃ نے تنوع پیدا کرنے کی غرض سے مثنوی قران السعدین میں اکثر ابواب کا خاتمہ ایک غزل پر کیا ہے جس کی بحر مثنوی کی بحر سے مختلف ہے اس طرح پوری مثنوی میں اٹھارہ غزلیں مختلف بحروں میں موجود ہیں۔ اس کے علاوہ ابو نصر فراہی کی شہرۂ عالم تصنیف نصاب الصبیان بھی مختلف بحروں میں ہے اور خالق باری میں بھی تقریباً اٹھارہ مختلف بحریں پائی جاتی ہیں۔ موضوع سے قطع نظر یہ دونوں کتابیں مثنوی کی

ہر دل پہ جو درد کا بارِ گراں ہے اے دل
اور دل کے لئے وقت کہاں ہے اے دل
پہنچا ہی رہے آہ جو بھرنے ہی نہ پائیں
یہ آہ تو بس زبان کا دھواں ہے اے دل

حق کی ہے عدالت میں نرالی رنگت
ہوتا ہے جہاں قدر پہ باطل سے دعا
[illegible]
[illegible]

معمہ

میکش اکبرآبادی

علم انسان کی بنا مشاہدہ اور قیاس پر ہے یعنی کچھ چیزیں دیکھتا ہے اور کچھ چیزوں کو ان دیکھی ہوئی چیزوں کی مانند سمجھ لیتا ہے۔ مشاہدہ تمامتر توہمات اور تقلید علمی سے مرکب ہے "آفتاب آمد دلیلِ آفتاب" نہیں تو اذعان بھی کیا سکتے ہیں، رہ گیا قیاس تو وہ خود مشاہدہ کا تابع ہے

ترقی یافتہ صورت جہالت کی ہے علم اپنا
جو کچھ سمجھے وہی دیکھا جو کچھ دیکھا وہی سمجھے

دلیل ایک فریب ہے جس کے ذریعہ انسان اپنے آپ کو تسکین دینا چاہتا ہے یا مخاطب کو اپنا فریب دلفریب سمجھنے پر مجبور کرتا ہے۔ دلیل اس تکبر کا نتیجہ ہے جو جہل مرکب سے پیدا ہوتا ہے یعنی کسی چیز کے سمجھنے کی فضول کوشش زعم علمی کے تحت میں۔ دلیل خود کوئی سبب نہیں ہے بلکہ سبب کا علم ہے یعنی جب کوئی شئے یا واقعہ واقع ہو جاتا ہے تو اس واقع کو اپنے پہلے کے حاصل کئے ہوئے علم سے مطابق کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ جہالت کی انتہا یہ ہے کہ اگر ہمارا علم اس واقع سے مطابق نہ ہو تو بجائے اپنے علم کی صحت کے اس واقع کی صحت سے انکار کر دیا جائے۔

کائنات پر ذرا غور کیجئے اور یہ سوچئے کہ ہم جو کچھ جانتے اور محسوس کرتے ہیں وہ سب کا سب علم اعراض ہے مثلاً رنگ، فاصلہ، جہت، شکل نرمی، سختی، کمیت، کیفیت، وغیرہ لیکن ہمارے علم سے بالا اور برتر ہونے کے باوجود کوئی شئے ایسی ضرور ہے جسکو یہ اعراض لاحق ہیں اس لئے اعراض اپنے پائے جانے میں دوسرے کے محتاج ہیں۔

ہر چیز اپنے غیر سے اعراض اور اعتبارات ہی کی وجہ سے ممتاز ہے اور اعراض کا خود وجود نہیں ہے لیکن دنیا ہے کہ اعتبارات پر مٹی جاتی ہے اور حقیقت سے غافل ہے حقیقت کا انکار خود اپنا انکار ہے اور حقیقت واحد ہے اس لئے ایک ذرے کی حقیقت کو جان لینا تمام کائنات کی حقیقت جان لینا ہے اور حقیقت کی تلاش کا بہترین ذریعہ اپنی تلاش ہے دنیا اس وقت تک حقیقت سے بے خبر رہے گی جب تک حقیقت کو اپنے باہر تلاش کرے گی۔

دنیا کی ہر ایک شے کو جانا تو نے	تسخیر کیا ہے اک زمانہ تو نے
ہر شے سے زیادہ مستحق تھی تری ذات	افسوس اسی کو کچھ نہ جانا تو نے

حقیقت وجودِ محض ہے اور وجودِ محض میں اجتماع یا ارتفاع نقیضین محال نہیں ہے بلکہ واقع اور ثابت ہے اور عقلائے دہر مظاہرِ حقیقت کی صفات سے علم حاصل کرتے ہیں اور مظاہر کی صفات آپس میں اضداد بھی ہیں اس لئے ہمیشہ ان کو ایک نیا علم اپنے پرانے علم اور تجربے کے مخالف حاصل ہوتا رہتا ہے وہ سمجھتے ہیں ہم ترقی کر رہے ہیں حالانکہ وہ کولھو کے بیل کی طرح ایک ہی دائرے میں گردش کر رہے ہیں ایک قید سے نکلتے ہیں اور دوسری میں مقید ہو جاتے ہیں یہ سلسلہ کبھی ختم نہ ہوگا یہاں تک کہ موجودات کا سلسلہ ہی ختم ہو جائے اور یہ محال ہے یا یہ کہ ان لوگوں کو سکون حقیقی حاصل ہو جائے جو شاید موت سے تعبیر کیا جا سکے اور یا عرفان تام میسر ہو جائے مگر جب تک یہ علم

و اغراض حاصل کرتے رہینگے سکونِ حقیقی سے آشنا نہیں ہو سکتے حقیقت چونکہ ہستی محض ہو ان کی دسترس سے باہر ہے مفت صرف صفت ہی کو حاصل کر سکتی لہذا وہ علم جو اِن کی صفت کے علاوہ کس چیز کا ادارک کر سکتا ہے۔

(۲)

میرا قول خواہ کسی نظر سے دیکھا جائے مگر واقعہ یہ ہے کہ اسلام کورانہ تقلید کے بالکل خلاف ہے رائے کی آزادی جس کو اکثر علماء برا سمجھتے ہیں اسلام کا خاص اصول ہے (الذین یستمعون القول فیتبعون احسنہ) (قرآن) مذہبی معلومات کا دائرہ اس قدر تنگ کر لینا یہودی علماء اور ہندو برہمنوں کی سنت ہے کیونکہ سطحی عزت اور غیر حقیقی بزرگی بغیر اس کے حاصل بھی نہیں ہو سکتی۔ یہ سمجھ لینا ضروری ہے کہ تصوف یا شریعت جو بھی ہو قرآن کے علاوہ اور خلاف کوئی شئے نہیں ہے جس قدر حال قال جبے عمامے، مدرسے اور خانقاہیں توحید کے علاوہ ہیں سب باطل ہیں وہ جو انسانوں سے اپنی پوجا کراتے ہیں ان بتوں سے زیادہ قابلِ نفرت ہیں جو کعبے میں نصب تھے۔ مسلم کا انتہائی مقصد سوائے حق کے کچھ نہیں ہونا چاہیے۔

تصوفِ اسلام کا مطمحِ نظر ہمیشہ سے یہی ہے کہ وہ تمام مقاصد اور جذباتِ محبت کو ایک خدا سے متعلق کر دے اور سوائے خدا کے تمام معبودوں کو لائے نفی کی تلوار سے نیست و نابود کر دے خواہ وہ معبود آفاقی ہوں جیسے بت، مُلّا، پنڈت، زمان مکان یا انفسی ہوں جیسے حرص حسد ریا وغیرہ۔ غرض گناہ اور حرام تو ایک طرف اگر کوئی نماز پڑھتا ہے اور مقصد حق تعالیٰ نہیں ہے تو وہ نماز ہی نہیں ہے، عبادت بغیر عرفان کے لہو ولعب ہے، اور عرفان ہی عین حق ہے۔

وہ علما قابلِ افسوس ہیں جو طہارتِ جسم کے مسائل میں ایک دوسرے سے دست و گریباں رہتے ہیں طہارتِ قلب نہ خود حاصل کرتے ہیں نہ دوسروں کو اس کی طرف متوجہ کرتے ہیں خدا کی صفات اور عبادت میں شرکت سے بچنے کا وعظ سناتے ہیں اور وجود باری میں جو عین ذات اور مبدء صفات ہے لاکھوں بلکہ لاتعداد شریک سمجھتے ہیں اور وہ صوفیہ قابلِ نفرت ہیں جو شریعت کی نظری قیدوں سے خواہشاتِ نفسانی کی خاطر آزاد ہو کر تصوف کو بدنام کرتے ہیں حالانکہ تصوف انتہائی پابندی کا نام ہے۔

مقالاتِ زرّیں

وہ محفل میں تجھے سب سے بہتر دیکھ رہا ہے جو آنکھیں بچا کر دیکھ رہا ہے۔ اور گویا دیکھ ہی نہیں رہا ہے۔

گزشتہ صحبتوں کی یاد ایک خوش آواز طائر کی طرح آتی ہے۔ اور میرے کان کے پاس سے گاتی ہوئی نکل جاتی ہے۔

جھوٹے کا آغاز اس قدر بلند ہوتا ہے کہ لوگ گردنیں اٹھا اٹھا کر دیکھتے ہیں۔ لیکن انجام میں لوگوں کو غاروں میں جھک جھک کر دیکھنا پڑتا ہے۔

جب مسرت و الم، راحت و ایذا، مدح و مذمت، یہ سب تجھے ایک نظر آنے لگیں، تو مژدہ ہو کہ تو کور نہیں رہا۔

تیرا خیال آتے ہی، میرا دل کانپ اٹھتا ہے، جس طرح بوند پڑتے ہی تالاب میں حلقہ بن جاتا ہے۔

حسینوں کی سرد مہریوں نے یہ بات میرے دل پر نقش کر دی کہ حُسن کے نقش و نگار ہمیشہ پتھر ہی پر بنائے جاتے ہیں۔

اے منفعلِ حسن! اس طرح اپنی جفاؤں کی معافی نہ مانگ، دیکھ میرے تمام جسم کا خون عرقِ انفعال میں تبدیل ہوا جاتا ہے۔

مقنن مجرموں کے واسطے دفعات تیار کرتا ہے اور الہامی شاعر زندگی کا قانون پیش کرتا ہے۔

میرے سامنے کروڑوں مُردے ایسے ہیں جو بات کرتے ہیں اور سانس لیتے ہیں۔ اور اُن میں کا ایک میں بھی ہوں۔

بعض جاہل ہمہ دانی کے مدعی ہوتے ہیں، حالانکہ انھیں نہیں معلوم کہ اُن کی جہالت عجائباتِ عالم میں سے شمار کی جاتی ہے۔

(از مقالاتِ زرّیں مصنفہ جوش ملیح آبادی مطبوعہ ۱۹۲۱ء)

کھڑ بڑ خاں

سید نذیر حسین بی اے

"چھوکرے میرے پائپ کے لئے ایک کوئلہ لا" یہ الفاظ بڑی بی نے اُسوقت کہے جب اس کے منہ میں پائپ تھا۔ یہ پائپ اُس نے تمباکو سے بھر کر منہ کو لگا لیا تھا مگر اتنی توفیق نہ ہوئی کہ چولہے میں آگ روشن تھی اس میں سے ایک کوئلہ اٹھا کر رکھ لیتی۔ بڑی بی کے مُنہ سے حکم صادر ہونا تھا کہ پائپ کی چلم میں آگ کی ایک لَو اٹھی اور منہ سے دھواں نکلنے لگا۔ کوئلہ کہاں سے آیا اور کونسی نامعلوم طاقت اسے لائی۔ یہ ہم باوجود تحقیق معلوم نہ کرسکے۔ چھوکرا وغیرہ کوئی نہیں آیا۔

"شاباش" بڑی بی نے اپنے سر کو ذراسی جنبش دیکر کہا۔ "اچھا تو اب کھیت کیلئے ایک گُڈا بنانا ہے۔ قریب ہی رہنا شاید کسی کام کے لئے ضرورت پڑے۔"

بڑی بی آج صبح سویرے دن نکلنے سے پہلے اُٹھ بیٹھی تھی اس خیال سے کہ کھیت کے لئے جانور ماڑانے ایک گُڈا بنانا تھا جانور کھیت کا نقصان کرتے تھے۔ بڑی بی علاقہ بھر میں بڑی ہوشیار اور صاحب اثر ساحرہ مشہور تھی۔ وہ اگر چاہتی تو اپنے کھیت کے لئے ایسا عجیب وغریب گُڈا بنا لیتی جسے دیکھکر بڑے سے بڑے بہادر ڈر جاتے۔ مگر اس مرتبہ وہ خوشی کے گھر میں تھی اور تمباکو کے کشوں نے سونے پر سہاگے کا کام کردیا تھا۔ اس کا ارادہ تھا کہ اس مرتبہ کوئی ایسا حسین وجمیل گُڈا بنائے جو کسی فیشن ایبل جوبن کی صورت کا ہو۔ اسوقت وہ اپنے آپ سے یہ باتیں کر رہی تھی۔ "نوج میں اپنے کھیت میں اور اپنے گھر کے دروازے کے آگے بھوت چڑیل کی ایک صورت بناؤں اور بچوں کو ناحق ڈراؤں اگرچہ اس میں شک نہیں کہ میں ایسی چیزیں بنا سکتی ہوں اور ساحرہ ہوں"

اب سنئیے گُڈا کس شکل وصورت کا تھا۔ پیٹھ کی ہڈی کی جگہ بڑی بی کے گھر جھاڑنے کی جھاڑو تھی جس پر وہ آدھی رات کے وقت سوار ہوکر بار اڑتی پھرتی تھی۔ یا نہیں ایک ٹوٹی ہوئی کرسی کے دو بازو تھے ٹانگیں دو لمبی لمبی لکڑیاں تھیں جو بڑی بی نے جلاؤ لکڑیوں میں سے چھانٹ کر لگادی تھیں۔ پھیپھڑوں معدے اور انتڑیوں کی جگہ آٹے کا ایک تھیلا تھا جس میں بھُس بھر دیا تھا۔ سر کی جگہ ایک سوکھا ہوا کدو تھا جس کو تین جگہ سے کاٹ کر بڑی بی نے دو آنکھیں اور منہ بنا دیا تھا بیچ میں ایک لٹو سا بنا تھا جو ناک کی طرح معلوم ہوتا تھا۔

اس تپتے کو بنا کر بڑی بی نے یوں گوہر افشانی کی۔ "اچھا ہے۔ میں نے انسانوں کے کندھوں پر اس سے بڑے بڑے دیکھے ہیں میرے گُڈے کا سر ایسا ہی ہے جیسا کسی اچھے سے اچھے فیشن ایبل نوجوان کا ہوتا ہے۔"

کپڑوں کی جگہ بڑی بی کے معصوم شوہر کا جو اپنے زمانے میں ایک رسالدار تھے، ایک پرانا کوٹ تھا جس کی سلائیوں کفوں جیبوں اور بٹنوں

کے مقاموں پر کشیدے اور زر تار کا کام تھا، یہ کوٹ کہنیوں پر سے پھٹا اور جگہ جگہ سے تار تار تھا، اس کوٹ کی بائیں طرف چھاتی پر ایک سوراخ تھا جو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہاں کسی وقت کوئی ستارہ بطور تمغہ لگا ہوا تھا۔ واسکٹ پرانی مخمل کی ڈھیلی ڈھالی تھی جس پر پھول بوٹے بنے ہوئے تھے مگر پرانے ہو کر بہت ماند پڑ گئے تھے، پاجامے کی جگہ ایک پرانی برجس تھی، ٹانگوں میں دو پرانی ریشمین جرابیں تھیں جس کے سوراخوں میں سے ٹانگوں کی سوکھی سوکھی ہڈیاں صاف دکھائی دے رہی تھیں، سر پر بڑی بی کے شوہر کی بے بالوں والی ٹوپی تھی اور اس میں مرغی کا ایک پر طرّہ کی طرح کھڑا ہوا تھا۔

اس پتلے کو بنا کر بڑی بی نے اپنی جھونپڑی کے ایک کونے میں کھڑا کر دیا اور اس کی صورت کو دیکھکر ایک قہقہہ لگایا ایسا معلوم ہوتا تھا کہ پتلا زبان حال سے یہ کہہ رہا ہے کہ آؤ اور مجھے دیکھو، بڑی بی اس کی طرف دیکھکر بولی: "ہاں بلاشبہ تم دیکھنے کے ہی لائق ہو۔ میں نے جب سے میں جادوگرنی ہوئی بہت سے پتلے بنائے، مگر تو ان سب سے اچھا ہے اور سچ پوچھو تو کھیت میں کھڑا کرنے کے لائق نہیں، اور ہاں میں ایک چلم تو اور پی لوں پھر اسے کھیت پر لے چلوں گی"

بڑھیا تمباکو بھرتی جاتی تھی اور پتلے کو میٹھی میٹھی نگاہوں سے دیکھتی جاتی تھی۔ حقیقت یہ ہے چاہے اسے اتفاق کہو کاریگری کہو جادو کہو یہ پتلا سچ مچ انسان کا سا معلوم ہوتا تھا۔ اور چہرے پر ایک طرح متبسم یانہ تبسم نظر آتا تھا۔ گویا حضرت انسان کی حالت کو دیکھ دیکھ کر ہنستا ہے۔ بڑھیا اسے دیکھکر باغ باغ ہوئی جاتی تھی۔

یکایک پھر اُسنے چلا کر کہا: "چھوکرے چلم کے لئے ایک اور کوئلہ" اس کا یہ کہنا تھا کہ چلم میں پھر پہلے کی طرح ایک لو دکھائی دی، اس نے ایک لمبا کش لیا۔ تمباکو کا دھواں چلم سے نکل کر جھونپڑی میں پھیل گیا۔ بڑی بی کش پر کش لگاتی تھی اور کہتی تھی: "یہ پتلا تو اس قابل نہیں کہ میں اسے کھیت میں جانوروں کے ڈرنے کے لئے رکھوں یہ تو بڑے بڑے کام کرنے کے لائق ہے۔ جب کبھی جنگل کے ناچوں میں مجھے کوئی بہتر ساتھی نہیں ملا تو میں کئی دفعہ اس سے بُرے بُرے ساتھیوں کے ساتھ ناچی ہوں، میں تو اس کا مقابلہ دنیا کے اور پتلوں سے کراؤں گی جو اس سے بھی گئے گذرے ہوتے ہیں، میں اُسے دنیا میں بھیجوں گی جہاں اس کے بہت سے بھائی بند اسے ملیں گے ہاں میں تو اپنے پتلے کو انسان ہی بناؤں گی چاہے یہ ایک مذاق ہی ہو"

یہ کہکر بڑی بی نے پائپ اپنے منہ سے نکال کر پتلے کے منہ میں ٹھوس دیا اور کہنے لگی: "پی پی میری جان پی، تیری زندگی کا دار و مدار اسی پر ہے" لکڑی کے ایک پتلے سے اس طرح خطاب کرنا ایک نہایت عجیب و غریب بات معلوم ہوتی تھی لیکن ہم کو یاد ہوگا بڑی بی ایک بڑی ہوشیار جادوگرنی تھی، اس سے ایسی کرامات کا ظاہر ہونا کوئی بڑی بات نہیں، بڑی بی کا یہ کہنا تھا کہ پتلے نے اپنے منہ سے دھواں نکالا۔ یہ دھواں پہلے پہل خفیف سا تھا پھر ہر کش کے ساتھ زیادہ ہوتا گیا۔

بڑھیا یہ دیکھکر بولی "پئے جا میرے لال، تیری زندگی اسی میں ہے" بلاشبہ یہ ایک جادو کا کھیل تھا۔ پتلے نے پہلے آہستہ آہستہ پھر زور زور سے دھواں نکالنا شروع کیا۔ بڑھیا یہ دیکھکر اپنے بوڑھے ہاتھوں سے تالیاں بجانے لگی۔ اس نے اپنی آنکھوں اپنا جادو چلتا دیکھ لیا۔ جوں جوں پتلا دھواں نکالتا تھا اس کا چہرہ ایسا معلوم ہوتا تھا گویا سچ مچ انسان کا ہے۔

"شاباش میرے خوبصورت جوان" بڑھیا نے پھر چلا کر کہا "ہاں ایک کش اور زور سے" اس کے بعد اس نے پتلے کی طرف ایک مقناطیسی نگاہ سے دیکھکر کہا "کونے میں سست ہو کر کیوں کھڑا ہے، قدم بڑھا، دنیا تیری ہی ہے" اس حکم کی تعمیل میں پتلے نے ہاتھ پھیلائے، اور ایک قدم بڑھایا۔ مگر لڑکھڑایا اور گر پڑا، بڑھیا نے تیوری چڑھائی، اور تیز نظر سے دیکھکر اشارہ کیا، معاً پتلا قدم اٹھا کر چلنے لگا۔ بڑھیا پھر چلائی، "پی کمبخت پی، پی چیتھڑوں اور بھُس کی پوٹ پی پی کر دے سر پی، نہیں تو پائپ تیرے منہ سے کھینچ کر تجھے چولھے جھونک دونگی"۔ اس دھمکی پر پتلے نے پھر دھواں نکالنا شروع کیا، اور اس زور سے کہ جھونپڑی میں دھواں ہی دھواں ہو گیا، اب تو اس کے کپڑوں پر بھی جادو کا اثر ہونے لگا، اس کے سنہری تار چمکنے

لگے اور آنکھیں بھی چمکنے لگیں، بڑھیا نے اپنی مٹھی بند کی اور پتلے کو گھونسا دکھایا غصے سے نہیں بلکہ اس اصول پر کہ بعض کمزور ہستیوں کو عمل کرنے کے لئے ڈرانے دھمکانے کی ضرورت ہوا کرتی ہے۔" تیری صورت انسانوں کی سی ہے، میں تجھے حکم دیتی ہوں بول۔ پتلے نے سانس لیا اور بڑی کوشش کے بعد ایک دھیمی سی آواز نکالی" اماں غصے مت ہو میں تو بہتیرا بولنا چاہوں مگر عقل کے بغیر کیا خاک بولوں "۔

" ہاں ہاں " بڑھیا بولی" کیوں نہیں بول سکتا، جیسے اور تہی مغز بولتے ہیں تو بھی بولیگا، تو ہزاروں باتیں کہے گا، تجھ میں اتنی عقل ہے، تو تو مینا کی طرح باتیں کریگا" جو حکم" پتلے نے جواب دیا۔

" خوب بولا میرا اچھا لڑکا خوب بولا، تو تو سینکڑوں ہزاروں چچے ٹچلے چٹکلے بولیگا۔ میں نے تیری خاطر اتنی محنت کی ہے تو تو اتنا خوبصورت ہے کہ کسی جادوگرنی کا پتلا اتنا خوبصورت نہ رہیگا، میں نے مٹی کے موم کے، تنکوں کے، رات کے دھندکے، صبح کے دھندکے، سمندر جھاگ کے آتشدان کے دھوئیں کے، سب طرح کے پتلے بنائے، مگر تو ان سب سے اچھا ہے، غور سے سُن میں کیا کہتی ہوں "

" ہاں پیاری اماں دل وجان سے" پتلے نے کہا" ہاں دل وجان سے" بڑھیا بولی" دیکھ تو تیرے بولنے کا انداز کیسا اچھا ہے، اور تو نے اپنی واسکٹ کی بائیں طرف اپنا ہاتھ بھی تو رکھ لیا ہے گویا سچ مچ ہاتھ ہی ہے، جا دنیا میں جا کھیل کھا، جہاں سو میں ایک انسان بھی ایسا نہیں جس میں تجھ سے زیادہ خوبیاں ہوں ہاں تجھے دولت کی ضرورت ہے تو لے، میں نے تجھے الٹریڈو کی سونے کی کان کا ایک حصہ بخشا، قطب شمالی کے پچاس لاکھ انگورستان دیئے اسپانیہ میں ایک پورا محل مع اس کی آمدنی کے دیا۔ آ اب مجھے ایک چوما دے، دیکھ تو میں نے تیرے لئے کیا کیا کیا" اس کے بعد بڑھیا نے پتلے کے کان میں ایک لفظ کہا اور بولی کہ جب تو کسی امیر عہدہ دار یا سوداگر سے ملے تو یہی لفظ اس سے کہہ دینا، دیکھ خان بہادر عبد الکفنگف خاں سے یہ لفظ کہہ دینا، وہ فوراً تیرے حکم کی تعمیل کرے گا، وہ مجھے جانتا ہے اور میں اسے جانتی ہوں خان بہادر کے ایک لڑکی ہے بڑی خوبصورت، تیرا ظاہر اچھا ہے عقل بھی اچھی ہے جس کا حال تجھے اس وقت معلوم ہوگا جب تو اور لوگوں کی عقلوں کو دیکھیگا، حوصلے سے کام لینا، آہیں بھرنا، مسکرانا، ٹوپی ہلانا، مٹکنا بس لڑکی تیری ہی ہو جائیگی"

اب تو پتلا سچ مچ کا انسان معلوم ہونے لگا۔ اس کی نظریں بڑھیا کے چہرے پر پڑ رہی تھیں اور وہ کبھی کبھی اپنا سر بھی ہلاتا تھا۔ اب اسے کچھ لفظ بھی یاد ہو گئے تھے جو یہ تھے" حقیقت میں، واقعی، فرمائیے، ارشاد "قول مرداں جان دارد، ہرگز نہیں، آہ، اوہ، پتلا جوں جوں پائپ پیتا تھا، اس کی سب باتیں انسان کی سی معلوم ہوتی تھیں، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس کی جان تمباکو پینے اور دھواں نکالنے ہی میں ہے اور تمباکو کے پینے کے ساتھ اس کی زندگی کا خاتمہ بھی ہے"، بڑھیا اس رمز سے واقف تھی، اسی لئے اس نے کہا" پائپ لئے رہ، میں اسے پھر بھرے دیتی ہوں"

بڑی بی نے چلم کی خاک جھاڑی اور تمباکو رکھنے لگی، اس درمیان میں پتلا بیجان ہو کر گر پڑا، بڑھیا نے تمباکو چلم میں رکھکر زور سے کہا چھوکرے اس پائپ کے لئے ایک اور کوئلہ" فوراً چلم میں پھر آگ دکھائی دی۔ اور پتلے نے کھڑے ہو کر پہلے آہستہ آہستہ کش لگائے، پھر ٹھہر ٹھہر کر تمباکو پینا شروع کر دیا۔

بڑی بی پھر کہنے لگی، دیکھ میری جان، کچھ بھی ہو اس پائپ کو مُنہ سے الگ نہ کرنا تیری جان اسی میں ہے، پیتے رہنا اور دھواں نکالتے رہنا، اور کوئی تجھ سے پوچھے تو کہنا کہ میری صحت کے لئے یہی مفید ہے حکیم نے مجھ سے ایسا ہی کہا ہے، اور ہاں جب تو دیکھے کہ تمباکو ختم ہو رہا ہے تو کسی کونے میں الگ جا کر کہنا" چھوکرے میرے پائپ کے لئے ایک کوئلہ" اچھا اب خدا حافظ، اور دیکھ میرا یہ ڈنڈا بھی ساتھ لیتا جا"

پتلے نے ڈنڈا ہاتھ میں لیا، جو ہاتھ میں لیتے ہی سونے کی موٹھ والی ایک چھڑی ہو گیا" یہ ڈنڈا سیدھا تجھے خان بہادر کی طرف لے جائے گا بڑھیا نے سمجھایا" اور دیکھ میں نے تیرا نام تیری حرکات کی رعایت سے کھڑ بڑ خاں رکھا ہے، بھولنا مت"۔

اب کھڑ بڑ خاں جھونپڑی سے نکل کر قصبے کی طرف مردانہ وار خراماں خراماں چلے، بڑی بی دروازے پر کھڑی تھی اور دیکھ دیکھ کر خوش ہو رہی تھی کہ اس کا لباس سورج کی کرنوں سے جگمگ جگمگ کر رہا ہے وہ برابر اپنا پائپ پئے جا رہا ہے، اور باوجود اس کے ٹانگوں میں کسی قدر

اکڑاہٹ ہے کس خوبصورتی سے چل رہا ہے، وہ اس وقت تک برابر اُسے دیکھتی رہی جب تک وہ نگاہوں سے اوجھل نہ ہوگیا اور برابر دعائیں دیتی رہی۔

دوپہر ابھی نہیں ہوئی تھی، قصبے کے بازار میں خوب چہل پہل تھی ایک شخص اجنبی راستے کے ایک طرف چلا جا رہا تھا، اس کے لباس اور چال ڈھال سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ کوئی امیرزادہ ہے، وہ ایک پُرکار رنگین کوٹ پھول دار واسکٹ ارغوانی رنگ کی برجس اور سفید ریشمین جرابیں پہنے تھا۔ بالوں میں خوشبودار پوڈر لگا تھا، اور ایک لیسدار ٹوپی سر سے اتار کر بغل میں لئے تھا، وہ اپنی سنہری موٹھ والی چھڑی اس انداز سے ہوتا تھا جیسے فیشن ایبل لوگ ہلایا کرتے ہیں۔ ان کی چھاتی پر ایک ستارہ چمک رہا تھا، بائیں ہاتھ میں ایک پائپ تھا جسکی چلم رنگیں اور مہنال عنبر کی تھی، اس پائپ کو وہ ہر پانچ چھ قدم چل کر اپنے منہ سے لگاتا تھا۔ اور دہوئیں کے لچھے کے لچھے اُڑاتا تھا۔ جو اس کے منہ اور نتھنوں سے نکلتے ہوئے بھلے معلوم ہوتے تھے، تمام بازار اس تلاش میں تھا کہ یہ شخص کون ہے، کوئی کہتا تھا، ضرور یہ ایک امیر آدمی ہے۔ مگر یہ کس جہاز سے اور کس سواری سے آیا ہوگا ایک مہینے سے تو کوئی جہاز ہی نہیں آیا، اور اگر خشکی کی راہ سے آیا ہے تو اس کے ہمراہی اور خدمتگار کہاں ہیں، کوئی کہتا تھا، ایسے شخص کو ہمراہیوں کی کیا ضرورت ہے، اگر وہ چیتھڑے لگا کر بھی آجاتا تو اس کا حسب نسب انھیں چیتھڑوں میں دکھائی دے جاتا، میں نے ایسی معزز صورت کبھی نہ دیکھی تھی، میرا خیال ہے کہ اس کی رگوں میں بادشاہوں کا خون ہے، کوئی کہتا تھا یہ ہالینڈ کا باشندہ ہے وہاں کے لوگ ہر وقت منہ میں پائپ لئے رہتے ہیں، کوئی کہتا تھا فرانس کا رہنے والا ہے اور شاہی سفیر ہے، کوئی کہتا تھا ہسپانیہ کا رہنے والا ہے اسی لئے رنگ زرد ہے، کوئی کہتا تھا یہ پیرو یا میکسیکو کا رہنے والا ہے اور وہاں کے مونے کا اثر اس کے رنگ پر ہے، ایک خاتون بولی رنگ زرد ہو یا نہ ہو بڑا خوبصورت شخص ہے کیسا لانبا اور پتلا دبلا ہے، چہرہ کیسا خوبصورت اور شریفانہ ہے، ناک کیسی اچھی اور منہ کیسا حسین ہے، اور دیکھو اس کی چھاتی کا ستارہ کیسا چمکتا ہے گویا شعلے نکل رہے ہیں۔

اجنبی نے اپنی تعریف سنی اور آداب بجالا کر خاتون سے کہا؟ اور آپ کی آنکھیں بھی تو ایسی ہی چمکتی ہیں مجھے تو ان کی چمک نے چندھیا دیا" خاتون اِن تعریفی کلمات کو سنکر پھولی نہ سمائی۔

اس عام مدا ی میں صرف دو آوازیں مخالف ثابت ہوئیں ایک آواز تو ایک کتے کے پلے کی تھی جس نے ہمارے دوست کی ایڑیوں کو آکر سونگھا اور دم دبا کر ایک کریہہ آواز نکالتا ہوا اپنے مالک کے آنگن میں بھاگ گیا، دوسری آواز ایک چھوٹے بچے کی تھی جو گلا پھاڑ پھاڑ کر ایک کدو کی داستان سنا رہا تھا۔

اجنبی تمباکو نوشی میں محو تھا، اس کے مرتبے کے لئے یہی دلیل کافی تھی کہ وہ اس تمام شور وشغب میں مطمئن نظر آتا تھا، بالآخر وہ خان بہادر کے مرشن محل پر پہنچا اس حال میں کہ ایک انبوہ تماشائیوں کا اس کے پیچھے پیچھے تھا۔ اس سے پہلے کہ اس کی اطلاع کا جواب مالک مکان کیطرف سے آیا اس نے اپنا پائپ جھاڑا اور ایک تیز سی آواز منہ سے نکالی۔ ایک تماشائی نے یہ دیکھکر کہا"، دیکھو تو حضور کیسے نڈھال نظر آتے ہیں یہ ان کو یکایک کیا ہوگیا!" مگر یہ حالت تھوڑی ہی دیر تک رہی، پائپ پھر روشن ہوگیا اور دھواں نکلنے لگا، اجنبی کی وہی شان عود کر آئی جو پہلے تھی، خان بہادر صاحب کے مکان کا دروازہ کھلا اور کھڑبڑ خاں نے مڑ کر بڑے آدمیوں کی طرح گردن کو ذرا خم کر کے ہجوم کو آداب عرض کیا اور مکان میں غائب ہوگیا، اس کے چہرے پر اس وقت تمسخر آمیز تبسم تھا۔

مکان کے اندر کھڑبڑ خاں کی ملاقات خان بہادر صاحب کی دختر نیک اختر سے ہوئی، یہ ایک بھولی بھالی شکیل اور حسین لڑکی تھی، اس نے اجنبی کو باہر کھڑے ہوئے جھانک کر دیکھ لیا تھا اور اس کے اندر آنے سے پہلے کپڑے بدل کر اور ایک آدھ زیور پہن کر تیار ہوگئی تھی، اپنے کمرے سے نشستگاہ کو جاتے وقت ان سے اپنے چہرے اور حرکات وسکنات کو آئینہ میں دیکھکر اطمینان کر لیا تھا۔ لڑکی اپنے والد ماجد کے بھاری بھاری قدموں کی چاپ اور کھڑبڑ خاں کے اونچی ایڑی والے بوٹ کی کھڑبڑ سنکر نشستگاہ میں اپنی جگہ تن کر بیٹھ گئی اور ایک گیت گنگنانا شروع کیا۔

نشستگاہ میں آتے ہی خان بہادر نے کہا "بیٹی ادھر آؤ دیکھو یہ ہمارے کرم کپتان کھڑبڑ خان ہیں، یہ میرے ایک پرانے دوست

کا پیغام لے کر آئے ہیں، ان کی خاطر مدارات جیسا ان کا رتبہ ہے ویسی کرو، یہ کہکر وہ باہر چلے گئے، خاتون اس وقت ان کے چہرے کو دیکھتی تو معلوم ہو جاتا کہ دال میں کچھ کالا کالا ہے، مگر وہ تو مہماں کی آؤ بھگت میں لگی ہوئی تھی، خان بہادر کچھ گھبرائے ہوئے اور پریشان خاطر سے تھے، انھوں نے مہمان کا استقبال قاعدے سے ضرور کیا مگر اس میں صریحاً ایک تصنع تھا جو ان کے چہرے سے معلوم ہوتا تھا، بڑی بی کے پیغام وسلام نے ان کو کچھ خوف زدہ کر دیا تھا۔ اس کے علاوہ وہ ایک عمر رسیدہ تجربہ کار شخص تھے، انھوں نے کھڑ بڑ خاں کے پائپ کی طرف دیکھا تو اس کے نقش ونگار متحرک نظر آتے تھے اور ان میں ایسی شکلیں ان کو دکھائی دیتی تھیں جن کے سروں پر چھوٹے چھوٹے سینگ تھے اور پیچھے دمیں تھیں اور یہ سب شکلیں ایک دوسرے کے ہاتھ میں ہاتھ دیئے ناچ رہی تھیں، ان حالات میں وہ اس بات سے کچھ خوش نہ تھے کہ ایک اجنبی اور ایسا اجنبی ان کی بیٹی سے ملاقات کرے، بلکہ ان کے دل میں ایک ڈر سا تھا۔

اتفاق دیکھئے کہ نشستگاہ کے کواڑوں میں آئینے لگے تھے اور ان کے ریشمین پردے اپنی جگہ سے کسی قدر ہٹے ہوئے تھے، خان بہادر کچھ ایسی ادھیڑ بن میں تھے کہ انھوں نے جان بوجھ کر آئینوں سے جھانکنا شروع کیا، اجنبی ایک گھڑا گھڑایا اور چھلا چھلایا دنیا دار آدمی معلوم ہوتا تھا اور اس کی حرکات کو دیکھ دیکھ کر وہ یہ خیال کرتے تھے کہ میں نے ایسے شخص سے ملنے ملانے میں بڑی غلطی کی، اجنبی کی تمام حرکات ان کو مصنوعی معلوم ہوتی تھیں اور وہ خود بھی ایک مصنوعی چیز معلوم ہوتا تھا۔

لیکن بھولی بھالی لڑکی کا خیال ایسا نہ تھا۔ وہ اپنے مہمان کے ساتھ کمرہ کی چیزیں دکھاتی ہوئی ادہر اُدہر گھومتی پھرتی تھی، اور جیسے جیسے ملاقات کو طول ہوتا جاتا اس کے چہرے پر بشاشت کھلتی نظر آتی تھی، ایسی معلوم ہوتا تھا کہ وہ اجنبی سے محبت کرنے لگی ہے، اس کے رخساروں پر حیا کا رنگ ہونٹوں پر مسکراہٹ اور نگاہوں میں ایک چمکدار گھلاوٹ دکھلائی دیتی تھی، اس کی نظریں اجنبی کے چہرے پر گڑی تھیں، اجنبی کے پائپ کے گرد شیاطین زور زور سے رقص کر رہے تھے، ان کمبختوں کو نہیں معلوم کیوں یہ دیکھکر خوشی ہو رہی تھی کہ یہ بھولی بھالی لڑکی ایک بے حقیقت اور سراب نماشے پر لٹو ہو رہی ہے۔

یکایک اس کی نظر ایک قد آدم آئینے پر پڑی جس کے سامنے وہ دونوں کھڑے تھے، اس کو دیکھتے ہی اس نے ایک چیخ ماری اور الگ ہو کر ایک لمحہ بھر اجنبی کی طرف دیکھا اور بیہوش ہو کر فرش پر گر پڑی اجنبی نے بھی اپنے عکس کو آئینے میں دیکھا۔ اس میں اس کو اپنی واقعی صورت اور حقیقت صاف صاف نظر آئی، اور وہ سخت نادم ہو کر بلا اطلاع کمرے سے باہر نکلا۔

جھٹپٹے کا وقت تھا۔ بڑی بی باورچیخانے میں چولھے کے پاس بیٹھی چلم بھرنے کی تیاری میں تھیں کہ سامنے سڑک پر کسی کے تیز تیز چلنے کی آہٹ سنائی دی، کسی انسان کی نہیں بلکہ ایسی جیسے کوئی خشک ہڈیوں یا لکڑیوں کے گھسٹنے کی آواز ہو" ارے یہ کون مردہ قبر سے نکل کر چلا آرہا ہے"۔

یکایک ایک شکل جھونپڑی کے دروازہ سے اندر آئی، پائپ بدستور روشن تھا، چھاتی کا ستارہ بھی چمکتا تھا، صورت شکل بھی انسانوں کی سی تھی، مگر باوجود ان تمام باتوں کے تصنع کے ساتھ ساتھ حقیقت بھی صاف نظر آرہی تھی۔

"ارے خیر تو ہے، کیا اس کھوسٹ نے تجھے اپنے مکان سے نکال دیا، بدمعاش کہیں کا۔ دیکھ تو اس کے سر پر ایسے شیاطین تعینات کروں کہ وہ ہاتھ جوڑ کر اپنی لڑکی تجھے دے"۔

"نہیں اماں ایسا نہیں ہے"۔ "تو کیا میرے لال کو اس لڑکی نے حقارت کے ساتھ ٹھکرا دیا، میں اس کے چہرے کو کے لئے پھنسیوں سے داغدار، ناک کو لال انگارہ اور منہ کو پوپلا کر دوں کی اُسے کوئی پوچھے گا بھی نہیں"

"نہیں اماں، لڑکی کا کوئی قصور نہیں، اس غریب کو تو میں نے فریب فریب جیت ہی لیا تھا، مگر مجھ پر میری حقیقت منکشف ہو گئی، میں اب زندہ رہنا نہیں چاہتا"۔

یہ کہکر کھڑ بڑ خاں نے اپنا پائپ منہ سے کھینچکر زمین پر دے مارا اور خود فرش پر ڈھیر ہو کر رہ گیا۔ دیکھا تو ایک کروا اور کچھ لکڑیاں زمین

پڑی تھیں۔

"ارے رے رے، میرا بانکا کھڑ بڑ خاں۔ دنیا میں ہزاروں لاکھوں پھلّٹے خاں اور تیس مار خاں اس کے سے بھرے پڑے ہیں، وہ بدستور زندہ و سلامت ہیں، کبھی ان کی حقیقت ان پر منکشف نہیں ہوتی، یہ میرے غریب گڈے پر کیا آفت آئی اس نے اپنی حقیقت کو پہچان لیا اور مر مٹا" "میں چاہوں تو اسے ایک موقع دنیا میں جانے کا اور دے سکتی ہوں۔ مگر اس غریب کے جذبات بہت نازک اور احساسات نہایت عمیق ہیں، یہ اس بے حقیقت دنیا کے لائق نہیں، یہ تو محض کھیت کا گڈا ہونے کے ہی لائق ہے، اگر اس کے اور بھائی بند اسی دل و دماغ کے ہوں تو کیسا اچھا ہو"

یہ کہکر بڑھیا نے پائپ منہ سے لگایا اور چلا کر کہا "چھوکرے میرے پائپ کے لئے ایک اور کوئلہ"۔

ناظرین:۔ دیکھئے جو خیال اس قصّے کی جان ہے، اسی خیال کو ہمارے ملک کے ایک باخدا فقیر بھگت کبیر نے حضرت انسان کی مدح میں ذیل کے دوہے میں ظاہر کیا ہے:۔

کدو کاٹ مردنگ بنایا، نبّو کاٹ مجیرا!
پانچ توریاں رل مل گاویں ناچے بالم ہیرا

عجب نہیں جو اس قصّے کے مصنّف نے کبیر سے ہی یہ خیال اخذ کیا ہو کیونکہ ان کے ملفوظات انگریزی میں ترجمہ ہو چکے ہیں، مگر دیکھئے زورِ تخیل اور زبان آوری کو ذراسی بات کو پھیلا کر کیا فصاحت و بلاغت کا باغ لگایا ہے۔

(ماخوذ از نتھانیل ہاتھارن)

خواب کی سی رات

کیا سناؤں ہمنفس تھا کیا سماں کل رات کو
حسن تھا دلوانہ سازِ قلب و جاں کل رات کو

رقص میں تھی ہر نظر، گردش میں تھا ہر ایک جام
جوش پر تھی بخششِ پیرِ مغاں کل رات کو

عشق تھا محوِ پرستشِ حسن تھا جلوہ فروش
غرقِ حیرت تھے زمین و آسماں کل رات کو

حکمتیں تھیں سرنگوں پیشِ جنونِ عاشقی
ہیچ تھا اندیشۂ سود و زیاں کل رات کو

تھا نظر کے سامنے اک رہزنِ ایمان و ہوش
لٹ رہا تھا زندگی کا کارواں کل رات کو

رُوح تھی رقصاں مثالِ شعلۂ شمعِ حیات
وجد میں تھی محفلِ کون و مکاں کل رات کو

رو برو تھا روئے خورشیدِ شبابِ زندگی
چھٹ گئیں تھیں یاس و غم کی بدلیاں کل رات کو

ہاتھ میں تھا جامِ زر، پہلو میں جانِ رنگ و بُو
تھی محبت کامیاب و کامراں کل رات کو

اُٹھ رہی تھی دمبدم چشمِ حیا بارِ جمال
گر رہی تھیں پے بہ پے لون بجلیاں کل رات کو

منتشر تھی زلفِ مشکیں عارضِ گلرنگ پر
ظلمتیں انوار پر تھیں حکمراں کل رات کو

سینۂ شفاف میں تھا جزر و مدِ شرم و شوق
تھا تہ و بالا نظامِ دو جہاں کل رات کو

ہو رہا تھا امتحانِ ضبطِ شرحِ آرزو
لے رہا تھا کوئی یوں انگڑائیاں کل رات کو

خسروی تھا محوِ دیدِ روئے رنگیں بہار
تو کہاں تھا ہمدمِ صیدِ خزاں کل رات کو؟

اعظم خسروی جیبوی

رادھا کی شادی

محمد حسام الدین خاں غوری سکندرآبادی

میں پُرانا لوہا فروخت کرنے کی غرض سے تعلقہ یادگیر گیا ہوا تھا۔ شیوانند آئل ملز کے گودام میں کپڑے کی گرانی عرصہ سے بند پڑی تھی اور اس کا لوہا بمبئی کے مشہور تاجر مسٹر ابراہیم جی ناکارہ خرید رہے تھے، صبح چھ بجے سے لوہا تولنے کا کام شروع کر دیا جاتا۔ ہر روز تقریباً پچاس ساٹھ مزدور صبح پانچ بجے سے مزدوری کے لئے مل کے دروازہ پر ہمارے انتظار میں بیٹھے رہتے اور جب ہم وہاں پہونچتے تو سب کے سب کھڑے ہو کر دونوں ہاتھوں سے سلام کرتے، مسٹر ابراہیم جی ناکارہ کا ملازم ان مزدوروں میں سے بیس نوجوان، قوی، اور مضبوط آدمیوں کو منتخب کر لیتا باقی ضعیف اور کمزور آدمیوں کو نفی میں جواب دے دیا جاتا وہ تھوڑی دیر تک کھڑے ہو کر اپنے ساتھیوں کو جو کام پر لگ جاتے حسرت بھری نظروں سے دیکھتے، ایسا معلوم ہوتا کہ ان کا چہرہ زرد پڑتا جا رہا ہے، شاید ضمیر کی آواز ان کے کانوں میں گونجتی "آہ! سرمایہ داروں کے دل میں ضعیف و لاغر انسانوں کے لئے کوئی جگہ نہیں،" وہ مایوس ہو کر ادھر اُدھر منتشر ہو جاتے۔

ایک دن حسب معمول جبکہ توانا مزدوروں کا انتخاب کر کے باقی کمزور اور ضعیف آدمیوں کو واپس کرا دیا گیا تھا، ایک بوڑھا۔ لکڑی ٹیکتا ہوا میرے پاس آیا اور پیروں پر گر پڑا میں نے اس کو فقیر سمجھکر پوچھا۔

کیا چاہتے ہو؟"

مجھے بھی کام پر لگا دیجئے مہاراج" بوڑھے نے تھرائی ہوئی آواز میں سر اٹھا کر اپنی چھوٹی بے نور آنکھوں سے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"تم کیا کروگے؟ میں نے مسکرا کر سوال کیا۔

"رادھا کا بیاہ کروں گا مہاراج" بوڑھا میرے سوال کو سمجھے بغیر بولا" اب وہ بڑی ہو چلی ہے اس کے لئے میرے پاس پیسہ نہیں ورنہ کبھی کا ہو گیا ہوتا۔ مجھے کہیں مزدوری نہیں ملتی۔ مہاراج بوڑھا ہو گیا ہوں اس لئے سب دھتکار دیتے ہیں"

مجھے اس کی ضعیفی پر ترس آگیا۔ میں نے اپنی جیب سے چوّنی نکال کر اس کے ہاتھ میں رکھدی۔ اس کے جھریوں بھرے بے رونق چہرہ پر ہلکا سا تبسم نمودار ہوا اور وہ خاموش لکڑی ٹیکتا ہوا چلا گیا، مسٹر ابراہیم جی نے کہا۔

"بھیک مانگنے کا یہ طریقہ بالکل نیا ہے۔!"

"اور کامیاب بھی" ان کے ساتھی بولے،

ایک مزدور جو قریب ہی ترازو پر لوہا رکھ رہا تھا ہماری گفتگو سن کر ا

"وہ بوڑھا دیوانہ ہے سرکار"

"دیوانہ"؟ میں نے حیرت و استعجاب سے دریافت کیا۔

"جی ہاں لوگ اُسے دیوانہ کہتے ہیں" مِل کے منیجر حسین صاحب جو میرے پاس ہی کھڑے تھے بولے "غریب بلونت زندگی نے اس کا کوئی بھلا نہیں کیا۔ وہ اکثر جنگلوں میں پھرتا ہے، اور کبھی کبھی گاؤں میں آکر مزدوری کی تلاش کرتا ہے بڑی عبرتناک سرگذشت ہے اس کی" میں نے سُننے کا اشتیاق ظاہر کیا تو انہوں نے رات کو کہنے کا وعدہ کیا اور چلے گئے۔

ہم لوگ شام کے چھ بجتے ہی کام بند کر کے سات بجے تک شب کا کھانا کھا لیا کرتے تھے، باگیر ایک پہاڑی مقام ہے دن بھر سخت گرمی پڑتی ہے۔ لیکن شب میں نہایت خوشگوار ہوائیں چلتی ہیں، مِل شہر سے باہر کھلے میدان میں واقع ہے، دور دور تک میدان ہی میدان نظر آتے ہیں، رات کا کھانا کھا کر ہم آرام کرسیوں پہ دراز ہو گئے، چاند پوری آب و تاب سے چمک رہا تھا اور دودھ سی چاندنی ہر طرف بکھری ہوئی تھی، جس کی سیمیں کرنوں میں وہاں کا ذرہ ذرہ مسکرا رہا تھا، ہوا کے فرحت بخش جھونکے آرہے تھے میں نے موقع پا کر منیجر صاحب سے اس بوڑھے مزدور کے حالات سنانے کی خواہش کی، انہوں نے ایک آہ کھینچ کر کہنا شروع کیا:۔

"بہت دنوں کا ذکر ہے واقعات کی تفصیل تو یاد نہیں تاہم جو کچھ یاد ہے وہ واقعات کا اندازہ لگانے کے لئے بہت کافی ہے، غریب بلونت پاگل ہونے سے قبل ایک محنتی اور جفاکش کسان تھا۔ ابھی بمشکل صبح ہوتی کہ وہ ہل لئے سورج نکلنے سے پہلے مسرت سے لبریز راگ الاپتا ہوا اپنے کھیتوں میں پہنچ جاتا اور بلاناغہ صبح سے شام تک محنت و مشقت کرنا ہی اس کا مشغلہ تھا۔ اس طرف شمال کی جانب جو وہ ٹیلا سا نظر آرہا ہے، ہاں وہیں اس کا کھیت تھا، اس ٹیلہ کے پیچھے کنواں ہے، جو اب قریب قریب بند ہو چکا ہے، اس افتادہ زمین پر دھان کا ہرا بھرا کھیت لہلہاتا تھا۔ وہ اپنے سرسبز کھیت! "خلاقِ کائنات کی عظیم ترین نعمت" کو دیکھ کر کس قدر خوش ہوتا اس کا اندازہ لگانا ناممکن ہے، کسانوں کی زندگی کا اکثر حصہ "مشقت" ہے بلونت بھی کسان تھا۔ اس کی زندگی بھی محنت و مشقت کے لئے وقف تھی باقی دنیا سے اُسے کوئی سروکار نہ تھا۔ وہ اپنی اسی دنیا میں ایسا خوش تھا۔ گویا رنج و الم کے وجود کا اُسے علم ہی نہ تھا۔ اس کی زندگی میں پہلا المناک واقع اس کی بیوی کی موت تھی زندگی کے آخری لمحات میں اس کی وفادار بیوی نے ننھی رادھا کو اس کی گود میں دیکر کہا تھا میں اپنی اس نشانی کو تمہیں سونپے جاتی ہوں" اس دن سے بلونت کی زندگی کی ہر دلچسپی، اس کے دل کی ہر خواہش رادھا سے وابستہ ہو گئی تھی۔

دن گذر رہے تھے ننھی رادھا کی عمر بڑھ رہی تھی اور بلونت کی محنت و مشقت میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ ہم اکثر اس کو بہت سویرے رادھا کو ساتھ لئے کھیت پر جاتے دیکھتے وہ دن بھر کھیت میں سخت محنت کرتا اور رات کے اندھیرے میں گھر لوٹتا روز بروز اس کا جسم لاغر ہوتا جا رہا تھا، ایک مرتبہ میں نے اس سے اظہار ہمدردی کے طور پر کہا۔ تم اس قدر سخت محنت کیوں کرتے ہو بلونت اپنی حالت دیکھو کس قدر دُبلے ہو گئے ہو، دو افراد کی گذر اوقات کے لئے اتنی سخت محنت کی کیا ضرورت ؟"

"نہیں مہاراج" بلونت نے کہا:" میں صرف گذر اوقات کے لئے اس قدر محنت نہیں کرتا میرے پیش نظر ایک مقصد ہے، میں روپیہ جمع کر رہا ہوں، رادھا کی شادی کے لئے" بلونت کو رادھا کی شادی کی فکر دامنگیر تھی۔

وقت گذرتا چلا گیا ننھی رادھا اب ۱۶ سال کی دوشیزہ تھی وہ زندگی کے اس دور سے گذر رہی تھی جس میں زندگی بہت دلچسپ اور رنگین کھیل ہوتی ہے، جب آنکھوں میں چمک ہوتی ہے، اور چال میں والہانہ پن جب دل میں امنگیں ہوتی ہیں، اور دماغ میں منصوبے گناہ و ثواب سے بے خبر حصول

آرزو میں جانفروشی کی تمنا مقصد حیات ہوتی ہے، رادھا کے دن گذر رہے تھے، بے فکری میں ویسے ہی جیسے پہلے گذرتے تھے مگر بلونت کے لئے وہ دن پہلے سے دن نہ تھے، اس کی زندگی ہی بالکل بدل چکی تھی، وہ سوکھ کر کانٹا ہو گیا تھا، سخت سے سخت محنت کرنے کے بعد اس کے پاس اتنا روپیہ جمع ہوا تھا کہ وہ رادھا کے بیاہ کا ارادہ کرتا، لیکن قسمت نے ساتھ نہ دیا۔

گاؤں میں قحط پڑا۔ خوفناک قحط، لوگ پتے کھا کھا کر زندگی بسر کرنے لگے، اس کے کھیت تباہ ہوگئے زمیندار نے اس پر قرقی حاصل کرلی، اور اس کی ساری کمائی ضبط کرلی گئی اب اس کے پاس رادھا کی شادی کے لئے ایک پائی بھی نہ تھی، لیکن رادھا جوان ہو چکی تھی، اس کی عمر بڑھتی چلی جارہی تھی۔ بلونت مزدوری کرنے لگا۔ رات دن اس تیل کی گرن میں دور وہ جو دھواں سا نظر آرہا ہے وہ ٹھیلے ڈھویا کرتا تھا۔ رادھا بھی کھیتوں میں مزدوری کے لئے جایا کرتی تھی بلونت کو کھانے پینے کی سدھ بھی نہ رہی، رادھا جو کچھ بھی پکا کر رکھ جاتی کھا لیتا، شاید مشکل ہی سے کبھی نصف گھنٹہ گھر پر رہتا ورنہ کارخانہ میں دن رات گذرتے تھے۔

رادھا جوان تھی اور آزاد، وہ کھیت میں مزدوری کو جایا کرتی تھی وہ خوبصورت نہ تھی لیکن اس کے بھرپور شباب نے اس کی ہر ادا میں ایک جاذبیت پیدا کر دی تھی یکایک وہ کہیں غائب ہوگئی، اس پر چہ میگوئیاں ہوئیں، دبی دبی آوازیں اٹھیں، بعض لوگوں کا خیال ہے، بھولی رادھا، خدا اس کا گناہ معاف کرے، ایک پردیسی بانکے نوجوان کی محبت میں گرفتار ہوگئی تھی، اکثر دونوں مست متوالے کھیتوں میں گھوما کرتے تھے ہاتھ میں ہاتھ دیئے آپس میں باتیں کرتے جاتے پریم کی باتیں، انھیں اپنی باتوں کے سوا کسی بات کا خیال نہ ہوتا اکثر چاندنی راتوں میں کھیت کے کنارے دو پریمی دنیا سے بےخبر، پہلو بہ پہلو بیٹھے پریم کی بستی بسائے، پریم کا راگ گاتے، کچھ معلوم نہیں کتنا زمانہ اس طرح گذرا۔ پھر وہ چلی گئی، کہاں؟ کوئی نہیں جانتا شاید اس پردیسی بانکے کے ساتھ، اس کے ایک سال بعد اسی کھیت میں جہاں وہ اور پردیسی گھوما کرتے تھے ایک مرا ہوا بچہ پایا گیا پولیس نے تحقیقات کی لیکن کچھ پتہ نہ چل سکا، یہ بات ہر شخص کی زبان پر ہے کہ اس کھیت میں اب بھی رات کے وقت کوئی دوشیزہ دلہنوں کا سا لباس پہنے کھڑی ہوئی نظر آتی ہے۔ جب کوئی اس کا پیچھا کرتا ہے، تو وہ اس کھیت کے کوئیں میں کود پڑتی ہے۔ بعض لوگ کہتے ہیں، رادھا پردیسی کے ساتھ بھاگی نہیں بلکہ اس نے خودکشی کرلی تھی اور اس کی روح اب بھی منڈلاتی رہتی ہے یہی وجہ ہے کہ اس زمین پر اب کوئی کاشت کرنے کی جرأت نہیں کرتا۔ یہ سب روایتیں ہیں، میں کچھ وثوق سے نہیں کہہ سکتا، کہ اس میں صداقت کہاں تک ہے، البتہ میں اتنا ضرور جانتا ہوں کہ ایک دن رات میں بلونت میرے پاس آیا آہ! آج بھی وہ منظر میری آنکھوں میں پھر رہا ہے اس وقت شدت غم وبیکسی سے اس کا چہرہ خوفناک ہو گیا تھا میرا دل لرز اٹھا۔

"خدایا تمہاری طبیعت کیسی ہے بلونت تم سر سے پیر تک کانپ رہے ہو؟ میں نے سوال کیا۔

"میں بالکل اچھا ہوں مہاراج" بلونت نے تھرائی ہوئی الم انگیز آواز میں جواب دیا، "آج دوسرا دن ہے رادھا گھر نہیں آئی آپ کو اس کے متعلق کچھ معلوم ہے مہاراج"

"نہیں تو، میں کچھ نہیں جانتا بلونت، رادھا دو دن سے نہیں آئی"؟ میں نے کہا اس کا چہرہ زرد پڑنے لگا "تم فکر نہ کرو صبح کو میں کھوج لگاؤں گا" میں نے بلونت کو دلاسا دینے کی خاطر کہا وہ میرے پاس سے چلا گیا اور اس کے بعد مہینوں بیمار پڑا رہا ان دنوں وہ اکثر حالت بخار میں کہتا "میں کسقدر محنت سے روپیہ جمع کر رہا ہوں رادھا کی شادی کے لئے" اب آپ سمجھ لیجئے کہ بلونت کیوں مارا مارا پھرتا ہے۔

چین کا آہنی انسان

رابطہ مونگیری

بیسوصدی کے آغاز سے ابتک دو اشخاص چین کے اعلی دماغ اور غیر معمولی ذہنیت کے انسان خیال کئے جاتے ہیں پہلا ڈاکٹر سن یاٹ سن اور دوسرا جنرل چیانگ کائی شیک۔

جمہوری سلطنت کا بانی اول ڈاکٹر سن یاٹ سن تھا جس نے اپنی زندگی میں تمام صعوبات و مشکلات کا مقابلہ قوم کی فلاح و بہبودی کی خاطر خندہ پیشانی سے کیا، اس نے سیاست اور حکومت میں چین کے باشندوں کے لئے ایک بہترین دستور اساسی چھوڑا جو میدان سیاست میں چینیوں کے لئے شمع ہدایت بنا، ڈاکٹر سن یاٹ سن ۱۹۲۵ء میں انتقال کر گیا، اس کے بعد جنرل چیانگ کائی شیک پر ملک کی قسمت کا فیصلہ تھا۔ ان دونوں نے لوگوں میں یکجہتی اور بیداری کی ایسی روح پھونکی کہ صدیوں چین اس سبق کو فراموش نہ کر سکیگا اور ان دونوں کے نام تاریخ میں سنہرے حرفوں سے لکھے جائینگے۔

ڈاکٹر سن کے بعد جب جنرل چیانگ کائی شیک نے قوم کی رہنمائی کرنی شروع کی اور قوم کی قیادت کی باگ اپنے ہاتھ میں لے لی تو غریب قوم کو سرمایہ داروں اور خود غرض رہنماؤں کے چنگل سے خلاصی و رستگاری کے لئے حتی المقدور سعی کی، اس نے قوم کی مالی اور اقتصادی حالت کیطرف بھی توجہ کر کے بہت کچھ اصلاح کی اور چینیوں کو اس قابل بنا دیا کہ وہ بھی دوسروں کی نظروں میں قابل وقعت ہو گئے۔

جنرل چیانگ کی پچاسویں سالگرہ کے موقع پر جو ۱۳۱ر اکتوبر ۱۹۳۶ء میں منائی گئی تھی تمام امراء و ارکین سلطنت اور پوری قوم نے جنرل چیانگ کی اطاعت و فرمانبرداری پر حلف اٹھایا زیکوسلاویہ کے وزیر، ایم، فیجر (M. Fauscher) کہتے ہیں کہ میں چین میں چھ برس سے ہوں اور برابر دیکھتا رہا ہوں کہ چینیوں کی مالی اور اقتصادی حالت روز بروز درست ہوتی جا رہی ہے اور یہ محض جنرل چیانگ کی پر خلوص خدمت اور قومی امتیاز کا نتیجہ ہے، جنرل مذکور کی دانشمندی و عقلمندی اور قوم کی سچی خدمت کی وجہ سے چینیوں کی بگڑی ہوئی حالت درست ہو گئی اور یہ بھی دنیا کی نظروں میں عزت کی نگاہ سے دیکھی جانے لگی، جنرل مذکور بلاریب اس زمانے میں ایک بہت بڑے دماغ کے آدمی ہیں اور ان کی ہستی بیشک دنیا کی بڑی ہستیوں میں شمار کی جاتی ہے۔

پیدائش

تاریخ شاہد ہے کہ بڑے بڑے ڈکٹیٹروں کی پیدائش نہایت معمولی گھرانے میں ہوئی اور پھر اپنی فطری بہادری اور لیاقت سے دنیا کی عظیم ترین ہستیوں میں شمار کئے جانے لگے بعینہ یہی حالت جنرل چیانگ کی بھی ہوئی، ان کی پیدائش "فن گہو چیکنگ" (FENGUHUACHEGKING) میں ہوئی، ایام طفولیت میں ہی باپ کا سایہ سر سے اٹھ گیا، والد کے انتقال کے بعد ان کی تربیت کی ساری ذمہ داری ان کی والدہ کے سر پر آپڑی

اور انہوں نے بھی اس ذمہ داری کو خوب نبھایا۔ ان کی والدہ نہایت ہی قابل اور عاقلہ تھیں۔ جنرل چیانگ کی لیاقت اور ذہانت کے مناسب انھیں ان کی تعلیم کی فکر ہوئی لیکن ہزارہا دشواریاں حائل تھیں پھر بھی اس دھن کی پکی نے ارادہ کو متزلزل نہ کیا اور اپنے بچے کی تعلیم کا مصمم ارادہ کرلیا۔ ابتدائی تعلیم گھر ہی میں ہوئی اور ان کی والدہ ہی ان کی پہلی معلمہ تھیں۔

قابل معلمہ نے ہونہار اور قابل لڑکے کو دیکھکر انہیں سچائی راست بازی اور خودداری کا سبق پڑھادیا۔ قوم کی خدمت کرنا ان کی تکالیف میں ہمدم و رفیق ثابت ہونا ان کی مصائب کے دور کرنے کی کوشش کرنی دوسرا سبق تھا بچہ نے سبق ذہن نشین کرلیا اور ایسا کیا کہ اپنے پچاسویں سالگرہ میں خود ان سبقوں کا اعادہ کرتے ہوئے لوگوں سے کہا کہ "مجھے دو چیزیں اچھی طرح یاد رہتی ہیں اور میں اُسے کبھی فراموش نہیں کرسکتا۔ لوگ ابتک مصیبت میں زندگی گذار رہے ہیں اور یہ میری ماں کی خواہش تھی اور یہ ان کا دیا ہوا سبق تھا کہ میں ان تکالیف میں لوگوں کے لئے معاون ہوسکوں قومی خدمت اور غلامی سے نجات کا سبق میری والدہ نے سکھایا تھا۔ وہ اب تک مکمل نہ ہوسکا۔ میں تمام لوگوں کے مصائب و آلام کا اس وقت تک ذمہ دار رہونگا جب تک چینی قوم تکالیف سے نجات نہ پالے"۔

قوم چین ایسے مخلص جاں نثار اور قوم پرست سردار کی جتنی بھی توقیر کرے کم ہے، کتنے مبارک ہیں وہ لوگ جن کے سردار اور لیڈر ایسے فدائی اور وطن پرست ہیں۔

ماں نے اپنے ہونہار لال کی ہمت بندھائی اور چیانگ سترہ سال کی عمر میں تحصیل علم کے لئے شمالی چین کے پوٹانگ (POATING) ملٹری اکاڈمی میں داخل ہوگئے، فوجی قابلیت اور صلاحیت خداداد موصوف میں پہلے ہی سے موجود تھی داخل ہوتے ہی انہوں نے نمایاں ترقی حاصل کرنی شروع کی اور چار سال کی تعلیم کے بعد ٹوکیو ملٹری اکاڈمی سے میٹرک کی سند حاصل کرلی۔

جاپان میں جنرل چیانگ نے اپنی زندگی کو انقلابی پارٹی کے لئے وقف کردیا جسکو ڈاکٹر سن یاٹ نے منظم کیا تھا، وہ ٹنگمنگہو سوسائٹی کے جس کو ڈاکٹر سن یاٹ نے قایم کیا تھا ایک ممبر ہوگئے اور جمہوری سلطنت کے قیام کے حامی بنے۔

۱۹۱۱ء میں جبکہ انقلاب پہلے پہل ووچانگ (WUCHANG) میں برپا ہوا تو اپنے ساتھیوں کے بلانے پر خود جنرل موصوف شنگھائی چلے آئے، وہاں وہ ایک انقلابی فوج کے کپتان بنا دیئے گئے اور انہوں نے بڑی بہادری سے شنگھائی مان چوس (MAN CHAS) سے لے لیا۔ دوسری بار ۱۹۱۳ء میں انہوں نے یان شیہ کائی (YAN SHKAI) کے مقابلہ میں خوب ہی بہادری دکھائی۔

فوجی لیاقت

۱۹۲۳ء اور ۱۹۲۴ء چیانگ کی زندگی میں نمایاں حیثیت رکھتا ہے کیونکہ دس برس کے بعد پھر وہ انقلابی پارٹی میں داخل ہوگئے جنرل چیانگ کے فوجی صلاحیت اور فہم و فراست کو دیکھکر ڈاکٹر سن یاٹ سن ان کے گرویدہ ہوگئے، ڈاکٹر سن یاٹ نے ان کو ترقی دی اور اسٹاف افیسر سے وھامپوآ (WHAMPOA) پریسیڈنسی اکاڈمی کا کپتان بنادیا۔

جس وقت جنرل چن چیان منگ (CHENSHUNMING) کی ماتحتی میں فوجوں نے ڈاکٹر سن یاٹ سے بغاوت کی تو ڈاکٹر موصوف نے اس بغاوت کو فرو کرنے کے لئے جنرل چیانگ ہی کو منتخب کیا انہوں نے بڑی ہی فہم و ادراک سے کام لیا اور بڑی جوانمردی سے مٹھی بھر فوج سے بہترین فوج پر فتح پائی اور شہر میں امن و امان قایم کردیا۔ اسی سال پھر ایک دوسری بغاوت ہوئی جنرل چیانگ نے باغیوں کے مضبوط ترین اور مرکزی قلعہ پر حملہ کیا جو وی چو (WAICHO) میں واقع تھا اور چوبیس گھنٹے کے اندر حیرت انگیز طور پر باغیوں کو شکست دے دی اور ۱۹۲۵ء کے اختتام تک وانگٹنگ (KWANGTING) سے کومنٹنگ (KAOMINTANG) تک قبضہ کرلیا اور تمام امن و امان قایم ہوگیا۔

خود غرض مخالف پارٹی کے سرداروں نے جنگی سپہ سالاروں

نے اور سلطنت کے طامع اور لالچی امراء نے ڈاکٹر سن یاٹ کی جماعت
کی قوت کے شیرازہ کو منتشر کر دینے کی دھمکی دی، جنرل چیانگ
کو اس وقت کمانڈر انچیف کا عہدہ عطا کیا گیا۔ جنرل موصوف
کی جاں نثارانہ خدمت قوم اور قومی عمل نے قوم میں بھی جذبۂ
عمل پیدا کر دیا اور سبھوں کے قلوب وطن پرستی کے جذبہ سے
لبریز ہو گئے۔ جماعت کا ہر فرد وطن کا سچا اور جاں نثار سپاہی بن گیا
اور خدمت وطن کو اپنا فرض سمجھنے لگا۔ جنرل چیانگ کی جان توڑ
کوششوں سے دو سال کے اندر اندر چین کا بڑا حصہ ڈاکٹر سن یاٹ
کی پارٹی میں داخل ہو گیا اور یہ جماعت روز افزوں ترقی کرنے
لگی، اس کے بعد قوم کو جب ان کی دانائی اور سچی خدمت کا اندازہ
ہوا تو پھر جنرل موصوف انقلابی فوج کے افسر اعلیٰ مقرر کر دیئے گئے
اور اس کے بعد پھر نیشنل گورنمنٹ کے چیرمین کا عہدہ بھی انہی کے
سپرد کیا گیا۔

۱۹۲۸ء میں یہ پوری جماعت کے خود لیڈر ہو گئے اور
جماعت کے سفید و سیاہ کے تنہا مختار، جنرل موصوف جن جن
اوصاف کے حامل تھے وہ کما حقہ ابتک منصۂ شہود پر نہیں آئے
تھے، لیکن اب وقت آگیا تھا کہ تمام صفتیں خود بخود ظاہر ہوتی چلی
جائیں چنانچہ جنرل موصوف اکزیکیوٹو کمیٹی کے صدر بھی منتخب
ہوئے، اور ملٹری ڈیپارٹمنٹ کے صدر رہے۔ وزیر تعلیم کی حیثیت
سے بھی ۱۹۲۵ء سے ۱۹۳۱ء تک کام کرتے رہے اپنی انتھک کوششوں
اور جانفشانیوں سے تباہ و برباد قوم کو ترقی کی شاہراہ پر لے آئے
اور گرتی ہوئی قوم کو تباہی سے بچا لیا۔ لوگوں میں اتحاد کا رشتہ استوار ہو گیا
سبھوں میں یکجہتی اور اتفاق اچھی طرح سرائت کر گیا۔

بانی اتفاق

جنرل چیانگ کی سرگرمیٔ عمل اور جذبہ آزادی وطن نے انھیں
مجبور کیا کہ وہ قوم کو شاہراہ ترقی پر دیکھیں، اسی سبب سے انھوں
نے اپنی انتھک کوششوں سے منتشر چینیوں کو ایک مرکز پر لا جمع کیا اور
سبھوں میں وطن پرستی اور آزادی کی روح پھونک دی، یہ جنرل موصوف
ہی کی ستودہ صفات اور دانشمندانہ عمل کا ثمرہ تھا کہ ۱۹۳۶ء کے
موسم بہار میں انقلابی جماعت کا سب سے بڑا مقصد حاصل ہو گیا
اور چینی ایک دوسرے کے حقیقی بھائی نظر آنے لگے، اتحاد و اتفاق
یہ کوئی تیر و تفنگ سے حاصل نہیں ہوا بلکہ ان کے اخلاق اور زبان کی
طاقت نے چینیوں کو جھک جانے پر مجبور کیا اور انہوں نے ایسے
بہادر اور جنرل کے سامنے سر نیاز خم کر دیا۔ جنرل موصوف کی تعریف
و تحسین بعض ان کی فوجی لیاقت ہی کی بنا پر نہیں کی جاتی بلکہ اُن
کی زبان میں وہ اثر ہے کہ لوہے کو بھی موم کر دے۔ لاریب ایسا
جنرل قابل صد آفریں ہے اور ہمارا فرض ہے کہ ہم اس کا
احترام کریں۔

ان باتوں سے بھی بالاتر جنرل چیانگ میں کوئی ایسی بات مستور
تھی جس کے باعث قوم کا بچہ بچہ اُن کی محبت کا دیوانہ و پرستار ہو گیا
وہ کیا بات تھی وہ تعلیمی، اقتصادی، سیاسی، معاشرتی حالتوں میں تبدیلیاں
تھیں، دیکھتے ہی دیکھتے چینی قوم نے اپنے شفیق جنرل کے اسکیم پر
سچے دل سے عمل کرتے ہوئے ہر شعبہ میں کافی ترقی حاصل کر لی
انہوں نے ہر حیثیت سے قوم کو بلند کرنا چاہا اور اسی کے حصول
کے لئے انہوں نے تمام تکالیف و مصائب کا خندہ پیشانی سے
مقابلہ کیا، تھوڑی مدت میں چینیوں نے جتنی ترقی ہر شعبہ حیات
میں کی وہ صرف جنرل موصوف کے مساعی جمیلہ کی رہین منت
ہے، ایسی فقید المثال ہستی کی لوگ پوجا نہ کرتے تو کیا کرتے۔ اتنے
ہی پر انہوں نے بس نہ کیا بلکہ چینیوں کی صحت و تندرستی کے
قیام کے لئے، غیر ممالک سے خط و کتابت کے لئے، تجارت اور
نئی نئی چیزوں کی ایجاد کے لئے نئے نئے محکمے کھول دیئے جن
محکموں کے زیر نگرانی قوم کا بچہ بچہ مستفیض ہوا اور چینیوں نے ہر شعبہ
حیات میں خاطر خواہ ترقی کی، ان ساری ترقیوں کا بانی کون تھا؟ وہی
آہنی انسان جس کے پائے ثبات کو کبھی لغزش نہ ہوئی، اس نے اپنی
نیند کو نیند نہ سمجھا اور آسائش و آرام کو قوم پر قربان و نثار کر دیا یقینی
اہلِ چین ایسے بہادر اور لائق جنرل پر جتنا فخر کریں بجا اور
درست ہے۔

خانگی زندگی

جنرل چیانگ جس طرح ظاہر میں بہت سے صفات حسنہ کے حامل ہیں اسی طرح ان کی گھریلو زندگی بھی سبق آموز ہے۔

قوم کا وہ سچا پرستار، مادر وطن کا وہ سپوت فرزند اور آزادی کا وہ سچا داعی گھریلو زندگی نہایت سیدھی سادی گذارتا ہے، نمود و نمائش کا اس میں شائبہ تک نہیں، سب سے بڑی صفت جو یہاں کے متکبر امیروں اور مغرور دولتمندوں کے لئے تازیانۂ عبرت ہے وہ جنرل موصوف کی خاکساری ہے ظاہری ٹیپ ٹاپ سے انھیں قطعاً نفرت ہے، شہرت سے وہ طبعاً نفور ہیں وہ اپنی مصروفیت اور مشغولیت کے بعد اپنا وقت اپنے خاندان کے لوگوں کے ساتھ بسر کرتے ہیں اور خصوصاً اپنی رفیقۂ حیات بیگم چیانگ کے ساتھ۔

وہ علم کا شیدائی، قوم کی ترقی کا دیوانہ اپنے خانگی اوقات کو بھی مفید معلومات کے حاصل کرنے میں صرف کرتا ہے، وہ ڈاکٹر سن یاٹ سن کے کاموں اور جنرل منگ کے نظریوں اور چینیوں کے مدبر اعظم سنگ کو فان (TSENG-KUO-FAN) کے سیاسی کارناموں کے مطالعہ میں اپنے اوقات کو صرف کرتا ہے۔ اس کے علاوہ وہ ہمیشہ جغرافیہ، سائنس، فلسفہ، سیاسی اور فوجی طریقہ تعلیم کی کتابوں کو پڑھتا رہتا ہے انہوں نے کسی سے اپنی روزانہ ڈائری کا ایک ورق بھی بیس سال سے پوشیدہ نہ رکھا تاکہ ان کی خانگی حالات سے مستفید ہوسکیں۔

انگریزی میں ایک مقولہ ہے کہ (it is the lot of great men to be mis understood) بڑے آدمی اکثر عوام کی نظروں سے پنہاں رہتے ہیں اور عوام کی نظریں ان کی صفات حمیدہ سے ناواقف رہتی ہیں لیکن جن لوگوں نے جنرل چیانگ کو سمجھنے میں غلطی کی ہے وہ ضرور قابل افسوس ہیں کہ انھوں نے جنرل موصوف کو پہچانا ہی نہیں اور ان کی شخصیت سے ہنوز ناواقف ہیں۔

بھلا مشاہدہ کا کس طرح انکار کیا جا سکتا ہے جس نے ایکبار بھی اپنی نظروں سے چینیوں کی موجودہ ترقی اور سدھری ہوئی حالت کا معائنہ کیا ہے۔ بھلا کس طرح اس کا ضمیر اس بات پر راضی ہوگا کہ وہ ایک کھلی ہوئی حقیقت کا انکار کردے، نااہل انسانوں سے خدا قوم کو محفوظ رکھے۔

بھلا ہٹلر کی جدوجہد اور اس کے ثمرہ سے، مسولینی کی قوت و طاقت سے اور مصطفیٰ کمال کی لیاقت سے کون انکار کرسکتا ہے! جس مصطفیٰ نے تباہ شدہ ترکوں کو آج اس قابل بنا دیا ہے کہ لوگ اس کی عظمت کا طوعاً و کرہاً اعتراف کریں کس قدر ہلاکت آفریں ہے۔ یہ بات کہ قوم کو سچے رہنما اور بہی خواہان وطن سے اجتناب کا سبق سکھایا جائے۔ جس چیانگ نے قوم کو علم حاصل کرنے، روزی کمانے کے ڈھنگ، تجارت کے طریقے، اتفاق کا سبق سکھایا ہو بھلا اس کی پرستاری سے کون منحرف ہوسکتا ہے۔ لوگوں کا خیال ہے کہ جنرل چیانگ نے جو جو کام چینیوں کی فلاح و بہبود کے لئے کئے ہیں۔ وہ اتنے اہم ہیں کہ نہ معلوم جنرل موصوف کی عدم موجودگی میں ملک کا کیا حشر ہوگا۔

(ترجمہ از انگریزی)

اہل قلم

مضمون کاغذ کے ایک طرف تحریر فرمایا کریں۔
مضمون صاف اور کھلا ہوا تحریر ہو
مضمون کے شروع یا آخر میں اپنا پورا پتہ صاف تحریر فرمائیں۔

خریدار

خط و کتابت کے وقت اپنا پتہ مکمل اور صاف مع نمبر خریداری تحریر کریں۔
چندہ بذریعہ منی آرڈر روانہ کریں۔ وی پی منگانے میں نقصان ہوتا ہے۔

گورنمنٹ میسور سلک فیکٹری

کی بنی ہوئی جارجٹ، کریپ یا ساٹن ملاحظہ فرمائیے یقیناً آپ اُن کی عمدہ بناوٹ اور خوبصورتی کو دیکھکر ہندوستانی صنعت پر متحیر رہ جائیں گے کیونکہ وہ بالکل ایسی ہی عمدہ بنی کارآمد۔ دیرپا اور مضبوط



مال سے تیار کی جاتی ہیں، جیسے ولائتی، کثیر تعداد میں نئی قسم اور جدید ترین ڈیزائن کے نمونے ملاحظہ فرمائیے۔ یہ خالص اور صرف خالص ریشم سے تیار کی گئی ہیں۔ اس میں کسی قسم کی ولائتی یا نقلی آمیزش نہیں ہے۔

گورنمنٹ سلک فیکٹری میسور

ایجنٹ برائے دہلی اور صوبجات متحدہ

میسرز گوکل چند کھنہ اینڈ کمپنی سودیشی کلاتھ مرچنٹس

دہلی کلاتھ مارکیٹ۔ لکشمی بازار گیٹ۔ کوئنس روڈ دہلی

عروسی

یہ ایک کامیاب علاج ہے جو بعد روغنِ عروس ترتیب دیا گیا ہے، مگر در اصل عروسی کی کامیابی کا راز بتقاضائے خریداران طشت از بام کیا جاتا ہے جو مصلحت اشارۃً اشتہار میں لکھا جاتا تھا۔ لیکن اس طرح پر خط و کتابت کی طوالت لوگوں کو تکلیف دہ تھی۔ تاہم دوسروں کے مقابلے میں کامیاب اور مانگ زیادہ تھی، اور صاحب ضرورت کو خاص طور پر لکھا جاتا تھا (کہ اگر لاغری کے سوا پس و پیش میں ناہمواری و کجی ہو تو پہلے دو شیشیاں جو تین دن میں بالکل اس عیب کو رفع کر دیں گی موافق ہدایات استعمال کریں، جن کی قیمت مبلغ پانچ روپیہ ہے۔ پھر عروسی کا استعمال طاقتِ رفتہ اُبھار کر دائمی نفع کا باعث ہوگا) ورنہ معمولی شکایات تو عروسی کھو دیگی، یہ علاج ہر موسم میں ہو سکتا ہے۔ اس کے ہمراہ چار چیزیں مومی، نباتی، کلیدی، نعلی اور دی جاتی ہیں۔ ایک سٹ عروسی ہفتہ بھر کو کافی ہوتا ہے۔ جس کی قیمت ۱۵؎ علاوہ محصول ڈاک مقرر ہے۔ صاحبِ فرمائش نام و پتہ خوشخط تحریر فرمائیں۔ عروسی کے استعمال سے کامیاب ہونے والے حضرات کے بیشمار سارٹیفکٹ موجود ہیں جو بوجہ طوالت درج نہیں کئے جا سکتے۔

شفاخانہ رضویہ چاندنی محل دہلی

ناظرین رسالہ کلیم

اگر آپ ادب اردو کی خدمت کرنا چاہتے ہیں
اگر آپ کلیم کی خوبیوں میں خاطر خواہ اضافہ دیکھنا چاہتے ہیں
اگر آپ ملک کے بہترین شعراء اور ادباء کے حوصلے بڑھانا چاہتے ہیں۔
اگر آپ اپنے علمی و ادبی ذوق کو ترقی دینا چاہتے ہیں۔
اگر آپ اردو کو ہندوستان کی واحد زبان دیکھنا چاہتے ہیں
اگر آپ ماضی اور حال کے شعراء اور ادباء کا مقابلہ کرنا چاہتے ہیں۔
اگر آپ بکفایت بہترین اخلاقی اور ادبی کتب خریدنا چاہتے ہیں

تو آپ اور آپ کے احباب صرف

کلیم بک ڈپو جنیتی لال نمبر ۴ دریا گنج دہلی سے خرید فرمائیں

بیسویں صدی کی حیرت انگیز نئی ایجاد

من مانی یعنی برتھ کنٹرول

اس دوا کی جتنی تعریف کی جائے فضول ہے۔ بس اتنا لکھنا کافی ہے کہ اس مقصد کے لئے جتنی دوائیں اب تک ایجاد ہوئیں ہیں ان سب میں

من مانی

سب سے بہتر اور کامیاب ثابت ہوئی ہے۔ لطف یہ ہے کہ بالکل بے ضرر اور ملذ ہے۔ اس کے استعمال سے کسی قسم کی سوزش یا تکلیف وغیرہ کچھ نہیں ہوتی ہے۔ زیادہ تعریف کے لئے تہذیب مانع ہے۔ ایک بار استعمال کرکے ملاحظہ فرمائیں۔ قیمت فی شیشی علاوہ محصول ڈاک

تین روپے (سے)

صحت نسواں

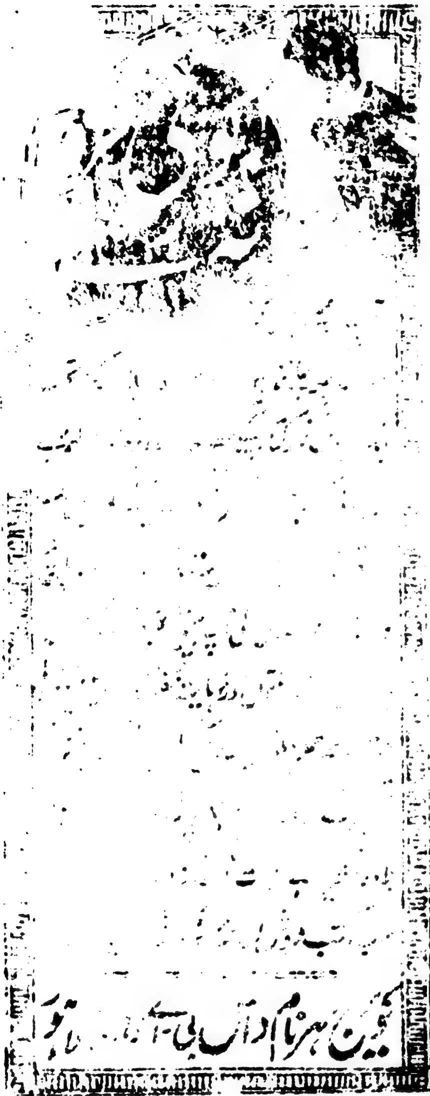
سیلان الرحم۔ اختناق الرحم یعنی سفید۔ نیلا پانی کا خارج ہونا۔ ایام کی بے قاعدگی، یا درد کے ساتھ رک رک کر آنا۔ خون کی کمی یا زیادتی کے ساتھ آنا وغیرہ وغیرہ کے لئے اکسیر ہے۔ اس دوا کے استعمال سے یہ تمام شکائیتیں رفع ہی نہیں ہو جاتیں۔ بلکہ عورتوں کی عام صحت جسمانی پر اس کا بہت اچھا اثر پڑتا ہے۔ چہرہ مثل گلاب کے نکھر آتا ہے۔

رحم کو قوی کرکے اولاد نرینہ پیدا کرتی ہے

قیمت علاوہ محصول ڈاک تین روپے (سے)

پرچہ ترکیب ہمراہ

منیجر بیت الشفا یونانی لال کنواں دہلی



بلاک برائے فروخت

دفتر کلیم میں وہ تمام بلاک جو رسالہ کلیم میں چھپ چکے ہیں اور جو تخیل و اہمیت کے اعتبار سے اپنی نظیر آپ ہیں۔ برائے فروخت موجود ہیں۔ اور اگر کرایہ پر لینا چاہیں تو بھی مل سکتے ہیں۔ **منیجر کلیم دہلی**

خریداران کلیم

سے گذارش ہے کہ خط و کتابت کے وقت نمبر خریداری کا حوالہ ضرور دیں۔ جواب طلب امور کے لئے جوابی کارڈ یا ایک آنہ کا ٹکٹ بھیجنا چاہیے۔ خط و کتابت کے وقت اتنا ضرور خیال رکھیں کہ مضمون اور اپنا نام و پتہ صاف تحریر فرمائیں۔ ورنہ عدم تعمیل کی شکایت معاف۔

نیاز مند منیجر کلیم

بنام قوت و حیا

کلیم دہلی

منظور شدہ
دائرکٹران تعلیم

آئے گا نہ جانے کب زمانہ اپنا
قدرت سے ملا ہے مجھکو صد حیف یہ حکم

آگے کئی صدیوں ہے فسانہ اپنا
بہروں کو سُنائے جا ترانہ اپنا

سالانہ چندہ دو روپے — ریاستہائے میسور، پٹیالہ و حیدر آباد دکن سالانہ چندہ چھ روپے
ششماہی چندہ تین روپے آٹھ آنے — فی پرچہ نو آنے

جلد ۷ — نمبر ۶

فہرست مضامین بابتہ ماہ دسمبر سنہ ۱۹۳۸ء

نمبر شمار	عنوان	مضمون نگار	نمبر صفحہ
۱	اشارات	مدیر	۴۳۴
۲	رند ہزار پیشہ (نظم)	جوش	۴۳۹
۳	مذہب اور سائنس	"ناظر"	۴۴۱
۴	مرد قلندر	جناب بیکش صاحب اکبرآبادی	۴۴۵
۵	لیڈر	م - ج	۴۴۶
۶	جمہوریت	جناب کریم اللہ صاحب حسنی	۴۴۸
۷	خدا	جناب سید اختر علی صاحب تلہری	۴۴۹
۸	تصویر رخصت	جناب مرزا یاور علی صاحب کلکتہ	۴۵۷
۹	شوہر دار بیوہ	جناب حکیم عبد الوالی صاحب لکھنؤ	۴۵۸
۱۰	فریب دوستی	جناب احسان بن دانش صاحب	۴۶۲
۱۱	سوشلسٹ کانگریسیوں کی زبان	جناب امام صاحب اکبرآبادی	۴۶۳
۱۲	جمال آرا کا اعتراف شکست	جناب سید عزت علی صاحب الہ آبادی	۴۶۵
۱۳	درس حریت	جناب محسن صاحب اعظم گڑھی	۴۷۴
۱۴	سوشلزم کا مفہوم	" "	۴۷۵
۱۵	خواب کی سی رات	جناب اعظم صاحب خسروی	۴۷۷
۱۶	پریم کی دنیا	جناب محمد اسمٰعیل صاحب افسر رمضان پوری	۴۷۸
۱۷	میں محبت کرتی ہوں	جناب سجاد حیدر صاحب افریدی ملیح آبادی	۴۸۷
۱۸	پرواز تخیل اور راہ عمل	جناب شیو صاحب فرید آبادی	۴۸۸
۱۹	پٹرول کی جنگی اہمیت	جناب رئیس صاحب دہلوی	۴۹۹
۲۰	دھوکا	جناب حسن ابن ضیا صاحب علوی کاکوروی	۵۰۳
۲۱	ایک خط	جناب بیکش صاحب اکبرآبادی	۵۰۵
۲۲	فسون محبت	جناب ظہرا صاحبہ	۵۰۶
۲۳	آ	جناب عبد الغنی صاحب میسور	۵۰۷
۲۴	نظام جدید	جناب محمد یوسف رضا صاحب بدایونی	۵۰۸

(جوش ملیح آبادی پرنٹر و پبلشر نے محبوب المطابع برقی پریس دہلی میں چھپوا کر دفتر رسالہ کلیم نمبر ۴ دریا گنج سے شائع کیا)

اشارات

"خدا" اور "نامعلوم قوّت"

مُدیر

آپ کلیم کی اِس اشاعت میں اٹلی کے مشہور فلسفی "میزنی" کے ایک مقالے "خدا" کا ترجمہ کسی جگہ ملاحظہ فرمائیں گے۔

"میزنی" کے اس مضمون سے، میرے نزدیک چونکہ ایک علمی پیچیدگی کے پیدا ہو جانے کا اندیشہ ہے۔ اس لئے مدیرانہ دیانت سے مجبور ہو کر، میں اُس کے متعلق کچھ عرض کر دینا مناسب خیال کرتا ہوں۔

"خدا" کا مسئلہ، اِس قدر نازک، اور ہندوستان میں تو اِس قدر خطرناک حد تک نازک واقع ہوا ہے کہ اِس پر روشنی ڈالتے ہوئے انتہائی احتیاط سے کام لینے کی ضرورت ہے۔

اِس کے علاوہ لسانی حیثیت سے بھی اِس نوعیت کے مسائل پر کامیاب خامہ فرسائی نہایت ہی دشوار معلوم ہوتی ہے۔

بات یہ ہے کہ نازک اور عمیق مسائل کا جب الفاظ کی پشت پر بار ڈالا جاتا ہے، تو الفاظ کی کمر، یا تو کم سے کم ٹوٹنے کی حد تک لچک جاتی ہے، یا پھر صاف ٹوٹ ہی کر رہ جاتی ہے۔

صحیح ترین بات کا صحیح ترین الفاظ میں ادا کر دینا ایک بہت بڑے ملک کے فتح کر لینے کے برابر ہے۔

عمیق و لطیف خیالات کے بُخارات جس وقت دل و دماغ سے اُٹھنے لگتے ہیں، طوفانی سمندر سے مانسُون کے لچھّوں کی طرح —— تو اُس وقت ناطقہ حیران ہو کر مُنہ تکنے لگتا ہے کہ اُنھیں الفاظ کے ذریعے سے کیونکر گرفتار کیا جا سکتا ہے ——

تخئیل کی وُسعتیں، عیاذاً باللہ کس طرح زبان ہو نہ حیران و تباہ
الفاظ لرز کے ڈال دیتے ہیں سپر جس وقت گزرتی ہے معانی کی سپاہ

بات یہ ہے کہ سوچنے والے سوچتے تو ہیں خالص سونا، مگر جب الفاظ میں اُس سونے کو پیش کرتے ہیں تو وہ پیتل ہو کر رہ جاتا ہے۔

معنیٰ کی تب و تاب گھٹاتا ہوں میں جب نطق کی منزلوں میں لاتا ہوں میں
افکار کے پگھلے ہوئے سونے کو ندیم الفاظ کے تانبے پہ بہاتا ہوں میں

اس کے علاوہ، جیسا کہ ابھی عرض کیا جا چکا ہے، "خدا" کا مسئلہ، دیگر ممالک میں تو صرف "نازک" ہی ہے، لیکن ہندوستان کے سے ملک میں صرف "نازک" ہی نہیں" خطرناک" بھی ہے —— کیونکہ اِن مسائل میں ایک ذرا سے اختلاف رائے پر صرف یہی نہیں ہوتا کہ انکار و الحاد کے فتوے صادر کر دئے جاتے ہیں، بلکہ گتھم گتھا ہو جاتی ہے اور چھُریاں تک چلنے لگتی ہیں۔

ہندوستان، چونکہ ہنوز ذہنی طفولیت کی منزل میں ہے، اور ابھی تک یہاں کے بیشتر تعلیم یافتہ خواص تک عوام و جُہلا، کی سی پست ذہنیت رکھتے ہیں، اِس لئے بچّوں کی طرح سمجھانا پڑتا ہے کہ الحاد، دراصل اُس منزل کا نام ہے، جہاں سرے سے کسی قوّت کو تسلیم ہی نہیں کیا جاتا۔ اور آنکھیں بند کر کے انکار کر دیا جاتا ہے، لیکن، اگر کوئی شخص کسی قوت کی موجودگی کو تو تسلیم کرتا ہے، مگر اُس قوت کے ساتھ، عوام کا طبقہ جن تصورات کو وابستہ کئے ہوئے ہے۔ اُن تصورات کے تسلیم کر لینے پر اپنے کو عقلاً مہیا نہیں کر سکتا تو کس دانائے راز کے مُنھ میں اتنے دانت ہیں کہ وہ ایسے شخص کو منکر یا ملحد

کالقب دے سکے؟ اس مختصر سی دفع دخل کرنے والی تمہید کے بعد اب میں اصل موضوع کی طرف متوجہ ہوتا ہوں۔

"میزنی" کا قول ہے کہ: "(۱) تم میں منکرین خدا کا وجود نہیں ہے اور (۲) اگر کوئی منکرِ خدا ہوتا بھی تو وہ بددعاؤں اور لعنتوں کے عوض، آنسوؤں کا مستحق ہوتا (۳) تاروں بھری رات میں، اپنے عزیز ترین احباب کی قبروں کے پہلو میں، یا شہادت (قتل فی سبیل اللہ) کی موجودگی میں، خدا کا انکار کرنے والا یا تو نہایت ہی بدنصیب ہے، یا انتہائی شریر۔ (۴) سب سے پہلا ملحد، بیشک وہ شخص تھا، جس نے اپنے جرائم، تمام آدمیوں سے چھپالئے تھے، اور خدا کا انکار کرکے اُس نے یہ چاہا تھا کہ اُس تنہا شاہد سے بھی، جس سے کوئی جرم چھپایا نہیں جاسکتا، آزادی حاصل کرے۔"

"میزنی" کے اس متذکرۂ بالا بیان میں کئی باتیں قابلِ غور ہیں — میں نے سہولت کی خاطر اُس کے ہر قول پر نمبر لگا دئے ہیں۔

سب سے پہلی بات پر یعنی "تم میں منکرین خدا کا وجود نہیں ہے" میں سب سے آخر میں روشنی ڈالوں گا۔ کیونکہ اس اشارے کا مقصود اصلی وہی ہے۔ پہلے نمبر (۲) سے نمبر (۴) تک پر اظہارِ خیال کرنا مناسب سمجھتا ہوں۔

نمبر (۲) "اگر کوئی منکرِ خدا ہوتا تو وہ بددعاؤں، اور لعنتوں کے عوض، آنسوؤں کا مستحق ہوتا۔"

ہم اس قول پر "میزنی" کو مبارکباد دئے بغیر نہیں رہ سکتے، یہ یہ ایک نہایت ہی تندرست خیال ہے۔ کیونکہ جیسا کہ ہر فلسفی کا خیال ہونا چاہئیے "میزنی" کے نزدیک جو شخص، خدا کے وجود کو تسلیم نہیں کرتا، وہ ذہنی حیثیت سے بیمار ہے، اور ظاہر ہے کہ بیمار آدمی، بددعاؤں اور لعنتوں کا نہیں، بلکہ آنسوؤں کا مستحق ہوتا ہے۔

اس متذکرۂ بالا قول کے اندر "میزنی" ہمارے سامنے ایک صاحبِ دل فلسفی کی شکل سے نمودار ہوا ہے۔ لیکن جب وہ اپنے قول نمبر (۳) میں یہ کہتا ہے کہ "تاروں بھری رات میں، اپنے عزیز ترین احباب کی قبروں کے پہلو میں یا قتل فی سبیل اللہ کی موجودگی میں، خدا کا انکار کرنے والا یا تو نہایت ہی بدنصیب ہے، یا انتہائی شریر" تو اس فقرے پر وہ اپنا حکیمانہ لباس اُتارے، اور شاعرانہ عبا، زیبِ دوش کئے ہوئے ہمارے سامنے آکھڑا ہوتا ہے۔

"عزیز ترین احباب کی قبروں کے پہلو میں" اور وہ بھی کب؟ "تاروں بھری رات میں" خدا کا تصور کرنا شاعرانہ وجدان کے حضور، خواہ کتنی اہم یا رومانی بات کیوں نہ ہو۔ مگر فلسفے کی بارگاہ میں ان چیزوں کو، کسی شرط کے ساتھ بھی بار نہیں دیا جاسکتا۔

اپنے محبوبوں کی قبروں کے قریب بیٹھکر ٹھنڈی سانسیں بھرنا، اس وقت، جب کہ ستارے، آسمان کے سینے میں دلوں کی طرح دھڑک رہے ہوں، ایک ایسی ناقابلِ شرح دردآمیز روحانی عشرت ہے۔ جس کے تصور تک سے ایک شاعرانہ دل و دماغ کا آدمی سر دُھن سکتا ہے۔ مگر اس ماتمِ احباب اور خوفِ اجل کے سانچے میں ڈھلی ہوئی ایک خالص جذباتی بات سے ہم وجودِ "خدا" پر کوئی استدلال قائم نہیں کرسکتے۔

یہ متذکرۂ بالا چیزیں، ہمیں ایک اعلیٰ درجے کی شاعرانہ قوت سے متاثر کرکے ہمارے جذباتِ محبت، ہمارے جبلی خوفِ مرگ، اور ہمارے جمالیاتی شعور کو تو بڑی آسانی کے ساتھ وجد کرنے پر آمادہ کرسکتی ہیں۔ لیکن ہماری حکیمانہ تشنگی کے ساتھ اُسی طرح کھیلتی ہیں جس طرح خوفناک ریگستان کے ذرّوں کی چمک، سراب بن کر پیاسے مسافروں کے ساتھ عربدے کرتی رہتی ہے۔

ہمیں "میزنی" سے یہ شکایت کرنے کا بجا طور پر حق پہونچتا ہے کہ وہ فلسفیانہ باتیں کرتے کرتے، یکایک ایک شاعر کا پارٹ کرنے لگا، جو اس موقع پر صرف بے موقع ہی نہیں گمراہ کُن بھی ہے —— اور اُسی کے دوش بدوش ہمیں "میزنی" سے یہ شکایت بھی ہے کہ اُس نے منکرِ خدا کو "بدنصیب" اور "شریر" کے لفظ سے بھی یاد کیا ہے۔

ایک خالص جذباتی آدمی کو تو ہر وقت تند و تُرش الفاظ کے استعمال کا حق حاصل ہے۔ لیکن ایک حکیم کے واسطے خراش انگیز الفاظ کا استعمال قطعی ناروا ہے —— حکیمانہ مسائل میں جو شخص اپنے جذبات کو داخل کردیتا ہے، فلسفہ سرے سے اُس کے حکیم ہونے ہی کا انکار کرتا ہے، اور تند و تلخ الفاظ کے استعمال کو حکمت کی شریعت حرام قرار دے چکی ہے۔

یہ بات اچھی طرح ذہن نشین کرلینے کے قابل ہے کہ اثنائے مکالمت میں جیسے اپنے حریف پر غصہ آجاتا ہے، ایک حکیم کی حیثیت سے اس کا مرتبہ

کوئی قابلِ لحاظ بلندی نہیں رکھتا۔

"میزنی" نے منکرِ خدا کے باب میں "انتہائی بدنصیب یا شریر" کہکر تند و تلخ الفاظ کا ارتکاب کرتے ہوئے اُس کے متعلق اپنے قول نمبر (۴) میں ایک ایسی عجیب بدگمانی کا بھی اظہار کیا ہے۔ جو سراسر ناممکن سی بات ہے ــــ وہ کہتا ہے "سب سے پہلا ملحد، بیشک وہ شخص تھا جس نے اپنے جرائم، تمام آدمیوں سے چھپا لیے تھے۔ اور خدا کا انکار کر کے اُس نے یہ چاہا تھا کہ اُس تنہا شاہد سے بھی، جس سے کوئی جرم چھپایا نہیں جا سکتا، آزادی حاصل کرے"۔

لیکن میں نہایت بلند آہنگی سے ایسے مُنکرِ خدا کا قطعی انکار کرتا ہوں۔ کیونکہ میرے نزدیک، کوئی احمق سے احمق، آدمی بھی ایسا نہیں ہو سکتا جو دل میں تو خدا کے وجود کا قائل ہو، اور زبان سے محض اِس واسطے انکار کرے کہ اُس "تنہا شاہد" سے بھی اپنے جرائم کو چھپا لے، جس سے کوئی جرم چھپایا نہیں جا سکتا۔ یہ بات کسی طرح بھی عقل میں نہیں آتی ہے کہ خُدا کے وجود کا دل سے تو اقرار کیا جائے۔ اور زبان سے محض اس توقع پر انکار کیا جائے کہ قلبی اعتقاد کی سی شے کی موجودگی میں، صرف زبانی انکار یہ معجزہ کر دکھائے گا کہ مُنکر کے جرائم کو اُس "تنہا شاہد" سے چھپا لے گا جس سے کوئی جرم چھپایا نہیں جا سکتا۔

تصور کیجئے ایک ایسے شخص کا جس کے سامنے ایک شخص بھرا ہوا پستول لئے کھڑا ہے۔ اور اُس کے سینے کی طرف نشانہ باندھ کر پستول کا گھوڑا دبانے ہی والا ہے، کیا اس موقعے پر وہ شخص، جو پستول کی زد پر کھڑا ہوا ہے، اپنے کو خوفِ مرگ سے صرف یہ کہہ کر نجات دے سکتا ہے، کہ نہیں، میرے سامنے تو کوئی شخص پستول لئے کھڑا ہی نہیں ہوا ہے!

بس جس طرح متذکرۂ بالا صورت ناممکن ہے، اُسی طرح یہ بات بھی امکان سے خارج ہے کہ دل میں تو خدا کے وجود کا اعتقاد رکھا جائے اور زبان سے محض اِس اُمید میں انکار کیا جائے کہ اُس "تنہا شاہد" سے بھی آزادی حاصل کر لی جائے جس سے کوئی جرم مخفی نہیں رکھا جا سکتا۔

اب رہی آخری بات جس کے متعلق میں نے عرض کیا تھا کہ اُس پر سب سے آخر میں روشنی ڈالوں گا۔

"میزنی" کا سب سے پہلا جملہ یہ ہے کہ "تم میں منکرینِ خدا کا وجود نہیں ہے" ــــ

اس جملے کے متعلق میں، ایک ایسی شدید تکلیف کے ساتھ، جو کسی علمی مسئلے کے اُلجھ جانے سے پیدا ہوا کرتی ہے، یہ عرض کروں گا کہ اس قول نے علمی دنیا میں بہت بڑا مغالطہ پیدا کر دیا ہے ــــ

اس قول کے متعلق لوگوں کے دل میں یہ ایک غلط خیال بیٹھ گیا ہے کہ اِس نے بڑی خوبی، اور بے پایاں وسعت کیساتھ منکرینِ "خدا" کا اِس طرح احاطہ کر لیا ہے کہ وہ کہیں باہر نکل ہی نہیں سکتے۔

اس قول کے یہ معنی ہیں کہ جو شخص "خدا" کو نہیں مانتا وہ بھی مانتا ہے۔ چنانچہ ہمارے ایک پُرانے شاعر حالی نے بھی اپنی اِس رباعی میں:۔

ہندو نے صنم میں جلوہ پایا تیرا　　آتش پہ مغاں نے راگ گایا تیرا
دہری نے کیا دہر سے تعبیر تجھے　　انکار کسی سے بن نہ آیا تیرا

اِسی متذکرۂ بالا قول کی تائید و تصدیق کی ہے۔

حالی اپنی رُباعی سے اِس امر پر روشنی ڈالتے ہیں کہ "صنم" "آتش" اور "دہر" وغیرہ یہ تمام چیزیں ہر چند ایک طرف تو باہم دگر بالکل مختلف واقع ہوئی ہیں۔ اور دوسری طرف "خدا" سے بھی بظاہر انھیں کوئی نسبت ہی نہیں معلوم ہوتی۔ لیکن چونکہ "خدا" ہر شے پر محیط ہے۔ ہر شے کی اصل ہے۔ ہر شے کا پروردگار ہے۔ یا یوں سمجھئے کہ وہ ہر شے کی حقیقت و عینیت، یا ہر شے کے روپ میں خود ہی جلوہ گر ہے۔ اِس لئے اِس دنیا کی جس چیز کو بھی مانا یا سجدہ کیا جائے گا، وہ سجدہ، اس مسجود چیز کی معرفت پہونچ جائے گا، اُسی حقیقی ذات تک جسے "خدا" کہا جاتا ہے ــــ اور یہی وہ نظریہ ہے جس کے تحت "میزنی" کے اِس قول کی تصدیق ہوتی ہے کہ "تم میں منکرینِ خدا کا وجود نہیں ہے"۔

لیکن افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ یہ قول، اور اِس قول کے متعلقات ایک بہت بڑے مغالطے پر مبنی ہیں۔

اِس مغالطے کے سمجھنے کی خاطر پہلے ایک بات کا سمجھ لیا جانا بہت ضروری ہے ــــ بات یہ ہے کہ انسانی جماعت میں دو گروہ ہمیشہ نمایاں رہے، اور آج بھی ہیں ــــ جن میں سے ایک گروہ تو وہ ہے جو "خدا" کا معتقد ہے، اُن تمام معنوں میں جنھیں مختلف مذاہب مختلف اوقات میں متعین کرتے رہے ہیں ــــ اور دوسرا گروہ وہ ہے جو مذاہب کے پیش کردہ "خدا" کے عوض ایک علمی قوت کو نامعلوم قوت کے نام سے تسلیم کرتا ہے۔ اور ان دونوں کے نظریات میں زمین آسمان کا فرق ہے۔

لیکن "میزنی" اور اُس کی ہمخیال جماعت اِن دونوں نظریات

یعنی مذہبی "خدا" اور علمی "قوتِ نامعلوم" کو کسی عقلی دلیل کے بغیر ایک ہی شے فرض کر کے یہ آوازہ بلند کرتے ہیں کہ "تم میں منکرینِ خدا کا وجود نہیں ہے"! حالانکہ صورتِ حال قطعی طور پر اِس کے برعکس معلوم ہوتی ہے۔

ممکن ہے بہت سے سہل پسند احباب، اِس موقعے پر، بڑی بے تکلفی سے یہ کہہ اٹھیں کہ "اس میں ہرج ہی کیا ہے؟ "خدا" اور "نامعلوم قوت" دونوں ہیں ہی ایک چیز، پھر "ہیزنی" اور ہیزنی کی ہمخیال جماعت پر اعتراض کیوں کیا جاتا ہے۔ یہ تو محض لفظی تکرار ہے، جس کے کوئی معنی ہی نہیں"——

میں ان سہل پسند احباب سے بحث کرنا پسند نہیں کروں گا۔ بلکہ اُن کی تسکین کی خاطر یہاں تک کہہ دینے پر اپنے کو آمادہ کر لوں گا کہ جہاں تک خالص حقیقت کا تعلق ہے، بہت ممکن ہے کہ "خدا" اور "نامعلوم قوت" دونوں ایک ہی ہوں——

لیکن مجھ غریب کے پاس اِس کا کوئی علاج ہی نہیں کہ خالص اصطلاحی حیثیت" سے "خدا" کا جو مفہوم صدیوں اور قرنوں سے سینہ بسینہ اور "صحف" بہ "صحف" چلا آرہا ہے، اُس پر نگاہ کر کے کوئی صاحبِ فکر اس بات کے ماننے پر اپنے کو رضامند نہیں کر سکتا کہ "خدا" اور "نامعلوم قوت" اصل میں ایک ہی شے کے دو نام ہیں۔

سب سے زیادہ کھٹکا، اور ذہن کو الجھا دینے والی بات یہ ہے لفظِ "خدا" کے چپ و راست "پیش و پس، تحت و فوق، اور گرداگرد، جن بیشمار جذباتی اور وجدانی اعتقادات، خیالات، ظنیات اور قیاسات کا حیرتناک جال بُنا ہوا ہے، اور اِس لفظِ خاص سے انسانی صفات، اور شخصی تعینیات کے جو لاتعداد تصوّرات وابستہ کر دئے گئے ہیں، وہ سب کے سب اپنی نوعیت کے لحاظ سے اس قدر بعید از عقل واقع ہوئے ہیں، کہ حکیمانہ بصیرت، اور مفکرانہ ژرف نگاہی، ہمیں اِس کی اجازت نہیں دیتی کہ ہم علمی "نامعلوم قوت" کو اعتقادی خدا" کا لقب دے کر ایک ایسی حیرتناک و ناقابلِ تسلیم شے بنا دیں جو ایک جہت سے تو خالق معلوم ہوتی ہے۔ اور دوسری جہت سے مخلوق۔

"ہیزنی" نے دو متضاد چیزوں، یعنی "خدا" اور "نامعلوم قوّت" کو مخلوط کر کے جو منتشر اور غیر معیّن جذباتی بحث کی ہے، اس سے کوئی تشفی بخش نتیجہ نہیں نکلتا۔ اور وہ سب کچھ کہہ چکنے کے بعد جو "ہیزنی" کہنا چاہتا ہے، پڑھنے والے کے ذہن پر یہ اثر ہوتا ہے کہ معنوی اعتبار سے اُس نے کچھ بھی نہیں کہا ہے۔ اور یہ بیچارے "ہیزنی" کا قصور نہیں ہے۔ بلکہ یہ علم الاخلاق کے ذریعے سے اثباتِ "خدا" پر حجت قائم کرنے کی غلطی کا نتیجہ ہے کہ یہ طریقہ ہمیشہ اِسی قسم کی خامیوں کا موجب ہوتا ہے۔

"مذہبی خدا" اور "نامعلوم قوّت" میں ایک دوسری حیثیت سے بھی بڑا فرق ہے—یعنی "مذہبی خدا" کے متعلق نامعلومیت باقی نہیں رہی ہے، کیونکہ صحائف کے ذریعے سے ہمیں اُس کے مزاج، اور اُس کے طبعی رجحانات تک کا پتا چل چکا ہے، اور "نامعلوم قوت" کے متعلق، جیسا کہ خود اُس کے نام سے ظاہر ہے، ہم کچھ بھی نہیں جانتے——

"خدا" کے "صفات" کو تو مذاہب نے نمایاں کر دیا ہے۔ اور "ذات" کے متعلق اگرچہ وہ خاموش ہیں۔ مگر تعینیات اُس کے بارے میں بھی موجود ہیں۔ اور اِس طرح "ذات" کی نوعیت "صفات" میں گُم ہے، کیونکہ بعض قدیم فلسفیوں کے بموجب اگر کسی شے کے جملہ صفات کا تجزیہ کر دیا جائے تو پھر اُس میں کوئی چیز ایسی باقی نہیں رہ جاتی جس کو "ذات" سے تعبیر کیا جائے، اور اِس لئے یہ کہہ سکتے ہیں کہ "ذات" دراصل "صفات" کے مجموعے کا نام ہے، یعنی متفرق و مختلف "صفات" کا یکجا ہو جانا ہی "ذات" ہے۔ اور یہ اِکائی، ایک خالص ذہنی چیز ہے۔ کیونکہ اشیاء میں اِس کے مقابلے کی کوئی چیز نہیں پائی جاتی۔ اِس لئے "ذات" محض ایک ذہنی چیز ہے، خارج میں "صفات" ہیں، اور یہ "صفات" ہی ہیں جو اپنی اثر آفرینی سے اپنے وجود کا پتا دیتے ہیں۔

الغرض نظر سے اگر دیکھا جائے تو اعتقادی "خدا" کے متعلق کوئی چیز بھی دریافت طلب نہیں ہے۔ اور سائنٹیفک "نامعلوم قوت" کے متعلق کوئی بات بھی نامعلوم نہیں ہے۔ اِس لئے یہ دونوں چیزیں یکساں ہونے کے عوض، متضاد ہیں، اور جو لوگ ایک چیز کو دوسری کا مرادف خیال کرتے ہیں، وہ بڑی نادانی میں مبتلا ہیں۔

بعض اوقات بہت سے احباب نہایت ہی آسانی کے ساتھ یہ سوال کر بیٹھتے ہیں کہ وہ "نامعلوم قوت" دراصل ہے کیا؟ نیز شاعر ہے، کہ غیر شاعر؟ کاش انھیں اِس کا اندازہ ہوتا کہ جس آسانی سے وہ یہ سوال

کر رہے ہیں، اُسی آسانی کے ساتھ اُن کے سوال کا جواب نہیں دیا جا سکتا۔

یہ ایک نہایت ہی قابلِ مضحکہ بات معلوم ہوتی ہے کہ جس شے کا نام ہی ہو "نامعلوم قوت" اُسے معلوم کرنے کے واسطے کوئی سوال کیا جائے سوال کرنے والوں کو معلوم ہونا چاہیئے کہ اِس سوال کا جواب دینا ہرگز ہمارے بس کی بات نہیں، اس لئے کہ "نامعلوم" کے معنی ہی یہ ہیں کہ اُس کے متعلق اِس وقت تک ہمیں کچھ بھی معلوم نہیں ہے۔ یعنی:-

معلوم شُد کہ ہیچ معلوم نہ شُد!

اور معلوم ہو بھی تو کیونکر؟

ابھی تک یعنی آج کی تاریخ، اور اِس لمحۂ تحریر تک ہمیں تو اُن پیش پا اُفتادہ اشیائے عالم تک کی حقیقت نہیں معلوم ہو سکی ہے، جن پر ہم اپنی روزمرّہ کی زندگی میں، اپنے تمام قہرمانی طمطراق کے ساتھ حکومت کر رہے ہیں ——— نامعلوم

صدیوں کی مُسلسل کاوشوں، اور ناقابلِ شمار قرنوں کی مستقل عرق ریزیوں کے باوصف، ہم اب تک حاصل ہی کیا کر سکے ہیں؟

چند اشیاء کے اسماء! چند اشیاء کے خواص! جی ہاں۔ بس، اسی قدر۔ صرف اِسی قدر۔

چند اشیاء کے اسماء، اور چند اشیاء کے خواص، یہی لے دے کر ہماری کائنات ہے ———

پس ان حالات میں بہ بانگِ دُہل میں دریافت کرنا چاہتا ہوں کہ کیا آدم کا کوئی فرزند اپنی اِس اسماء و خواص کی حقیر پُونجی سے اُس عظیم بازار میں خرید و فروخت کی جسارت کا خواب دیکھ سکتا ہے، جہاں "خواصِ اشیاء" کے عوض "حقائقِ اشیاء" کی درآمد و برآمد کا کاروبار ہوتا رہتا ہے۔ ہے کوئی ایسا؟

این است کہ دل بردہ و خوں کردہ بسے را ✝ بسم اللہ اگر تابِ نظر ہست کسے را!!

نومیدیٔ نظارۂ انوار بھی ہے،
اُمیدِ شہود و شوقِ دیدار بھی ہے،
اِک قادرِ مطلق کا جہاں ہے یہ سوال
انکار بھی ہے، اور اقرار بھی ہے،

احسن

ہنسنا بھی عجیب ہے، ترا رونا بھی عجیب
پانا بھی ہے حرفِ ناروا، کھونا بھی عجیب
اِک قادرِ مطلق کا یہ اوصافِ حسن
ہونا بھی عجیب ہے، نہ ہونا بھی عجیب

احسن

رندِ ہزار پیشہ

ہمنشیں، مجھکو لرزتے ہوئے آگاہ نہ کر
ہاں، میں واقف ہوں کہ اوہام زبوں کے فرزند
میری آواز سے ہے رُوحِ قدامت کو عناد
ہاں مری جان کے دشمن ہیں خیالاتِ عقیم
جن پر اک عمر سے تقلید کا نازل ہے عذاب
میں نے خورشیدِ حقائق کو جو چمکایا ہے
ہاں میں واقف ہوں کہ برگشتہ ہیں مجھسے وہ عوام
جن کا ادراک، تعفن سے غذا پاتا ہے
بھونکتے ہیں مرے افکار پہ وہ خانہ خراب
مسلکِ عذر کا ہر سالک بیہودہ مزاج
مشورے ہیں مری تخریب کے، مگر اُہوں میں
ہاں وہ کہتے ہیں مجھے بادہ کش و نامہ سیاہ
ہاں، سیاست کو بھی کچھ بُغض نہیں کم مجھسے
ہاں مری سمت ہے، تقدیر سے دو نوکی نگاہ
شیر ہی مجھ سے پریشاں نہیں، رُوباہ بھی ہے
تو مگر خوف دلاتا ہے عبث، یار حبیب
رند ہیں موت کے دھارے میں اُبھرنے والے
موت کا جام ہے صہبا کی صُراحی مجھ کو
رُوح ہے مجھ میں صُعوبت کے پرستاروں کی
بر سول جھُولا ہوں اُن اجداد کے گہواروں میں
تیغِ خوں ریز سے بڑھ چڑھ کے تھے ابرو جن کے
جانتا ہی نہیں درماندہ و حیران ہونا
سبزہ گلزار ہے، شعلوں کا بھڑکنا مجھ کو
اپنے تابندہ روایات کی کھاتا ہوں قسم
رقص کرتا ہوں میں چلتی ہوئی تلواروں پر

کہ بلا خیز حوادث کی نظر ہے تجھ پر
پھینکنا چاہ رہے ہیں مرے قلعے پہ کمند
میرے افکار سے آشفتہ ہیں اربابِ فساد
ہاں، مرے خُون کے پیاسے ہیں روایاتِ قدیم
وہ مجھے "کافر" و "زندیق" کا دیتے ہیں خطاب
خُون، اوہام کی آنکھوں میں، اُتر آیا ہے
جن کے افکار کو یرقان ہے، عقلوں کو جُذام
جن کو بُوئے گل و نسریں سے بُخار آتا ہے
خود کو "علامہ" و "شاعر" کا جو دیتے ہیں خطاب
میری آزاد روِش سے ہے بر افروختہ آج
کتنے بزدل ہیں کہ بیٹھے ہیں کمینگاہوں میں
جن میں باقی نہیں اب جرأتِ رندی و گناہ
طُرّہ افسرِ شاہی بھی ہے برہم مجھ سے
وہ محتسبِ شہر ہو، یا شحنۂ شاہ
شاہ صاحب" بھی مری فکر میں ہیں، شاہ بھی ہے
پھر تو دُہرا کہ تری موت کی ساعت ہے قریب
موت کے نام سے ڈرتے نہیں، مرنے والے
موت کے نام سے آتی ہے جماہی مجھ کو
نشہ ہوتا ہے مجھے چھاؤں میں تلواروں کی
صُبح منُھ دیکھتے تھے اُٹھ کے جو تلواروں میں
تیر سینوں ہی میں ہوتے تھے ترازو جن کے
کھیل ہے، غم سے مجھے دست و گریباں ہونا
لحنِ شیریں ہے کمانوں کا کڑکنا مجھ کو
زہر، امرت ہے مرے حق میں، جراحت مرہم
نیند آتی ہے دہکتے ہوئے انگاروں پر

اُس کو کیا خوف ہو چلتی ہوئی تلواروں سے
نہ تو کھیل چکا ہو جو طرحداروں سے

اب مصیبت ہے، مصیبت کا نہ ہونا مجھ کو
کر دیا عشق کی نرم آنچ نے سونا مجھ کو

ہوں، اگر دہر میں آثار ہیں پیکاروں کے
زخم ہیں دل پہ مرے حُسن کی تلواروں کے

ہوں، اگر حشر ہیں دنیا کے بلاخانے میں
ایسے ٹکڑے ہیں بہت سے مرے افسانے میں

کیا بھلا خوف میں کانٹوں کے گرفتار ہوں میں
جس کو پھولوں نے ڈسا ہے وہ دلِ افگار ہوں میں

موجِ صرصر سے ڈراتا ہے اُسے تو بیکار
جل چکا ہے جو نسیمِ سحری سے سو بار

اُس کو شعلوں سے ڈراتا ہے کوئی اے ہمدم
نوجوانی میں جسے پھونک چکی ہو شبنم

قہرِ یاراں کو سمجھتا ہے وہ از قسمِ نیاز
قہرِ خوباں کا جو مقتول ہے اے محرمِ راز

تیغِ دشمن سے جواں مرد بھی ڈرتے ہیں کہیں
خنجرِ دوست کے مارے ہوئے مرتے ہیں کہیں

بحر میں آگ لگاتی ہے کہانی میری
گرمیٔ برق پہ ہنستی ہے جوانی میری

کتنے گرداب ہیں دیکھے ہیں کنارے میں نے
کتنے کاٹے ہیں مچلتے ہوئے دھارے میں نے

کتنے ادیان کی موڑی ہے کلائی میں نے
کتنے اصنام کو بخشی ہے خدائی میں نے

شوق نے پاؤں سے مَسلی ہیں وبائیں کیا کیا
عشق نے ہجر کی جھیلی ہیں بلائیں کیا کیا

کتنا اُلجھا ہوں تڑپتے ہوئے ارمانوں سے
کتنا کھیلا ہوں برستے ہوئے طوفانوں سے

خوفِ جاں ہی نہیں، ہر خوف پہ خنداں ہوں میں
اک رہا خوفِ خُدا، خیر، مسلماں ہوں میں

پُوچھ، دم بھرتا ہے کب سے مری مداحی کا
تجربہ، مملکتِ حُسن کی سیاحی کا

مانتی ہیں سفرِ صعب کی گھاتیں مجھ کو
خُوب پہچانتی ہیں خوف کی راتیں مجھ کو

کب سے دیوانہ خرامی کو مری جانتی ہیں
ظلمتیں مجھ کو، مری چاپ سے پہچانتی ہیں

بُول، اگر نطق ہے، اے دیدۂ حیراں تجھ میں
کتنے پُر ہول شب و روز ہیں غلطاں تجھ میں؟

تُو نے کیا کیا نہ اُٹھایا ہے، مری رُوحِ نیاز
تیز کرنوں کا غرور، اور کڑی دُھوپ کا ناز

کس قدر شدّتِ سرما کے ہیں خنجر تجھ میں؟
جذب ہیں کتنی سِلیں برف کی، اے سر تجھ میں؟

بول، ہُوں زُلف گزیدہ، دلِ حیراں کب سے؟
زہرِ کاکُل ہے مرے خوں میں غلطاں کب سے؟

کس قدر لُو کے تھپیڑے ہیں پرافشاں تجھ میں؟
کتنے طوفان ہیں، اے سینۂ سوزاں تجھ میں؟

دست و بازو میں ہیں بھرے ہوئے دریا کیا کیا
اِس کفِ پا میں ہیں تپتے ہوئے صحرا کیا کیا

سَر میں ہیں، شورشِ کونین کے کس بَل کتنے!
گُم ہیں کانوں میں گرجتے ہوئے بادل کتنے!

بَرق و باراں سے ہوئیں دشت میں باتیں کیا کیا
غرق ہیں دل میں برستی ہوئی راتیں کیا کیا!

رند ہیں خون کے دریا میں نہانے والے
جا بھی اے سیلِ حوادث سے ڈرانے والے

جوش ملیح آبادی

مذہب اور سائنس

ناظر

اس مضمون کا موضوع جس قدر فرسودہ اور پامال ہے وہ محتاجِ بیان نہیں۔ فی زمانہ اس عنوان کے تحت جو کچھ لکھا جاتا ہے اُس کا رجحان ہوتا ہے کہ مذہب اور سائنس کی دیرینہ تنقیض کو مٹا کر اِن میں یگانگی پیدا کرنے کی کوشش کی جائے اور اس کوشش کی محرک وہی مذہبی گرویدگی ہے جس کے لئے علم کی روشنی اور جہالت کی تاریکی یکساں ہے۔ مذہب اور سائنس کی تنقیض کی صورت میں اہلِ مذہب کو یہ اندیشہ تھا کہ علمی دَور میں مذہب سائنس کی بھینٹ نہ چڑھ جائے۔ اس لئے مذہب کو سلامت اور برقرار رکھنے کے لئے ضروری معلوم ہوا کہ دونوں چیزوں میں مطابقت اور ہم آہنگی تلاش کی جائے۔ چنانچہ ہم کو بتایا گیا کہ سائنس اور مذہب میں تنقیض سمجھنا ایک قدیم جہالت ہے۔ اور سائنس کے نئے مذہب میں یہ سنتِ متروکہ سے کم نہیں۔ مذہبی معتقدات کا احترام نہ کرنا سائنس کی کوتاہ اندیشی تھی کیونکہ یہ محققانہ تبحر کی علامت ہونے کی بجائے علمی تنگ ظرفی کی دلیل ہے۔ اِن خیالات کی اشاعت نے مذہب کے سُوکھے ہوئے درخت میں آبیاری کا کام دیا۔ خصوصاً ہندوستان جیسے ملک میں جہاں سنجیدگی اور متانت کا معیار ہی مذہب پرستی ہے۔ اور تعلیم یافتہ ہو کر اپنے آبائی مذہب سے بے بہرہ ہو جانا حد درجہ کی ناخلفی اور سفلہ پن ہے۔ مذکورہ خیالات نے مذہب کی جڑیں مضبوط کر کے یہاں کی غلامانہ ذہنیت کو استوار کر دیا۔ آج یہی مذہبی ذہنیت اتحاد۔ ترقی اور ہماری قومی آزادی کے لئے سدِّ راہ بنی ہوئی ہے۔ جن مغربی محققین کا نام لے کر ان خیالات کی اشاعت کی جاتی ہے۔ وہ خود مذہب سے دُور کا بھی تعلق نہیں رکھتے۔ اُن کی ذہنیت ہر قسم کی غلامی سے آزاد ہے۔ مذہب اور سائنس کا سب سے اہم اور اصولی تضاد یہی ذہنی تضاد ہے۔ مذہب کی بنیاد تقلید اور روایات پر ہے اور سائنس بالکل اس کے منافی ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ مذہب میں جدت یا بدعت گناہ ہے اور سائنس کی وہ جان ہے اس میں تقلید گناہ ہے۔ سارا فرق ذہنیت کا ہے۔ سائنس کسی خاص تحقیقاتی نتائج کے مجموعہ کا نام نہیں ہے۔ بلکہ مخصوص ذہنیت کا نام ہے۔ جو اُس ذہنیت کے بالکل برعکس ہے جو مذہب کی ہوتی ہے۔ ایک منقولی چیز ہے تو دوسری معقولی۔ ایک حریتِ فکر کی علمبردار ہے تو دوسری ذہنی غلامی کا پروپگینڈا۔ ایک میں اعتقاد ہے تو دوسرے میں اجتہاد۔ ایک کی بنیاد تجربے اور مشاہدے پر ہے تو دوسرے کی اساس کورانہ تقلید۔ ایک میں ترقی ہے۔ دوسرے میں جمُود۔ ایک میں تازگی ہے دوسرے میں بوسیدگی۔ نتائج کے لحاظ سے ممکن ہے سائنس آگے چل کر تحقیقات کی کسی منزل پر مذہب کے بعض عقائد سے متفق ہو جائے، مگر دونوں کی ذہنیت میں تضاد باقی رہے گا۔ ورنہ سائنس سائنس نہیں اور مذہب مذہب نہیں۔ جو چیز ایک کی جان ہے وہ دوسرے کی موت ہے، سائنس کے لئے جس طرح یہ نامناسب ہے کہ وہ کسی بات کا محض اس بنا پر انکار کر دے کہ وہ عام تجربے اور مشاہدے کے خلاف ہے۔ اسی طرح یہ بھی سائنس کے منافی ہے کہ بغیر تحقیق وہ اُس کو آمنّا و صدقنا کہے۔

ہم نے اپنے کسی گزشتہ مضمون میں یہ بتایا تھا کہ جن چیزوں کو قوانینِ قدرت کہا جاتا ہے کہ اُن کا اطلاق محدود ہے یعنی وہ روزمرّہ کی عملی زندگی میں بالکل ٹھیک ثابت ہوتے ہیں۔ مگر مثلاً ہر فطرت کے عام معینہ حدود سے

متجاوز ہو کر دہ شکست ہو جاتے ہیں۔ مادّہ اور قوّت۔ زمان و مکان، ایک ہو جاتے ہیں۔ یہ تمام چیزیں اضافی ہیں اور ایک حدتک ٹھیک ہیں۔ ہم نے یہ بھی بتایا تھا کہ مادّے اور روح کی قدیم تفریق مٹ چکی ہے اور یہ ممکن ہے کہ اصلی وجود نہ مادّہ ہو نہ رُوح۔ بلکہ ایک خاص ترتیب میں آکر وہی چیز روح ہے اور دوسری ترتیب میں مادہ۔ ان سب باتوں نے اگرچہ انیسویں صدی کے طبعی نظریئے میں تبدیلی پیدا کر دی ہے اور دہریت اور مادہ پرستی کے مفہوم میں فرق آگیا ہے۔ مگر اس سے مخصوص مذہبی عقائد کو کوئی فائدہ نہیں پہنچا۔ نہ تو اس سے خدا کے مذہبی تصور کی تصدیق ہوتی ہے اور نہ اُس کی پرستش کی ضرورت ثابت ہوتی ہے۔ اسی طرح حیات بعد الممات کے عقیدے کی بھی عقدہ کشائی نہیں ہوتی۔ جیسا کہ ابھی بتایا جاچکا ہے۔ روح اور مادہ کوئی علیحدہ علیحدہ چیزیں نہیں ہیں۔ یہ ممکن ہے کہ آگے چل کر سائنس کی تحقیقات اِن عقائد سے ہم آہنگ ہو جائیں۔ مگر یہ بھی ممکن ہے کہ کوئی نیا انکشاف سارے قیاسات کو درہم برہم کر دے۔ پھر موجودہ صورت بھی کچھ اطمینان بخش نہیں ہے۔ یہ ہمارا مذہبی تعصب ہے کہ ہم ہر ایسے انکشاف کو مذہب کی تائید میں لینے کی کوشش کرتے ہیں۔ مگر اس طرح دراصل ہم اپنے کمزور پہلو کو جھلکاتے ہیں۔ تحقیقاتی اسپرٹ کو اس سے کچھ بحث نہیں کہ وہ مذہب کے خلاف جارہی ہے یا موافق۔ اور یہی وہ ذہنیت ہے جو مذہب پر فائق ہے۔ ہماری آزادیٔ خیال اور وسعتِ نظر کسی تنگ دائرے میں محدود نہیں ہو سکتی۔ ورنہ ترقی مسدود ہو جائے۔

پھر مذہبی طبقہ میں جن جدید انکشافات کا سہارا لیا جاتا ہے وہ عملی مقاصد کے لئے بہت دُور از کار ہیں۔ مثال کے طور پر اس طرح سمجھیئے کہ پہلے خیال کیا جاتا تھا کہ سورج زمین کے گرد گھومتا ہے۔ اس کے بعد یہ معلوم ہوا کہ زمین سورج کے گرد گروش کرتی ہے۔ مگر اس نظریئے کی تبدیلی سے ہماری روزمرّہ کی زندگی میں کوئی فرق نہیں آیا۔ یہ حکیمانہ موشگافیاں ہیں جو عملی مقاصد پر کوئی اثر نہیں ڈالتیں۔ معمولی حدود میں وہی طبعی قوانین کارفرما ہیں جو معروف ہیں۔ اور مذہب کا جہاں تک عملی زندگی سے تعلق ہے (اور یہی غالبًا اس کا بڑا مقصد ہے) اس کو عام طبعی قوانین سے جانچنا چاہیئے۔ ہرچند کہ مذہبی دلدادگان اس بات کو اپنی تائید میں پیش کرتے ہیں کہ عملی طور پر انیسویں صدی کی دہریت اور مادہ پرستی کا زور و شور فنا ہو گیا۔ اور مذہب کی مخالفت گھٹتی جارہی ہے۔ مگر دنیا کی عملی زندگی میں مادّی پہلو پہلے سے بہت زیادہ نمایاں ہوتا جارہا ہے۔ آج زندگی کا اقتصادی پہلو تمام دیگر پہلوؤں پر حاوی ہے۔ مذہب ہماری معاشی زندگی کو برباد کرتا ہے۔ ہماری توہم پرستی ترقی کے ہر ہر قدم پر حائل ہوتی ہے۔ چنانچہ عقیدتًا گو مذہب اب بھی باقی ہے۔ یا یوں کہو کہ بعض طبقاتی مفاد کی خاطر اس کو باقی رکھنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ مگر عملاً وہ دن بدن معدوم ہوتا جاتا ہے۔ اور یہ اثر صرف انفرادی زندگی ہی میں نہیں بلکہ اجتماعی زندگی میں بھی غلبہ حاصل کر رہا ہے۔ گروہ بندی یا قومیت کا جذبہ روز افزوں فروغ پا رہا ہے۔ جس کی بنا اقتصادی محرکات ہیں۔ مذہب کی عالمگیر روحانی برادری کے مقابلے میں نسلی امتیازات اور قومی تفوق کو سامنے لایا جارہا ہے۔ غرض زندگی کے ہر شعبہ میں ہماری فطرت کے طبعی مظاہرے شدت اختیار کرتے جاتے ہیں جن کے مقابلے میں نام نہاد روحانیت پسپا ہوتی جارہی ہے۔ اور آسمانی مذہب پر ارضی مذہب چیرہ دستی حاصل کر رہا ہے۔

روح سے مراد نفس یا ذہن ہے اور روحانی ترقی کے صحیح معنی ذہنی ارتقا ہے۔ عام خیال یہ ہے کہ دنیا بحیثیت مجموعی ترقی کر رہی ہے۔ مخالفین کہتے ہیں کہ اخلاقی حیثیت سے دنیا ترقی نہیں کر رہی ہے بلکہ تنزل پذیر ہے۔ اور یہ ارتقا کے متعلق مخصوص اعتراض ہے۔ معترضین کا خیال ہے کہ ارتقا جو مذہب کے مقابلے میں دہریت کا ہتھیار ہے۔ اخلاقی مظاہر کی توجیہ سے قاصر ہے۔ یعنی یہ ضروری نہیں ہے کہ ارتقائی عمل میں اعلیٰ ترین چیز اخلاقی طور پر بھی بہترین ہو۔ لیکن اس کا جواب یہ ہے کہ ارتقائی سلسلہ میں انسان اُس کی تازہ ترین پیداوار ہے۔ اور وہ تمام مخلوق سے اخلاقی حیثیت میں ممتاز ترین ہے۔ رہی یہ بات کہ خود انسانی ترقی کے ساتھ اخلاق کیوں کم ہوتا جاتا ہے اور اس لحاظ سے اُس کو ترقی کہنا درست ہے یا تنزل۔ اور اگر یہ تنزل ہے تو ارتقا کا نظریہ شروع سے غلط ہے۔ تو اس کے متعلق یہ کہا جاسکتا ہے کہ اوّل تو اخلاقی معیار ہر انسانی سوسائٹی میں یکساں نہیں ہوتا۔ اس کا تعلق ہر گروہ کے معاشرتی حالات سے ہے جو بجائے خود مخصوص مرز بوم اور مقامی طبعی حالات کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ اس لئے اخلاقی معیار حالات کے لحاظ سے بدلتا رہتا ہے۔ اخلاقی شعور مطلق جو انسانی ذہن کا جزو لاینفک ہوتا ہے۔ قوائے ذہنی کی ترقی کے ساتھ ساتھ وہ بھی ترقی کرتا رہتا ہے۔

ابتدائی انسانی ذہن میں جذبات کا غلبہ تھا اور خود غرضی اور نفس پرستی عام تھی۔ اس کے بعد ذہنی ترقی کے ساتھ عقل کا عنصر بڑھتا گیا۔ اور جذبات عقل کے تحت میں آکر اخلاقیات بن گئے۔ یہی وہ دَور تھا جب کہ مذہب کا عروج شروع ہوا۔ اور تزکیۂ نفس کے لئے دنیاوی تعزیری قوانین کو نارسا سمجھ کر ایک سمیع و بصیر، حاضر و ناظر حاکم کی سزا و جزا کے عقیدے کی ضرورت ہوئی۔ اس عقیدے نے اس دَور میں بڑا کام کیا۔ اور انسان کے خصائل کو سنوارنے میں بڑا حصہ لیا۔ اس کے بعد جب تہذیب و تمدن کا دَور اور آگے بڑھا اور برائی سے اجتناب اور نیکی کے ارتکاب کے لئے کسی تہدید یا تحریص کی ضرورت نہ رہی تو یہ عقیدہ قدرتاً ضعیف ہوتا گیا۔ ذہنی ترقی خالص علمی رنگ اختیار کرنے لگی۔ اور ایسے سائنس کی بنیاد پڑی جو ہر قسم کے جذباتی محرکات سے بری تھی اور علم کی ترقی خالص علم ہی کے مقصد سے تھی۔ کسی خاص مسلک کو فروغ دینے یا شکست دینے کی غرض سے نہ تھی۔

غرض مذہب ارتقائی عمل کے تحت ایک ضرورتاً بروئے کار آیا اور جوں جوں اور جہاں جہاں وہ ضرورت پوری ہوتی گئی۔ مذہب بھی ختم ہوتا گیا۔ اور جو طبقے اب بھی ارتقا کی درمیانی منازل میں ہیں وہاں اب بھی اس کی ضرورت ہے اور وہ موجود ہے۔

ایک اور بات جو اس ضمن میں قابلِ ذکر ہے وہ یہ ہے کہ تہذیب و تمدن کے درمیانی دَور تک زندگی کا انفرادی پہلو ہر شعبے میں زیادہ نمایاں معلوم ہوتا ہے۔ مثلاً کرمفاسد۔ انتہا وعمل۔ اور قومی تخیل تمدن کے اعلیٰ مدارج میں رونما ہوتا ہے اور جبرِ نفس، تقویٰ اور پرہیزگاری کا معیار اجتماعی زندگی سے متعلق ہو جاتا ہے۔ نجات کا مفہوم اجتماعی زندگی کی فلاح اور خوش حالی ہوتا ہے۔ انفرادی اعمال کے حسن و قبح کے جانچنے کی کسوٹی سوسائٹی پر ان اعمال کا اثر و انفعال ہوتا ہے۔ صدق و صفا۔ راست بازی۔ حریتِ خیال۔ روح کی آزادی۔ اور ضمیر کی پاکی۔ یہ سب چیزیں اجتماعی رنگ اختیار کر لیتی ہیں۔ قومی زندگی ایک مسلسل زندگی ہوتی ہے۔ جو انفرادی حادثات اور اموات سے فنا نہیں ہوتی۔ بلکہ انفرادی اعمال کی اچھائی اس کو تقویت اور فروغ دیتی رہتی ہے۔ اس ارتقائی میلان کی بنا پر یہ بجا طور پر توقع کی جا سکتی ہے کہ قدرت کا ارتقائی عمل اور آگے چل کر اس قومیت کے مفہوم کو بتدریج وسیع کر کے تمام انسانی برادری کو اس میں شامل کر دے۔ اور پھر ذاتی یا انفرادی مفاد جمیع بنی نوعِ انسان کے مفاد سے ہم آہنگ اور وابستہ ہو جائے۔ یہ اخلاق کی معراج ہوگی۔

ایک اور بات جو ارتقا کے متعلق معترضین کہتے ہیں وہ یہ ہے کہ ارتقائی عمل میں ذہن بہت بعد کی پیداوار ہے۔ اس لئے کائنات سے ماوراء پہلے سے ایک مکمل ذہن کا وجود لازمی ہے جو کائنات کے ارتقائی عمل کی رہنمائی کرتا ہو۔ مگر اس کے یہ معنی ہیں کہ گویا اشیاء میں بالخاصہ خود ارتقا کی صلاحیت نہیں ہے جس کے لئے ایک خارجی وجود کی ضرورت ہے، حالانکہ اس کا کوئی ثبوت نہیں۔

پھر اس علت العلل کا کائنات سے ماوراء ہونا بھی ایک نقیض ہے۔ کیونکہ اس کے یہ معنی ہیں کہ علت و معلول کا درمیانی تعلق یا واسطہ منقطع یا حذف ہو گیا ہے۔ ورنہ اس سلسلے کے قائم رہنے کی صورت میں علت و معلول علیحدہ علیحدہ نہیں کئے جا سکتے۔ بلکہ دونوں ایک ہی سلسلے کی چیزیں ہیں۔ اور ماوراء کا تخیل بر خود غلط ہے۔ یہاں پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ سائنس کے جدید طبعی نظریئے کے مطابق تسلسل ضروری نہیں۔ مثلاً ذرّے کے تجزیئے اور تحلیل کے دوران میں یہ بات منکشف ہوئی ہے کہ برقیاتے جو اپنے مراکز کے گرد مختلف فاصلوں پر گردش کرتے ہیں تو ایک فاصلے سے دوسرے فاصلے پر جست ہوتی ہے۔ تدریجی ترقی نہیں ہوتی۔ رفتار کے مدارج پوری پوری اکائیوں میں ظاہر ہوتے ہیں۔ کسروں میں نہیں۔ گویا درمیانی کڑیاں غائب ہوتی ہیں۔ یہ درست ہے لیکن اس جدید تحقیق نے خود علت و معلول کے نظریئے ہی کو سرے سے ختم کر دیا۔ اور خالق و مخلوق کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اگر کہا جائے کہ اس صورت میں ارتقا یعنی تدریجی ترقی کا نظریہ بھی غلط ہو جاتا ہے تو یہ بالکل ٹھیک ہے۔ مگر ہم ارتقا کا اطلاق مشاہدے کی عام حدود میں کرتے ہیں۔ جہاں وہ ظاہر اور عیاں ہے۔ ان حدود میں ہر معلومہ طبعی قانون بجنسہٖ درست ہے۔ تخلیق کا مفہوم ان حدود میں بھی درست نہیں۔ تخلیق کے معنی یہ لئے جاتے ہیں کہ کسی چیز کا یکایک پیدا ہو جانا۔ یکایک سے یہ مراد ہے کہ عدمِ محض سے وجود میں آنا۔ اس خیال کے بموجب کوئی چیز خواہ کتنی ہی بتدریج طور پر پیدا ہوئی ہو اُس میں ایک جگہ ایسا انقلابی نقطہ ضرور ہوگا جہاں وہ پہلے نہیں تھی اور پھر ہو گئی۔ یہ دونوں حالتیں آپس میں متضاد اور انتہائی ہیں۔ اور ان میں فصل یا بُعد لازمی ہے۔ یہ

بے ربطی یا خلیج عام طبعی قوانین کی رُو سے ممکن نہیں ۔ اور اس لئے ارتقا تخلیق کے منافی ہے ۔ اِن حدود سے متجاوز ہو کر جیسا کہ ابھی بتا یا جا چکا ہے نہ تسلسل رہتا ہے نہ علت و معلول نہ ارتقا ۔ خالق و مخلوق کا سوال وہاں کبھی پیدا نہیں ہوتا ۔

غرض موجودہ سائنس کی رُو سے پوزیشن یہ ہے کہ عام طبعی قوانین کے تحت میں تخلیق کی گنجائش نہیں ۔ اور اِن سے آگے بڑھ کر جہاں یہ قوانین شکست ہو جاتے ہیں خالق و مخلوق کا سوال بے محل ہے ۔ اس سے ظاہر ہے کہ موجودہ دَور علم میں بھی مذہبی خیالات کو کوئی امداد نہیں پہنچی ۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ مذہب کو مسئلۂ تخلیق سے کوئی خاص سروکار نہیں ہے ۔ اور نہ ارتقا سے اُس کو پرخاش ہے ۔ وہ تو زندگی کا ایک دستور العمل پیش کرتا ہے ۔ مگر ارتقا کے نقطۂ نظر سے اِس پر یہ اعتراض ہے کہ جب ارتقا ہے تو لازمی طور پر ایک قدیم مسلک جدید حالات میں درست نہیں ہو سکتا ۔

مذہب کی طرف سے جواب دیا جاتا ہے کہ ارتقا ایک حد پر پہنچ کر ختم ہو جاتا ہے ۔ چنانچہ حیوان کا نوعی ارتقا انسان پر منتہی ہو گیا ۔ ارتقا کی طرف سے جواب الجواب یہ ہے کہ ارتقا مجموعی طور پر جاری رہتا ہے ۔ کسی ایک جہت میں وہ ختم ہو جاتا ہے تو دوسری سمت میں جاری رہتا ہے ۔ انسان کا ذہنی ارتقا ابھی ختم نہیں ہوا ۔ تہذیب و تمدن اور معاشرتی ترقی جاری ہے ۔ اور مذہب کا تعلق چونکہ اسی پہلو سے ہے ۔ اس لئے اعتراض درست ہے ۔ چنانچہ ترقی یافتہ دَور میں مذہب کے پابند اور لکیر کے فقیر طبقے پسماندگی کی حالت میں نظر آتے ہیں ۔

زیادہ سے زیادہ جو مذہب کی حمایت میں علمی حیثیت سے کہا جا سکتا ہے وہ یہ ہے کہ دنیائے سائنس میں انتہائی حقیقت کی تلاش ہنوز جاری ہے ۔ جس قدر علمی تحقیقات آگے بڑھتی جاتی ہے مادہ تحلیل ہو جاتا ہے ۔ اور اشیا لطیف سے لطیف تر ہوتی جاتی ہیں ۔ اس میلان کو دیکھتے ہوئے یہ قیاس کرنا ممکن ہے کہ کائنات کا مبدا ، ایک خالص ذہن ہو ۔ کیونکہ مادّے اور ذہن کی قدیم تفریق مٹ چکی ہے ۔ مگر مبدا ر یا ماخذ ما دراد نہیں ہوا کرتا ۔ البتہ اس لحاظ سے ما دراکہہ سکتے ہیں کہ یہاں دونوں چیزیں بظاہر غیر جنس ہیں ۔ اور مادّی عالم اور ذہن مطلق کے درمیان طبعی سلسلے کا سراغ نہیں مل سکتا ۔ اِن دونوں کے درمیان جو تعلق یا واسطہ ہو سکتا ہے اس کی صورت ایک ادارے یا حُکم کی ہے ۔ بہر حال اگر کوئی ایسا وجود ہے بھی تو اس کی پرستش کی ضرورت سمجھ میں نہیں آتی ۔ اور اس کو کسی مقصد برآری کی غرض سے راضی کرنے کا خیال مضحکہ خیز ہے ۔ کیونکہ کم از کم یہ معمولی عالم جس میں ہم رہتے ہیں اسباب و علل کا سلسلہ رکھتا ہے ۔ اور وہ طبعی زنجیروں میں جکڑا بند ہے ۔ اگر کہا جائے کہ عبادت کا مقصد اس دنیا سے متعلق نہیں ہے ۔ بلکہ اُس ذہنی یا روحانی عالم سے ہے جہاں ہم مادّی آلائش سے پاک ہو کر جانے والے ہیں ۔ تو وہاں عبادت کی کیا خصوصیت ہے ۔ اس نظریئے کے مطابق ہر ایک عمل کی بازگشت ہوگی ۔ اس لئے تمام اچھے اعمال پر زور دینا چاہیئے ۔ اور بہترین عمل وہ ہے جس میں ذاتی مفاد تمام بنی نوع انسان کے مفاد سے ہم آہنگ ہو ۔ اور تفرقہ نہ رہے ۔ لیکن مذہب سب سے زیادہ تفرقہ اندازی کا موجب ہے ۔ اس لحاظ سے بھی اُس کی حمایت غلط ہے ۔ کیونکہ وہ اپنے مقصد کو آپ ہی شکست دیتا ہے ۔

عبادت کا مقصد غالباً یہی تھا کہ انسان کو اپنی بندگی ، بیچارگی اور درماندگی کا احساس رہے اور تکبر ، نخوت اور رعونت پیدا نہونے پائے ۔ تاکہ دولت ، حکومت اور طاقت کے نشے میں ایک انسان دوسرے انسان پر مظالم روا نہ رکھے ۔ مگر مظالم کا سدِّباب پھر بھی نہ ہو سکا ۔ اور خود مذہب ہی کے پردے اور آڑ میں مظالم مختلف صورتوں میں روا ہوتے رہے ۔ پھر عبادت کے عمل کے مسلسل اثر نے غلامانہ ذہنیت پیدا کر دی ۔ اسی لئے کہا جاتا ہے کہ مذہب ایک حد تک ہی ٹھیک ہوتا ہے اور وہ تمدن کے ارتقا کی مخصوص حالتوں اور درجوں میں لیکن جب انسانی شعور ترقی یافتہ ہو جاتا ہے تو اُس کی ضرورت ختم ہو جاتی ہے اور اُس کا موثر اور کارگر ہونا بند ہو جاتا ہے ۔ اور نہ صرف یہ کہ اُس کی منفعت جاتی رہتی ہے بلکہ مضرتیں پیدا ہو جاتی ہیں ۔ اور فطرت جس طرح اس کو خود بخود بروئے کار لائی تھی ۔ اسی طرح خود بخود اس کا ازالہ کر دیتی ہے اور ترقی یافتہ تمدن کے دَور میں وہ اپنے صدیوں کے تعلق کی وجہ سے صرف تبرکاً باقی رہ جاتا ہے ۔

اس سلسلے میں ایک غلط فہمی کو رفع کرنا ضروری ہے ۔ عام طور پر اہل مذہب کی طرف سے یہ اعتراض ہوتا ہے کہ قتل و خونریزی اور مظالم

مذہب سے بھی زیادہ اِس علم و تمدن کی ترقی کے دور میں کئے جاتے ہیں۔ اس لئے مذہب کو بدنام کرنا بیکار ہے۔ مگر یہ اعتراض کسی قوم یا سوسائٹی کے بین الاقوامی یا خارجی تعلقات پر ہے۔ اور اِس وقت بیرونی تعلقات کا ذکر نہیں ہو رہا ہے۔ بلکہ کسی ایک متمدن قوم یا سوسائٹی کی اندرونی حالت کا موازنہ کسی ایسی سوسائٹی یا قوم کی اندرونی حالت سے کیا جائے جہاں مذہب پیش پیش ہے۔ مثلاً ہندوستان۔ یقیناً متمدن سوسائٹی میں انسانیت زیادہ ہوتی ہے اور اُس کے افراد کے حقوق زیادہ مامون و مصئون ہوتے ہیں۔ بہ نسبت نیم متمدن سوسائٹی کے جہاں مذہبی محسوسات کی شدت سے خود اپنے ہی ہم قوم افراد کے ہاتھوں امن و سلامتی ہر وقت خطرے میں رہتی ہے ؂

ہر کس از دستِ غیر نالہ کند
سعدیؔ از دستِ خویشتن فریاد

مذہب سے مراد مخصوص رسومات و عبادات اور عقائد ہیں۔ جو لازمی طور پر تفریق۔ تعصب اور جمود کا باعث ہوتے ہیں۔ حُسنِ اخلاق و معاشرت کے بعض مذہبی اصول اگر موجودہ علمی دَور میں افادیت کے لحاظ سے موثر اور کارگر ہو سکتے ہیں تو وہ مذہب کے پس منظر ( ) سے الگ ہو کر۔ مذہبی ذہنیت ہی ایسی چیز ہے جو مذہب کے بعض اچھے پہلوؤں کو بھی بدنما کر دیتی ہے۔ اور اس مضمون میں سب اعتراضات اسی مذہبی ذہنیت پر ہیں۔ یہ بھی ظاہر ہے کہ جو مذہب جس قدر زیادہ جزوی اور تفصیلی طور پر عملی زندگی پر حاوی ہوگا اسی قدر اس میں لوچ کی کمی ہو گی۔ اور رفتارِ زمانہ کے ساتھ مشکلات کا سامنا ہوگا۔ تبدیلیٔ حالات کے ساتھ سازگاری کی استعداد کم ہو گی۔ اور قدم قدم پر مذہبی فتوے کی ضرورت ہوگی اور ہر ترقی کے خلاف مذہب کا احتجاج ہو گا۔

مردِ قلندر

یکساں ہے مرا دل حرم و دیر میں خورسند　　خود اپنا ہی بندہ ہوں میں خود اپنا خداوند
ہاں چھیڑ دے مطرب مری ہستی کا ترانہ　　میں حُسن کا مرکز ہوں دلِ عشق کی سوگند
وہ عشق نہیں ہوں کہ ہو آہوں میں مقید　　وہ حُسن نہیں ہوں کہ ہو جلووُں میں نظر بند
ہوں لالۂ صحرا کی طرح خانماں بر دوش　　وہ سرو نہیں جو کسی گلشن کا ہو پابند
مستی مری محتاج مے و جام نہیں ہے　　بے ہجر کے غمگین ہوں بے وصل کے خورسند
واں فیض سے دل کے میں پر افشاں ہوں جہاں تک　　دنیا ہے نہ عقبیٰ ہے نہ بندہ نہ خداوند
کیا دخل ہے زاہد کا مرے دل کے حرم میں　　یہ قصر نہیں جنتِ فردوس کی مانند

آزاد ہے کونین سے وہ مردِ قلندر
میکشؔ کو نہ دو تاجِ بخارا و سمرقند

میکش اکبر آبادی

لیڈر

م ۔ ح

بہرام نگر کا سب سے بڑا میدان آدمیوں سے بھرا پڑا تھا۔ لاکھوں کی تعداد میں کسان جمع تھے۔ ہفتوں سے بیل گاڑیوں۔ ٹٹوؤں اور بہلیوں کا تانتا بندھا تھا۔ ہزاروں آدمی پچیس پچیس۔ تیس تیس کوس سے پیدل آئے تھے۔ ان میں بوڑھے بھی تھے۔ جوان بھی تھے۔ بچے بھی تھے۔ اور عورتیں بھی۔ بعض کسان اتنے خوش حال تھے کہ اُن کے گلوں میں سونے کے کنٹھے اور کانوں میں "مُرکیاں" پڑی تھیں۔ لیکن زیادہ تعداد اُن لوگوں کی تھی کہ جن کے جسم پر ایک پھٹی پرانی دھوتی کے سوا کچھ نہ تھا۔ عورتوں میں کچھ تو سرخ شہابی ساڑیاں اور کچھ قلعی دیہاتی زیور پہنے تھیں۔ کچھ سپید سنہری کنارے دار ساڑیاں زیب جسم کئے تھیں۔ لیکن اکثر کا صندلی رنگ انھیں کے ہاتھ کی دھوئی اور رنگی ہوئی گاڑھے کی ساڑی میں روپوش ہوکر افلاس و معصومیت کا دادخواہ تھا۔ بچوں میں بعض کے جسم پر کرتا اور دھوتی، دونوں چیزیں تھیں۔ مگر اکثر کے لئے صرف دھوتی ہی ستر پوش تھی۔ چھوٹے ننھے معصوموں کے لئے تو ان جھگڑوں کی ضرورت ہی نہ تھی۔ وہ فطرتِ عریاں کی مکمل تصویریں تھے۔

آدمیوں کے اس جنگل کو "مہاشے جی" کے درشنوں کا بڑا شوق تھا۔ اور یہی جذبۂ بے اختیار گلوں کا پھندا بن کر سب کو بہرام نگر کھینچ لایا تھا۔ "مہاشے جی" تھے بھی اسی قابل۔ اپنے صوبے کے بڑے مشہور وکیل۔ ہزاروں روپیہ روز کمانے والے وکیل رہ چکے تھے۔ متعدد شہروں میں بڑی بڑی کوٹھیاں اور عالی شان دکانیں تھیں۔ مگر "دلیس کی سیوا" کے لئے اس مجسم ایثار نے راحت و آسائش کو لات مار دی تھی۔ انھیں بس ایک ہی دھن تھی۔ جس طرح ہو مظلوم کسانوں کو ظالم اور خونخوار زمینداروں کے پنجوں سے چھڑانا چاہیئے۔ اس عفریت مآب جماعت نے دکھیارے کسانوں کی زندگیاں بہشتم بنا رکھی ہیں! ــــ ڈوبتے ہوئے کو تنکے کا سہارا بہت ہوتا ہے۔ ایسے کسانوں کو جو واقعی مفلس اور فاقہ کش تھے "مہاشے جی" اوتار جان پڑے۔ انھوں نے اُن کے قدم کی خاک کو سرمۂ چشم بنایا اور اُن کے منہ سے نکلے ہوئے "شبدوں" کو وید کے منتروں کی طرح دلوں میں جگہ دی۔ وہ "مہاشے جی" کی تقریر کا ایک ایک لفظ اس طرح پی جاتے تھے جس طرح سوکھی زمین پہلے پانی کی بوندیں جذب کر لیتی ہے۔ جھونپڑے میں رہنے والے کسانوں کو پہلی بار محلوں کا خواب دکھائی دینے لگا تھا۔

آج بہرام نگر میں یہ بھیڑ بھاڑ اس لئے تھی۔ مہاشے جی کی تقریر تھی۔ بھوکے پیاسے کسان اسی آبِ حیات سے سیراب کئے جانے کی تمنا میں اکٹھا ہوئے تھے۔ بارے "مہاشے جی" آئے۔ پھول برسائے گئے۔ دھول اُڑاتے، گاؤں کے مطلع کو غبار آلود کرتے، موٹر پر تشریف لائے۔ سینکڑوں پگڈیوں کے پھاٹکوں میں سے ہوکر، پچاسوں گیندے کے ہار پہنکر، سجدہ کرتے ہوئے "بھائیوں" کو "آشیرباد" دے کر، اونچے چبوترے پر رکھی ہوئی کرسی پر آکے "براجمان" ہوئے۔ کسان سنگھ کے مقامی سکرٹری نے ایڈریس پیش کیا اور مہاشے جی نے جے جے کے فلک شگاف نعروں میں تقریر شروع کی۔ تقریر کیا تھی سرمایہ داری کے ہاتھوں کچلی ہوئی انسانیت کے آنسوؤں کا دریا تھا۔ وہ مد و جزر، وہ اُتار چڑھاؤ کہ اللہ تری پناہ! تان اس پر ٹوٹی کہ زمیندار کسانوں کا خون پی پی کر موٹے ہوتے جاتے ہیں۔ ان کا قلع قمع کر دو۔

ان کا گھر پھونک دو۔ ان سے زمینداریاں چھین لو۔ یہ اگر بیوی بچوں کا خیال دلائیں تو کہہ دو "تمہاری بیویاں ناگنیں اور تمہارے بچے سنپولے ہیں! ان موذیوں کے مرجانے ہی میں ملک کی رکشا ہے!"

"مہاشے" نے تقریر ختم کی۔ اپنے سفری دفتر میں تشریف لے گئے۔ پرائیویٹ سکرٹری نے چاندی کی کٹوری میں چھٹانک بھر پسا اور رگھسا ہوا بادام پیش کیا۔ دو انگلیوں میں وہ اسے چاٹ گئے۔ پھر آدھ سیر تازہ دودھ پی کر آرام کرسی پر دراز ہوگئے۔ پرائیویٹ سکرٹری کو تقریر کا خلاصہ اخبارات میں شائع ہونے کے لئے لکھوانے لگے۔ دفعتہً رُک کے انھوں نے پوچھا۔ کیوں جی آج کوئی خط یورپ سے تو نہیں آیا؟"

سکرٹری نے کہا "جی دو خط آئے ہیں۔ ایک تو پیرس کے بینک کا ہے۔ دوسرا ہالینڈ کا۔"

پوچھا "تم نے پڑھا، کیا لکھا ہے؟"

وہ بولا "جی ہاں۔ پیرس بنک نے تو یہ اطلاع دی ہے کہ اس سال کا سود ملا کر اب اس کے "فکسڈ ڈیپازٹ" میں آپ کے نام گیارہ لاکھ روپے پورے ہوگئے ہیں۔"

مہاشے جی نے کہا "ہوں" پھر کچھ سوچ کر پوچھا "اور ہالینڈ بنک نے کیا لکھا ہے؟"

سکرٹری بولا "جی اُس نے لکھا ہے کہ آپ کے نام سے تین سال سے جو رقم چلی آتی ہے اس میں آپ نے نہ تو حسبِ وعدہ اب تک کوئی اضافہ ہی کیا ہے اور نہ اس کو اس کے متعلق ہدایت کی کہ وہ کس طرح کی کمپنیوں میں لگایا جاسکتا ہے۔"

"مہاشے جی" پھر "ہوں" کہہ کے کسی گہرے سوچ میں پڑ گئے۔

سکرٹری نے ڈرتے ڈرتے کہا "محمد پور مل سے بھی ایک خط آیا ہے۔"

مہاشے نے چونک کے پوچھا "کیوں کیا کوئی خاص بات ہے۔ کیا لکھا ہے؟"

سکرٹری بولا "جی منیجر نے لکھا ہے کہ کانپور اور احمد آباد کی دبا وہاں بھی اب پھیلنے لگی ہے۔ مزدوروں کا خیال اب آپ کی طرف سے روز بروز خراب ہوتا جارہا ہے۔ وہ کہتے ہیں اگر مزدوری نہ بڑھائی گئی تو ہم اسٹرائیک کردیں گے۔"

مہاشے جی بگڑ پڑے "سخت پاجی ہیں۔ نیچ ذات۔ چھ آنہ روزانہ میں صرف آٹھ گھنٹے کام لیا جاتا ہے۔ اب انہیں کیا چاہئے۔ غریب کسانوں کو نہیں دیکھتے کہ بارہ بارہ گھنٹے سخت محنت کرنے پر بھی چھ پیسے روزانہ سے بھی کم ان کی اوسط آمدنی ہے۔"

سکرٹری نے کہا "لیکن وہ کہتے ہیں کہ مل کے مالک زمینداروں سے کئی گنا زیادہ کماتے بھی تو ہیں۔"

مہاشے جی بپھر کر بولے "جھوٹے ہیں۔ وہ کیا جانیں۔ زمیندار دیش کا دشمن ہے۔ اور ہم ------ ہم ملکی صنعت و حرفت کو ترقی دیتے ہیں۔"

سکرٹری نے اپنی مسکراہٹ چھپا کر پوچھا "تو میں منیجر صاحب کو کیا لکھ دوں؟"

مہاشے بولے "بس یہی لکھ دو کہ مجھے کسانوں کی سیوا سے اس وقت فرصت نہیں کہ میں اس طرح کی چھوٹی باتوں کی طرف توجہ کرسکوں۔ وہ خود مزدوروں کو سمجھائیں کہ ہڑتال کرنا کوئی اچھی بات نہیں ہے۔ مہاتما جی نے ابھی حال میں ملوں میں دھرنا دینا عدم تشدد کے خلاف بتایا ہے۔ اگر وہ لوگ نہ مانیں گے تو میں مہاتما جی کو چٹھی لکھ کر سب مزدوروں سے خفا کرا دوں گا۔ پھر وہ کہاں جائیں گے؟ ------- ہونہہ! بڑے آئے اسٹرائک کرنے! اب اگر ہم ہی لوگوں کے کارخانوں میں ہڑتال ہونے اور دھرنا دیا جانے لگے تو پھر تو دیش کی رکشا کا کام ہوچکا!"

سکرٹری باہر جانے لگا۔ مہاشے نے ہاتھ کے اشارے سے اُسے رُک کے کہا "اور دیکھو! آج ہی ہالینڈ بنک کو لکھ دینا کہ میرے روپوں سے مختلف ملکوں کی اسلحہ ساز کمپنیوں میں حصے خرید لئے جائیں۔ سمجھے نا! مختلف ملکوں کی کمپنیوں میں۔ اس کے نیچے لکیر کھینچ دینا!"

سکرٹری نے کہا "بہت خوب"

مہاشے بولے "ہاں بھائی، آج کل جنگ کے بادل یورپ پھر پر منڈلا رہے ہیں۔ خوب ہتھیار بنائے اور خریدے جارہے ہیں۔ بس اب ان کمپنیوں سے زیادہ کسی سے نفع نہیں مل سکتا۔"

سکرٹری "بہت اچھا" کہہ کر باہر چلا گیا۔

مہاشے جی کسانوں کی فلاح و بہبود کی اسکیمیں سوچنے لگے۔

جمہوریت

کریم اللہ حسنی

یہ ۱۸۳۸ء، یعنی آج سے پوری ایک صدی قبل کی بات ہے، کہ انگلستان میں "قانونِ غلہ" (Corn Law) کا نفاذ ہوا تھا۔ اور پبلک نے اِس قانون کی شدومد کے ساتھ مخالفت کی تھی اور ملک کے تمام بلند پایہ خطیبوں نے اِس کے خلاف دُھواں دھار تقریروں کے ذریعے سے اظہارِ نفرت کیا تھا۔ چنانچہ اُن تقریروں میں سے ارنسٹ جان (Earnest John) کی اُس ہیجان آفریں تقریر کا خلاصہ پیش کیا جاتا ہے جس نے حکومت کو مجبور کر دیا تھا کہ وہ اُس قانون کو واپس لیلے۔

(حسنی)

"جنابِ صدر اور اہالیانِ منچسٹر، کامل اٹھارہ سو سال سے ہمارے امرائے کرام، انجیلِ مقدس کی تعلیم کا آوازہ، کلیسا کے منبر و محراب سے بلند کرتے ہیں، جس سے ہم سب پر عرصۂ حیات تنگ ہو چکا ہے۔ لیکن دوستو، آج میں حضرتِ مسیح کی صحیح جمہوری تعلیم دینے کے لئے اس جگہ کھڑا ہوا ہوں۔

سنو، اور غور سے سنو۔ اے ہزاروں مفلسو، اے دولتمندوں کے عبرتناک کھلونو تمام بڑے بڑے سر بفلک کارخانوں کی ہر اینٹ مزدوری کی قوتِ بازو سے رکھی گئی ہے۔ اور ان پیشِ نظر شاندار ملوں کی ہر ایک مشین کو مزدوروں ہی نے بنایا اور ڈھالا ہے۔ ان سڑکوں پر جو گاڑیاں دوڑتی نظر آ رہی ہیں۔ اُنھیں بھی مزدورو، یعنی تم نے ہی بنایا ہے، اور ان تابناک دوکانوں کی ہر جگمگاتی ہوئی چیز تمہاری ہی دستکاریوں کی مرہونِ منت ہے۔

ہاں وہ تمھیں ہو، جن کے بَل بوتے پر لڑائیاں لڑی، اور جیتی گئی ہیں لیکن میں پُوچھتا ہوں، میں گھبرا کر دیوانہ وار پوچھتا ہوں کہ اِن تمام کاوشوں اور جانبازیوں کے باوجود تمھیں تمھارے استعمال کرنے والے امرائے کرام نے عطا کیا فرمایا؟ تمھارے انعامات کیا ہیں؟ صرف یہی نہ کہ ہمارے شہر میں دو ہزار کرور کی خطیر دولت صرف چند اشخاص کے قبضے میں آگئی—— اور تمھارے گرد و پیش کی تمام زمینیں صرف چند ہزار زمینداروں کی ملکیت بن گئیں؟ لیکن ہم لوگوں کے حصّے کیا ہیں؟ کیا ہمارے حصّے، یہ ملعون" قومی قرضے" ہیں، جو ہمیں اپنے خون کے ہر قطرے سے ادا کرنا پڑیں گے؟

مزدورو، فریب خوردہ بھُوکے مزدورو، آہ تمھارے قبضے میں کچھ نہیں ہے—— تم انعامات حاصل کرنے کے لئے گھوڑ دوڑ کے گھوڑوں کی طرح دوڑتے ہو۔ اور اِس دوڑ میں کامیاب بھی ہو جاتے ہو—— مگر انعام کون پاتا ہے؟ آہ گھوڑ دوڑ کا انعام!

گھوڑے سرپٹ دوڑتے ہیں—— "جاکی" اپنی جانوں کو خطرے میں ڈال کر شہسواری کے کرتب دکھاتے ہیں، لیکن اِس کے باوصف، طلائی کپ، گھوڑے کے مالک کا ہی حصہ ہوتا ہے۔ "جاکی" کو چند حقیر سکے مل جاتے ہیں، اور پسینے میں شرابور ہانپتے ہوئے گھوڑے کا حصہ ہوتا ہے صرف ایک تازیانہ۔

خدا

سید اختر علی تلہری

اٹلی کے نامور سیاسی فلسفی جوزف میزنی کے رسالہ فرائضِ انسانی کے پہلے باب کا ترجمہ کلیم کے کچھ ماہ پہلے کے نمبروں میں شائع ہوچکا ہے جس میں اس اطالوی مفکر نے اپنے دلنشیں انداز میں مفصل طور سے "نظریہ حقوق" اور "نظریۂ فرائض" سے بحث کی ہے۔ اور تشفی بخش دلائل سے یہ امر اچھی طرح ثابت کیا ہے کہ درحقیقت ہماری تمام تکلیفوں کا اصلی درماں موخرالذکر نظریہ ہی ہے۔ تنہا نظریہ حقوق کو مقصدِ زندگی قرار دے کر نوعِ انسانی کی سچی آسائشوں کی کوئی سبیل نہیں نکل سکتی۔ نظریۂ حقوق کے ساتھ ساتھ جب تک نظریۂ فرائض کو بھی پیشِ نظر نہیں رکھا جائے گا اُس وقت تک انسانی سماج کو رفعتیں حاصل کرنے کا موقع حاصل نہیں ہوسکتا۔ ہم جب اپنے حقوق حاصل کرنے کے درپے ہیں تو ہمیں اُن فرائض کی انجام دہی کا بھی لحاظ رکھنا ضروری ہے۔ جو ہم پر لازمی طور سے عاید ہوتے ہیں" نظریۂ حقوق" پر زور دینا اور "نظریۂ فرائض" کو پسِ پشت ڈال دینا عملی ناکامیوں کا پیش خیمہ ہے۔ اس نمبر میں فرائضِ انسانی کے دوسرے باب کا ترجمہ پیش کیا جاتا ہے۔

اگرچہ عام طور سے "شعر و افسانہ" کی رنگینیوں کے مقابلہ میں ان خشک مباحث کو اس کا مستحق نہیں سمجھا جاتا کہ اُن پر غور و فکر کے چند لمحے بھی صرف کئے جائیں۔ لیکن انسان کی عقلی تربیت کے لئے ان مقالات کی ضرورت کا انکار نہیں کیا جاسکتا۔ شعر و افسانہ سے اگر دلوں کو سرور حاصل ہوتا ہے تو فلسفیانہ مباحث سے دماغ کو۔

اسی سلسلہ میں یہ بھی عرض کردیا جائے کہ میزنی نے اس باب میں جن خیالات کا اظہار کیا ہے اُن سے مجھے کہیں کہیں اختلاف بھی ہے۔ میزنی جا بجا نہایت فرزانگی سے خطیبانہ سحر طرازیوں کو فلسفیانہ دلائل کا قائم مقام بنا دیتا ہے۔ غور کی نظر وہ مقامات آسانی سے دریافت کرسکتی ہے جہاں اس خطابت آمیز فلسفہ یا فلسفہ آمیز خطابت کی بوقلمونیاں موجود ہیں لیکن یہاں اس پر نقد و جرح کا عمل مقصود نہیں ہے۔ صرف میزنی کے خیالات پیش کرنا مدِنظر ہیں۔

میزنی عیسائی ہے۔ اس لئے اُس کی مذہبیت کا سرچشمہ عیسائیت ہی بن سکتی ہے۔ مگر جس قسم کی مذہبیت کی اُس نے تلقین کی ہے وہ اسلام کے عین مطابق ہے اور یقیناً یہ وہ مذہبیت نہیں ہے جو اجتماعی زندگی کے خرمن کے لئے اپنے دامن میں بجلیوں کی پرورش کرتی ہے۔ میزنی نے مذہب و عقائد کی یکسانی کو قومیت کی استواری کے لئے لازم قرار دیا ہے جو اپنے مقام پر صحیح ہے اور اسی کا فقدان ہندوستان کی بدبختیوں کا ہیولیٰ بنا ہوا ہے۔ اب اگر ہندوستان مذہبی یکسانی پیدا نہیں کرسکتا اور زمانہ کی گردشوں کا مقتضا یہی ہے کہ لامذہبیت کا بول بالا ہو۔ تو مادی نجات کی صورت یہ ہے کہ موجودہ لامذہبیت اپنے میں مذہبی روح (جو عبارت ہے حصولِ مقصد کی خاطر ہر قسم کی امکانی قربانیوں اور ایثار کے پیش کرنے سے) پیدا کرے۔ اور یہی کیفیت عام طور سے ہر فرد میں سرائت کرجائے۔ اس صورت میں ہم الٰہیاتی حیثیت سے کتنے ہی تہی داماں ہوں مگر مادی حیثیت سے سرسبز ہوسکیں گے۔ (مترجم)

ہمارے فرائض کی ابتدا خداسے ہوتی ہے۔ ہمارے فرائض کی تحدید و تعین اُسی کے قوانین میں مل سکتی ہے۔ اُس کے اُنھیں قوانین کا ترقی پذیر علم اور افعال واعمال پر اُن کا عائد کرنا نوعِ انسانی کا کام ہے۔ خدا بہر حال موجود ہے لیکن مجھے نہ تو اس کی ضرورت ہے اور نہ خواہش کہ اُس کا وجود ثابت کرنے کی کوشش کروں۔ اُس کے وجود کے ثبوت مہیا کرنے کی کوشش بیکار ہے۔ اور اس پر استدلال قائم کرنا حماقت۔ خدا ہمارے ضمیر میں، نوعِ انسانی کے ضمیر میں قیام پذیر ہے۔ رنج اور خوشی کے سنجیدہ ترین لمحوں میں ہمارا ضمیر اُسی کی طرف رجوع ہوتا ہے۔ نوعِ انسانی اُس کے نام کو مسخ اور آلودگیوں میں تو مبتلا کر سکی ہے لیکن اُسے کبھی دبا نہیں سکی۔

دنیا اپنے حرکات اور قوانین کی ترتیب مناسب اور حکیمانہ ہونے کے ذریعے سے اُس کے وجود کا مظاہرہ کرتی ہے۔

منکرینِ خدا کا وجود

تم میں منکرینِ خدا کا وجود نہیں ہے اور اگر کوئی منکرِ خدا ہوتا بھی تو وہ بددعاؤں اور لعنتوں کے بجائے آنسوؤں کا مستحق ہوتا۔ تاروں بھری رات میں۔ اپنے عزیز ترین احباب کی قبروں کے پہلو میں یا پھر شہادت (قتل فی سبیل اللہ) کی موجودگی میں خدا کا انکار کرنے والا یا تو نہایت ہی بدنصیب ہے یا انتہائی شریر۔ سب سے پہلا ملحد بلاشک وہ شخص تھا جس نے اپنا جرم تمام آدمیوں سے چھپا لیا تھا اور خدا کا انکار کرکے اُس نے یہ چاہا کہ اُس تنہا شاہد سے بھی جس سے کوئی جرم چھپایا نہیں جاسکتا آزادی حاصل کرے۔ اور حسرت و افسوس کے اُس خیال کا جو اُسے تکلیف پہونچا رہا ہے گلا گھونٹ دے یا پھر خدا کا منکر ایک ایسا ظالم شخص ہوگا جس نے اپنے بھائیوں کی جسمانی آزادی کے ساتھ اُن کی آدھی روحانی قوتیں بھی سلب کر لی ہونگی اور اس کا کوشاں رہا ہوگا کہ فرائض اور دوامی حقوق پر اعتقاد رکھنے کے بجائے جسمانی طاقت سے پورا کام لے۔ اس کے بعد مختلف صدیوں میں گاہے گاہے ایسے اشخاص پیدا ہوتے رہے جن کی فلسفیانہ کج نگاہیوں اور اخلاقی بے راہ رویوں نے ملحدانہ نظریوں کی طرف دبے لفظوں میں اشارہ کرنے پر آمادہ کیا۔ لیکن وہ بہت کم تھے اور ان خیالات کے اظہار میں بہت زیادہ حجاب محسوس کر رہے تھے۔

پھر کچھ دنوں کے بعد ہی ایک ایسی جماعت کا وجود ہوا جس نے خدا کے اُس غلط اور احمقانہ تصور سے جسے کسی قوم یا ظالمانہ قوت نے اپنے فائدہ کے لئے مقرر کر لیا تھا برانگیختہ ہو کر خدا ہی کا انکار کر دیا لیکن یہ انکار صرف آنی و ہنگامی تھا۔ خدا کی ضرورت اُس وقت بھی اتنی تھی کہ اُنھوں نے "عقلیت" یا "نیچر" کو ربانی قوتوں کا حامل مان کر اُن کی پرستش شروع کر دی۔

مذاہب سے نفرت کی ایک خاص وجہ

اس زمانہ میں ایسے افراد کا وجود ہے جنھوں نے یہ دیکھکر کہ اعتقادات میں خرابیاں پائی جاتی ہیں۔ اور مستقبل میں بھی اُن کے ٹھیک راستہ پر آنے کی اُمید نہیں کی جاسکتی۔ تمام مذاہب ہی سے بغاوت شروع کر دی لیکن ان افراد میں بھی کوئی ایسا شخص نہیں ہے جو اپنے کو ملحد اور منکرِ خدا کہنے کی جرات کرسکے۔ اس میں شک نہیں کہ ایسے مذہبی پیشوا موجود رہے ہیں جنھوں نے خدا کے نام کو دنیا کی مادی منفعتوں اور فائدوں کا آلہ یا طاقتور سے ڈرنے کا ذریعہ قرار دے لیا ہے۔ اسی طرح ایسے ظالم و جابر بھی ہیں جو اُسے اپنے مظالم کا محافظ و نگہبان قرار دیتے ہوئے اُس سے استغاثہ کرتے اور اس طرح اُسے نہایت ہی غیر مقدسانہ طور سے یاد کرتے ہیں۔ لیکن سوال یہ ہے کہ اگر سورج کی روشنی کبھی کبھی خراب بخارات میں آلودہ ہو کر صاف و شفاف ہم تک نہیں پہونچتی ہے تو اس کی وجہ سے ہم سورج کے وجود اور اُس کے اُن حیات آفریں اور تازگی بخش شعاعوں کا انکار کر دیں گے جن سے دنیا برابر فیض حاصل کرتی ہے؟ اور کیا محض اس بنا پر کہ شریر آدمی کبھی کبھی آزادی سے ناجائز فائدہ اُٹھا کر (فتنہ و فساد) بغاوت پیدا کر دیتے ہیں، ہم آزادی ہی کو کوسنے لگیں گے؟

خدا کے اعتقاد کی غیر زوال پذیری

خدا کا اعتقاد اپنے غیر زوال پذیر نور کے ساتھ اُن تمام ضلالتوں اور خرابیوں کے درمیان سے جنھوں نے خدا کے نام کو تاریک بنا دیا ہے، چمک اُٹھتا ہے۔ یہ ضلالتیں اور خرابیاں ظلم و جور کی طرح فنا ہو جاتی ہیں۔ (لیکن) خدا باقی رہے گا اور وہ لوگ باقی رہیں گے جو زمین[1] پر خدا کا عکس ہیں۔

[1] اور کیا سب فنا ہو جائیں گے؟ کیا کسی موجود کا معدوم ہونا امکان میں ہے؟ (مدیر)

جس طرح سے کہ قومیں غلامی کی تکلیف اور مفلسی کے درمیان سے آہستہ آہستہ ضمیر، طاقت اور آزادی حاصل کرلیتی ہیں۔ اُسی طرح مذہب کے برباد شدہ نظامات کے ملبہ میں سے خدا کا مقدس نام روشن و منور ہو کر زیادہ پاک، زیادہ پُرجوش اور زیادہ حکیمانہ عبادت سے گھرا ہوا اُبھرتا ہے۔

دنیا سے خدا کے علیحدہ کرنے کا مفسدہ

یہی تو وجہ ہے کہ میں خدا کے متعلق تم سے کوئی گفتگو اس غرض سے نہیں کرنا چاہتا ہوں کہ اُس کا وجود تم پر ثابت کردوں یا تم سے یہ کہوں کہ تمھیں اُس کی حمد و ثنا کرنا چاہیئے۔ تم خود اُس کی حمد و ثنا اُس کا نام لئے بغیر ہی کبھی اُن تمام اوقات میں کرتے ہو جبکہ تمھیں اپنی زندگی یا اپنے ارد گرد میں بسنے والوں کی زندگی کا احساس ہوتا ہے۔ میں یہ چاہتا ہوں کہ تمھیں اُس کی کس طرح تمجید و تقدیس کرنا چاہیئے۔ اور اسی کے ساتھ اُس غلطی پر بھی متنبہ کردینا چاہتا ہوں جس کا شکار تمہارے حکمراں طبقے کے اکثر افراد ہیں۔ اور اُن کی تقلید میں بہت سے تمہارے دماغ بھی اُس میں مبتلا ہوگئے ہیں۔ وہ غلطی اُسی قدر اہم اور خطرناک ہے جس قدر کہ خود الحاد و کفر۔

یہ غلطی کیا ہے؟ خدا کا اُس کے افعال سے علیحدہ کرنا، اُس دنیا سے علیحدہ کرنا جس میں تمھیں اپنی زندگی کی ایک مدت بسر کرنا ہوتی ہے، اب یہ علیحدگی خواہ زیادہ نمایاں ہو یا کم۔

دو خطرناک فتنے

ایک طرف تو ایسے لوگ ہیں جو تم سے کہتے ہیں کہ "یہ سچ ہے کہ خدا موجود ہے۔ لیکن تم جو کچھ کرسکتے ہو وہ صرف اتنی بات ہے کہ اُس کے وجود کو تسلیم کرو۔ اور اُس کی تمجید و تقدیس کرو۔ خدا اور انسانوں کے درمیان میں جو تعلق ہے اُسے نہ تو کوئی شخص سمجھ سکتا ہے اور نہ اُس کی تشریح کرسکتا ہے۔ یہ ایک ایسا سوال ہے جسے تمہارے ضمیر کو خود خدا سے طے کرنا چاہیئے۔ جو کچھ تم چاہو خدا کے متعلق سوچو۔ لیکن اپنے ان افکار و خیالات کی اپنے ساتھیوں میں نشر و اشاعت نہ کرو۔ اور نہ دنیا کی چیزوں پر انھیں عاید کرنے کی کوشش کرو۔ سیاسیات اور مذہب دو جداگانہ چیزیں ہیں۔ انھیں آپس میں خلط ملط نہ کرو۔ اُس دنیا کی چیزوں کو قائم شدہ باضابطہ و مستند روحانی طاقت کے لئے (اب وہ جو کچھ بھی ہو) چھوڑ دو۔ اپنے لئے یہ حق محفوظ رکھو کہ اگر وہ طاقت تمہارے نزدیک اس روحانی مشن کو پورا نہ کررہی ہو تو اُس پر یہ اعتقاد نہ رکھو۔ ہر شخص کو اپنے طریقے سے سوچنے اور اعتقاد کرنے دو۔ تم صرف دنیاوی چیزوں میں مشترکہ طور سے کام کرو۔ تم خواہ مادہ پرست ہو یا روحانیت کے حلقہ بگوش، اس سے کوئی بحث نہیں۔ سوال یہ ہے کہ آیا تم آزادی اور انسانی مساوات پر اعتقاد رکھتے ہو۔ آیا اکثریت کے لئے بہبود چاہتے ہو اور عالمگیر حق رائے دہندگی کے حامی ہو؟ اگر جواب اثبات میں ہے تو ان خواہشوں کے پورا کرنے کے لئے متحد ہو جاؤ۔ اب اس کے لئے یہ ضروری نہیں ہے کہ تم آسمانی چیزوں کے متعلق بھی کسی عام مشترکہ عقیدہ کے پابند ہو۔"

دوسری طرف کچھ ایسے لوگ ہیں جو تم سے یہ کہتے ہیں۔

"خدا موجود ہے۔ لیکن وہ تمام مخلوقات کے مقابلے میں اس قدر عظیم الشان اور جلیل المرتبت ہے کہ تم انسانی اعمال کے ذریعے سے اُس تک پہونچنے کی کوئی امید نہیں کرسکتے۔ دنیا مٹی کی بنی ہوئی ہے۔ زندگی ایک ساعت کی ہے۔ جہاں تک ممکن ہو تم اپنے کو دنیا سے علیحدہ رکھو، اور زندگی کو زیادہ اہمیت نہ دو۔ روح کی غیر فانی زندگی کے مقابلے میں دنیوی مقاصد و اغراض کی درحقیقت اصل ہی کیا ہے۔ روح کو اپنی توجہ کا مرکز بناؤ۔ آسمانی چیزوں کی طرف نظر رکھو۔ دنیاوی زندگی تم کس حالت میں بسر کررہے ہو۔ یہ کوئی اہم امر نہیں ہے۔ مرنا برحق ہے۔ خدا تم سے اُن چیزوں کو دریافت کرے گا جو تم نے روح کے سنوارنے کے متعلق کی ہیں۔

آیا تم تکلیفیں جھیل رہے ہو؟ اگر ایسا ہے تو خدا کا شکر ادا کرو۔ جو تمھاری آزمائش کے لئے ان مصیبتوں کو بھیجتا ہے۔ دنیوی زندگی آزمائش گاہ ہے۔ دنیا تمہارے لئے جلا وطنی کا ملک ہے۔ اس سے نفرت کرو............۔ اور اس سے اپنے خیالات بلند رکھو۔ نفیری اور غلامی کی حالت میں بھی تم خدا کی طرف مڑ سکتے ہو اور اُس کی تمجید و تقدیس کرکے اُس سے (عقیدت میں بھری ہوئی) دعائیں کرکے دنیوی چیزوں سے نفرت کرکے اور اپنے مستقبل پر اعتقاد رکھ کے جس میں تمھیں

بڑے بڑے انعامات ملیں گے اپنے کو مقدس بنا سکتے ہو ؟

تم سے جو لوگ اس طرح کی باتیں کرتے ہیں اُن میں سے پہلے خیال والے تو خدا کو دوست نہیں رکھتے اور دوسرے خیال والوں کو سرے سے اُس کی معرفت ہی حاصل نہیں ہے۔

انسان ایک ہی شخصیت رکھتا ہے

پہلے خیال والوں سے تو یہ کہدو کہ انسان ایک ہی شخصیت رکھتا ہے تم اُسے دو میں تقسیم نہیں کر سکتے کہ وہ تمہارے ساتھ اُن اصولوں میں تو متفق رہے جن سے سماج اور جمعیت کی تنظیم ہوتی ہے۔ لیکن اپنے مبدأ کے متعلق اپنے مقدرات کے متعلق اور اس دنیا میں اپنی زندگی کے قانون کے متعلق تم سے اختلاف رکھے۔

مذاہب کی دنیا پر حکمرانی

مذاہب دنیا پر حکمراں ہیں۔ ہندوؤں کا جب یہ اعتقاد تھا کہ برہما دیوتا سے وہ سب پیدا ہوئے ہیں کچھ اُس کے پیر سے کچھ اُس کے سر سے۔ کچھ اُس کے بازوؤں سے تو انھوں نے سماج کو مختلف طبقوں میں تقسیم کر کے اُس کی تنظیم کی تھی۔ جو لوگ دماغ سے پیدا ہوئے تھے اُنھیں عقلی و ذہنی کاموں کی وراثت سپرد کی جو لوگ بازوؤں سے پیدا ہوئے تھے اُن کے متعلق حرب و جنگ کا کام کیا اور جو لوگ پیر سے پیدا ہوئے تھے اُن کے متعلق معمولی درجہ کی محنتیں اور مزدوریاں کر دیں اور اس طرح اپنے کو اس جمود میں مبتلا کر لیا جو اس وقت بھی موجود ہے۔ اور اُس وقت تک باقی رہے کا جب تک کہ یہ اعتقاد باقی ہے۔

عیسائیوں نے جب دنیا کے سامنے یہ اعلان کیا کہ تمام آدمی خدا کے بیٹے اور آپس میں بھائی ہیں تو پرانے قانون سازوں اور فلسفیوں کے نظریئے جو انسان میں دو قوتوں کا وجود ثابت کرتے تھے، غلامی کے محو کرنے کو روک نہ سکے جس سے کہ سماج کی تنظیم اصولی حیثیت سے مختلف بنیاد پر قائم ہونا لازمی تھی۔

ہم یہ دکھا سکتے ہیں کہ جب کبھی کسی مذہبی اعتقاد کو نشو و نما ہوئی ہے تو اُس کی مناسبت سے انسانی تاریخ میں معاشرتی ترقی بھی ہوئی ہے۔

لیکن تم جو مذہب سے بے اعتنائی کا نظریہ قائم کر رہے ہو اُس کا نتیجہ سوائے بغاوت اور ہنگاموں کے کیا دکھا سکتے ہو؟ تم تباہ و برباد تو کر سکتے ہو لیکن کوئی تعمیری کام نہیں کر سکتے ہو۔ اگر ممکن ہو تو اس کا انکار کرو۔

پروٹسٹنٹ مذہب کے ایک اصول کے خطرناک نتائج

ایک ایسے اصول کو جو پروٹسٹنٹ مذہب میں شامل تھا اور جسے خود پروٹسٹنٹ والے آج ترک کر دینے کی ضرورت محسوس کر رہے ہیں اُسے مبالغے کا لباس پہنا کے اور صرف انفرادی آزادی سے اپنے تمام خیالات مستنبط کر کے تم کہاں پہونچے ہو؟

تجارت میں بغاوت و بے ترتیبی یعنی کمزوروں پر ظلم و ستم کی مشق تک۔ سیاسیات میں آزادی تک۔ اُسی آزادی تک جو کمزوروں کا منہ چڑاتی ہے۔ کیونکہ اُن کے پاس نہ تو اُس کے ذرائع ہیں نہ وقت ہے اور نہ علم ہے کہ وہ اپنے جائز حقوق برت سکیں۔ اخلاقیات میں خود پرستی و خود بینی و انانیت تک یعنی ان کمزوروں سے علیحدگی اور اُنھیں برباد کرنے تک جو خود اپنی مدد نہیں کر سکتے۔ لیکن

اتحادِ عقائد کی ضرورت

ہم اتحاد و یکجہتی چاہتے ہیں۔ مگر یہ مطلوبہ اتحاد ان بھائیوں کے درمیان ہی میں محفوظ طریقے سے حاصل ہو سکتا ہے جو ایک ہی ہدایت کرنے والے اصول پر اعتقاد رکھتے ہوں اور جو ایک ہی عقیدے میں متحد ہوں اور جو ایک ہی نام کی قسم کھاتے ہوں۔ ہم تعلیم و تربیت چاہتے ہیں۔ مگر یہ تعلیم کیونکر دی جا سکتی اور حاصل کی جا سکتی ہے جب تک کہ ایک ایسا اصول و قانون نہو جو انسان کی اصل اور دنیا میں اُس کے مقصد زندگی کے متعلق عام عقیدہ کے اظہار پر مشتمل ہو۔ ہم عام تعلیم چاہتے ہیں لیکن اُس وقت تک عام تعلیم نہ تو دی جا سکتی اور نہ حاصل کی جا سکتی ہے، جب تک کہ اعتقاد میں یکجہتی نہو۔ ہم ایک قوم بنانا چاہتے ہیں۔ مگر ہم اس میں اُس وقت تک کامیاب نہیں ہو سکتے جب تک کہ ہم ایک مشترکہ مقصد اور مشترکہ فریضہ پر اعتقاد نہ رکھیں۔ اگر ہم "خدا اور خدا کا جو ہم سے تعلق ہے" سے عام فریضہ کا تصور اخذ نہیں کریں گے تو پھر کس سے کریں گے۔

بلاشبہ عام حق رائے دہندگی نہایت نفیس شے ہے اور یہی ایک قانونی ذریعہ ہے جس کے توسط سے ایک ملک اپنے پر اس طرح حکمرانی کرسکتا ہے کہ آئے دن کے مواقع خطر سے محفوظ رہے۔ لیکن اُسی ملک میں جہاں کہ صرف ایک مذہب کی حکومت ہو۔

عام حق رائے دہندگی قوم کے رجحانات کا قوم کی رائے کا اظہار کرسکتا ہے۔ لیکن ایسے ملک میں جہانکہ ایک مذہب موجود ہو عام حق رائے دہندگی سے اس کے سوا اور کس بات کا اظہار ہوسکتا ہے کہ جو لوگ تعداد کے لحاظ سے بہت زیادہ طاقتور ہیں، اُن کے اغراض و مقاصد کی حفاظت ہو رہی ہے اور باقی افراد دبائے جارہے ہیں۔

اُن ممالک میں جو مذہب نہیں رکھتے یا مذہب کی طرف سے بے پرواہیں عام سیاسی اصلاحات اُسی وقت تک چل سکتے ہیں جب تک کہ افراد کی خودغرضیوں کے مطابق ہیں۔ گزشتہ پچاس سال کے تجربہ نے ہمیں اس مسئلہ کے متعلق بہت کچھ بڑھا دیا ہے۔

عقبیٰ کا دنیا سے علیحدہ ہونا

اُس دوسری جماعت کو جو تم سے یہ کہتی ہے کہ دنیا سے عقبیٰ بالکل علیحدہ ہے۔ یہ بتا دو کہ دنیا اور عقبیٰ راستہ اور راستہ کے خاتمہ کے مانند ایک ہی چیز ہیں۔ ہم سے یہ نہ کہو کہ زمین مٹی کی ہے۔ زمین خدا کی ہے۔ خدانے اُسے پیدا کیا ہے تاکہ ہم اس کے ذریعے سے اس تک رسائی حاصل کرلیں۔

زمین حرص وطمع کی تشفی ہی کا مقام نہیں ہے بلکہ اس کی خلقت اس لئے ہوئی ہے کہ ہم اس میں اپنی ترقی اور دوسری بلند منزلوں تک پہونچنے کی سعی کریں۔ خدانے ہمیں صرف غور و فکر کے لئے نہیں پیدا کیا ہے۔ بلکہ عمل کے لئے بھی خلق کیا ہے۔ اُس نے ہمیں اپنی تمثال پہ پیدا کیا ہے۔ وہ خود غور و فکر بھی ہے اور عمل بھی۔ خدا کے یہاں کوئی فکر ایسی نہیں ہے جس کے ساتھ ہی عمل بھی نہ ہو۔ تم کہتے ہو کہ ہمیں تمام دنیاوی چیزوں سے نفرت کرنا چاہیئے اور اس "ارضی زندگی" کو ٹھکرا دینا چاہیئے تاکہ ہم پورے طور سے آسمانی چیزوں میں مشغول ہوسکیں۔ لیکن ارضی زندگی آسمانی زندگی کا مقدمہ ہی تو ہے۔ آسمانی زندگی کے حاصل کرنے کی اسے ایک منزل سمجھو۔ کیا تمھیں اس کا احساس نہیں ہوتا کہ وہ سیڑھی جس کے ذریعے سے ہم سب کو چڑھنا ہے اُس کے آخری درجہ کو متبرک اور پہلے درجہ کو ناپاک قرار دے کر تم ہمیں ہمارے راستہ سے علیحدہ کئے دے رہے ہو۔ روح کی زندگی اپنی منزل میں مقدس ہے خواہ وہ مادی منزل ہو یا اُس کے بعد والی منزل۔ اس لئے ہر منزل کو دوسری منزل کے لئے مقدمہ ہونا چاہیئے۔ اور ہماری ہر عارضی ترقی کو اُس غیر فانی زندگی کی (جو خدانے ہم سب میں اور ہمارے باہمی تعاون و تعامل کے نتیجہ کے طور پر اجتماعی انسانیت میں مشتعل کر رکھی ہے) مدد کرنا ضروری تاکہ نسل انسانی برابر عروجی ترقی کے جادہ پر گامزن رہے۔

(اپنی عطوفت سے) خدانے زمین کو تمھارے لئے جائے سکونت قرار دیا ہے۔

ہزاروں مخلوقات تمھارے اردگرد بسی ہوئی ہے۔ اُن کے دماغوں کی تمھارے دماغوں سے تربیت ہوتی ہے۔ اُن کی ترقیاں تمھاری ترقیوں کے ساتھ وابستہ ہیں اور اُن کی زندگی تمھاری زندگی سے سرسبزی و شادابی حاصل کرتی ہے۔ انفرادی زندگی کے خطرات سے بچانے کے لئے اُس نے تمھیں ایسی ضرورتیں دے دی ہیں جنھیں تم تنہا پورا نہیں کرسکتے۔ اور ایسی طاقتور معاشرتی جبلی قوتیں عطا کردی ہیں جو تمھیں حیوانات سے ممتاز کردیتی ہیں۔ کیونکہ اُن میں وہ قوتیں خوابیدہ رہتی ہیں۔ اُس نے تمھارے اردگرد ایسی دنیا پھیلا دی ہے جسے تم مادی کہتے ہو جو حسن و جمال میں ممتاز ہے اور زندگی سے لبریز۔ ایسی زندگی سے لبریز (اسے تمھیں بھولنا نہیں چاہیئے) جو ہر مقام پر خدا کی ظاہری نشانی کے طور سے نمایاں ہوتی ہے۔ تاہم وہ تمھارے اعمال کی منتظر ہے اپنے ظہور میں تمھاری محتاج ہے اور تمھاری جد و جہد کی نسبت سے اُس کی قوت میں ترقی ہوتی جاتی ہے۔

ہمدردی کی نہ بجھنے والی چنگاریاں اور خدا

اُس نے تمھارے اندر ہمدردیوں کی نہ بجھنے والی چنگاریاں روشن کردی ہیں، جو لوگ ماتم میں مصروف ہوتے ہیں اُن پر رحم و عطوفت۔ جو شاد و خوش ہوتے ہیں اُن کی مسرتوں میں شرکت۔ جو لوگ اپنے ساتھیوں پر ظلم کرتے ہیں اُن کے خلاف غیظ و غضب۔ اُن غیر معمولی فہم و ادراک والوں کے لئے جذبۂ توصیف و تعریف جو اُن صداقتوں کو نمایاں کرتے ہیں جن کا دنیا کو پہلے علم نہ تھا۔ اُن لوگوں کے لئے پُرجوش سرگرمی کا اظہار جو ان

صداقتوں کو ایسا عملی لباس پہناتے ہیں جو سب کے لئے مفید ہو۔ اور ایسے افراد کے واسطے مذہبی احترام کا جذبہ جو صداقت کو کامیاب بنا سکنے کے لئے ایک شہید کی موت مرجاتے اور اپنے خون سے ان صداقتوں پر مہرِ شہادت لگا جاتے ہیں۔ (اُسی نے یہ مختلف کیفیتیں ہمارے دلوں میں ودیعت کی ہیں) اس کے باوجود بھی تم انکار کرتے ہو اور اپنے مشن کی ان توضیحات ہی کی تحقیر کرنا چاہتے ہو جنھیں خدا نے اس سخاوت کے ساتھ تمھارے اردگرد پھیلا دیا ہے۔

اصل تو یہ ہے کہ تم ہمیں یہ حکم دیکر کہ ہم اپنی تمام طاقتیں باطنی صفائی کی طرف مرکوز رکھیں (درآنحالیکہ واقعہ یہ ہے کہ اگر اس باطنی صفائی کو تنہا حاصل کرنے کی کوشش کی جائے تو ہماری یہ جدوجہد نہ صرف غیر مکمل بلکہ ناممکن الوقوع بھی ہوگی) قدرت کی ان گوناگوں جلوہ فرمائیوں کو بددعائیں دیتے ہو۔

کیا خدا اُن لوگوں کو سزا نہیں دیتا جو اس سعیٔ لاحاصل میں مصروف رہتے ہیں؟ کیا غلام اخلاقی پستی کی حالت میں نہیں ہوتا؟ کیا اُس غریب روزانہ کے مزدور کی آدھی روح (جو اپنی اندرونی ایزدی حیات کو اُن جسمانی کاموں میں جن میں تعلیم کی روشنی کا ذرا سا بھی اثر نہیں ہے، صرف کرنے پر مجبور ہے) مادی وجسمانی خواہشوں کی تسکین میں گھٹ گھٹ کر برباد نہیں کی جاتی؟ کیا تم اُس پولینڈ کے باشندہ کی بہ نسبت جو اپنے ملک اور آزادی کی خاطر جنگ کر رہا ہے روس کے غلام میں مذہبی اعتقاد زیادہ پاتے ہو؟

جہاں خدا کی رُوح ہے وہاں آزادی ہے

کیا تم پوپ اور ایک ظالم بادشاہ کے مبتلائے تنزل حلقہ بگوشوں میں خدا کی محبت کا جوش بارہویں صدی کے جمہوریت پسند لمبارڈ یا چودھویں صدی کے فلورنس کے جمہوریت پسندوں سے زیادہ پاتے ہو؟ خدا کے ایک بہت بڑے طاقتور پیغمبر نے کہا ہے "جہاں خدا کی روح ہے وہاں آزادی ہے۔"

اس خدا کے برگزیدہ پیغمبر نے اپنے تلقین کردہ مذہب میں غلامی کے ختم کر دینے کا حکم نافذ کر دیا تھا۔ کیونکہ جو شخص خدا کی مخلوق کے سامنے سر جھکاتا ہے وہ ٹھیک طور سے نہ تو خدا کی معرفت حاصل کر سکتا ہے اور نہ اُس کی تسبیح وتہلیل ہی میں مصروف رہ سکتا ہے۔

تمہارا مذہب کوئی مذہب نہیں ہے۔ تم لوگ ان چند افراد کا مجموعہ ہو جنھوں نے اپنی اصلیت بھلا دی ہے۔ اور جنھوں نے اُن لڑائیوں کو جو اُن کے بزرگوں نے ایک بگڑی ہوئی سوسائٹی کے خلاف لڑی تھیں اور اُن کامیابیوں کو جو اُنھوں نے اسی دنیا کو بدل کر جس سے تم خیالی پلاؤ پکانے والے نفرت کر رہے ہو حاصل کی تھیں بالکل فراموش کر دیا ہے۔

پرانے تباہ شدہ اعتقادات کے کھنڈروں سے جو سرگرم اور جوشیلا مذہب اُبھرے گا وہ موجودہ معاشرتی تربیت وتنظیم کو بالکل بدل دے گا۔

کیوں؟ اس لئے کہ ہر سرگرم مذہب یہ چاہتا ہے کہ وہ انسانی جدوجہد کے تمام شعبوں پر حکم نافذ کرے اس لئے کہ ہر عصر میں دنیا کی یہ خواہش رہتی ہے کہ وہ اپنے کو اُس عقیدہ کے مطابق بنائے جس میں وہ اعتقاد رکھتی ہے۔ اس لئے کہ انسانیت کی تمام تاریخ مختلف شکلوں اور مختلف رجحانوں میں جو زمانہ کے لحاظ سے بدلتے رہتے ہیں۔ عیسائی دنیا کے اس جز کو کہ "اے خدا اے مالک تیری سلطنت دنیا میں اسی طریقے سے قائم ہو جس طرح سے کہ وہ آسمان پر قائم ہے۔" دوہراتی رہتی ہے۔

میرے بھائیو! یہی الفاظ جو زمانۂ ماضی کی بہ نسبت زیادہ رکھتے اور زندگی کے ہر شعبہ پر بہتر طریقے سے عائد کئے جا سکتے ہیں ہر وقت تمہاری زبان پر رہیں۔ یہی تمہاری دعا بنیں۔ انھیں کو دوہراؤ اور انھیں کے مطابق عمل کرو۔ تاکہ یہ مقصد پورا ہو۔ اُن لوگوں کی کچھ پروا نہ کرو جو تمہیں خاموش یکسوئی اور دنیوی چیزوں سے بے اعتنائی کا درس دیتے ہیں اور اس مقولہ کا (کہ قیصر کو وہ چیزیں دیدو جو قیصر کی ہیں اور خدا کو وہ چیزیں دیدو جو خدا کی ہیں) بغیر سمجھے ہوئے اعادہ کر کے مادی سلطنت کی اطاعت کا خواہ وہ کتنی ہی ظالم وجابر ہو تمہیں سبق پڑھاتے ہیں۔ کیا وہ تمھیں بتا سکتے ہیں کہ ایسی کونسی چیزیں ہیں جو خدا کی نہیں ہیں؟ کوئی چیز اُس وقت تک قیصر کی نہیں ہے جب تک کہ وہ ایزدی قانون کے مطابق نہو۔ قیصر جو مادی حکومت سے عبارت ہے صرف خدا کے منشا اور اُس کے احکام کو جہاں تک کہ اُس کارخانہ اور اُس کی طاقتیں اجازت دیں عمل میں لانے والا ہے۔ جہاں قیصر نے اس مشن اور مینڈیٹ کی خلاف ورزی

کی تو اُس وقت میں یہ تو نہیں کہوں گا کہ تمھارا حق ہے ہاں یہ کہوں گا کہ تمہارا فرض ہے کہ اس حکم کو بدل دو۔ اس دنیا میں تمھارے وجود کا منشا ہی کیا ہو سکتا ہے۔ اگر تم خدا کے ارادہ کو اُن ذرائع اور حالات کی مناسبت کے لحاظ سے جو تمھارے امکان میں ہیں عمل میں لانے کی پوری سعی نہیں کرتے ہو؟

تم اس کا کیوں اقرار کرتے ہو کہ تم انسانی نسل کے اتحاد کے قائل ہو جو خدا کی وحدت کا لازمی نتیجہ ہے۔ اگر تم سے اس کی کوشش نہیں ہو سکتی کہ ان مستبدانہ تفرقوں اور عداوتوں کے خلاف جو اب بھی مختلف گروہوں اور جماعتوں کو جن سے نوع انسانی بنتی ہے متفرق کئے ہوئے ہیں جنگ کر کے اس وحدت کو وجود میں لاؤ؟ ہم کیوں انسانی آزادی پر جو انسانی ذمہ داری کی بنیاد ہے اعتقاد رکھتے ہیں درآنحالیکہ ہم اُن موانع کو دور نہیں کر سکتے جن سے انسانی آزادی میں رکاوٹ پیدا ہوتی ہے اور انسانی ذمہ داری کا تخیل تباہ ہوتا ہے؟ ہم کیوں عام اخوت کے متعلق گفتگو کرتے ہیں درآنحالیکہ ہم روزانہ اپنے بھائیوں کو پیروں کے نیچے کچلتے رہتے انھیں تنزل کے غار میں ڈھکیلتے رہتے اور اُن کی توہین و تذلیل ہونے دیتے ہیں؟

الدنیا مزرعة الآخرة

دنیا ہماری محنتوں کا میدان ہے۔ ہمیں اُسے بُرا نہیں کہنا چاہیئے بلکہ ہمیں اُسے مقدس سمجھنا چاہیئے۔ وہ ہماری مادی قوتیں جو ہمیں گھیرے ہوئے ہیں ہماری محنتوں کے اسلحہ ہیں ہمیں انھیں مسترد نہیں کر دینا چاہیئے بلکہ انسانی بہبود کے لئے انھیں استعمال کرنا چاہیئے۔

خدا کی ضرورت

لیکن یہ کام خدا کے بغیر تم انجام نہیں دے سکتے۔ میں نے تم سے تمھارے فرائض کے متعلق گفتگو کی ہے۔ میں نے تمھیں یہ بتایا ہے کہ تنہا حقوق کا علم تمھیں مستقل طور سے ترقی کے راستہ پر لگا نہیں سکتا اور نہ غیر منقطع ترقی ان حالات و کیفیات میں عطا کر سکتا ہے جس کی تمھیں تلاش ہے۔ خدا کے بغیر ہم فرائض کا تخیل کہاں سے حاصل کر سکتے ہیں۔ خدا کے بغیر تم حکومت کے جس نظام سے بھی اپنے کو وابستہ کرو گے اس کی بنیاد وحشیانہ ظالمانہ اور جابلانہ قوت پر ہو گی۔ اُس سے کوئی نجات کی صورت نہیں ہے۔

انسانی معاملات کی نشو و نما یا تو اُن خدائی قوانین پر موقوف ہے جن کا انکشاف اور افعال و اعمال پر اُن کا عائد کرنا ہم سب لوگوں کا فرض ہے یا اُس کا انحصار وقتی حالات واتفاقات اور اُس شخص پر ہے جو یہ جانتا ہے کہ اُن سے کیونکر بہترین فائدہ اُٹھائے۔ یا تو ہمیں خدا کی اطاعت کرنا چاہیئے یا انسان کی خواہ وہ ایک ہو یا بہت، اگر ایک ایسا اعلیٰ و برتر دماغ موجود نہیں ہے جو تمام انسانی دماغوں پر مشتمل ہو تو ہمیں دوسرے طاقتور انسانوں کے ظلم سے کون بچا سکتا ہے؟ اگر کوئی ایسا مقدس اور غیر قابل شکست قانون جسے بندوں نے نہ بنایا ہو موجود نہیں ہے تو وہ کونسا ایسا طریقہ ہے جس سے ہم یہ فیصلہ کر سکیں کہ ہمارا فعل یا عمل منصفانہ ہے یا غیر منصفانہ؟ ہم کس شخص کے نام سے اور کس چیز کے نام سے ظلم اور عدم مساوات کے خلاف احتجاج کر سکیں گے؟ خدا کے بغیر واقعات ہی حکمراں بن سکتے ہیں۔ یہی واقعات وہ ہیں جن کے سامنے تمام مادئین ہمیشہ اپنا سر جھکا دیتے ہیں۔ اب خواہ اُن کا نام "انقلاب" رکھا جائے یا نپولین بونا پارٹ" یہی واقعات وہ ہیں جنھیں اس عصر کے مادئین بھی اٹلی اور دوسرے مقامات میں اپنی بے عملی کے حق بجانب ثابت کرنے کے لئے خواہ وہ ہمارے اصول سے لسانًا متفق ہی کیوں نہ ہوں پیش کرتے ہیں ایسی صورت میں ہم کیونکر اپنی انفرادی رایوں کے نام سے اُن سے قربانی اور شہادت کا مطالبہ کر سکتے ہیں۔ کیا ہم صرف اپنے مفاد و اغراض ہی کی قوت پر اپنے نظریوں کو عمل اور اصول مجردہ کو جہد و سعی کا جامہ پہنا سکے؟ دھوکا نہ کھاؤ۔ فریب میں مبتلا نہ ہو۔ جب تک ہم بطور افراد کے ان نظریوں کے نام سے جنھیں ہماری فہم و دانش اخذ کرتی ہے بات چیت کریں گے تب تک ہم میں صرف لفظی اتباع پیدا ہو گا۔ عملی اتباع پیدا نہ ہو گا۔

خدا کا اعتقاد ہی عمل و قربانی پر آمادہ کر سکتا ہے

صرف وہی آواز جو تمام بڑے انقلابوں میں گونجتی رہتی ہے۔ یعنی جہاد کی آواز۔ خدا کی یہی مرضی ہے؛ "خدا کی یہی مرضی ہے" علی انسانوں کو عمل کی طرف آمادہ کر سکتی۔ بزدلوں کے دل میں جرأت و ہمت۔ مذبذبین میں قربانی کا جوش اور اُن لوگوں میں جو بے اعتباری کے ساتھ تمام

انسانی تصورات کو مسترد کر دیتے ہیں عقیدہ پیدا کر سکتی ہے۔ لوگوں پر یہ ثابت کردو کہ غلامی سے آزادی کی سعی اور ترقی پذیر نشوونما کا کام جس کی طرف تم ان سب کو دعوت دے رہے ہو خدا کے منشا کا ایک جزو ہے۔ اس یقین کے بعد کوئی بغاوت نہیں کرے گا۔ اُن پر یہ ثابت کردو کہ جس کام کی تم اس دنیا میں تکمیل کرنا چاہتے ہو وہ تمہاری غیر فانی زندگی کا ایک حصہ ہے۔ اس کے بعد وقتی پس وپیش اور ہنگامی تذبذب مستقبل کی اہمیت کے سامنے غائب ہو جائے گا۔ خدا کے بغیر تم حکم دے سکتے ہو۔ ترغیب نہیں دے سکتے۔ اپنے وقت میں ظالم ہو سکتے ہو مگر معلم اور پیغمبر نہیں ہو سکتے۔

"خدا کی یہی مرضی ہے، خدا کی یہی مرضی ہے" بھائیو! یہی قوم کی آواز ہے۔ یہی اطالوی قوم کی آواز ہے۔ تم لوگ جو ملک سے سچی محبت کے جذبہ سے مجبور ہو کر کام کر رہے ہو، اُن افراد کی وجہ سے اپنے کو فریب میں مبتلا ہونے دو۔ جو یہ کہتے ہیں کہ اٹلی کی عقل وفہم سیاسی عقل وفہم نہیں ہے اور مذہبی روح اُس سے جاتی رہی ہے۔

اٹلی باہمی اختلافات کے باوجود بھی جب تک کہ علمی اور طاقتور رہا اُس سے مذہبی روح کبھی علیحدہ نہیں ہوئی۔ لیکن اس سولھویں صدی میں جبکہ فلورنس فتح کیا جا چکا ہے اور چارلس پنجم کے اسلحہ اور بڑے مذہبی پیشواؤں کی مکاریوں نے اٹلی کی زندگی بالکل کچل ڈالی ہے۔ اُس سے مذہبی روح بالکل علیحدہ ہو گئی ہے۔ ہم نے اپنے قومی کردار کو بالکل گم کر دیا ہے اور ہم یہاں اس طریقے سے زندگی بسر کر رہے ہیں جیسے کہ ہم ہسپانیہ کے جرمنی کے یا فرانس کے باشندے ہوں۔

فضلا وعلما اور مسخروں کا پارٹ

ان حالات میں ہمارے فضلا وعلما بادشاہوں کے سامنے مسخروں کا پارٹ کرنے لگے اور اپنے کاہلی وغیر علمی مربّیوں میں نشاطِ زندگی لہر پیدا کرنے کے لئے ہر شخص اور ہر چیز کا مذاق اُڑانے لگے۔ ہمارے مذہبی طبقہ نے جب یہ محسوس کیا کہ مذہبی صداقتوں کا کسی جگہ بھی عائد کرنا ممکن نہیں ہے تو اُنھوں نے مقدس چیزوں کی تجارت شروع کر دی۔ اور ان لوگوں کا خیال چھوڑ کر جنھیں روشن خیال بنانا اور اُن کی حمایت وحفاظت کرنا اُن کا فرض تھا وہ اپنے ہی مفاد کے سوچنے میں منہمک ہو گئے۔ جب یہ حالت ہوئی تو عام لوگوں نے جن کی فضلا وعلما تحقیر کر رہے تھے جنھیں مذہبی پیشوا دھوکا دے رہے تھے اور اُن کے جسموں سے کھالیں تک کھینچے لے رہے تھے اور پبلک معاملات میں اُن کا کوئی اثر باقی نہیں رہا تھا تو اُنھوں نے اس کا انتقام یوں لیا کہ حکماء وفضلاء کو طعن آمیز نگاہوں سے دیکھنا شروع کر دیا۔ مذہبی پیشواؤں پر اعتماد ترک کر دیا اور تمام عقائد کے خلاف بغاوت کا جھنڈا اونچا کر دیا۔ کیونکہ وہ اسے محسوس کرنے لگے تھے کہ پرانے عقائد ومذاہب بگڑ گئے ہیں اور اُن کے پاس ایسی نگاہیں نہیں تھیں کہ وہ اُن عقائد کے آگے نظر کر سکتے۔

اُس وقت سے اب تک ہم ذلت اور کمزوری کی حالت میں پڑے ہوئے اپنے کو اُن توہمات (جو کچھ تو ہماری عادتوں کا نتیجہ ہیں اور کچھ ہمارے حکمرانوں کے عائد کردہ ہیں) اور بے اعتمادی کے درمیان کھینچ رہے ہیں۔ لیکن اب ہم پھر ترقی کرنا چاہتے ہیں۔ بڑا اور معزز بننا چاہتے ہیں۔ ہم اپنی قومی روایتوں کو تازہ کریں گے۔ ہم اسے یاد کریں گے کہ ہمارے لمبارڈ بھائیوں نے بارھویں صدی میں جرمن حملہ آوروں پر در آنحالیکہ خدا کا نام اُن کے ہونٹوں پر تھا اور اُن کے اعتقادات کی نشانیاں شان کے مرکز میں قائم تھیں فتح وظفر حاصل کی تھی۔ اور جن آزادیوں کو اُن سے زبردستی چھین لیا گیا تھا اُنھیں دوبارہ حاصل کر لیا تھا۔ ہم اس واقعہ کو یاد کریں گے کہ ٹوسکان کے جمہوریت پسندوں نے کلیساؤں میں اپنی پارلیمنٹوں کے اجلاس منعقد کئے تھے۔ ہم اُسے یاد کریں گے کہ فلورنٹائن کے صناعوں نے (جو اس پر راضی نہیں ہوئے تھے کہ اپنی "جمہوریت پسندانہ آزادی" کو ہوس آف میڈیسی کا پابند بنا دیں) حضرت عیسیٰ کو اپنی ریپبلک کا صدر نہایت سنجیدگی سے منتخب کر لیا تھا۔ ہم اس فقیر سیونہ رولا کو یاد کریں گے جس نے ایک ہی سانس میں خدا پر اعتقاد اور عوام کے حقوق کی تلقین وتبلیغ کی تھی۔ اسی طرح ہم ۱۷۴۶ء جینوس کو یاد کریں گے جنھوں نے پتھروں کو اسلحہ بنا کر اپنی مربیہ کنواری مریم کے نام سے اپنے شہر کو جرمنی کی فوجوں سے جو اس پر قابض ہو گئے تھے آزاد کر لیا تھا۔ اسی طرح ہم ان واقعات کے ایک سلسلہ کو یاد کریں گے جن میں مذہبی خیال نے اٹلی کے ہر دلعزیز خیالات کی حمایت کی اور اُنھیں صالح نشوونما دی۔ اب بھی مذہبی جذبہ ہماری قوم میں سو رہا ہے اور اس کا منتظر ہے کہ اُسے جگایا جائے۔ مجھیں

اس جذبہ کو اُبھارنا جانتا ہے وہ قوم کے لئے بیسیوں سیاسی نظریات کے مقابلہ میں کہیں زیادہ کام کرسکتا ہے۔

خدا کے نام سے تلقین

غیر ملکی شاہی اداروں اور اُن کے سیاسی ہتھکنڈوں کے نقاؤں اور معتقدوں میں جنھوں نے حکومت کے خلاف باغیانہ سرگرمیوں کی رہنمائی کی تھی اسی جذبہ کی کمی اور ایک واضح ہردلعزیز مقصد کی عدم موجودگی ہی تھی جس نے اُن کوششوں کا قوم میں اب تک سرگرمی سے خیر مقدم نہیں ہونے دیا۔ اس لئے بھائیو، خدا کے نام سے قوم کو ان چیزوں کی تلقین کرو۔ جس شخص میں اُٹی کا دل ہوگا وہ تمھاری پیروی کرے گا۔ خدا کے نام سے تم ان چیزوں کی تلقین کرو۔ فاضل و قابل شخص اُسے سن کر مسکرائے گا۔ تم ایسے فاضل و قابل شخص سے پوچھو کہ تم نے ملک کے لئے کیا کیا؟

مذہبی پیشوا تم پر کفر کے فتوے عائد کریں گے۔ تم اُن سے کہدو کہ ان تمام مذہبی پیشواؤں کے مجموعہ سے کہیں زیادہ بہتر تمھیں خدا کی معرفت حاصل ہے اور یہ کہ تم خدا اور اُس کے قوانین کے درمیان میں کسی واسطہ کی ضرورت نہیں رکھتے ہو۔ قوم تمھاری باتیں سمجھے گی اور تمھارے ساتھ اس کا اعادہ کرے گی۔

"ہم خدا میں جو ہم سب کا باپ ہے جو فہم و محبت مطلق ہے جو نوعِ انسان کا خالق اور اُس کا معلم ہے،
پورا اعتقاد رکھتے ہیں۔"

اس قول کے ذریعے سے تم اور قوم فتح و کامرانی حاصل کرو گے۔

تصویرِ رخصت

اللہ رے آنکھوں سے یہ بہتا ہوا کاجل — اور ہاتھ میں اشکوں سے یہ بھیگا ہوا آنچل
یہ پھول سے رُخسار پہ بہتے ہوئے آنسو — یہ رنگ بدلتا ہوا چہرے کا مسلسل
کانپے ہوئے ہونٹوں پہ مچلتی ہوئی سسکی — افسانۂ اندوہ کو کرتی ہے مکمل
اندوہ کی کثرت سے یہ جذبات میں ہیجاں — جذبات کے ہیجان سے سینے میں یہ ہلچل
تا دیر جھکے رہنے سے دُکھتی ہوئی گردن — نازک سا بدن کثرتِ اندوہ سے بے کل
ہل جائے کبھی پاؤں تو پازیب کی جھنکار — یوں بجتی ہے جس طرح بجے موت کی چھاگل
جس زُلف پہ رقصاں تھا کبھی پرتوِ عشرت — چھائے ہوئے اُس زُلف پہ آلام کے بادل
جس آنکھ سے کل شب کو ٹپکتی تھی مسرت — اُس آنکھ سے اشکوں کا ٹپکنا یہ مسلسل

طاری ہے گلستاں کے ہر اک گُل پہ اُداسی
رونے کی صداؤں سے ہے گونجا ہوا جنگل

مرزا یاور علی کلکتہ

شوہردار بیوہ

از عبدالوالی۔ (فرنگی محل والے نہیں، جھوائی ٹولے والے)

بارہ بنکی شہر میں بوقت ۹ بجے دن بتاریخ ۷ر اکتوبر بروز جمعہ یہ خط تحریر ہوا

حضرتِ جوش!

خود میں خط لکھنے میں کاہل ہوں مگر غلط شوق یہ رکھتا ہوں کہ دوسروں کے خط میرے پاس کثرت سے آئیں۔ خدا جھوٹ نہ بلائے مہینہ بھر سے تو قصد کر رہا ہوں گا کہ آپ کو خط لکھوں۔ کسی طرح نوبت نہ آئی۔ آج دل کڑا کرکے بیٹھ ہی گیا اور کہا جو کچھ ہو ضرور خط لکھوں گا۔ جسم کے مزوں میں کچھ رکھا نہیں ہے۔ لیکن یہ مزے جب ذہن کے سپرد ہو جاتے ہیں تو ذہن انھیں کیا سے کیا کر دیتا ہے۔ آپ شاعروں نے اس حقیقت کی جانب اشارے کئے ہیں۔ آپ کے گھر پر آپ کی صحبت نے جسم کو جو لذت پہنچائی جسم تو اسے کب کا بھول چکا۔ لیکن ذہن محفوظ کئے ہے، اور اکثر اس لذت سے دل کو شاد کیا کرتا ہے۔ آپ جئیں آپ کے بیوی بچے جئیں۔ آپ کی ارمان والی نظم جو اگست کے کلیم میں شائع ہوئی مجھے بہت پسند آئی۔ آخر میں بغاوت کا جو رنگ دیا ہے وہ خوب ہے۔ انسان کی شان مشیت سے بغاوت ہی کرنے میں ہے۔ ہتھیار ڈال دینا۔ تسبیح لے کے مصلے پر بیٹھ جانا اُن لوگوں کا کام ہے جن کا شمار ادنیٰ اور ہیچ لوگوں میں ہے۔ بزدلوں کی عبادت بغاوت ہے۔ ایک چھوٹا سا قصہ بیرنگ لفافہ میں رکھکر بھیج چکا ہوں۔ دوسرا قصہ بھی آج لکھکے ختم کیا ہے۔ کل پرسوں تک روانہ کردوں گا۔ میں جانتا ہوں میں پھوہڑ زبان رکھتا ہوں۔ مگر کیا کروں مزہ اسی میں آتا ہے۔ ثقاہت کہاں سے لاؤں، اور کہیں سے لاؤں بھی تو وہ میرے جذبات کی حامل

نہیں ہو سکتی۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ گالی کی باتیں فقہ کی کتابوں میں پہنچکر تو گالی نہ رہیں۔ لیکن آرٹ لٹریچر میں گالی کی گالی بنی رہیں۔ خیر کور ذہن کور دل، کور باطن لوگوں سے مجھے کیا مطلب۔ جن کی عصمت دری میری تحریر سے ہوتی ہو وہ عصمت بچائے رہیں میری تحریر نہ پڑھیں۔



زلیخا ہجولیوں میں بیٹھی چہلیں کر رہی تھیں۔ نفیس بانو اس تاک میں تھیں کہ باتوں باتوں میں زلیخا کوئی اپنا قصہ چھیڑ دیں اور اُنھیں اپنے فسانے کے لئے دلچسپ پلاٹ مِل جائے۔ زلیخا کے پاس قصوں کی کمی نہ تھی۔ ذرا سی تحریک پر اپنا واقعہ بتا کر کوئی نہ کوئی قصہ کہہ سناتی تھیں اور سب قصے عورت و مرد کے زیادہ تر ہوتے تھے۔ صفیہ بولیں "زلیخا تمھیں کیا ہو گیا ہے۔ اتنی بیباک کیوں ہو گئی ہو۔ یہ جھوٹے جھوٹے قصے اپنے اوپر جوڑ کے برملا کہتی پھرتی ہو۔ تمھیں شرم نہیں آتی"؟

زلیخا۔ چلو ہٹو۔ تم سب پر اسی طرح کے نہ معلوم کتنے واقعات گزرتے ہوں گے۔ کہتے شرماتی ہو۔ بلکہ مکار ہو۔ لوگوں کے سامنے ننھی بنتی ہو۔ اور کیوں نہ گزریں، عورت کو مرد اچھا معلوم ہوتا ہے۔ مرد کو عورت۔ جب کبھی مرد اور عورت اِکٹھا ہوں گے کوئی نہ کوئی واقعہ ضرور پیش آئے گا۔

صفیہ۔ یہ ٹھیک سہی مگر اپنے اوپر جو واقعہ گزرے اُس کا ڈنکا کیوں پیٹے۔ جب یہ معمولی سی بات ہے جیسا تم کہتی ہو تو معمولی بات کا

دوہرانا اور اُسے جھنڈے پر چڑھانا کونسی عقلمندی ہے۔

زلیخا۔ جسم کے قصّہ کو جسم تک رکھنا بوالہوسی ہے۔ جب ایسا کوئی واقعہ ہو تو اُسے جسم سے چھین کر ذہن کے سپرد کر دے تاکہ ذہن سرسبز و شاداب ہو اور اس سے روح میں تازگی آئے۔ ذہن جسم کی واردادتوں کو کیا سے کیا کر دیتا ہے۔ نئے محققین کی رائے ہے کہ روحانیت حسن و عشق کے جذبات کا عصارہ اور جوہر ہے۔ حسن و عشق جنسی اور جسمی تحریکات نہیں تو اور کیا ہیں۔ نئے محققین کی یہ رائے کوئی نئی رائے نہیں ہے۔ مجاز اور حقیقت کی اصطلاحات قائم کر کے اس مسئلہ پر کتنا لکھا اور کتنا کہا جا چکا ہے۔ پُرانے کہنے اور لکھنے والے پردے کی بُو بُو تھے، عریاں حقیقت سے شرم اس درجہ تھی کہ بڑھتے بڑھتے شرم نے خوف کی شکل اختیار کر لی تھی۔ جو پہلے اصطلاحات کے پردے میں کہا جاتا تھا وہ اب کھُلم کھُلا کہا جانے لگا ہے۔ نفسیات کا فلسفہ جرمن یہودی فرواد ( ) اور ڈاکٹر سیری اسٹوپس کا بھلا ہو اس سے بیڑا پڑا ہے۔ تم بھی۔ صفیہ۔ بوڑھی جاہل عورتوں کی سی باتیں کرتی ہو۔ ہم تعلیم یافتہ عورتوں کو یہ حجابات اُٹھا دینے چاہئیں۔ پُرانی عورتوں کے پیشِ نظر حور بننا تھا۔ ہمیں حُر بننا ہے۔

رضیہ۔ زلیخا بُری اور بدکار نہیں ہے۔ ذرا مزیدار طبیعت پائی ہے تو اس میں کیا برائی ہے۔

صفیہ۔ میں کب کہتی ہوں بدکار ہیں۔ مگر زیادہ بیباکی بھی تو اچھی نہیں۔ خواہ مخواہ بدنام ہونے سے فائدہ؟

زلیخا۔ تم سب مونڈی کاٹیاں بدکار ہیں ہو۔ جسم کی مزیداریوں کو چھپاتی ہو۔ معرضِ اظہار میں نہیں لاتیں کہ ذہنی مزے کی صورت بنے۔ مزہ جسم ہی تک محدود رکھنا چاہتی ہو۔ یہی بدکاری ہے۔

بانو۔ کہتی تو سچ ہو یہ سب ایسی ہی ہیں۔

زلیخا۔ ہر شوہر مست و مغرور ہے کہ میری بیوی کو کسی دوسرے مرد نے ہاتھ نہیں لگایا۔ بیوی چاہے دوسرے مرد کے پیچھے دیوانی ہی کیوں نہ ہو۔ عصمت عورت کا زیور ہے! خوب! یہ کیوں نہ کہیں بے حسی عورت کا زیور ہے۔ عورت کی نہ جان ہے نہ ادراک نہ فہم۔ بس ایک خاص مرد یعنی شوہر کی پرستش اُس کا دھرم ہے۔ شوہر صاحب چاہے کیسے ہی ہوں! یہ سب دھوکا۔ تصنع اور دغا بازی ہے۔ ہر جاندار جان کے مزے اُٹھانا چاہتا ہے بلکہ یہ کہو کہ مزے اُٹھانے پر مجبور ہے اس حقیقت اور اصلیت پر ہر چیز قربان ہے۔ یہ تاڑ کن حقیقت ہر قانون شکنی کو ہر اخلاق کے مجموعے کو پاش پاش کرنے کے لئے ہمہ وقت تلی رہتی ہے۔ میں تمہیں ایک بیوی کا قصہ سناؤں۔

بانو۔ ہاں۔ ہاں، ضرور، ضرور

زلیخا۔ تیس سے اوپر اُن کا سن تھا ماں باپ بہت پیسے والے تھے۔ عیش میں بچپن گزرا۔ شادی اتفاق سے ایسے مرد سے ہوئی جو بدباغ اور بد دماغ دونوں تھا۔ نازک طبیعت اور نفیس و شائستہ خیالات شوہر کی حرکتوں کے متحمل نہ ہوئے۔ دل میں شوہر کی طرف سے ایک گرہ سی پڑ گئی۔ میاں صرف جنسی کام کے لئے انھیں استعمال کرتا تھا۔ ہر دفعہ جنسی فعل کے بعد اُنھیں یہ محسوس ہوتا تھا کہ کسی ناجائز فعل کی مرتکب ہوئیں۔ اپنے ضمیر پر ملامت اپنے جسم و جان پر ملامت کیا کرتی تھیں۔ یہاں تک کہ جنسی حرکات سے رغبت جاتی رہی۔ نیک دل و شریف النفس تھیں مگر ضعیف القلب اور خفیف العقل نہ تھیں۔ دل و دماغ میں عجیب ہیجان اور بے چینی کی کیفیت پیدا ہونی شروع ہوئی۔ ہوتے ہوتے اس ہیجان نے بغاوت کی شکل اختیار کر لی۔ باغی دل اور باغی دماغ والی عورت ہو گئیں پاکیزہ اور حلیم شکل و صورت کی تہ میں بغاوت۔ کس سے بغاوت؟ اپنے وجود سے اور اس عالم سے جس میں یہ وجود قائم ہے۔ ہر حقیقت سے نالاں۔ معاشرت کی ہر قائم کی ہوئی صورت سے متنفر۔ قوانینِ شریعت کی تحقیر۔ اصولِ اخلاق و معاشرت کی تذلیل، تہذیب و تمدن سے بیزاری۔ عجیب عالم۔ اُنھیں دیکھ کے حقائقِ حیات کی دیوی بائیولوجی کہیں کھڑی بڑبڑا رہی ہوگی "بُرے اور غلط جوڑ لگانے کے نتیجے"۔

صفیہ۔ لو اس میں بھی اِن کی بائیولوجی آ گئی۔ وہ اب دیوی ہو گئی تو اچھا ہوا۔

زلیخا۔ عالم کے حقائق ہی کو تو انسان کے ذہن نے شکل دے کے دیوی اور دیوتا بنائے ہیں۔ بائیولوجی حقائقِ حیات ہے۔ اس لئے حیات کی دیوی ہوئی۔ جتنی سائنسیں ہیں سب دیویاں ہیں۔ جتنے فلسفے ہیں سب دیوتا ہیں۔ عالم کو حسِ انسانی میں لانا۔ اُس کا تجزیہ و تحلیل کرنا دولتِ کفر ہے۔ اُس کو پردۂ غیب میں رکھنا شانِ ایمان ہے۔ یہ نکتہ تم نگوڑیوں کی سمجھ سے باہر ہے۔

بانو۔ اور اُڑتی چلی جاؤ؛ جوڑا کھاتے کھاتے کفر و ایمان تک پہونچ گئیں۔

اس پر قہقہہ پڑا۔ خود زلیخا بھی خوب ہنسی۔ جب سب ہنس چکے تو زلیخا نے کہا۔

زلیخا: بیوی جوڑا کھانے سوا دنیا میں ہے کیا۔ جوڑا کھانا۔۔۔۔۔۔

۔۔۔۔اور جوڑا کھانے کے متعلقات زندگی کے اصلی اور دائمی مسئلے ہیں۔ گالی بکہ کے اُن سے پیچھا تھوڑی چھڑا سکتی ہو۔ یہ تو تمہاری جان پر سوار رہیں گے۔ انسانی زندگی کا مرکزی مسئلہ یہ ہے کہ کس سے اور کن کیفیات کے ساتھ جوڑا کھائے۔ کیسا بر ڈھونڈھے کہ بہترین اولاد پیدا ہو اور عالم دنیا کا چمن گلزار ہو۔

بانو۔ اب یہ لکچر کبھی ختم بھی ہوگا۔ پائپ کی ٹونٹی کھل گئی۔ پانی پڑا بہا کرے گا۔ اللہ اس ٹونٹی کو بند کرو۔ ہاں تو اُن بیوی پر کیا گزری؟

زلیخا۔ ہاں تو جب شوہر کے پاس جاتی تھیں تو یہ محسوس کرتی تھیں کہ بدکاری کی۔ شادی کے پانچ سات برس اسی طرح گزرے۔ بُری زندگی نے بے دین اُنھیں بنا دیا مگر بدخو نہیں۔ عادات و اطوار بالکل درست۔ رجحانات طبیعت نہایت پاکیزہ۔ ہر پسندیدہ کام میں ایک حسن دکھائی دینا اور لطیف کیفیات محسوس کرنا۔ ادھر میاں کا یہ قصہ ہوا کہ اپنے گھسیارے کی جورو پر عاشق ہو گئے۔ ایک روز رات کو جب گھسیارہ اپنے گاؤں گیا ہوا تھا ان کی معشوقہ کوٹھری کی دہلیز پر کنگھی چوٹی کئے ملتھے پر ٹکلی لگائے بیٹھی زور زور گا رہی تھیں۔ عاشق صاحب نے اپنی کوٹھی کے کمرے سے سُنا۔ دل میں سمجھے گانا نہیں ہے معشوق کو عاشق کی طلب ہے۔ فوراً اٹھ کھڑے ہوئے۔ اور وہاں پہنچے۔ کوٹھری میں دونوں داخل ہوئے اور اندر سے کنڈی بند ہو گئی۔ عین اُسی وقت گھسیارہ بھی آگیا اور کوٹھری کے دروازے سے لٹھ چھوٹا سا ڈنڈا ہاتھ میں لئے کھڑا ہو گیا۔ عاشق اپنا عشق ختم کرکے جب نکلے تو ایک ایسا ڈنڈا اُن کے سر پر اُس نے رسید کیا کہ وہیں وہ ڈھیر ہو گئے۔ گھسیارے کو کسی دوسرے آدمی کا خیال تھا۔ جب دیکھا کہ مالک صاحب ہیں تو اُس کے حواس جاتے رہے اور بغیر بیوی کو صورت دکھائے بھاگا۔ یہ رات بھر بیہوش رہے۔ صبح اٹھ کے فکر کی کہ اس قصہ کی کسی کو خبر نہ ہو۔ اُن کی نزدیک قصہ چھپ گیا مگر واقعتاً بچے بچے کو خبر ہو گئی۔ بیوی یوں ہی بہت خوش تھیں!! یہ قصہ سن کے کتنی اور خوشی ہوئی ہوں گی، بس سمجھ لو۔ اس واقعہ کے بعد تو بالکل ہی شوہر وار بیوہ بن کے رہ گئیں۔ جس طرح کسی مرد میں رجولیت غائب ہو جاتی ہے اُن میں نسائیت غائب ہو گئی۔ یعنی جنسی خواہشات دبتے دبتے مردہ ہو گئیں۔ بہت سی نیک بیویاں ان حالات میں اپنا وقت نماز روزہ میں صرف کرنے لگتی ہیں۔ لیکن اُن کا وقت آراستگی جذبات اور ذہن کی صیقل میں صرف ہونے لگا۔ ایک عجیب خیال وہ اپنے دماغ میں رکھتی تھیں وہ یہ کہ عبادت شہوانی خیالات کو برانگیختہ کرتی ہے اس لئے عبادت سے اُنھیں نفرت تھی۔ میں نے جو سوچا تو میں بھی اسی نتیجہ پر پہونچی کہ عبادت مرد کو عورت کی طرف اور عورت کو مرد کی طرف راغب کر دیتی ہے۔ مگر اس قسم کی رغبت تو بجائے خود عبادت ہے۔

بانو۔ اپنی رائے پھر بتانا، پہلے قصہ ختم کرو۔

زلیخا۔ ہاں تو ایک روز اُن بیوی نے خواب دیکھا کہ کروٹ سے لیٹی ہوئی ہیں اور ایک اچھا خاصہ حسین دراز مرد اُن کے پاس آتا ہے، اور آنے کے ساتھ جمپر کے اندر منہ ڈال کے دودھ پینے لگتا ہے۔ اِن کو کچھ ہنسی آتی ہے اور کچھ غصہ۔ ہٹانا چاہتی ہیں تو وہ اپنے قوی ہاتھ سے نیچے کا دھڑ دبا لیتا ہے۔ اس کے سخت ہاتھ سے ان کے جسم کا گداز حصہ دبتا ہے تو ایک قسم کی لذت محسوس ہوتی ہے۔ اسی حالت میں آنکھ کھل گئی۔ لاحول پڑھنے لگیں۔ مگر طبیعت میں سخت ہیجان۔ خیر گئی گزری بات۔ اس خواب کا ذکر بھی کسی سے نہیں کیا۔ آٹھ دس روز کے بعد ایک روز نو دس بجے شب کو چاندنی رات میں وہ اپنی خالہ کے یہاں سے کار پر آرہی تھیں، دریا کے پُل پر گاڑی پہنچی تو دیکھا کہ ایک شخص پُل کی فصیل کے بیچوں بیچ پتھر کے مونڈھے کے اوپر چڑھا بیٹھا ہے۔ ایک پتھر اچھا خاصہ بڑا ایک رسی سے بندھا پاس رکھا ہے۔ اور اُسی رسّی کے دوسرے سرے کو اپنے پیر میں باندھ رہا ہے۔ چاندنی چونکہ خوب کھلی ہوئی تھی اس لئے یہ سب دکھلائی دے گیا۔ عین پل کے بیچوں بیچ اور اس آدمی کے بالکل ہی پاس گاڑی جس وقت پہنچی تو یکایک گاڑی کا بھوب بجا اور گاڑی ڈرائیور نے فوراً روک دی۔ اس آواز سے اور گاڑی کے وہاں رکنے سے وہ آدمی سٹ پٹا سا گیا۔ یہ بیوی چونکہ اُس شخص کو دیکھتی چلی آرہی تھیں فوراً گاڑی سے اُتر کر اُس کے پاس گئیں اور پوچھا تم کون ہو، اور کیا کر رہے ہو۔ اُن کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب اُنھوں نے دیکھا کہ اُس کی صورت خواب والے آدمی سے بہت ملتی جلتی ہے۔ اُنھوں نے

اُس سے کہا "میں تمھارے پاس بھیجی گئی ہوں"۔ اُنھوں نے اس معنی میں کہا تھا کہ اتفاقات کا اکٹھا ہونا غیبی انتظام کی دلیل ہے۔ لیکن اُس شخص نے دوسرا مطلب سمجھا۔ پوچھنے لگا "کیا کہا ہے" یہ فوراً تاڑ گئیں اور کہا "تم وہاں سے اُترآؤ تو کہوں" جیوں ہی وہ اُترا انھوں نے گھسیٹ کے اُسے موٹر میں بٹھا دیا۔ تھوڑی دیر میں اسٹیشن وسیل لگ گیا اور گاڑی روانہ ہوئی۔ جب کار روانہ ہو ئی تو آدمی نے فوراً پوچھا "بتایئے کیا کہا ہے"۔

یہ بیوی۔ کس نے کیا کہا ہے؟

آدمی۔ اُنھوں نے

یہ بیوی۔ میں کسی کو کیا جانوں۔ مجھے تو غیبی مشیت نے تمہاری جان بچانے کے لئے بھیجا تھا۔

آدمی۔ (دیوانہ وار طیش میں آکر) غیبی مشیت بی ڈیمنڈ۔ میری اس غیبی مشیت ہی سے تو جنگ ہے۔ آپ اس کی ایجنٹ ہو کر آئی ہیں۔ آپ پر بھی لعنت۔ مجھے جانے دیجئے۔ روکو گاڑی!! اگر گاڑی نہ رُکی تو میں پھاند پڑوں گا۔

ان بیوی کی دلچسپی اس شخص کے ساتھ اس گفتگو سے بہت زیادہ ہو گئی اپنے ہاتھ سے اُس کے پریشان بال برابر کر کے نہایت ملائمت سے، کندھے پر ہاتھ رکھ کے کہا "میں بھی مشیت سے بغاوت پر تلی ہوں۔ آپ ہی اکیلے باغی نہیں ہیں"۔ اس جملہ نے اُس پر بجلی کا اثر کیا۔ جیسے سخت تنی رسّی کسی کاری ضرب سے یکایک ٹوٹ جائے۔ وہ آدمی ٹوٹ سا گیا۔ جذبات کی کھنچی طنابیں ڈھیلی پڑ گئیں۔ زار و قطار رونے لگا۔ ان بیوی کا دل بھی نہ معلوم کیوں بھر آیا۔ اِن کے بھی آنسو بہنے لگے۔ یہ ہوہی رہا تھا اور اس میں دو تین منٹ گزرے ہوں گے کہ گاڑی مکان پہنچ گئی۔

جب منہ ہاتھ دھو کے یہ اتفاقی مہمان اور میزبان چار پینے بیٹھے تو گفتگو شروع ہوئی۔ میزبان نے مہمان سے بغاوت کا باعث پوچھا۔

مہمان۔ سبب بغاوت یہی ہے کہ اپنی ہی زندگی اپنے قابو میں نہیں: آدمی کیوں جئے! کس لئے جئے! (کچھ وقفہ کے بعد) کیوں کسی سے محبت ہو! ایک لڑکی مجھ پر عاشق ہوں۔ اس کی شادی ایک اور شخص کے ساتھ ہو گئی ہے۔ میرا دنیا میں کوئی رفیق و شریک نہیں۔ میں اس بھیانک وسیع دنیا میں اکیلا اور تنہا ہوں۔ میرے دل کا رابطہ کسی چیز اور کسی شخص سے نہیں رہا۔ میں کیوں جیوں۔ مشیت کو کیا حق ہے کہ میرے زندہ رہنے رہنے پر اصرار کرے۔

میزبان۔ دیکھئے! میں شوہر دار عورت ہوں۔ باپ بھی رکھتی ہوں۔ ماں بھی۔ دونوں جان سے زیادہ مجھے عزیز رکھتے ہیں۔ کسی چیز کی مجھے کمی نہیں۔ پھر بھی میں باغی ہوں۔ میری بغاوت دیوانہ وار آپ کی سی نہیں ہے۔ میں کسی پر عاشق نہیں۔ نہ مسلک عشق پر میرا عقیدہ ہے۔ عشق دل بہلانا اور مزیداری ہے۔ خود غرضی کی بنیاد پر اس کی عمارت بنتی ہے۔ عیش پرست اور عاشق تن میں میرے نزدیک کوئی فرق نہیں۔ میں مسلک عشق کی بالکل قائل نہیں: میں کیا کہوں عاشق سے مجھے مطلق ہمدردی نہیں ہوتی۔ میرے شوہر اپنے گھسیارے کی بیوی پر عاشق ہو گئے تھے۔ خیر میرے آپ کے درمیان ایک چیز عام ہے۔ یعنی بغاوت۔ اسی کی بنا پر مجھے آپ سے دلچسپی ہوئی تھی۔ آپ عشق کا قصہ لے کے بیٹھ گئے۔ دلچسپی جاتی رہی۔ عشق!! زندگی ایسی متبرک اور عظیم چیز کو ایک محض جھلک صرف نظر کی پسندیدگی یعنی حسن کے تابع کرنا کتنا ہیبت ناک اور حقارت دینے والا خیال ہے! حسن ہے کیا! فرانسیسی کارٹون بنانے والا اسم (Sem) اپنی پنسل کی چند شوشوں سے جسے ملیامیٹ کر دے۔ میگنفائنگ گلاس جسے خاک میں ملا دے انسانی زندگی اُس کے تابع کی جائے۔ کیا مذاق ہے۔

مہمان۔ اچھا آپ کی بغاوت کس بنا پر ہے؟

میزبان۔ میری بغاوت تو اس بنا پر ہے کہ شرع و آئین۔ دستور، و رواج کے تابع مشیت نے انسانی زندگی کو کیوں کیا ہے۔ انسانی زندگی ان کی حاکم ہو نہ کہ محکوم۔ اسی قسم کی اور چند باتیں ہوئی ہوں گی۔ ان باغی بیوی سے مرعوب ہو کر مہمان صاحب جو گھر سے جان دینے نکلے تھے صحیح سالم جان لئے واپس گئے۔ ان بیوی نے عاشق مہمان کو قائل اور مرعوب تو کر دیا، مگر اس کی جاں بازی کا سکہ اُن کے دل پر جم گیا۔ کبھی اپنے خواب کو یاد کرتی ہیں اور کبھی اس ملاقات کو۔ یہی چائے کی پیالی لینے والا ہاتھ تھا جس نے خواب میں رانیں چھوئیں بلکہ کس کے دبائیں۔ یہی مہمان چہرہ تھا جو خواب میں اس کی چھاتیوں سے ملا۔ ان خیالات نے آتا فاناً میں اُس کی مردہ نسائیت میں کئی جانیں ڈال کے زندہ کر دیا۔ سب خیالات اور دلیلیں ایک طرف جا پڑیں نہ مرد کی کشش اکیلی ایک طرف۔ اس کشش سے

جو آگ پیدا ہوئی۔ اس کے سامنے جو خیال آئے بھک سے جل جائے۔ نشان تک نہ باقی رہتا۔ کس مشکل سے رات گزری! دوسرے دن آنے کا وعدہ کرکے گئے تھے انھیں بھی چین نہ آیا۔ وقت سے پہلے پہنچ گئے۔ اس بلند مرتبہ اور بردبار عورت کے سامنے جس حُسن پر جان دینے کو میاں تیار ہوئے تھے محض دھوکہ نظر آنے لگا۔ جانباز نر کے لئے جان پرور مادہ درکار ہے مشیت نے نر کو مادہ سے ملا دیا۔ نہ اُن کو مشیت سے شکایت رہی۔ نہ انکو شریعت سے۔ طلاق تو بعد میں ہوتی رہے گی۔ یہ دونوں مِل گئے اور چہ میگوئیاں کرنے والے چہ میگوئیاں کرتے رہے۔ لمحہ کے لمحہ قصہ ختم کرکے زلیخا بُر کی ہتی کہ کچھ دل میں آیا تو تھرک کے توڑا لیا اور گانا شروع کیا "کیا سو ہے رام ملنے کی بیری۔ آج سہاگ کی رین اجیری" ہن میت راگ کے ڈھنگ کی۔ ما ما۔ پا پا۔ دھا دھا نی نی سا (سم) رے سا۔ نی دھا پا گا ما گا رے سا۔ کیا سو ہے رام ملنے کی بے (سم) اسرا درا لمعب کی بنڈ نے بڑا مزا دیا۔

فریبِ دوستی

یہ لفظِ دوستی ایجاد ہے مطلب کے بندوں کی
وفا کے قاتلوں کی تن کے اُجلے من کے گندوں کی

اِسے سُن کر مرے معصوم جذبے کانپ جاتے ہیں
میں جن کو بھول جانا چاہتا ہوں یاد آتے ہیں

شرافت جب یقیں کرتی ہے اس کی خیر خواہی کا
ذریعہ بن کے رہتا ہے یہ انساں کی تباہی کا

یہ ہے وہ لفظ جو شرمندۂ معنی نہیں ہوتا
یہ سب کچھ ہے بظاہر، اصل میں کچھ بھی نہیں ہوتا

جو سچ پوچھو تو یہ عنوانِ رنگیں ہے عداوت کا
کہ اس پردے میں اکثر خون ہوتا ہے شرافت کا

جو میرا بس چلے تو دوستی کو جرم ٹھیرا دوں
ملیں پرچم کُشا اس کے تو دیواروں میں چنوا دوں

لغت سے چھیل ڈالوں اور زبانوں پر نہ آنے دوں
دماغوں تک یہ زہریلا دُھواں ہرگز نہ جانے دوں

فریبِ دوستی اے یارِ مطلب دوست رہنے دے
تھپیڑے بیکسی کے میں اگر سہتا ہوں سہنے دے

یہ اظہارِ سخا خلق و مروت میں نہیں آتا!
میں ہرگز اس ترے رعبِ امارت میں نہیں آتا

جو ظاہر دار ہے وہ مردِ کامل ہو نہیں سکتا
تو شاعر کی طرح اک صاحبِ دل ہو نہیں سکتا

نتیجہ میں نے تیری دوستی سے یہ نکالا ہے
ہے دشمن آج دشمن اور تو کل ہونے والا ہے

بناوٹ کی بناوٹ دل کی قیمت دل سمجھتا ہوں
جو جس قابل ہے میں اُس کو اُسی قابل سمجھتا ہوں

زر و گوہر کی ضَو پر رُوحِ شاعر جھک نہیں سکتی
یہ وہ کشتی ہے اِن طغیانیوں سے رُک نہیں سکتی

(احسان دانش)

سوشلسٹ کانگریسیوں کی زبان

امام اکبرآبادی

باز گواز نجد از یارانِ نجد

اقلیتوں کو مطمئن کرنے کیلئے زبان و رسم الخط کے تحفظ کے باب میں کانگریس کا رزولیوشن یہ ہے۔

"ملک کی وہ زبان ہوگی جو عموماً شمالی ہند میں بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ خواہ وہ دیوناگری میں لکھی جائے یا اردو رسم خط میں"۔

اس کی بارہا تصریح کانگریس کے پلیٹ فارم سے اور مرکزی دفتر سے بھی کی گئی۔ قائدِ اعظم مہاتما گاندھی نے بھی دبی زبان سے طفل تسلیاں دیں۔ صدر نے بھی اعلانات کئے۔ اور ذمہ دار ہند و لیڈروں نے بھی اقلیتوں کو مطمئن کرنے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگایا۔ حتیٰ کہ میرے ایک مضمون پر توجہ دلانے سے کانگریس کے جنرل سکرٹری نے بھی اخبارات کے ذریعہ ماتحت کمیٹیوں کو آگاہ کیا کہ جملہ کارروائیاں اردو ہندی دونوں رسم الخط میں کی جائیں۔ لیکن وہاں

کون سنتا ہے کہانی میری؟ اور پھر وہ بھی زبانی میری!

ڈاکٹر کے ایم اشرف۔ اچاریہ نریندر دیو۔ ڈاکٹر زیڈ۔ اے احمد۔ ڈاکٹر رام منوہر۔ سجاد ظہیر بیرسٹر۔ ہرش دیو مالوی وغیرہ کی تشریف آوری پر آگرے کی کانگریس سوشلسٹ پارٹی نے ایک جلسہ ۱۱ر اکتوبر کو کیا۔ تقریروں میں جو زبان بولی گئی، وہ ملکوتی زبان تھی۔ اور اُس کے متعلق جو اشتہارات شائع کئے گئے وہ جناتی زبان میں تھے۔ ملاحظہ ہو۔

"آگرہ میں سماج وادی بھاشننز"

"لگاتار چھ دن تک"

"اکھل بھارتیہ سماج وادی نیتاؤں کے دوارا"

"ہمیں جنتا کو یہ سوچنا دیتے ہوئے پرسنتا ہوتی ہے کہ تاریخ ۱۱ر اکتوبر سے برابر چھ دن تک اکھل بھارتیہ سوشلسٹ نیتا راج نیتی کے انیک وشوں پر اپنے ستارگربھت اور ودتا پورن بھاشننز دیں گے۔ آگرے کی جنتا کے لئے یہ اپور وادسر ہے کی دے دیش کے وِگج سوشلسٹوں کے سمپرک میں آکر یہ سمجھ لیں کہ برٹش سامراج واد کو کس پرکار اکھاڑ پھینکنا چاہیئے۔ بھاشنوں کے وشے:

"کمیونزم۔ سوشلزم۔ پونجی واد۔ ورگ یدھ۔ سامراجیہ واد۔ فیسزم۔ نرم وگرم دل۔ فیڈریشن۔ کسان۔ کرانتی۔ وشو شانتی کی سمسیا۔ ودیارتھی اندولن۔ کسان بز دور۔ زدلن۔ روس کی کرانتی۔ سماج وادی روس۔ انترراشٹریہ۔ نرستھت۔ آدی۔ آدی"۔

بھاشننز میں پرویش چار آنے کے ٹکٹ سے ہوگا۔ آپ کو ٹکٹ ہر یہ مکھ کانگریس ودیارتھی کاریہ کرتا۔ تتھا وارڈ شہر کانگریس کمیٹی کے دفتر دوارا مل سکتا ہے۔ جن نیتاؤں کے آنے کی آشا ہے۔ اُن کے نام اس پرکار ہیں"۔

" ڈاکٹر اشرف۔ کے ایم۔ آکھا کانگریس کے راج نیتک وبھاگ کے پردھان۔

" آچاریہ نریندر دیو۔ اکھل بھارتیہ کانگریس سوشلسٹ پارٹی کی کاریہ کارنی کے پرمکھ سدسے تتھا کانگریس کارِیہ سمتی کے بھوت پورو سدسے۔

ڈاکٹر زیڈ اے۔ احمد۔ اکھل بھارتیہ کانگریس سوشلسٹ پارٹی کی

کارِ کارنی کے سدسے تھا۔ آ۔ بھا۔ کانگریس کمیٹی کے ارتھک دیاگ کے بھوت پورو۔

"ڈاکٹر رام منوہر لوہیہ۔ اکھل بھارتیہ کانگریس کمیٹی کے ودیدیکشیا دبھاگ کے منتری تھا۔ آ۔ بھا کا سوشلسٹ پارٹی کی کارِ کارنی کے سدسے۔

"کا۔ سجاد ظہیر بار ایٹ لا۔ آ۔ بھا کا سوشلسٹ پارٹی کی کارِ کارنی کے سدسے۔

"کا۔ ہرش دیو مالوی۔ یو۔ پی کسان سبھا کی کارِ کارنی کے پرکھ سدسے۔

"دھیان رہے، یہ بھاشن ۱۱ر اکتوبر سے شام کو ۵ بجے سے ۸ بجے تک ہوں گے۔ آستھان کی سوچنا شگر دی جائے گی۔ یہ بھاشن شہر کانگریس کمیٹی کانگریس سوشلسٹ پارٹی اور آگرہ ودیارتھی سنگھ کے سنیکت پلیٹ فارم پر ہوں گے"

مہادیو نرائن ٹنڈن

پردھان منتری کانگریس سوشلسٹ پارٹی آگرہ

پڑھئے۔ جل جلالہٗ

یہ ہے اشتہاری زبان، اور یہ ہے شمالی ہندوستان کی زبان۔ یہی وہ زبان ہے جو گاندھی جی۔ صدر کانگریس، اور ذمہ دار لیڈروں کے منہ میں ہے۔ یہی زبان اسکولوں۔ کالجوں اور سرکاری دفاتر کی ہوگی۔ اور یہی زبان تمام ملک کی زبان ہوگی۔ اب اگر مسلمانوں میں یا مسلم لیگ میں دم ہے، جناح صاحب میں یا ان کے ہمنواؤں میں طاقت ہے تو اس آنے والے سیلاب ہی کو روک کر طاقت آزمائی کرلیں۔ مگر بے اثر زبانوں اور کھوکھلے سینوں میں دم کہاں؟ یہ تو "لاٹھی" اور "بھینس" کا فلسفہ ہے۔ اِس فلسفہ کے مقابلہ پر، حقوق، مطالبات، انصاف۔ عدل، اخلاقیات وانسانیات، سب غلط اور محض بیکار ہیں۔ یہی ایک فلسفہ ہے جس کے ذریعے وسیع ترین سلطنتیں قائم کی گئی ہیں۔ اور کی جائیں گی۔ مگر "لاٹھی" اور "بھینس" کے فلسفے کو انسان نے ہمیشہ اپنے ذاتی مفاد اور ذاتی اغراض کے مقابلہ پر بُھلایا ہے۔ پھر مسلم لیگ کیوں نہ بُھلادے؟

آنے والی نسلیں کہیں گی کہ اردو زبان کا بیج چند صدی پہلے خسرو نے ڈالا تھا۔ پر ابوالکلام آزاد نے اور محمد علی جناح نے اس بیج کے ہونہار پودے کو جڑ سے اُکھڑوا دیا۔ اور آہ تک نہ کی۔

یہ سچ ہے کہ اسلامی سلطنتوں کو تباہ کرنے والا ہندو نہیں۔ حجاز کے ٹکڑے ٹکڑے کر دینے والا ہندو نہیں۔ اور مسلمانوں کا "بڑا دشمن" بھی ہندو نہیں۔ یہ سچ ہے کہ "بڑے دشمن" کو مٹانے کے لئے "چھوٹے دشمن" سے تعاون کرلینا چاہیئے۔ لیکن جب دونوں دشمن مل جائیں تو بتاؤ کہ تلوار بکف دشمن بہتر ہے یا خنجر بہ آستین دوست؟

بہت نازک مسئلہ ہے۔ بڑا اہم معاملہ ہے۔ لیکن بولنے کے وقت چُپ رہنا، اور چُپ رہنے کے وقت بولنا نادانی ہے۔ اس لئے کہا جاتا ہے کہ کانگریسیوں کو اپنی روش پر غور کرنا چاہیئے۔ اور سوشلسٹ کانگریسیوں کو خصوصیت کے ساتھ اپنا جائزہ لینا چاہیئے کہ اُن کی یہ طفلانہ حرکات کانگریس کے مواعید و اعلان کے بالکل خلاف ہے۔ ایسی زبان لکھنے اور بولنے والے جو مندرجہ صدر اشتہار کی ہے، نہ صرف کانگریس کے دشمن ہیں، بلکہ ملک کے لئے ہلاکت خیز ہیں۔ میں کہتا ہوں اور بار بار کہوں گا کہ شمالی ہند کی ہرگز یہ زبان نہیں جو اشتہار کی ہے۔ یہ کیا ہے کہ سوشلزم کا دعویٰ اور ترکی زبان میں! اگر یہی روز و شب ہے تو وہ دن جلد آنے والا ہے کہ طالب کی عربی زبان ہوگی اور مطلوب کی ترکی۔ پھر باہم محبت کے جذبات کا اظہار کیونکر ہوگا کہ

"زبانِ یارِ من ترکی و من ترکی نمیدانم"

میرے اس نوع کے مضامین سے بعض باطل اندیش و کوتاہ بین کانگریسی اغلباً مجھے غدار سمجھتے ہوں گے۔ لیکن ان کو چاہیئے کہ وہ میری آنکھ کا تنکا دیکھنے سے پہلے اپنی آنکھ کے شہتیر پر نظر ڈال لیں۔ زبان کے باب میں میں نے ابتک جو کچھ لکھا ہے وہ کانگریس کی بہبودی کو مدنظر رکھکر لکھا ہے۔ اور آئندہ بھی اسی خیال کے تحت لکھوں گا۔

فیضی حریفِ مجلسِ رنداں بود مدام
ہرگز قدم ز دائرہ بیروں نماندہ است

اہلِ قلم حضرات

مضمون صاف تحریر فرمایا کریں۔ اور بہتر یہ ہے کہ اگر کاغذ پتلا ہو تو ایک ہی طرف تحریر کیا کریں۔ اور مضمون کے اول یا آخر میں اپنا پورا نام اور پتہ تحریر کریں۔ ورنہ مضمون بغیر نام کے ہی شائع کردیا جائے گا۔ منیجر

جمال آرا کا اعترافِ شکست

سید عزت علی الہ آبادی

شباب کے وہ جذبات جو ہر انسانی زندگی کو دنیائے حسیات بنا دیتے ہیں جمال آرا کے دل میں بھی متلاطم ہیں۔ اس وقت جبکہ وہ فلسفۂ حسن و عشق پر ایک بسیط و رنگین مضمون لکھنے میں ہمہ تن مصروف ہے۔

سورج کی رخصتی شعاعیں کمرے کے سامنے والے درخت کی چوٹی کو ایک نمایاں خصوصیت دیتے ہوئے الوداع کہنا ہی چاہتی تھیں۔ ماحول کی معطر فضا بیلے کی خوشبوؤں سے معطر رفتہ رفتہ تاریکی میں تحلیل ہو ہی رہی تھی کہ جمال آرا نے مسودے کو بند کر کے ایک ہلکی سی انگڑائی لی۔ اور اُٹھ کھڑی ہوئی۔ کچھ دیر تک کسی گہرے خیال میں مستغرق گملے کے پھولوں سے لدے ہوئے پودوں کو تکتی رہی۔ آخر اُس نے کہا۔

"اگر محبت اسی جذبۂ آتشیں کا نام ہے تو میں اسے ایک قسم کی بیماری کہوں گی۔ جو انسان کی حسیات سے متعلق رہے"۔

وہ پھر خاموش ہو گئی اور ایک عمیق تخیل میں غرق، آخر اُس نے یکایک اپنے بائیں ہاتھ کی نازک کلائی کو ایک ہلکی سی جنبش دی اور گھڑی کو دیکھا۔ "ساڑھے چھ" "مجھے کلب جانا چاہیئے آج کس قدر دیر ہو گئی"۔

جمال آرا ایک تعلیم یافتہ نوجوان تھی جس نے اسی سال مقامی کالج "کراستھویٹ" سے بی اے کی ڈگری حاصل کی تھی۔ اس کی اعلیٰ ذہنیت، فلسفیانہ خیالات، ذوقِ ادب، مخصوص طرزِ انشا، اور ساتھ ہی اس کا ملکوتی اور معصوم حسن۔ یہ تھیں وہ خصوصیات جنھوں نے اسے بہت مشہور اور ہر دلعزیز بنا رکھا تھا۔ ہندوستان کی قدیم رسوم سے اسے سخت جلن تھی۔ وہ ہمیشہ کلب جاتی ٹینس کھیلتی۔ سیاسی معاملات میں دلچسپی لیتی، اور فنونِ لطیفہ میں مردوں کے دوش بدوش رہتی۔ وہ ایک آزاد خیال لڑکی تھی۔ اس درجہ آزاد خیال کہ اس کی رائے ہمیشہ اپنی رائے ہوتی۔ وہ جو کچھ کرتی نہایت بیباکی اور استقلال سے کرتی۔ اُس کے والدین اس کے معاملات میں قطعی دخل نہ دیتے اس لئے کہ وہ سمجھتے تھے کہ جمال آرا اُن کی بہ نسبت اپنے معاملات بہتر سمجھ سکتی ہے بلکہ وہ اکثر اپنے معاملات میں اس سے رائے لیتے اور وہ نہایت آسانی سے پیچیدہ معاملات طے کر دیتی کہ وہ عش عش کرتے رہ جاتے۔

اس کی قابلیت اور شہرت سے الہ آباد میں اس کی دھوم مچ گئی اور جیسا کہ قاعدہ ہے اعلیٰ سوسائٹی کا ہر فرد اس پر اس طرح گرنے لگا جس طرح شمع پر پروانے۔ دولت۔ شہرت۔ قابلیت اور حسن .... ایک عورت کی تکمیل کے لئے اور کسی چیز کی ضرورت ہے؟ ہر ایک اپنے دل سے یہ سوال کرتا اور اپنے کو جمال آرا کا گرویدہ خیال کرتا۔ رہا عصمت و عفت کا سوال سو اول تو نئی سوسائٹی میں یہ خیال ہی فرسودہ خیال کیا جاتا ہے۔ اور اگر بالفرض جمال آرا کو کوئی اِس نقطۂ نظر سے دیکھے تو وہ متحیر رہ جائے گا کہ باوجود اس قدر مغربی تہذیب کے رنگ میں رنگے ہونے کے وہ قطرۂ شبنم سے زیادہ پاکیزہ۔ کلی سے زیادہ معصوم اور چاندنی سے زیادہ بے داغ تھی۔ کیونکہ وہ اس آزادی اور تعلیمِ نسواں سے غلط فائدہ نہیں اُٹھا رہی تھی۔ وہ اس کی اہل تھی۔ وہ مردوں کو مردہ دل کہا کرتی۔ خدا معلوم کیوں؟

(۲)

اگر کوئی انسان اپنا مقصدِ حیات صرف یہ سمجھتا ہے کہ وہ کھائے پیئے اور اپنی طبعی عمر کو پہنچکر مرجائے تو میرے خیال میں وہ انسان زیادہ صحیح الفاظ میں حیوان کہا جاسکتا ہے جنسِ لطیف کے لئے یہ مخصوص انتہائی بدقسمتی ہے، خواہ مخواہ یہ تسلیم کرلیا گیا ہے کہ عورتوں کے لئے مردوں کا محکوم ہونا بھی فطری امر ہے۔ یہ خیال عورتوں کی ذہنیت میں اس قدر مستقل ہوگیا ہے کہ جن ملکوں میں عورتیں کسی حد تک آزاد ہیں وہاں بھی اُن کا مقصدِ حیات نہیں بدلا۔

شادی کرنا ہر عورت کے لئے ایسا ہی ضروری ہے جیسا زندگی برقرار رکھنے کے لئے کھانا، اور شادی کی غرض و غائت محض یہی دو ہوتے ہیں کہ یا تو اولاد پیدا کی جائے یا نفس پرستی۔ (جسے اکثر کوتاہ اندیش محبت سے تعبیر کرتے ہیں) میری سمجھ میں نہیں آتا کہ ہر انسان کے لئے شادی کی کیا خاص ضرورت پیش آتی ہے؟

اس سے میرا مطلب یہ نہیں کہ شادی کرنا ہی نہیں چاہیئے۔ کرنا چاہیئے۔ مگر اصول کے ماتحت۔ مثلاً فرض کیجئے کوئی شخص (مرد یا عورت) اکیلا ہے اور اُس کی زندگی بلا کسی ہمدم و غمخوار کے تلخ ہے تو اُسے اختیار ہے کہ وہ اپنے مزاج و حیثیت کے موافق کسی کو شریکِ زندگی بنائے اور بصورت تقضاءِ جنس شادی بھی کرے تو مضائقہ نہیں۔ یا فرض کیجئے کوئی بے یار و مددگار ہے اور بڑی مشکل سے گزر اوقات کرسکتا ہے تو اس صورت میں اگر وہ مرد ہے تو ایک ذی استطاعت عورت کا یہ انسانی فرض ہے کہ وہ فوراً اس سے شادی کرے۔ اور اس کی زندگی کو خوشگوار بنانے میں کوشاں ہو۔ اور اگر وہ مرد ہے مرد کا بھی یہی فرض ہے۔ اگر کسی کے لئے ڈاکٹروں نے تندرستی کے لئے شادی کرنا ضروری تبلا دیا ہے تو وہ بھی شادی کرسکتا ہے۔

اس کے علاوہ اور بہت سی صورتیں ہوسکتی ہیں جس سے شادی کرنا لاحق ہوسکتا ہے۔ لیکن یہ کہ ہر عورت یا مرد کو شادی کرنا لازم ہی ہے۔ ایک مہمل اور تباہ کن اصول ہے جو ہزارہا بدامنیوں اور تغیرات کا حامل ہے۔

یہ تھے وہ الفاظ جو جمال آرا نے اپنے مکان پر دو ایک دوستوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہے جنھوں نے کسی خاص مصلحت سے مسئلۂ ازدواج پر اس کی رائے چاہی۔

اس کی تقریر مسلسل تھی اور پُرلطف۔ مسٹر قاسم اور مسٹر شوکت حیرت سے اُس کی عجیب و غریب تقریر سُن رہے تھے۔ بالآخر جب وہ رُکی تو قاسم نے کہا۔ آپ نے فرمایا کہ شادی کرنا بُرا نہیں مگر اصول کے ماتحت۔ مثلاً انسانی ہمدردی کے طور پر، ضرورت کی بنا پر وغیرہ ———— کیا میں دریافت کرسکتا ہوں کہ اس ضرورت کے ضمن میں محبت بھی آسکتی ہے یا نہیں؟ جو بذاتِ خود ایک قسم کی مجبوری ہے"

آپ کے خیال کے پہلے حصے سے تو مجھے اتفاق ہے۔ جمال آرا نے مسکراتے ہوئے کہا" مگر دوسرے حصے سے اسی قدر اختلاف"

اس کی کوئی وجہ ہوگی۔

بیشک ایک مستقل وجہ، اس سے مجھے اتفاق ہے کہ محبت ایک جذبۂ ناگزیر، ایک مجبوری ہے لیکن محبت کا اقتضا رشادی کرنا تو نہیں بلکہ ایک دوسرے کی ہستی میں گُم ہوجانا ہے۔ یاد رکھئے۔ اگر جذبۂ محبتِ حقیقی ہے تو اس کے لئے ہجر و وصال دونوں یکساں ہیں۔

"اس کی دلیل اور مثال" قاسم نے وکیلانہ لہجہ میں کہا

"اس کی دلیل انسانی فطرت ہے جو قدرتاً یکسانی پسند نہیں ہے۔ وہ ایک چیز کو دیکھتے دیکھتے عادی ہوجاتی ہے۔ اور ایک چیز کا ذوق شوق رفتہ رفتہ بدشوقی اور بالآخر نفرت میں تبدیل ہوجاتا ہے۔ چنانچہ شادی ہی کو لیجئے۔ دنیا میں کتنے انسان ہیں جو ازدواج میں کامیاب خیال کئے جاتے ہیں۔ میرے خیال میں آپ انگلیوں پر گن سکیں گے۔ اور کتنی شادیاں ہیں جن کے نتائج طلاق کی صورت میں رونما ہوئے ہیں۔ شاید آپ عمر بھر حساب نہ لگا سکیں گے۔ کون سی ایسی ہستی ہے جو بعد شادی تندرست ہے؟ کیا میں بر سر غلط ہوں؟"

"جی نہیں بر سر غلط نہیں کہا جاسکتا۔ لیکن آپ کے اصول ہیں دنیا سے نرالے اور ناقابلِ عمل"

" اب آپ نے یہ پہلو نکالا۔ جمال آرا نے قہقہے کے ساتھ کہا۔ اچھا یہ اگر دنیا سے نرالے ہیں تو ہوا کریں مگر میں آپ سے یہ دریافت کرتی ہوں کہ آپ انھیں ناقابلِ عمل کیوں قرار دیتے ہیں؟

ناقابلِ عمل۔ قاسم نے رُکتے ہوئے کہا۔ مگر میں آپ سے دریافت کرتا ہوں یہ دنیا سے نرالے ہیں"

" تو ناقابلِ عمل سمجھنے کی کوئی خاص وجہ نہیں ہوئی۔ ہر نیا اصول ابتداً میں دنیا کو نرالا اور عجیب معلوم ہوا ہوگا۔ لیکن ہزارہا اصول ہیں جن پر دنیا.....؟

مس جمال آرا۔ جانے دیجئے آپ بمشکل مسٹر قاسم کو خاموش کرسکیں گی۔ اُن کے بشرے سے میں پہچان رہا ہوں کہ وہ آپ کے نظریات کے قائل تو ضرور ہو گئے ہیں۔ لیکن ابھی کئی گھنٹہ آپ سے بحث کرنے کے لئے تیار ہیں۔ اور شوکت نے بہ انداز مسخر اپنی کلائی پر گھڑی دیکھتے ہوئے کہا۔ نو تو فی الحال بج چکے ہیں۔"

معاف کیجئے گا شوکت صاحب مجھے معلوم نہ تھا کہ آپ اس مسئلہ میں کوئی دلچسپی نہیں لے رہے ہیں۔ واقعی میں نے آپ صاحبان کا بہت سا وقت خراب کر دیا۔ اور دیر بھی کافی ہو گئی۔ امید ہے کہ آپ مجھے معاف فرمائیں گے: قاسم صاحب ہماری آپ کی کل اس مسئلہ پر بحث ہو گی۔ جمال آرا نے یہ فقرہ کہا اور کھڑی ہو گئی۔ فوراً ہی قاسم۔ شوکت۔ حمید۔ ظہیر وغیرہ بھی جانے کو کھڑے ہو گئے اور اس طرح محفل برخواست ہوئی۔

(۳)

قاسم آگرہ کے ایک سوداگر کا لڑکا تھا۔ تجارتی دنیا میں اس کا نام بہت مشہور تھا۔ قاسم کو اصولی بنیاد پر تعلیم دلائی گئی تھی۔ مگر چونکہ وہ فطرتاً بدشوق تھا۔ اس لئے بمشکل بائیس سال کی عمر میں اس نے معمولی تعلیم حاصل کی۔ اور کمرشل ڈپلومہ کا امتحان پاس کیا، اس کے بعد اس کا تعلیمی سلسلہ منقطع ہو گیا اور وہ اپنے باپ کے ساتھ تجارتی معاملات میں حصہ لینے لگا۔ اُسے تجارتی کاموں سے مطلق دلچسپی نہ تھی۔ اور وہ بیشتر وقت ناکارہ کوتاہ اندیش دوستوں کی صحبت میں گزارتا۔ آگرہ کا کوئی ایسا مشہور کلب نہ تھا جس کا وہ ممبر نہ ہو۔ صورت شکل کے لحاظ سے اگر قاسم حسین نہ تھا تو بدصورت بھی نہیں کہا جا سکتا تھا۔ اور اس قدر اس کی تسلی کے لئے کافی تھا۔ دولت کی فراوانی اسے بالعموم ایک مکمل حسین نوجوان کی صورت میں پیش کیا کرتی تھی۔

تھوڑے عرصے سے وہ الہ آباد برانچ میں کام کر رہا تھا اور یہیں آکر بذریعہ کلب اس سے جمال آرا سے تعارف ہوا۔ اور اس طرح اس نے اپنی شامیں اسی کلب کے لئے وقف کر دی تھیں۔ مگر اول ہی روز جب وہ جمال آرا سے متعارف ہوا تو اس نے محسوس کیا کہ جمال آرا غیر معمولی حسین اور قابل ہونے کے علاوہ کچھ اور چیز بھی ہے جس کے سمجھنے کے لئے مدتیں چاہئیں۔

قاسم اب سے بیشتر ہزارہا حسین لڑکیوں کو دیکھ چکا تھا اور پرکھ چکا تھا۔ مگر جمال آرا اسے کچھ اور ہی نظر آئی۔ وہ سمجھنے لگا اُسے جمال آرا سے ضرور محبت ہو گئی ہے۔ شروع شروع کی دو چار ملاقاتوں میں تو اُس نے خیال کیا کہ اس قسم کی آزاد منش دوشیزہ کو جس کی تربیت بالکل انگریزی ماحول میں دی گئی ہو۔ قابو میں کر لینا آسان ہو گا۔ لیکن جب اُس نے دیکھا جمال آرا باوجود مکمل آزاد ہونے کے خیالات ہی دوسرے رکھتی ہے۔ اور اس کا حاصل کرنا آسان تو آسان دشواری کی حد سے بھی بڑھا ہوا ہے تو اس کے دل میں آتش شوق اور بھڑکی۔ اور اُس نے اپنی تمام دولت۔ اپنی تمام قابلیت۔ اپنے ان ہتھکنڈوں کو بیک وقت جمال آرا پر استعمال کرنے کا عزم بالجزم کر لیا۔ جن کے ذریعے سے وہ صدہا عورتوں کے استقلال کی بنیاد ہلا چکا تھا۔ چنانچہ یہی تقریب تھی جمال آرا کے ان خیالات کے معلوم کرنے کی جن کا اظہار گزشتہ باب میں ہوا ہے۔ قاسم جب دیکھ چکا جمال آرا اپنے اصول کے لحاظ سے اس درجہ عجیب ہے اور شادی نہ کرنے کا خیال اس کے دماغ میں اس قدر استوار ہے تو اُس نے غور کرنا شروع کر دیا کہ کس طریقہ سے اس کے نظریئے کو باطل ثابت کر کے اُس کے غرور کو توڑے۔ اُس نے سوچا کہ اسے دولت کا لالچ دینا بیکار ہے وہ خود مالدار ہے۔ دلکش باتوں سے اس کا دل لبھانا ممکن نہیں۔ اس لئے کہ وہ خطرناک حد تک فلسفی ہے۔ قابلیت کا سکہ اس پر جمایا نہیں جا سکتا۔ کیونکہ وہ اس سے کہیں زیادہ قابل ہے۔

حسن کا جادو اس پر نہیں چل سکتا۔ اس واسطے اول تو وہ حسین ہی نہیں اور اگر ہے بھی تو کم از کم جمال آرا کی نظروں میں سمانے کے لائق نہیں۔ پھر اُس نے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے غور کیا " اور کیا تدبیر رہ گئی؟ وہ بہت دیر تک خاموش رہا۔ اور خدا معلوم اس عرصہ میں کیا کیا تدابیر اس کے ذہن میں آئیں اور اُس نے بیکار سمجھ کر انھیں نکال دیا۔

وہ اپنے کمرے میں بیٹھا تھا۔ وسکی کی ایک بوتل اور ایک جام خوشبودار سگاروں کا ایک ڈبہ اور دیاسلائی کا بکس اس کے سامنے میز پر رکھے تھے اور اس کا تخیل جمال آرا کے لئے وقف اس کے چہرے کا تغیر بتلا رہا تھا۔ اس نے ابھی تک کوئی رائے نہیں قائم کی۔ غالباً ایک گھنٹہ اسی حالت میں گزر گیا۔ اور رفتہ رفتہ اس کے بشرے سے مایوسی ظاہر ہونے لگی۔ مگر وہ کچھ سنبھلا اور سگار سلگا کر اس نے کچھ سوچا۔ بالآخر وہ نتیجے پر پہنچ گیا۔

اور اس نے خود بخود کہنا شروع کیا۔

"یہ بالکل ٹھیک ہے" مانا کہ جمال آرا تعلیم یافتہ ہے۔ ادیب ہے۔ مستقل مزاج ہے فلسفی ہے۔ دنیاوی ضروریات سے بے نیاز ہے۔ لیکن بہر حال عورت ہے اور نوجوان ـــــــــ عورت ہونا اس کے ہر شعبۂ زندگی میں شامل ہے۔ اور شباب کا خون اس کے ہر رگ و پے میں جاری و ساری ہے۔ پس جب تک ایسا ہے وہ سب کچھ ہے۔ اور کچھ بھی نہیں، نا ممکن ہے کہ اس کے حسن کی تعریف کی جائے۔ اور وہ دل میں گدگدی محسوس نہ کرے۔ محال ہے کہ اس سے اظہارِ تعشق کیا جائے اور وہ بیتاب نہ ہو"

اس نے کامیابی کا سانس لیتے ہوئے وہسکی کی بوتل اٹھائی اور متواتر تین چار جام پی کر آرام کرسی پر دراز ہو گیا۔

شوکت جمال آرا کا دوست۔ ایک شریف نوجوان تھا اس کے سینے میں ایک شریف دل اور جسم میں شریف خون کا دورہ تھا۔ وہ اکثر جمال آرا کو ضروری ہدایتیں دیا کرتا خصوصاً پردہ کے عنوان پر۔ اس کا قول تھا پردہ ایک دوشیزہ کے لئے از حد ضروری ہے۔ خصوصاً ہندوستان کی عورتیں اس کی اہل نہیں۔ اور بفرضِ محال ایسا ہو بھی تو یہاں کے شباب زدہ نوجوان اس بات کے منافی ہیں۔ آج بھی اسی موضوع پر بحث ہو رہی تھی۔ جمال آرا کا جواب حسبِ ذیل تھا۔

عورتوں کو ایک محدود فضا کے اندر بند کر کے رکھنے کا وقت گذر گیا ہے۔ اور اب زمانہ کا اقتضا یہی ہے کہ انھیں آزادی دی جائے تاکہ وہ پوری طرح تعلیم و تربیت کے اصول سے واقف ہو کر اپنے بچوں کی پرورش اسی انداز سے کریں۔ اور اپنی کھوئی ہوئی صحت کو واپس لا سکیں۔ اصل پردہ اپنے نفس کا ہے۔ اگر اس میں کوئی بدی نہیں ہے تو کھلے بندوں پھرنا بھی مضرت رساں نہیں ہو سکتا۔ اور اگر خرابی تربیت کی وجہ سے نفس میں کمینگی پیدا ہو گئی ہے تو پھر بدرجہ شدید بھی نسوانی عصمت کی حفاظت نہیں کر سکتے۔ چاند سے کہیئے وہ پردہ میں رہے۔ سورج کو پردہ میں رہنے کی ہدایت کیجئے۔ چمکتے ہوئے تاروں اور مہکتے ہوئے پھولوں سے کہئے وہ پردہ میں رہیں۔ یہی قدرت کی صناعیاں مجھے پردہ سے باہر رہنے کی تلقین دیتے ہیں۔ جب دنیا کو رونق بخشنے والی کوئی چیز پردہ میں نہیں رہتی تو عورت جو بذاتِ خود ایک رونق ہے کیوں پردے میں رہے۔ جمال آرا کی رنگین خیالی پر شوکت کو ہنسی آ گئی اس کے دماغ میں ان ڈائلاگ کے جوابوں کا دریا موجیں مارنے لگا۔ مگر وہ اس سنگین بحث سے خود بخود ہٹ گیا۔ اور اس نے صرف اتنا کہا کہ جمال میں آپ کے ڈائلاگ کی قدر کرتا ہوں۔ مگر میں یہ ضرور کہوں گا اور بلا خوفِ تردید کہ تمھیں ایک روز پردہ کی ضرورت ضرور محسوس ہو گی۔ کیونکہ ماحول ایسا ہی بتلا رہا ہے۔ اتنی بحث کے بعد وہ مکان چلا گیا اور جمال آرا اپنے کمرے میں کتب بینی میں مشغول ہو گئی۔

کتب بینی میں عرصہ نہ گذرا تھا کہ چھنن (ملازم) نے نہایت سلیقہ کے ساتھ جمال آرا کے سامنے ایک ملاقاتی کارڈ لا کر رکھ دیا جس پر قاسم لکھا تھا۔ ملاقات کے کمرے میں بٹھا دو۔ اور کہہ دو میں ابھی آتی ہوں۔ دوسرے لمحے میں جمال آرا ملاقات کے کمرے میں تھی۔ قاسم جو خدا معلوم کن کن خیالات میں مستغرق تھا، جمال آرا کی آہٹ سے چونکا اور مسکراتے ہوئے جمال آرا سے ہاتھ ملایا۔

"غالباً اُس روز کی نامکمل بحث نے آپ کو آج تکلیف دی ہے۔ جمال آرا نے متبسمانہ لہجے میں قاسم سے پوچھا۔

"جی نہیں! وہ بات تو اُسی وقت تک محدود تھی۔ اور مجھے آپ کے خیالات سے انحراف ہی کب ہوا تھا جواب ہوتا۔ بلکہ اس وقت اگر سچ پوچھئے تو میں اعترافِ شکست کی غرض سے حاضر ہوا ہوں نہ کہ مزید بحث و گفتگو کے لئے۔

میں ممنون ہوں کہ آپ نے میرے ناچیز خیالات کو شرفِ قبولیت بخشا۔ آپ کے خیالات درحقیقت اس قدر دقیق اور عمیق ہوتے ہیں کہ بادی النظر میں انسان ان کی تہ کو نہیں پہونچ سکتا۔ لیکن جب ٹھنڈے دل سے غور کرتا ہے تب اُن کی حقیقت آشکار ہو جاتی ہے۔ اور آپ کی وسیع النظری اور عجیب و غریب قابلیت کا اعتراف ناگزیر ہو جاتا ہے۔ چنانچہ گزشتہ رات جب میں نے اس مسئلہ پر پھر غور کیا تو مجھے آپ کا ہمخیال ہو جانا پڑا۔

"میں آپ کی اس رائے کی تہ دل سے قدر کرتی ہوں۔ لیکن یہ تو بتلایئے آپ کے شکوک کس طرح رفع ہو گئے۔ اور آپ کے اعتراضات کا کس طرح کافی و وافی جواب مل گیا؟"

"اسے نہ پوچھئے۔ قاسم نے خفیف سی آہ کے ساتھ کہا۔ آپ کو علم نہیں میرا حافظہ اپنی بیشتر خلوتوں میں آپ کے الفاظ دوہرایا کرتا ہے۔ اور مجھے یاد نہیں رہتا کہ کس بنا پر میری رائے کا اختلاف اُس وقت مغلوب ہو جاتا تھا۔

میرے خیال میں تو اس کی وجہ آپ کے دلائل کی مضبوطی کے ساتھ آپ کے تصور کی دلکشی بھی ہے۔"

"آپ منطقی ہونے کے ساتھ ساتھ شاعر بھی معلوم ہوتے ہیں ورنہ گفتگو میں رنگینی اور مبالغہ کو غالباً آپ غیر ضروری سمجھتے" جمال آرا نے کسی قدر شرماتے ہوئے کہا۔ "میری بدقسمتی ہے کہ آپ واقعہ کو مبالغہ سمجھتی ہیں۔ اگر ایک حقیقت کا انکشاف شاعری سے تعبیر کیا جاتا ہے تب تو میں بیشک اس جرم کا مرتکب ہوں۔ ورنہ عرض کرنے دیجئے۔ آپ اس کی مرتکب ہیں اس لئے کہ آپ صریحاً مبالغہ کے ساتھ انکسار فرماتی ہیں۔"

"نہایت خوب" جمال آرا نے مسکراتے ہوئے کہا "آپ یقیناً ایک دلچسپ منطقی ہیں اور غالباً یہی وجہ ہے کہ میں دوسروں کی بہ نسبت آپ کی گفتگو میں زیادہ لطف اٹھاتی ہوں۔

"خدا کا شکر ہے، میں شاد ہوں کہ ہوں تو کسی کی نگاہ میں۔

جمال آرا اس فقرے پر خود بخود جھینپ گئی اور کچھ لمحوں کے لئے خون کی ہلکی ہلکی سرخیاں اس کے صبیح چہرے پر دوڑنے لگیں۔ قاسم نے اس تبدیلی کو ایک دزدیدہ مگر کامیاب نظر سے دیکھا، اور گفتگو کا پہلو بدل کر کہنے لگا

آج کل آپ کلب بھی نہیں آتی ہیں آخر کوٹھی میں پڑے پڑے گھبراتی نہیں ہوں گی۔

کتب بینی میرے لئے دنیا کی دلچسپ تفریحات میں سے ہے اور میں دیکھتی ہوں کہ اس سے بہتر کسی اور مشغلے میں اپنے وقت کو صرف نہیں کر سکتی۔

یہ تو بجا ہے لیکن آپ کو اپنی صحت کا خیال بھی تو ضروری ہے اس قدر دماغی کام کر کے آپ اپنے اوپر ظلم کرتی ہیں۔ آپ نے کبھی اس پر بھی غور کیا ہے کہ آپ کی نزاکت جسمانی بہ نسبت کام کرنے کے عیش و آرام کے لئے زیادہ موزوں ہے اور اس عمر میں بہ نسبت خلوت نشینی کے آپ کو جلسوں اور ہم صحبتوں کی زیادہ ضرورت ہے بلکہ میں تو کہہ سکتا ہوں کہ فطرت نے آپکو خلوت کے لئے ہی نہیں بلکہ حکمرانی کے لئے پیدا کیا ہے۔

جمال آرا نے قاسم کے یہ الفاظ نہایت تعجب سے سنے، اور اس کا چہرہ اس دوران میں کئی بار شرم سے گلابی ہو ہو گیا۔ اس کی پیشانی پر پسینے کے چند قطرے نمودار ہو گئے اور اس کی نظریں خود بخود جھک گئیں۔ آخر کار اس نے اپنے کو سنبھالتے ہوئے کہا۔

مسٹر قاسم .... وہ رکی اور اس نے پھر سلسلۂ کلام جاری کرنے کی کوشش کی۔ آپ سمجھتے ہیں کہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟"

"میں" قاسم نے انتہائی نرمی سے کہا۔ "میں بخوبی جان رہا ہوں کہ ایک حقیقت کا اظہار کر رہا ہوں۔ جمال آرا یقین کیجئے کہ مجھے آپ سے سچی ہمدردی ہے اور میں نہیں دیکھ سکتا کہ آپ کی زندگی اس قدر بے لطف گزرے۔

آپ کی ہمدردی کا تو میں شکریہ ادا کرتی ہوں لیکن" اس نے اپنے کو سنبھالتے ہوئے کہا۔ "یہ عرض کر دینا بھی ضروری سمجھتی ہوں کہ اس معاملہ میں آپ کی ہمدردی بے سود ہے۔ میں اپنے مستقبل کے متعلق طے کر چکی ہوں۔"

ہاں یہ تو آپ کر چکی ہوں گی۔ لیکن اس کے ساتھ آپ کو یہ بھی خیال ہے کہ آپ نے کسی دوسرے کے مستقبل کو تو تاریک نہیں بنا دیا۔

اس سے آپ کا کیا مطلب ہے۔ جمال آرا نے اندازِ برہمی سے پوچھا،

میرا مطلب .... میرا مطلب" قاسم نے جمال آرا کے پاس کرسی لاتے ہوئے انتہائی لجاجت سے کہا۔ جمال آرا خدا کے لئے مجھے میرا مطلب کہنے پر مجبور نہ کرو۔ آہ میں دیکھتا ہوں کہ تم مجھ سے برہم ہو رہی ہو۔ میں یقیناً تم سے گستاخانہ پیش آیا۔ لیکن میں کیا کروں؟ میں خود نہیں سمجھتا کہ جب تم سے مخاطب ہوتا ہوں تو کیا کیا کہہ جاتا ہوں۔ اور ان الفاظ کو محض اس واسطے سوچنے کے لئے کہ مبادا انھوں نے تمھیں برگشتہ کیا ہو، یا وہ خلاف شان ہوں۔ خدا معلوم کتنی راتیں گزار دیتا ہوں ——— مگر ——— وہ ایک لمحہ کے لئے رکا اور اپنی پیشانی سے پسینہ پوچھتے ہوئے اس نے جمال آرا کے چہرے کو ناقدانہ مگر غیر محسوس نگاہوں سے دیکھا اور سلسلۂ کلام جاری کیا۔ "مگر ——— میں اسے اپنی بدقسمتی کے سوا کیا کہوں کہ تمھیں میری حالت سے مطلق آگاہی نہیں ہمدردی تو درکنار .... جمال آرا ——— کہہ نہیں سکتا تم میرے واسطے کیا ہو۔

میں تمھیں کیا سمجھتا ہوں؟ اف تم میرے قلب کے ہر گوشے میں، میرے خیال کی ہر رو میں۔ میری حسیات کے ہر طلاطم میں موجود ہو۔ میری راتیں تمہارے خیال کے لئے وقف ہو چکی ہیں۔ اور میرے خواب تمہارے تصور کے لئے مخصوص! جمال آرا ——— میری دل کی ملکہ۔ میری ہستی کی فرمانروا، جانِ آرزو، جانِ تمنا۔ خدا کے لئے مجھے تباہی سے بچا لو، میں اور کچھ نہیں چاہتا" اس نے جمال آرا کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے اور بالکل

قریب آجانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ محض یہ کہ تم میری شریک زندگی ہوکر مجھے ایک خوفناک تباہی سے بچا لو۔

وہ یکایک خاموش ہوگیا اور جمال آرا کے عرق آلود گلابی چہرے کے مطالعہ میں مصروف ——— بیشک مطالعہ میں۔ اس لئے کہ وہ ایک کھلی ہوئی کتاب تھی جس پر شرم، حیا، نسائیت، انفعال، خودداری اور عصمت جلی حروف میں لکھے ہوئے تھے۔ وہ خاموش گردن جھکائے قاسم کا اظہار محبت سن رہی تھی۔ اور خدا معلوم کن کن خیالات میں محو تھی کہ دفعتاً گھبرا کر اس نے اپنی کرسی قاسم سے علیحدہ ہٹاتے ہوئے ایک متین اور خوددارانہ لہجہ میں کہا۔

"مسٹر قاسم" معاف کیجئے یہ

"خدا کے لئے ان الفاظ کے ادا کرنے میں ذرا رحم سے کام لو جس پر ایک شخص کی زیست اور موت کا مدار ہے۔ جو ایک شخص کی مکمل تباہی یا ابدی خوشی کا باعث ہیں جن کے ادا کرنے پر شاید بعد کو تمہیں افسوس ہو ------

میں نہیں چاہتا کہ تم مجھے اسی وقت جواب دو۔ میں کچھ عرصے کے واسطے اپنی زندگی کو یاس اور آس کی باہمی کشمکشوں کے لئے وقف کرنے کو تیار رہوں۔ لیکن خدارا تم کوئی ایسا جواب دے کر میرا دل نہ توڑ دو جو مجھے کسی غیر ارادی فعل پر مجبور کردے۔"

میں سن چکی مجھے آپ کی حالت سے قطعی ہمدردی ہے۔ اگر آپ چاہتے ہیں کہ میں اس وقت آپ کو کوئی صاف جواب نہ دوں بلکہ کچھ غور کرلوں تو بہتر ہے۔ آپ پھر کسی وقت مجھ سے دریافت کرسکتے ہیں۔ لیکن آپ کو خیال رکھنا چاہیے کہ اس بارے میں اپنی مکمل رائے کا اظہار اس روز کرچکی ہوں اور پھر میں والدین کی رائے کے خلاف ان معاملات میں گفتگو کرنا پسند نہیں کرتی۔ مجھے امید ہے آپ ایسے سوالات آئندہ ہرگز نہیں کریں گے۔

برابر کے کمرے میں کسی کے پیروں کی چاپ نے ان دونوں کی توجہ منتقل کرلی۔ اور جمال آرا کی تقریر نامکمل رہ گئی۔

کہئے مسٹر قاسم کیسے آنا ہوا!

یہ جملہ جمال آرا کے والد کے منہ سے ادا ہوا۔ پہلے تو قاسم گھبرایا۔ مگر اس نے تبسم اختیار کرتے ہوئے نہایت اطمینان کے ساتھ سلام کیا۔

قاسم۔ آج کل آپ کلب بھی نہیں آتے۔ عرصہ سے ملاقات نہیں ہوئی۔

جی ہاں آپ کا خیال درست ہے۔ دراصل میں بہت مصروف ہوں آج کل اور سفر کی تیاریاں بھی کر رہا ہوں۔ جمال آرا کے والد نے کہا۔

"سفر" قاسم نے متعجبانہ لہجہ میں پوچھا۔ کیا کسی لمبے سفر کا ارادہ ہے؟

جی ہاں دو ڈھائی ماہ کے لئے شملہ جا رہا ہوں۔ گرمی ناقابل برداشت ہوتی جا رہی ہے۔ میں سمجھتا تھا جمال نے آپ سے ذکر کردیا ہوگا۔

جی نہیں مجھے مطلق علم نہیں ——— روانگی کب ہے۔

پرسوں اتوار کے روز۔

جمال آرا ہنوز خاموش تھی۔ اس کے طرز سے ظاہر تھا وہ کسی دقیق مسئلہ میں الجھ رہی ہے۔ باوجود اس کے اس کا نام دوران گفتگو میں لیا گیا۔ لیکن اس نے مطلق نہ سنا۔ بالآخر تھوڑی دیر کی گفتگو کے بعد قاسم نے جمال آرا اور اس کے والد سے رخصت چاہی اور افسردہ قدموں کے ساتھ ٹہلتا ہوا کوٹھی سے باہر چلا گیا۔

(۴)

اتوار کے روز جمال آرا اپنے والدین اور ملازم کے ہمراہ شملہ کو روانہ ہوگئی۔ تاکہ گرمی کے ایام شملہ میں بسر ہوں۔

مختلف پھولوں سے ڈھکی ہوئی بلند چوٹیاں ----------

وادیوں میں ادھر ادھر بادلوں کا لوٹنا ---------- قسم قسم کے پرندوں کی نوا پردازی ---------- چٹانوں پر آبشاروں کا گرنا۔ خدا معلوم جولائی میں شملہ کیا سے کیا ہوجاتا ہے؟

سارا عالم نباتات گل فروش نظر آرہا ہے۔ اور ہر ذرہ متبسم فروش، ہوا کا ہر جھونکا گویا "موج خرام" ہے جو ہر جنبش پر گل کتر کر گزر جاتا ہے۔ یہاں جو چہرہ ہے متبسم ہے۔ جو قلب ہے مسرت سے دھڑک رہا ہے۔ جو نبض ہے خون صحیح لئے تڑپ رہی ہے۔ شباب کی حکومت ہے۔ حسن کی ملکیت ہے اور دولت کی فراوانی۔ ایسے ماحول میں جمال آرا کس قدر خوش رہی ہوگی اندازہ ہوسکتا ہے۔

جمال آرا کو شملہ آئے ہوئے تقریباً ایک ماہ ہوچکا ہے وہ اس درمیان متعدد تفریحات میں شریک ہوئی۔ اور بارہا قدرتی مناظر سے لطف اندوز ہوئی۔ آج تیسرا دن ہے کہ اسے معلوم ہوا کہ قاسم بھی شملہ آیا ہوا ہے۔ اس روز کی گفتگو کے بعد وہ اس وقت تک جمال آرا سے نہیں ملا تھا، اور جمال آرا

گزشتہ واقعہ کو قریب قریب دل سے محو کر چکی تھی۔ شام کے پانچ بجکر کچھ ہی منٹ ہوئے ہوں گے۔ جمال آرا اپنی کوٹھی کے سبزہ پر ایک کتاب ہاتھ میں لئے ہوئے خاموش ٹہل رہی تھی۔ کہ سامنے سے قاسم آتا ہوا دکھائی دیا۔ اُس کے چہرے سے حزن و ملال کے آثار نمایاں تھے۔ لیکن جیسے ہی وہ جمال آرا کے قریب آیا اُس نے اپنے کو خندہ پیشانی بناتے ہوئے مصافحہ کے لئے ہاتھ بڑھایا۔

جمال آرا، قاسم نے نہایت ادب سے کہا۔ الہ آباد کی بہ نسبت آپ اتنے عرصہ میں یہاں زیادہ تندرست اور بشاش نظر آتی ہیں۔"

ہاں اس لئے کہ میں یہاں کی آب و ہوا سے مکمل فائدہ اُٹھا رہی ہوں۔ میں نے کچھ روز کے لئے آپ کی قابل قدر نصیحت پر عمل کرنا شروع کر دیا ہے اور زیادہ وقت مطالعہ میں نہیں صرف کرتی۔"

شکریہ۔ لیکن اس وقت اگر آپ آبادی سے باہر ٹہلنے کے لئے چلی جایا کریں تو زیادہ بہتر ہو۔ اور آپ کے لئے تو بہت کچھ آسانی بھی ہے۔ سامنے والی چوٹی جہاں سے دوسری طرف کی سرسبز وادی سے ایک چشمہ شفاف گزرتا ہے یہاں سے کچھ دور نہیں ہے۔ اور وہاں کا نظارہ یقیناً نہایت جاذب نظر ہے۔

میں اکثر شام کے وقت وہاں جایا کرتی ہوں۔ لیکن آج نہیں جا سکی۔

افسوس نہ کیجئے۔ اب بھی کافی وقت ہے۔ اگر آپ چلنا چاہیں تو میں بھی آپ کی معیت کا فخر حاصل کرنا چاہتا ہوں۔ مجھے یقین ہے ہم قبل از غروب واپس ہو سکیں گے۔"

چلئے میں تیار ہوں جمال آرا نے کچھ سوچنے کے بعد جواب دیا۔

راستہ بھر قاسم اور جمال آرا مختلف موضوعات پر گفتگو کرتے کوہستان شملہ کی اس سرسبز چوٹی پر چڑھتے رہے۔ اور آخر کار اس جگہ پہونچ گئے جہاں وادی اور چشمے کا دلکش نظارہ اُن کے پیش نظر تھا۔ اب تک اُن کے درمیان گزشتہ واقعہ کے متعلق کوئی گفتگو نہیں ہوئی تھی۔ لیکن یہاں پہونچنے کے بعد قاسم نے یکایک موضوع گفتگو بدلتے ہوئے کہا۔

جمال آرا، میری پیاری، جمال آرا تم نے میری قسمت کا کیا فیصلہ کیا؟

جمال آرا اس طرح چونکی گویا وہ کسی خیال میں محو تھی، اور قاسم کو گہری نظر سے دیکھتے ہوئے جواب دیا۔

قاسم صاحب آپ میرا فیصلہ سن کر خواہ مخواہ اپنی تفریحات کو مکدر کرتے ہیں۔ میں تو خیال کرتی تھی کہ شاید آپ سنبھل گئے ہوں گے۔ لیکن میرا خیال غلط ثابت ہوا آپ بیکار مجھ سی وارفتہ مزاج عورت کے پیچھے پڑے ہیں اور اپنی زندگی برباد کرنے پر تلے ہیں۔

قاسم سمجھا کہ جمال آرا کا دل کچھ پسیجا ہے اس لئے وہ بالکل اس کے قریب آ گیا اور اس کے ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے کہا، تم وارفتہ مزاج ہو۔ اُف تمھاری یہ وارفتہ مزاجی ہی تو مجھے دیوانہ بنائے ہوئے ہے۔ تم مجھ سے سنبھلنے کے لئے کہتی ہو اس کا جواب میرے پاس یہ ہے کہ میری حالت اسی وقت اور صرف اسی وقت سنبھلنی ممکن ہے کہ ۔۔۔۔۔۔۔۔۔ قاسم شراب کے نشہ میں مدہوش تھا۔ اس لئے اس نے یہ گفتگو کرتے ہوئے جمال آرا کے جسم کو بھی چھونا چاہا۔ لیکن وہ ایک جھٹکے کے ساتھ قاسم کے ہاتھوں کو اپنے سے علیحدہ کر کے دور جا کھڑی ہوئی اور ایسی نظر سے جسمیں نفرت اور غصہ دونوں ملے ہوئے تھے قاسم کو دیکھنے لگی۔

تم یقیناً کوئی آوارہ مزاج اوباش ہو۔ میں نے اب تک تمھارے سمجھنے میں غلطی سے کام لیا۔ کیا تمھارا خیال ہے تم میری تنہائی سے ناجائز فائدہ اُٹھا سکتے ہو۔ اگر ایسا ہے تو تمھیں جنون ہے۔ یاد رکھو کہ میں خطرناک حد تک اپنے ارادوں میں مستقل ہوں اور تم کسی طرح مجھ پر قابو نہیں پا سکتے۔ جمال آرا نے یہ الفاظ انتہائی غیظ و غضب میں کہے۔

قاسم کچھ دیر تک تو جمال آرا کو اس طرح تکتا رہا جس طرح ایک مجسمۂ سنگین۔ لیکن آخر اس نے زیر لب تبسم سے الفاظ دوہرائے اور قہقہہ کے ساتھ جمال آرا کی طرف یہ کہتے ہوئے بڑھا۔

" میری روح کی فرمانروا بگڑو نہیں۔ میں گستاخ ہوں۔ لیکن عاشق سب ہی گستاخ ہوتے ہیں، آؤ اب غصہ تھوک دو ۔۔۔۔۔۔۔۔ دیکھو تو یہ موقع ۔۔۔۔۔۔۔۔ قاسم نے گفتگو کا سلسلہ توڑتے ہوئے جمال آرا کی طرف دونوں ہاتھ بڑھائے۔

الگ رہو ۔۔۔۔۔۔۔۔ نفس کے پاجی کتے۔ تم ہرگز اس قابل نہیں کہ مجھے تمھاری ہوا بھی لگے۔ یاد رکھو اب اگر تم نے آگے قدم بڑھایا تو میں۔ اُس نے ایک پتھر اُٹھا لیا۔ اس پتھر سے تمھارا سر پاش پاش کر دونگی۔

قاسم کی حالت ایکدم تبدیل ہو گئی اس نے یکایک (جیب) سے ریوالور

نکالا اور جمال آرا کے سینہ کی طرف اُٹھاتے ہوئے کہا "اچھا اگر ہم کتے ہیں تو تمہیں بھی کتے کی موت مرنا ہوگا ——— اب بتلاؤ کیا کہتی ہو۔

وہ ایک زیر خندہ ہنسی ہنسا وہ سمجھ رہا تھا کہ یہ بازی کا آخری پتہ ہے اور اسی پر ہار جیت کا مدار ہے۔ اس کا خیال تھا کہ ریوالور کو دیکھ کر جمال آرا سہم جائے گی اور خود کو اس کے حوالے کر دے گی۔ کیونکہ آخر وہ عورت ہے۔ لیکن جمال آرا عورت تو ضرور تھی مگر مافوق الفطرت عورت، وہ ریوالور کو اپنی طرف دیکھ کر بجائے اس کے کہ ڈر کر بھاگتی محض ہنسی، ایسی ہنسی جس سے نفرت و حقارت کا اظہار ہوتا تھا۔ اور قاسم سے ان الفاظ میں مخاطب ہوئی۔

اب تمہارے سیاہ کار اور ذلیل فطرت چہرہ ہونے کا کامل یقین ہو گیا۔ تم سمجھتے ہو گے میں اس ریوالور کے ڈر سے زندگی بچانے کے لئے اپنے اصول اور اپنی عفت و عصمت کو قربان کر دوں گی۔ تم کوتاہ اندیش اور دیوانے ہو۔

دیکھو جمال آرا میں ایک موقع اور دیتا ہوں۔ تم پھر سوچ لو۔ مجھے تمہاری دوشیزگی پر رحم آتا ہے "

بکومت، میں تمہاری کوئی بات سننا نہیں چاہتی۔

اچھا اگر تم نہیں چاہتیں تو" اُس نے ریوالور کی نال کو سیدھا کیا اور جمال آرا کے قلب کی شست لی ——— "ٹھن" ———

فائر کی آواز پہاڑوں کی چٹانوں اور وادیوں میں گونجی اور کچھ سیکنڈ تک متواتر بازگشت ہوتی رہی۔ بارود کا دھواں جب سامنے سے صاف ہوا تو قاسم نے اپنی کلائی ایک دوسرے شخص کی مضبوط گرفت میں دیکھی اور ریوالور کی نال کا رُخ آسمان کی جانب۔

جمال آرا سامنے کھڑی مسکرا رہی تھی۔

(۶)

شوکت ایک بیس سال کا نوجوان تھا، جسے ہم اس سے قبل ناظرین سے تعارف بھی کرا چکے ہیں۔ وہ ایک تعلیم یافتہ ہونہار ادیب اور ایک اوسط درجے کا فرد تھا۔ وہ بہت ہی سادہ زندگی بسر کرتا۔ اُس نے سب سے پہلے ہی جب جمال آرا کو دیکھا تو پہلی ہی نظر میں اُس نے خیال کیا کہ وہ دنیا میں نہیں ہے اور جب جمال آرا کے عجیب و غریب خیالات سُنے تو اول ہی روز اس نے اندازہ لگا لیا کہ جمال آرا کوئی حسین عورت ہی نہیں بلکہ حُسن کی ایک دیوی ہے۔ جو دنیا والوں کو محبت کا حقیقی درس دینے اور ان سے اپنی پرستش کرانے کے لئے آئی ہے۔ چنانچہ اسی وقت سے اس نے جمال آرا کو اپنی آنکھوں میں جذب کر لیا اور دل میں اُس کی تصویر اُتار لی۔ وہ صحیح معنوں میں اس کی پرستش کرنے لگا۔ اس کا عشق سچا تھا اور اُس کی محبت حقیقی۔ وہ بہت جلد مجاز سے حقیقت کی طرف رجوع ہونے لگا۔ اور اس کے دل میں اس بات کی کوئی خاص توجہ نہ رہی کہ وہ جمال آرا سے ملے یا اُسے حاصل کرے۔ حتی کہ وہ اُسے دیکھ کر کبھی کوئی توجہ نہیں کرتا تھا۔ وہ بارہا جمال آرا سے ملا اور کبھی اُس پر ظاہر نہ ہونے دیا۔ کہ اُسے اُس سے محبت ہے۔ بلکہ کچھ مدت کے بعد وہ اس بات کی کوشش کرنے لگا کہ جمال آرا سے نہ ملے۔ اس لئے کہ اسے دیکھ کر اس کے جذبۂ پرستش میں اکثر جوش آ جاتا تھا اور اس کا قلب اسے مجبور کرنے لگتا کہ وہ بے اختیار جمال آرا کے قدموں پر گر پڑے۔ چنانچہ اسی بنا پر اُس نے اس کے یہاں آنا جانا بہت کم کر دیا تھا اور ہر کام سے قطعاً دست بردار ہو گیا۔ چونکہ ایسی حالت میں وہ اپنے فرائض مکمل طور پر انجام نہیں دے سکتا تھا۔ اس کی اس بیکاری کی وجہ سے اس کے گھر والے اس سے ناراض رہنے لگے اور مجبوراً اُسے تلاش معاش کی فکر ہوئی اور آخر کار ایک ادبی رسالے کا ایڈیٹر ہو گیا۔ مگر وہ صرف اتنا چاہتا تھا کہ ایک عقیدت کیش پجاری کی طرح تمام عمر جمال آرا کے ساتھ آئین وفا کی پابندیوں میں گزار دے۔ اس کے رسالے میں جمال آرا کے مضامین اکثر شائع ہوا کرتے۔ اپنا روزانہ کا کام انجام دینے کے بعد باقی ماندہ وقت میں وہ جمال آرا کے مضامین کا مطالعہ کیا کرتا۔ اور جوشِ عقیدت میں اکثر اُن کو حفظ کر لیا کرتا لیکن رفتہ رفتہ اُس کی صحت خراب ہو گئی اور دن بدن حالت بدتر ہوتی گئی۔ ڈاکٹروں نے تجویز کیا کہ اب اسے کسی پہاڑ پر بغرض تبدیل آب و ہوا چلا جانا چاہیئے۔ یہی اس کے لئے بہترین علاج ہے ورنہ دق ہو جانے کا اندیشہ ہے۔

چنانچہ اسی وجہ سے شوکت ایک عرصے سے شملے میں ٹھیرا تھا۔ اس میں شک نہیں کہ شملہ آ کر شوکت اپنی تندرستی میں ایک نمایاں فرق محسوس کرنے لگا۔ لیکن جمال آرا کی پرستش اس سے نہ چھوٹنا تھی نہ چھوٹی۔ وہ اکثر تصور

میں اس سے باتیں کرتا۔ یہی تھی شوکت کی زندگی جس وقت جمال آرا شملہ پہونچی اس روز شام کو جب قاسم جمال آرا کو سیر کے لئے لے گیا شوکت نے ان دونوں کو چوٹی پر چڑھتے ہوئے دیکھا جس جگہ وہ کھڑا تھا وہ موقع ایسا تھا کہ لامحالہ جمال آرا کی نظریں اس پر پڑتیں اور اُسے مخاطب ہونا ناگزیر ہو جاتا۔ لیکن وہ ہمیشہ جمال آرا سے علیحدگی پسند کرتا۔ پس وہ ایک چٹان کے جوف میں چھپ گیا اور انتظار کرنے لگا۔ وہ گزر جائیں تو وہاں سے واپس چلا جائے، لیکن جمال آرا اور قاسم اس جگہ کے قریب ہی آکر رک گئے جہاں شوکت چھپا ہوا تھا۔

اُس نے تمام وہ باتیں سنیں جو جمال آرا اور قاسم کے درمیان ہوئیں، اس دوران میں بارہا اُس نے چاہا کہ قاسم کا اسی جگہ خاتمہ کر دے۔ لیکن آخری لمحہ تک اُس نے ضبط کیا۔ اور عین اس وقت جبکہ قاسم ریوالور سے جمال آرا کو نشانہ بنانا چاہتا تھا اس نے ایک جست کی اور قاسم کو ایک جھٹکا ایسا دیا کہ ریوالور کا اوپر کو فائر ہو گیا۔ قاسم کو پورے طور سے قابو میں کر لینے کے بعد شوکت کا دوسرا ہاتھ قاسم کے حلق پر تھا اور ممکن تھا کہ قاسم کا وہیں خاتمہ ہو جاتا اگر جمال آرا کا یہ جملہ اُسے بروقت نہ سنائی دیتا۔

"مسٹر شوکت اس بیوقوف امیدوار کو اس کے حال پر چھوڑ دو"

اس نے ریوالور کو قاسم کے ہاتھ سے چھین لیا اور ایک ٹھوکر لگا کر کہا جا شیطان تیری زندگی ابھی باقی تھی۔ میری آنکھوں سے دُور ہو جا کتے"

قاسم کپڑے جھاڑتا ہوا نیچی نظریں کئے چلا گیا۔ نہیں بتلایا جا سکتا کہ اس وقت اُس کے دل میں کیا خیالات موجزن تھے ———— اور نہیں کہا جا سکتا وہ کہاں جا رہا تھا، اس لئے کہ اُس روز سے وہ آج تک لاپتا ہے، ایک بار سننے میں آیا تھا کہ کانپور کے پریڈ کے بازار میں بھیک مانگتے ہوئے دیکھا گیا ہے۔

اس کے بعد شوکت نے مس جمال آرا سے رخصت چاہی، مگر اُس نے محسوس کیا کہ اسے کوٹھی تک بحفاظت پہونچا دینا اس کا فرض ہے۔ چنانچہ جمال آرا اور شوکت دونوں اس عجیب و غریب واقعہ پر گفتگو کرتے ہوئے چوٹی سے اترنے لگے، دوران گفتگو میں جمال آرا نے شوکت سے پوچھا،

آپ یہاں کب سے آئے ہوئے ہیں، اور کس تقریب سے، کیا محض تفریح کے لئے"؟

جی نہیں تفریح کیسی؟ شوکت نے عجیب انداز سے کہا اور اس کے بعد بے کم و کاست اپنے آنے کی تمام داستان جمال آرا سے بیان کر دی۔ لیکن اس مخصوص وجہ کو چھپاتے ہوئے جو ان تمام واقعات کا باعث تھی۔

جمال آرا نے بنظر ہمدردی اسے دیکھا اور خود بخود اس کے دل میں ایک خیال پیدا ہوا۔

مسٹر شوکت کیا دراصل آپ کی زندگی اس قدر بے لطف ہے اور کیا واقعی آپ کے تفکرات نے آپ کو اس درجہ پریشان خاطر اور دائم المرض بنا دیا ہے۔ مجھے آپ کے ساتھ دلی ہمدردی ہے۔ آپ کی شادی تو ابھی نہیں ہوئی؟

جی نہیں۔ شوکت نے بے پروائی سے کہدیا"

جمال آرا دس پندرہ منٹ تک بالکل خاموش رہی اور حسب عادت کسی دقیق خیال میں اس کا دماغ اُلجھ گیا۔ تھوڑی دیر بعد اُس نے نظر اُٹھائی اور شوکت کے صبیح و معصوم چہرے کو دیکھا ———— وہ آنکھیں جھکائے خاموش چلا جا رہا تھا۔

بالآخر اُس نے نہایت آزادانہ طریقے سے کہا۔

کیا خیال ہے آپ شادی کریں گے یا نہیں"؟

اس مسئلہ میں میں آپ سے متفق الرائے ہوں۔ میرے خیال میں شادی ایک فعل عبث ہے"

لیکن اگر میں اپنا اصول بدل دوں تو کیا اس وقت بھی آپ مجھ سے متفق الرائے رہیں گے۔ اس نے مسکرا کر پوچھا"

غالباً

یہ کس لئے

اس لئے کہ مجھے یقین ہے آپ ہمیشہ صحیح اصول قائم کرتی ہیں، شوکت نے جوش عقیدت میں کہا بہت اچھا۔

"بہت اچھا" تو آپ یقین کر لیجئے میں نے اپنے اصول نہیں بدلے، لیکن کم از کم "شادی" کے متعلق رائے تبدیل کر چکی ہوں۔

اس سے آپ کا مطلب کیا ہے۔

یہ کہ مجھے شادی کرنا چاہیئے۔

تو کیا آپ نے اس کے متعلق طے کر لیا ہے؟

بیشک

کب اور کس سے ؟

عنقریب اور اگر منظور کریں تو آپ سے۔

جمال آرا، شوکت اتنا کہہ کر خاموش ہو گیا، اور جمال آرا کا منہ تکنے لگا ——— آخر اس کی زبان سے نکلا۔ یہ مذاق تو.....

جی نہیں قطعی واقعہ ہے۔

شوکت کی پیشانی پر پسینہ کی بڑی بڑی بوندیں جمع ہو گئیں اور اس کا دماغ چکر کھانے لگا۔ وہ مجسم حیرت بنا ہوا تقریباً پانچ منٹ تک جمال آرا کی صورت دیکھتا رہا۔ اس کے نزدیک یہ بات مشکل سے قابل یقین تھی۔ بالآخر اُس نے اس کے سامنے سر جھکا دیا۔ اس حال میں کہ اُس کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ اور جمال آرا اُن آنسوؤں کو اپنے معطر رومال میں جذب کر رہی تھی۔

درسِ حرّیت

درد دل نے بڑھ کے چھیڑا نغمۂ سازِ وطن — آہ نے پردہ اُٹھایا کھُل گیا رازِ وطن !

کروٹیں لیتا ہے دریائے غلامی جوش میں — زندگانی کھیلتی ہے موت کی آغوش میں

اپنی بیداری کا دنیا کو سبق دیتے ہوئے — خوابِ غفلت سے اُٹھو انگڑائیاں لیتے ہوئے

اہلِ عالم کو دکھا دو آج شانِ حرّیت — نصب کر دو بڑھ کے پھر پر نشانِ حرّیت

صرف تم تنہا نہیں جرأت تمھارے ساتھ ہے — سرزمینِ ہند کی عزّت تمھارے ہاتھ ہے

کام لو ہمّت سے یہ طرزِ تغافل چھوڑ دو — ناتواں ہاتھوں سے زنجیرِ غلامی توڑ دو

ہے شجاعت کے منافی ذلّت وخواری کی موت — ایسے جینے سے کہیں بہتر ہے بیداری کی موت

دیکھتے کیا ہو مٹا دو ظلم کی بنیاد کو — پھونک دو آہوں سے بڑھ کر چرخِ استبداد کو

تا بہ کے دیکھو گے تم بستر پہ خوابِ زندگی — موت آتی ہے اُٹھانے کو حجابِ زندگی

اک بہادر کے لئے قیدِ غلامی ننگ ہے
اُٹھ کے سرگرمِ عمل ہو وقت محسنؔ تنگ ہے

محسن اعظم گڈھی

سوشلزم کا مفہوم

سوشلزم کا مقصد یہ نہیں ہے کہ سرمایہ داری کو مٹا دیا جائے بلکہ سوشلزم کا جدید ترین نظریہ یہ ہے کہ سرمایہ داری اور دولت آفرینی اور اُس کی تقسیم کے ذرائع کو ذاتی یا انفرادی اختیارات سے نکال کر حکومت کے ہاتھوں میں دیدیا جائے اور حکومت سے مطلب شخصی حکومت یا ملوکی حکومت یا طبقاتی حکومت نہیں ہے۔ بلکہ خالص جمہوری حکومت مراد ہے۔ سرمایہ داری کی خرابیاں اور مضرتیں شخصی اختیارات کی وجہ سے پیدا ہوتی ہیں۔ اس لئے اس کا سدباب اسی طرح ہو سکتا ہے کہ سرمایہ داری تو قائم رہے کیونکہ وہ معاشی ترقی کے لئے ضروری ہے۔ مگر اس کو ایسے ہاتھوں میں دیدیا جائے جہاں ذاتی اغراض شامل نہ ہوں۔ اور اُس کی منفعت عام ہو۔

سوشلزم اور کمیونزم میں فرق

سوشلزم ذاتی ملکیت کے سوال کو صرف سرمایہ داری کے متعلق رفع کرنا چاہتا ہے۔ اور کمیونزم ہر قسم کی ملکیت کا مخالف ہے۔ ظاہر ہے کہ اول الذکر صورت نسبتاً زیادہ قابلِ عمل ہے۔ اور ان قباحتوں سے محفوظ ہے جو کمیونزم میں مضمر ہے۔

سوشلزم پر اعتراضات

سوشلزم پر عام اعتراض جو کیا جاتا ہے وہ یہ ہے کہ اُس کے تحت میں enterprise فنا ہو جائے گا۔ مگر یہ اعتراض موجودہ ذہنیت کے تصور پر مبنی ہے جس میں enterprise کا محرک ذاتی نفع ہوتا ہے۔ لیکن جب سوشلزم موجودہ نظام سوسائٹی کی جگہ لے لے اور وہ اچھی طرح مسلط ہو جائے تو موجودہ ذہنیت ہی بدل جائے گی۔ اور یہ بات بعید از قیاس نہیں ہے کہ لوگ ذاتی نفع سے قطع نظر کر کے دوسروں کی خاطر، سوسائٹی کے مفاد کے لئے اور اس سے بھی بڑھ کر بنی نوع انسان کے لئے بڑے کام کریں۔ خدمت کا جذبہ ذاتی منافع کے جذبے سے اعلیٰ تر ہے۔ اور اگر لوگ اس کی اہمیت کو سمجھنے لگیں تو enterprise کی اسپرٹ باقی رہ سکتی ہے۔ دنیا میں philanthropic اب بھی موجود ہیں۔ اور پھر شہرت اور نیک نامی کا خیال سب سے بڑا محرک ہوتا ہے اور enterprise یہ چیز Socialistic regime میں باقی رہے گی۔ کاروباری کے لئے سرمائے کی ضرورت ہوتی ہے۔ سو وہ باقی رہے گا اور State اس کو انجام دے گی جس طرح وہ دیگر پبلک مہمات انجام دیتی ہے۔ اور یقیناً انفرادی قوت کے مقابلے میں State کی قوت زیادہ بہتر طریقہ پر یہ کام انجام دے سکے گی۔ اعتراض کا جواب سب سے آخر میں یہ ہے کہ سوشلزم کی جگہ modified capitalism رائج کیا جائے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ سوسائٹی کے فرد کی ضروریاتِ زندگی کے لحاظ سے جس قدر کم از کم درکار ہے وہ سب افراد کے لئے یکساں ہو اور جو زیادہ اہلیت رکھتے ہوں اُن کے لئے زیادہ حاصل کرنے میں کوئی رکاوٹ نہ ہو۔ اس طرح enterprise کی گنجائش باقی رہے گی اور ساتھ ہی امیر

اور غریب کی موجودہ زبردست تفریق بھی مٹ جائے گی۔

اعتراض کی وجہ

اصل میں سوشلزم یا محققہ تجاویز پر اعتراضات کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ ہم موجودہ نظام کے اس قدر عادی ہو گئے ہیں کہ اس میں تبدیلی کی تحریک کو شک اور شبہ کی نظر سے دیکھتے ہیں سوشلزم میں مذہب پر ضرب لگتی ہے۔ کیونکہ مذہب انفرادیت کا حامی ہے۔ اس میں نجات کا مسئلہ انفرادی حیثیت سے ہی تعلق رکھتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مذہب موجودہ نظام کو قائم رکھنا چاہتا ہے۔ اور صرف اس کی خرابیوں کی اصلاح اخلاقی طور پر کر دینا چاہتا ہے۔ تمام پیغامبر اور مصلحان یہی کام کرتے چلے آئے ہیں۔ مگر چونکہ نظام میں اساسی اور بنیادی تبدیلی نہیں کی گئی اس لئے کچھ عرصے کے بعد پھر خرابیاں عود کر آئیں۔ اور یہی سلسلہ آج تک جاری ہے۔

گاندھی ازم

گاندھی جی بھی اسی قسم کے ریفارمر ہیں۔ اور مذہب کے رنگ میں سب اصلاحات کرنا چاہتے ہیں۔ اسی لئے اُن کی تحریک ہندوستان جیسے ملک میں بڑی کامیابی حاصل کرتی ہے۔ ورنہ سچ پوچھئے تو یہ وہی تحریک ہے جو حضرت عیسیٰ نے کی تھی۔ اور تمام مذہبی پیشوا یاں کرتے چلے آئے ہیں۔ تشدد کی مذمت۔ موجودہ نظام کا قیام امیروں اور غریبوں کی اخلاقی اصلاح کے ساتھ۔ اور پھر اُن کے اصول کے مطابق بھی دولت کی ملکیت تو جاتی رہتی ہے کیونکہ وہ بتاتے ہیں کہ امیروں کو چاہیئے کہ وہ خود کو دولت کا مالک نہ سمجھیں بلکہ امانت دار سمجھیں۔ اول تو ایسی اخلاقی ذہنیت بالعموم پیدا ہو جانی بعید از قیاس ہے۔ البتہ یہ ممکن ہے کہ معدودے چند لوگ اس پر عمل کریں مگر کچھ نسلیں گزرنے کے بعد پھر وہی حالت ہو جائے گی۔ جس کا ہزاروں دفعہ تجربہ کیا جا چکا ہے۔ پھر غریبوں کو امیروں کے اخلاقی رحم و کرم پر چھوڑے رکھنا کوئی اطمینان بخش انتظام نہیں ہے کیونکہ اس کی ضمانت نہ کبھی ہوئی ہے اور نہ ہو گی۔

پھر امیروں کی امانت داری کا نظریہ اصل میں وہی ہے جو سوشلزم اقتضا ہے۔ وہ بھی سرمایہ داری کو مٹانا نہیں چاہتا۔ بلکہ ایسے ہاتھوں میں دینا چاہتا ہے جو ناجائز استعمال نہ کریں۔ اور رفاہ عام کے لئے وقف ہو۔ ظاہر ہے کہ یہ امانت داری کا کام انفرادی حیثیت سے بہتر قطعاتی کے ذریعے ہو سکتا ہے۔ بشرطیکہ قطعاتی یا ریاست اصلی معنوں میں جمہوری ہو۔ اور وہ کسی کی ملکیت نہ ہو۔ بلکہ صحیح طور پر پبلک سروس کے لئے قائم ہو۔

ناقابلِ عمل ہونے کا اعتراض گاندھی جی کے نظریئے میں بھی بڑی حد تک باقی رہتا ہے بلکہ سوشلزم کے مقابلے میں زیادہ ہے۔ کیونکہ گاندھی جی اس کو اخلاقاً کروانا چاہتے ہیں اور سوشلزم قطعاتی اور قانون کے ذریعے اور دونوں صورتوں کا فرق ظاہر ہے۔ البتہ یہ ضروری ہے کہ سوشلزم کی ذہنیت لوگوں میں بتدریج پیدا کی جائے۔ انقلابی طریقہ پر نہیں۔ اور یہ اس لئے بھی ضروری ہے کہ ہندوستان مذہبی ملک ہے اور لوگ اس کو یکایک کبھی قبول نہ کریں گے۔

گاندھی جی کی تحریک عدم تشدد کی ہر دلعزیزی کی وجہ بھی ہم لوگوں کی مذہبی ذہنیت ہے۔ اور اگرچہ ہم انفرادی طور پر کسی مذہب سے تعلق نہ رکھتے ہوں۔ مگر ہمارا مذہبی سماج۔ مذہبی ماحول، اور نسلوں کے اثرات اُس کے لئے باطنی طور پر سفارش کرتے ہیں۔ اور چونکہ ہندو مذہبی ذہنیت ہمیشہ سے تشدد کے منافی رہی ہے۔ اس لئے وہ ہندوؤں کو نسبتاً زیادہ اپیل کرتی ہے۔ اور یہ واقعہ ہے۔

اب رہی یہ بات کہ قطع نظر مذہب کے اُس میں فی نفسہٖ حُسن و قُبح کیا ہیں تو ہم اُس کا دل سے اعتراف کرتے ہیں کہ حکومت کے مقابلے میں غیر مسلح رعایا کے پاس اس سے بہتر اور کوئی حربہ نہیں ہو سکتا۔ ان مخصوص ماحول میں یہ تحریک قابلِ ستائش ہے۔ مگر ہر موقع اور ہر حالت میں اس پر اصرار کرنا نہ تو مصلحتاً درست ہوگا اور نہ فطرتاً یہ ممکن ہوگا۔ اس وقت تو سوائے اس کے کوئی چارہ ہی نہیں۔ مگر جب بحری اور بری اور ہوائی قوتوں کے ہم مالک بن جائیں تو اُس صورت میں اس قسم کے عدم تشدد اور ستیہ گرہ پر عمل کرنا محلِ نظر ہے۔

اور اصولاً بھی یہ غلط ہے کہ بعض قوتوں کو موقع اور محل کے لحاظ سے جائز طور پر بھی استعمال نہ کیا جائے اور اُن کو فنا کر دیا جائے اخلاق کے معنی یہ نہیں ہیں کہ موجودہ فطرت کو بدل دیا جائے۔ بلکہ قوائے کی

نشو و نما اس طرح کی جائے کہ اُن میں توازن قائم رہے اور بے محل اور بے ضرورت کوئی چیز استعمال نہ ہونے پائے۔ اور سب چیزیں موقع بموقع ظاہر ہوں۔

اہل یورپ میں سے جو بعض لوگ عدم تشدد کی تحریک سے ہمدردی رکھتے ہیں تو اس کی وجہ ظاہر ہے۔ وہاں تشدد کی زیادتی نے یا انفعالی کیفیت پیدا کر دی ہے۔ اور یہ بھی مخصوص صورت ہے۔ ایسی مخصوص صورتیں اور ہنگامی حالات کسی چیز کے مستقل حسن و قبح کو جانچنے کے لئے کسوٹی نہیں بن سکتے۔ اور مہاتما گاندھی کی موجودہ تحریک کو ہنگامی مصلحت سے زیادہ وقیع نہیں سمجھا جا سکتا۔ یہ ہمارے مذہبی اثرات اور خوش عقیدگی ہے کہ ہم اُس کو دوامی دستور العمل کا مرادف گردانتے ہیں۔

خواب کی سی رات

(کشتۂ وفا و محبت انیسۂ حیات کے نام سے معنون)

کیا سناؤں ہم نفس تھا کیا سماں کل رات کو
حُسن تھا دیوانہ سازِ قلب و جاں کل رات کو

رقص میں تھی ہر نظر، گردش میں تھا ہر ایک جام
جوش پر تھی بخششِ پیرِ مغاں کل رات کو

عشق تھا محوِ پرستش، حسن تھا جلوہ فروش!
غرقِ حیرت تھے زمین و آسماں کل رات کو

حکمتیں تھیں سرنگوں پیشِ جنونِ عاشقی!
ہیچ تھا اندیشۂ سود و زیاں کل رات کو

تھا نظر کے سامنے اک رہزنِ ایمان و ہوش
لُٹ رہا تھا زندگی کا کارواں کل رات کو

رُوح رقصاں مثالِ شعلۂ شمعِ حیات
وجد میں تھی محفلِ کون و مکاں کل رات کو

روبرو تھا رُوئے خورشیدِ شبابِ زندگی
چھٹ گئیں تھیں یاس و غم کی بدلیاں کل رات کو

ہاتھ میں تھا جامِ زر، پہلو میں جانِ رنگ و بُو
تھی محبت کامیاب و کامراں کل رات کو

اُٹھ رہی تھی دمبدم چشمِ حیا بارِ جمال
گر رہی تھیں پے بہ پے یوں بجلیاں کل رات کو

منتشر تھی زُلفِ مشکیں عارضِ گلرنگ پر
ظلمتیں تھیں نُور پر یوں حکمراں کل رات کو

سینۂ شفاف میں تھا جزر و مدِ شرم و شوق
یا تہ و بالا نظامِ دو جہاں کل رات کو

ہو رہا تھا امتحانِ ضبطِ شرحِ آرزو
لے رہا تھا کوئی یوں انگڑائیاں کل رات کو

خسروی تھا محوِ دیدِ روئے رنگینِ بہار
تُو کہاں تھا؟ ناصحِ صیدِ خزاں، کل رات کو

اعظم خسروی

پریم کی دنیا

محمد اسمٰعیل، افسر، رمضان پوری

"میں تیری وجہ سے شرم کے مارے کٹی جا رہی ہوں" یہ الفاظ تھے جو جمنا نے آنکھیں پوچھتے ہوئے اپنی بیٹی منورما سے کہے۔ "تری سی بے حیا اور بے شرم لڑکی میں نے نہیں دیکھی۔ تیری سی لڑکی پیدا کرنے کی بہ نسبت بے اولاد ہونا بدرجہا بہتر ہے۔ ذرا سوچ تو کہ تو نے کیسی بُری خبر سنی۔ ترے شوہر کا انتقال ہوگیا اور ترے دل پر اس کا ذرا بھی اثر نہ ہوا" منورما نے سر جھکا لیا۔ اور بے حس و حرکت بیٹھی رہی۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ منورما اس بری خبر سے ذرا بھی متاثر نہیں ہوئی تھی۔ نہ اُس نے گریہ و زاری کی۔ نہ اس کی آنکھیں اشک آلود ہوئیں اور نہ اس پر غشی کے دورے پڑے۔ اُس نے تعزیت کی ایک رسم بھی ادا نہ کی۔ رونے پیٹنے کے عوض اُس کے چہرے پر مسرت و استعجاب میں ملی ہوئی آزادی کی ایک عجیب و غریب جھلک پائی جاتی تھی۔ اِس کا سبب یہ نہ تھا کہ وہ کوئی بُری لڑکی تھی بلکہ در اصل وہ رونا اور چیخنا پسند نہ کرتی تھی۔ اور تصنع سے معرّا تھی۔ وہ بچپن ہی میں ایک دور دراز بستی میں بیاہ دی گئی۔ اُس کو یہ بھی معلوم نہ تھا کہ اُس کا شوہر کیسا ہے۔ ایسی حالت میں اُس کے لئے یہ ناممکن تھا کہ وہ اپنی عزیز اور قابل قدر ماں کو چھوڑ کر اپنے شوہر کے پاس ایک دور دراز بستی میں جانا پسند کرتی۔ اب وہ آزاد تھی جو چاہتی کرتی۔ اور جہاں چاہتی جا سکتی تھی۔ جمنا غصّے سے کانپ رہی تھی۔ اُس نے منورما کا ہاتھ زور سے پکڑ کر اپنی طرف گھسیٹتے ہوئے اس کے دونوں ہاتھوں کی چوڑیاں توڑ دیں اور اس کی زلف کی گرہیں کھول ڈالیں۔ "اب تو مناسب حال میں ہے" جمنا نے چلا کر کہا اور منورما کو دُور ڈھکیل دیا۔

اس بیدردانہ سلوک سے منورما کے نازک دل پر ایک چوٹ سی لگی۔ وہ زمین پر گر پڑی اور زار و قطار رونے لگی۔ اُسے اپنی ماں کی اس حرکت سے سخت صدمہ پہونچا۔ وہ روتی رہی چیختی رہی اور جمنا کو اس نظارے سے تسکین ہوتی رہی۔ جمنا نے دل ہی دل میں کہا۔ "منورما ابھی بہت ہی کمسن ہے۔ وہ زمانے کی رفتار کو سمجھنے سے مجبور ہے۔ وہ اس بڑے نقصان کا اندازہ بھی نہیں کر سکتی۔ میں نے جو کچھ کہا وہ اچھا ہی کہا۔ اس میں کیا مضائقہ ہے، اگر میں نے ذرا جھڑکی سے کام لیا۔ کیا اسے جھڑکنا مناسب نہ تھا، کیا یہ ایک وفادار ماں کا فرض نہیں کہ وہ اپنی بیٹی کو راہِ راست پر چلنے کی ہدایت کرے۔"

منورما سیڑھیوں سے ہوتی ہوئی چھت کے اوپر چڑھ گئی۔ اپنے کمرے میں داخل ہوئی۔ دروازہ اندر سے بند کر لیا۔ اور اپنے کو ایک بستر پر ڈال کر زار زار رونے لگی۔ جمنا بھی دبے پاؤں سیڑھیوں سے ہوتی ہوئی چھت کے اوپر چڑھ گئی۔ منورما کے کمرے کے پاس ٹھیر گئی اور کمرے کے اندر ایک سوراخ کے ذریعے سے جھانکنے لگی۔ جب اُس کی نظر منورما پر پڑی وہ مسکرائی اور اس کا دل خوشی سے اُچھلنے لگا۔ "کیا میں نے گمراہ منورما کے ساتھ مناسب برتاؤ نہیں کیا ہے۔ میں اس کو تھوڑی دیر کے لئے تنہا چھوڑے دیتی ہوں۔ تاکہ وہ اپنی اس مصیبت کو سمجھے اور مناسب طریقے پر آہ و زاری کرے۔" اتنا کہہ کر وہ پلٹ گئی۔

چند گھنٹے بعد منورما کا جاترے کو جانے کا ارادہ ہوا۔ اُسے خیال آیا کہ اِس وقت ماگھ میلے کے موقعہ پر کس طرح جاتریوں کی بڑی جماعت

گنگا اور جمنا کے درمیان مجتمع ہوتی ہے۔ سنکرانتی کا دن تھا اور دوپہر کا وقت۔ زمین سے لے کر آسمان تک پوری فضا گرد و غبار سے بھری تھی۔ تمام ہندؤں کے دلوں میں مذہبی جوش و خروش موجزن تھے سنگرام میں اشنان کرنے کے بعد منورما اور جمنا میلے کی مختلف دوکانوں کی خریداری سے فراغت پا کر بند کی طرف واپس جا رہی تھیں۔ دونوں جا بجا ٹھیرتیں اور غریبوں اور لاچاروں کو جو گرد و غبار سے اٹی ہوئی گنجان سڑک کی ہر دو جانب نظر آتے تھے۔ بھکوں اور اناجوں کی رسمی خیراتیں دیتیں اور سنگرام کی طرف جانے والے سادھوؤں کے ایک اکھاڑے کا نظارہ کرتی چلی جا رہی تھیں۔ دونوں آہستہ آہستہ قدم اٹھائے جا رہی تھیں کہ دیہاتیوں کا ایک ہجوم پیچھے کی طرف سے آ، یا تھا یہاں تک کہ ان دونوں کے قریب آکر منتشر ہو گیا۔ بیچاری منورما بھیڑ میں کھو گئی اور آگے کو بڑھ گئی وہ بہت ہی مشکلوں سے اپنے کو اس ہجوم سے الگ کرنے میں کامیاب ہوئی۔ جب دیہاتیوں کی یہ جماعت بہت آگے بڑھ گئی تو منورما اپنی ماں کو تلاش کرنے میں مشغول ہو گئی۔ اس نے اپنی ماں کی جستجو میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا۔ لاکھ جستجو کی لیکن اس کو نہ ملنا تھا نہ ملی۔ رنج و غم میں ڈوبی ہوئی منورما ایک تنہائی کی جگہ بیٹھ گئی اور زار و قطار رونے لگی۔

"اے نوجوان لڑکی۔ تم کیوں رو رہی ہو" منورما نے اپنی آنکھیں پونچھ ڈالیں اور نظر اٹھائی تو دیکھا کہ دو اجنبی اس کے سامنے کھڑے ہیں۔ ان میں سے ایک نے کہا جہاں تک ممکن ہوگا ہم دونوں تمھاری مدد کریں گے۔ مہربانی کرکے ہمیں اپنی مصیبت سے آگاہ کر دو"

منورما نے ان دونوں کو اپنے رنج و غم کی وجہ بتلا دی۔

"اے نوجوان لڑکی صبر سے کام لو۔ مایوس ہونے کی کوئی ضرورت نہیں۔ ہم دونوں فوراً تمھاری ماں کو تلاش کرلیں گے۔ ہمارے ساتھ چلو" اتنا کہہ کر اس شخص نے ایک معنی خیز نظر اپنے ساتھی پر ڈالی۔ منورما نے ان کا شکریہ ادا کیا۔ اٹھی اور ان کے ساتھ چل پڑی۔

وہ دونوں تھوڑی دیر تک ادھر ادھر گھومتے رہے اور جمنا کی تلاش و جستجو کرتے رہے۔ اس کے بعد ایک ایسی سڑک پر پہونچے جو میلے کے احاطے سے دور ایک کشادہ میدان کی طرف جاتی تھی۔ منورما کے دل میں ایک خوف سا سمایا وہ ٹھیر گئی، اور بولی۔

"اب ہم لوگ کہاں جا رہے ہیں"

"ہم ایک ایسی جگہ جا رہے ہیں جہاں امید ہے کہ تمھاری ماں مل جائے گی"

"سنسان میدانوں میں مجھے یقین ہے کہ میری ماں کا پتہ نہ لگے گا"

"یہ مختصر راستہ اسی جگہ کو جاتا ہے ہم تمھیں وہیں لے جا رہے ہیں"

ایک شخص جو منورما کے بہت ہی قریب تھا آگے بڑھا اس کا ہاتھ زور سے پکڑ لیا اپنے آگے کی طرف کھینچنے لگا۔ دوسرا شخص بھی اپنے ساتھی کا شریک کار ہو گیا۔ منورما نے ایک چیخ ماری اور ان کے پنجوں سے رہائی پانے کی انتھک کوششیں کیں لیکن اس کی تمام کوششیں بیکار گئیں۔ بدمعاش اسے اپنے قبضے میں لانے کی کوششیں کرتے رہے۔ منورما ان کے قبضے میں جانا نہیں چاہتی تھی۔ چیخ پر چیخ مار رہی تھی اور آزادی کے لئے بے حد جد و جہد کر رہی تھی۔ اس کی چیخیں سنکر ایک متناسب الاعضا خوش رو اور معزز جوان اس کی مدد کو پہونچ گیا۔

ٹھیرو، ٹھیرو تم اس لڑکی کو کیوں ستا رہے ہو۔

"تمھیں دوسروں کے کام میں دخل دینے کی کیا ضرورت ہے؟ یہ ہماری بہن ہے ایک شخص کے ساتھ بھاگ گئی تھی۔ ہم اسے اپنی قیام گاہ پر لے جا رہے ہیں"

"نہیں نہیں یہ سراسر جھوٹ ہے۔ میں انھیں بالکل نہیں جانتی۔ یہ میرے بھائی نہیں ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ میری ماں بھیڑ میں کھو گئی اور جبکہ میں اس کو تلاش کر رہی تھی یہ دونوں راستہ میں ملے۔ پہلے تو انھوں نے وعدہ کیا کہ ہم حتی الامکان تمھاری مدد کریں گے اور تمھاری ماں کو تلاش کریں گے لیکن اب میرے ساتھ اس طرح کا برتاؤ کر رہے ہیں۔ جسے آپ خود دیکھ رہے ہیں۔

اے بدمعاشو! رحمدل جوان نے کہا اور ایک زور کا گھونسہ اس شخص کے منہ پر مارا جو دونوں میں زیادہ کمینہ معلوم ہو رہا تھا۔ اس کے پاؤں لڑکھڑائے اور وہاں سے چلتا بنا۔ اس کا ساتھی بھی یہ دیکھکر کہ شکار ہاتھ سے جاتا رہا، فرار ہو گیا۔ منورما نے بہادر مہربان کا تہ دل سے شکریہ ادا کیا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

"اپنے ہوش و حواس درست کرو اور صبر سے کام لو۔ اب خوف کرنے کی کوئی بات نہیں۔ آؤ ہم دونوں مل کر جستجو کریں" منورما نے فوراً اپنے حواس درست کئے اور اپنی اشک آلود آنکھیں آنچل سے پونچھکر اس کے ساتھ ہولی۔

بہادر جوان اس کو سیوا سمتی کے خیمہ میں لے گیا جہاں جمنا اپنی بیٹی کا نہایت ہی بےچینی کے ساتھ انتظار کر رہی تھی۔ پھر فوراً دونوں کو اپنی گاڑی میں بٹھا کر ان کے گھر پہونچا دیا۔ منورما کو جب اس پردرد و پُرالم واقعہ کا خیال آتا اُس کی آنکھیں شکر گذاری اور خوشی کے اشکوں سے لبریز ہو جاتیں وہ دل ہی دل میں کہتی "مجھ پر کتنی بڑی مصیبت آتی۔ اگر رجندر میری آہ و زاری کی پروا نہ کرتا۔ رجندر کیسا شریف جوان اور کتنا بہادر نیک دل اور ہمدرد انسان ہے۔

رات کی تاریکی پھیل رہی تھی۔ ایک تیز رفتار گاڑی جمنا کے گھر کے پاس آکر رک گئی۔ رجندر گاڑی سے اتر گیا اور دروازہ پر دستک دی۔ جمنا نے دروازہ کھولا۔ رجندر اندر داخل ہوا اور جمنا کو جھک کر آداب کیا۔ جمنا رونے پیٹنے لگی۔

ماتا کیا بات ہے آپ کیوں روتی ہیں۔

جمنا نے بیٹھی ہوئی آواز میں کہا "میرے بیٹے غضب ہو گیا منورما کا شوہر اب اس دنیا میں نہیں رہا۔

خدایا یہ کیا غضب ہوا اس کا شوہر فوت ہو گیا؟

ہاں آج ہی صبح یہ بُری خبر ہم لوگوں کو ملی۔

کس عارضہ میں وہ مبتلا تھے۔

ہمیں ایک مختصر مضمون کا تار ملا۔ اس میں بیماری کی کیفیت درج نہ تھی۔

کیا ہی بدقسمتی کی بات ہے مجھے اس خبر سے سخت صدمہ پہونچا ہے میں ہر ممکن طریقہ پر آپ لوگوں کی مدد کرنے کو تیار رہوں۔ ان معاملات میں انسان مجبور محض ہے۔ تقدیر کے خلاف کوئی جنگ نہیں کر سکتا۔ وہی ہوتا ہے جو قسمت میں لکھا ہوتا ہے۔ کوئی نوشتۂ تقدیر کا ایک حرف بھی نہیں مٹا سکتا۔ تقدیر کا ہر حکم اٹل ہے۔ اس کے سوا کوئی چارۂ کار نہیں کہ انسان تقدیر کے حکموں کو برضا و رغبت قبول کرے اور صبر سے کام لے"

"میرے پیارے بیٹے تم سچ کہتے ہو اس کے سوا ہم لوگ اور کیا کر سکتے ہیں"

منورما کہاں ہے!

وہ کوٹھے پر ہے اگر کہو تو میں اس کو بلا لوں۔

نہیں اس کی ضرورت نہیں۔ میری موجودگی سے اس وقت اسے تکلیف ہوگی۔ میں خیال کرتا ہوں کہ آپ منورما کو اُس کے سسر کے گھر بھیج دیں گی۔

نہیں وہاں بھیجنے کا خیال نہیں ہے۔ وہ آج تک وہاں کبھی نہیں گئی۔ ایسی حالت میں اس کا وہاں اب جانا نامناسب ہوگا۔

آپ صحیح کہہ رہی ہیں۔

یہ دونوں اپنے اپنے خیالات میں محو تھوڑی دیر تک خاموش رہے۔ آخر رجندر نے پھر سکوت کو اس طرح توڑا۔

"میں آپ کو ایک مشورہ دینا چاہتا ہوں اگر آپ نامناسب نہ سمجھیں تو تھوڑے عرصے کے لئے آپ دونوں میرے دوسرے مکان میں جو گنگا کے لب ساحل واقع ہے۔ منتقل ہو جائیں۔ وہاں چند نوکروں کے سوا کوئی دوسرا نہیں رہتا۔ تبدیلیٔ آب و ہوا آپ دونوں کے لئے مفید ثابت ہوگی"

میرے عزیز تمہارا شکریہ۔ مجھکو کوئی عذر نہیں۔ لیکن خیال تو کرو ہمارے ایسے غریبوں کا ایک امیر شخص کے محل میں رہنا مناسب معلوم ہوتا ہے"

میری پیاری ماتا آپ یہ کیسی باتیں کر رہی ہیں۔ میں نے بارہا آپ سے التجا کی کہ آپ مجھے اپنا پُتر سمجھیں۔ لیکن آپ نے اُس کی مطلق پروا نہ کی۔ میں آپ کو اپنی ماتا کے مانند سمجھتا ہوں اور اسی طرح آپ کی عزت کرتا ہوں۔ پھر آپ مجھے اپنا پُتر کیوں نہیں سمجھتیں"

بیٹا برا نہ مانو ـــــ میں تمھیں اپنا پتر ہی سمجھتی ہوں۔ میں یقین کے ساتھ کہتی ہوں کہ میں تمھیں برابر اپنا عزیز ہی سمجھتی رہی ہوں۔ میں ایسا کیوں سمجھتی ہوں اس کا جواب میرے جذبات ہی دے سکتے ہیں"

شکر ہے کہ آپ مجھے اپنا پتر سمجھتی ہیں میں ابھی اس گھر کو روانہ ہوتا ہوں اور ضروری انتظامات کر کے ایک گھنٹہ کے اندر واپس آتا ہوں"

بہت اچھا میرے عزیز ہم دونوں اس گھر کو روانہ ہو جائیں گے۔

چند گھنٹے بعد جمنا اور منورما اپنے معمولی گھر سے رجندر کے عالیشان محل روانہ ہوگئیں۔ رجندر نے دروازے کے پاس ان دونوں کا پر زور طریقہ پر خیر مقدم کیا۔ اپنے گھر کا ہر حصہ انھیں دکھایا اور کہا "آپ لوگ اس گھر کو اپنا گھر سمجھ کر جب تک چاہیں رہیں۔ یہاں کسی طرح کی تکلیف نہ ہوگی۔"

اس کے بعد اس نے منورما کو تنہا پاکر کہا: رنج و غم نہ کرو منورما خوشی خوشی زندگی بسر کرو۔ رنج و غم میں زندگی کاٹنی حماقت ہے۔ دیکھو تو یہ دنیا کس قدر انبساط سے بھری ہوئی ہے" منورما نے کوئی جواب نہ دیا۔

کیا تم اس جگہ کو پسند کرتی ہو۔

بہت زیادہ

مجھے یہ سنکر بہت خوشی ہوئی کیا تم یہاں برابر رہنا پسند کروگی۔

یہ میرے لئے کس طرح ممکن ہو سکتا ہے۔

جہاں تک تمہاری پیاری ماں کا تعلق ہے۔ تمھیں ان کی طرف سے کسی طرح کی رکاوٹ نہ ہوگی۔

لیکن آپ یہ کیوں چاہتے ہیں کہ میں یہاں ہمیشہ رہوں۔

اس کا سبب ------- میں تمھیں بتادوں گا۔

منورما نے ایک متجسسانہ نگاہ اس پر ڈالی لیکن رجندر نے اپنا رُخ دوسری طرف پھیر لیا اور چھت کی طرف دیکھنے لگا۔ وہ اس گفتگو کو بے موقعہ جان کر کمرے سے نکل گیا۔

دوسرے روز رجندر جمنا اور منورما کے لئے بے شمار تحفے لایا۔ ان میں بیش قیمت ساڑیاں۔ نفیس کرتیاں اور نازک جوتیاں، بالوں کے لئے کانٹے۔ صابن۔ خوشبودار تیل۔ پوڈر اور اسی طرح کی دوسری سنگار کی چیزیں تھیں۔ منورما ان سے آراستہ ہو کر عالی شان محل کے خوبصورت اور پرفضا باغ میں چہل قدمی کر رہی تھی۔ اس کے ہر رگ و ریشہ میں ایک عجیب طرح کی خوشی اور انبساط کی لہر دوڑ رہی تھی۔ اس سے پہلے اس نے اپنے کو کبھی اتنا محظوظ اور بشاش نہ پایا تھا۔ اس کے جذبات اونچے اونچے درختوں کے ہرے بھرے پتوں پر اور گلشن شاداب کے پھولوں کی ہر پنکھڑی پر اپنا عکس ڈال رہے تھے۔ پھولوں کی بھینی بھینی اور خوشگوار بُو سے بھری ہوئی نشاط افزا ہوا چل رہی تھی اور اُس کے جھونکوں سے درختوں کی پتیاں اور شاخیں مستانہ وار جھوم رہی تھیں۔ منورما باغ کی سیر کرتی ہوئی پھولوں کی ایک کیاری کے پاس ٹھہر گئی۔ اس نے ایک خوشنما پھول توڑا اُسے سونگھتی اور مسکراتی باغ کے ایک دور دراز گوشے کی طرف جہاں سے دریاؤں اور اُن کے ساحلوں کا آسانی سے نظارہ ہوسکتا تھا، روانہ ہوگئی۔ یہاں پہونچکر وہ چار دیواری کے پاس کھڑی ہوگئی اور اپنی نشیلی اور رسیلی آنکھوں کو ہر طرف کے مناظر قدرت کے نظارے کی دعوت دیتی رہی۔ دریائے گنگا پیچدار راستوں سے ہو کر نہایت ہی شان و شکوہ کے ساتھ بہہ رہا تھا فضا بالکل ساکت تھی۔ ہر طرف سناٹا چھایا ہوا تھا۔ چند چڑیوں کی چہچہاہٹ کے سوا جو ادھر اُدھر اُڑ رہی تھیں یا ایک کسان کی بلند آواز کے علاوہ جو دور سے آرہی تھی، کچھ سنائی نہ دیتا تھا۔ یہ تمام نظارے منورما کے لئے بہت ہی دلفریب اور دلکش ثابت ہو رہے تھے۔ اتنے میں ایک آواز آئی۔

"منورما" منورما اپنے تصورات سے چونکی۔ دیکھا کہ رجندر اُس کے سامنے کھڑا ہے۔ اُس کے لب دلفریب مسکراہٹ کے ساتھ کھلے۔

رجندر نے کہا۔

"تم اس وقت کتنی حسین نظر آرہی ہو۔ یہ نارنجی رنگ کی ساری تمھیں بہت زیب دے رہی ہے" منورما نے اپنے چہرے سے حیرت و استعجاب کو دور کیا، اور اپنی گردن شرم کے مارے جھکا دی۔ وہ اب ذرا بھی خوفزدہ نہ تھی۔ رجندر نے پھر کہا۔

میں تم سے کچھ خاص باتیں کرنی چاہتا ہوں۔ چلو ہم دونوں اس جگہ چلیں۔"

منورما ——— بہت خوب"

وہ دونوں ایک چٹان پر پہونچے اور اس پر بیٹھ گئے۔ رجندر نے کہا۔

گذشتہ رات تم نے مجھ سے دریافت کیا تھا کہ میں تمھیں کیوں یہاں ہمیشہ کے لئے ٹھہرانا چاہتا ہوں۔ اس وقت میں نے اس کا جواب آئندہ موقع کے لئے ملتوی رکھا تھا۔ اب میں اس کا جواب دیتا ہوں۔ کیا تم اُسے سننا چاہتی ہو؟"

ہاں میں اس کا سبب معلوم کرنا چاہتی ہوں۔

میں امید کرتا ہوں کہ تم بُرا نہ مانوگی۔ اگر میں براہِ راست اس کا جواب دوں"

نہیں نہیں میں کبھی بُرا نہیں مان سکتی۔

میں نہایت ہی بے تکلفی کے ساتھ اس بات کا اقرار کرتا ہوں کہ مجھے تم سے محبت ہے۔

یہ سنکر وہ شرم وحیا سے پسینے پسینے ہوگئی اور اپنے چہرے کو دوسری جانب پھیر لیا۔

میں تم سے اسی روز سے محبت کرتا ہوں جبکہ اول اول میری نظر تم پر پڑی تھی۔ لیکن اس وقت عرضِ مدعا سے ڈرتا تھا اب مجھ سے ضبط کی طاقت رخصت ہوگئی۔ میں رازِ محبت کو پوشیدہ نہ رکھ سکا۔ اور صاف صاف لفظوں میں ظاہر کر دیا۔ اب صورتِ حال بدل گئی ہے۔ اُس وقت تم شادی شدہ تھیں۔ لیکن اب آزاد ہو۔ مجھے صرف ایک بات کا جواب دو۔ کیا تمھیں مجھ سے محبت ہے؟ منورما نے اس کا جواب دینے کی ہزار کوشش کی۔ لیکن اس کے منھ سے ایک لفظ بھی نہ نکل سکا۔

رجندر سے نہ رہا گیا۔ اس نے کہا منورما شرم نہ کرو تم اب جوان ہو۔ اپنے حالات کو اچھی طرح سمجھ سکتی ہو۔ میں نے تم سے نہایت ہی بے تکلفی سے اقرار کیا ہے۔ اب تمھارا فرض ہے کہ تم بھی ایسی ہی بے تکلفی سے اس کا جواب دو"

منورما نے بہت ہی آہستہ آہستہ اپنا چہرہ اس کی طرف بڑھا دیا۔

"شکریہ تمھارا۔ اب بڑی بے تکلفی کے ساتھ جواب دو۔ کیا تم مجھ سے محبت کرتی ہو"

"ہاں میں آپ سے محبت کرتی ہوں"

رجندر یہ سنکر بہت ہی مسرور ہوا۔ اور جذبات میں ڈوب کر منورما کو اپنے بازوؤں پر لٹا دیا۔ اس کے خوبصورت رخساروں اور نازک ہونٹوں پر بیشمار بوسے ثبت کر دئے۔

"ماتا مجھکو کیا کہیں گی" منورما نے اپنے کو اس کے بازوؤں سے چھڑاتے ہوئے کہا۔

"تمھیں ڈرنے کی کوئی ضرورت نہیں، میں نے اس کے متعلق اُن سے گفتگو کرلی ہے۔ ہم دونوں کے اتحاد پر وہ رضامند ہیں"

"تب کوئی ہرج نہیں"

میں تم سے نہیں کہہ سکتا کہ اس وقت میں کس قدر خوش ہوں تم کتنی حسین ہو میں تمھیں دل سے پیار کرتا ہوں۔ تمھارا حسن بے نظیر ہے اس کا کوئی مقابلہ نہیں کرسکتا"

"آپ خواہ مخواہ میری تعریفیں کر رہے ہیں۔ میں تو اتنی حسین نہیں ہوں"

یقین مانو۔ پیاری منورما میں تمھاری خوشامدانہ تعریفیں نہیں کر رہا ہوں۔ میں نے جو کچھ کہا وہ حقیقت کا اظہار ہے۔ میں وہی کہہ رہا ہوں جو میرا دل اس وقت سے کہنا چاہتا تھا جب کہ میں پہلے پہل تم سے ملا تھا۔ لیکن آج تک اُسے اپنے سینے ہی میں محفوظ رکھا۔ اس وقت میں ضبط نہ کرسکا۔ اور رازِ محبت افشا کر دیا۔

میں نے برابر تمھاری تعریف کی اور ہمیشہ تمھیں پسندیدہ نظروں سے دیکھا۔

میرے دل کو بیحد خوشی حاصل ہو رہی ہے کہ تمھارے لب نازک سے ایسے تعریفی الفاظ سن رہا ہوں۔ میں نے برابر نہایت ہی ناخوشگوار زندگی بسر کی۔ لیکن اب مجھ سے زیادہ کوئی خوش نصیب نہیں۔ وہ گھڑی کتنی مسعود ومبارک تھی کہ میں نے گنگا کے ساحل پر تمھاری آہ وزاری سنی اور اسے مسترد نہ کر دیا"

اور مجھ پر مصیبت والم کا کیسا بھاری پہاڑ ٹوٹ پڑتا اگر تم مجھ کو ان بدمعاشوں کے پنجے سے رہائی نہ دلاتے۔ اسی دن سے میرے دل دل میں تمھاری محبت پیدا ہوگئی اور آج تک اس رازِ محبت کو اپنے دل ہی میں پوشیدہ رکھا۔

لیکن تمھیں ایک نازک موقع سے رہائی دلاکر میں نے خود اپنے آپ کو ایک بڑی مصیبت سے آزاد کیا ہے۔

تم اپنی مصیبت بیان کر رہے ہو۔ لیکن یہ کس طرح ممکن ہے کہ ایک شخص اس قدر مال و دولت رکھنے کے باوجود مصیبت زدہ ہو"

صرف دولت ہی انسان کی خوشی کا سبب نہیں بن سکتی انسان کے خوش رہنے کے لئے دوسری چیزیں بھی درکار ہیں جن کا تعلق اُس کے

دل سے ہوتا ہے۔ ایک شخص کتنا ہی امیر کبیر کیوں نہ ہو اور عیش و راحت کے تمام سامان مہیا کیوں نہ ہوں۔ لیکن اگر کوئی اس سے محبت نہیں کرتا تو اس کی تلخ ہو جاتی ہے۔ اور اس کا دل برابر غمزدہ رہتا ہے۔ تم سے ملنے کے قبل میرے دل میں کسی کی محبت پیدا نہیں ہوئی تھی۔ میرے پاس دل تھا لیکن محبت سے خالی۔ آرام و آسائش کی تمام چیزیں موجود تھیں۔ لیکن سچی خوشی مفقود۔ یہ میری سخت بدنصیبی تھی کوئی حیرت کی بات نہیں کہ میں مصیبت زدہ تھا۔"

بعینہ یہی حالت میری تھی۔ لیکن اب ایشور کا ہزار ہزار شکریہ ادا کرتی ہوں کہ اُس نے میری زندگی کے لئے تم سا لائق رفیق عطا فرمایا۔

"آہ پیاری پیاری" وہ پھر اس کے قریب تر ہو گیا۔

خوشی و انبساط اور عشرت و راحت کے کئی مہینے گزر گئے جوں جوں دن گذرتے گئے ان دارفتگانِ الفت کی آتشِ محبت تیز تر ہوتی گئی۔ دونوں نہایت ہی اطمینان وسکون کے ساتھ زندگی بسر کر رہے تھے۔ ایک دن منورما ایک کوچ پر لیٹی ہوئی نہایت ہی محویت و استغراق کے ساتھ ایک دلچسپ ناول کا مطالعہ کر رہی تھی۔ یہ ایک بہت ہی ولولہ انگیز ناول تھا۔ اس میں ایک بہادر ڈاکو، اُس کے شریک کار اور ایک ہوشیار اور تجربہ کار خفیہ پولیس کے کارنامے دکھائے گئے تھے۔ آدھی رات کا وقت تھا کہ اس قصہ کا ڈاکو ایک امیر کبیر کے عالی شان محل میں داخل ہوا اور اپنی اولوالعزمی اور بہادری سے ایک مستحکم دروازے کو کھولنے کی کوشش کی۔ اُس نے دروازے کا قفل اپنے ہاتھ کی صفائی سے آن کی آن میں کھول ڈالا۔ اس کے بعد سامنے والے ایک دوسرے آہنی دروازے کو کھولنے میں کامیاب ہوا۔ منورما کی متاثر نظریں سطروں پر دوڑ رہی تھیں۔ اس کے سارے جسم میں ایک عجیب قسم کا ارتعاش پایا جاتا تھا۔ رجندر کمرے میں داخل ہوا لیکن منورما پر کچھ ایسی محویت طاری تھی کہ اس کو رجندر کے آنے کی مطلق خبر نہ ہوئی۔ منورما چونک پڑی۔ اُس نے اپنی نگاہیں کتاب پر سے ہٹا لیں اور رجندر کی طرف دیکھنے لگی۔ اس کا چہرہ شرم آلود تھا۔ لیکن فوراً اُس کے سُرخ سُرخ ہونٹوں پر ایک خفیف سی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔

"مجھے یہ دیکھکر بڑی مسرت ہوئی" رجندر نے منورما کے بغل میں بیٹھتے ہوئے کہا کہ تم مطالعہ میں اس قدر منہمک رہتی ہو۔ پیاری منورما تم ابھی کیا پڑھ رہی تھیں۔

یہ وہی ناول ہے جو تم نے مجھے کل لاکر دیا تھا۔

اس کے متعلق تمہارا کیا خیال ہے۔

یہ ایک نہایت ہی دلچسپ جاسوسی ناول ہے" یہ کہہ کر اس نے کتاب بند کر دی اور ایک چھوٹی سی میز پر جو نزدیک ہی تھی رکھ دی۔

رجندر نے ایک سگرٹ سلگایا۔ اسے پیتا رہا اور اس کی نظریں دھوئیں پر جمی رہیں۔ وہ چند سکنڈ اپنے تصورات میں کھویا رہا۔ پھر لب کھولے اور کہا۔

"پیاری منورما میں تم سے براہِ راست ایک سوال کرنا چاہتا ہوں۔ اور اُمید کرتا ہوں کہ تم بھی اس کا جواب براہ راست ہی دینے کی کوشش کرو گی۔

منورما نے اس کی طرف اپنی مستفسرانہ نگاہیں ڈال دیں اور کہا۔

پیارے وہ سوال کیا ہے۔

اگر تم پر کبھی یہ راز منکشف ہو جائے کہ میری ہستی ایک مجرم سے بہتر نہیں تو ایسی حالت میں میرے ساتھ تمہارے کیا برتاؤ ہوں گے۔

خدا کے لئے اپنے سوال کو ذرا صراحت کے ساتھ بیان کیجئے۔

کیا یہ راز جان لینے کے بعد میری محبت تمہارے دل میں باقی رہے گی۔

لیکن پیارے آپ ایسا انوکھا سوال کیوں کر رہے ہیں۔

اس سوال کی حقیقت ایک فوری تخیل سے زیادہ نہیں۔ لیکن میں اس کا جواب سننے کے لئے بےچین ہوں۔

میں کامل یقین کے ساتھ کہتی ہوں کہ کوئی بدترین قسم کا انکشاف بھی تمہاری محبت کو میرے دل سے کم نہیں کر سکتا۔

میں بہت ہی محظوظ ہوں کہ تمہاری پیاری زبان سے ایسے دل خوش کن الفاظ نکل رہے ہیں۔ یہ الفاظ کتنے قابلِ اعتبار ہیں۔ میرا اُس سوال سے کوئی خاص مطلب نہیں ہے۔ لیکن پیاری منورما محبت میں رشک وحسد اور بدگمانی کا ہونا لازمی ہے۔ میں نے مصمم ارادہ کر لیا ہے کہ میں اپنی تمام

زندگی صرف تمہاری ہی محبت میں بسر کروں گا۔ اور اب میں اپنے دل کو اس بات کا یقین دلانا چاہتا ہوں کہ بدترین حالات میں بھی تمہارے خیالات میری طرف سے بدل نہیں سکتے ؟

نہیں نہیں۔ تمھیں اس بارے میں بدگمان نہ ہونا چاہیئے۔ تم سے ملنے کے قبل میرے دل میں کسی کی محبت نہ تھی اور اب میں تمھیں یقین دلاتی ہوں کہ کسی حال میں بھی میری محبت میں کمی واقع نہیں ہوسکتی بلکہ میری محبت میں روز بروز اضافہ ہوتا جائے گا۔

اس کے بعد رجندر نے موضوعِ کلام کو بدل دیا۔ اور دو گھنٹہ بعد منورما سے رخصت لے کر اپنے دوسرے مکان کو کسی ضرورت سے چلا گیا۔ منورما پھر وہی ناول بڑے ذوق و شوق سے پڑھنے میں مصروف ہوگئی۔

آدھی رات گذر چکی تھی، منورما اپنے بستر پر لیٹی ہوئی اُسی دہشت انگیز ناول کا مطالعہ کر رہی تھی۔ جمنا پاس ہی دوسرے بستر پر خراٹے لے رہی تھی۔ منورما کی نظریں ناول کی سطروں پر جمتی نہ تھیں بلکہ ادھر اُدھر تیر رہی تھیں آخرکار اس کے ہاتھ سے کتاب گر پڑی۔ اُس نے پھر کتاب اٹھالی اور پڑھنے کی بیکار سعی کرنے لگی۔ کیونکہ اب اس کے لئے دو سطریں بھی پڑھنا ناممکن تھا۔ جب اس کی تمام سعی و کوشش بیکار ثابت ہوئی تو اُس نے کتاب میز پر رکھدی اور میز کی شمع کو گل کر کے آنکھیں بند کرلیں۔ بمشکل ایک گھنٹہ بھی نہ سوئی تھی کہ اُس کے منہ سے ایک دلخراش چیخ نکل کر ساری فضا میں گونج گئی۔ منورما چونک کر اپنے بستر سے اُٹھ بیٹھی۔ جمنا اُس کی دلدوز چیخ سنکر جاگ اُٹھی اور اُس کے پاس پہونچ گئی۔

" منورما کیا بات ہے تم کیوں ڈر رہی ہو " اُس نے متفکرانہ لہجہ میں کہا اور اُس پر جھک گئی۔

" ماتا مجھے ایک گلاس پانی لاکر دو " اُس کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا اور سارے جسم پر لرزہ طاری تھا۔ جمنا فوراً ایک گلاس پانی لے کر آئی۔ منورما نے اس کے ہاتھ سے گلاس لے لیا۔ اور ایک ہی گھونٹ میں سارا پانی چڑھا گئی۔

" پیاری بیٹی تم نے ابھی کیوں ایک دلخراش چیخ ماری " جمنا نے اُس کے ہاتھ سے گلاس واپس لیتے ہوئے دریافت کیا۔

میں نے ایک بڑا ہی وحشتناک خواب دیکھا ہے۔

تم نے خواب میں کیا دیکھا ؟

میں نے خواب میں دیکھا کہ میں ایک لق و دق اور وحشتناک صحرا میں پہونچ گئی ہوں اور وہاں اِدھر اُدھر خوفزدہ و سراسیمہ بھٹکتی پھر رہی ہوں اس مقام کی ساری فضا بڑی ہی ہیبت ناک تھی۔ ناگہاں دو کانسٹیبل میرے نزدیک آگئے۔ مجھے گرفتار کر لیا۔ اور میرے ہاتھوں میں ہتھکڑی پہنا دی۔ اور کہا کہ مجھے قتل کے الزام میں گرفتار کیا گیا ہے۔ میں خوف کے مارے کانپ رہی تھی کہ میری آنکھ کھل گئی۔

بیشک یہ بُرا خواب تھا۔ یقیناً بعض خواب سچے ہوتے ہیں اور آئندہ واقعات کی پیشین گوئی کرتے ہیں۔ لیکن بعض خواب سراسر جھوٹے اور بے معنی ہوتے ہیں۔ تمھارا خواب بھی بالکل جھوٹا ہے۔

نہیں ماتا میرا ضمیر کہہ رہا ہے کہ یہ خواب سچا ہے اور اس کی اصلیت ضرور ہے۔

منورما یہ ایک احمقانہ خیال ہے اس لئے تمھارے دماغ کو سخت تکلیف پہونچے گی۔ اس خواب کو بھول جاؤ۔ اور اپنے وہم کو دماغ سے نکال دو۔

بہت اچھا پیاری ماتا، میں اسے بھول جاؤں گی۔ پھر اُس نے آنکھیں بند کرلیں۔ لیکن اُسے نیند نہ آتی تھی۔ خواب کی وجہ سے اس کے دل میں ایک خوف سا سمایا تھا اور اُس کا دماغ پریشان تھا آخرکار بڑی کوشش کے بعد رات کے آخر حصہ میں اُس کی آنکھ لگ گئی۔ جب صبح بیدار ہوئی تو اُس نے رجندر سے خواب کے تمام واقعات بیان کر دئے۔

پیاری منورما گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ جب انسان کا دماغ عالمِ بیداری میں طرح طرح کے خیالات سے پریشان رہتا ہے تو اسے خواب میں بھی وہی خیالات یکے بعد دیگرے آتے رہتے ہیں۔ انہی دماغی پریشانیوں کی وجہ سے انسان خواب دیکھتا ہے۔ خواب کی کوئی حقیقت نہیں۔ تمام خواب مہمل اور بے معنی ہوتے ہیں۔ مرے خیال میں اس ناول کا مطالعہ یک قلم ترک کر دو۔ کیونکہ وہی ناول تمھارے خوفناک خواب کا موجب ہوا ہے۔ لیکن منورما کو اس مشورے سے ذرا بھی تسکین نہ ہوئی اس کا دماغ تمام دن پریشان رہا۔ آخر دوسرے روز رفتہ رفتہ پریشانی دُور ہوئی۔

اگرچہ منورما اور رجندر زن وشوہر کی حیثیت سے زندگی گزار رہے تھے ۔ لیکن ابھی تک ان کے درمیان کسی طرح کی شادی کی رسم ادا نہ ہوئی تھی ۔ منورما اور جمنا نے بھی کبھی شادی کا تذکرہ نہ چھیڑا تھا ۔ جمنا کے نزدیک شادی اور غیر شادی دونوں برابر تھیں ۔ اس کا خیال تھا کہ دو مختلف مذاہب کے افراد کے ساتھ شادی کی جائز رسم کسی طرح ادا نہ کی جاسکتی تھی ۔ اس کا یہ بھی خیال تھا کہ اگر دو مختلف مذہبوں کے افراد کے دل ملے ہوں اور وہ محبت کی زندگی بسر کرنی چاہتے ہوں تو انھیں صرف عاشق ومعشوق کی حیثیت سے رہنا چاہئیے ۔ اس کے متعصب خیالات میں سوسائٹی کے قوانین اور آداب واخلاق کے متعلق اسی وقت سے ایک بڑی تبدیلی رونما ہوئی تھی ۔ جبکہ وہ رجندر کے گھر میں منتقل ہوئی ۔ اور رجندر نے جمنا کے قدموں پر ایک بڑی بھاری رقم کی تھیلی لاکر ڈال دی تھی ۔ اب اُس کے دماغ سے تمام دقیانوسی اور لچر خیالات دور ہوچکے تھے ۔ اس کے نزدیک منورما کا رجندر کے پاس ایک معشوقہ کی حیثیت سے رہنا قابلِ اعتراض نہ تھا منورما کو اس بات کا یقین دلا دیا گیا تھا کہ رجندر بہت جلد اس سے شادی کرے گا ۔ اس لئے منورما نے شادی کا مسئلہ رجندر ہی کے فیصلہ پر چھوڑ دیا کہ جب وہ مناسب سمجھے گا شادی کی رسم ادا ہو جائے گی ۔ اب رجندر کی طویل خاموشی نے اس کی طبیعت کو بےچین کر دیا تھا وہ اب بہت ہی پریشان رہنے لگی تھی ۔

آخر وہ دن بھی آگیا ۔ منورما کو اپنے حاملہ ہونے کا علم ہوا ۔ وہ عنقریب ماں بننے والی تھی ۔ پہلے تو وہ اس انکشاف سے بہت ہی محظوظ ہوئی لیکن فوراً ہی اس کی خوشی رنج میں تبدیل ہوگئی ۔ اس نے خیال کیا کہ ایسی حالت میں غیر شادی شدہ رہنا کتنی شرم کی بات ہے ۔ اسی طرح کا ایک واقعہ اس کے ذہن میں آیا کہ ایک غریب لڑکی کو حاملہ ہونے پر اُس کے عاشق نے کس طرح چھوڑ دیا ، اس کے رشتہ داروں نے بھی اس کی خبر نہ لی اور گھر سے نکال دیا ، وہ غریب لڑکی اِدھر اُدھر ماری ماری پھری ۔ پھر اس طرح غائب ہوئی کہ کہیں اُس کا پتہ نہ ملا ۔ کیا یہی مصیبت مجھ پر نازل ہونے والی نہیں ہے ۔ لیکن مجھے فکر نہ کرنی چاہئیے ۔ رجندر کتنا شریف بہادر ، اور ایماندار انسان ہے ۔ اُس کی شریف النفسی سے ایسی امید نہیں ہوسکتی ۔ وہ کسی حال میں بھی مجھ سے کنارہ کش نہیں ہوسکتا ۔"

جب رجندر دوپہر کو گھر واپس آیا تو منورما نے اس نئے انکشاف سے باخبر کر دیا ۔

اب شادی کی رسم ادا کرنے میں ذرا بھی غفلت نہ کرنی چاہئیے ایسا نہ ہو کہ شادی سے پہلے لوگوں کو میرے حاملہ ہونے کی خبر ہو جائے ۔ ایسی حالت میں کتنی رسوائی ہوگی اور تم جانتے ہو کہ ایسے واقعات دیر تک پوشیدہ نہیں رہ سکتے ۔ میں التجا کرتی ہوں کہ تاخیر نہ کرو اور بہت جلد رسم کو انجام دے دو ۔

بہت خوب پیاری منورما ۔ نہ گھبراؤ ۔ میں بہت جلد شادی کا سارا انتظام کر لوں گا ۔ میں تسلیم کرتا ہوں کہ میری ہی وجہ سے اتنی تاخیر عمل میں آئی ہے ۔ یہ سراسر میری غفلت شعاری تھی ۔ آج تک تو اتنی بڑی تاخیر سے کوئی ہرج واقع نہ ہوا ۔ لیکن اب ذرا سی غفلت سے بڑی ندامت ہوگی ۔ میں اب ذرا بھی غفلت سے کام نہ لوں گا ۔ بلاشک وشبہ شادی کی رسم ادا کرنا ضروری ہے کیونکہ اس کے بغیر کوئی شخص سوسائٹی میں عزت حاصل نہیں کرسکتا ۔

منورما کو ان باتوں کا یقین ہوگیا ۔

دوسرے روز جبکہ رجندر اپنے آفس میں تھا ، منورما کو اس کی طرف سے مندرجہ ذیل مضمون کا ایک خط ملا ۔

پیاری منورما !

میں یہ خط بڑی گھبراہٹ اور پریشانی کے عالم میں لکھ رہا ہوں ۔ اس وقت میں تم پر ایک راز کا انکشاف کرنا چاہتا ہوں ۔ ممکن ہے کہ اس سے تمھارے نازک دل کو سخت تکلیف پہونچے ۔ حقیقت حال یہ ہے کہ بہت ہی قبل میری شادی ہو چکی ہے ۔ لیکن میں تمھیں یقین دلاتا ہوں کہ اس سے ہماری راہِ محبت میں کسی طرح کی رکاوٹ حائل نہیں ہوسکتی ۔ کیونکہ ہمارے مذہب نے ایک سے زیادہ شادی کرنے کی ممانعت نہیں کی ہے ۔

میرے گزشتہ رنج وغم کا سبب جس کے متعلق میں تم سے بار بار عرض کرچکا ہوں یہ تھا کہ میں ایام طفولیت ہی میں شادی کے بندھن میں بندھ چکا تھا لیکن مجھے اپنی بیوی سے کبھی محبت نہ ہوئی ۔ وہ سراسر میری

میری مرضی کے برعکس تھی میری ازدواجی زندگی باہمی نارضامندی اور شکر رنجی کے ساتھ بسر ہو رہی تھی۔ جس سے میں سخت پریشان تھا۔ جب تم سے میری ملاقات ہوئی تو میرے دل میں تمھاری محبت پیدا ہو گئی میری دلی آرزو تھی تمھیں اپنے قبضہ میں لانے کی تھی اس لئے میں نے راز محبت افشا کر دینے سے دریغ نہ کیا۔ شکر ہے کہ تمھیں بھی کوئی اعتراض نہ ہوا اس خوف سے کہ تمھارے خیالات تبدیل نہ ہو جائیں۔ میں نے یہ مناسب نہ جانا کہ تم پر اپنی شادی کی حقیقت ظاہر کر دوں۔ اگرچہ میں نے اخفائے حق کر کے ایک بڑی خود غرضی برتی تھی۔ لیکن اس میں بجز اپنی لامحدود محبت کے اور کوئی دوسرا عنصر کارفرما نہ تھا۔ مجھے امید ہے کہ تم میری اس غلطی کو فروگذاشت کر دو گی۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ عنقریب شادی کی رسم ادا کر لوں گا۔ اس کے لئے ضروری سامان کر رہا ہوں۔ میں وقت مقررہ پر تمھارے پاس آؤں گا۔ اور مجھے امید ہے کہ تم کو حسبِ معمول شاد و خرم پاؤں گا۔

تمھارا جاں نثار و عاشقِ زار۔ رجندر

میں اس دردانگیز و وحشت افزا خبر سے اس کے پاؤں تلے سے زمین نکلتی نظر آئی۔ دنیا اُس کی آنکھوں میں اندھیر ہو گئی۔ اس پر ایک حیرت و وحشت کا عالم طاری ہو گیا۔ وہ اپنے ایک ہاتھ میں خط لئے چند سکنڈ بالکل ساکت و خاموش پڑی رہی۔ پھر غیظ و غضب میں بھر گئی۔ اس کا چہرہ غصہ سے سرخ ہو رہا تھا وہ دلکش مورتی جس کی پرستش وہ کتنی عقیدت اور جوش و خروش کے ساتھ کر رہی تھی۔ افسوس آج اپنے ستون سے گر کر چکنا چور ہو گئی۔ اُس کے منہ سے بے ساختہ یہ الفاظ نکلے "کمینہ، بزدل، دغاباز" اور احساسات و جذبات سے مغلوب ہو کر اپنے کمرے میں داخل ہوئی۔ دروازہ اندر سے بند کر لیا اور اپنے بستر پر گر پڑی اور زار و قطار رونے لگی۔ وہ روتی رہی، چلاتی رہی۔ اور بہت دیر تک درد و الم اور زخم خوردہ معصومیت کے آنسو بہاتی رہی۔ آخر رفتہ رفتہ آنسو تھمنے شروع ہوئے، اور جب اس کی آنکھوں میں آنسو بالکل خشک ہو گئے تو موجودہ حالات پر غور کرنے لگی۔

کیا میں ایک ایسے شخص کے ساتھ رشتہ قائم کروں جس کی شادی بہت ہی پیشتر ہو چکی ہے! کیا اس کی محبت میں کوئی فرق آیا ہے؟ ہرگز نہیں پھر مجھے کیا کرنا چاہئے؟

وہ اُٹھ بیٹھی۔ کمرے سے نکل گئی اور ایک دوسرے متصلہ کمرے میں داخل ہوئی۔ کچھ دیر تک اِدھر اُدھر ٹہلتی رہی اور سوچتی رہی۔ پھر ایک الماری کی طرف بڑھی۔ اُسے کھولا اور اُس میں سے ایک طمنچہ نکالا جو رجندر نے اُسے تحفۃً دیا تھا اور اس کے استعمال سے بھی آگاہ کر دیا تھا۔ جونہی اُس کی نظر طمنچہ پر پڑی اُس کے دل کو ایک عجیب طرح کا اطمینان محسوس ہوا۔ وہ دل ہی دل میں کہنے لگی

"یہ ایک سرد لوہا ہے مگر خود بخود مصرف میں آنے کے لئے موجود۔ یہ کتنا منصف اور مہربان ہے"

اُس نے ایک فیصلہ کن عزم کر لیا۔ اُس نے طمنچہ بھر لیا اور اپنی ساری کے تہوں میں چھپاتی اپنی آرام گاہ کی طرف واپس لوٹی۔ دروازہ کھول کر اندر قدم رکھا۔ لیکن فوراً پلٹ کر سنگار خانہ میں داخل ہوئی، ایک کوچ پر بیٹھ گئی اور گھڑی کی طرف جو دیوار پر لٹک رہی تھی۔ ابھی چار بجنے میں چند منٹ باقی تھے۔ ٹک ٹک کی صدا کانوں میں آ رہی تھی وہ بڑی بے چینی سے رجندر کا انتظار کر رہی تھی۔ اُس کی نگاہیں گھڑی پر جمی تھیں، ایک گھنٹہ کے اندر رجندر آئے گا۔ پھر اس کے بعد؟ ---------- اُسے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ گھڑی بہت ہی آہستہ آہستہ چل رہی ہے۔ انتظار کی گھڑی بھی کتنی کڑی ہوتی ہے اُس کے لئے ایک ایک منٹ کا کاٹنا ایک ایک گھنٹہ کے برابر تھا۔ نہیں اس سے بھی زیادہ ---------- ایک ایک منٹ ایک ایک دن کے برابر تھا۔ آخر وہ خاص وقت بھی آ گیا، جس کا انتظار تھا۔ رجندر کمرے میں داخل ہوا۔ منورما اُچھل کر اُس کے قدموں کے پاس پہونچ گئی۔ اپنا ہاتھ ساری کے تہوں سے باہر نکالا اور نہایت ہی ہوشیاری کے ساتھ نشانہ کر کے طمنچہ رجندر کے سینہ کی طرف چلا دیا۔ رجندر محو حیرت رہ گیا اس کے پاؤں بے قابو ہو گئے اور زخم خوردہ فرش زمین پر گر پڑا۔ منورما فوراً اس کی طرف بڑھی۔ اپنے گھٹنے ٹیک کر بیٹھ گئی۔ اور اُس سے بغل گیر ہوتے ہوئے کہا۔

پیارے پیارے

رجندر نے آہستہ آہستہ اپنی آنکھیں کھول دیں۔

منورما نے کہا ——— "پیارے رجندر معاف کرو۔ کیا تم جانتے ہو، میں نے کیوں تمھیں نشانۂ اجل بنایا؟ میں اب بھی تم سے ویسی ہی محبت کرتی ہوں جیسی پیشتر کرتی تھی۔ لیکن اس مصیبت کو برداشت نہیں کرسکتی کہ تمھاری محبت میں کوئی دوسری عورت بھی شریک ہے۔ تمھاری خالص محبت حاصل کرنے کا اس کے سوا کوئی دوسرا طریقہ نہیں تھا جو میں نے اختیار کیا۔ پیارے بدگمان نہ ہو میں بھی تمھارے پیچھے آرہی ہوں:

رجندر نے اپنا سر ہلایا پھر آنکھیں بند کرلیں اور اس کی روح قفسِ عنصری سے عالمِ بالا کی طرف پرواز کرگئی۔ منورما اُٹھی، طمنچہ کا بغور معائنہ کیا اور ایک دوسرا نشانہ اپنی جانب لگایا۔ چشم زدن میں وہ بیہوش زمین پر گر پڑی اور چند ہی لمحہ کے اندر موت کے آغوش میں سوگئی۔

میں محبّت کرتی ہوں!

میں محبت کرتی ہوں .... سچی .... پاک .... اس لئے نہیں کہ تم جوان ہو .... خوبصورت ہو .... شاعر ہو .... پڑھے لکھے ہو .... مجھے تمھارے ان شعروں سے محبت نہیں جو کسی نامعلوم دوشیزہ کے عشق میں لکھے گئے ہوں .... اور مجھے تمھارے وہ افسانے بھی پسند نہیں ہیں جو حقیقت سے دور اور جھوٹ سے نزدیک ہیں۔ مجھے تمھارے ہونٹ چومنے کی خواہش اس لئے نہیں کہ وہ باریک اور نرم ہیں .... مجھے تمھاری آنکھیں پسند ہیں اس لئے نہیں کہ وہ بڑی بڑی اور سیاہ ہیں .... اور جسم اچھا لگتا ہے اس لئے نہیں کہ وہ پتھر کی طرح سخت اور مضبوط ہے ....

بلکہ میں محبت کرتی ہوں، تمھارے جسم سے اس لئے کہ یہ تلوار کھانے، اور ہاتھ تلوار اُٹھانے کو ہے .... میں تمھارے ہونٹ چومنا چاہتی ہوں اس لئے کہ ان میں سے شیرینی کی بجائے بھڑکتے ہوئے شعلے نکلتے ہیں، آزادی کے .... اور تمھاری آنکھیں پسند ہیں اس لئے کہ یہ آنسو بہاتی ہیں۔ خون روتی ہیں، اپنے غریب و مفلس بھائیوں کو تکلیف میں دیکھ کر .... اُنھیں بھوکا .... اُن کے بچوں کو بیماری میں دم توڑتے ہوئے اور اُن کی نازک عورتوں کو سخت گرمی اور لو میں پیٹ پالنے کے لئے پتھر اُٹھاتے ہوئے .... اور میں تم سے محبت کرتی ہوں اس لئے کہ تم اپنا دماغ اپنا حسن اپنی جوانی برباد کر رہے ہو، بھینٹ چڑھا رہے ہو .... ایک لفظ آزادی پر۔ کیا میں تم سے بیجا محبت کرتی ہوں؟ ....

اگر میری محبت بیجا ہے تو بتاؤ وہ کونسی سچی، پاک اور حقیقی محبت ہے، آخر میں بھی تو سنوں۔ کیا میں ان ہونٹوں کے چومنے کی خواہش کروں، جو صرف نرم اور نازک ہی ہوں، جن میں حدتِ آزادی کی بجائے غلامی کی حسرتناک خنکی ہو۔ اور کیا میں ان بڑی سیاہ آنکھوں کی پرستار بن جاؤں جو اپنی ہی تکلیف اور اپنے ہی مطلب کے لئے اُبل پڑیں۔ اور اُس جسم کو پسند کروں جو آرام اور محض آرام طلب ہو۔

مجھے ایسے اپاہج جسم سے، ایک محنتی مزدور کا جسم زیادہ اچھا لگتا ہے جو وطن اور قوم پر قربان ہونے کو تیار رہے۔ مجھے ان نرم و نازک ہونٹوں سے وہ سخت اور کھُردرے ہونٹ زیادہ پسند ہیں جو آزادی کے لئے حرکت میں آئیں، اور ان بڑی سیاہ آنکھوں سے وہ چھوٹی چھوٹی، گرد سے اٹی ہوئی آنکھیں زیادہ کارآمد اور قابلِ قدر اور قابلِ پرستش معلوم ہوتی جو حقیقی جذبۂ آزادی کے آنسوؤں سے ڈبڈبا آئیں۔

سجّاد حیدر (افریدی) ملیح آبادی

پروازِ تخیل اور راہِ عمل

شیو فرید آبادی

لکھتے وقت اومیش اپنی حالت ایسی محسوس کرنے لگتا تھا جیسے وہ عالمِ خواب میں سپنے کے جنجال سے نکل بھاگنے کی کوشش کر رہا ہے۔

آپ مجھ سے مضامین طلب کرتے ہیں مگر میں آپ ہی سے دریافت کرتا ہوں کہ کیا لکھوں۔ میری نگاہ میں زندگی نمائش سے زیادہ حقیقت نہیں رکھتی۔ یہ ایک مایوس کن خواب اور تصویر گھر ہے۔ آپ میری رائے سے متفق نہ ہوں۔ مگر آپ سچ مان لیجئے کہ میں اِن خوبصورت سنہری پھولوں کا بھید کچھ نہیں جانتا۔ جب میں ہوا کو ایک لڑکی پگلی کی مانند ہر چیز کو چومتے چھوتے، ٹٹولتے اور کچھ پوچھتے ہوئے پاتا ہوں تو میرے دل میں معاً یہ خیال ہوتا ہے کہ اس بہن کا دل آخر کس درد اور کرب کی آماجگاہ بنا ہوا ہے۔ خوف سے میری نگاہ کسی جانور، درخت یا ستارے کی طرف درشتی سے نہیں اُٹھنے پاتی۔ رامیش کبوتر لایا ہے۔ یہ کٹا کٹھو، دڑبہ چھوڑ کر اینڈتا پھرتا ہے۔ میں سوچتا ہوں یہ کبوتر کبوتر کیوں اور رامیش انسان کیوں۔ موسیقی کی تان کا تو ذکر ہی کیا ہے۔ میں اس کے تخیل سے ہی مدہوش سا ہو جاتا ہوں۔ اس زہریلی اور انقلاب انگیز زندگانی کا کیا حال لکھوں۔ اتنی عمر ہونے کو آئی مگر میں اس زندگی کی "کیوں" کو نہ سمجھ سکا۔ مجھے زندگی کے کسی رُخ پر اب اعتبار نہیں رہا وقت ہر سچائی پر پردہ ڈالے ہوئے ہے۔ میرے دوستو ذرا بتلاؤ تو میں عالمِ خواب میں ہوں یا عالمِ بیداری میں ——— ذرا بتلاؤ تو ————

اُس کے دل میں ایک ہوک سی اُٹھی، سوئی ہوئی آگ بھڑک اُٹھی۔ خون کا دریا سا بہہ نکلا۔ قلم میز پر رکھتے ہوئے اُس نے اپنے بالوں میں انگلیاں پھیریں اور گردن اُٹھا کر آسمان کی طرف دیکھا ——— بکھرے ہوئے ستاروں کے جھرمٹ ——— چرخ نیلی فام کا ناقابلِ بیان سنّاٹا ——— بہت دیر تک وہ اُسی طرح دیکھتا رہا۔ اُسے ایسا محسوس ہونے لگا جیسے تخیل کی جیتی جاگتی تصویریں "اُس پار" سے آکر اُس کی ہستی میں جذب ہوتی جا رہی ہیں۔

کمرے میں انتہائی خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ گھنٹے نے ٹن ٹن گیارہ بجائے۔ شیلا نے اب یہی مناسب سمجھا کہ وہ ایک دم سر پر سے چادر پھینک کر کھڑی ہو جائے۔ وہ اُٹھی۔ آنچل ٹھیک کیا اور دبے قدم نگر لیک کر ادیش کے پیچھے جا کھڑی ہوئی اور بولی ——— "لکھ رہے ہو نا اپنی اُسی کو۔"

شیلا نے بھید بھری نگاہ سے سارا خط پڑھ ڈالنا چاہا۔

کھلی ہوئی کھڑکی میں سے ہوا کا ایک تیز جھونکا آیا اور لیمپ کی بتی کو غنودگی سے چونکا گیا۔ مگر رامیش کا تخیل نہ ٹوٹا وہ ستاروں کی طرف ہی دیکھتا رہا۔ اور اس طرح دیکھتا رہا جیسے آسمان کی لاانتہا دوری اُس کی پلکوں کی نوکوں پر ہاتھ باندھے کھڑی ہے۔

شیلا نے پھر کہا "اب تو مجھ سے بات کرتے ہوئے بھی آپ کو بوجھ معلوم ہوتا ہے۔"

اومیش کا تصور ستاروں سے اُتر کر لیمپ کی بتی پر جم گیا۔

آدھ کھلا ہوا خط شیلا اپنی طرف کھینچتے ہوئے بولی۔ "کچھ پتہ بھی ہے کیا بجا ہے؟"

خط کو وہ نہایت سخت نگاہ سے دیکھ رہی تھی جیسے نگل ہی جائے گی۔

اومیش نے قہقہہ لگایا "آپ ہیں! میں سمجھا" میں خواب میں کسی کو"

"ہاں میں بھی تو یہی کہہ رہی ہوں۔ خواب میں اُسی کو" شیلا نے چند ہی الفاظ میں وہ تمام مطلب بیان کر دیا۔ پھر بھی اومیش نے پوچھا "کس کو"

شیلا نے خط اُٹھا کر پڑھنا چاہا مگر پڑھ نہ سکی۔ پھر بھی تمام خط پڑھ جانے کا ایکٹنگ کرکے اُس نے خط کو میز پر رکھ دیا اور بولی۔ اور کس کو! میری سوت کو!

شیلا!—— اومیش نے جلدی سے کہا۔ اُس کے دماغ کے سامنے ایک تصویر کھنچ گئی، پُرانی یاد پھر تازہ ہوگئی۔ گزشتہ خزانہ مل گیا، اُس نے تیزی سے کہا —— سُنو تو! —— مگر شیلا ایک لپک کے ساتھ بستر پر گر گئی۔ چادر سے مُنہ ڈھانک لیا اور ظاہر کیا جیسے وہ سو گئی ہے۔

اومیش کرسی پر بیٹھا اُسے تاک رہا تھا —— رات کے سناٹے میں پچھلے پہر کی غنی گھل مل رہی تھی وہ اُٹھا اور شیلا کے سرہانے جا بیٹھا —— بولا "سنتی ہو یا سو گئیں۔

شیلا چُپ چاپ پڑی رہی جیسے سو رہی ہو۔ خاموشی کے اس عمق میں، اومیش نے طبلِ جنگ کی گرجتی ہوئی آواز سُنی۔ وہ آہستہ سے بولا "ایسی سمجھدار ہو کر کیسی باتیں کرتی ہو —— تمہیں ہو کیا گیا ہے —— ؟

شیلا اسی طرح پڑی۔ رنج کو دنیا بھر کے غصے کو —— اپنے موتی کے سے دانتوں سے، گلابی ہونٹوں پر کس کر دبا رکھا تھا۔

اومیش خاموش بیٹھا ہوا تھا۔ اُس نے شیلا کے بھونرے کے سے کالے کالے چمکتے ہوئے بالوں پر ہاتھ پھیرا —— اُن لٹوں کو اُس کے نارنجی سُرخ مکھڑے پر بکھیرا۔ خنجر کی سی نکیلی بھوئیں —— سفید چوڑی پیشانی۔ نرگسی ہلکی نازک آنکھیں۔ وہ مسحور سا ہو گیا۔ شیلا کے کاندھے کو ہلاتا ہوا بولا، سُنو تو!

شیلا نفرت سے کروٹ بدلتے ہوئے بولی —— جاکر جو کچھ کہنا ہو اُسی سے کیوں نہیں کہتے؟

مڑ کر اومیش نے لیمپ کی بتی کی طرف دیکھا۔ سُرخ شعلے میں اُسے ایسا معلوم ہوا کہ پُرانا اومیش اس میں جل کر راکھ ہو گیا ہے —— ہاں

وہ شیلا سے کیا کہنا چاہتا تھا۔ یہی تو کہ وہ نندی کو بھول چکا ہے۔ اُس کے تبدیل شدہ دل میں اگر جگہ ہے تو صرف شیلا کے واسطے ہے۔ اب اُس کی زندگی از سرِ نو شروع ہوئی ہے وہ خوش ہے وہ یہی کہنا چاہتا تھا کہ شیلا تمہاری خوبصورتی اور وفاداری نے مجھے پُرانی زندگی کے حلقے سے نکال لیا ہے ------- یہی تو "بالکل ٹھیک" بے جان دیوار دل نے قہقہہ مار کر ہاں میں ہاں ملائی۔ میز پر رکھی ہوئی کتابوں نے "جی ہاں" کا شور مچا دیا۔ اس نہ ٹوٹنے والی خاموشی میں اُس نے شیلا کو پھر مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

شیلا! شیلا!! لوگوں نے تمہیں بہکا دیا ہے۔ میری بات سنتی ہو۔

شیلا کاٹھ کی پتلی کی مانند ہل کر پھر ایک جگہ قائم ہو گئی۔

اومیش نے پھر کہنا شروع کیا "میں قسم کھاتا ہوں۔ میرا یقین کرلو۔ میں نندی کو ہمیشہ کے لئے بھول چکا ہوں۔ زندگی میں صرف عورت سے ہی تو کام نہیں چلتا اور بھی بہت سے کام دھندے ہیں ---------- سُنا تم نے؟-----

شیلا کا رنج، عفو کی ٹھنڈی لہر سے ٹکرا کر سُن سا پڑ گیا..... وہ ذرا ہلی......

اومیش نے جوش میں آکر پھر کہنا شروع کیا.... تمہیں بات بات میں مجھ سے رُوٹھ جایا کرو گی تو میں کہاں جاؤں گا۔ آخر آدمی سے غلطی بھی ہو ہی جایا کرتی ہے۔ مرد کیسا بےوقوف ہے کہ خواب سے محبت کرنے لگتا ہے۔ کیوں یہی بات ہے نہ؟"

شیلا نے آہستہ سے آنکھیں کھولیں۔ اومیش کے چہرے کو گھور کر دیکھا۔ پھر دوسری طرف کروٹ بدل کر بولی "اب سو گئے بھی یا انہیں باتوں میں رات ختم کر دینا چاہتے ہو؟"

اومیش کھویا کھویا سا چارپائی پر لیٹ گیا، شیلا کے گداز بازوؤں کو اپنے سینے کے درمیان دباتے ہوئے بولا "اب میں اپنی زندگی کا نصب العین صرف ادائے فرض کو ہی سمجھتا ہوں۔ وہ تو خواہشِ نفسانی کی ایک لہر تھی جو صرف حیوانیت کی تشنگی کو ہی دور کر سکتی ہے۔ میں اب تھا۔ اور وفادار بن کر ہمیشگی کی دولت کمانا چاہتا ہوں —— تمہیں میری بات۔ اور اُس نے اپنی تعلیم یافتہ بیوی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اُس کے چہرے کی طرف

دیکھا۔ شیلا اپنے خاوند کے دل کی کمزوری کو خوب سمجھتی تھی۔ اس قسم کی سینکڑوں باتیں وہ پہلے بھی سن چکی تھی ——— ایک لمحے کے بعد بولی۔ میں نے آج آپ کے سر میں تیل تو ملا ہی نہیں۔ وہ اُٹھی، تیل کی پیالی لے کر اومیش کے سرہانے جا بیٹھی ...... سر میں تیل ملتے ملتے بولی ...... اب سو جاؤ۔ علی الصباح گاؤں کے چودھری سرکھانے کو آجائیں گے۔ اومیش شیلا کے بازو پر سر رکھکر سو گیا۔ اُس کی آنکھیں بند تھیں۔ مگر دل کی ظلمت کی گہرائی میں گناہ کی چیخ پکار صاف سنائی دیتی تھی۔ اپنی گمراہی کا اُسے کامل یقین ہو چکا تھا اور وہ تڑپ رہا تھا۔

گھنٹہ اپنی جان ٹاک ٹاک سے وقت کی رفتار رقم کر رہا تھا۔ شیلا نے آنسوؤں کے سیلاب کو دل کے بند پر ہی روکنے کی کوشش کی۔ مگر ہوا کا ایک تیز جھونکا آیا اور شیلا کے سنہری خوابوں کی دنیا میں ایک ظلمت کا طوفان پیدا کر گیا۔ وہ تیزی سے اُٹھی۔ میز پر پڑا ہوا خط اُٹھایا اور کامل سکون کے ساتھ پڑھکر بولی ...... اچھا نندنی اب تم نے اُن کے دل و دماغ میں بیراگ کا زہر چھڑکنا شروع کیا ہے۔ یہ حربہ تمہارے جوبن کے تیر و سنان سے بھی زیادہ تیز ہے۔ مگر میں بھی مرتے دم تک شکست قبول نہ کروں گی۔ دیکھتی ہوں کس طرح تم انھیں مجھ سے چھین کر لے جاتی ہو۔"

کیلوں کے پتوں پر سے ابھی اوس کی بوندیں نہ سوکھنے پائیں تھیں اور درختوں پر جانوروں نے چہچہانا بھی بند نہیں کیا تھا کہ شیلا بستر پر اُٹھکر بیٹھ گئی۔ اومیش نے پڑے پڑے کہا ابھی تو سورج بھی اچھی طرح نہیں نکلا، کہاں چلیں۔

شیلا نے بکھرے ہوئے بال ٹھیک کئے اور ناک کی کیل کو ٹھیک کرتے ہوئے کہا "شاستروں میں لکھا ہے کہ ہر آدمی کو برہم مورت (سورج نکلنے سے قبل کا وقت) میں ہی اٹھنا چاہیئے۔

اومیش نے تیز آواز سے کہا "اور ٹھنڈے پانی سے غسل بھی تو کرنا چاہیئے۔"

"جی ہاں پھر کسی کا دھیان بھی کرنا چاہیئے" یہ کہہ کر وہ کھڑی ہو گئی۔

اومیش نے اوپر کی طرف منہ اُٹھاتے ہوئے پوچھا "کس کا دھیان؟"

شیلا نے کچھ جواب نہ دینا چاہا۔ وہ دروازے تک پہونچ چکی تھی، اومیش نے جھک کر اُس کا آنچل پکڑ لیا۔ اور کھینچتا ہوا بولا "کس کا دھیان"

"رات کو جس کا کر رہے تھے" اور وہ آنچل چھڑا کر زینہ پر دھم دھم کرتی ہوئی نیچے اُتر گئی۔

اومیش خاموش ہو گیا۔ طعنوں نے اُس کا جگر چھلنی کر دیا تھا۔ وہ بولا آج ایک سال ہو چکا ہے اُس کی آنکھوں سے جلن اور حسد کی چنگاریاں برستی رہتی ہیں ایک لمحے کے لئے بھی مجھ پر یقین نہیں کرتی، کیا یہی اُس کی محبت ہے یہی اُس کا پیار ہے .... اُس نے رنج کو پی جانے کی کوشش کی۔

تھوڑی دیر کے بعد اُسے محسوس ہوا کہ موسم خزاں کے زرد پتوں کا ڈھیر اُس کے دل کے کھلیان میں جمع ہو گیا ہے۔ ایک طرف چند پپیہے مردہ اور کچھ کوئلیں غش کھائی ہوئی پڑی ہیں۔ چند جگنو مٹی میں اٹے پڑے ہیں۔ گذشتہ موسم بہار کی درد بھری موسیقی اُس کی نس نس میں ٹیسیں پیدا کر رہی ہے ... نندنی ...... نندنی کیا اب بھی تم میرے دل کی گہرائیوں میں تیرتی پھرتی ہو۔ میں سمجھا شیلا کے تیر مجھی کو نشانہ بنانا چاہتے ہیں وہ گھبرا کر اُٹھ بیٹھا۔

اُس کا علم، اُس کا ادراک، فلسفۂ زندگی کے نئے نئے محاذ، یہ سب کیا تھے، یا گذشتہ کی آتشیں بھٹی میں پکی ہوئی صراحیاں اور جام... جن میں وہ کبھی کم نہ ہونے والی خواہشِ نفسانی کی شراب بھر بھر کر پیتا رہتا تھا ...... اوف او ...... وہ کانپ اٹھا ...... شیلا اُس کے اس پاکھنڈ کو بھانپ چکی ہے۔

شفق کی کرنیں، ہرے ہرے درختوں کی پھنگوں پر معصوم حسن کی رنگینی کا غازہ مل رہی تھیں، اور اُس کی کاذب ہستی اُس کی اپنی آنکھوں میں منقش ہو رہی تھی ...... وہ گمراہ جھوٹا اور مکار ہے۔ یہ بات وہ آج صبح جان چکا تھا، اپنی ہی نگاہ میں وہ ذلیل سا ہو گیا، بے حیائی سے بستر سے اُٹھا۔ میز پر رکھی کتابوں پر نگاہ ڈالی ...... یونیورسٹی کی گون پہنے ہوئے اپنی تصویر کو دیکھا، پھر میز پر بیٹھکر لکھنے لگا۔

"میری زندگی کا ہر لمحہ کذب اور جھوٹ سے معمور ہے۔ زندگی کی بد اعتدالیوں پر، اگر سچے دل سے پچھتایا جاوے تو یہ پاپ ہی کیمیا بن جاتے ہیں۔ میری پیاس ابھی تک نہیں بجھی۔ کیا اِس اندھیرے میں کبھی روشنی نہ دکھائی دے گی۔ کیا خواہشِ نفسانی کے تشنہ خواب اسی طرح ظہور میں آتے رہیں گے اور سُکھ دُکھ کی آندھیاں چلتی رہیں گی۔ ایسی حالت میں کیا صبر و سکون ممکن ہے؟ ...... نہیں۔ نہیں۔ اس کم ظرفی کے ناٹک کو میں اسی وقت بند کر دوں گا۔ زمانۂ گذشتہ کی یاد کی جڑیں کھود پھینکوں گا۔ اور اگر تجربہ ہی ریاضتِ شاقہ ہے تو میں اپنے تجربوں کی آگ میں ہی جلا کر دوں گا تشنگی

ہی اگر روح کی غذا ہے تو میں پیاسا ہی مروں گا۔ اب یہ لیپا پوتی مجھ سے نہ ہو سکیگی۔ فہم و ادراک کی بیڑیوں سے میری روح جکڑی ہوئی ہے۔ اِسے اب چاند کی امرت جیوتی چاہیئے۔ پانی چاہیئے۔ دھوپ چاہیئے۔ میں اگر نندنی سے محبت کرتا ہوں تو اِس حقیقت سے اِنکار کیوں کروں۔ شیلا کو اگر دھوکا دیتا ہوں تو صاف صاف کیوں نہ کہدوں ۔۔۔۔۔ مگر ہائے عقل اور دانشمندی کے گھمنڈ نے مجھے مکار بنا دیا ۔۔۔۔۔ یہ دھوکا ہے سراسر دھوکا۔"

وہ میز پر سے کھڑا ہو گیا۔ الماری کی کتابیں نکال نکال کر پھینکنی شروع کر دیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ پاگل سا ہو گیا ہے۔ ہاتھ میں چائے کی ٹرے لئے شیلا فاصلے پر کھڑی تھی۔ جب اُس نے دیکھا کہ مسودوں پر بھی ہاتھ صاف ہونے لگا ہے تو بغیر بولے نہ رہا گیا "آپ کے اس فعل کو کیا کہا جاوے ۔۔۔۔۔ ان غریب کتابوں نے آپ کا کیا بگاڑا ہے؟"

"ہوں کچھ نہیں بگاڑا شیلا؟ میں اُنھیں قینچی سے کتر کتر کر پھینک دونگا، چولھے میں جلا دوں گا ۔۔۔۔۔ تم کہتی ہو کچھ نہیں بگاڑا ۔۔۔۔ ارے ان کتابوں کے انباروں نے میرے دل کے مندر میں اندھیرا کر رکھا ہے۔ اندھیرا کسی جگہ سے روشنی پہنچتی ہی نہیں۔"

"یہ بے چینی کرنے سے کیا اب اُجالا ہو جائے گا" آگے بڑھتے ہوئے چائے کی ٹرے اس نے تپائی پر رکھتے ہوئے پوچھا۔

بغیر کچھ جواب دئے اومیش نے مسودوں کے ٹکڑے کر ڈالے اور زور سے بولا زندگی کی صداقت مکر و فریب کی عینک سے دکھائی نہیں دیتی۔ "ہاتھ سمرنی پیٹ کترنی" اس سے کام اب نہیں چل سکتا۔ اِس کو میں روحانی خودکشی کے مترادف مانتا ہوں۔ یہ ریاضت نہیں خیالی عیاشی ہے۔ جس طریق زندگی کو میں دل سے پسند کرتا ہوں اُسی طرح مجھے زندگی بسر کرنی چاہیئے کیوں شیلا؟

اومیش نے گھوم کر دیکھا۔ جوانی کی گلابی دھوپ میں شیلا نارنجی ہیرے کی مورتی کی طرح اُس کے سامنے خاموش کھڑی تھی ۔۔۔۔۔ نکھری ہوئی صاف ستھری۔ شیرینی اور لطافت سے بھرپور ۔۔۔۔۔ وہ اُس کی طرف کھنچنے لگا ۔۔۔۔ شیلا کا آنچل ہوا میں اُڑ کر خوشبو کی لپٹیں پھینک رہا تھا، کالی کالی زلفیں، سفید پیشانی پر پریشان تھیں۔ آنکھوں میں سے پاکیزگی جھانک رہی تھی ۔۔۔۔۔ اِن کالی کالی پتلیوں میں اس نے خوبصورتی کی جھلک دیکھی اور بولا شیلا!

رُخساروں پر جواہر کی ضیا جھلکی اور لبوں پر زاہد فریب مسکراہٹ۔ وہ چائے کا پیالہ اومیش کی طرف بڑھاتے ہوئے بولی منجن ونجن تو آپ نے کر لیا ہوگا۔ اومیش نے لپک کر ٹوتھ پیسٹ کا کلیجہ مسوسا اور اُسے دانتوں سے رگڑا۔ کلّی کی اور تولئے سے منہ پوچھتے ہوئے بولا۔ تمھارے تیروں نے میرے نیستاں میں آتشیں طوفان پیدا کر دئے ہیں شیلا۔ اُس کی برہنہ پیٹھ پر ہلتی ہوئی کالی چوٹی کو دیکھکر اُسے ایسا محسوس ہوا جیسے ہلکی گلابی برف کے تودہ پر سانپنی لہراتی ہوئی جا رہی ہو۔ کمر کی لچک دیکھکر اُس کا غرور جھک گیا۔ کہنی سے اُس کو چھوتے ہوئے بولا۔

"میں سخت غلطی میں مبتلا رہا۔ بادلوں میں موتی کی کھوج کرتا رہا۔ حالانکہ سنسار کا سمندر میرے سامنے موجود ہے۔ اِس حُسن کو میں کتنا حقیر سمجھتا رہا"

شیلا نے اپنے پاؤں میں لڑکھڑاہٹ سی محسوس کی چائے پیتے ہوئے وہ بولا۔ مجھے اب معلوم ہو گیا ہے کہ تخیل اور زندگی میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ خیالات شیریں دھارے ہیں جن کی روانی میں سکھ کی لہریں موجیں مارتی ہیں۔ شیلا نے آہستگی سے پوچھا "اگر حکم ہو تو ان پھٹے ہوئے مسودوں کو میز پر رکھدوں" اومیش زور سے بولا "شیلا میں زندہ رہنا چاہتا ہوں انسان بڑا بے وقوف ہوتا ہے۔ وہ ہمیشہ آسانی سے حاصل کی ہوئی چیز کو ٹھکرانے میں ہی مگن رہتا ہے۔ اور اُس کے جوڑے کے ہیرپن کو ٹھیک کرتے ہوئے بولا "مجھ سے زیادہ خوش قسمت اور کون ہوگا۔ تمھارے چودھویں رات کے حسن کو دیکھکر میرے دوست جلے مرتے ہیں۔ سُلگے جاتے ہیں تمھیں پا کر اندر لوک کی اپسرا کی بھی اب مجھے پروا نہیں ۔۔۔۔۔ کیوں شیلا یہی بات ہے نہ؟ ۔۔۔۔۔"

شیلا نے پیچھے ہٹتے ہوئے کہا ۔۔۔۔ "کچھ آپ کو پتہ بھی ہے، گاؤں سے چودھری آنے والے ہیں" اومیش اُس کے دونوں بازوؤں کو اپنے بازوؤں کے درمیان بھینچتے ہوئے بولا "جانتا ہوں مگر میں کر ہی کیا سکتا ہوں۔ زلزلوں اور سیلابوں کو میں دعوت دینے نہیں گیا تھا"

باہر سے رامیش کی آواز آئی "بھابی کچھ چائے وائے بھی طیار ہے؟"

"رامیش اندر آ جاؤ" اومیش نے زور سے کہا۔

شیلا نے رامیش کے لئے چائے کا پیالہ تیار کرتے ہوئے پوچھا۔ تو

کیا کِسانوں کو نا امید ہی واپس جانا پڑے گا؟"

"لوٹ جائیں۔ میں نے اُنھیں یہاں بلایا ہی کب تھا۔ یہ لوگ خود ہی آئے ہیں اور چاہتے ہیں سال بھر کا لگان نہ دیں۔"

اور آپ کے خیال میں یہ ممکن نہیں" شیلا نے پان بناتے ہوئے پوچھا رامیش آکر مونڈھے پر بیٹھ گیا۔ شیلا نے اُسے چائے کا پیالہ دیتے ہوئے کہا ـــ رات کو تو بڑا رنگ جما رہے تھے بس۔ زندگی کی بال کی کھال نکال ڈالی۔

اومیش نے دیکھا کہ شیلا کے لبوں پر نفرت آمیز مسکراہٹ ناچ رہی ہے۔ جیسے وہ بیدار ہو گیا ہو۔ چند لمحے کے بعد بولا...... جی ہاں پیسے پیسے کو دانت سے نہ پکڑتا تو یہ سوا سو کی ساڑھی زیبِ تن نہ ہوتی۔ بڑی چلیں ہیں غریبوں کی حمایت کرنے۔ پہلے اپنے شوق کو دیکھو پھر مجھ سے کچھ کہنا"

رامیش نے زیرِ لب ہنستے ہوئے کہا "بھائی صاحب وہ بھی بنارسی نہیں خالص ولائتی! شیلا نے ایک بار اومیش کی طرف اور دوسری بار رامیش کی طرف دیکھا۔ اومیش نے رامیش سے کہا۔ نصیحت کرنا اور عمل کرنا دونوں الگ الگ باتیں ہیں۔ امیر جب غریب کی طرفداری کرتا ہے تو ہنستے ہنستے میرے پیٹ میں بل پڑ جاتے ہیں اور رامیش باہر جاتے ہوئے بولا میں تو ایسے امیر کو شریف بدمعاش ہی تصور کرتا ہوں۔ شیلا مشین کی مانند حرکت کر رہی تھی۔ ٹرے میں چائے کے پیالے رکھکر وہ ایسی تیزی سے کمرے کے باہر نکل گئی جیسے تیز ہوا سے ہلکی پتی اڑ جاتی ہے۔

کِشنی برآمدے میں ملی۔ مالکہ کو آج ٹرے اُٹھاتے دیکھا تو سہم گئی، سمجھ گئی دال میں ضرور کچھ کالا ہے۔ بولی۔ میرا لڑکا آج بھاگ گیا سرکار نہیں تو میں منہ جلی جلدی ہی آمرتی اور آپ کو یوں ہاتھ پاؤں نہ جلانے پڑتے۔

شیلا نے اُس کو گھورتے ہوئے دیکھا اور تیوری میں بل ڈالتے ہوئے بولی "عورت کام کرنے کے لئے ہی پیدا ہوئی ہے" کِشنی نے آسمان کی طرف دیکھا کیا سورج مغرب سے نکلا ہے۔ پھر کہا "سچ ہے مالکن" اور ٹرے تھام لی۔ شیلا سیدھی کمرے میں پہنچی۔ طلائی چوڑیاں اُتار کر قلمدان میں رکھ دیں۔ ہار الماری میں پھینک دیا۔ ساری کھونٹی پر ٹانگ دی۔ سادی دھوتی پہن لی۔ تمھارے پیسے پر شوق کروں گی؟ اتنا بڑا طعنہ دے گئے۔ جو نہ بولنا تھا وہ بول گئے۔ جو نہ کہنا تھا وہ کہہ گئے۔ کیا میں اپنے لئے سجتی ہوں۔ عورت کیا اپنے لئے ہی سجتی ہے۔ اگر ان ساریوں کو اب پہنوں تو کفن پہنوں۔ میرا ہاڑ ہالس اگر اتنے خوبصورت چہرے سے نہ منڈھا ہوتا تو میں دیکھتی یہ سوسو کی ساریاں مجھے لا دیتے۔ جوش میں اُس نے کان کے کنڈل اور ناک کی کیل ناک اُتار ڈالی۔ کمرے کے باہر نکل آئی۔ جیسے ویراگ چھا گیا ہو۔ جوگن بننے کی تیاری ہو۔ کِشنی کے ہاتھ سے جھاڑو چھینتے ہوئے بولی "مجھے دے جھاڑو"

پتلون کی جیب میں ہاتھ ڈالے اومیش پاس ہی آگیا تھا۔ اُس نے دیکھا۔ بولا۔ مطلب یہ ہے کہ مجھے ذلیل کیا جائے اور ملازمہ کے سامنے ذلیل کیا جائے۔ آگے بڑھکر بولا۔ تم سے کس نے کہا تھا کہ جھاڑو دو" شیلا خاموش تھی۔ اومیش گرجا۔ نہیں سُنا تم نے! میں کیا کہہ رہا ہوں۔

شیلا ہٹ کر کمرے کے دوسرے کونے میں جا کھڑی ہوئی۔ اومیش کِشنی کو دیکھکر گرجا اور بولا، دیکھتی کیا ہے لے جھاڑو ہاتھ سے۔ گدھی کہیں کی" کِشنی نے جھاڑو لے لینے کی کوشش کی۔ شیلا نے جھاڑو پھینک دی اور سِسکیوں سے جا اُلجھی۔ پانی میں تمام جمپر خراب ہو گیا۔ اومیش دانت پیستے ہوئے بولا جمپر کی مٹی پلید کر دی ہی آخر" اب وہ چوکے کی صفائی کی طرف راغب ہوئی۔ وہ چوکے کی طرف راغب ہوئی۔ وہ دنیا کو اپنا ایک چھپا ہوا رُخ دکھانا چاہتی تھی۔ وزیر ہرنرائن کی لڑکی آج بتا دینا چاہتی تھی کہ وہ عورت پہلے ہے جو گھریلو معاملات میں عقلِ کُل ہوتی ہے۔ اومیش کھڑا ہوا خاموش دیکھتا رہا۔ ایک لمحے کے بعد بولا چودھریوں کو کیا جواب دوں بولتیں کیوں نہیں۔ اُن کی حمایت کرتے وقت تو ناگن کی طرح بل کھاتی تھیں۔ شیلا تنگ آکر بولی جو آپ کی مرضی ہو وہ کہہ دیجئے۔ گھر کے مالک تو آپ ہی ہیں" "اور آپ کوئی نہیں؟ اومیش نے اونچی آواز سے پوچھا۔ غصے میں اُس کے ہونٹ کانپ رہے تھے۔" میں "آنسوؤں کو پلکوں میں ہی تھامتے ہوئے وہ بولی "میں کچھ نہیں ہوں۔ اومیش جھولے میں بیٹھ گیا اور کچھ نرم ہوتے ہوئے بولا" کچھ کیوں نہیں ہو۔ فضول بات بڑھانے سے کوئی نتیجہ" شیلا نے جواب دیا عورت جب سے پیدا ہوئی ہے وہ مرد کی نگاہ میں صرف بھوگ کی سامگری رہی ہے سماج اس پر ظلم توڑنے سے باز نہیں آتا

وہ ہم کو اپنی لونڈی سمجھتا ہے۔ یہاں کبھی پوچھا ہی نہیں گیا اور نہ کبھی پوچھا جائے گا۔ میں تو اِس گھر کی ایک رجسٹرڈ باندھی ہوں۔ بس کام کروں گی تو روٹی کھاؤں گی۔ اومیش کا رنج اور غصہ اس طعنے سے اُبل پڑا۔ کمزور مچان آندھی کے زور سے نیچے آگیا۔ بولا تم سے بحث کون کرے۔ مگر شیلا تم جو کچھ کر رہی ہو وہ اچھا نہیں۔"

اومیش دیوان خانے میں پہنچا۔ گرج گرج کر کسانوں سے بولا۔ آپ جائیے، میں کچھ نہیں سن سکتا۔ آپ لوگوں کو مجھے لگان دینا ہے اور مجھے سرکار کو۔ نہ میں بچ سکتا ہوں نہ آپ۔ یہ بات اچھی طرح سمجھ لیجئے یہ لگان تو قرضہ ہے جو خون بیچ بیچ کر بھی ایک دوسرے کو چکانا ہوگا اور میں کر ہی کیا سکتا ہوں وقت کا حکم خدا کا حکم ہے۔ شیلا کے ہاتھ ڈھیلے ہو کر نیچے گرنے لگے۔

اومیش کی گرج بڑھتی ہی گئی۔ سیلاب آیا تو میں کیا کروں۔ زلزلہ آیا تو میرا کیا گناہ۔ اولے پڑیں۔ کھلیان جل جائیں۔ اس میں میرا کیا قصور۔ آپ لوگ اپنے خدا کے پاس کیوں نہیں جاتے۔ کریم بخش کیا میں اُس کا وائسرائے ہوں ایجنٹ ہوں جو لپک کر میرے پاس دوڑے آتے ہو۔

شیلا کے ہاتھ سے جھاڑو چھوٹ کر زمین پر گر پڑی۔

کریم بخش نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔ حضور بھی تو ہمارے مالک ہیں۔ ہم لوگ بھاگ کے مارے ہیں۔ قسمت ساتھ دیتی ہی نہیں۔ یہاں سنائی نہ ہوگی تو کہاں ہوگی۔

اب کلکٹر صاحب کہاں چلے گئے۔ بڑے آئے تھے اُس دن رعب جمانے۔ جاؤ نہ اپنی اماں اس کانگرس کے پاس جو پچکار کر لڈو دے دے گی، غرض پڑتی ہے تو مجھے حضور کہتے ہیں۔ شرم نہیں آتی۔ جاؤ اپنے مالک ہر نرائن کو ووٹ دو۔ جاؤ۔ جاؤ۔

شیلا کے تلوؤں میں جیسے بچھو نے کاٹ کھایا۔ اُس نے جھٹ پٹ ساری بدلی۔ سنجیدہ صورت بنائی۔ اور دیوان خانے کی طرف چلی۔

کریم نے عاجزی سے پھر کہا، سرکار تو دیالو ہیں۔ غریب پرور ہیں۔ تھوڑی سی تکلیف ہی اُٹھا لیں۔ یہاں رہنے کو جھونپڑے تک نہیں بنا سکے لگان کہاں سے دیں گے۔ سوکھے جسم کو بھٹی میں جھونک دو گے تو صرف راکھ ہی ملے گی حضور۔

اومیش دل ہی میں ڈرا۔ مگر بناوٹی غصے کے ساتھ بولا۔ مجھے اُپدیش دینا چاہتے ہو۔ نصیحت کرنے آئے ہو۔ میں تو سب کچھ مان بھی لوں گا مگر اپنی مالکن سے بھی پوچھا ہے۔ تمھارے سُکھ کی فکر کروں یا اُس کے گہنے گھڑوا لوں کی۔ کریم نے شیلا کو دروازے میں سنگ مرمر کی مورتی کی طرح خاموش کھڑی کھڑے ہوئے پایا۔ اُس کو دیکھتے ہی سب سٹپٹا گئے۔

اومیش نے گھوم کر شیلا کی طرف دیکھا۔ آنریبل ہر نرائن تو اس صوبے کے پرائم منسٹر ہیں۔ یہ جائداد بھی اُنھیں کی کمائی ہے۔ اُنھیں کی دین ہے۔ جاؤ اُنھیں سے کہو۔ میں تو مفت کا بدنام ہوں۔ پیٹ بھر لیتا ہوں، اور کچھ لکھ پڑھ لیتا ہوں۔ مجھے اپنے واسطے کچھ نہیں چاہیئے۔ اس وجہ سے میں تمھارے آرام اور تکلیف کا ذمہ دار بھی نہیں۔

شیلا نے بات کاٹ کر کہا۔ کتنا روپیہ دینا ہے تم سب کو۔

دو تین کسان بولے۔ سب کا؟ کوئی پانچ چھ ہزار سرکار

اچھا تو اب تم سب لوگ جاؤ۔ کل روپیہ جمع کر دیا جائے گا۔ تم میں سے ایک آدمی فہرست طیار کر کے دے جانا۔ غیر متوقع طور سے سُکھ مل جانے کی مدہوشی میں تعجب سے ایک نے دوسرے کو دیکھا اور آپے سے باہر ہو کر سب ایک ساتھ چلا اُٹھے "رانی صاحبہ کی جے"۔ رامیش خاموشی سے شیلا کو گھورتا رہا۔ وہ تمام دن اپنی سٹڈی میں پڑا رہا۔ شیلا کے الفاظ کانوں میں گونج رہے تھے "اگر خدا، سرکار اور تم اُن کی نہ سنو گے تو کیا میں بھی نہ سنوں"

اومیش نے کوڑے کی مار محسوس کی۔ وہ بولا میں بھی دیکھتا ہوں پانچ ہزار روپیہ کیسے دئے جاتے ہیں۔ کہیں گڑے رکھے ہیں جو نکال لائے گی۔ مگر اُس کے ضمیر نے آہستگی سے ملامت آمیز لہجے میں کہا "آج تمھاری مردانگی، آبرو، ادائے فرض اور انسانیت کو کیا ہوا۔ جو عورت ساریوں کے ڈھیر میں بیٹھ کر سورگ کے سُکھ اُڑاتی تھی۔ گھٹنوں پر اس طرح لوٹتی تھی جیسے بچّے مٹھائی پر وہی عورت تمھارے رُخسار پر ایک طمانچہ رسید کر گئی۔ اُس کے دل میں غصّے کی لہر اُٹھی۔ پڑھنے میں دل لگا نہ کچھ لکھنے کو جی چاہا۔ وہ پاگلوں کی طرح پھر چلا اُٹھا۔ اِس کا تو مطلب یہی ہے کہ کہیں جا کر تم بھیک مانگو گی قرضہ لوگی۔ میری جوتیاں میرے ہی سر پر پڑیں گی۔ میں دیکھتا ہوں میرے برخلاف کون اُٹھتا ہے۔ کون ایک دھیلا بھی دیتا ہے۔ میں اس گستاخی کو برداشت نہیں کر سکتا۔ میری آبرو پر پانی پھیر

تمھیں شرم نہیں آئی شیلا!

وہ غصے سے کانپنے لگا۔ چلے ہوئے توپ کے گولے کی مانند اُس کی عقل ٹھنڈی پڑگئی۔ جمود سا طاری ہوگیا۔ شیلا دروازہ کھول کر اندر آئی۔

چائے حاضر ہے۔

اومیش نے غصے سے اُس کی طرف دیکھا۔ پھر کمرے میں اِدھر اُدھر گھومنے لگا۔

یہ چائے ٹھنڈی ہے۔

وہ دل ہی دل میں چلا اُٹھا چائے! چائے!! مجھے کچھ نہیں چاہیئے۔

شیلا خاموش کھڑی رہی۔ چائے کی پیالی میں سے اُٹھتی ہوئی بھاپ کو دیکھ رہی تھی اومیش اُس کے نزدیک دو تین مرتبہ آیا۔ غصے سے اُس کا جسم کانپ رہا تھا۔ اُس کی خودداری زخمی شیر کی طرح گونج رہی تھی۔۔۔۔۔۔۔

ے آئیں روپیہ۔ شیلا نے اُس کی طرف دیکھا اور کچھ جواب نہ دیا۔ وہ پھر کچھ بگڑا۔۔۔۔۔۔ سب چیک بُک تالے میں ہیں نہ۔ لو میں کھولے دیتا ہوں۔

کیوں کیا کہا منسٹر صاحب نے۔ تجوری کی تالی دیدی؟

شیلا نے چاہا کہ ایک تیز نگاہ سے اُس کا منہ سی دے۔

مگر اومیش پھر گرج اُٹھا "سرکار۔ زمیندار ان سب سے اونچا مرتبہ اب تمھارا ہوگیا ہے۔ تم جسے پاؤں تلے ناک کا شعور نہیں وہ کریں گی دلیش سیوا۔ غریبوں کا پیٹ بھریں گی۔ قالین سے نیچے قدم رکھنے پر جس کے تلوے چھل جاتے ہوں وہ آج جلتی ہوئی سڑک پر دوڑنے چلی ہیں۔ کیوں۔

اومیش اور زیادہ بھبکا۔ یہ بھی جانتی ہو کہ تم اپنے فرض کو بھولی جارہی ہو۔ میری نرمی کا ناجائز فائدہ اُٹھارہی ہو۔ میں کہے دیتا ہوں۔

شیلا اس مرتبہ بولی، میں آپ کا مطلب نہیں سمجھی۔

کیوں سمجھو گی میری جگہ دوسرا ہوتا تو معلوم ہوتا کہ اِن موالیوں کے سامنے اکڑا کر کیسے کھڑا ہوا جاتا ہے۔ کیسے اپنی جے کے نعرے بلند کرائے جاتے ہیں۔ مگر میں تو آزادی کے جال میں خود پھنسا ہوا ہوں۔

توڑ ڈالئے اس بندھن کو۔ میں نے تو یہ بندھن نہیں باندھا۔ خود کا باندھا ہوا بندھن توڑا بھی جاسکتا ہے" شیلا بولی۔

"میرے نصب العین کی بنیادیں کمزور عقیدوں پر نہیں ہیں جو آسانی سے توڑ دئے جاویں سمجھیں۔ میں عورت کو دوست کا درجہ دے چکا ہوں۔ اور اِس دوستی کا فرض نبھانا چاہتا ہوں"۔

میں آپ سے بحث کرکے جیتنا نہیں چاہتی۔ وقت تبلا دے گا کہ میں آپ کو ایسا نہیں سمجھتی۔ ذرا یہ تو تبلائیے کہ غریب اور مصیبت زدہ اپنے امیر دلیش باسیوں سے کچھ بھی امید نہ رکھیں۔ تم نے اِن کنگالوں کو سرکار کا دروازہ تبلا دیا۔ مگر شیروں کے غار میں ان بے بسوں کو گھسنے کون دے گا۔ جب زمین اور آسمان ہی مدد کرنے سے انکار کردیں تو تمھیں کہو کہ یہ بیکس کس کا آسرا لیں۔ کہاں جائیں۔ آپ ہی تبلائیے کہ ایک ظالم اور جابر زمیندار میں اور آپ میں کیا فرق ہوا۔

اومیش نے شیلا کی بات اِس طرح سُنی جیسے ایک کمانڈر اپنے باغی سپاہی سے "انقلاب زندہ باد" کا نعرہ سنتا ہے۔

شیلا کے چہرے پر پھر ایک جلال چمکا۔ آنکھوں میں بجلیاں کوندیں وہ پھر بولی "آگ لگا دیجئے ان کتابوں میں، تصویروں میں، ڈگریوں میں، مجھے آج معلوم ہوا کہ آپ کی رگوں میں سیاہ خون گردش کرتا ہے۔ آپ کی عقل وفہم اور دولت وعزت نے اُنھیں غریبوں کے کچلے ہوئے دل سے پرورش پائی ہے۔ آج کروڑوں بھوک سے مر رہے ہیں۔ ننگے ہیں۔ مگر ان کا کوئی مددگار نہیں، ہے بھگوان میں کس نرک میں آن پھنسی۔

اومیش نے ایسا محسوس کیا جیسے وہ ست یگ کے دَور میں سے گزر رہا ہے۔ اُس نے تعجب سے شیلا کی طرف دیکھا اور وہ برسات کی ایک جھڑی کی مانند کمرے سے نکل گئی۔

دوسرے روز رامیش دفتر میں ایک چمڑے کا تھیلا لئے ہوئے داخل ہوا۔ تھوڑی دیر تک بڑے بھائی سے اِدھر اُدھر کی گپیں لڑاتا رہا۔۔۔۔۔۔ خبر ہے الیکشن پھر ہوگا۔ اِس دفعہ اُس کا بھی ارادہ الیکشن لڑنے کا ہے۔ اومیش اپنا کام کرتا رہا۔ اور رامیش چلا گیا اور کوٹھی کے اندر تھوڑی دیر میں چلا گیا۔ جب اومیش کی کُہنی چمڑے کے بیگ سے ٹکرائی تو اُس کی نگاہ میز کے دوسرے کونے پر گئی۔

ایک خط اور چھ ہزار کے نوٹوں کا بنڈل۔ اومیش کو سکتہ ہوگیا۔ اُسے ایسا محسوس ہوا جیسے کسی نے لاکھوں گھونسے ایک دم سے رسید کئے ہوں! اچھا میں سمجھا۔ وہ اُٹھا، ہیٹ اُٹھائی اور کو دکر کار میں جا بیٹھا۔

سمجھا اچھی طرح سمجھ گیا۔ یہاں تک میری نگاہ نہیں پہنچی تھی۔

یہ ہورن، وہ موٹر، وہ موٹر، یہ ہورن اور پھر بنگلہ۔

تیر کی طرح وہ سیدھا اندر پہنچا۔ شیلا بوریوں کے برابر بیٹھی ہوئی گیہوں بین رہی تھی۔ ناک خالی۔ کان خالی۔ گلا خالی اور کلائیاں بھی سونی۔ معمولی دھوتی، بال بکھرے ہوئے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ شام نے ہلکے سفید بادل کی ساری پہن لی ہے۔ ہیٹ کو اُتار کر جھولے پر پھینکتے ہوئے اومیش گرج کر بولا۔ میری عزت بیچ کر ہی غریب پرور بنا جاتا ہے نا۔

شیلا نے گیہوں کے ڈھیر کو اور زیادہ پھیلا دیا۔

اومیش کے غصے کا بند ٹوٹ گیا۔ وہ بولا مجھ سے بغیر دریافت کئے گہنے بیچنے کا تمھیں کیا اختیار تھا۔

شیلا نے نفرت آمیز نگاہ سے اُس کی طرف دیکھا۔ پھر گیہوں کے ڈھیر میں سے دو چار کنکر بین کر دور پھینک دئے۔

"جواب دو" اُس کی آواز اور زیادہ تیز ہوتی جارہی تھی۔ "تم سمجھتی ہوگی کہ تم خود مختار ہو۔ مگر بغیر میری اجازت کے اِس گھر کا تم ایک تنکا بھی نہیں چھو سکتیں۔ سمجھیں؟ میں اپنے اختیارات کام میں نہیں لاتا۔ اِس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ میں اُن سے دست بردار ہو چکا ہوں۔ وہ دن بہت دُور ہیں جب عورت "استری دھن" کی مالک سمجھی جانے لگے گی۔ سمجھتی ہو؟

شیلا نے پھیلے ہوئے گیہوں کے ڈھیر میں ایک تصویر بنانی شروع کی۔

اچھا اب آپ سے بولا بھی نہیں جاتا منہ سے دو الفاظ تک نہیں نکلتے۔ میں یوں ہی بک رہا ہوں؟ کہاں ہیں گہنے؟ وہ اور زیادہ زور سے گرجا "ایک لمحے میں تمھارا دماغ ٹھیک کر دوں گا۔"

شیلا نے گیہوں کی تھالی ایک طرف سرکا دی۔ اُٹھی اور تھوڑی دیر میں ایک صندوقچی لئے ہوئے لوٹی اور خاموشی سے صندوقچی کو اُس کے قدموں میں رکھ دیا۔

اومیش خاموش اور بھونچکا سا رہ گیا۔ شیلا کاٹھ کی پتلی کی مانند پھر گیہوں بیننے بیٹھ گئی۔ اُس کے رُخساروں پر ایک رنگ آتا اور ایک جاتا تھا۔ دل میں ایک تلاطم برپا تھا۔

اُسی وقت رامیش کی آواز سنائی دی "بھیا"

اومیش نے مُڑ کر اُس کی طرف دیکھا۔ رامیش بولا "عزت علی کو لوگ شرابی کبابی سمجھتے ہیں۔ مگر وہ عجیب آدمی نکلا۔ کمبخت شراب میں چُور رہتا ہے مگر حاتم کی قبر پر لات مارنے کا دل رکھتا ہے۔ نہ معلوم کس زمانے کے احسان اُس نے یاد رکھے۔ میں نے سرُوکھنے پر "بلین بام" کی ایک شیشی اُسے اُدھار دی تھی۔ کسے معلوم تھا کہ یہ ناچیز اِتنے روپے بٹور لائے گی اور تمھارے گہنے سب بچ جائیں گے۔"

اِس کے بعد وہ شیلا کی طرف مخاطب ہوتے ہوئے بولا "صوبے کی کسان سبھا کے سکرٹری کا عہدہ تو آپ کو قبول ہے بھابھی۔"

اومیش جھولے پر بیٹھا ہوا ہل رہا تھا۔ شیلا گیہوں چن رہی تھی۔ اومیش شکست کھا چکا تھا۔ مگر پھر بھی اکڑ اور غرور۔ اومیش کی مایوسی اور مردنی کو دیکھ دیکھ کر پاش پاش ہوا جاتا تھا۔

رات کو دو لوں سوئے تو شیلا نے کہا "بہت دنوں سے ایک بات پوچھنا چاہتی ہوں۔"

اومیش ایک سیکنڈ میں سمجھ گیا کہ وہ بات کیا ہے۔ وہ اپنے ہونٹوں کو جو شیلا کے بوسے لینے کے لئے بیقرار ہو رہے تھے۔ دانتوں سے دبا کر بیٹھ گیا۔

"نہیں" ایک بیدار ربنا چیخ اُٹھی "نہیں ہرگز نہیں۔ بغیر پریم کئے تمھیں کسی عضو سے لطف اندوز ہونے کا حق نہیں ہے" اُسے یاد آگیا۔ ایک خط میں اُس نے سندری کو لکھا تھا۔

"خواہش نفسانی سے جس روز انسان مغلوب ہو جاتا ہے، اُسی روز موت اپنی شب عروسی مناتی ہے۔ پریم نہیں تو آنند نہیں۔ اس کے بغیر انسان کمینگی کی زندگی بسر کرنے لگتا ہے اور اُس کے لئے کوئی اُمید باقی نہیں رہتی۔"

ارے اومیش یہ تو اندھیرے کمرے میں آنکھیں بند کرکے شراب پینا ہے۔

شیلا نے آہستہ سے کہا "اگر میں دریافت کروں تو آپ ناراض تو نہ ہوں گے۔"

اومیش نے گویا تحت الثریٰ میں لیٹے لیٹے نسائیت کی یہ پکار سنی!

نہیں نہیں، بالکل نہیں۔ یہ تو بے ایمانی ہے کمینگی ہے۔ بے شرمی ہے۔ گناہ ہے، اگر میں شیلا سے پریم نہیں کرتا تو نہ کروں۔ مگر اُسے بے موت تو نہ ماروں۔"

وہ بولا "شیلا"

شیلا اُٹھ بیٹھی اور اِٹھلا کر بولی "ایک بار آپ نے مجھ کو لکھا تھا کہ زندگی میں اب آپ کو رس نہیں آتا" شیلا کے سر پر سے سنہری ساری کا پلّہ کھسک کر کندھے پر آ پڑا۔ بڑی بڑی آنکھوں میں اُس نے ایک نیا راگ سُنا۔ موسیقی کی پہلی جھنکار مجسم ہو کر زندہ ہو گئی تھی۔ اُس نے دیکھا کہ شیلا کے جوبن کا ٹیسوں بھرا اُبھار خواب کی بناوٹی شکل ترک کر کے اصلیت میں تبدیل ہوتا جا رہا ہے۔

"شیلا آج تم اتنی پیاری کیوں معلوم ہوتی ہو۔ مجھے علم نہ تھا کہ جھگڑے کے بعد تم اتنی سندر معلوم ہونے لگو گی" وہ بولا

"ہم عورتوں کو اگر قدرت خوبصورتی سے نہ سجاتی تو مرد ویراگ (فقر) کا مجسم اوتار ہو جاتے" شیلا بولی

اومیش کے دل میں ایک نامعلوم روشنی سی ہوئی، اومیش اومیش سنبھل۔ خواہشات نفسانی کو مشتعل نہ ہونے دے۔ یہ حالت ایک لمحے سے زیادہ قائم نہ رہ سکے گی۔

شیلا نے انگڑائی لیتے ہوئے پوچھا، جواب دو گے یا نہیں۔

جواب کا بغیر انتظار کئے شیلا اومیش سے لپٹ گئی اور بولی "میں نے آکاش میں چندرماں کو دیکھو اور تیرا مکھڑا نیارو اور پھر بتلاؤ، دونوں میں کون خوبصورت ہے۔

اومیش نے کوشش کر کے چاہا کہ کہہ دے "کوئی نہیں" مگر اس وقت اِس کے اندھیرے دل میں موسم بہار کی وہ تند آندھیاں آ رہی تھیں۔ جس کے جھونکوں میں شبِ عروسی کی مخموریت پوری قوت سے موجود تھی۔ شیلا کے خوبصورتی کے جلال سے اُس کی عقل کی آنکھیں خیرہ ہو چکی تھیں۔ اُس کی رگ رگ میں شیلا کے لوچدار جسم کی شیرینی کا مدہ بہہ نکلا اُس کے ہونٹوں میں ایک نئی قسم کی سی گدگدی کلبلانے لگی۔ وہ ایک دم بول اُٹھا "تم"

"سچ" اومیش کی پیشانی پر نگاہ ڈالتے ہوئے شیلا بولی ——

"تب تم کسے زیادہ چاہو گے"

وہ بے قابو سا ہو گیا اور شیلا کا بوسہ لیتے ہوئے بولا "تم کو"

"مجھے —— سچ!" اُس نے پوچھا

"ہاں۔ ہاں تمھیں کو میری جان۔ اس وقت تم مجھے سُکھ کی دیوی معلوم ہوتی ہو۔ معلوم نہیں عورت میں کیا جادو بھرا ہے" وہ بولا۔

شیلا نے اپنے آپ کو اُس کے بازوؤں میں ڈھیلا چھوڑ دیا۔ بولی "اومیش یاد رکھنا کیا کہہ رہے ہو"

اومیش نے کچھ جواب نہ دیا۔

"اومیش سنو تو ایک دن میں ضرور مر جاؤں گی" وہ اچانک بولی۔

"ہوں"!

"اچھا سچ بتاؤ تم نندنی کو پیار کرتے ہو یا مجھے؟"

اومیش کو ایسا معلوم ہوا کہ "تو نے رام" کے سینے پر تیر مارا ہو۔ اُس کے رنگ محل پر بجلی گر پڑی وہ چونک کر جاگ پڑا۔ کھویا کھویا سا شیلا کی طرف دیکھنے لگا۔ کچھ جواب دیتے نہ بن پڑا۔

رات بھیگتی چلی جا رہی تھی۔ چاند ڈھلتا جا رہا تھا۔ ہوا خنکی کی وجہ سے بھاری سی ہوتی جا رہی تھی۔ رات کے سناٹے اور خاموشی کی انتہا معلوم نہ ہوسکنے کی وجہ سے رات کے پرندے اپنے گھونسلوں میں واپس آ رہے تھے۔

اومیش کی پھر ہمت نہ پڑی کہ وہ شیلا کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال سکے، اُس کے سامنے جا سکے۔ اپنی ہی نگاہ میں وہ ایسا گر گیا۔ اتنا گر گیا کہ ایک چھوٹی چیونٹی بھی اُسے اپنے سے اچھی معلوم ہوتی تھی۔ واقعی وہ بہت ذلیل تھا۔ تو کیا اُس نے صرف خواہش نفسانی کے پورا کرنے کے لئے ہی شادی کی ہے۔ کس قدر خوفناک حقیقت ہے۔ اُس کی زندگی متضاد باتوں کا میدان کارزار بن کر رہ گئی ہے۔ او بھگوان یہ عجوبہ پن میری زندگی میں کہاں سے آکر جمع ہو گیا۔

آج صبح پہلی بار اُس کو اپنی آنکھوں میں اشکوں کی نمی محسوس ہوئی ریکیٹ اُٹھایا اور سوچا کھیلنے چلو۔ بلّا گھماتا ہوا وہ پورٹیکو میں پہنچا ہی تھا کہ سامنے ایک لینڈو آکر رُکی۔ یہ کون آیا۔ وہ ٹھیر گیا۔ من میں ایک بھینی سی ہوئی۔ علی الصباح آج کون آیا۔

اُس نے دیکھا وہ نندنی ہے۔ ایک لمحے میں وہ سیڑھیوں پر آپہنچی۔ رُک کر اومیش کی طرف دیکھا اس وقت رس بھرے ہوئے موسم بہار کو دیکھنے کے لئے اُفق پر ٹہل رہے تھے۔ فضا میں خمار سا چھایا ہوا تھا۔

نندنی! تم!! وہ بولا "اس وقت یوں۔ اب کیا ہو گا"

سورج نکل چکا تھا۔ مگر اُسے محسوس ہونے لگا کہ شام نے چاندنی

کی ہلکی ساری پہن لی ہے۔ لیلائے شب تاروں کی پیالیوں میں شراب بھر رہی ہے۔ سمندر نے اپنے ستار کے تار ہواؤں میں ڈھیلے چھوڑ دئے ہیں۔ اور آج اُس کے گھر پر نندنی؟ یوں۔

اور نندنی نے مسکرا کر کہا "نمستے" ایک پُرانی مگر امر یاد زندہ ہو کر سامنے آ کھڑی ہوئی اور نندنی کے مُنہ سے بول اُٹھی "نمستے"

نندنی نے قہقہہ مارا۔ بولی۔ خواب تو نہیں دیکھ رہے ہو۔ نمستے لیجئے۔ میں سپنے کی پری نہیں ہوں۔

اومیش نے بے قابو ہو کر کہا "معلوم نہیں تم کیا ہو۔ کیا تم نے سنیاس لے لیا ہے نندنی"

"اندر چلیئے گا یا اسی جگہ شام کر دیجئے گا۔ وہ آگے بڑھتے ہوئے بولی۔ چلیئے میں ہمیشہ آپ کے آگے ہی آگے رہی ہوں۔ آج آپ کے گھر میں بھی آپ کے آگے کیوں نہ رہوں اور وہ ڈرائنگ روم کی طرف مڑی۔ اس نے کہا آپ کو سکھی دیکھکر اپنے کو سکھی کیوں نہ سمجھوں، میں ایک کام سے آئی ہوں۔ آپ اس صوبہ کے دان ویر زمیندار ٹھیرے جن کے محترم خسر صوبے کے پرائم منسٹر ہیں۔ میں نے سوچا اپنے خیراتی اسپتال کے لئے کیوں نہ کچھ مانگ لاؤں، کچھ دیجئے گا یا نہیں۔ یا نئی شادی کے تقاضے ٹھکتا تے ہتھیلیوں میں گھاؤ ہو گئے ہیں۔

وہ سامنے لگی ہوئی تصویر کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔ یہ کس فلم اسٹار کی تصویر ہے، یہ شوق کب سے پالا"

شیلا پردے کے پیچھے دم بخود کھڑی ہوئی سب باتیں سُن رہی تھی۔ اس سے اپنی یہ بے عزّتی نہ سہی گئی۔ "یہ کلموئی سبھی کو طوائف سمجھتی ہے"

اومیش کا دم اوپر کا اوپر اور نیچے کا نیچے تھا۔

نندنی بولی "نکالئے چک بُک۔ میں یہاں کام سے آئی ہوں"

اومیش اُٹھا میز کی دراز سے چیک بُک نکالی اور بیٹھتے ہوئے بولا۔ "کتنا لکھ دوں"

نندنی بولی۔ پہلے کوئی ہندسہ لکھیئے اور پھر آخر میں جتنے صفر چاہئے بڑھا دیجئے۔

اومیش لکھتے لکھتے بولا "میں سوچتا ہوں زندگی کیا سے کیا بدل جاتی ہے۔"

"بس تین صفر ہی مجھے دے رہے ہو" وہ ہنسکر بولی۔

اومیش نے تین صفر کے آگے ایک صفر اور بڑھا دی ــــ بس۔

بس چک لیتے ہوئے وہ بولی۔ خدمت ہی وہ شاہراہ ہے جس پر اب ہم اور تم مل سکتے ہیں۔ کوئی کسی کا ہوا اور نہ ہوگا۔ اگر ہم اپنی غرض ہی ترک کر دیں تو یہی سب سے بڑی قربانی ہے۔ میں تو اب نہ دوست کا اعتبار کرتی ہوں اور نہ عاشقوں کا۔ میرے لئے یہ زندگی ایک یاترا کے مانند ہے۔ اچھا چلیں۔ چائے وائے نہ پلایئے گا کیا۔ برسوں بعد ایک مسافر آیا۔ پیاسا ہی ٹال دوگے کیا؟

نندنی نے چک لے کر چاہا کہ پاکٹ میں رکھ لے۔ مگر اُس کے کندھے پر کسی نے پیچھے سے ہاتھ رکھدیا۔ "چک ادھر لایئے" شیلا نے کہا۔

اومیش چونک کر دیکھنے لگا، نندنی کی نگاہوں میں مستفسرانہ انداز تھا۔

شیلا نے سنجیدگی سے پھر کہا۔ مجھے دیجئے یہ چک"

اومیش نے گھبرا کر کہا "شیلا"

شیلا نے اومیش کی طرف دیکھا اور دریافت کیا "یہی شریمتی شیلا دیوی ہیں؟"

ہاں میں ہی شیلا ہوں۔ میں دم حجانسے میں نہیں آسکتی۔ مرد محبت کے جال میں پھنس سکتا ہے۔ عورت نہیں۔ مجھے باتیں کرنے کی فرصت نہیں۔ چک میرے حوالے کیجئے۔ اور نکل جایئے بنگلے سے .... نہیں تو......"

وہ تھر تھر کانپ رہی تھی۔ اومیش نے اُٹھنا چاہا۔ مگر نندنی نے آنکھ کے اشارے سے بٹھا دیا بولی...... سمجھی میرا تو صرف دس ہزار کا سوال ہے۔ میں تمھارے اِس زمیندار اومیش کو لے کر کیا کروں گی۔ تم فضول شک کرتی ہو۔ کیوں سمجھیں۔ اور وہ اومیش کی طرف منہ کر کے بولی "اِس خوبصورتی کے چاند میں یہ حسد، روز روشن کے دل میں یہ اندھیرا!"

میں ایسا نہ سمجھتی تھی کیوں اومیش؟ میرے گھر میں میری ہی بے عزّتی کرتے تمھیں شرم نہیں آتی" شیلا گرجی۔

نندنی بولی۔ ایک کام کرو شیلا۔ میں تمھیں یہ پستول دیتی ہوں۔ مجھے گھر سے نکال دینے سے کچھ نہ ہوگا اور اُس نے اپنے کاڑھے کے تھیلے میں سے پستول نکال کر نندنی کی طرف پھینکا۔ کر دو میرا کام تمام۔ دیکھتی کیا ہو میری طرف۔ ڈرنے کی پھینے کی بات ہی کیا ہے۔ آخر تم اتنا زور کس پر دکھاتی ہو۔ بیوی بن جانے سے کوئی نئی بات تو حاصل نہیں ہو جاتی۔

شیلا نے غصے میں پستول اُٹھالیا۔ اومیش کو د کر کھڑا ہو گیا۔ شیلا! شیلا!!
نندنی اومیش کو ہاتھ سے روکتے ہوئے بولی۔ حسد کی آگ پر پریم کی ہانڈی نہیں چڑھ سکتی۔ محبت کا پھول کہیں اس مٹی میں کھل سکتا ہے اور وہ شیلا کو مخاطب کرتے ہوئے بولی " دیکھتی کیا ہو دبا دو گھوڑا۔ میں تمھارے اومیش کو چھیننا نہیں چاہتی۔

شیلا نے محبت بھری آنکھوں سے پستول کو دیکھا اور نند کی طرف دیکھتی ہوئی بولی۔ تم نے میری دل کی دنیا اُجاڑ ڈالی ہے۔ آج اِس میں میرے لئے صرف آگ ہی آگ باقی ہے۔

اومیش جیسے خواب دیکھ رہا تھا۔ خاموش اور کھویا ہوا۔

نندنی نے چلّا کر کہا " تو دیر کیا ہے دبا دو گھوڑا "

شیلا نے گھور کر دیکھا۔

میں مرنے سے نہیں ڈرتی۔ مجھے یہ وہم سا ہو گیا ہے کہ مرنے میں ہی سکھ ہے۔ یہ کام تمھارے ہی ہاتھوں پورا ہو اس سے زیادہ کیا اچھی بات ہے۔ شیلا دیکھو وقت نکلا جا رہا ہے۔ اپنی آگ آج میرے خون سے بجھا لو۔ بجھا لو۔ تم اتنا کیوں سوچ رہی ہو۔

شیلا کی مٹھی مضبوط ہوئی۔ اُس نے اومیش کی طرف دیکھا۔ وہاں کیا رکھا تھا۔ دونوں کی پھٹی ہوئی آنکھوں میں حیرانی اور نامردی ناچ رہی تھی۔

اُس نے چھاتی تان کر کھڑی ہوئی نندنی کی طرف دیکھا۔ وہاں کیا تھا۔ ایک کبھی نہ ٹوٹنے والا ارادہ۔ عریاں صداقت۔ سوسائٹی اور دھرم سے علیحدہ رہنے والی غیر متزلزل مرضی۔

شیلا نے پستول کو ایک بار پھر تولا

اومیش سے اُس نے دِل ہی دل میں چلا کر پوچھا " اومیش بولو! سچ بولو، میں مروں یا زندہ رہوں۔ ایک سیاہ بادل کے پیچھے سے گرجتی ہوئی آواز آئی " مر جاؤ "

پستول کی نلی کو شیلا نے اپنی چھاتی پر رکھ لیا۔

اومیش لپکا۔ مگر نندنی نے دونوں ہاتھوں سے اُسے روک لیا۔ اور بولی فکر نہ کرو۔ حاسد کبھی خودکشی نہیں کر سکتا۔

شیلا کا رواں رواں جل اُٹھا۔ اُس نے دیکھا نندنی کے بازوؤں میں کتنی طاقت ہے۔ اومیش وہیں رُک گیا نہ چاہتے ہوئے بھی نہ جانے کیوں۔

" شیلا! " دل نے کہا " شیلا اپنی بدقسمتی مجسم دیکھ لو۔

پستول کی نلی ان مدبھری چھاتیوں کے درمیان گڑ گئی۔ اُس نے آنکھیں بند کر لیں۔ اندھیرے میں اُسے دکھائی دیا کہ وہ اکیلی ہے۔

اُنگلی ہلی۔ اس میں سختی آئی اور وہ گھوڑے پر جا جمی۔ مر جا شیلا مر جا، سماج کے بھروسے پر بیٹھی بیٹھی تو کتنی راتیں گنوارے گی۔ کتنے دنوں تک جلتی رہے گی۔ پیاسی اِسی صحرا میں کب تک گھومتی پھرے گی۔

گھوڑا ہلا کہ آندھی کی طرح رامیش اندر کمرے میں گھس آیا۔ شیلا کی کلائی مروڑ کر پستول چھین لیا اور بولا " بھابی میری مزدور سبھا کی پہلی میٹنگ کیا ماتمی جلسے میں تبدیل ہو جائے گی۔

شیلا بے ہوش ہو کر نیچے کو ڈھلنے لگی کہ اومیش نے اُس کو تھام لیا۔



مچی جلدی کہ کلیاں ہیں چٹکنے والی
راہوں میں ہیں سب لوٹ کے گل بھٹکنے والی
ہنستا ہے کہ مژگانِ جہاں سے تری ہم
نسوں کی طرح ہے اب بہکنے والی

انجم

صد شکر کہ آگئے شہابی جاڑے
کھیتوں میں ہیں لہکے ہوئے جمالی جاڑے
بھینی بھینی رضائیوں کے قابل
ہلکے ہلکے خنک گلابی جاڑے

انجم

پٹرول کی جنگی اہمیت

رئیس دہلوی

مصنف "سونے کی اقتصادی اہمیت" (مطبوعہ ستمبر ۱۹۳۶ء) کا یہ دوسرا مضمون ہے۔ پہلے مضمون میں مصنف نے سونے کی تاریخ اور اس کی اقتصادی اہمیت پر روشنی ڈالی تھی اور دنیا کی کانوں کے متحیر کن اعداد وشمار پیش کئے تھے۔ اس مضمون میں پٹرول کی جنگی ضروریات اور عالمگیر اہمیت پر تبصرہ کیا ہے۔

پٹرول ضروریاتِ زندگی میں کس حد تک سبقت لے گیا ہے؟ اس کا اندازہ مسٹر جارج کلیمن سیو کے اس برقیہ سے ہو سکتا ہے جو اس نے جمہوریہ امریکہ کے صدر ولسن کو دسمبر ۱۹۱۷ء میں بھیجا تھا، اس نے اس برقیہ میں بیان کیا:۔

"اگر پٹرول کی ضرورت پوری نہ کی گئی تو ہماری جنگی قوت کا زوال شروع ہو جائے گا اور ہم ذلت آمیز صلح پر مجبور ہو جائیں گے۔ اگر اتحادی شکست نہیں چاہتے تو انھیں چاہیئے جرمن عظمیٰ کے حملہ کے موقع پر فرانس میں پٹرول کی کمی نہ ہونے دیں ـــــ اس وقت ہمارے لئے پٹرول کا ایک ایک قطرہ خون کے قطروں کے برابر ہے۔"

جنگِ عظیم میں فرانس کو صدہا مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ پھر بھی وہ کسی نہ کسی طرح ان پر قابو پا گیا۔ لیکن پٹرول کی کمی نے اسے اس حد تک پریشان کر دیا کہ مسٹر کلیمنسو کو مندرجہ بالا الفاظ میں صدر جمہوریہ امریکہ کو فہمائش کرنی پڑی۔ بہرکیف جان راک فیلر کی اسٹنڈرڈ آئل کمپنی نے اپنی پوری قوت سے اس کی مدد کی۔ اور یہ اخطاط دور کر دیا۔

آیا اس واقعہ نے جنگِ عظیم کا موجودہ نتیجہ مرتب کیا؟ اس کا فیصلہ مورخین ہی کریں گے مگر اس سے یہ ظاہر ہو جاتا ہے کہ جنگی ضروریات کے لئے پٹرول کس درجہ اہم ہے۔ اور اس کا نہ ہونا بڑی سے بڑی قوت کے لئے کس درجہ تخریب کا سامان بن سکتا ہے؟

کیلوین کو لیج کہتا ہے

"بہت ممکن ہے آئندہ اقوام کے تنزل و بہبود کا انحصار پٹرول کی پیداوار پر رہ جائے۔"

جنگی ضروریات میں پٹرول کو جو اتنی اہمیت حاصل ہے اس کی تشریح مشکل نہیں۔ اب وہ زمانہ نہیں رہا کہ انسانی بازوؤں کی قوت فتح و کامرانی کا فیصلہ کیا کرے بلکہ انسانی دماغوں کی کشف ریزیوں نے ایسی ایجادات دنیا کے سامنے پیش کر دی ہیں جو انسانی بازوؤں سے زیادہ دادِ شجاعت دے سکتی ہیں مگر وہ اس وقت تک بیکار ہیں جب تک پٹرول سے اُن میں جان نہ ڈال دی جائے۔ آج فتح کا بہت کچھ انحصار بحری و ہوائی جہازوں پر رہ گیا ہے۔ لیکن اگر پٹرول نہ ہو تو یہی مہیب جہازات پالکیوں اور رکشوں کے برابر رہ جاتے ہیں۔

پٹرول کی پیداوار

علم طبقات ارض کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ بارش، آندھی، برف

باعث گرمی اور سردی کے اثرات دنیا کی بڑی سے بڑی پہاڑی چوٹیوں کو آہستہ آہستہ لیکن مستقل طور سے صدمہ پہنچاتے رہتے ہیں۔ اور بارش اس گاد کو بہاکر دریا یا سمندر میں لے جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دریائے گنگا کا پانی ہمالیہ کی گاد کی بدولت بھاری ہے۔

بارش اور دریاؤں کی ہمیشہ یہی کوشش رہتی ہے کہ وہ اونچی سطح کو نیچے کردیں اور سمندر کو اُس تک پہنچادیں مگر زمین کی متضاد کشش انھیں اس جدوجہد میں مانع رکھتی ہے۔

کرۂ ارضی کی سطحی تبدیلیاں پہاڑیوں کا طول کم نہیں ہونے دیتیں اور سمندر کو ان تک پہونچنے سے روکتی ہیں۔ یہ متضاد جدوجہد دائم و قائم ہے کیونکہ اکثر آپ نے سمندر کو سطح زمین تک پہنچتے اور پھر وہاں سے اُترتے دیکھا ہوگا۔

یہ غیر مادی قوتیں جو کرۂ ارض کے سلسلہ میں آمادہ بہ پیکار رہتی ہیں اکثر زمین پر شکنیں اور گڑھے پیدا کردیتی ہیں۔ اُسی طرح جیسے کسی کمبل کے آمنے سامنے والے سرے کھینچنے پر اس میں شکنیں پڑجاتی ہیں۔ نظام قدرت کا یہ سوانگ وقفہ وقفہ کے بعد دنیا کے وسیع خطوں میں لاکھوں برس سے کھیلا جاتا ہے۔ بعض اوقات یہ جدوجہد زیادہ اہمیت اور تیزی اختیار کرلیتی ہے۔ جس سے بہار اور کوئٹہ کے سے زلزلے پیدا ہوسکتے ہیں۔

اس جدوجہد میں کرۂ ارضی کا یہ بوسیدہ اور زائل شدہ مادہ جسے گاد بھی کہہ سکتے ہیں زمین کے اندر دھنس جاتا ہے۔ یا بہہ کر سمندر میں پہنچ جاتا ہے۔ اس میں ایک حصہ نباتات اور کیڑوں و جانوروں کا بھی ہوتا ہے۔ بعض حالات میں یہ چیزیں کوئلہ کی شکل اختیار کرلیتی ہیں۔ دوسرے حالات میں گیس اور پانی بن جاتی ہیں۔ لیکن اگر یہ صورتیں عمل پذیر نہ ہوں تو یہ حصہ ایک دوسری صورت اختیار کرکے سمندر سے علیحدہ ہوجاتا ہے۔ وہ صورت خام پٹرول ہے۔

پٹرول کا ابتدائی عروج

پٹرول کی موجودہ تاریخ شاید ۱۸۵۹ء سے شروع ہوتی ہے۔ جب اس مقصد سے ایک کنواں پن سلوانیا میں کھدوایا گیا تھا اُس کی قدروقیمت معلوم ہونے کے بعد بھی اس کی تلاش کا کوئی ذریعہ نہیں تھا۔ اگر کہیں اس کا چشمہ خود ہی پھوٹ پڑتا تو اس کے نزدیک کنواں کھدوا کر نکالنے کی سعی کرلی جاتی۔ کنوئیں بھی کم گہرے کھودے جاتے۔ لیکن رفتہ رفتہ تیل کی جغرافیائی تقسیم کی معلومات نے ماہرین طبقات ارض کو اس قابل بنادیا کہ وہ وسیع خطوں میں اس کی موجودگی اور غیر موجودگی معلوم کرسکیں اور اب تو پچاس سالہ تجربہ نے اس علم میں ایک انقلاب برپا کردیا ہے۔

پٹرول کو شروع شروع میں بینز۔ ہنری فورڈ۔ ڈیملر اور ڈیزل نے اہمیت بخشی۔ اُنھوں نے سامان باربرداری کے لئے ایسی گاڑیاں ایجاد کیں جو بغیر پٹرول نہ چل سکتی تھیں اور دوسری چیزوں کی بہ نسبت ان کے ذریعے تبادلہ آسان تھا۔ اس طرح آہستہ آہستہ پٹرول دنیا کی نظروں میں اہمیت حاصل کرتا رہا۔ لیکن جب سے ہوائی جہازوں کی ایجاد ہوئی اور بحری قوت کا انحصار بھی اسی پر رہ گیا تو حکومتوں کے جنگی مفاد اس رقیق مادہ سے وابستہ ہوگئے

یوں تو فوجی لاریاں۔ موٹریں۔ ٹینکیں و دیگر تباہ کن اسباب جنگی موقعوں پر یہ پٹرول ہزاروں گیلن روزانہ خرچ کرتے ہیں۔ لیکن ان بحری و ہوائی جہازوں نے اس کو سب سے زیادہ تقویت بخشی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس کی تجارت جو پہلے آزاد تھی، آزاد نہ رہی اور حکومتوں کا مفاد اس سے بھی وابستہ ہوگیا۔

واقعی اگر جنگی قوت کا انحصار اس رقیق مادہ پر ہی رہ جائے تو حکومتی مفاد اس سے علیحدہ رہنے ممکن نہیں۔ اس لئے ہر حکومت یہی چاہتی ہے کہ وقت ضرورت اس کے پاس سب سے زیادہ پٹرول ہو۔ اور ہمیشہ اپنے ہم چشموں پر بازی لے جانے کی کوشش کرے۔ یہی وجہ ہے کہ اپنی ضروریات کا خیال کرتے ہوئے آج دنیا کی ہر قوت نے پٹرول کی تلاش اور اس کی حفاظت کو اپنا مطمع نظر بنا لیا ہے۔

اس وقت روس ہی ایک ایسا ملک ہے جہاں پٹرول کے چشموں کی ملکیت خود حکومت کی ہے۔ لیکن دیگر ممالک اپنے کارندوں کے ذریعہ تیل کے ارباب اقتدار سے خواہ وہ ہم وطن ہوں یا غیر ملکی ہر ممکن طریقہ پر تعلقات استوار رکھتے ہیں تاکہ وقت ضرورت وہ ان کے مفاد کے خلاف نہ جائیں۔

اسٹنڈرڈ آئل کمپنی

پٹرول کی اس درجہ اہمیت کو سب سے پہلے امریکہ نے محسوس کیا۔ اس منفعت بخش تجارت کا مستقبل معلوم کرتے ہی اسٹینڈرڈ آئل کمپنی راک فیلر کی ملکیت میں منصۂ شہود پر آگئی اور جلد یابدیر دنیا بھر کے چشموں پر قبضہ کر لیا۔ تجارتی دنیا میں شاید جان راک فیلر ہی ایک شخص ہے جس نے تاریخ میں اس قدر فائدہ اُٹھایا اور چند سال کے عرصہ میں ہی ارب پتی بن بیٹھا۔

شروع شروع میں اسٹنڈرڈ آئل کمپنی من مانا فائدہ اُٹھاتی رہی لیکن بعد میں جب اس سودمند تجارت کو دیکھ کر دوسرے سرمایہ داروں نے حصہ لینا چاہا تو کمپنی اس قدر مستحکم ہو گئی تھی کہ اُس نے مقابلہ میں قیمتیں کم کر کے اور اپنے ریلوے۔ پائپ اور سیاسی اقتدار کی بدولت کسی کو سامنے آنے نہیں دیا۔

۱۹۰۰ء تک اسٹینڈرڈ آئل کمپنی دنیا بھر کی تنہا اجارہ دار تھی لیکن اس کے بعد اپنی بے اندازہ دولت نے اُسے کچھ لاپرواسا بنا دیا۔ موقعہ ملتے ہی دوسرے ممالک کے سرمایہ دار اٹھ کھڑے ہوئے اور رفتہ رفتہ بعض بعض ذخیروں پر قبضہ کرنا شروع کر دیا۔

۱۹۰۳ء تک کئی کمپنیاں قائم ہو گئی تھیں اور چند چھوٹے موٹے سرمایہ دار انھیں مستحکم کرنے میں ساعی تھے۔ پھر بھی جان راک فیلر کی بین الاقوامی اہمیت انھیں آگے بڑھنے نہ دیتی تھی۔ لیکن ۱۹۰۳ء کے بعد اُسے دو مضبوط کمپنیوں کا مقابلہ کرنا پڑا جنھیں وہ آگے بڑھنے سے نہ روک سکتی تھی۔ ان میں سے ایک کو برطانیہ کی سرپرستی کا شرف حاصل تھا۔

حقیقت یہ ہے کہ جنگِ عظیم میں جب برطانیہ کو پٹرول کی صحیح قدر و قیمت معلوم ہوئی تو اس نے فیصلہ کر لیا کہ آئندہ جنگی موقعہ پر پٹرول پر برطانیہ کا خود اقتدار ہو۔ اس طرح ایک تو اُسے پٹرول کی کمی نہ ہوگی۔ دوسرے برطانوی کمپنیاں جن قوتوں کو پٹرول سپلائی کریں گی وہ اس کی مخالفت میں گریز کریں گی۔ چنانچہ میثاق وارسیلز نے رُوسی اُس نے تمام مشرقی مقامات پر جہاں پٹرول پیدا ہوتا تھا براہِ راست یا بالواسطہ اقتدار حاصل کر لیا اور جب اس پر جانبین کے دستخط ہو گئے تو اعلانیہ کہنا شروع کر دیا کہ برطانیہ نے دنیا کے آدھے پٹرول پر قبضہ کر لیا ہے۔ اس کا احساس دوسری اتحادی قوتوں کو بھی تھا۔ اُنھوں نے بھی صاف کہہ دیا کہ حصہ تقسیم میں برطانوی مفاد سب سے زیادہ ملحوظ رکھا گیا ہے۔ اور ہمارے ساتھ ناانصافی برتی گئی ہے۔

اس مقصد کے لئے برطانیہ نے اپنا ایک محاذ قائم کیا اور چند ایجنٹوں خدمات حاصل کیں۔ جن میں کرنل لارنس۔ گرٹ رو ڈ بل۔ سیڈنی ویلی۔ سر ہربرٹ کیسل۔ جنرل الن بائی۔ سر پرسی۔ سائکس وغیرہ ممتاز حیثیت رکھتے ہیں۔ اُنھوں نے اپنی ریشہ دوانیوں مکاریوں اور چلبازیوں سے مشرق کے آزاد حکمرانوں کو طرح طرح کا لالچ دے کر اور اپنے ناجائز سیاسی اقتدار سے دباؤ ڈال کر کسی نہ کسی طرح ان خطوں کو جن میں پٹرول پیدا ہوتا تھا قبضہ میں کر کے برطانوی سرمایہ داروں کے حوالے کر دیا۔

ان سرمایہ داروں نے جنھوں نے اس متحدہ محاذ میں حصہ لیا صرف ایک انگریز ہے۔ بقیہ یہودی ہیں۔ جن میں ایک اسکاٹ۔ ایک یونانی ایک ڈچ اور ایک آرمینین ہے۔

ان سب میں ممتاز ڈچ ہے۔ اس کا نام سر ہنری ڈیسٹرڈنگ کے۔ بی۔ ای ہے۔ اس نے رائل ڈچ شیل کمپنی قائم کی اور اپنی اعلیٰ دماغی اور برطانوی معاونت سے اُسے بہت جلد بامِ عروج پر پہنچا دیا۔ بعض دوسرے برطانوی سرمایہ داروں نے بھی ہنری ڈیٹرڈنگ کی مدد کی۔ اور آج اُسے اس قابل بنا دیا کہ کئی شاہانہ قصروں کا مالک ہے۔ ارب پتی ہے۔ اور عام رائے کے مطابق پٹرول کی تجارت کا حکمراں ہے۔ اس نے اسٹنڈرڈ آئل کمپنی کا بخوبی مقابلہ کیا اور اس کی مزاحمت کی تمام کوششیں رائیگاں کر دیں۔ آج رائل ڈچ شیل اپنی پیداوار کا کثیر حصہ جرمنی۔ فرانس۔ اٹلی اور جاپان وغیرہ کے ہاتھ فروخت کرتی ہے۔

برطانیہ کو اب امریکہ کی بھی فکر نہیں۔ کیونکہ اُس کے چشموں میں اب پٹرول بہت کم رہ گیا۔ برعکس برطانوی ملوکہ چشمے پٹرول سے لبریز ہیں۔ اس لئے صاف ظاہر ہے کہ برطانیہ سے پہلے امریکہ کے چشمے خالی ہو جائیں گے۔

روسی پٹرول

لیکن ایک تیسری قوت نے ان دونوں قوتوں کو بے حد وجوہ پریشان کر دیا ہے۔ اُسے ان دونوں پر ہر طرح فوقیت حاصل ہے۔ یہ قوت سویٹ روس تاریخ کی پہلی حکومت ہے جس نے اپنی دولت قوم کی مساوی ملکیت ثابت کر دی۔ اس کے پاس پٹرول کے لاتعداد چشمے ہیں۔

فی الحال ان چشموں کا دائرہ باکو تک محدود ہے۔ یہ خطہ زار کے زمانے سے وسیع پٹرول رکھنے کی بدولت مشہور ہے۔ انقلاب سے پہلے یہ

میں نے بھی بڑودہ کے اسٹیشن پر اُسے اسباب لادتے ہوئے دیکھا تھا" یہ سنکر مجھے غصہ آگیا اور ٹکٹ اگزامینر کو ڈانٹنے لگا۔ لڑکی نے ٹکٹ اگزامینر سے کہا" معاف کیجئے اس کی باتوں کا خیال نہ کیجئے۔ اس کے دماغ میں خلل ہے، مگر کام تو بہت اچھا کرتا ہے۔ اسی وجہ سے میں اسے پاپا کے پاس مدراس لئے جارہی ہوں۔ وہاں جو تدبیر مناسب ہوگی کروں گی" ٹکٹ اگزامینر خاموش رہا۔ ریل چل چکی تھی۔ میں یہ باتیں سنکر سکتے میں آگیا (جو کچھ میرے منہ میں آیا) خوب صلواتیں لڑکی اور ٹکٹ اگزامینر کو سنائیں۔ دونوں نے مجھے پاگل سمجھکر ہاتھ پیر بستر بند سے کس دئے۔ جب میں بالکل بے بس ہوگیا تو مجھے باتھ روم میں بند کر آئے۔ اور اطمینان سے آپس میں گفتگو کرنے لگے، میں شور مچایا کیا۔ مگر کسی نے دھیان نہ دیا۔ غالباً تمام گفتگو میرے متعلق تھی۔ جب میں بہت شور کرتا تھا تو ٹکٹ اگزامینر آکر میرے ناک اور کان ٹکٹ کاٹنے والی مشین سے دبا جاتا تھا جس کی وجہ سے میں اور بلبلا کر رہ دیتا تھا۔ یہ لڑکی کیا تھی ایک خوبصورت ناگن تھی جس کے کاٹنے کا منتر تھا۔ اگر یہ ظلم وستم محبت سے ہوتے تو میں بخوشی برداشت کرلیتا۔ مگر اس میں محبت کی ذرا بھی بو نہ تھی۔

(۴)

چلتے چلتے فرنٹیر میل مدراس کے عالی شان اسٹیشن پر رُکا۔ اور اور لڑکی نے قلیوں کو بلاکر اسباب اُتروانا شروع کیا۔ جب میرا بھی اسباب اُتارنے لگی تو میں نے شور مچانا شروع کیا کہ یہ چور ہے۔ میرا اسباب لئے جاتی ہے۔ مگر کسی نے اس کی پرواتک نہ کی۔ لڑکی نے ٹکٹ اگزامینر سے کہا" جناب من آپ اس آدمی کو ویٹنگ روم میں بند کردیجئے۔ میں مکان سے اپنا آدمی اور کار بھیجتی ہوں۔ آپ اُس پر اِس کو بھیج دیجئے گا" یہ کہہ کر لڑکی نے دو روپیہ ٹکٹ اگزامینر کو دئے جن کو اس نے تھنک یو کہہ کر لے لئے اور لڑکی فوراً نظر سے غائب ہوگئی۔ اس کے بعد ٹکٹ اگزامینر نے مجھ کو ویٹنگ روم میں بند کردیا۔ میں نے شور وغل مچانا شروع کردیا۔ اسٹیشن ماسٹر خود آئے اور شوروغل کی وجہ پوچھنے لگے۔ ٹکٹ اگزامینر نے سارا واقعہ بیان کردیا۔ جس کو سنکر اُس نے مجھ سے دو ایک سوال کئے۔ میں نے اس کو معقول جواب دئے۔ میرے جواب سنکر اسٹیشن ماسٹر کو اطمینان ہوا اور اُس نے میرا حال دریافت کیا۔ میں نے اس سے کہا کہ" میں آسر کا رہنے والا ہوں اور ساڑیوں اور شالوں کا ایجنٹ ہوں۔ آپ میری کمپنی کو فون کرکے دریافت کرسکتے ہیں۔ میرا نام احمد حسین ہے" اسٹیشن ماسٹر نے فوراً میرے منیجر سے فون پر دریافت کیا اور جب اُس کو یقین ہوگیا کہ جو کچھ میں نے کہا بالکل صحیح ہے تو اُس نے مجھ کو چھوڑدیا۔ اب سنئے جب میرا حال ٹکٹ اگزامینر پر ظاہر ہوا تو وہ بیچارہ بہت شرمندہ ہوا اور خوشامدیں کرنے لگا۔ میں نے کہا اب فرمائیے پاگل کون تھا۔ "بہرحال میں آپ کو نکلوانا تو چاہتا نہیں ہوں مگر میرا مال جو بہت قیمتی ہے مل جانا چاہئیے" ٹکٹ اگزامینر نے وعدہ کرلیا اور بہت سرگرمی سے کوشش کی مگر کچھ پتہ نہ چلا۔ آخر کار بیچارہ اپنی آدھی تنخواہ مجھ کو دیتا رہا اور کئی برس کے بعد میرا قرضہ ادا کرسکا۔ اس قسم کے لوگ اب بھی ملتے ہیں اس لئے ہر مسافر کو ہوشیار ہوکر سفر کرنا چاہئیے۔ اب جب کبھی میں اُدھر جاتا ہوں تو ٹکٹ اگزامینر میری قدر کرتا ہے۔ اور مجھے جب ریل کا واقعہ یاد آتا ہے تو میرے رونگٹے کھڑے ہوجاتے ہیں۔ پھر یہ نہ پتہ چلا کہ اس لڑکی کا کیا حشر ہوا۔

بندے بھی گناہوں کئے جاتے ہیں
توفیقِ گنہ بھی وہ دئے جاتے ہیں
توبہ پہ شکستِ توبہ کئے جاتے ہیں
ہم حکم کی تعمیل کئے جاتے ہیں

نسیم سعیدی ہاشمی

ایک خط

آگرہ۔ ۲۰ ستمبر ۳۶ء

کملا! تمھارا خط ملا اس سے پہلے بھی ایک خط آیا تھا۔ اس وقت یاد نہیں آتا، میں نے کیوں اُس کا جواب نہیں دیا۔ خیر اب تمھیں خط کے انتظار کا عرفانِ صحیح حاصل ہو گیا ہو گا۔ کسی چیز کا علم اُس کے جہل سے کچھ اچھا ہی ہوتا ہے۔ بہر حال معاف کر دو۔ محبت غلطیوں کا مجموعہ ہی ہے۔ گناہ سے تقدس کی توقع فضول ہے۔ تیل سے دامن کے داغ نہیں دھوئے جا سکتے اس لئے معاف کر دو کہ معاف کرنے کے علاوہ کچھ کر بھی نہیں سکتی ہو، یا کچھ کر سکتی ہو؟ زیادہ سے زیادہ خط و کتابت بند کر دو گی۔ لیکن محبت اس سے بہت بلند ہے۔ مجھے یقین ہے کہ تم مجھے بھُلا نہیں سکتیں، نہیں تو آزما دیکھو، جتنا بھُلاؤ گی اتنا ہی یاد آؤں گا، کیونکہ مجھے تم سے محبت ہے اور کیونکہ تمھیں مجھ سے محبت ہے۔ مشتعل نہ ہونا دیکھو تنکا شعلہ بن جانا چاہتا ہے۔ یہ بھی محبت ہے اور شعلہ تنکے کو اپنا سا کر لینا چاہتا ہے یہ بھی محبت ہے۔ لوہا مقناطیس کو کھینچتا ہے یا مقناطیس لوہے کو، کون بتا سکتا ہے بہ ظاہر جس کا وزن کم ہوتا ہے کھنچ جانے کا الزام اُسی پر عاید کر دیا جاتا ہے۔ مگر وزن کی کمی بیشی سے خواص اور ماہیت پر تو کوئی اثر نہیں پڑتا۔ لفظوں میں حقیقت تلاش نہ کرو۔ واقعات کے آئینے میں دیکھو۔ رہ گئیں مجبوریاں تو یہ رونے کی چیز نہیں۔ اُنھیں ہنس کر گزار دینا چاہیئے۔ توجہ کر کے اُن کی عزت بڑھانا مناسب نہیں میرا عقیدہ تو یہ ہے کہ میں جتنا زیادہ طاقت سے دبایا جاؤں گا اتنی ہی بلندی پر پہونچوں گا۔

کم

اگر کاغذ پر محبت کا غم رکھا جا سکتا تو میں غم ہی نہیں دل بھی نکال کر رکھ دیتا، مگر کملا! تم جانتی ہو، غم کا گاہک کون ہے۔ اگر محبت غم کی طالب نہ ہوتی تو تمھیں کو کیوں انتخاب کیا ہوتا۔ کسی ایسے سے محبت کی ہوتی جو پاس ہوتا، ساتھ رہتا۔ خیال تو کرو کہاں جنوب، کہاں شمال، کجا حیدرآباد کجا آگرہ۔ پھر حالات اتنے مایوس کُن کہ دوبارہ ملنے کی توقع وہم سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی، اور ان سب کے علاوہ میرا تمھارا ذہنی اختلاف کہ تم محبت کو بھی سُٹینس کا ہیچ سمجھتی ہو، ہر چیز کو فیصلہ کن نظر سے دیکھنے کی عادی ہو۔ اور میں دنیا کی ہر چیز کو غیر فیصل شدہ سمجھتا ہوں، اس لئے مجھے ڈر ہے کہ شاید تم میری محبت کو محبت ہی نہ سمجھتی ہو۔ کیونکہ میں تم سے کچھ نہیں چاہتا مجھے خود اپنی حالت پر ترس آتا ہے کہ بغیر کہے دل نہیں مانتا۔ اور یہ بھی سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کہوں، اگر کہوں کہ مجھے تم سے محبت ہے تو یہ نئی بات نہیں ہے۔ تسکینِ دل کی اگر درخواست کروں تو فضول ہے، کیونکہ اگر تم پاس ہوتیں اور تسکین دینا بھی چاہتیں تب بھی نہیں دے سکتیں۔ تسکین تو صرف ہوس ہی کو دی جا سکتی ہے۔ تم سوال کرتی ہو کہ آخر تم کیا چاہتے ہو۔ لیکن میں اس کا کیا جواب دوں، اس کے سوا تمھیں چاہتا ہوں تم سے کچھ نہیں چاہتا۔ چاہنے کا مطلب بھی یہ ہے کہ محبت بھی تمھیں سے اور عداوت بھی تمھیں سے، خوشی کا مرکز بھی تمھیں ہو اور رنج کا بھی غرض تمھارے سوا ذہن و دل میں کوئی نہیں۔ ذہن میں کچھ ہو تو مانگوں، تم سے تمھیں کو مانگتا ہوں۔ نہیں معلوم اس سفر کا کیا انجام ہو گا جس کی منزل ہی نہیں ہے۔ تم نے پوچھا ہے کہ اس

حماقت کا مقصد کیا ہے۔ مگر میرا خیال ہے کہ مقصد خود حماقت ہے۔ ہاں اگر آپ اجازت دیں تو سوال کروں کہ تم میرے لئے کیا کرسکتی ہو یا کرنا چاہتی ہو، چاہے کچھ نہ کرو، مجھے تو صرف تمھارے احساسات سے علاقہ ہے۔ امکانات سے کیا بحث۔ کیا تم جواب دینے کی تکلیف کروگی۔ حالانکہ میں جانتا ہوں کہ تمھارے جواب سے میری تکلیف میں کوئی کمی نہ ہوگی۔ کاش مجھے محبت نے آداب کا پابند نہ کیا ہوتا، اور کاش میں تم سے کہہ سکتا کہ یہ کرو اور وہ نہ کرو۔ مگر محبت تو بندگی ہے۔ کیا بندہ اپنے معبود کو حکم دے سکتا ہے۔ مجھے تو بندگی ہی میں انتہائی لذت محسوس ہوتی ہے۔

آپ مجھے یاد کرتی ہیں! شکریہ! میں نے خط دیر میں بھیجا، اس شکایت کا بھی شکریہ! میرا جی تو یہی چاہتا ہے کہ ایک خط روز لکھا کروں، لیکن سوچتا ہوں کہ زخموں میں نشتر چبھونے سے کیا حاصل۔ تمھارا خط دل کے لئے وہی کام کرتا ہے، جو مار گزیدہ کے لئے ساون کی ہوا، یا خاک میں دبے ہوئے بیج کے لئے بارش کا پانی۔ خط نہیں آتا ہے تو اور ستم کی بےچینی رہتی ہے، آجاتا ہے تو اور طرح کی، بےچینی کی بھی قسمیں ہوتی ہیں! تمھیں بھی معلوم ہے؟

تم الفاظ پر قادر نہیں ہو، کیسے یقین کرلوں۔ لفظ اور معنی، روح اور جسم، سب تمھارے ہیں، حسن کی حکومت کس پر نہیں ہے، میں تمھیں یاد کرتا ہوں، اس لئے کہ تم یاد کئے جانے کے واسطے ہو، تم مجھے کیوں یاد کرتی ہو! یہ بھی کوئی انداز ہوگا، بہت ہی قاتل، اس وار کا توڑ ہی نہیں ہے،

خوشی تو مٹ چکی لیکن نگاہِ لطف نے تیری
دیا تھا دل کو وہ دھوکا کہ غم بھی مٹ گیا ہوتا

بھلا! عشق و حسن دونوں کی خواہش ذاتی ظاہر ہونا ہے۔ نہ عشق چھپ سکتا ہے نہ حسن، اس لئے میں بہت دن تک کشمکش میں کیوں رہتا، میں نے جرأت کے ساتھ ابتدا ہی میں تم سے محبت کا اظہار کردیا تھا۔ یہ تو تمھیں سے ہوسکتا تھا کہ جب تمھاری آنکھوں میں نہ معلوم کیوں آنسو آجاتے تھے تو مسکرا دیتی تھیں اور جب تمھارے لفظوں میں لوچ پیدا ہونے لگتا تو روٹھ جاتیں، وہ نہ کہتیں جو کہنا چاہتی تھیں۔ محبت کی طالب بھی تھیں اور جب محبت پیش کی جاتی تو ٹھکرا بھی دیتیں۔ شاید تم مطمئن تھیں کہ یہ تو میرے ہی لئے ہے، اور میں ہی اس محبت کی واحد حقدار ہوں، کیوں یہی بات تھی نا؟

کچھ ہی کرو، جو حرکت پیدا ہو چکی ہے وہ رُکنے والی نہیں ہے، وجود پر عدم سبقت نہیں لے جاسکتا۔ تم بے اختیارانہ میری طرف بڑھی چلی آرہی ہو، اب چاہے قریب آکر سینے سے لگ جاؤ، یا وار کرنا شروع کردو۔

(تمھارا بیکس)

فسونِ محبت

تمھیں سے ہوئی ہمکو الفت کچھ ایسی — وگرنہ نہ تھی اپنی عادت کچھ ایسی
محبت فسوں ہے محبت جنوں ہے — اسی نے بگاڑی ہے عادت کچھ ایسی
کبھی خود ہی رونا کبھی خود ہی ہنسنا — ہوئی ہے محبت میں وحشت کچھ ایسی
ہوئی ساری رخصت وہ تیزی ہماری — محبت میں پائی اذیت کچھ ایسی

سمجھتے نہ تھے تم سے ملنے سے پہلے
کہ ہو جائے گی تم سے الفت کچھ ایسی!

"ظہیرا" صاحب
بذریعۂ ضیاء الاسلام صاحب

آ !

عبدالغنی۔ میسور

اے آنے والے آ...... آ...... تجھکو آنا ہی چاہیئے۔ تیرے لئے دل بیتاب، آنکھیں منتظر اور جی بے قرار ہے...... تو آ...... اور آتے ہوئے دل کے لئے تاب۔ آنکھوں کے لئے نُور اور جی کے لئے قرار لیتا آ...... مگر آ......

تیری مہمان نوازی کے لئے ایک مدت سے تیاریاں کی جا رہی ہیں، گھر سجایا جا رہا ہے، اور تیری آمد کی خوشیاں منائی جا رہی ہیں—— آ...... اپنے ناچیز میزبان کو شرف بخش۔ گھر میں سجاوٹ بن کر سما جا۔ اور خوشی میں خوشی بن جا......

ساون کا مہینہ، ہر طرف خوشی ہی خوشی ہے۔ فضا میں خوشی کے گیت گائے جا رہے ہیں۔ ہر ایک کا دل پھُولے نہیں سماتا...... تو آ...... خوشی میں سما جا۔ خوشی بن کر گیت میں، گیت بن کر کانوں کی راہ سے ہی دل میں اُتر جا......

بہار کا موسم، پھُول کھِلتے ہیں۔ بلبلیں چہچہاتی ہیں۔ ہوا کے ٹھنڈے ٹھنڈے جھونکے چلتے ہیں۔ اب تو آ...... ہوا بن کر پھولوں کے ساتھ شوخی کر۔ اُن کو ہنسا۔ پھر خوشبو بن کر اُن میں سما جا، دماغوں کو معطر اور بلبل کو مستنظر کر دے......

پھول کھِلتے ہیں۔ بھونرے اُن کا طواف کرتے ہیں۔ مگر آہ گلچین پھولوں کی ہنسی پر جل اُٹھا۔ وہ اُن کی زندگی کو مٹی میں ملانے چلا ہے۔ اس وقت تو آ...... کانٹا بن کر گلچیں کا دامن تھام لے، اور گل کی سفارش کر...... یا کالا بن کر پھول کے دامن میں چھپ جا اور جیسے ہی گلچیں گُل توڑنے کے لئے دست دراز کرے تو تُو ڈس لے......

کسی کی راہ دیکھتے دیکھتے طبیعت تھک گئی ہے۔ کسی کا پیغام سننے کے لئے کان مشتاق ہیں۔ کسی کو جگہ دینے کے لئے دل تڑپ رہا ہے...... تو آ...... تھکی ہوئی طبیعت میں چستی و چالاکی بن کر سما جا...... قاصد بن کر آ، خود پیغام بن جا۔ پھر الفاظ بن کر آنکھوں میں سما جا۔ معنی بن کر دماغ میں بس جا، اور مسرت کا نُور بن کر خانۂ دل کو منور کر دے......

تو ظالم ہی بن کر آ اور مجھے ظلم کے فلسفے سے آشنا کر دے۔ تو قاتل ہی بن کر میری تشنگی کو آبِ تیغ سے بجھا دے۔ تو ساقی بن اور میرے پیمانۂ دل کو بھر دے، تو جنون بن اور مجھے مجنون بنا دے، تو بُت بنکر مجھے پجاری یا خدا بن کر مجھے منصور بنا دے۔

تو خدا بن یا بتِ کافر، تو ظالم بن یا رحمدل۔ تو جو چاہتا ہے بنجا...... مگر آ...... کسی صورت میں بھی کیوں نہ ہو۔ کسی رنگ میں یا کسی حالت میں بھی کیوں نہ ہو۔ اے آنے والے ضرور ضرور آ...... آ...... آ کر مجھ میں مل جا یا مجھے اپنے میں ملا لے...... مگر اے آنے والے خدا کے لئے آ......

نظامِ جدید

بہت دنوں سے یہ افواہ سنتے آئے ہیں — کہ عنقریب "نظامِ جدید" آئے گا
تمام قوم تھی غرقِ تفکّر و تشویش — "بڑے بڑوں" کی مجالس میں تھا یہی چرچا
کبھی کنارہ کشی "گول میز مجلس" سے — کسی کے قلب کو تھا اشتیاق شرکت کا
کسی نے ساتھ دیا سائمن کمیشن کا — کسی نے پاس کیا "بازگشت" کا فتویٰ

مظاہراتِ غم و غصۂ عمومی سے
حواس باختہ تھے سائمن کمیشن کے!

خلاصہ یہ ہے کہ اجرائے "انتظامِ جدید" — کیا حکومتِ برطانیہ کی "مجلس" نے
کہا تھا آپ نے "گو بیک!" جس کمیشن کو — وطن پہونچ کے یہ سب زہر اُگلا ہے اُس نے
مُقنّنین نے لکھا ہے کس تفخّر سے — کہ "ہے یہ ایکٹ مطابق نظامِ برٹش کے
مگر جہاں نظر آئی ضرورتِ ترمیم — وہاں کیا ہے تغیّر خفیف سا" ہم نے"

برائے کشفِ حقیقت "نظامِ نو" پڑھئے
کہ ہو وقوف "رموزِ درونِ پردہ" سے!

وہ خوبیاں جو ہیں رُوحِ نظامِ انگریزی — یہ ایکٹ خالی ہے اُن کے وجود سے یکسر
مگر عیُوب جو برطانوی نظام میں ہیں — وہ رکھ دئے ہیں "نظامِ جدید" میں چُن کر!
حقوق جتنے ہیں "قانون ساز مجلس" کے — چڑھیں گے بھینٹ وہ سب "اختیارِ حاکم" پر
خلاف ورزیِ قانون کرکے حاکم کو — نہ بازپُرس کا ڈر ہے نہ سرزنش کا خطر!
تمام ایکٹ ہیں باطل "نہیں!" سے حاکم کی — وہ "ہاں!" جو کہدے تو نخلِ اُمید بار آور!
غرق! "وفاق" ہے آئینہ دارِ استبداد — فقط غلامیٔ ہندوستاں ہے جس کا ثمر!
اور ادعا ہے کہ "ہم دے رہے ہیں آزادی — چڑھا رہے ہیں تمھیں حُرّیت کے زینے پر!"

خدا کرے کہ وہ آئین بے اثر ہو جائے
غلام جس کے سبب سے غلام تر ہو جائے

محمد یوسف رضا بدایونی

انشائے لطیف

ادیب العصر حضرت لطیف الدین احمد اکبرآبادی کے افسانے

اردو ادب میں صاحبِ "لالۂ رخ" کا نام محتاجِ تعارف نہیں اور افسانہ نویسی کا جو معیار ل احمدؔ نے پیش کیا ہے وہ اپنی جگہ تنہا ایک مثال ہے، اُن کا افسانہ علم و حکمت، جذبات واردات اور نفسیاتِ حسن و عشق کے نازک ترین اشارات کا حامل ہوتا ہے، ان کا طرزِ انشا شعریت اور تفلسف اردو ادب میں مستقل اضافات ہیں۔ ل احمد صاحب کے افسانے بلا شائبہ تغلیط ترقی یافتہ زبانوں کے مقابلے میں رکھے جاسکتے ہیں۔ انشائے لطیف ل احمد صاحب کے پندرہ شہ پاروں کا مجموعہ ہے، جو اکثر نگار اور دیگر مجلاتِ علمیہ و ادبیہ میں طبع ہو کر مقبولیتِ دوام حاصل کرچکے ہیں اس لئے اگر آپ کو سلاست و نفاستِ زبان کے ساتھ نفسیاتِ شباب اور جذباتِ حسن و عشق کی صحیح نقاشی سے کوئی خاص لگاؤ ہے۔ اگر آپ ادب و شعریت کا ذوقِ سلیم رکھتے ہیں تو اس مجموعہ میں آپ کو اپنی طلب و تشنگی کے لئے مکمل سامانِ سیرابی نظر آئے گا۔ طباعت و کتابت روشن ہونے کے ساتھ کراؤن سائز پر تقریباً ڈھائی سو صفحات کی ضخامت، نفیس مجلد اور قیمت صرف دو روپیہ (عہ)

نغمات

نثر کی شاعری

ادبِ اردو میں جناب ل احمد کی تنہا وہ ہستی ہے جس نے حسن و عشق کی واردات و نفسیات کو انتہائی مطالعۂ فکر کے ساتھ اپنی ذاتی تاثرات و تکیفات کے ماتحت شعریت و موسیقی یا موسیقیتِ شعر کی صورت میں صفحاتِ سادہ کو فردوسِ خیال بنا دیا ہے۔ اس مجموعے میں جناب لطیف کے ساٹھ مختصر ترین فسانے اور ادب پارے شامل ہیں جنھیں نثر کی شاعری کے شہ پاروں کا ایک دعد آفرین کارنامہ کہا جا سکتا ہے۔ یہ کتاب بھی مکمل ترتیب و تہذیب کے بعد تیار ہو چکی ہے۔ اگر آپ اپنی زبان کی نزاکت و لطافت کا اندازہ کرنا چاہتے ہیں تو اس کتاب کو ضرور منگائیے۔

قیمت صرف عہ علاوہ محصولڈاک

منیجر کلیم بک ڈپو جینتی نواس نمبر ۴ دریا گنج دہلی سے منگائیے

شاعرِ انقلاب حضرتِ جوش ملیح آبادی کی

چار پُرانی تصانیف

حضرتِ جوش نے ایک مدت ہوئی چار چھوٹے چھوٹے رسائل طبع کرائے تھے لیکن اُن کی شاعرانہ بےنیازی نے اس کی اجازت نہ دی کہ انھیں شائع کرتے۔ اتفاق سے یہ چیزیں میری نظر سے گزریں تو مناسب معلوم ہوا کہ ان کی قیمت غیر معمولی طور پر کم کر کے انھیں شائقین کے ہاتھوں تک پہنچا دیا جائے۔

(۱) **جذباتِ فطرت** — حضرتِ جوش کی وہ زلزلہ آرا نظم ہے جس میں مظاہرِ قدرت کی طرف سے شعراء اردو کی خدمت میں یہ اپیل کی گئی ہے، کہ وہ پرانی روش کو ترک کر دیں۔ قیمت رعایتی ار

(۲) **اوراقِ سحر** — یہ حضرتِ جوش کے لطیف چھوٹے چھوٹے جملوں کا مجموعہ ہے جس میں سحر خیز محاسن نہایت لطیف پیرایہ میں بیان کئے گئے ہیں۔ قیمت عہ رعایتی ۲ر

(۳) **آوازۂ حق** — یعنی معرکۂ تسلیم و رضا سب سے زبردست اور عدیم المثال ہیرو اور حق و باطل کے سب سے بڑے سادت حسینؑ ابنِ علیؑ کے خونِ ناحق اور صبر و استقلال کا ایک عظیم الشان مرقع اور آپ کی اخلاقی اور روحانی تعلیم کا نہایت درخشاں آئینہ۔ قیمت ۸ رعایتی ۲ر

(۴) **مقالاتِ زریں** — یہ حضرت جوش کے نادر کلمات، فلسفیانہ اقوال اور لطائف کا دلچسپ اور کار آمد مجموعہ ہے۔ قیمت ۱ار رعایتی ۲ر

پورے سٹ کی رعایتی قیمت مع محصول ڈاک ۲ر وی پی منگانے کی زحمت نہ فرمائیں بلکہ ڈاک کے ٹکٹ کر طلب کریں۔

ان کے علاوہ کلیم بک ڈپو سے ہر قسم کی سستی کتابیں ہر مصنف کی تصنیف ہم سے طلب فرمائیے۔

کلیم بک ڈپو جینتی نمبر ۴ دریا گنج دہلی پتہ لکھیے

خریداران کلیم

خط و کتابت کے وقت نمبر خریداری کا حوالہ ضرور دیں۔ اور اپنا نام و پتہ صاف
اور خوشخط لکھا کریں۔ جواب طلب امور کے لئے ایک آنہ کا ٹکٹ بھیجیں۔ (مینیجر)

بہت سستا اور بہت اچھا، بڑا سائز، ۱۲ صفحات۔ رنگین ٹائٹل

ہفتہ وار اخبار جدت مراد آباد

شمع وطن کا پروانہ۔ مذہب کا شیدائی۔ اصلاح ملت کا حامی۔ ہندوستانیوں کے مفاد کا پاسبان۔ مسلم جذبات کا ترجمان۔ زمینداروں و غرباء کے حقوق کا نگہبان مشرق و مغرب کے علم و ادب کا نایاب مرقع نہایت آب و تاب کے ساتھ کثیر تعداد میں شائع ہو کر ملک سے خراج تحسین حاصل کر رہا ہے۔

اس اخبار میں دلکش نظمیں۔ ممالک اسلامی کی خبریں۔ دلچسپ افسانے۔ روحانیات۔ مفرحات۔ اسلامی تعلیمات۔ مفید معلومات۔ ریاستوں کے حالات سیر رسول۔ ادب لطیف۔ معاشرت ادہام۔ تاریخ اسلام۔ آرٹیکل نوٹ۔ ملکی و غیر ملکی تازہ ترین خبروں کے عنوانات ہوتے ہیں۔ اس اخبار کے لئے مایۂ ناز اہل قلم و قابل فخر انشار پرداز حضرات کی خدمات حاصل کی گئی ہیں۔ اور یہ اخبار ملک کے بہترین اہل قلم کے دماغی افکار کا نتیجہ ہے۔ یہ اخبار نیا نہیں ہے بلکہ اس کی گیارھویں جلد ہے۔ جو پنچ سائز کے ۱۲ صفحہ رنگین ٹائٹل۔ بہترین کتابت۔ برقی مشین کی نایاب طباعت کے ساتھ شائع ہوتا ہے۔

اتنے اوصاف کے باوجود قیمت صرف تین روپیہ سالانہ اور ۱۲؍ ششماہی مقرر کی گئی ہے تاکہ ہر شخص آسانی خرید سکے لہٰذا آج ہی اخبار کی قیمت بھیجکر آپ اپنے نام یہ اخبار جاری کرائیے۔ مشتہرین کے لئے جدت بہت نفع بخش اخبار ہے ایسے کثیر الاشاعت اور موقر اخبار میں اشتہار دینے سے مشتہرین فائدہ حاصل کر سکتے ہیں۔

نئے ایجنٹ صاحبان ایجنسیوں کے لئے درخواست بھیجیں

مینجر اخبار جدت مراد آباد (یو۔پی) پرنس روڈ

ماہ بہتر صفحات

خضر راہ

ہندوستان بھر میں سیکسوئل سائنس (تعلقات جنسی) کا واحد آرگن

سال بھر کیلئے بالکل مفت

دو روپے دو (۲) آنے بھیج دیجئے

منی آرڈر وصول ہوتے ہی آپ کی خدمت میں مندرجہ ذیل کتب ارسال ہونگی۔

روسی افسانے۔	حجم ۲۷۰ صفحات	قیمت	۱۲؍
پہلا شراب کار۔	حجم ۸۰ صفحات	قیمت	۴؍
سالنامہ خضر راہ	حجم ۲۰۰ صفحات	قیمت	۱۰؍
کل۔	۴۲۴ صفحات	قیمتی	۲؍۲

گویا کہ خضر راہ سال بھر مفت حاضر ہوتا رہیگا۔ یہ موقعہ بار بار حاصل نہ ہوگا۔

خضر راہ بارود خانہ سٹریٹ لاہور